ہمایوں

جلد ۵۳

نمبر ۱
کل نمبر ۳۱۳

ہمایوں سالگرہ نمبر ۱۹۴۸ء

فہرست مضامین، جنوری ۱۹۴۸ء

ایڈیٹر: بشیر احمد بی۔اے (آکسن)، بیرسٹرایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: شیر محمد اختر

نمبر شمار	مضمون	صاحب مضمون	صفحہ
۱	کلام ہمایوں	آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم	۲
۲	بزدل (ترجمہ نظم)	اصغر بشیر مرحوم	۳
۳	بزم ہمایوں	بشیر احمد	۴
۴	جہاں نما	″	۵
۵	دنیا ۱۹۴۷ء میں	″	۱۵
۶	توحید (نظم)	جناب پیرزادہ احمد ندیم صاحب قاسمی بی۔اے	۲۲
۷	محض گفتگو	″ خان بہادر میاں عبدالعزیز صاحب فلک پیما	۲۳
۸	ہجر (ترجمہ عربی قطعہ)	″ حامد علی خاں صاحب بی اے	۲۵
۹	تجلیات (غزل)	″ خواجہ عبدالسمیع پال آثر صہبائی صاحب ایم۔اے۔ایل ایل بی	۲۶
۱۰	پاکستان میں اردو کا مستقبل	″ ڈاکٹر سید عبداللہ ایم۔اے۔ڈی لٹ ریڈر پنجاب یونیورسٹی	۲۷
۱۱	اگست ۱۹۴۷ء (نظم)	آنریبل جسٹس مسٹر ایس۔اے رحمٰن صاحب جج ہائیکورٹ لاہور	۳۴
۱۲	وادیٔ شملہ کو الوداع (نظم)	محترمہ ر ح۔ب صاحبہ	۳۵
۱۳	ہجرت کے بعد	جناب پروفیسر حمید احمد خاں صاحب ایم۔اے	۳۶
۱۴	آتش کدہ (افسانہ)	″ اعجاز حسین صاحب بٹالوی بی۔اے	۳۷
۱۵	برابر کا تول (نظم)	حضرت سید علی منظور صاحب حیدرآبادی	۴۰
۱۶	مشکل پسند شاعر	جناب فلک پیما	۴۱
۱۷	غزل	″ ڈاکٹر محمد دین صاحب تاثیر ایم۔اے، پی ایچ ڈی	۴۳
۱۸	سورج دیوتا کا پہلا پیار (افسانہ)	″ لفٹیننٹ کرنل میاں عطاءالرحمٰن صاحب بی۔اے	۴۴
۱۹	دو غزلیں	″ حفیظ ہوشیارپوری ایم۔اے	۴۶
۲۰	ننھی کرن (افسانہ)	شیر محمد اختر	۴۸
۲۱	نذر گلچیں		۵۳
۲۲	محفل ادب	حضرت جوش ملیح آبادی	۵۵
۲۳	مطبوعات		۵۹

چندہ سالانہ ۶ر
ششماہی ۳ر
قیمت سالگرہ نمبر ۱۲ر

کلامِ ہمایوں

وہ دن بھی یاد ہیں تجھ کو عجب دُنیا کی حالت تھی ہر اک قوم اور ملت غرقِ دریائے جہالت تھی
مشائخ میں حسد تھا اور قبیلوں میں عداوت تھی عرب کی سرزمیں سب تشنۂ آبِ اُخوّت تھی
یکایک جانبِ مکّہ سے اُٹھا ابر رحمت کا
ہوئی شاداب دُنیا معجزہ دیکھو نبوت کا

عرب جاگا خدائی نے خدا کو اپنے پہچانا، ہوئے وحدت میں یکتا جن کے معبد تھے جُداگانہ
بنے سب بھائی بھائی اعلیٰ ادنےٰ اپنا بیگانہ ہُوئے وحشی مہذّب اور ناداں بن گئے دانا
بنی آدم بنا انساں جہاں میں انقلاب آیا
سوالِ اوّلیں کا کیسا دل خوش کُن جواب آیا

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہو گا پھر کبھی دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا!
اک تُم کہ جم گئے ہو جمادات کی طرح اک وہ کہ گویا تیر کماں سے نکل گیا
ہاں ہاں سنبھالو قوم کو شاید سنبھل ہی جائے گر گر کے اپنا ملک کچھ آخر سنبھل گیا
دن گزرا پر تمھاری وہی ایک بات ہے
سر پر کھڑی وہ دیکھو قیامت کی رات ہے!

ہُمایوں مرحوم

بُزدل

غرق رہتا ہے میرا دل اس فکر میں کہ میں کون سی راہ انتخاب کروں؟
ہر پھیلایا ہوا ہاتھ میری روح پر منڈلاتا رہتا ہے،
ہر پھٹا ہوا لباس ایک مظلوم آواز ہے "
حاجت مندی کا فصیح اظہار!
کبھی تو میں محسوس کرتا ہوں امیروں کی طرح
جو تیوری چڑھاتے ہیں فقیروں کے ہاتھ پر،
اور کبھی یہ کہ "حیف ہو مجھ پر کیا کیا میں نے!"
اور یوں کھڑا رہتا ہوں میں حیرت زدہ!
کیونکہ غریب آدمی کی نگاہ عمیق ہے،
وہ میری رُوح کی گہرائی تک جا پہنچتی ہے،
اُس میں منعکس ہے اُس کی زندگی، ایک چٹان کی طرح خطرناک
جس پر وہ چلتا ہے تن تنہا!
آہ پھر میں محسوس کرتا ہوں "دے دے جو کچھ بھی تیرے پاس ہے"
لیکن کوئی شے ہے جو میرے دماغ میں پھڑکتی ہے
اور مجھے ایسا کرنے سے روک دیتی ہے،
یہ ہے سونے کی زنجیر جو مجھے بے بس کئے ہوئے ہے!
اور پھر اُداس تنہائی میں
بھوکے لوگوں کی آواز مجھے بلاتی ہے۔
لیکن میں ہوں کہ اپنی بزدلی میں مستغرق رہتا ہوں،
گھرا ہوا اونچی اونچی تنگ و تار دیواروں سے!
تاہم ہر روز مجھے موقع ملتا ہے
کہ بہت سی تھکی ماندی آنکھوں پر ڈالوں
ایک زیادہ نرم اور دل خوش کن نگاہ
بجائے سرد مہری کی نظروں کے!
لیکن غریب آدمی کی آنکھوں سے میں گریز ہی کرتا ہوں
تھوڑا بہت جو میں کرتا بھی ہوں اُف وہ کتنا تھوڑا ہے،
میرا تاریک دل تو صرف یہ خیال کر سکتا ہے
"بزدل او بزدل!" اور بس!

اصغر بشیر (لاہور دسمبر ۱۹۳۷ء)

(یہ مرحوم کی پہلی انگریزی نظم کا ترجمہ ہے جو انگلستان کو روانہ ہونے سے تین چار ماہ پہلے ۱۸½ سال کی عمر میں لکھی گئی "اصغر اور اُس کی نظمیں" پچھلے سال طبع ہوئی ہے)

بزمِ ہمایوں

ستہ سال جو انقلابِ عظیم ہمارے ملک میں برپا ہوا آج اُس سے ہماری قومی و انفرادی زندگی کا ہر شعبہ متاثر نظر آتا ہے۔ آج ہمارا مُلک وہ مُلک نہیں آج ہماری قوم وہ قوم ی وہ فرد نہیں رہا۔ ہندوستان "پاکستان" اور "انڈیا" بن گیا۔ "قوم" دو قوموں میں تقسیم ہو گئی۔ ملکی زبان بھی اس رسّہ کشی میں منقسم یا منقلب ہوا چاہتی ہے۔ نقلابی قوتیں کچھ اس طرح کام کر رہی ہیں کہ غالباً انڈیا یا ہندوستان زیادہ تر ہندوؤں کا مُلک ہو جائے گا اور پاکستان زیادہ تر مسلمانوں کا مُلک۔ اُردو کو فی الحال ن سے دیس نکالا دیا جا رہا ہے اور وہاں ہندی کا زور ہے ادھر پاکستان میں لامحالہ اُردو ہی جلد یا بدیر سرکاری زبان کا کام دے گی۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ علیحدگی ر کہاں تک قائم رہے گی سوال یہ ہے کہ کیا علیحدگی کے ہوتے ہوئے بھی ہم بعض باتوں میں مثلاً زبان کے بارے میں ایک حد تک کوئی قدرِ مشترک پیدا نہیں اس کا جواب آج ہم نہیں دے سکتے۔ اِس کا جواب خود وقت ہی مہیا کر سکتا ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ پاکستان کی قومی زبان اُردو اور صرف اُردو ہو سکتی ہے، ہماری گزشتہ روایات اور ہمارے آئندہ کے منصوبے صرف اُردو کے ذریعہ سے ظہار میں آئیں گے۔ پاکستان میں بھانت بھانت کی بولیاں رہیں لیکن اُس کی قومی زبان یقیناً اُردو ہی ہوگی۔ اس لئے اُردو کی اشاعت اور خدمت انی اور قومی فرض ہے۔ جہاں تک ہمارے بس میں ہے "ہمایوں" اس خدمت کو جاری رکھے گا۔

گزشتہ سال میں اُردو پر کیا گزری، یہ ایک دردناک کہانی ہے۔ ہم صرف دو ایک واقعات پر اکتفا کریں گے۔ سال کے شروع میں ریاست حیدرآباد نے ترقی اُردو کی امداد "ملتوی" لیکن دراصل گویا بند کرنے کا اعلان کیا۔ سال کے وسط تک آل انڈیا ریڈیو نے اُس نئی ہندوستانی کو روز و شب نشر کرنا شروع کیا اہلِ سنسکرتی ہندی ہے۔ اُس وقت تک تو خیر گزری جب تک "خاص خاص" خبروں کی جگہ "موٹی موٹی" خبروں نے لی یا "وقت" کو مُلک بدر کر کے "سمے" کو تخت کیا گیا۔ لیکن اب "بھارت" اور "منتری" سے گزر کر "اندولن" اور "بھاشنر" اور "آشا" اور "جاتیاں" رونما ہوئیں۔ ۵ر نومبر کو یو۔پی اسمبلی میں ہندی ری زبان قرار دی گئی اور کیا یہ بات مانی جا سکتی ہے کہ سال کے اخیر میں دہلی کے بازاروں میں اُردو کے "نام لیوا" کھلے بندوں نہ پھر سکتے تھے؟ اس ڑا "لسانی انقلاب" دنیا کی تاریخ میں کہیں کم دیکھنے میں آیا ہوگا۔ خدا کرے یہ محض ایک عارضی دیوانگی ثابت ہو۔

پاکستانیوں کو چھوڑ کر اس "زبردست بے وفائی" کا جو اثر ہندوستان کے بعض کٹر نیشنلسٹ خدا نا پرست مُسلمانوں پر بھی ہوا ہے اُس کی آواز اُس عبرتناک دیں سُنئیے جو "صلہ یا سزا؟" کے نام سے "حضرت" جوش ملیح آبادی کے دل سے نکلی ہے اور جسے خود انھوں نے ہمارے پاس ایک اخباری تراشے کی شکل میں بغرضِ اعت بھیجا ہے۔ (مُلاحظہ فرمائیے "محفلِ ادب") — جوش صاحب کے یہ فقرے یاد رکھنے کے قابل ہیں کہ "ہمارے مُلک نے ہمارے ساتھ ایک ایسی زبردست عبرتناک وفائی کی ہے جسے ہم نزع کی ہچکی تک معاف نہیں کر سکتے۔ آزاد ہوتے ہی ہماری قوم نے مرہم عطا کرنے کے عوض ہمارے دلوں میں ایک ایسا گہرا زخم ڈالا ہے جو قیامت ر رِستا رہے گا اور وہ زخم ہے ہمارے مال، ہماری جان اور ہمارے ایمان سے بھی بہ مراحل گراں قدر اُردو زبان کا خاتمہ، اُردو زبان کا خون اور اُردو زبان کی ہادت۔ دیدہ دلیری اور دھاندلی کی یہ انتہا ہے کہ اُردو کو یو۔پی میں معزول کر دیا گیا ہے۔ وہ یو۔پی جو اُردو کا گھر ہے جو اُردو کی راجدھانی ہے کیا ہم نے اپنے قلم اور اپنی بان کو استقلالِ وطن کی خاطر اسی لئے استعمال کیا تھا کہ ہمارا قلم توڑ دیا اور ہماری زبان کاٹ دی جائے؟ کہاں ہیں اُردو کے نام لیوا قبل اس کے کہ پانی سر سے اونچا ہو جائے ہر ممکن عجلت کے ساتھ بلا تفریقِ مذہب و ملت لکھنؤ میں جمع ہو جائیں اور انجمن تحفظ و ترویج اُردو کی بنیاد ڈال کر گاندھی کی طرح کام شروع کر دیں اور اُس وقت تک دم نہ لیں جب تک کہ اُن کے ارمان اور گاندھی جی کے فرمان کے مطابق نا انصافی انصاف کا جامہ پہن لے اور دیوناگری کے دوش بدوش اُردو کا دریا بھی نہ بہنے لگے۔

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم — قضا ز جنبشِ رطلِ گراں بگردانیم!"

ہم جوش صاحب کی "جنبشِ رطلِ گراں" کو دُور سے دیکھیں گے اور خدا سے اُن کی کامیابی کے لئے دست بدعا رہیں گے ——!

بشیر احمد

جہاں نُما

۱۹۴۷ء کے اہم واقعات

ہندوستان

نوری - اس بات کا امکان کہ کانگریس ۶ دسمبر کا بیان (لیگی نقطۂ نظر) مان لے گی

ر گاندھی جی کے "پیدل دورے" کا آغاز نواکھلی میں -

ر سندھ میں مُسلم لیگ کی وزارت

آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے ۶ دسمبر کا بیان تسلیم کر لیا (سکھوں کی ناراضی)

ر بنگال اور پنجاب کی تقسیم کے منصوبے -

ر

ار

ار کمیونسٹ پارٹی کے دفاتر پر حکومتِ ہند کے چھاپے

۲ ر مئی دہلی میں دستور ساز اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا -

۲۱ ر

۲ ر پنجاب کے مسلم لیگی لیڈروں کی گرفتاری اور لیگی تحریک کا آغاز -

ر فروری نئی دہلی میں مرکزی اسمبلی کا اجلاس (مسلم لیگ نے مقاطعہ کیا)

ر کرپلانی صدر کانگریس کی تقریر کہ بہار نے ہندومت کو دُنیا کی نظر میں ذلیل کر دیا ہے -

ر

ار

ار برطانوی حکومت کا بیان دارالعوام میں کہ برطانیہ جون ۱۹۴۸ء تک ہندوستان میں اختیاراتِ حکومت منتقل کر دے گا -

۲ ر

دُوسرے مُلک

جمعیتِ اقوام کے سکریٹری کا پیغام نو روز کہ سیاسی صورتِ حال پچھلے سال سے بہتر ہے -

فلسطین میں یہودیوں کا حملہ انگریزوں پر

عرب لیگ نے سوڈان کے بارے میں مصر کی حمایت کی -

انڈوچائنا اور انڈونیشیا میں لڑائی چھڑ گئی -

چینی کمیونسٹوں نے جارحانہ جنگ شروع کی -

برطانوی مصری معاہدہ کے متعلق گفت و شنید ناکام رہی -

یورپ میں سردی کی انتہائی شدت -

پیرس میں اطالیہ - رُومانیہ - ہنگری - بلغاریہ اور فن لینڈ کے متعلق صلح ناموں پر دستخط ہو گئے -

حفاظتی کونسل میں اٹیم بم اور تخفیفِ اسلحہ کے متعلق روس اور امریکہ میں شدید اختلاف

برطانوی وزیرِ اعظم اٹیلی کی دعوتِ عمل اپنی قوم کو کہ اس معاشی بحران میں وہ قربانی کے لئے تیار ہو جائے -

بزمِ ہمایوں

گزشتہ سال جو انقلابِ عظیم ہمارے ملک میں برپا ہوا آج اُس سے ہماری قومی و انفرادی زندگی کا ہر شعبہ متاثر نظر آتا ہے۔ آج ہمارا مُلک وہ مُلک نہیں آج ہماری قوم وہ قوم نہیں، فرد بھی وہ فرد نہیں رہا۔ ہندوستان "پاکستان" اور "انڈیا" بن گیا۔ "قوم" دو قوموں میں تقسیم ہو گئی۔ ملکی زبان بھی اس رستہ کشی میں منقسم یا منقلب ہوا چاہتی ہے۔ انقلابی قوتیں کچھ اس طرح کام کر رہی ہیں کہ غالباً انڈیا یا ہندوستان زیادہ تر ہندوؤں کا مُلک ہو جائے گا اور پاکستان زیادہ تر مسلمانوں کا مُلک۔ اُردو کو فی الحال ہندوستان سے دیس نکالا دیا جا رہا ہے اور وہاں ہندی کا زور ہے ادھر پاکستان میں لامحالہ اُردو ہی جلد یا بدیر سرکاری زبان کا کام دے گی۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ علیحدگی کب تک اور کہاں تک قائم رہے گی سوال یہ ہے کہ کیا علیحدگی کے ہوتے ہوئے بھی ہم بعض باتوں میں مثلاً زبان کے بارے میں ایک حد تک کوئی قدرِ مشترک پیدا نہیں کر سکتے؟ اس کا جواب آج ہم نہیں دے سکتے۔ اس کا جواب خود وقت ہی مہیا کر سکتا ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ پاکستان کی قومی زبان اُردو اور صرف اُردو ہو سکتی ہے، ہماری گزشتہ روایات اور ہمارے آئندہ کے منصوبے صرف اُردو کے ذریعہ سے معرضِ اظہار میں آئیں گے۔ پاکستان میں بھانت بھانت کی بولیاں رہیں لیکن اُس کی قومی زبان یقیناً اُردو ہی ہو گی۔ اس لئے اُردو کی اشاعت اور خدمت ہمارا لسانی اور قومی فرض ہے۔ جہاں تک ہمارے بس میں ہے ہمایوں اس خدمت کو جاری رکھے گا۔

گزشتہ سال میں اُردو پہ کیا گزری، یہ ایک دردناک کہانی ہے۔ ہم صرف دو ایک واقعات پر اکتفا کریں گے۔ سال کے شروع میں ریاست حیدرآباد نے انجمن ترقی اُردو کی امداد "ملتوی" لیکن دراصل گویا بند کرنے کا اعلان کیا۔ سال کے وسط تک آل انڈیا ریڈیو نے اُس نئی ہندوستانی کو روز و شب نشر کرنا شروع کیا جو دراصل سنسکرتی ہندی ہے۔ اُس وقت تک تو خیر گزری جب تک "خاص خاص" خبروں کی جگہ "موٹی موٹی" خبروں نے لی یا "وقت" کو ملک بدر کر کے "سمے" کو تخت نشین کیا گیا۔ لیکن اب "بھارت" اور "منتری" سے گزر کر "آندولن" اور "بھاشنڑ" اور "آشا" اور "جاتیاں" رُونما ہوئیں ۔۵ نومبر کو یو۔ پی اسمبلی میں ہندی سرکاری زبان قرار دی گئی اور کیا یہ بات مانی جا سکتی ہے کہ سال کے اخیر میں دہلی کے بازاروں میں اُردو کے "نام لیوا" کھلے بندوں نہ پھر سکتے تھے؟ اس سے بڑا "لسانی انقلاب" دنیا کی تاریخ میں کہیں کم دیکھنے میں آیا ہو گا۔ خدا کرے یہ محض ایک عارضی دیوانگی ثابت ہو۔

پاکستانیوں کو چھوڑ کر اس "زبردست بے وفائی" کا جو اثر ہندوستان کے بعض کٹر نیشنلسٹ خدا پرست مسلمانوں پر بھی ہوا ہے اُس کی آواز اُس عبرتناک فریاد میں سُنئیے جو "صلہ یا سزا؟" کے نام سے "حضرت" جوش ملیح آبادی کے دل سے نکلی ہے اور جسے خود انھوں نے ہمارے پاس ایک اخباری تراشے کی شکل میں لغرضِ اشاعت بھیجا ہے۔ (ملاحظہ فرمائیے "محفلِ ادب") ۔۔۔ جوش صاحب کے یہ فقرے یاد رکھنے کے قابل ہیں کہ "ہمارے ملک نے ہمارے ساتھ ایک ایسی زبردست و عبرتناک بے وفائی کی ہے جسے ہم نزع کی ہچکی تک معاف نہیں کر سکتے۔ آزاد ہوتے ہی ہماری قوم نے مرہم عطا کرنے کے عوض ہمارے دلوں میں ایک ایسا گہرا زخم ڈالا ہے جو قیامت تک رِستا رہے گا اور وہ زخم ہے ہمارے مال، ہماری جان اور ہمارے ایمان سے بھی بہ مراحل گراں قدر اُردو زبان کا خاتمہ، اُردو زبان کا خون اور اُردو زبان کی شہادت۔ دیدہ دلیری اور دھاندلی کی یہ انتہا ہے کہ اُردو کو یو۔ پی میں معزول کر دیا گیا ہے۔ وہ یو۔ پی جو اُردو کا گھر ہے جو اُردو کی راجدھانی ہے کیا ہم نے اپنے قلم اور اپنی زبان کو استقلالِ وطن کی خاطر اسی لئے استعمال کیا تھا کہ ہمارا قلم توڑ دیا اور ہماری زبان کاٹ دی جائے؟ کہاں ہیں اُردو کے نام لیوا؟ اپیل اس کے کہ پانی سر سے اونچا ہو جائے ہر ممکن عجلت کے ساتھ بلا تفریقِ مذہب و ملت لکھنؤ میں جمع ہو جائیں اور انجمنِ تحفظ و ترویجِ اُردو کی بنیاد ڈال کر گاندھی کی طرح کام شروع کر دیں اور اُس وقت تک دم نہ لیں جب تک کہ اُن کے ارمان اور گاندھی جی کے فرمان کے مطابق ناانصافی انصاف کا جامہ پہن لے اور دیوناگری کے دوش بدوش اُردو کا دریا بھی نہ بہنے لگے۔"

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم   قضا ز جنبشِ رطلِ گراں بگردانیم!

ہم جوش صاحب کی "جنبشِ رطلِ گراں" کو دُور سے دیکھیں گے اور خدا سے اُن کی کامیابی کے لئے دست بدعا رہیں گے ــــــ!

بشیر احمد

جہاں نُما

سنہ ۱۹۴۷ء کے اہم واقعات

ہندوستان	دُوسرے مُلک
یکم جنوری - اس بات کا امکان کہ کانگرس ۶ ر دسمبر کا بیان (لیگی نقطۂ نظر) مان لے گی	جمعیتِ اقوام کے سکریٹری لی کا پیغامِ نوروز کہ سیاسی صورتِ حال پچھلے سال سے بہتر ہے۔
۲ ر گاندھی جی کے "پیدل دورے" کا آغاز نواکھلی میں۔	فلسطین میں یہودیوں کا حملہ انگریزوں پر
۳ ر سندھ میں مُسلم لیگ کی وزارت	عرب لیگ نے سوڈان کے بارے میں مصر کی حمایت کی۔
۶ ر آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے ۶ ر دسمبر کا بیان تسلیم کرلیا (سکھوں کی ناراضی)	
۸ ر بنگال اور پنجاب کی تقسیم کے منصوبے۔	
۱۰ ر	انڈوچائنا اور انڈونیشیا میں لڑائی چھڑ گئی۔
۱۲ ر	چینی کمیونسٹوں نے جارحانہ جنگ شروع کی۔
۱۴ ر کمیونسٹ پارٹی کے دفاتر پر حکومتِ ہند کے چھاپے	
۲۰ ر نئی دہلی میں دستور ساز اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا۔	
۲۳ ر	برطانوی مصری معاہدہ کے متعلق گفت و شنید ناکام رہی۔
۲۴ ر پنجاب کے مسلم لیگی لیڈروں کی گرفتاری اور لیگی تحریک کا آغاز۔	
۳ ر فروری نئی دہلی میں مرکزی اسمبلی کا اجلاس (مسلم لیگ نے مقاطعہ کیا)	
۹ ر کرپلانی صدر کانگرس کی تقریر کہ ہمارنے ہندومت کو دُنیا کی نظر میں ذلیل کر دیا ہے۔	یورپ میں سردی کی انتہائی شدت۔
۱۰ ر	پیرس میں اطالیہ۔ رُومانیہ۔ ہنگری۔ بلغاریہ اور فن لینڈ کے متعلق صلح ناموں پر دستخط ہو گئے۔
۱۲ ر	حفاظتی کونسل میں اٹیم بم اور تخفیفِ اسلحہ کے متعلق روس اور امریکہ میں شدید اختلاف
۲۰ ر برطانوی حکومت کا بیان دارالعوام میں کہ برطانیہ جون سنہ ۱۹۴۸ء تک ہندوستان میں اختیاراتِ حکومت منتقل کر دے گا۔	
۲۲ ر	برطانوی وزیرِ اعظم اٹیلی کی دعوتِ عمل اپنی قوم کو کہ اس معاشی بحران میں وہ قربانی کے لئے تیار ہو جائے۔

	ہندوستان	دوسرے ملک
۲۵ فروری		برطانوی وزیر خارجہ بیون کا بیان کہ امریکی صدر ٹرومن فلسطین سے متعلق مفاہمت کرنے میں حارج ہے۔
۲۶ ر	حکومت پنجاب اور مسلم لیگ میں مفاہمت۔ لیگی لیڈروں کی رہائی۔	
۲۸ ر	عارضی حکومت ہند میں لیاقت نے اپنا بجٹ پیش کیا۔ جسے غریب طبقے نے سراہا۔ ماسٹر تارا سنگھ نے خانہ جنگی کی دھمکی دی کہ مسلمانوں کو پنجاب سے باہر نکال دیا جائے گا۔	
یکم مارچ	لیگی تحریک صوبہ سرحد میں پھیلتی گئی۔	برطانوی فوجوں نے فلسطین میں یہودیوں کی سرکوبی شروع کر دی۔
۲ ر	پنجاب میں مسلم لیگ کا یوم فتح۔ خضر حیات نے استعفیٰ دے دیا۔	
۳ ر	لاہور میں ہندوؤں اور سکھوں کا تشدد آمیز مظاہرہ پاکستان کے خلاف۔ اسمبلی کا التوا۔	
۴ ر	لاہور اور امرتسر میں ہندوؤں اور سکھوں کے حملے مسلمانوں پر۔ چوک پراگ داس کا واقعہ	
۵ ر	پنجاب میں دفعہ ۹۳ کا نفاذ۔ لاہور میں فوج بلائی گئی۔ صورت حال بد سے بدتر ہوتی گئی۔	
۸ ر	کانگریس ورکنگ کمیٹی کی قرارداد کہ پنجاب کو تقسیم کیا جائے۔	ماسکو میں چار وزرائے خارجہ کی کانفرنس۔
۹ ر		
۱۱ ر	پنجاب میں ہندوؤں اور سکھوں نے پاکستان کے خلاف دن منایا	روس کو صدر ٹرومن کی تنبیہ کہ تشدد سے سیاسی تغیرات پیدا کرنے کی کی شدید مخالفت کی جائے گی۔
۱۲ ر		
۱۵ ر	پنجاب کے فسادات میں "ایک ہزار" سے زیادہ آدمی ہلاک ہوئے۔ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں اور مغربی پنجاب میں ہندوؤں سکھوں کا قتل	
۲۲ ر	لارڈ ماؤنٹ بیٹن نئے وائسرائے کی آمد نئی دہلی میں۔	
۲۳ ر	نئی دہلی میں بین ایشیائی کانفرنس (تا ۲ اپریل)	ڈچ حکومت نے اصولی طور پر انڈونیشیا کی ریاست ہائے متحدہ کا وجود تسلیم
۲۵ ر		
۳۰ ر	کلکتہ بمبئی وغیرہ میں فرقہ وار فسادات	
۳۱ ر	گاندھی جی کی ملاقات وائسرائے سے (یہ ملاقاتیں ۱۰ اپریل تک جاری رہیں)	
یکم اپریل	صوبہ سرحد میں مسلم خواتین نے وزیراعظم کی کوٹھی پر مسلم لیگ کا جھنڈا نصب کر دیا۔	

ہندوستان

۱۰ اپریل جناح کی ملاقات وائسرائے سے (یہ ملاقاتیں ۲۶ تک جاری رہیں)

۱۵ر جناح اور گاندھی کی مشترکہ اپیل تشدد کے خلاف۔

۱۷ر لارڈ پیتھک لارنس کی بجائے لارڈ لسٹوئیل ہندوستان کے نئے سکریٹری آف سٹیٹ مقرر ہوئے۔

۲۰ر پنڈت نہرو کا بیان کہ مسلمان بے شک پاکستان لے لیں۔

۲۱ر ملک بھر میں فرقہ وارانہ فسادات (بمبئی۔ کلکتہ۔ بنارس۔ کانپور وغیرہ)

۲۴ر

۲۸ر بابو راجندر پرشاد نے دستور ساز اسمبلی کو ہندوستان کی تقسیم کے لئے تیار ہو جانے کی اطلاع دی۔

یکم مئی ر کانگرس ورکنگ کمیٹی کا جلسہ۔

۲ر ہندوستان کی آزادی کے متعلق وائسرائے نے اپنا منصوبہ لندن بھیجا۔

۵ر گاندھی نے برطانیہ سے مطالبہ کیا کہ وہ فوراً ہندوستان کو خالی کر دے۔

۶ر گاندھی کی ملاقات جناح سے۔

۷ر گاندھی کا بیان کہ کانگرس نے پاکستان کا اصول مان لیا ہے لیکن میں نہیں مانتا۔

۱۲ر امرتسر میں شدید فرقہ دار فساد۔

۱۵ر لاہور میں قتل و غارت اور آتش زدگی کی متعدد وارداتیں

۲۲ر پنجاب کے فرقہ دار فسادات میں تین ہزار سے زاید آدمی ہلاک ہو چکے۔

۲۲ر برطانوی کابینہ نے وائسرائے کے منصوبۂ حکومت ہند کو منظور کر لیا۔

۳۱ر وائسرائے کی واپسی ہند میں۔

۳۱ر

۲ جون۔ مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کا جلسہ نئی دہلی میں۔

ر وائسرائے کی کانفرنس سات ہندوستانی لیڈروں سے۔

ر جون ہندوستان کی آزادی کے متعلق برطانیہ کا نیا منصوبہ۔ ہندوستان اور پاکستان کی آزاد حکومتوں کا قیام۔ پنجاب اور بنگال کی تقسیم اور تقسیم ہند کی دوسری تفصیلات۔ لیگ نے صوبۂ سرحد کی تحریک بند کر دی۔

دوسرے ملک

صدر ٹرومن نے دنیا بھر کے آزاد لوگوں کو مکمل امداد دینے پر آمادگی ظاہر

ماسکو میں وزرائے خارجہ کی کانفرنس ۷ ہفتے کے بعد بغیر کوئی متفقہ فیصلہ کئے ختم ہو گئی۔

"یو این او" (جمعیت اقوام) نے فلسطین کی آزادی کے متعلق عربوں کی تجویز کو مسترد کر دیا۔

خوراک کے سلسلے میں انگلستان کی خراب صورت حال۔

۱۵ر یو این او نے فلسطین کے متعلق ایک کمیٹی مقرر کی۔

عبدالکریم رلیف لیڈر کا ورود پورٹ سعید میں۔

پوپ پائس دوازدہم کی نشری تقریر دنیا کی حالت پر کہ عدل و امن کی دنیا کو سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

ہندوستان

۔ گاندھی جی کا مشورہ اہل ملک کو کہ وہ تقسیم ہند کے متعلق کانگرس کے فیصلہ کو تسلیم کر لیں۔

۔ لیڈروں کی ملاقات وائسرائے سے

۷ر تقسیم ہند کے متعلق کمیٹیوں کی تشکیل

۸ر مہاسبھا اور سکھوں نے تقسیم ہند کی مخالفت کی۔

۹ر آل انڈیا مسلم لیگ کونسل نے برطانوی منصوبے کو منظور کر لیا۔

۱۱ر آل انڈیا ریاستی کانفرنس نے والیانِ ریاست کے خلاف قرارداد منظور کی۔

۱۵ر آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے برطانوی منصوبے کو منظور کر لیا۔

۱۶ر پاکستان فنڈ کے لئے جناح کی اپیل۔

۱۷ر جناح کا بیان کہ ہندوستانی ریاستیں مختار ہیں کہ ہندوستان یا پاکستان جس کے ساتھ چاہیں شامل ہو جائیں۔

۱۸ر یہ اعلان کہ ہند کی عارضی حکومت ۱۵ر اگست کو ختم ہو جائے گی۔
پروفیسر برج نرائن کا بیان کہ پاکستان معاشی طور پر اپنے پاؤں پر آپ کھڑا ہو سکے گا۔

۲۰ر "بنگال اسمبلی کا فیصلہ" تقسیم بنگال کے حق میں۔

۲۳ر "پنجاب اسمبلی کا فیصلہ" تقسیم پنجاب کے حق میں۔

۲۴ر پنجاب کے فسادات میں ۴۹۷ ر ۳ آدمی ہلاک ہو چکے۔

۲۶ر بمبئی۔ لاہور۔ امرتسر۔ جبل پور وغیرہ میں فرقہ وار فسادات۔ سندھ نے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں شریک ہونے کا فیصلہ کیا۔

۲۷ر

۲۹ر بلوچستان پاکستان میں شامل ہو گیا۔

۳۰ر پنجاب اور بنگال کے سرحدی کمیشن کے ارکان کے ناموں کا اعلان۔

یکم جولائی۔ ہندوستانی لیڈروں نے وائسرائے کے ہاں جمع ہو کر نئے انڈیا بل کے متعلق تبادلۂ خیالات کیا۔

۲ر

۳ر "علامہ مشرقی" نے خاکسار تحریک کے خاتمے کا اعلان کیا۔

دوسرے ملک

دولِ عظم میں ایٹمی جنگ کے لئے تیاریاں اور مقابلہ
ہنگری میں روسی اثر پھیلنے پر برطانیہ اور امریکہ کی پریشانی۔

حصولِ طاقت کے لئے روس اور امریکہ کی بڑھتی ہوئی طاقت کا تشویش ناک اثر یورپ میں۔ عربوں نے فلسطینی تحقیقاتی کمیٹی کے انعقاد پر مکمل ہڑتال کی۔
مصر نے ۱۹۳۶ء کے معاہدہ کے متعلق برطانیہ سے اختلاف کا معاملہ یو۔نو میں پیش کر دیا۔

جمہوریہ انڈونیشیا کے صدر سوکارنو نے ڈچ تجاویز منظور کر لیں۔

صدر ٹرومن کی اپیل کہ حبشیوں سے بہتر سلوک کیا جائے۔

یورپ کی معاشی امداد کے لئے امریکی منصوبے کے سلسلے میں پیرس کانفرنس ناکام رہی۔

ہندوستان	دُوسرے مُلک
جولائی برطانوی دارالعوام میں انڈیا بل پیش ہوا۔	
۵ ر سر سرل ریڈکلف پنجاب و بنگال کی سرحدائی کمیشنوں کا صدر مقرر ہوا	
۸ ر سکھوں نے برطانوی منصوبے کے خلاف پنجاب میں ہڑتال کی اور ہندو اُن کے ساتھ ہمدردانہ طور پر شریک ہوئے۔	
۱۰ ر ہندوستان اور پاکستان کے درمیان فوجی تقسیم کی تجاویز۔	
۱۲ ر	پیرس کانفرنس کا آغاز
۱۴ ر مُسلم لیگ سلہٹ کے استصواب رائے میں کامیاب ہوگئی۔	
۱۸ ر انڈیا کی آزادی کے بل کا قانون برطانیہ میں منظور ہوگیا۔	
۱۹ ر حکومت ہند منقسم ہوکر دہلی میں انڈیا اور پاکستان کی حکومتیں قائم ہوگئیں	
۲۰ ر مُسلم لیگ صوبۂ سرحد کے استصواب رائے میں کامیاب ہوگئی۔	ڈچ حکومت اور انڈونیشیا کے مابین جنگ۔
۲۱ ر پنجاب سرحدائی کمیشن کا پہلا اجلاس	انڈونیشیا میں ڈچ ہوائی حملہ۔
۲۲ ر دستور ساز اسمبلی میں مُسلم لیگ پارٹی نے ہندوستان کی حکومت کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔	ماسکو میں دنیا کے نوجوانوں کی فیڈریشن نے نوآبادیات کے لئے مکمل آزادی کا مطالبہ کیا۔
۲۴ ر ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں نے اقلیتوں کو اُن کے حقوق کے تحفظ کا یقین دلایا	
۲۶ ر وائسرائے کا مشورہ والیانِ ریاست کو کہ تم ہندوستان سے گریز نہیں کرسکتے۔	
۲۹ ر	ہندوستان نے یُونو میں انڈونیشیا کے لئے اپیل کی۔
یکم اگست۔ ہندو سبھا نے لکھنؤ میں حکومت کے خلاف اپنی تحریک شروع کی	برطانیہ کی حکومت نے ملک کے لئے "سادہ زندگی" کا ایک منصوبہ تیار کیا۔
۲ ر	یُونو کی حفاظتی کونسل نے انڈونیشیا اور ڈچ حکومت دونوں سے جنگ بند کرنے کی درخواست کی جس پر دو روز بعد "عمل درآمد" ہوا۔
۳ ر ہندوستان اور پاکستان کے گورنروں کے ناموں کا اعلان۔ صدر کانگرس کرپلانی کی تقریر کراچی میں کہ کانگرس بدستور متحدہ ہندوستان کے لئے اپنی کوششیں جاری رکھے گی۔	
۴ ر لارڈ مونٹ بیٹن ہندوستان کے اور مسٹر جناح پاکستان کے گورنر جنرل مقرر ہوئے۔	
۵ ر مشرقی بنگال اور مغربی پنجاب کے مُسلم لیڈروں کا انتخاب۔ امرتسر فیروزپور اور لدھیانہ میں مُسلمانوں کا قتلِ عام۔	مصر نے یُونو میں برطانیہ کے خلاف اپیل کی۔
۶ ر ہندوستان اور پاکستان کی کونسل تقسیم میں شدید اختلاف رائے۔ معاملہ ثالثوں کے سپرد کرنے کا فیصلہ۔	

ہندوستان

۷ جولائی قائدِ اعظم دہلی سے رخصت ہو کر کراچی پہنچ گئے جہاں اُن کا شاندار استقبال!

۸ر کرپلانی کی ہدایت پاکستانی کانگرسیوں کو کہ وہ پاکستان میں ۱۵ اگست کے جشنِ آزادی کا مقاطعہ کریں۔

۱۰ر کراچی میں پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کا افتتاح۔

۱۱ر پاکستان دستور ساز اسمبلی کے صدر مسٹر جناح نے اقلیتوں کو تحفظ کا یقین دلایا۔ نیز اسمبلی میں پاکستان کا جھنڈا پیش ہو کر منظور ہوا۔

۱۲ر مسٹر جناح کو سرکاری طور پر "قائدِ اعظم" کا لقب دیا گیا۔

۱۲ر سکھ مظالم سے تنگ آکر پانچ ہزار مسلمان مشرقی پنجاب سے ہجرت کر گئے۔ ۵ سے ۱۹ اگست تک مشرقی پنجاب میں ہزارہا مسلمانوں کا بے دریغ قتل۔

دُوسرے مُلک

یو.نو کی رپورٹ کہ دُنیا کی حالت میں کوئی خاطر خواہ ترقی نہیں ہوئی۔

پاکستان

۱۵ اگست (جمعہ) پاکستان میں جشنِ آزادی۔ مبارکباد کے پیغامات۔ قائدِ اعظم کا پیغام قوم کے نام۔ پنجاب میں نئی کابینہ کا تقرر۔ ممدوٹ وزیرِ اعظم ہوئے۔

۱۶ر مشترکہ ڈیفنس کونسل کا پہلا جلسہ۔ سندھ میں نئی وزارت

۱۸ر بنگال اور پنجاب کی سرحداتی کمیشنوں کے فیصلہ کا اعلان۔ مسلمانوں کے ساتھ انتہائی بے انصافی۔ عید کے موقع پر جناح کی اپیل۔ پاکستان اور دُنیا بھر کے مسلمانوں سے۔ خان لیاقت علی خاں وزیرِ اعظم پاکستان کا اعلان کہ پاکستان کی پالیسی غریبوں کی بھلائی پر مبنی ہوگی۔ پاکستان جمعیتِ اقوام کا رکن بن گیا۔

۲۲ر صوبۂ سرحد میں خان صاحبی وزارت کا خاتمہ اور عبدالقیوم خاں کی وزارت کی تشکیل۔ مشرقی پنجاب میں ایک لاکھ مُسلمان قتل کر دیئے گئے اور تین لاکھ مہاجرین مغربی پنجاب میں پہنچ گئے۔

۲۸ر قائدِ اعظم لاہور میں۔ ہندوستان اور پاکستان کی کانفرنس لاہور میں۔

۳۰ر شیخوپورہ، گوجرانوالہ اور سیالکوٹ میں فرقہ وارانہ فساد۔

۳۱ر قائدِ اعظم کی نشری تقریر کہ انتقامی کارروائی بند کی جائے۔

ہندوستان اور دُوسرے مُلک

۱۵ر ہندوستان میں جشنِ آزادی۔

۱۶ر پنڈت نہرو نے لال قلعہ پر سہ رنگا جھنڈا لہرایا۔

۲۶ر ہندوستان کا عزم کہ ایک زبردست فوج تیار رکھے۔

۲۸ر نہرو کا بیان کہ ہندوستان اور پاکستان میں قتل و غارت فوراً بند کیا جائے۔

۱۶ر لندن میں یو.نو کی خوراک کانفرنس۔

۲۱ر رُوس نے اطالیہ اور آسٹریا کو یو.نو کا رکن نہ بننے دیا۔

۳۱ر فلسطین کے متعلق یو.نو کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ جس کی رُو سے فلسطین کو تقسیم کر کے یہودیوں کو مُلک کا بہترین حصہ دیا گیا۔

پاکستان

یکم ستمبر: پاکستانی فوج نے پنجاب کے سرحدی اضلاع کو اپنے قبضے میں لے لیا۔

۲ر لاہور میں کل ۵ لاکھ مہاجرین داخل ہو چکے۔ کشمیر مسلم کانفرنس نے حکومت کشمیر کو الحاق کے بارے میں متنبہ کیا۔

۳ر پناہ گزینوں کے متعلق ہندوستان اور پاکستان کی باہمی کانفرنس۔

۸ر فساد اور نقض امن کے خلاف لیاقت اور نہرو کا مشترکہ بیان۔

۱۰ر مغربی پنجاب کی سرحد پر سکھوں کے اکا دکا حملے۔

۱۲ر قائد اعظم نے قومی فنڈ کے لئے اپیل کی۔

۱۴، ۱۵ر پنجاب مسلم لیگ کونسل کا اجلاس۔ مسلمانوں کے لئے فوجی تربیت کی قرارداد۔ لیاقت کا بیان کہ جب تک موجودہ نازک حالات رہیں گے وہ لاہور ہی میں قیام کریں گے۔

۲۰، ۲۱ر نئی دہلی میں لیاقت اور نہرو کی ملاقات۔

۲۲ر حکومت پاکستان نے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ثالثی فیصلہ حاصل کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ مشرقی و مغربی پنجاب میں قتل و غارت۔

۲۷ر پاکستان نے برطانیہ اور برطانوی سلطنت کی اقوام سے اپیل کی کہ وہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان مصالحت کرائیں۔

۲۸ر دریائے راوی میں غیر معمولی طغیانی سے لاہور کو شدید خطرہ۔

۲۹ر شیخ عبداللہ کو حکومت کشمیر نے رہا کر دیا۔ ہندوستان نے پاکستان کی اس تجویز کو مسترد کر دیا کہ یو۔ این۔ او کے چند نمائندوں کو ہند کی صورت حال کے مشاہدے کے لئے یہاں بلایا جائے۔

۳۰ر پاکستانی نمائندہ ظفر اللہ خاں کی تقریر یو۔ این۔ او میں کہ پاکستان کا نصب العین قوموں میں صلح کا قیام و استحکام ہے۔

۳ر اکتوبر یو۔ این۔ او کی ایک کمیٹی میں ہندوستان اور پاکستان کے اختلافات کی طرف اشارہ۔ بہاول پور اور خیرپور کی ریاستوں کا الحاق پاکستان کے ساتھ۔

۴ر کشمیر کے مسلمانوں نے ریاست میں ایک متوازی حکومت قائم کر لی۔

۶ر مغربی پنجاب میں اراضی کو قومی ملکیت بنانے کے مسئلے پر ایک وزیر کی تقریر۔ مشرقی اور مغربی پنجاب میں پناہ گزینوں کے بہت بڑے قافلوں کی آمد و رفت

ہندوستان اور دوسرے ملک

یکم ستمبر: کلکتہ میں فرقہ وار فسادات۔ گاندھی جی کا برت اور اس کا مفید اثر۔

۷، ۸ر دہلی میں شدید فرقہ وار فسادات۔ سکھوں اور سیوک سنگھ والوں نے ہزاروں مسلمانوں کو شہید کر دیا۔

۹ر گاندھی کی آمد دہلی میں۔ نہرو نے سختی سے فسادات کو دبا دیا۔ کرپان پر عارضی طور پر بندش۔

۱۶ر گاندھی کے مجمع عبادت میں سکھوں نے قرآن مجید کی تلاوت پر اعتراض کیا۔ گاندھی کا بیان کہ ہندو مسلمان پاگل ہو گئے ہیں۔

۲۰ر تارا سنگھ کا بیان کہ سکھوں کا ارادہ علیحدہ سکھ ریاست بنانے کا نہیں اور یہ اعتراف کہ مشرقی پنجاب میں ایک لاکھ مسلمان مارے گئے ہیں۔

۲۷ر نہرو کا بیان کہ فرقہ وار فساد کی وجہ سے ہندوستان دنیا کی نظروں میں ذلیل ہو گیا ہے اور ہندوؤں کی پالیسی کو نہ اندیش ہے۔ چرچل کا بیان کہ ابھی تو ہند میں بربریت کا محض آغاز ہوا ہے۔

۱۰ر ستمبر یو۔ این۔ او کی حفاظتی کونسل کا فیصلہ کہ برطانیہ اور مصر باہم بات چیت سے فیصلہ کریں۔

۱۶ر یو۔ این۔ او کی عام اسمبلی کا اجلاس۔ ارنہا (برازیل) کا انتخاب صدارت کے لئے۔

۱۹ر روسی نمائندہ وشنسکی نے یو۔ این۔ او میں کہا کہ برطانیہ اور امریکہ کی پالیسی دنیا کے لئے خطرہ کا باعث ہے۔

۲۲ر عرب ممالک نے برطانیہ اور امریکہ کو فلسطین کو تقسیم کرنے کے منصوبے کے خلاف متنبہ کیا۔ ایک ہوائی جہاز نے بغیر کسی جہاز ران کے خود بخود بحر اوقیانوس کو پار کیا۔

۲۹ر برطانوی کابینہ میں تبدیلیاں۔

۲ر اکتوبر گاندھی جی کی اٹھترویں سال گرہ۔

۶ر حکومت ہندوستان نے ریاست جوناگڑھ کے پاکستان سے الحاق کرنے کی مخالفت کی اور اپنی فوج وہاں بھیج دی۔

۱۷ر ہندوستان کے دستور کا مسودہ شائع کیا گیا۔ ہند ایک فیڈرل ریاست ہوگی۔

۲۳ر سکھ لیڈروں نے پٹیالہ میں پنتھک دربار قائم کیا۔

۲۴ر ابوالکلام آزاد کی تقریر جامع مسجد دہلی میں کہ موجودہ صورت حال کے لئے لیگی لیڈر قابل الزام ہیں۔

پاکستان

۴ر اکتوبر پریم ناتھ بزاز نے حکومتِ کشمیر کی مخالفت پاکستان کی پالیسی پر نکتہ چینی کی۔ یُو نو میں پاکستان کے نمائندے نے فلسطین پر ایک فصیح و بلیغ تقریر کی۔

۹ر امریکی صدر ٹرومن نے پاکستان کو مکمل امداد دینے کا وعدہ کیا۔

۱۵ر لاہور میں پاکستانی افواج کا مظاہرہ۔ وزیرِ اعظم پاکستان کا بیان کہ حکومت پاکستان ہندوستانی مسلمانوں کے مکمل طور پر ہجرت کر جانے کی مخالف ہے۔

۱۸ر وزیرِ اعظم پاکستان نے حکومتِ کشمیر کو الحاق کے متعلق متنبہ کیا۔

۲۲ر قائدِ اعظم کا بیان کہ پاکستان کو کبھی زبردستی سے ہندوستان سے متحد نہیں کیا جا سکتا۔

۲۳ر پاکستان نے اپنا نمائندہ اسلامی ممالک میں بھیجا۔

۲۴ر آزاد حکومتِ کشمیر کی از سرِ نو تشکیل۔

۲۵ر ڈوگرہ فوج کا حملہ پاکستان کے سرحدی دیہات پر۔

۲۶ر قائدِ اعظم کا ورود لاہور میں۔

۲۷ر ریاست کشمیر کی حکومت نے ہندوستان کے ساتھ الحاق کر لیا۔ بارہ مولا کے نزدیک "آزاد" کشمیر کی فوج اور ہندوستانی فوج میں مٹھ بھیڑ۔

۲۹ر وزیرِ اعظم سرحد کا بیان کہ کشمیر پر حملہ کر کے ہندوستان نے تمام اسلامی ممالک کو چیلنج دیا ہے۔

۳۰ر قائدِ اعظم نے لاہور میں تین لاکھ مسلمانوں کے مجمع میں تقریر کی۔

۳۱ر گلگت میں حکومتِ کشمیر کے خلاف بغاوت۔

یکم نومبر لاہور میں مشترکہ ڈیفنس کونسل۔ دونوں گورنر جنرلوں کی باہمی ملاقات

۳ر پاکستان نیشنل گارڈ کی تشکیل کا ہنگامی قانون نافذ ہوا۔ آزاد کشمیر کی حکومت نے دُنیا بھر سے امداد کی اپیل کی۔

۷ر سرینگر کے قریب لڑائی۔ "آزاد" فوج کی پسپائی۔

۱۱ر ایرانی وزیرِ اعظم کی اپیل اہلِ ایران سے کہ وہ ہر طرح پاکستان کی امداد کریں

۱۲ر جوناگڑھ پر ہندوستان کے فوجی قبضے کے خلاف پاکستان کا احتجاج۔

۱۳ر پاکستانی کابینہ کے پے در پے خاص جلسے لاہور میں

۱۴ر جموں کے مسلمانوں کا نفرت انگیز "قتلِ عام" انگریز عینی شاہد کا بیان

۱۶ر حکومتِ پنجاب اور مسلم لیگ میں کشمکش۔ وزیرِ اعظم پاکستان کی تجویز کہ کشمیر کا جھگڑا یُو نو سے طے کرایا جائے۔

ہندوستان اور دوسرے ملک

۲۸ر حیدر آباد دکن میں ہندوستان سے الحاق کرنے کے متعلق نازک صورتِ حال

۲ر اکتوبر عرب ملکوں نے لیبیا (طرابلس) میں عرب حکومت قائم کرنے کا مطالبہ کیا

۶ر یورپ میں ۹ یورپی ممالک کی کمیونسٹ پارٹیوں نے "چھوٹی کومنٹرن" کی بین الاقوامی انجمن کی بنیاد ڈالی۔

۱۱ر برطانیہ اور برما نے باہمی معاہدہ پر دستخط کئے۔

۲۰ر افغانستان نے یُو نو میں پاکستان کے خلاف اپنی ووٹ واپس لے لی۔

۲۵ر چینی کمیونسٹ منچوریا میں فتح یاب ہوئے۔

۲۹ر یہ خبر ملی کہ بہت سی قوموں کے پاس ایسے خفیہ آلاتِ حرب ہیں جن سے دُنیا بھر کو تباہ کیا جا سکتا ہے۔

۳۱ر یُو نو نے انڈونیشیا کے لئے ایک سب کمیٹی مقرر کی۔

۱۲ر نومبر یہ اعلان کہ ہندوستان اور پاکستان کا مشترکہ فوجی نظام ۳۰ر نومبر کے بعد ختم کر دیا جائے گا۔ پٹیل کی تقریر کہ پاکستان کا جوناگڑھ سے کوئی واسطہ نہیں اور یہ کہ حیدر آباد کو ہندوستان کی بات تسلیم کرنی پڑے گی۔

۱۰ر تا ۲۴ر لارڈ مونٹ بیٹن کی جگہ راج گوپال اچاریہ عارضی طور پر گورنر جنرل ہوئے۔

۱۳ر ابوالکلام کا مشورہ مسلمانوں کو کہ وہ کانگرس میں شریک ہو جائیں۔ ریاست جوناگڑھ میں سومناتھ کی مورتی از سرِ نو کھڑا کرنے کا عزم جسے محمود غزنوی نے نو سو سال ہوئے توڑا تھا۔

پاکستان

۲۰ نومبر ۰۰۰، ۱۷، ۳۵ مسلمان مہاجرین مغربی پنجاب میں پہنچے۔ اور ۰۰۰، ۶۵، ۲۸ غیر مسلم مشرقی پنجاب میں گئے۔

۲۱ ر دو مشہور مصری ایڈیٹروں کی آمد لاہور میں۔ اور یہ بیان کہ اگر پاکستان کو مجبوراً جنگ لڑنی پڑی تو اسلامی دُنیا پاکستان کا ساتھ دے گی۔

۲۲ ر لاہور میں عالمگیر اسلامی انجمن پاکستان کا قیام جس کا مقصد اسلامی ممالک میں رشتۂ اتحاد مضبوط کرنا ہوگا۔

۲۴ ر آل انڈیا مسلم لیگ کو ختم کرکے پاکستان میں "پاکستان نیشنل لیگ" کے قیام کی تجویز

۲۶ ر نئی دہلی میں ہندوستان اور پاکستان کی اہم کانفرنس۔ یہ فیصلہ کہ مشترکہ ڈیفینس کونسل بدستور قائم رہے گی۔

۲۷ ر پاکستان کی پہلی تعلیمی کانفرنس کراچی میں۔ قائداعظم کا پیغام کہ ہمیں علمی و صنعتی تعلیم کی ضرورت ہے اور ایسی تعلیم کی جو نوجوانوں کی سیرت اور اخلاق کو مضبوط بنائے

۲۸ ر دہلی کانفرنس میں یہ امکان کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان امور متنازعہ فیہ کے متعلق سمجھوتہ ہو سکے گا۔

۲۹ ر پاکستان کی تعلیمی کانفرنس میں سب کمیٹیاں بن کر اپنا کام کرنے لگیں۔

ہندوستان اور دُوسرے مُلک

۱۷ ر نومبر کرپلانی کی جگہ ڈاکٹر راجندر پرشاد کانگرس کے صدر منتخب ہوئے۔ ہندوستان کی مرکزی اسمبلی (قانون ساز) کا پہلا اجلاس۔

۲۰ ر پہلے ہندو ستیہ گرہی جتھے نے حیدرآباد کا رُخ کیا۔

۲۳ ر مہاراجہ پٹیالہ کی تقریر امرتسر میں کہ وہ علاقہ جس میں ہمارے مذہبی مقامات ہیں ہمیشہ ہمارا رہے گا۔

۲۴ ر گاندھی کا بیان کہ سکھ خطرے کا موجب ہیں۔

۲۵ ر ہندوستان اور حیدرآباد کے درمیان ایک سال کے لئے سمجھوتا۔

۲۷ ر ہندوستانی بجٹ میں سرمایہ داروں کی طرفداری اور خراب معاشی حالات کا اظہار

۲۸ ر نہرو کی تقریر کہ تشدد سے ہندوستان اور پاکستان کے اختلافات دُور نہ ہو سکیں گے۔

۳ ر نومبر برطانیہ کے میونسپل انتخابات میں قدامت پسندوں کی فتح۔

۹ ر سیام میں ایک فوجی انقلاب کے ساتھ حکومت میں تبدیلی۔

۱۳ ر یُو نو میں "چھوٹی اسمبلی" کے قیام کی تجویز باوجود رُوس کی مخالفت کے منظور ہوگئی۔

۱۸ ر یہ اعلان کہ برطانیہ فلسطین کو جون ۱۹۴۸ء تک خالی کردے گا۔ ٹرومین کی کانگرس سے درخواست کہ وہ جلد یورپ کو معاشی امداد دے۔

۲۰ ر لندن میں شہزادی الزبتھ (برطانوی تخت کی وارث) اور فلپ مونٹ بیٹن کی شاندار شادی۔

۲۱ ر ابن سعود نے صدر ٹرومن کو فلسطین کی بابت متنبہ کیا۔

۲۲ ر چین میں پہلے قومی انتخابات

۲۵ ر وزرائے خارجہ کی کانفرنس لندن میں۔

۲۹ ر جمعیت اقوام نے تقسیم فلسطین کے حق میں قرارداد منظور کی۔ ۳۳ ووٹ تقسیم کے حق میں اور ۱۳ اُس کے خلاف دیئے گئے۔ عرب ریاستیں اور ہندوستان اور پاکستان کے نمائندے اسمبلی چھوڑ کر باہر آ گئے۔

۳۰ ر عربوں کی بڑی کمیٹی نے فلسطینی تقسیم کی تجویز مسترد کردی۔

یکم دسمبر قائداعظم لاہور سے روانہ ہو کر کراچی پہنچ گئے۔ پاکستان کی تعلیمی کانفرنس ختم ہوگئی۔ اس کانفرنس میں یہ فیصلہ ہوا کہ پاکستان کا تعلیمی نظام اسلامی تصورات پر مبنی ہو۔ طلبا کے لئے فوجی تربیت، مذہبی تعلیم اور ثانوی درجہ

۳ ر ماسٹر تارا سنگھ کا مطالبہ کہ ہندوستان کی سرحد چناب تک بڑھادی جائے اور مسلمان ہندوستان سے نکل جائیں اور یہ دھمکی کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان چھ ماہ تک جنگ چھڑ جائے گی۔

پاکستان

میں اُردو لازمی مضمون قرار دی جائے۔ نیز یہ قرارداد منظور ہوئی کہ پاکستان کی قومی زبان اُردو ہو۔

۴ر دسمبر لاہور میں مغربی پاکستان کی حکومتوں کی پناہگزین کانفرنس۔ مرکزی حکومت پاکستان کا ان باتوں پر غور کہ کس طرح پاکستان کی ہوائی اور بحری آمد و رفت کا بہتر انتظام کیا جائے۔ امریکہ سے قرضہ لینے کا مسئلہ۔

۵ر آزاد حکومت کشمیر کی فوجوں کی فتح مندانہ پیش قدمی

۸ر لاہور میں مشترکہ ڈیفنس کونسل کا اجلاس۔ لندن کے اخبار سکیٹیر میں ڈیبنیٹینگ کا مضمون کہ ہند میں حال کے فرقہ وارانہ فسادات کے بارے میں مسلمان راستی پر ہیں اور زیادتی ہندوؤں اور بالخصوص سکھوں کی طرف سے ہوئی قضیہ کشمیر کے متعلق ہندوستان اور پاکستان کے وزیر اعظموں کی خفیہ گفت و شنید لاہور میں

۹ر یہ اعلان کہ لاہور میں پاکستان اور ہندوستان کے تمام اہم مسائل (مثلاً قرضہ فوجی سامان وغیرہ) کے متعلق سمجھوتہ ہو گیا اور اب ثالثی بورڈ کی مداخلت کی ضرورت نہیں۔

۱۰ر خان لیاقت علی خاں کا بیان (کراچی میں) کہ کشمیر کے متعلق مفاہمت کے امکانات روشن ہیں۔ پبلک کی طرف سے پاکستان میں مسلم لیگ کے ختم کرنے کی شدید مخالفت۔

۱۲ر خزانۂ حکومت، ذخائر حرب وغیرہ کے متعلق پاکستان اور ہندوستان کے اختلافات حل ہو گئے۔ سر ظفر اللہ خاں کی تقریر اور پاکستانی نوجوانوں سے اپیل کہ وہ اپنی زندگی کی قدروں کا معیار قرآن پر قائم کریں۔

۱۳ر پاکستان کی صنعتی کانفرنس: صدارتی تقریر میں اس بات کی توضیح کہ پاکستان کے قدرتی وسائل وسیع و کثیر ہیں۔ آل انڈیا مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کا اجلاس کراچی میں۔

۱۵ر آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل کا آخری اور ہنگامہ خیز اجلاس۔ مسلم لیگ کو پاکستان مسلم لیگ اور ہندوستان مسلم لیگ کے دو اجزا میں تقسیم کرنے کا فیصلہ۔

۱۴ر لندنی رسالہ "دنیائے حاضرہ" کی رائے کہ صنعت و حرفت میں پاکستان تیس سال میں ہندوستان کے برابر ہو جائے گا۔

۱۷ر امریکی فوجی نمائندہ رسل ہے کا بیان کہ کشمیر کی جنگ امریکی جنگ آزادی کی طرح جمہوریت اور آزادی کی جنگ ہے۔ دہلی، اجمیر وغیرہ میں مسلمانوں کے قتل کا اثر حیدرآباد سندھ میں۔

۱۹ر قائد اعظم کا بیان کہ برطانیہ پاکستان سے سرد مہری کا برتاؤ کر رہا ہے۔ نیز یہ کہ اس نے فلسطین کے بارے میں کماحقہ کوشش اور توجہ نہیں کی۔

ہندوستان اور دوسرے ملک

۴ر دسمبر ہندوستان کی مرکزی اسمبلی میں نہرو کی تقریر کہ امور خارجہ میں ہم ان دول کا ساتھ دیں گے جن سے ہمیں نفع کی اُمید ہو گی۔

۵ر یو۔پی کے وزیر مالیات کی تقریر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں کہ ہندوستانی دیوناگری رسم خط کے ساتھ قومی زبان ہو گی۔

۸ر راج گوپال اچاریہ نے ہندوستانی مسلمانوں کی حب الوطنی کو سراہا۔ مہاراجہ پٹیالہ نے یقین دلایا کہ سکھ مسلمانوں کے دشمن نہیں ہیں۔

۹ر پٹیل کا بیان مرکزی اسمبلی میں کہ قومیت اور مذہبیت ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

۱۱ر حکومت مدراس کا اعلان کہ وہ خاص پولیس کے لئے مسلمانوں کی بھرتی نہیں کرے گی۔ ہند کی مرکزی اسمبلی میں فوج کو خاص اختیارات دینے کا "دوسرا کالا بل" پیش ہوا۔

۱۵ر کھڑک سنگھ کا بیان کہ اکالی جماعت نے سکھوں کو دنیا کی نظروں میں ذلیل کر دیا ہے اور سکھوں کی قیادت میں تبدیلی ہونی ازبس ضروری ہے۔

۱۷ر بہار، دہلی اور اجمیر وغیرہ میں متعدد مسلمان قتل کر دیئے گئے۔

۱۸ر گاندھی جی کی تقریر کہ اُردو ایک ہندوستانی زبان ہے اور صحیح ہندوستانی زبان وہی ہے جس میں اُردو ہندی دونوں کا ملاپ ہو۔

یکم دسمبر تقسیم فلسطین کے متعلق جمعیت اقوام کے فیصلہ پر تمام عرب ملکوں میں شدید ترین احتجاج۔ لندن میں وزرائے خارجہ کی کانفرنس میں سخت اختلافات۔

۲ر فلسطین میں عربوں نے تین دن کی ہڑتال کی یہودیوں اور عربوں میں گھمسان کی لڑائی۔ ساری اسلامی دنیا میں تقسیم فلسطین کے متعلق انتہائی رنج و غصہ کا اظہار۔

۳ر یہ انکشاف کہ امریکہ نے نئے کیمی آلات حرب ایجاد کئے ہیں۔ جامع ازہر کے علما نے فلسطین کے لئے جہاد کا اعلان کیا۔

۱۱ر برطانوی دارالعوام میں اعلان کہ فلسطین میں برطانوی انتداب ۱۵ر مئی ۱۹۴۸ء تک ختم کر دیا جائے گا اور برطانوی فوجیں یکم اگست تک ملک کو خالی کر دیں گی۔

۱۲ر تمام عرب ممالک فلسطینی عربوں کی حمایت پر آمادہ ہو گئے۔

۱۳ر یہ انکشاف کہ زمین ایک نئے دمدار ستارے کی دُم میں سے ہو کر جو پانچ کروڑ میل لمبی ہے سلامتی سے گزر رہی ہے۔

۱۴ر برطانوی بچے ۵۰ تا ۱۰۰ پونڈ فی بچہ کے حساب سے امریکہ میں فروخت ہونے لگے۔

۱۵ر لندن میں وزرائے خارجہ کی کانفرنس کا ناکام خاتمہ اور اس کے نتیجے کے طور پر روس اور امریکہ کے تعلقات بگڑنے اور بین الاقوامی حالات کے خراب ہو جانے کا امکان۔

۱۶ر ڈچ انڈونیشی گفتگوئے مصالحت ڈچ حکومت کی شر انگیز کوشش کہ انڈونیشیا کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا

۱۷ر جینوا میں انسانی حقوق کمیٹی بین الاقوامی قانون پر مختلف اقوام کے نمائندوں کا اتفاق رائے اور ۔۔۔

۱۹ر نئے ایرانی وزیر اعظم سردار فخر حکمت قوام السلطنۃ کی جگہ چار روز حکومت کرنے کے بعد مستعفی ہو گئے۔

بشیر احمد

دُنیا ۱۹۴۷ء میں

اس سال کے خاص واقعات میں سب سے اہم واقعہ ہندوستان کی آزادی اور خانہ جنگی تھا۔

بین الاقوامی دُنیا میں امریکہ اور رُوس کی خطرناک رقابت جاری رہی اور عالمگیر جنگ کا خطرہ روز بروز بڑھتا گیا۔ جنوری میں انڈوچائنا اور انڈونیشیا میں جنگ چھڑ گئی۔ اگست میں ہندوستان آزاد ہوا اور اسی مہینے میں جمعیت اقوام کی فلسطینی کمیٹی نے فلسطین کے متعلق اپنی رپورٹ پیش کی۔ اکتوبر میں یورپ کے نو ملکوں نے ایک کمیونسٹ جماعت "چھوٹی کومنٹرن" کے نام سے قائم کی۔ نومبر میں امریکہ نے اس کے جواب میں یُونو میں "چھوٹی اسمبلی" کے قیام کا بندوبست کیا تاکہ وہاں اُس کا پلّہ بھاری رہے۔

دُنیا کی عام حالت کے متعلق پوپ نے ۲ جون کو اپنی ایک نشری تقریر میں کہا کہ عالمگیر جنگ نے نوعِ انسان کو جو گہرے زخم لگائے وہ نہ صرف تاحال بھر نہیں سکے بلکہ غالباً وہ اور زیادہ گہرے ہو گئے ہیں۔ امن اور عدل و انصاف کا دَور شروع کرنے کے لئے اخلاقی اور مادّی دونوں بنیادوں کو درست اور مضبوط کرنے کی ضرورت ہے۔ نوجوانوں کی بہبود اور خانگی زندگی کا استحکام ہمارا پہلا مقصد ہونا چاہیے۔ انسانی اُصولوں اور قدروں کے متعلق جو شکوک و شبہات پیدا ہو گئے ہیں اُنھیں دُور کرنا لازم ہے۔ سب کو مل کر معاشری عدل کے لئے کام کرنا چاہیے۔ کروڑوں آدمی جو ابھی استبداد کا شکار رہیں انھیں ظلم و ستم کے پنجے سے رہا کرنے کی ضرورت ہے اور سب سے بڑی ضرورت نوعِ انسان میں اخوّت کے خیالات کی اشاعت ہے۔ اپنے ایمان کو مضبوط کرو۔ راستی کی جنگ لڑو۔ مستقبل یقین کرنے والوں کے لئے ہے، اُن کے لئے نہیں جو شک کرتے ہیں نہ اُن کے لئے جو نفرت پھیلاتے ہیں۔

اگست میں جمعیّتِ اقوام (یُونو) کے سکرٹری نے اپنی سالانہ رپورٹ میں بتایا کہ دُنیا کی حالت میں کوئی تسلی بخش ترقی نہیں ہوئی۔ ستمبر میں یُونو کے نئے صدر نے عام اسمبلی کے دُوسرے اجلاس کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ "جمعیتِ اقوام پچھلے اجلاس کے بعد دُنیا کی بہتری کے لئے کم ہی کچھ کر سکی۔ اسلحہ کی اُصولی ممانعت کافی نہیں۔ ہمیں دلوں سے جنگ کا خیال محو کرنا ہے۔ ہم خودکشی کرنے والے لوگوں کی دُنیا میں یقین نہیں کر سکتے۔ اس وقت یورپ ایک معاشی المیہ ہے اور ایک فوجی علامتِ سوال۔ اُدھر ایشیا میں خون کا طوفان جو جنگِ عظیم کے دنوں میں برپا ہوا تھا ابھی انجام پذیر نہیں ہُوا۔ ہمارا رستہ صاف ہے اور وہ ہے امن و مصالحت کا رستہ۔ انسان کی ساری تاریخ یہ ہے کہ فطری میلان ہمیشہ اتحاد اور ربط و ضبط کی طرف رہا ہے۔

"یُونو" میں جو بین الاقوامی مسائل پیش ہوئے اُن میں سب سے پہلا اور سب سے اہم مسئلہ فلسطین کا تھا۔ اُس کے حل کرنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی گئی جس نے اگست کے اخیر میں اپنی رپورٹ پیش کی کہ فلسطین کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جائے ایک یہودیوں کے لئے اور دُوسرا عربوں کے لئے۔ فلسطین کا مسئلہ اس وقت نہایت پیچیدہ صورت اختیار کر چکا ہے۔ ایک طرف یہودیوں کی بے وطن لیکن مالدار سرمایہ دار قوم ہے جسے اکثر دولِ عظمیٰ کی مالیات میں عمل دخل حاصل ہے اور جو اپنی ریشہ دوانیوں کے سہارے رُوس اور امریکہ اور برطانیہ کو اپنی ناجائز طرفداری پر آمادہ کر چکی ہے اور دُوسری طرف تیرہ سو برس سے خاکِ فلسطین کو اپنے خون اور پسینے سے سینچنے والے غریب نادار عرب ہیں جن کی حمایت کے لئے اِس وقت سب عرب ممالک بلکہ ساری دُنیائے اسلام جان و مال کی بازی لگا دینے پر تیار ہے۔ ابن سعود نے امریکی صدر ٹرومن کو اس بھیانک خطرے سے بخوبی آگاہ کر دیا ہے۔ کیا دولِ عظمیٰ پر اس احتجاج کا کچھ اثر پڑے گا؟ ظاہر ہے کہ اُن کی نیت صاف نہیں!

فلسطین کے بعد مصر کا مسئلہ یُو۔ نو میں پیش ہوا۔ برطانیہ کہنے کو اپنی سلطنت سے دست بردار ہونا چاہتا ہے لیکن اعلانات آسان ہوتے ہیں اور اُن پر عمل کرنا بہت مشکل۔ برطانیہ ایک طرف ۱۹۳۶ء کے معاہدے کا بہانہ تلاش کر رہا ہے اور دُوسری طرف سوڈان کی جمہوری حمایت کا ڈھونگ رچائے ہوئے ہے اور یُوں وہ مصر میں ابھی تک اپنی ملوکیت کا اثر قائم رکھنا چاہتا ہے۔

اِسی طرح انڈونیشیا کی جمہوریہ کو بظاہر ڈچ حکمرانوں نے تسلیم کر لیا لیکن جب اختیارات سونپنے کا وقت آیا تو انھوں نے صاف انکار کر دیا۔ لڑائی چھڑ گئی۔ اور آخر کار یُو۔ نو نے اپنی سی بہت کوشش کر کے ایک کمیٹی وہاں بھیج دی۔ یہ ہے وہ بڑی سے بڑی رعایت جو کسی غریب ملک یا مظلوم قوم کے ساتھ کی جاتی ہے کہ یُو۔ نو انھیں مصالحتی کمیٹی کا تحفہ پیش کرتی ہے۔ اُدھر غاصب طاقت بدستور اپنا قبضہ قائم رکھتی ہے اور آہستہ آہستہ مظلوموں کا خون چوستی رہتی ہے۔ یہ ہے منظم بین الاقوامی انصاف کا مظاہرہ۔

یہ تو ہیں چھوٹی چھوٹی باتیں۔ جمعیتِ اقوام کا اصلی کارنامہ وہی **بڑی طاقتوں کا مقابلہ** ہے جو اِس وقت **رُوس و امریکہ** کی رسّہ کشی کی صورت میں رُونما ہو رہا ہے۔ **امریکہ** اس وقت دُنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے اور اس لئے جمعیتِ اقوام پر بھی اُسی کا قبضہ ہے اور اُسی کا اثر ہر بات میں کارفرما ہے۔ اُس کا مدِّ مقابل رُوس ہے جو ہر اہم معاملے میں اپنی اختلافی رائے (ویٹو) دے کر یُو۔ نو کی ہر کارروائی کو کالعدم قرار دے سکتا ہے۔ اِس لئے یُو۔ نو دُنیا کی حالت سُدھارنے کے لئے عملی طور پر کوئی مؤثر قدم نہیں اُٹھا سکتی۔ امریکہ نے پچھلے سال ارادہ کر لیا کہ وہ اس صورتِ حال میں ایک بُنیادی تبدیلی پیدا کرے گا۔ چنانچہ اپنی اکثریت کے بَل پر اُس نے یُو۔ نو میں ایک نئی جماعت "چھوٹی اسمبلی" کی تشکیل کی ہے جو سارا سال اپنا کام کرتی رہے گی اور جس کا اصلی مقصد رُوس کے ویٹو کی طاقت کو توڑ دینا ہے۔ رُوس نے اس "چھوٹی اسمبلی" کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ ایٹم بم اور تخفیفِ اسلحہ کے متعلق رُوس اور امریکہ کوئی سمجھوتہ نہیں کر سکے۔ اُدھر چار بڑی طاقتوں کے وزرائے خارجہ کی کانفرنس جو سال کے شروع میں اور پھر ماسکو میں مارچ اپریل میں جاری رہی نومبر کے اخیر میں پھر لندن میں منعقد ہوئی۔ یہاں بھی وجہِ اختلاف یہ تھی کہ رُوس جرمنی کو اپنے حلقۂ اثر میں رکھنا چاہتا تھا اور امریکہ اپنے حلقۂ اثر میں۔

لیکن صرف اسی پر بس نہیں۔ امریکہ اور رُوس کی یہ رقابت عالمگیر ہے۔ مشرقی یورپ میں **رُوس** کا اثر چھایا ہوا ہے لیکن امریکہ اور اُس کا علم بردار برطانیہ مغربی یورپ کو رُوس کے چنگل سے بچا کر اپنے لئے مخصوص کر لینا چاہتے ہیں اگرچہ یہاں بھی فرانس اور اطالیہ میں کمیونسٹ پارٹی کا زور روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ یورپ کی معاشی حالت بہت ابتر ہے۔ دُنیا کا بنیا امریکہ مفلس قوموں کو معاشی امداد دے کر انھیں اپنا حلقہ بگوش بنانا چاہتا ہے۔ اِس کے علاوہ اُس کے پاس ایٹم بم کا جادو بھی ہے۔ اُدھر رُوس کی فوجی طاقت زبردست ہے لیکن کہا جاتا ہے کہ اُس کی ایٹمی قوت ابھی خام ہے۔ امریکہ اس بارے میں اپنی "پختگی" کا فائدہ اُٹھا کر اس وقت دُنیا بھر سے اپنا لوہا منوانا چاہتا ہے۔ چنانچہ اُس نے صاف صاف اعلان کر دیا ہے کہ میں دُنیا کے تمام آزادی پسند لوگوں کا حامی و مؤید ہوں اور یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ رُوس اُن پر زبردستی اپنا نظام عاید کرے۔ اِس میں شبہہ نہیں کہ ان دو بڑوں کے نصب العین میں خاصا اختلاف ہے لیکن ملوکیت کے داغ سے ان میں سے نہ امریکہ بچا ہے اور نہ رُوس ہی۔ طاقت بُری بلا ہے اس کے نشے سے اچھے اچھے ہوش مند آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ عام پسند کمیونزم بھی اِس سے مستثنیٰ نہیں۔

مغرب میں جرمنی میں، تو مشرق میں کوریا میں رُوسی اور امریکی فوجیں ایک دُوسرے کے بالمقابل کھڑی ہیں۔ اور چین میں تو کئی برس سے رُوس اور امریکہ دو مخالف جماعتوں کی عملی حمایت کر رہے ہیں۔ اُدھر رُوس نے یورپ کے کمیونسٹ ملکوں کو "چھوٹی کومنٹرن" کی جماعت میں لا کر منظم کیا ہے تو امریکہ نے جمعیتِ اقوام میں رُوسی مخالفت کو ختم کرنے کے لئے "چھوٹی اسمبلی" کی بُنیاد رکھی ہے۔ وزرائے خارجہ کی کانفرنس میں جدا کشاکش جاری ہے، یہاں جرمنی وغیرہ کے متعلق اینچا تانی ہو رہی ہے۔ غرض اس وقت ہر بین الاقوامی اکھاڑے میں یہی دو

پہلوان ایک دوسرے کے مدِ مقابل ہیں۔ دنیا منتظر ہے اور خائف کہ کب یہ دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو جائیں۔ آئین سٹائن نے ۱۴ ستمبر کو کہا کہ ڈر ہے کہ نوعِ انسان اپنے ہاتھوں آپ ہی تباہ نہ ہو جائے۔ ہنری والس نے صریح لفظوں میں پیشین گوئی کر دی ہے کہ تیسری جنگِ عالمگیر اب ہو کے رہے گی! کیا تمدّن کے لئے کوئی راہِ مفر نہیں؟

۲۷ نومبر کو پرتگال کے وزیرِ اعظم نے کہا کہ امریکہ اور برطانیہ کو یا رُوس کے ساتھ سمجھوتا کر کے دُنیا کو اپنے اپنے حلقہ ہائے اثر میں تقسیم کر لینا چاہئے اور یا پھر اُنھیں ایک عالمگیر جنگ کے لئے تیار رہنا پڑے گا۔ بڑی طاقتوں کا یہ حال ہے۔ دُوسری قومیں کچھ ادھر کچھ اُدھر جمع ہو رہی ہیں۔ **برطانیہ** اپنی رہی سہی سلطنت کو چمٹا ہوا ہے۔ وہ ہندوستان میں تقسیم کی تدبیر کے نتائج کا تماشہ دیکھ رہا ہے۔ مصر میں بوسیدہ معاہدوں اور مقامی رقابتوں کے مُردے اُکھاڑنے میں مصروف ہے۔ شرق اردن کے بادشاہ کو "شامِ عظمیٰ" کا حکمران بنا کر مشرقِ ادنیٰ پر اپنا جال پھیلانا چاہتا ہے۔ فلسطین میں "غیر جانبدار" رہ کر امریکی یہودی سازشیوں کو شہ دے رہا ہے، برما اور سیلون کو نیم آزادی دے کر اپنے زیرِ اثر رکھنے کا خواہش مند ہے، اور اپنی باقی سلطنت کو جُوں کا توں برقرار رکھنے کا دعویدار ہے۔ **فرانس اور اطالیہ** دائیں اور بائیں بازو کی کش مکش سے نڈھال ہو رہے ہیں۔ **چین کی خانہ جنگی** اور زوروں پر ہے۔ وہاں "سُرخ" لوگوں کی طاقت پھر بڑھ رہی ہے۔ **سیام** میں ایک قدامت پسند فوجی حکومت قائم ہو گئی ہے۔ فرانس اپنے گھر میں بسترِ ضعف پر پڑا ہے لیکن **انڈوچائنا** کو آزادی دینے پر راضی نہیں۔ **انڈونیشیا** کو ڈچ نہیں چھوڑتے یہ نہیں چھوڑتے اور امریکہ اور برطانیہ در پردہ اُن کی حمایت کر رہے ہیں۔

فلسطین میں جنگ کا خطرہ ہے۔ یہاں اسلامی اور مغربی دُنیا کی پُرانی رقابت پھر تازہ ہو رہی ہے یعنی سرمایہ داری اور عشرت، شہنشاہیت اور حُرّیت باہم برسرِ پیکار ہونے کو ہیں اور عجیب تماشا ہے کہ اس دفعہ سوویٹ رُوس بھی سرمایہ داروں اور ملوکیت پسندوں کا ہمنوا ہے۔ یہودی عربوں کے جسم میں ایک پھوڑے کی حیثیت اختیار کئے ہوئے ہیں اور مغربی طاقتیں مُصر ہیں کہ یہ پھوڑا قائم رہے تاکہ جسم کبھی اپنی پوری صحت حاصل نہ کر سکے۔ اِدھر سب عرب مُلک مل کر فلسطین کی حمایت پر آمادہ ہیں اُدھر امریکہ برطانیہ اور روس یہودیوں کو وہاں بجبر متمکن کرنے کے درپے ہیں۔ یورپ اور ایشیا کی قدیمی آویزش کے از سرِ نو پیدا ہونے کا امکان روز افزوں ہے۔

اِسلامی دُنیا خطرے میں ہے۔ تُرکی اور ایران کو رُوس کا ڈر ہے، فلسطین کو تین "بڑے" گھیرے ہوئے ہیں، مصر برطانیہ سے پوری طرح آزاد نہیں ہُوا۔ باقی شمالی افریقہ ابھی اتحادی پنجے میں گرفتار ہے، انڈونیشیا "جمہوری" طاقتوں کا شکار ہے، پاکستان کے متعلق ہندوستان کے بعض لیڈروں کے ارادے نیک معلوم نہیں ہوتے۔ لیکن باوجود ان خطرات کے بلکہ کہنا چاہیے کہ زیادہ تر ان خطرات ہی کی وجہ سے یہ اور دوسرے اسلامی ملک نہ صرف خود بیدار ہو رہے ہیں بلکہ مِل کر سوچنے اور کام کرنے اور باہمی مدد کرنے پر روز بروز زیادہ آمادہ نظر آتے ہیں۔ یہ خطرات، یہ بیداری اور یہ تعاون اسلامی دُنیا کے لئے ایک نیک فال ہے۔ قومیں کبھی بیدار نہیں ہوتیں جب تک اُن پر مصیبتیں نہ پڑیں اور وہ کبھی مضبوط نہیں ہوتیں جب تک وہ اِن مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے لئے تیار نہ ہو جائیں۔

مغربی تہذیب کی اخلاقی قدور خطرے میں ہیں، انسانی شخصیت نظروں سے گر چکی ہے۔ برطانیہ میں جنسی جُرم ۱۹۳۸ء میں ۲۳۴۱ تھا ہوئے اور ۱۹۴۶ء میں ۲۲۸ ر۳۔ اور ۱۹۰۵ء میں ۶۵۰، ۱۹۴۵ء میں ۰۰۰ ر۲۵ اور ۱۹۴۷ء میں تقریباً ۰۰۰ ر۵۰ طلاق کے مقدمات دائر ہوئے۔ بدچلنی زوروں پر ہے۔ امریکہ میں ۲۵ سے ۵۰ فی صدی تک گریجوایٹ عورتیں شادی نہیں کرتیں اور جو کرتی ہیں اُن کی شرحِ طلاق مَردوں کی بہ نسبت چوگنی ہوتی ہے۔ پیرس میں شادی کی اوسط عمر ۲۲ اور طلاق کی ۲۷ برس ہے لیکن اس کے بعد معزز خاتون عموماً ۶۲ برس کی عمر تک زندگی کا لُطف اُٹھاتی ہے۔ اِن حالات سے ظاہر ہے کہ متمدن انسان کی کل کے بعض اخلاقی و رُوحانی پُرزے بالکل ڈھیلے ہو چکے ہیں۔ پس اس وقت سب سے بڑا خطرہ انسان کے لئے ایٹم بم کا نہیں بلکہ اخلاقی انحطاط اور رُوحانی دیوالیہ پن کا ہے۔

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں ۱۹۴۷ء کا سب سے اہم اور نتیجہ خیز واقعہ **ہندوستان کی آزادی** ہے۔ ہندوستان کی آزادی کا حصول دنیا کی تاریخ میں ایک عجیب و غریب کارنامہ ہے۔ اٹھارویں صدی کے وسط میں جب مغلیہ سلطنت کی بنیادیں کمزور ہوئیں اور ملک میں طوائف الملوکی کا دور دورہ ہوا تو برطانیہ نے اپنی مختلف تجارتی و سیاسی ریشہ دوانیوں سے بتدریج یہاں اپنا قبضہ جما لیا۔ انگریزی فوجیں دہلی میں انیسویں صدی کے شروع میں اور پنجاب میں انیسویں صدی کے وسط میں داخل ہوئیں۔ انیسویں صدی کے آخر میں اور خاص طور پر جنگ روس و جاپان کے بعد بیسویں صدی کے شروع میں ہندوستان میں سیاسی بیداری پیدا ہوئی۔ کانگرس بیس سال پہلے بن چکی تھی، مسلم لیگ اب وجود میں آئی۔ اس کے دس سال بعد ۱۹۱۶ء میں پہلی جنگ عظیم کے دوران میں کانگرس اور لیگ میں وہ مفاہمت ہوئی جس کی وجہ سے آزادی کی تحریک بیش از بیش ترقی کرنے لگی۔ ۱۹۱۹ء میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ منظور ہوا لیکن کانگرس نے گاندھی جی کی قیادت میں ان جزوی اختیارات کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ سنہ ۱۹۲۰ء میں عدم تعاون اور ۱۹۳۰ء میں سول نافرمانی کی تحریک چلی۔ ۱۹۳۵ء میں ایک اور گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ منظور ہوا جس کے بعد کانگرس نے ۱۹۳۷ء میں انتخابات میں غیر معمولی کامیابی حاصل کی لیکن اپنی کوتاہ نظری سے گورنمنٹ بنانے کے کام میں مسلم لیگ کے تعاون کو ٹھکرا دیا۔ اس سے مسلمانوں میں ایک زبردست سیاسی بیداری کا جذبہ پیدا ہوا۔ چنانچہ مارچ سنہ ۱۹۴۰ء میں لیگ نے پاکستان کی قرارداد منظور کر کے مسلمانوں کی آزادی کی مہم کا آغاز کیا۔ برطانیہ کی طرف سے انتقالِ اقتدار کے سلسلے میں ۱۹۴۲ء میں کرپس کی تجاویز پیش ہوئیں، ۱۹۴۵ء میں شملہ کانفرنس ہوئی اور ۱۹۴۶ء میں برطانوی وزارتی مشن کا منصوبہ تیار ہوا۔ لیکن بدقسمتی سے کانگرس اور لیگ کسی ایک تجویز پر متفق نہ ہو سکیں۔ آخر ۲۰ر فروری ۱۹۴۷ء کو برطانیہ نے اعلان کیا کہ برطانیہ جون ۱۹۴۸ء تک ہندوستان کو تمام اختیارات سونپ کر ملک کو خالی کر دے گا۔

۱۹۴۶ء میں وزارتی منصوبے کے سلسلے میں ایک سنہری موقع کانگرس کو ملا تھا کہ وہ مسلمانوں سے مساوات کی بنا پر ایک فیاضانہ مفاہمت کر کے ہندوستان کو متحد بھی رکھے اور مسلمانوں کے جائز مطالبات کو بھی پورا کر دے۔ لیکن بعض حریص اور کوتاہ بین لیڈروں کے تعصب اور حماقت کے باعث ہندوستان کی وحدت قائم نہ رہ سکی۔ اکتوبر ۱۹۴۶ء میں بہار میں مسلمانوں کا وہ قتلِ عام ہوا جس کے بعد اُن میں عام بددلی پھیل کر ہندوؤں سے بدظنی پیدا ہو گئی اور وہ اپنی قومی ہستی برقرار رکھنے کے لئے ایک جداگانہ وطن کے حصول کو ضروری سمجھنے لگے۔

۱۹۴۷ء ہندوستانی مسلمانوں کے لئے بالخصوص ایک انقلاب انگیز بلکہ زلزلہ خیز سال گزرا ہے جس کے دوران میں اُن میں پے در پے تحریکیں اٹھیں، قسم قسم کی غیر متوقع مصیبتوں کے حملے ہوئے، اُنھیں آزادی ملی، اُن کا بے پناہ قتل عام ہوا۔ وہ اپنی غفلت سے اُٹھے ہی تھے کہ اُنھیں گزشتہ غفلتوں کی پاداش میں دشمنوں کے ہاتھوں وحشیانہ سزائیں ملیں، اُن کا مقاطعہ کیا گیا، اُن کی املاک چھین لی گئیں اور اُن کی نئی نئی آزادی کو ملیامیٹ کرنے کے بیسیوں کھلے اور چھپے ہوئے منصوبے عمل میں لائے گئے۔

جنوری ۱۹۴۷ء میں پنجاب میں مسلم لیگ کی سول نافرمانی کی وہ پُر امن تحریک شروع ہوئی جس نے ایک ماہ میں توقع سے زیادہ کامیابی حاصل کی۔ ۲۰ر فروری کو برطانوی حکومت نے اعلان کیا کہ وہ جون ۱۹۴۸ء تک مرکزی یا صوبائی حکومتوں کو یا کسی اور طرح سے اپنے اختیارات ہندوستانی ہاتھوں کو سونپ دے گی۔ مسلم لیگ کی تحریک کی کامیابی دشمنوں کی نظر میں خار بن کر کھٹکی چنانچہ مارچ میں سکھوں اور ہندوؤں نے صوبے میں فساد برپا کر دیا اور یہ فساد آہستہ آہستہ ملک کے دوسرے حصوں میں پھیل گیا۔ ۳ر جون کو برطانوی حکومت نے ہندوستان کی آزادی کا نیا منصوبہ ملک کے سامنے پیش کیا جس کے مطابق ہندوستان کو انڈیا یعنی ہندوستان اور پاکستان دو حصوں میں منقسم کر دیا گیا، ساتھ ہی بنگال اور پنجاب کی تقسیم کی تجویز بھی ہوئی۔ مسلم لیگ اور کانگرس دونوں نے اس منصوبے کو منظور کر لیا باوجودیکہ مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے پنجاب اور بنگال کی تقسیم ایک صریح بے انصافی تھی اور باوجودیکہ سکھوں نے اس کے خلاف احتجاج کیا کہ یہ ہمارے قومی

مطالبے کو پُورا نہیں کرتا۔ ۱۸ر جولائی کو ہندوستان کی آزادی کا قانون برطانوی حکومت نے منظور کیا اور ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء ہندوستان اور پاکستان کی آزادی کا دن مقرر ہو گیا۔

اگر ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کے بعد **ہندوستان اور پاکستان** پچھلی کدورتوں کو بھول کر دو نیک نیّت اور دُور اندیش ہمسایوں کی طرح زندگی بسر کرنے پر آمادہ ہو جاتے تو ان دونوں مُلکوں اور دونوں قوموں کا حصُولِ آزادی دُنیا کی تاریخ میں سنہرے حرفوں سے لکھا جاتا لیکن ایسا نہ ہونا تھا نہ ہوا۔ ۱۵ر اگست سے پہلے ہی مشرقی پنجاب میں اُس گہری سازش کے ہولناک ڈرامے کا پہلا ایکٹ بے گناہ مُسلمانوں کے خون سے کھیلا گیا جو اب، معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں اور سکھّوں کے بعض بڑے لیڈروں نے مدّت سے تیار کر رکھی تھی۔ دو ڈھائی ماہ میں تین چار لاکھ اور ایک بیان کے مطابق آٹھ دس لاکھ مُسلمان بے رحمی اور سفاکی سے قتل کیے گئے، ہزاروں شاید لاکھوں اپنا مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کیے گئے اور تقریباً پچاس لاکھ نے اپنا گھر بار چھوڑ کر پاکستان میں آکر پناہ لی اور ابھی مصیبتوں کی یہ دلخراش داستان ختم نہیں ہوئی۔ ہندوستان کے مسلمانوں پر جو ظلم وستم ڈھائے گئے، جس طرح اُن کے مرد عورتوں اور بچّوں کے ساتھ وحشیانہ سلوک روا رکھا گیا اُس کی بہت کم مثالیں تاریخ میں ملتی ہیں۔ گاندھی جی اور پنڈت نہرو نے اعتراف کیا ہے کہ انھیں ہندوؤں سکھوں کے ان کارناموں پر سخت شرمندگی ہے۔ مسلمانوں نے اس کے جواب میں جو کچھ پاکستان میں کیا ہر چند کہ وہ قابلِ مذمت ہے لیکن وہ غیر مُسلموں کے مظالم کا دسواں حصہ بھی نہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستان کی حکومت نے ریاستوں پر بھی ہاتھ صاف کرنا شروع کیا۔ پاکستان نے برطانیہ اور اُس کی نوآبادیات سے اپیل کی لیکن وہاں صدائے برنخاست۔

یہ ایک بڑی طویل اور غمگین داستان ہے کہ یہ مظالم کیوں ہوئے۔ دَورِ حاضر میں بربریت کے یہ قصّے کس طرح دہرائے گئے، دُوسری طاقتیں اس زبوں حالی سے کیوں متاثر نہ ہوئیں۔ لیکن ایک بات اظہر من الشمس ہے کہ اس نام نہاد تدبّر و ترقی کے دَور میں بھی دُنیا میں طاقت کا سکّہ رواں ہے اور کمزوری اور بالخصوص قومی کمزوری ایک ایسا جُرم ہے جو کبھی معاف نہیں کیا جاتا — اس پر مستزاد یہ کہ سرمایہ داری کی اِس پُر فریب دُنیا میں جو قوم اپنی معصومیت، غفلت اور ناداری کے سہارے زندگی بسر کرے وہ کبھی نہ کبھی ایسی ٹھوکر کھاتی ہے کہ اُس کی ہستی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔

دو سو سال سے **ہندوستان کے مُسلمان** قعرِ مذلّت میں گرتے رہے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے کچھ عرصہ بعد سر سید احمد خاں نے انھیں اپنی غفلت کی لمبی نیند سے جگایا۔ ۱۹۰۶ء میں مُسلم لیگ قائم ہوئی جس میں محمد علی جناح نے ۱۹۳۷ء میں ایک نئی رُوح پھونکی۔ گزشتہ دس سال میں قوم نے سیاسی تنظیم کی چند منزلیں ضرور طے کیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ایک حکومت کو چلانے اور ایک خود مختار سلطنت کو سنبھالنے کے لئے جن اوصاف کی ضرورت ہوتی ہے وہ ابھی قوم میں پُوری طرح پیدا نہ ہوئیں۔ لیکن زمانہ اپنی تیز رفتاری میں کسی سُست رَو قوم کا انتظار نہیں کیا کرتا۔ ہندوستان کے مُسلمانوں کو گزشتہ سال میں جو عبرت ناک سبق ملا ہے اگر انھیں اپنی قومی ہستی کو برقرار رکھنا اور مضبوط بنانا ہے تو لازم ہے کہ وہ اُس سبق سے جلد از جلد محنت، ایثار اور اتحاد کے دشوار گزار رستے پر چلنا سیکھ لیں تاکہ بین الاقوامی دنیا میں وہ دُوسری باعزت قوموں کے دوش بدوش کھڑے ہو سکیں۔

کچھ عرصہ ہوا چند نئی **کتابیں** نظر سے گزریں جن سے مغربی مفکّرین کے بعض جدید میلانات کا پتہ چلتا ہے۔ ایک ہے گولڈ کی تصنیف "انسان، فطرت اور زمانہ" (W. A. Gauld :- Man, Nature & Time 1946)۔ مصنف کا نظریہ یہ ہے کہ دُنیا کی تاریخ میں فطرت سے زیادہ انسان واقعات کی سمت اور مقصد پیدا کرنے کا باعث ہوتا ہے۔ ہماری دُنیا زیادہ تر انسان کی بنائی ہوئی دنیا ہے۔ فطرت اور انسان مل کر اپنی مادّی و رُوحانی قوتوں سے دنیا کی تشکیل کرتے ہیں۔ انسان تقدیر کا بنانے والا ہے نہ کہ اُس کا صید۔

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں ۱۹۴۷ء کا سب سے اہم اور نتیجہ خیز واقعہ **ہندوستان کی آزادی** ہے۔ ہندوستان کی آزادی کا حصول دنیا کی تاریخ میں ایک عجیب وغریب کارنامہ ہے۔ اٹھارویں صدی کے وسط میں جب مغلیہ سلطنت کی بنیادیں کمزور ہوئیں اور ملک میں طوائف الملوکی کا دَورہ ہُوا تو برطانیہ نے اپنی مختلف تجارتی وسیاسی ریشہ دوانیوں سے بتدریج یہاں اپنا قبضہ جما لیا۔ انگریزی فوجیں دہلی میں اُنیسویں صدی کے شروع میں اور پنجاب میں انیسویں صدی کے وسط میں داخل ہوئیں۔ انیسویں صدی کے آخر میں اور خاص طور پر جنگ رُوس وجاپان کے بعد بیسویں صدی کے شروع میں ہندوستان میں سیاسی بیداری پیدا ہوئی۔ کانگرس بیس سال پہلے بن چکی تھی، مُسلم لیگ اب وجود میں آئی۔ اس کے دس سال بعد ۱۹۱۶ء میں پہلی جنگ عظیم کے دوران میں کانگرس اور لیگ میں وہ مفاہمت ہوئی جس کی وجہ سے آزادی کی تحریک بیش از بیش ترقی کرنے لگی۔ ۱۹۱۹ء میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ منظور ہوا لیکن کانگرس نے گاندھی جی کی قیادت میں اِن جزوی اختیارات کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ ۱۹۲۰ء میں عدم تعاون اور ۱۹۳۰ء میں سول نافرمانی کی تحریک چلی۔ ۱۹۳۵ء میں ایک اَور گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ منظور ہوا جس کے بعد کانگرس نے ۱۹۳۷ء میں انتخابات میں غیر معمولی کامیابی حاصل کی لیکن اپنی کوتاہ نظری سے گورنمنٹ بنانے کے کام میں مُسلم لیگ کے تعاون کو ٹھکرا دیا۔ اس سے مُسلمانوں میں ایک زبردست سیاسی بیداری کا جذبہ پیدا ہوا۔ چنانچہ مارچ ۱۹۴۰ء میں لیگ نے پاکستان کی قرارداد منظور کر کے مُسلمانوں کی آزادی کی مُہم کا آغاز کیا۔ برطانیہ کی طرف سے انتقالِ اقتدار کے سلسلے میں ۱۹۴۲ء میں کرپس کی تجاویز پیش ہوئیں، ۱۹۴۵ء میں شملہ کانفرنس ہوئی اور ۱۹۴۶ء میں برطانوی وزارتی مشن کا منصوبہ تیار ہوا۔ لیکن بدقسمتی سے کانگرس اور لیگ کسی ایک تجویز پر متفق نہ ہو سکیں۔ آخر ۲۰ر فروری ۱۹۴۷ء کو برطانیہ نے اعلان کیا کہ برطانیہ جون ۱۹۴۸ء تک ہندوستان کو تمام اختیارات سونپ کر ملک کو خالی کر دے گا۔

۱۹۴۶ء میں وزارتی منصوبے کے سلسلے میں ایک سُنہری موقع کانگرس کو ملا تھا کہ وہ مُسلمانوں سے مساوات کی بنا پر ایک فیاضانہ مفاہمت کر کے ہندوستان کو متحد بھی رکھے اور مسلمانوں کے جائز مطالبات کو بھی پورا کر دے۔ لیکن بعض حریص اور کوتاہ بین لیڈروں کے تعصب اور حماقت کے باعث ہندوستان کی وحدت قائم نہ رہ سکی۔ اکتوبر ۱۹۴۶ء میں بہار میں مسلمانوں کا وہ قتلِ عام ہوا جس کے بعد اُن میں عام بددلی پھیل کر ہندوؤں سے بدظنی پیدا ہو گئی اور وہ اپنی قومی ہستی برقرار رکھنے کے لئے ایک جداگانہ وطن کے حصول کو ضروری سمجھنے لگے۔

۱۹۴۷ء ہندوستانی مسلمانوں کے لئے بالخصوص ایک انقلاب انگیز بلکہ زلزلہ خیز سال گزرا ہے جس کے دوران میں اُن میں پے در پے تحریکیں اُٹھیں قسم قسم کی غیر متوقع مصیبتوں کے حملے ہوئے، اُنھیں آزادی ملی، اُن کا بے پناہ قتل عام ہُوا۔ وہ اپنی غفلت سے اُٹھے ہی تھے کہ اُنھیں گزشتہ غفلتوں کی پاداش میں دشمنوں کے ہاتھوں وحشیانہ سزائیں ملیں، اُن کا مقاطعہ کیا گیا، اُن کی املاک چھین لی گئیں اور اُن کی نئی نئی آزادی کو ملیامیٹ کرنے کے بیسیوں کھُلے اور چھُپے ہوئے منصوبے عمل میں لائے گئے۔

جنوری ۱۹۴۷ء میں پنجاب میں مُسلم لیگ کی سول نافرمانی کی وہ پُرامن تحریک شرُوع ہوئی جس نے ایک ماہ میں توقع سے زیادہ کامیابی حاصل کی۔ ۲۰ر فروری کو برطانوی حکومت نے اعلان کیا کہ وہ جون ۱۹۴۸ء تک مرکزی یا صوبائی حکومتوں کو یا کسی اَور طرح سے اپنے اختیارات ہندوستانی ہاتھوں کو سونپ دے گی۔ مُسلم لیگ کی تحریک کی کامیابی دشمنوں کی نظر میں خار بن کر کھٹکی چنانچہ مارچ میں سکھوں اور ہندوؤں نے صوبے میں فساد برپا کر دیا اور یہ فساد آہستہ آہستہ ملک کے دُوسرے حصّوں میں پھیل گیا۔ ۳ر جون کو برطانوی حکومت نے ہندوستان کی آزادی کا نیا منصوبہ ملک کے سامنے پیش کیا جس کے مطابق ہندوستان کو انڈیا یعنی ہندوستان اور پاکستان دو حصّوں میں منقسم کر دیا گیا، ساتھ ہی بنگال اور پنجاب کی تقسیم کی تجویز بھی ہوئی۔ مُسلم لیگ اور کانگرس دونوں نے اس منصوبے کو منظور کر لیا باوجودیکہ مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے پنجاب اور بنگال کی تقسیم ایک صریح بے انصافی تھی اور باوجودیکہ سکھوں نے اس کے خلاف احتجاج کیا کہ یہ ہمارے قومی

مطالبے کو پُورا نہیں کرتا۔ ۱۸ر جولائی کو ہندوستان کی آزادی کا قانون برطانوی حکومت نے منظور کیا اور ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء ہندوستان اور پاکستان کی آزادی کا دن مقرر ہوگیا۔

اگر ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کے بعد **ہندوستان اور پاکستان** پچھلی کدورتوں کو بھُول کر دو نیک نیّت اور دُور اندیش ہمسایوں کی طرح زندگی بسر کرنے پر آمادہ ہوجاتے تو ان دونوں ملکوں اور دونوں قوموں کا حصُولِ آزادی دُنیا کی تاریخ میں سنہرے حرفوں سے لکھا جاتا لیکن ایسا نہ ہونا تھا نہ ہوا۔ ۱۵ر اگست سے پہلے ہی مشرقی پنجاب میں اُس گہری سازش کے ہولناک ڈرامے کا پہلا ایکٹ بے گناہ مُسلمانوں کے خون سے کھیلا گیا جواب، معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں اور سکھوں کے بعض بڑے لیڈروں نے مدّت سے تیار کر رکھی تھی۔ دو ڈھائی ماہ میں تین چار لاکھ اور ایک بیان کے مطابق آٹھ دس لاکھ مُسلمان بے رحمی اور سفاکی سے قتل کئے گئے، ہزاروں شاید لاکھوں اپنا مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کئے گئے اور تقریباً پچاس لاکھ نے اپنا گھر بار چھوڑ کر پاکستان میں آکر پناہ لی اور ابھی مصیبتوں کی یہ دلخراش داستان ختم نہیں ہوئی۔ ہندوستان کے مسلمانوں پر جو ظلم وستم ڈھائے گئے، جس طرح اُن کے مرد، عورتوں اور بچّوں کے ساتھ وحشیانہ سلوک روا رکھا گیا اُس کی بہت کم مثالیں تاریخ میں ملتی ہیں۔ گاندھی جی اور پنڈت نہرو نے اعتراف کیا ہے کہ انھیں ہندوؤں سکھوں کے ان کارناموں پر سخت شرمندگی ہے۔ مسلمانوں نے اس کے جواب میں جو کچھ پاکستان میں کیا ہر چند کہ وہ قابلِ مذمت ہے لیکن وہ غیر مُسلموں کے مظالم کا دسواں حصہ بھی نہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستان کی حکومت نے ریاستوں پر بھی ہاتھ صاف کرنا شروع کیا۔ پاکستان نے برطانیہ اور اُس کی نوآبادیات سے اپیل کی لیکن وہاں صدائے برنخاست۔

یہ ایک بڑی طویل اور غمگین داستان ہے کہ یہ مظالم کیوں ہوئے۔ دَورِ حاضر میں بربریت کے یہ قصّے کس طرح دہرائے گئے، دُوسری طاقتیں اس زبوں حالی سے کیوں متاثر نہ ہوئیں۔ لیکن ایک بات اظہر من الشمس ہے کہ اس نام نہاد تدبّر و ترقی کے دَور میں بھی دُنیا میں طاقت کا سکّہ رواں ہے اور کمزوری اور بالخصوص قومی کمزوری ایک ایسا جُرم ہے جو کبھی معاف نہیں کیا جاتا — اس پر مستزاد یہ کہ سرمایہ داری کی اس پُرفریب دُنیا میں جو قوم اپنی معصومیت، غفلت اور ناداری کے سہارے زندگی بسر کرے وہ کبھی نہ کبھی ایسی ٹھوکر کھاتی ہے کہ اُس کی ہستی خطرے میں پڑجاتی ہے۔

دو سو سال سے **ہندوستان کے مُسلمان** قعرِ مذلّت میں گرے رہے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے کچھ عرصہ بعد سرسید احمد خاں نے انھیں اپنی غفلت کی لمبی نیند سے جگایا۔ ۱۹۰۶ء میں مُسلم لیگ قائم ہوئی جس میں محمد علی جناح نے ۱۹۳۷ء میں ایک نئی رُوح پھونکی۔ گزشتہ دس سال میں قوم نے سیاسی تنظیم کی چند منزلیں ضرور طے کیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ایک حکومت کو چلانے اور ایک خود مختار سلطنت کو سنبھالنے کے لئے جن اوصاف کی ضرورت ہوتی ہے وہ ابھی قوم میں پُوری طرح پیدا نہ ہوئیں۔ لیکن زمانہ اپنی تیز رفتاری میں کسی سُست رَو قوم کا انتظار نہیں کیا کرتا۔ ہندوستان کے مُسلمانوں کو گزشتہ سال میں جو عبرت ناک سبق ملا ہے اگر انھیں اپنی قومی ہستی کو برقرار رکھنا اور مضبوط بنانا ہے تو لازم ہے کہ وہ اُس سبق سے جلد از جلد محنت، ایثار اور اتحاد کے دشوار گزار رستے پر چلنا سیکھ لیں تاکہ بین الاقوامی دنیا میں وہ دُوسری باعزت قوموں کے دوش بدوش کھڑے ہوسکیں۔

کچھ عرصہ ہوا **چند نئی کتابیں** نظر سے گزریں جن سے مغربی مفکّرین کے بعض جدید میلانات کا پتہ چلتا ہے۔ ایک ہے گولڈ کی تصنیف "انسان، فطرت اور زمانہ" (W. A. Gauld :- Man, Nature & Time 1946.) مصنف کا نظریہ یہ ہے کہ دُنیا کی تاریخ میں فطرت سے زیادہ انسان واقعات کی سمت اور مقصد پیدا کرنے کا باعث ہوتا ہے۔ ہماری دُنیا زیادہ تر انسان کی بنائی ہوئی دنیا ہے۔ فطرت اور انسان مل کر اپنی مادّی و رُوحانی قوتوں سے دنیا کی تشکیل کرتے ہیں۔ انسان تقدیر کا بنانے والا ہے نہ کہ اُس کا صیدِ

شکار۔ دنیا کی موجودہ صورت میں انسانی زندگی بہت حد تک ریاست کے وجود سے متاثر ہوتی ہے اور آئندہ اس میں زیادہ تر جماعتی اختلاف
اور معاشی ضروریات اثر انداز ہوں گی اور غالباً انفرادی آزادی اور ریاست کی مداخلت کے بین بین کوئی راہ نکلے گی جس پر فرد کو گامزن
ہونا ہوگا۔ آج کل کے بین الاقوامی ادارے آنے والی سیاسی صورتِ حال کا پتہ دیتے ہیں۔ اخیر میں مصنف پھر اپنے نظریئے کو دہراتا ہے کہ "انسان
اور فطرت کسی مشترکہ مہم میں باہم مل کر کام کرنے والے ہیں جس کا نتیجہ نہ معلوم اچھا ہوگا یا بُرا لیکن پہلے کی بہ نسبت ترقی کی باگ ڈور فطرت کی بجائے
زیادہ تر انسان کے ہاتھوں میں آگئی ہے"۔

H.J. Morgenthau: Scientific
دوسری مارگن تھو کی کتاب ہے "علمی آدمی اور سیاسیات طاقت کی کشمکش" (Man Versus Power Politics) مصنف کہتا ہے کہ سائنسدان یا علمی آدمی مادّی دنیا میں علمی طریق کار کے استعمال میں کامیاب
ہو کر اسی طریقے کو معاشری دنیا میں استعمال کرتا ہے اور ناکام رہتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ دُنیا ایک خاص قانون کے ماتحت چلتی ہے اور تمام انسانی خرابیو
کا عقلی علاج موجود ہے۔ لیکن یہ انسانی مسائل محض میکانکی فارمولوں سے حل نہیں ہو سکتے۔ بدی دنیا میں اپنا کام کرتی ہے اور برابر کرتی رہے گی۔ طاقت
کی سیاسیات کا منبع طاقت کے لئے وہ بھوک ہے جو سب آدمیوں میں پائی جاتی ہے اور جو عقل کا کہنا نہیں مانتی۔ اس لئے علمی آدمی کی جگہ سیاسی مُدبّر
کو لینی چاہیئے جو یہ جان کر بھی کہ سیاسی کام عموماً بُرے ہوتے ہیں کچھ نہ کچھ کرتا رہے۔ دُور اندیش مدبّر کا کام ہے کہ وہ انسان کی سیاسی فطرت کو اس کے
اخلاقی نصب العین کے مطابق چلانے کی کوشش کرے۔ انسان کی فطرت سہ گانہ ہے حیوانی، عقلی اور رُوحانی۔ خالص آلیت پہلی اور تیسری شق کو
نظر انداز کرتی ہے اور اس لئے ناکام رہتی ہے۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے مغربی "آزادی پسندوں" نے محض اقلیت سے دنیا کو فتح کرنا
چاہا۔ سوال یہ نہیں کہ قانون کیا ہے بلکہ قانون کیا ہونا چاہیئے۔ قانون اور سیاسی دانشمندی ہمیشہ یکساں اور متحد نہیں ہو سکتے۔ فلسفۂ عقلیہ
نے انسان کی رُوحانی اور جذباتی فطرت کو نظر انداز کیا ہے۔ معاشری حلقے میں واقعات کے متعلق پیش گوئی نہیں کی جا سکتی۔ طاقت کی بد
سے پورا احتراز ناممکن ہے پس ہمیں انتخاب کرنا پڑے گا کہ کون سی بُرائی کم بُری ہے۔ کائنات میں ہمیشہ سے خدا کے مقابل میں شیطان کھڑا
ہے اور روشنی کے مقابل میں تاریکی ہے اور یہ کشمکش جاری رہتی ہے اور خدا معلوم کب تک جاری رہے۔ سچے انسان کا کام ہے کہ اس دائمی جنگ
میں نتیجہ سے بے پروا ہو کر ہمیشہ اچھائی کی طاقتوں کا ساتھ دیتا رہے۔

(Aldous Huxley :-
۱۹۴۷ء میں (مشہور مصنف آلڈس ہکسلے کی) ایک کتاب چھپی "سائنس، آزادی اور امن" (Science Liberty and Peace 1947) مصنف کہتا ہے کہ سائنس کی ترقی آزادی کی راہ میں حارج ہوئی ہے۔ سوسائٹی پر
حکومتیں چھائی ہوئی ہیں اور ہر جگہ طاقت کا سکہ جاری ہے۔ خوراک، لباس اور رہائشی مکان یہ ہیں انسان کی ابتدائی مادّی ضروریات
لیکن ان کے علاوہ انسان کی رُوحانی ضروریات بھی ہیں جو اس کی ترقی کے لئے کچھ کم ضروری نہیں۔ اس کے لئے انسان کو انفرادی آزادی کی ضرورت
ہے اور ایسے کام کی جو اس کے ماحول سے گہرا تعلق رکھتا ہو۔ آج کل کی دُنیا میں انسانی شخصیت اور زندگی کی قدروں کی طرف بے اعتنائی برتی جا رہی
ہے۔ انسان کا نصب العین اندرونی روشنی کی ابدیت میں مضمر ہے۔ متمدن دنیا میں قومیت کا زور ہے جس کا نتیجہ ہے انسان کی اخلاقی بربادی۔
خود اختیاری حکومت کا اصول زندگی کے تمام شعبوں میں اور ہر کہیں نافذ ہونا چاہیئے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہر فرد بشر امدادِ باہمی کی ایک چھوٹی
مقامی جماعت میں رہ کر امن اور چین سے اپنا کام کرے۔ لہٰذا دُنیائے حاضر کی پہلی ضرورت ہے وسیع پیمانے پر لامرکزیت۔ اس کام میں سائنسدان
اپنی محنت اور توجہ سے ایسی ایجادیں کر سکتے ہیں جن سے چھوٹی جماعتیں بغیر کسی مرکزی حکومت کی امداد کے خوراک اور صنعت سے متعلق اپنی تمام
ضروریات آپ سے آپ مقامی طور پر پوری کر لیں۔ یہی وہ طریقہ ہے جس سے مرکزی حکومت کی ہمہ گیر طاقت کچھ کم اور افراد کی آزادی
زیادہ محفوظ ہو سکتی ہے۔

۱۹۴۷ء میں ایک اور چھوٹی سی کتاب مصنفہ لارڈسنل مرحوم شایع ہوئی ہے۔"نئی دُنیا" (The New World - by Lord Snell) مصنف کا قول ہے کہ دنیائے حاضر کی سب سے بڑی ضرورت عقل پر زیادہ اعتماد اور اخلاق جس کا تیز تر کرنا ہے۔ دُوسری جنگِ عالمگیر کے بعد اتحادی فتح سے دُنیا ایک ہولناک خطرے سے بچالی گئی۔ اب لوگ چاہتے ہیں تقریر کی آزادی اور معاشری اور اقتصادی اصلاح' اور دُور بین اور حقیقت شناس آدمی چاہتے ہیں عقل سے انسانی مسائل کو حل کرنا اور اخلاق کو جلا دینا اور اُبھارنا۔ اس کے لئے سب سے پہلی ضرورت آپ اپنی اصلاح ہے۔ پُرانا نظام ختم ہوچکا جس میں طاقت' دولت اور اقتدار پر بھروسہ کرنا انسان کا نصب العین تھا۔ اب دوسری جنگ کے خاتمے پر ہم کو سمجھ لینا چاہیئے کہ کوئی قوم قدرت کی چہیتی نہیں' اخلاقی قدور کی قدر افزائی انسانیت کی ترقی کا زینہ ہے۔ ہر شے کو علم اور تجربے کی کسوٹی پر پرکھنا ہمارے لئے مفید ہے اور جمہوری نمائندگی' انفرادی آزادی اور قانون کی پابندی ہر متمدن حکومت کے لازمی اجزا ہونے چاہئیں۔ انسان کی تعمیرِ نَو کے لئے عقل کا استعمال لازم ہے لیکن عقل بھی اپنی حدود رکھتی ہے انسانی زندگی میں جذبات کا عنصر قابلِ غور ہے۔ البتہ انسانی فطرت اٹل نہیں بلکہ بدلی جاسکتی ہے۔ مذہب کی بھی ایک حد تک عقل سے اصلاح ہو سکتی ہے اور اس نئے زمانے میں ہمیں ایک نئی اشتراکی تصوریت کو اپنا نصب العین بنانا چاہیئے۔ مذاہب ختم ہوجائیں لیکن سچّے مذہب اور سچی رُوحانیت کے احیاء کے بغیر انسانی سوسائٹی زندہ نہیں رہ سکتی۔ آج ہمیں ایک نئے عقیدے اور نئے پُرجوش اعتقاد کی ضرورت ہے۔ ہر فردِ بشر کی ایک ذاتی ذمہ داری ہے کیونکہ ہر شخص کو اپنے طور پر سوسائٹی کی ترقی کے لئے اپنا فرض ادا کرنا ہے۔ سوسائٹی کو ہر شخص کی ذاتی کوشش کی انتہائی ضرورت ہے۔

مصنف کہتا ہے کہ اچھے سے اچھا آدمی بھی دنیا میں بُرائیوں کا غلبہ دیکھ کر محض تارکُ الدنیا ہوجانے سے نوعِ انسانی کی خدمت نہیں کرسکتا۔ تمام مذاہب کو غور سے دیکھو تو اُن سب میں ایک چیز مشترک نظر آئے گی اور وہ ہے ایک زیادہ نیک اور شاندار زندگی بسر کرنے کا خیال' کوئی شخص سکون میں ترقی نہیں کرسکتا' حرکت زندگی کے لئے لازم ہے' اگر انسان چاہے کہ وہ پیچھے نہ ہٹے تو اُسے لامحالہ آگے بڑھنا پڑے گا۔ پس فرد اور نوعِ انسان کی مکمل ترقی کے لئے کاموں میں ہر فرد کی ذاتی شرکت لابدی ہے۔ تامّل نہ کرو' اعتراض نہ اُٹھاؤ' شرائط نہ پیش کرو' آؤ اور کسی نہ کسی کام میں لگ جاؤ۔ نئی دنیا کی تعمیر میں نوجوانوں کی ذمہ داری سب سے زیادہ ہے۔ لیکن ساتھ ہی سوسائٹی کی بہتری کے لئے جوانوں اور معمّر لوگوں میں درست قسم کے سمجھوتے کی ضرورت ہے۔ نئی دُنیا کی بنیادیں ہوں گی' افراد کی بلند سیرت' سچائی کے لئے اُن کا جوش اور بِالتّائید المحبّت۔ سانچے میں ڈھلے ہوئے ادارے مثلاً پُرانی تعلیم' یہ اب اپنا کام کرچکے۔ اب تو ایسے مردوں' عورتوں کو صحیح قسم کی تربیت دینے کی ضرورت ہے جن میں قوتِ اختراع ہو' اور کام کرنے کی بے تاب خواہش۔ جن کے ارادے مضبوط ہوں اور جن کی سیرت بلند و پاکیزہ ہو۔ جو مذہب مُردہ ہو چکے اب اُن کی جگہ ایک نئے زندہ مذہب کی ضرورت ہے ——!

بشیر احمد

ہر اک مقام سے آگے گزر گیا مہِ نَو کمال کس کو میسّر ہُوا ہے بے تگ و دَو

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی رُوحِ اُمم کی حیات کشمکشِ انقلاب

توحید

وحدتِ ذات میں نہاں وحدتِ کائنات ہے،

ورنہ تمام کائنات ایک طویل رات ہے

ذات ہے ولولہ طراز، ذات ہے زندگی نواز

جانِ حیات کون ہے؟ جانِ حیات ذات ہے،

قطرے کی تھرتھری سے ہے بحر تموّج آشنا

عام سی بات ہے، مگر کتنی عجیب بات ہے

تیرگیاں، تجلّیاں، محض فریبِ امتیاز

ایک ہی آفتاب جب مبدئ معجزات ہے

شام کا سُرمئی غبار فرصتِ فکر کا نقیب

صبح کا نقرئی نکھار دعوتِ ممکنات ہے

احمد ندیم قاسمی

محض گفتگو

دراصل تو پنجاب کی زندہ دلی ایک قصۂ پارینہ ہے، مگر اس الم خیز خطہ میں اب بھی کہیں کہیں ایسی ہستیاں ہیں جن کا خیال یہ ہے کہ آسمان تاریک ہو، زمین خونخوار ہو تو دل روشن ہمت بلند تر ہو۔ یہ لوگ اپنی کہے جاتے ہیں، اُن کی ہنسی سنتے جو عید کو محرم بنا کر ہر وقت سوز کی لے میں یہ مصرع دہراتے ہیں ؎

رونا ہے شب و روز مقدر میں ہمارے

چند روز کا ذکر ہے کہ ایک قسمت کے مارے (یعنی قسمت جالندھر کے زخمی) اپنی پریشانیوں کی داستان ختم کرتے ہوئے یہ فرما رہے تھے کہ اُن کے لئے دن اور رات چکی کے دو پاٹ ہیں۔ اُن کا اُن کے متعلقین کا دل پسا جا رہا ہے۔ اس پر ایک شخص سے رہا نہ گیا۔ بولا:۔

"حضرت مجھ دیوانے کی بھی سُن لیجئے۔ اگر اس چکی کے چلانے والے نے آپ سے کوئی معاہدہ کیا تھا تو آپ اُس پر دیوان رام لال چیف جسٹس مشرقی پنجاب کی عدالت میں نالش دائر کر دیجئے۔"

زخمی۔ آپ کو مذاق کی سوجھی ہے تو یہ بھی سُن لیجئے کہ رام، رحیم کے حق میں کیا فیصلہ دے گا؟"

چونکہ زخمی صاحب کا نام رحیم تھا اس پر بے اختیار ہنسی کی لہر اٹھی مگر اس ہنسی اور مسکراہٹ میں بھی اک گونہ اندوہناک ترنم تھا اداشناس سمجھ گئے کہ رام خود ایک خوفناک تارے کی گردش میں مبتلا ہے۔ دیوانے صاحب کو "چکی کے پاٹ" والی تشبیہ پسند آئی تھی بولے۔

دیوانہ۔ بھیا جو مجھ سا جنونی نہ ہو وہ بتلائے کہ چکی میں گیہوں پستی ہے تو بنتا کیا ہے؟

حاضرین میں سے ایک صاحب بولے "مجھ گھنچکر کی سُنئے"۔

گھنچکر۔ آٹا بنتا ہے۔ آٹے کو گوندھا جاتا ہے۔ پھر آٹے کی چپاتی بنتی ہے۔ کھانے والا موجود ہو تو چپاتی سے اس کا پیٹ بھرتا ہے۔ کھانے والا موجود نہ ہو تو چپاتی کبھی گائے کے کام آتی ہے کبھی کتے کے۔ یہ ہے آٹے کی قسمت۔ پہلے پانی پھر آگ، پھر بعض دفعہ گائے کا پیٹ بعض دفعہ کتے کے دانت اور اکثر اوقات گائے اور کتے سے بدتر پنجابی دوزخ کا ایندھن۔

دیوانہ۔ اور اگر چکی میں مسلمان کا دل پیسا جائے تو کیا بنتا ہے؟

گھنچکر۔ مسلمان کا دل پسے تو پاکستان بنتا ہے۔ پاکستان بنتا ہے تو آدھے پنجابی مسلمانوں کو پوری کچوری کی طرح جلتے تیل میں نیا جنم عطا ہوتا ہے۔ باقی نصف پنجابی مسلمان چپاتی کی صورت اختیار کرتے ہیں اور کھانے والے لیڈر موجود ہوں تو سبحان اللہ ایسا تر نوالہ کہ باید و شاید۔

دیوانہ۔ (غضبناک ہو کر) لیڈروں کی شان میں یہ گستاخی! یاد رکھو حکم ربی یہ ہے کہ قوم لیڈروں کے لئے ہے، لیڈر قوم کے لئے نہیں اس حکم میں کوئی استثنا نہیں، روس سٹالن کے لئے، امریکہ ٹرومن کے لئے، ہندوستان پٹیل کے لئے، باقی ملک اور لیڈر کسی گنتی میں نہیں فلسطین اور چین کسی آنے والی بلا کے لئے مخصوص ہیں۔ پاکستان مٹ نہیں سکتا، زیارت کے لئے مخصوص ہے۔ صدیوں تک لوگ مقبروں کی زیارت سے بصیرت افروز ہوں گے۔

زخمی۔ واہ واہ! آپ تو مجھ سے بھی زیادہ مایوسی کے شیدائی نکلے۔
دیوانہ۔ قسم لے لو تمھیں آزما رہا تھا کسی آدمی کا رنج کم نہیں ہوتا جب تک وہ اپنے سے زیادہ کسی اور کو مبتلائے الم نہ دیکھ لے۔ تمھیں جالندھر کا رونا ہے۔ مجھ مرغ کباب کو کشمیر کا رونا ہے۔ آبائی وطن تخت سلیمان ہے۔ لکڑی کے ہمارے گھر، پانی پر ہماری روزی، تخت کا تختہ بنے گا۔ مگر مرتے دم تک یہی کہوں گا۔ ع "جو دیا اے خدا دیا تو نے" بددا نہیں ہوں، مایوس نہیں ہوں، آنحضرت کو عبداللہ نام سب ناموں میں پسند تھا۔ ہماری قسمت میں خدا نے وہ عبداللہ لکھ دیا جس کا دل پتھر ہے، دماغ بت کا ہے کاش! پتھر پہاڑ پر اُس کی چتا بنے۔
گھنچکر۔ بددعاؤں پر اُتر آئے؟
دیوانہ۔ جس کے پاس بندوق نہ ہو وہ بددعا کا تیر بھی نہ چلائے؟
زخمی۔ ہم لوگوں پر تو جو گذری سو گذری، مگر کشمیر کی حالت واقعی قابل رحم ہے۔ مگر حضرات یہ عقدہ کشائی تو کرو کہ ہماری قسمت میں نام بڑے کام کھوٹے کیوں لکھے ہیں؟ عبدالغفار، عبداللہ،
یہاں تک بات چلی تھی کہ ایک دہلوی حضرت مجلس میں شامل ہوئے۔
دہلوی۔ مخل تو نہیں ہوا؟
حاضرین۔ بسم اللہ
دہلوی۔ الحمدللہ کہ آپ نے بسم اللہ سے شروع کیا۔ مجھ جلاوطن کی سابقہ مجلسوں میں یہ لفظ استعمال میں کم آتا تھا۔ وہاں "بسر و چشم" کا زور زیادہ تھا۔ مگر پہلے اپنا تعارف کرا دوں۔ واقعہ یہ ہے کہ مرزا غالب اگر کسی کوچہ سے نکالے گئے تو رہے تو دہلی میں، ہماری حالت یہ ہے۔ ع
بہت بے آبرو ہو کر تگر دلی سے ہم نکلے!
اور ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ ہم سے زیادہ ذلیل وہ دلی والے ہیں جو اب بھی دہلی میں بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز ہیں۔ اُن میں سے ایک وہ ذات شریف بھی ہیں جنھوں نے پیدائش کے وقت اذان مکہ میں سُنی۔ کیا پوچھتے ہو؟ دلی سے نکلنا بُرا۔ دلی میں رہنا نکلنے سے بدتر۔ لال قلعہ کے پتھر آنسو بن کر نہ نکلیں تو تعجب نہیں، ہمایوں کے مقبرے میں ابوظفر بہادر شاہ نے پناہ لی اور موت کا خیر مقدم رنگون میں کیا۔ ہزاروں وہاں پناہ گزیں رہے۔ ہزاروں نکلے۔ ہزاروں اب بھی موجود ہیں۔ موت نہیں آتی سختی نہیں جاتی۔ ع
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں!
دہلوی حضرت کی تقریر ختم ہی ہوئی تھی کہ ایک اکھڑ سے پنجابی نے "السلام علیکم" بے تکلف گھونسے کی طرح مجلس کی طرف فائر کیا اور کہا۔ "خان شیر دل خاں سے ملئے۔" وعلیکم السلام اور مصافحہ کے بعد ابھی کوئی کچھ بولا نہ تھا (دہلوی صاحب تو محض مُنہ تک رہے تھے) کہ شیر دل خاں گرج کر بولے۔
شیر دل۔ خو تم لوگ سر جھکا کر کیوں بیٹھے ہو؟ اُٹھو نا، چلو کباب کھاؤ۔
اکھڑ پنجابی۔ تم لوگ مرد ہو کہ افسردگی کے تابوت، ہمارا کوئی نمک نہیں گیا۔ کارخانے دس بیس گئے تو بلا سے۔ جب تک کھانے کو کچھ ملتا ہے لطف اٹھاؤ۔ غم فردا کرے ہماری بلا۔
شیر دل۔ خو تم پنجابی لوگ رفل سے بیاہ کرو۔ کباب سے پیٹ بھرو۔ دال کھانے والے سے ڈرو گے تو ہم تم کو لوٹ لے گا۔

فلک پیما

ہجر

(ایک عربی قطعہ)

تواصلنا علی الایّام باق
ولکن ھجرنا مطر الربیع
یروعك صوبه لکن تراه
علیٰ علاته دانی النزوع

ترجمہ

سلیٰمی وصل کے دن جاودانی
جُدائی چند گھڑیاں' آنی جانی
اِسے ابرِ ربیعی جان جس کا
تقاطر رُوح فرسا' جوش آنی

(ترجمہ حامد علی خاں)

تجلّیات

نئی مستی، نیا عالم، وہ صبح و شام لیتے ہیں
جو تیرے ہاتھ سے جامِ مئے گلفام لیتے ہیں

جو تجھ سے آشنا ہیں دیکھتے ہیں تجھ کو پھولوں میں
مہ و خورشید و انجم سے ترا پیغام لیتے ہیں

سمجھتے ہیں اسے بھی ایک گردش جامِ اُلفت کی
ترے میخوار لطفِ گردشِ ایام لیتے ہیں

بہت محبوب ہیں مجھکو جنھیں تجھ سے محبت ہے
میں اُن پر جان دیتا ہوں جو تیرا نام لیتے ہیں

وہ گردابوں میں رقصاں ہیں وہ طوفانوں میں خنداں ہیں
جو کشتی کو ڈبو کر تیرا دامن تھام لیتے ہیں

گزر جاتے ہیں وہ ہنستے ہوئے تاریک راہوں سے
تری شمع محبت سے جو رہرو کام لیتے ہیں

بھروسا ہے جنھیں اپنے خدا کی کارسازی پر
اثرؔ آغوشِ طوفاں میں بھی وہ آرام لیتے ہیں

آثر صہبائی

پاکستان میں اُردو کا مستقبل

ہندوستان کی تقسیم کے بعد اُردو کا مستقبل کیا ہے؟ یہ سوال اب عام زبانوں پر ہے۔ اس کا سادہ اور مختصر جواب یہ ہے کہ اُردو کا مستقبل یقیناً شاندار اور خوشگوار ہے بشرطیکہ اُردو کے بہی خواہ سچے دل سے اس کی خدمت کا عہد کر لیں اور اس نقصان کی تلافی کی ٹھان لیں جو ملک کے بٹوارے سے بظاہر اس کو پہنچا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اُردو کی مملکت کا رقبہ اب پہلے سے کم ہو گیا ہے اور اُردو کے اصلی مرکزوں میں لوگوں کی زبان پر ہندی والوں کے سیاسی اقتدار نے اپنی مہر لگا دی ہے۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ اُردو کبھی ارباب سیاست کی دست نگر نہیں ہوئی۔ پنجاب سے مسلمان نوجیوں کے ذریعے سے دہلی پہنچی۔ وہاں سے کچھ آگے بڑھ کر برج سے آمیزش پا کر دکن میں داخل ہوئی اور پھر اِدھر اُدھر سارے ہندوستان میں پھیل گئی۔ اُس زمانے میں اس کے مقابلے میں فارسی کا سکہ چلتا تھا۔ سکے اور ٹکسال بادشاہی کے لوازم میں سے ہیں۔ غریب اُردو تو عوام کی ملکیت تھی عوام ہی نے اُسے اپنایا۔ صوفی اور مُلّا عوام کو مخاطب کرنا چاہتے تھے۔ اس کے سوا اور کس زبان میں کرتے؟ اسی کا سہارا تلاش کیا، نظمیں لکھیں، کہانیاں تصنیف ہوئیں۔ خال خال نثر کی کتابیں بھی مرتب ہوئیں مگر یہ سب کچھ شاہانہ سرپرستیوں سے نہیں ہوا۔ زبان نے اپنی صلاحیت سے اپنے لئے خود راستے پیدا کئے۔ اپنے لئے خود جگہ بنائی۔ عوام کی خادم تھی عوام نے سر آنکھوں پر بٹھایا۔ میں مانتا ہوں کہ اس کے عاشقوں اور خدمت گزاروں میں چند رؤسا، امرا اور سلاطین کے نام بھی نظر آتے ہیں، مگر واقعہ پھر بھی یہی ہے کہ اُردو ان کی سرپرستی اور فیاضی کی چنداں رہین منت نہیں ہوئی اس کے حقیقی خادم عوام الناس ہی تھے اور عوام الناس ہی رہیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندی والوں کے سیاسی غلبے کے باوجود میرا اعتقاد یہی ہے کہ اُردو نہ صرف پاکستان میں ترقی کرے گی بلکہ ہندوستان میں بھی بڑھے گی، عزت اور احترام کے ساتھ بولی جائے گی۔ بڑے لاڈ پیار سے واپس بلائی جائے گی ـــــ اس لئے کہ اس کی خوبیاں، اس کی صلاحیتیں، اس کے روشن پہلو اتنے دلکش اور جاذب نظر ہیں کہ خود بخود آنکھوں میں سما جاتی ہے، دل میں بس جاتی ہے اور زبانوں پر آجاتی ہے۔

ہندوستان میں مستقبل قریب میں اُردو کی جو حالت اور حیثیت ہوگی اس سے میں اس مضمون میں بحث نہ کروں گا۔ اس وقت میں صرف پاکستان میں اُردو کے امکانات پر غور کرنا چاہتا ہوں۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ ہندوستان کی تقسیم سے اُردو کی مملکت کو رقبے کی وسعت کے لحاظ سے بظاہر نقصان پہنچا۔ مگر دوسرے اعتبارات سے اُردو کو بہت سے فائدے ہوئے ہیں۔ اوّل تو یہ دیکھئے کہ متحدہ ہندوستان میں اُردو کی کیا حالت ہوتی؟ کانگریس اور گاندھی جی کے نظریئے کے مطابق سارے ملک کی زبان ہندوستانی ہونی قرار پائی تھی۔ یہ ہندوستانی زبان کوئی معین اور مشخص زبان نہ تھی۔ اس کے موجد اور مخترع خود گاندھی جی تھے وہ ایک ایسی زبان بنانا چاہتے تھے جو سارے ملک میں بولی اور سمجھی جائے۔ ہندوستانی وہ زبان نہیں جو سارے ملک میں بولی اور سمجھی جاتی ہو۔ زبانیں بنتی ہیں، بنائی نہیں جاتیں، زبانوں کے بننے میں عملی ضرورتوں اور تقاضوں کا ہاتھ غیر محسوس طور پر کام کرتا ہے۔ گاندھی جی کی ہندوستانی بنائی جا رہی تھی، بن نہیں رہی تھی۔ اتنے بڑے ملک میں جس میں پندرہ بیس بڑے بڑے صوبے ہوں اور آٹھ دس الگ الگ زبانیں بولی جاتی ہوں، اُن کے لئے ایک زبان کا ہونا تو درست اور بجا مگر ایک زبان وضع کرنا آسان بات نہیں۔ مدراس۔ بنگال، ناگپور، احمد آباد، کراچی، پشاور، کوئٹہ، دہلی، لاہور، پٹنہ ــــ ان شہروں کے لسانیاتی رقبوں پر غور کیجئے اور خود ہی بتایئے کہ ان کے درمیان سوا اُردو کے کون سا لسانیاتی رشتہ وحدت قائم ہو سکتا ہے۔ ”ہندوستانی“ کے مطالبے کی بنیاد یہ تھی کہ شمالی ہندوستان کے لوگوں کے علاوہ جنوبی اور مشرقی ہندوستان کے لوگوں کے لئے قابل فہم زبان کی ضرورت ہے۔ نتیجہ اس کا ایک دو

سال کے اندر اندر یہ ہوتا کہ ایک مصنوعی زبان بننے لگتی جو ممکن ہے کہ جنوبی اور مشرقی ہندوستان کے لیے قابلِ فہم ہو مگر شمالی ہندوستان کے لوگوں کے لیے یقیناً ناقابلِ فہم تھی۔ اگر ہندوستان تقسیم نہ ہوتا تو جمہوریت کا تقاضا اور نتیجہ سوا اس کے کچھ نہ ہوتا کہ شمالی ہندوستان کی سادہ اور عام فہم زبان جنوب اور مشرق کی خاطر اس قدر بگاڑ دی جاتی کہ اسے اُردو کے لقب سے ہرگز ہرگز ملقب نہ کیا جا سکتا۔ اس طرح اردو اپنی فطرت اپنے خمیر، اپنے اصلی رُجحانات، اپنی رُوح سے یکسر محروم اور منقطع ہو جاتی۔ ملک کی تقسیم نے اُس کو اس خطرے سے قطعی طور پر بچا لیا ہے۔ اب اُردو اپنے اصلی ماحول میں رہ کر بڑھ سکتی ہے، ترقی کر سکتی ہے، پھل پھول سکتی ہے۔

اسی نقطۂ نظر سے ادب کی حالت کا تصوّر کیجیے۔ متحدہ ہندوستان کی ہندوستانی کا ادب کیسا ہوتا؟ ایک ایسا بے ڈھنگا اور بے ہنگم ادب ہوتا جو فرمائشی اور مصنوعی ہونے کی وجہ سے صداقت اور اصلیت سے محروم ہوتا۔ مشہور اشتراکی ادیب سید سجاد ظہیر صاحب نے نیا ادب کی کسی گزشتہ اشاعت میں اُردو ادب کو مسلمانی روایات اور ہندی ادب کو ہندو روایات کا آئینہ دار قرار دیا ہے۔ میرے خیال میں اُن کی یہ رائے کسی حد تک درست ہے۔ رہا ہندوستانی ادب سو یہ ہندی ادب سے کسی حد تک ضرور مختلف ہوتا مگر اس پر بھی اکثریت کی چھاپ کا لگنا یقینی تھا۔ یہ ایک بے رنگ اور بے مقصد طومار ہوتا جس میں اُردو والے اپنے تہذیبی مضامین و مطالب کو ہرگز داخل نہ کر سکتے۔ اگر کوئی ادیب ایسی جُرأت کر بھی لیتا تو اس کے کارنامے غیر مقبول اور غیر محبوب قرار دیے جاتے۔ لفکاڈیو ہرن نے ایک موقع پر کہا ہے کہ ادب در اصل قوم کی حیاتِ اجتماعی کا رازدار اور ترجمان ہوتا ہے۔ اگر کوئی ادب کسی خاص نوع کی زندگی کی ترجمانی نہیں کرتا تو وہ ادب کھوکھلا اور بے روح کہلائے گا۔ اس اصُول کے پیشِ نظر اور مسلمانوں کے تہذیبی نظام کے نقطۂ نگاہ سے ہندوستانی ادب کے امکانات کو دیکھیے اور بتائیے کہ اس میں اسلامی تہذیب اور مُسلمانی زندگی کی روح کس حد تک داخل کی جا سکتی تھی؟ میرا خیال ہے کہ ہندوستان کے مشترکہ نظامِ حیات میں رہ کر اُردو اپنی روایات اور اصلی ماحول سے بالکل منقطع ہو جاتی اور ہندوستانی ہندوستان کی اکثریت کی ترجمان ہوتی، اسلامی تہذیب اور روایات اس کے پاس تک نہ پھٹک سکیں۔ ہمارا ادب ہمارا ادب نہ ہوتا بلکہ ہمارے قلم سے ایک غیر زبان میں کسی اور کی کہانی لکھی جاتی ——! اگر اس خیال کی روشنی میں دیکھا جائے تو ملک کی تقسیم سے اُردو کو بہت بڑا فائدہ یہ ہوا ہے کہ وہ اس احتساب سے محفوظ رہ گئی ہے جو مشترکہ ہندوستان میں اس کے رُجحانات پر عائد ہوتا۔ اب اُردو قدرتی نشوونما اور ارتقا کی منزلیں طے کر سکتی ہے، اس کا ادب اپنی روایات کے تسلسل کو برقرار رکھ سکتا ہے، اس میں وہی باتیں آزادانہ بیان ہو سکیں گی جو اُردو اور اُردو والوں کے مزاج اور فطرت کے مطابق ہوں گی۔ پرانی ادبی علامات (Symbols) قائم رہیں گی۔ گل و بُلبل کی زبان سے دلوں کی کہانیاں بدستور بیان ہوتی رہیں گی۔ شمع و پروانہ اور سرو و قمری کی تشبیہوں اور استعاروں میں معاملاتِ عشق ادا ہوتے رہیں گے، دیر و حرم، سبحہ و زنار، شیخ و برہمن، مدرسہ و خانقاہ، شہباز و شاہین سب کے سب الفاظ ہمارے مضمون و معنی کی خدمت گری کے لیے موجود ہوں گے۔ ان میں سے جس کو ہم چاہیں گے اُٹھا لیں گے جس کو چاہیں گے گرا دیں گے، مگر یہ ترک و اختیار اپنی مرضی سے ہوگا اس میں جبر اور زبردستی نہ ہوگی۔

ادبی علامتوں کی طرح ہماری تلمیحات بھی زندہ رہیں گی۔ ہماری رُومانی کہانیوں کے ہیرو، لیلیٰ مجنوں، یوسف زلیخا، قیس و لبنیٰ، وامق و عذرا بدستور ہمارے تخیل میں ہیجان پیدا کرتے رہیں گے۔ ہم اپنے ابطال اور صنادید کی سیرتوں کی تصویر کھینچنے میں آزاد ہوں گے۔ ہم اپنی تاریخ کو اپنے آزاد تصوّرات کی روشنی میں پڑھیں گے اور اپنے آزاد تصوّرات کی روشنی میں لکھیں گے۔ اس بارے میں ہماری فطرتوں اور صلاحیتوں کے غنچے تنگیٔ دل سے گھبرا کر مر نہ جائیں گے، بلکہ اپنی آزاد فضا کی وسعتوں میں پھیلیں گے، پھُولیں گے اور ادب کے باغ کو زینت بخشیں گے۔

ادب کے ساتھ ساتھ تعلیمی زبان کا سوال بھی ہمارے سامنے آتا ہے۔ گزشتہ آٹھ دس سال سے یونیورسٹیوں میں یہ بحث گرم تھی کہ ذریعۂ تعلیم میں تبدیلی پیدا کی جائے۔ مگر قابلِ حل یا ناقابلِ حل سوال یہ تھا کہ اس غرض کے لیے زبان کون سی استعمال میں لائی جائے۔ ہندی والے ہندی کی چندی نکالتے تھے۔ اُردو والے (بجا طور پر) اُردو، اُردو کی رٹ لگاتے تھے۔ بعض صوبائی زبانیں بھی میدان میں تھیں ان کو بھی ہمسری کا دعویٰ تھا۔

اور ہے ' ان حالات میں دوسرے معاملات کی طرح اس معاملے میں بھی اعتدال اور بیچ کی راہ ' وہی ہندوستانی قرار پاتی ۔ مگر بدقسمتی سے ہندوستانی خود (دہنِ یار اور کمرِ معشوق کی طرح) معدوم تھی ع عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ!

بایں ہمہ اگر ملک کی تقسیم عمل میں نہ آتی تو یہی ہندوستانی ذریعۂ تعلیم قرار پاتی ' پھر کیا ہوتا ؟ یہی ہوتا کہ اچھی خاصی رائج الوقت علمی و تعلیمی زبان کو ترک کرتے ہوئے نامانوس اور "غریب" اور "وحشی" الفاظ تعلیمی زبان میں داخل کیئے جاتے اور نصاب کی کتابوں کی زبان کو آسان کرنے کے بہانے سے مشکل تر اور ناقابل فہم بنایا جاتا ۔ اصطلاحوں کا سوال سب سے مشکل تھا ۔ علمی اصطلاحوں کو "فی صدی تناسب" کے اصول پر وضع کیا جاتا اور کوشش یہی کی جاتی کہ جنوب کی خاطر شمال کی زبان مسخ ہو جائے ۔ معمولی معمولی دیسی لفظ جنھیں سب لوگ بآسانی سمجھ لیتے ہیں اس طرح بگاڑ دیئے جاتے کہ اُن کے لیئے ہر وقت پلیٹس ہندوستانی ڈکشنری کی طرف رجوع کی ضرورت پڑتی ۔ موجودہ سیاسی حل نے ہماری اس دقت کو بھی رفع کر دیا ہے ہم ان پُرانی اصطلاحات کو جو زندہ رہنے کے قابل ہیں زندہ رکھیں گے ' جو مر چکی ہیں انھیں بصد احترام دفن کر دیں گے ۔ جہاں بین الاقوامی اصطلاحوں کو استعمال کرنے کی ضرورت ہوگی بلا تکلف استعمال کریں گے ۔ اس معاملے میں بھی ہماری زبان بے جا مداخلت سے آزاد ہوگی ۔

گزشتہ سطور سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیئے کہ ہم خالص ہندوستانی مضامین اور ہندوستانی الفاظ سے پرہیز کریں گے یا زبان و ادب میں جو ہندوستانی الفاظ و معانی موجود ہیں ان کو نکال باہر کریں گے ۔ اُردو والے یہ حرکت ہرگز نہیں کریں گے ۔ اُردو ' دراصل اپنی ترکیب اور فطرت کے لحاظ سے ہی اس کی مخالف ہے ' اس کی تعمیر میں سب زبانوں کا حصہ ہے ۔ اس نے سب زبانوں سے کسبِ فیض کیا ' مضمون بھی لیئے معانی بھی اخذ کیئے ' بیان کے پیرائے بھی سیکھے ' حسنِ ادا کی طرزیں بھی اُڑائیں ' جو جس سے مل سکا لے لیا مگر ایک شرط پر کہ جو کچھ لیا جائے ایسا ہو جو زبان کے مزاج سے ہم آہنگ ہو ' ذوقِ سلیم کے لیئے گوارا ہو اور زبان میں بآسانی جذب ہو سکے ۔ ہماری زبان نے جس طرح عربی ' فارسی ' ترکی ' انگریزی ' رُوسی ' پرتگیزی ' ہندی ' بنگالی ' مرہٹی وغیرہ سے پہلے استفادہ کیا ہے اب بھی اسی طرح برابر ان سب سے فیض حاصل کرتی جائے گی ۔ مگر یہ سب کچھ اپنے ذوق اور اپنی ضرورتوں کی وجہ سے ہوگا اور آزادانہ ہوگا نہ کہ زبردستی ۔

ان اُمور سے قطع نظر اُردو ہماری نوزائیدہ سلطنت کے مختلف صوبوں کے درمیان رابطۂ مودت قائم کرنے کے لیئے بہترین وسیلہ ثابت ہوگی پاکستان کی موجودہ وسعتوں میں پانچ صوبائی زبانیں موجود ہیں ۔ پشتو ۔ پنجابی ۔ سندھی ۔ بلوچی اور مشرقی پاکستان میں بنگالی ۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے ان سب زبانوں کے لیئے اہلِ خطہ کے دلوں میں ایک تعصب موجود ہے ۔ پشتون اور سندھی اپنی صوبائی زبانوں کے بے حد دلدادہ ہیں ۔ اہلِ پنجاب اگرچہ بین الاقوامی ذہن کے لوگ ہیں اور اُردو سے انھیں محبت ہے پھر بھی پنجابی ان کے گھروں میں بولی جاتی ہے ۔ ان حالات میں پاکستان کو ایک ایسی زبان کی ضرورت ہے جو ان بکھرے ہوئے صوبوں کو کم از کم لسانی طور پر ایک رشتۂ وحدت میں پرو دے ۔ یہ زبان اُردو ہی ہو سکتی ہے ۔ سرکاری زبان بننے کا شرف بھی اسی کو حاصل ہو سکتا ہے ' مکاتبہ و مراسلہ کی زبان بھی یہی ہوگی ۔ اعلیٰ ادب اور کلچر کے مضمون بھی اسی میں باندھے جائیں گے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان کی بکھری ہوئی کڑیوں کو باہم مضبوط رکھنے کے لیئے جس قدر اُردو کی پاکستان گیری مفید ہوگی ' دوسری کوئی چیز اتنی نافع ہوگی ۔ یہ ممکن ہے کہ سیاسی اور اقتصادی معاملات میں صوبوں میں باہمی کشمکش پیدا ہو جائے ' اگر زبان کی وحدت آویزش کے بجائے آمیزش ' فصل کی بجائے وصل اور بُعد کی جگہ قرب کا باعث ہوگی ۔ پہلی اور دوسری جنگِ عظیم میں امریکہ اور انگلستان کے درمیان زبان کی وحدت اتحاد کی قوی ترین بنیاد تھی ۔ زبان کی وحدت باہمی محبت اور اُلفت کا محکم ترین ذریعہ بن سکتی ہے ۔ اس کے توسط سے ہم فی الفور ایک دوسرے کے قریب ہو جا سکتے ہیں ۔ زبان ایک ہو تو زمان و مکان کی دُوری ہماری قربت میں حائل نہیں ہو سکتی ' ہم زبانی کی برکت سے ہم اشاروں سے وہ بات نکال سکتے ہیں جو عبارتوں میں نہ سما سکتی ہو ' زبان سے ایک جملہ نکلا اور اُس نے دلوں پر دستک دی ' پاکستان کے لیئے زبان کی وحدت اور یکرنگی (باایں ہمہ رنگا رنگی) نہایت ضروری ہے ۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارے اربابِ سیاست اس نکتہ سے بخوبی آگاہ ہوں گے اور اس نقطۂ نگاہ سے اُردو کی اہمیت کے معترف ہوں گے ۔ پس اگر یہ صحیح ہے تو یقیناً

پاکستان اور اُردو دونوں کا مستقبل خوشگوار ہے۔

اُردو کے مستقبل کے بارے میں میں نے جن پُر امید خیالات کا اظہار کیا ہے اُن سے یہ مراد نہیں کہ اُردو اپنے نئے وطن میں بغیر کسی کوشش کے ترقی کر سکے گی۔ میرے خیال میں یہ قیاس درست نہ ہوگا، اُردو کو بڑھانے اور اُس کی جڑوں کو مضبوط کرنے کے لئے کسی سوچے سمجھے ہوئے پروگرام کی ضرورت ہوگی جس کی تکمیل کے لئے اربابِ حکومت، اہل علم و ادب اور عامۃ الناس کو متفقہ طور پر اپنے اپنے فرائض انجام دینے پڑیں گے حکومت کا فرض تو یہ ہے کہ فی الفور اُردو کو واحد سرکاری اور عدالتی زبان بنانے کا اقدام کرے۔ بیرونی دُنیا کے لوگوں سے مراسلت کے لئے انگریزی یا کسی دوسری زبان کو اظہارِ خیال کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح صوبائی زبانوں کو تعلیمات میں مناسب مقام دے دینے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں، مگر ان دو ضرورتوں کے علاوہ قلمرو پاکستان کے طول و عرض میں اُردو اور صرف اُردو ہی کا سکہ رائج ہونا چاہیئے۔ عدالتوں میں۔ دفتروں میں، سرکاری کاروبار میں۔ ریڈیو میں، تقریروں میں، اشتہاروں میں، تبلیغ و اشاعت میں غرض اظہار اور ترجمانی کے ہر موقعے پر اُردو ہی کو استعمال کیا جائے۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اس معاملے میں کسی حد تک تعصب پیدا کرنے کی ضرورت ہوگی۔ کیونکہ سہل انگاری اور مدارا سے زبان کی وحدت کا مسئلہ حل ہو ہی نہیں سکتا۔ انگریزوں نے ہندوستان میں انگریزی کے حق میں خود ہندوستانیوں کے دل میں ایک طرح کا تعصب پیدا کر دیا تھا۔ میں مانتا ہوں کہ ہندوستانی بعد میں خود ہی انگریزی کے دل دادہ اور عاشق ہو گئے تھے مگر اس واقعہ سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ چارلس گرانٹ کی اپیل اور میکالے کے نوٹ کے بعد حکومت نے اس ملک میں انگریزی کو کسی حد تک جبر سے نافذ کیا، اس کے لئے اقتصادی اور علمی منافع کی ترغیب کے علاوہ سرکاری رعب اور اثر کو بھی استعمال کیا گیا۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ بہت تھوڑے عرصے میں لوگ انگریزی میں بولنے اور لکھنے پر فخر محسوس کرنے لگے۔ اور رفتہ رفتہ اپنی زبانوں اور ادبوں کو حقیر سمجھنے لگے تھے۔ انگریزی کے حق میں یہ تعصب آج تک موجود ہے اور گو کہ سیاسی حالات نے انگریزی کا وقار بہت حد تک گھٹا دیا ہے پھر بھی غلامی کے اثرات کے ماتحت ہمارے ملک کے بہت سے لوگ ابھی تک اس کو ناگزیر اور بے بدل سمجھتے ہیں۔ پس اگر ایک غیر ملکی زبان کے حق میں یہ تعصب پیدا کیا جا سکتا ہے تو خود اپنی زبان کے بارے میں یہ عصبیت کیونکر پیدا نہ ہو سکے گی۔ مگر اس بارے میں پہلا قدم حکومت ہی اُٹھا سکتی ہے۔

یہ مضمون یہاں تک پہنچا تھا کہ میں نے مشرقی بنگال کے ایک وزیر مسٹر عبدالقیوم بہار کا ایک بیان اخبارات میں دیکھا جس میں انھوں نے مطالبہ کیا ہے کہ چونکہ پاکستان میں بنگالی بولنے والوں کی اکثریت ہے لہٰذا پاکستان کی سرکاری زبان بنگالی ہونی چاہیئے۔ اسی طرح کراچی کی تعلیمی کانفرنس کی روداد (جو اخباروں میں چھپی ہے) سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض بعض حلقوں میں صوبائی زبانوں کے حق میں غیر معتدل جوش اور حمایت موجود ہے۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ صوبائی زبانوں کو اُن کے مناسب مقام پر رکھ کر اُن کو ترقی دینی چاہیئے۔ اُردو کے ساتھ تصادم کا ان کے لئے کوئی موقع نہیں۔ جس طرح انگریزی زبان ان صوبائی زبانوں کے دوش بدوش چلتی رہی اور ان دونوں فریقوں کے درمیان کوئی پرخاش قائم نہ ہوئی اسی طرح عام ملکی زبان اور مقامی زبانوں کے درمیان کوئی جھگڑا نہ ہونا چاہیئے۔ ہمارے ملک کو ایک متحدہ زبان کی ضرورت ہے، وہ زبان زبان اُردو ہے۔ اُس کو اس کے اصلی منصب سے نہ محروم کیا جا سکتا ہے نہ کرنا چاہیئے۔ اُردو کو علمی زبان ہونے کا شرف ابھی سے حاصل ہے تعلیمی زبان بن چکی ہے اور بن رہی ہے۔ ابتدائی درجوں کے سوا اس کو ہر منزل اور ہر مرحلے پر ذریعۂ تعلیم اور ذریعۂ امتحان بننا ہوگا ——— اور سب صوبوں میں، کیونکہ اسی سے وحدت اور مواخات کے رشتے مضبوط ہوں گے، طوائف الملوکی اور ذہنی انتشار ملک کے لئے نقصان دہ ہے اور اس کا سب سے بڑا سرچشمہ لسانی افتراق اور رنگا رنگی ہے۔ زبان دلوں کی ترجمان ہے۔ زبان کی رنگا رنگی اور بھانت بھانت کی بولیاں جُدا جُدا مقاصد کی غمازی کریں گی۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں ڈاکٹر مہتہ نے لاہور کی میڈیکل کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ سارے ملک میں طب اور دوسرے علوم کو پڑھانے کے لئے زبان ایک ہی ہونی چاہیئے۔ اگر اس غرض کے لئے صوبائی زبانوں سے کام لیا گیا تو ملک علمی لحاظ سے کئی الگ الگ مملکتوں میں تقسیم ہو جائے گا

صوبے الگ الگ علمی زبانوں کی وجہ سے افادہ و استفادہ سے محروم رہ جائیں گے۔ پس مناسب یہی ہے کہ ملک کی علمی اور تعلیمی زبان ایک اور صرف ایک ہو۔ یہ اصول جس طرح سارے ہندوستان کے لئے قابلِ عمل تھا اسی طرح مملکت پاکستان کے لئے بھی قابلِ نفاذ ہے۔

اُردو کی تقویت اور فروغ کے سلسلے میں ایک بات اور ــــ! زبان دانوں اور ادیبوں کا فرض ہے کہ اُردو ادب کو ہمہ گیر، دلچسپ اور عام فہم بنانے کی پوری پوری کوشش کریں۔ اُردو کی اعلیٰ اور ترقی پذیر صلاحیتوں سے انکار نہیں، مگر موجودہ حالات میں اُردو کی ایک بنیادی کمزوری یہ ہے کہ یہ زبان اب جن جن صوبوں میں رائج کی جا رہی ہے اُن میں سے کوئی بھی اس کا اصلی گھر یا وطن نہیں۔ اس کی جڑیں ان صوبوں میں گہرے طور پر پیوست نہیں۔ عام بول چال کے لئے عوام کے پاس اُن کی اپنی مقامی بولیاں موجود ہیں۔ بنا بریں اس امر کی احتیاط ملحوظ رہے کہ لوگ ادیبوں اور عالموں کی مشکل زبان سے تنگ آ کر اُردو سے اپنا دامن نہ چھڑا لیں۔ جو ادب عوام کے لئے ہے (اور اس کا کوئی اصطلاحی پہلو نہیں) اس کی سلاست، گیرائی اور کشش اتنی نمایاں ہونی چاہیئے کہ لوگوں کے دل خود بخود اس کی طرف کھچیں۔ مشکل زبان اکثر لکھنے والوں ہی کی بے سلیقگی اور بد ذوقی کی علامت ہوتی ہے۔ اس سے یہ تو ظاہر ہو جاتا ہے کہ صاحبِ مضمون کے پاس الفاظ کا ذخیرہ موجود ہے مگر اس سے یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ قدرت نے اس شخص کو شائستگی اور لطافت سے محروم کر رکھا ہے۔ اسی طرح ادب کو زندگی کا ترجمان بنا کر اس کو عوام و خواص دونوں میں مقبول بنایا جائے تاکہ اُردو ادب اپنی پیداوار اور اشاعت کے لحاظ سے بھی وسعت پائے۔

اس کے علاوہ ایک ضروری بحث محاورہ و روزمرہ اور لب و لہجہ کی ہے۔ زمانہ کے بے پناہ ہاتھ نے دہلی اور لکھنؤ کی مرکزیت کو توڑ دیا ہے۔ اس کا ہمیں افسوس ہے۔ ان مرکزوں میں معیاری زبان بولی اور لکھی جاتی تھی۔ ان ٹکسالوں سے جو سکہ نکلتا تھا وہ سکہ بہرہ شاہی کی طرح مسلّم اور مستند تھا۔ مگر اب سیاسی حالات نے کچھ اس طرح پلٹا کھایا ہے کہ ہم تا دیر ان مرکزوں سے رابطہ قائم نہ رکھ سکیں گے۔ ہمارا تعلق اہلِ زبان کی معیاری زبان سے قائم نہ رہ سکے گا۔ اس صورت میں دہلی اور لکھنؤ کا روزمرّہ اور اہلِ زبان کا لب و لہجہ اور محاورہ کہاں باقی رہ سکتا ہے؟ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس بارے میں بے جا سختی روا نہ رکھی جائے۔ اُردو جن جن صوبوں میں جائے گی مقامی زبانوں سے ضرور اثر قبول کرے گی۔ مقامی محاورے گفتگو میں آئیں گے۔ صوبائی الفاظ کی بہت بڑی تعداد زبان کے ذخیرے میں زبردستی داخل ہو جائے گی۔ لب و لہجہ میں تغیر آئے گا۔ حروف و الفاظ کے مخرج بدلیں گے۔ یہ تبدیلیاں قدرتی ہیں اور ہر صوبے کے خاص اثرات میں ان کا ظہور میں آنا لازمی و لابدی ہے۔ پس اس معاملہ میں پرانی پابندیاں اور سختیاں نہ کی جائیں تو بہتر ہوگا۔ کیونکہ زبان کی وسعت اور ترقی کے لئے وسعتِ قلب کی بے حد ضرورت ہے ورنہ اندیشہ یہ ہے کہ لوگ خوردہ گیروں کے بے جا احتساب سے تنگ آ کر علاقائی اور مقامی زبانوں کی پناہ ڈھونڈنے لگیں گے۔ مسلمانانِ ہندوستان نے ہزار سال تک فارسی زبان کی وہ خدمت کی کہ خود ایرانیوں سے نہ ہو سکی۔ فارسی کی اکثر بلند پایہ لغت کی کتابیں اہلِ ہند کے قلم سے نکلی ہیں۔ فارسی ادب میں ہندی مسلمانوں اور ہندوؤں کا حصہ قابلِ اعتنا ہے ــــ مگر مغلوں کے زمانے میں تازہ وارد ایرانی جب ہندوستان میں آئے تو انھوں نے ہندوستانیوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنا شروع کیا اور ان کی زبان پر خوردہ گیری کی۔ یہ سلوک عام فارسی دانوں کے ساتھ ہی نہ کیا بلکہ مستند علما و فضلا کے خلاف زبان طعن دراز کی۔ علی حزیں نے سراج المحققین خان آرزو کے متعلق کہا: "در پوچ گویانِ ہند بد نیست"۔ اس پر دہلی اور دوسرے ادبی مرکزوں میں ایک ہنگامہ بپا ہوا۔ فضلائے ہند جو اس وقت تک فارسی کو دل و جان سے چاہتے اور سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے بددل ہو گئے اور کہنے لگے کہ جس زبان میں صدیوں تک لکھنے کے بعد بھی ہمارے بزرگ کوئی امتیاز پیدا نہ کر سکے۔ اس میں مزید سر کھپانے سے ہمیں کیا فائدہ ہوگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ لوگ ریختہ کی طرف مائل ہوتے گئے۔ اور نوبت بایں جا رسید کہ اب فارسی کی تعلیم و تحصیل ہوتی ہے ع لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا ــــ مجھے ڈر ہے کہ اُردو کے نادان دوستوں کی نادانی اور کم فہمی سے کہیں اُردو کا بھی یہی حشر نہ ہو۔ اُردو کی حدود کی توسیع اب جن قدرتی راستوں پر ہوگی اُس میں رکاوٹیں نہیں ڈالنی چاہئیں۔ تنقید اور ذوقِ صحیح دونو اس معاملے میں ہماری رہنمائی کریں گے۔

اور مطلق العنانیوں اور بے اعتدالیوں کو خود روک دیں گے۔

قلمرو پاکستان اس وقت صوبہ سرحد، پنجاب (مغربی) سندھ، بلوچستان اور بنگال (مشرقی) پر مشتمل ہے۔ ان میں سے بلوچستان، بنگال (مشرقی) اور سندھ میں اُردو کی ابھی کاشت ہوئی ہے۔ اس کا پودا لگانا ہے۔ ان صوبوں میں زبان کا خاصا تعصب موجود ہے۔ ان لوگوں میں اُردو کو بڑی دانائی سے رواج دینے کی ضرورت ہے۔ صوبائی زبانوں کی اہمیت تسلیم کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں، ان صوبوں میں اُردو اور صوبائی زبان ہر دو بطور لازمی مضمون کے پڑھانی چاہئیں۔ مگر تعلیم کی زبان پرائمری سے اوپر اُردو ہی ہونی چاہئے۔ مجھے یقین ہے کہ جب کبھی ان صوبوں کے لوگ اُردو کے دلکش ادب سے براہ راست روشناس ہوں گے، خود بخود اُردو کے دلدادہ ہو جائیں گے۔ اور اس کے لئے ان کے دل میں ایک طرح کا تعصب پیدا ہو جائے گا۔ اس سلسلے میں یہ بھی ضروری ہے کہ عدالتی اور سرکاری زبان ان صوبوں میں اُردو ہی ہو کیونکہ وہی اس اعزاز کی مستحق ہے۔

صوبۂ سرحد کا حال بنگال سے بہتر ہے۔ اگرچہ پشتو والوں کو اپنی زبان سے محبت بلکہ عشق ہے۔ مگر تقریباً ایک صدی سے اُردو صوبۂ سرحد میں رائج ہے۔ اکثر لوگ اُردو بولتے اور سمجھتے ہیں۔ ہزارہ اور ڈیرہ اسمٰعیل خاں میں پشتو کے علاقے کم ہیں، ان میں تقریر و تحریر اُردو زبان میں ہوتی ہے۔ پشتو میں ادب کچھ زیادہ نہیں، اس کا رسم الخط بھی مشکل اور بے ڈھنگا ہے۔ پشتو کی شاعری کم ہے، مگر جس قدر ہے بے مثل ہے۔ پٹھانوں کو خوشحال خاں خٹک اور عبدالرحمٰن کی شاعری سے بڑی محبت ہے مگر صحیح یہ ہے کہ ابھی تک پشتو میں اعلیٰ نثر پیدا نہیں ہوئی۔ عوام میں اُردو سمجھنے اور بولنے والوں کی کثرت ہے۔ جمرود۔ لنڈی کوتل اور تورخام تک چلے جایئے۔ اُردو میں بات کرنے اور سمجھنے والوں کی کمی محسوس نہ ہوگی اسلامیہ کالج پشاور کے طالب علم اس زبان کو قبائل میں پھیلانے کا کام سب سے زیادہ کر رہے ہیں۔ ضلع ہزارہ کے بعید ترین شمال مشرقی گوشے میں وادی کاغان واقع ہے جو گلگت اور چلاس تک چلی جاتی ہے۔ بہت سے لوگوں کے لئے یہ امر موجب حیرت ہوگا کہ اس وادی میں بعض لوگوں کی مادری زبان اُردو (گوجری) ہے۔ یہ لوگ گوجر ہیں۔ پرانے زمانے میں گجرات سے آکر یہاں آباد ہوئے تھے۔ ان کا کام بھیڑ بکریاں چرانا ہے۔ یہ وادی کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں۔ گرمیوں میں پہاڑوں کی چوٹیوں پر اپنے ریوڑوں کو لے جاتے ہیں۔ اس موسم میں درّہ کاغان اور درّہ بھوگرمنگ تک کے دشوار گزار راستوں پر چلئے اور اپنے کانوں سے گوجری اُردو کے گیت اور بول سُنئے اور لُطف اُٹھایئے۔ ہزارہ میں اُردو کی جڑیں بہت مضبوط ہیں اور تمام صوبۂ سرحد میں سب سے زیادہ ہزارہ کے لوگ اُردو سے قریب ہیں۔ مگر باقی اضلاع میں بھی اُردو کا خاصا چرچا ہے۔ سندھ اور بنگال کی طرح صوبۂ سرحد میں بھی تعلیمات میں پشتو کی بنیادی اہمیت کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ اس کے ماسوا باقی تمام دفتری اور سرکاری کاموں کے لئے اُردو ہی کو استعمال کرنا چاہیئے۔

اب پاکستان میں اُردو کے سب سے بڑے مرکز کی طرف آیئے۔ یہ پنجاب ہے، جسے اُردو کا وطن ثانی کہہ دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اُردو سے پنجاب کا تعلق بہت پرانا، بہت گہرا اور بہت مضبوط ہے۔ محققین کی یہ رائے ہے کہ اُردو کا ابتدائی ڈھانچہ لہندا اور ملتانی پنجابی کے خمیر سے تیار ہوا۔ لہندا مغربی ہندی شاخ سے متعلق ہے اور اپ بھرنش کی وارث ہے۔ استاد مرحوم پروفیسر شیرانی قوی دلیلوں سے یہ ثابت کر چکے ہیں کہ اُردو کا اوّلیں وطن پنجاب ہی تھا۔ سلطان محمود غزنوی کے زمانے میں علامہ البیرونی ہندوستان (پنجاب) میں وارد ہوتے ہیں، یہاں وہ جس عوامی زبان سے دوچار ہوتے ہیں اسے وہ الهندیہ کہتے ہیں مگر ان کی کتابوں خصوصاً ادویہ کی کتاب الصیدنہ) کے بیشتر الفاظ پنجابی ہیں، اسی زبان کو وہ ملک کے عوام کی زبان کہہ رہے ہیں غرض پنجاب کا دعویٰ ہے کہ اُردو کی تعمیر کی پہلی منزل اس کی حدود میں طے ہوئی۔ یہاں سے اُردو کا لشکر دہلی اور وہاں سے خلجیوں اور تغلقوں کی ظفر موج فوج کے ساتھ دکن اور گجرات میں پہنچا۔ اُردو کا پہلا ادب انھیں صوبوں میں پیدا ہوا اس کے بعد عرصہ تک پنجاب ان ادبی تحریکات سے بے خبر رہا جس کی پہلی لہر خود اس کے دریاؤں سے اُٹھی تھی ـــــ پنجاب میں اُردو کی دوسری لہر اورنگ زیب کے زمانے میں ہریانہ کے علاقے میں نمودار ہوئی۔ عین اس زمانے میں جب اُردوئے معلّٰی شاہجہان آباد ابھی تک طالب، کلیم، وسلیم کے قند پارسی ہی کا مداح اور عاشق تھا اور اہل دہلی کے کام و دہن فارسی سے لذت گیر ہو رہے تھے

ہریانہ کے علاقے میں نظم و نثر کے رسالے اُردو میں بہ تعداد کثیر لکھے جاتے ہیں۔ جن میں سے بعض کو قدیم اُردو ادب کا بہترین نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

پنجاب میں اُردو کی تیسری لہر ۱۸۵۷ء کے بعد اٹھی اب کی بار اس کے محرک انگریز تھے جنھوں نے اپنی سیاسی اغراض کے ماتحت ہندوستان میں وحدت زبان پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ۱۸۵۹ء میں پنجاب کا محکمہ تعلیم قائم ہوا اس زمانے سے لے کر اس وقت تک برابر اُردو پنجاب کی ادبی علمی تعلیمی اور سرکاری زبان ہے۔ پنجاب نے اس عرصہ میں اُردو زبان اور ادب کی جو خدمت کی ہے اس کی تفصیل بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اس کا حال تمام اہل علم جانتے ہیں یہاں تک کہ اہل اُردو نے پنجاب کو اُردو کا تیسرا مرکز قرار دیا ہے۔ بسمل الہ آبادی نے اسی وجہ سے کہا تھا ؎

مرکز زبان اُردو کا لاہور ہو گیا — دہلی و لکھنؤ کو پکارا کرے کوئی

اس تجزیے سے یہ بخوبی ثابت ہو جاتا ہے کہ پاکستان میں اُردو کا مستقبل پنجاب کی کوششوں پر منحصر ہے۔ اس لئے میرا عقیدہ ہے کہ پنجاب میں اُردو کے مسائل پر غور و فکر کی سب سے زیادہ ضرورت ہے آئندہ اُردو کی ترقی کے وسائل پنجاب ہی میں مہیا ہو سکتے ہیں اور اسی سرزمین میں اُردو کی عمارت مضبوط بنیادوں پر کھڑی کی جا سکتی ہے۔ پنجاب میں اُردو کو کیسے ترقی دی جائے اس کی تفصیل میں کسی دوسرے موقع پر بیان کروں گا اس جگہ مختصراً ان اقدامات کی فہرست پیش کرتا ہوں جن پر پاکستان اور پنجاب میں اُردو کی ترقی موقوف ہے۔

۱۔ اُردو کو انگریزی کی بجائے پنجاب کی اعلیٰ سرکاری زبان بنایا جائے اور سارا دفتری کام اسی زبان میں انجام دیا جائے۔

۲۔ عدالت عالیہ (ہائی کورٹ) کی زبان اُردو ہو۔

۳۔ نشر و اشاعت اور دفتری مراسلت کی زبان اُردو ہو۔

۴۔ ریڈیو کی زبان علی العموم اُردو ہو، اسمبلیوں میں تقریریں اُردو میں ہوں۔

۵۔ یونیورسٹی میں اُردو کو سب مضامین کا ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔

۶۔ یونیورسٹی میں اُردو کو لازمی مضمون بنایا جائے اور ایم۔ اے اُردو شروع کیا جائے۔

۷۔ اُردو میں ریسرچ اور تصنیفی کام کے لئے آسانیاں مہیا کی جائیں۔

۸۔ اُردو کی لائبریری کی توسیع کی جائے۔

۹۔ اُردو میں نصاب تیار کرنے کے لئے دار الترجمہ اور دار التصنیف قائم کئے جائیں۔

۱۰۔ اُردو میں انعامی تقریروں اور مباحثوں کے لئے عطیات طلب کئے جائیں۔

۱۱۔ تعلیم بالغان کی مہم جاری کی جائے۔

۱۲۔ اُردو بولو، تحریک کو وسعت دی جائے۔

۱۳۔ فلم کی زبان کا ادبی معیار عوامی نقطۂ نگاہ سے بلند کیا جائے۔

۱۴۔ عوام میں اُردو کو مقبول بنانے کے لئے اعلیٰ عوامی ادب پیدا کیا جائے۔

یہ "چہاردہ نکات" پنجاب میں اُردو کی آئندہ ترقی کے ضامن ہیں۔ اس پروگرام کو سارے پاکستان کے سلسلے میں بھی پیش نظر رکھا جا سکتا ہے مجھے یقین ہے کہ پنجاب اور پاکستان کے ارباب اقتدار اپنے فرض کو پہچانیں گے اور اُردو کی ترقی کے اس پروگرام پر عمل کریں گے۔ کیونکہ اس سے قبل ہمارے راستے میں جو رکاوٹیں تھیں وہ اب دور ہو گئی ہیں۔ اگر اب بھی لیت و لعل اور گو مگو کا عالم رہا تو پھر اُردو کے لئے اس ملک میں کوئی جگہ نہیں اور اس کے خوشگوار مستقبل کے بارے میں ہم جو اُمیدیں لگائے بیٹھے ہیں وہ سب نقش بر آب ثابت ہوں گی۔

سید عبداللہ

اگست ۱۹۴۷ء

فضا کے تیور بدل چکے ہوں، ہوائیں طوفاں بدوش آئیں
رہِ حرم کے مسافروں کے قدم سرِ مُو نہ ڈگمگائیں

اُفق پہ کچھ نُقرئی لکیروں میں نورِ فردا جھلک رہا ہے
یہ رہنے والی نہیں اگرچہ گرج رہی ہیں بہت گھٹائیں

خدا ہی خود ناخدا ہو جس کا وہ پار کیونکر نہ ہوگی کشتی
یہ موج و گرداب اپنی اپنی بساط تک ہم کو آزمائیں

خود اپنے پھندے میں آ پھنسیں گے جو راہ میں کانٹے بچھا رہے ہیں
یہ مکر و تزویر کے پُجاری سنبھل کے آگے قدم بڑھائیں

الٰہی پھر تیرے سادہ بندے ہیں اور اک سخت امتحاں ہے
دے اِن کو ہمت کہ تیری رہ میں یہ زخم کھا کھا کے مُسکرائیں

زمیں کی چھاتی دہل رہی ہے کہ خونِ مُسلم ہوا ہے ارزاں
دل و جگر سے ہیں پھر تقاضے، چراغ داغوں کے جگمگائیں

پُرانا آئیں ہے، رنگ بھرتے ہیں خوں سے قوموں کی داستاں میں
شہیدِ حق کو نہ مُردہ سمجھو، ہیں اُس سے سہمی ہوئی قضائیں

زباں ہو آلودہ شکایت، نہیں ہے شیوہ یہ عاشقوں کا
خرید لیتے ہیں جان و دل کے عوض وہ محبوب کی ادائیں

حرم کے راہی نہ ہوں ہراساں کہ کارداں میرِ کارواں ہے،
ہُوا کرے تنگ و تار رستہ کہ ساتھ ایماں کی ہیں ضیائیں

ایس۔ اے رحمٰن

وادیٔ شملہ کو وداعی سلام

وادیٔ شملہ کے دلکش کوہسارو الوداع — اے فرازِ کوہ کی رنگیں بہارو الوداع

کیل کے اور چیل کے رعنا درختو الفراق — وادیٔ خضرا کے نکھرے سبزہ زارو الوداع

خوبصورت جھاڑیو اے ناز پرورڈالیو! — حشر تک اس کوہِ رنگیں کو نکھارو الوداع

تم کو اے اونچے درختو اور شوکت ہو نصیب — قصرِ رفعت کے منظم پہرہ دارو الوداع

کوثر و تسنیم کے شاید جگر پارے ہو تم — اے سرِ کہسار کے پانی کے دھارو الوداع

کوہسارِ سبز کی زرخیز مٹی لے سلام — کنکرو اور پتھرو اور آبشارو الوداع

اے پہاڑوں کی مسلسل ننھی ننھی کھیتیو — اے غریبوں کی غذا کی چارہ کارو الوداع

اے فرشتوں کے پرو! اے گھاٹیوں کے بادلو — وادیٔ فطرت کے چابک شہسوارو الوداع

الوداع اے آب جو میں شورشِ آبِ رواں — کوہ کی خاموشیو! بن کی بہارو! الوداع

اِس فراقِ عارضی پر بے سبب روتی ہو تم

آہ ح۔ب صبر سے یہ دن گزارو الوداع

ح۔ب

ہجرت کے بعد

ہندوستان سے پاکستان! ان تین لفظوں میں زندگی کا اتنا بڑا انقلاب بیان ہو جاتا ہے جس کے آگے فرانس اور روس کے مشہور انقلاب تاریخ کی دو پگ ڈنڈیوں کا گرد و غبار بن کر رہ گئے ہیں۔

پاکستان کی طرف لاکھوں بے خانماں انسانوں ہی نے کوچ نہیں کیا۔ ایک اور مظلوم مگر عظیم الشان ہستی بھی چپ چاپ، دبے پاؤں، تنہا ہمارے درمیان آپہنچی ہے اور ہم سے زندگی اور امان کی طالب ہے۔ یہ ہماری اُردو زبان ہے! اس کی پکار قیامت کی پکار ہے۔ وہ دن گئے کہ جب اس آواز سے تاریخ کے ایوان گونج گئے۔

دوسرے پناہ گزینوں کی طرح اُردو کے چہرے پر بھی درد و کرب کے آثار نمایاں ہیں، لیکن اس لئے نہیں کہ باقی مہاجرین کی طرح یہ لُٹ کھسُٹ، جل جھلس کر یہاں پہنچی ہے، بلکہ اس لئے کہ ہندوستان کے نئے دیوتاؤں نے اس کو اس کی جنم بھومی سے نکال باہر کیا ہے۔ یہ اب بھی تندرست اور سلامت اور قوی ہے، مگر میر اور غالب، محمد حسین آزاد اور رتن ناتھ سرشار کی سرزمین اب اس کے لئے نہیں ہے۔ اُسے اپنے لئے ایک نئے وطن کی تلاش ہے۔

ہجرت کے بعد پاکستان میں اُردو کا مستقبل کیا ہے؟ اس سوال کا جواب اتنا آسان نہیں ہے جتنا جی چاہتا ہے کہ ہو۔ ذرا ابتدائی مشکلات کا اندازہ کیجئے۔ اُردو پاکستان میں پیدا نہیں ہوئی۔ اُردو پاکستان کے کسی علاقے کی بولی نہیں ہے۔ صرف مغربی پنجاب کا تھوڑا سا حصہ اسے اپنی ادبی زبان کہنے کا دعویٰ کرتا ہے اور بس۔ یہ صورتِ حال اور کچھ نہیں تو غیر معمولی ضرور ہے، لیکن اگر ہمیں اُردو کو پورے ملک کی قومی زبان بنانا ہے تو اب وقت ہے کہ ہم ہمت کریں۔ مغربی پنجاب کے متعلق کوئی شبہ نہیں کہ وہ اپنا ووٹ اُردو کو دے گا، لیکن سرحد اور سندھ؟ اور پھر مشرقی بنگال؟ جب تک یہ علاقے بھی بڑھ کر اُردو کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں نہ لیں اُردو پاکستان کی قومی اور سرکاری زبان نہیں بن سکتی۔ اگر قانونی طور پر اسے یہ حیثیت حاصل ہو گئی تو فوراً ہی بعد اسے ایک اور کڑی منزل در پیش ہوگی۔ اس وقت یہ سوال پیدا ہوگا کہ بول چال اور لب و لہجہ، روزمرہ اور محاورہ کس معیار پر جانچے جائیں گے اور کس حد تک اپنی اصلی صورت پر قائم رہ سکیں گے؟

ان مشکلات کے باوجود یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر پاکستان صوبجاتی بولیوں میں تقسیم ہوا تو اس کی سیاسی وحدت بتدریج ختم ہو جائے گی۔ آزاد پاکستان کی تخلیق کے لئے ہم نے سبھی طرح کی جانی اور مالی قربانیاں کی ہیں، اب اس کے تعمیر و استحکام کے مقصد کو پنجابی یا سندھی، پشتو یا بنگالی کی محبت پر قربان کر دینا کبھی روا نہیں ہو سکتا۔

پاکستان کے لئے اتحادِ زبان کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے —— اُردو! ہندوستان میں رہنے والے کروڑوں مسلمان جو سیاسی طور پر ہم سے الگ ہو گئے ہیں، اور تمدن کی رُو سے ہمارے بھائی ہیں، اُن کے اور ہمارے درمیان عملی طور پر اب بھی اگر کوئی رابطہ باقی رہ سکتا ہے تو یہی ایک —— اُردو زبان!

لیکن اصولی طور پر اُردو کی یہ حیثیت تسلیم کر بھی لی جائے تو بھی اس کو عملی صورت دیتے ہوئے کئی نئے مسائل ہمارے سامنے آئیں گے۔ پنجاب میں عام طور پر یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ اُردو کا اختیار کر لینا پاکستان کے تمام صوبوں کے لئے یکساں مشکل یا آسان ہوگا۔ حقیقت حال اس کے برعکس ہے۔ مثلاً رسم الخط کے مسئلے ہی کو لیجئے۔ سندھی، پنجابی اور پشتو سب اُردو حروف میں لکھی جاتی ہیں مگر بنگالی کا رسم الخط سنسکرتی ہے اور زبان کی ماہیت کو رسم الخط سے وہی تعلق ہے جو انسان کو بدن سے۔ پھر مشرقی بنگال کے ہمسائے میں ہندوستان ہے۔ حالانکہ سرحد اور بلوچستان، سندھ اور پنجاب کا سلسلہ اسلامی تمدن اور فارسی کے علاقوں سے ملا ہوا ہے —— اُردو کی راہ میں مشکلات خواہ کیسی اور کتنی ہوں، پاکستان کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ دوسرے مہاجرین کی طرح اُسے بھی؟ یہ زبان ہماری قوم کی ہزار سالہ تہذیبی روایات کا گنجینہ ہے۔ ہم لال قلعے اور تاج محل، مانڈو اور گولکنڈے کو چھوڑ سکتے ہیں مگر اُردو کو نہیں چھوڑ سکتے۔

کراچی۔ ۲۰ دسمبر ۱۹۴۷ء

حمید احمد خاں

آتش کدہ

اور پھر اُس کی شادی کا دن مستقبل کے دُھندلکے سے نکل کر روز بروز قریب ہونے لگا اور اسے یوں محسوس ہُوا جیسے وہ کسی دیوقامت پہاڑ کے نیچے تنہا کھڑی ہے اور چوٹی پر سے برف کا ایک مہیب سا تودہ آہستہ آہستہ پھسل کر اُس کی طرف بڑھا آرہا ہے۔ اور وہ وہیں کھڑی ہے تنہا، مجبور اور بے بس، پھر گھر میں سفیدی ہوگئی، نئے فرش بچھ گئے، فرنیچر پر پالش ہوا اور مہمان آنے لگے۔ خالہ نے آتے ہی اُس کے جہیز کی تیاری کا کام سنبھال لیا اور خالہ کی بیٹیوں نے صبح و شام شادی بیاہ کے مذاق کرکے اُس کا ناک میں دم کر دیا۔ چچی اپنی تینوں ہڑدنگی سی بیٹیوں سمیت آدھمکیں اور بچوں کا ایک لشکر صحن میں جمع ہو کر اپنے شور سے آسمان سر پر اٹھانے لگا۔ گھر کے بیشتر کمروں پر مہمانوں نے قبضہ جما لیا اور وہ سب کی نظروں سے بچتی، سمٹی سمٹائی اپنے کمرے میں پڑی رہنے لگی۔ مگر یہ خالہ اور چچی کی بیٹیاں اُسے کب چین لینے دیتی تھیں ہر وقت اُس کے گھٹنے سے لگی بیٹھی رہتیں، اور قمر کی تو کچھ ایسی زبان کھل گئی تھی کہ اُس کے بیہودہ مذاق سُن سُن کر اُس کا خون کھولنے لگتا۔ لیکن وہ خاموش رہتی اور قمر اور راحت چیخ اٹھتیں —— "آپا بی! ابھی تو دُلھن بننے میں چار دن باقی ہیں آپ تو ابھی سے شرما رہی ہیں"۔

پھر اس کی ہمجولیاں اور سہیلیاں اس پر ٹوٹ پڑیں اور اس کا کمرہ رنگین قہقہوں اور مہین آوازوں سے گونج اٹھا اور وہ اُن سب کے درمیان چُپ چاپ سر جھکائے بیٹھی رہی، ڈھولک پر تھاپ پڑی اور جوان ہونٹوں پر جوان ترنمے لہرانے لگے۔ ہنستے ہونٹوں، مسکراتی آنکھوں اور مچلتے ہاتھوں نے اُسے گھیر لیا اور وہ حسن و جوانی کے اس ہنستے بولتے دائرے میں ایک اجنبی کی طرح بیٹھی رہی، جیسے وہ ان ساتھ کھیلی سہیلیوں، ان کھلکھلاتی البیلیوں میں سے کسی کو نہیں جانتی، جیسے وہ عالم بالا کی بُھولی بھٹکی روح ہے جو اس ہجوم میں آگھری ہے۔ کامدانی جوڑے اور زرق برق دوپٹے، بجلی کی روشنی میں جگمگانے لگے۔ سات سہاگنوں نے مل کر اس کے ہاتھوں پر مہندی لگائی اور میراثنوں نے پُرسوز لَے میں سہاگ گانا شروع کیا۔ اُس نے اپنی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو چھپانے کے لئے سر جھکا لیا اور دوپٹے کا آنچل ماتھے سے اور بھی نیچے سرک آیا۔ پاس ہی بیٹھی ہوئی کسی بڑی بوڑھی نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا — "نا بیٹی شگن کے موقع پر رویا نہیں کرتے —" اور خالہ بول اُٹھی — "آج کل کی پڑھی لکھی لڑکیاں تو اپنی شادی پر بھی گٹر گٹر کرنے سے باز نہیں آتیں۔ مگر اللہ رکھے ہماری فاخرہ کیسے دُلھن بنی بیٹھی ہے۔ خدا کرے رہتی دنیا تک سہاگ قائم رہے —"

اُس کی امّی کی آنکھیں بھی ڈبڈبا آئیں۔ انھوں نے اپنے اُمنڈتے ہوئے آنسوؤں کو جلدی سے پونچھ ڈالا اور مبارک سلامت کے شور میں ان کے آنسو ہنسی میں گھُل مل گئے۔ ہر طرف ایک شور اُٹھا، ایک ہنگامہ۔ مگر اس ہجوم میں ایک اور لڑکی بھی تھی جو فاخرہ کی طرح خاموش بیٹھی اور اسی کی طرح اُداس —— بانو شاید اس شادی میں فاخرہ کا غم بانٹ رہی تھی۔ اُس نے قہقہوں میں حصّہ نہ لیا تھا۔ گیتوں کی اُٹھتی ہوئی تان میں اپنی آواز نہ ملائی تھی۔ وہ خاموشی سے فاخرہ کے پاس بیٹھی تھی، اور جب یہ ہجوم چھٹ گیا اور مہندی کی رسمیں ہو چکنے پر یہ ہجوم منتشر ہو گئیں تو اُس نے تنہائی میں اُس سے کہا —— "یوں کب تک رو رو کر اپنے آپ کو ہلکان کرو گی فاخرہ، جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب خدا کے لئے اپنے آپ کو سنبھالو، خدا کرے . . . . " اور ابھی وہ اپنی بات پوری نہ کر پائی تھی کہ پھر لڑکیوں کا ہجوم آدھمکا اور بانو نے اپنی زبان وہیں روک لی۔

رات گئے تک ہر طرف ایک چہل پہل سی رہی۔ پھر آہستہ آہستہ یہ ہنگامہ کم ہونے لگا۔ بچوں کی آنکھوں میں نیند بھرنے لگی اور وہ

ہجرت کے بعد

ہندوستان سے پاکستان! ان تین لفظوں میں زندگی کا اتنا بڑا انقلاب بیان ہو جاتا ہے جس کے آگے فرانس اور روس کے مشہور انقلاب تاریخ کی دو ریگ ڈنڈیوں کا گرد و غبار بن کر رہ گئے ہیں۔

پاکستان کی طرف لاکھوں بے خانماں انسانوں ہی نے کوچ نہیں کیا۔ ایک اور مظلوم مگر عظیم الشان ہستی بھی چپ چاپ، دبے پاؤں، تنہا ہمارے درمیان آ پہنچی ہے اور ہم سے زندگی اور امان کی طالب ہے۔ یہ ہماری اردو زبان ہے! اس کی پکار قیامت کی پکار ہے۔ وہ دن آئے گا جب اس آواز سے تاریخ کے ایوان گونج اٹھیں گے۔

دوسرے پناہ گزینوں کی طرح اردو کے چہرے پر بھی درد و کرب کے آثار نمایاں ہیں، لیکن اس لئے نہیں کہ باقی مہاجرین کی طرح یہ لُٹ کھسٹ، جل جھلس کر یہاں پہنچی ہے، بلکہ اس لئے کہ ہندوستان کے نئے دیوتاؤں نے اس کو اس کی جنم بھومی سے نکال باہر کیا ہے۔ یہ اب بھی تندرست اور سلامت اور قوی ہے، مگر میر اور غالب، محمد حسین آزاد اور رتن ناتھ سرشار کی سرزمین اب اس کے لئے نہیں ہے۔ اُسے اپنے لئے ایک نئے وطن کی تلاش ہے۔

ہجرت کے بعد پاکستان میں اردو کا مستقبل کیا ہے؟ اس سوال کا جواب اتنا آسان نہیں ہے جتنا جی چاہتا ہے کہ ہو۔ ذرا ابتدائی مشکلات کا اندازہ کیجئے۔ اردو پاکستان میں پیدا نہیں ہوئی۔ اردو پاکستان کے کسی علاقے کی بولی نہیں ہے، صرف مغربی پنجاب کا نصف حصہ اسے اپنی ادبی زبان کہنے کا دعویٰ کرتا ہے اور بس۔ یہ صورتِ حال اور کچھ نہیں تو غیر معمولی ضرور ہے لیکن اگر ہمیں اردو کو پورے ملک کی قومی زبان بنانا ہے تو اب وقت ہے کہ ہم ہمت کریں۔ مغربی پنجاب کے متعلق کوئی شبہ نہیں کہ وہ اپنا ووٹ اردو کو دے گا لیکن سرحد اور سندھ؟ اور پھر مشرقی بنگال؟ جب تک یہ علاقے بھی بڑھ کر اردو کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں نہ لیں اردو پاکستان کی قومی اور سرکاری زبان نہیں بن سکتی اگر قانونی طور پر اسے یہ حیثیت حاصل ہو گئی تو فوراً ہی بعد اسے ایک اور کڑی منزل درپیش ہو گی۔ اس وقت یہ سوال پیدا ہو گا کہ بول چال اور لب و لہجہ، روزمرہ اور محاورہ کس معیار پر جانچے جائیں گے اور کس حد تک اپنی اصلی صورت پر قائم رہ سکیں گے؟

ان مشکلات کے باوجود یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر پاکستان صوبجاتی بولیوں میں تقسیم ہوا تو اس کی سیاسی وحدت بتدریج ختم ہو جائے گی۔ آزاد پاکستان کی تخلیق کے لئے ہم نے سبھی طرح کی جانی اور مالی قربانیاں کی ہیں، اب اس کے تعمیر و استحکام کے مقصد کو پنجابی یا سندھی، پشتو یا بنگالی کی محبت پر قربان کر دینا کبھی روا نہیں ہو سکتا۔

پاکستان کے لئے اتحادِ زبان کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے ——— اردو! ہندوستان میں رہنے والے کروڑوں مسلمان جو سیاسی طور پر ہم سے الگ مگر مذہب اور تمدن کی رو سے ہمارے بھائی ہیں، اُن کے اور ہمارے درمیان عملی طور پر اب بھی اگر کوئی رابطہ باقی رہ سکتا ہے تو یہی ایک ——— اردو زبان!

لیکن اصولی طور پر اردو کی یہ حیثیت تسلیم کر بھی لی جائے تو بھی اس کو عملی صورت دیتے ہوئے کئی نئے مسائل ہمارے سامنے آئیں گے۔ پنجاب میں عام طور پر یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ اردو کا اختیار کر لینا پاکستان کے تمام صوبوں کے لئے یکساں مشکل یا آسان ہو گا۔ حقیقت حال اس کے برعکس ہے۔ مثلاً رسم الخط کے مسئلے ہی کو لیجئے سندھی، پنجابی اور پشتو سب اردو حروف میں لکھی جاتی ہیں مگر بنگالی کا رسم الخط سنسکرتی ہے اور زبان کی ماہیت کو رسم الخط سے وہی تعلق ہے جو انسان کی روح کو بدن سے۔ پھر مشرقی بنگال کے دائیں بائیں ہندوستان ہے۔ حالانکہ سرحد اور بلوچستان، سندھ اور پنجاب کا سلسلہ اسلامی تمدن اور فارسی زبان کے علاقوں سے ملا ہوا ہے ——— اردو کی راہ میں مشکلات خواہ کیسی اور کتنی ہوں، پاکستان کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ دوسرے مہاجرین کی طرح اُسے بھی یہاں بسائیں۔ یہ زبان ہماری قوم کی ہزار سالہ تہذیبی روایات کا گنجینہ ہے۔ ہم لال قلعے اور تاج محل، مانڈو اور گولکنڈے کو چھوڑ سکتے ہیں مگر اردو کو نہیں چھوڑ سکتے۔

کراچی۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۴۷ء

حمید احمد خاں

آتش کدہ

اور پھر اُس کی شادی کا دن مستقبل کے دُھندلکے سے نکل کر روز بروز قریب ہونے لگا اور اسے یوں محسوس ہُوا جیسے وہ کسی دیو قامت پہاڑ
کے نیچے تنہا کھڑی ہے اور چوٹی پر سے برف کا ایک مہیب سا تودہ آہستہ آہستہ پھسل کر اُس کی طرف بڑھا آ رہا ہے۔ اور وہ وہیں کھڑی ہے
تنہا، مجبور اور بے بس، پھر گھر میں سفیدی ہو گئی، نئے فرش بچھ گئے، فرنیچر پر پالش ہوا اور مہمان آنے لگے۔ خالہ نے آتے ہی اُس کے جہیز کی
تیاری کا کام سنبھال لیا اور خالہ کی بیٹیوں نے صبح و شام شادی بیاہ کے مذاق کر کے اُس کا ناک میں دم کر دیا۔ چچی اپنی تینوں ہڑدنگی سی بیٹیوں
سمیت آ دھمکیں اور بچوں کا ایک لشکر صحن میں جمع ہو کر اپنے شور سے آسمان سر پر اٹھانے لگا۔ گھر کے بیشتر کمروں پر مہمانوں نے قبضہ جما لیا
اور وہ سب کی نظروں سے بچتی، سمٹی سمٹائی اپنے کمرے میں پڑی رہنے لگی۔ مگر یہ خالہ اور چچی کی بیٹیاں اُسے کب چین لینے دیتی تھیں ہر وقت
اس کے گھٹنے سے لگی بیٹھی رہتیں، اور قمر کی تو کچھ ایسی زبان کھُل گئی تھی کہ اُس کے بیہودہ مذاق سُن سُن کر اُس کا خون کھولنے لگتا۔ لیکن وہ خاموش
رہتی اور قمر اور راحت چیخ اٹھتیں ——— "آپا بی! ابھی تو دُلھن بننے میں چار دن باقی ہیں آپ تو ابھی سے شرما رہی ہیں۔"

پھر اس کی ہمجولیاں اور سہیلیاں اس پر ٹوٹ پڑیں اور اس کا کمرہ رنگین قہقہوں اور مہین آوازوں سے گونج اٹھا اور وہ اُن سب کے
درمیان چُپ چاپ سر جھکائے بیٹھی رہی، ڈھولک پر تھاپ پڑی اور جوان ہونٹوں پر جوان ترنمے لہرانے لگے۔ ہنستے ہونٹوں، مسکراتی آنکھوں
اور مچلتے ہاتھوں نے اُسے گھیر لیا اور وہ حسن و جوانی کے اس ہنستے بولتے دائرے میں ایک اجنبی کی طرح بیٹھی رہی، جیسے وہ ان ساتھ کھیلی
سہیلیوں، ان کھلکھلاتی البیلیوں میں سے کسی کو نہیں جانتی، جیسے وہ عالم بالا کی بھُولی بھٹکی روح ہے جو اس ہجوم میں آ گھری ہے۔ کامدانی
جوڑے اور زرق برق دوپٹے، بجلی کی روشنی میں جگمگانے لگے۔ سات سہاگنوں نے مل کر اس کے ہاتھوں پر مہندی لگائی اور میراثنوں نے
پُرسوز لے میں سہاگ گانا شروع کیا۔ اُس نے اپنی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو چھپانے کے لئے سر جھکا لیا اور دوپٹے کا آنچل ماتھے سے اور
بھی نیچے سرک آیا۔ پاس ہی بیٹھی ہوئی کسی بڑی بوڑھی نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ——— "نا بیٹی شگن کے موقع پر رویا نہیں کرتے ——" اور
خالہ بول اُٹھی ——— "آج کل کی پڑھی لکھی لڑکیاں تو اپنی شادی پر بھی لُتر لُتر کرنے سے باز نہیں آتیں۔ مگر اللہ رکھے ہماری فاخرہ کیسے دُلھن
بنی بیٹھی ہے۔ خدا کرے رہتی دنیا تک سہاگ قائم رہے ——"

اُس کی امی کی آنکھیں بھی ڈبڈبا آئیں۔ انھوں نے اپنے اُمڈتے ہوئے آنسوؤں کو جلدی سے پونچھ ڈالا اور مبارک سلامت کے شور میں
ان کے آنسو ہنسی میں گھُل مل گئے۔ ہر طرف ایک شور اُٹھا، ایک ہنگامہ۔ مگر اس ہجوم میں ایک اور لڑکی بھی تھی جو فاخرہ کی طرح خاموش بیٹھی تھی
اور اسی کی طرح اُداس ——— بانو شاید اس شادی میں فاخرہ کا غم بانٹ رہی تھی۔ اُس نے قہقہوں میں حصہ نہ لیا تھا۔ گیتوں کی اُٹھتی ہوئی تانوں
میں اپنی آواز نہ ملائی تھی۔ وہ خاموشی سے فاخرہ کے پاس بیٹھی تھی، اور جب یہ ہجوم چھٹ گیا اور مہندی کی رسمیں ہو چکنے پر سب
عورتیں منتشر ہو گئیں تو اُس نے تنہائی میں اُس سے کہا ——— "یُوں کب تک رو رو کر اپنے آپ کو ہلکان کرو گی فاخرہ، جو ہونا تھا ہو چکا،
اب خدا کے لئے اپنے آپ کو سنبھالو، خدا کرے .... " اور ابھی وہ اپنی بات پوری نہ کر پائی تھی کہ پھر الھڑ لڑکیوں کا ہجوم آ دھمکا اور
بانو نے اپنی زبان وہیں روک لی۔

رات گئے تک ہر طرف ایک چہل پہل سی رہی۔ پھر آہستہ آہستہ یہ ہنگامہ کم ہونے لگا۔ بچوں کی آنکھوں میں نیند بھرنے لگی اور وہ مچل

مچل کر اپنے ساتھ اپنی ماؤں کو سُلانے پر مُصر ہونے لگے۔ مہمان اپنے اپنے کمروں میں جا سوئے۔ اب نیند کی دیوی جو عرصے سے دروازے پر کھڑی دستک دے رہی تھی گھر پر حکمران ہونے لگی۔ کوئی رات کے دو بجے اُس کی امّی ضروری کاموں سے فارغ ہو کر اور اگلے روز کے انتظامات مکمل کرنے کے بعد نوکروں کو علی الصبح اُٹھنے کی ہدایت کرتی ہوئی تھک ہار کر اپنے پلنگ پر جا سوئی۔ اب تمام کمروں کی بتیاں بجھ گئی تھیں۔ گھر پر ایک مکمل سکوت چھا گیا اور مکان کی ایک ایک اینٹ ایک گہری اُداسی میں ڈوب گئی۔

جوں جوں اس کی شادی کا دن قریب آ رہا تھا اُس کی راتوں کی نیندیں پریشان رہنے لگی تھیں۔ وہ ذرا کی ذرا آنکھ جھپکتی تو جیسے کوئی اُسے شانہ ہلا کر جگا دیتا اور وہ چونک پڑتی جیسے کوئی بہت پریشان خواب دیکھا ہو۔ آج اُس کے کمرے میں بہت سی لڑکیاں سو رہی تھیں۔ جمیلہ اور سعیدہ ایک ہی بستر پر پڑی تھیں۔ قمر راحت کے ساتھ لیٹی مزے سے ہلکے ہلکے خرّاٹے لے رہی تھی۔ اور بانو اُس کی ساتھ کی چارپائی پر بے خبر سو رہی تھی۔ وہ اپنے بستر پر خاموش لیٹی سوچتی رہی اور لڑکیاں جوانی کی نیند میں مدہوش پڑی سوتی رہیں۔ کبھی کبھی قمر کے ہلکے ہلکے خرّاٹے کمرے کی خاموش فضا میں چھوٹی چھوٹی سلوٹیں پیدا کر دیتے اور جب کمرہ خاموش ہو جاتا تو اُسے یوں محسوس ہوتا جیسے اُس کے اُلجھے ہوئے خیالات کی گونج اُسے صاف سنائی دے رہی ہے۔ کبھی آندھیوں کے فرّاٹوں کی آوازیں، کبھی چڑھتے ہوئے دریاؤں کا ہیبت ناک شور، کبھی چکراتے بگولوں کی تیز سرسراہٹ اور کبھی آسمان سے گرتی ہوئی سفید برف کی مدھم مدھم آواز — آوازوں کے اس ہجوم کے درمیان وہ خاموشی سے اپنے بستر پر لیٹی رہی۔ کمرے کے کونے میں اس کی کتابوں کی الماری پر پڑا ہوا ٹائم پیس ٹِک ٹِک کیے جا رہا تھا۔ اب وہ اس گھر میں صرف چند گھنٹوں کی مہمان تھی۔ بند کھڑکی کے دھندلے شیشوں اور روشن دان کے جھروکے میں سے بجھی بجھی روشنی کی کرنیں کمرے میں آ رہی تھیں۔

اُس نے اس نیم اندھیرے میں کمرے کے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ سامنے دیوار پر لگی ہوئی تصویر سے ہوتے ہوئے اُس کی نگاہیں اپنی کتابوں کی الماری پر جا پڑیں اور سنگار میز کے آئینے پر سے پھسلتے ہوئے آتش دان پر پڑے ہوئے گلدان پر جا کر جم گئیں۔ پھول پڑے پڑے مُرجھا گئے تھے۔ کئی دن سے کسی نے گلدان میں پانی تک تبدیل نہیں کیا تھا۔ شادی کے اس ہنگامے میں بھلا پھولوں کا کون خیال رکھتا۔ پھر سوچ گہری ہوتی چلی گئی۔ وہ خاموشی سے اُٹھی، لحاف ہٹایا، دوپٹہ سنبھالا اور چپلیں ہاتھ میں لے کر آہستہ آہستہ دبے پاؤں کمرے سے باہر نکل آئی۔ برآمدے میں نوکرانیاں نیند میں بے سُدھ پڑی تھیں۔ آنگن میں آ کر اُس نے چپلیں پہنیں اور اپنے آپ کو کھلے آسمان تلے پا کر اطمینان کا لمبا سانس لیا۔ آنگن سے گزرتی ہوئی وہ کوٹھی کے کھلے کمپونڈ میں آ گئی۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ ہوا ساکن تھی اور رات خاموش، خاموش اور اُداس۔ درخت سر جھکائے چپ چاپ کھڑے تھے۔ آسمان پر آنکھیں جھپکاتے ہوئے تاروں کے درمیان بادلوں کے ٹکڑے تیرتے پھرتے تھے۔ اُس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ بادل کے ایک ٹکڑے کے کنارے روشنی کی ایک جھالر سی جھلملا رہی تھی، پھر یہ جھالر اور جگمگائی اور پھر یکایک تمام آسمان کا رنگ دودھیا ہو گیا بادل کے ٹکڑے سے دامن چھڑائے چھوٹا سا چاند دودھیائے آسمان پر تیز تیز بھاگا جا رہا تھا۔ اب درختوں کی شاخوں پر روشنی کے پھول کھل اُٹھے اور اُس کے پاؤں میں بچھی ہوئی نرم نرم گھاس کا سیاہی مائل رنگ سبز ہونے لگا۔ چاند نے ابھی زیادہ سفر طے نہ کیا تھا کہ بادل کے ایک اور سیاہ ٹکڑے نے بڑھ کر اُسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ سیاہ بادل کے کنارے پر روشنی کی جھالر جھلملانے لگی اور فضا پر پھر وہی اندھیرا چھا گیا۔ دُور درختوں کے پاس تاریک سے سائے ناچنے لگے اور آنکھیں جھپکاتے ہوئے تارے ایک دُوسرے سے سرگوشیاں کرنے لگے جیسے چاند کی بے بسی پر ہنس رہے ہوں۔

وہ بنچ پر بیٹھ گئی۔ اگرچہ سردی زیادہ نہیں تھی۔ مگر کبھی کبھی ہوا کا کوئی جھونکا گزرتا تو اُس کے جسم میں ایک ہلکی سی کپکپی دوڑ جاتی۔ اُس نے اپنی گرم چادر اچھی طرح لپیٹ لی اور سرد سرد گھاس سے پیر ہٹا کر بنچ پر رکھ لیے۔ وہ اسی طرح بنچ پر نیم دراز آسمان کی طرف دیکھتی رہی غنودگی کے اس عالم میں لیٹے لیٹے اُس نے محسوس کیا جیسے تاریکی اور روشنی گلے مل رہے ہیں۔ آواز اور سکوت میں ٹکر ہو رہی ہے اور جیسے خواب اور بیداری کی سرحدیں مل رہی ہیں۔ پھر کچھ بھولی بسری یادیں، کچھ بیتی ہوئی گھڑیاں اور کچھ مٹے مٹے نقش اس کے قریب آنے لگے۔

ی بھُولے ہوئے نغمے کی طرح جو تنہائی میں خود بخود ذہن کے کسی چھپے ہوئے گوشے سے نکل کر دماغ میں گونجنے لگتا ہے۔ جیسے جنگل میں سرِ شام
ے کسی چرواہے کی بانسری اُس کے لبوں تک آتی ہے تو دُور گھاٹیوں میں چرتی ہوئی بکریاں اُس کی آواز پر جلدی جلدی لمبے لمبے ڈگ بھرتی
ں کی طرف آنے لگتی ہیں۔ یہ نغمہ اُس کے بکھرے ہوئے خیالات کو ایک مرکز کی طرف لا رہا تھا۔ اُس نے اپنے رتجگے سے بھاری پپوٹوں کو بند
یا۔ مگر اُس کی آنکھیں دکھتی رہیں۔ زندگی کے آراستہ لمحات اس کی نظروں میں پھرتے رہے۔ اس کا گلا خشک ہو گیا۔ ہونٹ سردی سے سِل
ے۔ بدن میں لہو کی بوند بوند منجمد ہو گئی اور اُسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ صدیوں سے یہاں لیٹی ہے۔ وہ اسی طرح لیٹی تھی کہ قریب کی مسجد
ے موذن کی آواز گونجی اور صدیوں کا یہ طلسم ٹوٹ گیا۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اُس نے آسمان کی طرف دیکھا، ستارے ماند پڑ رہے تھے۔
ند سامنے کی مُنڈیر کے پیچھے ڈوب رہا تھا۔ اُس نے آہستہ سے گردن کے نیچے گریبان میں ہاتھ ڈالا اور کاغذ کا ایک چھوٹا سا پرزہ نکال
چاند کی ہلکی ہلکی روشنی میں پڑھنے لگی۔ اُس کی پلکوں پر ننھے ننھے قطرے کانپنے لگے اور پھر یکبارگی مچل کر اس پُرزے پر آگرے۔ اتنے
ں امّی کے کمرے میں بتی جلی اور وہ گھبرا کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس نے کاغذ کا پُرزہ پھر گریبان میں اُڑس لیا۔ چند قدم چل کر وہ رُک گئی
ے کچھ سوچ رہی ہو۔ اُس نے پھر کاغذ کا پُرزہ نکالا اُسے پڑھا اور پھاڑ کر پھینک دیا۔ آنکھیں پونچھ ڈالیں اور امی کے کمرے کے
امنے سے آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی ہوئی اپنے پلنگ پر آلیٹی۔

صُبح، باجوں اور شہنائیوں کی آوازوں سے اس کا دل ڈولنے لگا۔ اُس کا کمرہ الھڑ لڑکیوں اور البیلی سہیلیوں سے کلبلا رہا تھا۔
ات میں آئی ہوئی کچھ نوعمر لڑکیاں بھی اب دُلھن کو دیکھنے کے شوق میں دیوانی ہو رہی تھی اور پھر اُس کی چند بے تکلف سہیلیوں نے
ے کے دروازے بند کر کے اُسے دُلھن بنانا شروع کیا۔ عروسی جوڑا پہنے، عطر میں نہائے، سولہ سنگار کئے وہ خاموشی سے بیٹھی تھی کہ
حت کو شرارت سوجھی۔ اُس نے اس سے کہا: "آؤ میں تمھیں دُلھن دکھاؤں ــ" اور پھر اُسے اٹھا کر سنگار میز کے سامنے لے گئی۔ قدِ
دم آئینے میں اُس نے اپنے آپ کو دُلھن بنے دیکھا اور اسے اپنے آپ سے نفرت ہو گئی۔ اُس کا بے اختیار رونے کو جی چاہا۔ پھر اس
ے ماموں نے اُس کے سر پر پھولوں کا سہرا باندھ دیا اور وہ گھونگھٹ میں مُنہ چھپائے، سر جھکائے کھڑی رہی۔

پھر شہنائی گونجنے لگی اور میراثنوں نے وداع کا گیت گانا شروع کیا۔ اب وہ سہیلیوں کے جھُرمٹ میں امّی کے کندھے سے لگی ماموں
سہارا لئے آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ سب کی آنکھیں پُرنم تھیں۔ شہنائی گونج رہی تھی، اُس کی امّی زار زار رو رہی تھی سہیلیوں
ں آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے اور ان سب کے درمیان وہ دُلھن بنی آہستہ آہستہ قدم اُٹھا رہی تھی۔ اُسے محسوس ہوا جیسے
ندگی کی ہر چیز دُور ہوتی جا رہی ہے اور جب اُس نے کمرے کی دہلیز سے باہر قدم رکھا تو برآمدے کے آگے پھُولوں سے سجی سجائی موٹر کھڑی
تھی۔ اُس کے ماموں نے اُسے موٹر میں بٹھاتے ہوئے خدا حافظ کہا اور وہ ایک مُردہ جسم کی طرح دھم سے سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اُس
ے دائیں طرف کوئی زری کی اچکن پہنے بیٹھا تھا۔ شہنائی کی چیخ پھر بلند ہوئی اور موٹر کے ہچکولے سے اس کا جسم زری کی اچکن سے
چھو گیا۔ وہ تڑپ کر پیچھے ہٹی اور اس کی ساس نے اُس کا سر پیار سے اپنے شانے سے لگا لیا اور اُسے محسوس ہوا جیسے اب وہ
عُمر بھر اسی آتش کدے میں جلتی رہے گی۔

اعجاز حسین بٹالوی

(حلقۂ اربابِ ذوق میں پڑھا گیا)

برابر کا تول

اُصولِ مہر و اُلفت سے نہ وہ غافل نہ میں غافل — دبستانِ محبت میں نہ وہ جاہل نہ میں جاہل
میں اپنے ذوق سے واقف وہ اپنے حسن سے واقف — بحدِ صورت و سیرت نہ وہ سایل نہ میں سایل
وفا کے معجزہ کا اعتراف اُن کو بھی مجھ کو بھی — تصنّع کی کرامت کے نہ وہ قایل نہ میں قایل
محبت اُن کی لاثانی صداقت میری لافانی — حقیقت ہی حقیقت ہے نہ وہ باطل نہ میں باطل

خوشامد، التجا، منّت سماجی، آرزومندی
ظواہر ہیں — ظواہر کی کریں ہم خاک پابندی

مقامِ اُنس و عرفاں میں رہیں آزاد ہم دونوں — مثالِ اُنث نئی رسمیں کریں ایجاد ہم دونوں
وہ روٹھیں میں مناؤں وہ ہنسیں میں قہقہہ ماروں — وہ جائیں میں بلاؤں یُوں رہیں دلشاد ہم دونوں
وہ چُپ سادھیں میں چُپ سادھوں نہ وہ چھیڑیں نہ میں چھیڑوں — جہانِ کیف کو یُوں بھی کریں آباد ہم دونوں
محبت زندہ باد اب تک شگفتہ دل ہیں جس ڈھب سے — اسی ڈھب سے رہیں ناواقفِ فریاد ہم دونوں

"تفوّق" ہے پیامِ جنگ، ہم دونوں پر بھی ہیں
"عقابی جنگ نامہ" سے نہ وہ راضی نہ خوش ہوں میں

میں اُن کے ناز اُٹھاؤں اور میرا دل وہ بہلائیں — غرور انگیز شاہانہ نہ میں گاؤں، نہ وہ گائیں
اکیلے پھول چُن لیں باغ میں تو خیر چُن بھی لیں — مگر تنہا پئے گلگشت میں جاؤں نہ وہ جائیں
گِلہ کرنا تو جائز ہی نہیں ہے فرض ہے لیکن — زباں پر شکوۂ بے جا نہ میں لاؤں نہ وہ لائیں
انھیں سوگند میں دُوں حسن کی وہ مجھ کو اُلفت کی — قسم لیلا و مجنوں کی نہ میں کھاؤں نہ وہ کھائیں

بآئینِ خرد میں بھی وفا کا دم بھروں وہ بھی
غرض، قانونِ فطرت کا ادب میں بھی کروں وہ بھی

علی منظور

مُشکل پسند شاعر

بال ایسے ریشمیں کہ گھونگر نثار ہونے کو تڑپیں مگر چہرہ پھیکا، نگاہیں بے ذوق۔ شاعر یہ کہہ کر محفل سے اُٹھ گیا ـــ "ضروری نہیں کہ کالی گھٹا میں بجلیاں بھی ہوں۔"

۲

چہرہ سڈول، کمر میں لچک مگر آواز میں بھینس کے دودھ کا اثر۔ شاعر کانوں میں انگلیاں دیتا ہوا بھاگا۔ پوچھا کہ کیوں گھبرائے؟ بولا خوشنما ساز سے گیدڑوں کا شور کون سنے؟

۳

رنگ کھلا، آنکھوں میں چمک، مگر دانت گویا کھجور کی گٹھلیاں۔ شاعر اپنے دل کا قیمہ بنتے نہ دیکھ سکا۔

۴

نورانی چہرے میں ہونٹوں کی جگہ گلاب کی پتیاں لگا کر فطرت اترائی رہی۔ مگر گردن بنانا بھول گئی۔ یوں معلوم دیتا تھا کہ مٹی کے گھڑے پر خوبصورت پری کا سر ہے۔ فطرت کی کوتاہیوں پر توبہ توبہ کرتے ہوئے مُنہ پھیر کر چل دیا۔

۵

دیکھنے سننے کو کافی دلکش یعنی موزوں قد کے ساتھ آواز میں رَس مگر گفتگو نوکروں کی بدعنوانیوں اور آلو بھنڈی کے بھاؤ تک محدود۔ اُدھار گذارہ کرنے والے شاعر نے آہ بھری اور حُسن کی دنیا کو خیرباد کہہ کر سیاسی اکھاڑوں کی سیر شروع کی۔

۶

تاریخیں، اخبار، سرکاری گزٹ تو گھر میں دیکھتا مگر حالات حاضرہ کے لئے شاعر نے مہاتماؤں کے، پنڈتوں کے، مولاناؤں کے حاشیہ نشینوں سے ربط بڑھایا۔ کیا کیا دنگل اُس نے نہ دیکھے۔ فقیر صاحب اپنی کی کرامات کا قائل ہُوا، مہاتما گاندھی کی صداقت کا کلمہ پڑھنے لگا۔ مولانا آزاد کی تقریروں میں عش عش کرتے سال وماہ گزارے مگر آخران مجلسوں سے بھی یہ کہہ کر چل دیا۔

"بہت گہرے لوگ ہیں۔ چوک میں بیٹھیں تو خدا جانے کیا کچھ نہ کمالیں؟ بڑے آدمی ہیں مگر انسان ہرگز نہیں۔ وقتی ضروریات کو پوجنے والے مفید ہوں تو ہوں رُوحانی صداقت سے کوسوں دُور ہیں۔"

۷

حُسن اور سیاسیات دونوں سے بیزار ہو کر ایک مشہور ولی کامل کی خدمت میں حاضر ہُوا۔ حُسن پرستی میں شباب لُٹوا چکا تھا۔ سیاسیات کی دیت میں اخلاق سے عریاں ہو چکا تھا، دلِ زار کو ولی کامل کے قدموں پر پھینک یہ لفظ زبان پر لایا۔

"حضور میری مشکل پسندی کا علاج فرمایئے جو چند دن زندگی کے ہیں کچھ تو دیکھ لوں۔"

ولی ۔ اس کی تلاش کرو جو تمھارے خیال میں ہر معنی میں مطلقاً نا اہل ہو۔

شاعر ۔ حضرت مجھے یہ ارشاد کیا ہوا؟ ادیبوں کے طبقے سے قدرے تعلق رکھتا ہوں۔ کئی قطعی نا اہل کافی نامور ہیں۔

برابر کا تول

اُصولِ مہر و اُلفت سے نہ وہ غافل نہ میں غافل
دبستانِ محبت میں نہ وہ جاہل نہ میں جاہل

میں اپنے ذوق سے واقف وہ اپنے حُسن سے واقف
بحدِ صورت و سیرت نہ وہ سایل نہ میں سایل

وفا کے معجزہ کا اعتراف اُن کو بھی مجھ کو بھی
تصنّع کی کرامت کے نہ وہ قایل نہ میں قایل

محبت اُن کی لاثانی صداقت میری لافانی
حقیقت ہی حقیقت ہے نہ وہ باطل نہ میں باطل

خوشامد، التجا، منّت سماجی، آرزو مندی
ظواہر ہیں — ظواہر کی کریں ہم خاک پابندی

مقامِ اُنس و عرفاں میں رہیں آزاد ہم دونوں
مثالاً نت نئی رسمیں کریں ایجاد ہم دونوں

وہ رُوٹھیں میں مناؤں وہ ہنسیں میں قہقہہ ماروں
وہ جائیں میں بلاؤں یُوں رہیں دلشاد ہم دونوں

وہ چُپ سادھیں میں چُپ سادھوں وہ چھیڑیں میں چھیڑوں
جہانِ کیف کو یُوں بھی کریں آباد ہم دونوں

محبت زندہ باد۔ اب تک شگفتہ دل ہیں جس ڈھب سے
اسی ڈھب سے رہیں ناواقفِ فریاد ہم دونوں

"تفوّق" ہے پیامِ جنگ، ہم دونوں پریمی ہیں
"عقابی جنگ نامہ" سے نہ وہ راضی نہ خوش ہوں میں

میں اُن کے ناز اُٹھاؤں اور میرا دل وہ بہلائیں
غرور انگیز شاہانہ نہ میں گاؤں، نہ وہ گائیں

اکیلے پھول چُن لیں باغ میں تو خیر چُن بھی لیں
مگر تنہا پئے گلگشت میں جاؤں نہ وہ جائیں

گِلہ کرنا تو جائز ہی نہیں ہے فرض ہے لیکن
زباں پر شکوۂ بے جا نہ میں لاؤں نہ وہ لائیں

انھیں سوگند میں دُوں حُسن کی وہ مجھ کو اُلفت کی
قسم لیلا و مجنوں کی نہ میں کھاؤں نہ وہ کھائیں

بآئینِ خرد میں بھی وفا کا دم بھروں وہ بھی
غرض، قانونِ فطرت کا ادب میں بھی کروں وہ بھی

علی منظور

مُشکل پسند شاعر

بال ایسے ریشمیں کہ گھونگر نثار ہونے کو تڑپیں مگر چہرہ پھیکا، نگاہیں بے ذوق۔ شاعر یہ کہہ کر محفل سے اُٹھ گیا ــــ "ضروری نہیں کہ ہر کالی گھٹا میں بجلیاں بھی ہوں۔"

۲

چہرہ سڈول، کمر میں لچک مگر آواز میں بھینس کے دودھ کا اثر۔ شاعر کانوں میں انگلیاں دیتا ہوا بھاگا۔ پوچھا کہ کیوں گھبرائے؟ بولا "خوشنما ساز سے گیدڑوں کا شور کون سنے؟"

۳

رنگ کھلا، آنکھوں میں چمک، مگر دانت گویا کھجور کی گٹھلیاں۔ شاعر اپنے دل کا قیمہ بنتے نہ دیکھ سکا۔

۴

نورانی چہرے میں ہونٹوں کی جگہ گلاب کی پتیاں لگا کر فطرت اتراتی رہی۔ مگر گردن بنانا بھول گئی۔ یوں معلوم دیتا تھا کہ مٹی کے گھڑے پر خوبصورت گجری کا سر ہے۔ فطرت کی کوتاہیوں پر توبہ توبہ کرتے ہوئے مُنہ پھیر کر چل دیا۔

۵

دیکھنے سننے کو کافی دلکش یعنی موزوں قد کے ساتھ آواز میں رَس مگر گفتگو نوکروں کی بدعنوانیوں اور آلو بھنڈی کے بھاؤ تک محدود۔ اُدھار پر گذارہ کرنے والے شاعر نے آہ بھری اور حُسن کی دنیا کو خیرباد کہہ کر سیاسی اکھاڑوں کی سیر شروع کی۔

۶

تاریخیں، اخبار، سرکاری گزٹ تو گھر میں دیکھتا مگر حالاتِ حاضرہ کے لئے شاعر نے مہاتماؤں کے، پنڈتوں کے، مولاناؤں کے حاشیہ نشینوں سے ربط بڑھایا۔ کیا کیا دنگل اُس نے نہ دیکھے۔ فقیر صاحب اپی کی کرامات کا قائل ہُوا، مہاتما گاندھی کی صداقت کا کلمہ پڑھنے لگا۔ مولانا آزاد کی تقریروں پر عش عش کرتے سال و ماہ گزارے مگر آخر ان مجلسوں سے بھی یہ کہہ کر چل دیا۔

"بہت گہرے لوگ ہیں۔ چوک میں بیٹھیں تو خدا جانے کیا کچھ نہ کما لیں؟ بڑے آدمی ہیں مگر انسان ہرگز نہیں۔ وقتی ضروریات کو پُوجنے والے مفید ہوں تو ہوں رُوحانی صداقت سے کوسوں دُور ہیں۔"

۷

حُسن اور سیاسیات دونوں سے بیزار ہو کر ایک مشہور ولی کامل کی خدمت میں حاضر ہُوا۔ حُسن پرستی میں شباب لُٹوا چکا تھا۔ سیاسیات کی محویت میں اخلاق سے عریاں ہو چکا تھا، دلِ زار کو ولی کامل کے قدموں پر پھینک یہ لفظ زبان پر لایا۔

"حضور میری مشکل پسندی کا علاج فرمایئے جو چند دن زندگی کے ہیں کچھ تو دیکھ لوں۔"

ولی ۔ اس کی تلاش کرو جو تمہارے خیال میں ہر معنی میں مطلقاً نااہل ہو۔

شاعر ۔ حضرت مجھے یہ ارشاد کیا ہوا؟ ادیبوں کے طبقے سے قدرے تعلق رکھتا ہوں۔ کئی قطعی نااہل کافی نامور ہیں۔

ولی۔ کیا مطلب؟

شاعر۔ حضور! صحیح ادب مشین کے پرزوں کی طرح نہیں کہ ٹاٹا کے کارخانے میں ہزاروں کی تعداد میں چند ہفتوں میں تیار ہو سکے۔ فرانس میں ضرور ایک آدھ دفعہ یہ ہو چکا ہے کہ ایک مشہور افسانہ نویس نے معمولی انشا پردازوں سے اُجرت پر کام کروالیا اور پھر اُن کی تحریر کو اصلاح کے بعد اپنے نام سے شائع کرادیا۔ کتابیں خوب بکیں، افسانہ نویس کا نام اور زیادہ چمکا۔ ہمارے یہاں بھی جنگ کے آخری دو سالوں میں روپیہ سستا تھا۔ کتابیں مہنگی تھیں۔ بعض لکھنے والوں کی تین تین روپے میں ایسی کتابیں فروخت ہوئیں جو ۱۹۳۰ء سے پہلے کوئی بارہ آنے میں بھی نہ لیتا۔ بعض مطبع والوں نے تو پبلک کو ایسا احمق بنایا ہے کہ پبلک بھی یاد رکھے گی۔ پاکستان پر درجنوں کتابیں لکھوا کر دام کھرے کرلئے۔ لکھنے والوں کو کچھ مل گیا۔ پڑھنے والوں کے پلّے کچھ بھی نہ پڑا۔ یہ اس لئے عرض کر رہا ہوں کہ آج کل ایک رَو ہے جس کا انگریزی نام ہے industrialisation of literature یہ رَو اُردو پر بھی حملہ آور ہے۔ گو خوددار مصنف صرف سخن شناس طبقے کے لئے قلم اُٹھاتے ہیں۔ مجھے از راہِ کرم اُن کی طرف نہ دھکیلیں جن سے میں پہلے ہی اُکتا چکا ہوں۔

ولی۔ کیا تم نے کوئی ایسا انسان بھی دیکھا ہے جس میں قطعی کسی قسم کی خوبی نظر نہ آئے۔

شاعر۔ یہ تو ناممکن ہے۔ قاتلوں تک میں خوبیاں ہوتی ہیں۔

ولی۔ بہرحال میرے پاس صرف ایک ہی نسخہ ہے اور وہ یہ کہ ایسی ہستی کی تلاش کرو جو ہمہ تن عیب ہو۔

شاعر۔ اس تلاش سے مجھے کیا ملے گا؟

ولی۔ سچے دل سے تلاش کروگے تو بہت کچھ مل جائے گا۔

شاعر۔ کچھ پتہ تو چلے!

ولی۔ زیادہ پُوچھ گچھ نہ کرو۔

شاعر۔ تجسس میری فطرت ہے۔

ولی۔ قسمت کا لکھا قبل از وقت نہ پڑھو۔

شاعر۔ وہ شاعر کیا جو قسمت سے جُوا نہ کھیلے۔

ولی۔ (مجذوبانہ لہجے میں) آنکھیں بند کرو اور پڑھو کہ آسمان پر کیا لکھا ہے؟

(شاعر آنکھیں بند کرتا ہے۔ آسمان کی تحریر اسے صاف دکھائی دیتی ہے۔ جلی قلم سے مندرجہ ذیل تحریر چمک رہی ہے)

"عقل جائے گی خدا ملے گا!"

اُس دن سے وہ شاعر دیوانہ شمار کیا جاتا ہے۔

ولی کوئی اور نہ تھا، شاعر کی غیر شعوری زندگی کا خیالی مجسمہ تھا۔ شاعر حُسن سے، حکومت سے، رسمی ادب سے بالاتر ہو گیا۔

فلک پیما

غزل

مجالِ صبر نہیں تابِ انتظار نہیں — وہ جائیں اب مجھے اپنا بھی اعتبار نہیں

کسی سے تیرا کوئی عہد استوار نہیں — میں بے قرار سہی تجھ کو بھی قرار نہیں

یہ اختیار میسّر کہ چاہتا ہوں تجھے — اور اس پہ جبر کہ تجھ پر کچھ اختیار نہیں

رُکی رُکی ہوئی باتیں جُھکی جُھکی آنکھیں — مگر یہ دل ہے کہ اب تک بھی شرمسار نہیں

وہ تُو کہ تیری ہنسی زہر خند ہے واعظ — یہ مَے کہ تلخ ہے اور پھر بھی ناگوار نہیں

ستارے شمع بکف منتظر ہیں صف بستہ — یہ کہکشاں کہیں اُن کا تو رہگذار نہیں

وہ تیرا اپنا فرشتہ وہ دشمنِ آدم — میں کیا کروں کہ تجھے اُس پہ اختیار نہیں

ترے کرم کی قسم تیری بخششوں کے طفیل — گناہ گار ہے وہ جو گناہ گار نہیں

قدم قدم پہ ہیں پھانسیں یہاں وہاں صیاد — بہار نام ہے کس کا جو یہ بہار نہیں

چمن تو پیشِ نظر ہے میں پر شکستہ سہی — یہ آشیاں تو ہے گو مجھ کو سازگار نہیں

بندھے ہوئے ہیں مراتب کچھ اس طرح کہ یہاں — ذلیل و خوار ہے وہ جو ذلیل و خوار نہیں

"میں کچھ نہیں مرے اشعار کچھ نہیں" تاثیر
یہ سب طلب ہے ستائش کی انکسار نہیں

تاثیر

سُورج دیوتا کا پہلا پیار

کوہ پارنے سس[1] یونان کا وہ پہاڑ تھا جسے دیوتاؤں نے مقدس قرار دے دیا تھا۔ اور جس پر کئی بڑے بڑے دیوتاؤں کا مسکن بھی بتایا جاتا تھا
ں پہاڑ کے ایک غار میں ایک بہت بڑا اژدہا پیدا ہو گیا تھا جس نے چاروں طرف رہنے والے انسانوں کی جانیں عذاب میں مبتلا کر رکھی تھیں
ں علاقے میں سے وہ گزر جاتا اُس کے پیچھے تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نظر نہ آتا کیونکہ گھاس پھوس، پتے جھاڑیاں، درخت، کھیتی باڑی کے
ادہ جو زندہ چیز بھی اُس کے سامنے پڑتی اس کی غذا بن جاتی۔ کچھ عرصے کے بعد اس علاقے کے رہنے والوں نے سخت تنگ آ کر دیوتاؤں سے
یاد کی اور بار بار ہر ایک دیوتا کے مندر میں اس پر تقاضا ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ اپالو سورج دیوتا نے ایک روز غصے میں آکر اپنی کمان
ھالی اور شعلہ دار نوک والے تیر سے اژدھا کا خاتمہ کر دیا۔

اس کارنمایاں کے بعد وہ اپنے مسکن کو واپس جا رہا تھا کہ راستے میں اُس نے کیوپڈ (پیار دیوتا) کو دیکھا، جو ایک دریا کے کنارے بیٹھا
ی کمان اور تیروں سے کھیل رہا تھا۔ یہ اس سے مخاطب ہوا اور کہنے لگا "اے لڑکے تجھے تیر و کمان سے کیا واسطہ؟ یہ ہم جیسے جوانوں کے
ئے ہے۔ دیکھ میں ابھی کوہ پارنیس کے اژدھا کو قتل کر کے آیا ہوں۔ تو اپنی مشعل سے کھیلا کر اور جہاں چاہے آگ لگا دیا کر۔ لیکن تیر و کمان
یرے ننھے ہاتھوں کے لئے موزوں نہیں۔"

کیوپڈ نے مُسکرا کر اپالو کی طرف دیکھا۔ اپنے تیروں میں سے ایک نوکدار سُنہرے پھل والا تیر چُن کر کمان میں لگایا اور کہا ــــ "دیوتا! تجھے
پنے ہی تیروں کا حال معلوم ہے۔ میرے تیر کی طاقت معلوم نہیں۔ دیکھ میرا تیر کیا کچھ کر سکتا ہے ــــ" یہ کہہ کر اُس نے ظاہرا بے پروائی سے تیر چلایا
جو اپالو کے دل میں پیوست ہو گیا۔ دیوتا حیران ہو کر ابھی وہیں کھڑا دیکھ رہا تھا کہ کیوپڈ نے اپنے ترکش میں سے ایک تیر نکالا جس کا پھل سیسے کا
تھا اور نوک گول کر دی گئی تھی، تاکہ اس سے زخم نہ لگے اور چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ دریا کے کنارے دُور اس دریا کے دیوتا کی لڑکی
ڈافنی[2] اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ اُس کی طرف کمان پھیر کر کیوپڈ نے دوسرا تیر چلایا جو لڑکی کو لگا لیکن لگ کر زمین پر گر گیا۔ وہ لڑکی
اور اُس کی سہیلیاں ہنستی ہوئی بھاگ گئیں۔

اب سنہری پھل والے تیر کی خاصیت تو یہ تھی کہ جس کو لگے وہ محبت میں گرفتار ہو جاتا تھا۔ لیکن سیسے والے تیر میں یہ اثر تھا کہ جس کو لگے
اُسے محبت سے نفرت ہو جاتی تھی۔ چنانچہ اپالو دیوتا جہاں ڈافنی کے پسینے پر خون بہانے کو تیار تھا، ڈافنی اس کی صورت سے بھاگتی تھی اور
دوسرے نوجوانوں کو بھی جو اسے چاہتے تھے اپنے قریب آنے کا کوئی موقع نہ دیتی تھی۔ اس کا تمام دن چند سہیلیوں کے ساتھ باغوں میں دریا
کے کنارے پر یا جنگل میں شکار کی تلاش میں پھرتے گزر جاتا تھا۔ اُس کا باپ دریا کا دیوتا کئی مرتبہ منت سماجت کرتا اور کہتا بٹیی! مجھے اپنی نسل
قائم رکھنے کی خواہش ہے۔ جس سے تو چاہے شادی کر لے۔ لیکن وہ جواب میں یہی کہتی کہ آبا مجھ سے یہ بات مت کہو اور جو حکم دو میں بجا لانے
کو تیار ہوں ــــ"

ادھر اپالو دیوتا اس کی محبت میں گھلا جا رہا تھا اور جس کے مندر میں جہان بھر کے آئندہ کے متعلق سوالوں کے جواب ملتے تھے وہ اپنے آئندہ
سے بے خبر تھا اور نہ جانتا تھا کہ اُس کی ناکام محبت کا نتیجہ کیا ہو گا وہ ڈافنی کے بکھرے ہوئے اور ہوا میں اُڑتے ہوئے بالوں کو دیکھتا تو کہتا کہ جو بال

[1] پارنے سس Parnassus، (۲) ڈافنی Daphne

بکھرے ہوئے ایسے بھلے معلوم ہوتے ہیں وہ بنے ہوئے کیسے ہوں گے۔ وہ اس کی ستاروں کی طرح چمکتی ہوئی آنکھوں کو دیکھتا تو کہتا کہ یہی آنکھیں اگر کسی کی طرف محبت سے دیکھیں تو کیا ہو۔ وہ اس کے سُرخ گلاب کی کلی جیسے مُنہ اور ہونٹوں کی طرف دیکھتا تو کہتا کیسا خوش قسمت ہوگا وہ نوجوان جس کے ہونٹ ان سے چھو جائیں گے' وہ اس کا پیچھا کرتا' وہ بھاگتی اور اس کی منت سماجت کی کوئی پروانہ کرتی۔ وہ رُک جاتا اور بلند آواز سے کہتا کہ اگر دوڑنا ہی ہے تو آہستہ دوڑو تاکہ تمھیں چوٹ آنے کا اندیشہ نہ ہو۔ میں کوئی معمولی دیوتا نہیں ہوں' ڈیوس دیوتا کا لڑکا ہوں اور اتنا طاقتور کہ تمام دُنیا کو آناً فاناً اندھا کر سکتا ہوں۔ میرا علم گزشتہ' موجودہ اور آئندہ اوقات پر حاوی ہے۔ موسیقی میری غلام ہے۔ کوئی تیر میرے تیروں سے زیادہ صحیح نشانے پر نہیں بیٹھتا۔ لیکن افسوس کہ میرے دل کو جس تیر نے زخمی وہ میرے تیروں سے بھی زیادہ مہلک ہے۔ میں علم طب کا دیوتا ہوں اور ہر بیماری کا علاج کر سکتا ہوں لیکن افسوس میرے مرض کی کوئی دوا نہیں۔

اس طرح گھنٹوں اپالو دیوتا ڈافنی کا پیچھا کرتا لیکن وہ اُس کی باتیں سننے کے لئے ایک لمحہ کے لئے بھی نہ رکتی۔ یہاں تک کہ رات ہو جاتی ڈافنی شکار اور چاند کی دیوی ڈائنا[1] کی چہیتی خواصوں میں تھی۔ وہ اس کے پاس چلی جاتی اور اس کے ساتھ چاندنی رات میں شکار کھیلتی اُسے محبت یا مرد کے نام سے نفرت تھی اور جب اُس کی سہیلیاں اُسے اس بات پر چھیڑتیں تو مُنہ بنا کر کہتی "واہ! مرد کی ذات کس کام کی ہے"۔ کچھ عرصہ اس طرح گزرا لیکن آخر کار اپالو سے برداشت نہ ہو سکا جو طاقتور دیوتا تھا اور اپنی خواہشات کی تکمیل میں انتظار کرنا نہ جانتا تھا ایک روز تہیہ کر کے نکلا۔ ڈافنی اس کو دیکھتے ہی خوف کے پروں پر سوار ہو کر ہوا ہو گئی لیکن آج اپالو نے اپنی رفتار کو ڈافنی کی رفتار کے مطابق روک کر اُسے ہلکا نہ کیا اور لحظہ بلحظہ اُس کے قریب ہونے لگا۔ ڈافنی نے بھی دوڑنے میں پوری طاقت صرف کر دی لیکن کہاں تک جب اس نے جان لیا کہ اب بچ نہیں سکتی تو دریا کے کنارے کی طرف بھاگی اور وہاں پہنچ کر اپنے باپ کو آواز دی۔ "ابا! مجھے بچا لے' میں زندہ نہ رہوں تو کچھ پروا نہیں۔ مجھے اس مرد کے ہاتھوں سے بچا لے ــــ!"

وہ بمشکل اس قدر کہہ پائی تھی کہ اُس کے قدم زمین میں جم گئے' جسم پر نرم و نازک کھال پیدا ہو گئی۔ بازوؤں کی شاخیں اور بالوں کے پتّے بن گئے اور سوا حسن کے جو درخت کی شکل میں ہی بدستور موجود تھا انسانی جسم کا کچھ حصہ باقی نہ رہا۔ اپالو اس کے تنے سے لپٹ گیا۔ اس کی شاخوں پر سیکڑوں بوسے دیئے۔ تڑپا' تلملایا' لیکن مجبور ہو کر آخر کار بلند آواز سے کہنے لگا۔ اچھا ڈافنی تو میری بیوی نہ بن سکی لیکن میں تجھے اپنا خاص پودہ بناتا ہوں۔ میں خود تیرے پتوں کا تاج پہنوں گا اور زمانہ آئندہ میں جب روما کے عظیم الشان فاتح اپنی جہانگیر فوجوں کے آگے آگے فتح کے جشن میں اپنے شہر کے دروازے میں داخل ہوں گے تو تیرے پتوں[2] کا گندھا ہوا حلقہ اُن کی پیشانی کو سجائے گا۔

عطاء الرحمٰن

[1] ڈائنا Diana [2] Laurel اس درخت کا نام جسے اپالو نے اپنا بنایا

ڈیشتان

اس مُلک کے ہر شہر میں گندا نالہ موجود ہے بلکہ ہر شہر بجائے خود گندا نالہ ہے۔ یعنی ہوا کثیف' پانی میلا' جسموں پر پھٹے پرانے لتّے' زبانوں پر فواحشات' دلوں میں غلیظ کدورتیں' ہاتھوں سے بے گناہ خون' فوج ایسی کہ اہلِ وطن کو مارے' حکام ایسے کہ ڈاکوؤں کے مدّاح' شاعر نے خوب لکھا ع

سارے جہاں سے گندا ڈیشتاں ہمارا

فلک پیما

غزل

دشوار تھے جو لمحے غمِ روزگار کے
آساں بنا لئے ترے غم میں گذار کے

ہر دم پکارتے تھے کہ شاید کوئی سنے
چپ ہیں کہ تھک گئے ہیں کسی کو پکار کے

میں ہوں گنا ہگار گناہوں کا ذکر کیا
کچھ جبر کے طفیل ہیں کچھ اختیار کے

شاید نشانِ منزلِ مقصود بن سکیں
یہ نقش سجدہ ہائے سرِ رہگذار کے

روئیں گے ہم گزشتہ بہاروں کی یاد میں
آئے بھی لوٹ کر جو کبھی دن بہار کے

قائم اسی روش پہ ہیں تیرے نیاز مند
اور وہ بھی باوجود غمِ روزگار کے

سوئیں گے حشر تک کہ سبکدوش ہو گئے
بارِ امانتِ غمِ ہستی اُتار کے

گر ساتھ دے سکیں یہ پریشانیاں حفیظؔ
جائیں گے زلفِ شاہدِ ہستی سنوار کے

حفیظ ہوشیارپوری

غزل

(جو ۶ دسمبر ۱۹۴۷ء کو "ترقی پسند مصنفین" کے مشاعرے میں پڑھی گئی)

جنوں میں شیخ و برہمن ہیں کس قدر کامل
ہزار قافلۂ بے نشان و بے منزل

کچھ اس طرح سے بہار آئی ہے کہ بجھنے لگے
ہوائے لالہ و گُل سے چراغِ دیدہ و دِل

رواں ہے قافلۂ بے درا و بے مقصود
جو دل گرفتہ ہیں اہی تو رہنما غافل

یہ اضطراب، یہ شوقِ عروسِ آزادی
اُٹھا کے دیکھ تو لینا تھا پردۂ محمل

حدیثِ دردِ بجز "قتلِ محض" کچھ بھی نہیں
نہ چھیڑ "قصۂ مقتول" و "مقتل" و "قاتل"

یہ بات کہہ کے ہوا ناخدا الگ مجھ سے
یہ ہے سفینہ، یہ گرداب ہے، وہ ہے ساحل

میں اپنے حال کو ماضی سے کیوں کہوں بہتر
اگر وہ حاصلِ غم تھا تو یہ غمِ حاصل

میانِ عشق و ہوس ہے مقامِ قلب و نظر
نہ عشق عینِ حقیقت نہ ہے ہوس باطل

سُنا رہا ہوں برنگِ غزل زمانے کو
حکایتِ غمِ دوراں، فسانۂ غمِ دل

تڑپ رہا ہے کہیں پھر مری نظر کے لئے
جو حُسن تھا مرے ذوقِ نگاہ کا حاصل

یہ کہہ رہی ہے مرے بام و در کی تاریکی
وہ جلوے آج بھی ہیں میری بزم کے قابل

چلے گئے جو حریفانِ دلنوازِ حفیظ
اب اُن کا ذکر ہے اور یادِ گرمیٔ محفل

حفیظ ہوشیارپوری

ننھی کرن

"انسان بُزدل ہے، بزدل۔" سہیل کا یہ فیصلہ ہمیں اچنبھے میں ڈال گیا۔ انسانیت پر اتنا بڑا الزام اور وہ بھی سہیل لگائے جو انسان کی بزرگی کا قائل تھا۔ کسی نے اُس کی تائید نہ کی اور سب چُپ رہے۔

ہم لوگ کافی ہاؤس میں بیٹھے تھے، جہاں اب نہ رونق تھی اور نہ وہ مانوس چہرے۔ صاف وشفاف ہال، خوبصورت فرنیچر ہال کی بےکسی کو زیادہ نمایاں کر رہا تھا۔

"بھائی" میں نے کہا۔ "اتنے عرصے کے بعد کافی ہاؤس کھُلا ہے اور تم انسانیت کی بُزدلی کا قصہ لے بیٹھے ہو۔ چھوڑو اس قصے کو، کہو کیا کھاؤ گے؟ چکن سینڈوچ، فرائی انڈے، چاپ ــــ"

"تم بھی بزدل ہو" سہیل نے فتویٰ دیا۔ "میں کہتا ہوں ہم سب بزدل ہیں، حقیقت کا سامنا نہیں کر سکتے۔"

ہم نے مل کر زور سے قہقہہ لگایا، جو خالی ہال میں گونجا۔ اس گونج میں یاس کی سی کیفیت پیدا ہوئی۔ کونٹر سے نوجوان منیجر نے ہمیں دیکھا۔ بیرے ہماری طرف متوجہ ہوئے۔ یہ سب لوگ نئے آئے تھے انھیں کیا معلوم کہ اس ہال میں ایسے کتنے قہقہے بلند ہوا کرتے تھے۔

میں نے کافی کا آرڈر دیا۔

"قہقہہ لگاتے شرم نہیں آئی" سہیل بولا۔ "بزدل ہمیشہ قہقہہ لگاتا ہے۔"

کافی آگئی، احمد اسے پیالیوں میں ڈالنے لگا اور بات ٹالتے ہوئے بولا۔ "جانے کب یہ کافی ہاؤس پھر آباد ہو گا، ایک وہ زمانہ تھا جب جگہ کے لئے پہروں انتظار کرنا پڑتا اور آج یہ خالی ہال کھانے کو آ رہا ہے۔"

میں نے گرم گرم گھونٹ کا مزا لیتے ہوئے لقمہ دیا۔ "عرصے کے بعد آج کھُلا ہے، رونق ہو جائے گی۔"

"رونق ہو جائے گی۔" سہیل نے میرا فقرہ کچھ اس طرح دہرایا کہ مجھے بُرا لگا۔ "زندہ انسانوں کی جگہ یہاں مُردے آئیں گے، مُردے۔"

"سہیل تم پاگل تو نہیں ہو گئے" احمد نے تنگ آ کر پوچھا۔ "آخر یہ کیا ہے؟ تم بات بات پر بگڑ رہے ہو۔"

"میں بگڑ نہیں رہا مجھے دکھ ہو رہا ہے، انسان کی بزدلی پر، اپنی بزدلی پر، اس خوف پر جو ہمارے دلوں میں جاگزیں ہے۔ انسان کے ذہنی جمود پر، جو ہزاروں سال بیت جانے کے بعد بھی اس پر طاری ہے۔ تم مجھے یہاں لے آئے ہو، میرے لئے یہ بات بہت اہمیت رکھتی ہے، یہ ایک تہذیبی مرکز تھا یہاں ایک نئی دنیا جنم لے رہی تھی جس کا مذہب انسانیت تھا اور آج یہ ایک خالی کمرے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ یہ میز، یہ کرسیاں جو کبھی زندگی سے سرشار تھیں اب پتھر سے زیادہ سخت اور سرد ہیں۔ یہ منیجر، یہ بیرے، انھیں کیا خبر کہ یہاں کونسی دُنیا آباد تھی؟"

"وہ ایک خیالی دنیا تھی، جو مٹ گئی" میں نے کہا۔ "اب ہم ایک حقیقت کا سامنا کر رہے ہیں۔ حالات کا تقاضا یہی ہے۔ انسان کو بزدل کہنا کسی حالت میں بھی روا نہیں، یہ بقا کے لئے کشمکش تھی۔"

"بقا کے لئے کشمکش ــــ" وہ غرایا۔ "ہزاروں سال کی تہذیب و تمدن کو برباد کر دینے کا نام تم کشمکش رکھتے ہو۔"

"یہ سب اور کیا تھا" ریاض ابھی خاموش کافی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ بولا:-

"کافی ہاؤس کی بربادی سے انسان بزدل نہیں بن جاتا۔"

"اگر ہم حالات کا جائزہ لیں" احمد نے کافی کا ایک گھونٹ لیتے ہوئے کہا "تو ہمیں معلوم ہوگا کہ یہاں دو قوموں کا سوال تھا۔ ایک ہر لحاظ سے دوسری پر فوقیت رکھتی تھی۔ اس کے پاس طاقت کے سارے سامان تھے اور دوسری تہی دست، ایک طاقت کے نشے میں مخمور دوسری کو زندگی کی بقا کی فکر، نتیجہ یہ انقلاب ہے۔ اسے بزدلی سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔"

"چند مکانوں کو جلا دینا انسانوں کا قتل کرنا انفرادی طور پر اس کی اہمیت ہے لیکن زمانے کے مقابلے میں اس کی اہمیت کیا ہے؟"

"سہیل بھئی! کافی ٹھنڈی ہو رہی ہے" ریاض نے توجہ دلائی۔ سہیل کی ان باتوں نے سارا مزا کرکرا کر دیا۔

"کافی بدمزا ہے" وہ بولا "جب تک ماحول نہ ہو کافی کا لطف نہیں آتا۔"

"ہاں تو تم نے کہا تھا" وہ میری طرف متوجہ ہوا "کہ زمانے کے سامنے اس ہنگامے کی کوئی اہمیت نہیں۔ مجھے اس سے بنیادی اختلاف ہے۔ تم زمانے کو اہمیت دیتے ہو اور میں انسان کو، تم قوم کی برتری اور کمتری کو دیکھتے ہو اور میں انسان کی فطرت میں جھانکتا ہوں۔"

"لیکن" میں نے ٹوکا "تم زمانے کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتے۔"

"میں انکار نہیں کرتا۔ جس چیز کو تم نظر انداز کر جاتے ہو میں اسے مقدم سمجھتا ہوں۔"

مال روڈ پر ایک شور بلند ہوا۔ لاریوں کی مہیب آواز نے کلام کا سلسلہ روک دیا۔ لاریوں کا ایک قافلہ پناہ گزینوں کو لئے جا رہا تھا۔ بے شمار تباہ حال لوگ ان لاریوں میں بھرے پڑے تھے۔ ہم بھی اٹھ کر کونٹر کے پاس نمائشی کھڑکی سے نظارہ کرنے لگے۔ دروازے میں منیجر اور بیرے راستہ روکے کھڑے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف لوگوں کا ہجوم تھا، ان میں کئی جانے والوں پر ہنس رہے تھے۔ یہ قافلہ کافی طویل تھا۔

"دیکھا تم نے انسانوں کا یہ قافلہ" سہیل بولا، ہم لوگ اپنی جگہ پر واپس آ چکے تھے۔ "یہ لوگ کہاں لے جائے جا رہے ہیں، خود جانے والوں کو بھی معلوم نہیں ہوگا۔ کتنے ہیں جو یہ جانتے ہوں گے کہ انھیں کس لئے گھروں سے اکھاڑ پھینکا جا رہا ہے۔ ان پر ہنسا جا رہا ہے۔" اس کی آواز بلند ہو گئی۔ "انسان کی عظمت کتنی ارفع ہے۔ وہ فطرت الٰہی پر پیدا کیا گیا، خدا کا نائب قرار پایا، ساری کائنات اس کے زیر نگین کی گئی فرشتوں نے اسے سجدہ کیا۔ یہ بلند و بالا انسان، مگر اب ـــــ"

"اور کافی پیو گے" میں نے اُسے روکنا چاہا، مگر وہ کب رکنے والا تھا۔

"ضرور! مگر گرم ہو" وہ بولا "میں ایک عرصے سے خاموش ہوں۔ اچھا ہوا تم لوگ مل گئے۔ میں باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ پرانی باتیں اُبھر رہی ہیں، وہ یادیں جو اس ہال سے وابستہ تھیں اُجاگر ہو رہی ہیں، وہ حسین لمحات جو ہم نے یہاں گزارے ہیں، نشتر بن کر ذہن میں چُبھ رہے ہیں۔"

"کافی کے بدلے تمھاری باتیں مہنگی نہیں" ریاض مسکرایا، اُس نے موضوع کی سنجیدگی اور تلخی کو کم کرنے کی کوشش کی۔ "لیکن اپنی چند حسین یادوں کی خاطر سارے انسانوں کو بزدل بنانا درست نہیں۔ لوگوں نے بہادری سے مقابلہ کیا۔ بقا کے لئے جدوجہد کی"

"جدوجہد نہیں! یہ خوف تھا۔ ہماری سیاست خوف پر مبنی ہے۔ ایک قوم دوسری کی برتری سے خائف ہے۔ دشمن نے اس سے فائدہ اٹھایا خوف سے انسان بزدل ہو جاتا ہے۔ بزدلی سے مردانگی نہیں درندگی پیدا ہوتی ہے ـــــ" وہ رُکا اور اُس نے کافی کے چند گھونٹ لئے۔ "ایک انسان کائنات کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ مہینوں ماں اُسے پیٹ میں اُٹھائے پھرتی ہے۔ ماں برسوں کی محنت سے اُسے پالتی پوستی ہے قدرت سامان مہیا کرتی ہے، وہ جوان ہوتا ہے۔ اُس کی فطری ودیعتیں بر روئے کار آتی ہیں۔ علم کے خزانوں سے اپنا حصہ لے کر وہ مالا مال ہوتا ہے اور تہذیب کی عمارت کو بلند کرنے میں لگ جاتا ہے۔ ایکا ایکی کسی کا نامعلوم ہاتھ اس کے سینے میں چاقو گھونپ دیتا ہے۔ وہی انسان جو ابھی کائنات کا ایک بہت بڑا شاہکار تھا اب لاش کی صورت میں پڑا ہے کوئی اُسے اٹھانے کی جرأت نہیں کرتا۔ کسی کی ہمت نہیں پڑتی کہ قاتل کو پکڑ لے ـــ"

اور کافی آگئی تھی، سہیل کا جوش بڑھ گیا۔ وہ پولیٹیکل سائنس کا ایم۔ اے تھا، اب وہ اقتصادیات کے ایم۔ اے کی تیاری کر رہا تھا کہ فسادات شروع ہو گئے۔ اس کا گھر بار لُٹ گیا۔ ساری جائداد تباہ کر دی گئی۔ حساس نوجوان کے لئے یہ سانحہ کوئی معمولی نہ تھا، اس کا مستقبل تاریک ہو گیا۔ کئی دن بعد وہ ہمیں ملا۔ ہم لوگ اُسے کافی ہاؤس لے گئے۔ وہ حق بجانب تھا، میں نے باتوں کا رُخ بدلنا چاہا۔ یہ موضوع خوشگوار نہ تھا۔ ہم لوگ مہینوں اس پر کھپاتے رہے ہیں۔ مستقبل کا ذکر چھیڑا تو وہ بولا۔ "مستقبل! میں اس سے مایوس ہوں۔ ہم لوگ مستقبل کے لئے سکیمیں بنایا کرتے تھے۔ ورندر، ستیہ ورت، بیدی اس میں حصہ لیتے رہے۔ مس تشکلا بھی اس میں شامل تھیں۔ ہم نے کئی اقتصادی پلان بنائے لائبریریاں چھان ماریں، بین الاقوامی قانون کی کتابیں دیکھیں۔ ہم عوام کی تعلیم کے منصوبے تیار کیا کرتے تھے۔ "پنچائتی زراعت" پر لٹریچر جمع کرتے تھے۔ مس تشکلا کا بوڑھا تایا پروفیسر ودیا ساگر، اُس نے ہماری راہ نمائی کا ذمہ لے رکھا تھا۔ وہ ایک تحقیقی مقالہ لکھ رہا تھا۔ اس نے اخبارات میں مضامین لکھے، ہماری اقتصادیات کے روشن مستقبل کی طرف توجہ دلائی —— مگر اُس کا انجام! درندوں نے اُسے بھی پھاڑ کھایا — اُس کے سارے کاغذات جلا دیئے، انھیں کیا معلوم کہ ان کاغذوں میں انہیں کی خوشحالی کے منصوبے تھے۔"

"سہیل! تم جذباتی ہو رہے ہو" ریاض بولا "تم خوب جانتے ہو کہ یہ کتنا بڑا انقلاب ہے۔ ایسے واقعات کا رُونما ہونا اتنی بڑی بات نہیں۔ جب طوفان بپھرتا ہے تو اس کی راہ میں جو آجائے وہ اُسے بہا لے جاتا ہے۔"

"میرے بھائی! تم ٹھیک کہتے ہو۔" سہیل نے درد انگیز لہجے میں کہا۔ "مگر میرا نقطۂ نگاہ اور ہے۔ ہم تو یہی جانتے ہیں کہ اس طوفان کو روکنے کے لئے ہمارے لیڈروں نے آپس میں سمجھوتا کر لیا تھا۔ ایک پارٹی نے تو خسارے پر سودا منظور کیا مگر اس کے باوجود یہ سب کچھ کیوں ہوا۔ لیڈروں نے امن کی اپیلیں کیں مگر اس کا اثر کچھ نہ نکلا۔ تہذیب و تمدن میں ترقی ہوئی، سائنس نے دنیا کو مسخر کر لیا۔ ذرات سے کام لیا جانے لگا۔ ہوا میں اُڑنا، پانی پر تیرنا آسان ہو گیا مگر خود انسان ابھی تک انسان سے ڈرتا ہے۔ اسی ڈر نے اسے بزدل بنا دیا۔"

"خوف اور بزدلی، ان دونوں کو گڈمڈ نہ کریں" احمد جو خاموشی سے کافی پینے میں مصروف تھا کہنے لگا۔ "خوف ایک بنیادی جبلت ہے اسے چھوڑا نہیں جا سکتا۔ موجودہ انقلاب میں جسے تم بزدلی کہتے ہو وہ جہد للبقا تھی۔"

"میں اسی جہد للبقا کا ماتم کر رہا ہوں" سہیل نے ترش ہو کر کہا۔ "اسی جہد للبقا کا نتیجہ پنجاب کی تباہی کی صورت میں نمودار ہوا۔ کبھی فرصت ملے تو پناہ گزینوں کے کیمپ دیکھو، ہسپتال دیکھو، اُن زخمی بچوں اور عورتوں کو دیکھو جو اس جدوجہد کا شکار ہوئیں۔ ابھی تک لاشوں کے ڈھیر سڑکوں کے کنارے پڑے انسانیت پر لعنت بھیج رہے ہیں۔ کل تک جہاں آبادیاں تھیں، لہلہاتے کھیت تھے، آج ان کی حالت دیکھ کر کلیجہ مُنہ کو آتا ہے، انسانوں کی اتنی لاشیں کہ کتے اور گدھ کھاتے کھاتے تنگ آگئے، یہ جو کچھ ہوا کیا بقا کے لئے جدوجہد ہے، یہ بزدلی کا مظاہرہ ہے۔ حیوانیت نہیں درندگی ہے۔ آنے والی نسلیں اس دور کے انسان پر نفرین کریں گی۔" سہیل کی آواز اور بلند ہو گئی۔ بیرے ہماری جانب دیکھنے لگے۔ کونٹر پر بیٹھا ہوا نوجوان منیجر جو ابھی ابھی دلّی سے آیا تھا حیرانی سے ہماری طرف دیکھنے لگا۔

"ہم لوگ ادب کے پجاری ہیں" اُس نے سلسلۂ کلام جاری رکھا "ذرا بازاروں میں جا کر دیکھو ادب کی مٹی پلید ہو رہی ہے۔ قیمتی کتابیں زمین پر بکھری ہیں، جو لوگ بیچ رہے ہیں کتاب کی ضخامت سے قیمت کا اندازہ لگاتے ہیں۔ دلّی میں اس سے بھی زیادہ کمال دکھایا گیا۔ اُردو کا سب سے بڑا کتب خانہ جلا دیا گیا۔" اُس کی آواز بھرّا گئی۔ "نایاب قلمی نسخے، ادب کے انمول ہیرے، جہد للبقا کے پجاری، کمینے۔" اُس نے غم و غصہ سے ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ لیں۔

"آسمان ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک" ریاض نے لقمہ دیا۔ "اب اس قصے کو جانے بھی دو مہینوں سے رو رہے ہیں اب تو آنکھوں میں آنسو بھی خشک ہو گئے ہیں۔"

"تارے ڈوبے کیوں؟" وہ بولا "یہی بات تو مجھے دیوانہ بنا رہی ہے۔ میں رات دن سوچتا رہا ہوں۔ ہمارے سیاست داں اور راہ نُما مسخرے ہیں، ہٹ دھرمی اور غلط روی گویا ان کا شیوہ ہے۔ اپنی غلط سیاست کے باعث وہ لاکھوں انسانوں کی زندگی سے کھیل چکے ہیں۔"

"سہیل بھائی!" میں نے بحث کو ختم کرتے ہوئے نرمی سے کہا "اُن کا اتنا زیادہ قصور نہیں۔ وہ بھی ہمارے زمانے کی پیداوار ہیں، اب اُن کی جگہ اور کسے لایا جاسکتا ہے؟ تم زمانے کی اہمیت کو بھول گئے اور فرد کو بڑھا رہے ہو۔ فرد زمانے کے سامنے حقیر چیز ہے۔"

"عجیب منطق ہے۔ اگر فرد نہ ہوتا تو زمانہ کہاں ہوتا، زمانے کی اہمیت فرد کی ذات سے ہے۔" وہ بولا

ریاض نے زور سے قہقہہ لگایا یہ بحث ختم ہونے کا اشارہ تھا۔ "اب فرد اور زمانے کا چکر چلاؤ گے۔"

احمد اور میں نے بھی تائید کی۔ یہ محفل ختم ہوئی مگر سہیل نے ہمیں بھی مایوس کر دیا تھا۔ ہم آگئے مگر وہ جانے کب تک وہیں بیٹھا رہا۔

رسل و رسائل کے سارے ذرائع مسدود، ریل گاڑیاں بند، لاریاں پناہ گزینوں کے کام میں مصروف، پٹرول پر پابندی، عجیب مصیبت کا سامنا ہے۔ ایک ضروری کام سے مجھے باہر جانا تھا۔ بڑی مشکل سے ایک کار کا بندوبست ہوسکا۔ جاتی دفعہ تو راستہ بخوبی کٹ گیا لیکن واپسی پر اچانک کار کے انجن میں کچھ نقص ہونے لگا۔ شام ہونے کو تھی، اس لئے ڈرائیور اس خیال سے کہ ہم واپس شام سے پہلے پہنچ جائیں کار چلاتا رہا لیکن تھوڑی دُور جاکر آواز زیادہ آنے لگی، مجبوراً ہمیں رُکنا پڑا۔

گاؤں کافی دُور تھا۔ میں نے دیکھا تھوڑے فاصلہ پر ایک جھونپڑی سی ہے۔ میں یونہی وقت گزارنے کی خاطر جھونپڑی کی طرف روانہ ہُوا۔ جب قریب پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اندر بے سروسامانی ہے، ایک ادھیڑ عمر کا لاغر سا کسان جو بدحالی کا شکار معلوم ہو رہا تھا نیم تاریکی میں زمین پر بچوں کو لئے بیٹھا تھا۔ زمین ہی اُن کا بستر تھا، ایک طرف ہنڈیا چولھے پر رکھی تھی۔ کسان پاس بیٹھا تھا۔ ایک لڑکی آٹا گوندھ رہی تھی یہ نظارہ دیکھ کر مجھے بہت دُکھ ہوا۔ بے سروسامانی اور ان لوگوں کی بدحالی صاف صاف کہہ رہی تھی کہ وہ کون تھے۔ میرا دل بھر آیا۔

میں نے سلام کیا۔ بوڑھے کسان نے بڑی متانت سے جواب دیا، آگ درست کی اور فوراً اُٹھ کر میری جانب آیا۔

"آپ مہاجر ہیں" میرے دل میں ہمدردی پھوٹ رہی تھی "آپ کا زیادہ نقصان تو نہیں ہوا" نہ جانے میں نے یہ سوال کیوں پوچھ لیا حالانکہ بے گھر ہونا ہی وہ نقصان ہے جس کی تلافی ممکن نہیں۔

کسان نے ایک آہ کھینچی "آپ مہمان ہیں، میرے پاس کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں آپ بیٹھ سکیں۔" وہ رُکا اور سنبھل کر بولا "نقصان! چار کڑیل جوان بیٹے، دو بہوئیں شہید کی گئیں۔ خدا کا دیا بہت کچھ تھا گھر بار لُوٹا گیا، نوم چھلا چھینا گیا۔ ڈھور ڈنگر سب لُٹ گئے۔ تین پوتے اور ایک پوتی بچا کر لایا ہوں۔" اس کی آواز بھاری ہوگئی۔ شام کی تاریکی نے کسان کے چہرے پر اور وحشت بکھیر دی، مگر اُس کی آنکھوں میں یقین تھا اور صبر۔ یہ شخص — میرے ذہن میں سہیل کی باتیں اُبھر آئیں۔ "انسان بزدل ہے" ظلم کی داستان، سنگ دلی اور درندگی کا مظاہرہ جس کا شکار میرے سامنے موجود تھا۔

"آپ کو یہاں زمین مل گئی ہے؟" میں نے دلاسا دینے کے لہجے میں پوچھا۔

"ہاں بیٹا! کچھ زمین مل گئی ہے، خدا کا شکر ہے" اُس کی نگاہیں اچانک آسمان کی طرف اُٹھیں۔ "امتحان سخت تھا مگر میں نے برداشت کرلیا" وہ رُک گیا، اس کے چہرے پر نور کی جھلک نمودار ہوئی، وہ پہلی وحشت جاتی رہی، وہ میرے قریب آگیا، اُس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا، اُس کا ہاتھ لرز رہا تھا۔

"بیٹا! انہیں نے سب کچھ کھو دیا" مجھے اس کا کوئی غم نہیں - میرا لہلہاتا باغ برباد ہوگیا۔ مجھے اس کی فکر نہیں - میں یہ چار ننھی ٹہنیاں سینے سے لگائے بیٹھا ہوں، انھیں سینچوں گا، اپنے خون سے، خدا نے چاہا ایک دن یہ درخت بن جائیں گے۔ پھلیں پھولیں گے۔ گزارے کے لئے یہ زمین کافی ہے، اُس نے ہاتھ سے اشارہ کیا، یوں معلوم ہوا جیسے زمین میلوں پھیل گئی تھی - پھر اُس نے ہاتھ بڑھایا "ان ہاتھوں میں ابھی کچھ سکت باقی ہے۔ ہم زندہ رہ سکتے ہیں"۔ وہ پھر رُک گیا۔

اُس کے ہاتھ نے میرے کندھے کو اور دبایا، میں اُس کے ذہن کی حالت کا اندازہ لگا رہا تھا، وہ اپنے غم کو چھپا رہا تھا۔ اُس کے اندر ایک کشمکش تھی۔

"لیکن شکر ہے میں ثابت قدم رہا۔" اُس نے دہرایا "میرا جرم یہی تھا کہ میں مسلمان تھا۔ اس کی مجھے سخت ترین سزا دی گئی"۔ اس کی آواز میں اعتماد آگیا، اس نے سر کو اونچا کر لیا۔ "میں نے سزا کو بخوشی قبول کیا۔ اس کا اجر مجھے مل گیا ہے۔ میں اب اُس پاک سرزمین میں ہوں جہاں میں سربلندی سے کہہ سکوں گا کہ میں مسلمان ہوں"۔ اُس نے ہاتھ میرے کندھے سے اُٹھا لیا۔

ایک خستہ حال انسان جس کے پاس سر چھپانے کو بھی جگہ نہ تھی ایسی باتیں کر رہا تھا۔ یہ باتیں دماغ کی نہ تھیں وہ سہیل ہی کر سکتا تھا — یہ دل کی باتیں تھیں، میں نے جیب سے چند نوٹ نکال کر پیش کئے۔ "آپ بچوں کے کپڑے اور سردی کے لئے لحاف بنا لیجئے"۔

وہ مسکرایا "بیٹا! خدا آپ کو زیادہ دے، ہم لوگ زمین کے بیٹے ہیں، زمین ہماری گود ہے، یہیں ہم پرورش پاتے ہیں، آج تک کسی سے کچھ لیا نہیں، اب لیتے شرم آتی ہے، میں مہمان کی خاطر تواضع بھی نہ کر سکا"۔ اس کی آنکھیں آبدیدہ ہوگئیں۔

ڈرائیور کے ہارن نے بتایا کہ کار ٹھیک ہوگئی ہے۔ میں نے رخصت چاہی۔ اس کسان کی باتوں نے میرے دل کو مسرتوں سے بھر دیا تھا۔ مجھے ایک انسان سے ملاقات کا فخر حاصل ہوا۔

کار پوری رفتار سے چلی جا رہی تھی۔ میرا ذہن خیالات سے پُر تھا۔ سہیل کی ذہانت میں کسے کلام ہے۔ اُسے انسان کی بزدلی کی شکایت تھی، اُسے انسان پر یقین نہ رہا تھا۔ لیکن یہ کسان اور اُس کی سیدھی سادھی باتیں، اُسے اپنے آپ پر یقین تھا، ایک محکم یقین، وہ سراپا عمل تھا اور مستقبل سے اُمیدوار، چند بیگھے زمین اُس کے لئے ارضِ مقدس تھی، اور اُس کے ناتوان ہاتھ کام کرنے کے لئے بےتاب، سب کچھ کھو کر بھی وہ مایوس نہیں ہوا۔ اس کا طرزِ عمل بتا رہا تھا کہ انسان بہت بلند ہے!

باہر اندھیرا چھا رہا تھا اور میرا ذہن ایک نئی روشنی پا کر مستقبل کا راستہ تلاش کرنے لگا۔

شبیر محمد اختر

جاہل

"مولوی کسان کو، کسان کے چھوٹے بھائی چرواہے کو جاہل کہتا رہتا ہے اور لوگ مولوی کو باور کرتے چلے جاتے ہیں۔ کسان کبھی نہیں کہتا کہ مولوی ہل کے علم سے بے خبر ہے — واقعہ یہ ہے کہ بڑے مولوی کے سامنے چھوٹا مولوی، بڑے ڈاکٹر کے سامنے چھوٹا ڈاکٹر قریباً قطعی جاہل ہے۔ پڑھے لکھوں میں ایک احمقانہ سازش ہے کہ "جاہل" کا لفظ ان پڑھوں کے لئے مخصوص کر دیا جائے۔ طرفہ یہ ہے کہ یہ بزعم خود کتابوں کے عالم خود تو کتابوں کے معانی کے متعلق ایک دوسرے کو گالی دیتے ہیں مگر کسان سے توقع کرتے ہیں کہ وہ کتابوں کے وہ معنی پسند کریں جو سمجھ نہیں سکتے۔

یہ "علم والے" اس قدر جاہل ہیں کہ اُن پر بلائیں نازل ہوں تو بھی ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ پڑھے لکھوں کے تفرقہ کے باعث ملک میں تباہی ہے۔ سب سے بڑے جاہل "علم والے" ہیں۔

فلک پیما

نذرِ گلچیں

دو بھائی اکثر بڑے زور شور سے بحث کیا کرتے تھے اور ایک دوسرے کو قطعاً غلط ہونے کا الزام دیا کرتے - ایک روز اُن کے باپ نے اُن کی گرماگرم بحث سُن کر انھیں اپنے کتب خانے میں بلالیا - اُس نے انھیں ایک میز پر ایک دوسرے کے مقابل میں بٹھادیا اور پھر اُن کے درمیان ایک سرخ پھول دان رکھ دیا جس کی ایک طرف ایک سفید گلاب کا پھول بنا ہوا تھا - پھول دان وہاں رکھ کر اُس نے ایک بھائی سے کہا کہ مجھے بتاؤ تم کیا دیکھتے ہو؟ اُس نے کہا کہ ایک سُرخ پھول دان - پھر اُس نے دوسرے سے پوچھا اور تم؟ اُس نے جواب میں کہا کہ ایک سُرخ پھول دان جس پر ایک سفید گلاب کا پھول بنا ہوا ہے - باپ نے کہا تو اچھا لڑکو! اب تم جاؤ —— لڑکے سمجھ گئے اور آج یہ حالت ہے کہ جب کبھی اُن میں اختلاف رائے ہو کر تیز بحث ہونے لگتی ہے تو انھیں وہ سُرخ پھول دان یاد آجاتا ہے اور وہ سمجھ لیتے ہیں کہ ہر ایک کا نقطۂ نگاہ جدا ہوتا ہے!

بڑا آدمی وہ ہے جس کے سینے میں ہمیشہ اُس کے بچپن کا دل دھڑکتا رہے -

ڈاکٹر لن یوٹانگ مشہور چینی فلسفی جو "جینے کی اہمیت" کا مصنف ہے لکھتا ہے: زمانہ حال کا انسان زندگی پر بہت سنجیدگی سے نگاہ ڈالتا ہے اور اسی سنجیدگی کی وجہ سے اُس کی دنیا فکر و تشویش کی دنیا ہے - ظرافت کی اہمیت کو کبھی بھولنا نہ چاہیئے کیونکہ ظرافت کی حس سے ہماری ساری شائستہ زندگی ایک نئے رنگ میں رنگی جاتی ہے، میرے خیال میں آمرین کی زندگی کی سب سے بُری بات یہ ہے کہ وہ ظرافت سے عاری ہوتے ہیں - آمرین ہمیشہ بڑے سنجیدہ یا پُر رعب یا خفا نظر آتے ہیں - اس کے مقابل میں جمہوری حکومتوں کے صدر مسکراتے ہیں اور لوگ انھیں پسند کرتے ہیں - لیکن ایک آمر اپنی اہمیت کے خیال سے اتنا پھول جاتا ہے کہ اُس کی ساری ظرافت جاتی رہتی ہے اور اس کے ساتھ اس کی حس تناسب کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے اس کا نتیجہ انتہا درجہ مضر ہوتا ہے، ہنسی میں فضا کو مصفّا کرنے کی ایک ایسی طاقت ہوتی ہے جو افراد اور قوموں دونوں میں اپنا کام کرتی ہے - اگر ظرافت کی حس قائم رہے تو سمجھداری برقرار رہتی ہے اور اس کے ساتھ سادہ خیالات اور امن پسند مزاج اور دنیا کو تہذیب یافتہ نظر سے دیکھنے کی عادت نشو و نما پاتی ہے"

زندگی کا راز اس میں نہیں کہ تم جو چاہو وہ کرو بلکہ یہ کہ جو تم کرو اُسے چاہو -

---

اگر کوئی تمھیں ایک بار دھوکا دے تو یہ اس کا قصور ہے لیکن اگر وہ دوسری بار بھی تمھیں دھوکا دے تو یہ تمھارا قصور ہے -

---

تم صبح دس بجے تک خوش مزاج رہو، اس کے بعد تمھارا دن خود بخود اچھا گزرے گا -

---

اگر کوئی آدمی نیچے زمین کی طرف دیکھے تو ممکن ہے وہ دہریہ ہو سکے، لیکن میں نہیں سمجھتا کہ کوئی آدمی بھی اوپر آسمان کی طرف سے دیکھے اور پھر کہے کہ خدا موجود نہیں -

مسلماں کے لہو میں ہے سلیقہ دل نوازی کا
مروّت حسنِ عالمگیر ہے مردانِ غازی کا

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

اعجاز ہے کسی کا یا گردشِ زمانہ
ٹوٹا ہے ایشیا میں سحرِ فرنگیانہ
یہ بندگی خدائی وہ بندگی گدائی
یا بندۂ خدا بن یا بندۂ زمانہ

عزائم کو سینوں میں بیدار کردے
نگاہِ مسلماں کو تلوار کردے

گرمِ فغاں ہے جرس اُٹھ کہ گیا قافلہ
وائے وہ رہرو کہ ہے منتظرِ راحلہ
اس کی خودی ہے ابھی شام و سحر میں اسیر
گردشِ دوراں کا ہے جس کی زباں پر گلہ

خرد کو غلامی سے آزاد کر
جوانوں کو پیروں کا اُستاد کر
تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے
دلِ مرتضےٰ سوزِ صدیق دے
جگر سے وہی تیر پھر پار کر
تمنّا کو سینوں میں بیدار کر

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

دلِ مُردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے اُمتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

جُرأت ہو نمُو کی تو فضا تنگ نہیں ہے
اے مردِ خدا مُلکِ خدا تنگ نہیں ہے

وہی زمانے کی گردش پہ غالب آتا ہے
جو ہر نفس سے کرے عمرِ جاوداں پیدا

دریا میں موتی! اے موجِ بے باک
ساحل کی سوغات! خار و خس و خاک
ایسا جنوں بھی دیکھا ہے میں نے
جس نے سیئے ہیں تقدیر کے چاک

(اقبال)

محفلِ ادب

صِلہ یا سزا؟

خوبانِ جہاں کہیں بدی کرتے ہیں — خدامِ کہن سے بے رُخی کرتے ہیں
اے بادِ صبا ان کی لٹوں کو چھو کر — کہنا کہ غریبوں سے یہی کرتے ہیں

اپنے قوائے خلاقی کے سیلِ کائنات کاروانِ برق رفتار کو، سیاسیات کی خاردار زنجیروں میں، شاعرانہ نقطۂ نظر سے نقصان رساں حد تک جکڑ کر ہم اُردو کے بدبخت شاعروں اور ادیبوں نے اپنی مردہ قوم میں متحرک زندگی، سیاسی و ذہنی بیداری، مردانہ ولولۂ سرفروشی اور آہن گداز حرارتِ عزم و انقلاب پیدا کر کے ہندوستان کی جنگِ آزادی میں سیاسی رہنماؤں کے دوش بدوش جو نمایاں، درخشاں اور ناقابلِ فراموش حصہ لیا ہے اس ہمارے زرّیں کارنامے سے اُردو کے سب سے بڑے دشمنوں کو بھی بشرطیکہ بے انصافی اور بے شرمی ان کے ضمیروں کو نگل نہیں چکی ہے تاقیامت انکار کرنے کی جرأت نہیں ہو سکتی۔

لیکن ربع صدی سے زاید کی ان مسلسل کاوشوں ان متصل کاوشوں اور ان متواتر قربانیوں کا ہمیں کیا صلہ ملا؟ ادب نواز ہندوستان اس کا جواب دے صلہ ملا کہ سزا؟ معلوم تو ایسا ہوتا ہے کہ اپنے ملک کی خدمت کر کے ہم نے ایک بہت بڑے گناہ کا ارتکاب کیا تھا اور حماقت کی بنا پر گناہ کر کے ثواب کے اُمیدوار تھے ع خطا نمودہ ام و چشمِ آفریں دارم، اور غالباً اسی بنا پر جب سیاسی راہ نما اور ادبی راہبر میدانِ جنگ سے فتح یاب ہو کر پلٹے تو پرچم و علم اور جاہ و جلال نے دوڑ کر سیاسی رہنماؤں کی تو رکابیں تھامیں اور ان کے گھوڑوں کو تھپ تھپایا لیکن ہمارے ہانپتے گھوڑوں کے ایک ایک چابک رسید کر کے انہیں میدان سے بھگا دیا۔ آزادی کا پرچم کھلتے ہی بڑے لیڈروں کو زرّیں مسندیں ملیں اور چھوٹوں کو طلائی کرسیاں، خدا انھیں مبارک کرے، یہ دراصل اُن کا حق تھا جو انھیں ملا اور درحقیقت یہ ہم سب کی دیرینہ آرزو تھی جو پوری ہوئی۔ لیکن اس مطبوع صورتِ حال کے دوش بدوش کئی صورتیں ایسی بھی پیدا ہو گئیں جو صد درجہ افسوسناک ہیں جن میں سے ایک تو یہ ہے کہ ان لیڈروں کو بھی جی بھر کے اچھل کود کے مواقع مل گئے جو دُور اندیشانہ خود غرضی کی بنا پر گاندھی ٹوپی میں مصلحتی جذبے دے، جیل جا اور خون لگا کر شہیدوں میں نام لکھا چکے تھے اور ع "پایا تھا اک گدھے نے کہیں پوستین شیر" کی آڑ میں سنہری مچھلیاں پکڑنے کی خاطر ہمیشہ ہر دریا کے کنارے بیٹھا کرتے ہیں۔ چنانچہ ان بظاہر لیڈروں، بباطن آدم خوروں نے اعلانِ آزادی ہوتے ہی جلدی جلدی اپنے اپنے کڑھاؤ چڑھا دیے اور غریب آزاریوں، محنت سوزیوں، رشوت ستانیوں، پگڑی بازیوں، نفع خوریوں اور غلہ چوریوں کی پکوڑیاں تلنا شروع کر دیں اور جب اخباروں اور بازارِ خلق کی ہواؤں پر انسانی چربی کی چراند اُڑی تو محتسبوں نے گھبرا کر ادھر دیکھا، دونوں کی آنکھیں ملیں، دونوں نے ایک دوسرے کو پہچانا، ہونٹوں پر سازشانہ تبسم دوڑے، آنکھوں ہی آنکھوں میں کاروباری اشاروں کے مبادلے ہوئے اور پھر یکایک گہری خاموشی چھا گئی ؎

پینے والا ہے مرے ساتھ کا یہ جان گئے — دیکھ کر شکل مری ہنس دیے پہچان گئے

دوسری طرف یہ ہوا کہ معروف و مسلّم غدارانِ وطن یعنی خطاب یافتگان، بدگہر اور نیک نام و نیک نہاد اربابِ آئی۔سی۔ایس نیز سند یافتہ برٹش افسروں نے گرگٹ کی طرح رنگ بدل کر یہی نہیں کیا کہ اپنے اس وقار کو قائم ہی رکھا جو ہندوستان کا خون بہا کر انھوں نے حاصل کیا تھا بلکہ اُسے حلقۂ حکومت میں داخل ہو کر اور بھی بڑھا لیا اور اسی کے ساتھ وہ حکامان برطانیہ پرست و وطن دشمن بھی اپنے اپنے عہدوں پر خیر سے بحال و برقرار رہے جو ہزاروں مرتبہ کانگریسیوں پر لاٹھیاں چلا اور گولیاں برسا چکے تھے۔ اب رہے "دیگر احوال یہ ہے" کی قسم کے دیگر سردارانِ وطن جو ایک طویل و عریض خواب دیکھ رہے تھے انھوں نے موقع

پاکے ہی مذہبی شیطانوں اور اقتدار کے دیوانوں سے ساز باز کر کے ملک کے اس سرے سے اُس سرے تک ناقابل تصور بربریت، بہیمیت، بے حیائی اور بد چلنی کا ایسا حکومت شکن، انسانیت سوز، شقاوت پرور، ناموس ربا اور زلزلہ انگیز فتنہ عظیم برپا کر دیا کہ اگر خوش قسمتی سے ہمارے محبوب ترین لیڈر پنڈت جواہر لال نہرو کو اس سازش و شرارت کا عین وقت پر پتہ نہ چل جاتا اور وہ لاثانی و غیر معمولی عزم و عمل اور بے نظیر حُبِ وطن کے ساتھ مردانہ وار میدان میں کود نہ پڑتے تو یہ سوچ کر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں کہ اس وقت ہمارے وطن عزیز کا وہی نقشہ ہوتا جو نصیبِ دشمناں آٹھ سو برس پیشتر تھا اور ہماری بربادی کا پارہ جب اس ڈگری تک چڑھ جاتا تو ہمارے "مذہبی" اکھاڑے اور شریف رجواڑے بھوکے بھیڑیوں کی طرح ہم پر ٹوٹ پڑتے اور ہماری شیر خوار آزادی کا سر قلم کر کے اُسے اپنے نیزے پر نچاتے اور اپنی مادرِ مشفقہ برطانیہ عظمیٰ کے قدموں پر لے جا کر ڈال دیتے۔ لیکن —"رسیدہ بود بلائے"— پھر بھی —"ولے بخیر گزشت—" ابھی اس کی منزل دُور اور شاید بہت دُور ہے۔

قصہ مختصر کہنے کا مقصد یہ ہے کہ آزادی نے سب کو نوازا، سچوں اور جھوٹوں، اچھوں اور بُروں، کھوٹوں اور کھروں سب کو اچھے بُرے مواقع بہم پہنچائے لیکن ہم شاعر و ادیب جہاں تھے وہیں رہے ؎

سرما بگذشت و ایں دلِ زار ہماں — گرما بگذشت و ایں دلِ زار ہماں
القصہ ہزار سرد و گرم عالم — بر ما بگذشت و ایں دلِ زار ہماں

نہیں یہ بھی درست نہیں "ایں دلِ زار ہماں" تک ہوتا تو بھی غنیمت تھا۔ ہم غلامی کی حالت میں جس زبوں حالت میں تھے آج آزادی کے دور میں اس سے بھی زبوں تر حالت میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ اور وہ وفادارانِ برطانیہ کل جو ہماری نظمیں ضبط کراتے اور غدار کہہ کر ہمیں سزائیں دیتے تھے آج ہمیں دھکے دے دے اور کہنیاں مار مار کر مادرِ وطن کے پہلو میں جا بیٹھے ہیں اور اپنے مقام بلند سے ہماری پستیوں پر مسکرا رہے ہیں ؎

جو کوئی آئے ہے نزدیک ہی بیٹھے ہے ترے — ہم کہاں تک ترے پہلو سے سرکتے جائیں

یہ سچ ہے کہ ہم نے اپنے وطن کی خدمت کسی صلے یا انعام کی خاطر نہیں بلکہ اپنی بے پناہ و بے لوث ولولۂ حبِ وطن کی بنا پر کی تھی اور ہمارا سب سے بڑا صلہ اور ہمارا سب سے بڑا انعام یہی ہے کہ ہم نے اپنے "ترنگے" کو اوپر جاتے اور اُن کے "یونین جیک" کو نیچے آتے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ البتہ ہمارے دلوں میں جو تلخی پیدا ہو رہی ہے کہ وہ محض اس خیال سے پیدا ہو رہی کہ آزادی کے قدرتی ردِ عمل نے جس طرح سیاسی لیڈروں کو وطن کی مزید خدمت گزاری کے مواقع بہم پہنچا دیئے ہیں ویسا ہمارے ساتھ نہیں ہوا۔ ہرچند کہ ہم بھی اس کے مستحق تھے اور ہمارے ملک کو ہماری خدمات کی آج بھی ویسی ہی ضرورت ہے جیسے کل تھی، اور شاید آج کل سے کہیں زیادہ ضرورت ہے ہندوستان کے اس آسمان کے نیچے شاید ہمارا ہی وہ تنہا گروہ ہے جو وطن رہتے ہوئے غریب الوطنی کی زندگی بسر کر رہا ہے ؎

اپنا کوئی وطن نہیں ہے شاید — ہوتا ہے وطن ہر اک بشر کا لیکن
اصطبل ہے انجمن نہیں ہے شاید — اندازۂ علم و فن نہیں ہے شاید

خیر یہ تمام مبنی بہ حقیقت لیکن بے نتیجہ خامہ فرسائی اور یہ تمام مبنی بہ بشریت، بے صرفہ تلخ نوائی تو صرف ایک جملہ معترضہ تھی اور اس کی حقیقت ع

"تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں یہ بھی"۔ یا بقول انیس ؎ کہنے میں بات آتی ہے یہ کچھ گلہ نہیں — دن تیسرا ہے آج کہ پانی ملا نہیں، سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ بہ فیض قوت و حیات ہمارے سینے اتنے چوڑے اور ہمارے دل اتنے بڑے ہیں کہ ہم اپنے وطن کی ان تمام ناقدردانیوں کو جو ہمارے گلے کو گھونٹے اور ہماری قوتِ کارکردگی کو بھینچے ہوئے ہیں، معاف اور بآسانی معاف کر سکتے ہیں اور اگر خدا موجود ہے تو مسیح کی طرح ہم بھی اپنے الفاظ میں اس سے ہندوستان کو معاف کر دینے کی سفارش کر سکتے ہیں: "اے باپ! ہندوستان اندھا ہے، اسے معاف کر دے، اس لئے کہ یہ ہمیں دیکھ ہی نہیں سکتا!"

البتہ ہمارے ملک نے ہمارے ساتھ ایک ایسی زبردست دہشتناک بیوفائی کی ہے جسے ہم نزع کی ہچکی تک معاف نہیں کر سکتے۔ ہمارے وطن نے ہمیں ایک ایسی غیر متوقع و شدید ترین سزا دی ہے اور عین اس وقت سزا دی ہے جب ہم اپنی خدمت گزاریوں کے اعتراف کا انتظار کر رہے تھے کہ شرافت و انسانیت انگشت بدنداں ہو کر رہ گئی ہے اور آزاد ہوتے ہی ہماری قوم نے مرہم عطا کرنے کے عوض ہمارے دلوں میں ایک ایسا گہرا زخم ڈالا ہے جو قیامت تک رستا رہے گا۔ مہینے سالوں میں تبدیل ہو جائیں گے، سال صدیوں میں بدل جائیں گے، صدیاں قرنوں اور قرن قرنہا قرن کی صورت اختیار کر لیں گے لیکن یہ زخم نسلوں میں منتقل ہوتا ہوا رستا اور برابر رستا رہے گا اور وہ زخم ہے ہمارے مال، ہماری جان اور ہمارے ایمان سے بھی بمراحل گراں قدر اردو زبان کا خاتمہ، اردو زبان کا خون، اور اردو زبان کی شہادت ع آسماں حق بود اگر خوں ببارد بر زمیں

(الف) اُردو زبان ہندو مسلم اتحاد و یگانگی کی سب سے بڑی اور تنہا یادگار ہے (ب) اُردو زبان تاریخ کے اس زریں دور محبت و رواداری کی جیتی جاگتی اور منہ بولتی تصویر ہے
جب کہ فرمانروائی و کشور کشائی کے باوجود اپنے ہندو دوستوں سے باتیں کرنے کی خاطر مسلمان اپنی دفتری زبان فارسی اور دینی زبان عربی کے منالے سے گنگا کے کنارے اُتر آئے تھے
(ج) اُردو زبان متعدد لسانی چشموں سے بہرہ اندوز ہونے کے باعث بڑھنے پروان چڑھنے اور پیچیدہ و مرکب معانی و مفاہیم ادا کرنے کی بےپناہ لچک اور استعداد رکھتی ہے (د)
اُردو زبان تمام ہندوستان میں سمجھی اور اکثر و بیشتر مقامات پر بولی جاتی ہے (س) اور اُردو زبان میں ہندوستان کی تمام موجودہ مروّجہ زبانوں کے بالمقابل سرکاری زبان بننے
کی سب سے زیادہ صلاحیت پائی جاتی ہے ـــــ ان حقائق کو لیکن کس کے روبرو اور کس توقع پر بیان کیا جائے ؎

رہی نہ طاقت گفتار اور اگر ہو بھی — تو کس امید پہ کہیئے کہ آرزو کیا ہے؟

اس لئے کہ اُردو کی ان خصوصیات سے خود وہ تمام افراد واقف ہیں جو تجاہل عارفانہ اور تنفر فرقہ وارانہ کی بنا پر اُردو کے گلے پر چھری پھیر رہے ہیں اور تو اور سینہ زوری، دیدہ دلیری
اور دھاندلی کی یہ انتہا ہے کہ اُردو کو یو۔پی میں معزول کر دیا گیا ہے، وہ یو۔پی جو اردو کا گھر ہے، گلستان ہے، گہوارہ ہے، جو اُردو کا کعبہ ہے، کلیسا ہے، کاشی ہے اور جو اُردو کی راجدھانی ہے،
وہاں اُردو کو تخت سے اُتار دیا گیا، وہ یوپی جس کا بچہ بچہ ہندو ہو کہ مسلمان اُردو کے سانچے میں ڈھلا اور اُردو کا دودھ پی کر پلا ہے۔ وہ یوپی جہاں اُردو کلیاں چٹکتی، اُردو پپیہے بولتے،
اُردو چڑیاں چہچہاتی، اُردو ہوائیں سنکتی اور اُردو گھٹائیں برستی ہیں، وہاں اُردو کے چشمے کو خشک اور اُردو کی نعمتوں کو ساقط کر دیا گیا ہے۔ یوپی کے بام حکومت سے بڑے معصومانہ انداز
میں اس مفہوم کا آوازہ بلند کیا گیا ہے کہ چونکہ اس صوبے کے صرف چودہ فیصدی مسلمانوں کی زبان اُردو ہے اور باقی چودہ کم سو فیصدی ہندوؤں کی زبان ہندی ہے اس لئے اقلیت کی زبان
کو اکثریت کی زبان پر ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ اور اسی منطقی و منصفانہ بنیاد پر ہندی کے سر پر اودھ کی نوابی اور پورے صوبے کی شاہی کا تاج رکھا جا رہا ہے ـــــ افریقہ وغیرہ کے ناواقف لوگوں
کو تو اس چودہ فیصدی کا دھوکا بڑی آسانی سے دیا جا سکتا ہے لیکن دائی سے کون پیٹ چھپائے اور واقف کاروں کے سامنے کون ڈنڈی مار سکتا ہے۔ مجھے تو یہ کہتے بھی شرم آتی ہے کہ
یوپی کی زبان بلا تفریق مذہب سو فیصدی اُردو ہے اس لئے کہ یہ تو بالکل ایسی بات ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ آفتاب روشن و گرم ہوتا ہے۔

بہرحال اگر یو۔پی کی حکومت راست گفتار، معدلت گستر اور شریف النفس ہے تو اُس کا فرض ہے کہ ایک آزاد کمیشن مقرر کر کے اپنے اعلان کی تصدیق اور سچائی کا ثبوت
کرے ورنہ یاد رہے کہ یہ کلنک کا ٹیکہ چھپائے نہیں چھپے گا اور آگے چل کر اس کے نتائج اس قدر بُرے ہوں گے کہ پکڑ کر رونا پڑے گا ؎

دل کی لگی شب فراق اپنا اثر دکھائے گی — لپٹیں گے لاکھ بن کے وہ نیند مگر نہ آئے گی

یہ بات بلا خوف ابطال کہی جاتی ہے کہ تعلیمی اصول، سیاسی مقاصد اور لسانی مصالح سے اُردو دشمن تحریک کا ذرہ بھر بھی تعلق نہیں، بلکہ اس کے پیچھے وہ اندھا اور احمقانہ
جذبہ کارفرما ہے جو ہندوستان کی تقسیم و خانہ جنگی کا تنہا ذمہ دار ہے اور جسے نہایت سختی کے ساتھ نہ روکا گیا تو ہندوستان و پاکستان دونوں ریاستوں کو کبھی امن کے ساتھ جینا
میسر نہیں ہوگا۔ ہندوستان و پاکستان کے وہ پہلوان جو آج اکثریت کا تھرّا پئے ہاتھی کی طرح جھوم رہے ہیں اُن سے کوئی پوچھے ؎

نہ بینی کہ چوں گربہ عاجز شود — بر آرد بہ چنگال چشم پلنگ!

شاید یہ ہندو مسلمان پہلوان اکثریت و اقلیت کی آویزشوں اور اُن کی تباہ کاریوں سے واقف ہی نہیں ورنہ انہیں معلوم ہو جاتا کہ اپنے وطن سے غداری کر کے وہ خود اپنے ہی پاؤں پر
کلہاڑی مار رہے ہیں۔ پاکستان کا مجھے علم نہیں لیکن ہندوستان کے متعلق مجھے معلوم ہے کہ مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو مندرجہ بالا نکتے کو سمجھتے ہوئے گلا پھاڑ پھاڑ کر اس کے خلاف
چیخ رہے ہیں اور موجودہ اندھیرے کے اندر روشنی کی جو ایک دھاری نظر آ رہی ہے وہ انہی دونوں کے دم سے ہے اور آج "خدا نخواستہ" یہ دو ہستیاں ہمارے درمیان موجود نہ ہوتیں
تو آزاد ہندوستان کب کا خودکشی کر چکا ہوتا لیکن نہایت ہی قلق کے ساتھ آج یہ بات محسوس کی جا رہی ہے کہ قوم کے دل پر اب ان دو بزرگ ہستیوں کی وہ گرفت باقی نہیں رہی ہے
جو یادش بخیر آج سے بیشتر تھی اور آج عامۃ الناس اُن سواران سازش و شرارت کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں جو یا تو انتہا درجے کے بے عقل ہیں یا پہلے درجے کے مفسدہ
پرداز اور ایسے مفسدہ پرداز کہ اگر انہیں مفسدہ پرداز کہا جائے تو نفس مفسدہ پردازی کے ماتھے پر شرم کا پسینہ ٹپکنے لگے۔

شاباش! اے شریف ہندوستان! نہرو اور گاندھی کے سے شریفوں سے منہ موڑا اور شریروں سے ناتا جوڑا، اس محسن کشی و ناخلفی کی داد نہیں دی جا سکتی!
بہرحال اس صورت حال میں آج ہم اُردو کے شاعروں کے دل سے چوٹ کھائے ہوئے اژدھے کی طرح پھنکارتا ہوا یہ سوال بار بار اُٹھ رہا ہے کہ کیا ہم

جنگ آزادی میں یہی دن دیکھنے کے لئے شریک ہوئے تھے؟ ہم نے کیا راتیں جگائیں تھیں اسی دن کے لئے۔

کیا ہم نے اپنے قلم اور اپنی زبان کو استقلالِ وطن کی خاطر اسی لئے استعمال کیا تھا کہ ہمارا قلم توڑ دیا اور ہماری زبان کاٹ دی جائے؟ یاد ش بخیر ایک مبارک زمانہ وہ بھی تھا کہ ایک ایک شعر پر شاعروں کے منہ موتیوں سے بھر دیئے جاتے تھے اور ایک منحوس دَور یہ آیا ہے کہ صلے کے بدلے ان کی زبان گدی سے کھینچ لی گئی ہے۔

غلط فہمی کے مٹانے کی خاطر ہم یہ بھی کہہ دینا چاہتے ہیں کہ حاشا ہم اربابِ اُردو ہندی زبان اور دیوناگری رسم الخط کے ہرگز مخالف نہیں۔ بلکہ اس کے قطعی برعکس ان کے سچے ہمدرد و ہم نوا ہیں۔ اور ہندی کی محبت تو ہمارے دل میں اس لئے اور بھی ہے کہ ہماری اُردو اسی کی آغوش میں پلی اور اسی کے سانچے میں ڈھل رہی ہے۔ دُنیا جانتی ہے کہ ہمارے گروہ کی زندگی ادب اور صرف ادب ہے اور ادب جہاں کہیں بھی اور جس زبان میں بھی ہو ہماری ملکیت اور ہماری میراث ہے اس لئے تمام دنیا کا ادب اور تمام کرۂ ارض کی زبانیں ہمیں اپنی جان سے زیادہ محبوب ہیں — لیکن ہم اپنے دلوں کو کسی غرض اور کسی عالم میں بھی اس امر پر آمادہ و فراہم نہیں کر سکتے کہ اُردو کی شہ رگ کو کاٹ کر اس کا خون ہندی، فارسی، عربی یا دنیا کی کسی زبان کو پلا دیا جائے — "جیو اور جینے دو" — ہماری زندگی کا سب سے بڑا اصول ہے۔ ہم اُردو اور ہندی دونوں کو باقی رکھنا چاہتے ہیں اس لئے اگر ہمارے ملک کے سب سے بڑے لیڈر مہاتما گاندھی کے مشورے پر جسے میں شاہی فرمان سے زیادہ مرتبہ دیتا ہوں عمل کرتے ہوئے "ہندوستانی" کو سرکاری زبان کا مرتبہ دے کر اُردو اور ہندی دونوں کے رسم الخط کو دوش بدوش جاری رہنے اور پھلنے پھولنے کا موقع دیا جائے، ہم خوش، ہمارا خدا خوش — پھر ہمیں شکایت کا کوئی موقع ہی باقی نہ رہے گا۔ صرف سمجھ کا پھیر ہے ورنہ بات تو ذرا سی ہے۔

تم ظلم چھوڑ دیتے ہم ترک آہ کرتے — کچھ تم نباہ کرتے کچھ ہم نباہ کرتے

لیکن اگر ہمارے اس ارمان اور گاندھی جی کے فرمان کو ٹھکرا دیا گیا تو عمر بھر نہ تو ہم چین سے بیٹھیں گے اور نہ ہندوستان ہی کو بیٹھنے دیں گے — اُردو کے دشمنوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ جس زبان کی زریں محراب کے نیچے ہماری معاشرت، ہماری ثقافت اور ہماری تہذیب کی شمعیں جل رہی ہیں ہماری روایات، ہماری تاریخ اور ہمارے علوم و فنون کے چراغ ہیں، ہمارے ادب، ہماری موسیقی اور ہماری نقاشیوں کے ساز چھڑے ہوئے ہیں، ہمارے اقربا و احباب، ہمارے شعرا و ادبا اور ہمارے آبا و اجداد کی آوازیں گونج رہی ہیں اور جس محراب کی زریں مسند پر ہمارے محبوب و معشوق سر گرمِ حرف و حکایت ہیں، ہم اُس زبان کو اُس وقت تک پائندہ و تابندہ رکھیں گے جب تک اس زمین پر پہاڑ قائم ہیں اور یہ زمین آفتاب کے گرد گردش کر رہی ہے ؎

تا رسے خانہ و مے نام و نشاں خواہد بُود — سرِ ما خاکِ رہِ پیرِ مغاں خواہد بود

کہاں ہیں اُردو کے نام لیوا ہندو، مسلمان اور سکھ — جو نہ ہندو ہیں، نہ مسلمان، نہ سکھ، بلکہ صرف شاعر اور ادیب ہیں اور جن کا مذہب ادب کے سوا کچھ نہیں — زمانہ اپنے گلے کی پوری طاقت سے انھیں آواز دے رہا ہے "بر بندید محملہا" قبل اس کے کہ پانی سر سے اونچا ہو جائے ہر ممکن عجلت کے ساتھ بلاتفریقِ مذہب و ملت لکھنؤ میں جمع ہو جائیں اور انجمن تحفظ و ترویج اُردو کی بنا ڈال کر گاندھی کی طرح کام شروع کر دیں اور اس وقت تک دم نہ لیں جب تک کہ ان کے ارمان اور گاندھی جی کے فرمان کے مطابق نا انصافی انصاف کا جامہ پہن لے اور دیوناگری کے دوش بدوش اُردو کا دریا بھی نہ بہنے لگے ؎

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم!
قضا ز جنبشِ رطلِ گراں بگردانیم

جوشؔ ملیح آبادی

مطبوعات

بقت عبودیت | ازصدرالدین اصلاحی، شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ کا اسم گرامی اسلامی دنیا میں محتاج تعارف نہیں۔ موصوف اسلام کے جید عالموں میں سے تھے۔ یہ کتاب امام موصوف کے ارشادات کا اردو ترجمہ ہے۔ موجودہ زمانے میں جب ایک
سلامی سلطنت معرض وجود میں آئی ہے اور اس کی فلاح و بہبود کے لئے تجاویز سوچی جا رہی ہیں ایسے وقت میں عوام کی ذہنی تربیت کے لئے
اب نہایت مفید ہے تاکہ لوگ عبادت اور عبودیت کے حقیقی مفہوم کو سمجھیں۔

مولانا صدرالدین اصلاحی ایک مدت سے خدمت اسلام میں نہایت خاموشی سے سرگرم عمل ہیں۔ اس کتاب کی اشاعت سے انھوں نے
ے کی ایک اہم ضرورت کو پورا کیا ہے۔ کاغذ و طباعت نفیس، ضخامت ۱۶۴ صفحات قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

ناشر:۔ دارالاشاعت نشاۃ ثانیہ ۔حیدرآباد دکن

لامی عدل گستری | ازعبدالحفیظ صدیقی۔ یہ ایک چھوٹی سی کتاب ہے جس میں حکومت، اقتدار اعلیٰ، قانون اور عدل کے متعلق اسلامی تصورات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور عہد رسالتؐ اور خلفائے راشدین کے زمانے میں جو نظام عدل گستری
ا تھا اُس کی وضاحت بھی کی گئی ہے ان موضوعات پر ضخیم کتابیں لکھی جا سکتی ہیں لیکن مصنف نے بڑی کاوش سے کوزے کو دریا میں بند کرنے کی کوشش
ہے۔ کتاب کے آخر میں اردو اور انگریزی میں "کتابیات" کی فہرست شامل ہے جو نہایت کارآمد ہے۔ اس مختصر کتاب کی تیاری میں مصنف نے کافی
ت کی ہے۔ کاغذ کتابت اور طباعت عمدہ ضخامت ۹۶ صفحات ۔قیمت ایک روپیہ دس آنے

ملنے کا پتہ:۔ ادارۂ ادبیات اُردو، حیدرآباد دکن۔

ارے پھول | ازمحمد سعیدالدین۔ ہماری زندگی میں پھول کو کافی دخل ہے۔ خوشی کا موقع آئے تو ہم پھول ہی کے ذریعہ اُس کا اظہار کرتے ہیں اور جب موت کا وقت آتا ہے تو بھی پھول ہی ہمارے مونس ہیں۔ مذہبی تیوہار ہوں یا آرائش کے موقعے۔ پھول ہر جگہ موجود ہیں۔ مگر بہت کم لوگ
لوں کی اصلیت سے واقف ہوں گے۔ اس کتاب کے فاضل مصنف نے بڑی آسان زبان میں پھولوں کے متعلق فنی نکتۂ نگاہ سے ہمیں آگاہ کیا ہے
صوف جامعۂ عثمانیہ کے شعبہ نباتات کے صدر ہیں۔ یہ کتاب فنی ہوتے ہوئے بھی بہت دلچسپ ہے کتاب کو زیادہ مفید بنانے کے لئے مصنف
ان کی شکلیں اور انگریزی نام بھی درج کر دیئے ہیں آخر میں ایک فہرست شامل ہے جس میں پھولوں کے نباتاتی، انگریزی اور ہندوستانی نام دیئے گئے ہیں
ذ طباعت اچھی ہے ضخامت ۶۲ صفحات قیمت ایک روپیہ

ملنے کا پتہ:۔ ادارۂ ادبیات اُردو۔خیریت آباد، حیدرآباد دکن

ورت اور زندگی | ازسید کلب مصطفیٰ (ایڈوکیٹ لکھنؤ) اردو ادب میں ایسا لٹریچر بہت کم ہے جو عورت کو اپنی گھریلو زندگی کے بہتر بنانے میں مدد دے۔ ہمارے یہاں لکھی پڑھی خواتین کی تعداد بہت ہی کم ہے اور پھر اردو میں ایسی کتابیں نہیں ہیں جو اُن
راہنمائی کر سکیں۔ سید کلب مصطفیٰ صاحب نے اس طرف توجہ کی ہے اور انھیں ایک امریکی خاتون مسز ڈریک کی کتاب What a young
ehand ought to Kno ل گئی۔ جسے انھوں نے نہایت کاوش اور خوبصورتی سے اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ اس کتاب میں گھریلو زندگی کے مختلف
پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہر ایک گھرانے میں پڑھی جائے خود والدین اپنی نوجوان بچیوں کو یہ کتاب پڑھائیں۔ لکھائی

ملک آزادی میں یہی دن دیکھنے کے لئے شریک ہوئے تھے ع ہم نے کیا راتیں جگائیں تھیں اسی دن کے لئے۔

کیا ہم نے اپنے قلم اور اپنی زبان کو استقلالِ وطن کی خاطر اسی لئے استعمال کیا تھا کہ ہمارا قلم توڑ دیا اور ہماری زبان کاٹ دی جائے؟ یا دش بخیر ایک مبارک زمانہ بھی تھا کہ ایک ایک شعر پر شاعروں کے مُنہ موتیوں سے بھر دیئے جاتے تھے اور ایک منحوس دور یہ آیا ہے کہ صلے کے بدلے ان کی زبان گُدّی سے کھینچ لی گئی ہے۔

غلط فہمی کے مٹانے کی خاطر ہم یہ بھی کہہ دینا چاہتے ہیں کہ حاشا ہم اربابِ اُردو ہندی زبان اور دیوناگری رسم الخط کے ہرگز مخالف نہیں۔ بلکہ اس کے قطعی برعکس ان کے سچے ہم درد و ہم نوا ہیں۔ اور ہندی کی محبت تو ہمارے دل میں اس لئے اور بھی ہے کہ ہماری اُردو اسی کی آغوش میں پلی اور اسی کے سانچے میں ڈھل چکی ہے۔ دُنیا جانتی ہے کہ ہمارے گروہ کی زندگی ادب اور صرف ادب ہے اور ادب جہاں کہیں بھی اور جس زبان میں بھی ہو ہماری ملکیت اور ہماری میراث ہے یوں سمجھئے تمام دنیا کا ادب اور تمام کرۂ ارض کی زبانیں ہمیں اپنی جان سے زیادہ محبوب ہیں — لیکن ہم اپنے دلوں کو کسی غرض اور کسی عالم میں بھی اس امر پر آمادہ و راضی نہیں کر سکتے کہ اُردو کی شہ رگ کو کاٹ کر اس کا خون ہندی، فارسی، عربی یا دنیا کی کسی زبان کو پلا دیا جائے —۔ "جیو اور جینے دو" — ہماری زندگی کا سب سے بڑا اصول ہے۔ ہم اُردو اور ہندی دونوں کو باقی رکھنا چاہتے ہیں اس لئے اگر ہمارے ملک کے سب سے بڑے لیڈر مہاتما گاندھی کے مشورے پر جسے میں شاہی فرمان سے زیادہ مرتبہ دیتا ہوں عمل کرتے ہوئے "ہندوستانی" کو سرکاری زبان کا مرتبہ دے کر اُردو اور ہندی دونوں کے رسم الخط کو دوش بدوش جاری رہنے اور پروان چڑھنے کا موقع دیا جائے، ہم خوش، ہمارا خدا خوش — پھر ہمیں شکایت کا کوئی موقع ہی باقی نہ رہے گا۔ صرف سمجھ کا پھیر ہے ورنہ بات تو ذرا سی ہے۔

تم ظلم چھوڑ دیتے ہم ترکِ آہ کرتے
کچھ تم نباہ کرتے کچھ ہم نباہ کرتے

لیکن اگر ہمارے اس ارمان اور گاندھی جی کے فرمان کو ٹھکرا دیا گیا تو عمر بھر نہ تو ہم چین سے بیٹھیں گے اور نہ ہندوستان ہی کو بیٹھنے دیں گے — اُردو کے دشمنوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ جس زبان کی زرّیں محراب کے نیچے ہماری معاشرت، ہماری ثقافت اور ہماری تہذیب کی شمعیں جل رہی ہیں ہماری روایات، ہماری تاریخ اور ہمارے علوم و فنون کے چراغ ہیں، ہمارے ادب، ہماری موسیقی اور ہماری نقاشیوں کے ساز چھڑے ہوئے ہیں، ہمارے اقربا و احباب، ہمارے شعرا و ادبا اور ہمارے آباو اجداد کی آوازیں گونج رہی ہیں اور جس محراب کی زرّیں مسند پر ہمارے محبوب و معشوق سر گرمِ حرف و حکایت ہیں، ہم اُس زبان کو اُس وقت تک پائندہ و تابندہ رکھیں گے جب تک اس زمین پر پہاڑ قائم ہیں اور یہ زمین آفتاب کے گرد گردش کر رہی ہے ؎

تا رسے خانہ و مے نام و نشاں خواہد بُود
سرِ ما خاکِ رہِ پیرِ مغاں خواہد بود

کہاں ہیں اُردو کے نام لیوا ہندو، مسلمان اور سکھ — جو نہ ہندو ہیں، نہ مسلمان، نہ سکھ، بلکہ صرف شاعر اور ادیب ہیں اور جن کا مذہب ادب کے سوا کچھ نہیں — زمانہ اپنے گلے کی پوری طاقت سے انھیں آواز دے رہا ہے "بر بندید محملہا" قبل اس کے کہ پانی سر سے اونچا ہو جائے ہر ممکن عجلت کے ساتھ لاتفریقِ مذہب و ملت لکھنؤ میں جمع ہو جائیں اور انجمن تحفظ و ترویج اُردو کی بنا ڈال کر آندھی کی طرح کام شروع کر دیں اور اس وقت تک دم نہ لیں جب تک کہ ان کے ارمان اور گاندھی جی کے فرمان کے مطابق نا انصافی انصاف کا جامہ پہن لے اور دیوناگری کے دوش بدوش اُردو کا دریا بھی نہ بہنے لگے ؎

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم!
قضا ز جنبشِ رطلِ گراں بگردانیم

جوش ملیح آبادی

مطبوعات

حقیقت عبودیت

از صدر الدین اصلاحی، شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ کا اسم گرامی اسلامی دنیا میں محتاج تعارف نہیں۔ موصوف اسلام کے جید عالموں میں سے تھے۔ یہ کتاب امام موصوف کے ارشادات کا اردو ترجمہ ہے۔ موجودہ زمانے میں جب ایک نئی اسلامی سلطنت معرض وجود میں آئی ہے اور اس کی فلاح و بہبود کے لئے تجاویز سوچی جا رہی ہیں ایسے وقت میں عوام کی ذہنی تربیت کے لئے یہ کتاب نہایت مفید ہے تاکہ لوگ عبادت اور عبودیت کے حقیقی مفہوم کو سمجھیں۔

مولانا صدر الدین اصلاحی ایک مدت سے خدمت اسلام میں نہایت خاموشی سے سرگرم عمل ہیں۔ اس کتاب کی اشاعت سے انھوں نے زمانے کی ایک اہم ضرورت کو پورا کیا ہے۔ کاغذ و طباعت نفیس، ضخامت ۱۶۴ صفحات قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

ناشر:- دار الاشاعت نشاۃ ثانیہ - حیدرآباد دکن

اسلامی عدل گستری

از عبد الحفیظ صدیقی - یہ ایک چھوٹی سی کتاب ہے جس میں حکومت، اقتدار اعلیٰ، قانون اور عدل کے متعلق اسلامی تصورات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور عہد رسالتؐ اور خلفائے راشدین کے زمانے میں جو نظام عدل گستری رائج تھا اُس کی وضاحت بھی کی گئی ہے ان موضوعات پر ضخیم کتابیں لکھی جا سکتی ہیں لیکن مصنف نے بڑی کاوش سے کوزے کو دریا میں بند کرنے کی کوشش کی ہے۔ کتاب کے آخر میں اردو اور انگریزی میں "کتابیات" کی فہرست شامل ہے جو نہایت کارآمد ہے۔ اس مختصر کتاب کی تیاری میں مصنف نے کافی محنت کی ہے۔ کاغذ کتابت اور طباعت عمدہ ضخامت ۹۶ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ دس آنے

ملنے کا پتہ:- ادارۂ ادبیات اُردو، حیدرآباد دکن۔

ہمارے پھول

از محمد سعید الدین - ہماری زندگی میں پھول کو کافی دخل ہے۔ خوشی کا موقع آئے تو ہم پھول پہن کر اُس کا اظہار کرتے ہیں اور جب موت کا وقت آتا ہے تو بھی پھول ہی ہمارے مونس ہیں۔ مذہبی تیوہار ہوں یا آرائش کے موقعے۔ پھول ہر جگہ موجود ہیں۔ مگر بہت کم لوگ پھولوں کی اصلیت سے واقف ہوں گے۔ اس کتاب کے فاضل مصنف نے بڑی آسان زبان میں پھولوں کے متعلق فنی نکتۂ نگاہ سے ہمیں آگاہ کیا ہے موصوف جامعۂ عثمانیہ کے شعبہ نباتات کے صدر ہیں۔ یہ کتاب فنی ہونے ہوئے بھی بہت دلچسپ ہے کتاب کو زیادہ مفید بنانے کے لئے مصنف نے ان کی شکلیں اور انگریزی نام بھی درج کر دیئے ہیں آخر میں ایک فہرست شامل ہے جس میں پھولوں کے نباتیاتی، انگریزی اور ہندوستانی نام دیئے گئے ہیں کاغذ طباعت اچھی ہے ضخامت ۶۲ صفحات قیمت ایک روپیہ

ملنے کا پتہ:- ادارۂ ادبیات اُردو - خیریت آباد، حیدرآباد دکن

عورت اور زندگی

از سید کلب مصطفےٰ (ایڈووکیٹ لکھنؤ) اُردو ادب میں ایسا لٹریچر بہت کم ہے جو عورت کو اپنی گھریلو زندگی کے نبھانے میں مدد دے۔ ہمارے یہاں لکھی پڑھی خواتین کی تعداد بہت ہی کم ہے اور پھر اُردو میں ایسی کتابیں نہیں ہیں جو اُن کی راہنمائی کر سکیں۔ سید کلب مصطفےٰ صاحب نے اس طرف توجہ کی ہے اور انھیں ایک امریکی خاتون مسز ڈریک کی کتاب What a young wife ought to know مل گئی۔ جسے انھوں نے نہایت کاوش اور خوبصورتی سے اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ اس کتاب میں گھریلو زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہر ایک گھرانے میں پڑھی جائے خود والدین اپنی نوجوان بچیوں کو یہ کتاب پڑھائیں۔ لکھا

چھپائی اچھی ہے۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔ ناشر:۔ رائے صاحب لالہ رام دیال اگروال۔ کٹرہ الہ آباد

آوارہ گرد کے خطوط

از ش "مظفر آبادی"۔ یہ کتاب مجموعہ ہے ایک "آوارہ گرد" کے سولہ خطوط اور چند افسانوں کا۔ مصنف کو یہ خطوط لکھنے کی تحریک ایک ایسے خط سے ہوئی جو "آوارہ گرد" کی ادبی کاوشوں کو سراہتے ہوئے کسی "نوشین ساحرہ" نے لکھا ہے۔

ان خطوط اور افسانوں میں کافی ادبی بے راہ روی ہے۔ "تلخ اور اذیت ناک گھلاوٹ"۔ "بیاز نگاہیں"۔ "کڑوی مسکراہٹیں"۔ "سرد آہیں"۔ اور "زخم خوردہ احساسات" ایسی تراکیب کا لکھ دینا ادب کو بلند نہیں کرتا۔ بلند اور ارفع ادب کے لئے خیالات کی پاکیزگی اور اخلاقی قدروں کا لحاظ ضروری ہوتا ہے۔ ہم جس دور سے گزر رہے ہیں اس میں زندگی اپنی نئی قدریں تیار کر چکی ہے۔ اب اسے مریضانہ ادب کی بجائے صحت مند ادب کی ضرورت ہے۔ ادب اور عریاں ادب نے سماج کو کافی رسوا کر دیا ہے۔ کاغذ اور طباعت اچھی ہے۔ ضخامت ۲۴۸ صفحات کتاب مجلد ہے۔ قیمت اڑھائی روپیہ

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ ادب اردو۔ جامع مسجد دہلی،

قائدِ ملت

از غلام محمد بی۔ اے، نواب بہادر یار جنگ مرحوم کا نام نامی کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ آپ حیدر آباد دکن کی مجلس اتحاد المسلمین کے صدر تھے اور مسلم لیگ کے روح رواں۔ مسلمانوں کی بیداری کے سلسلے میں اُن کی انتھک کوششوں کی داستان بہت طویل ہے۔ یہ مردِ مجاہد زندگی بھر خدمتِ اسلام کے لئے سینہ سپر رہا۔ عمر کے آخری حصہ میں فرمانروائے دکن سے بعض سیاسی وجوہ کی بنا پر اختلاف ہو گیا۔ انھوں نے اپنا خطاب واپس کر دیا۔ جب یہ خدا کا سپاہی اپنے مولا کے حضور روانہ ہوا تو محمد بہادر خاں تھا۔

قائدِ ملت اسی مردِ مومن کی سوانح حیات ہے۔ اس میں اُن کی زندگی پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ جب تک وہ زندہ رہے مسلم نوجوانوں کے راہ نما تھے، اب اُن کی زندگی کے حالات نوجوانوں کے لئے مشعلِ راہ کا کام دے سکتے ہیں۔ جناب غلام محمد صاحب کا یہ ادبی کارنامہ قابلِ تحسین ہے کہ انھوں نے قائدِ ملت محمد بہادر خاں کی زندگی کو محفوظ کر دیا ہے۔ ہر مسلم نوجوان کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے جس کا ہر باب ایمان افروز ہے۔ کاغذ کتابت اور طباعت نہایت عمدہ ضخامت ۲۴۴ صفحات مجلد مع گردپوش قیمت تین روپے چار آنے

ملنے کا پتہ:۔ نفیس اکیڈمی۔ حیدر آباد دکن

جام و مینا

مرتبہ حکیم یوسف حسن، ہمارے افسانوی ادب کا ذخیرہ کافی ہے۔ اُردو میں اس صنفِ ادب کو جتنی ترقی ہوئی ہے شاید کسی اور صنف کو میسر آئی ہوگی، افسانہ نویسی اب ایک "ملک گیر" صورت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں اچھے افسانے سامنے آتے ہیں وہاں روز بروز ارزاں افسانوی ادب بھی عام ملتا ہے۔ دوسری عالمگیر جنگ کے دوران میں محاذِ جنگ پر "ٹلنگوں" کا دل بہلانے کے لئے امریکہ اور برطانیہ کی طرف سے جو تفریحی لٹریچر مہیا کیا جاتا رہا ہے اُس نے ہمارے افسانے پر بہت بُرا اثر کیا۔ ہمارے افسانے میں گھٹیا پن آ گیا اور اب تو حالت یہ ہے کہ اچھے افسانے بڑی تلاش سے میسر آتے ہیں۔

زیرِ تبصرہ کتاب مختلف ادیبوں کے بارہ اچھے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ان میں منشی پریم چند۔ خواجہ حسن نظامی۔ سلطان حیدر جوش۔ نذر سجاد حیدر۔ عبد المجید سالک۔ سید نصیر حیدر کے افسانے خوب ہیں۔ یہ مجموعہ افسانوی ادب میں قابلِ قدر اضافہ ہے۔ کتابت طباعت اور کاغذ عمدہ ہے۔ ضخامت ۲۰۴ صفحات۔ کتاب مجلد اور گردپوش سے مزین ہے۔ قیمت اڑھائی روپے

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ ادب اردو بازار دہلی

سید منظور حسین ہماری منیجر، پرنٹر پبلشر نے اتحاد پریس بل روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر ہمایوں ۳۲ لارنس روڈ لاہور سے شائع کیا صرف سرورق رپن پریس بل روڈ لاہور میں چھپا!

Regd. No. L. 1363.

بیادگار علامۂ فصیحہ آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لاء

جائنٹ ایڈیٹر: شیر محمد اختر

فہرست مضامین

ہمایوں بابت ماہ فروری ۱۹۴۸ء

نمبر شمار	مضمون	صاحب مضمون	نمبر صفحہ
۱	بزمِ ہمایوں	بشیر احمد	۶۲
۲	جہاں نما	شیر محمد اختر	۶۳
۳	چند روز پاکستان کے دار السلطنت میں	بشیر احمد	۶۷
۴	غزل	جناب احمد ندیم قاسمی صاحب بی۔ اے	۷۲
۵	عصمت کا تحفظ	جناب فلک پیما	۳
۶	غزل	جناب ڈاکٹر مسعود حسین صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی	۴
۷	ادب اور سائنس	جناب حنیف فوق صاحب	۵
۸	کشمیر (نظم)	جناب سید محمد جعفری صاحب ایم۔ اے	۹
۹	کوئی کپڑا کوئی اُترن (ڈراما)	جناب آغا بابر صاحب بی۔ اے (آنرز)	۱
۱۰	غزل	جناب قتیل شفائی صاحب	۸
۱۱	صفیہ باجی (افسانہ)	جناب راجہ امین الرحمٰن صاحب ایم اے	۹
۱۲	غزل	جناب عرش بدایونی	
۱۳	ادھورا خواب (نظم)	جناب اختر ہوشیار پوری صاحب بی۔ اے۔ ایل ایل بی	
۱۴	پال ـــ میرا دوست (افسانہ)	جناب ڈاکٹر صلاح الدین اکبر صاحب ایم بی بی ایس	
۱۵	غزل	جناب مغنی تبسم صاحب حیدر آبادی	
۱۶	مطبوعات		

چندہ سالانہ	ششماہی	فی پرچہ
۶	۳	۸

بزمِ ہمایوں

ہماری قومی تاریخ کے اس نئے دَور میں جو ہندوستان اور پاکستان کے حصول آزادی سے شروع ہوا ہے اُردو ادب کیسی شکل اختیار کرے گا؟ کیا ہمارا ادب نئی سیاسی تبدیلیوں سے بے نیاز ہو کر "خالص" ادبی راہ پر گامزن ہونے کا تہیہ کر لے گا؟ لیکن صحیح ادبی راہ تو عام زندگی کے میدان اور جنگل ہی میں سے ہو کر گزرتی ہے۔ اس لئے کسی قسم کی ادبیت محض "خالص" ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ ادب اور زندگی کا گہرا تعلق ہے اور صحیح ادب ہی ہے جو زندگی کا آئینہ دار ہو۔ یہ درست ہے کہ ادبی تصورات اخباری واقعات سے مختلف ہوتے ہیں روزمرّہ کے واقعات چھوٹی بڑی لہریں ہیں۔ ادب دریا کے عام بہاؤ پر نظر رکھتا ہے لیکن دریا کا بہاؤ اور دریا کی لہریں دو مختلف چیزیں قطعاً نہیں ایک کا دوسرے سے قریب کا تعلق ہے۔

چند ماہ ہوئے ایک دوست نے مدیر ہمایوں سے کہا کہ کیا اب وقت نہیں آگیا کہ ہمایوں کو ایک سیاسی رسالہ بنا دیا جائے۔ قوم کی ضروریات اس کی متقاضی ہیں کہ اب ادبی رسالے بھی اس کی ترقی میں حصّہ لیں۔ خیال دل پر اپنا اثر چھوڑ گیا اور غیر شعوری طور پر میں اس پر غور کرتا رہا۔ اگر قوم کی ساری زندگی کو سیاسیات سے تعبیر کیا جائے تو یقیناً کسی حقیقی ادبی رسالے کو سیاسیات سے الگ تھلگ نہ رہنا چاہیئے لیکن اگر سیاسیات کے معنی مختلف سیاسی جماعتوں کی کشاکش ہے تو کم از کم ایک ایسے ادبی رسالہ کو جو مختلف قسم کے ادبی خیالات کا ذخیرہ ہو اور جس کا مقصد اپنی قوم کی زندگی کو ایک بلند اخلاقی معیار پر پہنچانا ہو روزمرّہ کی سیاسیات میں حصہ نہیں لے سکتا۔

البتہ قوموں کی تاریخ میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب اُس کے ادیبوں اور شاعروں کے لئے محض اصطلاحی یا فنّی موشگافیوں میں منہمک رہنا ایک گناہ کبیرہ کے مترادف ہوتا ہے۔ آج کل ہم ایک ایسے انقلابی دَور میں سے گزر رہے ہیں اور ہم میں سے ہر ادیب اور شاعر کا فرض ہے کہ وہ بطور ایک قوم کے فرد کے کسی نہ کسی عملی کام میں بھی حصّہ لے۔ اگر کوئی پناہ گزین سڑک کے کنارے پڑا دم توڑ رہا ہے تو ایک ادیب اُس سے مُنہ موڑ کر اپنی راہ پر نہیں چل سکتا یہ خیال کرتے ہوئے کہ مجھے تو گھر پہنچ کر تیر کے گھر کے حال پر ایک تبصرہ لکھنا ہے۔ ایک شاعر محض اپنی محبوبہ کی زلفوں میں اسیر نہیں رہ سکتا جب کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان الجھنیں بڑھتی جا رہی ہوں۔ ایسے کٹھن وقت میں ادیبوں اور شاعروں کو کچھ عملی کام بھی کرنے ہیں اور کچھ قوم کی روزمرّہ معاشری و اخلاقی زندگی پر صداقت کی روشنی بھی ڈالنی ہے۔ امن کے زمانے میں اُن کا کام کچھ اور ہونا چاہیئے اور تشویش و جنگ کے زمانے میں کچھ اور!

ادیب اور غیر ادیب شہری میں یہ فرق ہے کہ ادیب کم از کم تھوڑی دیر کے لئے عام سطح سے بلند ہو کر مسائل حاضرہ پر ایک غیر متعصبانہ نظر ڈالتا ہے وہ ایک قسم کا مبلغ ہے جو قومی زندگی کو وقتی یا مقامی آلودگیوں سے مبرّا ہو کر اسے پاک و صاف کرنا چاہتا ہے۔ پاکستان کے اکثر ادیبوں کے لئے یہ ایک فطری اور لازمی بات ہے کہ اُن کے ادب میں بسا اوقات اسلامی ثقافت کی جھلک دکھائی دے لیکن پھر یہ بھی انہیں کا کام ہے کہ وہ اپنی قوم اور دُوسری قوموں کو دکھا دیں کہ اسلامی تہذیب کی بلندی عام انسانی تہذیب کی بلندی سے کوئی مختلف شے نہیں اور اگر ہے تو صرف یُوں کہ مسلمانوں کی اصلی تہذیب اور غیر مسلموں کی اصلی تہذیب ایک ہی کوہستانی سلسلے کی خوبصورت چوٹیاں ہیں۔ پاکستان دنیا سے کوئی الگ خطہ نہیں۔ اُس میں ہمسائگی مقامی ہمدردی اور انسانی ہم نوائی کے اوصاف بدرجہ اتم موجود ہیں۔

پاکستانی ادب کبھی تنگ دلی اور کم ظرفی اور تعصب کا مظہر نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ اسم بامسمّی ہے تو اسے باوجود ہزار کثافتوں کے اوروں سے زیادہ پاک و صاف ہو کر رہنا ہے۔ موجودہ خوفناک رقابتوں کے ہوتے ہوئے بھی اُردو ادب کو ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ایک سنہری کڑی بن جانا چاہیئے۔ کیا عجب ہے کہ دیگر اسباب کے ساتھ مل کر یہ بھی اس آہنی دَور کو ایک زرّیں عہد میں تبدیل کرنے کا موجب ہو جائے!

بشیر احمد

جہاں نُما

امریکی ادب کی چند خصوصیات

گزشتہ چند سالوں میں ہمارے یہاں امریکی ادب کافی مقبول ہوا ہے۔ امریکی ناول اور افسانے بڑے شوق سے پڑھے جاتے ہیں اور ہم امریکی زندگی میں گہری دلچسپی لینے لگے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب کہا جاتا تھا کہ امریکہ کا تو اپنا کوئی ادب ہی نہیں لیکن اب یہ حالت ہے کہ ہر کتب فروش کے ہاں امریکی ادب کی کتابوں کی بھرمار نظر آتی ہے۔

یہ ادب ہمارے ادب پر اثر انداز ہو رہا ہے اس لئے اس کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

۱۔ امریکی ادب کی سب سے نمایاں بات اُس کی فراخ دلی ہے۔ ہر ملک میں مُلکی تعصب نظر آتا ہے مگر امریکہ میں ایسا نہیں، وہاں غیر ملکی ادیب موجود ہیں جو انگریزی زبان میں لکھتے ہیں۔ چین کا مشہور فلسفی ڈاکٹر لن یوٹانگ، شام کا شاعر اور مصور خلیل جبران اور آرمینیا کا تمثیل نگار اور افسانہ نویس ولیم سارویان امریکی ادب کے اُفق پر چمک رہے ہیں۔ چین، شام اور آرمینیا کے زاویہ ہائے نگاہ امریکی ادب کا جزو بن رہے ہیں۔ یہی وہ آئینہ ہے جس میں امریکی قوم کا دل دیکھا جا سکتا ہے۔

۲۔ امریکی دورِ حاضر کی عمر کوئی تین سو برس کے قریب ہے۔ وہ لوگ جنھوں نے امریکہ کو یہ نئی زندگی دی ان کے خاندان ابھی موجود اور اُن کی روایات ابھی تازہ ہیں، اس لئے عمومًا امریکی ناول رزمیہ انداز میں لکھے جاتے ہیں۔ اُن کے مناظر ہمارے سامنے ملک کے وہ حصے لے آتے ہیں جہاں فطرت ابھی آوارہ ہے دھرتی کے دامن پر تہذیب سے نا آشنا انسان بے نیازی سے گھوم پھر رہا ہے، ان ناولوں میں قدیم زمانے کی زندگی عام ہے۔ بہت سے امریکی ناول نگار فطرت پرست ہیں۔ اُن میں فرانسیسی ادیب ایمل زولا کی سی فطرت پرستی پائی جاتی ہے۔ امریکہ ایک وسیع برِّ اعظم ہے جہاں قدرتی مناظر بے شمار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان مناظر کو بیان کرتے وقت ادیبوں کے قلم کی روانی تیز ہو جاتی ہے، اسی لئے امریکی ناولوں میں حادثات کی بہتات ہے۔

۳۔ امریکی ادیب اپنے خطۂ زمین پر بہت نازاں ہیں جس کا اظہار اُن کے ناولوں اور افسانوں میں عام ملتا ہے۔ شمالی امریکہ کے مصنفین خانہ جنگی کو موضوع بناتے ہیں۔ اُن کے ادب میں نسلی کش مکش کا ذکر ہوتا ہے۔ نیو انگلینڈ والے آداب و رسوم اور اشرافی زوال کے المیہ پہلو کا خوب خوب مضحکہ اُڑاتے ہیں۔ مغربی خطے اور کیلیفورنیا کے ادیبوں کا رنگ اور ہے۔ یہاں کے نامور لکھنے والے جان سٹین بک اور اُپٹن سنکلیئر امریکہ سے زیادہ ہندستان میں مقبول ہیں۔

۴۔ امریکی ادب کو سمجھنے کے لئے امریکی تاریخ کی کم عمری کا لحاظ ضروری ہے لیکن اس کے باوجود قوموں کی برادری میں امریکہ ایک مضبوط اور جاندار قوم ہے اس کم عمری نے اُس کے تاریخی احساس کو ایک نیا رخ دے دیا ہے۔ دنیا کے کسی ملک نے اس قدر تھوڑے زمانے میں شاید ہی اتنے تاریخی ناول پیدا کئے ہوں ان ناولوں میں گزشتہ نسلوں کی کش مکش نمایاں ہے۔

۵۔ ہمارے یہاں شہر اور دیہات کی زندگی میں نمایاں فرق ہے لیکن امریکہ میں ایسا نہیں ہے۔ وہاں اگر چند جھونپڑیاں بھی کہیں ہیں تو بھی وہ ایک چھوٹے سے شہر کا نمونہ ہوگا۔ ہر چھوٹے سے گاؤں میں پکی سڑکیں، سینما، ریڈیو، شفاخانہ، سکول، ٹاؤن ہال اور کئی مقامات پر ڈراما کلب تک موجود ہیں۔ دیہاتیوں کا یہ عالم کہ جونہی کام سے فارغ ہوئے ہالی وڈ کے ایکٹروں ایسا لباس زیب تن کیا اور گھومنے چلے۔ گاؤں والوں میں موسیقی کا بھی کافی ذوق و شوق موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ کے اکثر لوگ شہروں کی بجائے دیہات میں رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں، بخلاف اس کے ہمارے یہاں جو دیہاتی لوگ پڑھ لکھ جاتے ہیں وہ فورًا شہروں کی طرف

قل ہونے لگتے ہیں۔ دیہاتی زندگی کا یہ پہلو امریکی ادب میں عام ملتا ہے۔

۶۔ امریکہ جہاں بڑے بڑے کاروباری اداروں اور سرمائے کے اجارے داروں کا ملک ہے وہاں تخلیقی فن کار بھی اپنا ایک مسلک رکھتے ہیں اور وہاں زندگی میں آہستہ آہستہ انقلاب پیدا کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ ترقی پسند یا بایاں بازو کہلاتے ہیں۔ یہ ادیب اپنے ادب کے ذریعہ بڑے بڑے رمایہ داروں پر خوب چوٹیں لگاتے اور ایک عام انسان کو بلند کرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ اس گروہ میں ڈاس پسوس، شٹین بک، جیمز فی، فیرل اور اپٹن سنکلیر یسے مشہور ادیب شامل ہیں اور اُن کی ادبی تخلیقات سے وہاں کی زندگی متاثر ہو رہی ہے۔

۷۔ امریکی زندگی میں محنت مزدوری کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ ایک عام آدمی کی عزت افزائی ہے جسے برقرار رکھنے کے لئے ادیبوں نے ناول لکھے ہیں۔ عام آدمی کی سربلندی کی خاطر اُس کی زبان کو خوب خوب ابھارا ہے اور عام بول چال کو ادب میں استعمال کیا گیا ہے جن ادیبوں نے یہ روش اختیار کی ان کا ادب عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور اس میں ساری تخلیقی خصوصیات موجود ہیں۔

۸۔ جرمن اور انگریز نظریات تیار کرنے میں بہت مشہور ہیں۔ لیکن امریکہ کے لوگ نظریات کی بجائے حقیقت کی تلاش کرتے ہیں۔ اُن کے ادب میں بھی یہ بات نمایاں ہے۔ امریکہ میں امر واقعہ کا جان لینا ایک سحر کا اعجاز رکھتا ہے۔ اُن کا ایمان ہے کہ واقعہ کی حقیقت کو جان لو اور مسئلہ کو حل سمجھو۔ اپٹن سنکلیر کے ناولوں میں یہ بات بہت زیادہ موجود ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس کے ناول پڑھ کر طبیعت میں کچھ افسردگی سی آجاتی ہے ایسے ادب میں روانی اور شاعری کم ہوتی ہے۔ انسانی ڈرامے میں رنگ آمیزی نہیں ہو سکتی۔ ایسا ادب زیادہ تر واقعاتی ریکارڈ بن جاتا ہے۔

۹۔ شراب نوشی امریکی زندگی کا ایک جزو ہے۔ ناول، افسانہ، تمثیل اور مصوری میں اس کی ایک نمایاں حیثیت ہے۔ یورپی ممالک کے لئے ادب میں شراب کا ذکر چنداں تعجب خیز نہیں۔ لیکن انڈیا میں ایسے ادب کو حیرت کی نگاہ کی دیکھا جاتا ہے۔ یہاں شراب نوشی معیوب سمجھی جاتی ہے۔ بخلاف اس کے وہاں کی ادبی تخلیقات اور ادیبوں کی روزمرہ زندگی میں شراب ایک معمولی چیز ہے۔ بعض امریکی ہیروز کی خصوصیت یہی تھی کہ وہ شراب پیتے پیتے موت کے قریب پہنچ گئے۔

۱۰۔ امریکہ میں متوسط طبقہ ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ امریکی عوام بھی متوسط طبقہ ہے۔ امریکی ادب میں طبقاتی احساس کا فقدان ہے۔ وہاں کے معمولی کام کرنے والے اپنے آپ کو کل کے کروڑپتی خیال کرتے ہیں۔ ایک مزدور کا اعلیٰ طبقہ میں پہنچ جانا کوئی عجیب بات نہیں۔ امریکی ادب کا مرکزی خیال بھی فرد کی کامیابی اور ترقی ہے۔ امریکی ذہن آسمان کو بھی حدِ نگاہ نہیں سمجھتا۔ دُنیا میں امریکی ذہن سب سے بڑا رجائی ہے۔

۱۱۔ آخری بات قابلِ ذکر وہاں کے ادب کا مالی پہلو ہے۔ امریکہ میں ادبی کاوشوں کا معاوضہ کافی ملتا ہے۔ بعض ادیب اور ناول نگار اتنے مالدار ہیں کہ اُن کا مقابلہ وہاں کے کارخانہ داروں سے کیا جا سکتا ہے۔ وہاں کتابوں کا کاروبار ایک صنعت ہے۔ چونکہ دنیا کے بڑے بڑے ادیب سونے کی تلاش میں امریکہ پہنچتے ہیں اس لئے کتابوں کی منڈی میں مقابلہ سخت اور ادبی معیار بلند ہے۔

یورپ کی مشینی تہذیب نے شاعری کی نشوونما کو روک دیا ہے۔ امریکہ میں بھی شاعری زوال پذیر ہوتی جا رہی ہے۔ مادہ پرست ماحول میں لطیف جذبات کا دم گھٹ چکا ہے۔

تیسری عالمگیر جنگ؟

دُوسری جنگ کا قصہ ابھی ختم نہیں ہوا، خیال کیا جاتا تھا کہ بڑی بڑی حکومتوں کے نمائندے جنگ کے زخموں کے اندمال کی صورت تجویز کر رہے ہیں لیکن ہُوا یہ ہے کہ خود "مسیحا" نے ایک نیا چرکہ لگایا ہے اور یہ اُسی کا اثر ہے کہ ارضِ مقدس پر آج جنگ کے تاریک بادل چھا چکے ہیں۔ فلسطین لاکھوں عربوں کا وطن عزیز ہے اور اُنھیں اس وطنِ عزیز سے محروم کرنے کے لئے دُنیا کی تینتیس "امن پسند" اور "امن خواہ" حکومتوں نے فیصلہ صادر کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ

اس فیصلے کے پیچھے قتل و غارت، لوٹ کھسوٹ، خانہ جنگی اور ایک نئی عالمگیر جنگ کا خطرہ ہے۔ یہودی اس فیصلے پر بغلیں بجا رہے ہیں اور عربوں کی شمشیر آبدار وطن عزیز کی حفاظت کے لئے میان میں بے قرار ہے۔ مشرق وسطیٰ کی یہ جنگ روس اور امریکہ کے لئے ایک "لذیذ طشتری" ہے جسے وہ مزے لے کر چاٹنا چاہتے ہیں۔ لیکن دُور بین نگاہیں اشتراکیت اور سرمایہ داری کو گتھم گتھا دیکھ رہی ہیں۔ اُدھر واقعہ یہ ہے کہ دنیا کے عوام نہ جنگ چاہتے ہیں اور نہ انھیں اس کی خواہش ہے۔

فلسطین کے مسئلے میں حیرت انگیز بات یہ ہے کہ عربوں کا گلا دبانے کا فیصلہ ان تینتیس ملکوں نے دیا ہے جنھیں مشرق وسطیٰ کے معاملہ سے کوئی سروکار ہی نہیں ہے۔ "مجلس اقوام" کی ناکامی کا موجب یہ تھا کہ وہ اپنے اصولوں پر قائم نہ رہ سکی اور اب یو۔ نو بھی تباہی کی طرف جا رہی ہے۔ اس نے نہ صرف جمہوریت کے ابتدائی اصولوں کو نظر انداز کیا ہے بلکہ جو قومیں بلا واسطہ فلسطین سے تعلق رکھتی ہیں ان کا بھی کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا۔ آزاد عربوں پر سفاک "اکثریت" کی مرضی کو مسلط کیا گیا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا یو۔ نو کی اکثریت اس مسئلے میں فیصلہ دینے میں حق بجانب ہے یا عرب ملکوں کی اکثریت؟ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ عربوں کی رائے کا احترام نہ کیا جائے اور انھیں بالکل الگ پھینک دیا جائے۔ وہ سارے ذریعے جو دنیا میں امن و امان واپس لانے کے بتائے جاتے ہیں، تیسری جنگ کا پیش خیمہ ثابت ہو رہے ہیں۔ اس نازک وقت میں عرب بھی اپنی ذمے داری سے غافل نہیں۔ وہ موقع کی نزاکت کو خوب سمجھتے ہیں۔ جمہوریت کے اصولوں کے مطابق وہ اپنی آزادی کے طالب ہیں۔

عرب حکومتوں نے یو۔ نو سے علیحدگی کا اعلان کر دیا ہے۔ اب انھیں یو۔ نو کے منشور پر اعتماد نہیں رہا۔ وہ سارے وعدے جو عربوں سے کئے جاتے رہے تھے انھیں بھلا دیا گیا ہے۔ فلپائن جیسی جمہوری حکومت سے زبردستی تقسیم کے حق میں ووٹ دلایا گیا۔ وہ ممالک جو کل جمہوریت کے نام پر لڑ رہے تھے آج ایک ایسے جرم کے مرتکب ہوئے ہیں جسے تاریخ کبھی معاف نہیں کر سکتی۔ فلسطین پر یہ نظر عنایت کیوں؟ عربوں کی وحدت یورپ کی سیاسی آنکھوں میں مدتوں سے کھٹکتی ہے۔ روس اور امریکہ کی ملی بھگت ان کے ارادوں کی غمازی کر رہی ہے۔ یہ امن کے دیوتا کے پجاری اور یو۔ نو کے مندر کے جاروب کش کل نازیوں کو بدنام کر رہے تھے۔ لیکن آج ان کا اپنا رویہ کیا ہے؟ یورپ کے سیاست دان شاطر کھلاڑی ہیں۔ آئرلینڈ کے بعد ہندوستان اور اب فلسطین —— خونیں داستان کے یہ ابواب! تیسری جنگ کا پیش خیمہ!

اُردو ٹائپ

اُردو کے رسم الخط اور ٹائپ کے متعلق ان صفحات میں کئی بار ذکر آ چکا ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں سید آفتاب حسن صاحب پرنسپل عثمانیہ کالج اورنگ آباد (دکن) کا ایک خط موصول ہوا ہے جسے قارئین کرام کی معلومات کے لئے درج ذیل کیا جاتا ہے۔ ٹائپ کا مسئلہ اگر آسان ہو جائے تو اُردو زبان کی ترقی میں کافی مدد مل سکتی ہے۔

"ابھی اتفاقاً دسمبر کے "ہمایوں" میں "جہاں نما" پر نظر پڑی اور اُردو کے رسم الخط کے مسئلے کو پڑھنا شروع کیا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اُردو رسم الخط کے متعلق لوگوں کی ناواقفیت کس حد تک بڑھی ہوئی ہے۔ کیا اچھا ہوتا کہ لوگ اس پر رائے زنی کرنے سے پہلے حیدر آباد کی کوششوں سے بھی تھوڑی بہت واقفیت حاصل کر لیتے۔

دانیال لطیفی صاحب نے رومن رسم الخط کے جو فوائد گنوائے ہیں وہ غلط فہمی پر مبنی ہیں، ان کا جواب آپ نے دے دیا ہے لیکن اُردو رسم الخط کی جو دقتیں انھوں نے گنوائی ہیں اس کا جواب جناب نے نہیں دیا اور آپ کے جواب مندرجہ صفحہ ۹۳۵ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بدقسمتی سے آپ کو بھی شاید علم نہیں ہے کہ اُردو کے ٹائپ کی موجودہ حالت کیا ہے؟

آپ نے فرمایا ہے کہ "ان تمام باتوں کا حل ہمارے نزدیک یہ ہے کہ جب تک ہمارے یہاں اُردو ٹائپ اور ٹائپ رائٹر کی سہولت میسر نہیں آتی
ضمنی طور پر انگریزی کو بدستور دفاتر کی زبان بنائے رکھیں .... "

شاید آپ کا خیال ہے کہ اُردو کا ٹائپ رائٹر نہیں ہوتا۔ اس کے متعلق عرض ہے کہ اُردو کا ٹائپ رائٹر آج سے نہیں بیس برس سے موجود ہے
خط ریمنگٹن کے اُردو ٹائپ رائٹر پر لکھا جا رہا ہے۔ یہ بہت قدیم ماڈل ہے۔ نئے ماڈل کے حروف اس سے زیادہ خوبصورت ہیں۔ اس کا چھوٹا
ماڈل" بھی ہوتا ہے۔ ریمنگٹن کے علاوہ انڈر ووڈ کمپنی بھی اُردو ٹائپ رائٹر بناتی ہے۔ سب سے خوبصورت حروف کا ٹائپ رائٹر "سلیم حداد" کا ہے جو
کمپنی ہے۔ اس کے ٹائپ رائٹر آج کل کمیاب ہیں۔ شاید کچھ دنوں کے بعد یہ اپنا کاروبار پھر شروع کرے۔

یہ تو ہوا ٹائپ رائٹر کا قصہ اب ٹائپ کی سنئے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ اُردو کے تقریباً ہر طریقہ تحریر جدید کے نستعلیق کا ٹائپ بھی تیار ہو چکا ہے اور نسخ کا بہترین ٹائپ
مطبع سرکار عالی حیدر آباد کا شمار کیا جاتا ہے۔ حیدر آباد کے تیار کئے ہوئے رسم الخط میں مونو ٹائپ مشین تیار ہو چکی ہے جو مونو ٹائپ کمپنی سے خریدی جا سکتی ہے۔
کے علاوہ بمبئی کے ٹائپ کو استعمال کر کے لائنو ٹائپ کمپنی نے اُردو کا لائنو ٹائپ تیار کیا ہے اس کو تیار ہوئے بھی کافی عرصہ ہو چکا ہے۔

اس لئے اگر کوئی یہ کہے کہ اُردو ٹائپ کی تیز رفتار مشینیں نہیں ہیں تو بڑی لاعلمی کی بات ہے۔ موجودہ زمانے میں تیز رفتار طباعت کی مشینوں کی جتنی قسمیں ہیں
سب کی سب اُردو میں موجود ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سوال یہ نہیں ہے کہ اُردو کا رسم الخط موجودہ مشینوں کے بار کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ سوال یہ ہے کہ کیا رسم الخط کو
آسان کیا جا سکتا ہے کہ ٹائپوں کے جوڑ کم ہوں اور طباعت میں مزید سہولت ہو؟

حسب ذیل مسائل غور طلب ہیں جن پر ماہرین رسم الخط اور ٹائپ کو غور کرنا چاہیئے۔

(۱) صحیح نستعلیق کا ٹائپ نہیں بن سکتا۔ حیدر آباد نے اس پر لاکھوں روپیہ ضائع کیا ہے۔ پھر بھی جو ٹائپ بنا ہے اُس میں نستعلیق کا پورا حسن موجود نہیں ہے
اس کے علاوہ اس میں جوڑ بہت ہیں۔ اس لئے کیا ممکن نہیں کہ ایک ایسا خط ایجاد کیا جائے جس میں نستعلیق کا حسن موجود ہو اور جو نسخ کی طرح ایک سیڑھی میں بیٹھ
جائے۔ اگر پرانے زمانے میں نسخ اور تعلیق کو ملا کر نستعلیق بنایا جا سکتا تھا تو اب ایجاد کا دروازہ کیوں بند ہے؟

(۲) نسخ کا ٹائپ بہت خوبصورت ہے اس میں شانِ خطاطی بھی موجود ہے۔ اس کی تمام مشینیں بھی بن چکی ہیں۔ پھر بھی اس میں ابھی جوڑ کافی ہیں۔ کیا یہ
ممکن نہیں کہ ایک ایسا ٹائپ ایجاد کیا جائے جس میں جوڑ بہت کم ہوں اور حسن بھی سلامت رہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ اُردو کی طباعت انتہا درجہ کی
آسان ہو جائے گی۔

جہاں تک مجھے علم ہے اس سلسلے کی پہلی کوشش مولوی سجاد مرزا صاحب (حال معتمد تعلیمات حکومت حیدر آباد) نے کی۔ انھوں نے ایک ایسا رسم الخط ایجاد کیا
جس میں جوڑ صرف ۹۰ کے قریب تھے (معمولی نسخ میں جوڑ تقریباً ۲۵۰ ہیں نستعلیق کے ۳۵۰ سے اوپر ہیں) اس کا نام انھوں نے بنیادی رسم الخط رکھا۔ جوڑ
کی کمی ہو گئی تھی لیکن بدصورت ہے۔ اس خیال کو حکومت حیدر آباد کے دار الطبع نے لے کر ایک دوسرا رسم الخط ایجاد کیا جس میں بنیادی خط کی طرح
کم تھے۔ لیکن کچھ حسن آگیا ہے۔ اس کا نام دار الطبع نے خط عثمانی رکھا۔ یہی وہ ٹائپ ہے جس سے آپ کے رسالہ کے سرورق کے آخری سطر میں ایڈیٹر کا نام
رہتا ہے۔ یہ ٹائپ آسان ضرور ہے لیکن نسخ کے مقابلہ میں بہت بھدا ہے۔ یہاں بھی یہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس کی شکل کو اور بہتر
بنایا جا سکتا؟ ——— یہی دو مسائل ہیں جن پر غور کرنا ہے اور جن کا حل معلوم کرنا ہے۔ یہ ایک انتہائی فنّی چیز ہے۔ اس پر وہی لوگ رائے د
جو خطاطی اور فن ٹائپ سازی دونوں کے ماہر ہیں۔ عام لوگ اگر ان معاملات میں دخل نہ دیں تو نہایت بہتر ہو۔

حیدر آباد نے اپنے مقدور سے زیادہ اُردو کی خدمت کی ہے اور کر رہا ہے۔ اب الحمد للہ پاکستان قائم ہو چکا ہے۔ اُس کو چاہیئے کہ ہاتھ
اور ایک ایسا سرکاری ادارہ قائم کرے جو ان سبھی مسائل پر غور کرے اور قوم کی رہبری کرے۔"

شد محمد اختر

چند روز پاکستان کے دار السلطنت میں

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان قائم ہوگیا۔ کراچی اس کا دار السلطنت کم از کم عارضی طور پر قرار پایا۔ معلوم ہوا کہ وہاں قیام پاکستان کے موقع پر ایک جشن ہونے والا ہے۔ کہا گیا کہ اس نادر تقریب میں وہاں شامل ہونا چاہیئے لیکن مختلف وجوہ سے میں ایسا کرنے سے قاصر رہا۔ غالباً بعض رنج دہ سیاسی واقعات نے ایک امن پسند ادیب کی طبیعت میں افسردگی اور اس کی وجہ سے "خود مرکزیت" کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ لیکن سال کے آخری ماہ میں وہاں آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ اور کونسل کا آخری جلسہ ہونے والا تھا اور اس میں شرکت جذباتی طور پر بھی ایک دلکش چیز نظر آئی۔ مسلم لیگ کا عوامی دور اکتوبر ۱۹۳۷ء میں شروع ہوا اور اس وقت میں لکھنؤ میں آل انڈیا مسلم لیگ کے پچیسویں سالانہ اجلاس میں اپنی قوم کی تجدید حیات کا نظارہ دیکھنے گیا اور اس سے متاثر ہو کر پنجاب مسلم لیگ میں کام کرنے لگا۔ اب سنا کہ اس آل انڈیا لیگ کو ختم کرنے اور اسے دو حصوں میں تقسیم کرنے کی تجویز پیش ہونے والی ہے۔ پچھلے پانچ سال میں میں باقاعدہ طور پر لیگ کی مجلس عاملہ اور کونسل کے جلسوں میں دہلی، شملہ، لاہور اور بمبئی میں شرکت کرتا رہا لہذا ان کے آخری جلسے میں شریک ہونا اور بھی لازم تھا۔ سو کراچی گیا۔

پاکستانی ریل کے سفر کی صعوبتوں کے ذکر سے خوف زدہ ہو کر میں نے ہوائی جہاز سے سفر کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن وہاں بھی ایسی بے قاعدگی سے واسطہ پڑا کہ مجھے لیگ کی مجلس عاملہ میں شرکت کا شرف حاصل نہ ہو سکا۔ آخر ۱۳ دسمبر کی شام کو ٹھٹھرتی سردی میں ہوائی جہاز میں یہ سفر طے ہوا۔ غنیمت ہے کہ آدھی رات کے وقت کراچی میں لیڈی عبداللہ ہارون کے ہاں پہنچ گیا۔

دوسرے روز خالق دینا ہال میں آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل کا اجلاس منعقد ہوا جو دو روز تک جاری رہا۔ یہ خفیہ اجلاس تھا اور اس میں مسلم لیگ کو ہندوستان مسلم لیگ اور پاکستان مسلم لیگ کے دو حصوں میں تقسیم کرنے کا فیصلہ ہوا۔ قائداعظم صدر تھے۔ دو مشہور لیڈروں نے غیر معمولی سیاسی حالات سے فائدہ اٹھا کر لیگ کے مقتدر رہنماؤں کی تجویز تقسیم کو مسترد کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور اپنی تقریروں پر خاصی واہ واہ بھی حاصل کی لیکن اخیر میں جب انھیں صرف پانچ ووٹ ملے تو ظاہر ہو گیا کہ موجودہ تشویش ناک صورت حال میں مسلم قوم کو اپنے قائداعظم کی رہنمائی پر کمل اعتماد ہے اور وہ خوب سمجھتی ہے کہ ایسے نازک وقت میں کسی قسم کی تفریق ہمارے لئے انتہا درجہ ضرر رساں ثابت ہوگی۔

۱۴ دسمبر کی سہ پہر کو قائداعظم (گورنر جنرل پاکستان) کے دولت کدے پر مسلم لیگ کونسل کے ارکان کو عصرانہ دیا گیا جہاں پاکستان اور ہندوستان کے متعدد معزز مسلمانوں کا اجتماع ہوا۔ مدت کے بچھڑے پھر ملے۔

اس کے دوسرے روز مسلم لیگ کا جلسہ ختم ہونے پر ارادہ ہوا کہ دو تین روز اور ٹھہر کر لاہور واپس چلا جاؤں لیکن ایک عزیز کی غیر متوقع اور غیر شادی کے سلسلے میں ان کے تقاضے پر مجھے مزید ڈیڑھ دو ڈھائی ہفتے کے لئے کراچی میں قیام کرنا پڑا۔ وہاں کا موسم لاہور کے مقابل میں معتدل اور خوشگوار میں نے اس مجبوری کے قیام سے فائدہ اٹھا کر کراچی میں سستی سے وقت گزارنے کا تہیہ کر لیا۔

یہ سستی جلد ذرا سی چستی میں بدل گئی۔ یوں تو اس سے پہلے بھی میں دو تین بار کراچی آچکا تھا لیکن اب کی بار کراچی پاکستان کا دار السلطنت تھا کیا کہ پاکستان کے دار السلطنت میں قیام اور سیر و تفریح کا کام اپنے ذمہ لیا جائے تو چنداں حرج نہیں۔

نہ جانے میری یہ عادت غیر معمولی ہے یا نہیں کہ اپنے شہر میں رہے تو خانہ نشین اور دوسرے شہر میں گئے تو آوارہ گرد۔ گھر سے دور جا کر میرا جی ہمیشہ چاہتا ہے کہ گھوموں پھروں لوگوں ملاؤں اور دنیا کو دیکھوں۔ یہ عادت یورپ سے سیکھی کہ جس شہر میں گئے پہلے وہاں کی گائیڈ بک (رہنما کتاب) حاصل

ن کے جغرافیہ کا مطالعہ کیا۔ اُس کے نقشے کو حفظ یاد کیا۔ اپنے بستر یا میز کے قریب اُسے لٹکایا اور ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھتے رہے۔ کراچی کا نقشہ کہیں نہ مل سکا۔ صرف ایک پنجابی دوست نے ایک کاغذ پر سڑکوں کی چند لکیریں کھینچ دیں جس سے زیادہ تسلی نہ ہوئی۔ کچھ ٹیلیفون کی کتاب سے اور کچھ پوچھ گچھ سے میں نے چند صفحات میں اپنے لئے کراچی کی ایک ڈائرکٹری تیار کر لی جس میں چند دوستوں اور چند بڑے آدمیوں اور چند اداروں کے پتے اور ٹیلیفون نمبر درج کر دیئے اور پھر میں لگا ٹیلیفون کرنے اور گھوڑا گاڑی پر سوار ہو کر گھومنے اور سڑکوں پر چلنے پھرنے اور دوستوں اور بھلے مانسوں سے وقت بے وقت ملنے جُلنے۔

حُسنِ اتفاق سے میرے ایک دیرینہ دوست اس زمانے میں کراچی میں بے روزگار تو نہیں لیکن "کثیر الفرصت" ضرور تھے وہ بالفعل پاکستانی حکومت کے اُن بہت سے ملازمین میں شامل ہیں جنھیں بغیر کام کئے تنخواہ ملتی ہے۔ گویہ "فائدہ مند" بیکاری میرے اس "فرصت زدہ" دوست کے لئے سوہانِ روح ہے۔ قصّہ کوتاہ ہماری باہمی خوش قسمتی تھی کہ ان کی کثیر الفرصتی اور میری فارغ البالی آپس میں مل گئیں۔ دونوں ایک دُوسرے کے لئے سُود مند ثابت ہوئے اور مل کر فراغت میں مصروف ہو گئے۔ چونکہ جو واقعات میں بیان کر رہا ہوں ان میں سے اکثر میں ہم اکٹھے موجود تھے۔ اس لئے ان کی صحبت کو پسِ پردہ رکھنا مشکل بھی ہے اور بے معنی بھی، لہذا ـــ اُن کا نام حمید احمد خاں اور کام پروفیسری ہے۔

لیگ کونسل کے بعد عارضی طور پر میں نے عزم بالجزم کیا کہ جہاں تک ہو سکے گا سیاسی اصحاب سے نہ ملوں گا بلکہ صرف ان احباب سے جن کی طبیعت میں ادبیت کا رنگ غالب ہو۔ یہ ٹھان کر میں گھوڑا گاڑی میں سوار ہو کر کراچی کی سمندری تفریح گاہ کلفٹن کی طرف چل نکلا اور بیگم صغریٰ شائستہ سہروردیہ اکرام اللہ کے دروازے پر جا دستک دی۔ سہ پہر کا وقت تھا اور اوپر کی منزل سے ماں بچّوں کے شائستہ و ناشائستہ شور کی آواز آ رہی تھی۔ واضح ہو کہ بیگم صاحبہ گو ایک مشہور سیاست دان کی دختر ہیں اور ایک معروف افسر پاکستان کی زوجہ اور خود بھی بہ نفسِ نفیس پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کی ایک رکن ہیں مگر باوجود ان غیر معمولی اوصاف کے وہ ایک معمولی ہمدرد انسان اور ایک ادیب اور مقالہ نگار بھی ہیں۔ وہ چند برس کے بعد بزم ہُمایوں میں تشریف لایا کرتی ہیں۔ جب میں نے انھیں یاد دلایا کہ ادب کا روزمرہ کی زندگی سے گہرا تعلق ہوتا ہے اور وہ بھی اپنے بچّوں کو جس طریقِ تدریس کے مطابق پڑھا رہی تھیں اس کے متعلق ایک مختصر مقالہ اُردو ادب کے لئے مفید اور دلچسپ ہو سکتا ہے تو انھوں نے فوراً ہمایوں کی خاطر سیاست و ادب کے عملی ارتباط کا وعدہ کر لیا۔ ان کے دریچے سے بحرِ عرب کی موجوں کا نظارہ صاف دکھائی دیتا تھا اور یاد دہانی کراتا تھا کہ پاکستان کے رہنے والے ہندوستان و عربستان کے درمیان ایک زبردست کڑی بن سکتے ہیں۔

ان دنوں میں اُردو کی ہجرت کے کئی نمونے نظر آئے۔ "بابائے اُردو" مولوی عبدالحق صاحب سے تو کہیں جگہ ملنا ہوا۔ سُنا کہ یہاں بھی ایک "حلقۂ اربابِ ذوق" ہے نیز ایک نوزائیدہ "بزمِ ادب"۔ "اربابِ ذوق" کے اصرار پر ۲۱ر دسمبر کو میں نے اُن کے ایک جلسے کی صدارت کی۔ جس میں پروفیسر حمید احمد خاں نے اپنا ایک مختصر مقالہ "اُردو ہجرت کے بعد" پڑھا۔ (جو ہمایوں کے سالگرہ نمبر ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا۔ اس پر خوب بحث ہوئی۔ پھر حقی صاحب نے شیکسپیر کے ڈرامے انٹونی اور کلیوپیٹرا کا منظوم ترجمہ پیش کیا جو فی الحقیقت نہایت کامیاب تھا۔ اس چھوٹی سی مجلس میں کراچی میں ہندوستان اور پاکستان کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے اصحاب شریک تھے اور صاف ظاہر تھا کہ ان لوگوں کے درمیان اُردو تمدّن کی ایک مضبوط کڑی اور اتحاد کا ایک زبردست ذریعہ ہے جس سے ہماری ملکی اور اسلامی حس دونوں کی تسکین ہو سکتی ہے۔

"بزمِ ادب" کے ایک جلسے میں بھی میں گیا۔ یہ عجیب چوں چوں کا مربّہ تھا۔ "بزمِ ادب" کے نام سے خیال تھا کہ یہ اُردو کی ایک بزم ہو گی۔ مگر اس میں ایک یورپی خاتون بیگم فیروز خاں نون نے صدارت کی اور مس عطیہ فیضی نے ہندوستانی موسیقی پر انگریزی میں تقریر کی۔ ڈائس پر افغانی سفیر داد سماعت دے رہے تھے اور حاضرین میں عطیہ صاحبہ کے "خطوطِ شبلی" اور "خطوطِ اقبال" کے متعلق چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ اتنے میں جعفری صاحب نے آ کر اپنے مزاحیہ اُردو اشعار سے ہمیں یہ سمجھنے کی ترغیب دی کہ یہ واقعی بزمِ ادب اُردو ہے۔

ایک شام ممتاز حسن صاحب ڈپٹی سکریٹری محکمہ مالیات نے مجھے ممنون فرمایا اور پنجاب اور یو۔پی کے ادیب دوستوں کی ایک "جسمانی" او

دماغی ضیافت سے لاہور اور دہلی کے ادبی حلقوں کی یاد تازہ کردی۔ ممتاز حسن صاحب کے ادبی چٹکلے اور "منقولے" سُن کر مجھے معلوم ہوا کہ مسلمان یا شاعر کا اقتصادی معاملات سے بے بہرہ ہونا لازم اور لابُدی نہیں ہے۔ کچھ اسی طرح دہلی اور اب پھر کراچی میں اپنے دوست غلام احمد صاحب پرویز سے مل کر یہ ثابت ہو کہ یہ ضروری نہیں کہ مذہبی معاملات میں دخل رکھنے والا انسان ذکاوت و ظرافت سے معرّیٰ ہو۔

انہیں دنوں میں مجھے ایک کتاب کے سودّے کو تنقیدی نظر سے دیکھنے کا کام سپرد کیا گیا۔ یہ حاجی سر عبداللہ ہارون کی مجوزّہ سوانح عمری تھی جسے اُن کی دختر نیک اختر بیگم انور ہدایت اللہ نے (جو موجودہ گورنر سندھ کی بہو ہیں) مسٹر احمد شفیع (ایسٹرن ٹائمز کے مشہور مقالہ نگار) کے ساتھ مل کر انگریزی میں مرتّب کیا ہے۔ چار سال ہوئے جب میں کراچی میں دسمبر ۱۹۴۳ء میں مسلم لیگ کے آخری عام اجلاس میں شرکت کی غرض سے آیا تھا تو بیگم انور نے یہ جان کر کہ مجھے حاجی ہارون مرحوم سے دلی عقیدت تھی مجھ سے اُن کی سوانح عمری لکھنے کے متعلق مشورہ کیا۔ اب انھوں نے اس کا تیار شدہ مسودّہ مجھے دکھایا۔ حاجی صاحب مغفور کی زندگی اس قدر سبق آموز ہے اور مصنفین نے اُسے ایسے دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے کہ میں دو روز کئی کئی گھنٹے اس کے پڑھنے میں منہمک رہا۔ ایک غریب ماں کا بیٹا جو اپنے لڑکپن میں اپنی پڑھائی کے ساتھ چار روپیہ ماہوار کما کر گزر اوقات کرتا ہے بڑھتے بڑھتے ایک کروڑپتی بن جاتا ہے جو پھر لاکھوں روپے خیرات میں صرف کرنے کے بعد لاکھوں روپے کی جائداد کار خیر کے لئے وقف کر دیتا ہے۔ سر عبداللہ ہارون نے کبھی اعلیٰ تعلیم نہیں پائی۔ وہ کہنے کو محض ایک تاجر تھے۔ لیکن قوم کا درد شروع سے اُن کے دل میں موجزن تھا اور سیاسی معاملات میں اُن کی نظر دُور رس تھی۔ اُن کی عمر ۴۷ برس کی تھی جب ۱۹۱۹ء میں انھوں نے عدم تعاون اور خلافت کی تحریک میں عملی طور پر حصّہ لیا۔ آئندہ سال وہ سندھ مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے۔ ۱۹۲۶ء سے تادم مرگ ۱۹۴۲ء تک سولہ برس وہ سنٹرل اسمبلی کے ممبر رہے۔ وہ اُن پہلے آدمیوں میں تھے جنھوں نے ۱۹۴۰ء سے قبل پاکستان کا نصب العین قوم کے سامنے پیش کیا۔ وہ یقیناً ہر معنی میں ایک پُرخلوص مُسلمان تھے جن کی زندگی قوم کے نوجوانوں کے لئے مشعلِ ہدایت ہے۔ میں نے اُن کی سوانح عمری کے محض بعض حصّوں پر ایک سرسری نظر ڈالی اور بیگم صاحبہ کو مشورہ دیا کہ وہ اُسے ایک غائر اور تنقیدی نگاہ سے دیکھنے کا کام پروفیسر حمید احمد خاں کے سپرد کریں۔

حسب معمول خرید و فروخت کے معاملہ میں میری دلچسپی ایک ہی جنس سے تھی: کتابیں۔ اس بارے میں مجھے ایک ہم نوا کی شبانہ روز محبت حاصل تھی۔ اور وہ تھا میرا بیٹا منظر بشیر۔ ہماری ہم نوائی میں فرق اتنا تھا کہ وہ دوکانوں میں انگریزی نظم اور مغربی موسیقی کی کتابوں کا متلاشی رہتا تھا اور میں عالمگیر سیاست یا پاکستانی لٹریچر کا۔ لاہور کے مقابلے میں ہم نے کراچی کی دوکاناتِ کتب کو اونچی دوکان پھیکا پکوان کا مصداق پایا۔ پارٹی پروپیگنڈا کے چند پمفلٹ تو میں پہلے لیگ کونسل کی نشستوں پر بکھرے ہوئے دیکھ چکا اور جمع کر چکا تھا۔ "پاکستان کا مستقبل"۔ "کمیونسٹ پارٹی کی اپیل اہلِ پاکستان سے" "پاکستان کی لاج" اور "اینگلو محمڈن نوابوں کا راج" لیکن دوکانوں میں کسی کار آمد نئی کتاب کا کھوج نہ ملا۔ آخر ایک برائے نام کتاب نظر پڑی اور خرید لی۔ اس کا عنوان تھا "Prospects & Potentialities of Pakistan" "پاکستان کے امکانات اور مضمر وسائل"، اس کا حجم ۴۸ صفحات تھا اور اس کے مصنف کوئی پارسی بھاؤالا تھے۔ اس پر کتابچہ کا نام بمشکل ہی عاید ہو سکتا ہے۔ کراچی کی سیر کی یادگار کے طور پر میں نے مجبوراً اسے پانچ روپے میں خرید لیا۔ جس سے ایک تاجر قوم اور امیر اور ایک "حاکم" قوم اور غریب ہوگئی! ان دنوں میں میرا کتب بینی کا شوق زیادہ تر منظر کے "ریڈرز ڈائی جسٹ" اور اس قسم کے امریکی و انگریزی رسائل سے پورا ہوتا تھا۔ ایک رسالہ Coronet (کارونٹ) میں "درخت" پر ایک مشہور انگریزی نظم کو نقل کرکے اس کے اشعار کے ساتھ ساتھ مختلف قسم کے درختوں کی لاجواب تصویریں تھیں۔ درخت کیا تھے جیتی جاگتی ہستیاں معلوم ہوتی تھیں۔ مثلاً ایک درخت تھا جو زیادہ تر ایک طرف کو جھکا ہوا تھا گویا کسی چیز کی طرف مائل یا کسی نصب العین کے لئے ساعی تھا وہ اس مصرع کی تصویر تھا "ایک درخت جو دن بھر خدا کو تکتا رہتا ہے"۔

کتابوں کو دیکھنا تو خیر اُن کے پڑھنے کے لئے پاکستان کے دارالسلطنت میں زیادہ وقت نہ ملتا تھا۔ سیر اور میل جول سے جو وقت بچتا اس کے لئے اخبارات کافی تھے۔ بلکہ دن اخبارات ہی سے شروع ہوتا تھا اور جسے اخبارات کے مطالعہ کی بُری عادت ہو اُس کے لئے آج کل کی ہنگامہ خیز دنیا میں ہر روز صبح

ت سا بُرا بھلا لٹریچر برابر موجود رہتا ہے! مثال کے طور پر ملاحظہ ہو:- ۲۷ دسمبر امریکی برگیڈیر رسل ہے" نے جو کشمیر میں آزاد حکومت کے لئے لڑ رہا ہے جنگ
یر کو امریکی جنگ آزادی سے مشابہت دی۔ ۲۰ جنرل طارق نے قوم سے اپیل کی کہ وہ جنگ کشمیر میں جان و مال کی بازی لگا دے۔ ۲۲ قائد اعظم بڑے
ا ووٹ بن گئے۔ لاہور میں سردی سے ایک رات میں چار سو مہاجرین مر گئے۔ ۲۵ قائد اعظم کی سال گرہ پر کراچی میں عوامی اور فوجی مظاہرے ہوئے ۲۷
اچی میں ٹاٹا کمپنی کا ہوائی جہاز فضا میں ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور سب مسافر ہلاک ہو گئے۔ ۲۷ قائد اعظم نے اپنی تقریر میں کہا کہ "ہم لوگ آج کل آگ میں سے
گزر رہے ہیں۔ ابھی وہ دن نہیں آئے کہ ہم مزے سے چمکتی دھوپ سے لطف اُٹھائیں"۔ ۲۷ چودھری ظفراللہ خاں پاکستان کے وزیر خارجہ مقرر ہوئے
ں پر ہر طرف سے خوشی کا اظہار ہوا۔ ہندوستان میں (۱۵ کو) کھڑک سنگھ نے سکھوں کے احمق قائدین کی قیادت پر اظہار افسوس کیا۔ ۱۸ گاندھی جی نے
ردو کو ایک ہندوستانی زبان تسلیم کیا۔ ۱۹ حکومت ہند نے انجمن ترقی اُردو کو دہلی میں موعودہ قطعہ زمین دینے سے انکار کر دیا۔ ۲۹ پٹیل نے مطلع کیا کہ ہندوستان
ہر روز جنگ کشمیر پر ۴ لاکھ روپیہ صرف ہو رہا ہے۔ بیرونی ممالک میں (۱۵ کو) وزرائے خارجہ کی کانفرنس ناکام ہو کر ختم ہو گئی۔ ۲۵ چین میں کمیونسٹ فوجیں
یش قدمی کرنے لگیں اور ۳۰ کو رومانیہ ایک جمہوریہ بن گیا۔

اس قسم کی خبروں سے ہمارے دن شروع ہوتے اور ختم ہوتے ہیں اور یہ ہے ہماری زندگی، کائنات کے نقطۂ نظر سے یہ شاید ایک لطیفہ ہے یا حماقت
کا اظہار لیکن دُنیا کے نقطۂ نگاہ سے ایسی روزانہ خبریں ہماری زندگی کے لئے ایک تلاطم کا کام دیتی ہیں۔ کہتے ہیں زندگی کے معنی حرکت ہیں اور حرکت میں برکت
ہے۔ پھر تو ہم بڑے ہی زندہ اور بابرکت لوگ ہیں۔ خدا کی رحمت، ہو ہم پہ!

یہ اخبارات اور یہ واقعات بھلا کب مجھ سے" ابو کسلان" کو چین سے پڑا رہنے دیتے۔ جی میں آیا کہ میں بھی کچھ کروں۔ بڑا آدمی نہیں بن سکتا تو کم از
کم چند بڑے آدمیوں سے مل ہی لوں۔ شاید اُس روشنی کی کوئی بھولی بھٹکی کرن میرے تاریک دل پر بھی پڑ جائے۔

۲۵ دسمبر کو قائد اعظم کی اکہترویں سال گرہ تھی یعنی وہ ۷۱ برس کے ہو گئے۔ اُس روز شام کو وزیر اعظم پاکستان کے ہاں پارٹی تھی اور پھر گورنر
سندھ کے ہاں کھانا تھا۔ ان دونوں تقریبوں میں ہم بھی شامل ہوئے۔ ملکی اور غیر ملکی اصحاب اور خواتین شریک تھیں۔ کئی لوگوں سے ملنا ہوا بعض سے
مہینوں اور بعض سے برسوں کے بعد۔ انڈونیشی نمائندے مسٹر ادہم سے مل کر اور ناساعد حالات میں اُن کے قومی جذبے اور مستقل مزاجی کو دیکھ کر میں بہت متاثر ہوا۔

اب میری پیاس ذرا بڑھی اور میں حکومت پاکستان کے بعض وزراء اور سکریٹریوں کے ہاں پہنچ کر اُن سے ملا۔ وہ سبھی بے انتہا مصروف معلوم ہوتے تھے۔
ان میں بعض تھکے ماندے تھے اور بعض باوجود کمزوری صحت کے جذبۂ قومی سے ہمہ تن معمور۔ قومی اداروں کے بعض سرگرم کارکنوں سے بھی ملنا ہوا ان میں "ڈان" کے لائق
ایڈیٹر اور مشرقی پاکستان کے لیگی رضا کاروں کے ناظم مسٹر مہاجر اور سندھ مدرسہ کے نایب پرنسپل جمیل واسطی صاحب تھے۔

ایک دن واسطی صاحب مجھے اور حمید احمد خاں صاحب کو سندھ مدرسے لے گئے جس میں سکول اور کالج دونوں شامل ہیں۔ یہی وہ سکول ہے جس میں
قائد اعظمؒ نے اپنے بچپن میں تعلیم پائی۔ مدرسہ میں ایک سُنّی اور ایک شیعہ مسجد ہے اور ایک اور عجیب بات ہے کہ کالج میں لڑکے اور لڑکیاں مل جُل کر تعلیم پاتی
ہیں۔ بظاہر ہر جماعت میں ایک پردہ دار گوشہ ہے لیکن معلوم ہوا کہ اب عملاً پردہ ختم ہو چکا ہے۔ ہمارے سامنے سائنس کی جماعت میں دو لڑکیاں پروفیسر
صاحب سے عملی سائنس کی تعلیم لے رہی تھیں۔ پردہ دار گوشے میں عملی سائنس کا سبق دینا مشکل کام ہے۔

ایک روز مجھے خیال آیا کہ پاکستان کے بحری "بیڑے" کا معاینہ کیا جائے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ بمبئی میں اُس کی مرمت ہو رہی ہے۔ لیکن منظر
کے ایک دوست مسٹر احسن نے جو پاکستان بحری سروس کے ایک ممتاز رکن ہیں اور آج کل گورنر جنرل کے ایک خاص اے۔ ڈی۔ سی ہیں یہ انتظام کیا کہ ہم
"بادشاہ سلامت کے پاکستانی جہاز بہادر" کی سیر کر سکیں۔ یہ پاکستانی "جہاز" ایک عجیب و غریب "جہاز" تھا جو جزیرہ منوڑہ کے خشک خطّے پر سمندر کے
کنارے ایک وسیع و عریض عمارت کی شکل میں کھڑا تھا۔ یہ دراصل ایک جہازی تعلیم گاہ ہے جسے استعارۃً جہاز کہا جاتا ہے۔ جہاز کے مختلف محکموں اور جماعتوں
کو دیکھنے کے بعد اُس کے وسیع میدان میں سے گزرتے ہوئے ہم اُس کے کمانڈر علوی صاحب کے یہاں پہنچے جنھوں نے اپنی انتہا درجہ فصیح و بلیغ تقریر سے تھوڑی دیر

کے لئے ہیں گویا ایک مردِ مومن بلکہ ایک مردِ مجاہد سے دوچار کر دیا اور پاکستان پر اس وقت جو مشکلات ایک کالی گھٹا بن کر چھائی ہوئی ہیں اُن پر نورِ ایمان کی روشنی ڈال کر ہمارے دلوں کو تازہ اُمیدوں اور ولولوں سے لبریز کر دیا۔ علوی صاحب نے کہا مسلمانوں کو خدا کا شکر کرنا چاہیئے کہ انھیں قدرت نے ایسی زبردست آزمائش میں ڈالا ہے اور پھر ایسی شاندار سلطنت کا تحفہ ان کو پیش کیا ہے۔ انشاء اللہ ہم اس آزمائش میں پُورے اُتریں گے اور اگر خدانخواستہ ایسا نہ ہُوا تو پھر ہم اسی قابل ہیں کہ زمانہ ہمیں مٹا کر رکھ دے۔ علوی کی بات بات میں اقبال کا کوئی نہ کوئی شعر یا مصرع ایک نگینے کی طرح جڑا ہوا تھا۔ اس ملاقات کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ ہماری تمام کمزوریوں کا علاج فقط یہی ہے کہ ؏ "یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم!"

۱۹۴۷ء کے آخری دن ایسی ہی پاکستانی خیال آرائیوں میں گزر گئے۔ میرا ارادہ تھا کہ ۱۹۴۸ء کا نوروز اپنے وطن لاہور میں طلوع ہو لیکن منظر اُسے اپنے دوست احسن کی معیت میں گزارنے پر مُصر ہوا سو اپنے لئے میں نے ارادہ کیا کہ سب میل جول چھوڑ کر اس دن کو سکون اور سُستی میں گزارا جائے۔ لیڈی ہارون صاحبہ کے دولتکدہ کے پاس ایک پبلک باغ وکٹوریہ پارک ہے جس کے وسط میں فریئیر ہال کی لائبریری اور اس کے ایک طرف شاہ ایڈورڈ ہفتم اور دُوسری طرف ملکہ وکٹوریہ کا بُت باغ کو آراستہ پیراستہ کئے ہوئے ہے نوروز کو میں ہارون منزل سے ٹہلتا ٹہلتا ذرا باغ چل" یہاں پہنچا" موسم کا یہ عالم کہ "سردی ہوا میں پر نہ زیادہ بہت نہ کم"۔ جب میں جناب ایڈورڈ کے پاس پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سبزہ زار پر ایک ادھیڑ عمر کا آدمی اور ایک نوعمر لڑکا چند رنگین بوتلیں سامنے رکھے بیٹھے ہیں۔ ان کی بدتمیزی پر حیران ہوا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ میں اُدھر لپکا کہ تماشا دیکھوں، اتنے میں وہ آدمی ایک پٹھان کے لہجے میں بولا۔ "خو شیخ جی! سر کی مالش کرائے گا؟" میں نے سوچا کیسے بدتہذیب لوگ ہیں اور کیوں ان کو اس خوبصورت باغ میں آنے کی اجازت دی جاتی ہے؟ اور کون ہوتے ہیں وہ لوگ جو ایسی جگہ آکر مالش کراتے ہیں؟ وہ پھر بولا "خو سر کی مالش صرف چار آنے" اور دونوں باپ بیٹا میرے پیچھے پڑ گئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ اُن کی متحرک دُوکان کا میں ہی پہلا اتفاقی گاہک ہوں۔ میں ہنس پڑا اور اس ہنسی کے ساتھ ایک نخت میرے دل میں کسی مسخرے نے کہا ارے میاں سنجیدہ احمد! تم نے اپنی ساری جوانی سنجیدگی اور متانت میں گزار دی، آج نوروز ہے، تم ۴۵ برس کے ہونے والے ہو۔ آج دنیا بھر میں چھٹی کا دن ہے کبھی تو تم بھی اپنی عقل کو چھٹی دو، چلو آج ایک گنوار کی طرح اس مہذب باغ میں سر کی مالش کرا دیکھو، کیا عجب ہے کہ اس مالش کے جھٹکوں سے تمہارا دماغی توازن بدل کر تمھیں کسی سیدھے رستے پر لگا دے جسے تم آج تک ٹیڑھا سمجھتے رہے ہو۔

"اچھا خان! ہم مالش کرائیں گے" میں نے کہا "لیکن یہاں سے ذرا دُور" (یہ کہہ کر میں نے درخت کی آڑ میں ایک بنچ کی طرف اشارہ کیا) میں نے اُس کے اوزاروں کی طرف دیکھا اور کہا "تم کس طرح مالش کرتے ہو" اُس نے کہا "خو اگر تم کو تکلیف ہوا تو چار آنہ مجھ پر جرمانہ اور اگر تم خوش ہوا تو خو چار آنہ اُجرت اور چار آنہ انعام"۔ اب میرے سر سے جناح ٹوپی اُتر کر مالش کا عمل شروع ہو چکا تھا کیسی کیسی حرکتیں ہوئیں۔ کیسے کیسے جھٹکے لگے کیسے کیسے تیل ملے گئے کچھ نہ پُوچھیئے۔ اب ادھر میں کہوں کہ جان چھوٹے لیکن وہ ادھر اپنے چار آنے پورا کرنے میں مصروفِ عمل، کبھی کہوں میں کہاں احمق بن کر آن پھنسا اور کبھی جی کو تسلی دوں کہ خوب لُطف آ رہا ہے۔ سر تیل سے لت پت ہو رہا تھا میں نے کہا "خان! اب بس کرو بس کرو ہمیں دیر ہوتی ہے"۔ "خو فکر مت کرو۔ تیل کا کام ہم سمجھتا ہے"۔ میں نے کہا "خان! ہمارے بال کم ہیں زیادہ تیل نہ ملو" خان نے کہا "خو تیل سر میں جاتا ہے بال میں نہیں رہتا"۔ جب مالش ہو چکی تو اُس نے کہا اب سر کو ڈھیلا چھوڑ دو۔ ڈھیلا چھوڑنا تھا کہ اُس نے ایک نخت سر کو کندھے کی طرف زور سے جھٹکا دیا۔ ایسا معلوم ہوا کہ میرا سر تن سے جُدا ہو گیا۔ اُس نے پہلے میرا سر ایک طرف جھکا کر میری گردن چٹخائی۔ جس سے سر جیسے ہلکا سا ہو گیا۔ آناً فاناً اُس نے میرا سر دوسری طرف جھکا دیا اور اُدھر بھی گردن اسی طرح چٹخائی۔ یہ ہو چکا تو میں اُٹھا اور اُٹھتے ہی فوراً اُسے ایک روپیہ چار آنے دیا اور کپڑے جھاڑتا خدا کا شکر بجا لاتا باغ سے چل نکلا کہ بال لت پت ہوئے تو بلا سے لیکن شکر ہے کہ سر تو میرے کندھوں پر قائم رہا!

یہ تھا نوروز! دوسرے روز ۲ر جنوری کو ہم ریل میں سوار ہوئے اور ۳ر جنوری ۱۹۴۸ء کی رات کو پاکستانی گرد پھانکتے بخیریت لاہور پہنچ گئے یُوں کہ ہم مسافر ؏ "بہ سلامت چلے و باز آئے!"

بشیر احمد

غزل

ابھی نہیں اگر اندازۂ سپاس ہمیں
تو دی ہے حشر میں کیوں تابِ التماس ہمیں

اُفق اُفق پہ نقوشِ قدم نمایاں ہیں
تلاش لائی کہاں سے تمھارے پاس ہمیں

گنہ یہ تھا کہ سبُو پر نگاہ کیوں ڈالی
تمام عُمر کی بخشی گئی ہے پیاس ہمیں

لویں لپیٹ کے روتے ہیں حسرتوں کے چراغ،
نہ آسکے گا نزا التفات راس ہمیں

کبھی قریب سے گزرے بدن چُرائے ہوئے
تو دُور تک نظر آتے رہے اُداس ہمیں

جو ہو سکے تو اس ایثار پر نگاہ کرو
ہماری آس جہاں کو تمھاری آس ہمیں

یہ پوچھنا ہے کب آدم زمیں پہ اُترے گا
جو لے چلے کوئی کامل۔ خدا کے پاس ہمیں

یہیں ملیں گے تمھیں پھول بھی ستارے بھی
بتا رہی ہے دل آویزیٔ لباس ہمیں

سُنا ہے آئینۂ روئے دلبری میں ندیمؔ
فریب دے گا ہمارا ہی انعکاس ہمیں

احمد ندیم قاسمی

عصمت کا تحفّظ

ایشیائی طرزِ بود و باش کو مدِنظر رکھتے ہوئے بچ بچ کر بات کرنی لازمی ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ ایشیائی تمدّن کسی قسم کا مہلک مرض ہے اور مریض کو اُس کی نازک حالت سے مطلع کرنا اسے ضرورت سے پہلے اگلے جہان کا فری پاس دینا ہے۔ مطلب صرف اس قدر ہے کہ ایشیائی تمدّن کی خوبیاں خود اپنا گلا گھونٹنے میں از حد کامیاب ہو رہی ہیں۔ ایشیا میں عصمت کا تحفّظ یوں ہوتا ہے کہ دوشیزہ شباب سے پہلے دوشیزہ نہ رہے۔ اس رکھ رکھاؤ میں ہزاروں لاکھوں شباب ہر سال قربانی کے بکرے بنتے ہیں۔ نیچر کی بے پروائی کی وجہ سے کم سن مائیں عام ہیں اور یہی بچاریاں ۳۲، ۳۴ سال کی عمر تک نانیاں بھی بن جاتی ہیں۔ اگر خدانخواستہ کسی شادی شدہ خاتون کے دو چار سال اولاد نہ ہو تو عجیب عجیب قسم کی چارہ جوئی میں شباب کے واپس نہ آنے والے شب و روز مرادوں کی آرزوؤں میں ہر قسم کی تلخی کا شکار بنتے ہیں۔ دعائیں، دوائیں، دُوسری شادی کا ڈراوا، بھوت مذکورہ خاتون کو جونکوں کی طرح چمٹ کر لہو چوسنے میں مشغول ہو جاتے ہیں اور جب تک بیٹی یا بہو ماں نہ بنے ماں اور ساس کو چین نہیں آتا۔

بچے ہونے ہیں تو تابڑ توڑ۔ شوہر کی کمائی محدود، بچوں کا خرچ غیر محدود۔ کھاتے پہنتے شروع سے ہیں کمانے کا نام بیس بائیس سال تک نہیں لیتے "عصمت" بقول ایک منہ پھٹ "غربت" کی ماں ہے۔ راقم سطور کو اس کلیہ سے اتفاق نہیں مگر انگریزی پڑھوں کے سر پر اعداد و شمار کا جن ایسی بُری طرح سوار ہے کہ جوان ہوائیں گنواتے ہیں۔ اوسطاً ہر چوبیس سالہ لڑکی کے تین بچے ثابت کرتے ہیں۔ اوسط آمدنی بیس تیس ماہوار، اوسط خرچ ۳۰، ۳۵ ماہوار، دائیاں ڈاکٹر غائب، دُکھ درد موجود، ان ہندسہ بازوں سے تو خدا سمجھے مگر کسی حد تک یہ ضرور صحیح ہے کہ عصمت کے تحفّظ کا جو طریقہ رائج ہے وہ مقروض ہونے کی شاہراہ ہے۔ عصمت لازماً ہر خوبی سے مقدم ہے مگر قرض ہر بُرائی کا پیش خیمہ ہے۔ اگر کوئی تدبیر ہو سکے کہ میاں قرضے سے بیوی عصمت کو طلاق حاصل ہو جائے تو ایشیائی بود و باش چمک اُٹھے۔

پاکستان میں جہاں صنعتی اور تجارتی ترقی کا ڈھول پیٹا جا رہا ہے، کاش کوئی ہوش مند یہ اعلان بھی کر دے کہ جو قرض ایک سال میں ادا نہ ہو سکے (یعنی بغیر دوسرا قرض لینے کے) اور جس قرض کی شرح سود تین فی صدی سے زیادہ ہو وہ قانونی چارہ جوئی سے مستثنیٰ ہیں۔ علاوہ ازیں یہ بھی قانون بنا دیا جائے کہ شادی کے لئے قرض ممنوع اور شادی سے پہلے تین بچوں کی تعلیم اور پرورش کا بیمہ لازمی۔ قانون کی ایک دفعہ یہ بھی ہو کہ جس شخص کے یہاں چار بچے موجود ہوں اور اس کے یہاں پانچواں بچہ ہو تو اُسے سات سال کی قید تنہائی۔ پھر تو اکثر مسلمان مرد مزے سے جیل میں زندگی کاٹیں۔ بیویوں کو بھی ہوش آ جائے کہ نسل کشی کی مشین بنا اور متواتر اس مشقت میں مصروف رہنا شائستہ شیوہ نہیں۔

اے کاش شاعر کا قول ع

"دُنیا میں گرانباریٔ اولاد غضب ہے"

لوگوں کی سمجھ میں آ جائے۔

فلک پیما

غزل

میں نے کہا کہ راز چھپایا نہ جائے گا! بولے کسی سے مُنہ بھی لگایا نہ جائے گا

ہو ایک دو گھڑی کا تو ہم جی پہ سہ بھی لیں آٹھوں پہر کا غم تو اُٹھایا نہ جائے گا

اس نامراد دل نے یہ ٹھانی ہے آخیال! سوئی محبتوں کو جگایا نہ جائے گا

ہر غنچہ دل گرفتہ ہُوا سُن کے میری بات چھوڑو بھی اب وہ قصّہ سُنایا نہ جائے گا

اُس لالہ رُخ نے دیکھا بھی میرے جگر کا داغ اُس سے تو میرا غم بھی بٹایا نہ جائے گا

کس بھاری دل سے جاتے ہیں ہم اس کے در پہ آج سر جھک گیا وہاں تو اُٹھایا نہ جائے گا

کس کی نظر کے کانٹے پہ تُلتا ہے برگِ گُل تیرے سُبک لبوں سے بتایا نہ جائے گا

ہر لالہ اس چمن کا ہے بے داغِ آرزو شبنم سے یہ چراغ جلایا نہ جائے گا

مسعودؔ باغِ ہند میں کیا آ گئی بہار

ہم سے تو اس بہار میں گایا نہ جائے گا

مسعود حسین

اَدب اور سائنس

گزشتہ دَور کے اُردو شعر و ادب کے تجزیئے کے بعد ہمیں دو باتیں خاص طور سے معلوم ہوتی ہیں۔ اوّل تو یہ کہ ادب ہمیشہ سے ارتقائی شکلیں اختیار کرتا رہا ہے۔ فن کے لحاظ سے بھی اور موضوع کی حیثیت سے بھی۔ دوسرے یہ کہ ادب کا دائرہ روز بروز زیادہ وسیع ہوتا گیا ہے۔ پہلے انفرادی حقیقتیں بیان کی جاتی تھیں، پھر وطنی اور قومی نظمیں لکھی جانے لگیں اور جب اجتماعیت دماغوں پر زیادہ مسلّط ہو گئی تو انسانیت کا درس دیا جانے لگا۔ یا فرد کو انسان بنانے کی کوششیں شروع ہو گئیں لیکن اس دوسری جنگ عظیم نے دیگر دور رس اثرات کے ساتھ ساتھ ادیب کی انفرادیت پر جِلا بھی کر دی ہے اس لئے ادبی رُجحانات میں بھی اس انفرادیت نے مختلف رنگ آمیزیاں کی ہیں۔ آج کا ادیب اور شاعر اپنی زندگی کے قریب قریب ہر پہلو کا شعور رکھتا ہے یا دوسرے الفاظ میں ہیئتِ اجتماعی سے وابستہ ہے۔ کیونکہ ان دونوں احساس کے زاویوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ ناقص انفرادیت اجتماعیت کی راہ میں سنگ گراں بن سکتی ہے لیکن وہ انفرادیت جو زندگی کی کشمکش سے نشوونما پاتی اور حوادث کی آغوش میں پلتی ہے کبھی اجتماعی رُوح سے انحراف روا نہیں رکھتی کیونکہ اس انفرادیت میں نظامِ حیات کا بیدار احساس بھی شامل ہے اس لئے ہر ذہین اور واقف کار ادیب (لوئی ممفرڈ کے الفاظ میں) اپنے سینے میں سارے مُعاشرے کا حامل ہوتا ہے۔ آج کے اُردو ادب میں بھی ادیب کی انفرادیت مادّی پہلو کے گوناگوں مظاہر کی حامل ہے اور صرف ایک شخص کی جنسی زندگی سے مراد نہیں ہے۔

اس دور میں شاعروں اور ادیبوں نے بہت سی ایسی حقیقتوں کو پیش کیا ہے جنھیں اب سے پہلے ادب و شاعری کی حدود سے باہر سمجھا جاتا تھا۔ آج اگر یہ کہا جائے کہ ادب و سائنس میں بھی ایک ربط ہے جو غیر محسوس سہی لیکن غیر اہم ہرگز نہیں، تو یہ زیادہ چونکا دینے والی بات نہیں ہوگی۔ شیلے نے بہت پہلے اس حقیقت کو معلوم کر لیا تھا کہ شاعری (اور اس لئے مجموعی حیثیت سے ادب بھی) علوم کا مرکز بھی ہے اور محیط بھی۔ سائنس زندگی پر نہایت اہم اور وسیع اثر مترتّب کرتی ہے اور ادب زندگی کو صحیح رنگوں میں پیش کرنے کا دعویدار رہا ہے۔ لہٰذا یہ تعصّب کسی طرح درست نہیں کہا جا سکتا کہ ادب کے مقدس حلقے میں سائنس کو قدم رکھنے کی اجازت نہ دی جائے۔ سائنس کی ایجادات و انکشافات کو ہم جہنمی اختراعات کہہ کر بھی ان سے دامن نہیں بچا سکتے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ آج سائنس کی انتہائی ترقی یہی سمجھی جاتی ہے کہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ جسم بے جان کر دیئے جائیں لیکن اس برق و آہن کے عہد میں صرف اتنا ہی جان لینا کافی نہیں ہے۔ جہاں ہمیں ایک جانب سائنس کی تعمیری صلاحیتیں پیش نظر رکھنا ہیں وہاں یہ سمجھنے کی بھی ضرورت ہے کہ ہم ایسے مادّی دَور میں بس رہے ہیں جہاں طاقت کے بغیر حق کا وجود نہیں ہے بڑے سے بڑا اجتماعی اصول جیسے انسانی فلاح و بہبود کے لئے وضع کیا گیا ہو اس وقت تک کوئی اہمیت نہیں رکھتا جب تک اس کی پشت پر توپوں کی گرج، فلک پرواز طیاروں کی قطاریں اور موت و ہلاکت پھیلانے کی شیطانی قوتیں نہ ہوں۔ اگر انسانیت شیطانیت پر غالب آنا چاہتی ہے تو اسے اس کا مقابلہ انھیں ہتھیاروں سے کرنا ہوگا۔

سائنس اپنی تمام تباہ کاریوں اور شورش آفرینیوں کے باوصف ایک باعظمت وجود ہے۔ یہ ایک ایسا طوفان ہے جس نے ذہنِ انسانی میں تلاطمِ عظیم برپا کر دیا ہے۔ ہمیں اس طوفان سے ڈرنا نہیں چاہیئے کیونکہ ہماری زندگی خود طوفانی ہو گئی ہے۔ ہم وقت کی پُرشور لہروں پر بہ رہے ہیں اور ہمارے اوقیانوسِ حیات میں ایسا خروش ایسا سیلاب پہلے کبھی نہیں دیکھا گیا تھا۔ پھولوں کی چھاؤں میں عہدِ بے فکری کے دن رات گزارنے اور بیداریوں میں سرور انگیز خواب دیکھنے کا زمانہ چلا گیا۔ اب خارا شگافی اور آتش آشامی کا وقت ہے۔

ابتدائی عہد کے انسان کی شاعری آج کی شاعری سے بہت مختلف تھی اور اس زمانے کے ادب میں مظاہرِ فطرت کو انسانی تصوّر نے تقدس کا رنگین ہالہ

بخشتا تھا۔ کوہسار کی برفانی چوٹیوں، میدان کی حدِ نگاہ تک پھیلی ہوئی ہریالیوں اور سرسبز و شاداب وادیوں میں انھیں کسی بلند و ارفع طاقت کی جھلک نظر آتی تھی۔ لیکن آج جبکہ سائنس نے تمام عناصر کو ہمارا غلام بنا دیا ہے ہم اس انداز سے نہیں سوچ سکتے حقیقت سامنے آجانے کے بعد مفروضات کے لئے گنجائش نہیں رہتی۔ اب انسان نے عناصر کی وحشی طاقتوں کو رام کر لیا ہے اور ان بہت سے بھیدوں کا جو سینۂ کائنات میں پنہاں تھے، پتہ چل گیا ہے۔ اس طرح انسان صحیح معنوں میں "کردگارِ برق و باراں" ہوتا جا رہا ہے۔ لہٰذا آج کا ادب بھی ابتدائی عہد کے انسان کا ناواقفانہ جذبۂ حیرت و پرستش نہیں ہے اور یہ امید بھی درست ہے کہ اس ادب میں سائنس کی ان جدید دریافت شدہ حقیقتوں کا ادراک پایا جائے گا۔

ایک عرصے تک ہمارا ادب عقلیت سے بے نیاز تخیلی فضا میں پروان چڑھتا رہا۔ خیال کی سُرعت و بلند پروازی کسی روک تھام کی متحمّل نہیں تھی۔ لیکن اس دَور کے ادب میں خیال کی بے اعتدالی کے باوجود حیرت انگیز معصومیت اور طفلانہ خلوص کی جھلک پائی جاتی ہے۔ سچ بھی یہ ہے کہ ادب اور زندگی دونوں اپنے عہدِ طفولیت میں کہانیوں سے جی بہلاتے ہیں۔ معاشی نظام کی یکسانیت اور مستقبل کی غیر یقینی کیفیت نے مافوق الفطرت کرداروں کو جنم دیا۔ اِن کرداروں نے شہنشاہی نظام کے سایۂ عاطفت میں تابندگی حاصل کی کیونکہ شہنشاہیت کا مدار ہمیشہ ذاتی تعصبات اور اتفاقات پر رہا ہے۔ اس اتفاق ہی کی بدولت ایک انسان کو ملک کے سیاہ و سفید کا اختیار دے دیا جاتا ہے۔ اس کے افعال پر سماجی اخلاق کی گرفت نہیں تھی کیونکہ وہ مروّجہ اخلاق سے بالاتر تھا اور زمین پر خدا کا سایہ سمجھا جاتا تھا۔ یہ اس کی مرضی تھی کہ حرم سرا میں دادِ عیش دیتا یا جوعِ فتوحات اور ہوسِ ملک گیری سے بے تاب ہو کر ہمسایہ ریاستوں پر فوج کشی اور خونریزی کرتا۔ دربار سے تعلق رکھنے والوں کو نہیں معلوم ہوتا تھا کہ آج کا چاند ان کی سربریدہ لاشوں پر طلوع ہوگا یا کل صبح کا آفتاب انھیں قلمدانِ وزارت سنبھالے ہوئے دیکھے گا۔

ظاہر ہے کہ یہ فضا زندگی سے دُور واقعات اور خیالی کرداروں کی تخلیق کے لئے کتنی سازگار ہے۔ اسی دَور میں ہماری بیشتر داستانیں اور مثنویاں لکھی گئی ہیں۔ اس معاشی و معاشرتی جمود میں رہنے والوں کے لئے تخیّل کی پرواز ہی ذہنی حرکت اور زندگی کی علامت تھی۔ لہٰذا یہ داستانیں اور مثنویاں خیالی ہوتے ہوئے بھی اسی ہزار رنگ زندگی کے بوقلموں مظاہر ہیں۔ ہر لحظہ بدلتے ہوئے حادثات اور ساکت سماجی نظام نے جو فضا پیدا کی تھی وہ ان ادبی کاوشوں کے غیر معمولی کردار اور واقعات کے لئے معاون ثابت ہوئی اور ہم ایک عرصے تک اُس سے آسودگی حاصل کرتے رہے لیکن مغربی سائنس نے ذہنوں کو متاثر کرنا شروع کر دیا تھا اور عقل و نظر کے قدم جمتے ہی "طلسم ہوشربا" اور "بوستانِ خیال" کا فسونِ اثر "حمام بادگرد" کی طرح ٹوٹ گیا۔ عقلیت کی آواز میں "کوہ ندا" جیسی کشش تھی۔ اب جو آنکھیں کھلیں تو ہمارے ادیبوں اور شاعروں نے پہلی بار فطرت کے حسن کا جائزہ لیا اور مظاہرِ فطرت کی دلکشی اور رعنائی کا احساس انھیں اپنی جذباتی کیفیتوں سے قطعِ نظر بھی ہوا۔ لیکن ایک عرصے تک سائنس دماغوں کو پوری طرح متاثر نہ کر سکی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُس کے لانے والے انگریز تھے اور اس کا شمار لوازماتِ غلامی میں ہوتا تھا۔ یہ خیال کیا جاتا تھا کہ سائنس سے نہ صرف مذہبی عقاید کو ٹھیس لگے گی بلکہ وہ مدنیت اور ثقافت بھی، جو ہندوؤں اور مسلمانوں کی گزشتہ روایات کی حامل تھی ختم ہو جائے گی۔ اکبر نے اسی بنا پر سائنس اور اُس کی جدید انکشافات کا مذاق اُڑایا۔ ریل گاڑی، انجن، برقی اور بھاپ وغیرہ پر اُن کے یہاں بڑے لطیف نکات ملتے ہیں۔ "اودھ پنچ گروہ" بھی قدامت پرستی اور جدّت دشمنی میں اکبر کے ساتھ تھا۔ لیکن اس مخالفت سے نئے نظریات و انکشافات کی ترقی نہ رک سکی۔ اور جدید سائنس نے آہستہ آہستہ مگر یقینی طور پر ہندوستان میں اپنے قدم جما لئے۔

تہذیب و مدنیت کی بنیاد انسانوں کی معاشی زندگی پر ہوتی ہے۔ کلچر کا تحفظ جن ادیبوں کے پیشِ نظر تھا اب اُن کی سمجھ میں یہ آیا کہ سائنس کی ترقی کی رَو سے ملک کو پہلے سے بھی بڑا خطرہ درپیش ہے۔ اب مفکروں کے ناخنِ فکر کے لئے بے روزگاری کا عقدہ مشکل تھا۔ سائنس کی وقت اور محنت بچانے والی ایجادوں (Time and labour saving devices) نے دس آدمیوں کا کام ایک آدمی کے سپرد کر دیا اور کام کرنے والوں کے بس میں صرف یہ رہا کہ مشینوں کی خوراک بن جائیں، انسان خود اپنی ایجادات کا غلام بن گیا۔ یہاں سرمایہ اور محنت کی کشمکش پر بحث مقصود نہیں ہے صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ جو لوگ اس مسئلے کو تجزیاتی اور علمی نقطۂ نظر سے دیکھنے کے بجائے جذبات پرستی سے کام لے کر یہ کہہ دیتے ہیں کہ انسان کی نجات اسی میں مضمر ہے کہ

ان آلات پیدائش کو مٹا کر دو سو سال پہلے کی دنیا میں لوٹ جائے اور چرخہ کاتنے لگے۔ کیا وہ یہ بتا سکتے ہیں کہ ان کی اس دو سو سال پہلے کی دنیا میں بے زگاری کا مسئلہ کلی طور پر حل ہو چکا تھا اور انسان کی تمام مادی اُلجھنیں سُلجھ گئی تھیں؟ اگر جواب نفی میں ہے تو کیا وہ اُمید کر سکتے ہیں کہ انسانیت اپنے ہم پیچھے ہٹا کر پھر اُنہیں مشکلات میں گرفتار ہو جائے گی جن سے نجات حاصل کرنے کے لئے سرمایہ دارانہ انقلاب کی ضرورت محسوس ہوئی تھی اور جو تکمیلِ سانیت کی زنجیر میں ایک ارتقائی کڑی ہے۔

سائنس نے ہمارے لئے کیا کیا اور آخر ہماری زندگی پر اس قدر اثر انداز کیسے ہو گئی؟ یقیناً ہم یہی کہہ دیں گے کہ اس نے اپنی ایجادات سے ہمارے ل دہ لئے ہیں۔ وہ ہواؤں کو چیرتی، سمندروں کو کھنگالتی اور کوہساروں کو روند ڈالتی ہے۔ جمادات و نباتات، آتش و باد، آب و خاک غرضیکہ کائنات ، ہر شے سائنس کی بدولت روز بروز ہمارے تابع فرمان ہوتی جا رہی ہے۔ انسان ـــــ وہ زمین پر رینگنے والی کمزور سی مخلوق جس کے پاس اپنی محافظت کوئی سامان نہیں تھا، اور جس کی زندگی کا پورا ڈھانچہ محض چند کمزور ریشوں پر قائم تھا ـــ آج خدائے بحر و بر ہے۔ زمین جس شے کو چھپاتی ہے انسان س کا سینہ چیر کر اسے معلوم کر لیتا ہے۔ ہوا جسے اُڑاتی ہے اُسے انسان گرا دیتا ہے اور جسے کشش ثقل زمین پر گراتی ہے اُسے وہ آسمان پر اُڑاتا ہے۔ وہ مظاہر ن سے وہ کبھی خوفزدہ رہا کرتا تھا آج اُس کے غلام ہیں، جن اشیا کو وہ علوم، آلات اور وسائل کی کمی کی وجہ سے حد درجہ قابلِ احترام و لائقِ پرستش سمجھتا تھا، آج اُن کی ماہیت جان لینے کے بعد اُن کی وقعت پرِ کاہ سے زیادہ نہیں رہی۔ مختصر یہ ہے کہ سائنس نے انسانی بیچارگی کو عظمت، بے بسی کو طاقت اور جہالت کو علم سے بدل دیا۔

بڑی حد تک یہ جواب صحیح ہے، مگر یہی سب کچھ نہیں، اگر بات اتنی ہی سی ہوتی تو ہمیں آج ادبیات کے سلسلے میں سائنس پر غور کرنے کی ضرورت نہ پیش آتی سائنس نے سب سے بڑی جو چیز ہمیں عطا کی ہے وہ زندگی کے مختلف شعبوں کی ہم آہنگی و یک جہتی کا احساس ہے۔ سائنس کا آغاز اسی وقت سے ہوا ہو گا جب انسان نے یہ محسوس کیا کہ نظامِ کائنات میں ایک طرح کی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ پھر اُسی وقت سے ظاہری بے ترتیبیوں میں درمیانی کڑی ڈھونڈنے کی کوشش جاری ہے، اور اسی کوشش و تلاش نے زندگی کے معروضی اصول قائم کئے ہیں۔ کیٹس نے غلط کہا تھا کہ نیوٹن نے توس قزح کا تجزیہ کر کے اس کا سارا حسن غارت کر دیا۔ آج نہ صرف یہ کہ توس قزح کی رعنائی برقرار ہے بلکہ نیوٹن کے اس سائنٹفک تجزیہ کا حُسن بھی ہمیں مسحور کر رہا ہے۔

سائنس نے ہمیں تعصبات و توہمات کے حجرۂ تنگ سے نکال کر حکیمانہ تحقیق اور کلیاتی قوانین کی ہوادار اور دھوپ سے جگمگاتی دنیا میں داخل کیا ہے سائنس کے معیّن نتائج اخلاقی قوانین سے جھجکے بغیر ہمیں دعوتِ فکر و نظر دے رہے ہیں اور انسان روز بروز تحقیق و تدقیق کی طرف مائل ہو رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ادب پر اخلاق کی گرفت اتنی مضبوط نہیں رہی۔ سائنس نے ہماری نگاہ میں وسعت، مذاق کی سطح میں بلندی اور قلب میں کشادگی پیدا کر دی ہے۔ عقلی تجسّس اور مشاہدے کی عادت جو آج کے ادبی رُجحانات میں نمایاں ہے اور ذہنی صحت کی بقا کے لئے بھی ضروری ہے سائنس کی فکری ترقیوں کا فیضان ہے۔

اِس فکری ترقی کی روشنی میں انسان نے اسباب و علل اور علت و معلول کے باہمی ربط کو سمجھا اور کائنات کے تخلیقی اجزا پر غور کیا ہے، صلابت، پختگی، استقامت اور ایقان کی صفتیں اسی غور و فکر کا نتیجہ ہیں۔ حیاتیاتی نظریوں کو سمجھ لینے سے انسان کے خیالات، طرزِ معاشرت، سماجی ذہنیت، ذہنی افکار اور ثقافتی قدروں میں انقلاب عظیم سا آ گیا ہے اور ادب اس انقلاب کا مطالعہ کرتا ہے لہٰذا ادب اور سائنس کا مقامِ اتصال انسانی ذہن ہے۔ یہیں ادب اور سائنس کے دائرے پھیلتے پھیلتے ایک دُوسرے سے مل جاتے ہیں۔

ادب نے سائنس سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ خیالات کی نئی وادیاں، تخیل کی نئی فضائیں، فکر و نظر کی نئی جولانگاہیں، زندگی کا صحت بخش احساس اور فکری و تجرباتی عناصر ادب کے مابعد الطبیعاتی مفہوم کو ختم کرنے میں سائنس کے ٹھوس مادی نتائج نے بڑا کام کیا ہے۔ سائنس ہمیں کار زارِ حیات کے صبر آزما تگ و دو کے لئے تیار کرتی ہے، اور ہمیں بتاتی ہے کہ اگر ادب بھی زندگی ہی کا ایک شعبہ ہے تو اس کا مقصد آخری بھی یہی ہونا چاہیئے۔ اور اُسے معاملاتِ زندگی سے اپنا تعلق براہِ راست قائم کرنا چاہیئے۔

اتنا کچھ جان لینے کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ سائنس حقائق اور واقعات پیش کرتی ہے اور ادب اُن واقعات کی تعبیر کرتا ہے۔ سائنس نے ریل ایجاد کی اور مجاز نے اُسے انقلابی تصور بنا کر پیش کیا۔ سائنس کے پیش کردہ حقائق کی روشنی ہی میں ہم آگے بڑھتے اور اسی ساحل پر کھڑے ہو کر تصورات کے وسیع عریض سمندر میں کود پڑتے ہیں۔

لیکن خیالات کی نئی وادیوں، سوچنے کے نئے زاویوں اور رکھنے کے نئے طریقوں سے زیادہ بھی سائنس نے ہمیں کچھ دیا ہے۔ یہ بات کم نہیں کہ ہم "ایک ٹینک اک جہاز، اک زنجیر" کو ایک ہی لڑی میں پروتے جا رہے ہیں۔ مشینوں کی چیخیں اور جہازوں کا شور و غل ہمیں متاثر کرنے لگا ہے۔ مگر اس سے بھی بڑی شے تنقید کے سائنٹفک اور معروضی اصول ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ سائنس نے ہم میں تجزیہ و تحلیل کی عادت پیدا کر کے ہمارے تنقیدی شعور کو جلا دی ہے۔ اب سے پہلے تنقید پہ جذباتیت اس قدر چھائی ہوئی تھی کہ صحیح فکر و نظر کے لئے گنجائش نہیں رہتی تھی۔ تنقید جب جذبات سے الگ ہوئی تو اپنے بازو کو سہارا دینے کے لئے ادھر اُدھر نظر دوڑانے لگی۔ سائنس آگے بڑھی اور اس نے بتایا کہ حقیقی و بے لاگ تنقید محض فنی وجدان (Artistic Conscience) سے حاصل نہیں ہو سکتی اور تجرباتی محسوسات بھی اُسی وقت اہم ہیں جب وہ بامعنی ہوں۔ تخیل حقیقت کی حد سے نکل کر بے معنی اور مہمل ہو جاتا ہے۔ ایک شاعر یا ادیب کے تجربات اس لئے اہم ہیں کہ وہ حقیقت کو زیادہ گہری نظر سے جانچتا ہے۔ بقول عرفی ؎

هر کس نہ شناسندۂ راز است وگرنہ
ایں ہا ہمہ راز است کہ معلوم عوام است

یہ تجربات و محسوسات نظام زندگی کے دُوسرے شعبوں سے خاص مناسبت رکھتے ہیں۔ جس طرح ایک سائنس دوسری سائنس سے مربوط ہے اسی طرح کی ہر شے ایک دُوسرے سے ربط پذیر ہے اور اگر ہمارے تجربات دنیا کے مشاہدات سے ہم آہنگ نہیں رہ سکتے تو وہ بے کار ہیں۔ انفرادی واقعات کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش سے متاثر ہوتے ہیں۔ فضائی اثرات قبول کرتے ہیں اور خود اُن کا وجود کائنات کی دوسری موجودات سے وابستہ

سائنس نے ہمیں بتایا ہے کہ تجربوں کے مجموعی اثرات کو پرکھنے کے لئے ذہنوں کی مخصوص ساخت کے ساتھ ساتھ سماج اور فطرت کی مخصوص ہم آہنگی (Harmonious) بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ طبیعیات اور حیاتیات ممکن ہے کائنات کے صرف ایک حصے پر توجہ کریں اور اسی کو اپنا مخصوص دائرہ عمل قرار دے لیں لیکن اس کے باوجود فلکیات، ریاضیات یا حیوانیات سے مکمل قطع تعلق ممکن نہیں کیونکہ علم کو اس طرح ٹکڑے ٹکڑے نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح زندگی بھی خانوں میں نہیں بانٹی جا سکتی۔ لہٰذا جب ہم سائنس پر نظر ڈالیں یا ادب پہ غور کریں تو ہمیں بحیثیت مجموعی دیگر علوم سے ان کی مطابقت کو سمجھ لینا چاہیئے۔ اسی لئے ادب پر تنقید کرتے ہوئے ہمیں اُن دوسرے علوم سے جو انسان سے بحیثیت فرد یا جماعت تعلق رکھتے ہیں (مثلاً فلسفہ، نفسیات، حیاتیات، سیاست، معاشیات اور تاریخ وغیرہ) ادب کے قائم شدہ حیاتی ربط کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔

حنیف فوق

بننے کو موقع ملے تو چیونٹی کے مُنہ سے خشخاش کا دانہ نوچ لے۔ غریب کشمیری کی زندگی پامال ہو رہی ہے، ہندوستان کا سب سے بڑا بنیا لُطف لے رہا ہے۔
کیا پنڈت کی پوتھی میں یہ لکھا ہے؟ "خون کرے خالصہ راج کرے پٹیل!"
ہندو کو ہنسنا نہیں آتا۔ اس اُلجھن میں گرفتار ہے کہ انگریز جیسے فاتح کو مقروض اور خوار کر کے نکالا مگر تب چین آئے جب چرخے والا روپیہ کابل میں چلے۔
مسلمان فتح و شکست کا آزمودہ کار ہے۔ بہار کا خنجر کلیجے میں، امرتسر کا بھالا پہلو میں، مگر مایوس نہیں ہوتا، قطعی بے نیاز ہے کہ مزار بنے تو کیا اور مٹ گئے تو کیا؟

فلک پیما

کشمیر

انقلاب آیا بدل دینے کو تقدیرِ اُمم
بیج ڈالا تھا جسے انگریز نے لے کر درم
ڈوگروں اور پنڈتوں نے جس پہ ڈھائے تھے ستم
آج اس وادی میں آزادی کے اٹھتے ہیں قدم

دیکھ اے کشمیر خونیں انقلاب آ ہی گیا
تیرے مظلوموں کی آہوں کا جواب آ ہی گیا

احمدِ مُرسل کی اُمت کے بہت سے جاں فروش
نعرۂ تکبیر لب پر دل میں آزادی کا جوش
بڑھ رہے ہیں تیغ در کف اور کفن بالائے دوش
جانتے ہیں یہ جہادِ زندگی کے سخت کوش

"برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی"

سید محمد جعفری

کوئی کپڑا کوئی اترن

(ایک شخص کی کھانسی کی آواز کے بعد مختلف فاصلوں سے کھانسی کی مختلف آوازیں۔ کوئی رندھے ہوئے گلے سے، کوئی جمے ہوئے سینے سے، کوئی کمزور پسلیوں کی گہرائیوں سے، کھانسی کی یہ آوازیں جس ترتیب سے اُبھریں اسی ترتیب سے مدھم ہو جائیں)

وقفہ

پھاتاں۔ ہائے ہائے اماں!

سین۔ کیوں پھاتاں! اچھا ہو جائے گا چراغ، اتنی فکر تو کیوں کرتی ہے بیٹی؟

پھاتاں۔ چاچا آج تو اُس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی ہے۔

سین۔ دیکھوں۔ (سانس چلنے کی آواز) ہوں، تیری کمر کا درد کیسا ہے؟

پھاتاں۔ میری خیر ہے چاچا۔ کوئی بس چلے تو میرے لال کو بچاؤ کسی طرح

برکتے۔ (ذرا فاصلے سے) کیوں کیا ہے پھاتاں؟

پھاتاں۔ چاچی!

سین۔ چراغ کا پنڈا بہت تپ رہا ہے۔ میں نے کہا رحیم کی ماں، وہ سوکھی گھاس پھونس کہاں رکھ دی ہے۔ ذرا اُسے ہی جلاؤں کچھ تو کم ہو سردی!

برکتے۔ وہیں چولھے کے پاس کہیں ہوگی۔ سولاں کا بیٹا درخت کے چھلکے بھی اُتار کر لایا تھا (سوچ کر) وہ بھی وہیں رکھ دیئے تھے میں نے۔

سین۔ دیکھتا ہوں۔

برکتے۔ رات کتنی گئی ہے؟

سین۔ آدھی،

پھاتاں۔ چاچا! چاچا!! دیکھنا یہاں پاؤں نہ رکھنا۔ یہ چھت بس اللہ ہی کے سہارے کھڑی ہے۔

سین۔ یاد ہی نہیں رہتا۔ ہر بار بھول جاتا ہوں۔

برکتے۔ میں تو آنکھوں سے محتاج ہوں، تم تو خدا کے واسطے دیکھ کر چلا کرو۔

اب اس پردیس میں ہمارا ہے کون، جوان بیٹا راستے میں مارا گیا پھاتاں گھر سے چلی تو سہاگن، بیس کوس چلی تو بیوہ ہو گئی۔ یہ اندھیر کبھی دیکھا تھا نہ سُنا۔

سین۔ (تھکی ہوئی آواز سے) مرضی مولا کی۔ سارے جگ سے یہی ہوا۔ لاکھوں بے گھر ہو گئے ہیں جسے کہا رہی کو دیکھو، ماں سامنے قتل ہوئی۔ پھر بیوی ڈھیر ہو گئی۔ پھر دو بچے قتل ہو گئے۔ بیٹی کو روبرو اٹھا کر لے گئے۔

پھاتاں۔ ہائے میں ساری بھیگ گئی۔

برکتے۔ کیوں پھاتاں؟

پھاتاں۔ کاکے نے پیشاب کر دیا۔

برکتے۔ مجھے پکڑا دے۔

پھاتاں۔ لو! میری تو ساری قمیض ریخ ہو گئی۔

برکتے۔ تجھے کہیں ٹھنڈ نہ لگ جائے بیٹی! لے میری واسکٹ پہن لے میں اُتار دیتی ہوں، لا مجھے دے اپنی قمیض نچوڑ کر سوکھنے ڈال دوں

سین۔ بیٹھی رہ آرام سے۔ تیرے انگ پر ہے کیا۔ ایک واسکٹ وہ بھی جلی ہوئی۔ پھاتاں یہ لے میری چدر لے۔ میں تو آگ کے پاس بیٹھا ہوں۔

پھاتاں۔ اچھا چاچا!

برکتے۔ (پچکار کر) کاکا۔ کاکا۔ چراغ۔ ہائے میں صدقے۔ پنڈا تو پھنک رہا ہے۔ میں نے کہا تمہاری پوٹلی میں گڑ کی ڈلی تھی ایک۔

سین۔ ہے تو۔ کیوں؟

برکتے۔ زچہ کو دیا کرتے ہیں، اور آج سردی بھی زیادہ ہے۔ دو برس ہوئے جب چراغ پیدا ہوا تھا۔

سین۔ مجھے یاد ہے ——— ہیجڑے ناچے تھے۔ اُنھیں گڑ کی بوری بھیلی دی تھی۔

برکتے ۔ ایک وہ دن تھے ۔ ایک یہ کہ سردی سے ٹھٹھر کر مرجائیں تو کوئی رونے والا نہیں ۔

پھاتاں ۔ چاچا تم تمبا کو لاتے ہو ۔ بازار سے میرے لئے ایک آدھ پیسے کی سونٹھ نہیں لا سکتے ۔ میری تو ٹانگیں جیسے بدن سے جُڑ گئی ہیں ۔

سین ۔ اوہو، کل ضرور لے آؤں گا ۔ کیا کریں اتنا بڑا شہر ہے ۔ سڑکوں کا پتہ نہیں چلتا ۔ کہیں ہاتھ پیر ہلانے سے کوئی کام مل جائے تو سب کچھ ...

برکتے ۔ کسی سے کوئی چھوٹی موٹی اُترن مل سکے تو وہ بھی لے آنا ــــ چراغ کے بدن پر چیتھڑا بھی نہیں ۔

سین ۔ رحیم کی ماں ۔ چار گھماؤں زمین کا مالک بھیک مانگتا پھرے یہی کسر باقی رہ گئی تھی ۔

برکتے ۔ سوچتی ہوں، اب ہو گا کیا ۔ میں آنکھوں سے اندھی کسی کا بھانڈا برتن مانجھنے سے بھی لاچار، ہائے میرا رحیم ہی اس دُنیا سے نہ جاتا ہمارا بڑا سہارا تھا ۔

پھاتاں ۔ چاچی جو ہُوا سو ہُوا ۔ میرا کاکا تندرست ہو جائے ۔ مجھے کچھ نہیں چاہیئے ۔

سین ۔ خدا تیرا بھلا کرے ۔ بس اللہ سے یہی دُعا مانگو بیٹی کہ وہ میرے بیٹے کی نشانی قائم رکھے ۔

(دو موٹر ٹرکوں کے دُور سے قریب آنے کی آواز)

برکتے ۔ یہ کیا ہے ؟

سین ۔ معلوم نہیں ۔ اندھیرے میں کچھ دکھائی نہیں دیتا ــــ موٹروں کی آواز تھی ۔

پھاتاں ۔ ہاں دو لاریاں ہیں اب کوئی نئی مصیبت نہ آئے ۔

برکتے ۔ سنا تھا لوگوں کو مکانوں سے نکال رہے ہیں ۔ ہمارا کیا ہو گا ؟

سین ۔ سارے تو اسے مکان کہتی ہے ۔ آدھا جلا ہوا آدھا گرا ہوا ۔ میرا پاؤں چھت پر نہیں پڑا نہیں تو اس کی باقی کڑیاں بھی گر پڑتیں ۔

برکتے ۔ کچھ نہ سہی، پھر بھی سر چھپانے کو ٹھکانہ تو ہے ۔

سین ۔ اس لحاظ سے کہہ لو مکان !

برکتے ۔ اگر سرکار نے کہا اس ملبے کے ڈھیر سے بھی اُٹھ جاؤ ۔

سین ۔ کہاں اُٹھ جاؤ، اب کہاں دیس نکالا دے گی سرکار سگلے سڑے سارے مکانوں میں پناہی بیٹھے ہیں ــ جہاں وہ جائیں گے ہم بھی چلے جائیں گے ۔

پھاتاں ۔ چاچی ! چاچی !! چراغ زور زور سے کانپ رہا ہے ۔ اسے کیا ہو گیا ــ دیکھنا، ہائے میرا لال ۔

برکتے ۔ کدھر ہے، کہاں ہے ؟

پھاتاں ۔ اِدھر چاچی ۔

برکتے ۔ کچھ نہیں بیٹی ! دیکھو تو ننھی سی جان پر ایک چیتھڑا بھی نہیں سردی کے مارے کانپ رہا ہے ۔

پھاتاں ۔ میں نے ساری چادر اسی پر ڈال رکھی ہے ۔

سین ۔ بیٹا ۔ میری چادر میں گرمائی کہاں ۔ بابا آدم کے وقت کی ہے دُھل دُھل کر بے جان ہو چکی ہے ۔

آواز نمبر ا ۔ کیوں بھئی اتنی رات گئے جاگ رہے ہو ؟

سین ۔ کیا بتائیں بابو جی، تن پر کپڑا نہیں ۔ چار سو کھے پتے جلا کر تاپ رہے ہیں ۔ یہ اندھی بڑھیا میری بیوی ہے، وہ میری بہو ہے امیدواری تھی خیر سے پرچار دن ہوئے بچہ ضائع ہو گیا ۔ دن کو گم سُم پڑی رہتی ہے ۔

آواز نمبر ا ۔ تمہارا کوئی لڑکا ....

سین ۔ (ٹھنڈی سانس) جوان لڑکا تھا سرکار ۔ راستے میں قتل ہو گیا اب تو اُس کی ایک ہی نشانی ہے ۔

نمبر ا ۔ کیا ؟

سین ۔ میرا پوتا، اللہ رکھے چھوٹا سا ہے ۔ آج پانچواں روز ہے بابو جی، بخار میں بیہوش پڑا ہے ۔

(پھاتاں کے بے اختیار رونے کی آواز) صبر کر بیٹی صبر کر ۔ مرنے والا مر گیا ۔ جب تک دم میں دم ہے روکھی سوکھی کھلاؤں گا آپ کون ہیں بابو جی ؟

نمبر ا ۔ تمہارا غم بٹانے والے بابا ۔ حکومت کی طرف سے آئے ہیں بابا ضرورت مندوں کے لئے لاریوں میں کمبل لحاف ڈالے رات گھومتے پھرتے ہیں ۔

نمبر ۲ ۔ ادھر کوئی ہے مستحق ؟

نمبر ۱۔ ہاں بھئی ہے۔ لاؤ ادھر، لالٹین اونچی کرو۔ اس بابا کو ایک کمبل دو۔ اس بڑھیا کو لحاف دو۔

نمبر ۲۔ یہ لے بابا۔ یہ لے مائی۔

سین۔ اور میری بہو کو بابو جی؟

نمبر ۱۔ دیتے ہیں۔ دیتے ہیں۔ اس زچہ کو بھی ایک کمبل دو۔

نمبر ۲۔ یہ لے بہن!

نمبر ۱۔ اس کے اوپر ڈال دو۔ بیمار ہے ہاں اس طرح۔

نمبر ۲۔ یہ تو کچے فرش پر لیٹی ہوئی ہے۔

نمبر ۱۔ بابا! ایک تو تمھاری بہو کا بچہ ضائع ہو گیا۔ دوسرا تم نے اسے کچے فرش پر لٹا رکھا ہے۔ تمھاری عقل کو کیا......

سین۔ بابو جی کیا کریں۔ پردیس میں.....

نمبر ۱۔ ٹھیک ٹھیک ہے دیکھو ایک توشک اس لڑکی کے نیچے ڈال دو

نمبر ۲۔ بہتر جناب! یہ لو بابا یہ دولائی اس کے نیچے بچھا دو۔

سین۔ جیتے رہو بابو جی۔

پھاتاں۔ چاچا میرے چراغ کے لئے کوئی پھٹا پرانا کپڑا۔

سین۔ اچھا بیٹی۔

نمبر ۱۔ کیا کہتی ہے؟

سین۔ بچے کے لئے کپڑا مانگ رہی ہے۔

برکتے۔ میرے تن پر بھی کچھ نہیں، ایک جلی ہوئی واسکٹ....

سین۔ میری بیوی کے پاس بھی کچھ نہیں جناب.... بس ایک واسکٹ پہن رکھی ہے۔

نمبر ۱۔ منشی! ان کو کل کپڑے پہنچانے ہیں۔ ضرور۔ نوٹ کر لو۔

نمبر ۲۔ بہتر جناب!

نمبر ۱۔ دیکھو ہم آج اپنے ساتھ کپڑے لے کر نہیں آئے۔ صرف کمبل اور چند رضائیاں لائے ہیں۔

سین۔ بابو جی! پناہیوں کو کپڑے کی بڑی ضرورت ہے۔ تھوڑے بہت اپنے ساتھ لے کئے ہوتے۔ آپ کے ہاں کس چیز کی کمی ہے۔

نمبر ۱۔ بابا مجھے کپڑے اپنے گھر سے تھوڑے دینے ہیں۔ یہ تو ساری قوم کا سوال ہے۔ مسلمان جتنے کپڑے بیت المال میں بھیجتے ہیں وہ تم جیسے ضرورتمندوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ کل سے کوئی کپڑا دفتر میں نہیں آیا۔ میں کوشش کروں گا کہ کل دوپہر تک تمھیں ایک آدہ قمیض یا کوٹ بھیج دوں۔

پھاتاں۔ اور میرے کاکے کے لئے بابو جی؟

نمبر ۱۔ ہاں تمھارے بچے کے لئے ضرور بھیجوں گا۔ کوئی قمیض یا گرم سویٹر جو کچھ بھی ملا۔ منشی! ڈاکٹر صاحب کہاں ہیں؟

نمبر ۲۔ جی ساتھ والے مکان میں ایک بیمار کو دیکھ رہے ہیں۔

نمبر ۱۔ اگر دیکھ چکے ہوں تو بلا لاؤ۔

نمبر ۲۔ بہتر، لو وہ آپ ہی آ گئے۔

نمبر ۱۔ ڈاکٹر صاحب! اس عورت کو دیکھئے۔ A case of miscarriage

ڈاکٹر۔ اوہو، ہاتھ دکھا بہن۔

پھاتاں۔ مجھے کچھ نہیں، میرا کاکا بیمار ہے۔ اسے دیکھئے آج پانچواں روز ہے بخار میں لوتھ پڑا ہے۔

ڈاکٹر۔ اچھا، چادر ہٹاؤ۔ ادھر کرو — ٹونٹی لگا کر دیکھوں گا — ہوں، کروٹ کے بل لٹاؤ۔

نمبر ۱۔ نبض دکھاؤ۔

سین۔ بنڈا کبھی تپ جاتا ہے کبھی ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔

ڈاکٹر۔ یہ لے بابا۔ ایک گولی بچے کو ابھی کھلا دے دوسری گولی صبح اور یہ شام کو۔ اور یہ چھ گولیاں اس لڑکی کے لئے ہیں۔ دو صبح دو دوپہر دو شام۔

سین۔ جیو بابو جی!

نمبر ۱۔ اور یہ کونے میں کون بیٹھا ہے؟ اونچی کرنا لالٹین۔

سین۔ جناب یہ ہمارے گاؤں کا کمہار ہے۔ پہلے اس کی ماں قتل ہوئی۔ پھر اس کی بیوی اور دو بچے اس کے سامنے قتل کئے گئے۔ بیٹی کو اٹھا کر لے گئے۔ اچھا بھلا تھا اب بات نہیں کرتا۔ تین دن سے بالکل چپ ہے۔ منہ سے جھاگ بہتے ہیں۔

نمبر ۱۔ ڈاکٹر صاحب.....

ڈاکٹر۔ جی ہاں میں نے دیکھ لیا مَنٹل ہسپتال کا کیس ہے۔ میں نے نوٹ کر لیا ہے۔

نمبر ا۔ چلئے (وقفہ) بچے کے متعلق کیا خیال ہے ڈاکٹر صاحب؟ بچ جائے گا؟

ڈاکٹر۔ نمونیا ہے، حالت نازک ہے۔ رات گزار گیا تو بچ جائے گا۔

نمبر ا۔ اب کدھر؟

نمبر ۲۔ دائیں ہاتھ گھوم جائیے۔ اس سامنے والی مسجد کے حجروں میں بھی پناہ گزین ہیں۔ (قدموں کی آواز)

نمبر ا۔ لو ہو گئے شروع۔ دو تو یہ پڑے ہیں، خیر ان کے پاس تو ہیں رضائیاں آگے چلو (وقفہ) (قدموں کی آواز) ان کے پاس بھی ہیں۔ آگے چلو ـــــ لو مسجد کے حجرے آگئے۔ وہ سامنے کونے میں دو شخص گٹھری بنے پڑے ہیں۔

ڈاکٹر۔ ان کو کمبل دے دو۔ بیچارے ایک ہی چادر میں سو رہے ہیں۔

نمبر ا۔ فرش بھی کچا ہے۔ کتنی سیلن ہے (ایک شخص کی کھانسی کی آواز کے بعد مختلف فاصلوں سے کھانسی کی آوازیں)

مُلّا۔ جی سرکار ادھر کو آیئے۔ اس حجرے میں دو چار پناہ گزین بغیر لحاف کے پڑے ہیں۔ ان پر بھی مہربانی فرمایئے۔

نمبر ا۔ تم کون ہو؟

مُلّا۔ جی میں بھی پناہ گزین ہی ہوں۔ اس مسجد کا امام ہوں۔

نمبر ا۔ رہتے کہاں ہو؟

مُلّا۔ مسجد کی بغل میں وہ چھوٹی سی کوٹھری ہے۔

نمبر ا۔ وہ سامنے جہاں روشنی دکھائی دے رہی ہے؟

مُلّا۔ جی ہاں، وہیں رہتا ہوں، سب کچھ لٹا آیا ہوں۔ بڑا نقصان ہُوا بڑا عزت دار . . . .

نمبر ا۔ چلو جو کچھ ہُوا سو ہُوا۔ اب آج کی سوچو تاکہ . . . . . .

مُلّا۔ آپ نے بجا فرمایا۔ خداوند تعالےٰ نے اپنے پاک کلام میں صبر کی بار بار تلقین کی ہے، فرمایا ہے وہی مرد مومن جو کرتا ہے سامنا مصیبتوں کا اور دیتا ہے ہمارے لئے قربانیاں بار بار، اور بجا لاتا ہے ہمارا شکریہ ہمیشہ صدق دل سے، ہم ہیں قادر ہر بات پر . . . .

نمبر ا۔ درست فرمایا آپ نے مولانا۔ کیا اچھا ہو اگر آپ یہی درس ان پناہ گزینوں کو دیں جو مسجد میں آپ کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں۔

مُلّا۔ جی دیکھئے یہ تسبیح ہر وقت میرے ہاتھ میں رہتی ہے اور زبان پر کلام الہٰی۔ میں تو ہر دم ان غریب لوگوں کو دم دلاسا دیتا رہتا ہوں۔ کلام پاک سے آیتیں سناتا رہتا ہوں۔

نمبر ا۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے گا۔

مُلّا۔ ایک گذارش ہے۔

نمبر ا۔ ہاں، ہاں۔

مُلّا۔ مجھ غریب الدیار پناہ گزین کو بھی ایک کمبل مرحمت فرما دیں تو عین . . .

نمبر ا۔ ضرور ضرور۔

نمبر ۲۔ آپ کے پاس کوئی لحاف نہیں؟

مُلّا۔ جی کہاں، ایک پھٹی پرانی دری ہے۔ وہی اوڑھ کر پڑ رہتا ہوں تسبیح کر رہا تھا آپ کی آواز سن کر باہر نکل آیا۔

نمبر ا۔ ہمیں کمبل دینے میں تو کوئی عذر نہیں مولانا۔ مگر ہمارا دستور ہے کہ اپنے اطمینان کے لئے پہلے ہم یہ دیکھ لیا کرتے ہیں کہ کمبل ضرورتمند اور مستحق کو دیا جا رہا ہے۔

نمبر ۲۔ چل کر مولانا کی کوٹھری دیکھ لیں نا۔

مُلّا۔ میرے مہربان! مسجد کا فرش اس وقت برف کی طرح ٹھنڈا ہے آپ ننگے پاؤں چلیں گے اور موسم بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ آپ کو زحمت . . . . . .

نمبر ا۔ زحمت . . . . (ہنس کر) ہم اتنی رات کو سردی میں کمبل بانٹ رہے ہیں۔ اگر آرام کا خیال ہوتا مولانا تو گھر سے نہ نکلتے۔

مُلّا۔ درست فرمایا سرکار۔

نمبر ا۔ تو تم جاکر دیکھ آؤ منشی، وہ رہی سامنے کوٹھری۔

نمبر ۲۔ جی، بہت بہتر

نمبر ا۔ ہاں تو مولانا آپ کب یہاں پہنچے اور کب سے اس مسجد کے امام مقرر ہوئے۔

نمبر ۲۔ (فاصلے سے اونچی آواز) حضور رات کا وقت ہے۔ ہوشیار رہیے گا۔ یہ مولانا کہیں اندھیرے میں کھسک نہ جائیں۔ خیال رکھیے۔

نمبر ا۔ کیوں ـــــ؟

نمبر ۲۔ (بلند آواز سے) پلنگڑی پر بستر بچھا ہے۔ بستر میں ایک دری ہے اُوپر

توشک، اس کے اوپر کھیس اور ایک لحاف جس میں مولانا ابھی نکل کر باہر گئے ہیں۔ لالٹین کی بتی بجھی کر گئے ہیں۔ ایک بوتل مٹی کے تیل کی طاق میں رکھی ہے۔ ذرا ٹھہریئے دیکھ لوں، ایک مٹکا بھی پڑا ہے۔

نمبر۱۔ مٹکے میں کیا ہے؟

نمبر۲۔ مونگ پھلی سے بھرا پڑا ہے۔ کھائی ہوئی مونگ پھلی کے چھلکے بستر کے سرہانے پڑے ہیں۔

نمبر۱۔ (ہنس کر) چلے آؤ۔ کافی سے زیادہ ثبوت مل چکا۔ مگر ہاں، بستر کے نیچے سے مولانا کی توشک اور اوپر سے لحاف اٹھا لاؤ۔

نمبر۲۔ بہت بہتر جناب۔

نمبر۱۔ کیوں مولانا! اب فرمایئے کیا کہتی ہے آپ کی تسبیح جو آپ کے ہاتھ میں ہے اور کلام الٰہی جو آپ کی زبان پر تھا؟ کیوں وہ زبان اب گنگ کیوں ہوگئی، جو ابھی قینچی کی طرح چل رہی تھی —— دیکھا ڈاکٹر صاحب!

ڈاکٹر۔ جی ہاں بہت خطرناک مرض کا شکار نظر آتے ہیں۔

نمبر۱۔ علاج کیجیئے۔ دراصل ضرورت ان لوگوں کے علاج کی ہے جو ہماری آنکھوں میں دھول جھونکنا چاہتے ہیں۔ ان کی صورت دیکھئے ہے نا انسان کے لباس میں شیطان ——

ڈاکٹر۔ تمھیں شرم آنی چاہیئے۔

نمبر۱۔ بس یہی سزا ہے تمھاری کہ بغیر لحاف کے سوؤ۔ ذرا پتہ تو چلے تمھیں بھی کہ پناہ گزین کی ضرورت کیا چیز ہے؟

ڈاکٹر۔ اور وہ رات کو سردی میں کس طرح ٹھٹھرتے ہیں۔

مُلّا۔ معافی چاہتا ہوں۔

نمبر۱۔ بکو مت۔ چلو منشی،

مُلّا۔ مجھ سے خطا سرزد ہوئی۔ ناک رگڑتا ہوں۔ میں اتنی سردی میں مرجاؤں گا۔ حضور مجھے ایک چیز ہی دے دیجیے۔

نمبر۲۔ جاؤ مونگ پھلی پھانکو۔

نمبر۱۔ ہٹو راستہ چھوڑو۔

(موٹر کے چلنے کی آواز فیڈ آؤٹ)

(اذان کی آواز فیڈ ان اللہ اکبر اللہ اکبر)

پھاتاں۔ چاچی۔ جاگتی ہو۔

برکتے۔ ہاں بیٹی پھاتاں۔ کیوں؟

پھاتاں۔ کاکے کا جسم ٹھنڈا پڑ رہا ہے؟

برکتے۔ بخار اتر گیا ہوگا۔

پھاتاں۔ (چیخ کر) ہائے نہیں چاچی دیکھو تو۔ ادھر کرو ہاتھ۔

برکتے۔ میں نے کہا جاگتے ہو؟

سین۔ ہاں ہاں کیوں؟

پھاتاں۔ ہائے میرا کاکا (روتی ہے)

سین۔ صبر، بیٹی صبر

پھاتاں۔ (رو کر) ہائے چاچا۔ میرا کچھ نہ رہا۔

(وقفہ)

(فیڈ ان قہقہے کی آواز)

جیب تراش نمبر۱۔ ابے یا جی اتنے زور سے نہ ہنس۔ یہاں میت ہوگئی ہے

نمبر۲۔ کہاں؟

نمبر۱۔ یہ سامنے پناہ گیروں کا بچہ مر گیا ہے۔

نمبر۲۔ ہٹ تیرا ستیا ناس، صبح صبح کس کا سامنا ہوا۔

نمبر۱۔ کیوں کوئی سامی نہیں ملے گی؟

نمبر۲۔ ابے کیا بتاؤں جیسے یہاں آیا ہوں بھوکوں مر رہا ہوں خدا کی قسم!

نمبر۱۔ ابے جا سالے، جھوٹا لپاٹی کہیں کا۔ جیسے ہم جانتے نہیں۔ خدا کو حاضر ناظر کرکے بتائیو۔ پچھلے ہفتے کتنوں کی جیب تراشی ہے۔ سچ سچ!

نمبر۲۔ اونہہ، جیب، لوگوں کی جیب میں آج کل دھرا کیا ہے؟

نمبر۱۔ تو یہ معلوم کیسے ہوا؟ اور اگر یہ نہیں تو تیرا گذر کیوں کر . . .

نمبر۲۔ گزر؟ (ہنس کر) ارے! اللہ رازق ہے۔

نمبر۱۔ ابے پھر وہی بات، ہمیں بھی تو شبہ لگنے لگے آخر۔ سینما بند ہیں تھیٹر بند ہیں۔ وہ مزے دار دھکا پیل ریلوے سٹیشن کی ختم ہو چکی اور تم ہو کہ وہی پہلے سے ٹھاٹھ۔ اچھے پناہ گیر ہو۔

نمبر۲۔ یہ دیکھو جیب میں۔

جیب تراش نمبر۱۔ نوٹ ہوں گے سالے ہم صبح صبح نوٹ دکھا کر لگا ہے جی ترسانے۔

نمبر۲۔ ابے ذرا دیکھ تو۔

نمبر۱۔ کیا ہے؟ چٹھیاں دکھتی ہیں۔

نمبر۲۔ تو کیا سمجھے گا کودن کہیں کا۔ آج کل یہ چٹھیاں ہی سب کچھ ہیں۔

نمبر۱۔ کیسے؟

نمبر۲۔ شام کو جھٹ پٹے کے وقت یا چراغ جلے جب لوگ اپنے کام دھندوں سے گھروں کو لوٹتے ہیں تو کوئی سامی تاڑ لیتے ہیں کسی کھمبے کے پاس کھڑا ہو کر چٹھی اس کے منہ کے آگے رکھ کر بڑی عاجزی سے کہتے ہیں "بابو جی! ذرا چٹھی پڑھ دینا" ادھر اس کا دھیان چٹھی کی طرف ہوا ادھر دائیں ہاتھ سے یاروں نے صفائی کر ڈالی۔ کبھی نوٹ کبھی بٹوا کبھی عینک کبھی قلم کبھی......

نمبر۱۔ ابے سور کے بچے اکیلے ہی اکیلے۔

نمبر۲۔ ابے پاجی مسلمان ہو کر صبح سویرے سور کا نام لیتا ہے۔

نمبر۱۔ ابے سن تو۔

نمبر۲۔ (فاصلے سے) پھر ملیں گے، یہ گاہکی کا وقت بھی ہے۔

نمبر۱۔ ابے جوسف تو کس خیال میں بیٹھا ہے۔ اٹھ اللہ مالک ہے چل ہم بھی یہی کاروبار شروع کریں۔

نمبر۳۔ (سوچ میں) اوں ہوں۔ آج کا بندوبست ہو گیا ہے۔

نمبر۱۔ اللہ قسم!

نمبر۳۔ اللہ قسم! ذرا سی دیر کی بات ہے۔

نمبر۱۔ کیا ــــ؟

نمبر۳۔ یہ پناہ گیر میت کو اٹھا کر لے جانے ہی والے ہیں۔ بس پھر اللہ چاہے میدان مار لیں گے۔

نمبر۱۔ ارے مگر میدان کیسا؟ یہاں ہے کیا؟

نمبر۳۔ وہ دیکھ تین کمبل!

نمبر۱۔ ہاں ہاں! ہاں ہاں!!

نمبر۳۔ ابے تو تو بالکل اندھا ہے۔

نمبر۱۔ میں نے خیال ہی نہیں کیا تھا۔

نمبر۳۔ تو کیوں خیال کرے۔ تیرا باپ جو ہے خیال کرنے والا۔

نمبر۱۔ بک نہ بہت۔ وہ دیکھ میت اٹھی۔

نمبر۳۔ ابے اتنا بے صبرا نہ بن۔ ذرا انھیں موڑ تو مڑ لینے دو۔

نمبر۱۔ کرنا کیا ہے؟

نمبر۳۔ جو میں کروں۔

نمبر۱۔ لے موڑ بھی مڑ گئے۔

نمبر۳۔ اب چلا آ (رعب کے ساتھ کھانس کر) او مائی! تجھ سے کہہ رہا ہوں۔ اوے اندھی مائی سنتی نہیں۔

برکتے۔ مجھ سے کہہ رہے ہو؟

نمبر۳۔ اور تیرے فرشتوں سے۔ مرد کہاں ہیں تیرے؟

برکتے۔ بھاناں! کیا پوچھ رہے ہیں یہ؟

بھاناں۔ (رندھے گلے سے) قبرستان گئے ہیں میت لے کر۔

نمبر۳۔ سنا۔ سن لیا دوست ہوا نہ۔

نمبر۱۔ جی ہاں کمال ہے۔ عورتیں مردوں سے ایک ہاتھ آگے ہیں۔ تم اپنا کام کرو داروغہ جی۔

نمبر۳۔ یہ نئے کمبل تم نے کہاں سے چرائے؟

برکتے۔ ہم تو بھائی دکھیا پناہی ہیں۔

نمبر۱۔ (ہنس کر) دکھیا کیا چوری نہیں کیا کرتے؟

نمبر۳۔ بڑھیا کو تھانے لے چلو۔ اٹھ ری تو بھی ٹھگنی

بھاناں۔ چاچی!

برکتے۔ ہم نے چوری نہیں کی۔ رات کو ایک بھاگوان ہمیں کمبل دے گیا تھا۔

نمبر۱۔ بھاگوان! (ہنستا ہے)

نمبر۳۔ اٹھو اٹھو تھانے چلو۔

برکتے۔ یہ بچی تو بیمار ہے بابو جی۔ اس کا ایک ہی دیا ابھی ابھی اللہ کو.....

نمبر۳۔ چپ رہ مائی۔ دیکھو تم یوں کرو۔

نمبر۱۔ جیسا حکم ہو۔

نمبر۳۔ یہ تینوں کمبل تھانے لے چلو۔

نمبر۱۔ بہت اچھا۔

نمبر۳ - ادمائی ہم گشت کر کے ابھی واپس پلٹتے ہیں - مرد آئیں تو انھیں بٹھا رکھیو - نہیں تو جیل کی ہوا کھانا پڑے گی - سُن رہی ہے ؟

برکتے - (ٹھنڈی سانس) جیل کی ہوا !

پٹھانی - چاچی! (روتی ہے) ہائے میرا چراغ، میرا کاکا!

(رونے کی آواز - فیڈ آوٹ)

جیب تراش نمبر۱ - دو تو اچھے خاصے ہیں ایک ذرا پُرانا ہے -

نمبر۳ - کیوں اُستاد - آئے ہاتھ -

نمبر۱ - مان لیا بھئی، اب انھیں بیچنے کی فکر کرو - میری انتڑیاں تو قل ہو اللہ پڑھ رہی ہیں - چلو کہیں چل کر کچھ کھائیں پئیں -

نمبر۳ - چلو اس طرف چلیں - ذرا جلدی قدم اُٹھاؤ -

نمبر۱ - چلو -

(وقفہ)

مُلّا - کیوں شیخ صاحب کیا دیکھا جا رہا ہے یہ ؟

شیخ - کمبل تھے بکاؤ -

مُلّا - سودا نہیں بنا کیا ؟

شیخ - جی نہیں، مجھے کوئی ایسی ضرورت نہ تھی - میں نے کہا چلو آپ لے لیجئے اگر ضرورت ہو تو، پر پیسے بڑے مانگ رہے ہیں -

مُلّا - آپ ٹھہرائیے انھیں - میں ابھی نیچے آیا - یہ مسجد بھی تو زمین سے سوا گز اونچی ہے -

شیخ - ٹھہر جاؤ بھئی - امام مسجد سے شاید تمھارا سودا بن جائے - ہم چل دیئے -

جیب تراش نمبر۳ - بہت اچھی بات!

مُلّا - کیوں بھئی کیا لوگے ؟

نمبر۳ - بوہنی کا وقت ہے میاں جی ایک دام کہیں گے -

مُلّا - ہاں ہاں!

نمبر۳ - دو جوڑیاں تھیں - ایک تو بک چکی ہے، ایک رہ گئی ہے - دس روپے میں دی ہے -

مُلّا - ارے رے دس روپے، اماں مسلمان کے ہاتھ بیچ رہے ہو - اور ہم ہیں امام مسجد - پھر یہ مال استعمال شدہ ہے - پہلے انھیں دھوئیں گے پاک کریں گے سکھائیں گے - سو دھندے کرنے پڑیں گے - پھر ہم بھی پناہ گیر - بستر ہمارا اُٹ چکا - بھئی سستے داموں دے جاؤ - دعائیں دیا کریں گے -

نمبر۳ - پناہ گیر تو ہم بھی ہیں ملا جی!

مُلّا - بس تو کر دو پیسے کھرے - تمھارا بھی بھلا ہو ہمارا بھی - چھ روپے میں دے جاؤ -

نمبر۳ - جی نہیں -

مُلّا - اچھا ٹھہرو تو کیا لوگے آخر ؟

نمبر۳ - سات روپے لیں گے -

مُلّا - ساڑھے چھ ؟

نمبر۱ - جی نہیں -

مُلّا - اچھا میاں دے جاؤ - سات ہی میں دے جاؤ -

(وقفہ)

آواز نمبر۱ - کون بول رہا ہے - اچھا منشی، ہاں ہاں، کیا کہا تم نے سات بجے وہاں گئے تھے - کہاں ؟ اچھا جہاں رات کو وہ بچہ بیمار تھا - پھر مر گیا — چ چ چ چ! اچھی بات : میں ابھی پریس کو ٹیلیفون کئے دیتا ہوں ——— وقفہ ———

(ٹیلیفون کی گھنٹی) ایڈیٹر صاحب ہیں - اُنھیں ٹیلیفون دیجئے - آداب عرض ہے - مجھے آپ سے یہ عرض کرنا تھا کہ چھوٹے بچوں کے کپڑوں کی اشد ضرورت ہے - سردی روز بروز بڑھ رہی ہے، رات ایک بچہ نمونئے سے بیمار تھا - آج صبح میرا آدمی گرم سویٹر لے کر وہاں پہنچا تو اُس کی میت اُٹھ چکی تھی - جی ہاں — بُرا حال ہے — پبلک کو اس طرف دھیان دینا چاہیئے - آپ ازراہ کرم اپنے اخبار میں بچوں کے کپڑوں کی اپیل کیجئے - ضرور کل ہی کر دیں — بلکہ دو چار دن کرتے رہیں - باحیثیت لوگوں کے سر پر جوں نہیں رینگتی — جی ہاں! اگر توجہ کریں تو کیا نہیں ہو سکتا -

ایڈیٹر - (دُوسری طرف سے) آپ نے صحیح فرمایا - میں آپ کو ایک چشم دید واقعہ سناتا ہوں - کچھ دن ہوئے میں خود ذاتی مشاہدے کے لئے کارکنوں کے ساتھ کمبل اور رضائیاں بانٹنے گیا تھا - ایک صاحب

ہمارے ساتھ تھے وہ بار بار ریذیڈنسی کی طرف چلنے پر زور دے رہے تھے۔ آخر دو ایک جگہوں سے فراغت پاکر ٹرک ریذیڈنسی کی طرف روانہ ہوا وہ صاحب راستہ بتاتے تھے آخر ہمارا ٹرک ایک نہایت عالی شان کوٹھی کے اندر داخل ہوا وہاں دو نوجوان صاحبزادے گاؤن پہنے مفلر لپیٹے ہمارے استقبال کے لئے برآمدے میں سے اُترے۔ انھوں نے بتایا کہ دہلی میں اُن کا بہت بڑا کاروبار تھا۔ اعلیٰ درجے کے ہوٹل تھے لاکھوں کا امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس تھا۔ اب اُن کے ملازمین اور چند اور پناہگزین دہلی سے آکر ان کی کوٹھی کے out-Houses میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ جن کے لئے لحاف اور کپڑے درکار ہیں۔

ہم نے کہا بسم اللہ لیجئے، ضرور لیجئے۔ باہر چونکہ سردی تھی، وہ صاحبزادے ہمیں اندر لے گئے۔ گول کمرے میں کوئی دس بارہ ہزار کا ایرانی قالین بچھا تھا۔ کیا بیان کروں، ہر چیز اعلیٰ درجہ کی۔ جھاڑ فانوس، صوفے، کرسیاں، آئل پینٹنگ، چینی چوکھٹے۔ آبنوس کی میزیں۔ ہر چیز دوسری سے بڑھ کر، بٹن دبایا Heater جل اُٹھا۔ ہیٹر تھا کہ کوہ آتش فشاں، پل بھر میں کمرہ گرم ہوگیا۔ رات کے کوئی دو بجے تھے۔ بدن ہمارے تھکے ہوئے باہر سے سردی کھائے ہوئے آئے، یہ آرام پایا تو جی چاہا کہ یہیں ٹھہرے رہیں اتنے میں ہمارے سٹاف کا ایک آدمی آیا کہ باہر اندھیرا بہت ہے۔ ٹارچ کی ضرورت ہے۔ ہم نے کہا بھئی ہمارے پاس تو ہے نہیں۔ صاحب خانہ سے پُوچھ لو۔ ایک صاحبزادے نے کہا "تھی تو"۔ دوسرا بولا "ہاں، تھی تو، مگر وہ تو آپا محمودہ کے پاس ہے اور آپا محمودہ سو رہی ہیں۔ ہمارے آدمی نے تکلف برتا اور کہنے لگا "تو چلو رہنے دو"۔ اب آپ بتائیے کہ ان دولت مند لوگوں کو اتنا خیال نہیں آتا کہ پناہ گزینوں کی خاطر اگر آپا محمودہ کو جگایا جائے تو کیا قیامت آجائے گی۔

تمبرا۔ وہی تو میں نے کہا کہ باحیثیت لوگوں کے سر پر جوں نہیں رینگتی اس وقت عملی ہمدردی کی ضرورت ہے۔ ہمیں آپا محمودہ کو جگانا ہی پڑے گا۔ ہمیں ٹارچ کی ضرورت ہے۔ ہمیں پناہ گیر کی امداد کرنا ہے۔ اس چھائے ہوئے اندھیرے میں اُسے راستہ دکھلانا ہے۔ ہمیں روشنی کی ضرورت ہے۔ کوئی تکلف نہیں، کوئی لحاظ نہیں۔ اگر غریبوں کی دلجوئی اب نہ کی گئی تو کب کی جائیگی اگر آپا محمودہ کی نیند پر پناہ گزینوں کے مصائب کو ترجیح نہ دی گئی تو وہ دن دُور نہیں جب جھونپڑیاں محلات سے ٹکرا اُٹھیں گی۔

(مائیکروفون کے پاس سے گاتی ہوئی آواز گزر جاتی ہے)

اُٹھو مری دُنیا کے غریبوں کو جگادو
کاخِ امُرا کے در و دیوار ہلادو

(ریڈیو پاکستان لاہور سے نشر ہوا)

آغا بابر

سیلاب زمیں ہے۔ آسماں ہے طوفاں   آندھی کی طرح رواں دواں ہے طوفاں
ہستی کا سفر ہے اور شب ہے تاریک   کشتی ہے بھنور تو بادباں ہے طوفاں

(جوش)

غزل

آنکھوں میں ستارے جاگ اٹھے سینے میں چراغاں کیا کیجے

جذبات تو عریاں ہو کے رہے احساس کو عریاں کیا کیجے

جو چیز ہمارے بس میں نہیں اُس چیز کا دعویٰ کیا معنی

دورِ روز کی راحت کا چرچا اے گردشِ دوراں کیا کیجے

گرداب کے یہ خونیں حلقے ساحل کی حدوں تک پھیل گئے

ٹوٹی ہوئی کشتی کو کھے کر اب جھوٹے احساں کیا کیجے

جو دردِ دل پرسہ لیں گے جو بات ہے خود سے کہہ لیں گے

دن رات پریشاں ہو ہو کر دُنیا کو پریشاں کیا کیجے

آئی ہے کسی کی یاد مگر آنسو ہی نہیں ہیں آنکھوں میں

مہماں کی تواضع تو ہی بتا اے خانۂ ویراں کیا کیجے

قتیل شفائی

صفیّہ باجی

صفیہ باجی کی عمر اب پینتیس برس کے قریب ہے۔ ابھی انھوں نے شادی نہیں کی۔ اُن کی آنکھوں کے گرد جو سیاہ حلقے ہیں وہ اور زیادہ گہرے ہوتے جا رہے ہیں اور اب تو اُن کے بالوں میں کہیں کہیں چاندی کے باریک سے تار بھی چمکتے نظر آتے ہیں۔ وہ عام طور پر اپنے کمرے میں جو مکان کی دوسری منزل پر ہے بیٹھی پڑھتی رہتی ہیں۔ پڑھنے سے اُکتا جاتی ہیں تو کروشیا یا سلائیاں لے بیٹھتی ہیں۔ البتہ ہر روز وہ نہایت التزام سے دونوں وقت ڈاکئے کی آمد کی منتظر رہتی ہیں اور جونہی وہ گلی میں داخل ہوتا ہے تو وہ کھڑکی کے پٹ کے قریب آ کھڑی ہوتی ہیں اور اُس کی اوٹ میں ڈاکئے کو گھر گھر ڈاک تقسیم کرتے دیکھتی رہتی ہیں......

چھوٹی باجی کہا کرتی ہیں کہ صفیہ باجی کے چہرے میں اب وہ تازگی نہیں رہی جو آج سے پندرہ برس پہلے تھی۔ پر باجی کی گھنی پلکوں والی سیاہ آنکھیں اب بھی خوبصورت ہیں اور اگر اُن کی چمک میں ایک ایسی مُتانت آ گئی ہے جو کسی نامعلوم دُکھ کی گہری غمازی کرتی ہے تو پھر کیا ہوا آخر اُن کی کشش میں تو کمی نہیں ہوئی۔

ویسے تو گھر کے لوگوں سے الگ تھلگ رہنے کی عادت باجی میں بچپن ہی سے چلی آتی ہے۔ لیکن صبح و شام گھر کا تھوڑا بہت کام کاج کرنے کے لئے باجی اپنے کمرے سے باہر آجاتی ہے اور ممانی جان کے کہنے پر گھر کا وہ کون سا کام ہے جو باجی نہیں کرتیں، اگر ماما سلامت سے چولھا نہ سلگایا جا سکے تو نہ جانے باجی کو کیا ڈھب آتا ہے منٹوں میں آگ سُلگا کر رکھ دیں گی۔ ضرورت پڑے تو بھابی جان کے ننھے کے لئے دودھ بھی گرم کر دیں گی شام کی چائے کے لئے الماری سے برتن بھی اکثر خود ہی نکال لائیں گی اور کراکری کو جس احتیاط سے باجی جان دھوتی ہیں شاید ہی کوئی اور دھو سکتا ہو دیکھنے میں تو باجی بھی گھر کے دوسرے لوگوں ہی کی طرح ہنستی بولتی ہیں اور کسی کو خیال تک بھی آ سکتا کہ باجی کا دل بھی کسی خاموش غم کا کفیل ہو سکتا ہے اور باجی کی آنکھیں بھی کسی طوفان کا خاموش تلاطم اپنی گہرائیوں میں چھپا سکتی ہیں پر باجی تو بچپن ہی سے ایسی تھیں۔ اُن کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں ایسی دکھائی دیتی تھیں گویا آنسوؤں سے بھیگ رہی ہوں اور شاہد بھائی نے تو انھیں چڑانے کے لئے نہ جانے کیا کیا فقرے اور بول بنا رکھے تھے اور اگر اس قسم کی باتوں سے باجی ان لوگوں کے کھیلوں میں شریک نہ ہوتیں تو اس میں تعجب کی کیا بات۔ بچپن ہی سے باجی کو یہ وہم تھا کہ وہ دُنیا میں بالکل اکیلی ہیں، حالانکہ باجی کے ساتھ محبت جتانے میں نہ ممانی جان نے کوئی کسر اُٹھا رکھی تھی اور نہ ماموں جان نے۔ ہاں اگر شاہد بھائی رُکھاوٹ سے پیش آتے تو اور بات تھی۔ لیکن آخر دس برس کے ایک ننھے لڑکے کی بات کو چھ سات برس کی ایک ننھی مُنی لڑکی اتنی اہمیت ہی کیوں

بچپن کا زمانہ یُوں گزر گیا گویا کوئی چہچہاتا ہوا خوش رنگ پرندہ پھر سے باجی کے پاس سے اُڑ گیا ہو اور باجی اُسے پکڑتے پکڑتے رہ گئی ہو خالو ابا کی تبدیلی ہو جانے سے شاہد بھائی اور ذکیہ دونوں ہی کو لکھنؤ جانا پڑا۔ بچپن کے وہ ننھے منے جھگڑے، رُکھائیاں وہیں کی وہیں رہ گئیں اور باجی کو ایسا معلوم ہوا کہ ذکیہ اور شاہد بھائی کے جانے سے باجی کی سب سے الگ تھلگ چھوٹی سی دُنیا اور بھی سونی ہو گئی اور پھر پانچ چھ برس اور گزر گئے۔ صحن میں انار کا جو پیڑ کبھی باجی ذکیہ اور شاہد نے نہایت شوق سے لگایا تھا اب سُرخ سُرخ کلیوں سے لدا پھندا کھڑا تھا اور باجی کے چہرے پر ایک ایسی شرمگیں بشاشت نظر آتی کہ بے اختیار انار کی کلیوں کا خیال آ جاتا۔

وقت گزرتے دیر نہیں لگتی۔ آج صفیہ باجی کی عمر پینتیس برس کے قریب ہے تو آج سے پندرہ برس پہلے وہ بیس برس کی تھیں۔ سڈول اور جسم اور پھر جسم کے خطوط میں وہ تمام دلآویز پیچ و خم موجود تھے جن میں دیکھنے والوں کی نگاہیں اُلجھ اُلجھ کر رہ جائیں۔ باجی کا جسم اب کچھ کم

ں ہوتا جارہا ہے۔ اُن کے جسم کے خطوط میں اب وہ پہلا سا تیکھا پن نہیں رہا اور نہ ان خطوط میں وہ ہم آہنگی ہی رہی ہے جو آج سے پندرہ برس پہلے
ہکے تنگ اور چُست لباس کے ایک ایک جوڑ سے دکھائی دیتی تھی۔

اُن دنوں باجی جان کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی خواہ مخواہ ایک لمبے سائے کی طرح باجی کے پیچھے پیچھے پھر رہا ہے۔ جس سے گھبرا کر باجی کبھی آنچ
ل کو اپنے چہرے کے اور زیادہ قریب کرلیتیں اور کبھی دوپٹے سے سر کو اور زیادہ ڈھانپ لیتیں اور ایسا تو کئی بار ہوا کہ بیٹھے بیٹھے باجی کو جیسے کوئی
ل آیا ہو اور ساتھ ہی ان کا چہرہ کان کی لوؤں تک سُرخ ہو گیا۔ معلوم نہیں وہ کیا خیال تھا جس کی رعنائی یوں بے باکانہ طور پر باجی کے چہرے پر
ر پھیل جاتی؟ ویسے تو گھر میں چچا زاد، ماموں زاد اور خالہ زاد بہنوں اور بھائیوں کا بے تکلفی سے آنا جانا تھا۔ چچا جان کی نجمہ، قدسیہ، ماموں جان کی طاہرہ
رخالہ جان کی اسما ہر روز نہیں تو ہر دُوسرے تیسرے دن ضرور ہی ان کے گھر کا پھیرا کرلیتی تھیں۔ لیکن باجی نے اپنے کمرے کے چار دیواری کے اندر
چھوٹی سی دنیا الگ تھلگ بنا رکھی تھی اس میں کسی کا دخل نہیں تھا۔ ہاں البتہ خالہ اماں کی ذکیہ سے باجی کا ملنے کو دل ضرور چاہتا تھا۔ کئی بار ممانی جان نے
نوُ خط بھی لکھا کہ اور نہیں تو ذکیہ ہی کو اب کی گرمیوں یا کرسمس کی چھٹیوں میں لاہور بھیج دو۔ پر خالہ اماں آپ جانئے اتنے لمبے سفر پر جوان جہان
بی کو کیسے بھیج سکتی تھیں؟ وہ تو خیر اچھا اتفاق ہُوا کہ خالو جان اپنے کسی ذاتی کام کے سلسلے میں لاہور آرہے تھے ذکیہ کو بھی ساتھ لیتے آئے۔ کالج گرمیوں
چھٹیوں کی وجہ سے بند تو تھا ہی، دن بھر بے فکری سے گزرتا۔ ذکیہ کو آپ جانئے اچھا لباس پہننے کا ہمیشہ سے شوق رہا ہے ادھر باجی جان کو بھی معلوم
ا کہ لباس جس طرح ان کے جسم پر پھبتا ہے شاید ہی کسی اور کے پھبتا ہو۔ دونوں نئے نئے فیشن کی تلاش میں رہتیں نئے سے نیا کپڑا ڈھونڈ نکالتیں۔
ر پھر دری پر بیٹھ قینچی ہاتھ میں لئے اس کی کتر بیونت میں اس طرح محو ہو جاتیں کہ انھیں معلوم بھی نہ ہونے پاتا کہ سائے کب ڈھلے اور شام کب ہوئی۔

ذکیہ سے اتنی مدت بعد مل کر باجی کو ایسا محسُوس ہُوا گویا کھوئی ہوئی شے کا کھوج تو مل گیا ہے لیکن چیز ابھی نہیں ملی اور ذکیہ کی آمد کے بعد بھی باجی
ان کبھی کبھی بڑی دیر تک اپنے کمرے میں اکیلے بیٹھے کچھ پڑھتی رہتیں یا بُننا لے بیٹھتیں۔ ممانی جان کے ٹرنک میں کہیں اتفاق سے ذکیہ نے پھولدار
لی کا گز بھر کا ایک ٹکڑا کیا دیکھ لیا اُس پر ریجھ ہی تو گئی، فوراً ہی ممانی جان سے مانگ لیا۔ اُسے بلاؤز کا ایک نیا نمونہ آیا تھا جو باجی کو بھی بہت پسند تھا۔
دوپہر کے کھانے سے فراغت پاتے ہی دونوں اسے لے کر بیٹھ گئیں باجی نے کپڑا قطع کیا اور ذکیہ سلائی کرنے لگی۔ شام کے قریب بلاؤز میں آخری ٹانکہ لگا۔ ذکیہ تو کمر سیدھی کرنے ذرا کی ذرا
پلنگ پر لیٹ گئی اور باجی بلاؤز لے کر ڈرائنگ روم میں آگئیں۔ پہن کر آئینے کے سامنے آڑا ترچھا ہو دیکھنے لگیں کہیں شکن تو نہیں پڑ رہی ہے، مونڈھے کہیں زیادہ تو اُبھر نہیں آئے
آستینیں تو بازوؤں پر چُست بیٹھتی ہیں نا، کبھی اوپر کا بٹن کھولتیں کبھی نیچے کا، کبھی اِسے بند کرتیں کبھی اُسے......

آئینے کے سامنے باجی اس طرح محو کھڑی بلاؤز کو سراہ رہی تھیں کہ یکایک جیسے آئینے میں کوئی پرچھائیں سی پڑی ہو۔ دو ہی لمحوں میں یہ سب کچھ
ہو گیا۔ باجی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ آسکتی تھی کہ شاہد بھائی ذکیہ کو ملنے یُوں آجائیں گے۔ وہ شرم سے گڑ ہی تو گئیں۔ قالین پر سے اپنی قمیص
اٹھانے کا بھی ہوش نہ رہا۔ اور ہائی اللہ کہتی ہوئی کمرے سے بھاگ گئیں۔ شاہد بھائی کے لبوں پر ایک مسکراہٹ سی کھیل گئی۔ انھیں معلوم ہوا کہ صفیہ
و اب جوان ہو گئی ہے اور وہ اُدھر ممانی جان کے پاس چلے گئے۔

اتنی مدت بعد شاہد بھائی سے آمنا سامنا ہوا بھی تو تو بہ کس حال میں، صفیہ باجی کو بار بار یہی خیال آرہا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں جا کر پلنگ پر اوندھے
مُنہ لیٹ گئیں۔ شرم سے گال تمتما اُٹھے تھے۔ گردن اور ماتھے پر پسینے کے قطرے آگئے تھے۔ بات بالکل معمولی تھی اگر شاہد بھائی کی نگاہ اتفاق سے آئینہ
پر جا بھی پڑی تو پھر کیا ہوا؟ پر صفیہ باجی کو تو جیسے کوئی وہم ہو گیا ہو۔ کمرے ہی میں پڑی رہیں۔ رات کے کھانے کے وقت البتہ مجبوری سے صحن میں چلی
آئیں، پر اس رات وہ شاہد بھائی سے آنکھ نہ ملا سکیں، انھوں نے دو ایک بار بات کرنے کی کوشش بھی کی پر صفیہ باجی نے جیسے چُپ سادھ رکھی ہو۔
ہُوں ہاں کرکے ٹال دیا۔

اب پندرہ برس گزر جانے کے بعد کبھی کبھی صفیہ باجی کو خیال آتا ہے کہ اگر وہ اُس زمانے میں کبھی اتنی شرمیلی نہ ہوتیں تو کیا ہوتا؟ یقیناً شاہد بھائی

کی توجہ اس آسانی سے اُن کی طرف مبذول نہ ہوتی اور اُن کی مُسکراتی ہوئی نگاہیں اور لوگوں کے ہوتے ہوئے بھی باجی کے چہرے ہی کی طرف نہ پلٹ پڑتیں اور اُن کے چہرے پر ایک شرگیں مسکراہٹ اپنے کچھ مدھم سے نقوش نہ چھوڑ جایا کرتی۔

اور ایک دن تو غضب ہی ہوگیا، وہ دوپہر کے وقت سیڑھیوں پر سے اُتر رہی تھیں کہ شاہد بھائی بھی اتفاق سے اوپر کی طرف آرہے تھے۔ وہ گھبرا ہی تو گئیں۔ سانس تیز ہوگیا۔ دل دھک دھک کرنے لگا۔ توبہ! شاہد بھائی کے اتنا قریب سے ہو کر گزرنے میں وہ اپنے جسم میں کس قدر سنسنی محسوس کرتیں وہ نگاہیں نیچی کئے اپنے جسم کو چراتے ہوئے اُن کے قریب سے گزر ہی رہی تھیں کہ کمبخت جارجٹ کا دوپٹہ ایک لمحہ کے لئے اُن سے چھُو ہی گیا۔ شاہد بھائی ایک لمحہ کے لئے ٹھہر گئے۔ صفیہ کو بھی یونہی روک لیا۔ اُس وقت ان کے لبوں پر ایک ایسی مسکراہٹ تھی جس کا مفہوم صفیہ باجی کو بہت دنوں بعد جاکر معلوم ہُوا۔

شاہد بھائی یہی کوئی ہفتہ بھر ان کے یہاں ٹھہرے ہوں گے۔ لیکن یہ چھ سات دن بھی کیا تھے، صفیہ باجی کو یوں محسوس ہوتا تھا گویا گھر میں بہار آگئی ہے کونپلیں پھر سے پھوٹ رہی ہیں اور سبزہ نکھرتا چلا آرہا ہے اور صحن میں لگا ہوا انار کا پیڑ تو اپنے دامن میں سُرخ سُرخ کلیوں کا ایک انبوہ لئے ہوئے کھڑا تھا......

اور جاتے جاتے وہ صفیہ باجی سے جو یہ کہہ گئے تھے کہ "صفیہ تم میرے خط کا انتظار کرنا میں جاتے ہی خط لکھوں گا" کیا محض اُن کا ایک وعدہ ہی تھا! تین دن تک تو صفیہ باجی کو خط کا انتظار کرنا ہی چاہئیے تھا پر جب چوتھے دن بھی ڈاکیہ لیٹر بکس میں کوئی خط ڈالے بغیر چلا گیا تو باجی بے صبر ہوگئیں پانچواں دن بھی یونہی گزر گیا اور جس خط کا باجی کو انتظار تھا وہ نہ آیا۔ پورا ایک ہفتہ گزر گیا پھر دوسرا ہفتہ بھی اور پھر تیسرا بھی.....

مہینوں بعد ذکیہ کے ایک خط سے صفیہ باجی کو اتنا معلوم ہوا کہ آج کل اُن کے ہاں اُن کی پھوپھی کی لڑکی صدیقہ آئی ہوئی ہے۔ صدیقہ بھی باجی ہی کی ہم عمر تھی اور اُن سے ایک جماعت پیچھے تھی۔ صفیہ باجی کا جی چاہتا تھا کہ خود خط لکھ کر شاہد بھائی سے پوچھ لے کہ کیا بات ہوئی کئی بار خط شروع بھی کیا لیکن دو تین مہمل سی سطریں لکھ کر ہی چھوڑ دیا۔ کبھی خیال آتا کہ شاہد بھائی نے خط تو ضرور لکھا ہوگا راستے میں کہیں کھو گیا ہے۔ وہ ضرور دوسرا خط لکھیں گے۔ جونہی باجی کو معلوم ہوتا کہ ڈاکیہ آیا ہوا ہے تو خواہ وہ تیسری منزل ہی پر کیوں نہ ہوتیں، خواہ دوپٹہ سر پہ ہوتا یا نہ ہوتا، خواہ جوتی پاؤں میں ہوتی یا نہ ہوتی باجی فوراً بھاگتی ہوتی ڈیوڑھی میں آموجود ہوتیں اور کواڑ بھیڑ ڈاکئے کی منتظر رہتیں کہ جونہی وہ لیٹر بکس میں ڈالنے کے لئے خط نکالے گا فوراً ہی ہاتھ بڑھا کر وہ لے لیں گی۔ اور پھر جوں جوں ڈاکیہ قریب آتا جاتا باجی کا دل دھک دھک کرنے لگتا، سانس کی آمد و رفت تیز ہوجاتی۔ چہرہ سرخ ہو جاتا اور وہ اس طرح گھبرا جاتیں گویا کوئی جرم کر رہی ہوں اور جب ڈاکیہ ان کے لیٹر بکس میں خط ڈالے بغیر ڈیوڑھی کے پاس سے یونہی گزر جاتا تو صفیہ باجی کو غم و غصّہ اور شکست کا ملا جلا ایک ایسا احساس ہوتا جس سے اُن کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آتے اور پھر وہ اس ناکامی کے بعد سیڑھیوں پر اس طرح آہستہ آہستہ چڑھنے لگتیں گویا برسوں کی بیماری سے اٹھی ہوں......

صفیہ باجی کو اب شاہد بھائی کے خط کا انتظار نہ تھا بلکہ اب تو وہ اس خیال ہی پر جھنجلا اٹھتیں اور بعد میں تو انھیں یہ بات اس قدر بے معنی سی نظر آئی کہ انھوں نے اس خیال پر جھنجلانا بھی چھوڑ دیا اور نہایت دل سوزی سے اپنے امتحان کی تیاری میں مصروف رہنے لگیں۔ دُوسرے سال باجی نے نہایت اچھے نمبروں پر بی۔ اے پاس کر لیا۔ ذکیہ نے باجی کو امتحان میں پاس ہونے پر مبارکباد کا جو خط لکھا اُس میں یہ بھی تھا کہ تمھیں یہ سُن کر خوشی ہوگی کہ شاہد بھائی کی نسبت صدیقہ سے ہوگئی ہے اور کرسمس کی چھٹیوں میں شادی ہے۔ باجی نے نہایت سرسری سی دلچسپی سے یہ سطریں پڑھیں اور پھر وہ ایک کتاب پڑھنے میں مصروف ہوگئیں۔ کرسمس آیا اور چلا گیا۔ شاہد بھائی کی شادی ہوگئی۔ شادی میں سبھی شریک تھے ہاں باجی کو ان دنوں زکام ہو رہا تھا وہ البتہ شریک نہ ہو سکیں۔ اگلے سال باجی بی۔ ٹی کی کلاس میں داخل ہوگئیں، لیکن نہ جانے کس خیال سے انھوں نے کالج چھوڑ دیا اور بی۔ ٹی کی تعلیم مکمل نہ کر سکیں۔ اس دوران میں باجی کے لئے کئی جگہوں سے پیغام بھی آئے۔ رشتہ داروں نے ممانی جان پر بہتیرا زور دیا کہ لڑکی کی عمر زیادہ ہوتی جارہی ہے شادی کر دو، مگر ممانی جان باجی کی مرضی کے خلاف اُن کا رشتہ کیسے کر سکتی تھیں؟ اور اس بارے میں باجی کی طرف سے ایک ہی جواب تھا

آخر شادی کی اتنی جلدی بھی کیا ہے، آخر شادی ہی کرنی ہے، دیکھا جائے گا۔

وقت کی اُڑان بے صدا ہے۔ پندرہ برس یوں دبے پاوں گزر گئے گویا کوئی جرم کر گئے ہیں۔ اس عرصے میں ذکیہ کی شادی ہو گئی۔ چھوٹی باجی بیچاری کے تو تین بچے ہو کر مر بھی گئے۔ شاہد بھائی ملازمت کے سلسلے میں کبھی ہندوستان کے ایک گوشے میں مقیم ہوتے تو کبھی کسی دوسرے گوشہ میں۔ ان پندرہ برسوں میں انھیں وطن آنے کا صرف چار پانچ بار ہی موقع ملا۔ اور اتفاق کی بات کہ باجی سے اُن کی پھر کبھی ملاقات نہ ہو سکی۔ ہاں صدیقہ سے باجی کا دو تین بار ضرور ملنا ہُوا۔

اور اب صفیہ باجی کی عمر پینتیس برس کے لگ بھگ ہے۔ ابھی انھوں نے شادی نہیں کی۔ اُن کی آنکھوں کے گرد جو سیاہ حلقے نظر آتے ہیں وہ اور زیادہ گہرے ہوتے جا رہے ہیں۔ اور اب تو اُن کے بالوں میں کہیں کہیں چاندی کے باریک سے تار بھی چمکتے نظر آ جاتے ہیں۔ وہ عام طور پر اپنے کمرے میں پلنگ پر بیٹھے لیٹے کچھ نہ کچھ پڑھتی رہتی ہیں۔ پڑھنے سے اُکتا جاتی ہیں تو کبھی کروشیا لے بیٹھتی ہیں کبھی سلائیاں۔ باجی کو اب زندگی کی بہت سی باتوں سے دلچسپی نہیں رہی۔ البتہ گلی میں ڈاکیئے کی آمد سے اُنھیں ضرور دلچسپی ہے وہ دونوں وقت ڈاکیئے کی آمد کی منتظر رہتی ہیں۔ حالانکہ ان کے پاس شاذ و نادر ہی کوئی خط آتا ہے اور جب وہ گلی میں داخل ہوتا ہے تو باجی آپ ہی آپ کھڑکی کے قریب آ کھڑی ہوتی ہیں اور پٹ کی اوٹ میں کھڑے اُسے گھر گھر ڈاک تقسیم کرتے اُس وقت تک دیکھتی رہتی ہیں جب تک وہ گلی کے آخری موڑ پر پہنچ نہیں جاتا......

امین الرحمٰن

غزل

سکوں میں ماتمِ سوز و گداز کرتا ہوں
خود اپنا سلسلۂ غم دراز کرتا ہوں

بتوں کے سامنے عزمِ نماز کرتا ہوں
حقیقتوں کو سپردِ مجاز کرتا ہوں

زبانِ اشک سے ہوتی ہے ترجمانیٔ غم
کبھی جو کوششِ اخفائے راز کرتا ہوں

حجابِ چہرۂ عرفاں کچھ اُٹھ سے جاتے ہیں
بہ اذنِ شوق جو عزمِ نماز کرتا ہوں

ترے کرم کو کبھی جوش آ ہی جائے گا
کہ آج دستِ دُعا پھر دراز کرتا ہوں

درِ حبیب پہ خم کر کے اے جبینِ نیاز
ہر ایک در سے تجھے بے نیاز کرتا ہوں

مجھے خلوصِ احبا سے عرشؔ کیا مطلب
کہ میں تو اپنی محبت پہ ناز کرتا ہوں

عرشؔ بدایونی

ادھورا خواب

لوگ کہتے ہیں زمانے کا یہی ہے دستور
محفلیں جمتی ہیں لُٹتی ہیں اُجڑ جاتی ہیں
قافلے آتے ہیں اور آکے چلے جاتے ہیں
رُک بھی جاتے ہیں کبھی راہ میں سُستانے کو
اور کچھ دیر کو ہنس دیتے ہیں تاروں کے چراغ
کہکشاں زیست کی تفسیر کیا کرتی ہے
پھر وہی عالمِ ہُو اور وہی ویرانی
وہی راہیں، وہی راہوں پہ اندھیرے کا طلسم
اور ایسا بھی ہوا ہے کہ گلستاں کی بہار
ابھی رگ رگ میں سماتی نہیں نکہت بن کر
ابھی ہر ریشے کو ملتا نہیں پیغام نمُو
آنکھ بے ساختہ کہہ اٹھتی ہے لو جانِ چمن
وہ دبے پاؤں حریمِ چمنستاں سے چلی
اور کسی سوچ میں کھوئے ہوئے سوکھے اشجار
ہاتھ پھیلائے کہیں دُور تکا کرتے ہیں
اور جب تم بھی یہاں آئیں تو میں یہ سمجھا
میرے ظلمت کدہ میں ایک کرن آئی ہے
اب مقدّر کے شبستاں میں چراغاں ہوگا
زیست یُوں اپنے حسین سپنوں میں کھو جائے گی
دل کی ویرانی بہاروں سے بدل جائے گی
میں نے یہ خواب ابھی دیکھا ہی تھا۔ تم چل دیں
جیسے ویرانے میں اب تک کوئی ٹھہرا ہی نہیں
جیسے ظُلمت کو کبھی نُور نے دھویا ہی نہیں
کاش تم نے یہ کبھی سوچا تو ہوتا جی میں
کہ یہ دُکھ درد کی ہر سمت سیاہی کا وجود
خود سیاہی کی نہیں نور کی رسوائی ہے
خود سیاہی کی نہیں نور کی پسپائی ہے
اور یہ نورِ حسیں میں تو نہیں ہوں۔ تم ہو

ــــــــ

اب وہی میں ہوں وہی دل ہے وہی تاریکی
اور اُمیدیں وہی افسانے کہا کرتی ہیں!

ــــــــ

(حلقہ اربابِ ذوق شاخ دہلی میں پڑھی گئی)

اختر ہوشیارپوری

پال — میرا دوست

"ہو — ڈاکٹر" اُس نے اپنے بالوں کو ماتھے سے ہٹاتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں نعرہ لگایا۔ "تم نے جیمس جائس (James Joyce) کا Ulysses پڑھا؟"

"نہیں —"

"اُس کا پورٹریٹ آف ... ؟"

"نہیں"

"اُس کا کچھ اور ..."

"میں نے اُس کا لکھا ہوا کچھ نہیں پڑھا۔"

"اور رومین رُولان (Romain Rollan) کا —؟ جان لیمان کا —؟ ہیری لوئی کا —؟"

بڑے بڑے ناموں کی اس بوچھاڑ سے بچنا محال تھا۔ میں نے کہا "نہیں بابا! میں نے ان سب کا کچھ نہیں پڑھا، اور یہ کیا میں برناڈ شا، شولوکوف، چیخوف، گورکی اور ٹالسٹائے تک کی ادبی تخلیقات سے ناآشنا ہوں —"

"تو تم نے پھر پڑھا کیا ہے؟" میں نے سمجھا تھا کہ خلاصی ہوگی مگر کہاں، حالانکہ میں نے کبھی اپنے مطالعہ کے وسعت کے بارے میں اس سے کوئی دعویٰ نہیں کیا۔

"کیا لکھتے ہیں یہ لوگ، کبھی پڑھ کے دیکھو، لطف ہی تو آجاتا ہے۔ میرے ہاں چلو، میں تمھیں رُولان کی نئی کتاب دوں گا —"

اور ایسے فقروں پر یہ گفتگو ختم ہو جاتی، سڑک پر چلتے چلتے دیہاتیوں کی طرح سگرٹ کا کش لگاتے ہوئے وہ اکثر اُن کا تذکرہ کرتا اور اس ذکر سے اُسے ایک قسم کی فرحت محسوس ہوتی تھی۔ خدا جانے اس میں کیا Complexes تھے، شاید برتری، شاید کمتری، میں ان باتوں کے متعلق کبھی نہیں سوچتا، وہ میرا دوست تھا اور دوست کی بہت سی ناخوشگوار باتیں بھی برداشت کرنا پڑتی ہیں — اور بعض ناخوشگوار باتیں ہی کچھ لوگوں کو عزیز بنا دیتی ہیں۔ اس کی اگر کچھ باتیں یاد ہیں تو یہی حرکتیں، سگریٹ کے دیہاتیوں کی طرح کش، سڑک پر چلتے چلتے کسی کی طرف اشارے، زور زور سے قہقہے اور ہاتھا پائی — جس کی وجہ سے اُسے بار بار اپنے لمبے بال درست کرنے پڑتے۔

وہ اکثر صرف ایک قمیص اور ایک پتلون پہنے ہوتا۔ بنیان استعمال نہیں کرتا تھا اور کوٹ سخت سردیوں میں ہی استعمال کرتا تھا، سردیوں کے عام دنوں میں وہ سویٹر پہنے بغل میں کوئی کتاب یا ہاتھ دبائے پھرتا رہتا تھا کپڑوں کی کمی کی اُسے ہمیشہ شکایت رہی، مگر جب اُسے تنخواہ ملتی تو دو ایک نئی کتابیں ضرور خرید لیتا اور خریدنے کے ہفتہ بعد تک انھیں بغل میں دبائے پھرتا اور پھر مجھے سرِ راہے چلتا چلتا کہتا۔ "ڈاکٹر تم نے موپاساں کی لائف پر جو نئی کتاب لکھی گئی ہے دیکھی؟"

"نہیں بھئی"

"ضرور پڑھو، پرسوں ہی میں نے خریدی ہے، دکھا سکتا ہوں" اور بیشتر اس کے کہ میں کتاب کے لئے ہاتھ بڑھاؤں وہ خود مجھے اسے ورق اُلٹ اُلٹ کر دکھانے لگتا اور کہیں کہیں سے ایک آدھ فقرہ بھی پڑھ دیتا۔ "مگر پڑھنے کے لئے ابھی نہیں دے سکتا۔"

"مجھے بھی آج کل وقت نہیں۔" میں کہتا۔

"تو تم کرتے کیا رہتے ہو؟" وہ چڑ جاتا "پڑھتے ہوئے تمھیں کبھی نہیں دیکھا، کھیل تماشے میں تم نظر نہیں آتے اور ہوٹل میں تو کبھی بھولے بھٹکے بھی نہیں گئے

ہمارے ساتھیوں کو دیکھتا ہوں کہ اکثر ہوٹلوں میں ہوتے ہیں اور لطف کی بات ہے اکیلے نہیں۔ ابھی کل ہی کی بات ہے ہم میٹرو میں تھے' ایک دوست مل گیا میں نے سوچا چلو چائے ہی پلا دو' پھر کام ہیں گے اس سے بھی' وہاں میں نے دیکھا تمھارے یہاں کے دو لڑکے — پھر چند دن کی بات ہے ہم لورینگ میں ڈنر کھا رہے تھے — تم سے تو وہی" لڑکا اچھا ہے' تم سے گو کئی سال جونیئر ہے لیکن بڑے مزے کی لڑکی کے ساتھ گھومتا ہے' تم تو بالکل وہ ہو' بزدل کہیں کے —"

اور آج میں سوچتا ہوں کہ شاید سچ مچ میں بزدل ہوں' شاید یہی وجہ ہے کہ فساد کے تمام دنوں میں — اور اس دفعہ فساد کے دن بھی کچھ کم نہیں رہے' اور یوں تو سچ بھی گیا کہ ہے — دوپہر ہی کے وقت فضا دھوئیں سے بھری پڑی ہے' چاروں طرف سیاہ دھوئیں کے بادل اٹھ رہے ہیں اور کہیں کہیں شعلے بھی — یہ دن شاید اب کبھی ختم نہ ہوں گے' ایک دن' دو دن' تین — ہفتے نہیں مہینے گزر گئے ہیں مگر فساد ہے کہ تھمنے ہی میں نہیں آتا' لیکن میں باوجود اس کے فساد کے تمام دنوں میں ایک آدمی کو بھی تو نقصان نہیں پہنچا سکا' ایک لمحے کے لئے بھی میرے دل میں خنجر اٹھانے کا خیال نہیں آیا۔ تاننے بھر کو بھی تو میرے دماغ نے کسی کو مارنے کے حق میں فیصلہ نہیں دیا — اور آج جبکہ اس طرف سے بھی دھواں اٹھ رہا ہے جس طرف میرا دوست پال رہا کرتا تھا۔ میں سوائے چھت کی دیوار پر سے اُسے دیکھنے اور بےکار سوچنے کے اور کچھ نہیں کر سکتا۔

باہر ایک بھگدڑ سی مچ رہی ہے' لوگ گلیوں میں' سڑکوں پر بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ جو کچھ کسی کے ہاتھ آیا لئے جا رہا ہے۔ سامنے کے بڑے نالے کے ساتھ ساتھ' کھیتوں میں فصلوں کو پامال کرتے ہوئے لوگ اس محلّے کی طرف بھاگے جا رہے ہیں جہاں مخلوط آبادی ہے۔ سیٹیاں' شور و غل! ایک کہرام سا مچ رہا ہے' لوگ کھیتوں میں چھپ چھپ کر ادھر جا رہے ہیں — "ایک ہندو نے مسلمان کو اینٹ ماری ہے"— "ایک سکھ نے اپنی دیوار پر سے فائر کیا ہے"— "صلح کے معاہدے کر رکھے تھے ان لوگوں نے' دکھاوے کیلئے کچھ اور دراصل — کوئی اعتبار نہیں ان لوگوں کا —"

"ڈاکٹر!" اُس نے کل ہی مجھے کافی ہاؤس میں کہا تھا' "تم آئے نہیں میری طرف عرصے سے' آجایا کرو کبھی کبھار' میں ذرا مشغول ہوں آج کل' ترجمہ کر رہا ہوں بیری لوئی کی "نغمات بلقیس" کا' آنا' تمھیں سناؤں گا' مزا آ رہا ہے' کیا خوب لکھتا ہے' اتنا عریاں کہ تمھارے عریاں نویس اُس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ پاتے مگر اتنا ہی آرٹسٹک —! آنا' ہوں!"

"مشکل ہے — میں بھی آج کل مشغول ہوں —" وہ سمجھا میں چڑا رہا ہوں مگر میں نے سنجیدگی سے بات جاری رکھی' "انجیل پڑھ رہا ہوں"— "انجیل"— اور اُس نے ایک زور کا قہقہہ لگا دیا۔

"ہاں ہاں اسکریوتی کے بیٹے یہواہ کی داستان' مسیح کے صلیب دیئے جانے کا واقعہ' میں ایک کہانی لکھنا چاہتا ہوں کہ آج بھی —"

"چھوڑو' ہاں اس میں سے Song of songs ضرور پڑھنا — اور پھر یہ لوگ عریاں نویسی پر احتساب روا رکھتے ہیں' بیری لوئی' نغمات بلقیس بھی Song of Songs ضرور آؤ' تمھیں سناؤں گا اور انجیل بھی لیتے آنا —"

"آج کل میں نہیں آسکتا —"

"ہوں' تو تم بھی ڈرتے ہو —"

"ہاں بھائی' آج کل کسی کا کیا اعتبار' ہندوؤں کے محلّوں کی طرف سے ہو کر ہسپتال جانا بھی ترک کر چکا ہوں —"

ایک لمحے کے لئے وہ خاموش رہا مگر زور سے سگرٹ کا کش لگاتے ہوئے اُس نے ایک اور قہقہہ لگایا۔ لوگ اس طرف متوجہ ہو گئے۔ آج کل لوگوں کے کان بھی تو یونہی کھڑے ہو جاتے ہیں — مگر وہ ان سے بے پروا بڑے مزے سے کچھ گنگنانے لگا' یہ اُس کی عادت ہے۔ کسی مشرقی یا مغربی شاعر کا کوئی مصرع اپنے مخصوص انداز میں وہ گنگنانے لگتا ہے۔

"اچھا تو کل میں خود آؤں گا' تم تو یونہی ڈرتے ہو —" اور وہ پھر گانے لگا "مرمریں قصر کا لذت سے وہ لبریز ستوں!" میں نے دیکھا وہ کونے میں بیٹھی انگریز لڑکی کی ٹانگوں کی طرف عجیب انداز سے گھور رہا تھا۔

"کیا حماقت ہے" میں نے کہا۔

"یہ تھی، یہی" اُس نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا، "جسے میں نے کل سٹیفلز میں دیکھا تھا، خوب رقص کرتی ہے ——"

"کیا بمبئی کے آدمی ہو، شاید یہ شاعر بھی تمہاری ہی طرح کا بمبئی کا ہندوستانی —— ہندوستانی نہیں —— ہندو یا مسلمان —— مگر یہ شاعر ——" اس کے چہرے پر ایک تحکّہ خیز سا تاثر آگیا — "ایک مثلث، ایک عمود، یہ ہے اس کی کتاب کا انتساب، اس دنیا میں اور ہے کیا؟ —— کل صبح میں لیتا آؤں گا اپنے ساتھ بیری لوئی کتاب! — ہا! کیا چیز لکھی ہے ——" اور پھر وہ آنکھوں اور ہاتھوں کے اشاروں کی مدد سے کچھ نظموں کا ترجمہ سنانے کی کوشش کرنے لگا۔

آج صبح صبح وہ سچ مچ پالا آیا۔ میرا خیال تھا وہ یونہی گپ ہانک رہا تھا جیسے اُس کی عادت ہے، سردار پٹیل سے لے کر نظام دکن تک سے فرضی ملاقات کی تیں اُس کی زبان پر ہوتیں۔ لیکن آج تو اُس نے کافی ہاؤس میں کہی ہوئی بات کی لاج رکھ لی۔

"ارے تم —— ؟" میں نے کہا۔ میں واقعی اُس کی جرأت پر حیران تھا۔ اُس رات شہر کی فضا کافی بگڑ چکی تھی۔ رات بھر شہر کے مختلف کونوں سے شعلے چمکتے رہے تھے مکانوں سے دھواں اُٹھتا رہا اور فضا کا سکوت مخالف نعروں سے ٹوٹتا رہا تھا۔ اور میں تو پہلے بھی کئی بار اُسے ادھر آنے سے منع کر چکا تھا اور آج یہ گمان تک نہ تھا —— مگر وہ میری ڈسپنسری میں تھا، مع اپنے بھانجے کے ——

"نامعقول! " میں نے اُس سے کہا۔ "یہ جرأت نہیں بیوقوفی ہے۔"

"سچ!" اُس نے کہا۔ "آج تو میں خود بہت ڈر رہا تھا، ادھر دیکھو ہاتھ، یہ جہاں میرا نام کھدا ہے، میں نے رومال لپیٹ رکھا ہے۔ بہن نے زبردستی بھیجا ہے تسلی کے لئے۔ اُسے اور کسی پر اعتبار ہی نہیں، کتابیں نہیں لا سکا۔ پھر ذرا ترجمہ مکمل ہو لے۔ کافی ہاؤس سہی ——"

اور میں اُسے دور تک چھوڑ کر آیا، اُس وقت تک ہماری طرف فضا خاموش تھی، مگر لوگوں کے استعجاب سے پُر چہرے اور مشکوک نگاہیں کسی طوفان کی غماز ضرور تھیں۔ یہی طوفان جواب اُمڈ رہا ہے ایک طرف سے بندوقوں کے چلنے کی آواز آرہی ہے، دُھواں اُٹھ رہا ہے۔ شعلے بلند ہو رہے ہیں، مہلک ہتھیار سنبھالے لوگ بھاگے جا رہے ہیں۔

میں نے ان لوگوں کو پہلے بھی دیکھا ہے، میں اُن کی صورتوں سے ناآشنا نہیں، مگر اس وقت یہ عام انسان تھے اور اب اُن کی حرکات میں تیزی، بلتا ہوا اضطراب اور آنکھوں میں وحشیانہ چمک انھیں کچھ اور ہی رنگ دے رہی ہے ——

گولیوں کی آواز زیادہ تیز ہوتی جا رہی ہے، لوگ واپس بھاگ رہے ہیں، دھواں اور زیادہ ہوتا جا رہا ہے۔ سیاہ دھواں سہ پہر کی دھوپ پر چھا گیا ہے، جو لوگ واپس آرہے ہیں وہ بھی خالی ہاتھ نہیں، اب اُن میں ہتھیاروں کی بجائے سامان ہے، ان کے ہاتھ رُکے ہوئے، جھولیاں بھری ہوئی ہیں، کندھوں پر بوجھ ہے —— ان میں سبھی قسم کے آدمی ہیں جوان، بوڑھے، عورتیں اور بچے! —— اور سبھی قسم کا سامان اُٹھائے ہوئے —— صابن چھتریاں بتیاں —— سرد کپڑے، ساڑیاں —— گرم کپڑے، نفیس کوٹ، سویٹر، اعلیٰ چادریں، قیمتی قالین —— کپڑوں سے بھرے ہوئے صندوق —— اور وہ ہنستے کھیلتے یہ سب چیزیں لئے آرہے تھے

گراموفون ——! سلائی کی مشین ——! ٹائپ رائٹر ——!

ایک نیا شعلہ چمکا ہے، اسی طرف سے جدھر اُس کا مکان ہے۔

"پال ——!" میں نے اس سے کہا تھا۔ "تم لوگ سب سامان رکھے یہاں بیٹھے ہو —— اسے نکالو، حالات خراب ہیں —— خدانخواستہ اگر کسی دن تمھیں جانا پڑا ——"

"ہم کہاں جائیں گے —— ساری عمر کی کمائی سے بمشکل باوجی نے یہ مکان بنایا ہے اور باقی چھوٹی ہمشیرہ کی شادی کا سامان ——"

اور لوگ سامان لئے ابھی تک چلے آرہے ہیں۔

کرسیاں، میزیں، صوفے اور دوسرا فرنیچر!

سائیکل، موٹر سائیکل،

بجلی کے پنکھے، ریڈیو،

خدا جانے کس مصیبت سے لوگوں نے یہ چیزیں بنائی ہوں گی۔

اس کے مکان کے مانوس کمروں میں بھی دھواں ہی دھواں بھرا ہوگا، سیاہ، زہریلا دھواں، آنکھوں اور گلے میں گھستا ہوا، اور وہ سب لوگ پریشان وہاں آگ اور دھوئیں کی لپیٹ میں،

میں آگ اور دھوئیں کے پردوں میں سے اُن کی صورتیں دیکھ رہا ہوں، وحشت زدہ چہرے، ہراساں، پریشاں اُن کی آنکھوں میں خوف ہے اور ہراس وہ اُن کی روحوں تک میں سرایت کر رہا ہے۔

"تم ڈرتے ہو — پال —" "تمھاری کتابوں کی الماری بھی آگ کی لپیٹ میں ہوگی، جیمس جائس، رومین رولاں، جان لیمان، ایشرووڈ، شولوکوف اور کی چیخوف، موپاساں — سیاہ دھواں چھا رہا ہے، شعلوں کی زبان ان کی روحوں کو چاٹ رہی ہے۔

ممکن ہے یہ اسی کے گھر کا سامان ہو، الماری کے ساتھ بچھا ہوا پلنگ، قریب ہی ایک میز، جس پر اُس کے نامکمل مسودات پڑے ہوتے، وہ مجھے اکثر اپنی چیزیں سناتا اور آئندہ کے پروگرام بناتا اور مجھ سے رائے پوچھتا، ہم وہاں بیٹھے گھنٹوں باتیں کیا کرتے، ادب کی، ادیبوں کی، زندگی کی، سیاست کی —

"میں سیتا رتھی کے متعلق ایک افسانہ لکھ رہا ہوں — لکھ دوں؟"

"اوں ہوں" میں کہتا "شرافت برتو —"

"اُس نے کبھی شرافت برتی ہے — اور تم آج کل کیا لکھ رہے ہو؟"

"نُسخے!" میں جواب دیتا۔

"بتو نہیں"

"میں ان کے لئے اور کیا لکھوں، یہ لوگ کتوں سے بھی ذلیل زندگی گزار رہے ہیں اور چوہوں سے بھی بدتر حالت میں مر رہے ہیں، خالی باتیں کرنے سے فائدہ؟"

انھی باتوں میں بعض اوقات گہری شام اُتر آتی۔ اُس کی بہن آنگن ہی سے آواز دیتی — "ڈاکٹر بھائی! آج روٹی یہیں کھا لو —"

"نہیں سمترا بہن، گھر ہی جاؤں گا اب، نزدیک ہی تو ہے، اور آج کل —"

"کیا ہرج ہے:" وہ جواب دیتی: "اور پھر خیر سے آج پال بھی گھر ہے، تمھارے ساتھ کھائے گا۔ ورنہ اُس نے کبھی وقت پر کھانا نہیں کھایا — رات گئے تک باہر رہتا ہے۔ خدا جانے کیا کرتا ہے، اسے پوچھو تو —"

"اس سے پوچھو تو،" اس کے والد بھی اکثر مجھ سے کہتے: "اسے کچھ سمجھاؤ۔ آدھی آدھی رات تک گھومتا رہتا ہے —"

"ورنہ آرٹ کہاں سے پیدا ہو" وہ آہستہ سے کہتا۔

اور جب بہن یہ سوال کرتی تو میں زور سے کہہ دیتا "بہن! میرا اس کا تعلق کیا؟ یہ ہندو — میں مسلمان — !"

اور ہم تینوں زور کا قہقہہ لگاتے۔ وہ کھانا چُن دیتی، کھانے کے بعد وہ چائے ضرور پیتا، اور پھر مجھے رخصت کرنے کے لئے دُور سڑک تک چلا آتا، کسی مغربی یا مشرقی شاعر کا کوئی خوبصورت سا مصرع گنگناتے ہوئے۔ اُس کا تلفظ اکثر میرے کانوں پر گراں گزرتا — اور پھر اسی مصرع سے بات آرٹ کی دنیا تک پہنچ جاتی، نئے مصوروں پر بھی وہ یوں بات کرتا جیسے وہ Picasso ہو، اس کے کمرے کی زینت چند کلاسیکی تصویروں کے علاوہ نئی نئی تصویریں ہوتیں، اُلٹی سیدھی لکیریں اور میری سمجھ سے باہر۔

وہ سب تصویریں بھی جل رہی ہوں گی۔ بنگالی مصور بوس کی ہاتھ کی بنائی ہوئی وہ تصویر جو خوبصورت فریم میں اس کے سرہانے دیوار پر تھی۔ جمنا ے تٹ پر — صبح کا خوشگوار منظر اور وہ رومان پرور سماں جو اس زمانے کے تقدس کی گود میں پلا تھا — اور وہ مغربی تصویریں جو میری سمجھ سے اہر تھیں، وہ اکثر اُن کی تعریف کیا کرتا تھا، شاید اس لئے کہ وہ مجھے سمجھ نہ آتی تھیں — اور ان باتوں سے وہ واقعی خوش ہوتا تھا۔ عجیب عجیب ام "الجھی الجھی لکیریں" — غیر ملکی مصنفوں کے کارنامے —

"تم نے کبھی اس کا نام بھی نہیں سنا — یہ دیکھو اس کی تصنیفات" — اور وہ مجھے خوبصورت گِٹ آپ والی ضخیم کتابیں دکھاتا — لیکن یہ تمہیں مجھ نہیں آئے گی۔ Memoirs ستیارتھی کے پاس ہے، وہ دیکھنا تم، ڈراما بھی ہے، افسانہ بھی، ناول بھی، بیانیہ بھی —"

"یعنی سب گڈمڈ، 'الجھن'" میں کہہ دیتا "اور اس زمانے میں تمہیں معلوم ہے ہر صحیح الذہن انسان الجھن سے بھاگتا ہے، اُس کی زندگی میں پہلے ہی کافی الجھنیں ہیں —"

"مگر یہ وہ چیزیں ہیں" وہ اپنی بات کہے جاتا "جو ابھی تک ہندوستان میں لکھی ہی نہیں کی گئیں، اسی طرح ایک چیز ہے Ballet بیلے سمجھتے ہو" اور پیشتر اس کے کہ میں جواب دے سکتا وہ ادب کی اس صنف پر ایک لیکچر شروع کر دیتا۔

اور آخر وہ کہتا "ایسی چیز ظاہر ہے یہاں کسی نے نہیں لکھی۔ میں!" وہ فخریہ انداز میں کہتا "میں لکھ رہا ہوں ایسی چیز، مکمل ہوئے تو سناؤں کا تمہیں، ور میری چیز Political ہوگی، میں اسے سوشلسٹ لیڈر جے پرکاش کے نام کر رہا ہوں —"

"اچھا اب چپ رہو" میں اسے کہتا "اور واپس گھر جاؤ، سیاست! مجھے اِس سے نفرت ہے —" اور مجھے واقعی اس سے نفرت ہے، ان آبادیوں پر سیاست ہی کا دھواں چھا رہا ہے، اس کے مکان میں سیاست ہی کے شعلے لپک رہے ہیں۔ ننھے ہریش کی خوبصورت آنکھوں میں یہی گھرا کڑوا دھواں چھو رہا ہے اور یہ سب لوگ اسی کی قوت سے بھاگے چلے جا رہے ہیں ہتھیار سنبھالے۔ اور اسی کی مظہر یہ گولیوں کی آواز ہے — اور میں، مجھے اس سے نفرت ہے۔ بس اپنی چھت پر سے اس دھوئیں کو دیکھ رہا ہوں جو اس طرف سے اُٹھ رہا ہے، جہاں میرا دوست پال رہتا ہے — لوگ ابھی تک چیزیں لئے چلے آ رہے ہیں، گائیں، بھینسیں، گھوڑے، اناج، بچہ گاڑیاں — سبھی طرح کی چیزیں۔

گھرے سیاہ دھوئیں کے مرکز سے ایک بھوری تکون اُٹھی ہے اور پھیل کر اُس پر قابض ہوگئی ہے، دھوئیں کا رنگ تبدیل ہو گیا ہے، کوئی چھت یا کوئی دیوار گر گئی ہے۔ تسولوکوف، رولان، جائس، گورکی، سب اس کے نیچے دب گئے ہیں، مستقبل کے معمار ننھے ہریش کی آنکھوں میں دھواں ہے، سمترا کی ہنسی اسی میں کھو گئی ہے، اور پال — !

صلاح الدین اکبر

اقوال

غریب دہقان کا کم سن بچہ شوخ رنگ کا کرتہ پہن کر اتراتا ہے۔ غریبستان کے بعض بھولے چُست ترکیبی تن کر زمین پر پاؤں نہیں رکھتے۔ نقلی بُلبُلوں کو ستاروں سے زیادہ چمکدار تصور کرتے ہیں۔

یہ لوگ نہ ہوتے تو زندگی بے لطف رہتی۔ جہاں کہیں ہیں خوش رہیں۔

بول پڑنا آسان ہے، خاموش رہنا مشکل ہے۔ بہت لوگوں کی زبان پر ہے کہ دنیا مٹ رہی ہے، ایک دفعہ نہیں لاکھ دفعہ مٹ جائے مگر دنیا والوں کا یہ غم کہ خدا نہ ملا کبھی نہ مٹے گا۔ یہ غم کون کھائے گا؟

خاموشی کا علم مانع ہے کہ اُس کا نام لوں۔

فلک پیما

غزل

پھر بختِ سیہ کا کیا شکوہ جب شب کی سحر ہو جاتی ہے

یُوں بھی تو گزر ہی جاتی ہے یُوں بھی تو بسر ہو جاتی ہے

دُنیائے محبّت میں ہمدم! انعامِ تمنّا کیا کہیے!

اک آہ نکل کر سینے سے محرومِ اثر ہو جاتی ہے

بس ایک نگاہِ ساقی کا محتاج ہے سارا میخانہ

اُس رند کی قسمت کیا کہیے جس پر وہ نظر ہو جاتی ہے

تکمیلِ اثر سے آہوں کی توہین گوارا کیوں ہو گی

مانا کہ تمھارے آنے سے تسکینِ جگر ہو جاتی ہے

کیا کہیے سرودِ سوزِ الم جب مست گھٹائیں چھاتی ہیں

اک درد سا دل میں ہوتا ہے حالت ہی دِگر ہو جاتی ہے

ناگاہ پشیماں ہو جانا، پلکوں کا حیا سے جُھک جانا

کیا اُن کو تبسّم حالِ دلِ محزوں کی خبر ہو جاتی ہے

مغنی تبسّم

مطبُوعات

اُردو۔ہندی۔ہندُستانی از سجاد ظہیر۔ یہ ایک چھوٹا سا پمفلٹ ہے جو اُردو ہندی کے اہم اور متنازعہ فیہ مسئلے پر لکھا گیا ہے۔ مصنف نے اُردو اور ہندی کے ارتقا پر بحث کر کے انھیں ہندُستانی کے درمیانی راستے پر لانے کی کوشش کی ہے۔

سید سجاد ظہیر صاحب ترقی پسند مصنفین کی انجمن کے جنرل سکریٹری ہیں، انھوں نے اس مسئلے پر اپنے خاص زاویۂ نگاہ سے روشنی ڈالی ہے اور اس جھگڑے کے اسباب پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ ہندوستان کی ملکی تقسیم کے بعد اُردو کو دیس بدر کرنے کی جو پالیسی ہندوستانی صوبائی حکومتوں نے شروع کر رکھی ہے اُس کے پیشِ نظر اب ہندُستانی پر بھی سمجھوتا ممکن نہیں رہا۔

کاغذ طباعت نہایت عمدہ، ضخامت ۴۸ صفحات قیمت ۱۲ ر ناشر کتب پبلشرز لمیٹڈ بمبئی

امیر پاکستان از عارف بٹالوی، پاکستان اور حضرت قائد اعظم پر کافی کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور یہ کتابیں کافی مقبول ہوئی ہیں۔ یہ کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، اُس میں قائد اعظم کی اُن سیاسی سرگرمیوں کا جائزہ لیا گیا ہے جو انھوں نے امیر قوم کی حیثیت سے دکھائی ہیں، کتاب میں کافی معلومات ہیں اور محنت سے انھیں ترتیب دیا گیا ہے۔

کاغذ، طباعت معمولی کتاب مجلد مع گرد پوش ضخامت ۸۴ صفحات قیمت دو روپے ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ سلطانی بمبئی نمبر ۳

چھالے از قدوس صہبائی، اُردو کے نوجوان مشہور صحافی اور ادیب قدوس صہبائی کے نتیجۂ فکر کو اس کتاب میں جمع کیا گیا ہے۔ قدوس صاحب ہمیشہ زندگی میں ڈوب کر لکھتے ہیں۔ ان کی زندگی کو خود ایک بہت بڑے چھالے سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ زیر تبصرہ مجموعے کے افسانے زندگی کی ان تلخ حقیقتوں سے متعلق ہیں جن کا مشاہدہ ہم روزمرہ زندگی میں کرتے ہیں، یہ افسانے جہاں حقیقت سے نزدیک ہیں وہاں ادب کی بلندی کو بھی برقرار رکھتے ہیں، یہی ایک اچھے ادیب کی کامیابی ہے، اس مجموعے میں چند افسانے ہندی ترجمہ ہیں۔

کاغذ طباعت اچھی ہے ضخامت ۲۵۲ صفحات کتاب مجلد مع گرد پوش قیمت تین روپے۔ ناشر، نیا کتاب گھر، اُردو بازار دہلی،

ملے جلے افسانے مرتبہ مقصود یوسف عثمانی۔ افسانوں کے اس مجموعہ میں طبع زاد افسانوں کے علاوہ چند بنگالی اور مرہٹی زبان کے تراجم بھی ہیں۔ اُردو داں طبقے کو ہندوستان کی دوسری زبانوں کے ادب سے روشناس کرانے کے سلسلے میں ایسی کوششیں نہایت احسن ہیں۔ یہ افسانے ہمیں بنگالی اور مرہٹی زندگی کے اندر جھانکنے کا موقع دیتے ہیں تراجم کی زبان کافی اچھی ہے سلاست اور روانی کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

کاغذ کتابت اور طباعت اچھی ہے ضخامت ۱۰۴ صفحات کتاب مجلد مع گرد پوش قیمت ایک روپیہ چار آنے ملنے کا پتہ اُردو اشاعت گھر ۱۱/۴۲ فیرس لین کلکتہ

ماہنامہ "نفسیات" لاہور بابت ماہ جنوری ۱۹۴۸ء۔ مکتبہ نفسیات ایک ایسا ادارہ ہے جو صرف نفسیات کے موضوع پر کتابیں شائع کر رہا ہے اب اس ادارے کی طرف سے ایک ماہنامہ جاری کیا گیا ہے۔ جس کا پہلا پرچہ ہمارے سامنے ہے۔ پرچہ نہایت اچھی طرح مرتب کیا گیا ہے۔ شروع میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب اور میاں بشیر احمد صاحب کے پیغامات درج ہیں۔ مضمون نگاروں میں پروفیسر محمد اسلم صاحب شعبہ فلسفہ و نفسیات گورنمنٹ کالج لاہور اور ڈاکٹر اے لطیف صدر شعبہ فلسفہ و نفسیات ایف سی کالج لاہور پرچے کے وقار کے ضامن ہیں۔

اُردو زبان میں یہ پہلا پرچہ ہے جو نفسیات کے لئے وقف کیا گیا ہے عام فہم زبان میں نفسیاتی مضامین کو ادا کرنا اس کی خصوصیت ہے۔ سالانہ چندہ چھ روپے فی پرچہ ۸ ر ملنے کا پتہ مکتبہ نفسیات ۸ بیڈن روڈ لاہور۔

سید منظور حسین بخاری منیجر پرنٹر پبلشر نے اتحاد پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر ہمایوں ۳۲ لارنس روڈ لاہور سے شایع کیا۔ صرف سرورق زرین پریس لاہور میں چھپا

Regd. No. L.1363.

بیادگار علامۂ فصیح آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوںؔ مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی-اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لاء
جائنٹ ایڈیٹر: شیر محمد اختر

فہرست مضامین

ہمایوں بابت ماہ مارچ ۱۹۴۸ء

نمبر صفحہ	صاحبِ مضمون	مضمون	نمبر شمار
۱۰۲	بشیر احمد	بزمِ ہمایوں	۱
۱۰۳	شیر محمد اختر	جہاں نما	۲
۱۰۶	جناب ڈاکٹر غلام یزدانی صاحب	مرزا فرحت اللہ بیگ کی شاعری	۳
۱۱۶	جناب جلیل کریر صاحب بی۔اے	غزل	۴
۱۱۷	جناب شان الحق صاحب حقی	سرفروش (نظم)	۵
۱۱۸	جناب ظہیر کاشمیری صاحب بی۔اے	اُجالا (ڈرامہ)	۶
۱۲۲	جناب تابش دہلوی صاحب	سوزِ ناتمام (نظم)	۷
۱۲۳	"لالۂ صحرائی"	پناہ (افسانہ)	۸
۱۳۰	جناب طفیل ہوشیارپوری صاحب	غزل	۹
۱۳۱	"ابن انشا"	واردات (نظم)	۱۰
۱۳۲	جناب جعفر طاہر صاحب	غزل	۱۱
۱۳۳	جناب اختر رضی صاحب بی۔اے	سہارا (افسانہ)	۱۲
۱۳۷	جناب مضطر اکبرآبادی	غزل	۱۳
۱۳۸	جناب ضمیر اظہر صاحب بی۔اے	اوراب	۱۴
۱۳۹		مطبوعات	۱۵

چندہ سالانہ ۶ روپے — ششماہی ۳ روپے — فی پرچہ ۸ آنے

بزمِ ہمایوں

مہاتما گاندھی کے اندوہ ناک قتل نے دُنیا کا دل ہلا دیا ہے۔ نصف صدی تک اِس بڑے آدمی نے اپنے مُلک کی بے لوث خدمت کی پہلے جنوبی افریقہ میں اور پھر ہندوستان میں۔ تقریباً تیس برس ہوئے جب اُس نے ہندوستان کی سیاسی زندگی میں قدم رکھا تو یہ ملک محض ایک غلام ملک تھا۔ رولٹ ایکٹ کے بعد کی شورش کا آغاز گاندھی کے ہاتھوں ہوا۔ ۱۹۲۰ء میں اُس نے عدم تعاون اور ۱۹۳۰ء میں سول نافرمانی کی تحریک شروع کی۔ ۱۹۳۷ء میں کانگرس برسرِ اقتدار ہوئی اور ۱۹۴۲ء میں "ترکِ ہندوستان" کی تحریک پھر گاندھی ہی کی قیادت میں بروئے کار آئی۔

لیکن اتنے میں ملک میں ایک اَور طاقت اُبھر چکی تھی اور وہ تھی قائدِاعظم محمد علی جناح کی مُسلم لیگی تحریک۔ اِن دو بڑے آدمیوں میں رسہ کشی شروع ہوئی اور آخر ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو یہ ملک آزاد بھی ہو گیا اور دو حصّوں میں منقسم بھی ہُوا۔ ہندوستان جسے گاندھی نے آزاد کرایا اور پاکستان جس کی بِنا جناح نے ڈالی۔

گاندھی عمر بھر ہندوستان کی وحدت کا مؤید رہا لیکن گزشتہ سال جب آخر ملک کی تقسیم عمل میں آئی تو یہ گاندھی کی عظمت کا اک ثبوت ہے کہ اُس نے پاکستان کے وجود کو بسروچشم قبول کیا اور جب ہندوستانیوں کے ایک برگشتہ گروہ نے پاکستان کے خلاف تشدّد کا حربہ استعمال کرنا چاہا اور مسلمانوں کو ہندوستان میں ختم کرنے کی ٹھان لی تو وہ انتہائی دلیری سے ایک غیر قوم کی حفاظت کے لیئے اپنی قوم کے خلاف سینہ سپر ہو گیا۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ وہ جیا ہندوؤں کے لیئے لیکن مرا مُسلمانوں کے لیئے!

مُلک مُلک کے رہنماؤں نے مہاتما گاندھی کی حسرت ناک موت پر اپنی عقیدت کے پھُول برسائے۔ نہرو نے کہا "ہماری زندگی روشنی سے محروم ہو گئی ہے اگرچہ یہ روشنی ایک ہزار برس کے بعد بھی اس مُلک میں دکھائی دے گی اور ساری دُنیا اِسے دیکھا کرے گی"۔ لیاقت نے کہا "تعجب ہے کہ جو شخص عمر بھر تشدد کے خلاف تلقین کرتا رہا وہ خود تشدّد ہی کا شکار ہُوا"۔ کراچی کے ایک مُسلم موٹر ڈرائیور نے کہا "آخر یہ کیوں ہوا؟ اور دُنیا کو کیا ہو گیا ہے؟" لندن میں ہندوستانی طلبا پھوٹ پھوٹ کر روئے اور کہا جاتا ہے کہ انگلستان والے مزدور حکومت کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد کسی واقعے سے ایسے متاثر نہیں ہوئے۔ ماٹلی نے کہا "یہ بات باور نہیں کی جا سکتی کہ انسان کی شکل میں کوئی ایسا شیطان نمودار ہو سکتا ہے جو ایک ایسے بڑے آدمی کو عین اس وقت قتل کر دے جب وہ اپنی زندگی نوعِ انسان کی محبت کے لیئے وقف کر چکے"۔ برنارڈ شا نے کہا "اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ حد سے زیادہ نیک ہونا بھی کس قدر خطرناک ہے!"

گاندھی اور جناح کی برسوں ملاقاتیں ہوتی رہیں، بات بات میں اُن کا اختلاف رہا۔ وہ اپنی قوم کا عاشق تھا یہ اپنی قوم کا، وہ اُس کا نجات دہندہ تھا یہ اِس کا لیکن آخر عملاً دونوں ایک ہی بات پر متفق ہو گئے اور وہ بات تھی مسلمانوں کی حفاظت، ایک بڑے ہندو نے مسلمانوں کے لیئے جان دے کر ہندو قوم کو صحیح عظمت و ایثار کا رستہ دکھایا!

گاندھی زندگی بھر ہندوستانیوں کا لیڈر رہا اور مر کر وہ ہندو مسلمانوں دونوں کا ہیرو بن گیا۔

اب اگر ہندو اپنے سب سے بڑے لیڈر کی یاد تازہ رکھنا چاہتے ہیں تو اِس کی یہی صورت ہے کہ وہ ہندوستان میں مسلمانوں کے مددگار رہیں اور اگر مسلمان اپنی احسان مندی کا اعتراف کرنا چاہتے ہیں تو یہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ وہ پاکستان میں اپنے تمام ہندو ہمسایوں کو اپنی محافظت میں لے لیں۔ اگر یہ ہو جائے تو یہ مہاتما گاندھی کی موت ہندوستان اور پاکستان دونوں کے لیئے ایک نئی زندگی کا پیش خیمہ ثابت ہو!

بشیر احمد

جہاں نُما

گفتگو ایک فن ہے

ہمارے اس مہذب زمانے میں جب الفاظ کے ظاہری مطالب کے ساتھ ساتھ سننے والے بین السطور اور غیر شعوری معنی بھی پرکھتے ہیں گفتگو
اظہارِ مطلب نہیں رہ جاتی بلکہ اُس سے ذہن کی بہت سی خفیہ باتیں منظرِ عام پر آجاتی ہیں اب گفتگو نے فن کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اچھی باتیں
والا ہر زمانے میں "رونقِ بزم" کہلاتا رہا ہے، غالب نے اس کی تعریف یُوں کی ہے ؎

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا　　میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

گو کے شعوری اور لاشعوری پہلوؤں کے امتزاج کی یہ نفسیاتی کیفیت ہے جس کا اظہار غالب نے کیا ہے۔

ہر فن کے لوازمات ہوتے ہیں گفتگو کے بھی چند لوازمات ہیں جن کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے تاکہ باتیں زیادہ اچھی اور با اثر ہوں اور گفتگو کرنے والا
نِ بزم بن سکے۔ ان لوازمات پر ایک امریکی مصنف نے یوں روشنی ڈالی ہے۔

۱۔ محفل میں اپنی ذات کے متعلق کبھی زیادہ تفصیل سے گفتگو نہ کی جائے، دُوسرے کی صحت، ذاتی تکالیف اور مالی مشکلات سے بہت کم سننے والوں
دلچسپی ہوتی ہے۔ اگر آرٹ، سائنس، تاریخ اور روز مرہ کے واقعات پر باتیں ہوں تو اُن میں بہت سے اور لوگ حصہ لے سکتے ہیں، اس طرح گفتگو
یادہ دلچسپ اور موثر ہوگی۔

۲۔ بعض لوگ دوسروں کو بات کرنے نہیں دیتے، ہر انسان باتیں کرنا چاہتا ہے، ہو سکتا ہے تھوڑی دیر کے لئے کسی کی باتیں محفل کا رنگ بدل دیں
ر جب سلسلۂ کلام طویل ہوتا جائے گا اور کسی دوسرے کو بات کرنے کا موقع ہی نہ ملے گا تو ایسی گفتگو سے سب اکتا جائیں گے، خاموشی گفتگو کو دلکش
بنا دیتی ہے، اس لئے گفتگو کے درمیان وقفہ دیں تاکہ دُوسرے بھی کچھ کہہ سکیں۔

۳۔ ایکا ایکی کسی بات کی تردید اچھی نہیں ہوتی۔ اگر ایسا کرنا ہی ہے تو تحمل سے یُوں کہہ دیا جائے کہ "میں آپ سے پوری طرح اتفاق نہیں کرتا" اس
سے بات بھی بن جائے گی اور کوئی بُرا بھی نہ مانے گا۔ بہتر تو یہ ہے کہ آپ دوسروں کی باتوں میں سے ایسے نکات تلاش کریں جن سے آپ متفق ہیں اس سے
گفتگو دلچسپ ہو جائے گی اور ایک پسندیدہ طریق سے اپنے جذبات کا اظہار کیا جا سکے گا۔

۴۔ کبھی قطع کلام نہ کریں، اسے کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔ بات کاٹنے سے خیالات کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے۔ اس کی بجائے گفتگو کے دوران میں اگر
داد دی جائے تو اس سے بات پُر لطف ہو جائے گی۔ رنگِ محفل خوب جمے گا۔

۵۔ گفتگو کا موضوع اچانک نہیں تبدیل کرنا چاہیئے، بعض لوگ صبر اور تحمل سے دوسروں کی باتیں سُن تو لیتے ہیں مگر جوں ہی بات ختم ہوئی انھوں نے
جھٹ نیا موضوع چھیڑا، حالانکہ اگر بات ختم ہونے کے بعد چند لمحات خاموشی رہے اور اس عرصے میں اُس بات پر غور کیا جائے اور پھر سلسلۂ کلام شروع ہو
تو اس سے گفتگو میں زیادہ گہرائی آجاتی ہے۔

۶۔ دوسروں کی گفتگو میں دلچسپی کا اظہار ضروری ہے۔ اس کے لئے صرف کان کافی نہیں، بلکہ آنکھ، ہاتھ اور پسندیدہ حرکات کی مدد بھی چاہیئے۔ گفتگو
کے دوران میں سننے والوں کا خاموش رہنا گفتگو کے اچھا ہونے کی دلیل نہیں جب تک اُن کی آنکھیں، حرکات اور چہرے پر جذبات کا اظہار اُس کی شہادت

نہ دیں، دلچسپ گفتگو سننے والوں کو شگفتہ بنا دیتی ہے، وہ بھی زندہ دلی کا ثبوت دیں گے، اپنی مصیبتوں کا قصہ کبھی نہ چھیڑیئے ورنہ ہر ایک ویسی ہی مصیبت کی داستان سنانے لگا اور بزم پر پژمردگی چھا جائے گی۔

۷۔ اگر باتوں باتوں میں موضوع سے گفتگو کا رُخ ہٹ جائے تو فن کی خوبی یہ ہے کہ اُسے اصل موضوع پر لایا جائے، ایسا کرنا کمال کی دلیل ہے۔ اس سے گفتگو میں دلچسپی قائم رہے گی۔

۸۔ کبھی کسی بات پر حتمی رائے نہ دی جائے، عام طور پر لوگ اس "حماقت" کا شکار ہیں، بلا سوچے سمجھے آخری فیصلہ صادر کر دیتے ہیں، بہتر یہ ہے کہ صرف اپنی رائے کا اظہار کیا جائے تاکہ دوسروں کو بھی موقع ملے کہ وہ اس کے متعلق سوچیں، جو لوگ کسی بات کے متعلق پوری واقفیت رکھتے ہیں اکثر رائے دینے میں انکسار سے کام لیتے ہیں، یہی اُن کی بڑائی کا ثبوت ہے۔

۹۔ باتیں ٹھہر ٹھہر کر کی جائیں۔ الفاظ کی ادائیگی صاف ہونی چاہیئے۔ جب تک کسی کی بات کو سمجھا نہ جائے اُس سے لطف نہیں اٹھایا جا سکتا۔ "الفاظ کترنے والا" کبھی کامیاب گفتگو نہیں کر سکتا۔ "پہلے تولو اور پھر بولو" واقعی گفتگو کے لئے ضروری ہے۔

ماہر نفسیات فوٹوگرافر

فوٹو اُتارنا اور فوٹو اُتروانا دونوں فن ہیں۔ آج کی دُنیا کے ہر بڑے انسان کو فوٹو اُتروانے کے فن میں مہارت خوب ہوتی ہے، اس لئے فوٹو اُتارنا بھی بہت ترقی کر گیا ہے۔ فوٹوگرافی کے فن میں اس وقت کینیڈا کا فوٹوگرافر یوسف قرش سب سے آگے ہے جو فوٹوگرافر سے زیادہ ماہر نفسیات ہے۔ وہ دُوسروں کے جذبات سے کھیلتا ہے۔ چرچل نے اُسے یوں خراج تحسین ادا کیا ہے کہ "تم دھاڑتے شیر کو خاموش کرا سکتے ہو"۔ قرش نے چرچل کا فوٹو اتنا اچھا اُتارا ہے کہ وہ سیکڑوں بار اخبارات و رسائل میں چھاپا جا چکا ہے۔ اس کا قصہ کافی دلچسپ ہے۔

۱۹۴۱ء میں چرچل اٹاوہ گیا اور وہاں کی پارلیمان کے سامنے ایک دھواں دھار تقریر کی۔ تقریر کے بعد جب چرچل باہر آیا تو قرش منتظر کھڑا تھا۔ چرچل تھکا ہوا تھا مگر جونہی اُس نے کیمرہ دیکھا اکڑ گیا، جھٹ سگار دانتوں میں دبا کر اُسے سلگایا اور پھر تحکمانہ لہجے میں بولا "اب تصویر لو"۔ جس طرح ایک عاشق اپنے محبوب کے لبوں سے بوسہ چرانے کے لئے نرم روی سے آگے بڑھا بڑھتا ہے بالکل اسی طرح قرش نے آگے بڑھ کر سگار چھینا اور "معاف کیجئے" کہہ کر اسے راکھ دانی پر رکھ دیا۔ چرچل کا چہرہ غصے اور غضب سے تمتما اُٹھا اور قرش نے آن کی آن میں فوٹو لے لیا۔ نتیجہ ایک ایسی لافانی تصویر ہے جس میں چرچل برطانوی مستقل مزاجی کا اشاریہ بن گیا۔

اس تصویر کے بعد حکومت کینیڈا نے قرش کو برطانیہ کی دیگر مشہور ہستیوں کے فوٹو اُتارنے پر مامور کیا۔ چنانچہ وہ لندن پہنچا اور اسے بکنگھم پیلس میں شاہ جارج ششم کے حضور باریابی کا شرف بخشا گیا۔ اُس نے بادشاہ کے کئی "پوز" لئے۔ اس دوران میں بادشاہ کچھ اُکتا سا گیا اور چائے لانے کو ارشاد فرمایا مگر قرش نے نہایت گستاخی سے "چائے کی کوئی ضرورت نہیں" کا جملہ کہا۔ بادشاہ خاموش ہو گیا اور پھر تصویر اتاری جانے لگی مگر اب کی چہرے پر ایک اور کیفیت تھی، یہی قرش چاہتا تھا۔

کیمروں کا رنگ عموماً سیاہ ہوتا ہے مگر قرش کا خیال ہے کہ اس سے طبیعت پر اُداسی چھا جاتی ہے، اس لئے اُس نے اپنے کیمرہ پر سفید رنگ کر رکھا ہے اور فوکس کے لئے سیاہ پردے کی جگہ مخمل ہے جس کے کناروں پر سنہری حاشیہ ہے۔

برنارڈ شا کی تصویر کا واقعہ بھی دلچسپ ہے۔ قرش جب اُس کے ہاں پہنچا تو اُس کے سکرٹری نے اسے بہت سی ہدایات دیں، روشنی نہ کی جائے، بڑا نہ ہو، اس کام کے لئے صرف پانچ منٹ کی اجازت ہے وغیرہ۔ وہ ابھی یہ ہدایات دے رہا تھا کہ آئرلینڈ کا مزاح نگار خود باہر آ گیا اور قرش پر طنز کیا لیکن قرش نے ہر تیر کو ڈھال پر لیا اور بالآخر پانچ منٹ بڑھ کر اڑھائی گھنٹے ہو گئے اور جب اُس نے اپنا بڑا کیمرہ بند کیا تو شا استدعا کر رہا تھا کہ "جب نوّے برس کا ہو جاؤں تو اُس دن آ کر ضرور میرا فوٹو اُتارنا"۔

قرش آرمینیا کا باشندہ ہے، تیرہ برس کی عمر میں وہ کینیڈا چلا آیا اور اٹاوہ میں کام شروع کیا۔ اُسے اٹاوہ کے لوگوں سے بہت محبت ہے

لوگ اُسے بے تکلفی سے صرف قرش پکارتے ہیں۔ اُس کا مشہور سٹوڈیو اٹاوہ ہی میں ہے۔ حکومت کے بڑے بڑے عہدیدار اُس کے سرپرست ہیں اور وہ سرکاری فوٹوگرافر بھی ہے، وہ ایک تصویر کا معاوضہ ۲۵۰ ڈالر لیتا ہے، مگر اٹاوہ والوں سے صرف ۷۵ ڈالر۔ اس کی بیوی فرانسیسی ہے اور خاوند کے کام میں بہت مدد دیتی ہے۔ ایک بار اُس نے بیان دیتے ہوئے بتایا کہ "میں نے ایک کیمرہ سے شادی کی ہے جس کے لنز کی جگہ دل ہے"۔

پچھلے برس اُس نے ۷۵ تصاویر کا مجموعہ "تقدیر کے چہرے" (Faces of Destiny) کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس میں سب سے اچھی تصویر جنرل جوزف پرشنگ کی ہے جو پہلی عالمگیر جنگ میں امریکی افواج کا کمانڈر تھا۔ اس تصویر کے اُتارنے سے قبل قرش نے وہ تمام کتابیں دیکھ ڈالیں جن میں جنرل پرشنگ کے حالات زندگی تھے۔ ان دنوں یہ بہادر سپاہی والٹر ریڈ ہسپتال میں بیمار تھا، قرش اُسے ملنے گیا، اُس نے دیکھا کہ اب پرشنگ ایک کمزور سا تھکا ہارا انسان رہ گیا ہے، اس رات قرش سو نہ سکا، وہ بے قرار کمرے میں اِدھر اُدھر گھومتا رہا، وہ سوچ رہا تھا کہ تیس برس کا زمانہ کیسے واپس لایا جا سکتا ہے۔

دوسرے دن مقررہ وقت پر قرش ہسپتال پہنچا۔ جنرل کرسی پر منتظر بیٹھا تھا۔ اس ڈر سے کہ کہیں ضعیفی کی وجہ سے جنرل اونچا نہ سنتا ہو قرش ایک ٹانگ پر جھک گیا اور پھر دھیمی آواز میں اُن الفاظ کو جو اُس نے جنرل کے ایک ایڈی کانگ سے سُنے تھے تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ دُہرایا "میں آپ کی ایک ایسی تصویر لینا چاہتا ہوں جسے امریکی لوگ سو برس تک یاد رکھیں" ان الفاظ نے جادو کا اثر کیا۔ پرشنگ مسکرایا اور لمحہ بھر کے لئے نظریں جھکا لیں اور پھر آہستہ آہستہ اُس کے کندھے پیچھے کی طرف ہونے لگے۔ سینہ چوڑا ہوتا گیا، سربلند ہوا، چہرہ بارونق ہو گیا اور چند لمحوں میں تیس سال کا گزرا ہوا زمانہ واپس آ گیا۔ اب کرسی پر ۱۹۱۷ء کا جنرل پرشنگ بیٹھا تھا جس نے فلپائن جزائر میں بہادری کے جوہر دکھائے تھے۔

قرش سامان سنبھال رہا تھا اور اُس کے کیمرہ میں جنرل کی لافانی تصویر بند تھی، جنرل اُٹھا اور اپنے پلنگ کے سرہانے کھڑا ہو گیا۔ قرش نے فوجی سلام کیا اور جواب میں پرشنگ کا ہاتھ پھرتی اور صفائی سے اُٹھا، وہ مسکرایا، قرش کے کندھے پر تھپکی دی اور بولا "بیٹے! میری فوج میں بھرتی ہو گے نا؟"

مصنوعی بارش

قحط کے خلاف جنگ کرنے کے لئے انسان صدیوں سے تجاویز سوچتا آ رہا ہے۔ جوہری بم کی ایجاد نے سائنسدانوں کے سامنے بہت سے نئے راستے کھول دیئے ہیں یا دلوں کے بغیر بارش کا حاصل کر لینا اب ممکنات میں سے ہے۔ تجربے کرنے والوں کا کہنا ہے کہ آب پاشی کے اس ذریعے سے دگنی پیداوار ہو سکتی ہے۔ چنانچہ دو انچ مصنوعی بارش سے گاجروں کی فصل میں پچاس فی صدی کا اضافہ ہوا ہے۔ چار انچ بارش سے یہ اضافہ اسّی فی صدی تک جا پہنچا۔

اگر مصنوعی بارش کا تجربہ مکمل طور پر کامیاب ہو جائے اور اسے عام کیا جا سکے تو اس کے ذریعے بے موسم کی سبزیاں کافی مقدار میں مل سکتی ہیں پھر اس طریق میں ایک آسانی یہ ہے کہ اس بارش سے کہیں بھی ضرورت سے زیادہ پانی نہیں گرے گا کہ اس سے فصل کے برباد ہو جانے کا ڈر ہو۔ بلکہ چھلنی کے ذریعے ضرورت کے مطابق جہاں اور جتنا پانی چاہیئے گرایا جا سکتا ہے اس بارش کیلئے صاف و شفاف پانی سے کام لیا جاتا ہے۔ ایک گھومنے والے پائپ میں سے پانی گزار کر کھیتوں میں یوں پھینکا جاتا ہے کہ وہ بارش کی صورت اختیار کر لے پانی حاصل کرنے کے لئے بجلی کی سب سے زیادہ ضرورت ہے تاکہ موٹر انجن کے ذریعہ پانی کی کافی مقدار بہم پہنچائی جائے اور پھر اُسے کام میں لایا جا سکے۔ یہ تجربات ابھی ابتدائی دَور میں سے گزر رہے ہیں اس لئے ان میں بڑی احتیاط برتی جا رہی ہے۔ اس وقت کوئی نصف درجن کے قریب انگریزی فرمیں موجود ہیں جو اس کام میں ماہر ہیں ان میں سے بعض کا دعویٰ ہے کہ وہ دُنیا کے ہر حصے میں مصنوعی بارش برسا سکتی ہیں اور ایک "پلانٹ" سے ایک ہزار ایکڑ زمین سیراب کر سکتی ہیں، اس کے کئی فائدے ہوتے ہیں پانی کی بچت ہوتی ہے اور ضرورت کے مطابق زمین کو سیراب کیا جا سکتا ہے۔ زیادہ بارش سے کھیتوں میں گڑھے پڑ جاتے ہیں اور اُن سے زمین خراب ہو جاتی ہے مگر مصنوعی بارش سے اس کا احتمال نہیں۔ محنت مزدوری میں بھی تخفیف ہو جاتی ہے۔

امریکہ اس تجربے کی کامیابی کے بعد انسانی تہذیب کو ایک قدم اور آگے لے جائے گا۔ اب تک تین گھنٹوں میں نصف انچ کے قریب بارش برسا جا سکی ہے۔ فنِ زراعت کا مستقبل اس کے بعد بہت ہی روشن ہو جاتا ہے۔

شیر محمد اختر

مرزا فرحت اللہ بیگ کی شاعری

مرزا صاحب کا [illegible] اس مضمون میں پورا نام نہیں لوں گا اور صرف تخلص فرحت ہی سے ان کا ذکر کروں گا۔ اس مضمون کو میں کم و بیش
یزی زبان میں Humorous Poetry کے ایک جلسہ میں پڑھ چکا ہوں اس لئے ایسے سننے والوں کو جو وہاں موجود تھے اگر انگریزی ضرب المثل
وافق دوسرے وقت کی گوبھی کا مزہ آئے یا اردو مثل کے لحاظ سے باسی کڑھی کا ابال معلوم ہو تو وہ نواب سعید جنگ بہادر یا ان کے لائق
ن مولوی سجاد مرزا صاحب سے گلہ کریں جنھوں نے اصرار سے اس مضمون کو اردو مجلس میں پڑھنے کے لئے مجھے مجبور کیا۔ حبیب کا ذکر اگر مکرر بھی ہو
عث آتا ہے اس لئے مجھے تعمیل میں کچھ عذر نہ ہوا۔

کسی شاعر کے کلام کی داخلی اور خارجی صفات کو سمجھنے کے لئے چونکہ اس کے واقعات زندگی اور عام کردار سے مدد ملتی ہے اس لئے میں نہایت مختصر
سے فرحت کے حالات بیان کروں گا اور ایسے صاحبوں سے جو ان کی زندگی اور رجحانات سے واقف ہیں اور اس جلسہ میں موجود ہیں استدعا
ہ وہ مجھے معاف فرمائیں۔

فرحت ۱۸۸۴ء میں دلی میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۷ء میں حیدرآباد آئے اور یہیں رس بس گئے، ۲۶ اور ۲۷ اپریل کی درمیانی رات میں وہ
کے پیارے ہو گئے یہ واقعہ ۱۹۴۷ء میں ہوا۔ دلی میں وہ ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جس میں ممتاز شاعر گزر چکے تھے مثلاً مومن، غالب
رند اور رنگین۔ مرزا صاحب کے دو چچا بھی شاعر تھے ایک ذاکر تخلص فرماتے تھے دوسرے شاکر۔ دونوں صاحبِ دیوان ہیں، فرحت کو اس طرح
ری کا ملکہ میراث میں ملا لیکن وہ اس ملکہ کے جوہر جب تک ان کی عمر خاصی پختہ نہ ہو گئی دکھا نہ سکے۔ تاہم ان کی طبیعت کی براقی اور خداداد
ت کا پتہ بعض ہجووں اور قطعوں سے ملتا ہے جو انھوں نے مدرسہ اور کالج کی طالب علمی کے زمانے میں مرتب کئے تھے۔ فرحت جب کالج کی تعلیم سے
غ ہوئے تو ان مشاعروں میں بھی شریک ہوئے جو خود ان کے مکان پر ہوتے تھے۔ طالب علمی کے زمانے میں ایک مرتبہ علی گڑھ بھی مشاعرے میں
یک ہونے کے لئے گئے تھے۔ لیکن خود فرحت نے ایسی شرکت کو محض تفریح سمجھا کیونکہ شاعر بننے کا جذبہ اس وقت تک ان میں پیدا نہیں ہوا تھا
ن کو پڑھنے کا بے حد شوق تھا اور اردو اور فارسی اساتذہ کا منتخب کلام ازبر یاد تھا۔ خدا نے ان کو نہایت سریلی، پاٹ دار آواز دی تھی
عرا کے کلام کو سنا کر وہ اپنے دوستوں کو بھی خوش کرتے تھے اور خود بھی محو ہو جاتے تھے۔ فرحت کو حالی کی مسدس کے ساتھ جعفر زٹلی، چرکین اور
ر کی ہزلیات بھی یاد تھیں، وجہ یہ ہے کہ زمانہ کا ذوق ایسا تھا کہ کتب فروش گٹھر باندھے ہوئے جب گھر گھر پھیری لگاتے تھے تو راہ نجات،
[illegible] ہرنی کا معجزہ، قرآن کے سیپاروں کے علاوہ نظیر کا چوہے نامہ، دیوان جان صاحب۔ دیوان جعفر زٹلی۔ دیوان چرکین بھی ساتھ رکھتے
ر لوگ انھیں بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ کم عمر بچوں کے ذہن اور رجحانات پر ایسے ادب کا اثر پڑنا لازمی ہے اور فرحت کی نثر اور نظم دونوں
یہ میلان موجود ہے۔

فرحت [illegible] میں مدرس کی حیثیت سے شریک ہوئے اور اپنی ذاتی قابلیت اور علمی استعداد کی وجہ سے ہائی کورٹ کی ججی کے ممتاز
[illegible] پہنچے۔ فرحت کی شخصیت بہ حیثیت سرکاری عہدہ دار ان کی خانگی روش سے بالکل جدا تھی۔ خاموش، کم سخن، نپی تلی بات، فرض کا گہرا احساس، اوقات
پابندی اور کام کرنے کا غیر معمولی جذبہ۔ دوستوں میں جب بیٹھتے تھے تو ڈینگ مارنا، فقرے کسنا، ہنسنا اور ہنسانا اور مرزا منشی کی باتیں ان کی
عادات تھیں۔ طالب علمی کے زمانے میں پیدل پھرنے کا بہت شوق تھا۔ مجھے یاد ہے کہ دسمبر کا مہینہ تھا کڑاکے کے جاڑے پڑ رہے تھے۔ ہم دونوں صبح

ربجے اٹھتے۔ اوور کوٹ پہنے گھر سے نکلتے۔ جیبوں میں چبینا بھرا اور قطب صاحب کی طرف چل نکلے۔ راستے میں گاڑیبانوں کے پاس بیٹھے۔ الاؤ پر
ـتاپی۔ فرحت تو چلم کے دور میں بھی شریک ہو گئے۔ گاؤں کے حالات پوچھے۔ کنواں مل گیا تو پنہاریوں سے باتیں کیں ۔ ایک گنبد مٹتے جیسے روز کا
ـ ذکر کر رہا ہوں اس روز تغلق آباد کا تاریخی قلعہ بھی دیکھا اور گھر واپس ہونے تک پورے چونتیس میل کی منزل طے کی۔ دو ہی میل کا تو روز چکر ہو جاتا تھا
ہلی میں جہاں اب دہلی یونیورسٹی ہے اور پہلے لارڈ کرزن نے اپنے قیام کے لئے ایک مختصر عمارت "وائسریگل لاج" کے نام سے تعمیر کی تھی وہاں کھیت تھے
ور فرحت اور اُن کے ساتھ میں بھی وہاں اکثر کچریاں کھانے جایا کرتے تھے کیونکہ وہاں کی کچریاں بہت مزیدار ہوتی تھیں۔ فرحت کی آنکھیں اور
ماغ ایسی سیروں میں ہمیشہ قدرتی مناظر سے لطف اُٹھاتے تھے۔ جغرافیائی اور تاریخی حالات کے معلوم کرنے کا شوق تھا۔ دیہاتی زندگی بہت پسند تھی
در اسی وجہ سے وہ اپنے ایسے ہم جماعتوں میں بہت عزیز ہو گئے تھے جو گاؤں سے تعلیم کے لئے آئے تھے۔

فرحت کا دل محبت کے جذبے سے لبریز تھا اس لئے جس سے ایک دفعہ وہ مل لیتے اُن کا گرویدہ ہو جاتا تھا ہندوستان کے مختلف حصوں میں
ن کے دوست اور احباب موجود ہیں البتہ خط و کتابت میں پابند نہ تھے شاید اس وجہ سے کہ اس کو وہ فضول سمجھتے ہوں ہمیشہ شاد باش و شاد زی
پر عمل تھا۔ آخر عمر میں دل کے سخت دورے پڑتے تھے لیکن ذرا سنبھلے اور پھر وہی ہنسی اور خوش مذاقی، کبھی افسردگی اور تیوری پر بل نظر نہیں آتا تھا
دہ زندگی کے فلسفے میں ہمیشہ "پر مسرت" نظر کے صرف قائل ہی نہ تھے بلکہ کاربند بھی تھے۔ موت سے اٹھارہ گھنٹے پہلے اپنے مکان پر اُردو مجلس کے جلسے میں
جو اپنا تازہ کلام سنایا اس میں وہی لطافت اور چاشنی تھی جو ان کی نظم میں ہمیشہ ہوا کرتی تھی آواز بھی وہی زوردار اور گلا بھی ویسا ہی دلکش۔

فرحت چالیس برس کے سن میں ہی ایک مشاق نثر نویس ہو گئے تھے۔ مہاراجہ کشن پرشاد نہایتی کو ان کے مضامین بے حد پسند تھے۔ اکثر اپنی ڈیوڑھی
پر بلواتے تھے اور مضامین کو سن کر دل کھول کر داد دیتے تھے۔ مہاراجہ کو یہ خبر نہ تھی کہ فرحت شاعر بھی ہیں۔ ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ ڈیوڑھی میں مشاعرہ
ہوا۔ فرحت نے بھی غزل پڑھی، مہاراجہ سن کر پھڑک اُٹھے اور فرمایا "اوہو آپ شاعر بھی ہیں۔ پھر کیا تھا، فرمائشوں کا تار بندھ گیا، فرحت اس زمانہ
میں گلبرگہ میں سیشن جج تھے۔ حکم تھا جب بلدہ آؤ تازہ کلام لے کر آؤ اور مجھے سناؤ۔ مہاراجہ کی صحبت میں ہر قسم کے آدمی ہوتے تھے۔ ایک شاعر "بیگم" تخلص
فرماتے تھے اور ریختی لکھتے تھے۔ ان کا کلام ذرا پھس پھسا ہوتا تھا۔ فرحت سے نہ رہا گیا جان صاحب کا دیوان انھوں نے بچپن میں پڑھا تھا۔ لیکن
فرحت کی مہذب طبیعت نے فحش کو گوارا نہ کیا۔ البتہ اپنی غزلیات میں عورتوں کے جذبات اور محاورہ کو خوب ادا کیا ہے۔ میں اس مضمون میں آگے
چل کر اُن کی ریختی غزلیات کے نمونے پیش کروں گا۔ مہاراجہ کی قدردانی اور ذوق کے فرحت بہت مدّاح تھے اور کہا کرتے تھے میں محض نثر نویس تھا
مہاراجہ کی قدردانی نے شاعر بنا دیا۔

فرحت نے جو اپنے کلام کا انتخاب "میری شاعری" کے عنوان سے شائع کیا تھا اس میں انکسار کے طور پر اپنے آپ کو تیسرے درجہ کے شاعروں میں
شمار کیا ہے لیکن اگر ان کی شاعرانہ صنعت گری، زبان کی شادابی اور موزونی، بیان کی صفائی اور بحور و قوافی کے ترنم کو دیکھا جائے تو ان کا رتبہ
دوسرے درجہ کے شاعروں میں بھی ممتاز نظر آتا ہے۔ میں اس رائے کی تائید میں فرحت کے کلام کے چند نمونے پیش کروں گا آپ خود اندازہ فرما سکتے
ہیں، لیکن ترنم کے لطف کے لئے اب اُن کا سا گلا کہاں؟

فرحت کی طبیعت ہمہ گیر تھی۔ انھوں نے عشقیہ غزلیات میر اور مومن کے رنگ میں لکھی ہیں صوفیانہ غالب کے طرز میں۔ مزاحیہ اکبر الہ آبادی اور
رنگینی کے تتبع میں۔ قومی نظموں میں حالی اور اقبال کا ڈھنگ موجود ہے۔ ہجو کے میدان میں سودا کی پیروی کی ہے اور فطرت انسانی مناظر قدرت
اور سماجی خصوصیتوں کے مرقعے نظیر اکبر آبادی کی فن کاری کے اسلوب پر تیار کئے ہیں۔ نظیر کے وہ بڑے مدّاح تھے اور ان کو بے حد خوشی ہوئی تھی جب
نظیر کے دیوان کا ایک نسخہ پروفیسر آغا حیدر حسن کے کتب خانہ میں ان کو مل گیا تھا۔ دیوان کو انھوں نے ایک عالمانہ مقدمے کے ساتھ انجمن ترقی اردو کی اشاعت
کے سلسلے میں چھپوا دیا ہے اور وہ اُن کی نقیدی نظر اور وسیع مطالعہ کی ہمیشہ یادگار رہے گا۔ فرحت کے کلام میں جو نظمیں نظیر کے ڈھنگ پر

لکھی گئی ہیں اُن میں فرحت کا مخمس "جمنا کا کنارا" نہایت مقبول ہوا۔ دریائے جمنا کو ہندو مذہب کی روایات میں خاص تقدس حاصل ہے۔ پھر دہلی شہر بھی اسی کے کنارے پر بسا ہوا ہے۔ موسمی میلے بھی وہاں ہوتے ہیں اور مختلف اوقات میں مناظر قدرت بھی خاص دلکشی رکھتے ہیں۔ فرحت نے ان سب کی تصویریں کھینچی ہیں اور چونکہ وہ دہلی کے رہنے والے تھے اور وطن سے گہری محبت تھی اس لئے اُن کی صنعت گری میں درد اور ردعانیت بھی موجود ہے۔ اب آپ اس نظم کے چند بند سنئے اور داد دیجئے۔ نظم کا عنوان ہے "یادِ وطن"۔

یادِ وطن

اے اہلِ وطن پُوچھو نہ یہ مجھ سے خدارا — دلّی کا بھی ہے یاد تجھے کوئی نظارا
ہے یادِ وطن ہی مرے جینے کا سہارا — اس شہر کا ہر گوشہ ہے یُوں تو مجھے پیارا
آنکھوں میں سدا پھرتا ہے جمنا کا کنارا

چاندنی رات

وہ چاندنی رات اور وہ فضا نور سراپا — رہ رہ کے وہ پھر بادِ سُبک سیر کا جھونکا
پانی کا وہ اندازِ روانی کہ کہوں کیا — اس منظرِ خاموش میں گھاٹوں کا وہ نقشہ
آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

اس عکسِ رُخِ ماہ میں پانی کا وہ دھارا — پگھلی ہوئی چاندی تھی کہ بہتا ہُوا پارا
اور سطح کو کچھ موجِ ہوا نے جو اُبھارا — پھر لہروں کا اُٹھ اُٹھ کے بُلانے کا اشارا
آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

اور سامنے ہی قلعہ کا وہ منظرِ مایُوس — وہ شمعِ زباندانی کا ٹوٹا ہُوا فانوس
اک حُسن کہ ہے چادرِ ویرانی میں ملبوس — تھا ہند کا پہلے جو کبھی مرکزِ ناموس
آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

صبح

مشرق میں اُفق کے وہ چمکدار کنارے — اور ان میں وہ کرنوں کے پُر از نور شرارے
مغرب میں اُترتے ہوئے وہ ماند ستارے — دریا کی وہ بیداری وہ موجوں کے طرارے
آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

ہر گھاٹ پہ دہلی کے حسینوں کا وہ جھرمٹ — وہ ساڑیاں ہر رنگ کی دو ہاتھ کے گھونگھٹ
وہ حُسنِ خداداد نہیں جس میں بناوٹ — قدرت کے تماشائی کا دل جس سے ہو تلپٹ
آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

پھر گھاٹ کے نزدیک وہ ڈبکی کا لگانا — گھبرا کے مگر پانی سے جلدی نکل آنا
بھیگی ہوئی ساڑی میں بدن کا وہ چرانا — جھک جھک کے وہ جل ہاتھوں سے سورج کو چڑھانا
آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

سادھو کا کہیں بیٹھنا مارے ہوئے آسن — کھینچے ہوئے دُنیا کی تمناؤں سے دامن

خاموش مگر ہاتھ میں پھرتی ہوئی سمرن ‏ اور ٹوٹنا لوگوں کا وہاں کرنے کو درشن

آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

بڈھوں کا وہ پایان کنارے پہ اُترنا ‏ اور جوشِ عقیدت سے وہ جل گھنٹی میں بھرنا

بند آنکھیں کئے دل میں دعائیں یہی کرنا ‏ ہے رام ہمارا تو یہیں جینا ہو مرنا۔

آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

اک سمت وہ جلتی ہوئی دو چار چتائیں ‏ شعلوں کی لپک اور دھوئیں کی وہ گھٹائیں

وہ شیون و فریاد کی دل دوز صدائیں ‏ سُن کر جنھیں دشمن کے بھی آنسو نکل آئیں

آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

برسات

برسات کے عالم کا نہ کچھ پوچھ فسانا ‏ دریا پہ اُمنڈ آتا تھا سارا ہی زمانا

لہروں کی زبانوں پہ وہ ساون کا ترانا ‏ عگت میں وہ گرداب لئے چنگ وچغانا

آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

بجتا تھا کہیں ڈھول کہیں دف کہیں مرچنگ ‏ چلتا تھا کہیں یاروں میں دورِ مئے گلرنگ

گانجا کہیں اُڑتا تھا تو چھنتی تھی کہیں بھنگ ‏ تھا سب کا غرض شوق جدا اور جدا رنگ

آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

وہ بیلے کے ہر کونہ سے موروں کی جھنکاریں ‏ اور آموں پہ کوئل کی وہ کوکو کی پکاریں

وہ ابر کے رنگوں کے بدلنے کی بہاریں ‏ ان اُودی گھٹاؤں میں وہ بگلوں کی قطاریں

آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

وہ قسمتِ بیدار کے دن اور وہ راتیں ‏ وہ کشمکشِ دہر کے جھگڑوں سے نجاتیں

اور لطفِ جوانی کا اُٹھانے کی وہ گھاتیں ‏ فرحت کو نہ بھولی ہیں نہ بھولیں گی وہ باتیں

یاد آئے گا ہر وقت وہ جمنا کا کنارا

تیسرے بند میں "پگھلی ہوئی چاندی" اور "بہتا ہوا پارا" اگرچہ انگریزی تشبیہات کے ترجمے ہیں لیکن اُردو میں نئی لطافت پیدا کر دی ہے۔ ان لہروں کے اُبھار میں اُٹھ اٹھ کے بُلانے کا اشارا فرحت کی جدّت ہے اور نہایت نفیس استعارہ ہے۔ چوتھے بند کی تشبیہات بھی نہایت نادر ہیں خصوصاً مصرع "اک حسن کہ ہے چادر ویرانی میں ملبوس" کتنا پاکیزہ اور کیسا موثر۔ انسانی فطرت اور عورتوں کی شرم وحیا کی تصویر چھٹے اور ساتویں بند کے ان مصرعوں میں خوب کھینچی گئی ہے۔

وہ ساڑیاں ہر رنگ کی دو ہاتھ کے گھونگھٹ

قدرت کے تماشائی کا دل جس سے ہو تلپٹ

گھبرا کے مگر پانی سے جلدی نکل آنا

بھیگی ہوئی ساڑی میں بدن کا وہ چرانا

فرحت نقاش تھے۔ لیکن رنگوں اور خطوط کی نقاشی میں ان کی تصاویر ایسی مؤثر اور دلپذیر نہیں ہوئیں جیسی الفاظ کی نقاشی ہیں۔ دسویں بند میں بھی جہاں جلتی ہوئی چتاؤں کا ذکر ہے ہندی عورت کی والہانہ محبت اور وفاداری کا عجب دلسوز مرقع پیش کیا ہے۔ بارہویں بند میں الفاظ کے زور اور جذبات کے ہجوم سے نظیر اور قاآنی دونوں کا لطف آجاتا ہے۔ لکھتے ہیں ؎

بجتا تھا کہیں ڈھول کہیں دف کہیں مرچنگ　　چلتا تھا کہیں یاروں میں دورِ مئے گلرنگ
گا نجا کہیں اُڑتا تھا تو چھنتی تھی کہیں بھنگ　　تھا سب کا غرض شوق جُدا اور جدا رنگ

فرحت کو قاآنی کا کلام بھی بہت پسند تھا اور اکثر یہ تب دوستوں کو سنایا کرتے تھے۔

من از شراب می خورم بہ بانگِ کوس می خورم　　بہ بارگاہِ تہمتن بہ بزمِ طوس می خورم
پیالہ ہائے دہ منِ علی الرؤس می خورم　　شراب گیری چشم مئے مجوس می خورم
نہ جو گیم کہ خوکنم بہ برگِ کو کنار ہا

تیرھویں بند کے اس مصرع میں "ان اودی گھٹاؤں میں وہ بگلوں کی قطاریں" فرحت کی دل آویز رنگ آمیزی ضرور ہے لیکن یہ تشبیہ عبدالرحیم خاں احسان کے اس مصرع میں "ابر میں بگلوں کی جس طرح قطار آئے نظر" پہلے سے موجود ہے اور نظیر اکبرآبادی نے بھی اس تشبیہ کو معشوق کے مسی ملے ہوئے ہونٹوں کی تعریف میں پیش کیا ہے ؎

اس سیہ ابر میں یوں اُڑتے ہیں بگلے جیسے　　لبِ مالیدہ مسی میں دُرِ دنداں کی صفا

فرحت نے اودی گھٹاؤں کے تلازمہ سے اس تشبیہ کو بڑی رنگینی دے دی۔

اب میں فرحت کی غزلیات پر تبصرہ کروں گا۔ ان کی طبیعت میں درد تھا اور انسانی فطرت اور جذبات کو بھی خوب سمجھتے تھے۔ اسی لئے اُن کے کلام میں غزلیات کی تعداد زیادہ ہے۔ قدما کے رنگ میں بھی لکھی ہیں اور دورِ حاضر کے رنگ میں بھی۔ میرؔ کے طرز پر جو چھوٹی بحروں میں لکھی ہیں وہ بہت مقبول ہوئیں۔ ایک غزل کے چند اشعار جو میرؔ کے رنگ کے ہیں سناتا ہوں ؎

اپنے بیمارِ غم کو دیکھ تو آ　　کہتے ہیں ہوشیار ہے اب تک

حرماں نصیب عاشق کی آخری دم کی تمنا کو خوب بیان کیا ہے ؎

ہے خزاں اور دل کے زخموں سے　　میرے گھر میں بہار ہے اب تک
موت آچک کہ غیر کے غم میں　　دیکھو وہ سوگوار ہے اب تک
اُس کے وعدے کو ہوگئے برسوں　　اور مجھے انتظار ہے اب تک

عشق کی لگن اور چینک کو آخری شعر میں کیسے موثر طریقے سے ادا کیا ہے۔ آخر میں اسی غزل میں کہتے ہیں ؎

کیا زمانہ بھی تھا جوانی کا　　جس کا فرحتؔ خمار ہے اب تک

ایک اور غزل کے بھی چند شعر سن لیجئے۔ جن میں فرحت کی اعلیٰ ذہنی صفات نمایاں ہیں ؎

زاہد تو میکدے میں آجا مگر بتا دے　　کیا تجھ سے نبھ سکیں گے آئینِ مے پرستی
اس عشق نے بھلا دی سب بزم آفرینی　　خاموش ہوگیا ہے گویا کہ سازِ ہستی
شہرت طلب ہے شاید آہ و فغاں سے اپنے　　یہ عاشقی نہیں ہے اے محوِ خود پرستی
کیا کیا نہ میرے دل میں ارماں بھرے ہوئے تھے　　اور اب تو غم کے ہاتھوں ویران ہے یہ بستی

کم فرصتی سبب ہے دُنیا میں کوششوں کا ہے خوفِ مرگ ہی سے یہ سب بہارِ ہستی

فرحت تمھاری حالت کیوں کر نہ بگڑے اتنی بلند نظری اور ایسی تنگ دستی

اس غزل کے پہلے شعر میں حافظ کے رنگ کی جھلک نظر آتی ہے جنھوں نے زاہد ظاہر پرست کی خوب خبر لی ہے۔ دوسرے اور چوتھے شعر میں خارجی محاسن یعنی لفظی خوبیاں ہیں۔ مثلاً دوسرے شعر کے آخری مصرع میں "خاموش" اور "گویا" کا تضاد، اور اسی طرح چوتھے شعر کے دوسرے مصرع میں "ویران" اور "بستی" کا تضاد۔ پانچویں شعر میں مغربی فلسفہ کا اثر اور زندگی کی تگ و دو نمایاں ہیں۔ آخری شعر میں دورِ جدید کی شاعری کا رنگ ہے خطاب اپنے سے ہے لیکن متوسط طبقے کی تباہی بیان کی گئی ہے کہ آمدنی کم اور معیار زندگی یورپ والوں کا۔

تصوف نے عشقِ حقیقی کے رنگ میں مشرقی شاعری میں ایک خاص جاذبیت پیدا کر دی ہے۔ اب میں فرحت کی غزلیات کے ایسے اشعار سناؤں گا جن میں صوفیانہ عقاید موجود ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

اُبلنے لگی جام میں خود شراب جہاں ذکرِ دُردی کشاں آگیا

اس شعر میں عاشقانِ خدا کی محویت کے اثر سے جو شان غیر ذی حیات کائنات میں بھی نمودار ہو جاتی ہے اس کی طرف اشارہ ہے۔

یہ کعبہ ہے فرحت نہیں بُتکدہ بھٹک کر کہاں سے کہاں آگیا

کس طرح منزلِ دُنیوی سے منزلِ حقیقی تک انسان پہنچ سکتا ہے۔ اس کو نہایت لطیف پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے "بھٹک کر" یہ دو لفظ شعر کی جان ہیں۔ ایک اور غزل میں شاعر کی وسیع مشربی اور ذہنی پس منظر کو دیکھئے۔

کیوں ٹھہر گیا آخر وسطِ رہِ الفت میں مسجد ہی سے نکلی ہے زاہد رہِ بُتخانہ

فرحت کی طبیعت بھی اک رازِ سربستہ میکش تو نہیں لیکن کچھ رنگ ہے رندانہ

اپنے رُوحانی جوش کا کس خوبصورت انداز میں اظہار کیا ہے۔ حالی کی مشہور غزل کے تتبع میں یہ شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

گرے اپنی نظروں سے ہم خوار ہو کر ابھی دیکھیں قسمت میں کیا خواریاں ہیں

زمانہ ہے عیش و مصیبت کا چکر مگر آگے پیچھے کی یہ باریاں ہیں

قویٰ مضمحل ہو گئے سارے فرحت یہ چلنے چلانے کی تیاریاں ہیں

آخری شعر میں غالب کے مشہور شعر کا مفہوم آگیا ہے ؎

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب اب عناصر میں اعتدال کہاں

عشقیہ رمز و کنایہ کو اس شعر میں نہایت خوبصورتی سے ادا کیا ہے ؎

نگاہیں اُن کی تصدیقِ محبت کر کے کہتی ہیں مگر دیکھو کسی سے تم نہ یہ رازِ نہاں کہنا

ایک غزل غالب کے طرز میں بھی سُن لیجئے۔ غالب کی بلند خیالی کو پہنچنا ہر شاعر کی قدرت میں نہیں، البتہ اس غزل کے ترنمی اثر کا کیا کہنا ؎

دل مرا روزِ ازل سے بیقرارِ نغمہ ہے ہر نفس اس کے لئے آوازِ تارِ نغمہ ہے

ہر مصیبت کیا گزشتہ راحتوں کی یاد ہے نوحہ بھی دیکھو تو گویا یادگارِ نغمہ ہے

ساز کی حاجت نہیں ہے نغمۂ جانسوز کو گوشِ اہلِ ذوق کو ہر ساز عارِ نغمہ ہے

گوش بر آوازِ بلبل ہیں تو سب گلہائے باغ شاید ان کو اس فضا میں اعتبارِ نغمہ ہے

جل بجھے پہلو میں دل وہ چیز ہے سازِ دسرد درد کا اس میں جو پردہ ہے شرارِ نغمہ ہے

یہ نہیں آوازِ مطرب ہے رواں اک جوئبار — تان جو اس میں ہے گویا آبشارِ نغمہ ہے

ابر ہے ساقی ہے مے ہے اور زمانہ سازگار — چھیڑ مطرب وقت کی ہاں اب بہارِ نغمہ ہے

انقلابِ دہر میں جب رنج و غم کا بھی ہے دور — کیوں دلِ راحت طلب کو انتظارِ نغمہ ہے

میں کہاں فرحتؔ کہاں اس طرزِ غالب میں غزل — یہ مگر روزِ ازل کا ہی خمارِ نغمہ ہے

فلسفیانہ خیالات اور حُسنِ بیان کے لحاظ سے فرحتؔ کی یہ غزل بہت مقبول ہوئی آپ بھی ملاحظہ فرمائیں ؎

ہُوں مشتِ خاک لیکن ہستی کی داستاں ہوں — دیکھو تو کچھ نہیں ہوں سمجھو تو اک جہاں ہُوں

صد حیف عمر ساری کس بے خودی میں گزری — یہ بھی کھلا نہ مجھ پر میں کون ہوں کہاں ہوں

کس طرح قافلہ کے ہمراہ چل سکوں میں — جو اُٹھ کے بیٹھ جائے وہ گردِ کارواں ہو

جس کی تلاش میں ہیں سارے جہاں کے رہرو — اس بے نشاں کا میں بھی دھندلا سا اک نشاں ہوں

آزادیٔ حقیقی ملتی ہے کس کو بُلبُل — تو ہے قفس میں اور میں پابندِ آشیاں ہوں

اس غزل میں یہ مصرع لاجواب ہے ع "اُس بے نشاں کا میں بھی دھندلا سا اک نشاں ہوں"۔ تصوّف کے رنگ میں فرحتؔ نے بہت سی غزلیں لکھی ہیں جن میں بعض کو اہلِ ذوق نے بے حد سراہا ہے۔ مثلاً یہ غزل ؎

کس شان کے ساقی نے میخانے بنا ڈالے — جو ٹوٹے ہوئے دل تھے پیمانے بنا ڈالے

دل کس کا تھا اور ہم نے کس کس کو جگہ دی ہے — اس کعبے میں لاکھوں ہی بت خانے بنا ڈالے

یہ رازِ حقیقت کیا اوروں سے نہ چھپ سکتا — تو نے جو یہ ہم جیسے دیوانے بنا ڈالے

مذہب کے یہ سب جھگڑے بس اس لئے برپا ہیں — سمجھے نہ حقیقت کو افسانے بنا ڈالے

اے پیرِ مغاں ہم ہیں قائل تری جدت کے — مسجد کے نمونوں پر میخانے بنا ڈالے

میں کچھ نہ سہی فرحتؔ اس قوم کا ہوں لیکن — فغفوروں کے سر جس نے پیمانے بنا ڈالے

اس غزل کے تیسرے اور چوتھے شعر میں حافظ کی مشہور غزل کے ان مصرعوں کے مضمون کو دہرایا گیا ہے ؎

"قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند" اور "چوں ندیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند"

البتہ ان دو شعروں میں فرحتؔ کی طباعی قابلِ داد ہے ؎

دل کس کا تھا اور ہم نے کس کس کو جگہ دی ہے — اس کعبے میں لاکھوں ہی بتخانے بنا ڈالے

اے پیرِ مغاں ہم ہیں قائل تری جدّت کے — مسجد کے نمونوں پر میخانے بنا ڈالے

فرحتؔ نے عشقِ مجازی کے رنگ میں انسانی فطرت اور فلسفیانہ عقاید کو نہایت مؤثر طریق پر سمویا ہے۔ اس غزل میں ان کے انداز کو ملاحظہ فرمائیے ؎

کیا نزاکت کیا ادا کیا ناز کیا انداز ہے — تیری صورت پر یدِ قدرت کو کیا کیا ناز ہے

ہر نگاہِ ناز گویا تیرِ بے آواز ہے — اس کی ناوک افگنی میں یہ غضب کا راز ہے

حسن طالب عشق کا اور عشق طالب حُسن کا — تم کو مجھ پر ناز ہے اور مجھ کو تم پر ناز ہے

بے نیازی اور تیرا ناز کچھ ہیں ایک سے — فرق اتنا ہے کہ اس میں سوز اس میں ساز ہے

ہر قدم پر ہوتی ہے سیلِ حوادث پائے بوس — یہ ہماری زندگی ہے جس پہ یہ کچھ ناز ہے

ہاں نہ پوچھ ان میکشوں کے دل کی کیفیت نہ پوچھ — یہ وہ گنجینہ ہے جس میں دو جہاں کا راز ہے

اے حریفِ زندگی کیوں موت سے ڈرتا ہے تُو — زندگیٔ دائمی کا موت ہی آغاز ہے

مجھ کو فرحتؔ شاعری میں دخل تو ہرگز نہیں — ہاں مری غزلوں کا بیشک اک نیا انداز ہے

"مقطع میں انداز کے انوکھے پن کو کہہ تو گئے لیکن طبیعت چونکہ حق پسند اور جوہر شناس تھی اس لئے "میری شاعری" میں خود لکھتے ہیں "مقطع میں کے علاوہ صریح جھوٹ ہے۔" آگے چل کر لکھتے ہیں۔ "ارادہ ہوا تھا کہ "غزلوں" کی جگہ "شعروں" لکھ دوں، لیکن پھر خیال آیا اس طرح رعب کم ہو جائے گا اس لئے جھوٹ کو بحال خود رکھنا ہی مناسب سمجھا گیا۔"

فرحت کی شاعری پر جب بحیثیت مجموعی نظر ڈالی جاتی ہے تو ظرافت اور شوخی کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فرحت کو خواہ بہ حیثیت مضمون نویس دیکھیں خواہ بہ حیثیت افسانہ نگار، خواہ بہ حیثیت شاعر شوخی اور بذلہ سنجی ان کی طبیعت کا خاص امتیاز ہیں۔ ان کی ظرافت ایک موج زن دریا تھی جس کی طغیانی بعض اوقات ان کے قابو سے بھی باہر ہو جاتی تھی۔ ان کی مزاحیہ نظموں کی ایک بڑی تعداد عوام میں مقبول ہو چکی ہے بچے اور بوڑھے، مرد اور عورت سب ان کو شوق سے پڑھتے اور سنتے ہیں۔ مدرسہ کے لڑکے اپنے جلسوں میں ان کو دہراتے ہیں۔ نفیس طبع لوگ اپنے کتب خانوں اور ملاقاتی کمروں میں ان کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ان نظموں میں ان کے "شکوہ" اور "جواب شکوہ" کو بہت شہرت حاصل ہو چکی ہے۔ یہ میاں بیوی کی آپس کی لڑائی کی روداد ہے۔ لڑائی کی ابتدا روپے پیسے کی تنگی سے ہوتی ہے لیکن بدمزگی آخر میں بہت بڑھ جاتی ہے اور دونوں ایک دوسرے سے علیحدگی پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ آخر میں دوستوں اور عزیزوں کی نصیحت کام آتی ہے جو مذہبی اور سماجی ذمہ داریوں کو دونوں کو سمجھاتے ہیں۔ یہ نظمیں چونکہ بہت لمبی ہیں اس لئے آج کی مجلس میں ان کا پڑھنا ممکن نہیں، لیکن "میری شاعری" میں یہ دونوں نظمیں شائع ہو چکی ہیں اور میں ظرافت پسند بہنوں اور دوستوں سے کہوں گا کہ وہ ان نظموں کو ضرور پڑھیں۔ اس وقت میں آپ کو ایک اور نظم سناؤں گا جس سے آپ کو ان کے مذاق کی پاکیزگی اور بے ساختہ پن کا اندازہ ہو سکے گا۔

کیا اسی واسطے پیدا ہوئے سنسار میں ہم — کہ دھرے جائیں سدا عشق کی بیگار میں ہم

اس بُری طرح پھنسے مجمعِ اغیار میں ہم — گھٹ کے دم مر ہی گئے کوچۂ دلدار میں ہم

شکل تو ایسی ہے واللہ کوئی مُنہ نہ لگائے — کچھ عجب ٹھاٹھ سے ہاں چھپتے ہیں اخبار میں ہم

ہم نے مانا کہ سنہ اُنیس کی ہی فورڈ سہی — کہیں جاتے ہیں تو جاتے ہیں مگر کار میں ہم

چھیڑ خانی سے حسینوں کی نہ باز آئیں گے — کیا ہُوا اگر کبھی پٹ بھی گئے بازار میں ہم

مان لیتے ہیں کہ ہم شکل میں گلفام نہیں — کچھ بُرے بھی نہیں یوں دیکھ تو دو چار میں ہم

لوگ سمجھیں کہ بھئی یہ تو بڑے عالم ہیں — بیٹھے رہتے ہیں کتابوں کے انبار میں ہم

شوق میں ڈانٹ تو لیتے ہیں پٹھانوں کا لباس — ہاں نظر آتے ہیں کچھ ریچھ سے شلوار میں ہم

کیا غضب ہے کہ عدو رولز روائس میں پھریں — اور گھسٹتے پھریں ٹوٹی ہوئی اک کار میں ہم

اس نظم میں دو تین مصرعے نہایت عمدہ ہیں ایک تو یہ "کچھ عجب ٹھاٹھ سے ہاں چھپتے ہیں اخبار میں ہم"۔ اوّل تو انسانی طلب شہرت کے جذبہ کا خاکہ اُڑایا ہے دوسرے اس دھوکے کو رفع کیا ہے کہ کس طرح فوٹو کے نیگیٹو کی تراش خراش سے بدصورت خوبصورت بن جاتے ہیں۔ "کچھ عجب ٹھاٹھ" کے الفاظ نے مصرعے کی زبان میں بڑی لطافت پیدا کر دی ہے۔

دوسرا مصرعہ جو شوخی اور ظرافت کی جان ہے یہ ہے۔ "کیا ہوا اگر کبھی پٹ بھی گئے بازار میں ہم"۔ ایک مصرع میں "انبار" کا لفظ بھی بہت پُر لطف ہے۔

پہلے تذکرہ نویس جب کسی شاعر کی ہمہ گیر طبیعت کی تعریف کرتے تھے تو اکثر یہ جملہ لکھا کرتے تھے "بر ہمہ اصناف سخن قادر بود" یہ رائے فرحت کی شاعری کے تنوع پر پورے طور سے صادق آتی ہے۔ انھوں نے غزلیں لکھیں، مزاحیہ اور قومی نظمیں لکھیں، قصاید لکھے، مرثیے لکھے، رباعیاں بنائیں، مناجاتیں لکھیں، ہجو لکھی اور تاریخ گوئی کو بھی نہ چھوڑا۔ میں جب یورپ کے پہلے سفر سے ۱۹۲۴ء میں واپس آیا تو فرحت نے بڑے زور کا ترانہ دیا اور ایک تاریخ بھی نظم کی۔ چونکہ وہ خود میرے بارے میں ہے اس لئے میں اُس کی تعریف نہیں کر سکتا، البتہ میری شاعری میں آپ اس کو ملاحظہ فرما سکتے ہیں اور داد دے سکتے ہیں۔ ہجو کی طرف فرحت کی طبیعت قدرتاً مائل تھی لیکن ان کا مذاق پاکیزہ تھا اور کلام میں کسی قسم کا ابتذال نہیں۔ ایک بناوٹی مولوی کی ہجو لکھی ہے، وہ آپ بھی سن لیجئے۔ آمد، تازگی اور شاعرانہ ترصیع کاری ملاحظہ ہو ؎

ہجو

ایک صاحب ہیں مولوی صورت ان کو مذہب سے ہے مگر نفرت
سب انھیں مولوی تو کہتے ہیں پر وہ مذہب سے دور رہتے ہیں
ان کو مذہب سے کیا تعلق ہے اُن کا مذہب فقط تملق ہے
کب ہے ایسی کسی بشر کی شان کہیں سر کہیں منہ کہیں ہے کان کہیں
ان کی صورت بھی کیا تماشا ہے گویا پچکا ہوا بتاشا ہے
ہائے چہرہ پہ کیا رونق ہے آدمی کیا ہے بس خونق ہے
کالی رنگت بہار دیتی ہے بھینس سے بھی خراج لیتی ہے
آنکھیں چھوٹی ہیں ناک ہے موٹی گال جیسے جلی ہوئی روٹی
چھاج سی داڑھی ایسی ان کی ہے جیسے روئی کسی نے دھنکی ہے
یا کہیں آپ اس کو بے وسواس کالی مسجد پہ خشک ہو گئی گھاس
مونچھیں ٹھوڑی تک ان کی آتی ہیں اور اُڑ اُڑ کے منہ میں جاتی ہیں
جوش میں جب کبھی یہ آتے ہیں اپنی مونچھوں کو کھائے جاتے ہیں
مونچھ منہ میں اگر نہیں جاتی پھر تو داڑھی کی آتی ہے باری
ناک یہ مڑ کے منہ میں آئی ہے پھکنی چولھے پہ یا جھکائی ہے
تر نوالہ کہیں جو یہ پائیں کتے کی طرح لوٹ ہی جائیں
میوے آجائیں گر نظر ان کو پھر نہیں رہتی کچھ خبر ان کو
اس طرح دونوں گلے بھرتے ہیں جس پہ لنگور رشک کرتے ہیں
اب ذرا ان کے دیکھئے اطوار ایسے اطوار پر خدا کی مار
شہر سے دور دور رہتے ہیں ان کو گیدڑ جبھی تو کہتے ہیں
دور جنگل میں اک ٹھکانا ہے گویا الو کا آشیانا ہے
ساری دنیا پہ تنگ دستی ہے دولت ان کے ہی گھر برستی ہے
خوش مذاقی سے ان کو کام بھلا اور ظرافت کو جانے ان کی بلا

گالیوں پر اُتر ہی آتے ہیں　　بے نقط ان کو پھر سناتے ہیں
اب کوئی لاکھ ان کو سمجھائے　　نہیں ممکن سمجھ میں کچھ آئے
کب کسی کی یہ بات مانتے ہیں　　سب ہی بیہودہ ان کو جانتے ہیں
کون پرواہ ان کی کرتا ہے　　گالیوں سے ضرور ڈرتا ہے

میں نے اس مضمون کے شروع میں فرحت کے ریختی لکھنے کا بھی ذکر کیا تھا۔ اس کا بھی نمونہ ملاحظہ فرمایئے۔ زبان کے لوچ نسوانی خیالات در چہ چلے کو دیکھئے اور دل کھول کر ہنسئے۔ بی ہمسائی سے میاں کی شکایت ہو رہی ہے ۔

لڑاکا میں سہی اچھا پھوہڑ بھی میں سہی، مانا　　مگر یہ بھی تو دیکھو حال کیا ہے خود بدولت کا
تھکی کہہ کہہ کے میں ان سے کہ چھوڑو اپنی یہ باتیں　　نہیں جاتا مُوا جب پڑ گیا جسکا بُری لت کا

ایک موقع پر جب بال بچہ ہونے کے جلد آثار ہیں تو بی ہمسائی سے یوں مخاطب ہیں۔

دین ہے اُس کی آج دے کل دے　　میں نے دائی مگر بُلا لی ہے

اس شعر میں عورتوں کے روزمرہ کو نہایت صفائی سے ادا کیا ہے۔ فرحت کا مذاق ریختی میں بھی نہیں جانا جاتا ہے ۔

میری ہمسائی یوں تو کالی ہے　　پر مُوا کیا سلیقہ والی ہے

بازار میں پھرنے والی عورتوں کی گفتگو کا اس طرح حق ادا کیا ہے ۔

رستہ میں دو دہاڑے فرحت نے مجھ کو چھیڑا　　یہ سنتے ہی مرا غصہ ہوا کیا پر اُٹھا لی بستی

فرحت کا مشاہدہ نہایت وسیع تھا اور جب فرقہ وار فسادات کا حال سنتے تھے تو انھیں بے حد صدمہ ہوتا تھا۔ دلی سے انھیں بے حد محبت تھی اور اگر زندہ رہتے تو وہاں کی بربادی کی دلخراش داستان سے خبر نہیں کتنا رنج ہوتا۔ اب میں چند اشعار ایک نظم کے سناتا ہوں جو انھوں نے فسادات اور قتل و خون سے متاثر ہو کر لکھی تھی۔ رنگ مزاحیہ ہے اور ہر شعر میں درد اور طنز کو نہایت کمال سے سمویا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔

جہاں میں ہوں

نہ پوچھ اس شہر کی حالت نوا ہے ہمدم جہاں میں ہوں　　کہ ہر گھر پہ پڑے ہیں جنگ کے پریم جہاں میں ہوں
سدا چلتی ہیں چھریاں اور سدا چاقو نکلتے ہیں　　ہمیشہ رہتا ہے بس ہو کا اک عالم جہاں میں ہوں
پہننے کے لئے ڈھونڈے کبھی ملتی نہیں کھادی　　جلا ڈالا ہے لاکھوں گز مگر ریشم جہاں میں ہوں
کبھی ہے جیپ کی پوں پوں کبھی ہے توپ کی گھڑ گھڑ　　کبھی ہے فوجیوں کے پاؤں کی دھم دھم جہاں میں ہوں
اذاں کیسی کدھر کے سنکھ کیسے چرچ کے گھنٹے　　برتن کی ہاں مگر آواز ہے ہر دم جہاں میں ہوں
ہے نافذ کرفیو آرڈر کھڑی ہے فوج سڑکوں پر　　مگر پھر بھی مچا رہتا ہے اک اودھم جہاں میں ہوں
یہاں پتھر چلے، لاٹھی چلی، گولی چلی پہلے　　مگر اب پھینکتے ہیں آنسوؤں کے بم جہاں میں ہوں
کہیں سڑکوں پہ زخمی ہیں کہیں گلیوں میں لاشیں ہیں　　سمندر پہ کسی کا ٹوٹتا ہے دم جہاں میں ہوں
ہے بجلی بند ٹیلیفون سب بیکار ہیں بالکل　　کہ ٹوٹے ہیں یہاں سے وائر تلک سب کھمبے جہاں میں ہوں
یہاں چھوٹے بڑے جتنے ہیں سب چکر میں آئے ہیں　　اٹھائے پھر کسی کا کون آخر غم جہاں میں ہوں
نہ گھر میں اب جواں ہی ہے نہ بڈھا ہے نہ بچہ ہے　　کسی کا کوئی آخر کیوں کرے ماتم جہاں میں ہوں

یہاں کی دیکھ کر حالت فلک کا دل بھر آیا ہے نہیں ساون برستا رقتا ہے موسم جہاں میں ہوں
کچھ ایسے زندگی سے آ گئے ہیں تنگ مرد و زن کہ اب کرنے لگے ہیں موت کو ویلکم جہاں میں ہوں
جدھر دیکھو اُدھر گڑبڑ جہاں جاؤ وہاں شورش غرض میں کیا کہوں بس ناک میں ہے دم جہاں میں ہوں
یہاں مرنا بہت آسان ہے اور جینا مشکل ہے غنیمت ہے کہ میں جیتا ہوں "تا اینذم" جہاں میں ہوں
مصیبت کون سی ہے جو یہاں نازل نہیں ہوتی ہے قصہ مختصر ہر وقت "می نالم" جہاں میں ہوں
نہ کپڑا تن کے ڈھکنے کو نہ روٹی پیٹ بھرنے کو مگر پھر جی رہا ہوں "در چنیں عالم" جہاں میں ہوں

یہاں کے شور و شر سے اب تو یہ وحشت ہوئی فرحت
کہ اپنے آپ کو بھی "من نمی دانم" جہاں میں ہوں

دلّی میں بارش نے مہاجرین پر جو پرانے قلعے کے کھلے میدان میں پڑے ہوئے تھے جو مصیبت ڈھائی تھی اُس کے لئے یہ دو شعر حسب حال ہیں ؎

یہاں کی دیکھ کر حالت فلک کا دل بھر آیا ہے نہیں ساون برستا روتا ہے موسم جہاں میں ہوں۔
کچھ ایسے زندگی سے آ گئے ہیں تنگ مرد و زن کہ اب کرنے لگے ہیں موت کو ویلکم جہاں میں ہوں

فرحت کی شاعری کی خاص خوبیاں ان کی زبان کی شستگی، ان کے بیان کی صفائی اور اُن کی پاکیزہ ظرافت ہیں موجودہ زمانہ کے شاعروں میں شاید کم ایسے نکلیں جو ان محاسنِ کلام میں فرحت کا مقابلہ کر سکیں اور انہی خوبیوں کی وجہ سے ان کا نام مجھے اُمید ہے اُردو ادب کی تاریخ عرصہ تک باقی رہے گا۔ خدا اُن کی مغفرت فرمائے۔

غلام یزدانی

(اُردو مجلس حیدر آباد دکن میں پڑھا گیا)

غزل

آنکھوں میں پھر اشک جھلملائے دامن سے کہو سمٹ نہ جائے
دیکھو! دلِ منزل آشنا بھی تاریکیٔ غم میں کھو نہ جائے
کچھ رازِ وفا انھیں سے پوچھو آنسو جو سرِ مژہ نہ آئے
یہ چشمِ کرم ـــ اتھاہ ساگر جو ڈوب سکے وہ راز پائے
میں ترکِ وفا پہ مطمئن ہوں اس پر بھی اگر وہ یاد آئے
یہ پائے طلب ہے دشت پیما یوں کتنے مقام رہ میں آئے

میں اور جلیل یہ کشاکش!
آغازِ وفا ہی لوٹ آئے

جلیل کریر

سرفروش

ہ اُٹھی سازِ بغاوت کی لرزہ خیز ترنگ
ہ اُبھری سینۂ گیتی کی بیقرار اُمنگ
ہ گونج اُٹھا فضاؤں میں دیکھ نعرۂ جنگ
کارتا ہے مجھے ضربِ تیغ کا آہنگ
مرے رفیق مرا انتظار مت کرنا!

مرا یقیں مرا ایماں پکارتا ہے مجھے
مری وفا مرا پیماں پکارتا ہے مجھے
نقیب داورِ دوراں پکارتا ہے مجھے
بطونِ غیب سے انساں پکارتا ہے مجھے
مرے رفیق مرا انتظار مت کرنا!

ری نگاہ میں ہے رقص شعلہ و شمشیر
ری زباں پہ خداوندِ عصر کی تکبیر
ری ہی مٹھی میں ہے آج دہر کی تقدیر
رے لہو ہی سے ہوگی یہ داستاں تحریر
مرے رفیق مرا انتظار مت کرنا!

وہ دیکھ لشکرِ دشمن قریب آپہنچا
وہ شورِ ضربتِ آہن قریب آپہنچا
وہ دیکھ برق سے خرمن قریب آپہنچا
وہ دیکھ فتح کا دامن قریب آپہنچا
مرے رفیق مرا انتظار مت کرنا!

وطن کی بے بسی آواز دے رہی ہے مجھے
بشر کی خستگی آواز دے رہی ہے مجھے
زبانِ وقت کی آواز دے رہی ہے مجھے
اک اور زندگی آواز دے رہی ہے مجھے
مرے رفیق مرا انتظار مت کرنا!

وطن کی تازہ بہاروں میں دیکھنا مجھکو
جہانِ نو کے نظاروں میں دیکھنا مجھکو
فلک کے ٹوٹتے تاروں میں دیکھنا مجھکو
سخن کے شوخ شراروں میں دیکھنا مجھکو
مرے رفیق مرا انتظار مت کرنا!

شان الحق حقی

اُجالا

کردار:- دیوار ۔ کتا ۔ پاگل ۔ ہذیانی ۔

وقت:- ۲ بجے رات

نظر:- ایک محراب دار کمرہ، دیواریں بوسیدہ، ستون
لتہ، چھت جالے سے اَٹی ہوئی، محراب کے آگے ایک ناپختہ
ڑک جس میں گہرے شگاف پڑے ہوئے ہیں۔ سڑک کے ادھر
نارے پر ایک لیمپ پوسٹ جو نظر نہیں آتا۔ لیمپ کی مدھم
وشنی سامنے والی دیوار کو اُجاگر کر رہی ہے۔ سامنے والی دیوار کا
لستر بالکل اکھڑ چکا ہے۔ چھت کے قریب جابجا اینٹیں باہر کو نکلی ہوئی
ہیں۔ اس دیوار پر سڑک سے گزرنے والی ہر چیز کا عکس پڑتا
رہتا ہے۔ [دفعتہ پاؤں کی چاپ بلند ہوتی ہے۔ دو سائے
سامنے والی دیوار پر حرکت کرنے لگتے ہیں ۔ پاگل کالے کمبل میں مُنہ
چھپائے چوروں کی طرح سرکتا ہوا محراب میں داخل ہوتا ہے
اُس کے پیچھے پیچھے ایک کتا چلا آرہا ہے۔ بھورے رنگ کا مریل
سا کتا ۔ پاگل مُنہ سے کمبل سرکا کر سامنے والی دیوار کے آگے
مودبانہ انداز میں کھڑا ہو جاتا ہے]

۔ (دیوار سے) ہاں! میں آگیا ہوں ..... تو میرے بغیر اُداس ہوگئی
تھی نا؟ ... آج تیرے سینے پر کوئی سایہ سرکتا نظر نہیں آتا۔ تو
شاید میرا انتظار کرتے کرتے سوگئی۔

۔ اِدھر اُدھر (اینٹیں گرتی ہیں)

۔ میں سمجھا تو ابھی جاگ رہی ہے ..... بچہ رات گئے تک واپس نہ
آئے تو ماں بھی نہیں سو سکتی ..... میں تیری ممتا کو جانتا ہوں نا۔

عف عف

۔ (کتے سے) بھیا، بڑوں کی باتوں میں دخل نہیں دیا کرتے .....
قریب جا کر اسے پچکارتا ہے) تمھیں بھی نیند آرہی ہے کیا؟ تم بھی
دیجاؤ ماں کے گرم پہلو میں .... سو جاؤ، سڑک بھی سو چکی ہے ۔۔
راہگیر بھی سو چکے ہیں، اور دیکھو لیمپ کی شعاعیں بھی اونگھنے
لگ گئی ہیں .... سو جاؤ بھیا .....

(کتا زمین سونگھتا ہوا دیوار کے پاس لیٹ جاتا ہے۔ پاگل
دیوار سے ذرا ہٹ کر بیٹھنے ہی لگتا ہے کہ دیوار پر ایک اور
سایہ نمودار ہو جاتا ہے)

پاگل:- (چونک کر سائے سے) کون ہو تم؟ میری ماں کی نیند میں خلل
ڈالنے والے ..... چلے جاؤ،

(ہذیانی بیرونِ منظر سے جواب دیتا ہے)

ہذیانی:- میں صبح سے کسی اجاڑ کی تلاش میں تھا۔ لیکن یہ جگہ بھی انسان
کے گندے سانسوں سے اَٹی پڑی ہے۔

کتا:- عف عف!

پاگل:- (کتے سے) بھیا یہ کوئی پڑھا لکھا مہمان ہے .... اسے اندر
آجانے دو (محراب کی طرف مُنہ پھیر کر) آجاؤ۔

(کھٹ کی آواز کے ساتھ ہذیانی داخل ہوتا ہے۔ لمبا تڑنگا
انسان، سر پر گھنے بال، داڑھی فرنچ کٹ)

کتا:- (ہذیانی کو دیکھ کر) عف عف عف

ہذیانی:- (کتے سے) گالیاں دے رہے ہو مجھے .... ان گالیوں میں زیادہ
زور پیدا کرو، انھیں زیادہ مہلک بناؤ۔ تاکہ تمھیں بھی اشرف المخلوقات
کے نام سے پکارا جاسکے۔ (چاروں طرف دیکھ کر افسردہ لہجے میں)
مجھے اجاڑ کی تلاش ہے (بیٹھ جاتا ہے)

پاگل:- (ہذیانی سے) مجھے افسوس ہے کہ تم (کتے کی طرف اشارہ کرتا ہے)
میرے بھائی کو غلط سمجھے ہو، یہ بڑا ہی شریف النفس ہے۔ یہ
تمھیں خوش آمدید کہہ رہا تھا (سر کھجاتا ہے) اور یہاں تمھیں

اُجاڑ کی تلاش ہے!.... کیوں؟

ہذیانی ۔ اس لئے کہ میں جس شہر میں جاتا ہوں لوگ میرے لامحدود دماغ کو تجارتی منڈیوں میں بند کرنے لگ جاتے ہیں۔

پاگل ۔ (حیرانی سے) یہ کیوں؟

کتا ۔ عف

ہذیانی ۔ (کتے سے) تم میری باتوں میں دخل نہ دو.... (پاگل سے) ہاں تو وہ کہتے ہیں کہ تمھارے خیالات کی تاثیر گرم ہے۔ اس سے جنگلوں اور مال گوداموں میں آگ لگ جائے گی۔ اور پھر وہ کہتے ہیں کہ جب گندم بک سکتی ہے تو خیالات کیوں نہیں بک سکتے۔

پاگل ۔ ٹھیک ہی تو کہتے ہیں۔ تم جواب دے سکتے ہو کہ ایک ننھے سے خیال کے بدلے گندم کے بیس دانے لوں گا۔

ہذیانی ۔ (جوش میں کھڑا ہو کر چلاتا ہے) بکتے ہو، بکتے ہو.... تم سب لوگ بکتے ہو۔ خیالات کبھی نہیں بک سکتے ۔ مجھے اُجاڑ کی تلاش ہے۔

(ہذیانی شور مچاتا ہے ۔ کتا عف عف کرنے لگ جاتا ہے، دیوار کی اینٹیں اڑاڑا دھم گرتی ہیں)

پاگل ۔ (ہذیانی سے) بس بس، اڑاڑا دھم کی آواز سنی تم نے۔ تمھارے شور سے میری بوڑھی ماں کی نیند اُچٹ گئی ہے (دیوار سے) ماں یہ پڑھا مہمان بڑا بدتمیز ہے .... تم سو جاؤ۔

ہذیانی ۔ تم نے پہلے بھی ماں کا لفظ استعمال کیا تھا۔ .... دیوار بھی کسی کی ماں ہو سکتی ہے؟

پاگل ۔ اور یہ کتا میرا بھائی ہے۔

کتا ۔ عف عف

پاگل ۔ دیکھو اپنا نام سُن کر چونک پڑا ہے .... ایسا ذہین بھائی آج تک کسی کو نصیب نہیں ہوا۔

ہذیانی ۔ (بڑبڑاتا ہے) بڑے بدمذاق سے پالا پڑا ہے... (پاگل سے) جس طرح سورج کی شعاعیں زمین کو جکڑے ہوئے ہیں۔ جس طرح تارے زنجیروں کے بغیر ہوا میں لٹکتے ہیں، اسی طرح دیوار بھی ماں نہیں بن سکتی۔

پاگل ۔ تمھارے خیالات بہت پرانے ہیں۔ کل سورج کی شعاعیں زمین کو جکڑے ہوئے تھیں۔ آج زمین کے ذرے سورج کو ہوئے ہیں۔ کل تاروں کا وجود ایک حقیقت تھا، آج وہ زنجیر حقیقت ہے جو آسمان اور تاروں کے درمیان قائم رکھنے کے باوجود نظر نہیں آتی.... اور اسی طرح آج پتھر بن گئی ہیں اور پتھر کی دیواروں نے ماؤں کا روپ دھ

ہذیانی ۔ یہ سب بکواس ہے.... پتھر کی دیوار انسان کو جنم نہیں دے

پاگل ۔ عام لوگوں کا بھی یہی خیال ہے۔ لیکن مجھ جیسے جید عالم اس بھید کو پوری طرح پا لیا ہے کہ انسان عورت کے بطن پیدا نہیں ہوا بلکہ پتھروں سے اُگا ہے۔

دیوار ۔ اڑاڑا دھم (اینٹیں گرتی ہیں)

پاگل ۔ (دیوار سے) ماں معاف کرنا ۔ ہم ذرا فلسفہ کی باتیں کر رہ

ہذیانی ۔ تم نے ابھی کہا کہ تم جید عالم ہو .... اور پھر تم فلسفی بھی ہوتے ہو .... تم نے یہ فلسفہ اور علم کہاں سے حاصل کیا

پاگل ۔ (دیوار کی طرف اشارہ کر کے) اس نے میرے ضمیر میں چراغ اس نے میرے خیالوں میں قوس قزح کے رنگ بھرے۔

کتا ۔ عف عف

پاگل ۔ (کتے کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے) او بھائی میں تمھار کرنا تو بھول ہی گیا... (ہذیانی سے) اس نے بھی میری ما تعلیم حاصل کی، یہ بھی جید عالم ہے۔

ہذیانی ۔ خیر تم کافی عجیب و غریب آدمی ہو... تم فلسفی نہیں پا

پاگل ۔ تم ایسے لوگ مجھے پاگل سمجھتے ہیں، لہذا میں عقلمند ہ میری ماں نے مجھے اور میرے بھائی کو تعلیم کیسے دی؟.. میری ماں کے پاس لاتعداد تصویریں ہیں اور لاتعداد ـــــ یہ تصویریں اور آوازیں مختلف سانچوں میں ڈھ میرے اور میرے بھائی کے ذہن میں حلول کر گئی ہیں ا حیرت انگیز طور پر عقلمند ہو گئے ہیں۔

ہذیانی ۔ (کھویا ہوا ہے) وہ کیسے؟

پاگل ۔ نہیں سمجھے؟ ـــــ (دیوار کی طرف اشارہ کرتا ہے) تین سائے، ہمارے تین سائے۔ میری ماں کے پاس یہ

تصویریں ہیں، ہر اس گاڑیبان یا شہزادے کی تصویر جو ادھر کے باہر گزر رہا ہو۔

ہذیانی۔ ٹھیک (سوچتا ہے) (وقفہ)

پاگل۔ میری آواز کی گونج سُن رہے ہونا؟ .... میری ماں کے پاس ایسی لاکھوں آوازیں ہیں۔ میدانوں، شہروں اور جنگلوں میں بجتی ہوئی شہنائیاں میری ماں کی گود میں چکر کاٹ کر ہمارے کانوں میں اُتر جاتی ہیں۔ میری ماں دنیا کی سب سے بڑی سلطنت ہے یہ کرہ دنیا کی سب سے بڑی درسگاہ ہے اور ہم یتیم ہیں اور میرا بھائی یہاں کے سب سے بڑے طالب علم۔

دیوار۔ اڑاڑ ادھم (اینٹیں گرتی ہیں)

ہذیانی۔ (دیوار کی طرف اشارہ کرکے) اگر یہ تمھاری ماں ہے تو اسے کہو سو جائے ..... اڑاڑ ادھم کی کرخت آواز سے میرے کانوں کے پردے پھٹنے لگے ہیں۔

پاگل۔ شاید اسے آج نیند نہ آئے .... یہ تین دن سے بیمار ہے۔

ہذیانی۔ بیمار ہے .... کیا بیماری ہے اسے (دیوار کی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھتا ہے)

پاگل۔ تین دن ہوئے قریب ہی کسی نے برف خانہ کھولا ہے .... اس کی گرانبار مشین نے ارگرد کی زمین پر بڑا ناگوار اثر ڈالا۔ جس سے میری ماں کی صحت بھی خراب ہو گئی .... اُسے رعشہ ہو گیا ہے اور اس کے اعضا ایک ایک کرکے گرتے جا رہے ہیں۔

دیوار۔ اڑاڑ ادھم (اینٹیں گرتی ہیں)

پاگل۔ ایک اور عضو گر گیا ..... ماں میں تجھے مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔

ہذیانی۔ تم اپنے بھائی کو ساتھ کر برف خانہ پر حملہ کیوں نہیں کر دیتے؟

کتا۔ عف عف عف

ہذیانی۔ لو تمھارا بھائی بھی تمھارے ساتھ چلنے کو تیار ہے۔

پاگل۔ میں نے شہر والوں کو کہتے سُنا ہے کہ برف خانہ کھلنے سے انھیں بہت فائدے ہو گئے ہیں .... میری ماں خود مر جائے گی لیکن برف خانہ تباہ نہ ہونے دے گی ... وہ شہر والوں کا دکھ نہیں دیکھ سکتی وہ ماں ہے سب کی ماں ... (دیوار کو دیکھ کر) .... ماں!

دیوار۔ اڑاڑ ادھم (اینٹیں گرتی ہیں)

ہذیانی۔ ایک اور عضو گر گیا۔ یہاں خطرناک صورت اختیار کر رہا ہے

پاگل۔ جب کوئی بیمار مر رہا ہو تو اس کے رشتہ دار اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں اور دیئے کی دھیمی روشنی میں اس کے بیتے ہوئے دنوں کا تذکرہ چھیڑ دیتے ہیں۔ میری ماں مر رہی ہے۔ میں اُس کی گزری ہوئی زندگی کو دُہرانا چاہتا ہوں۔ تم سنو گے کیا؟

ہذیانی۔ کوئی نئی بات سناؤ۔ تم اپنی مرتی ہوئی ماں کا ذکر کرو گے تو میں قہقہے لگانا شروع کر دوں گا۔ جنازے دیکھ دیکھ کر میری آنکھیں منجمد ہو گئی ہیں میں تمھیں ایک آنسو بھی پیش نہیں کر سکتا۔

کتا۔ عف عف

ہذیانی۔ (کتے سے خوفزدہ ہو کر) اچھا بھائی سنتا ہوں۔ لیکن دیکھو یہ بدلحاظی اچھی نہیں .... (پاگل سے) سناؤ۔

پاگل۔ چالیس برس کی عمر میں داخل ہوتے ہی مجھے یک بیک علم ہو گیا کہ میں بچہ ہوں، چنانچہ میں کسی ماں کی تلاش میں شہر بشہر گھومنے لگا

ہذیانی۔ چالیس برس کا بچہ؟ بڑے بھونڈے قسم کا مذاق کر رہے ہو۔

پاگل۔ تمھاری عمر کیا ہے؟

ہذیانی۔ ساٹھ برس۔

پاگل۔ تم بھی ابھی بچے ہو۔ تو خیر ماں کی تلاش میں میں نے کائنات کا چپّہ چپّہ چھان مارا۔ اونچے پہاڑ، پست وادیاں، زمین دوز غار میں نے سب کچھ دیکھا، اور یہ بھی دیکھا کہ ہر شے کی آستین میں نشتر چھپے ہوئے ہیں۔ ماں کہیں نہ مل سکی۔

ہذیانی۔ (دلچسپی لیتے ہوئے) پھر؟

پاگل۔ آخر ایک دن تھک ٹوٹ کر میں اس محراب میں آ کر لیٹ گیا اور یہ دیوار؟ --- اس کے خنک سایوں نے مجھے تھپک کر سلا جب میں سو کر اُٹھا تو مجھے محسوس ہونے لگا جیسے اس دیوار کی آستین میں کوئی نشتر نہیں --- میں نے ماں کہہ کر اس کے پاؤں

ہذیانی۔ تمھارے آنے سے پہلے تمھاری ماں کی گود صدیوں تک خالی رہی ہوگی .... جب سے عقل باریک ہو گئی ہے بیٹوں کا قحط پڑ گیا

پاگل۔ (غصے سے) مجھے اپنی بات ختم کر لینے دو۔ بیٹھ فلسفہ بگھارنے۔

یانی - تم بھی تو جوش میں آؤ - اپنی مرتی ہوئی ماں کا سوگ منانے بیٹھے ہو یا مجھ سے جنگ کرنے۔

ل - (منہ بسور کر) واقعی مجھے تو عورتوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہئیے۔ تم ہی بتاؤ رونا شروع کر دوں یا اپنی کہانی جاری رکھوں۔

یانی - مجھے تمہارا رونا پسند نہ آئے گا۔ تمہارے گلے میں رس نہیں، کہانی سناؤ

گل - تو دوسرے ہی دن میں نے اپنی ماں کو ساری دکھ بھری داستان سنا دی میں نے کہا 'ماں میں بالکل بچہ ہوں، بالکل اکیلا ہوں، بجلیاں میرا پیچھا کر رہی ہیں۔ بگولے مجھ پر کمندیں پھینک رہے ہیں۔ پُر اسرار خلا میرے خلاف سرگوشیاں کر رہے ہیں، مجھے بچاؤ۔ (ہاتھ کی جنبش سے ہذیانی کو متوجہ کرتے ہوئے) اور تم جانتے ہو میری ماں نے مجھے کیا جواب دیا؟

ہذیانی - کیا جواب دیا؟

پاگل - اس کا جواب یہی تھا کہ اُس نے مجھے بجلیوں، بگولوں اور طوفانوں کی زد سے بچا لیا - ایک دفعہ بجلیاں میرا تعاقب کر رہی تھیں میری ماں بڑھ کر درمیان آگئی، اس کا آدھا جسم جل کر سیاہ ہو گیا۔ لیکن مجھے آنچ تک نہ آئی - اسی طرح بگولوں اور طوفانوں نے مجھ پر کئی بار حملے کئے۔ لیکن میری ماں اپنے سینے پر چوٹ سہہ کر مجھے بچا لیتی رہی — دیکھو ان چوٹوں کے نشان .... بچاری کا جبڑا ٹوٹ چکا ہے سینہ پھٹ چکا ہے .... ایک طرف ہڈیاں باہر کو اُبھر آئی ہیں اس نے میرے لئے کیا کچھ نہ کیا .... ہائے ماں!

ہذیانی - تمہاری باتیں سن کر میرے دماغ کے تمام اُفق روشن ہو گئے اب مجھے اُجالے کی تلاش نہ ہو گی۔

پاگل - میں نے جان بوجھ کر آسان زبان میں باتیں کیں تاکہ تم انہیں بخوبی سمجھ سکو۔

ہذیانی - پتھر بولتے ہیں، پھول محسوس کرتے ہیں، ندیاں سنتی ہیں، زندگی سب جگہ موجود ہے، جس کے سینے میں دل ہے اس کے لئے ہر اجاڑ امید و بیم کا شورش کدہ ہے۔ .. سنو سنو کائنات کے سب ذرے مل کر گا رہے ہیں

(ہذیانی اُٹھ کر ناچنا شروع کر دیتا ہے)

پاگل - میری ماں مر رہی ہے اور تم ناچنے لگے ہو — بیٹھ جاؤ۔

ہذیانی - (بیٹھتے ہوئے) لو میں بیٹھ گیا — (کتے کو دیکھ کر) ہاں یہ کیا؟ تمہارا بھائی تو خراٹے لے رہا ہے۔

پاگل - بیچارہ تین راتیں جاگتا رہا ہے، ماں کی تیمارداری کرتا رہا۔ میں ابھی اسے جگا دوں گا تاکہ اپنی مرتی ہوئی ماں کا آخری بار منہ دیکھ سکے۔

ہذیانی - یہ تمہارا بھائی کیسے بنا؟

پاگل - برسوں اُدھر — میں ایک تاریک گلی میں سے گزر رہا تھا کہ چند انسان بھیڑیئے بن کر مجھ سے چمٹ گئے - اس نے انسان بن کر ان کا مقابلہ کیا اور مجھے خلاصی دلائی ان دنوں یہ بہت تندرست تھا اور بلیغ سے بلیغ تقریر کر سکتا تھا۔

ہذیانی - تمہاری ماں دیر سے چپ ہے۔ بیماری میں افاقہ ہو گیا ہے شاید!

پاگل نہیں یہ سکرات موت کے عالم میں ہے — وہ دیکھو شعاعیں ماند پڑ گئیں ہیں لیمپ بجھنے ہی والا ہے - ہاتھ اٹھاؤ ماں کے حق میں دعا کریں۔

ہذیانی - کس سے دعا مانگوں، میں خدا کو نہیں مانتا - ذرہ ذرے سے ٹکرا رہا ہے آفتاب آفتاب سے اُلجھ رہا ہے خلا، خلا کو نگل رہا ہے — خدا کا نام لے کر ہر شے تباہی مچا رہی ہے۔

پاگل - آؤ ہم فطرت سے خطاب کریں، فطرت میں شعور ہے فطرت میں احساس ہے - ہماری دعائیں بیکار نہ جائیں گی، ہاتھ اٹھاؤ، ماں سکرات موت کے عالم میں ہے۔ (دونوں آنکھیں بند کر کے ہاتھ اٹھاتے ہیں۔ کمرہ میں مکمل سکوت چھا جاتا ہے) (وقفہ)

[دفعتہ لیمپ بجھ جاتا ہے۔ کمرہ میں تاریکی پھیلتے ہی دیوار لرز کر گر جاتی ہے کتا ملبہ کے نیچے دب جاتا ہے اور ایک دو ٹوٹی آوازیں نکالنے کے بعد ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جاتا ہے - دیوار کے اُس پار سورج طلوع ہو رہا ہے ملگجے اُجالے میں ایک ٹنڈ منڈ درخت چپ چاپ کھڑا ہے - ہذیانی اور پاگل دونوں آہستہ آہستہ اُٹھتے ہیں۔]

پاگل - میری مہربان ماں مر گئی .... تصویریں اور آوازیں منتشر ہو گئیں، آج سے یہ ڈیرا بھی اُجڑ گیا۔

ہذیانی - تمہاری ماں مرتے ہوئے تمہارے بھائی کو بھی ساتھ لے گئی۔

پاگل - دونوں سہارے ٹوٹ گئے، دونوں ساتھی بچھڑ گئے ... ہائے مہرباں ماں۔

ہذیانی - تمہارا سہارا ٹوٹ گیا اور میں بے سہارا ہوں - آؤ سورج کی روشنی میں کوئی موزوں جگہ تلاش کریں اور اپنے سہارے چنیں .... آؤ ... وہ دیکھو سورج طلوع ہو رہا ہے - (ہذیانی پاگل کو بازو سے کھینچتا ہے)

پاگل - (چلتے ہوئے) ماں کی لاش کو آخری سلام۔ میں جا رہا ہوں اپنا سہارا آپ بننے —! (دونوں جاتے ہیں)

(حلقۂ اربابِ ذوق لاہور میں پڑھا گیا)

ظہیر کاشمیری

سوزِ ناتمام

دردمندی کا مل گیا انعام — دل کی ہر چوٹ ہو چلی آرام

عشرتِ درد کے سوا بھی مجھے — چاہیئے شوق کا کوئی پیغام

کیوں مرے رہبروں نے رکھا ہے — اپنی درماندگی کا منزل نام

آپ کی چارہ سازیاں معلوم — دردِ دل کا ہُوا دوا انجام

غم زدہ خوش بھی ہو نہیں سکتے — ایک اک سانس ہے تمہارا نام

کیوں جور میں شان ہے کرم کی — دل آپ ہی بدگماں ہے اپنا

جیتے ہیں اس آسرے پہ قیدی — باغ اپنا ہے باغباں ہے اپنا

اس برق و بلا میں باغ کی خیر — ہر شاخ پہ آشیاں ہے اپنا

احساس کی شدّتیں بلا ہیں — ایک ایک نفس گراں ہے اپنا

بیداد ہے مجھ پہ ترکِ بیداد — دشمن ابھی آسماں ہے اپنا

اندازِ تجمّلِ حسن اداؤں میں پھر بھی وہ مستور رہے

اللہ رے اوجِ نظارہ نظارے میں کیا کیا طور رہے

تابش

پناہ

افتاد

ے اُجالوں کے تعاقب میں رواں لاری کے آگے، جیسے کسی نے پتھر رکھ دیا "روک" کے ناگہانی عمل کی وجہ سے گڑگڑاتے ہوئے پہیوں سے ایک
ہوئی اور تمام مسافر اکڑوں ہو کر بیٹھ گئے کہ شاید منزل آگئی، لیکن منزل ابھی کہاں؟ — یہ تو ایک لق و دق ویرانہ تھا، جہاں چار سو
اور سنناتی ہوئی خموشیوں کے مابین سرگوشیاں جاری تھیں، بھنبھناتے ہوئے انجن نے دم سادھا تو مسافروں نے لاری رُک جانے
کے لئے دریچیاں کھولیں۔ پناہ گزین منیب نے بھی سامنے پھیلائے ہوئے اخبار کو الگ ہٹا کر باہر کی طرف توجہ کی اور انجن کی بغل
بز پوش فوجی افسر کا منحنی سا ہیولیٰ نظر آیا، جس کے شانے پر آویزاں پیتل کا ایک پھول کجلائی ہوئی دھندلاہٹوں میں ہڈّی کے پُرانے
رہا تھا۔ جمعدار کے پہلو میں ایک اور کاہیدہ جسم فوجی جوان، سنگین چڑھی ہوئی رائفل تھامے اور ایک تھکے ہوئے گھوڑے کی طرح
ائے استادہ تھا اور اس سے ذرا ہٹ کر، سلیٹی سڑک کے دوسرے کناروں پر ایک بھوسلی سی فوجی جیپ، بطن میں ایک سیاہ خلا
..... دفعتاً لاری کی فرنٹ سیٹ کلبلائی تو منیب ادھر متوجہ ہوا۔ اُس پر قابض تھانیدار صاحب نے شمپین کی بوتل کو الگ ہٹا کر اپنی اُبلتی
لاری کی ننھی سی گزرگاہ میں سے ایک بگولے کی طرح گزارا، نخوت کی بھاپ کی ایک تیز رَو لپکی اور منیب کا ذہن تپنے لگا۔

پی میں سے مسافروں کا ایک گروہ سڑک پر کود آیا، اور منیب نے بھی اپنی میل خوردہ ٹوپی کے لوتھڑے کو سر پہ جما کر اور اپنے ٹینوں سے
نذرات کو بغلوں میں اُڑس کر لاری سے چھلانگ لگائی تو اُس نے دیکھا کہ لاری کے انجن کی سیدھ میں ذرا ہٹ کر چند انسان نما چیزوں کا
م سڑک پر ایک پھسپھسے سے ٹیلے کی مانند کھڑا ہے اور ان کی طرف پشت کئے دُور ایک جھاڑی کے پاس، تھانیدار صاحب اپنے بازوؤں
ے اور جسم کے دونوں طرف تکونیں بنائے کھڑے ہیں اور فوجی جمعدار ایک تکون میں اپنے مجوب ہاتھ کے ساتھ عمود گرانے کی سعی کر رہا ہے
کی تازہ کلف لگی ہوئی پگڑی کا طرّہ ایک اصیل مرغے کی مانند سارے ماحول میں تن کر کھڑا تھا اور اُن کے سر کی خفیف سی جنبش کے ساتھ
ہوئے ناگ کی مانند ادھر سے ادھر لپک جاتا تھا ناگہاں تھانیدار صاحب اپنی بغلی تکونوں کو برقرار رکھنے اور فوجی جمعدار کے عمود کو نخوت
ہوئے برق وار پیچھے ہٹے اور پھر ڈگ بھرتے اس پھسپھسے سے ہجوم کے سامنے جم گئے۔

م؟" پولیس کا شیر دھاڑا۔
رہیں حضور۔" اُن انسان نما چیزوں میں سے ایک چیز دھیمے سے آگے کھسکی اور پھر جیسے پاتال سے آواز آئی "پناہ گزین ہیں حضور، ہمارا کچھ قصور نہیں۔"

لع؟"

پور، جناب، بڑے وبال ——"
ں۔ں! تو تمہیں ہو وہ جنہوں نے پچھلے ہفتہ سے میرے علاقے میں چوریوں سے اُدھم مچا رکھا ہے۔ فیروز پور سے میں خوب واقف ہوں۔"
ہم تو ابھی ابھی یہاں اُترے ہیں، وہ دیکھئے ہمارا سامان ابھی سڑک کے کنارے ہی پہ پڑا ہے۔ کرایہ ہمارے پاس تھا نہیں اس لئے
ہیں سپاہی سزا کے طور پر اس ویرانے میں لا کر اُتار دیا۔ بیوی بال بچّوں والے ہیں حضور، چوری کس مُنہ سے کریں۔ ہندوستان والوں نے
ے ظلم توڑے۔ میرا جوان بیٹا ——!"

جس جی۔ لپیٹ رکھو اس کہانی کو"۔ فوجی جمعدار نے بھی اپنی موجودگی کا ثبوت دیا۔ تھانیدار صاحب جو چپ چاپ بیٹھے تھے
اور منیب کے لاشعور کی پھلجھڑی کو جیسے کسی نے دیا سلائی دکھا دی۔ معاً اسے حاکم ضلع یاد آ گیا جس کی حضوری میں وہ آج صبح اپنی جمعیت کی
باریافت کے لیے گیا تھا۔ لیکن چونکہ اس کے دفتر کے باہر نئی نویلی کاروں کی ایک لمبی قطار مزاحم تھی اور اندران کے نئے مالک اس سے ملاقات کی
نوبت نہ آئی۔ کاروں کی اس قطار سے گزر کر اس کے خیالات کا جلوس ایک اور انسانی جلوس سے دوچار ہوا جس میں چند سادہ وضع لوگوں کا ایک
پھیلا ہوا ہجوم، ہاتھوں میں سبز علم اٹھائے، ایک دھندلے راستے پر خلوص سے دمکتے ہوئے چہروں کے ساتھ اور شدتِ جذبات سے لرزاں آواز میں
نعرے لگاتا رواں تھا "پاکستان کا مطلب کیا۔ لا الٰہ، الا اللہ!" ان کے ہر نعرے پر پیشین کا چلبلا سا شخص اپنی ناچتی ہوئی آنکھوں اور گوشوں میں
بھنچے ہوئے متبسم لبوں کے ساتھ اظہارِ خوشنودی کرتا جاتا تھا۔..... پھر یکایک ٹھوس حقائق کے برش نے بڑھ کر تخیل کے نگار خانے پر جیسے تارکول پھیر دیا
اور منیب کو یوں محسوس ہوا جیسے اس نعرہ زن انبوہ سے فیروز پوری پناہ گزینوں کا پھسپھسا ہجوم ابھر آیا ہے جس کی پیشی میں تھانیدار اور فوجی جمعدار
ایستادہ تھے، ایک بار پھر جیسے اس کے اپنے اندر ہی سے کسی نے پکارا "پاکستان کا مطلب کیا؟" اور از خود اس کے لب ہلے، پر اس نے انھیں پھر بھینچ
لیا.... (شاید اس ڈر سے کہ الٰہ آبادی اکبر کی مانند مبادا اس کی بھی رپٹ نہ لکھ لی جائے۔) تھانیدار پتھر کے ایک بت کی مانند اس ننھے سے گروہ کے
سامنے ایستادہ تھا اور فوجی جمعدار اس کی طرف طمانیت اور تفاخر سے لبریز آنکھوں سے گھور رہا تھا جیسے یہ آذر ابھی ابھی اس بت کی تخلیق سے فارغ ہوا ہو۔

"کدھر ہے، وہ بڑھیا؟" پتھر کا بت بولا۔

"وہ تو مر چکی ہجور (حضور) پر اس میں ہمارا کچھ قصور نہیں۔"

"لیکن ہے کہاں وہ؟"

"آیئے وہ ادھر میری جیب کی پچھلی طرف ہے۔" فوجی جمعدار نے پھر عمود گرایا اور تھانیدار صاحب کا بت اپنی سنگین تجسیم برقرار رکھتے ہوئے بڑھا۔
سامنے کے پھسپھسے ٹیلے کا فراز بکھر گیا، اور فیروز پور ساختہ انسان نما چیزیں ادھر ادھر لڑھکنے لگیں..... ہوا میں پھر نفرت کی بھاپ کے بھبکارے پھیل
گئے۔ جس کی تپش سے عقب میں آتے ہوئے منیب کے دماغ کے گلیشیر سے پھر یادوں کی بوندیں ٹپکنے لگیں۔ ایک بوند میں اس دن کا منظر لرز رہا تھا جس
روز ایک کار اور حلقہ ووٹران کے مالک بزرگ اپنی ٹوپی پر ایک نیا چاند تارا سجائے، جلو میں ایک دو مشرع شکلوں اور دو تین مہذب سوٹوں والے
رفقا لیے امرتسر اس کے محلے میں آئے اور وہاں انھوں نے فرزندانِ توحید کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر مہیا کرنے کے بعد ایک اسلامی حکومت
کی برکات پر ایسی حسین تقریر کی کہ توحید کے بیٹے واہ واہ کرتے رہ گئے۔ اس کے بعد ایک مولوی صاحب کی دبنگ آواز اس رعشہ آفرینی کے ساتھ فضا
میں گونجی کہ سارا سمندر دیکھتے ہی دیکھتے متلاطم ہو گیا اور انھوں نے سب کو ع اور ق کے پیچاک میں الجھا کر ان کی ادراک پر حکومتِ الٰہیہ اور دولت
وصولتِ اسلامیہ، خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے ایسے گول مول پتھر لڑھکائے کہ سامعین مبہوت ہو کر رہ گئے۔ پھر سلک کی قمیص پر ملیشیا کا سوٹ پہنے ایک
خوش وضع نوجوان نے باندازِ دلربائی اٹھ کر جہاد کا فلسفہ آنکھیں اور ہاتھ نچا نچا کر بیان کرنا شروع کیا۔ وفورِ جوش میں اس کا بازو اس قدر پھیل جاتا
کہ ملیشیا کے کوٹ کی آستین کھِسک کھِسک جاتی اور نیچے پہنی ہوئی طلائی گھڑی سورج کی روشنی میں جیسے ہنس دیتی.... آخر میں ملت کے ایک شعلہ مقال
شاعر نے آہِ سرد بھر کر سامعین کے جذبات کو بیدار اور برانگیختہ کیا۔ ہوا میں ہاتھ چلا کر قلعوں کے خطوط کھینچے اور اپنی مخمورسی کی لہراتی ہوئی پگڈنڈیوں کے
ذریعے ان میں نصرتِ الٰہی کے عساکر اُتارے۔ تب یکایک فضائیں اطاعت الٰہی کے معاہدوں کی تجدید و تکرار — یعنی اسلام زندہ باد! — کے نعروں
سے گونج اٹھیں۔ پھر ڈی۔ ایس۔ پی کے سٹینو مسٹر منیب الرحمٰن نے ایک وردی پوش سب انسپکٹر پولیس کو مجمع میں سے اٹھتے دیکھا جس نے اپنی کمر سے
پیٹی اتار کر اعلان کیا کہ آج سے وہ ان غدارانِ ملت کی چاکری سے جن کے نام ہماری جماعت کے رجسٹروں میں درج نہیں ہیں تائب ہوتا ہے اور لوگ
وفورِ مسرت سے دھڑا دھڑ نعرے لگانے لگے..... یکایک نعروں کی آواز ایک مہیب چیخ میں تبدیل ہو گئی۔ منیب نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا تو بوند

بیٹ چکی تھی اور اُس کے سامنے ایک بہت ہی گھنی جھاڑی کے پہلو میں میلے کچیلے چیتھڑوں کی ایک متعفن گٹھری پڑی کراہ رہی تھی اور اُس کے سرہانے تھانیدار صاحب بار بار اپنی چھڑی کو کمر پر جمانے کی کوشش کرتے ہوئے کھڑے تھے۔ گٹھری میں سے پھر ایک فضا دوز چیخ بلند ہوئی۔ منیب ذرا آگے بڑھا تو اُسے گٹھری کے ایک سرے پر ایک چہرہ نظر آیا۔ بھوسلا، گھسا پٹا، سُتا ہوا، زندگی کی دمک سے یکسر خالی نقلی چہرہ! ...... چہرے پر پتلے پتلے لبوں کی دھجیاں تھرتھرائیں۔ اور اُن کے اندرون سے پھر ایک چیخ دھڑ دھڑا کر نکلی۔ منیب نے سہم کر اپنی نگاہیں چہرے سے الگ ہٹا لیں۔ لیکن اب کے یہ گٹھری کے میلے کپڑوں پر سُرخ سُرخ دھبوں کے ساتھ اُلجھ گئیں۔

"یہ تو زندہ ہے کمبخت — جھوٹے کہیں کے"۔ تھانیدار صاحب کا سُرخ چہرہ تمتما اُٹھا۔

"بس چند سانس باقی ہیں، جی پر اس میں کسی کا قصور نہیں" ایک فیروزپوری جیز نے اپنے سر پہ اُگی ہوئی سفید سَن پر اوڑھنی جماتے ہوئے ہچکیوں میں کہا۔ "میری بہن-ن-ن-کی- تقدیر- یونہی- لکھی ی ی- تھی"۔

اور یکایک فیروزپور کے گھسے پٹے ڈبے ٹھنکنے اور بلکنے لگ گئے، کچھ اور میلی کچیلی گٹھریاں سُرسُراتی ہوئی آگے بڑھیں اور جھاڑی والی گٹھری کے قریب پہنچ کر رک گئیں، زندگی کی دمک سے یکسر خالی وہ نقلی چہرہ اب یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے ابھی ابھی کوئی اسے بدرو کی تازہ کیچڑ سے بنا کر گیا ہو سیاہ اور متعفن!....

"دراصل یہ بڑھیا تھی بھی بڑی نٹ کھٹ"۔ فوجی جمعدار نے پھر عمود گرایا۔ "ہماری جیپ ابھی سو گز کے فاصلے پر تھی کہ ہم نے اسے سڑک کی چوڑائی میں پہلے تین چکر لگاتے دیکھا سامان اُٹھائے ادھر سے اُدھر یوں بھاگ رہی تھی جیسے جولاہے کی کوچ!"

"بھئی کیا پوچھتے ہیں آپ ان لوگوں کی" بڑھتے ہوئے ہجوم میں سے لاری کا ایک بھیم وشحیم مسافر کھنکارتے ہوئے بولا جس نے اپنے لمبے بالوں والے سر پر ایک تنگ سی سپید کھال کی ٹوپی جما رکھی تھی اور جسے منیب نے شہر سے لاری کے روانہ ہوتے دم تھانیدار صاحب کو شیمپین کی بوتل لا کر دیتے دیکھا تھا۔ "جب ان لوگوں کو کوئی دیکھنے والا نہ ہو تو یہ طرار گھوڑوں کی طرح چلتے ہیں۔ لیکن جونہی کوئی اجنبی شخص ان کی نگاہوں کے سامنے ہوا اور انھوں نے فوراً پینترا بدلا۔ چہروں کی شگفتگی یوں غائب ہو جاتی ہے جیسے ابھی ان بےچاروں پر سکھوں کا حملہ ہوا چاہتا ہے —"

تھانیدار صاحب دہکنے لگے۔

"تو پھر جناب فیروزپوری پناہ گزینو، ہمارے افسر، جناب کی بڑھیا اگر مٹرگشتی کے دوران میں سرکاری جیپ کی لپیٹ میں آگئی تو بتاؤ ہم کیا کریں؟ ہم اسے ٹھکانے لگا دیں گے زناب، جو ہونا تھا ہو گیا، ہم کسی سے کچھ نہیں کہہ سکتے"۔

اور منیب کے دماغ کا گلیشیر پھر ٹپکنے لگا۔ اس کی پھٹی ہوئی نگاہوں کے سامنے امرتسر کے سول اسپتال کا دروازہ کھل گیا، طبابت کے شریف فن کا ایک جواں سال اور پروقار نمائندہ سیاہ سوٹ پر نیکلی مالوی پگڑی باندھے نچلا ہونٹ پھیلائے ہوئے باہر نکلا اور بھنویں سکیڑ کر اپنے نازک سے چشمے کے شیشوں کے اوپر سے دیکھتا ہوا ایک گہری 'ہوں ں ں' کے بعد منیب سے بولا۔ "تمھاری والدہ بم سے زخمی ہوئی ہے اور تمھارے ننھے بھائی کو بلم کی انی لگ گئی ہے پر میں کیا کروں؟ — یہ کافروں کا اسپتال ہے مسٹر، تم پاک لوگوں کو ہم اپنے ناپاک ہاتھ کیونکر لگائیں — آہ مس سرجیت، پاکستان کے لئے ایک، ارد

اور منیب کا ننھا بھائی معصوم احمد سرجن کی انگشت اشاریہ کے تلے یوں کراہنے لگا جیسے ایک اور نیزے کی انی اس کے گلابی جسم میں ترازو ہو گئی ہو!

پھر یکایک منیب کی کوٹ کے دونوں جیبوں میں چار ہاتھ گھس گئے اس نے پلٹ کر پیچھے کی طرف دیکھا تو دو بھاری جسم استادہ تھے جنھوں نے اپنی گھنی مونچھوں کو تازہ تازہ بل دے رکھے تھے۔ سروں پر گتے کی پستہ قد سیاہ ٹوپیاں پہن رکھی تھیں اور کاندھوں پر لال رنگ کے بلے چمک رہے تھے ان کے پیچھے اور آدمی تھے جنھوں نے منیب کا واحد بکس اور اس کی والدہ کی واحد گٹھری فرداً فرداً سر پہ اُٹھا رکھی تھی۔ منیب کی تینوں جیبوں میں سے ایک پنسل، ایک سادے کاغذ کا ٹکڑا، تین آنے اور ایک ازار بند کش نکلا۔ انھوں نے ان اشیا کو ہنستے ہوئے اپنی جیبوں میں ڈالا اور پھر ایک دہقانی جسامت کے ہاتھ نے بڑھ کر منیب کی کلائی پر سے گھڑی اُتار لی۔

"بابوجی آپ پاکستان جا رہے ہیں نا اس لئے وہاں پاک ہو کر جایئے"

"قہ۔ قہ۔ قہ۔ قہ۔ قہے ہے ہے۔"

"یکایک بوند پھر پھٹ گئی"... لیکن قہقہے کی آواز اب بھی منیب کے کانوں میں آرہی تھی۔ منیب نے نگاہیں اٹھائیں تو اس [illegible] کسی امرتسری کی بجائے سپید ٹوپی والے ملتانی بانکے اور تھانیدار صاحب کے شیمپین رساحلق کو قہقہہ فشاں پایا۔ جس کا بالوں بھرا ہاتھ کدال [illegible] ایک دوسرے متبسم مسافر کے ہاتھ پر پڑ رہا تھا۔ ان دونوں کی آنکھوں کے گھومتے ہوئے ڈھیلے فیروزپوری گٹھریوں میں سے ایک کی نسبتاً چمکیلی گٹھڑی پر مرکوز تھے [illegible] پاس ہی سنگین بردار فوجی گویا ہنسی ہنسی میں ایک فیروزپوری شے کے کرتے کی چھوٹی چھوٹی جیبوں میں ناجائز اسلحہ ڈھونڈ رہا تھا۔

"ہائے میری ماں جائی!" سر پر آگی ہوئی سفید سن پر سے اوڑھنی اتر کر پرے جا پڑی اور ایک گھسے پھٹے چہرے نے دوسرے نقلی چہرے کے بھیجے ہوئے ماتھے پر بھرپور زندگی کی سی برق رفتاری کے ساتھ اپنے ہونٹ پیوست کر دیئے... بچلے چہرے کی آنکھوں کی میلی کوڑیوں کی دراڑیں ایک لمحے کے لئے ازحد دہن کا بل وسیع تر ہوا اور اس میں سے دو ہی دانت چاک کی ڈلیوں کی طرح نمودار ہوئے، پھر ناک کی مٹیالی ٹکیہ سکڑی، ٹھوڑی کی پلپلی ہیلی اور لٹکی گردن کی کمانی تنی اور پھر ڈھلک گئی!... ادھر فیروزپوری گٹھریاں چیخیں، ڈبے ہلکے اور چیزیں ٹھنکیں۔

ہجوم اور سکڑا، منیب کے جسم کے ساتھ زور سے جسم بھڑاتا ہوا، ایک متعفن پناہ گزین ہجوم چیر کر آگے نکل گیا، اور ساتھ ہی منیب نے اپنے دل کے قریب ایک تیز دھار چیز کی رفتار محسوس کی۔

"ارے بیوقوف، روتے کیوں ہو؟ شکر کرو کہ تمہاری بڑھیا مسلمینوں کے ہاتھوں سے مری ہے، تم بھی مسلمین ہو اور یہ جمعدار صاحب بھی مسلمین!" تھانیدار مڑتے ہوئے بولا۔ "اسے ٹھکانے لگاؤ اور چوریوں سے باز آجاؤ۔ ورنہ یاد رکھو کہ میں سکھوں سے بھی برا ہوں۔"

جمعدار صاحب نے اب کے اقلیدس کا ایک اور مسئلہ برتا، انہوں نے تھانیدار صاحب کے بائیں بازو پر اپنا دایاں بازو منطبق کر دیا، اور ساتھ ہی اپنے اور ان کے ہاتھ کی انگلیاں کا باہم جال بن دیا......

"اوہ، معمولی بات ہے، میں اسے آج کی ڈائری میں "ناگہانی موت" کے طور پر دکھا دوں گا۔" تھانیدار صاحب نے اپنے دائیں ہاتھ کو فضا میں یوں حرکت دی جیسے کوئی چیز طاق پر رکھ رہے ہوں، فوجی جمعدار نے اپنی جھکی ہوئی گردن بلند کی۔ آنکھوں میں نئی نگاہیں رقصاں کیں اور انگلیوں کے جال میں اپنے "ٹانکے" زیادہ مضبوط کر دیئے۔

"شکریہ" فوجی جمعدار کی تنی ہوئی چھاتی سے آواز یوں نکلی جیسے ابھی اس ڈھول پر تازہ جھلی چڑھائی گئی ہو۔

ہڈی کے پرانے بٹن کا سا پھول اور ناگ کے پھن کا ساطرہ جیب کے بوسیدہ سلہوٹ کے پاس جا کر رک گیا۔ فوجی جمعدار نے بڑھ کر گاڑی کی دری کھولی اور ساتھ ہی تھانیدار صاحب کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ منیب نے ذرا قریب ہو کر اندر نگاہ دوڑائی تو انجن کے اندرونی حصے کے خلا میں اسے ایک بکس نظر آیا، جس میں آٹھ دس کالے کالے رنگ کی بوتلیں پڑی تھیں۔

"وائٹ ہارس!" تھانیدار صاحب بلند آواز سے ناک کے رستے سانس کھینچتے ہوئے بولے۔

"اوہ معمولی بات ہے۔" فوجی جمعدار نے چار بوتلیں بکس سے نکال کر تھانیدار صاحب کے دونوں ہاتھوں میں تھما دیں۔ "میرے پاس ادھر [illegible] میں ان کا پورا بکس موجود ہے۔"

"کہاں سے کر یہ لائے آپ انہیں؟" تھانیدار صاحب نے کھیس نکالی۔

"کراچی سے" فوجی جمعدار نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ بمبئی کے ایک بوہرے کو حال ہی میں ہمارے سپرنٹنڈنٹ نے ایک [illegible] کی دکان کا لائسنس دلوایا تھا، وہاں سے وائٹ ہارس کا ایک عظیم دفینہ برآمد ہوا۔ تین پیٹیاں تو میجر صاحب نے وصول کیں اور دو یونٹ کا [illegible] ہونے کی حیثیت سے [illegible]

[illegible] یہ بہت چھپا یا کہ یہ بے لوگوں کے لئے بھی بہت دو لیکن آپ جانتے آج کل ملٹری والوں کے سامنے بھلا کس کی چلے گی۔ ہم نے بھی اس مال کو کان سے سنا کر کے چھوڑا۔"

"خوب، تو اب یہ پاکستان کی دولت ہے۔"

"ہا ہا ہا! ہا ہا ہا!"

"کیا بتائیں، جمعدار صاحب، قسمت نے ایسے بنجر علاقے میں لا کر پھینکا ہے کہ ایسی چیزوں کا ملنا اس جگہ سخت مشکل ہے۔ خدا غارت کرے چاولے یہاں کے نئے ٹھیکیداروں کو، نہ جانے کس چکر خانے سے اٹھ کر آ گئے ہیں، خان صاحب بہت تیر ماریں گے تو مری کا مال اٹھا کر سامنے رکھ دیں گے۔ ولایتی چیزوں کا پیچھا تو بھیڑ کی طرح منمنانے لگیں گے۔ میں ں ں، وہ تو جناب ڈسٹرکٹ یو فرکراچی سے آگے آنے ہی نہیں دیتے۔ کہتے ہیں وہاں بہت مانگ ہے اور پھر اگر بھولے بھٹکے سے چار مدد آ بھی جائیں تو ہمارے ام ال اے صاحب کے کان میں خدا جانے کہاں سے بھنک پڑ جاتی ہے کہ یہ ذات شریف اچک لے جاتے ہیں۔"

"خیر جی یہ تو خاص چیز ہے۔"

"اور پھر پاکستانی" سپید ٹوپی والے بانکے نے آگے بڑھتے ہوئے کہا اور تھانیدار صاحب کے آڑے وقت کام آتے ہوئے لپک کر بوتلیں اُن کے ہاتھ سے لے لیں، "قہ قہ قہ قہ!" اسی بانکے نے پھر گویا منیب کے ذہن پر برما چلانا شروع کر دیا۔

"تو لیجئے، السلام علیکم" تھانیدار صاحب نے ہاتھ بڑھایا

"وعلیکم السلام قبلہ۔ آہ یہ بوتلیں خیال سے رکھئے گا، ان میں سے ایک ذرا بہتی ہے۔" اور جمعدار نے پھر جال بُنا اور تو ڑا، سنگین بردار سپاہی دائیں جیب سہلاتا جیپ کے اندر کود گیا۔ جمعدار نے لپک کر سٹیرنگ سنبھالا اور بھوسلی جیپ اپنے بطن کے سیاہ خلا میں دو اور گہرے دھبوں کا اضافہ کر کے سلیٹی سڑک پر ایک دیوانے سانپ کی طرح پھنکارتے ہوئے رواں ہو گئی۔

پھریری

منیب کی نگاہیں جیپ کے اُگلے ہوئے غبار کے کثیف مرغولوں سے مجروح ہو کر لاری کی سمت پلٹیں، تو مسافر عقبی دریچی کی طرف لپک رہے تھے اور سپید ٹوپی والا بانکا فرنٹ سیٹ میں مال رکھ کر فارغ ہو چکا تھا، فیروز پوری چیزیں، گٹھریاں اور ڈبے پھر ایک بھُسبھُسا سا ٹیلہ بن چکے تھے اور تھانیدار صاحب اپنے خمکدۂ نخوت سے بھاپ کے بھبکارے چھوڑتے اُس کے قریب سے گزر رہے تھے۔

"صاحب، جمعدار سے کم از کم ان بدبختوں کو کفن دفن کے لئے دو چار روپئے ہی دلوا دیئے ہوتے" ایک چسٹر پوش مسافر نے تھانیدار صاحب کے فولادی پستول پر نگاہیں گاڑتے ہوئے کہا۔

"آپ ان کے اس قدر ہمدرد واقع ہوئے ہیں تو اتنے روپے خود ہی دے دیئے ہوتے ...... اور یہ اپنا چسٹر بھی اُتار دیجئے، ان سردی میں ٹھٹھرنے والے مصیبت زدوں کو......"

چسٹر پوش کی تھوتھنی لٹک گئی اور وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا لاری میں جا کودا اور پھر اس جوش کے ساتھ اُس نے لاری کے چوبی بنچ پر اپنے آپ کو پٹخا کہ سفید ٹوپی والے ملتانی بانکے کو قہقہے چھوٹ گئے۔

"قہ قہ قہ۔ بابو جی مفت میں پریشان ہو گئے، قہ قہ قہ، افسوس دُنیا کس قدر ناشناس ہے کہ اتنے اچھے بابو جی کو ڈی۔ ایس۔ پی بھی نہ بنا سکی۔"

"میں — "اور چسٹر پوش نے وہیں بیٹھے بیٹھے یوں تڑپ کر پہلو بدلا جیسے وہ غلطی سے کسی گرم گرم توے پر بیٹھ گیا ہو، "میں —"

"جی" تھانیدار صاحب کا نصف بالائی دھڑ ایک کٹھ پتلی کی طرح پیچھے کی طرف گھوما۔ "ڈی۔ ایس۔ پی سے شکایت کیجئے گا۔ ڈی۔ ایس۔ پی کوئی خدا نہیں ہے۔" اور ساتھ ہی تھانیدار صاحب نے بائیں انگشت شہادت کے ذریعے بڑے زور سے اپنے قلب کو ٹھونکا، "اور ڈی ایس پی کے سابق اسٹینو [illegible]

منیب الرحمٰن بی۔ اے، ایل ایل بی نے سوچا کہ تھانیدار صاحب نے سچ کہا، ان کا خدا تو خود اُن کا دل ہے اور پھر ایک ڈی۔ ایس پی تو واقعی خدائی کا اہل ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ وہ بچارا تو خود اپنے ایس۔ پی کا بندہ ہوتا ہے یا ان چمکیلی کاروں کا جو کبھی اُس کے دفتر کے سامنے آکر رکتیں تو قتل، اغوا، ڈکیتی اور بلوے کے مقدمات کی کئی فربہ اور عظیم الجثہ فائلیں ہمیشہ کے لئے منیب سے چھین لی جاتیں۔

"ادھر کے پیچھے چل، گاڑی سنبھال" تھانیدار صاحب کی للکار لبِ سڑک بینڈ پر بیٹھے ہوئے ڈرائیور پر قمچی کی طرح پڑی، اور وہ بگٹٹ بھاگتا ہوا سٹیرنگ والی سیٹ پر آن بیٹھا۔ منیب نے بھی تیزی کے ساتھ اپنا جسم لاری کے اندر پھینکا۔ دریچی بند کی، اخبار اٹھایا اور اواخر شام کی بڑھتی ہوئی خنکی کے پیش نظر اپنے بٹنوں سے عاری کوٹ کو شانوں کے قریب سے سونت سونت کر چھاتی پر جمع کرنے لگا۔ اس حرکت کے دوران میں غیر شعوری طور پر اس کا ہاتھ کوٹ کی اندرونی جیب میں داخل ہو گیا اور پھر بقدر چھ انچ نیچے جا کر کوٹ کی بیرونی سطح پر نکل آیا...... دفعتاً منیب نے پھر اُسی تیز دھار چیز کی رفتار محسوس کی لیکن اب یہ احساس اس کی پسلی کی بجائے اُس کے ذہن پر وارد ہوا۔ اور فیروز پوری پناہ گزین اپنا تعفن پاش وجود، اس کے جسم کی بجائے اُس کی ذہانت کے ساتھ بھڑاتا ہوا گزر گیا اور سرقہ اور کیسہ تراشی کے لاتعداد مقدمات کی ضخیم فائیلوں سے کھیلتے ہوئے منیب پر دو روپیہ ایک آنے کی اس رقم کا ضیاع ثابت ہو گیا جو پانچ روپے کے اس قرض کا بقیہ تھی جسے آج صبح اُس نے اپنے انصار عزیز کے ہاں سے روانہ ہوتے وقت میزبان کے متاسّل ہاتھوں سے باچشم اشکبار وصول کیا تھا۔ اسٹارٹر غرّایا، رُوک کا تیند واسکڑا اور لاری ایک دھچکے کے ساتھ رینگنے لگی۔

یہ دھچکا منیب کے لئے گویا کسی سینما ہال کے نمائش کار کا ایک میکانکی ٹھونکا تھا۔ جس کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں دھڑ دھڑا کر فلم کی ایک ریل کھل گئی اور دوڑتی ہوئی لاری کی قریبی دریچی سے دکھتی ہوئی ویراں فضاؤں کے ٹیالے فیتے پر منیب کی پھٹی پھٹی نگاہیں ذہن کے عکاس کی لاتعداد مصوّر تخلیقات دیکھنے لگیں...... ایک سلائیڈ پر اُس دن کا منظر لرز رہا تھا جب وہ اپنے دو کڑیل بھائیوں کو اپنے جھلسے ہوئے مکان کے ملبے تلے دفن کر کے اور والدہ اور تیسرے ننھے بھائی کی لاشوں کو امرتسر کے اعلیٰ سائنسی اور مہذّب "سول ہسپتال" کے ایک تازہ کٹے ہوئے لان پر بے گور و کفن چھوڑ کر خود تنِ تنہا محض بدن کے چار جاموں میں ایک لدے پھندے ٹرک پر سے پاکستان کے سب سے بڑے شہر لاہور میں اُترا تھا اور اُترتے ہی اُسے اُس سیاہ بلیزر کی ٹوپی والے فوجی ڈرائیور کی کڑی اور نفرت آمیز نگاہوں کا مقابلہ کرنا پڑا تھا جسے امرتسر سے چلتے دم اُس نے کوئی "انعام" دینے سے معذوری ظاہر کی تھی...... پھر اس سے اگلے روز "دار المہاجرین" کا وہ منظر اُس کے سامنے آن رُکا۔ جب تاروں سے ڈھلی ہوئی تُنک و سیمیں شب میں نکھرے ہوئے آسمان تلے انسانی غلاظتوں سے بٹے ہوئے میدان پر وہ اپنے دو وقت کے بھوکے اور پچکے ہوئے پیٹ پر ہاتھ پھیرتا دراز تھا۔ اُس روز دار المہاجرین کے طالب علم رضا کاروں نے ہڑتال کر رکھی تھی کیونکہ انھوں نے اپنے ہفتہ بھر کے اخراجات خوراک کے لئے جو نو صد روپے کا بل پیش کیا تھا اُسے کیمپ کے منتظمین نے ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اُس کے قریب ہی جیتھڑوں میں لپٹی ہوئی ایک ستّر سالہ بڑھیا پڑی رو رہی تھی، کیونکہ اُس کی جوان لڑکی اپنے رنڈوے بہنوئی کے ساتھ کہیں بھاگ گئی تھی اور اس کے بعد آج صبح ایک پردیسی اس کی گٹھری لے کر چمپت ہو گیا تھا۔

پھر ایک اور منظر صوبہ کے سول سکریٹریٹ کے وسیع و کشادہ ایوان کی اس کیفیت کو سامنے لے آیا۔ جب اُس کے واحد باشندہ نوکر شاہی افسر نے جس کا نام مردم شماری کے مطابق پنجابی مسلمانوں کا سا تھا، ایک ہیبت ناک اور عظیم الجثہ میز کے اُدھر سے اپنی ٹانٹ کے صاف و ہموار گنبد پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ایک سیسہ تن بچ کی سی پیوست و خشونت کے ساتھ اُس کی درخواست ملازمت کا فیصلہ سنایا تھا: "ہمارے دفتر میں ابھی تک ری فیوجی ز کے بارے میں نئے حکم نہیں آئے۔ اس لئے ہم مجبور ہیں کہ گورنمنٹ کی پہلی پالیسی کے مطابق پہلے پرانے فوجی کو جگہ دے (جگہ دے)"...... اور پھر باہر نکل کر دفتر کی غلام گردش میں منیب نے بیٹھی ہوئی خاکی وردی میں ملبوس ایک شخص کو دیکھا جو کھڑا ایک سوٹ پوش سے شکایت کر رہا تھا کہ ایمپلائمنٹ ایکسچینج والوں کی پرزور سفارش کے باوجود بڑے صاحب نے ملازمت نہیں دی۔ کہتے ہیں کہ پہلا حق پناہ گزینوں کا ہے...... پھر لاہور کی ایک اور شب اس کی نگاہوں کے سامنے عود کر آئی جب اُس نے اسمبلی چیمبر کے لان میں فروزاں بلب کے نیچے بتیسی نکالے ایک دوسرے کو کہنیوں سے ٹھوکے

ے دے کر باتیں کرتے دو سوٹ پوش نوجوان دیکھے تھے جن میں سے ایک نے بالکل نئی نیلٹ پہن رکھی تھی۔

"لیکن یار، تمھارے ایف۔اے ہونے کا کیا بنا؟ اس اسامی کے لئے تو اخبارات میں بی۔اے ایل ایل بی کی شرط تھی؟"

"واہ بھئی واہ، تم عجیب کینڈے کے آدمی ہو، بندۂ خدا بتایا جو ہے کہ ڈیپارٹمنٹ کے ڈائرکٹر میرے پھوپھا ہیں۔" نئی نیلٹ والے نے اپنی پتلون
بیوں میں ہاتھ گھسیڑتے اور گردن کو ایک طرف خم دیتے ہوئے کہا تھا...... پھر لاہور کے نو تعمیر اور نو متعفن ریلوے سٹیشن کی اس غلیظ شام کا منظر غیب
بیرت پر ابھرا جب وہ عمر رسیدہ عورتوں کے ایک کثیر التعداد قافلہ کے واحد "قوام" بزرگ کے سامان کو پناہ گاڑی میں ڈھونڈ رہا تھا۔ کیونکہ ایک سبز
ن اسلامی رضاکار نے اس خدمت کے لئے سولہ روپے طلب کئے تھے۔ منیب کی اس دردمندی سے متاثر ہو کر جب اس بزرگ "امیر کارواں" نے
راہ دل نوازی اُسے ملتان جانے کا مشورہ اس انکشاف کے ساتھ دیا کہ وہاں ابھی بحالی کے کافی سامان موجود ہیں تو منیب کو معاً اپنے رشتے کے خالو
چچا کا ایک ممیرا بھائی یاد آ گیا جو عرصے سے ملتان کے ایک قصبے میں معمولی تاجر کے طور پر مقیم تھا۔

چنانچہ منیب نے بھی اللہ کا نام لے کر سابق "اسباب" اور موجودہ "پناہ گاڑی" کے ایک بے پناہ ہجوم سے پُر چھکڑے کے بیرونی بڑھاؤ کی نسبتاً خالی
پر چھلانگ لگا دی تھی۔.... پھر ذہن کی عکاسی نے وہ منظر پیش کیا جب وہ ہونق سی صورت نکالے، شلوار کے پھٹے ہوئے پائچوں کو ٹخنوں پر اڑسے اپنے
ماراعزیز کے یہاں ملتان کے ایک عجیب و غریب قصباتی وضع کے مکان میں داخل ہوا تھا، اور اُس کا داخلہ دیکھتے ہی گھر کی بی بی کی پیشانی کی تیوریوں
ں مزید ایک کا اضافہ ہو گیا تھا...... پھر ایک اور سلائیڈ پر اُسے آج صبح کا وہ منظر نظر آیا جب وہ کانپتے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ اپنے انصار عزیز اور
زبان سے پانچ روپے کا ایک بھورا نوٹ قرض کے طور پر وصول کر رہا تھا اور میزبان کی بیوی مکان کے دوسرے گوشے میں کھڑی تیوری کی کڑی کمان چ
اتھ اپنے خاوند پر ناراضی کے تیر برسا رہی تھی...... پھر ضلع کے ڈی۔سی کے دفتر کا وہ کمرہ اُسے یاد آیا جہاں سُرخ بنات اور زرّیں حاشیئے کا کوٹ
نے ہوئے اردلی نے اُس کی زبان سے مدّعائے آمد کا ایک لفظ سُنے بغیر محض اس کا بڑھا ہوا خط اور پھٹی ہوئی میلی کچیلی شلوار دیکھ کر کہہ دیا تھا "صاحب
با درآج اور کل کسی بھی پناہ گزین سے نہیں ملیں گے کیونکہ انھوں نے ان دنوں زمینداروں اور بڑے آدمیوں کی کمیٹی بُلا رکھی ہے".... پھر لاریوں کے
ڈے کا وہ منظر طلوع ہوا جب اُس نے اپنے ہی ایک مشتنڈے بھک منگے کو ٹالنے کی غرض سے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک چیتھڑا نکالا تھا، اور ساتھ
ا اُس کی نگاہوں نے یہ دلدوز حقیقت بھانپ لی تھی کہ اس کے پلّو والی زنبیل میں اب صرف روپے روپے کے دو سبز نوٹ اور اکنّی کا ایک بھدّا سا
مسا پھٹا سکّہ باقی رہ گیا ہے اور اُس نے ندامت اور اندوہ کی ایک تیز رَو کو سینے کے اندر ہی نگلتے ہوئے وہ ایک آنہ فقیر کی غلیظ ہتھیلی پر رکھ دیا
ما اور چیتھڑے کو پھر اُسی طرح گانٹھ دے کر واپس کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا تھا.....

تب ناگہاں دریچے کے "پردۂ سیمیں" کے حیطۂ کل پر اُسی فیروزپوری پناہ گزین کا تیز دھار والا آلہ چھا گیا جو اگرچہ منیب نے بچشم خود نہیں دیکھا
ما تاہم اس کا وجود برحق تھا اور منیب کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ تیز دھار آلہ ٹھوس صورت پا کر اور جلو میں بے شمار مرئی و غیر مرئی تیز دھار آلات
ے اس کے ذہن پر حملہ آور ہو رہا ہو، اور پھر اس کیسہ تراش پناہ گزین کے متعفن تنفس کی غلیظ یاد ـــــ پناہ بخدا... منیب تلملا ہی تو گیا، پہلو بدل کر اُس
ے گود سے اخبار اُٹھایا، اور اُس کے کونے کھدروں میں اپنے دھڑ دھڑ جلتے ذہن کو آسودگی بخشنا چاہی، ایک غیر نمایاں گوشے میں اُسے ایک ننھا سا نخلستان
ظر آیا اور اُس کی نگاہوں کا سُلگتا ہُوا تار دھیمے سے اُس کے اندرون پیر گیا۔

"مہاجرین کی خدمت کے لئے
رضائے الٰہی کے طلبگاروں کی ضرورت!"

آغوش

اور معاً اُس کے شعور کا فعّال اور چابکدست مصوّر ذہن کے بسیط کینوس پر پھر مصروف کار ہو گیا... خیالات و تصوّرات کے بے انداز پیکر

صورت پذیر ہو کر اُبھرے اور منیب کی تخئیل کی دُھندلی اُفق پر رقص کناں ہو گئے ۔۔۔ اور اس کا لاشعور مُنہم شدہ معتقدات کو ایک ایک کر کے ۔۔۔ کیٹس، بائرن، شیلے اور ریکھلے کی بخشی ہوئی بھیدوں بھری، ملائم، نشیلی اور سُریلی رومانیت ۔۔۔ ویلز، شا اور سمرسٹ ماہم کی یبوست و ظرافت کے لطیف و ثقیل آمیزے ۔ روسو ۔ نطشے ۔ ہیگل اور مارکس کی ہولناک حد تک مادّیت اور تخصیت ۔ میکاولی کی افادی لیکن کھوکھلی وطنیت لا توسیت اقبال کی دلکشا آفاقیت اور پھر سب سے آخر میں ازلی وابدی حقائق کی وہ لازوال برقیت، جسے آج صبح پہلی بار اس نے تلاوت کے وقت چند بادام کاغذوں پر نورانی بجلیوں کے طور پہ تڑپتے ہوئے پایا تھا، جن کی تابانیوں نے اوہام و تشکیک کی تاریک گھٹاؤں کو ایک لبریز ذوق یقین کا ایسا سوا دِ نور بنا تھا جہاں سلیس لیکن جامع اصولوں کا غیر ارضی حسن فروزاں تھا ۔۔۔ اور یکایک منیب کے ذہن پر توحید کے عظیم و جلیل منارۂ نور کا انعکاس چھا گیا ۔۔۔! بصیرت کا سحاب غمگیں اسے چھٹتا ہوا محسوس ہوا، اور اس کی عمیق خلوص اور فطرتی شفافی سے بہرہ مند نگاہیں اپنے چاروں اطراف کی اشیا اور افراد کے ماند معنویت تلاش کرنے لگیں، ایک جھرجھری لے کر اس نے انہی مصفا نگاہوں سے خود اپنے مادی و روحانی سراپا کا جائزہ لیا اور وہاں لفظ "منیب" کی معنویت کو عنقا پا کر کانپ اُٹھا ۔۔۔۔۔

کچی سڑک کا جھولا جھولتی ہوئی لاری کے اندر بیٹھے ہوئے منیب کو یوں محسوس ہوا جیسے اُس کے مادی جسم کے ساتھ ساتھ اس کی روح کا لطیف و غیر مرئی د بھی متزلزل ہو رہا ہے ۔۔۔۔ اور اگرچہ یہ کسی نماز کا وقت نہ تھا لیکن منیب کے قلب میں بے اختیار کسی موذن کی ندا سننے کی خواہش پیدا ہوئی ۔ اس کی متجس نگاہیں بڑھتے ہوئے اندھیرے کی تاریک و دبیز چادر میں چاروں طرف گھوم گئیں، اور پھر پناہ گزین منیب کا سر آپ سے آپ جھک گیا ۔

لاری ایک دھچکے کے ساتھ پھر رکی، لیکن اب کے منزل آگئی تھی ۔

"لالۂ صحرائی"

غزل

گو عمر ترے حسن کے جلووں میں بسر کی — کم ہو نہ سکی تشنہ لبی ذوقِ نظر کی

اتنا بھی محبت میں نہ محسوس ہوا دوست — کانٹوں پہ گزاری ہے کہ پھولوں میں بسر کی

آپ آئے ہیں اور پرسشِ احوال کی خاطر — کیا بات ہے کیوں آپ نے تکلیفِ نظر کی

روتا رہا دل شام و سحر خون کے آنسو — خود دارِ محبت نے مگر آنکھ نہ تر کی

آپ آئے تو ہمراہ سحر آئی وگرنہ — صورت نظر آئی نہ شبِ غم کو سحر کی

ڈالی ہیں ترے حسن نے عالم پہ کمندیں — سوئی رہی تقدیر مرے ذوقِ نظر کی

سو بار بھلایا تجھے سو بار کیا یاد — اس طرح بھی تسکیں نہ ہوئی قلب و جگر کی

دنیا نے سنا آکے مرے غم کا فسانہ — تو نے نہ مرے حالِ پریشاں پہ نظر کی

آنے نہ دیا حرف طفیل عشق پہ اپنے
جس طرح بسر ہم سے ہوئی ہم نے بسر کی

طفیل ہوشیار پوری

واردات

رات بھر اُن کا انتظار رہا
رات بھر گاڑیاں گزرتی رہیں
وہ کوئی دم میں آئے جاتے ہیں
راہیں سرگوشیاں ہی کرتی رہیں

ایک اُمیدِ بازدید جو تھی
دل کبھی یاس آشنا نہ ہوا
کب یہ سمجھے وہ دُور ہیں ہم سے
کب انھیں سامنے نہیں پایا
رات بھر میں نے اُن سے باتیں کیں
رات تک میرے پاس تھے گویا
ہونٹ' رخسار' کاکلیں' باہیں
ایک اک چھُو کے دیکھ سکتا تھا

پڑگیا سست رات کا جادو
دیکھتے دیکھتے سماں بدلا
ہولے ہولے سرک گئے تارے
چاند کا رنگ پڑ گیا پھیکا
اور پھر مشرقی جھروکے سے
صبحدم آفتاب نے جھانکا

در پہ باہر کسی نے دستک دی
(ڈاکیا ڈاک لے کے آیا تھا)
ایک دو ہی تو لفظ تھے خط میں
کیا پڑھا' کیا ہوا' نہ جانے کیا
اب سکوں آشنا ہیں دیدہ و دل
آج وہ سلسلہ بھی ختم ہُوا
اب کوئی کس کا راستہ دیکھے
اب کرے انتظار تو کس کا

وہ حسیں ہونٹ وہ حسیں آنکھیں
پھُول سا جسم' چاند سا چہرہ
عنبریں زلفیں' مخملیں باہیں
آج تک جن کا "لمس" باقی تھا
اب فقط اُن کی "یاد" باقی ہے
لُٹ گیا عشق کا سر و ساماں
ارضِ اُمید ہوگئی ویراں
اُس کی اک رُوداد باقی ہے
ایک اُجڑا سواد باقی ہے

ابنِ انشا

غزل

مرے نصیب کئی مہوشوں کی چاہ رہی — تمام عمر ملاقاتِ مہر و ماہ رہی

اجل کے داغ سے محفوظ ہے جمال اُس کا — وہ دل کہ جس کو ترے دل سے رسم و راہ رہی

حیات و موت کی اس کشمکش میں بھی اے دوست — نظر بلند رہی، اوج پر نگاہ رہی

اُٹھائے ناز مری بیکسی کے شاہوں نے — مری خزاں کو بہاروں پہ دستگاہ رہی

کہاں پناہ ملے گی، کہاں اماں لوں گا — اگر یہی روشِ حُسن بے پناہ رہی

زمانہ آج اُسے گرچہ کہکشاں کہہ دے — کبھی تو رہگذرِ یار کجکلاہ رہی

رہا کیے در و دیوار گوش بر آواز — تمام رات مری چشم رُو براہ رہی

تری نظر سے برستے رہے حسیں انوار — مری نگاہ میں دنیا مگر سیاہ رہی

ہمارے عشق کی معصومیت پہ اے طاہر
کسی کے حُسن کی پاکیزگی گواہ رہی

جعفر طاہر

سہارا

آج وہی تارے، وہی دو تارے پھیلے ہوئے آسمان کی وسعتوں میں ٹمٹماتے ہوئے بہت سے تاروں میں سے بڑھتے معلوم ہو رہے تھے۔ آج اُس نے اُنھیں اپنا سہارا جانا اور چارپائی پر لیٹے لیٹے انھیں چمکتے دیکھتی رہی۔ کسی کسی وقت یُوں معلوم ہوتا جیسے وہ تارے بہت دُور چلے گئے ہوں، اور کبھی یوں نظر آتا جیسے دُھندلا گئے ہوں۔ اُن کی دُھندلاہٹ سے معلوم ہوتا کہ آنکھیں پُرنم ہیں۔ آہیں اُس کے سینے سے اُٹھتیں لیکن وہ انھیں روک لیتی، کہیں آس پاس سوئے ہوئے بھائی بہن جاگ رہے ہوں تو سُن نہ پائیں۔ وہ آنکھوں کو زور زور سے ملنے لگتی لیکن تارے کبھی کبھی دُھندلا ہی جاتے۔

کئی ماہ پہلے اُس نے ان ہی تاروں کو حمید اور وحید کے روپ میں دیکھا تھا، جیسے وہ دونوں اس کی دنیا میں چمکتے تھے۔ یہ بھی آسمان کی گھنی دُنیا میں چمکتے رہتے تھے۔ اُس نے بارہا کوشش کی ایک کو دوسرے سے زیادہ چمکتا دیکھنے کی مگر وہ دونوں یکساں آب و تاب سے فضا میں معلق رہتے۔ کئی دفعہ تو اس نے بڑی دیر تک ایک ہی پر ٹکٹکی باندھے رکھی اور پھر اُسے چھوڑ کر دوسرے پر نظر جما دی۔ اسے خیال رہتا کہیں ایک سے زیادہ دوسرے کو نہ دیکھتی رہے کیونکہ وہ دونوں قریبی رشتے دار تھے اور اکثر اکٹھے اُن کے ہاں آجاتے تھے۔ جب بھی وہ دونوں آتے وہ یا تو انھیں چھوڑ کر باہر نکل جاتی یا بیٹھی دونوں کی طرف ایک سا التفات ظاہر کرتی اور پھر دونوں کا موازنہ کرتی رہتی۔

دونوں کو سماجی نظام سے اختلافات تھے اور انسانی کمزوریوں اور بیچارگیوں سے ہمدردی۔ جب کبھی وہ پورے انہماک سے تبادلۂ خیالات کر رہے ہوتے اور ایسی باتیں کرتے جو اُن کے دل سے نکلی ہوئی ہوتیں تو وہ اُن میں کھو جاتی اور انھیں صحیح سمجھ کر تسلیم کر لیتی، اس طرح وہ ان کے بہت قریب آجاتی۔ لیکن جب وہ اس صورتِ حال کا حل تلاش کرتے تو ان کی رائے دو سمتوں میں چلی جاتی۔ حمید اس کا علاج سیاست میں تلاش کرتا: "سیاست سے ایسا ماحول پیدا کیا جا سکتا ہے جس سے تمام سماجی الجھنیں اور رکاوٹیں دُور ہو سکتی ہیں۔ سیاسی لیڈر ایسی سکیمیں تیار کر کے انھیں قوانین کی صورت میں پیش کر سکتے ہیں اور سب سماجی خرابیاں دُور ہو سکتی ہیں۔"

لیکن وحید اس کو ادب کا کام بتاتا اور ادب میں بھی افسانے کی صنف کو بالخصوص اس قابل سمجھتا کیونکہ افسانہ تھوڑا لکھے پڑھے لوگوں کو بھی متاثر کر سکتا ہے اور ان خامیوں کو دور کرنے کے لیے عوام کے دل تک پہنچنا زیادہ ضروری بھی تھا۔ اس کے علاوہ حمید کا زیادہ باتیں کرنا اور متبسم رہنا اور اس کے مقابلے میں وحید کا سنجیدہ اور کم گو ہونا ان دونوں کو تھوڑا سا مختلف کر دیتا۔

ایک دن ــــ اُس نے یکایک محسوس کیا کہ ایک تارے کی چمک مدھم پڑ گئی ہے اور وہ آسمان پر چھائے ہوئے کالے بادلوں کی زد میں آ رہا ہے، ہوا ہولے ہولے چل رہی تھی، کالے بادل مختلف شکلیں اختیار کرنے لگے۔ بادل پھیلتے رہے، انھوں نے کئی شکلیں اختیار کیں، انسانوں کی، جانوروں کی، پہاڑوں کی اور پھیلے ہوئے روئی کے گالوں کی اور دُھند سی آسمان پر چھا گئی، اُس دُھند میں سے دُوسرا ستارہ اُسے دکھائی دیتا رہا۔ دیکھتے دیکھتے اُسے دن بھر کی گزری باتیں پھر ستانے لگیں۔ آج صبح صبح اس کی چھوٹی پھوپھی آئی تھی۔ حسبِ معمول شور مچاتی ہوئی، اُس نے آتے ہی اپنی دھنسی ہوئی آنکھیں نکال کر، نتھنے پھلا کر، اور اپنا گورا چٹا چہرہ سُرخ کر کے اُس کی امّی سے پوچھا تھا۔ "بھابی، بھائی کہاں ہیں؟" اور اُس کی امی نے چولھے کے آگے بیٹھے بیٹھے ہنس کر کہا تھا "نہ علیک نہ سلیک، نہ سلام نہ دعا، صبح صبح تمھیں بھائی کی کیا ضرورت پڑ گئی؟"

اور اُس نے صرف سنجیدگی ہی سے نہیں بلکہ سختی سے بھی کہا تھا۔ "تم بتاؤ تو سہی کہاں ہیں، ابھی ضرورت کا بھی پتہ چل جائے گا۔"

اُس کی امّی چپ ہو رہیں اور اُس کے ابا کے کمرے کی طرف اشارہ کر دیا، چھوٹی پھوپھی ادھر چلی گئی اور تھوڑی دیر بعد اُن کے ابا نے باہر آکر

امی کو بلایا اور وہ چولھا اُس کے حوالے کر کے اندر چلی گئیں۔

دن بھر امیّ نے اُس سے کھُل کر بات نہ کی، امی کی سسکیاں اور آہیں اُس نے کئی بار سنیں، ابّا نے جب بھی اُسے دیکھا اُن کے ماتھے پر تیوری آ گئی اور بھائی بے دلی سے باتیں کرتے رہے، وہ حیران تھی، گھر کا رویّہ کیوں ایک دم بدل گیا تھا؟

اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا، وہ سوچتی، سوچتے سوچتے تنگ آ جاتی تو جھنجلا جاتی، میں نے کیا کر دیا ہے۔ چھوٹی پھوپھی کو میں نے کچھ نہیں کہا ابا کو، امی کو، بھائیوں کو بھی کچھ نہیں کہا، اسے خیال آتا شاید حمید اور وحید کی کوئی بات ہو، لیکن اُن کے متعلق تو اُس نے قطعاً کوئی بات کسی سے نہ کہی، پھر اُس نے سوچا، شاید امیّ کی طبیعت ٹھیک نہ ہو۔ اُس نے امیّ سے پوچھ ہی لیا ــــ "امیّ آپ اُداس کیوں ہیں؟"

امیّ کی لال لال آنکھوں نے اُسے دیکھا۔ آنکھوں کی سُرخی سے پتہ چلتا تھا کہ وہ روتی رہی ہیں، امیّ چپ رہیں۔

اُس نے پھر پوچھا "امی کیا بات ہے؟"

انھوں نے چولھے میں لکڑیاں ٹھیک کرتے ہوئے کہہ دیا۔ "کچھ نہیں۔"

لیکن اُن کی آواز میں رقت تھی، وہ برداشت نہ کر سکی، اُٹھی اور اپنے کمرے میں پہنچ کر پلنگ پر اوندھے مُنہ ہو کر خوب روئی، روتی رہی۔ اُسے کمرے میں رکھی ہوئی سب چیزیں، الماری، سنگار میز، پلنگ، اپنی جگہ سے اُکھڑے اُکھڑے معلوم ہوئے، وہ پریشان بیٹھی سب کچھ دیکھ رہی تھی کہ حمید دروازے میں نمودار ہوا۔ اس کا چہرہ بھی اُترا ہوا تھا اور وہ حواس باختہ معلوم ہو رہا تھا۔ اُس نے آتے ہی پوچھا "کیا یہ سب کچھ سچ ہے؟"

وہ بھڑک اُٹھی "کیا سچ ہے؟" اور پھر رونا شروع کر دیا۔

وہ آگے بڑھا "میں نے جو کچھ سُنا سب ٹھیک ہے؟"

وہ سسکیاں لیتی رہی، حمید نے پھر اپنا سوال دُہرایا۔

وہ اُٹھ بیٹھی "آپ کیا پوچھ رہے ہیں؟"

"تم نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا، تمھیں وحید کا زیادہ خیال ہے۔" حمید نے انتہائی بے چارگی سے پوچھا۔

وہ سنبھل گئی "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔"

"تم نے اُسے خطوط بھی لکھے ...." وہ فقرہ پورا نہ کر سکا۔

"خطوط؟" حیرت سے اُس کا مُنہ کھل گیا "کیسے خطوط، کون سے خطوط؟"

وہ چپ رہا۔ اُس نے پھر پوچھا "آپ کون سے خطوط کا ذکر کر رہے ہیں؟"

"مجھ سے نہ چھپاؤ۔ اب تو سب جان چکے ہیں۔" حمید زیادہ پریشان دکھائی دینے لگا۔

"لیکن میں نے کسی کو کبھی کوئی خط نہیں لکھا، آپ کن خطوط کا ذکر کر رہے ہیں۔" لفظ اُس کی زبان سے بے تکلف نکلے جا رہے تھے۔ وہ حیرت حمید کے چہرے پر ٹکٹکی باندھے تھی۔

"وہ خطوط جو اس وقت تمھاری چھوٹی پھوپھی جان کے پاس ہیں اور تم نے وحید کو لکھے ہیں۔"

"میں نے کوئی خط نہیں لکھا۔ میں کچھ نہیں جانتی، آپ مجھے ٹھیک ٹھیک کیوں نہیں بتاتے۔" اس نے ہاتھوں میں مُنہ چھپا لیا اور رونے

"تم نے کوئی خط نہیں لکھا؟" حمید کچھ حیران اور کچھ مضطرب سا دکھائی دینے لگا۔

"نہیں نہیں ــ!" وہ تڑپ کر بولی،

"تو وہ خطوط جو وحید کی الماری سے نکلے ہیں اور جن پر تمھارا نام لکھا ہے کس کے ہیں؟" حمید کا اضطراب خوشی میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔

"مجھے معلوم نہیں، میں نے کبھی کسی کو کوئی خط نہیں لکھا۔" وہ رو رہی تھی۔

حمید ذرا آگے بڑھا اور بولا "کیا یہ سچ ہے؟"

"آپ کو مجھ پر یقین نہیں تو میں کیسے یقین دلا سکتی ہوں،" وہ روئے جا رہی تھی۔

حمید نے اُس کے جھکے ہوئے سر کو اپنے ہاتھوں پر اُٹھایا اور اطمینان سے کہنا شروع کیا۔ "مجھے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں۔ مجھے تم پر اعتماد ہے یقین ہے۔ اب آنسو پونچھ لو۔ رونا بند کرو، پگلی کیوں ہو رہی ہو۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ـــ "امی صبح سے مجھ پر ناراض ہیں، ابا قہر آلود نظروں سے دیکھتے ہیں، میں نے کیا قصور کیا ہے، کیا ہو گیا ہے مجھ سے" حمید اسے کتنی ہی دیر دلاسا دیتا رہا، وہ ابا، امی کی ناراضی اور بھائیوں کے رویے کا خیال کر کے روتی رہی۔ وہ پریشان تھی، بیٹھے بٹھائے کسی نے اتنا بڑا الزام اُس پر لگا دیا۔ ایسی بات جس کا اسے گمان تک نہ تھا۔ دن بھر وہ سب کے ڈر سے کچھ نہ کہہ سکی اور رات کو تاروں کو دیکھتی ہوئی سسکی لینے کو ترستی رہی، کہیں بھائی پاس ہوں تو سُن نہ لیں۔

اس دن کے بعد سے حمید کا آنا جانا زیادہ ہو گیا۔ کبھی اُس کی امی کو اپنے گھر کا کوئی پیغام دینے آ جاتا کیونکہ وہ اس کی پھوپھی ہی تو تھی، اور کبھی اس کے بھائی سے ملنے چلا آتا اور پہروں بیٹھا باتیں کرتا رہتا۔ اُسے حمید کی باتوں میں دلچسپی تو تھی اور اس کے پاس بیٹھ کر محو ہونا چاہتی تھی لیکن جب بھی وہ آتا وحید کا سنجیدہ چہرہ اُس کی نظروں میں گھومنے لگتا۔ اُس کی گفتگو اور شستہ بحث یاد آ جاتی، اور پھر خطوط اور ابا امی کی ناراضی ایک خوف سا پیدا کر دیتی۔ گھر والے اُس سے ملنے کو بُرا تو نہیں سمجھتے تھے لیکن خود اسے اس واقعہ کے بعد سے ڈر لگتا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ پھر اُس کے متعلق ایسی کوئی بات ہو اور پھر وہی پریشانی عود کر آئے مگر جب وہ دونوں اکیلے میں ملتے تو اس کے ہونٹ بے اختیار متبسم ہو جاتے اور وہ مسکراتا ہوا اُس سے طبیعت کا حال پوچھ لیتا۔ حمید کے چلے جانے پر اسے محسوس ہوتا جیسے کچھ چھن گیا ہے۔ وحید کے ساتھ اُس کی پُرلطف صحبتیں، اور وحید کا طرزِ تکلم اس کے لئے بیگانہ ہو گیا ہے۔ اُسے دکھ ہوتا آخر وہ یہاں کیوں نہیں آتا۔ شاید اس معاملے میں اسے بھی کچھ سرزنش کی گئی ہو۔ قصور کس کا ہے؟ وہ سوچنے لگتی۔

حمید کا آنا جانا کم ہو گیا، وہ ہر روز اس کا انتظار کرتی، وہ نہ آتا تو اس کے ذہن میں طرح طرح کے خیال آتے، کبھی وہ سوچتی "نہ مجھ سے ناراض ہو گئے ہوں"۔ کبھی ڈرتی "کہیں پہلی سی کوئی بات نہ ہو گئی ہو" پھر جب امی اور ابا کی طرف غور سے دیکھتی اور معلوم ہوتا کہ اُن میں کوئی تبدیلی نہیں تو چپ ہو رہتی۔ چند دن بعد اُس نے محسوس کیا کہ ابا اس میں زیادہ دلچسپی لینے لگے ہیں اور امی سے اکثر کہتے ہیں "اسے چولھا دے دیا کرو۔ سارا کام سنبھالنا ہی تو ہے۔" اور جب بھی کھانا کھانے بیٹھتے تو کہتے "میں تو اپنی بیٹی کے ہاتھوں کا پکا ہوا کھاؤں گا، دیکھوں تو بھلا کیا پکاتی ہے۔"

وہ اس تبدیلی کو سمجھنے سے قاصر انھیں کھانا کھلانے میں محو ہو جاتی اور خوش ہوتی کہ انھیں وہ بات بھول سی گئی ہے جس کے بعد وہ اتنی قہرآلود نظروں سے اُسے دیکھا کرتے تھے۔ حالانکہ اس میں اُس کا کوئی قصور نہ تھا ـــــ بعض دفعہ اُسے خیال آتا، انھوں نے مجھ سے پوچھا تک نہیں، وہ خط کس کے ہو سکتے تھے، میں نے تو وحید کو خط نہیں لکھے اور لکھتی بھی کس لئے، پھر خط اُس کی الماری میں ـــــ ابا نے بالکل نہ سوچا، چھوٹی پھوپھی کو کسی کو بھی خیال نہ آیا، مجھ سے پوچھ ہی لیتے اور یوں ہی الزام دھر دیا، وحید ایسے خاموش اور شریف طبع کی الماری میں کس کے خط ہو سکتے تھے، یہ ایسی اُلجھن تھی جسے وہ سُلجھا نہ پاتی تھی۔

اور آج صبح جب گھر میں کوئی نہ تھا، وہ اپنے کمرے میں چیزوں کو ٹھیک کرنے میں مصروف تھی، حمید آیا اور آتے ہی کہنے لگا ـــــ "کیوں بھئی ہمارے یہاں چلو گی؟"

"کیا بات ہے؟" اس کے ہاتھ الماری میں کپڑے رکھتے ہوئے رُک گئے اور اُس نے سر اُٹھا کر حمید کو دیکھا اس کی آنکھوں میں ایسی چمک پہلے کبھی

"بات تو کچھ نہیں، میں پوچھ رہا ہوں، ہمارے یہاں چلنا پسند کرو گی۔" وہ مسکرا رہا تھا۔

"پسند تو میں کرتی ہوں، اور آپ کو معلوم ہے میں جا کر رہتی بھی ہوں کئی کئی دن۔۔۔ میں سمجھی کوئی خاص بات ہے جو آپ آج خاص طور پر مجھے کہنے آئے ہیں۔"

وہ شوخ ہو گئی اور کپڑے الماری میں رکھنے لگی۔ حمید سنجیدہ ہو کر بولا، اب تمھیں ہمیشہ کے لئے ہمارے یہاں چلنا ہوگا، کہو پسند کرو گی؟"

"ہمیشہ کے لئے؟" حیرانی اور شرم سے وہ چپ ہو گئی۔ حیرانی اس لئے کہ حمید پہلے کبھی اتنا بے باک نہ ہوا تھا۔ شرم سے اس کی نظریں جھک گئیں۔

"حیران کیوں ہوتی ہو؟"

وہ چپ رہی۔

"ارے تم تو جیسے رونے لگیں۔ کیوں ہمارے ہاں جانا پسند نہیں تمھیں۔۔۔" اور جواب کا انتظار کئے بغیر حمید اتنا کہہ کر "اچھا اب ایک روز تمھیں لینے آؤں گا، اور پھر تم میری ہو گی اب میں چلتا ہوں۔" جلدی سے باہر نکل گیا۔

وہ مبہوت کھڑی رہی اس کے ذہن میں بار بار حمید کے الفاظ گونجتے "اب تمھیں ہمیشہ کے لئے میرے ہاں چلنا ہوگا" پھر "ہمارے ہاں چلنا پسند کرو گی" اور پھر "اچھا اب۔۔۔ ایک روز تمھیں لینے آؤں گا" اور پھر "تم میری ہو گی"۔۔۔ "تم میری ہو گی" ایک کپکپی کے ساتھ ماحول میں پھیل جاتا اور وحید کا مجسمہ سامنے آ جاتا۔ وہ سوچتی وحید اگر یونہی آتا تو میں اُسے کیا جواب دے سکتی۔ حمید کے لئے ابا امی کہاں تک راضی ہیں؟ اسے معلوم نہ تھا مگر ان کی مرضی کے بغیر یہ ہو کیسے سکتا تھا۔ لیکن حمید یہاں کیسے آ گیا، اگر کسی نے دیکھ لیا ہو تو؟۔۔۔ وہ گھبرا گئی،

وہ کتنی دیر وہاں کھڑی رہی اسے معلوم نہ تھا، لیکن سارا دن اسے گھر کے کام کاج کے دوران میں وہ واقعہ یاد آ جاتا، تو وہ جھٹ امی کی طرف دیکھتی کہیں وہ دیکھ تو نہیں رہیں اور کہیں انھوں نے وہ آواز تو نہیں سنی "تم میری ہو۔۔۔!" اس پر خوشی اور حیرت سارا دن سوار رہی اور اپنے ہی خیالات میں کھوئی رہی۔ شام کو اسے محسوس ہوا کہ آج پھر ابا اور امی کے تیور بدل گئے ہیں، وہ گھبرائی کہیں کسی نے دیکھ نہ لیا ہو، حمید بھی تو ایسے میں اکیلا چلا آیا اُسے معلوم ہی تو نہ تھا اگر معلوم بھی ہوتا تو کیا کر سکتی تھی۔ اسے چلے جانے کو کیسے کہتی۔ اس نے اچھا ہی تو کیا آ گیا، ملنے کو جی بھی چاہ رہا تھا، لیکن وحید کبھی نہ آیا، اس الزام کے بعد حمید ہی اُس کا سہارا تھا۔ اُس نے فیصلہ کر لیا اب وحید کے متعلق کچھ نہ سوچا کروں گی اور حمید پر اپنی توجہ مرکوز کر دوں گی، مگر ابا امی آج پھر کیوں ناراض ہو گئے، شاید انھوں نے ہم دونوں کو اکٹھا دیکھ لیا ہے اب وہ امی سے کیا پوچھے؟ کیسے پوچھے؟ اُس نے محسوس کیا کہ آج اُس نے پھر ابا امی کو کوئی صدمہ پہنچایا ہے، وہ اُن سے پرے پرے رہنے لگی اور کافی رات تک وہ سونے کے لئے نہ اُٹھی تو امی نے اُس سے پوچھا

"تم سوتی کیوں نہیں۔۔۔؟"

"یوں ہی۔ میں ابا کا انتظار کر رہی ہوں۔ انھوں نے ابھی کھانا نہیں کھایا۔"

امی نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم جاؤ، میں انھیں کھانا کھلا لوں گی، وہ مردانے میں جانے کتنی دیر بیٹھیں۔"

وہ اوپر سونے کے لئے چلی آئی۔ چارپائی پر لیٹے لیٹے پھر انھی دو ستاروں کو دیکھنے لگی، جن میں سے ایک میں اُسے اپنا سہارا مل رہا تھا اور دوسرا اُس کی دنیا سے باہر ہو کر اُس سے دُور ہوتا جا رہا تھا، اُسے پھر حمید کی سلجھی ہوئی باتیں اور اُس کا اسے سنبھالا دینا یاد آ گیا، اتنے میں نیچے سے کھسر پھسر آوازیں آنے لگیں، وہ اوندھے منہ ہو کر باتیں سننے لگی، ابا اور امی باتیں کر رہے تھے۔

"میں نے تو اُن سے کہا تھا، لیکن وہ نہیں مانتے۔" ابا کہہ رہے تھے۔

"لیکن اس میں لڑکے کا کیا قصور ہے، پڑھا لکھا ہے، اللہ رکھے کماتا ہے، شریف ہے اور ہمیں کیا چاہیئے۔"

"مگر انھیں تو ایک ہی بات پر اعتراض ہے، وہ کیسے دُور ہو۔" ابا اکتائے سے تھے۔

"لڑکا تو شریف ہے" امی نے زور دیا۔

"شریف بھی ہے، خاندان سے بھی ہے، لیکن چچا کہہ رہے تھے آخر اُسی ماں کا بیٹا ہے جو شادی سے پہلے بازاری تھی۔"

"مگر اب تو گھر ہی میں رہنے لگی ہے اور کبھی اُس نے کوئی بات ایسی نہیں کی جس سے بازاری ہونے کا شبہ بھی ہو سکے۔" امی نے کہا۔

"تو بتاؤ میں کیا کروں؟ میں مانتا ہوں جو کلنک کا ٹیکہ ہمیں لگا تھا وہ بھی دُھل رہا ہے، لیکن چچا کہتے ہیں یہ رشتہ نہیں ہونے دوں گا، بازاری کا لڑکا نہ جانے کب کیا گل کھِلانے لگے، اور میں خاندان والوں کی رائے کیسے رد کر دوں۔" ابا غصّے میں آگئے،

اب وہ سمجھ گئی، اُس نے کروٹ لی اور انہی دو ستاروں کو دیکھنے لگی، وہ کبھی ایک کو اور کبھی دوسرے کو دیکھتی رہی اور کئی باتیں اُس کے ذہن پر لگاتی رہیں، اُسے معلوم نہ ہو سکا وہ کیا سوچ رہی ہے۔

"لیکن دونوں ستارے تو میرے ہی ہیں، انھیں تو مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔" اُس نے لمبی آہ بھری، ستارے دُھندلا گئے اور آنکھیں مل کر کوشش کرتی رہی کہ وہ صاف دکھائی دینے لگیں۔

اختر رضی

غزل

یوں بیٹھے بیٹھے تیرا کرم یاد آگیا — گویا علاجِ کثرتِ غم یاد آگیا

جب بھی کسی خوشی نے کیا اپنا التفات — گزرا ہُوا زمانۂ غم یاد آگیا

پھر اُٹھ رہی ہے میری طرف آپ کی نظر — کیا اور کوئی تازہ ستم یاد آگیا

بھولا ہُوا تھا دیر سے آدابِ بندگی — خوش ہوں کہ تیرا نقشِ قدم یاد آگیا

ہنستے ہوئے گلوں کو جگر چاک دیکھ کر — افسانۂ وجود و عدم یاد آگیا

گھر سے چلا تھا شیخ سوئے میکدہ مگر — ظالم کو راستے میں حرم یاد آگیا

مضطر حیات چھوڑنے والی تھی میرا ساتھ

ناگاہ دونوں کا کرم یاد آگیا

مضطر اکبرآبادی

اوراب......؟

کبھی وہ عہدِ فسوں ساز تھا کہ جامِ حیات　　ترے جمال کی مئے سے مہِ منور تھا
تری جمیل محبت کے فیض رنگیں سے　　مری ہر ایک نظر میں شفق کا منظر تھا

۲

تری بہارِ جوانی کی اوٹ میں چھپ کر　　جہاں کو پیکرِ رنگ و شمیم سمجھا تھا
مقامِ دل کو ترے التفاتِ پیہم سے　　گلاب و لالہ و گل کی حریم سمجھا تھا

۳

خیال و فکر و تخیّل کے عرش بوس محل　　ضیائے انجم و مہتاب سے فروزاں تھے
نشاط و کیف و طرب کے حسین افسانے　　برنگِ خوابِ شگفتہ نظر میں رقصاں تھے

۴

گزر چکا ہے وہ عہدِ طرب نواز اور اب　　حریمِ دل کئی رنگینیوں کا مدفن ہے
خیال و فکر کے بے رنگ و آب محلوں میں　　فقط مہیب سی تاریکیوں کا مسکن ہے

۵

غبار بن کے پریشاں ہیں رہگزاروں میں　　فسردہ پتیاں میرے گلِ تمنا کی
اُجڑ چکا ہے گلستان آرزوؤں کا　　نظر پہ بھاری ہے شامِ خزاں کی ویرانی

۶

بدلتے وقت کی رفتارِ تیز گام کے ساتھ　　بدل گیا ہے کچھ اس طرح زیست کا نقشا
کہ دل کو رات کی غمگین خلوتوں میں بھی
گزشتہ عیش کا احساس تک نہیں ہوتا

(حلقہ اربابِ ذوق دلی میں پڑھی گئی)

ضمیر اظہر

مطبوعات

کشمیر

چراغ حسن حسرت - کشمیر کا مسئلہ اس وقت بین الاقوامی حیثیت اختیار کر گیا ہے اس کے تسلی بخش حل پر پاکستان اور ہندوستان کی دونوں مملکتوں کے آئندہ تعلقات کا انحصار ہے - زیر تبصرہ کتاب میں کشمیر کی تاریخ پر ایک سیر حاصل نظر ڈالی گئی ہے اور آزاد کشمیر تحریک کے پس منظر کو اُجاگر کرکے موجودہ حالات کو سامنے لایا گیا ہے -

کتاب کا انداز نہایت دلکش اور دلنشین ہے، چراغ حسن حسرت اُردو کے کہنہ مشق ادیب اور صحافی ہیں اور پونچھ سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے کشمیر کے مسائل میں اُن کا انداز نہایت ہمدردانہ ہے -

جلد پوش نہایت اچھا ہے اور ایک ایسے کشمیری کی تصویر سے مزین جو ڈل میں کھڑا شاید اپنے سائے کو دیکھ رہا ہے - کتابت، کاغذ اور گٹ اپ نہایت اچھا ہے ضخامت ۱۴۰ صفحات قیمت ۲/۸/- ملنے کا پتہ :- قومی کتب خانہ ریلوے روڈ - لاہور

حماقتیں

شفیق الرحمٰن ، اُردو کے افسانوی ادب میں شفیق الرحمٰن نے ایک مقام حاصل کر لیا ہے - آپ کا انداز نہایت شگفتہ ہے اور ہنسی ہنسی میں بڑی بڑی باتیں کہہ جاتے ہیں - کھلنڈرا شفیق الرحمٰن اب کافی متین ہو گیا ہے، یہ عمر کا تقاضا ہے اور تجربات کا نتیجہ - وہ دیس دیس گھوم آیا ہے اس لئے اب وہ زندگی کے بیتے دنوں کی یاد تازہ کرکے "زندگی کا فلسفہ" بیان کرتا ہے - حماقتیں دراصل زندگی کے وہ پہلو ہیں جن کی یاد عمر بھر نہیں بھولتی ——— "نیلی جھیل" اور "بے بی" یہ دونوں کہانیاں بہت زیادہ بلند ہیں -

یہ کتاب اُردو ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہے -

کتابت، طباعت اور گٹ اپ نہایت عمدہ قیمت ۲/۸/- ملنے کا پتہ، مکتبہ جدید، انارکلی، لاہور

ہندوستان کی قومی زبان اور رسم الخط

پروفیسر محمد معین الدین دردائی - اُردو کی ترقی اور ترویج کے سلسلے میں یہ کتاب ایک نہایت اہم کڑی ہے - پروفیسر صاحب ایک عرصے تک انجمن ترقی اُردو (ہند) میں ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے کام کرتے رہے ہیں اور ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کی رہبری اور مشوروں سے آپ نے کافی تحقیقی کام کیا ہے - یہ کتاب ایک تحقیقاتی مضمون ہے جس میں رسم الخط کے متعلق مواد کا کافی ذخیرہ ہے - اُردو رسم الخط کا مسئلہ بہت اہم ہے اس لئے یہ کتاب اس سلسلے میں دلچسپی سے پڑھی جائے گی -

کتابت، طباعت اور گٹ اپ اچھی ہے - کتاب مجلّد، ضخامت ۶۷ صفحات قیمت ایک روپیہ دو آنے

ملنے کا پتہ :- طیب احسن اینڈ برادرس اسلامیہ بک ڈپو آرہ

گھروندے

عرش تیموری، یہ کتاب چھ ڈراموں کا مجموعہ ہے جس میں دو ریڈیائی ڈرامے ہیں - دو ڈرامے محض پڑھنے جانے کے لئے لکھے گئے ہیں اور دو ڈرامے انگریزی سے ماخوذ ہیں -

اُردو میں ڈراما بہت کم لکھا جا رہا ہے جس کی وجہ سٹیج کا موجود نہ ہونا ہے - بہت تھوڑے ریڈیو ڈرامے ایسے ہوں گے جو آسانی سٹیج ڈرامے میں تبدیل کئے جا سکیں، اس لئے جو بھی ڈرامے لکھے جاتے ہیں اُن میں سٹیج کا عنصر بہت کم ملتا ہے یا وہ اس لحاظ سے ناقص

ہوتے ہیں۔ بہرحال ادب کی اس صنف کو زندہ رکھنے کی یہ انفرادی کوششیں قابلِ تحسین ہیں،

کتاب مجلّد، کتابت طباعت اچھی ہے۔ ضخامت ۴۸ صفحات قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ سلطانی بمبئی نمبر ۳

علی گڑھ میگزین

جلد ۲۳ نمبر ۱ بابت ۱۹۴۷ء ۳۱۸ صفحات ایڈیٹر محمود فاروقی بی۔اے (آنرز) ایم۔اے

مسلمانوں کی تعلیم کے سلسلے میں علی گڈھ کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ ہماری بہت سی علمی و ادبی تحریکات یہیں سے یہیں سے اٹھتی رہی ہیں، علی گڈھ کی اپنی ادبی روایات ہیں۔ طلبائے مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کا یہ علمی و ادبی سہ ماہی رسالہ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جسے نہایت محنت اور کاوش سے مرتّب کیا گیا ہے۔ اُردو زبان پر تحقیقاتی مقالات اور دوسرے مضامین نظم و نثر بلند پایہ ہیں۔

تبصرہ کرتے وقت دل میں ایک خلش سی ہے۔ یو۔پی میں ہندی کو سرکاری زبان قرار دیا جا چکا ہے۔ اب وہاں اُردو کا مستقبل کیا ہوگا؟ مسلم یونیورسٹی کے طلبا ایسے کامیاب مجموعے پیش کرتے رہیں گے؟

خدا علی گڈھ کے طلبا کو توفیق دے کہ وہ اُردو کو زندہ رکھ سکیں۔

جان نثار

(افواجِ آصفیہ کا سہ ماہی رسالہ) ناشر حیدرآباد آرمی ایجوکیشن کور، ہیڈ کوارٹرز حیدرآباد آرمی۔

افواجِ حیدرآباد کے سپاہیوں میں علمی دلچسپی پیدا کرنے اور ناخواندگی کو دُور کرنے کے لئے یہ رسالہ جاری کیا گیا ہے، اس کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اسے نسخ ٹائپ میں چھاپا گیا ہے۔ سرورق پر ایک سپاہی بندوق تھامے آگے بڑھ رہا ہے۔ رنگوں کے امتزاج نے سرورق کو دیدہ زیب بنا دیا ہے۔ رسالہ تصاویر سے مزیّن ہے۔ یہ پہلا شمارہ ہے۔ مضامین عام فہم اور دلچسپ ہیں۔ نظم کا حصہ بھی خوب ہے۔

اُردو رسم الخط کے سلسلے میں ٹائپ میں تجربات کرنے والوں کے لئے یہ رسالہ کافی رہنمائی کرے گا۔ یہ رسالہ میجر محمد عطاء الرحیم افسر کمانڈنگ حیدرآباد آرمی ایجوکیشن کور کی ساعی سے جاری ہوا ہے جو قابلِ مبارکباد ہیں۔

اقبال خواتین کی نظر میں

مرتبہ یکتا امروہوی۔ حکیم امت علامہ اقبالؒ پر بے شمار کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ مسلمانوں کی موجودہ بیداری میں علامہ کے افکار کو بہت زیادہ دخل ہے۔ خواتین اسلام بھی اُن کے پیغام سے متاثر ہوئی ہیں اور اس کا ثبوت وہ شعور ہے جو آج ان خواتین میں پایا جاتا ہے اور جس کا اظہار زیرِ تبصرہ کتاب سے ہوتا ہے۔

اس کتاب میں چوبیس خواتین کے مضامین درج ہیں۔ بائیس مسلمان خواتین ہیں اور دو غیر مسلم خواتین، اقبال اور اُن کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مقالات کا معیار کافی بلند ہے۔

کتابت اور طباعت خوب ہے۔ کتاب مجلد حجم ۲۶۴ صفحات قیمت تین روپے آٹھ آنے۔ ناشر حکیم ذکی احمد، ملنے کا پتہ:۔ دفتر اتالیق انگریزی، کلاں محل دہلی!

سید منظور حسین بخاری منیجر، پرنٹر پبلشر نے اتحاد پریس ہل روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر ہمایوں ۳۲ لارنس روڈ لاہور سے شائع کیا۔ صرف سرورق رہبر پریس لاہور میں چھپا۔

Regd. No. L.1363

بیادگار جسٹس شاہ دین مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی-اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لاء
جائنٹ ایڈیٹر: شیر محمد اختر

فہرست مضامین

ہمایوں بابت ماہ مارچ ۱۹۴۸ء

نمبر شمار	مضمون	صاحب مضمون	نمبر صفحہ
۱	بزم ہمایوں	بشیر احمد	۱۰۲
۲	جہاں نما	شیر محمد اختر	۱۰۳
۳	مرزا فرحت اللہ بیگ کی شاعری	جناب ڈاکٹر غلام یزدانی صاحب	۱۰۶
۴	غزل	جناب جلیل کریر صاحب بی۔اے	۱۱۶
۵	سرفروش (نظم)	جناب شان الحق صاحب حقی	۱۱۷
۶	اُجالا (ڈرامہ)	جناب ظہیر کاشمیری صاحب بی۔اے	۱۱۸
۷	سوزِ ناتمام (نظم)	جناب تابش دہلوی صاحب	۱۲۲
۸	پناہ (افسانہ)	"لالۂ صحرائی"	۱۲۳
۹	غزل	جناب طفیل ہوشیارپوری صاحب	۱۳۰
۱۰	واردات (نظم)	"ابن انشا"	۱۳۱
۱۱	غزل	جناب جعفر طاہر صاحب	۱۳۲
۱۲	سہارا (افسانہ)	جناب اختر رضی صاحب بی۔اے	۱۳۳
۱۳	غزل	جناب مضطر اکبرآبادی	۱۳۷
۱۴	اور اب	جناب ضمیر اظہر صاحب بی۔اے	۱۳۸
۱۵	مطبوعات		۱۳۹

چندہ سالانہ ۶ر — ششماہی ۳ر — فی پرچہ ۸ر

بزمِ ہمایوں

مہاتما گاندھی کے اندوہ ناک قتل نے دُنیا کا دل ہلا دیا ہے۔ نصف صدی تک اِس بڑے آدمی نے اپنے مُلک کی بے لوث خدمت کی پہلے جنوبی افریقہ میں اور پھر ہندوستان میں۔ تقریباً تیس برس ہوئے جب اُس نے ہندوستان کی سیاسی زندگی میں قدم رکھا تو یہ ملک محض ایک غلام ملک تھا۔ رولٹ ایکٹ کے بعد کی شورش کا آغاز گاندھی کے ہاتھوں ہوا۔ ۱۹۲۰ء میں اُس نے عدم تعاون اور ۱۹۳۰ء میں سول نافرمانی کی تحریک شروع کی۔ ۱۹۳۷ء میں کانگرس برسرِ اقتدار ہوئی اور ۱۹۴۲ء میں "ترکِ ہندوستان" کی تحریک پھر گاندھی ہی کی قیادت میں بروئے کار آئی۔

لیکن اتنے میں ملک میں ایک اَور طاقت اُبھر چکی تھی اور وہ تھی قائدِ اعظم محمد علی جناح کی مُسلم لیگی تحریک۔ اِن دو بڑے آدمیوں میں رسّہ کشی شروع ہوئی اور آخر ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو یہ ملک آزاد بھی ہو گیا اور دو حصّوں میں منقسم بھی ہُوا۔ ہندوستان جسے گاندھی نے آزاد کرایا اور پاکستان جس کی بِنا جناح نے ڈالی۔

گاندھی عمر بھر ہندوستان کی وحدت کا مؤید رہا لیکن گزشتہ سال جب آخر ملک کی تقسیم عمل میں آئی تو یہ گاندھی کی عظمت کا اک ثبوت ہے کہ اُس نے پاکستان کے وجود کو بسر و چشم قبول کیا اور جب ہندوستانیوں کے ایک برگشتہ گروہ نے پاکستان کے خلاف تشدّد کا حربہ استعمال کرنا چاہا اور مسلمانوں کو ہندوستان میں ختم کرنے کی ٹھان لی تو وہ انتہائی دلیری سے ایک غیر قوم کی حفاظت کے لئے اپنی قوم کے خلاف سینہ سپر ہو گیا۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ وہ جیا ہندوؤں کے لئے لیکن مرا مُسلمانوں کے لئے!

مُلک مُلک کے رہنماؤں نے مہاتما گاندھی کی حسرت ناک موت پر اپنی عقیدت کے پھُول برسائے۔ نہرو نے کہا "ہماری زندگی روشنی سے محروم ہو گئی ہے اگرچہ یہ روشنی ایک ہزار برس کے بعد بھی اس مُلک میں دکھائی دے گی اور ساری دُنیا اِسے دیکھا کرے گی۔" لیاقت نے کہا "تعجب ہے کہ جو شخص عمر بھر تشدّد کے خلاف تلقین کرتا رہا وہ خود تشدّد ہی کا شکار ہُوا۔" کراچی کے ایک مُسلم موٹر ڈرائیور نے کہا "آخر یہ کیوں ہوا؟ اور دُنیا کو کیا ہو گیا ہے؟" لندن میں ہندوستانی طلبا پھُوٹ پھُوٹ کر روئے اور کہا جاتا ہے کہ انگلستان والے مزدور حکومت کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد کسی واقعے سے ایسے متاثر نہیں ہوئے۔ منڈل نے کہا "یہ بات باور نہیں کی جا سکتی کہ انسان کی شکل میں کوئی ایسا شیطان مُودار ہو سکتا ہے جو ایک ایسے بڑے آدمی کو عین اس وقت قتل کر دے جب وہ اپنی زندگی نوعِ انسان کی خدمت کے لئے وقف کر چکے۔" برنارڈ شا نے کہا "اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ حد سے زیادہ نیک ہونا بھی کس قدر خطرناک ہے!"

گاندھی اور جناح کی برسوں ملاقاتیں ہوتی رہیں، بات بات میں اُن کا اختلاف رہا۔ وہ اپنی قوم کا عاشق تھا یہ اپنی قوم کا، وہ اُس کا نجات دہندہ تھا یہ اِس کا لیکن آخر عملاً دونوں ایک ہی بات پر متفق ہو گئے اور وہ بات تھی مسلمانوں کی حفاظت، ایک بڑے ہندو نے مسلمانوں کے لئے جان دے کے ہندو قوم کو صحیح عظمت و ایثار کا رستہ دکھا دیا!

گاندھی زندگی بھر ہندوستانیوں کا لیڈر رہا اور مر کر وہ ہندو مسلمان دونوں کا ہیرو بن گیا۔

اب اگر ہندو اپنے سب سے بڑے لیڈر کی یاد تازہ رکھنا چاہتے ہیں تو اِس کی یہی صورت ہے کہ وہ ہندوستان میں مسلمانوں کے مددگار رہیں اور اگر مسلمان اپنی احسان مندی کا اعتراف کرنا چاہتے ہیں تو یہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ وہ پاکستان میں اپنے تمام ہندو ہمسایوں کو اپنی محافظت میں لے لیں۔ اگر یہ ہو جائے تو پھر بلا شبہ مہاتما گاندھی کی موت ہندوستان اور پاکستان دونوں کے لئے ایک نئی زندگی کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

بشیر احمد

جہاں نُما

گفتگو ایک فن ہے

ہمارے اس مہذب زمانے میں جب الفاظ کے ظاہری مطالب کے ساتھ ساتھ سننے والے بین السطور اور غیر شعوری معنی بھی پرکھتے ہیں گفتگو محض اظہارِ مطلب نہیں رہ جاتی بلکہ اُس سے ذہن کی بہت سی خفیہ باتیں منظرِ عام پر آجاتی ہیں اب گفتگو نے فن کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اچھی باتیں کرنے والا ہر زمانے میں "رونقِ بزم" کہلاتا رہا ہے، غالب نے اس کی تعریف یوں کی ہے ؎

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا   میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

گفتگو کے شعوری اور لاشعوری پہلوؤں کے امتزاج کی یہ نفسیاتی کیفیت ہے جس کا اظہار غالب نے کیا ہے۔

ہر فن کے لوازمات ہوتے ہیں گفتگو کے بھی چند لوازمات ہیں جن کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے تاکہ باتیں زیادہ اچھی اور با اثر ہوں اور گفتگو کرنے والا رونقِ بزم بن سکے۔ ان لوازمات پر ایک امریکی مصنف نے یوں روشنی ڈالی ہے۔

۱۔ محفل میں اپنی ذات کے متعلق کبھی زیادہ تفصیل سے گفتگو نہ کی جائے، دُوسرے کی صحت، ذاتی تکالیف اور مالی مشکلات سے بہت کم سننے والوں کو دلچسپی ہوتی ہے۔ اگر آرٹ، سائنس، تاریخ اور روزمرہ کے واقعات پر باتیں ہوں تو اُن میں بہت سے اور لوگ حصہ لے سکتے ہیں، اس طرح گفتگو زیادہ دلچسپ اور مؤثر ہوگی۔

۲۔ بعض لوگ دوسروں کو بات کرنے نہیں دیتے، ہر انسان باتیں کرنا چاہتا ہے، ہو سکتا ہے تھوڑی دیر کے لئے کسی کی باتیں محفل کا رنگ بدل دیں، مگر جب سلسلۂ کلام طویل ہوتا جائے گا اور کسی دوسرے کو بات کرنے کا موقع ہی نہ ملے گا تو ایسی گفتگو سے سب اکتا جائیں گے، خاموشی گفتگو کو دلکش بنا دیتی ہے، اس لئے گفتگو کے درمیان وقفہ دیں تاکہ دُوسرے بھی کچھ کہہ سکیں۔

۳۔ ایکا ایکی کسی بات کی تردید اچھی نہیں ہوتی۔ اگر ایسا کرنا ہی ہے تو تحمّل سے یُوں کہہ دیا جائے کہ "میں آپ سے پوری طرح اتفاق نہیں کرتا" اس سے بات بھی بن جائے گی اور کوئی بُرا بھی نہ مانے گا۔ بہتر تو یہ ہے کہ آپ دوسروں کی باتوں میں سے ایسے نکات تلاش کریں جن سے آپ متفق ہیں اس سے گفتگو دلچسپ ہو جائے گی اور ایک پسندیدہ طریق سے اپنے جذبات کا اظہار کیا جا سکے گا۔

۴۔ کبھی قطع کلام نہ کریں، اسے کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔ بات کاٹنے سے خیالات کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے۔ اس کی بجائے گفتگو کے دوران میں اگر داد دی جائے تو اس سے بات پُر لطف ہو جائے گی۔ رنگِ محفل خوب جمے گا۔

۵۔ گفتگو کا موضوع اچانک نہیں تبدیل کرنا چاہیے، بعض لوگ صبر اور تحمل سے دوسروں کی باتیں سُن تو لیتے ہیں مگر جوں ہی بات ختم ہوئی انھوں نے جھٹ نیا موضوع چھیڑا، حالانکہ اگر بات ختم ہونے کے بعد چند لمحات خاموشی رہے اور اس عرصے میں اُس بات پر غور کیا جائے اور پھر سلسلۂ کلام شروع ہو تو اس سے گفتگو میں زیادہ گہرائی آجاتی ہے۔

۶۔ دوسروں کی گفتگو میں دلچسپی کا اظہار ضروری ہے۔ اس کے لئے صرف کان کافی نہیں، بلکہ آنکھ، ہاتھ اور پسندیدہ حرکات کی مدد بھی چاہیے۔ گفتگو کے دوران میں سننے والوں کا خاموش رہنا گفتگو کے اچھا ہونے کی دلیل نہیں جب تک اُن کی آنکھیں، حرکات اور چہرے پر جذبات کا اظہار اُس کی شہادت

ہو دیں، دلچسپ گفتگو سننے والوں کو شگفتہ بنا دیتی ہے وہ بھی زندہ دلی کا ثبوت دیں گے، اپنی مصیبتوں کا قصہ کبھی نہ چھیڑیئے ورنہ ہر ایک ویسی ہی مصیبت کی داستان سنانے لگا اور بزم پر پژمردگی چھا جائے گی۔

۷۔ اگر باتوں باتوں میں موضوع سے گفتگو کا رخ ہٹ جائے تو فن کی خوبی یہ ہے کہ اسے اصل موضوع پر لایا جائے، ایسا کرنا کمال کی دلیل ہے۔ اس سے گفتگو میں دلچسپی قائم رہے گی۔

۸۔ کبھی کسی بات پر حتمی رائے نہ دی جائے، عام طور پر لوگ اس "حماقت" کا شکار ہیں، بلا سوچے سمجھے آخری فیصلہ صادر کر دیتے ہیں، بہتر یہ ہے کہ صرف اپنی رائے کا اظہار کیا جائے تاکہ دوسروں کو بھی موقع ملے کہ وہ اس کے متعلق سوچیں، جو لوگ کسی بات کے متعلق پوری واقفیت رکھتے ہیں اکثر رائے دینے میں انکسار سے کام لیتے ہیں، یہی اُن کی بڑائی کا ثبوت ہے۔

۹۔ باتیں ٹھہر ٹھہر کر کی جائیں۔ الفاظ کی ادائیگی صاف ہونی چاہیے۔ جب تک کسی کی بات کو سمجھا نہ جائے اُس سے لطف نہیں اٹھایا جا سکتا۔ الفاظ کترنے والا "کبھی کامیاب گفتگو نہیں کر سکتا"۔ "پہلے تولو اور پھر بولو" واقعی گفتگو کے لئے ضروری ہے۔

ماہر نفسیات فوٹو گرافر

فوٹو اتارنا اور فوٹو اتروانا دونوں فن ہیں۔ آج کی دنیا کے ہر بڑے انسان کو فوٹو اتروانے کے فن میں مہارت خوب ہوتی ہے، اس لئے فوٹو اتارنا بھی بہت ترقی کر گیا ہے۔ فوٹو گرافی کے فن میں اس وقت کینیڈا کا فوٹو گرافر یوسف قرش سب سے آگے ہے جو فوٹو گرافر سے زیادہ ماہر نفسیات ہے۔ وہ دوسروں کے جذبات سے کھیلتا ہے۔ چرچل نے اسے یوں خراج تحسین ادا کیا ہے کہ "تم دھاڑتے شیر کو خاموش کرا سکتے ہو"۔ قرش نے چرچل کا فوٹو اتنا اچھا اتارا ہے کہ وہ سینکڑوں بار اخبارات و رسائل میں چھاپا جا چکا ہے۔ اس کا قصہ کافی دلچسپ ہے۔

۱۹۴۱ء میں چرچل اٹاوہ گیا اور وہاں کی پارلیمان کے سامنے ایک دھواں دھار تقریر کی۔ تقریر کے بعد جب چرچل باہر آیا تو قرش منتظر کھڑا تھا۔ چرچل تھکا ہوا تھا مگر جونہی اس نے کیمرہ دیکھا اکڑ گیا۔ جھٹ سگار دانتوں میں دبا کر اسے سلگایا اور پھر تحکمانہ لہجے میں بولا "اب تصویر لو"۔ جس طرح ایک عاشق اپنے محبوب کے لبوں سے بوسہ چرانے کے لئے نرم روی سے آگے بڑھا بڑھتا ہے بالکل اسی طرح قرش نے آگے بڑھ کر سگار چھینا اور "معاف کیجئے" کہہ کر اسے راکھ دانی پر رکھ دیا۔ چرچل کا چہرہ غصے اور غضب سے تمتما اٹھا اور قرش نے آن کی آن میں فوٹو لے لیا۔ نتیجہ ایک ایسی لافانی تصویر ہے جس میں چرچل برطانوی مستقل مزاجی کا اشارہ بن گیا ہے۔

اس تصویر کے بعد حکومت کینیڈا نے قرش کو برطانیہ کی دیگر مشہور ہستیوں کے فوٹو اتارنے پر مامور کیا۔ چنانچہ وہ لندن پہنچا اور اسے بکنگھم پیلس میں شاہ جارج ششم کے حضور باریابی کا شرف بخشا گیا۔ اس نے بادشاہ کے کئی "پوز" لئے۔ اس دوران میں بادشاہ کچھ اکتا سا گیا اور چائے لانے کو ارشاد فرمایا مگر قرش نے نہایت گستاخی سے "چائے کی کوئی ضرورت نہیں" کا جملہ کہا۔ بادشاہ خاموش ہو گیا اور پھر تصویر اتاری جانے لگی مگر اب اس کے چہرے پر ایک اور کیفیت تھی، یہی قرش چاہتا تھا۔

کیمروں کا رنگ عموماً سیاہ ہوتا ہے مگر قرش کا خیال ہے کہ اس سے طبیعت پر اُداسی چھا جاتی ہے، اس لئے اُس نے اپنے کیمرہ پر سفید رنگ کر رکھا ہے۔ اور فوکس کے لئے سیاہ پردے کی جگہ مخمل ہے جس کے کناروں پر سنہری حاشیہ ہے۔

برنارڈ شا کی تصویر کا واقعہ بھی دلچسپ ہے۔ قرش جب اُس کے ہاں پہنچا تو اُس کے سکرٹری نے اسے بہت سی ہدایات دیں، روشنی نہ کی جائے۔ کیمرہ بڑا نہ ہو، اس کام کے لئے صرف پانچ منٹ کی اجازت ہے وغیرہ۔ وہ ابھی یہ ہدایات دے رہا تھا کہ آئرلینڈ کا مزاح نگار خود باہر آ گیا اور قرش پر طنز کرنے لگا لیکن قرش نے ہر تیر کو ڈھال پر لیا اور بالآخر پانچ منٹ بڑھ کر اڑھائی گھنٹے ہو گئے اور جب اس نے اپنا بڑا کیمرہ بند کیا تو شا استدعا کر رہا تھا کہ "جب میں نوے برس کا ہو جاؤں تو اس دن آ کر ضرور میرا فوٹو اتارنا"۔

قرش آرمینیا کا باشندہ ہے، تیرہ برس کی عمر میں وہ کینیڈا چلا آیا اور اٹاوہ میں کام شروع کیا۔ اسے اٹاوہ کے لوگوں سے بہت محبت ہے۔ وہاں کے

لوگ اُسے بے تکلفی سے صرف قرش پکارتے ہیں۔ اُس کا مشہور سٹوڈیو اٹاوہ میں ہے۔ حکومت کے بڑے بڑے عہدیدار اُس کے سرپرست ہیں اور وہ سرکاری فوٹوگرافر بھی ہے، وہ ایک تصویر کا معاوضہ ۲۵۰ ڈالر لیتا ہے، مگر اٹاوہ والوں سے صرف ۷۵ ڈالر۔ اس کی بیوی فرانسیسی ہے اور خاوند کے کام میں بہت مدد دیتی ہے۔ ایک بار اُس نے بیان دیتے ہوئے بتایا کہ میں نے ایک کیمرہ سے شادی کی ہے جس کے لنز کی جگہ دل ہے۔

پچھلے برس اُس نے ۷۰ تصاویر کا مجموعہ "تقدیر کے چہرے" (Faces of Destiny) کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس میں سب سے اچھی تصویر جنرل جوزف پرشنگ کی ہے جو پہلی عالمگیر جنگ میں امریکی افواج کا کمانڈر تھا۔ اس تصویر کے اتارنے سے قبل قرش نے وہ تمام کتابیں دیکھ ڈالیں جن میں جنرل پرشنگ کے حالات زندگی تھے۔ ان دنوں یہ بہادر سپاہی والٹر ریڈ ہسپتال میں بیمار تھا، قرش اُسے ملنے گیا، اُس نے دیکھا کہ اب پرشنگ ایک کمزور سا تھکا ہارا انسان رہ گیا ہے، اس رات قرش سو نہ سکا، وہ بے قرار کمرے میں اِدھر اُدھر گھومتا رہا، وہ سوچ رہا تھا کہ تیس برس کا زمانہ کیسے واپس لایا جاسکتا ہے۔

دوسرے دن مقررہ وقت پر قرش ہسپتال پہنچا۔ جنرل کرسی پر منتظر بیٹھا تھا۔ اس ڈر سے کہ کہیں ضعیفی کی وجہ سے جنرل اونچا نہ سنتا ہو قرش ایک ٹانگ پر جھک گیا اور پھر دھیمی آواز میں اُن الفاظ کو جو اُس نے جنرل کے ایک ایڈی کانگ سے سُنے تھے تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ دُہرایا "میں آپ کی ایک ایسی تصویر لینا چاہتا ہوں جسے امریکی لوگ سَو برس تک یاد رکھیں" ان الفاظ نے جادو کا اثر کیا۔ پرشنگ مسکرایا اور لمحہ بھر کے لئے نظریں جھکا لیں اور پھر آہستہ آہستہ اُس کے کندھے پیچھے کی طرف ہونے لگے۔ سینہ چوڑا ہوتا گیا، سربلند ہوا، چہرہ بارونق ہو گیا اور چند لمحوں میں تیس سال کا گزرا ہوا زمانہ واپس آگیا۔ اب کرسی پر ۱۹۱۷ء کا جنرل پرشنگ بیٹھا تھا جس نے فلپائن جزائر میں بہادری کے جوہر دکھائے تھے۔

قرش سامان سنبھال رہا تھا اور اُس کے کیمرہ میں جنرل کی لافانی تصویر بند تھی، جنرل اُٹھا اور اپنے پلنگ کے سرہانے کھڑا ہو گیا۔ قرش نے فوجی سلام کیا اور جواب میں پرشنگ کا ہاتھ پھرتی اور صفائی سے اُٹھا، وہ مسکرایا، قرش کے کندھے پہ تھپکی دی اور بولا "بیٹے! میری فوج میں بھرتی ہو گئے نا؟"

مصنوعی بارش

قحط کے خلاف جنگ کرنے کے لئے انسان صدیوں سے تجاویز سوچتا آرہا ہے۔ جوہری بم کی ایجاد نے سائنسدانوں کے سامنے بہت سے نئے راستے کھول دیئے ہیں۔ بادلوں کے بغیر بارش کا حاصل کر لینا اب ممکنات میں سے ہے۔ تجربے کرنے والوں کا کہنا ہے کہ آب پاشی کے اس ذریعے سے دگنی پیداوار ہو سکتی ہے۔ چنانچہ دو انچ مصنوعی بارش سے گاجروں کی فصل میں پچاس فی صدی کا اضافہ ہوا ہے۔ چار انچ بارش سے یہ اضافہ اسّی فی صدی تک جا پہنچا۔

اگر مصنوعی بارش کا تجربہ مکمل طور پر کامیاب ہو جائے اور اسے عام کیا جا سکے تو اس کے ذریعے بے موسم کی سبزیاں کافی مقدار میں مل سکتی ہیں پھر اس طریق میں ایک آسانی یہ ہے کہ اس بارش سے کہیں بھی ضرورت سے زیادہ پانی نہیں گرے گا کہ اس سے فصل کے برباد ہو جانے کا ڈر ہو۔ بلکہ چھلنی کے ذریعے ضرورت کے مطابق جہاں اور جتنا پانی چاہیئے گرایا جا سکتا ہے اس بارش کیلئے صاف و شفاف پانی سے کام لیا جاتا ہے۔ ایک گھومنے والے پائپ میں سے پانی گزار کر کھیتوں میں یوں پھینکا جاتا ہے کہ وہ بارش کی صورت اختیار کر لے پانی حاصل کرنے کے لئے بجلی کی سب سے زیادہ ضرورت ہے تاکہ موٹر انجن کے ذریعہ پانی کی کافی مقدار بہم پہنچائی جائے اور پھر اسے کام میں لایا جا سکے۔ یہ تجربات ابھی ابتدائی دَور میں سے گزر رہے ہیں اس لئے ان میں بڑی احتیاط برتی جا رہی ہے۔ اس وقت کوئی نصف درجن کے قریب انگریزی فرمیں موجود ہیں جو اس کام میں ماہر ہیں ان میں سے بعض کا دعویٰ ہے کہ وہ دُنیا کے ہر حصے میں مصنوعی بارش برسا سکتی ہیں اور ایک پلانٹ سے ایک ہزار ایکڑ زمین سیراب کر سکتی ہیں، اس کے کئی فائدے ہوتے ہیں پانی کی بچت ہوتی ہے اور ضرورت کے مطابق زمین کو سیراب کیا جا سکتا ہے۔ زیادہ بارش سے کھیتوں میں گڑھے پڑ جاتے ہیں اور اُن سے زمین خراب ہو جاتی ہے مگر مصنوعی بارش سے اس کا احتمال نہیں۔ محنت مزدوری میں بھی تخفیف ہو جاتی ہے۔

امریکہ اس تجربے کی کامیابی کے بعد انسانی تہذیب کو ایک قدم اور آگے لے جائے گا۔ اب تک تین گھنٹوں میں نصف انچ کے قریب بارش برسائی جا سکی ہے۔ فن زراعت کا مستقبل اس کے بعد بہت ہی روشن ہو جاتا ہے۔

شیر محمد اختر

مرزا فرحت اللہ بیگ کی شاعری

مرزا صاحب کا آئندہ میں اس مضمون میں پورا نام نہیں لوں گا اور صرف تخلص فرحت ہی سے ان کا ذکر کروں گا۔ اس مضمون کو میں کم و بیش
ریزی زبان میں Poetic Society کے ایک جلسہ میں پڑھ چکا ہوں اس لئے ایسے سننے والوں کو جو وہاں موجود تھے اگر انگریزی ضرب المثل
موافق دوسرے وقت کی گو بھی کا مزہ آئے یا اُردو مثل کے لحاظ سے باسی کڑھی کا اُبال معلوم ہو تو وہ نواب سعید جنگ بہادر یا ان کے لائق
مائی مولوی سجاد مرزا صاحب سے گلہ کریں جنھوں نے اصرار سے اس مضمون کو اُردو مجلس میں پڑھنے کے لئے مجھے مجبور کیا۔ حبیب کا ذکر اگر مکرر بھی ہو
یلطف آتا ہے اس لئے مجھے تعمیل میں کچھ عذر نہ ہوا۔

کسی شاعر کے کلام کی داخلی اور خارجی صفات کو سمجھنے کے لئے چونکہ اس کے واقعات زندگی اور عام کردار سے مدد ملتی ہے اس لئے میں نہایت مختصر
طور سے فرحت کے حالات بیان کروں گا اور ایسے صاحبوں سے جو اُن کی زندگی اور رجحانات سے واقف ہیں اور اس جلسہ میں موجود ہیں استدعا
ہے کہ وہ مجھے معاف فرمائیں۔

فرحت ۱۸۸۳ء میں دلّی میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۷ء میں حیدرآباد آئے اور یہیں رس بس گئے، ۲۶ اور ۲۷ اپریل کی درمیانی رات میں وہ
اللہ کے پیارے ہوگئے یہ واقعہ ۱۹۴۷ء میں ہوا۔ دلّی میں وہ ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جس میں ممتاز شاعر گزر چکے تھے مثلاً مومن، غالب
میر درد اور رنگین۔ مرزا صاحب کے دو چچا بھی شاعر تھے ایک ذاکر تخلص فرماتے تھے دوسرے شاکر۔ دونوں صاحب دیوان ہیں، فرحت کو اس طرح
شاعری کا ملکہ میراث میں ملا لیکن وہ اس ملکہ کے جوہر جب تک اُن کی عمر خاصی پختہ نہ ہوگئی دکھا نہ سکے۔ تاہم ان کی طبیعت کی براقی اور خداداد
ظرافت کا پتہ بعض ہجوؤں اور قطعوں سے ملتا ہے جو انھوں نے مدرسہ اور کالج کی طالب علمی کے زمانے میں مرتب کئے تھے۔ فرحت جب کالج کی تعلیم سے
فارغ ہوئے تو ان مشاعروں میں بھی شریک ہوئے جو خود ان کے مکان پر ہوتے تھے۔ طالب علمی کے زمانے میں ایک مرتبہ علی گڑھ بھی مشاعرے میں
شریک ہونے کے لئے گئے تھے۔ لیکن خود فرحت نے ایسی شرکت کو محض تفریح سمجھا کیونکہ شاعر بننے کا جذبہ اس وقت تک ان میں پیدا نہیں ہوا تھا
فرحت کو پڑھنے کا بے حد شوق تھا اور اُردو اور فارسی اساتذہ کا منتخب کلام از بر یاد تھا۔ خدا نے اُن کو نہایت سُریلی، پاٹ دار آواز دی تھی
اور شعرا کے کلام کو سنا کر وہ اپنے دوستوں کو بھی خوش کرتے تھے اور خود بھی محو ہو جاتے تھے۔ فرحت کو حالی کی مسدس کے ساتھ جعفر زٹلی، چرکین اور
نظیر کی ہزلیات بھی یاد تھیں، وجہ یہ ہے کہ زمانہ کا ذوق ایسا تھا کہ کتب فروش گٹھر باندھے ہوئے جب گھر گھر پھیری لگاتے تھے تو راہ نجات،
نور نامہ، ہرنی کا معجزہ، قرآن کے سیپاروں کے علاوہ نظیر کا چرہے نامہ، دیوان جان صاحب۔ دیوان جعفر زٹلی۔ دیوان چرکین بھی ساتھ رکھتے
تھے اور لوگ انھیں بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ کم عمر بچوں کے ذہن اور رجحانات پر ایسے ادب کا اثر پڑنا لازمی ہے اور فرحت کی نثر اور نظم دونوں
میں یہ میلان موجود ہے۔

فرحت سرکار نظام کی ملازمت میں مدرس کی حیثیت سے شریک ہوئے اور اپنی ذاتی قابلیت اور علمی استعداد کی وجہ سے ہائی کورٹ کی ججی کے ممتاز
عہدہ تک پہنچے۔ فرحت کی شخصیت بحیثیت سرکاری عہدہ دار اُن کی خانگی روش سے بالکل جدا تھی۔ خاموش، کم سخن، نپی تلی بات، فرض کا گہرا احساس، انصاف
اور حق پسندی اور ہمام کرنے کا غیر معمولی جذبہ۔ دوستوں میں جب بیٹھتے تھے تو ڈینگ مارنا، فقرے کسنا، ہنسنا اور ہنسانا اور مرزا منشی کی باتیں اُن کی
عام عادات تھیں۔ طالب علمی کے زمانے میں پیدل پھرنے کا بہت شوق تھا۔ مجھے یاد ہے کہ دسمبر کا مہینہ تھا کڑاکے کے جاڑے پڑ رہے تھے۔ ہم دونوں صبح

چار بجے اُٹھے۔ اُوورکوٹ پہنے گلوبند لپیٹے۔ جیبوں میں چبینا بھرا اور قطب صاحب کی طرف چل نکلے۔ راستے میں گاڑی بانوں کے پاس بیٹھے۔ الاؤ پر آگ تاپی، فرحت تو چلم کے دور میں بھی شریک ہو گئے۔ گانوں کے حالات پوچھے۔ کنواں مل گیا تو پنہاریوں سے باتیں کیں، ان کے گیت سنے۔ جس روز کا میں ذکر کر رہا ہوں اس روز تغلق آباد کا تاریخی قلعہ بھی دیکھا اور گھر واپس ہونے تک پورے چونتیس میل کی منزل طے کی۔ دو ڈھائی میل کا تو روز چکّر ہو جاتا تھا دہلی میں جہاں اب دہلی یونیورسٹی ہے اور پہلے لارڈ کرزن نے اپنے قیام کے لئے ایک مختصر عمارت "وایسریگل لاج" کے نام سے تعمیر کی تھی، وہاں کھیت تھے اور فرحت اور اُن کے ساتھ میں بھی وہاں اکثر کچریاں کھانے جایا کرتے تھے کیونکہ وہاں کی کچریاں بہت مزیدار ہوتی تھیں۔ فرحت کی آنکھیں اور دماغ ایسی سیروں میں ہمیشہ قدرتی مناظر سے لُطف اُٹھاتے تھے۔ جغرافیائی اور تاریخی حالات کے معلوم کرنے کا شوق تھا۔ دیہاتی زندگی بہت پسند تھی اور اسی وجہ سے وہ اپنے ایسے ہم جماعتوں میں بہت عزیز ہو گئے تھے جو گانوؤں سے تعلیم کے لئے آئے تھے۔

فرحت کا دل محبت کے جذبہ سے لبریز تھا اس لئے جس سے ایک دفعہ وہ مل لیتے اُن کا گرویدہ ہو جاتا تھا ہندوستان کے مختلف حصوں میں ان کے دوست اور احباب موجود ہیں البتہ خط و کتابت میں پابند نہ تھے شاید اس وجہ سے کہ اس کو وہ مدفضول سمجھتے ہوں، ہمیشہ شاد باش و شاد زی پر عمل تھا۔ آخر عمر میں دل کے سخت دورے پڑتے تھے لیکن ذرا سنبھلے اور پھر وہی ہنسی اور خوش مذاقی، کبھی افسردگی اور تیوری پر بل نظر نہیں آتا تھا وہ زندگی کے فلسفے میں ہمیشہ "پرمسرت" نظر کے صرف قائل ہی نہ تھے بلکہ کاربند بھی تھے۔ موت سے اڑتالیس گھنٹہ پہلے اپنے مکان پر اُردو مجلس کے جلسے میں جو اپنا تازہ کلام سنایا اس میں وہی لطافت اور چاشنی تھی جو اُن کی نظم میں ہمیشہ ہُوا کرتی تھی آواز بھی وہی زوردار اور گلا بھی ویسا ہی دلکش۔

فرحت چالیس برس کے سن میں ہی ایک مشاق نثر نویس ہو گئے تھے۔ مہاراجہ کشن پرشاد آنجہانی کو ان کے مضامین بے حد پسند تھے۔ اکثر اپنی ڈیوڑھی پر بلواتے تھے اور مضامین کو سن کر دل کھول کر داد دیتے تھے۔ مہاراجہ کو یہ خبر نہ تھی کہ فرحت شاعر بھی ہیں۔ ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ ڈیوڑھی میں مشاعرہ ہوا۔ فرحت نے بھی غزل پڑھی، مہاراجہ سن کر پھڑک اُٹھے اور فرمایا 'اوہو آپ شاعر بھی ہیں'۔ پھر کیا تھا، فرمائشوں کا تار بندھ گیا، فرحت اس زمانہ میں گلبرگہ میں سیشن جج تھے۔ حکم تھا جب بلدہ آؤ تازہ کلام لے کر آؤ اور مجھے سناؤ۔ مہاراجہ کی صحبت میں ہر قسم کے آدمی ہوتے تھے۔ ایک شاعر "بیگم" تخلص فرماتے تھے اور ریختی لکھتے تھے۔ ان کا کلام ذرا پھس پھسا ہوتا تھا۔ فرحت سے نہ رہا گیا 'جان صاحب' کا دیوان انھوں نے بھی بچپن میں پڑھا تھا۔ لیکن فرحت کی مہذب طبیعت نے فحش کو گوارا نہ کیا۔ البتہ اپنی غزلیات میں عورتوں کے جذبات اور محاورہ کو خوب ادا کیا ہے۔ میں اس مضمون میں آگے چل کر اُن کی ریختی غزلیات کے نمونے پیش کروں گا۔ مہاراجہ کی قدردانی اور ذوق کے فرحت بہت مدّاح تھے اور کہا کرتے تھے میں محض نثر نویس تھا مہاراجہ کی قدردانی نے شاعر بنا دیا۔

فرحت نے جو اپنے کلام کا انتخاب "میری شاعری" کے عنوان سے شائع کیا تھا اس میں انکسار کے طور پر اپنے آپ کو تیسرے درجہ کے شاعروں میں شمار کیا ہے لیکن اگر ان کی شاعرانہ صنعت گری، زبان کی شادابی اور موزونی، بیان کی صفائی اور بحور و قوافی کے ترنّم کو دیکھا جائے تو ان کا رُتبہ دوسرے درجہ کے شاعروں میں بھی ممتاز نظر آتا ہے۔ میں اس رائے کی تائید میں فرحت کے کلام کے چند نمونے پیش کروں گا، آپ خود اندازہ فرما سکتے ہیں لیکن ترنّم کے لُطف کے لئے اب اُن کا سا گلا کہاں؟

فرحت کی طبیعت ہمہ گیر تھی۔ انھوں نے عشقیہ غزلیات میر اور مومن کے رنگ میں لکھی ہیں صوفیانہ غالب کے طرز میں۔ مزاحیہ اکبر الہ آبادی اور رنگین کے تتبّع میں۔ قومی نظموں میں حالی اور اقبال کا ڈھنگ موجود ہے۔ ہجو کے میدان میں سودا کی پیروی کی ہے اور فطرتِ انسانی مناظرِ قدرت اور سماجی خصوصیتوں کے مرقعے نظیر اکبر آبادی کی فن کاری کے اسلوب پر تیار کئے ہیں۔ نظیر کے وہ بڑے مدّاح تھے اور ان کو بے حد خوشی ہوئی تھی جب نظیر کے دیوان کا ایک نسخہ پروفیسر آغا حیدر حسن کے کتب خانہ میں ان کو مل گیا تھا۔ دیوان کو انھوں نے ایک عالمانہ مقدمے کے ساتھ انجمن ترقی اردو کی اشاعت کے سلسلے میں چھپوا دیا ہے اور وہ اُن کی تنقیدی نظر اور وسیع مطالعہ کی ہمیشہ یادگار رہے گا۔ فرحت کے کلام میں جو نظمیں نظیر کے ڈھنگ پر

...گئی ہیں اُن میں فرحت کا مخمس [illegible] بہت مقبول ہوا۔ دریائے جمنا کو ہندو مذہب کی روایات میں خاص تقدس [illegible] ہے۔ [illegible]
...ر بھی اسی کے کنارے پر بسا ہوا ہے۔ مذہبی میلے بھی وہاں ہوتے ہیں اور مختلف اوقات میں مناظرِ قدرت بھی خاص دلکشی رکھتے ہیں۔ فرحت نے
...ن سب کی تصویریں کھینچی ہیں اور چونکہ وہ دہلی کے رہنے والے تھے اور وطن سے گہری محبت تھی اس لئے اُن کی صنعت گری میں درد اور روحانیت
...ی موجود ہے۔ اب آپ اس نظم کے چند بند سنئے اور داد دیجئے۔ نظم کا عنوان ہے "یادِ وطن"۔

یادِ وطن

اے اہلِ وطن پوچھ نہ یہ مجھ سے خدارا　　دلّی کا بھی ہے یاد تجھے کوئی نظارا
ہے یادِ وطن ہی مرے جینے کا سہارا　　اس شہر کا ہر گوشہ ہے یوں تو مجھے پیارا
آنکھوں میں سدا پھرتا ہے جمنا کا کنارا

چاندنی رات

وہ چاندنی رات اور وہ فضا نور سراپا　　رہ رہ کے وہ پھر بادِ خنک سیر کا جھونکا
پانی کا وہ اندازِ روانی کہ کہوں کیا　　اس منظرِ خاموش میں گھاٹوں کا وہ نقشہ
آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

اس عکسِ رُخِ ماہ میں پانی کا وہ دھارا　　پگھلی ہوئی چاندی تھی کہ بہتا ہوا پارا
اور سطح کو کچھ موجِ ہوا نے جو اُبھارا　　پھر لہروں کا اُٹھ اُٹھ کے بلانے کا اشارا
آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

اور سامنے ہی قلعہ کا وہ منظرِ مایوس　　وہ شمعِ زبانِ دانی کا ٹوٹا ہوا فانوس
اک حسن کہ ہے چادرِ ویرانی میں ملبوس　　تھا ہند کا پہلے جو کبھی مرکزِ ناموس
آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

صبح

مشرق میں اُفق کے وہ چمکدار کنارے　　اور ان میں وہ کرنوں کے پُر از نور شرارے
مغرب میں اُترتے ہوئے وہ ماند ستارے　　دریا کی وہ بیداری وہ موجوں کے طرارے
آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

ہر گھاٹ پہ دہلی کے حسینوں کا وہ جھرمٹ　　وہ ساڑیاں ہر رنگ کی وہ ہاتھ کے گھونگھٹ
وہ حسنِ خداداد نہیں جس میں بناوٹ　　قدرت کے تماشائی کا دل جس سے ہو تلپٹ
آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

پھر گھاٹ کے نزدیک وہ ڈبکی کا لگانا　　گھبرا کے مگر پانی سے جلدی نکل آنا
بھیگی ہوئی ساڑی میں بدن کا وہ چرانا　　جھک جھک کے وہ جل ہاتھوں سے سورج کو چڑھانا
آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

ادھو کہیں بیٹھنا مارے ہوئے آسن　　کھینچے ہوئے دنیا کی تمناؤں سے دامن

خاموش مگر ہاتھ میں پھرتی ہوئی سمرن اور ٹونا لوگوں کا وہاں کرتے تو درشن

آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

بڈھوں کا وہ پایان کنارے سے پہ اُترنا اور جوشِ عقیدت سے وہ ہر بل گنگنی میں بھرنا

بند آنکھیں کئے دل میں دعائیں یہی کرنا ہے رام ہمارا تو یہیں جینا ہو مرنا۔

آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

اک سمت وہ جلتی ہوئی دو چار چتائیں شعلوں کی لپک اور دھوئیں کی وہ گھٹائیں

وہ شیون و فریاد کی دل دوز صدائیں سُن کر جنھیں دشمن کے بھی آنسو نکل آئیں

آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

برسات

برسات کے عالم کا نہ کچھ پوچھ فسانا دریا پہ اُمنڈ آتا تھا سارا ہی زمانا

لہروں کی زبانوں پہ وہ ساون کا ترانا سنگت میں وہ گرداب نئے چنگ وچغانا

آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

بجتا تھا کہیں ڈھول کہیں دف کہیں مرچنگ چلتا تھا کہیں یاروں میں دورِ مئے گلرنگ

گانا کہیں اُڑتا تھا تو چھنتی تھی کہیں بھنگ تھا سب کا غرض شوق جدا اور جدا رنگ

آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

وہ بیلے کے ہر کونہ سے موروں کی جھنکاریں اور آموں پہ کوئل کی وہ کوکو کی پکاریں

وہ ابر کے رنگوں کے بدلنے کی بہاریں ان اُودی گھٹاؤں میں وہ بگلوں کی قطاریں

آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

وہ قسمتِ بیدار کے دن اور وہ راتیں وہ کشمکشِ دہر کے جھگڑوں سے نجاتیں

اور لطفِ جوانی کا اُٹھانے کی وہ گھاتیں فرحت کو نہ بھولی ہیں نہ بھولیں گی وہ باتیں

یاد آئے گا ہر وقت وہ جمنا کا کنارا

تیسرے بند میں "پگھلی ہوئی چاندی" اور "بہتا ہوا پارا" اگرچہ انگریزی تشبیہات کے ترجمے ہیں لیکن اُردو میں نئی لطافت پیدا کردی ہے۔ البتہ لہروں کے اُبھار میں اُٹھ اُٹھ کے بُلانے کا اشارہ فرحت کی جدّت ہے اور نہایت نفیس استعارہ ہے۔ چوتھے بند کی تشبیہات بھی نہایت نادر ہیں خصوصاً اس مصرع "اک حسن کہ ہے چادرِ ویرانی میں ملبوس" کتنا پاکیزہ اور کیسا مؤثر۔ انسانی فطرت اور عورتوں کی شرم و حیا کی تصویر چھٹے اور ساتویں بند کے ان مصرعوں میں خوب کھینچی گئی ہے۔

وہ ساڑیاں ہر رنگ کی وہ ہاتھ کے گھونگھٹ

قدرت کے تماشائی کا دل جس سے ہو تلپٹ

گھبرا کے مگر پانی سے جلدی نکل آنا

بھیگی ہوئی ساڑی میں بدن کا وہ چُرانا

فرحت نقاش تھے۔ لیکن رنگوں اور خطوط کی نقاشی میں ان کی تصاویر ایسی مؤثر اور دلپذیر نہیں ہوئیں جیسی الفاظ کی نقاشی میں۔ دسویں بند میں بھی جھاجھلتی ہوئی چتاؤں کا ذکر ہے ہندی عورت کی والہانہ محبت اور وفاداری کا عجیب دلسوز مرقع پیش کیا ہے۔ بارہویں بند میں الفاظ کے زور اور جذبات کے ہجوم سے نظیر اور قاآنی دونوں کا لطف آجاتا ہے۔ لکھتے ہیں ؎

بجتا تھا کہیں ڈھول کہیں دف کہیں مرچنگ — چلتا تھا کہیں یاروں میں دورِ مئے گلرنگ
گاتا تھا کہیں اُڑتا تھا تو چھنتی تھی کہیں بھنگ — تھا سب کا غرض شوق جُدا اور جدا رنگ

فرحت کو قاآنی کا کلام بھی بہت پسند تھا اور اکثر یہ بند دوستوں کو سنایا کرتے تھے۔

من از شراب می خورم ببانگ کوس می خورم — ببارگاہِ تہمتن بہ بزم طوس می خورم
پیالہ ہائے دہ منِ علی الرؤس می خورم — شراب گیرمی چشم مئے مجوس می خورم
نہ جو گیم کہ خوکنم برگِ برگ کو کمنا رہا

تیرھویں بند کے اس مصرع میں "ان اودی گھٹاؤں میں وہ بگلوں کی قطاریں" فرحت کی دل آویز رنگ آمیزی ضرور ہے لیکن یہ تشبیہ عبدالرحمٰن خاں احسان کے اس مصرع میں "ابر میں بگلوں کی جس طرح قطار آئے نظر" پہلے سے موجود ہے اور نظیر اکبرآبادی نے بھی اس تشبیہ کو معشوق کے مسی ملے ہوئے ہونٹوں کی تعریف میں پیش کیا ہے ؎

اس سیہ ابر میں یوں اُڑتے ہیں بگلے جیسے — لبِ مالیدہ مسی میں دُرِ دنداں کی صفا

فرحت نے اودی گھٹاؤں کے تلازمہ سے اس تشبیہ کو بڑی رنگینی دے دی۔

اب میں فرحت کی غزلیات پر تبصرہ کروں گا۔ ان کی طبیعت میں درد تھا اور انسانی فطرت اور جذبات کو بھی خوب سمجھتے تھے۔ اسی لئے اُن کے کلام میں غزلیات کی تعداد زیادہ ہے۔ قدما کے رنگ میں بھی لکھی ہیں اور دورِ حاضر کے رنگ میں بھی۔ میر کے طرز پر جو چھوٹی بحروں میں لکھی ہیں وہ بہت مقبول ہوئیں۔ ایک غزل کے چند اشعار جو میر کے رنگ کے ہیں سناتا ہوں ؎

اپنے بیمارِ غم کو دیکھ تو آ — کہتے ہیں ہوشیار ہے اب تک

حرماں نصیب عاشق کی آخری دم کی تمنا کو خوب بیان کیا ہے ؎

ہے خزاں اور دل کے زخموں سے — میرے گھر میں بہار ہے اب تک
موت آچک کہ غیر کے غم میں — دیکھ وہ سوگوار ہے اب تک
اُس کے وعدے کو ہوگئے برسوں — اور مجھے انتظار ہے اب تک

عشق کی لگن اور چینک کو آخری شعر میں کیسے مؤثر طریقے سے ادا کیا ہے۔ آخر میں اسی غزل میں کہتے ہیں ؎

کیا زمانہ بھی تھا جوانی کا — جس کا فرحت خمار ہے اب تک

ایک اور غزل کے بھی چند شعر سن لیجئے۔ جن میں فرحت کی اعلیٰ ذہنی صفات نمایاں ہیں ؎

زاہد تو بیکدے میں آجا اگر بتا دے — کیا تجھ سے نبھ سکیں گے آئینِ مے پرستی
اس عشق نے بھلا دی سب بزم آفرینی — خاموش ہوگیا ہے گویا کہ سازِ ہستی
شہرت طلب ہے شاید آہ و فغاں سے اپنے — یہ عاشقی نہیں ہے اے محوِ خود پرستی
کیا کیا نہ میرے دل میں ارماں بھرے ہوئے تھے — اور اب تو غم کے ہاتھوں ویران ہے یہ بستی

کم فرستی سبب ہے دُنیا میں کوششوں کا   ہے خوفِ مرگ ہی سے یہ سب بہارِ ہستی

فرحت تمھاری حالت کیوں کر ن بدن نہ بگڑے   اتنی بلند نظری اور ایسی تنگ دستی

اس غزل کے پہلے شعر میں حافظ کے رنگ کی جھلک نظر آتی ہے جنھوں نے زاہد ظاہر پرست کی خوب خبر لی ہے۔ دوسرے اور چوتھے شعر میں خارجی محاسن یعنی لفظی خوبیاں ہیں۔ مثلاً دوسرے شعر کے آخری مصرع میں "خاموش" اور "گویا" کا تضاد اور اسی طرح چوتھے شعر کے دوسرے مصرع میں "ویران" اور "بستی" کا تضاد پانچویں شعر میں مغربی فلسفہ کا اثر اور زندگی کی تگ و دو نمایاں ہیں۔ آخری شعر میں دورِ جدید کی شاعری کا رنگ ہے خطاب اپنے سے ہے لیکن متوسط طبقے کی تباہی بیان کی گئی ہے کہ آمدنی کم اور معیار زندگی یورپ والوں کا۔

تصوف نے عشقِ حقیقی کے رنگ میں مشرقی شاعری میں ایک خاص جاذبیت پیدا کر دی ہے۔ اب میں فرحت کی غزلیات کے ایسے اشعار سناؤں گا جن میں صوفیانہ عقاید موجود ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے۔

اُبلنے لگی جام میں خود شراب   جہاں ذکرِ دُردی کشاں آگیا

اس شعر میں عاشقانِ خدا کی محویت کے اثر سے جو شان غیر ذی حیات کائنات میں بھی نمودار ہو جاتی ہے اس کی طرف اشارہ ہے۔

یہ کعبہ ہے فرحت نہیں بتکدہ   بھٹک کر کہاں سے کہاں آگیا

کس طرح منزلِ دُنیوی سے منزلِ حقیقی تک انسان پہنچ سکتا ہے۔ اس کو نہایت لطیف پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے "بھٹک کر" یہ دو لفظ شعر کی جان ہیں۔ ایک اور غزل میں شاعر کی وسیع مشربی اور ذہنی پس منظر کو دیکھئے۔

کیوں ٹھیر گیا آخر وسطِ رہِ الفت میں   مسجد ہی سے نکلی ہے زاہد رہِ بتخانہ

فرحت کی طبیعت بھی اک راز ہے سربستہ   میکش تو نہیں لیکن کچھ رنگ ہے رندانہ

اپنے رُوحانی جوش کا کس خوبصورت انداز میں اظہار کیا ہے۔ حالی کی مشہور غزل کے تتبع میں یہ شعر ملاحظہ فرمایئے؎

گرے اپنی نظروں سے ہم خوار ہو کر   ابھی دیکھیں قسمت میں کیا خواریاں ہیں

زمانہ ہے عیش و مصیبت کا چکر   مگر آگے پیچھے کی یہ باریاں ہیں

قویٰ مضمحل ہو گئے سارے فرحت   یہ چلنے چلانے کی تیاریاں ہیں

آخری شعر میں غالب کے مشہور شعر کا مفہوم آگیا ہے؎

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب   اب عناصر میں اعتدال کہاں

عشقیہ رمز و کنایہ کو اس شعر میں نہایت خوبصورتی سے ادا کیا ہے؎

نگاہیں اُن کی تصدیقِ محبت کر کے کہتی ہیں   مگر دیکھو کسی سے تم نہ یہ رازِ نہاں کہنا

ایک غزل غالب کے طرز میں بھی سُن لیجئے۔ غالب کی بلند خیالی کو پہنچنا ہر شاعر کی قدرت میں نہیں، البتہ اس غزل کے ترنمی اثر کا کیا کہنا؎

دل مرا روزِ ازل سے بیقرارِ نغمہ ہے   ہر نفس اس کے لئے آوازِ تارِ نغمہ ہے

ہر مصیبت کیا، گزشتہ راحتوں کی یاد ہے   نوحہ بھی دیکھو تو گویا یادگارِ نغمہ ہے

ساز کی حاجت نہیں ہے نغمۂ جانسوز کو   گوشِ اہلِ ذوق کو ہر ساز عارِ نغمہ ہے

گوش بر آوازِ بلبل ہیں تو سب گل ہائے باغ   شاید ان کو اس فضا میں اعتبارِ نغمہ ہے

جل بجھے پہلو میں دل وہ چیز ہے سازِ دسرشد   درد کا اس میں جو پردہ ہے شرارِ نغمہ ہے

یہ نہیں آوازِ مطرب ہے رواں اک جوئبار
تان جو اس میں ہے گویا آبشارِ نغمہ ہے

ابر ہے ساقی ہے مے ہے اور زمانہ سازگار
چھیڑ مطرب وقت کی ہاں اب بہارِ نغمہ ہے

انقلابِ دہر میں جب رنج و غم کا بھی ہے دور
کیوں دلِ راحت طلب کو انتظارِ نغمہ ہے

میں کہاں فرحت کہاں اس طرزِ غالب میں غزل
یہ مگر روزِ ازل کا ہی خمارِ نغمہ ہے

فلسفیانہ خیالات اور حسنِ بیان کے لحاظ سے فرحت کی یہ غزل بہت مقبول ہوئی آپ بھی ملاحظہ فرمائیں ؎

ہوں مشتِ خاک لیکن ہستی کی داستاں ہوں
دیکھو تو کچھ نہیں ہوں سمجھو تو اک جہاں ہوں

صد حیف عمر ساری کس بے خودی میں گزری
یہ بھی کھلا نہ مجھ پہ میں کون ہوں کہاں ہوں

کس طرح قافلہ کے ہمراہ چل سکوں میں
جو اُٹھ کے بیٹھ جائے وہ گردِ کارواں ہوں

جس کی تلاش میں ہیں سارے جہاں کے رہرو
اس بے نشاں کا میں بھی دھندلا سا اک نشاں ہوں

آزادیٔ حقیقی ملتی ہے کس کو بلبل
تو ہے قفس میں اور میں پابندِ آشیاں ہوں

اس غزل میں یہ مصرع لاجواب ہے ع "اُس بے نشاں کا میں بھی دھندلا سا اک نشاں ہوں" تصوف کے رنگ میں فرحت نے بہت سی غزلیں لکھی ہیں جن میں بعض کو اہلِ ذوق نے بے حد سراہا ہے۔ مثلاً یہ غزل ؎

کس شان کے ساقی نے میخانے بنا ڈالے
جو ٹوٹے ہوئے دل تھے پیمانے بنا ڈالے

دل کس کا تھا اور ہم نے کس کس کو جگہ دی ہے
اس کعبے میں لاکھوں ہی بتخانے بنا ڈالے

یہ رازِ حقیقت کیا اوروں سے نہ چھپ سکتا
تو نے جو یہ ہم جیسے دیوانے بنا ڈالے

مذہب کے یہ سب جھگڑے بس اس لئے برپا ہیں
سمجھے نہ حقیقت کو افسانے بنا ڈالے

اے پیرِ مغاں ہم ہیں قائل تری جدت کے
مسجد کے نمونوں پر میخانے بنا ڈالے

میں کچھ نہ سہی فرحت اس قوم کا ہوں لیکن
فغفوروں کے سر جس نے پیمانے بنا ڈالے

اس غزل کے تیسرے اور چوتھے شعر میں حافظ کی مشہور غزل کے ان مصرعوں کے مضمون کو دہرایا گیا ہے ؎

"قرعہ فال بنامِ من دیوانہ زدند" اور "چوں ندیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند"

البتہ ان دو شعروں میں فرحت کی طباعی قابلِ داد ہے ؎

دل کس کا تھا اور ہم نے کس کس کو جگہ دی ہے
اس کعبے میں لاکھوں ہی بتخانے بنا ڈالے

اے پیرِ مغاں ہم ہیں قائل تری جدت کے
مسجد کے نمونوں پر میخانے بنا ڈالے

فرحت نے عشقِ مجازی کے رنگ میں انسانی فطرت اور فلسفیانہ عقاید کو نہایت مؤثر طریق پر سمویا ہے۔ اس غزل میں ان کے انداز کو ملاحظہ فرمائیے ؎

کیا نزاکت کیا ادا کیا ناز کیا انداز ہے
تیری صورت پر یدِ قدرت کو کیا کیا ناز ہے

ہر نگاہِ ناز گویا تیرِ بے آواز ہے
اس کی ناوک اُفگنی میں یہ غضب کا راز ہے

حسن طالب عشق کا اور عشق طالب حسن کا
تم کو مجھ پر ناز ہے اور مجھ کو تم پر ناز ہے

بے نیازی اور تیرا ناز کچھ ہیں ایک سے
فرق اتنا ہے کہ اس میں سوز اس میں ساز ہے

ہر قدم پر ہوتی ہے سیلِ حوادث پائے بوس
یہ ہماری زندگی ہے جس پہ یہ کچھ ناز ہے

ہاں نہ پوچھ ان بیکسوں کے دل کی کیفیت نہ پوچھ
یہ وہ گنجینہ ہے جس میں دو جہاں کا راز ہے

اے حریصِ زندگی کیوں موت سے ڈرتا ہے تو — زندگیٔ دائمی کا موت ہی آغاز ہے
مجھ کو فرحت شاعری میں دخل تو ہرگز نہیں — ہاں مری غزلوں کا بیشک اک نیا انداز ہے

مقطع میں انداز کے انوکھے پن کو کہہ تو گئے لیکن طبیعت چونکہ حق پسند اور جوہر شناس تھی اس لئے "میری شاعری" میں خود لکھتے ہیں "مقطع میں تعلّی کے علاوہ صریح جھوٹ ہے"۔ آگے چل کر لکھتے ہیں۔ "ارادہ ہوا تھا کہ "غزلوں" کی جگہ "شعروں" لکھ دوں، لیکن پھر خیال آیا اس طرح رعب کم ہو جائے گا اس لئے جھوٹ کو بحال خود رکھنا ہی مناسب سمجھا گیا۔"

فرحت کی شاعری پر جب بحیثیت مجموعی نظر ڈالی جاتی ہے تو ظرافت اور شوخی کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فرحت کو چاہ بہ حیثیت مضمون نویس دیکھیں، خواہ بہ حیثیت افسانہ نگار، خواہ بہ حیثیت شاعر شوخی اور بذلہ سنجی ان کی طبیعت کا خاص امتیاز ہیں، ان کی ظرافت ایک موج زن دریا تھی جس کی طغیانی بعض اوقات ان کے قابو سے بھی باہر ہو جاتی تھی۔ ان کی مزاحیہ نظموں کی ایک بڑی تعداد عوام میں مقبول ہو چکی ہے بچے اور بوڑھے، مرد اور عورت سب ان کو شوق سے پڑھتے اور سنتے ہیں۔ مدرسہ کے لڑکے اپنے جلسوں میں ان کو دہراتے ہیں۔ نفیس طبع لوگ اپنے کتب خانوں اور ملاقاتی کمروں میں ان کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ان نظموں میں ان کے "شکوہ" اور "جواب شکوہ" کو بہت شہرت حاصل ہو چکی ہے۔ یہ میاں بیوی کی آپس کی لڑائی کی روئداد ہے۔ لڑائی کی ابتدا روپے پیسے کی تنگی سے ہوتی ہے لیکن بدمزگی آخر میں بہت بڑھ جاتی ہے اور دونوں ایک دوسرے سے علیحدگی پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ آخر میں دوستوں اور عزیزوں کی نصیحت کام آتی ہے جو مذہبی اور سماجی ذمہ داریوں کو دونوں کو سمجھاتے ہیں۔ یہ نظمیں چونکہ بہت لمبی ہیں اس لئے آج کی مجلس میں ان کا پڑھنا ممکن نہیں، لیکن "میری شاعری" میں یہ دونوں نظمیں شائع ہو چکی ہیں اور میں ظرافت پسند بہنوں اور دوستوں سے کہوں گا کہ وہ ان نظموں کو ضرور پڑھیں۔ اس وقت میں آپ کو ایک اور نظم سناؤں گا جس سے آپ کو ان کے مذاق کی پاکیزگی اور بیساختہ پن کا اندازہ ہو سکے گا۔

کیا اسی واسطے پیدا ہوئے سنسار میں ہم — کہ دھرے جائیں سدا عشق کی بیگار میں ہم
اس بُری طرح پھنسے مجمع اغیار میں ہم — گھٹ کے دم مر ہی گئے کوچۂ دلدار میں ہم
شکل تو ایسی ہے واللہ کوئی مُنہ نہ لگائے — کچھ عجب ٹھاٹھ سے ہاں چھپتے ہیں اخبار میں ہم
ہم نے مانا کہ سنہ اُنیس کی ہی فورڈ سہی — کہیں جاتے ہیں تو جاتے ہیں مگر کار میں ہم
چھیڑ خانی سے حسینوں کی نہ باز آئیں گے — کیا ہُوا اگر کبھی پٹ بھی گئے بازار میں ہم
مان لیتے ہیں کہ ہم شکل میں گلفام نہیں — کچھ بُرے بھی نہیں یوں دیکھو تو دو چار میں ہم
لوگ سمجھیں کہ بھئی یہ تو بڑے عالم ہیں — بیٹھے رہتے ہیں کتابوں کے انبار میں ہم
شوق میں ڈانٹ تو لیتے ہیں پٹھانوں کا لباس — ہاں نظر آتے ہیں کچھ ریچھ سے شلوار میں ہم
کیا غضب ہے کہ عدو رولز رائس میں پھریں — اور گھسٹتے پھریں ٹوٹی ہوئی اک کار میں ہم

اس نظم میں دو تین مصرعے نہایت عمدہ ہیں ایک تو یہ "کچھ عجب ٹھاٹھ سے ہاں چھپتے ہیں اخبار میں ہم"۔ اوّل تو انسانی طلب شہرت کے جذبہ کا خاکہ اُڑایا ہے دوسرے اس دھوکے کو رفع کیا ہے کہ کس طرح فوٹو کے نیگیٹو کی تراش خراش سے بدصورت خوبصورت بن جاتے ہیں۔ "کچھ عجب ٹھاٹھ" کے الفاظ نے مصرعے کی زبان میں بڑی لطافت پیدا کر دی ہے۔

دوسرا مصرعہ جو شوخی اور ظرافت کی جان ہے یہ ہے۔ "کیا ہوا اگر کبھی پٹ بھی گئے بازار میں ہم" ایک مصرع میں "انبار" کا لفظ بھی بہت پُر لطف ہے۔

پہلے تذکرہ نویس جب کسی شاعر کی ہمہ گیر طبیعت کی تعریف کرتے تھے تو اکثر یہ جملہ لکھا کرتے تھے "برہمہ اصناف سخن قادر بود" یہ رائے فرحت کی شاعری کے تنوع پر پورے طور سے صادق آتی ہے۔ انھوں نے غزلیں لکھیں، مزاحیہ اور قومی نظمیں لکھیں، قصاید لکھے، مرثیے لکھے، رباعیاں اور مناجاتیں لکھیں، ہجو لکھی اور تاریخ گوئی کو بھی نہ چھوڑا۔ میں جب یورپ کے پہلے سفر سے ۱۹۲۴ء میں واپس آیا تو فرحت نے بڑے زور کا عصرانہ دیا اور ایک تاریخ بھی نظم کی۔ چونکہ وہ خود میرے بارے میں ہے اس لئے میں اُس کی تعریف نہیں کرسکتا، البتہ "میری شاعری" میں آپ اس کو ملاحظہ فرما سکتے ہیں اور داد دے سکتے ہیں۔ ہجو کی طرف فرحت کی طبیعت قدرتاً مائل تھی لیکن ان کا مذاق پاکیزہ تھا اور کلام میں کسی قسم کا ابتذال نہیں۔ ایک بناوٹی مولوی کی ہجو لکھی ہے، وہ آپ بھی سن لیجیے، آمد، تازگی اور شاعرہ ترصیع کاری ملاحظہ ہو ؎

ہجو

ایک صاحب ہیں مولوی صورت — ان کو مذہب سے ہے مگر نفرت
سب انھیں مولوی تو کہتے ہیں — پر وہ مذہب سے دور رہتے ہیں
ان کو مذہب سے کیا تعلق ہے، — اُن کا مذہب فقط تملق ہے
کب ہے ایسی کسی میں شان کہیں — سر کہیں منہ کہیں ہے کان کہیں
ان کی صورت بھی کیا تماشا ہے — گویا بکھرا ہوا بتاشا ہے
ہائے چہرہ پہ کیا رونق ہے — آدمی کیا ہے بس حونق ہے
کالی رنگت بہار دیتی ہے — بھینس سے بھی خراج لیتی ہے
آنکھیں چھوٹی ہیں ناک ہے موٹی — گال جیسے جلی ہوئی روٹی
چھاج سی داڑھی ایسی ان کی ہے — جیسے روئی کسی نے دھنکی ہے
یا کہیں آپ اس کو بے وسواس — کالی مسجد پہ خشک ہوگئی گھاس
مونچھیں ٹھوڑی تک ان کی آتی ہیں — اور اُڑ اُڑ کے منہ میں جاتی ہیں
جوش میں جب کبھی یہ آتے ہیں — اپنی مونچھوں کو کھائے جاتے ہیں
مونچھ منہ میں اگر نہیں جاتی — پھر تو داڑھی کی آتی ہے باری
ناک یہ مڑ کے منہ میں آئی ہے — پھکنی چولھے پہ یا جھکائی ہے
تر نوالہ کہیں جو یہ پائیں — کتے کی طرح لوٹ ہی جائیں
میوے آجائیں گر نظر ان کو — پھر نہیں رہتی کچھ خبر ان کو
اس طرح دونوں گلے بھرتے ہیں — جس پہ لنگور رشک کرتے ہیں
اب ذرا ان کے دیکھئے اطوار — ایسے اطوار پر خدا کی مار
شہر سے دُور دُور رہتے ہیں — ان کو گیدڑ جبھی تو کہتے ہیں
دُور جنگل میں اک ٹھکانا ہے — گویا الو کا آشیانا ہے
ساری دُنیا پہ تنگ دستی ہے — دولت ان کے ہی گھر برستی ہے
خوش مذاقی سے ان کو کام بھلا — اور ظرافت کو جانے ان کی بلا

گالیوں پر اُتر ہی آتے ہیں — بے نقط ان کو پھر سناتے ہیں

اب کوئی لاکھ ان کو سمجھائے — نہیں ممکن سمجھ میں کچھ آئے

کب کسی کی یہ بات مانتے ہیں — سب ہی بیہودہ ان کو جانتے ہیں

کون پرواہ ان کی کرتا ہے — گالیوں سے ضرور ڈرتا ہے

میں نے اس مضمون کے شروع میں فرحت کے ریختی لکھنے کا بھی ذکر کیا تھا۔ اس کا بھی نمونہ ملاحظہ فرمائیے۔ زبان کے لوچ، نسوانی خیالات اور چوچلے کو دیکھئے اور دل کھول کر ہنسئے۔ بی ہمسائی سے میاں کی شکایت ہو رہی ہے ؎

لڑاکا میں سہی اچھا پھوہڑ بھی ہیں سہی، مانا — مگر یہ بھی تو دیکھو حال کیا ہے خود بدولت کا

تھکی کہہ کہہ کے میں ان سے کہ چھوڑو اپنی یہ بانیں — نہیں جاتا مُوا جب پڑ گیا چسکا بُری لت کا

ایک موقع پر جب بال بچہ ہونے کے جلد آثار ہیں تو بی ہمسائی سے یوں مخاطب ہیں۔

دین ہے اُس کی آج دے کل دے — میں نے دائی مگر بلا لی ہے

اس شعر میں عورتوں کے روزمرہ کو نہایت صفائی سے ادا کیا ہے۔ فرحت کا مذاق ریختی میں بھی نہیں جاتا۔ کہتے ہیں ؎

میری ہمسائی یوں تو کالی ہے — پر مُوا کیا سلیقہ والی ہے

بازار میں پھرنے والی عورتوں کی گفتگو کا اس طرح حق ادا کیا ہے ؎

رستہ میں دن دہاڑے فرحت نے مجھ کو چھیڑا — میں نے بھی غل مچا کر سر پر اُٹھا لی بستی

فرحت کا مشرب نہایت وسیع تھا اور جب فرقہ وار فسادات کا حال سنتے تھے تو انھیں بے حد رنج ہوتا تھا۔ دلّی سے انھیں بے حد محبت تھی اور اگر زندہ رہتے تو وہاں کی بربادی کی دلخراش داستان سے خبر نہیں کتنا رنج ہوتا۔ اب میں چند اشعار ایک نظم کے سناتا ہوں جو انھوں نے فسادات اور قتل و خون سے متاثر ہو کر لکھی تھی۔ رنگ مزاحیہ ہے اور ہر شعر میں درد اور طنز کو نہایت کمال سے سمویا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

جہاں میں ہوں

نہ پوچھ اس شہر کی حالت تو اے ہمدم جہاں میں ہوں — کہ ہر گھر پہ چڑھے ہیں جنگ کے پرچم جہاں میں ہوں

سدا چلتی ہیں چھریاں اور سدا چاقو نکلتے ہیں — ہمیشہ رہتا ہے بس ہُو کا اک عالم جہاں میں ہوں

پہننے کے لئے ڈھونڈے بھی ملتی نہیں کھادی — جلا ڈالا ہے لاکھوں گز مگر ریشم جہاں میں ہوں

کبھی ہے جیپ کی پوں پوں کبھی ہے توپ کی گھڑ گھڑ — کبھی ہے فوجیوں کے پاؤں کی دھم دھم جہاں میں ہوں

اذاں کیسی کدھر کے سنکھ، کیسے چرچ کے گھنٹے — برتن کی ہاں مگر آواز ہے ہر دم جہاں میں ہوں

ہے نافذ کرفیو آڈر کھڑی ہے فوج سڑکوں پر — مگر پھر بھی مچا رہتا ہے اک اودھم جہاں میں ہوں

یہاں پتھر چلے، لاٹھی چلی، گولی چلی پہلے — مگر اب پھینکتے ہیں آنسوؤں کے بم جہاں میں ہوں

کہیں سڑکوں پہ زخمی ہیں کہیں گلیوں میں لاشیں ہیں — سمندر پر کسی کا ٹوٹتا ہے دم جہاں میں ہوں

ہے بجلی بند ٹیلیفون سب بیکار ہیں بالکل — کہ ٹوٹے ہیں یہاں سے واں تلک سب کھم جہاں میں ہوں

یہاں چھوٹے بڑے جتنے ہیں سب چکر میں آئے ہیں — اٹھائے پھر کسی کا کون آخر غم جہاں میں ہوں

نہ گھر میں اب جواں ہی ہے نہ بڈھا ہے نہ بچہ ہے — کسی کا کوئی آخر کیوں کرے ماتم جہاں میں ہوں

یہاں کی دیکھ کر حالت فلک کا دل بھر آیا ہے — نہیں ساون برستا رو رہا ہے موسم جہاں میں ہوں
کچھ ایسے زندگی سے آگئے ہیں تنگ مرد و زن — کہ اب کرنے لگے ہیں موت کو ویلکم جہاں میں ہوں
جدھر دیکھو اُدھر گزر جہاں جاؤ وہاں شورش — غرض میں کیا کہوں بس ناک میں ہے دم جہاں میں ہوں
یہاں مرنا بہت آسان ہے اور جینا مشکل ہے — غنیمت ہے کہ میں جیتا ہوں "تا اینم" جہاں میں ہوں
مصیبت کون سی ہے جو یہاں نازل نہیں ہوتی — ہے قصہ مختصر ہر وقت "می نالم" جہاں میں ہوں
نہ کپڑا تن کے ڈھکنے کو نہ روٹی پیٹ بھرنے کو — مگر پھر جی رہا ہوں "در چنیں عالم" جہاں میں ہوں

یہاں کے شور و شر سے اب تو یہ وحشت ہوئی فرحت
کہ اپنے آپ کو بھی "من نمی دانم" جہاں میں ہوں

دلی میں بارش نے مہاجرین پر جو پرانے قلعے کے کھلے میدان میں پڑے ہوئے تھے جو مصیبت ڈھائی تھی اُس کے لئے یہ دو شعر حسب حال ہیں ؎

یہاں کی دیکھ کر حالت فلک کا دل بھر آیا ہے — نہیں ساون برستا روتا ہے موسم جہاں میں ہوں
کچھ ایسے زندگی سے آگئے ہیں تنگ مرد و زن — کہ اب کہنے لگے ہیں موت کو ویلکم جہاں میں ہوں

فرحت کی شاعری کی خاص خوبیاں ان کی زبان کی شستگی، ان کے بیان کی صفائی اور اُن کی پاکیزہ ظرافت ہیں موجودہ زمانہ کے شاعروں میں شاید کم ایسے نکلیں جو ان محاسن کلام میں فرحت کا مقابلہ کر سکیں اور انہی خوبیوں کی وجہ سے ان کا نام مجھے اُمید ہے اُردو ادب کی تاریخ میں عرصہ تک باقی رہے گا۔ خدا اُن کی مغفرت فرمائے۔

غلام یزدانی

(اُردو مجلس حیدرآباد دکن میں پڑھا گیا)

غزل

آنکھوں میں پھر اشک جھلملائے — دامن سے کہو سمٹ نہ جائے
دیکھو! دلِ منزل آشنا بھی — تاریکیٔ غم میں کھو نہ جائے
کچھ رازِ وفا انھیں سے پوچھو — آنسو جو سرِ مژہ نہ آئے
یہ چشمِ کرم ــــ اتھاہ ساگر — جو ڈوب سکے وہ راز پائے
میں ترکِ وفا پہ مطمئن ہوں — اس پر بھی اگر وہ یاد آئے
یہ پائے طلب ہے دشت پیما — یوں کتنے مقام رہ میں آئے

میں اور جلیل یہ کشاکش!
آغازِ وفا ہی لوٹ آئے

جلیل کریر

سرفروش

وہ اُٹھی سازِ بغاوت کی لرزہ خیز ترنگ
وہ اُبھری سینۂ گیتی کی بیقرار اُمنگ
وہ گونج اُٹھا فضاؤں میں دیکھ نعرۂ جنگ
پُکارتا ہے مجھے ضربِ تیغ کا آہنگ
مرے رفیق مرا انتظار مت کرنا!

مرا یقیں مرا ایماں پکارتا ہے مجھے
مری وفا مرا پیماں پُکارتا ہے مجھے
نقیبِ داورِ دوراں پُکارتا ہے مجھے
بطونِ غیب سے انساں پُکارتا ہے مجھے
مرے رفیق مرا انتظار مت کرنا!

مری نگاہ میں ہے رقصِ شعلہ و شمشیر
مری زباں پہ خداوندِ عصر کی تکبیر
مری ہی مٹھی میں ہے آج دہر کی تقدیر
مرے لہو ہی سے ہوگی یہ داستاں تحریر
مرے رفیق مرا انتظار مت کرنا!

وہ دیکھ لشکرِ دشمن قریب آپہنچا
وہ شورِ ضربتِ آہن قریب آپہنچا
وہ دیکھ برق سے خرمن قریب آپہنچا
وہ دیکھ فتح کا دامن قریب آپہنچا
مرے رفیق مرا انتظار مت کرنا!

وطن کی بے بسی آواز دے رہی ہے مجھے
بشر کی خستگی آواز دے رہی ہے مجھے
زبانِ وقت کی آواز دے رہی ہے مجھے
اک اور زندگی آواز دے رہی ہے مجھے
مرے رفیق مرا انتظار مت کرنا!

وطن کی تازہ بہاروں میں دیکھنا مجھکو
جہانِ نو کے نظاروں میں دیکھنا مجھکو
فلک کے ٹوٹتے تاروں میں دیکھنا مجھکو
سخن کے شوخ شراروں میں دیکھنا مجھکو
مرے رفیق مرا انتظار مت کرنا!

شان الحق حقی

اُجالا

کردار:- دیوار — کتا — پاگل — ہذیانی —
وقت:- ۲ بجے رات

منظر:- ایک محراب دار کمرہ، دیواریں بوسیدہ، ستون شکستہ، چھت جالے سے اٹی ہوئی، محراب کے آگے ایک ناپختہ سڑک جس میں گہرے شگاف پڑے ہوئے ہیں۔ سڑک کے ادھر کنارے پر ایک لیمپ پوسٹ جو نظر نہیں آتا۔ لیمپ کی مدھم روشنی سامنے والی دیوار کو اُجاگر کر رہی ہے۔ سامنے والی دیوار کا پلستر بالکل اکھڑ چکا ہے۔ چھت کے قریب جابجا اینٹیں باہر کو نکلی ہوئی ہیں۔ اس دیوار پر سڑک سے گزرنے والی ہر چیز کا عکس پڑتا رہتا ہے۔ آدفعتہً پاؤں کی چاپ بلند ہوتی ہے۔ دو سائے سامنے والی دیوار پر حرکت کرنے لگتے ہیں — پاگل کالے کمبل میں مُنہ چھپائے چوروں کی طرح سرکتا ہوا محراب میں داخل ہوتا ہے اُس کے پیچھے پیچھے ایک کتا چلا آرہا ہے۔ بھورے رنگ کا مریل سا کتا — پاگل مُنہ سے کمبل سرکا کر سامنے والی دیوار کے آگے مؤدبانہ انداز میں کھڑا ہو جاتا ہے)

پاگل- (دیوار سے) ماں! میں آگیا ہوں ... تو میرے بغیر اُداس ہو گئی تھی نا؟ ... آج تیرے سینے پر کوئی سایہ سرکتا نظر نہیں آتا۔ تو شاید میرا انتظار کرتے کرتے سو گئی۔

دیوار- اڑاڑادھم (اینٹیں گرتی ہیں)

پاگل- میں سمجھا تو ابھی جاگ رہی ہے ... بچہ رات گئے تک واپس نہ آئے تو ماں بھی نہیں سو سکتی ... میں تیری مامتا کو جانتا ہوں نا۔

کتا- عف عف

پاگل- (کتے سے) بھیا، بڑوں کی باتوں میں دخل نہیں دیا کرتے ......
(قریب جا کر اسے پچکارتا ہے) تمھیں بھی نیند آرہی ہے کیا؟ تم بھی سو جاؤ ماں کے گرم پہلو میں ... سو جاؤ، سڑک بھی سو چکی ہے — راہگیر بھی سو چکے ہیں، اور دیکھو لیمپ کی شعاعیں بھی اونگھنے لگ گئی ہیں ... سو جاؤ بھیا .....
(کتا زمین سونگھتا ہوا دیوار کے پاس لیٹ جاتا ہے۔ پاگل دیوار سے ذرا ہٹ کر بیٹھنے ہی لگتا ہے کہ دیوار پر ایک اور سایہ نمودار ہو جاتا ہے)

پاگل- (چونک کر سائے سے) کون ہو تم؟ میری ماں کی نیند میں خلل ڈالنے والے .... چلے جاؤ،
(ہذیانی بیرونِ منظر سے جواب دیتا ہے)

ہذیانی- میں صبح سے کسی اجاڑ کی تلاش میں تھا۔ لیکن یہ جگہ بھی انسان کے گندے سانسوں سے اَٹی پڑی ہے۔

کتا- عف عف!

پاگل- (کتے سے) بھیا یہ کوئی پڑھا لکھا مہمان ہے .... اسے اندر آجانے دو (محراب کی طرف مُنہ پھیر کر) آجاؤ۔
(کھٹ کی آواز کے ساتھ ہذیانی داخل ہوتا ہے۔ لمبا تڑنگا انسان، سر پر گھنے بال، داڑھی فرنچ کٹ)

کتا- (ہذیانی کو دیکھ کر) عف عف عف

ہذیانی- (کتے سے) گالیاں دے رہے ہو مجھے ... ان گالیوں میں زیادہ زور پیدا کرو، انھیں زیادہ مہلک بناؤ۔ تاکہ تمھیں بھی اشرف المخلوقات کے نام سے پکارا جا سکے۔ (چاروں طرف دیکھ کر افسردہ لہجے میں) مجھے اجاڑ کی تلاش ہے (بیٹھ جاتا ہے)

پاگل- (ہذیانی سے) مجھے افسوس ہے کہ تم (کتے کی طرف اشارہ کرتا ہے) میرے بھائی کو غلط سمجھے ہو، یہ بڑا ہی شریف النفس ہے۔ تمھیں خوش آمدید کہہ رہا تھا (سر کھجلاتا ہے) اور رہاں تمھیں

اُجاڑ کی تلاش ہے! .... کیوں ؟

یانی - اس لئے کہ میں جس شہر میں جاتا ہوں لوگ میرے لامحدود دماغ کو تجارتی منڈیوں میں بند کرنے لگ جاتے ہیں -

گل - (حیرانی سے) یہ کیوں ؟

تا - عف

یانی - (کتے سے) تم میری باتوں میں دخل نہ دو .... (پاگل سے) ہاں تو وہ کہتے ہیں کہ تمھارے خیالات کی تاثیر گرم ہے - اس سے جنگلوں اور مال گوداموں میں آگ لگ جائے گی - اور پھر وہ کہتے ہیں کہ جب گندم بک سکتی ہے تو خیالات کیوں نہیں بک سکتے -

گل - ٹھیک ہی تو کہتے ہیں - تم جواب دے سکتے ہو کہ ایک ننھے سے خیال کے بدلے گندم کے بیس دانے لوں گا -

یانی - (جوش میں کھڑا ہو کر چلاتا ہے) بکتے ہو، بکتے ہو .... تم سب لوگ بکتے ہو - خیالات کبھی نہیں بک سکتے - مجھے اُجاڑ کی تلاش ہے -

(ہذیانی شور مچاتا ہے - کتا عف عف کرنے لگ جاتا ہے دیوار کی اینٹیں اڑاڑادھم گرتی ہیں)

پاگل - (ہذیانی سے) بس بس، اڑاڑادھم کی آواز سنی تم نے - تمھارے شور سے میری بوڑھی ماں کی نیند اُچٹ گئی ہے (دیوار سے) ماں یہ بڑھا مہمان بڑا بدتمیز ہے .... تم سو جاؤ -

ہذیانی - تم نے پہلے بھی ماں کا لفظ استعمال کیا تھا - .... دیوار بھی کسی کی ماں ہو سکتی ہے ؟

پاگل - اور یہ کتا میرا بھائی ہے -

کتا - عف عف

پاگل - دیکھو اپنا نام سُن کر چونک پڑا ہے .... ایسا ذہین بھائی آج تک کسی کو نصیب نہیں ہوا -

ہذیانی - (بڑبڑاتا ہے) بڑے بدمذاق سے پالا پڑا ہے ... (پاگل سے) جس طرح سورج کی شعاعیں زمین کو جکڑے ہوئے ہیں - جس طرح تارے زنجیروں کے بغیر ہوا میں لٹکتے ہیں، اسی طرح دیوار بھی ماں نہیں بن سکتی -

پاگل - تمھارے خیالات بہت پرانے ہیں - کل سورج کی شعاعیں زمین کو جکڑے ہوئے تھیں - آج زمین کے ذرے سورج کو جکڑے ہوئے ہیں - کل تاروں کا وجود ایک حقیقت تھا، آج وہ نامعلوم زنجیر حقیقت ہے جو آسمان اور تاروں کے درمیان رشتہ قائم رکھنے کے باوجود نظر نہیں آتی .... اور اسی طرح آج مائیں پتھر بن گئی ہیں اور پتھر کی دیواروں نے ماؤں کا روپ دھار لیا ہے

ہذیانی - یہ سب بکواس ہے .... پتھر کی دیوار انسان کو جنم نہیں دے سکتی -

پاگل - عام لوگوں کا بھی یہی خیال ہے - لیکن مجھ جیسے جیّد عالموں نے اس بھید کو پوری طرح پا لیا ہے کہ انسان عورت کے بطن سے پیدا نہیں ہوا بلکہ پتھروں سے اُگا ہے -

دیوار - اڑاڑادھم (اینٹیں گرتی ہیں)

پاگل - (دیوار سے) ماں معاف کرنا - ہم ذرا فلسفہ کی باتیں کر رہے ہیں

ہذیانی - تم نے ابھی کہا کہ تم جید عالم ہو ... اور پھر تم فلسفی بھی معلوم ہوتے ہو .... تم نے یہ فلسفہ اور علم کہاں سے حاصل کیا -

پاگل - (دیوار کی طرف اشارہ کر کے) اس نے میرے ضمیر میں چراغ جلائے اس نے میرے خیالوں میں قوس قزح کے رنگ بھرے -

کتا - عف عف

پاگل - (کتے کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے) اوہ بھائی میں تمھارا ذکر کرنا تو بھول ہی گیا ... (ہذیانی سے) اس نے بھی میری ماں سے تعلیم حاصل کی، یہ بھی جیّد عالم ہے -

ہذیانی - خیر تم کافی عجیب و غریب آدمی ہو .... تم فلسفی نہیں پاگل بھی ہو

پاگل - تم ایسے لوگ مجھے پاگل سمجھتے ہیں، لہذا میں عقلمند ہوں ... میری ماں نے مجھے اور میرے بھائی کو تعلیم کیسے دی؟ ... لو سنو میری ماں کے پاس لاتعداد تصویریں ہیں اور لاتعداد آوازیں — یہ تصویریں اور آوازیں مختلف سانچوں میں ڈھل کر میرے اور میرے بھائی کے ذہن میں حلول کر گئی ہیں اور ہم حیرت انگیز طور پر عقلمند ہو گئے ہیں -

ہذیانی - (کھویا ہوا ہے) وہ کیسے ؟

پاگل - نہیں سمجھے ؟ — (دیوار کی طرف اشارہ کرتا ہے) وہ دیکھو تین سائے، ہمارے تین سائے - میری ماں کے پاس ایسی لاکھوں

اُجالا

کردار: دیوار — کتّا — پاگل — ہذیانی —

وقت: ۲ بجے رات

منظر: ایک محراب دار کمرہ، دیواریں بوسیدہ، ستون شکستہ، چھت جالے سے اٹی ہوئی، محراب کے آگے ایک ناپختہ سڑک جس میں گہرے شگاف پڑے ہوئے ہیں۔ سڑک کے ادھر کنارے پر ایک لیمپ پوسٹ جو نظر نہیں آتا۔ لیمپ کی مدھم روشنی سامنے والی دیوار کو اُجاگر کر رہی ہے۔ سامنے والی دیوار کا پلستر بالکل اکھڑ چکا ہے۔ چھت کے قریب جابجا اینٹیں باہر کو نکلی ہوئی ہیں۔ اس دیوار پر سڑک سے گزرنے والی ہر چیز کا عکس پڑتا رہتا ہے۔ [دفعتہً پاؤں کی چاپ بلند ہوتی ہے۔ دو سائے سامنے والی دیوار پر حرکت کرنے لگتے ہیں — پاگل کالے کمبل میں مُنہ چھپائے چوروں کی طرح سرکتا ہوا محراب میں داخل ہوتا ہے اُس کے پیچھے پیچھے ایک کتّا چلا آ رہا ہے۔ بھورے رنگ کا مریل سا کتا — پاگل مُنہ سے کمبل سرکا کر سامنے والی دیوار کے آگے مودّبانہ انداز میں کھڑا ہو جاتا ہے]

پاگل - (دیوار سے) ماں! میں آگیا ہوں..... تو میرے بغیر اُداس ہو گئی تھی نا؟..... آج تیرے سینے پر کوئی سایہ سرکتا نظر نہیں آتا۔ تو شاید میرا انتظار کرتے کرتے سو گئی۔

دیوار - اڑاڑ ادھم (اینٹیں گرتی ہیں)

پاگل - میں سمجھا تو ابھی جاگ رہی ہے..... بچہ رات گئے تک واپس نہ آئے تو ماں بھی نہیں سو سکتی..... میں تیری ممتا کو جانتا ہوں ماں۔

کتّا - عف عف

پاگل - (کتے سے) بھیّا، بڑوں کی باتوں میں دخل نہیں دیا کرتے......
(قریب جا کر اسے پچکارتا ہے) تمھیں بھی نیند آ رہی ہے کیا؟ تم بھی سو جاؤ ماں کے گرم پہلو میں..... سو جاؤ، سڑک بھی سو چکی ہے — راہگیر بھی سو چکے ہیں، اور دیکھو لیمپ کی شعاعیں بھی اونگھنے لگ گئی ہیں..... سو جاؤ بھیّا.....

(کتا زمین سونگھتا ہوا دیوار کے پاس لیٹ جاتا ہے۔ پاگل دیوار سے ذرا ہٹ کر بیٹھنے ہی لگتا ہے کہ دیوار پر ایک اور سایہ نمودار ہو جاتا ہے)

پاگل - (چونک کر سائے سے) کون ہو تم؟ میری ماں کی نیند میں خلل ڈالنے والے..... چلے جاؤ،

(ہذیانی بیرونِ منظر سے جواب دیتا ہے)

ہذیانی - میں صبح سے کسی اجاڑ کی تلاش میں تھا۔ لیکن یہ جگہ بھی انسان کے گندے سانسوں سے اٹی پڑی ہے۔

کتّا - عف عف!

پاگل - (کتے سے) بھیا یہ کوئی پڑھا لکھا مہمان ہے..... اسے اندر آجانے دو (محراب کی طرف مُنہ پھیر کر) آجاؤ۔

(کھٹ کی آواز کے ساتھ ہذیانی داخل ہوتا ہے۔ لمبا تڑنگا انسان، سر پر گھنے بال، داڑھی فرنچ کٹ)

کتّا - (ہذیانی کو دیکھ کر) عف عف عف

ہذیانی - (کتے سے) گالیاں دے رہے ہو مجھے..... ان گالیوں میں زیادہ زور پیدا کرو، انھیں زیادہ مہلک بناؤ۔ تاکہ تمھیں بھی اشرف المخلوقات کے نام سے پکارا جا سکے۔ (چاروں طرف دیکھ کر افسردہ لہجے میں) مجھے اجاڑ کی تلاش ہے (بیٹھ جاتا ہے)

پاگل - (ہذیانی سے) مجھے افسوس ہے کہ تم (کتے کی طرف اشارہ کرتا ہے) میرے بھائی کو غلط سمجھے ہو، یہ بڑا ہی شریف النفس ہے۔ یہ تمھیں خوش آمدید کہہ رہا تھا (سر کھجلاتا ہے)، اور رہاں تمھیں

اُجاڑ کی تلاش ہے!.... کیوں؟

ہذیانی ۔ اس لئے کہ میں جس شہر میں جاتا ہوں لوگ میرے لامحدود دماغ کو تجارتی منڈیوں میں بند کرنے لگ جاتے ہیں۔

پاگل ۔ (حیرانی سے) یہ کیوں؟

کتا ۔ عف

ہذیانی ۔ (کتے سے) تم میری باتوں میں دخل نہ دو.... (پاگل سے) ہاں تو وہ کہتے ہیں کہ تمہارے خیالات کی تاثیر گرم ہے ۔ اس سے جنگلوں اور مال گوداموں میں آگ لگ جائے گی ۔ اور پھر وہ کہتے ہیں کہ جب گندم بک سکتی ہے تو خیالات کیوں نہیں بک سکتے۔

پاگل ۔ ٹھیک ہی تو کہتے ہیں ۔ تم جواب دے سکتے ہو کہ ایک ننھے سے خیال کے بدلے گندم کے بیس دانے لوں گا۔

ہذیانی ۔ (جوش میں کھڑا ہو کر چلاتا ہے) بکتے ہو بکتے ہو.... تم سب لوگ بکتے ہو۔ خیالات کبھی نہیں بک سکتے ۔ مجھے اُجاڑ کی تلاش ہے۔

(ہذیانی شور مچاتا ہے ۔ کتا عف عف کرنے لگ جاتا ہے' دیوار کی اینٹیں اڑاڑ ادھم گرتی ہیں)

پاگل ۔ (ہذیانی سے) بس بس' اڑاڑ ادھم کی آواز سنی تم نے ۔ تمہارے شور سے میری بوڑھی ماں کی نیند اُچٹ گئی ہے (دیوار سے) ماں یہ بڑھا مہمان بڑا بدتمیز ہے .... تم سو جاؤ۔

ہذیانی ۔ تم نے پہلے بھی ماں کا لفظ استعمال کیا تھا .... دیوار بھی کسی کی ماں ہو سکتی ہے؟

پاگل ۔ اور یہ کتا میرا بھائی ہے۔

کتا ۔ عف عف

پاگل ۔ دیکھو اپنا نام سُن کر چونک پڑا ہے .... ایسا ذہین بھائی آج تک کسی کو نصیب نہیں ہوا۔

ہذیانی ۔ (بڑبڑاتا ہے) بڑے بدمذاق سے پالا پڑا ہے ... (پاگل سے) جس طرح سورج کی شعاعیں زمین کو جکڑے ہوئے ہیں ۔ جس طرح ستارے زنجیروں کے بغیر ہوا میں لٹکتے ہیں' اسی طرح دیوار بھی ماں نہیں بن سکتی۔

پاگل ۔ تمہارے خیالات بہت پرانے ہیں ۔ کل سورج کی شعاعیں زمین کو جکڑے ہوئے تھیں ۔ آج زمین کے ذرے سورج کو جکڑے ہوئے ہیں ۔ کل ستاروں کا وجود ایک حقیقت تھا' آج وہ نامعلوم زنجیر حقیقت ہے جو آسمان اور ستاروں کے درمیان رشتہ قائم رکھنے کے باوجود نظر نہیں آتی.... اور اسی طرح آج مائیں پتھر بن گئی ہیں اور پتھر کی دیواروں نے ماؤں کا روپ دھار لیا ہے

ہذیانی ۔ یہ سب بکواس ہے.... پتھر کی دیوار انسان کو جنم نہیں دے سکتی۔

پاگل ۔ عام لوگوں کا بھی یہی خیال ہے ۔ لیکن مجھ جیسے جیّد عالموں نے اس بھید کو پوری طرح پا لیا ہے کہ انسان عورت کے بطن سے پیدا نہیں ہوا بلکہ پتھروں سے اُگا ہے۔

دیوار ۔ اڑاڑ ادھم (اینٹیں گرتی ہیں)

پاگل ۔ (دیوار سے) ماں معاف کرنا ۔ ہم ذرا فلسفہ کی باتیں کر رہے ہیں

ہذیانی ۔ تم نے ابھی کہا کہ تم جید عالم ہو .... اور پھر تم فلسفی بھی معلوم ہوتے ہو.... تم نے یہ فلسفہ اور علم کہاں سے حاصل کیا۔

پاگل ۔ (دیوار کی طرف اشارہ کر کے) اس نے میرے ضمیر میں چراغ جلائے اس نے میرے خیالوں میں قوس قزح کے رنگ بھرے۔

کتا ۔ عف عف

پاگل ۔ (کتے کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے) اوہ بھائی میں تمہارا ذکر کرنا تو بھول ہی گیا ... (ہذیانی سے) اس نے بھی میری ماں سے تعلیم حاصل کی' یہ بھی جیّد عالم ہے۔

ہذیانی ۔ خیر تم کافی عجیب و غریب آدمی ہو.... تم فلسفی نہیں پاگل بھی ہو

پاگل ۔ تم ایسے لوگ مجھے پاگل سمجھتے ہیں' لہذا میں عقلمند ہوں... میری ماں نے مجھے اور میرے بھائی کو تعلیم کیسے دی؟ ... لو سنو

• میری ماں کے پاس لاتعداد تصویریں ہیں اور لاتعداد آوازیں ـــ یہ تصویریں اور آوازیں مختلف سانچوں میں ڈھل کر میرے اور میرے بھائی کے ذہن میں حلول کر گئی ہیں اور ہم حیرت انگیز طور پر عقلمند ہو گئے ہیں۔

ہذیانی ۔ (کھویا ہوا ہے) وہ کیسے؟

پاگل ۔ نہیں سمجھے؟ ـــ (دیوار کی طرف اشارہ کرتا ہے) وہ دیکھو تین سائے' ہمارے تین سائے ۔ میری ماں کے پاس ایسی لاکھوں

تصویریں ہیں یہ اس نگارستان یا شہزادے کی تصویر جو محراب
کے باہر گزر رہا ہو۔

ہذیانی۔ ٹھیک (سوچتا ہے) (وقفہ)

پاگل۔ میری آواز کی گونج سُن رہے ہونا؟ ... میری ماں کے پاس ایسی لاکھوں آوازیں ہیں۔ میدانوں، شہروں اور جنگلوں میں بجتی ہوئی شہنائیاں میری ماں کی گود میں چکر کاٹ کر ہمارے کانوں میں اُتر جاتی ہیں۔ میری ماں دنیا کی سب سے بڑی معلمہ ہے یہ کمرہ دنیا کی سب سے بڑی درسگاہ ہے اور ہم یہیں ہیں اور میرا بھائی یہاں کے سب سے بڑے طالب علم۔

دیوار۔ اڑاڑا دھم (اینٹیں گرتی ہیں)

ہذیانی۔ (دیوار کی طرف اشارہ کرکے) اگر یہ تمہاری ماں ہے تو اسے کہو سو جائے ...... اڑاڑا دھم کی کرخت آواز سے میرے کانوں کے پردے پھٹنے لگے ہیں۔

پاگل۔ شاید اسے آج نیند نہ آئے .... یہ تین دن سے بیمار ہے۔

ہذیانی۔ بیمار ہے .... کیا بیماری ہے اسے (دیوار کی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھتا ہے)

پاگل۔ تین دن ہوئے قریب ہی کسی نے برف خانہ کھولا ہے ... اس کی گرانبار مشین نے ارگرد کی زمین پر بڑا ناگوار اثر ڈالا۔ جس سے میری ماں کی صحت بھی خراب ہوگئی .... اُسے رعشہ ہوگیا ہے اور اس کے اعضا ایک ایک کرکے گرتے جارہے ہیں۔

دیوار۔ اڑاڑا دھم (اینٹیں گرتی ہیں)

پاگل۔ ایک اور عضو گر گیا ..... ماں میں تجھے مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔

ہذیانی۔ تم اپنے بھائی کو ساتھ کر برف خانہ پر حملہ کیوں نہیں کر دیتے؟

کتا۔ عف عف عف

ہذیانی۔ لو تمہارا بھائی بھی تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہے۔

پاگل۔ میں نے شہر والوں کو کہتے سُنا ہے کہ برف خانہ کھلنے سے انھیں بہت فائدے ہوگئے ہیں ... میری ماں خود مر جائے گی لیکن برف خانہ تباہ نہ ہونے دے گی ... وہ شہر والوں کا دکھ نہیں دیکھ سکتی وہ ماں ہے سب کی ماں ... (دیوار کو دیکھ کر) .... ماں!

دیوار۔ اڑاڑا دھم (اینٹیں گرتی ہیں)

ہذیانی۔ ایک اور عضو گر گیا، بیماری خطرناک صورت اختیار کر رہی ہے

پاگل۔ جب کوئی بیمار مر رہا ہو تو اس کے رشتہ دار اس کے گرد جمع ہوجاتے ہیں اور دیئے کی دھیمی روشنی میں اس کے بیتے ہوئے دنوں کا تذکرہ چھیڑ دیتے ہیں۔ میری ماں مر رہی ہے۔ میں اُس کی گزری ہوئی زندگی کو دُہرانا چاہتا ہوں۔ تم سنوگے کیا؟

ہذیانی۔ کوئی نئی بات سناؤ۔ تم اپنی مرتی ہوئی ماں کا ذکر کروگے تو میں قہقہے لگانا شروع کردوں گا۔ جنازے دیکھ دیکھ کر میری آنکھیں منجمد ہوگئی ہیں میں تمہیں ایک آنسو بھی پیش نہیں کر سکتا۔

کتا۔ عف عف

ہذیانی۔ (کتے سے خوفزدہ ہوکر) اچھا بھائی سنتا ہوں۔ لیکن دیکھو یہ بدلحاظی اچھی نہیں .... (پاگل سے) سناؤ۔

پاگل۔ چالیس برس کی عمر میں داخل ہوتے ہی مجھے یک بیک علم ہوگیا کہ میں بچہ ہوں چنانچہ میں کسی ماں کی تلاش میں شہر بشہر گھومنے لگا۔

ہذیانی۔ چالیس برس کا بچہ؟ بڑے بھونڈے قسم کا مذاق کر رہے ہو۔

پاگل۔ تمہاری عمر کیا ہے؟

ہذیانی۔ ساٹھ برس۔

پاگل۔ تم بھی ابھی بچے ہو۔ تو خیر ماں کی تلاش میں میں نے کائنات کا چپہ چپہ چھان مارا۔ اونچے پہاڑ، پست وادیاں، زمین دوز غاریں میں نے سب کچھ دیکھا، اور یہ بھی دیکھا کہ ہر شے کی آستین میں نشتر چھپے ہوئے ہیں ۔۔ ماں کہیں نہ مل سکی۔

ہذیانی۔ (دلچسپی لیتے ہوئے) پھر؟

پاگل۔ آخر ایک دن تھک ٹوٹ کر میں اس محراب میں آکر لیٹ گیا اور یہ دیوار؟ ۔۔ اس کے خنک سایوں نے مجھے تھپک کر سلا دیا جب میں سو کر اُٹھا تو مجھے محسوس ہونے لگا جیسے اس دیوار کی آستین میں کوئی نشتر نہیں ۔۔ میں نے ماں کہہ کر اس کے پاؤں پکڑ لیے۔

ہذیانی۔ تمہارے آنے سے پہلے تمہاری ماں کی گود صدیوں تک خالی رہی ہوگی ..... جب سے عقل باریک ہوگئی ہے، بیٹوں کا قحط پڑ گیا ہے۔

پاگل۔ (غصے سے) مجھے اپنی بات ختم کر لینے دو۔ بیٹھ گئے فلسفہ بگھارنے۔

ہذیانی۔ تم بھی تو جوش میں آؤ۔ اپنی مرتی ہوئی ماں کا سوگ منانے بیٹھے ہو یا مجھ سے جنگ کرنے۔

پاگل۔ (منہ بسور کر) واقعی مجھے تو عورتوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہئے۔ تم ہی بتاؤ رونا شروع کر دوں یا اپنی کہانی جاری رکھوں۔

ہذیانی۔ مجھے تمہارا رونا پسند نہ آئے گا۔ تمہارے گلے میں رس نہیں، کہانی سناؤ

پاگل۔ تو دوسرے ہی دن میں نے اپنی ماں کو ساری دکھ بھری داستان سنا دی میں نے کہا، ماں میں بالکل بچہ ہوں، بالکل اکیلا ہوں، بجلیاں میرا پیچھا کر رہی ہیں۔ بگولے مجھ پر کمندیں پھینک رہے ہیں۔ پُراسرار خلا میرے خلاف سرگوشیاں کر رہے ہیں، مجھے بچاؤ۔ (ہاتھ کی جنبش سے ہذیانی کو متوجہ کرتے ہوئے) اور تم جانتے ہو میری ماں نے مجھے کیا جواب دیا؟

ہذیانی۔ کیا جواب دیا؟

پاگل۔ اس کا جواب یہی تھا کہ اُس نے مجھے بجلیوں، بگولوں اور طوفانوں کی زد سے بچا لیا۔ ایک دفعہ بجلیاں میرا تعاقب کر رہی تھیں میری ماں بڑھ کر درمیان آ گئی، اس کا آدھا جسم جل کر سیاہ ہو گیا۔ لیکن مجھے آنچ تک نہ آئی۔ اسی طرح بگولوں اور طوفانوں نے مجھ پر کئی بار حملے کئے۔ لیکن میری ماں اپنے سینے پر چوٹ سہہ کر مجھے بچا لیتی رہی — دیکھو ان چوٹوں کے نشان..... بیچاری کا جبڑا ٹوٹ چکا ہے سینہ پھٹ چکا ہے..... ایک طرف ہڈیاں باہر کو اُبھر آئی ہیں اُس نے میرے لئے کیا کچھ نہ کیا..... ہائے ماں!

ہذیانی۔ تمہاری باتیں سن کر میرے دماغ کے تمام اُفق روشن ہو گئے اب مجھے اُجاڑ کی تلاش نہ ہو گی۔

پاگل۔ میں نے جان بوجھ کر آسان زبان میں باتیں کیں تاکہ تم انہیں بخوبی سمجھ سکو۔

ہذیانی۔ پتھر بولتے ہیں، پھول محسوس کرتے ہیں، ندیاں سنتی ہیں، زندگی سب جگہ موجود ہے، جس کے سینے میں دل ہے اس کے لئے ہر اجاڑ امید و بیم کا شورش کدہ ہے... سنو سنو کائنات کے سب ذرے مل کر گا رہے ہیں

(ہذیانی اُٹھ کر ناچنا شروع کر دیتا ہے)

پاگل۔ میری ماں مر رہی ہے اور تم ناچنے لگے ہو — بیٹھ جاؤ۔

ہذیانی۔ (بیٹھتے ہوئے) لو میں بیٹھ گیا — (کتے کو دیکھ کر) ایں یہ کیا؟ تمہارا بھائی، تو خراٹے لے رہا ہے۔

پاگل۔ بیچارہ تین تین راتیں جاگتا رہا ہے، ماں کی تیمارداری کرتا رہا۔ میں ابھی اسے جگا دوں گا تاکہ اپنی مرتی ہوئی ماں کا آخری بار منہ دیکھ سکے۔

ہذیانی۔ یہ تمہارا بھائی کیسے بنا؟

پاگل۔ برسوں اُدھر — میں ایک تاریک گلی میں سے گزر رہا تھا کہ چند انسان بھوں بن کر مجھ سے چمٹ گئے۔ اس نے انسان بن کر ان کا مقابلہ کیا اور مجھے خلاصی دلائی ان دنوں یہ بہت تندرست تھا اور بلیغ سے بلیغ تقریریں کر سکتا تھا۔

ہذیانی۔ تمہاری ماں دیر سے چپ ہے۔ بیماری میں افاقہ ہو گیا ہے شاید؟

پاگل۔ نہیں یہ سکراتِ موت کے عالم میں ہے — وہ دیکھو شعاعیں ماند پڑ گئیں ہیں لیمپ بجھنے ہی والا ہے۔ ہاتھ اٹھاؤ ماں کے حق میں دعا کریں۔

ہذیانی۔ کس سے دعا مانگوں، میں خدا کو نہیں مانتا۔ ذرہ ذرے سے ٹکرا رہا ہے آفتاب آفتاب سے اُلجھ رہا ہے خلا خلا کو نگل رہا ہے — خدا کا نام لے کر ہر شے تباہی مچا رہی ہے۔

پاگل۔ آؤ ہم فطرت سے خطاب کریں، فطرت میں شعور ہے، فطرت میں احساس ہے۔ ہماری دعائیں بیکار نہ جائیں گی، ہاتھ اٹھاؤ، ماں سکراتِ موت کے عالم میں ہے (دونوں آنکھیں بند کر کے ہاتھ اٹھاتے ہیں۔ کمرہ میں مکمل سکوت چھا جاتا ہے)

(وقفہ)

[دفعتہً لیمپ بجھ جاتا ہے۔ کمرہ میں تاریکی پھیلتے ہی دیوار لرز کر گر جاتی ہے کتا ملبہ کے نیچے دب جاتا ہے اور ایک دو ٹوٹی آوازیں نکالنے کے بعد ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جاتا ہے۔ دیوار کے اُس پار سورج طلوع ہو رہا ہے ملگجے اُجالے میں ایک ٹنڈ منڈ درخت چپ چاپ کھڑا ہے۔ ہذیانی اور پاگل دونوں آہستہ آہستہ اُٹھتے ہیں۔]

پاگل۔ میری مہربان ماں مر گئی.... تصویریں اور آوازیں منتشر ہو گئیں، آج سے یہ ڈیرا بھی اُجڑ گیا۔

ہذیانی۔ تمہاری ماں مرتے ہوئے تمہارے بھائی کو بھی ساتھ لے گئی۔

پاگل۔ دونوں سہارے ٹوٹ گئے، دونوں ساتھی بچھڑ گئے... ہائے مہرباں ماں۔

ہذیانی۔ تمہارا سہارا ٹوٹ گیا اور میں بے سہارا ہوں۔ آؤ سورج کی روشنی میں کوئی موزوں جگہ تلاش کریں اور اپنے سہارے چنیں.... آؤ... وہ دیکھو سورج طلوع ہو رہا ہے۔ (ہذیانی پاگل کو بازو سے کھینچتا ہے)

پاگل۔ (جاتے ہوئے) ماں کی لاش کو آخری سلام کہہ جا رہا ہوں اپنا سہارا آپ بننے —!

(دونوں جاتے ہیں)

(حلقۂ اربابِ ذوق لاہور میں پڑھا گیا)

ظہیر کاشمیری

سوزِ ناتمام

دردمندی کا مل گیا انعام　　دل کی ہر چوٹ ہو چلی آرام
عشرتِ درد کے سوا بھی مجھے　　چاہیئے شوق کا کوئی پیغام
کیوں مرے رہبروں نے رکھا ہے　　اپنی درماندگی کا منزل نام
آپ کی چارہ سازیاں معلوم　　دردِ دل کا ہُوا دَوا انجام
غم زدہ خوش بھی ہو نہیں سکتے　　ایک اک سانس ہے تمھارا نام

کیوں جورَ میں شان ہے کرم کی　　دل آپ ہی بدگماں ہے اپنا
جیتے ہیں اس آسرے پہ قیدی　　باغ اپنا ہے باغباں ہے اپنا
اِس برق و بلا میں باغ کی خیر　　ہر شاخ پہ آشیاں ہے اپنا
احساس کی شدّتیں بلا ہیں　　ایک ایک نفس گراں ہے اپنا
بیداد ہے مجھ پہ ترکِ بیداد　　دشمن ابھی آسماں ہے اپنا

انداز تجمّلِ حسن ادائیں پھر بھی وہ مستور رہے
اللہ رے اوجِ نظارہ نظّارے میں کیا کیا طوُر رہے

تابش دہلوی

پناہ

افتاد

سمٹتے ہوئے اُجالوں کے تعاقب میں رواں لاری کے آگے، جیسے کسی نے پتھر رکھ دیا" روک کے ناگہانی عمل کی وجہ سے گڑگڑاتے ہوئے پہیوں سے ایک دلدوز کراہ بلند ہوئی اور تمام مسافر اکڑوں ہو کر بیٹھ گئے کہ شاید منزل آگئی، لیکن منزل ابھی کہاں؟ — یہ تو ایک لق و دق ویرانہ تھا، جہاں چار سو ملگجے اندھیروں اور سنسناتی ہوئی خموشیوں کے مابین سرگوشیاں جاری تھیں، بھنبھناتے ہوئے انجن نے دم سادھا تو مسافروں نے لاری رُک جانے کی وجہ معلوم کرنے کے لئے دریچیاں کھول لیں۔ پناہ گزین منیب نے بھی سامنے پھیلائے ہوئے اخبار کو الگ ہٹا کر باہر کی طرف توجہ کی اور انجن کی بغل میں اُسے ایک سبز پوش فوجی افسر کا منحنی سا ہیولیٰ نظر آیا، جس کے شانے پر آویزاں پیتل کا ایک پھول کجلائی ہوئی دھندلاہٹوں میں ہڈی کے پُرانے بٹن کی طرح چمک رہا تھا۔ جمعدار کے پہلو میں ایک اور کا ہیدہ جسم فوجی جوان، سنگین چڑھی ہوئی رائفل تھامے اور ایک تھکے ہوئے گھوڑے کی طرح ایک گھٹنا نہوڑائے استادہ تھا اور اس سے ذرا ہٹ کر سیلٹی سڑک کے دوسرے کناروں پر ایک بھوسلی سی فوجی جیپ، بطن میں ایک سیاہ خلا سمائے کھڑی تھی ...... دفعتاً لاری کی فرنٹ سیٹ کلبلائی تو منیب ادھر متوجہ ہوا۔ اُس پر قابض تھانیدار صاحب نے شمپین کی بوتل کو الگ ہٹا کر اپنی اُبلتی ہوئی شخصیت کو لاری کی ننھی سی گزرگاہ میں سے ایک بگولے کی طرح گزارا، نخوت کی بھاپ کی ایک تیز رَو لپکی اور منیب کا ذہن تپنے لگا۔

عقبی کھڑکی میں سے مسافروں کا ایک گروہ سڑک پر کود آیا، اور منیب نے بھی اپنی میل خوردہ ٹوپی کے لوتھڑے کو سر پر جما کر اور اپنے بٹنوں سے عاری کوٹ کے کھنڈرات کو بغلوں میں اُڑس کر لاری سے چھلانگ لگائی تو اُس نے دیکھا کہ لاری کے انجن کی سیدھ میں ذرا ہٹ کر چند انسان نما چیزوں کا ایک چھوٹا سا ہجوم سڑک پر ایک پھسپھسے سے ٹیلے کی مانند کھڑا ہے اور ان کی طرف پشت کئے دُور ایک جھاڑی کے پاس، تھانیدار صاحب اپنے بازوؤں کو کولھوں پر جمائے اور جسم کے دونوں طرف تکونیں بنائے کھڑے ہیں اور فوجی جمعدار ایک تکون میں اپنے مجوب ہاتھ کے ساتھ عمود گرانے کی سعی کر رہا ہے، تھانیدار صاحب کی تازہ کلف لگی ہوئی پگڑی کا طرّہ ایک اصیل مرغے کی مانند سارے ماحول میں تن کر کھڑا تھا اور اُن کے سر کی خفیف سی جنبش کے ساتھ ایک پھن اُٹھائے ہوئے ناگ کی مانند ادھر سے اُدھر لپک جاتا تھا۔ ناگہاں تھانیدار صاحب اپنی بغلی تکونوں کو برقرار رکھتے اور فوجی جمعدار کے عمود کو نخوت کی قینچی سے کاٹتے ہوئے برق وار پیچھے ہٹے اور پھر ڈگ بھرتے اس پھسپھسے سے ہجوم کے سامنے جم گئے۔

"کون ہو تم؟" پولیس کا شیر دھاڑا۔

"پناہ گیر ہیں ہجُور" اُن انسان نما چیزوں میں سے ایک چیز دھیمے سے آگے کھسکی اور پھر جیسے پاتال سے آواز آئی پناہ گزین ہیں ہجُور ہمارا کچھ قصور نہیں"

"کون ضلع؟"

"پھروج پور، ژناب، بڑے وبال ——"

"ہوں۔ ں۔ ں! تو تمہیں ہو وہ جنھوں نے پچھلے ہفتہ سے میرے علاقے میں چوریوں سے اُدھم مچا رکھا ہے۔ فیروز پور سے میں خوب واقف ہوں"

"مگر ہجور، ہم تو ابھی ابھی یہاں اُترے ہیں، وہ دیکھئے ہمارا سامان ابھی سڑک کے کنارے ہی پر پڑا ہے۔ کرایہ ہمارے پاس تھا نہیں اس لئے لاری والے نے ہمیں سجا (سزا) کے طور پر اس ویرانے میں لا کر اُتار دیا۔ بیوی بال بچوں والے ہیں ہجُور، چوری کس مُنہ سے کریں۔ ہندوستان والوں نے ہم پر بڑے بڑے جُلم توڑے۔ میرا جوان بیٹا ——!"

بس بی پلیٹ رکھو اس کہانی کو لے تو جی جمعدار نے بھی اپنی موجودگی کا ثبوت دیا۔ تھانیدار صاحب جو پوچھتے ہیں وہ بتلاؤ۔"
اور منیب کے لاشعور کی پھلجھڑی تو جیسے کسی نے دیا سلائی دکھا دی۔ بھلا اسے حاکم ضلع یاد آگیا جس کی حضوری میں وہ آج صبح اپنی چھینی ہوئی لڑکی کی بازیافت کے لئے گیا تھا۔ لیکن چونکہ اس کے دفتر کے باہر نئی نویلی کاروں کی ایک لمبی قطار مزاحم تھی اور اندران کے نئے 'مالک' اس لئے ملاقات کی نوبت نہ آئی۔ کاروں کی اس قطار سے گزر کر اس کے خیالات کا جلوس ایک اور انسانی جلوس سے دوچار ہوا جس میں چند سادہ وضع لوگوں کا ایک پھیلا ہوا ہجوم ہاتھوں میں سبز علم اٹھائے، ایک دھندلے راستے پر خلوص سے دمکتے ہوئے چہروں کے ساتھ اور شدتِ جذبات سے لرزاں آواز میں نعرے لگاتا رواں تھا "پاکستان کا مطلب کیا۔ لا الٰہ الا اللہ!" ان کے ہر نعرے پر ہیئین کا چلبلا سا شخص اپنی ناچتی ہوئی آنکھوں اور گوشوں میں بھنچے ہوئے متبسم لبوں کے ساتھ اظہار خوشنودی کرتا جاتا تھا...... پھر یکایک ٹھوس حقائق کے برش نے بڑھ کر تخیل کے نگار خانے پر جیسے تارکول پھیر دیا اور منیب کو یوں محسوس ہوا جیسے اس نعرہ زن انبوہ سے فیروز پوری پناہ گزینوں کا پسپسا ہجوم ابھر آیا ہے جس کی پیشی میں تھانیدار اور فوجی جمعدار ایستادہ تھے، ایک بار پھر جیسے اس کے اپنے اندر ہی سے کسی نے پکارا "پاکستان کا مطلب کیا؟" اور از خود اس کے لب ہلے، پر اُس نے انھیں پھر بھینچ لیا... (شاید اس ڈر سے کہ الٰہ آبادی اکبر کی مانند مبادا اس کی بھی رپٹ نہ لکھ لی جائے۔) تھانیدار پتھر کے ایک بُت کی مانند اس ننھے سے گروہ کے سامنے ایستادہ تھا اور فوجی جمعدار اس کی طرف طمانیت اور تفاخر سے لبریز آنکھوں سے گھور رہا تھا جیسے یہ آذر ابھی ابھی اس بت کی تخلیق سے فارغ ہوا ہو۔

"کدھر ہے، وہ بڑھیا؟" پتھر کا بُت بولا۔

"وہ تو مر چکی ہجور (حضور) پر اس میں ہمارا کچھ قصور نہیں۔"

"لیکن ہے کہاں وہ؟"

"آیئے وہ اِدھر میری جیپ کی پچھلی طرف ہے۔" فوجی جمعدار نے پھر عمود گرایا اور تھانیدار صاحب کا بُت اپنی سنگین تجسیم برقرار رکھتے ہوئے بڑھا۔ سامنے کے پسپسے ٹیلے کا فراز بکھر گیا، اور فیروز پور ساختہ انسان نما چیزیں ادھر اُدھر لڑھکنے لگیں...... ہوا میں پھر نفرت کی بھاپ کے بھبکارے پھیل گئے۔ جس کی تپش سے عقب میں آتے ہوئے منیب کے دماغ کے گلیشیئر سے پھر یادوں کی بوندیں ٹپکنے لگیں۔ ایک بوند میں اس دن کا منظر لرز رہا تھا جس روز ایک کار اور حلقہ ووٹران کے مالک بزرگ اپنی ٹوپی پر ایک نیا چاند تارا سجائے، جِلو میں ایک دو مشرّع شکلوں اور دو تین مہذب سوٹوں والے رفقا لئے امرتسر اس کے محلے میں آئے اور وہاں انھوں نے فرزندانِ توحید کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر مہیا کرنے کے بعد ایک اسلامی حکومت کی برکات پر ایسی حسین تقریر کی کہ توحید کے بیٹے واہ واہ کرتے رہ گئے۔ اس کے بعد ایک مولوی صاحب کی دبنگ آواز اس رعشہ آفرینی کے ساتھ فضا میں گونجی کہ سارا سمندر دیکھتے ہی دیکھتے متلاطم ہو گیا اور انھوں نے سب کو عَ اور قَ کے بیچاک میں الجھا کر ان کی ادراک پر حکومتِ الٰہیہ اور دولت وصولتِ اسلامیہ، خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے ایسے گول مول پتھر لڑھکائے کہ سامعین مبہوت ہو کر رہ گئے۔ پھر سلک کی قمیص پر ملیشیا کا سوٹ پہنے ایک خوش وضع نوجوان نے باندازِ دلربائی اٹھ کر جہاد کا فلسفہ آنکھیں اور ہاتھ نچا نچا کر بیان کرنا شروع کیا۔ وفور جوش میں اس کا بازو اس قدر پھیل جاتا کہ ملیشیا کے کوٹ کی آستین کھسک کھسک جاتی اور نیچے پہنی ہوئی طلائی گھڑی سورج کی روشنی میں جیسے ہنس دیتی.... آخر میں ملت کے ایک شعلہ مقال شاعر نے آہِ سرد بھر کر سامعین کے جذبات کو بیدار اور برانگیختہ کیا۔ ہوا میں ہاتھ چلا کر قلعوں کے خطوط کھینچے اور اپنی مخمورے کی لہراتی ہوئی پگڈنڈیوں کے ذریعے ان میں نصرتِ الٰہی کے عساکر اُتارے۔ تب یکایک فضائیں اطاعت الٰہی کے معاہدوں کی تجدید و تکرار — یعنی اسلام زندہ باد! — کے نعروں سے گونج اٹھیں۔ پھر ڈی۔ ایس۔ پی کے سٹینو مسٹر منیب الرحمٰن نے ایک وردی پوش سب انسپکٹر پولیس کو مجمع میں سے اُٹھتے دیکھا جس نے اپنی کمر سے پیٹی اتار کر اعلان کیا کہ آج سے وہ ان غدارانِ ملت کی چاکری سے جن کے نام ہماری جماعت کے رجسٹروں میں درج نہیں ہیں تائب ہوتا ہے اور لوگ وفور مسرت سے دھڑا دھڑ نعرے لگانے لگے...... یکایک نعروں کی آواز ایک مہیب چیخ میں تبدیل ہو گئی۔ منیب نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا تو لو!

[illegible]

قہ۔ قہ۔ قہ۔ [illegible]

یک ایک [illegible] قہقہے کی آواز اب بھی منیب کے کانوں میں آرہی تھی۔ جیسے [illegible]

[illegible] بکھیرنے والے فلک بوس قہقہے اور تھانیدار صاحب کے چمکیلے رسالے کو قہقہ [illegible] پیا جس [illegible]

[illegible] گھور رہا تھا۔ ان دونوں کی آنکھوں کے گوشے جیسے فیروز پوری گٹھریوں سے ایک [illegible] کر کے [illegible]

[illegible] کو ہنسی ہنسی میں ایک فیروز پوری شے کے کرتے کی چھوٹی چھوٹی جیبوں میں ناجائز اسلحہ ڈھونڈ رہا تھا۔

[illegible] مل جائی!" سر پر اُگی ہوئی سفید سن جیسا اور جتنی اُتر کر پیرسے جا پڑی اور ایک بگلے جیسے چہرے نے دوسرے نقلی چہرے کے بچے ہوئے

[illegible] زندگی کی سی برق رفتاری کے ساتھ اپنے ہونٹ پیوست کر دیئے۔۔۔ بچلے چہرے کی آنکھوں کی میلی کوڑیوں کی دراڑیں ایک لمحے کے لئے [illegible]

[illegible] وسیع تر ہوا اور اس میں سے دو ہی دانت چاک کی ڈلیوں کی طرح نمودار ہوئے، پھر ناک کی مٹیالی ٹکیہ سکڑی، ٹھوڑی کی چپلی سیلی اور [illegible]

[illegible] کی تنی اور پھر ڈھلک گئی!۔۔۔ ادھر فیروز پوری گٹھریاں چیخیں، ڈبے بلکے اور چیزیں ٹھنکیں۔

ہجوم اور سکڑا، منیب کے جسم کے ساتھ زور سے جسم بھڑاتا ہوا، ایک متعفن پناہ گزین ہجوم چیر کر آگے نکل گیا، اور ساتھ ہی منیب نے اپنے دل کے

قریب ایک تیز دھار چیز کی رفتار محسوس کی۔

"ابے بیوقوف، روتے کیوں ہو؟ شکر کرو کہ تمھاری بڑھیا مسلمینوں کے ہاتھوں سے مری ہے، تم بھی مسلمین ہو اور یہ جمعدار صاحب بھی مسلمین! [illegible]

تھانیدار ہنستے ہوئے بولا۔ "اسے ٹھکانے لگاؤ اور چوریوں سے باز آجاؤ۔ ورنہ یاد رکھو کہ میں سکھوں سے بھی بُرا ہوں"۔

جمعدار صاحب نے اب کے اقلیدس کا ایک اور مسئلہ برتا، انھوں نے تھانیدار صاحب کے بائیں بازو پر اپنا دایاں بازو منطبق کر دیا، اور ساتھ ہی

اپنے اور اُن کے ہاتھ کی انگلیاں کا باہم جال بُن دیا۔۔۔۔۔۔

"اوہ، معمولی بات ہے، میں اسے آج کی ڈائری میں "ناگہانی موت" کے طور پر دکھا دوں گا" تھانیدار صاحب نے اپنے دائیں ہاتھ کو فضا میں یوں حرکت

دی جیسے کوئی چیز طاق پر رکھ رہے ہوں، فوجی جمعدار نے اپنی جھکی ہوئی گردن بلند کی۔ آنکھوں میں نئی نگاہیں رقصاں کیں اور انگلیوں کے جال میں اپنے

"ہتھکڑی" زیادہ مضبوط کر دیئے۔

"شکریہ" فوجی جمعدار کی تنی ہوئی چھاتی سے آواز یوں نکلی جیسے ابھی اس ڈھول پر تازہ جھلی چڑھائی گئی ہو۔

ہڈی کے پرانے بن کا سا پھول اور ناگ کے پھن کا سا طرّہ جیپ کے بھوسلے سلہوٹ کے پاس جا کر رُک گیا۔ فوجی جمعدار نے بڑھ کر گاڑی کی ڈگی

کھولی اور ساتھ ہی تھانیدار صاحب کے مُنہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ منیب نے ذرا قریب ہو کر اندر نگاہ دوڑائی تو انجن کے اندرونی حصے کے خلا میں

اسے ایک بکس نظر آیا، جس میں آٹھ دس کالے کالے رنگ کی بوتلیں پڑی تھیں۔

"وائٹ ہارس!" تھانیدار صاحب بلند آواز سے ناک کے رستے سانس کھینچتے ہوئے بولے۔

"اوہ معمولی بات ہے" فوجی جمعدار نے چار بوتلیں بکس سے نکال کر تھانیدار صاحب کے دونوں ہاتھوں میں تھما دیں۔ "میرے پاس ادھر [illegible]

میں ان کا پورا بکس موجود ہے"۔

"کہاں سے کر یدلائے آپ انہیں؟" تھانیدار صاحب نے کھیس نکالی۔

"کراچی سے" فوجی جمعدار نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ بمبئی کے ایک بوہرے کو حال ہی میں ہمارے یونٹ کمانڈر نے ایک شخص کی دکان کا لائسنس

دلایا تھا، وہاں سے وائٹ ہارس کا ایک عظیم دفینہ برآمد ہوا۔ تین پیٹیاں تو میجر صاحب نے وصول کیں اور دو یونٹ کا کمانڈر ہونے کی حیثیت سے میرے

[illegible] میں [illegible] جیسے [illegible] کہ [illegible] لوگوں کے لئے ہی بہتر [illegible] لیکن آپ جانتے کہ کل [illegible] والوں کے سامنے بھلا کس کی چلے گی ہم نے
[illegible] کان [illegible] کے چھوڑا۔"
"خوب [illegible] یہ پاکستان کی دولت ہے۔"
"ہا ہا ہا!"
"کیا بتائیں جمعدار صاحب، قسمت نے ایسے بنجر علاقے میں لاکر پھینکا ہے کہ ایسی چیزوں کا ملنا اس جگہ سخت مشکل ہے۔ خدا غارت کرے ہمارے
یہاں کے ان ٹھیکیداروں کو، نہ جانے کس جنگل خانے سے اٹھ کر آگئے ہیں، خان صاحب بہت تیر ماریں گے تو مری کا مالٹا اٹھا کر سامنے رکھ دیں گے۔ ولایتی چیزوں
کو چھوڑ کر تو بھیڑ کی طرح منمنانے لگیں گے۔ میں ں ں، وہ تو جناب ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر کراچی سے آگے آنے ہی نہیں دیتے۔ کہتے ہیں وہاں بہت مانگ ہے اور پھر
[illegible] سے چار عدد آ بھی جائیں تو ہمارے ایم ایل اے صاحب کے کان میں خدا جانے کہاں سے بھنک پڑ جاتی ہے کہ یہ ذات شریف اچک لے جاتے ہیں۔
خیر، جی یہ تو خاص چیز ہے۔"
"اور پھر پاکستانی" سپید ٹوپی والے بانکے نے آگے بڑھتے ہوئے کہا اور تھانیدار صاحب کے آڑے وقت کام آتے ہوئے لپک کر بوتلیں اُن کے ہاتھ سے
لے لیں، "قہ قہ قہ قہ!" اسی بانکے نے پھر گویا منیب کے ذہن پر برما چلانا شروع کر دیا۔
"تو لیجئے، السلام علیکم" تھانیدار صاحب نے ہاتھ بڑھایا
"وعلیکم السلام قبلہ! آہ یہ بوتلیں خیال سے رکھئے گا، ان میں سے ایک ذرا بہتی ہے۔" اور جمعدار نے پھر جالی بنا اور تولیا، سنگین بردار سپاہی دائیں جیب
سہلاتا جیپ کے اندر کود گیا۔ جمعدار نے لپک کر سٹیرنگ سنبھالا اور بھوسلی جیپ اپنے بطن کے سیاہ خلا میں دو اور گہرے دھبوں کا اضافہ کرکے سیلی سڑک
پر ایک دیوانے سانپ کی طرح پھنکارتے ہوئے رواں ہو گئی۔

پھُریری

منیب کی نگاہیں جیپ کے اُگلے ہوئے غبار کے کثیف مرغولوں سے مجروح ہو کر لاری کی سمت پلٹیں تو مسافر عقبی دریچی کی طرف لپک رہے تھے اور
سپید ٹوپی والا بانکا فرنٹ سیٹ میں مال رکھ کر فارغ ہو چکا تھا، فیروز پوری چیزیں، گٹھریاں اور ڈبے پھر ایک چپٹا سا ٹیلہ بن چکے تھے اور تھانیدار
صاحب اپنے مکدّرہ نخوت سے بھاپ کے بھبکارے چھوڑتے اُس کے قریب سے گزر رہے تھے۔
"صاحب، جمعدار سے کم از کم ان بدبختوں کو کفن دفن کے لئے دو چار روپئے ہی دلوا دیئے ہوتے" ایک چسٹر پوش مسافر نے تھانیدار صاحب کے
فولادی پستول پر نگاہیں گاڑتے ہوئے کہا۔
"آپ ان کے اس قدر ہمدرد واقع ہوئے ہیں تو اتنے روپے خود ہی دے دیئے ہوتے ... اور یہ اپنا چسٹر بھی اُتار دیجئے، ان سردی میں ٹھٹھرنے
والے مصیبت زدوں کو ....."
چسٹر پوش کی گھگھی بندھ گئی اور وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا لاری میں جا کودا اور پھر اس جوش کے ساتھ اُس نے لاری کے چوبی بنچ پر اپنے آپ کو پٹخا
کہ سفید ٹوپی والے ملتانی بانکے کو قہقہے چھوٹ گئے۔
"قہ قہ قہ۔ بابو جی مفت میں پریشان ہوگئے، قہ قہ قہ، افسوس دُنیا کس قدر ناشناس ہے کہ اتنے اچھے بابو جی کو ڈی۔ایس۔پی بھی نہ بنا سکی۔"
"میں ۔۔" اور چسٹر پوش نے وہیں بیٹھے بیٹھے یوں تڑپ کر پہلو بدلا جیسے وہ غلطی سے کسی گرم گرم توے پر بیٹھ گیا ہو "میں ۔۔"
"جی!" تھانیدار صاحب کا نصف بالائی دھڑ ایک کٹھ پتلی کی طرح پیچھے کی طرف گھوما "ڈی۔ایس۔پی سے شکایت کیجئے گا۔ ڈی۔ایس۔پی کوئی [illegible]
خدا نہیں ہے۔" اور ساتھ ہی تھانیدار صاحب نے بائیں انگشت شہادت کے ذریعے بڑے زور سے اپنے قلب کو ٹھونکا "اور ڈی ایس پی کے سابق [illegible]

"بابو جی آپ پاکستان [illegible] پاک ہو گئے ..."

"قہ - قہ - قہ - قہ [illegible]"

"یکایک بند ہو گئی" ... لیکن قہقہے کی آواز اب بھی منیب کے کانوں میں آ رہی تھی۔ منیب نے نگاہیں اٹھائیں تو اس نے ایک [illegible] سی انگریزی کی بجائے سفید ٹوپی والے قبائلی بلنکے اور تھانیدار صاحب کے شہپلین رسا حلق کو قہقہہ فشاں پایا۔ جس کا بایاں ہاتھ کنڈل کی طرح اٹھ کر ایک [illegible] مسافر کے شانے پر پڑ رہا تھا۔ ان دونوں کی آنکھوں کے گھومتے ہوئے ڈھیلے فیروز پوری گٹھریوں میں سے ایک کی لمبی چمکیلی گٹھری پر مرکوز تھے۔ [illegible] سنگین بردار فوجی گویا سہمی سہمی میں ایک فیروز پوری شے کے کرتے کی چھوٹی چھوٹی جیبوں میں ناجائز اسلحہ ڈھونڈ رہا تھا۔

"ہائے میری ماں جائی!" سر پرا گی ہوئی سفید تن پر سے اوڑھنی اُتر کر پرے جا پڑی اور ایک گھِسے پٹے چہرے نے دوسرے نقلی چہرے کے پچکے ہوئے گالوں پر بھرپور زندگی کی سی برق رفتاری کے ساتھ اپنے ہونٹ پیوست کر دیئے ... پچلے چہرے کی آنکھوں کی میلی کوڑیوں کی دراڑیں ایک لمحے کے لئے ذرا سی [illegible] وسیع تر ہوا اور اس میں سے دو ہی دانت چاک کی ڈلیوں کی طرح نمودار ہوئے، پھر ناک کی مٹیالی ٹکیہ سکڑی، ٹھوڑی کی پلپلی سیلی اور لٹکی، گردن کی کمانی تنی اور پھر ڈھلک گئی! ... ادھر فیروز پوری گٹھریاں چیخیں، ڈبے ہلکے اور چیزیں ٹھنکیں۔

ہجوم اور سکڑا، منیب کے جسم کے ساتھ زور سے جسم بھڑاتا ہوا ایک متعفن پناہ گزین ہجوم چیر کر آگے نکل گیا، اور ساتھ ہی منیب نے اپنے دل کے قریب ایک تیز دھار چیز کی رفتار محسوس کی۔

"ابے بیوقوفو! روتے کیوں ہو؟ شکر کرو کہ تمھاری بڑھیا مسلمینوں کے ہاتھوں سے مری ہے، تم بھی مسلمین ہو اور یہ جمعدار صاحب بھی مسلمین!" تھانیدار ہنستے ہوئے بولا۔ "اسے ٹھکانے لگاؤ اور چوریوں سے باز آ جاؤ۔ ورنہ یاد رکھو کہ میں سکھوں سے بھی بُرا ہوں۔"

جمعدار صاحب نے اب کے اقلیدس کا ایک اور مسئلہ برتا۔ انھوں نے تھانیدار صاحب کے بائیں بازو پر اپنا دایاں بازو منطبق کر دیا، اور ساتھ ہی اپنے اور اُن کے ہاتھ کی انگلیاں کا باہم جال بُن دیا ......

"ماننا معمولی بات ہے، میں اسے آج کی ڈائری میں "ناگہانی موت" کے طور پر دکھا دوں گا۔" تھانیدار صاحب نے اپنے دائیں ہاتھ کو فضا میں یوں حرکت دی جیسے کوئی چیز طاق پر رکھ رہے ہوں، فوجی جمعدار نے اپنی جھکی ہوئی گردن بلند کی۔ آنکھوں میں نئی نگاہیں رقصاں کیں اور انگلیوں کے جال میں اپنے "ٹھکے" زیادہ مضبوط کر دیئے۔

"شکریہ" فوجی جمعدار کی تنی ہوئی چھاتی سے آواز یوں نکلی جیسے ابھی اس ڈھول پر تازہ جھلی چڑھائی گئی ہو۔

ہڈی کے پرانے بٹن کا سا پھول اور ناگ کے پھن کا سا طرّہ جیپ کے ہوسلے سلہوٹ کے پاس جا کر رک گیا۔ فوجی جمعدار نے بڑھ کر گاڑی کی ڈگی کھولی اور ساتھ ہی تھانیدار صاحب کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ منیب نے ذرا قریب ہو کر اندر نگاہ دوڑائی تو انجن کے اندرونی حصّے کے خلا میں اسے ایک بکس نظر آیا، جس میں آٹھ دس کالے کالے رنگ کی بوتلیں پڑی تھیں۔

"وائٹ ہارس!" تھانیدار صاحب بلند آواز سے ناک کے رستے سانس کھینچتے ہوئے بولے۔

"اوہ معمولی بات ہے۔" فوجی جمعدار نے چار بوتلیں بکس سے نکال کر تھانیدار صاحب کے دونوں ہاتھوں میں تھما دیں۔ "میرے پاس ادھر ہولڈال میں ان کا پورا بکس موجود ہے۔"

"کہاں سے کر لائے آپ انھیں؟" تھانیدار صاحب نے کھیس نکالی۔

"کراچی سے" فوجی جمعدار نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "بمبئی کے ایک لٹیرے کو حال ہی میں ہمارے یونٹ کمانڈر نے ایک پنے کی دکان کا لائسنس دلوایا تھا، وہاں سے وائٹ ہارس کا ایک عظیم دفینہ برآمد ہوا۔ تین پیٹیاں تو میجر صاحب نے وصول کیں اور دو یونٹ کا کوارٹر ماسٹر ہونے کی حیثیت سے میرے

شہری تھیں وہ پھر راست چلا یا کہ بڑے لوگوں کے لئے بھی رہنے دو لیکن آپ جانئے آج کل ملٹری والوں کے سامنے بھلا کس کی چلے گی۔ ہم نے
ان اس کل کا فکان سے مٹا کے چھوڑا۔"

"خوب! تو اب یہ پاکستان کی دولت ہے۔"

"ہا! ہاہا! ہاہا!"

"کیا بتائیں جمعدار صاحب، قسمت نے ایسے بنجر علاقے میں لا کر پھینکا ہے کہ ایسی چیزوں کا ملنا اس جگہ سخت مشکل ہے۔ خدا غارت کرے ہمارے
یہاں کے نئے ٹھیکیداروں کو، نہ جانے کس جنگڑ خانے سے اُٹھ کر آگئے ہیں۔ خان صاحب بہت تیر ماریں گے تو مری کا مال اُٹھا کر سامنے رکھ دیں گے۔ ولایتی چیز کو
پوچھو تو بھیڑ کی طرح منمنانے لگیں گے۔ میں ں ں، وہ تو جناب ڈسٹری بیوٹر کراچی سے آگے آنے ہی نہیں دیتے۔ کہتے ہیں وہاں بہت مانگ ہے اور پھر
بھولے بھٹکے سے چار عدد آ بھی جائیں تو ہمارے ایم ال اے صاحب کے کان میں خدا جانے کہاں سے بھنک پڑ جاتی ہے کہ یہ ذات شریف اُچک لے جاتے ہیں۔"

"خیر، جی یہ تو خاص چیز ہے۔"

"اور پھر پاکستانی" سپید ٹوپی والے بانکے نے آگے بڑھتے ہوئے کہا اور تھانیدار صاحب کے آڑے وقت کام آتے ہوئے لپک کر بوتلیں اُن کے ہاتھوں سے
لے لیں، "قہ قہ قہ قہ!" اسی بانکے نے پھر گویا منیب کے ذہن پر برما چلانا شروع کر دیا۔

"تو لیجئے، السلام علیکم" تھانیدار صاحب نے ہاتھ بڑھایا

"وعلیکم السلام قبلہ۔" آہ یہ بوتلیں خیال سے رکھئے گا، ان میں سے ایک ذرا بہتی ہے۔" اور جمعدار نے پھر جالی بنا اور تو ڑا، سنگین بردار سپاہی دائیں جیب
سہلاتا جیپ کے اندر کود گیا۔ جمعدار نے لپک کر سٹیرنگ سنبھالا اور بھوسلی جیپ اپنے بطن کے سیاہ خلا میں دو اور گہرے دھبوں کا اضافہ کر کے سلیٹی سڑک
پر ایک دیوانے سانپ کی طرح پھنکارتے ہوئے رواں ہو گئی۔

پھریری

منیب کی نگاہیں جیپ کے اُگلے ہوئے غبار کے کثیف مرغولوں سے مجروح ہو کر لاری کی سمت پلٹیں تو مسافر عقبی دریچی کی طرف لپک رہے تھے اور
سپید ٹوپی والا بانکا فرنٹ سیٹ میں مال رکھ کر فارغ ہو چکا تھا۔ فیروز پوری چیزیں، گٹھریاں اور ڈبے پھر ایک چُپ سا ٹیلہ بن چکے تھے اور تھانیدار
صاحب اپنے مکدرہ نخوت سے بھاپ کے بھبکارے چھوڑتے اُس کے قریب سے گزر رہے تھے۔

"صاحب، جمعدار سے کم از کم ان بدبختوں کو کفن دفن کے لئے دو چار روپئے ہی دلوا دیئے ہوتے" ایک چسٹر پوش مسافر نے تھانیدار صاحب کے
فولادی پستول پر نگاہیں گاڑتے ہوئے کہا۔

"آپ ان کے اس قدر ہمدرد واقع ہوئے ہیں تو اتنے روپے خود ہی دے دیئے ہوتے . . . . اور یہ اپنا چسٹر بھی اُتار دیجئے، ان سردی میں ٹھٹھرنے
والے مصیبت زدوں کو . . . . ."

چسٹر پوش کی سٹی گم ہو گئی اور وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا لاری میں جا کودا اور پھر اس جوش کے ساتھ اُس نے لاری کے چوبی بنچ پر اپنے آپ کو پٹخا
کہ سفید ٹوپی والے ملتانی بانکے کو قہقہے چھوٹ گئے۔

"قہ قہ قہ۔ بابو جی مفت میں پریشان ہو گئے، قہ قہ قہ، افسوس دُنیا کس قدر ناشناس ہے کہ اتنے اچھے بابو جی کو ڈی۔ ایس۔ پی بھی نہ بنا سکی۔"

"جی ں ں ں ۔" اور چسٹر پوش نے وہیں بیٹھے بیٹھے یوں تڑپ کر پہلو بدلا جیسے وہ غلطی سے کسی گرم گرم توے پر بیٹھ گیا ہو۔ "میں ۔۔۔"

"جی! " تھانیدار صاحب کا نصف بالائی دھڑ ایک کٹھ پتلی کی طرح پیچھے کی طرف گھوما۔ "ڈی۔ ایس۔ پی سے شکایت کیجئے گا۔ ڈی۔ ایس۔ پی کوئی ہوا
خدا نہیں ہے۔" اور ساتھ ہی تھانیدار صاحب نے بائیں انگشت شہادت کے ذریعے بڑے زور سے اپنے قلب کو ٹھونکا، "اور ڈی ایس پی کے سابق اسٹنوٹ

"بابوجی! آپ پاکستان جا رہے ہیں نا؟ اس لئے وہاں پاک ہو کر جائیے۔"

"قہ۔ قہ۔ قہ۔ قہ۔ قہے۔ سے ۔۔۔"

"یکایک بوند پھر پھٹ گئی"۔۔۔ لیکن قہقہے کی آواز اب بھی منیب کے کانوں میں آ رہی تھی۔ منیب نے نگاہیں اٹھائیں تو اس نے اب کے سیاہ ٹوپی والے لسی امرتسری کی بجائے سپید ٹوپی والے ملتانی بلنکے اور تھانیدار صاحب کے شیمپئین رساحلق کو قہقہہ فشاں پایا۔ جس کا باؤں بھرا ہاتھ کدال کی طرح اُٹھ کر ایک دوسرے متبسم مسافر کے ہاتھ پر پڑ رہا تھا۔ ان دونوں کی آنکھوں کے گھومتے ہوئے ڈھیلے فیروزپوری گٹھریوں میں سے ایک کی نسبتاً چمکیلی گٹھری پر مرکوز تھے۔ ان کے پاس ہی سنگین بردار فوجی گویا ٹھنی ٹھنی میں ایک فیروزپوری شے کے کرتے کی چھوٹی چھوٹی جیبوں میں ناجائز اسلحہ ڈھونڈ رہا تھا۔

"ہائے میری ماں جائی!" سر پڑا گی ہوئی سفید سَن پرسے اوڑھنی اُتر کر پرے جا پڑی اور ایک گھسے پھٹے چہرے نے دُوسرے نقلی چہرے کے پچکے ہوئے ماتھے پر بھرپور زندگی کی سی برق رفتاری کے ساتھ اپنے ہونٹ پیوست کر دیئے۔۔۔ پچلے چہرے کی آنکھوں کی میلی کوڑیوں کی دراڑیں ایک لمحے کے لئے لرزیں دہن کا بل وسیع تر ہوا اور اس میں سے دو ہی دانت چاک کی ڈلیوں کی طرح نمودار ہوئے، پھر ناک کی مٹیالی ٹکیہ سکڑی، ٹھوڑی کی پلپلی بھیلی اور لٹکی، گردن کی کمانی تنی اور پھر ڈھلک گئی!۔۔۔ ادھر فیروزپوری گٹھریاں چیخیں، ڈبے ہلکے اور چیزیں ٹھنکیں۔

ہجوم اور سکڑا، منیب کے جسم کے ساتھ زور سے جسم بھڑاتا ہوا، ایک متعفن پناہ گزین ہجوم چیر کر آگے نکل گیا، اور ساتھ ہی منیب نے اپنے دل کے قریب ایک تیز دھار چیز کی رفتار محسوس کی۔

"ارے بیوقوف! روتے کیوں ہو؟ شکر کرو کہ تمھاری بڑھیا مُسلمینوں کے ہاتھوں سے مری ہے، تم بھی مُسلمین ہو اور یہ جمعدار صاحب بھی مسلمین!" تھانیدار مڑتے ہوئے بولا۔ "اسے ٹھکانے لگاؤ اور چوریوں سے باز آجاؤ۔ ورنہ یاد رکھو کہ میں سکھوں سے بھی بُرا ہوں۔"

جمعدار صاحب نے اب کے اقلیدس کا ایک اور مسئلہ برتا، انھوں نے تھانیدار صاحب کے بائیں بازو پر اپنا دایاں بازو منطبق کر دیا، اور ساتھ ہی اپنے اور اُن کے ہاتھ کی انگلیاں کا باہم جال بُن دیا۔۔۔۔۔۔

"اوہ، معمولی بات ہے، میں اسے آج کی ڈائری میں "ناگہانی موت" کے طور پر دکھا دوں گا۔" تھانیدار صاحب نے اپنے دائیں ہاتھ کو فضا میں یوں حرکت دی جیسے کوئی چیز طاق پر رکھ رہے ہوں، فوجی جمعدار نے اپنی جھکی ہوئی گردن بلند کی۔ آنکھوں میں نئی نگاہیں رقصاں کیں اور انگلیوں کے جال میں اپنے "ناکے" زیادہ مضبوط کر دیئے۔

"شکریہ" فوجی جمعدار کی تنی ہوئی چھاتی سے آواز یوں نکلی جیسے ابھی اس ڈھول پر تازہ جھلی چڑھائی گئی ہو۔

ہڈی کے پرانے بٹن کا سا پھول اور ناگ کے پھن کا سا طرّہ جیپ کے بھوسلے سلہوٹ کے پاس جا کر رُک گیا۔ فوجی جمعدار نے بڑھ کر گاڑی کی ڈکی کھولی اور ساتھ ہی تھانیدار صاحب کے مُنہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ منیب نے ذرا قریب ہو کر اندر نگاہ دوڑائی تو انجن کے اندرونی حصّے کے خلا میں اسے ایک بکس نظر آیا، جس میں آٹھ دس کالے کالے رنگ کی بوتلیں پڑی تھیں۔

"وائٹ ہارس!" تھانیدار صاحب بلند آواز سے ناک کے رستے سانس کھینچتے ہوئے بولے۔

"اوہ معمولی بات ہے۔" فوجی جمعدار نے چار بوتلیں بکس سے نکال کر تھانیدار صاحب کے دونوں ہاتھوں میں تھما دیں۔ "میرے پاس ادھر ہولڈال میں ان کا پورا بکس موجود ہے۔"

"کہاں سے کر بدلائے آپ انہیں؟" تھانیدار صاحب نے کھیس نکالی۔

"کراچی سے" فوجی جمعدار نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ بمبئی کے ایک بوہرے کو حال ہی میں ہمارے یونٹ کمانڈر نے ایک بنئے کی دکان کا لائسنس دلوایا تھا، وہاں سے وائٹ ہارس کا ایک عظیم دفینہ برآمد ہوا۔ تین پیٹیاں تو میجر صاحب نے وصول کیں اور دو یونٹ کا کوارٹر ماسٹر ہونے کی حیثیت سے میرے

نصے میں آئیں، وہ بوہرا بہت چیخا چلایا کہ کچھ بڑے لوگوں کے لئے بھی رہنے دو لیکن آپ جانئے آج کل ملٹری والوں کے سامنے بھلا کس کی چلے گی۔ ہم نے بھی اس مال کا دکان سے صفایا کر کے چھوڑا!"

"خوب، تو اب یہ پاکستان کی دولت ہے؟"

"ہا! ہاہا! ہاہا!"

"کیا بتائیں، جمعدار صاحب، قسمت نے ایسے بنجر علاقے میں لا کر پھینکا ہے کہ ایسی چیزوں کا ملنا اس جگہ سخت مشکل ہے۔ خدا غارت کرے ہمارے یہاں کے نئے ٹھیکیداروں کو، نہ جانے کس جنگل خانے سے اٹھ کر آ گئے ہیں، خان صاحب بہت تیار ہیں گے تو مری کا مال تھانیدار سامنے رکھ دیں گے۔ ولایتی چیزوں کا پوچھو تو بھیڑ کی طرح ممنانے لگیں گے۔ ایس ڈی، وہ تو جناب ڈسٹری بیوٹر کراچی سے آگے آنے ہی نہیں دیتے۔ کہتے ہیں وہاں بہت مانگ ہے اور پھر اگر بھولے بھٹکے سے چار عدد آ بھی جائیں تو ہمارے ایم ال اے صاحب کے کان میں خدا جانے کہاں سے بھنک پڑ جاتی ہے کہ بہ ذات شریف اچک لے جاتے ہیں"

"خیر، جی یہ تو خاص چیز ہے؟"

"اور پھر پاکستانی" سپید ٹوپی والے بانکے نے آگے بڑھتے ہوئے کہا اور تھانیدار صاحب کے آڑے وقت کام آتے ہوئے لپک کر بوتلیں ان کے ہاتھوں سے لیں، "قہ قہ قہ!" اسی بانکے نے پھر گویا منیب کے ذہن پر برا چلانا شروع کر دیا۔

"تو لیجئے، السلام علیکم" تھانیدار صاحب نے ہاتھ بڑھایا

"وعلیکم السلام قبلہ! آہ یہ بوتلیں خیال سے رکھئے گا ان میں سے ایک ذرا اہنتی ہے۔" اور جمعدار نے پھر جال بنا اور توڑا۔ سنگین بردار سپاہی دائیں جیب سہلاتا جیپ کے اندر کود گیا۔ جمعدار نے لپک کر سٹیرنگ سنبھالا اور بھوسلی جیپ اپنے بطن کے سیاہ خلا میں دو اور گہرے دھبوں کا اضافہ کر کے سلیٹی سڑک پر ایک دیوانے سانپ کی طرح پھنکارتے ہوئے رواں ہو گئی۔

پھُریری

منیب کی نگاہیں جیپ کے اگلے ہوئے غبار کے کثیف مرغولوں سے مجروح ہو کر لاری کی سمت پلٹیں، تو مسافر عقبی دریچی کی طرف لپک رہے تھے اور سپید ٹوپی والا بانکا فرنٹ سیٹ میں مال رکھ کر فارغ ہو چکا تھا، فیروزپوری چیزیں گٹھریاں اور ڈبے پھر ایک بھُسبھُسا سا ٹیلہ بن چکے تھے اور تھانیدار صاحب اپنے خمکدہ نخوت سے بھاپ کے بھبکارے چھوڑتے اس کے قریب سے گزر رہے تھے۔

"صاحب، جمعدار سے کم از کم ان بدبختوں کو کفن دفن کے لئے دو چار روپے ہی دلوا دیئے ہوتے" ایک جسٹر پوش مسافر نے تھانیدار صاحب کے نولادی پستول پر نگاہیں گاڑتے ہوئے کہا۔

"آپ ان کے اس قدر ہمدرد واقع ہوئے ہیں تو اتنے روپے خود ہی دے دیئے ہوتے ..... اور یہ اپنا جسٹر بھی اتار دیجئے، اس سردی میں ٹھٹھرنے والے مصیبت زدوں کو....."

جسٹر پوش کی تھوتھنی لٹک گئی اور وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا لاری میں جا کودا اور پھر اس جوش کے ساتھ اس نے لاری کے چوبی بنچ پر اپنے آپ کو پٹخا کہ سفید ٹوپی والے ملتانی بانکے کو قہقہے چھوٹ گئے۔

"قہ قہ قہ۔ بالو جی مفت میں پریشان ہو گئے، قہ قہ قہ، افسوس دنیا کس قدر ناشناس ہے کہ اتنے اچھے بالو جی کو ڈی۔ایس۔پی بھی نہ بنا سکی۔"

"میں ـــ" اور جسٹر پوش نے وہیں بیٹھے بیٹھے یوں تڑپ کر پہلو بدلا جیسے وہ غلطی سے کسی گرم گرم توے پر بیٹھ گیا ہو۔ "میں ـــ"

"جی!" تھانیدار صاحب کا نصف بالائی دھڑ ایک کٹھ پتلی کی طرح پیچھے کی طرف گھوما۔ "ڈی۔ایس۔پی سے شکایت کیجئے گا۔ ڈی۔ایس۔پی کوئی ہمارا خدا نہیں ہے۔" اور ساتھ ہی تھانیدار صاحب نے بائیں انگشت شہادت کے ذریعے بڑے زور سے اپنے قلب کو ٹھونکا، اور ڈی ایس پی کے سابق اسٹینوگرافر

منیب الرحمٰن بی۔اے، ایل ایل بی نے سوچا کہ تھانیدار صاحب نے سچ کہا ہے "عقل کا خدا تو خود ان کا دل ہے" اور ایک نئی سائنس پر تو دقیق جدال کا اہل ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ وہ بچارا تو خود اپنے ایس۔پی کا بندہ ہوتا ہے یا ان چمکیلی کاروں کا جو کبھی اُس کے دفتر کے سامنے آکر رکتیں تو قتل، اغوا، ڈکیتی اور بلوے کے مقدمات کی کئی فربہ اور عظیم الجثہ فائلیں ہمیشہ کے لئے منیب سے چھین لی جاتیں۔

"او بچو کے نیچے، چل گاڑی سنبھال" تھانیدار صاحب کی للکار لیب سٹرک مینڈھ پر بیٹھے ہوئے ڈرائیور پر قمچی کی طرح پڑی، اور وہ بگٹٹ بھاگتا ہوا سٹیرنگ والی سیٹ پر آن بیٹھا۔ منیب نے بھی تیزی کے ساتھ اپنا جسم لاری کے اندر پھینکا۔ دریچی بند کی، اخبار اٹھایا اور اواخر شام کی بڑھتی ہوئی خنکی کے پیش نظر اپنے بٹنوں سے عاری کوٹ کو شانوں کے قریب سے سونت سونت کر چھاتی پر جمع کرنے لگا۔ اس حرکت کے دوران میں غیر شعوری طور پر اس کا ہاتھ کوٹ کی اندرونی جیب میں داخل ہو گیا اور پھر بقدر چھ انچ نیچے جاکر کوٹ کی بیرونی سطح پر نکل آیا...... دفعتاً منیب نے پھر اُسی تیز دھار چیز کی رفتار محسوس کی لیکن اب یہ احساس اس کے سینے کی بجائے اُس کے ذہن پر وارد ہوا۔ اور فیروز پوری پناہ گزین اپنا تعفن پاش وجود، اس کے جسم کی بجائے اُس کی ذہانت کے ساتھ بھڑاتا ہوا گزر گیا اور سرقہ اور کیسہ تراشی کے لاتعداد مقدمات کی ضخیم فائیلوں سے کھیلے ہوئے منیب پر دو روپیہ ایک آنے کی اس رقم کا ضیاع ثابت ہو گیا جو پانچ روپے کے اس قرض کا بقیہ تھی جسے آج صبح اُس نے اپنے انصار عزیز کے ہاں سے روانہ ہوتے وقت میزبان کے متامل ہاتھوں سے باچشم اشکبار وصول کیا تھا۔ اسٹارٹر غرایا، رک کا تیند واسکڑا اور لاری ایک دھچکے کے ساتھ رینگنے لگی۔

یہ دھچکا منیب کے لئے گویا کسی سینما ہال کے نمائش کار کا ایک میکانکی ٹھونکا تھا۔ جس کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں دھڑ دھڑا کر فلم کی ایک ریل کھل گئی اور دوڑتی ہوئی لاری کی قریبی دریچی سے دکھتی ہوئی پرّاں فضاؤں کے مٹیالے فیتے پر منیب کی پھٹی پھٹی نگاہیں ذہن کے عکاس کی لاتعداد مصور تخلیقات دیکھنے لگیں...... ایک سلائیڈ پر اُس دن کا منظر لرز رہا تھا جب وہ اپنے دو کڑیل بھائیوں کو اپنے جھلسے ہوئے مکان کے ملبے تلے دفن کر کے اور والدہ اور تیسرے ننھے بھائی کی لاشوں کو امرتسر کے اعلیٰ سائنسی اور مہذب (سول ہسپتال کے ایک تازہ کٹے ہوئے لان پر بے گور و کفن چھوڑ کر خود تنِ تنہا محض بدن کے چار جاموں میں ایک لدے پھندے ٹرک پر سے پاکستان کے سب سے بڑے شہر لاہور میں اُترا تھا اور اُترتے ہی اُسے اُس سیاہ بلیزر کی ٹوپی والے فوجی ڈرائیور کی کڑی اور نفرت آمیز نگاہوں کا مقابلہ کرنا پڑا تھا جسے امرتسر سے چلتے دم اُس نے کوئی "انعام" دینے سے معذوری ظاہر کی تھی...... پھر اس سے اگلے روز "دارالمہاجرین" کا وہ منظر اُس کے سامنے آن ٹکا۔ جب تاروں سے ڈھلی ہوئی تنک وسیمیں شب میں نکھرے ہوئے آسمان تلے انسانی غلاظتوں سے پٹے ہوئے میدان پر وہ اپنے دو وقت کے بھوکے اور پچکے ہوئے پیٹ پر ہاتھ پھیرتا دراز تھا۔ اُس روز دارالمہاجرین کے طالب علم رضاکاروں نے ہڑتال کر رکھی تھی کیونکہ انھوں نے اپنے ہفتہ بھر کے اخراجات خوراک کے لئے جو نو صد روپے کا بل پیش کیا تھا اُسے کیمپ کے منتظمین نے ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا اُسی کے قریب ہی چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی ایک ستر سالہ بڑھیا پڑی رو رہی تھی، کیونکہ اُس کی جوان لڑکی اپنے رنڈوے بہنوئی کے ساتھ کہیں بھاگ گئی تھی اور اس کے بعد آج صبح ایک "پردیسی" اس کی گٹھڑی لے کر چمپت ہو گیا تھا۔

پھر ایک اور منظر صوبہ کے سول سکریٹریٹ کے وسیع و کشادہ ایوان کی اس کیفیت کو سامنے لے آیا۔ جب اُس کے واحد باشندہ نوکر شاہی افسر نے جس کا نام بیرونی تختی کے مطابق پنجابی مسلمانوں کا سا تھا، ایک ہیبت ناک اور عظیم الجثہ میز کے اُدھر سے اپنی ٹانٹ کے صاف و ہموار گنبد پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ایک سیشن جج کی سی یبوست و خشونت کے ساتھ اُس کی درخواست ملازمت کا فیصلہ سنایا تھا: "ہمارے دفتر میں ابھی تک ری فیوجی ز کے بارے میں نئے حکم نہیں آئے۔ اس لئے ہم مجبور ہیں کہ گورنمنٹ کی پہلی پالیسی کے مطابق پہلے پرانے فوجی کو جگہ دیں (جگہ دے)"... اور پھر باہر نکل کر دفتر کی "غلام گردش" میں منیب نے پٹی ہوئی خاکی وردی میں ملبوس ایک شخص کو دیکھا جو کھڑا ایک سوٹ پوش سے شکایت کر رہا تھا کہ ایمپلائمنٹ ایکسچینج والوں کی پرزور سفارش کے باوجود بڑے صاحب نے ملازمت نہیں دی۔ کہتے ہیں کہ پہلا حق پناہ گزینوں کا ہے...... پھر لاہور کی ایک اور شب اس کی نگاہوں کے سامنے عود کر آئی جب اُس نے اسمبلی چیمبر کے لان میں فروزاں بلب کے نیچے بتیسی نکالے ایک دوسرے کو کہنیوں سے ٹھوکے

دبے دبے کرباتیں کرتے دو سوٹ پوش نوجوان دیکھے تھے جن میں سے ایک نے بالکل نئی فیلٹ پہن رکھی تھی۔

"لیکن یار، تمھارے ایف۔ اے ہونے کا کیا بنا؟ اس اسامی کے لئے تو اخبارات میں بی۔ اے ایل ایل بی کی شرط تھی؟"

"واہ بھئی واہ، تم عجیب کینڈے کے آدمی ہو، بندۂ خدا بتایا جو ہے کہ ڈیپارٹمنٹ کے ڈائرکٹر میرے پھوپھا ہیں۔" نئی فیلٹ والے نے اپنی پتلون کی جیبوں میں ہاتھ گھسیڑتے اور گردن کو ایک طرف خم دیتے ہوئے کہا تھا...... پھر لاہور کے نوتعمیر اور نو متعفن ریلوے سٹیشن کی اُس غلیظ شام کا منظر منیب کی بصیرت پر اُبھرا جب وہ عمر رسیدہ عورتوں کے ایک کثیر التعداد قافلہ کے واحد "قوام" بزرگ کے سامان کو پناہ گاڑی میں ڈھونڈ رہا تھا۔ کیونکہ ایک سبز پوش اسلامی رضاکار نے اس خدمت کے لئے سولہ روپے طلب کئے تھے۔ منیب کی اس دردمندی سے متاثر ہو کر جب اُس بزرگ "امیر کارواں" نے ازراہِ دل نوازی اُسے ملتان جانے کا مشورہ اس انکشاف کے ساتھ دیا کہ وہاں ابھی بحالی کے کافی سامان موجود ہیں تو منیب کو معاً اپنے رشتے کے خالو کے چچا کا ایک ممیرا بھائی یاد آگیا جو عرصے سے ملتان کے ایک قصبے میں معمولی تاجر کے طور پر مقیم تھا۔

چنانچہ منیب نے بھی اللہ کا نام لے کر سابق "اسباب" اور موجودہ "پناہ گاڑی" کے ایک بے پناہ ہجوم سے پُر چھکڑے کے بیرونی بڑھاؤ کی نسبتاً خالی جگہ پر چھلانگ لگا دی تھی۔.... پھر ذہن کی عکاسی نے وہ منظر پیش کیا جب وہ ہونق سی صورت نکالے، شلوار کے پھٹے ہوئے پائنچوں کو ٹخنوں پر اُڑسے اپنے انصار عزیز کے یہاں ملتان کے ایک عجیب و غریب قصباتی وضع کے مکان میں داخل ہوا تھا، اور اُس کا داخلہ دیکھتے ہی گھر کی بی بی کی پیشانی کی تیوریوں میں مزید ایک کا اضافہ ہو گیا تھا...... پھر ایک اور سلائیڈ پر اُسے آج صبح کا وہ منظر نظر آیا جب وہ کانپتے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ اپنے انصار عزیز اور میزبان سے پانچ روپے کا ایک بھورا نوٹ قرض کے طور پر وصول کر رہا تھا اور میزبان کی بیوی مکان کے دوسرے گوشے میں کھڑی تیوری کی کڑی کمان کے ساتھ اپنے خاوند پر ناراضی کے تیر برسا رہی تھی...... پھر ضلع کے ڈی۔ سی کے دفتر کا وہ کمرہ اُسے یاد آیا جہاں سُرخ بنات اور زرّیں حاشئیے کا کوٹ پہنے ہوئے اردلی نے اُس کی زبان سے مدّعائے آمد کا ایک لفظ سُنے بغیر محض اس کا بڑھا ہُوا خط اور پھٹی ہوئی میلی کچیلی شلوار دیکھ کر کہہ دیا تھا۔ "صاحب بہادر آج اور کل کسی بھی پناہ گزین سے نہیں ملیں گے کیونکہ انھوں نے ان دنوں زمینداروں اور بڑے آدمیوں* کی کمیٹی بُلا رکھی ہے".... پھر لاریوں کے اڈّے کا وہ منظر طلوع ہوا جب اُس نے اپنے ہی ایک مشتبہ بھک منگے کو ٹالنے کی غرض سے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک چیتھڑا نکالا تھا، اور ساتھ ہی اُس کی نگاہوں نے یہ دلدوز حقیقت بھانپ لی تھی کہ اس کے پلّو والی زنبیل میں اب صرف روپے روپے کے دو سبز نوٹ اور اکنّی کا ایک بھدّا سا گِھسا پِٹا سکّہ باقی رہ گیا ہے اور اُس نے ندامت اور اندوہ کی ایک تیز رَو کو سینے کے اندر ہی نگلتے ہوئے وہ ایک آنہ فقیر کی غلیظ ہتھیلی پر رکھ دیا تھا اور چیتھڑے کو پھر اُسی طرح گانٹھ دے کر واپس کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا تھا.....

تب ناگہاں دریچی کے "پردۂ سیمیں" کے حیطۂ کل پر اُسی فیروز پوری پناہ گزین کا تیز دھار والا آلہ چھا گیا جو اگرچہ منیب نے بچشمِ خود نہیں دیکھا تھا تاہم اس کا وجود برحق تھا اور منیب کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ تیز دھار آلہ ٹھوس صورت پاکر اور جِلو میں بے شمار مرئی و غیر مرئی تیز دھار آلات لئے اس کے ذہن پر حملہ آور ہو رہا ہو، اور پھر اس کیسہ تراش پناہ گزین کے متعفن تنفس کی غلیظ یاد ــــ پناہ بخدا ... !منیب تلملا ہی تو گیا، پہلو بدل کر اُس نے گود سے اخبار اُٹھایا، اور اُس کے کونے کھدروں میں اپنے دھڑ دھڑ جلتے ذہن کو آسودگی بخشنا چاہی، ایک غیر نمایاں گوشے میں اُسے ایک ننھا سا نخلستان نظر آیا اور اُس کی نگاہوں کا سُلگتا ہُوا تار دھیمے سے اُس کے اندرون پیر گیا۔

"مہاجرین کی خدمت کے لئے

رضائے الٰہی کے طلبگاروں کی ضرورت!"

آغوش

اور معاً اُس کے شعور کا فعّال اور چابکدست مصوّر ذہن کے بسیط کینوس پر پھر مصروفِ کار ہو گیا... خیالات و تصوّرات کے بے انداز پیکر

اور اس کا لاشعور منجمد شدہ معتقدات کو ایک ایک کرکے اُگلنے لگا۔
صورت پذیر ہوکر اُبھرے اور منیب کی تخیل کی دھندلی اُفق پر رقص کناں ہوگئے،.... کیٹس، بائرن، شیلے اور ٹیگور کی بخشی ہوئی بھیدوں بھری، ملائم، نشیلی اور سُریلی رومانیت ۔۔۔ ویلز، شا اور سمرسٹ ماہم کی یبوست و ظرافت کے
لطیف و ثقیل آمیزے۔ روسیو۔ نطشے ۔ ہیگل اور مارکس کی ہولناک حد تک مادیت اور دہریت۔ میکاولی کی افادی لیکن کھوکھلی وطنیت و قومیت
اقبال کی دلکشا آفاقیت اور پھر سب سے آخر میں ازلی و ابدی حقائق کی وہ لازوال برتریت، جسے آج صبح پہلی بار اس نے تلاوت کے وقت چند بادامی
کاغذوں پر نورانی بجلیوں کے طور پر تڑپتے ہوئے پایا تھا، جن کی تابانیوں نے اوہام و تشکیک کی تاریک گپھاؤں کو ایک لبریزِ ذوقِ یقین کا ایسا سوادِ نور بنا دیا
تھا جہاں سلیس لیکن جامع اصولوں کا غیر ارضی حسن فروزاں تھا،.... اور یکایک منیب کے ذہن پر توحید کے عظیم و جلیل منارۂ نور کا انعکاس چھا گیا... اپنی
بصیرت کا سحاب غمگیں اسے چھٹتا ہوا محسوس ہوا، اور اس کی عمیق خلوص اور فطرتی شفافی سے بہرہ مند نگاہیں اپنے چاروں اطراف کی اشیا اور افراد کے اندر
معنویت تلاش کرنے لگیں، ایک جھرجھری لے کر اس نے انہی مصفّا نگاہوں سے خود اپنے مادّی و رُوحانی سراپا کا جائزہ لیا اور وہاں لفظ "منیب" کی معنویت
کو عنقا پاکر کانپ اُٹھا.....
کچی سڑک کا جھولا جھولتی ہوئی لاری کے اندر بیٹھے ہوئے منیب کو یوں محسوس ہوا جیسے اُس کے مادّی جسم کے ساتھ ساتھ اس کی رُوح کا لطیف و غیر مرئی وجود
بھی متزلزل ہو رہا ہے،.... اور اگرچہ یہ کسی نماز کا وقت نہ تھا لیکن منیب کے قلب میں بے اختیار کسی مؤذن کی ندا سننے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس کی متجسس
نگاہیں بڑھتے ہوئے اندھیرے کی تاریک و دبیز چادر میں چاروں طرف گھوم گئیں، اور پھر پناہ گزین منیب کا سر آپ سے آپ جھک گیا۔
لاری ایک دھچکے کے ساتھ پھر رُکی، لیکن اب کے منزل آگئی تھی۔

"لالۂ صحرائی"

غزل

گو عمر ترے حسن کے جلووں میں بسر کی
کم ہو نہ سکی تشنہ لبی ذوقِ نظر کی

اتنا بھی محبت میں نہ محسوس ہوا دوست
کانٹوں پہ گزاری ہے کہ پھولوں میں بسر کی

آپ آئے ہیں اور پرسشِ احوال کی خاطر
کیا بات ہے کیوں آپ نے تکلیفِ نظر کی

روتا رہا دل شام و سحر خون کے آنسو
خود دارِ محبت نے مگر آنکھ نہ تر کی

آپ آئے تو ہمراہ سحر آئی وگرنہ
صورت نظر آئی نہ شبِ غم کو سحر کی

ڈالی ہیں ترے حسن نے عالم پہ کمندیں
سوئی رہی تقدیر مرے ذوقِ نظر کی

سو بار بھلایا تجھے سو بار کیا یاد
اس طرح بھی تسکیں نہ ہوئی قلب و جگر کی

دنیا نے سنا آکے مرے غم کا فسانہ
تو نے نہ مرے حالِ پریشاں پہ نظر کی

آنے نہ دیا حرف طفیل عشق پہ اپنے
جس طرح بسر ہم سے ہوئی ہم نے بسر کی

طفیل ہوشیارپوری

واردات

رات بھر اُن کا انتظار رہا
رات بھر گاڑیاں گزرتی رہیں
وہ کوئی دم میں آئے جاتے ہیں
راہیں سرگوشیاں ہی کرتی رہیں

ایک اُمیدِ بازدید جو تھی
دل کبھی یاس آشنا نہ ہوا
کب یہ سمجھے وہ دُور ہیں ہم سے
کب انھیں سامنے نہیں پایا
رات بھر میں نے اُن سے باتیں کیں
رات تک میرے پاس تھے گویا
ہونٹ، رخسار، کاکلیں، باہیں
ایک اک چھُو کے دیکھ سکتا تھا

پڑ گیا سُست رات کا جادو
دیکھتے دیکھتے سماں بدلا
ہولے ہولے سرک گئے تارے
چاند کا رنگ پڑ گیا پھیکا
اور پھر مشرقی جھروکے سے
صبحدم آفتاب نے جھانکا

در پہ باہر کسی نے دستک دی
(ڈاکیا ڈاک لے کے آیا تھا)
ایک دو ہی تو لفظ تھے خط میں
کیا پڑھا، کیا ہوا، نہ جانے کیا
اب سکوں آشنا ہیں دیدہ و دل
آج وہ سلسلہ بھی ختم ہُوا
اب کوئی کس کا راستہ دیکھے
اب کرے انتظار تو کس کا

وہ حسیں ہونٹ وہ حسیں آنکھیں
پھُول سا جسم، چاند سا چہرہ
عنبریں زلفیں، مخملیں باہیں
آج تک جن کا ”لمس“ باقی تھا
اب فقط اُن کی ”یاد“ باقی ہے
لُٹ گیا عشق کا سر و ساماں
ارضِ اُمید ہو گئی ویراں
اُس کی اک روئداد باقی ہے
ایک اُجڑا سواد باقی ہے

ابنِ انشا

غزل

مرے نصیب کئی مہوشوں کی چاہ رہی　　تمام عمر ملاقاتِ مہر و ماہ رہی

اجل کے داغ سے محفوظ ہے جمال اُس کا　　وہ دل کہ جس کو ترے دل سے رسم و راہ رہی

حیات و موت کی اس کشمکش میں بھی اے دوست　　نظر بلند رہی، اوج پر نگاہ رہی

اُٹھائے ناز مری بیکسی کے شاہوں نے　　مری خزاں کو بہاروں پہ دستگاہ رہی

کہاں پناہ ملے گی، کہاں اماں لوں گا　　اگر یہی روشِ حُسنِ بے پناہ رہی

زمانہ آج اُسے گرچہ کہکشاں کہہ دے　　کبھی تو رہگذرِ یار کجکلاہ رہی

رہا کیے در و دیوار گوش بر آواز　　تمام رات مری چشم رُو براہ رہی

تری نظر سے برستے رہے حسیں انوار　　مری نگاہ میں دنیا مگر سیاہ رہی

ہمارے عشق کی معصومیت پہ اے طاہر
کسی کے حُسن کی پاکیزگی گواہ رہی

جعفر طاہر

سہارا

آج وہی تارے، وہی دو تارے پھیلے ہوئے آسمان کی وسعتوں میں ٹمٹماتے ہوئے بہت سے تاروں میں سے بڑھتے معلوم ہو رہے تھے۔ آج اُس نے اُنھیں اپنا سہارا جانا اور چارپائی پر لیٹے لیٹے انھیں چمکتے دیکھتی رہی۔ کسی کسی وقت یُوں معلوم ہوتا جیسے وہ تارے بہت دُور چلے گئے ہوں، اور کبھی یوں نظر آتا جیسے دُھندلا گئے ہوں۔ اُن کی دُھندلاہٹ سے معلوم ہوتا کہ آنکھیں پُرنم ہیں۔ آہیں اُس کے سینے سے اُٹھتیں لیکن وہ انھیں روک لیتی، کہیں آس پاس سوئے ہوئے بھائی بہن جاگ رہے ہوں تو سُن نہ پائیں۔ وہ آنکھوں کو زور زور سے ملنے لگتی لیکن تارے کبھی کبھی دُھندلا ہی جاتے۔

کئی ماہ پہلے اُس نے ان ہی تاروں کو حمید اور وحید کے روپ میں دیکھا تھا، جیسے وہ دونوں اس کی دنیا میں چمکتے تھے۔ یہ بھی آسمان کی گھنی دُنیا میں چمکتے رہتے تھے۔ اُس نے بارہا کوشش کی ایک کو دوسرے سے زیادہ چمکتا دیکھنے کی مگر وہ دونوں یکساں آب و تاب سے فضا میں معلق رہتے۔ کئی دفعہ تو اس نے بڑی دیر تک ایک ہی پر ٹکٹکی باندھے رکھی اور پھر اُسے چھوڑ کر دوسرے پر نظر جما دی۔ اسے خیال رہتا کہیں ایک سے زیادہ دوسرے کو نہ دیکھتی رہے کیونکہ وہ دونوں قریبی رشتے دار تھے اور اکثر اکٹھے اُن کے ہاں آجاتے تھے۔ جب بھی وہ دونوں آتے وہ یا تو انھیں چھوڑ کر باہر نکل جاتی یا بیٹھی دونوں کی طرف ایک سا التفات ظاہر کرتی اور پھر دونوں کا موازنہ کرتی رہتی۔

دونوں کو سماجی نظام سے اختلافات تھے اور انسانی کمزوریوں اور بیچارگیوں سے ہمدردی۔ جب کبھی وہ پورے انہماک سے تبادلۂ خیالات کر رہے ہوتے اور ایسی باتیں کرتے جو اُن کے دل سے نکلی ہوئی ہوتیں تو وہ اُن میں کھو جاتی اور انھیں صحیح سمجھ کر تسلیم کر لیتی، اس طرح وہ ان کے بہت قریب آجاتی۔ لیکن جب وہ اس صورتِ حال کا حل تلاش کرتے تو ان کی رائے دو سمتوں میں چلی جاتی۔ حمید اس کا علاج سیاست میں تلاش کرتا۔ "سیاست سے ایسا ماحول پیدا کیا جا سکتا ہے جس سے تمام سماجی الجھنیں اور رکاوٹیں دُور ہو سکتی ہیں۔ سیاسی لیڈر ایسی سکیمیں تیار کر کے انھیں قوانین کی صورت میں پیش کر سکتے ہیں اور سب سماجی خرابیاں دُور ہو سکتی ہیں۔"

لیکن وحید اس کو ادب کا کام بتاتا اور ادب میں بھی افسانے کی صنف کو بالخصوص اس قابل سمجھتا کیونکہ افسانہ تھوڑا لکھے پڑھے لوگوں کو بھی متاثر کر سکتا ہے اور ان خامیوں کو دور کرنے کے لئے عوام کے دل تک پہنچنا زیادہ ضروری بھی تھا۔ اس کے علاوہ حمید کا زیادہ باتیں کرنا اور متبسم رہنا اور اس کے مقابلے میں وحید کا سنجیدہ اور کم گو ہونا ان دونوں کو تھوڑا سا مختلف کر دیتا۔

ایک دن ـــ اُس نے یکایک محسوس کیا کہ ایک تارے کی چمک مدھم پڑ گئی ہے اور وہ آسمان پر چھائے ہوئے کالے بادلوں کی زد میں آ رہا ہے، ہوا ہولے ہولے چل رہی تھی، کالے بادل مختلف شکلیں اختیار کرنے لگے۔ بادل پھیلتے رہے، انھوں نے کئی شکلیں اختیار کیں، انسانوں کی، جانوروں کی، پہاڑوں کی اور پھیلے ہوئے روئی کے گالوں کی اور دُھند سی آسمان پر چھا گئی، اُس دُھند میں سے دُوسرا ستارہ اُسے دکھائی دیتا رہا۔ دیکھتے دیکھتے اُسے دن بھر کی گزری باتیں پھر ستانے لگیں۔ آج صبح صبح اس کی چھوٹی پھوپھی آئی تھی۔ حسبِ معمول شور مچاتی ہوئی، اُس نے آتے ہی اپنی دھنسی ہوئی آنکھیں نکال کر، نتھنے پھلا کر، اور اپنا گورا چٹا چہرہ سُرخ کر کے اُس کی امّی سے پوچھا تھا۔ "بھابی، بھائی کہاں ہیں؟" اور اُس کی امی نے چولھے کے آگے بیٹھے بیٹھے ہنس کر کہا تھا۔ "نہ علیک نہ سلیک، نہ سلام نہ دعا، صبح صبح تمھیں بھائی کی کیا ضرورت پڑ گئی؟"

اور اُس نے صرف سنجیدگی ہی سے نہیں بلکہ سختی سے بھی کہا تھا۔ "تم بتاؤ تو سہی کہاں ہیں، ابھی ضرورت کا بھی پتہ چل جائے گا۔"

اُس کی امّی چپ ہو رہیں اور اُس کے ابا کے کمرے کی طرف اشارہ کر دیا، چھوٹی پھوپھی ادھر چلی گئی اور تھوڑی دیر بعد اُس کے ابا نے باہر آ کر

امی کو بلایا اور وہ چولھا اُس کے حوالے کر کے اندر چلی گئیں۔
دن بھر امّی نے اُس سے کھُل کر بات نہ کی، امی کی سسکیاں اور آہیں اُس نے کئی بار سنیں، آپا نے جب بھی اُسے دیکھا اُن کے ماتھے پر تیوری آ گئی، اور بھائی بے دلی سے باتیں کرتے رہے، وہ حیران تھی، گھر کا رویّہ کیوں ایک دم بدل گیا تھا؟
اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا، وہ سوچتی، سوچتے سوچتے تنگ آجاتی تو جھنجلا جاتی، میں نے کیا کر دیا ہے۔ چھوٹی پھوپھی کو میں نے کچھ نہیں کہا، ابا کو، امی کو، بھائیوں کو کبھی کچھ نہیں کہا، اسے خیال آتا شاید حمید اور وحید کی کوئی بات ہو، لیکن اُن کے متعلق تو اُس نے قطعاً کوئی بات کسی سے کہی، پھر اُس نے سوچا، شاید امّی کی طبیعت ٹھیک نہ ہو۔ اُس نے امّی سے پوچھ ہی لیا ــــ "امّی آپ اُداس کیوں ہیں؟"
امّی کی لال لال آنکھوں نے اُسے دیکھا۔ آنکھوں کی سُرخی سے پتہ چلتا تھا کہ وہ روتی رہی ہیں، امّی چپ رہیں۔
اُس نے پھر پوچھا "امی کیا بات ہے؟"
انھوں نے چولھے میں لکڑیاں ٹھیک کرتے ہوئے کہہ دیا۔ "کچھ نہیں"۔
لیکن اُن کی آواز میں رقت تھی، وہ برداشت نہ کر سکی، اُٹھی اور اپنے کمرے میں پہنچ کر پلنگ پر اوندھے مُنہ ہو کر خوب روئی، روتی رہی۔ اُسے کمرے میں رکھی ہوئی سب چیزیں، الماری، سنگار میز، پلنگ اپنی جگہ سے اُکھڑے اُکھڑے معلوم ہوئے، وہ پریشان بیٹھی سب کچھ دیکھ رہی تھی کہ حمید دروازے میں نمودار ہوا، اس کا چہرہ بھی اُترا ہوا تھا اور وہ حواس باختہ معلوم ہو رہا تھا۔ اُس نے آتے ہی پوچھا "کیا یہ سب کچھ سچ ہے؟"
وہ بھڑک اُٹھی، "کیا سچ ہے؟" اور پھر رونا شروع کر دیا۔
وہ آگے بڑھا "میں نے جو کچھ سُنا سب ٹھیک ہے؟"
وہ سسکیاں لیتی رہی، حمید نے پھر اپنا سوال دُہرایا۔
وہ اُٹھ بیٹھی، "آپ کیا پوچھ رہے ہیں؟"
"تم نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا، تمھیں وحید کا زیادہ خیال ہے۔" حمید نے انتہائی بے چارگی سے پوچھا۔
وہ سنبھل گئی، "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی"۔
"تم نے اُسے خطوط بھی لکھے ....." وہ فقرہ پورا نہ کر سکا۔
"خطوط؟" حیرت سے اُس کا مُنہ کھل گیا "کیسے خطوط، کون سے خطوط؟"
وہ چپ رہا۔ اُس نے پھر پوچھا "آپ کون سے خطوط کا ذکر کر رہے ہیں؟"
"مجھ سے نہ چھپاؤ۔ اب تو سب جان چکے ہیں۔" حمید زیادہ پریشان دکھائی دینے لگا۔
"لیکن میں نے کسی کو کبھی کوئی خط نہیں لکھا، آپ کن خطوط کا ذکر کر رہے ہیں" لفظ اُس کی زبان سے بے تکلف نکلے جا رہے تھے۔ وہ حیرت حمید کے چہرے پر ٹکٹکی باندھے تھی۔
"وہ خطوط جو اس وقت تمھاری چھوٹی پھوپھی جان کے پاس ہیں اور تم نے وحید کو لکھے ہیں"۔
"میں نے کوئی خط نہیں لکھا۔ میں کچھ نہیں جانتی، آپ مجھے ٹھیک ٹھیک کیوں نہیں بتاتے"۔ اس نے ہاتھوں میں مُنہ چھپا لیا اور رونے لگی
"تم نے کوئی خط نہیں لکھا؟" حمید کچھ حیران اور کچھ مضطرب سا دکھائی دینے لگا۔
"نہیں نہیں ــ!" وہ تڑپ کر بولی،
"تو وہ خطوط جو وحید کی الماری سے نکلے ہیں اور جن پر تمھارا نام لکھا ہے کس کے ہیں؟" حمید کا اضطراب اب خوشی میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔

"مجھے معلوم نہیں، میں نے کبھی کسی کو کوئی خط نہیں لکھا۔" وہ رو رہی تھی۔

حمید ذرا آگے بڑھا اور بولا "کیا یہ سچ ہے؟"

"آپ کو مجھ پر یقین نہیں تو میں کیسے یقین دلا سکتی ہوں۔" وہ رُوئے جا رہی تھی۔

حمید نے اُس کے جھکے ہوئے سر کو اپنے ہاتھوں پہ اُٹھایا اور اطمینان سے کہنا شروع کیا۔ "مجھے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں۔ مجھے تم پر اعتماد ہے مجھے یقین ہے۔ اب آنسو پونچھ لو۔ رونا بند کرو، پگلی کیوں ہو رہی ہو۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی — "امی صبح سے مجھ پر ناراض ہیں، ابا قہر آلود نظروں سے دیکھتے ہیں، میں نے کیا قصور کیا ہے، کیا ہو گیا ہے مجھ سے۔"

حمید اسے کتنی ہی دیر دلاسا دیتا رہا، وہ ابا، امی کی ناراضی اور بھائیوں کے رویئے کا خیال کر کے روتی رہی۔ وہ پریشان تھی، بیٹھے بٹھائے بھوپھی نے اتنا بڑا الزام اُس پر لگا دیا۔ ایسی بات جس کا اسے گمان تک نہ تھا۔ دن بھر وہ سب کے ڈر سے کچھ نہ کہہ سکی اور رات کو تاروں کو دیکھتی ہوئی سسکی لینے کو ترستی رہی، کہیں بھائی پاس ہوں تو سُن نہ لیں۔

اس دن کے بعد سے حمید کا آنا جانا زیادہ ہو گیا، کبھی اُس کی امی کو اپنے گھر کا کوئی پیغام دینے آ جاتا کیونکہ وہ اس کی پھوپھی ہی تو تھی، اور کبھی یونہی اس کے بھائی سے ملنے چلا آتا اور پہروں بیٹھا باتیں کرتا رہتا۔ اُسے حمید کی باتوں میں دلچسپی تو تھی اور اس کے پاس بیٹھ کر محو ہونا چاہتی تھی لیکن جب بھی وہ آتا وحید کا سنجیدہ چہرہ اُس کی نظروں میں گھومنے لگتا۔ اُس کی گفتگو اور رشتہ بحث یاد آ جاتی، اور پھر خطوط اور ابا، امی کی ناراضی سامنے آ کر ایک خوف سا پیدا کر دیتی۔ گھر والے اُس سے ملنے کو بُرا تو نہیں سمجھتے تھے لیکن خود اسے اس واقعہ کے بعد سے ڈر لگتا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ پھر اُس کے متعلق ایسی کوئی بات ہو اور پھر وہی پریشانی عود کر آئے مگر جب وہ دونوں اکیلے میں ملتے تو اس کے ہونٹ بے اختیار متبسم ہو جاتے اور حمید بھی مسکراتا ہوا اُس سے طبیعت کا حال پوچھ لیتا، حمید کے چلے جانے پر اسے محسوس ہوتا جیسے کچھ چھن گیا ہے۔ وحید کے ساتھ اُس کی پُر لطف سنجیدہ باتیں، اور وحید کا طرزِ تکلم اس کے لئے بیگانہ ہو گیا ہے۔ اُسے دکھ ہوتا آخر وہ یہاں کیوں نہیں آتا۔ شاید اس معاملے میں اسے بھی کچھ سرزنش کی گئی ہو، مگر پھر قصور کس کا ہے؟ وہ سوچنے لگتی۔

حمید کا آنا جانا کم ہو گیا، وہ ہر روز اس کا انتظار کرتی، وہ نہ آتا تو اس کے ذہن میں طرح طرح کے خیال آتے، کبھی وہ سوچتی "وہ مجھ سے ناراض نہ ہو گئے ہوں۔" کبھی ڈرتی "کہیں پہلی سی کوئی بات نہ ہو گئی ہو۔" پھر جب امی اور ابا کی طرف غور سے دیکھتی اور معلوم ہوتا کہ اُن میں کوئی تبدیلی نہیں ہے تو چُپ ہو رہتی۔ چند دن بعد اُس نے محسوس کیا کہ ابا اس میں زیادہ دلچسپی لینے لگے ہیں اور امی سے اکثر کہتے ہیں "اسے چولھا دیا کرو۔ سارا کام سنبھالے آخر سنبھالنا ہی تو ہے۔" اور جب بھی کھانا کھانے بیٹھتے تو کہتے، "میں تو اپنی بیٹی کے ہاتھوں کا پکا ہوا کھاؤں گا، دیکھوں تو بھلا کیا پکاتی ہے۔"

وہ اس تبدیلی کو سمجھنے سے قاصر انھیں کھانا کھلانے میں محو ہو جاتی اور خوش ہوتی کہ انھیں وہ بات بھول سی گئی ہے جس کے بعد وہ اتنی قہر آلود نظروں سے اُسے دیکھا کرتے تھے۔ حالانکہ اس میں اُس کا کوئی قصور نہ تھا —— بعض دفعہ اُسے خیال آتا، انھوں نے مجھ سے پوچھا تک نہیں، وہ خط کس کے ہو سکتے تھے، میں نے تو وحید کو خط نہیں لکھے اور لکھتی بھی کس لئے، پھر خط اُس کی الماری میں —— ابا نے بالکل نہ سوچا، چھوٹی پھوپھی نے امی کو بھی خیال نہ آیا، مجھ سے پوچھ ہی لیتے اور یوں ہی الزام دھر دیا، وحید ایسے خاموش اور شریف طبع کی الماری میں کس کے خط ہو سکتے تھے؟ یہ ایسی اُلجھن تھی جسے وہ سُلجھا نہ پاتی تھی۔

اور آج صبح جب گھر میں کوئی نہ تھا، وہ اپنے کمرے میں چیزوں کو ٹھیک کرنے میں مصروف تھی، حمید آیا اور آتے ہی کہنے لگا —— "کیا بھئی ہمارے یہاں چلو گی؟"

"کیا بات ہے؟" اس کے ہاتھ الماری میں کپڑے رکھتے ہوئے رُک گئے اور اُس نے سر اُٹھا کر حمید کو دیکھا اس کی آنکھوں میں ایسی چمک پہلے کبھی

"بات تو کچھ نہیں، میں پوچھ رہا ہوں، ہمارے یہاں چلنا پسند کرو گی؟" وہ مسکرا رہا تھا۔
"پسند تو میں کرتی ہوں، اور آپ کو معلوم ہے میں جا کر رہتی بھی ہوں کئی کئی دن ۔۔۔ میں سمجھی کوئی خاص بات ہے جو آپ آج خاص طور پر مجھے کہنے آئے ہیں؟"
وہ شوخ ہو گئی اور کپڑے الماری میں رکھنے لگی۔ حمید سنجیدہ ہو کر بولا "اب تمھیں ہمیشہ کے لئے ہمارے یہاں چلنا ہوگا، کہو پسند کرو گی؟"
"ہمیشہ کے لئے؟" حیرانی اور شرم سے وہ چپ ہو گئی۔ حیرانی اس لئے کہ حمید پہلے کبھی اتنا بے باک نہ ہوا تھا۔ شرم سے اس کی نظریں جھک گئیں۔
"حیران کیوں ہوتی ہو؟"
وہ چپ رہی۔
"ارے تم تو جیسے رونے لگیں۔ کیوں ہمارے ہاں جانا پسند نہیں تمھیں ۔۔۔" اور جواب کا انتظار کئے بغیر حمید اتنا کہہ کر "اچھا اب ایک روز تمھیں لینے آؤں گا، اور پھر تم میری ہو گی اب میں چلتا ہوں" جلدی سے باہر نکل گیا۔
وہ مبہوت کھڑی رہی اس کے ذہن میں بار بار حمید کے الفاظ گونجتے "اب تمھیں ہمیشہ کے لئے میرے ہاں چلنا ہوگا" پھر "ہمارے ہاں چلنا پسند کرو گی" اور پھر "اچھا اب میں ایک روز تمھیں لینے آؤں گا" اور پھر "تم میری ہو گی" ۔۔۔ "تم میری ہو گی" ایک بیکسی کے ساتھ ماحول میں پھیل جاتا اور وحید کا مجسمہ سامنے آ جاتا۔ وہ سوچتی وحید اگر یونہی آتا تو میں اُسے کیا جواب دے سکتی۔ حمید کے لئے ابا امی کہاں تک راضی ہیں؟ اسے معلوم نہ تھا مگر ان کی مرضی کے بغیر یہ ہو کیسے سکتا تھا۔ لیکن حمید یہاں کیسے آ گیا، اگر کسی نے دیکھ لیا ہو تو؟ ۔۔۔ وہ گھبرا گئی۔
وہ کتنی دیر وہاں کھڑی رہی اسے معلوم نہ تھا، لیکن سارا دن اسے گھر کے کام کاج کے دوران میں وہ واقعہ یاد آ جاتا، تو وہ جھٹ امی کی طرف دیکھتی کہیں وہ دیکھ تو نہیں رہیں اور کہیں انھوں نے وہ آواز تو نہیں سنی "تم میری ہو ۔۔۔!" اس پر خوشی اور حیرت سارا دن سوار رہی اور اپنے ہی خیالات میں کھوئی رہی۔ شام کو اسے محسوس ہوا کہ آج پھر ابا اور امی کے تیور بدل گئے ہیں، وہ گھبرائی کہیں کسی نے دیکھ نہ لیا ہو، حمید بھی تو ایسے میں اکیلا چلا آیا اُسے معلوم ہی تو نہ تھا، اگر معلوم بھی ہوتا تو کیا کر سکتی تھی، اسے چلے جانے کو کیسے کہتی۔ اس نے اچھا ہی تو کیا، آ گیا، ملنے کو جی بھی چاہ رہا تھا، لیکن وحید کبھی نہ آیا، اس الزام کے بعد حمید ہی اُس کا سہارا بنا۔ اُس نے فیصلہ کر لیا اب وحید کے متعلق کچھ نہ سوچا کرے گی اور حمید پر اپنی توجہ مرکوز کر دوں گی مگر ابا امی آج پھر کیوں ناراض ہو گئے، شاید انھوں نے ہم دونوں کو اکٹھا دیکھ لیا ہے اب وہ امی سے کیا پوچھے؟ کیسے پوچھے؟ اُس نے محسوس کیا کہ آج اُس نے پھر ابا امی کو کوئی صدمہ پہنچایا ہے، وہ اُن سے پرے پرے رہنے لگی اور کافی رات تک وہ سونے کے لئے نہ اُٹھی تو امی نے اُس سے پوچھا
"تم سوتی کیوں نہیں ۔۔۔؟"
"یوں ہی۔ میں ابا کا انتظار کر رہی ہوں۔ انھوں نے ابھی کھانا نہیں کھایا۔"
امی نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم جاؤ، میں انھیں کھانا کھلا لوں گی، وہ مردانے میں جانے کتنی دیر بیٹھیں۔"
وہ اوپر سونے کے لئے چلی آئی۔ چارپائی پر لیٹے لیٹے پھر انہی دو ستاروں کو دیکھنے لگی، جن میں سے ایک میں اُسے اپنا سہارا مل رہا تھا اور دوسرا اُس کی دنیا سے باہر ہو کر اُس سے دُور ہوتا جا رہا تھا، اُسے پھر حمید کی سلجھی ہوئی باتیں اور اُس کا اسے سنبھالا دینا یاد آ گیا، اتنے میں نیچے سے کھسر پھسر آوازیں آنے لگیں، وہ اوندھے منہ ہو کر باتیں سننے لگی، ابا اور امی باتیں کر رہے تھے۔
"میں نے تو اُن سے کہا تھا، لیکن وہ نہیں مانتے" ابا کہہ رہے تھے۔
"لیکن اس میں لڑکے کا کیا قصور ہے، پڑھا لکھا ہے، اللہ رکھے کماتا ہے، شریف ہے اور ہمیں کیا چاہیئے"
"مگر انھیں تو ایک ہی بات پر اعتراض ہے، وہ کیسے دُور ہو" ابا اکتائے سے تھے۔

"لڑکا تو شریف ہے" امی نے زور دیا۔

"شریف بھی ہے، خاندان سے بھی ہے، لیکن چچا کہہ رہے تھے آخر اُسی ماں کا بیٹا ہے جو شادی سے پہلے بازاری تھی۔"

"مگر اب تو گھر ہی میں رہنے لگی ہے اور کبھی اُس نے کوئی بات ایسی نہیں کی جس سے بازاری ہونے کا شبہ بھی ہو سکے۔" امی نے کہا۔

"تو بتاؤ میں کیا کروں؟ میں مانتا ہوں جو کلنک کا ٹیکہ ہمیں لگا تھا وہ بھی دُھل رہا ہے، لیکن چچا کہتے ہیں یہ رشتہ نہیں ہونے دوں گا، بازاری عورت کا لڑکا نہ جانے کب کیا گل کھلانے لگے، اور میں خاندان والوں کی رائے کیسے رد کر دوں۔" ابا غصے میں آ گئے،

اب وہ سمجھ گئی، اُس نے کروٹ لی اور انہی دو ستاروں کو دیکھنے لگی۔ وہ کبھی ایک کو اور کبھی دوسرے کو دیکھتی رہی اور کئی باتیں اُس کے ذہن میں چکر لگاتی رہیں، اُسے معلوم نہ ہو سکا وہ کیا سوچ رہی ہے۔

"لیکن دونوں ستارے تو میرے ہی ہیں، انھیں تو مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔" اُس نے لمبی آہ بھری، ستارے دُھندلا گئے اور آنکھیں مل کر کوشش کرتی رہی کہ وہ صاف دکھائی دینے لگیں۔

اختر رضی

غزل

یوں بیٹھے بیٹھے تیرا کرم یاد آگیا　　گویا علاجِ کثرتِ غم یاد آگیا

جب بھی کسی خوشی نے کیا اپنا التفات　　گزرا ہُوا زمانۂ غم یاد آگیا

پھر اُٹھ رہی ہے میری طرف آپ کی نظر　　کیا اور کوئی تازہ ستم یاد آگیا

بھولا ہُوا تھا دیر سے آدابِ بندگی　　خوش ہوں کہ تیرا نقشِ قدم یاد آگیا

ہنستے ہوئے گلوں کو جگر چاک دیکھ کر　　افسانۂ وجود و عدم یاد آگیا

گھر سے چلا تھا شیخ سوئے میکدہ مگر　　ظالم کو راستے میں حرم یاد آگیا

مضطر حیات چھوڑنے والی تھی میرا ساتھ

ناگاہ دوستوں کا کرم یاد آگیا

مضطر اکبر آبادی

اور اب ......؟

کبھی وہ عہدِ فسوں ساز تھا کہ جامِ حیات — ترے جمال کی مئے سے مہِ منوّر تھا
تری جمیل محبت کے فیض رنگیں سے — مری ہر ایک نظر میں شفق کا منظر تھا

۲

تری بہارِ جوانی کی اوٹ میں چھپ کر — جہاں کو پیکرِ رنگ و شمیم سمجھا تھا
مقامِ دل کو ترے التفاتِ پیہم سے — گلاب و لالہ و گل کی حریم سمجھا تھا

۳

خیال و فکر و تخیّل کے عرش بوس محل — ضیائے انجم و مہتاب سے فروزاں تھے
نشاط و کیف و طرب کے حسین افسانے — برنگِ خوابِ شگفتہ نظر میں رقصاں تھے

۴

گزر چکا ہے وہ عہدِ طرب نواز اور اب — حریمِ دل کئی رنگینیوں کا مدفن ہے
خیال و فکر کے بے رنگ و آب محلوں میں — فقط مہیب سی تاریکیوں کا مسکن ہے

۵

غبار بن کے پریشاں ہیں رہگزاروں میں — فسردہ پتیاں میرے گلِ تمنا کی
اُجڑ چکا ہے گلستان آرزوؤں کا — نظر پہ بھاری ہے شامِ خزاں کی ویرانی

۶

بدلتے وقت کی رفتارِ تیز گام کے ساتھ — بدل گیا ہے کچھ اس طرح زیست کا نقشا
کہ دل کو رات کی غمگین خلوتوں میں بھی
گزشتہ عیش کا احساس تک نہیں ہوتا

(حلقہ اربابِ ذوق دلی میں پڑھی گئی)

ضمیر اظہر

مطبوعات

کشمیر | چراغ حسن حسرت - کشمیر کا مسئلہ اس وقت بین الاقوامی حیثیت اختیار کر گیا ہے اس کے تسلی بخش حل پر پاکستان اور ہندوستان کی دونوں مملکتوں کے آئندہ تعلقات کا انحصار ہے - زیر تبصرہ کتاب میں کشمیر کی تاریخ پر ایک سیر حاصل نظر ڈالی گئی ہے اور آزاد کشمیر تحریک کے پس منظر کو اُجاگر کر کے موجودہ حالات کو سامنے لایا گیا ہے۔

کتاب کا انداز نہایت دلکش اور دل نشین ہے، چراغ حسن حسرت اُردو کے کہنہ مشق ادیب اور صحافی ہیں اور پونچھ سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے کشمیر کے مسائل میں اُن کا انداز نہایت ہمدردانہ ہے۔

جلد پوش نہایت اچھا ہے اور ایک ایسے کشمیری کی تصویر سے مزین جو ڈل میں کھڑا شاید اپنے سائے کو دیکھ رہا ہے۔ کتابت، کاغذ اور گٹ اَپ نہایت اچھا ہے ضخامت ۲۰۴ صفحات قیمت ۲/۸/- ملنے کا پتہ:- قومی کتب خانہ ریلوے روڈ - لاہور

حماقتیں | شفیق الرحمن، اُردو کے افسانوی ادب میں شفیق الرحمن نے ایک مقام حاصل کر لیا ہے - آپ کا انداز نہایت شگفتہ ہے اور ہنسی ہنسی میں بڑی بڑی باتیں کہہ جاتے ہیں - کھلنڈرا شفیق الرحمن اب کافی متین ہو گیا ہے، یہ عمر کا تقاضا ہے اور تجربات کا نتیجہ - وہ دیس دیس گھوم آیا ہے اس لئے اب وہ زندگی کے بیتے دنوں کی یاد تازہ کر کے "زندگی کا فلسفہ" بیان کرتا ہے - حماقتیں دراصل زندگی کے وہ پہلو ہیں جن کی یاد عمر بھر نہیں بھولتی ---- "نیلی جھیل" اور "بے بی" یہ دونوں کہانیاں بہت زیادہ بلند ہیں۔

یہ کتاب اُردو ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔

کتابت، طباعت اور گٹ اپ نہایت عمدہ قیمت -/۸/۲ ملنے کا پتہ، مکتبہ جدید، انارکلی، لاہور

ہندوستان کی قومی زبان اور رسم الخط | پروفیسر محمد معین الدین دردائی - اُردو کی ترقی اور ترویج کے سلسلے میں یہ کتاب ایک نہایت اہم کڑی ہے - پروفیسر صاحب ایک عرصے تک انجمن ترقی اُردو (ہند) میں ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے کام کرتے رہے ہیں اور ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کی رہبری اور مشوروں سے آپ نے کافی تحقیقاتی کام کیا ہے - یہ کتاب ایک تحقیقاتی مضمون ہے جس میں رسم الخط کے متعلق مواد کا کافی ذخیرہ ہے - اُردو رسم الخط کا مسئلہ بہت اہم ہے اس لئے یہ کتاب اس سلسلے میں دلچسپی سے پڑھی جائے گی۔

کتابت، طباعت اور گٹ اپ اچھی ہے - کتاب مجلد، ضخامت ۷۶ صفحات قیمت ایک روپیہ دو آنے

ملنے کا پتہ:- طیّب احسن اینڈ برادرس اسلامیہ بک ڈپو آرہ

گھروندے | عرش تیموری، یہ کتاب چھ ڈراموں کا مجموعہ ہے جس میں دو ریڈیائی ڈرامے ہیں - دو ڈرامے محض پڑھے جانے کے لئے لکھے گئے ہیں اور دو ڈرامے انگریزی سے ماخوذ ہیں۔

اُردو میں ڈراما بہت کم لکھا جا رہا ہے جس کی وجہ سٹیج کا موجود نہ ہونا ہے - بہت تھوڑے ریڈیو ڈرامے ایسے ہوں گے جو آسانی سے سٹیج ڈرامے میں تبدیل کئے جا سکیں، اس لئے جو بھی ڈرامے لکھے جاتے ہیں اُن میں سٹیج کا عنصر بہت کم ملتا ہے یا وہ اس لحاظ سے ناقص

ہوتے ہیں۔ بہر حال ادب کی اس صنف کو زندہ رکھنے کی یہ انفرادی کوششیں قابل تحسین ہیں،

کتاب مجلد، کتابت طباعت اچھی ہے۔ ضخامت ۴۴ صفحات قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ سلطانی بمبئی نمبر ۳

علی گڈھ میگزین

جلد ۲۳ نمبر ۱ بابت ۱۹۴۷ء ۳۱۸ صفحات ایڈیٹر محمود فاروقی بی۔اے (آنرز) ایم۔اے

مسلمانوں کی تعلیم کے سلسلے میں علی گڈھ کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ ہماری بہت سی علمی و ادبی تحریکات یہیں سے یہیں سے اٹھتی رہی ہیں، علی گڈھ کی اپنی ادبی روایات ہیں۔ طلبائے مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کا یہ علمی و ادبی سہ ماہی رسالہ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جسے نہایت محنت اور کاوش سے مرتب کیا گیا ہے۔ اُردو زبان پر تحقیقاتی مقالات اور دوسرے مضامین نظم و نثر بلند پایہ ہیں۔

تبصرہ کرتے وقت دل میں ایک خلش سی ہے۔ یو۔پی میں ہندی کو سرکاری زبان قرار دیا جا چکا ہے۔ اب وہاں اُردو کا مستقبل کیا ہوگا؟ مسلم یونیورسٹی کے طلبا ایسے کامیاب مجموعے پیش کرتے رہیں گے؟

خدا علی گڈھ کے طلبا کو توفیق دے کہ وہ اُردو کو زندہ رکھ سکیں۔

جان نثار

(افواج آصفیہ کا سہ ماہی رسالہ) ناشر حیدرآباد آرمی ایجوکیشن کور، ہیڈ کوارٹرز حیدرآباد آرمی۔

افواج حیدرآباد کے سپاہیوں میں علمی دلچسپی پیدا کرنے اور ناخواندگی کو دُور کرنے کے لئے یہ رسالہ جاری کیا گیا ہے اس کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اسے نسخ ٹائپ میں چھاپا گیا ہے۔ سرورق پر ایک سپاہی بندوق تھامے آگے بڑھ رہا ہے۔ رنگوں کے امتزاج نے سرورق کو دیدہ زیب بنا دیا ہے۔ رسالہ تصاویر سے مزین ہے۔ یہ پہلا شمارہ ہے۔ مضامین عام فہم اور دلچسپ ہیں۔ نظم کا حصہ بھی خوب ہے۔

اُردو رسم الخط کے سلسلے میں ٹائپ میں تجربات کرنے والوں کے لئے یہ رسالہ کافی رہنمائی کرے گا۔ یہ رسالہ میجر محمد عطاء الرحیم افسر کمانڈنگ حیدرآباد آرمی ایجوکیشن کور کی ساعی سے جاری ہوا ہے جو قابل مبارکباد ہیں۔

اقبال خواتین کی نظر میں

مرتبہ یکتا امروہوی۔ حکیم امت علامہ اقبالؒ پر بے شمار کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ مسلمانوں کی موجودہ بیداری میں علامہ کے افکار کو بہت زیادہ دخل ہے۔ خواتین اسلام بھی اُن کے پیغام سے متاثر ہوئی ہیں اور اس کا ثبوت وہ شعور ہے جو آج ان خواتین میں پایا جاتا ہے اور جس کا اظہار زیر تبصرہ کتاب سے ہوتا ہے۔

اس کتاب میں چوبیس خواتین کے مضامین درج ہیں۔ بائیس مسلمان خواتین ہیں اور دو غیر مسلم خواتین، اقبال اور اُن کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مقالات کا معیار کافی بلند ہے۔

کتابت او[illegible] اعت خوب ہے۔ کتاب مجلد حجم ۲۶۴ صفحات قیمت تین روپے آٹھ آنے۔ ناشر حکیم ذکی احمد، ملنے کا پتہ:۔ دفتر تالیق انگریزی، کلاں محل دہلی!

سید منظور حسین بخاری منیجر، پرنٹر پبلشر نے اتحاد پریس بل روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر ہمایوں ۳۲ لارنس روڈ لاہور سے شائع کیا۔ صرف سرورق رہنما پریس لاہور میں چھپا۔

Regd. No. L.1363.

بیادگار عمدۃ الفصحاء آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوں مرحوم

اردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی-اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لاء
جائنٹ ایڈیٹر: شیر محمد اختر

اُردو نمبر

فہرست مضامین

جلد ۵۳ — نمبر ۴

ہمایوں بابت ماہ اپریل ۱۹۴۸ء
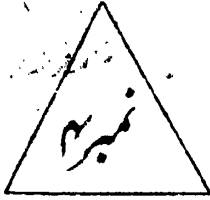
نمبر شمار	مضمون	صاحبِ مضمون	صفحہ
۱	بزمِ ہمایوں	بشیر احمد	۱۴۲
۲	قوم کے نام ڈاکٹر مولوی عبد الحق صاحب کا پیغام		۱۴۳
۳	اُردو سے وفا	خان بہادر میاں عبد العزیز صاحب ایم۔اے فلک پیما	۱۴۴
۴	مُسلمانوں کی بیداری کا نیا دَور	جناب سید وقار عظیم صاحب ایم۔اے	۱۴۶
۵	ہماری قومی زبان کی داستان	بشیر احمد	۱۵۹
۶	پاکستان میں اُردو	جناب ظہیر الدین احمد صاحب ایم۔اے	۱۷۲
۷	پاکستان سے اُردو کی توقعات	جناب سید نصیر الدین ہاشمی صاحب	۱۷۸

سالانہ چندہ	ششماہی	فی پرچہ
۶؍ صہ؍	سے؍	۸؍

بزمِ ہمایوں

پاکستان کے قیام کے بعد اُردو کے متعلق پنجاب کی ذمّہ داری دو چند بلکہ دہ چند ہوگئی ہے۔ لہٰذا ہمایوں یہ اُردو نمبر پیش کر رہا ہے۔ پچیس سال ہوئے مارچ ۱۹۲۳ء میں ہمایوں کا پہلا اُردو انعامی نمبر شائع ہوا تھا جس میں یہ مسئلہ زیرِ بحث تھا کہ "اُردو ہندوستان کی مُلکی زبان کیونکر بن سکتی ہے"؟ آج اُردو کو ہندوستان سے دیس نکالا دیا جا رہا ہے اور پاکستان اُسے اپنی قومی زبان بنانے کا اعلان کر چکا ہے۔ ہم کہاں تھے اور آج کہاں ہیں؟ یہ ہے ہمارے لئے ایک قومی اور اُردو کے لئے ایک لسانی انقلاب!

اِس نمبر میں ہم نے اُردو کے ماضی و حال پر نگاہ ڈالی ہے اور اُس کے مستقبل کا جائزہ لیا ہے۔ شروع میں لسانِ قوم ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے ہمایوں کے ذریعے اُردو کے متعلق قوم کے نام ایک معنی خیز پیغام بھیجا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ "لاہور اب اُردو کا سب سے بڑا مرکز ہے" اور "اُردو ہی ایک ایسی زبان ہے جو ہماری قومیت کی جان ہے"۔ جناب فلک پیما نے اپنے چند اُردو مشاہدات بیان کر کے بعض مقتدر رہنمایانِ اُردو کی یاد تازہ کر دی ہے۔ اس کے بعد "مسلمانوں کی بیداری کا نیا دَور" جدید ہندوستان کی تاریخ کا وہ پس منظر پیش کرتا ہے جس کے سامنے ہندو مسلمانوں اور اُردو ہندی کا ڈراما کھیلا گیا۔ "ہماری قومی زبان کی داستان" اُردو کے بچپن اور جوانی کی رام کہانی ہے۔ "پاکستان میں اُردو" میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ موجودہ حالات میں اُردو کی ایک ٹکسال کا قیام لابدی ہے اور اُردو کا پروپیگنڈا اور کام مختلف صوبوں میں مختلف طور پر ہونا چاہیئے۔ اخیر میں ایک پندرہ سالہ پروگرام پیش کیا گیا ہے جس کے مطابق پندرہ سال میں اُردو مکمل طور پر انگریزی کی جگہ لے سکتی ہے۔ "پاکستان سے اُردو کی توقعات" میں اس بات کی صراحت کی گئی ہے کہ اُردو کیونکر خواص و عوام میں پھیلائی جائے۔ گفتگو اور خط و کتابت وغیرہ اُردو میں ہو اور حیدرآباد کے ذخیرۂ اُردو سے کیونکر فائدہ اُٹھایا جائے۔

رسالہ پریس میں جا رہا تھا کہ ایک اور بیش بہا مضمون موصول ہوا۔ یہ ہے ڈاکٹر شائستہ بیگم سہروردی کا مضمون "پاکستان میں اُردو کا مستقبل" جو اب آئندہ نمبر میں شایع ہوگا۔ بیگم صاحبہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں بنگال کی نمائندہ ہیں اور اس لئے بنگال کے قضیۂ زبان کے متعلق انھوں نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ ایک خاص اہمیت اور دلچسپی رکھتا ہے۔ انھوں نے بنگالیوں کے اُردو والوں سے متعلق شبہات بیان کئے ہیں اور کہا ہے کہ اگر بنگالیوں کو یہ سمجھا دیا جائے کہ بنگالی اور اُردو کا مناقشہ دراصل پاکستان کے دشمنوں کی ایک سازش ہے تو وہ جلد انگریزی کی جگہ اُردو کو اپنی مشترک قومی زبان تسلیم کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ پنجاب کو اس بات میں خطاوار ٹھہرا کر کہ وہاں کے بعض نئے انشا پرداز اپنی غلطیوں کو نہیں مانتے۔ وہ فرماتی ہیں کہ "پنجاب اُردو کی علم برداری کا بیڑا اُٹھا رہا ہے اور اُسے اٹھانا بھی چاہیئے اور اقبال کے وطن کے یہ شایانِ شان بھی ہے"۔ اخیر میں انھوں نے لکھا ہے کہ "لاہور کو اُردو ادب اور اُردو زبان کا مرکز بنانا چاہیئے اور لاہور والوں کی کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ اُن کی زبان کی لطافت اور چاشنی دہلی اور لکھنؤ کو مات کر دے"۔

پنجاب میں پاکستان کی قومی زبان کے شیدائی اتنا بڑا دعویٰ کبھی نہ کریں گے لیکن امید ہے کہ وہ اپنے عمل اور مستقل مزاجی سے تازہ ترین انقلابی حالات میں دوسروں سے تعاون کرتے ہوئے اُردو کی مسلسل خدمت کر کے یہ ثابت کر دیں گے کہ بقولِ فلک پیما "اُردو سے وفا میں پنجابی سب سے اوّل ہے"! ــــ اسی قومی ضرورت کے ماتحت مارچ کے اخیر میں (۲۶ تا ۲۸ مارچ) پنجاب یونیورسٹی اُردو کانفرنس کا انعقاد قرار پایا اور ۲۶ مارچ کو "یومِ اُردو" منانے کا پروگرام تجویز ہوا۔ مقصد یہ ہے کہ اُردو کو جلد از جلد مکمل طور پر پنجاب کی دفتری تعلیمی اور قومی زبان کا بلند درجہ دے دیا جائے ــــ صدیاں ہوئیں کہ اُردو کی بنیاد پنجاب میں پڑی۔ کیا اب یہ پنجاب کی خوش قسمتی نہیں کہ اُردو دورِ حاضر میں بھی پنجاب ہی کے ہاتھوں علم و ادب اور قبولِ عام کی بلندیوں پر چڑھے؟ ــــ اُدھر پاکستان کے دارالسلطنت میں انجمن ترقیٔ اُردو (پاکستان) کے قیام کا اعلان ہو رہا ہے۔ خدا کرے کہ اُردو کا جھنڈا اُدھر مرکزی حکومت کے ایوان پر لہرائے اور اِدھر اہلِ پنجاب کی پھیلی ہوئی بستیوں کے لئے موجبِ لطف و ترقی ہو!

بشیر احمد

قوم کے نام ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کا پیغام

(ہمایوں کے ذریعے سے)

سرسید مرحوم کے سفرِ پنجاب کے بعد لاہور میں بیسیوں کانفرنسیں ہوئیں جن میں خود سرسید، نواب محسن الملک، مولانا نذیر احمد، مولانا حالی، علامہ اقبال اور دوسرے بزرگوں کی فصیح اور پُرجوش تقریریں ہوئیں اور نظمیں پڑھی گئیں، انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے خاص طور پر بڑی شان و اہتمام سے ہوتے اور دُور دُور دُوسرے شہروں اور قصبوں کے لوگ بڑے شوق سے ان میں شریک ہوتے تھے۔ ہجوم کی یہ کثرت ہوتی تھی کہ چھتوں اور درختوں پر بھی جگہ باقی نہ رہتی تھی۔ یہ کانفرنسیں کے جلسے بہت یاد آئیں گے۔ مگر اب جو اُردو کانفرنس یہاں ہو رہی ہے اُس کی حیثیت اور نوعیت بالکل اور ہے۔ یہ آزاد مملکتِ پاکستان میں پہلی اُردو کانفرنس ہے اور اس کی عزت لاہور کو حاصل ہوئی ہے۔ اِس کا انعقاد خاص مقصد سے کیا جا رہا ہے وہ یہ کہ اُردو اور صرف اُردو پنجاب کی تعلیمی اور سرکاری زبان ہو۔ اس کے متعلق اس سے قبل صدہا تقریریں ہوئیں، مضامین لکھے گئے، رسالے اور کتابیں شایع ہوئیں، قرار دادیں منظور کی گئیں، لیکن عمل کے میدان میں کچھ کامیابی نہ ہوئی، اس لئے کہ عمل صرف ہمارے ہاتھ میں نہ تھا۔ جن اداروں اور محکموں کے اختیار میں ان تجویزوں اور قرار دادوں کی تعمیل تھی اُن میں کثرت سائے مخالفین کی تھی، جن میں ایسے بھی تھے جو اُردو بولتے، پڑھتے اور لکھتے تھے۔ اب فضا بہت کچھ بدل گئی ہے اور اختلاف کی وہ شدت باقی نہیں رہی اس لئے توقع ہے کہ یہ کانفرنس جو تجویزیں بالاتفاق منظور کرے گی وہ دیر سویر ضرور عمل میں آکر رہیں گی۔

ہندوستان سے اور خاص کر اس علاقے سے جو اُردو کا جنم بھوم ہے اور جہاں اس نے بے نظیر ترقی کی منزلیں طے کی تھیں اور جہاں وہ مقبولِ خاص و عام تھی وہ بڑی بے دردی سے نکال دی گئی ہے۔ اب اس کا ٹھکانا پاکستان میں رہ گیا ہے اور پاکستان میں جس علاقے نے سب سے زیادہ اُردو کی خدمت کی ہے اور اسے فروغ دینے کی کوششیں کی ہیں وہ صوبۂ پنجاب ہے۔ یہ اسی ذوق اور جوش کا نتیجہ ہے کہ سب سے پہلے اُردو کانفرنس لاہور میں کی جا رہی ہے جو اس وقت اُردو کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ یقین ہے کہ اِس کانفرنس کے بعد اس ذوق اور جوش میں اور اضافہ ہوگا اور لاہور کے اخبار اور رسالے کانفرنس کی منظور کردہ قرار دادوں کی تائید میں پُرزور مضامین لکھیں گے۔ جس کی پہلی قسط میاں بشیر (یا ہمایوں) کا یہ اُردو نمبر ہے۔ اُمید ہے پاکستان کے دوسرے علاقے بھی اپنی قومی زبان کی ترویج میں پنجاب سے پیچھے نہ رہیں گے۔

ہم میں بعض ایسے بھی ہیں جو خیال کرتے ہیں کہ پہلے ہمیں ہندی والوں کی رعایت سے عربی فارسی الفاظ کے استعمال میں بڑی پابندی کرنی پڑتی تھی، اب ہم آزاد ہیں۔ بلاتکلف غیر مانوس عربی لفظ استعمال کر سکتے ہیں۔ ایک صاحب نے تو یہ تجویز پیش کی ہے کہ اُردو میں زیادہ سے زیادہ عربی لفظ استعمال کئے جائیں تاکہ وہ عربی زبان سے زیادہ قریب ہو جائے۔ یہ زبان کے بگاڑ کی باتیں ہیں۔ ہندی کے الفاظ اُردو زبان کے بنیادی لفظ ہیں اور اس کا حسن ہیں اور زیادہ تر کہاوتیں اور محاورے ہندی ہیں یا ان میں ہندی جُز غالب ہے۔ اس قسم کے خیال یو۔ پی کی جدید ہندی کو دیکھ کر دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ یہ ہندی جو اب یو۔ پی کے دفتروں اور آل انڈیا ریڈیو میں جاری کی گئی ہے عجیب و غریب زبان ہے جو کسی فرد بشر کی مادری زبان نہیں اور کسی علاقے شہر، قصبے یا گاؤں میں نہیں بولی جاتی۔ ہمیں اس کی تقلید کر کے اپنی زبان خراب نہیں کرنی چاہیئے اس سے بڑھ کر تنگ دلی اور تعصب کیا ہوگا کہ یہ لوگ ایسے عربی فارسی لفظ بھی جو عام طور پر لکھے پڑھے اور اَن پڑھ سب بولتے ہیں اپنی زبان سے خارج کر کے اُن کی جگہ ثقیل بھدّے سنسکرت لفظ داخل کر رہے ہیں۔ ہماری کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ ہم اپنی زبان کو زیادہ فصیح و وسیع اور قومی بنائیں۔ زبان میں جو لفظ آگئے ہیں خواہ کسی زبان کے ہوں، ان کو اپنا سمجھیں۔ ہمیں اس معاملے میں ہندی والوں کی طرح تنگ نظری سے کام نہیں لینا چاہیئے۔ یہ ہماری زبان کے مزاج اور فطرت کے خلاف ہے ـــــ اب اہلِ پاکستان کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی قومی زبان کی ترویج و ترقی کی ہر ممکن کوشش کریں کیونکہ قوم کے شیرازے کو مضبوط کرنے اور اس کو منتشر ہونے سے بچانے کے لئے یہی کام آسکتی ہے۔ مقامی زبانیں محدود ہیں۔ ان میں قومی شان اور قومی قوت نہیں۔ اُردو ہی ایک ایسی زبان ہے جو ہماری قومیت کی جان ہے اور اس کی بدولت ہم ایک دوسرے سے قریب ہو کر اپنی تہذیب و روایات کو قائم رکھ سکتے اور یک دل و یک جان ہو کر کام کر سکتے ہیں۔

ع الحق

اُردو سے وفا

میرے بچپن میں ہر پنجابی بچّے کی اُردو تعلیم
"ماں بچّے کو گود میں لئے بیٹھی ہے"

سے شروع ہوتی تھی۔ یہ کتاب ختم ہوئی تو سکول میں قصصِ ہند اور اُس کے بعد بنات النعش نے دل موہ لیا۔ اُس زمانے میں گورنمنٹ کی دریادلی تھی کہ مولوی نذیر احمد صاحب کو پانسو روپیہ انعام عطا کردیا! یہ تو درسی کتابیں تھیں۔ اینجانب نے فرصت کے وقت چھپ چھپ کر حاتم طے اور فسانۂ عجائب کو بار بار پڑھا۔ پھر داستان امیر حمزہ، فسانۂ آزاد اور آخر کار طلسم ہوشربا۔ جن دنوں حاتم طے پڑھتا تھا ایک دن موچی دروازہ کے باغ کے باہر مولانا محمد حسین آزاد مرحوم کو اُس حالت میں دیکھا جو اُن کی تھی۔ مگر مصنف آبحیات کو زمانے اور زمانے والوں سے کیا واسطہ، اُردو میں وہ خوانِ نعمت پھیلا گئے کہ حاتم رشک کرے۔ ۱۸۹۴ء میں مرحوم سید احمد خاں کا لاہور تشریف لانا سٹیشن پر جاکر دیکھا اور پھر اس جگہ جہاں اب کپور تھلہ ہاؤس ہے اور جس کا پنجابی نام کوڑی باغ ہے مرحوم کی تقریر سُنی۔ اُن کا جوش سے کلمہ لاالہ الا اللہ محمدؐ رسول اللہ پڑھنا اب تک یاد ہے۔ کانوں میں وہ خلوص کی صدا گونج رہی ہے۔ شیخ عبدالعزیز جو بعد میں ابزرور کے ایڈیٹر بنے میرے ہمراہ تھے وہ اور میں پورے چار سال کالج میں پرائمس اور سکنڈس کہلاتے رہے۔

کالج داخل ہوتے ہی مرحوم عبدالرشید چشتی، مرحوم مرزا اعجاز حسین اور ہم دو عبدالعزیزوں کی باقی دنیا سے الگ تھلگ ٹولی سی بن گئی۔ ایک ڈیڑھ سال بعد ہم چاروں شعر شاعری کے متعلق تو کامل طور پر شیخ سر عبدالقادر کے زیر اثر آگئے اور تقریروں کے متعلق مولوی شاہ دین کے گرویدہ ہوئے۔ ینگ مینز محمڈن ایسوسی ایشن کے جلسے باقاعدہ ہونے اور چشتی صاحب کے بعد میں سکریٹری بنا اور برسوں رہا۔ جب ہمارے استاد مسٹر ٹی۔ ڈبلیو۔ آرنلڈ نے ہمارے ساتھ فرش پر بیٹھ کر مولوی شاہ دین کے گھر کھانا کھایا تو بہت تعجب ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب محمود غزنوی کے حملوں کو مات کر دینے والے حملے مولانا حافظ نذیر احمد صاحب کے ہوتے تھے۔ ہر سال انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں میں آتے۔ گھنٹوں وعظ کرتے چندہ وصول ہوتا۔ لوگ خوش ہوتے۔ مولوی صاحب قہوہ پیتے جاتے اور تقریر کرتے نہ تھکتے۔ اس رنگ میں بعد میں خواجہ کمال الدین مرحوم نے بھی بہت نام پیدا کیا مگر مولانا نذیر احمد کی بات اور تھی۔ ہم سب نے اُن کا نام لارڈ مکالے (Macaulay) رکھا ہوا تھا۔ ان کے وعظ زیادہ تر انجمن کے سکول (واقع شیرانوالہ دروازہ) کے صحن میں ہوتے تھے اور ایک لکچر اسی صحن میں مرحوم نواب محسن الملک کا ہوا۔ نواب محسن الملک کی تقریر میں جوش کم مٹھاس اس قدر زیادہ کہ لوگ ترستے رہ جاتے۔ اُن کے شاداب سُرخ سفید چہرے سے محفل میں رونق آجاتی۔ مولانا نذیر احمد صاحب کی بلاغت کو اُن کے چہرے کی ساخت سے مدد کم ہی ملتی تھی۔ محسن الملک صاحب کی صورت نورانی اور لفظ پھول۔

جب لاہور میں ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ ریلوے ٹکنیکل سکول میں ۱۸۹۸ء میں ہوا تو میں تھرڈ ایئر میں تھا۔ والنٹیر تھا اور چندہ کے لئے پنڈال میں مختصر تقریر بھی کی۔ محسن الملک مرحوم نے مجھے کتابیں انعام میں دیں اور ایک فوٹو کھینچا گیا جس میں میرا ہاتھ مرحوم صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کے کندھے پر تھا۔ ایک موقع پر انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں مرحوم نواب محمد حیات خاں والد نواب لیاقت حیات خاں نے بھی مجھ مہربانی سے یاد فرماکر میرے کام کی تعریف کی تھی۔ اصلی قومی زندگی تو مرحوم سید احمد خاں کے میموریل فنڈ کے جلسے میں نظر آئی۔ یہ جلسہ ٹاؤن ہال کے پہلو والے قطعہ میں ہوا۔ مرحوم صاحبزادہ آفتاب احمد خاں اس جلسہ کے روحِ رواں تھے۔ میں اُن دنوں گورنمنٹ کالج کے بورڈنگ میں

رہتا تھا اور میرا اور مرحوم سر فضل حسین کا کمرہ ساتھ ساتھ تھا یہی وہ دن تھے جب میر غلام بھیک نیرنگ سے دوستی بڑھی اور شعر سننے کا شوق سر عبدالقادر کی پُر لطف گفتگو سن کر پہلے سے دس گُنا زیادہ ہوا۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد علامہ اقبالؔ مرحوم کی نظم "جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں" بہت عقیدت سے مولوی شاہدین کے گھر ینگ مینز محمڈن ایسوسی ایشن میں خود میں نے سنائی۔

اُردو کا شوق بڑھتا گیا۔ برسوں باقاعدہ طور پر ہر سال محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں شرکت ہوئی۔ چنانچہ ۱۹۰۴ء لکھنؤ والی کانفرنس میں ہم سب یعنی علامہ اقبالؔ مرحوم، مرزا اعجاز حسین مرحوم، شیخ سر عبدالقادر اکٹھے ایک ہی جگہ قیصر باغ میں رہے اور لکھنؤ کے مشہور شاعر مرزا محمد ہادی سے اُن کا کلام سننے اکٹھے گئے وہیں مولانا محمد علی مرحوم جیسی شاندار ہستی سے پہلی دفعہ تعارف ہوا۔

۱۹۰۳ء سے دو سال پہلے کے ایک واقعہ کی طرف توجہ دلا کر اس تذکرہ کو ختم کرتا ہوں۔ لارڈ کرزن کا دہلی دربار دسمبر ۱۹۰۲ء اور جنوری ۱۹۰۳ء میں ہوا کرزن بھی گیا، لیڈی کرزن کا طاؤسی گون بھی لوگ بھول گئے مگر جو چیز جب تک ایک مسلمان جو اُس وقت موجود تھا زندہ ہے کبھی محو نہ ہوگی وہ ہے مولانا حالیؔ کی نظم!

نظم کی صبح مرزا اعجاز حسین اور بندہ اور شاید ایک آدھ اور دوست مولانا حالیؔ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مولانا کو حرارت تھی پشمینہ کی چادر اوڑھے سردی سے بچنے کے لئے اکڑوں بیٹھے تھے۔ دل سے ہزاروں دعائیں نکلیں کہ خدا کرے شام کو نظم خود پڑھیں۔ شام ہوئی تو مولانا پنڈال میں موجود تھے مگر اُسی طرح چادر لپیٹے لپٹائے اور نظم مولانا وحید الدین کو دے دی کہ پڑھ کر سنائیں۔ مولانا وحید الدین نے دو تین شعر ہی پڑھے تھے کہ حالیؔ صاحب سے رہا نہ گیا، اُٹھے نظم وحید الدین صاحب کے ہاتھ سے نوچ کر خود سنانے لگے۔ عجب سماں بندھا۔ کوئی آنکھ نہ تھی جو پُرنم نہ تھی بعض کی تو ہچکیاں بندھ گئیں۔ شخصیت ہو، خلوص ہو تو اُردو جادو ہے۔

پنجاب والوں میں خامیاں سہی، دہلی، لکھنؤ والوں میں پختگی سہی، مگر اُردو سے وفا میں پنجابی سب سے اوّل ہے۔
"اُردو اپنے زندہ دل بچّے کو گود میں لئے بیٹھی ہے۔"
"ہمایوں" میں اس وفا کی جھلک نمایاں ہے!

فلک پیما

زبانِ اُردو

اللہ اللہ یہ معراجِ زبانِ اُردو — اور ہی کچھ نظر آنے لگی شانِ اُردو

اب تو ہر موجِ حوادث بھی سہارا ہے اِسے — ہم کو باقی نہیں کچھ خوفِ زبانِ اُردو

ہم نشیں عہدِ گزشتہ کے فسانوں کی قسم — شانِ ملت ہے جو قائم رہی شانِ اُردو

شررؔ نعمانی

(منقول از "ہماری زبان" ۱۶)

[illegible] یادو

۱۸۵۷ء کا غدر ہندوستان کی زندگی کے لئے عموماً اور مسلمانوں کی زندگی کے لئے خصوصاً ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سنگِ میل پر کھڑے ہوکر اصحابِ نظر نے مسلمانوں کی گزری ہوئی زندگی کی جو تصویر دیکھی ہے اس میں ہر طرح کی ابتری اور بدحالی کے آثار نظر آتے ہیں۔ اجتماعی حیثیت سے سیاست، تمدن اور معیشت کے جسموں پر گہرے زخم ہیں اور انفرادی حیثیت سے مایوسی، انتشار، پراگندگی اور اس کے لوازم فکر اور عمل کا فقدان۔ مسلمان نے اپنی صدیوں کی جدّوجہد اور ذہنی، جسمانی، روحانی اور اخلاقی قوتوں سے جو کچھ حاصل کیا تھا وہ سیاست کے شاطروں نے اُن سے چھین لیا۔ سیاست ہاتھ سے گئی تو اس کا فوری اثر معاشی زندگی پر پڑا اور معاشی زندگی کی ضربوں نے ذہنی اور اخلاقی قوتوں کو مجروح کیا اور ایک وقت ایسا آیا جب مسلمان کے پاس ماضی کے تزک و احتشام کی نمائش کے جذبے کے سوا کچھ باقی نہ رہا۔ نام کی حکومت، نام کا تمدن، نام کی معیشت اور محض تسکین خاطر کے لئے روحانی اور اخلاقی قوتوں سے ایک جذباتی تعلق، یہ سب کچھ تھا، لیکن جو کچھ اب مسلمانوں کے پاس نہیں رہا تھا اسے دوبارہ حاصل کر لینے کی خواہش ایک خاص گروہ میں اب بھی موجود تھی۔ اب بھی ایک گروہ ایسا تھا جو اپنے صدیوں کے حاصل کئے ہوئے سرمایہ کے چھن جانے کے خیال سے بےچین تھا اور اُس کے دل میں اس "ذات" کے خلاف حد درجہ کی تلخی تھی جو اس صورت حال کی ذمہ دار تھی۔ اکثر دلوں میں یہ خیال اُبھرتا لیکن گردوپیش کے حالات اُسے دبا دیتے۔ لیکن کچھ لوگ ایسے تھے جنھیں یہ بھروسہ تھا کہ وہ اپنی گرمیٔ ایمان سے تخریبی قوتوں کو جلا کر خاک کر دیں گے۔ یہ گرمیٔ ایمان اپنا کام کرتی رہی۔ چنگاری شعلہ بنی اور ایک دن ایسا آیا کہ اس شعلہ کی لپک نے ملک کے مختلف حصوں میں بغاوت کی آگ سُلگا دی۔ یہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ تھا۔ ہنگامہ ہوا لیکن شعلہ کی طرح بھڑک کر خاموش ہوگیا۔ دلّی جو پہلے سے تباہ تھی اور بھی تباہ ہوئی۔ جس تخت و تاج پر مسلمانوں کا برائے نام قبضہ تھا وہ ہمیشہ کے لئے ہاتھ سے گیا۔ مسلمانوں میں جنھیں ذرا عزت حاصل تھی انھیں چُن چُن کر مارا گیا۔ زمینیں چھنیں، جائدادوں پر قبضہ ہوا، بے گناہوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی اور مسلمانوں کی جو رہی سہی عزت، آبرو، آن بان، شان و شوکت تھی وہ ختم ہوگئی۔ مرنے والے جینے والوں کے لئے عبرت کا سامان بنے اور جو جیتے رہے وہ جیتے جی مُردہ ہوگئے، بے آس، بےکس، مایوس، غمزدہ اور ماضی کی یادوں کا ایک عبرت خیز مرقع، انگریز اب تک جو کچھ سیاست کے پردے میں چھپ کر کرتے رہے تھے وہ اعلانیہ کرنے لگے۔ مسلمان باغی تھے، حکومت کو ان پر بھروسہ نہیں تھا، وہ انھیں اپنا دشمن سمجھتی تھی اور ان کے ساتھ کسی قسم کی مراعات کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ اس کی پالیسی صرف یہ تھی کہ ان کی اجتماعی قوت کو ختم کرنے کے بعد انفرادی طور پر بھی ان کے ذہنوں کو مفلوج اور جسموں کو ناکارہ بنا دے۔ وہ تعلیم سے محروم رہیں، انھیں ملازمتیں نہ دی جائیں، ان کی آزادی کی راہوں میں روڑے اٹکائے جائیں، ان میں اخلاقی پستیوں کی پرورش ہو اور وہ زندگی کی دوڑ میں اپنے سارے حریفوں سے پیچھے، بہت پیچھے رہ جائیں۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے ہر ممکن ترکیب کی گئی۔ مسلمانوں کے تعلیمی اداروں کی مالی امداد روک دی گئی۔ ان کے لئے نئی تعلیم کے دروازے سختی سے بند کر دیئے گئے۔ معاشی زندگی کی جدوجہد میں ان کے لئے ہر طرح کی دشواریاں پیدا کی گئیں، ان پر مقدمے چلائے گئے، ان کے عالموں کو قید و بند کی سزائیں دی گئیں، قوم کی اخلاقی اور ذہنی تربیت کی کوشش حکومت کی بغاوت کے مترادف ٹھہرائی گئی اور بغاوت کی سزا قانون کے نزدیک موت ہے یا زندگی بھر کی جلاوطنی ــــــ عالم اور مذہبی پیشوا جلاوطن ہوئے اور موت کے گھاٹ اُتار دیئے گئے۔

یہ سب ہوتا رہا اور حکومت کو اپنے مقصد میں کامیابی ہوتی رہی۔ مسلمان برابر ذہنی اور معاشی زندگی میں پیچھے ہٹتے رہے، ان کی مایوسی بڑھتی رہی وہ ذہنی اور جسمانی طور پر مفلوج اور ناکارہ ہوتے رہے۔ لیکن ایک گروہ اب بھی ایسا تھا جو ظلم و تشدد سے ٹکرلے رہا تھا، صبر و رضا کی قوت کے بھروسے

[illegible] سے اپنے کام میں مصروف تھا' بغاوت کے مقدمے' دار و رسن کی سختیاں' جلاوطنی' پھانسی' یہ سب کچھ جاری رہا۔ لیکن ایک کی جگہ دوسرا لیتا رہا۔ اب بھی مسلمانوں کی اصلاح و بیداری کا کام جاری رہا۔ غدر سے پہلے سید احمد شہید کی جو تحریک مسلمانوں کی اصلاح کے لئے شروع ہوئی تھی' غدر کے بعد ان کے پیروؤں نے اسے اسی جوش اور شدّومد سے جاری رکھا اور حکومت نے اپنی ہر کوشش کے باوجود اس جذبے کو مغلوب نہ کر سکی۔ زبانیں بند کی گئیں' اسیری کی صعوبتیں دی گئیں' لیکن ذہن آزاد رہا" اور اس ذہنی آزادی نے بالآخر حکومت کو شکست دی۔ حکومت نے ۱۸۷۰ء میں پہلی مرتبہ یہ محسوس کیا کہ مسلمانوں کو دبانا ممکن نہیں۔ ان کی وفاداری انھیں دشمن سمجھ کر حاصل نہیں کی جا سکتی۔ ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا پڑے گا۔ مسلمانوں کی گرمیٔ ایمان نے دشمن کو اس طرح مغلوب کیا اور حکومت کو بالآخر ۱۸۷۱ء میں مسلمانوں کے متعلق اپنی پالیسی بدلنی پڑی اور ان کی تعلیم کے سلسلے میں صوبوں میں ہدایات بھیجیں کہ سرکاری مدرسوں میں مسلمانوں کی قدیم زبانوں اور دیسی زبان کو رائج کیا جائے۔ مسلمان استادوں کا تقرر ہو۔ جن مدرسوں میں مسلمان جدید طرز کے مطابق تعلیم دینا چاہتے ہیں اُن کی مالی مدد کی جائے اور یونیورسٹیوں میں بھی عربی اور فارسی کی تعلیم شروع کی جائے۔ اس طرح صوبوں میں مسلمانوں کی تعلیم کے مختلف پہلوؤں کی طرف توجہ شروع ہو گئی۔ حکومت کی طرف سے مسلمانوں کی تمدّنی اور معاشی ترقی کی طرف یہ پہلا قدم تھا۔

اس کے بعد برابر حکومت کی طرف سے اس معاملہ میں سرگرمی اور عمل کا اظہار ہوتا رہا۔ وائسرائے نے صوبوں سے رپورٹیں طلب کرنے کے بعد ۱۲ر جون ۱۸۷۲ء کو ایک طویل ریزولیشن جاری کیا اور اس کے مطابق یہ فیصلہ ہوا کہ جہاں کہیں مسلمان خوش حال نہیں ہیں حکومت ان کی امداد کرے اور ان کی تعلیمی کمی کو پورا کرنے کا ذمہ لے۔ اس کے بعد سے ملک کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کو تعلیم کی ہر منزل میں رعایتیں دی جانے لگیں۔ ۱۸۸۲ء میں ہنٹر کمیشن بٹھا دیا گیا تاکہ وہ مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کا جائزہ لے۔ اس کمیشن نے تحقیقات کی تو پتہ چلا کہ مسلمان اب بھی تعلیم میں بہت پیچھے ہیں چنانچہ ۱۵ر جولائی ۱۸۸۵ء کو حکومت نے ایک ریزولیشن پھر جاری کیا اور اس میں ایسی تدابیر اختیار کرنے کا فیصلہ کیا کہ مسلمان تعلیم کی طرف تیزی سے قدم بڑھائیں۔ ۱۸۷۱ء سے ۱۸۸۵ء تک حکومت کی طرف سے مسلمانوں کی تعلیم کے سلسلے میں جو کچھ ہوا اُس سے مسلمانوں کو اپنی تعلیمی حالت بہتر بنانے میں خاصی مدد ملی۔

لیکن مسلمانوں کے ساتھ غدر سے پہلے اور غدر کے بعد انگریزوں کا جو برتاؤ رہا اُس کے بعد مسلمانوں کے لئے یہ سمجھنا دشوار تھا کہ حکومت جو کچھ کر رہی ہے اس کا مقصد مسلمانوں کی بہبودی ہے۔ وہ حکومت کی ہر چیز کو شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ان کے دلوں میں اب شاید آگے بڑھنے کا ولولہ اور اُمنگ باقی نہیں رہی تھی۔ بہت کچھ کھو کر جو تھوڑا بہت اُن کے پاس رہ گیا تھا اُسے وہ اپنے سینوں سے لگا کر رکھنا چاہتے تھے' لے دے کر انھیں مذہب اور مذہبی عقیدوں کا سہارا تھا اور اُن کا خیال تھا کہ انگریزی تعلیم کے جال میں پھانس کر ان کی یہ دولت بھی اُن سے چھیننا چاہتے ہیں۔ یہ خیال عام مسلمانوں کے دلوں میں بھی تھا اور بعض مذہبی جماعتیں بھی یہی سمجھتی تھیں اس لئے مسلمانوں کو تعلیم کی طرف مائل کرنے کا کام بے حد دشوار تھا۔ اس دشواری کا احساس مسلمانوں کے اس طبقے نے کیا جسے ہم آج اپنی بیداری کے دورِ جدید کا علم بردار کہہ سکتے ہیں۔ اس گروہ کے لوگوں نے مسلمانوں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لے کر جو نتیجے نکالے ان کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) مسلمانوں پر غدر اور غدر کے بعد کے واقعات نے مایوسی' مغلوبیت اور بے بسی کی سی کیفیت طاری کر دی ہے' ان کے فکر اور عمل کی قوتیں مفلوج ہو گئی ہیں۔

(۲) ان کی معاشی زندگی میں حد درجہ کی ابتری اور بدحالی پیدا ہو گئی ہے۔ وہ مفلوک الحال ہیں اور اس حالت میں بے بسی کی زندگی گزار رہے ہیں۔

(۳) سوسائٹی میں اب ان کی کوئی عزت باقی نہیں رہی اور اس حالت میں ان میں کمتری کا زہریلا احساس پیدا کر دیا ہے۔

قوم کے حکیموں نے ایک طرف تو مرض کی تشخیص کی اور دوسری طرف ان امراض کے علاج کے مختلف نسخوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ان کے نزدیک قوم کے ان امراض کو ذیل کے طریقوں سے دُور کیا جا سکتا تھا۔

(۱) ایسی تعلیم دے کر جس سے سرکاری ملازمتیں ملنے میں آسانیاں ہوں۔

مسلمانوں کی بیداری کا نیا دور

۱۸۵۷ء کا غدر ہندوستان کی زندگی کے لئے عموماً اور مسلمانوں کی زندگی کے لئے خصوصاً ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سنگِ میل پر کھڑے ہوکر اصحابِ نظر نے مسلمانوں کی گزری ہوئی زندگی کی جو تصویر دیکھی ہے اس میں ہر طرح کی ابتری اور بدحالی کے آثار نظر آتے ہیں۔ اجتماعی حیثیت سے سیاست، تمدن اور معیشت کے جسموں پر گہرے زخم ہیں اور انفرادی حیثیت سے مایوسی، انتشار، پراگندگی اور اس کے لوازم فکر اور عمل کا فقدان۔ مسلمان نے اپنی صدیوں کی جدوجہد اور ذہنی، جسمانی، روحانی اور اخلاقی قوتوں سے جو کچھ حاصل کیا تھا وہ سیاست کے شاطروں نے اُن سے چھین لیا۔ سیاست ہاتھ سے گئی تو اس کا فوری اثر معاشی زندگی پر پڑا اور معاشی زندگی کی ضربوں نے ذہنی اور اخلاقی قوتوں کو مجروح کیا اور ایک وقت ایسا آیا جب مسلمان کے پاس ماضی کے تزک و احتشام کی نمائش کے جذبے کے سوا کچھ باقی نہ رہا۔ نام کی حکومت، نام کا تمدن، نام کی معیشت اور محض تسکین خاطر کے لئے روحانی اور اخلاقی قوتوں سے ایک جذباتی تعلق، یہ سب کچھ تھا، لیکن جو کچھ اب مسلمانوں کے پاس نہیں رہا تھا اسے دوبارہ حاصل کر لینے کی خواہش ایک خاص گروہ میں اب بھی موجود تھی۔ اب بھی ایک گروہ ایسا تھا جو اپنے صدیوں کے حاصل کئے ہوئے سرمایہ کے چھن جانے کے خیال سے بے چین تھا اور اُس کے دل میں اس "ذات" کے خلاف حد درجہ کی تلخی تھی جو اس صورت حال کی ذمہ دار تھی۔ اکثر دلوں میں یہ خیال اُبھرتا لیکن گردو پیش کے حالات اُسے دبا دیتے۔ لیکن کچھ لوگ ایسے تھے جنھیں یہ بھروسہ تھا کہ وہ اپنی گرمیٔ ایمان سے تخریبی قوتوں کو جلا کر خاک کر دیں گے۔ یہ گرمیٔ ایمان اپنا کام کرتی رہی۔ چنگاری شعلہ بنی اور ایک دن ایسا آیا کہ اس شعلہ کی لپک نے ملک کے مختلف حصوں میں بغاوت کی آگ سُلگا دی یہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ تھا۔ ہنگامہ ہوا لیکن شعلہ کی طرح بھڑک کر خاموش ہو گیا۔ دلی جو پہلے سے تباہ تھی اور بھی تباہ ہوئی۔ جس تخت و تاج پر مسلمانوں کا برائے نام قبضہ تھا وہ ہمیشہ کے لئے ہاتھ سے گیا۔ مسلمانوں میں جنھیں ذرا عزت حاصل تھی انھیں چُن چُن کر مارا گیا۔ زمینیں چھنیں، جائدادوں پر قبضہ ہوا بے گناہوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی اور مسلمانوں کی جو رہی سہی عزت، آبرو، آن بان، شان و شوکت تھی وہ ختم ہو گئی۔ مرنے والے جینے والوں کے لئے عبرت کا سامان بنے اور جو جینے رہے وہ جیتے جی مُردہ ہو گئے، بے آس، بے کس، مایوس، غمزدہ اور ماضی کی یادوں کا ایک عبرت خیز مرقع، انگریز اب تک جو کچھ سیاست کے پردے میں چھپ کر کرتے رہے تھے وہ اعلانیہ کرنے لگے۔ مسلمان باغی تھے، حکومت کو ان پر بھروسہ نہیں تھا، وہ انھیں اپنا دشمن سمجھتی تھی اور ان کے ساتھ کسی قسم کی مراعات کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ اس کی پالیسی صرف یہ تھی کہ ان کی اجتماعی قوت کو ختم کرنے کے بعد انفرادی طور پر بھی ان کے ذہنوں کو مفلوج اور جسموں کو ناکارہ بنا دے۔ وہ تعلیم سے محروم رہیں، انھیں ملازمتیں نہ دی جائیں، ان کی آزادی کی راہوں میں روڑے اٹکائے جائیں، ان میں اخلاقی پستیوں کی پرورش ہو اور وہ زندگی کی دوڑ میں اپنے سارے حریفوں سے پیچھے، بہت پیچھے رہ جائیں۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے ہر ممکن ترکیب کی گئی۔ مسلمانوں کے تعلیمی اداروں کی مالی امداد روک دی گئی۔ ان کے لئے نئی تعلیم کے دروازے سختی سے بند کر دیئے گئے۔ معاشی زندگی کی جدوجہد میں ان کے لئے ہر طرح کی دشواریاں پیدا کی گئیں، ان پر مقدمے چلائے گئے، ان کے عالموں کو قید و بند کی سزائیں دی گئیں، قوم کی اخلاقی اور ذہنی تربیت کی کوشش حکومت کی بغاوت کے مترادف ٹھہرائی گئی اور بغاوت کی سزا قانون کے نزدیک موت ہے یا زندگی بھر کی جلاوطنی ——— عالم اور مذہبی پیشوا جلاوطن ہوئے اور موت کے گھاٹ اُتار دیئے گئے۔

یہ سب ہوتا رہا اور حکومت کو اپنے مقصد میں کامیابی ہوتی رہی۔ مسلمان برابر ذہنی اور معاشی زندگی میں پیچھے ہٹتے رہے، ان کی مایوسی بڑھتی رہی، وہ ذہنی اور جسمانی طور پر مفلوج اور ناکارہ ہوتے رہے۔ لیکن ایک گروہ اب بھی ایسا تھا جو ظلم و تشدد سے ٹکر لے رہا تھا، صبر و رضا کی قوت کے بھروسے

پر مجاہدانہ شان سے اپنے کام میں مصروف تھا، بغاوت کے مقدمے، دار و رسن کی سختیاں، جلاوطنی، پھانسی، یہ سب کچھ جاری رہا۔ لیکن ایک کی جگہ دوسرا لیتا رہا۔ اب بھی مسلمانوں کی اصلاح و بیداری کا کام جاری رہا۔ غدر سے پہلے سید احمد شہید کی جو تحریک مسلمانوں کی اصلاح کے لئے شروع ہوئی تھی، غدر کے بعد ان کے پیرووں نے اسے اسی جوش اور شد و مد سے جاری رکھا اور حکومت نے اپنی ہر کوشش کے باوجود اس جذبے کو مغلوب نہ کر سکی۔ زبانیں بند کی گئیں، اسیری کی صعوبتیں دی گئیں، لیکن ذہن آزاد رہا اور اس ذہنی آزادی نے بالآخر حکومت کو شکست دی۔ حکومت نے ۱۸۷۰ء میں پہلی مرتبہ یہ محسوس کیا کہ مسلمانوں کو دبانا ممکن نہیں۔ ان کی وفاداری انھیں دشمن سمجھ کر حاصل نہیں کی جا سکتی۔ ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا پڑے گا۔ مسلمانوں کی گرمیٔ ایمان نے دشمن کو اس طرح مغلوب کیا اور حکومت کو بالآخر ۱۸۷۱ء میں مسلمانوں کے متعلق اپنی پالیسی بدلنی پڑی اور ان کی تعلیم کے سلسلے میں صوبوں میں ہدایات بھیجیں کہ سرکاری مدرسوں میں مسلمانوں کی قدیم زبانوں اور دیسی زبان کو رائج کیا جائے۔ مسلمان استادوں کا تقرر ہو۔ جن مدرسوں میں مسلمان جدید طرز کے مطابق تعلیم دینا چاہتے ہیں اُن کی مالی مدد کی جائے اور یونیورسٹیوں میں بھی عربی اور فارسی کی تعلیم شروع کی جائے۔ اس طرح صوبوں میں مسلمانوں کی تعلیم کے مختلف پہلوؤں کی طرف توجہ شروع ہو گئی۔ حکومت کی طرف سے مسلمانوں کی تمدنی اور معاشی ترقی کی طرف یہ پہلا قدم تھا۔

اس کے بعد برابر حکومت کی طرف سے اس معاملہ میں سرگرمی اور عمل کا اظہار ہوتا رہا۔ وائسرائے نے صوبوں سے رپورٹیں طلب کرنے کے بعد ۱۳ر جون ۱۸۷۲ء کو ایک طویل ریزولیشن جاری کیا اور اس کے مطابق یہ فیصلہ ہوا کہ جہاں کہیں مسلمان خوش حال نہیں ہیں حکومت ان کی امداد کرے اور ان کی تعلیمی کمی کو پورا کرنے کا ذمہ لے۔ اس کے بعد سے ملک کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کو تعلیم کی ہر منزل میں رعایتیں دی جانے لگیں۔ ۱۸۸۲ء میں ہنٹر کمیشن بٹھا دیا گیا تاکہ وہ مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کا جائزہ لے۔ اس کمیشن نے تحقیقات کی تو پتہ چلا کہ مسلمان اب بھی تعلیم میں بہت پیچھے ہیں چنانچہ ۱۵ر جولائی ۱۸۸۵ء کو حکومت نے ایک ریزولیشن پھر جاری کیا اور اس میں ایسی تدابیر اختیار کرنے کا فیصلہ کیا کہ مسلمان تعلیم کی طرف تیزی سے قدم بڑھائیں۔ ۱۸۷۱ء سے ۱۸۸۵ء تک حکومت کی طرف سے مسلمانوں کی تعلیم کے سلسلے میں جو کچھ ہوا اُس سے مسلمانوں کو اپنی تعلیمی حالت بہتر بنانے میں خاصی مدد ملی۔

لیکن مسلمانوں کے ساتھ غدر سے پہلے اور غدر کے بعد انگریزوں کا جو برتاؤ رہا اُس کے بعد مسلمانوں کے لئے یہ سمجھنا دشوار تھا کہ حکومت جو کچھ کر رہی ہے اس کا مقصد مسلمانوں کی بہبودی ہے۔ وہ حکومت کی ہر چیز کو شبہہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ان کے دلوں میں اب شاید آگے بڑھنے کا ولولہ اور اُمنگ باقی نہیں رہی تھی۔ بہت کچھ کھو کر جو تھوڑا بہت اُن کے پاس رہ گیا تھا اُسے وہ اپنے سینوں سے لگا کر رکھنا چاہتے تھے، لے دے کر انھیں مذہب اور مذہبی عقیدوں کا سہارا تھا اور اُن کا خیال تھا کہ انگریزی تعلیم کے جال میں پھانس کر ان کی یہ دولت بھی اُن سے چھیننا چاہتے ہیں۔ یہ خیال عام مسلمانوں کے دلوں میں بھی تھا اور بعض مذہبی جماعتیں بھی یہی سمجھتی تھیں اس لئے مسلمانوں کو تعلیم کی طرف مائل کرنے کا کام بے حد دشوار تھا۔ اس دشواری کا احساس مسلمانوں کے اس طبقے نے کیا جسے ہم آج اپنی بیداری کے دورِ جدید کا علم بردار کہہ سکتے ہیں۔ اس گروہ کے لوگوں نے مسلمانوں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لے کر جو نتیجے نکالے ان کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) مسلمانوں پر غدر اور غدر کے بعد کے واقعات نے مایوسی، مغلوبیت اور بے بسی کی سی کیفیت طاری کر دی ہے، ان کے فکر اور عمل کی قوتیں مفلوج ہو گئی ہیں۔

(۲) ان کی معاشی زندگی میں حد درجہ کی ابتری اور بدحالی پیدا ہو گئی ہے۔ وہ مفلوک الحال ہیں اور اس حالت میں بے بسی کی زندگی گزار رہے ہیں۔

(۳) سوسائٹی میں اب ان کی کوئی عزت باقی نہیں رہی اور اس حالت میں ان میں کمتری کا زہریلا احساس پیدا کر دیا ہے۔

قوم کے حکیموں نے ایک طرف تو مرض کی تشخیص کی اور دوسری طرف ان امراض کے علاج کے مختلف نسخوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ان کے نزدیک قوم کے ان امراض کو ذیل کے طریقوں سے دُور کیا جا سکتا تھا۔

(۱) ایسی تعلیم دے کہ جس سے سرکاری ملازمتیں ملنے میں آسانیاں ہوں۔

(۲) ایسی ذہنیت پیدا کرے جو معاشرت کے صحیح مفہوم کو سمجھے اور مسلمان سماجی زندگی میں عزت حاصل کر سکیں۔
(۳) مسلمانوں کو اچھے اخلاق کی طرف مائل کرے۔

چنانچہ بیداری کے اس احساس کے ساتھ اور بڑی حد تک حکومت کی پالیسی کے سہارے پر ہندوستان کے مختلف حصوں میں مثلاً لکھنؤ
ن پور، علی گڈھ، کان پور، دہلی، لاہور، کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں بہت سی مذہبی اور تعلیمی انجمنیں قائم ہوئیں اور انھوں نے مسلمانوں کے مذہب
ر تمدن کی حفاظت کا بیڑا اٹھا کر ان کے دلوں میں نئے سرے سے زندگی کا احساس پیدا کرنا شروع کیا اور راکھ کے نیچے دبی ہوئی چنگاری کو ہوا
ے کر پھر روشن کرنے کی کوشش کی۔ ان انجمنوں کے قیام میں ہر جگہ عموماً علما کا ہاتھ تھا اور اس لئے لوگوں نے ان انجمنوں کے قیام کو ایک نئی زندگی
پیام سمجھ کر آہستہ آہستہ اُن کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ لیکن یہ رفتار بے حد دھیمی تھی اور ضرورت تھی ذہنیتوں میں انقلاب پیدا کرنے کی۔ انقلاب
اس ضرورت کا احساس ہمارے ادبی، تمدنی اور تعلیمی رہنماؤں میں سے تین نے شدت سے کیا اور انقلاب کی یہ ابتدائی رَو اور بیداری کی
ی چنگاری ہمیں انہی تین رہنماؤں کے گرد بڑھتی اور چمکتی نظر آتی ہے۔ ان رہنماؤں میں پہلا نام سرسید احمد خاں کا ہے۔ بیداری کے احساس کی
لی کرن سرسید کے سینے میں جگمگائی، اور مسلمانوں میں وہی پہلے شخص ہیں جنھوں نے پوری جُرات اور ہمت کے ساتھ زبردست کے سامنے مظلوم
ور محکوم کی آواز پہنچانے کی کوشش کی ہے۔

۱۸۵۹ء میں سرسید نے "اسباب بغاوت ہند" کے نام سے ایک رسالہ لکھا اور اس میں پوری آزادی، بے باکی اور جُرات سے انگریزوں
ی پالیسی پر نکتہ چینی کر کے یہ بتایا ہے کہ غدر کے بعد مسلمانوں پر حکومت کے جو مظالم ہو رہے ہیں وہ سراسر ناانصافی اور کوتاہ اندیشی پر مبنی ہیں۔
س رسالہ میں حکومت کو یہ بتایا گیا ہے کہ اس نے مسلمانوں کے متعلق غلط فیصلے کر کے ایک ایسی پالیسی پر چلنا شروع کیا جو اس کے لئے سرتاسر مضر ہے
ہ رسالہ ایک ایسے زمانہ میں لکھا گیا جب لوگوں کے حوصلے پست اور زبانیں بند تھیں۔ حکومت کے خلاف زبان کھولنا بغاوت اور موت کے مرادف
ھا۔ لیکن سرسید نے ان ساری باتوں سے بے نیاز ہو کر مسلمانوں کی زندگی میں سیاسی ادراک و احساس کا ایک نیا باب کھولا۔ اس کے بعد سرسید نے
مسلمانوں کی تمدنی زندگی کے استحکام اور ان کی معاشی زندگی کی بہتری کے لئے جتنے قدم اٹھائے اُس سے اُن کی ذہنی بیداری کا پتہ چلتا ہے ۱۸۵۹ء
یں مُراد آباد میں مدرسہ فارسی کا قیام، ۱۸۶۴ء میں غازی پور میں سکول کی ابتدا، ۱۸۶۴ء میں سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد اور ۱۸۶۹ء میں
نگلستان کے تعلیمی اداروں کا جائزہ لینے کے لئے انگلستان کا سفر ایسے اقدام ہیں جن کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ سرسید مسلمانوں کی زندگی کے
ہر شعبے میں ایک نئی روح پھونکنے کے خواہش مند تھے۔ انگلستان سے واپسی پر ۱۸۷۰ء میں سرسید نے اپنا مشہور اخبار تہذیب الاخلاق
جاری کیا اور اس کے ذریعہ مسلمانوں کی ذہنی زندگی کی تربیت و تشکیل شروع کی۔ تہذیب الاخلاق کے مضامین انہیں خاص مقاصد کے پیش نظر لکھے
جاتے تھے جن کا ذکر ابھی ان امراض کے سلسلہ میں کیا گیا جن میں اس وقت مسلمان قوم مبتلا تھی۔ سرسید چاہتے تھے کہ مسلمان مغربی تعلیم کی طرف مائل ہوں
وہ یہ سمجھنا چھوڑ دیں کہ مغربی تعلیم مذہبی اور روحانی قدروں کی دشمن ہے۔ انھیں یہ محسوس ہونے لگے کہ مغربی تعلیم اُن کی معاشی زندگی کی بہتری اور برتری
کا ذریعہ ہے۔ انہیں یہ اندازہ ہو جائے کہ مغربی معاشرت کے اچھے پہلو اختیار کرنے میں کوئی نقصان نہیں، بلکہ یہ چیز سوسائٹی میں عزت و برتری حاصل
کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ تہذیب الاخلاق نے یہ ساری خدمات بحُسنِ وجوہ انجام دیں اور اُردو کے طرز بیان میں کچھ قابل قدر چیزوں کا اضافہ کرنے
کے علاوہ اُردو کی صحافت کو ایک بے لاگ اور سچی تنقید اور منطقی انداز فکر سے آشنا کیا، ان کا دُوسرا زبردست کارنامہ مدرسۃ العلوم علی گڈھ کا قیام
ہے۔ یہ مدرسہ ۱۸۷۵ء میں قائم ہوا اور قائم ہونے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد مسلمانوں کی ذہنی زندگی کی تعمیر شروع کر دی اور پھر رفتہ رفتہ ساری
مسلمان قوم کی سیاسی، تمدنی اور ادبی زندگی کا مرجع اور مرکز بن گیا۔

جو کام سرسید نے ایک وسیع پیمانے پر سیاست، تعلیم، تمدن، مذہب، صحافت اور کسی حد تک ادب کے میدانوں میں کیا وہی کام نذیر احمد

اور حالی نے نظم و نثر کی وساطت سے کیا۔ نذیر احمد کے ناول اور حالی کا مسدس ایسی اہم قومی کام کی کڑیاں اور قومی بیداری اور احیا کی جدّ و جہد کا جزوِ عظیم ہیں۔ نذیر احمد کا پہلا ناول مراۃ العروس ۱۸۶۹ء میں شائع ہوا' دوسرا یعنی بنات النعش ۱۸۷۲ء میں اور تیسرا توبۃ النصوح ۱۸۷۷ء میں، یہ تینوں ناول اصلاحی ہیں اور وقت کے تقاضے اور پکار کی صدائے بازگشت' پہلے ناول میں نذیر احمد نے جہیزوں سے بحث کی ہے اور مسلمانوں کو ایک دلچسپ پیرایہ میں یہ بتایا ہے کہ قومی زندگی میں تعلیم کی کیا اہمیت ہے۔ غریبی کے باوجود حسنِ معاشرت کا قائم رہنا انسانی اخلاق اور سیرت کا جوہر ہے اور محض نام و نمود کی خاطر اپنی زندگی کو مالی دشواریوں میں مبتلا کر لینے کا نام دانش مندی نہیں۔ یہ ساری باتیں مسلمانوں سے اُس وقت کہی گئی ہیں جب تعلیم کے زیور سے آراستہ ہوئے بغیر ان کے لئے زندگی کی خودداری اور وقار کا قائم رکھنا ناممکن ہو گیا تھا۔ جب گرد و پیش کے حالات کی لائی ہوئی غریبی کے ہاتھوں تمدن اور معاشرت کے جواہرات کے خاک میں مل جانے کا اندیشہ پیدا ہو چلا تھا اور جب مسلمان حقیقی جاہ و حشم کھو کر ایک عارضی ملمع کرنے کی فکر میں اور زیادہ دشواریوں میں اُلجھتے نظر آ رہے تھے۔ نذیر احمد کا دُوسرا ناول بنات النعش بھی مراۃ العروس کی ایک منطقی کڑی ہے۔ لیکن یہاں نذیر احمد نے باقی ہر چیز سے زیادہ تعلیم کی اہمیت اور ضرورت کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور تعلیم کے ذکر میں اس کے مختلف شعبوں یعنی تاریخ، جغرافیہ، ہیئت اور حفظانِ صحت وغیرہ کی اہمیت جتا کر لوگوں کو غیر شعوری طور پر تعلیم کے لئے رجحانات کی طرف مائل کیا ہے۔ توبۃ النصوح میں غدر کے بعد کے مسلمانوں کی اخلاقی اور ذہنی کیفیت کی ترجمانی بھی ہے اور وقت کی ضرورت کے مطابق زندگی کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنے کا پیام بھی۔ نذیر احمد کے دو اور ناول بھی اور اصلاحِ اخلاق و معاشرت کی اس مہم کا جزو ہیں۔ رویائے صادقہ اور ابن الوقت، پہلا سرسید کی تحریک کے ایک حصہ کا عکس اور اس کی حمایت ہے اور دُوسرا اُن کی تحریک کے ایک دوسرے حصہ کا ردِّ عمل پہلے ناول کا بنیادی خیال یہ ہے کہ سچا اسلام عقل کے مُطابق ہے۔ یہ سرسید کی مہم کی حمایت ہے۔ دُوسرے ناول میں ہندوستانی اور اسلامی معاشرت ترک کر کے انگریزی وضع اختیار کر لینے والے ایک شخص کی زندگی پر طنز و تشنیع ہے۔ یہ سرسید کی مہم کے ایک پہلو کا ردِّ عمل ہے۔

بیداری کے احساس کا جو عکس ہمیں نذیر احمد کے ناولوں میں نظر آتا ہے' ہر چند کہ وہ وقت کے ایک اہم رُجحان کا حامل ہے لیکن اس میں پیام کا وہ سوز و گداز نہیں جو حالی کے مسدس میں ہے۔ حالی کا مسدس ۱۸۷۹ء میں شائع ہوا۔ حالی نے ایک سچے طبیب کی طرح پہلے مسلمانوں کی مریض قوم کے مرض کی تشخیص کی اور بغیر کسی پس و پیش کے، یا کسی کی خوشنودی کی پروا کئے بغیر مریض کو ایک ایک کر کے اُس کے سارے مرض گنوا دیئے سب سے پہلے قوم کے متعلق مختصر لفظوں میں یہ کہا کہ ؎

گھٹا سر پہ ادبار کی چھا رہی ہے — فلاکت سماں اپنا دکھلا رہی ہے
نحوست پس و پیش منڈلا رہی ہے — چپ و راست سے یہ صدا آ رہی ہے

کہ کل کون تھے آج کیا ہو گئے تم
ابھی جاگتے تھے ابھی سو گئے تم

اس کے بعد مُسلمانوں کے ماضی کا جائزہ لیا اور انھیں بتایا کہ ماضی میں انھوں نے جو عظمت و شکوہ حاصل کیا تھا اُس کے کیا کیا وجوہ تھے؟ ان میں کیا خوبیاں تھیں جن کی قوت کے آگے دنیا کی ساری قوموں نے اپنا سر جھکایا اور اسلام اور اسلامیوں کی عظمت کا ڈنکہ کئی صدیوں تک دنیا میں بجتا رہا۔ لیکن جب مسلمانوں نے دین کا چلن چھوڑ دیا اور اُن کی زندگی ارکانِ اسلام سے خالی ہو گئی تو ؎

وہ ملت کہ گردوں پہ جس کا قدم تھا — ہر اک کھونٹ میں جس کا برپا علم تھا
وہ فرقہ جو آفاق میں محترم تھا — وہ امت لقب جس کا خیر الامم تھا

نشاں اس کا باقی ہے صرف اس قدر یاں
کہ گنتے ہیں اپنے کو ہم بھی مُسلماں

دگرنہ ہماری رگوں میں، لہو میں   ہمارے ارادوں میں اور جستجو میں
دلوں میں زبانوں میں اور گفتگو میں   طبیعت میں، فطرت میں عادت میں خو میں
نہیں کوئی ذرّہ نجابت کا باقی
اگر ہو کسی میں تو ہے اتفاقی

حالی نے اس بند میں اور اس کے بعد کے چند بندوں میں مسلمانوں کی اخلاقی حالت کی تصویر جن لفظوں میں اور جس انداز میں کھینچی ہے اس سے اصلاح کا مقصد پورا ہونے کے بجائے شاید پڑھنے والے میں ضد اور جھنجھلاہٹ زیادہ پیدا ہوتی ہے اور احتساب نفس اور اصلاح کی خواہش کم، لیکن اس سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ ۱۸۷۵ء میں یا اس سے کچھ پہلے ہمارے معلّم قوم کی حالت کی طرف سے کتنے مایوس تھے۔ چنانچہ اگلے دو تین بند مسلمانوں کے اخلاق کیلئے عبرت کا تازیانہ ہونے کے علاوہ تقدیر کے ایسے رُخ کی مصوّری بھی کرتے ہیں جس کے ہر نقش میں تخریب ہستی اور بربادی کے رنگوں کا امتزاج ہے ؎

ہماری ہر اک بات میں سفلہ پن ہے   کمینوں سے بدتر ہمارا چلن ہے
لگا نام آبا کو ہم سے گہن ہے   ہمارا قدم ننگِ اہلِ وطن ہے
بزرگوں کی توقیر کھوئی ہے ہم نے
عرب کی شرافت ڈبوئی ہے ہم نے

نہ قوموں میں عزت، نہ جلسوں میں وقعت   نہ اپنوں سے اُلفت، نہ غیروں سے ملّت
مزاجوں میں سستی، دماغوں میں نخوت   خیالوں میں پستی، کمالوں سے نفرت
عداوت نہاں، دوستی آشکارا
غرض کی تواضع، غرض کی مدارا

نہ اہلِ حکومت کے ہمراز ہیں ہم   نہ درباریوں میں سرافراز ہیں ہم
نہ علموں میں شایانِ اعزاز ہیں ہم   نہ صنعت میں، حرفت میں، ممتاز ہیں ہم
نہ رکھتے ہیں کچھ منزلت نوکری میں
نہ حصّہ ہمارا ہے سوداگری میں

تنزّل نے کی ہے بُری گت ہماری   بہت دُور پہنچی ہے نکبت ہماری
گئی گذری دنیا سے عزت ہماری   نہیں کچھ اُبھرنے کی صورت ہماری
پڑے ہیں اک اُمید کے ہم سہارے
توقع پہ جنت کی جیتے ہیں سارے

اس پوری تصویر میں حد درجہ کی جھنجھلاہٹ اور غصّہ ہے۔ لیکن غصّہ کا یہ جذبہ اس احساس کا نتیجہ ہے جو مسلمانوں کی سیاسی، معاشی اور اخلاقی ابتری و بدحالی نے حساس دلوں میں پیدا کیا تھا۔ مسدّس کا تکنیک ہی یہ ہے کہ جن کی اصلاح کرنی مقصود ہے پہلے انھیں گن گن کر ان کے مہلک عوارض بتائے جائیں، پھر ان عوارض کی تفصیلی وجہ بتائی جائے۔ ان کے سامنے ماضی کے مہتم بالشان کارنامے ہیں اور ان کے آئینے میں وہ اپنے مستقبل کی تعمیر کا پروگرام بنا سکیں۔ اس کام میں شاعر نے ایک مورّخ کی طرح واقعات کے مرقعے پیش کئے ہیں۔ مصلح کی طرح ان واقعات کو مستقبل کی رہنمائی کا وسیلہ بنایا ہے۔ کبھی شفقت سے، کبھی نفرت سے، کبھی مہر سے، کبھی قہر سے، کبھی دوست کی طرح دلوں میں اُتر کر، اور کبھی دشمن کی طرح نشتر زنی کرکے ماضی، حال اور مستقبل کو

ایک رشتے میں جوڑتا ہے اور اس قوم کو جو کبھی دنیا کی رہبر تھی اور جو اب ایسے اخلاقی عوارض میں مبتلا ہے کہ اس کا مستقبل بالکل تاریک نظر آرہا ہے عمل کی طرف مائل کیا ہے۔ جہاں ایک طرف وہ خود قوم سے اس بات کا طالب ہے کہ وہ اپنے مرض کا مداوا تلاش کرے وہ خدائے بزرگ و برتر سے بھی دعا کرتا ہے کہ ؎

انھیں کل کی فکر آج کرنی سکھا دے　　ذرا ان کی آنکھوں سے پردہ اٹھا دے
کمیں گاہِ بازیٔ دوراں دکھا دے　　جو ہونا ہے کل آج ان کو سجھا دے

مچیتیں پاٹ لیں تاکہ باراں سے پہلے
سفینہ بنا رکھیں طوفاں سے پہلے

سرسید کی تحریک، نذیر احمد کے ناول اور حالی کا مسدس مسلمانوں کی سیاسی، معاشی، تمدنی، ذہنی اور اخلاقی زندگی کے احیا کی تاریخ کی پہلی منزل کے نشان ہیں۔ لیکن ایسے نشان جو زندگی کی جدوجہد اور اُن کے دشوار گذار سفر میں مسافر کی رہبری بھی کرتے ہیں اور اُسے ماضی، حال اور مستقبل کے درمیان صحیح رابطہ پیدا کرنے میں بھی مدد دیتے ہیں۔ اس منزل کے بعد مسلمانوں کی سیاست، ان کا تمدن، ان کا ادب اور ان کا اخلاق سب چیزیں ایک خاص مقصد اور مطمح نظر کے ماتحت آگے کی طرف بڑھتی نظر آتی ہیں۔ سرسید کے دکھلائے ہوئے راستوں پر چل کر اور حالی کے پیدا کئے ہوئے سوز سے گرمیٔ رفتار لے کر مسلمانوں کی زندگی نئے سرے سے اپنے مستقبل کی تعمیر کی مہم پر روانہ ہوتی ہے اور اس مہم کے اثرات ہمیں ان سیاسی، تمدنی اور ذہنی تحریکوں میں نظر آتے ہیں جن سے انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں مسلمانوں نے اپنی تاریخ کا چراغ روشن کیا ہے۔ سرسید نے لوگوں کے دلوں سے یہ خیال نکالا کہ مغرب کی ہر چیز قابل نفرت و حقارت ہے۔ ان کی تحریک کی کامیابی نے لوگوں کو مغربی علوم کی طرف مائل کیا اور ہر اچھی چیز سے استفادہ کرنے والوں نے اپنے ادب کو مغرب کے طرز فکر و تخیل سے جلا دینی شروع کی۔ سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی نے (۱۸۶۲ء) انگریزی علوم کے بعض اچھے نمونے اُردو میں منتقل کئے۔ حالی اور آزاد نے گل و بلبل کی شاعری کے خلاف آواز اٹھائی اور شاعری نے پہلی دفعہ غزل کے حسن و عشق اور قصیدوں کی مدح و ستائش کی جگہ زندگی کے حقائق نے اپنی جھلک دکھائی۔ تنقید نے پہلی مرتبہ حسن، مدح و ذم کے محدود دائرے سے نکل کر شعر و ادب کو تجزیہ کی نظر سے دیکھنا شروع کیا۔ سوانح عمریوں میں جذبات کی رنگینی اور افراط تفریط کی جگہ حق و صداقت نے تاریخ میں تحقیق اور جستجو کی کاوش پیدا ہوئی۔ قصہ گوئی پہلی مرتبہ محض تفریح و تفنن طبع کا ذریعہ بننے کے بجائے قومی زندگی کی مصور، ترجمان اور مصلح بن کر سامنے آئی۔ انگریزی کتابوں کے ترجمے ہوئے۔ انگریزی ادب کے اچھے اچھے نمونوں کا مطالعہ کیا گیا اور اُردو دانوں نے اُن سے انداز فکر کو سنوارا، جلا دی، پرانی چیزیں چھوڑیں، نئی اختیار کیں اور نئے پرانے کے امتزاج سے ادب اور شعر میں زندگی کی دھڑکنیں پیدا کیں۔ یہی سب کچھ ہے جس کی بدولت حالی، آزاد اور شبلی کی تخلیقیں ہمارے ادبی خزانے کا بے بہا گوہر ہیں۔ ان کی چمک دمک ابدی ہے، لازوال ہے اور اسی تابانی سے آنے والوں نے زندگی کے سراغ پائے ہیں۔

انیسویں صدی کے بالکل آخر میں ملک کے گوشہ گوشہ میں علمی اور تمدنی بیداری کی جو لہریں اُٹھی تھیں۔ ان کے آثار ہمیں اب بھی جا بجا نظر آتے ہیں۔ بیداری کے اس احساس نے ملک کے مختلف حصوں میں تعلیمی ادارے قائم کئے اور یہ ادارے آگے چل کر مسلمانوں کی اخلاقی، علمی اور تمدنی زندگی کے گہوارہ اور مرکز بنے۔ ان مرکزوں میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس (۱۸۸۶ء) دار العلوم دیوبند (۱۸۶۶ء) ندوۃ العلوم (۱۸۹۴ء) دار المصنفین (۱۹۱۲ء) انجمن حمایت اسلام خاص طور پر اہم اور قابل ذکر ہیں۔

سرسید کی تحریک میں قومی بیداری اور مسلمانوں کے نشاۃ الثانیہ کی جو ابتدائی منزل طے ہوئی اُس کا سب سے اہم پہلو تو وہی کام ہے جو سرسید نے خود کیا اور اس کا مقصد قوم کو سیاست، تمدن، ادب، صحافت اور مذہب کے میدانوں میں ایک نئی شاہراہ پر ڈال دیا۔ لیکن سرسید کی تحریک کے ردّ عمل نے ملک کے مختلف حصوں میں سیاست، مذہب اور ادب کی جو سرگرمی پیدا کی اس میں خواہ انفرادی طور پر رجعت پسندی کی علامتیں

موجود ہوں۔ لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ردِّ عمل نے ٹھہرے ہوئے پانی میں ایک ہلچل پیدا کر دی اور لوگ مسلمانوں کے سیاسی اور مذہبی مستقبل کے متعلق اپنی اپنی بساط اور اپنی اپنی ہمت کے مطابق کچھ نہ کچھ سوچنے کے عادی ہو گئے۔ ایسی سرگرمی سے وقتی طور پر کوئی مفید نتائج برآمد نہ بھی ہوں تو آئندہ کی زندگی کے لئے ذہن کی تربیت ہو جاتی ہے۔ وہ معاملات پر سوچنے اور اُن سے نتیجے نکالنے کا عادی ہو جاتا ہے اور یہ عادت اگر افراد سے بڑھ کر جماعتوں میں اور جماعتوں سے بڑھ کر پوری قوم کی زندگی کا جزو بن جائے تو اُسے اجتماعی زندگی کے لئے ایک بے حد نیک فال سمجھنا چاہیئے۔

سرسید کی تحریک کا ایک دُوسرا بے حد اہم پہلو یہ بھی ہے کہ ان کا انقلابی انداز فکر مسلمانوں کو اتنا عجیب و غریب معلوم ہوا کہ ملک کے ہر گوشے سے اس کی مخالفت میں آوازیں اُٹھائی گئیں اور ان آوازوں کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کے لئے انجمنیں قائم ہوئیں، اخبار جاری کئے گئے، رسالے نکالے گئے، کتابیں لکھی گئیں، تقریریں ہوئیں، مباحثے اور مناظرے ہوئے اور شعر کہے گئے۔ یہ سب کچھ بھی بیداری کے تلاطم کی پیدا کی ہوئی لہریں ہیں، ادبی اور صحافتی زندگی پر سرسید کی تحریک نے براہ راست جو اثر ڈالا اس کے علاوہ غدر کے بعد کی انقلابی تبدیلیوں نے الگ بھی بہت سے افراد اور گروہوں کو متاثر کیا اور اس زمانے میں بعض ایسے رسالے نکلے اور ایسی کتابیں شایع ہوئیں جن کا نام اُردو صحافت اور ادب کی تاریخ میں ہمیشہ باقی رہے گا۔ اخباروں اور رسالوں میں سب سے مشہور "اودھ پنچ" اور کتابوں میں شرر اور سرشار کے ناول ہیں۔ شرر کے ناول مسلمانوں کی تاریخ کے بعض ایسے واقعات کی تصویریں ہمارے سامنے لائے ہیں جن سے مغلوبیت اور شکست خوردگی کا احساس دور ہوتا ہے سرشار کے ناول اور اودھ پنچ کے مضامین غدر کے بعد کی پیدا کی ہوئی اخلاقی پستیوں کی مصوری بھی کرتے ہیں۔ اور انھیں طنز و ملامت کا نشانہ بھی بناتے ہیں۔ اس طنز و تشنیع میں ہر جگہ اصلاح کا جذبہ طاری ہے۔ مختصر طور پر یہ ہے کہ انیسویں صدی کے آخر تک کی مسلمانوں کی ذہنی بیداری کا عکس جو سیاست میں، تمدنی تحریکوں میں، ادبی تخلیقوں میں ہر جگہ جلوہ گر ہے، اس عکس کو زمانہ کے ساتھ برابر جِلا تی رہی اور بغیر کسی رکاوٹ کے قومی زندگی کی ضروریات نے ادب اور صحافت کے ردِّ عمل میں بھی تبدیلیاں کیں۔ لیکن اس سفر کی پہلی منزل سرسید کے انتقال پر ختم ہو جاتی ہے۔

بیسویں صدی کے ابتدائی ۱۳، ۱۴ سال اس سفر کی دوسری منزل ہیں۔ جنگِ عظیم کے شروع ہونے تک مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبہ میں کچھ ایسی تحریکیں پیدا ہوئیں اور کچھ ایسے ادارے قائم ہوئے جنھوں نے قومی زندگی کی تشکیل و تعمیر میں بڑا حصہ لیا۔ سرسید کے انتقال کے بعد دارالعلوم کے معاملات میں وہ ہمواری باقی نہ رہی جو مخالفتوں کے باوجود سرسید کی زبردست شخصیت کی وجہ سے قائم تھی۔ ان کے انتقال کے بعد ہی دو مختلف گروہ یہ سوچنے لگے کہ اب علی گڑھ کی پالیسی کیا ہو گی۔ دونوں میں کچھ عرصہ خاصی کشاکش رہی اور آخر معاملات سلجھ کر ایسے ہو گئے کہ محسن الملک سکریٹری ہوئے اور کام پھر پہلے کی طرح چلنے لگا۔ پھر علی گڑھ سیاست، مذہب، زبان اور ادب میں قوم کی رہنمائی کا مرکز بن گیا۔ ۱۹۰۰ء میں اُردو ہندی کا جھگڑا اُٹھا اور اُس نے خاصی تلخی کی صورت اختیار کر لی۔ بالآخر جنوری ۱۹۰۳ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا شعبہ "ترقی اُردو" قائم ہوا اور شبلی اس کے سکریٹری ہوئے ۱۹۰۵ء میں حبیب الرحمن خاں سکریٹری ہوئے اور ۱۹۱۲ء میں مولوی عبدالحق۔ ان کی رہنمائی میں ترقی اُردو کا شعبہ جس کا نام آگے چل کر "انجمن ترقی اُردو" ہو گیا، مسلمانوں کے ادبی اور تمدنی سرمائے کے تحفظ کا کام بڑی سرگرمی سے کر رہا ہے۔ اس کے ذریعہ اُردو زبان کی ترویج و اشاعت ہوئی۔ پرانے ادبی سرمائے منظرِ عام پر آئے اور ادب اور تمدن میں جو قریبی تعلق ہے اُس کا احساس اُردو جاننے اور پڑھنے والوں میں عام ہوا لوگوں نے یہ سمجھا کہ سیاست، تمدن اور ادب اُردو زبان ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیاں ہیں۔ سیاست جو کچھ کرنا چاہتی ہے اسے زبان کے ذریعہ دوسروں تک پہنچاتی اور لوگوں کو اپنا ہم خیال بناتی ہے۔ ادب کے ذریعہ ہی احساسات محفوظ کئے جاتے ہیں تاکہ وہ تاریخ کا ایک جزو بنیں تمدن بھی اپنے بقا اور قیام کے لئے زبان اور ادب کا محتاج ہے۔ ادب اور شعر قوموں کی زندگی کی تشکیل و تعمیر بھی کرتے ہیں اور اس کے تمدنی سرمائے کو امانت کی طرح ایک نسل سے دوسری اور دوسری سے تیسری تک پہنچاتے ہیں، ادب ایک تاریخی عمل ہے، وہ زندگی کی مصوری کرتا ہے، اُس کا ترجمان بنتا ہے، اس کی تفسیر پیش کرتا ہے اور اُسے تنقید کی کسوٹی پر کستا ہے۔ انجمن ترقی اُردو کا قیام ادب کے ان مسلمہ اصولوں کی ترویج، اشاعت اور

تقسیم کا ذریعہ بنا اور جو کام قوم ایک بکھرے ہوئے انداز میں کرتی رہی تھی اسے اجتماعی صورت ملی۔ اس کے استحکام کا احساس دلوں میں جاگزیں ہو گیا۔

اس قسم کے ادبی اداروں کا قیام قوموں کی زندگی میں اسی وقت ہوتا ہے جب انھیں اپنے تمدن اور تاریخی سرمایے سے اتنا عشق ہو کہ وہ اس کے تحفظ و تسلسل کو قومی زندگی کی ایک گراں بہا دولت سمجھنے لگیں اور ان وسیلوں کو اپنی عملی سرگرمیوں کا مرکز بنائیں جن سے یہ گراں بہا دولت ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جائے۔ انجمن کے قیام کے علاوہ کچھ چیزیں اور بھی ہیں جن سے مسلمانوں کے اس تمدنی احساس اور بیداری کی شہادت ملتی ہے۔ کتابوں سے والہانہ عشق و فریفتگی یوں تو ہمیشہ سے مسلمانوں کو رہی ہے لیکن غدر کے زمانے میں ان کے تمدن کی اس نشانی کی جو تباہی و بربادی ہوئی اس سے مسلمانوں کے دل میں کتابوں اور خاص کر مخطوطات کے محفوظ کرنے کی خلش اور بھی تیز ہو گئی۔ چنانچہ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے ابتدائی دنوں میں تمدن کی اس دولت کو آنے والے زمانہ کی دستبرد سے بچانے کی منظم کوششیں کی گئیں اور انھیں کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج ہندوستان اور پاکستان میں آرٹ اور کلچر کے وافر ذخیرے شخصی اور قومی کتب خانوں میں موجود ہیں۔ قومی لائبریریوں میں کلکتہ، پٹنہ، رام پور، بھوپال، حیدرآباد اور علی گڈھ کی لائبریریاں قوم کی اس غیر فانی دولت کے خزینے ہیں اور شخصی کتب خانوں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں، کتابوں کے دیوانے والہانہ شیفتگی سے ان جواہرپاروں کو اپنے سینوں سے لگائے بیٹھے ہیں اور اپنی ہر چیز کی بازی لگا کر اسلاف کی ان یادگاروں کی پاسبانی کر رہے ہیں۔ یہ سلسلہ جاری ہے اور قومی احساس کی جو چنگاری اب سے ۷۰-۸۰ برس پہلے روشن ہوئی تھی اسے زمانہ کی ہوائیں ہی تیز کرتی رہیں اور یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ اور جس طرح حال نے تمدن کے ماضی کی حفاظت خونِ جگر سے کی ہے مستقبل بھی اس کی یادوں کو زندۂ جاوید بنا دے گا۔

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے ابتدائی ۵-۶ برس تک مسلمانوں کے رہنماؤں کی توجہ خاص کر تعلیمی اور معاشی امور کی طرف رہی۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمان جب تک معیشت اور تعلیم کے میدانوں میں تیزی سے آگے نہیں بڑھیں گے ان پر بے بسی، بے کسی، ذلت اور مغلوبیت کی جو کیفیت طاری ہے وہ دور نہیں ہو گی۔ چنانچہ انھوں نے اپنی عملی سرگرمیوں کی آماجگاہ ایسی چیزوں کو بنایا جن کی تربیت، تشکیل اور تنظیم سے مسلمانوں کی اس ذہنی کیفیت کو دور کر کے ان کی زندگی کو ترقی کی راہوں پر ڈالا جا سکے۔ سیاست کی طرف ان کی نظر ضرور رہی لیکن اسے انھوں نے مقصدِ زندگی نہیں بنایا، لیکن اب، جبکہ معاشی، تعلیمی اور تمدنی حیثیت سے زندگی نے ایک خاص نہج اختیار کر لی تھی انھیں اپنی سیاسی تنظیم کی ضرورت محسوس ہوئی اور ۳۰ر دسمبر ۱۹۰۶ء کو اس مقصد کے ماتحت آل انڈیا مسلم لیگ قائم ہوئی۔ اپنے قیام کے پانچ برس بعد تک مسلم لیگ نے اپنے سالانہ اجلاسوں میں جو قرار دادیں منظور کیں ان میں چند مفادِ عامہ کے متعلق تھیں اور باقی حکومت میں مسلمانوں کے عہدوں اور ملازمتوں اور حکومت کے کام میں ان کی جداگانہ نمائندگی کے متعلق تھیں ۱۹۱۰ء میں لیگ کا دفتر علی گڈھ سے لکھنؤ منتقل ہوا اور اس کے بعد سے اس کی پالیسی میں نمایاں تبدیلی ہوئی۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۱۰ء میں ناگپور میں مسلم لیگ کا جو اجلاس ہوا اس میں حکومت کی پالیسی پر جو اعتراض کئے گئے ان میں زیادہ جرأت سے کام لیا گیا۔ دسمبر ۱۹۱۱ء میں تقسیم بنگال کے فیصلہ کی تنسیخ نے مسلمانوں میں ایک سوزش برپا کر دی اور مسلمان رہنماؤں نے حکومت کے اس فیصلہ کے خلاف سخت احتجاج کئے اور ۳ر مارچ ۱۹۱۲ء کو کلکتہ میں مسلم لیگ کا جو اجلاس ہوا اس میں کئی ایسی تجویزیں پاس ہوئیں جن کے انداز اور لہجہ میں بغاوت کے آثار تھے۔ طرابلس اور ایران میں مسلمانوں پر جو مظالم ہو رہے تھے اس کے متعلق بھی تجویزیں پاس ہوئیں۔ ۱۹۱۲ء ساری دنیا کے مسلمانوں کے لئے سیاسی حیثیت سے ایک تازیانہ تھا۔ جنگ بلقان کے واقعات نے ہندوستان کے مسلمانوں کے جذبات پر بھی بے حد اثر کیا اور اخوتِ اسلامی کے شعلہ نے ان کے دلوں میں بغاوت کی گرمی کو تیز سے تیز تر کیا اور سارے ملک میں عملی سرگرمی کے آثار نظر آنے لگے، جلسے، جلوس، تقریریں، مضامین، معلوم ہوتا تھا کہ اک آگ ہے جو کسی طرح ٹھنڈی نہیں ہو گی۔ نومبر ۱۹۱۲ء میں ڈاکٹر انصاری کا طبی مشن ترکی گیا۔ اسی سال کانپور میں مسجد کی حفاظت کے جرم میں نہتے مسلمانوں پر گولیاں چلائی گئیں اور حکومت کی اس داخلی اور خارجی پالیسی نے ہر مسلمان کو حکومت کی طرف سے متنفر کر دیا۔ بیداری کا جو ولولہ برسوں سے مسلمانوں کے دلوں میں اٹھ رہا تھا وہ اب ہر قید و بند کو توڑ کر منظرِ عام پر آ گیا۔ خوف

وہراس کی جگہ مردانگی اور ایثار نے لی اور گویا مسلمانوں کی بیداری کا ستارہ اب آفتاب بن کر چمکا۔

سیاسی جدوجہد کے یہ چند سال جن میں آگ بھی ہے اور خون بھی' احساس کی شدت بھی ہے اور عمل کی تندی و تیزی بھی مسلمانوں کی بیداری کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ سیاست کا وہ احساس جو اب تک قانون کی حدوں میں رہ کر آگے بڑھتا رہا تھا اب کسی زنجیر کا پابند نہ رہا' اب آزادی اور مردانگی اس کا مسلک تھا اور اس آزادی' جرأت اور مردانگی کے مظاہر ہمیں ان ادبی کارناموں میں نظر آتے ہیں جو اس خاص زمانہ کی تخلیق ہیں شبلی نعمانی کی شاعری کا وہ حصہ جس میں شاعر نے سیاسی احساس کی ترجمانی کی ہے اسی خاص عہد کی تخلیق ہے اور اردو شاعری میں سیاست کے موضوع پر پہلی پرخلوص کوشش۔ شبلی نے طرابلس و بلقان کے ہنگامہ پر "شہر آشوب اسلام" کے نام سے ایک بہت اچھی نظم لکھی ہے۔ اس کے چند شعروں میں اس خاص وقت کے جذبات کی گرمی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ؎

کوئی پوچھے کہ اے تہذیب انسانی کے استادو
یہ ظلم آرائیاں تا کے یہ حشر انگیزیاں کب تک

یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے
ہماری گردنوں پر ہوگا اس کا امتحاں کب تک

یہ مانا گرمیٔ محفل کے ساماں چاہئیں تم کو
دکھائیں ہم تمھیں ہنگامۂ آہ و فغاں کب تک

عروسِ بخت کی خاطر تمھیں درکار ہے افشاں
ہمارے ذرہ ہائے خاک ہوں گے زرفشاں کب تک

کہاں تک لوگے ہم سے انتقامِ فتح ایوبی
دکھاؤگے ہمیں جنگِ صلیبی کا سماں کب تک

سمجھ کر یہ کہ دھندلے سے نشانِ رفتگاں ہیں ہم
مٹاؤگے ہمارا اس طرح نام و نشاں کب تک

جب ڈاکٹر انصاری کا وفد ترکی سے واپس آیا تو شبلی نے اس کے خیر مقدم میں ایک نظم پڑھی اور سچے جذبۂ اسلامی سے ان خدمت گزاروں کے قدموں پر عقیدت و محبت کے وہ موتی نچھاور کئے جو ادب کی قبا کی زینت بھی ہیں اور ریاست کے سفر کی ایک نشانی بھی۔ اسی سال "ہم کشتگان معرکۂ کانپور" کے عنوان سے ایک نظم لکھی اس کا ایک شعر ہے ؎

سینے پہ ہم نے روک لئے برچھیوں کے وار
از بسکہ مست بادۂ ناز و غرور رہیں

اسی طرح "علمائے زندانی" نام کی ایک نظم پڑھی اس کے تین شعروں میں مسلمانوں کے احساس کی روح کی تڑپ ہے ؎

پہنائی جا رہی ہیں عالمانِ دیں کو زنجیریں
یہ زیور سیدِ سجاد عالی کی وراثت ہے

یہی دس بیس اگر ہیں کشتگانِ خنجر اندازی
تو مجھ کو سستیٔ بازوئے قاتل کی شکایت ہے

شہیدانِ وفا کے قطرۂ خوں کام آئیں گے
عروسِ سجدۂ زیبا کو افشاں کی ضرورت ہے

شبلی کے مختصر سے مجموعے میں اور بھی بہت سی نظمیں ہیں۔ جنھیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت مسلمانوں کی ذہنی کیفیت کیا تھی؟ اور اس ذہنی کیفیت نے ان کی سیاسی جدوجہد کی تشکیل و تعمیل میں کتنا بڑا حصہ لیا ہے۔

اس احساس کا دوسرا زبردست ترجمان اقبال کا کلام ہے۔ اقبال نے جنگِ بلقان کے کچھ پہلے اور کچھ بعد جو نظمیں لکھی ہیں ان کی سب سے بڑی خصوصیت ان کا اسلامی جذبہ ہے۔ لیکن اس اسلامی جذبے میں جہاں ایک طرف مجاہدانہ جوش و خروش ہے اس کے ساتھ ہی ایک مفکر کے تخیل کی دور رسی بھی ہے اس میں جرأت ہے' قوت ہے' مردانگی ہے۔ لیکن ان چیزوں سے بھی کہیں زیادہ امید ہے' ایک روشن مستقبل کا پیام ہے اور یہ پیام مسلمانوں کے سیاسی احساس میں اس سے پہلے اتنی وضاحت سے ہمیں کہیں نہیں ملتا۔ اس دور کے احساس کی نمائندگی اقبال کی نظم "شمع و شاعر" سے ہوتی ہے۔ جو ۱۹۱۲ء میں لکھی گئی۔

اس طویل نظم کے جستہ جستہ شعروں میں اس امید افزا پیام کی جھلک ہے ؎

شامِ غم لیکن خبر دیتی ہے صبحِ عید کی ظلمتِ شب میں نظر آئی کرن اُمید کی

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

تو اگر خود دار ہے منت کشِ ساقی نہ ہو عین دریا میں حباب آسا نگوں پیمانہ کر
کیفیت باقی پرانے کوہ و صحرا میں نہیں ہے جنوں تیرا نیا پیدا نیا ویرانہ کر
اس چمن میں پیروِ بلبل ہو یا تلمیذِ گل یا سراپا نالہ بن جا یا نوا پیدا نہ کر

بے خبر تو جوہرِ آئینۂ ایام ہے تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

شعلہ بن کر پھونک دے خاشاکِ غیر اللہ کو خوفِ باطل کیا کہ ہے غارت گرِ باطل بھی تو

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
اس قدر ہوگی ترنم آفریں بادِ بہار نکہتِ خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی

شب گریزاں ہوگی آخر جلوہ خورشید سے یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

اقبال نے مسلمانوں کو پہلی مرتبہ وضاحت سے بتایا کہ انسان میں کتنی قوت ہے۔ وہ اپنی خودی پر قائم رہے اور اپنے آپ کو ملت کا ایک حصہ سمجھ کر سرگرم عمل ہو تو خورشید کی کرنیں رات کے سینے میں تیغ و سنان بن کر چبھیں گی، رات رخصت ہو جائے گی اور سارا زمانہ نور سے معمور ہوگا۔ مسلمانوں کو پہلی مرتبہ بتایا گیا کہ مستقبل صبحِ عید کا پیامی ہے۔ لیکن اس مستقبل کی تعمیر خودی کی تربیت اور ملت کی قوت سے ہوتی ہے۔

شاعری میں سیاسی احساس کا جو عکس اس درجہ نمایاں ہے، وہ جب سیاسی پلیٹ فارم پر آتا ہے تو شاعری کا نازک پردہ اٹھ جاتا ہے، اور باتیں تشبیہوں، استعاروں میں نہیں کی جاتیں۔ آگ کو آگ اور خون کو خون کہنے کے لئے کسی آڑ کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اس طرح کی تصویریں ہمیں اب لیگ کے اجلاسوں میں نظر آتی ہیں۔ مارچ ۱۹۱۳ء میں لکھنؤ میں مسلم لیگ کا اجلاس ہوا اور اس کے مقاصد میں تبدیلیاں کی گئیں۔ ان میں سے ایک متحدہ ہندوستان کے لئے مناسب سلف گورنمنٹ حاصل کرنا بھی تھا۔ اسی سال دسمبر میں آگرہ میں ایک دوسرا اجلاس ہوا اور اس کی تجویزوں میں مجموعی حیثیت سے سیاسی مطالبات کے انداز میں زیادہ جرأت سے کام لیا گیا۔ ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم کی وجہ سے کوئی اجلاس نہ ہوا۔ ۱۹۱۵ء میں بمبئی میں جو اجلاس ہوا اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ ہندوستان کی آزادی کی جد و جہد میں مسلم لیگ کانگرس کی ہم نوا ہے۔ یہی زمانہ ہے جب حکومت نے ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے ماتحت پہلے مولانا شوکت علی اور محمد علی —— کو اور پھر مولانا ابوالکلام آزاد اور حسرت موہانی کو نظر بند کر لیا اور اس کے بعد شیخ علما کی بھی باری آگئی۔ اسی سلسلے میں شیخ الہند مولانا محمود حسن بھی گرفتار ہوئے۔

مسلمانوں کی سیاست میں یہ دور ایسا تھا جب ہر گروہ اور خیال کے لوگ ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد کو اپنا مسلک سمجھنے لگے تھے۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۱۶ء میں مسلم لیگ کا جو اجلاس مسٹر محمد علی جناح کی صدارت میں لکھنؤ میں منعقد ہوا اس میں لیگ کی سیاست کا پلہ بہت بھاری نظر آتا ہے۔ اسی اجلاس میں ہندو مسلمانوں میں ایک سمجھوتا بھی ہوا اور ایک میثاق مرتب کیا گیا۔ اس میثاق کے مرتب ہونے کے ۹ مہینے بعد ستمبر ۱۹۱۷ء میں مشرقی یو۔پی میں بہت بڑے پیمانے پر ہندو مسلم فسادات ہوئے اور ۲۵ ہزار ہندوؤں نے دیہات کے مسلمانوں پر منظم حملہ کیا۔ ستمبر ۱۹۱۸ء میں ایک اور بلوہ ہردوار کے مقام پر ہوا جس میں ۱۹ مسلمان زندہ جلا دیئے گئے۔ اس کے باوجود مسلم لیگ برابر اتحاد کے راستے پر گامزن رہی اور قوم کی سیاسی جنگ میں دوسری سیاسی جماعتوں سے بھی زیادہ خلوص اور ایثار کا ثبوت دیا۔

اس دوران میں کئی چھوٹی بڑی باتیں ایسی ہوئیں جن سے مسلمانوں کے جوش عمل، جرأت اور بیداری کا اندازہ ہوتا ہے۔ کلکتہ میں ۱۹۱۸ء میں مسلمانوں پر گولیاں برسائی گئیں، رولٹ ایکٹ پاس ہوا۔ ۱۹۱۹ء میں گاندھی جی نے ستیہ گرہ کی تحریک شروع کی، اپریل میں ستیہ گرہ منائی گئی اور ہڑتال ہوئی تو دہلی میں ایک مجمع پر گولی چلائی گئی۔ امرتسر میں جلیانوالہ باغ میں ایک جلسہ پر بڑی بے دردی سے گولیاں چلائی گئیں اور اس میں چار سو آدمی ہلاک ہوئے۔ دسمبر ۱۹۲۰ء میں کانگریس اور مسلم لیگ نے ترکِ موالات کی تجویز پاس کی۔ ۱۹۲۱ء میں ہندو مسلمانوں نے پوری شدت اور قوت سے ہر ولایتی اور سرکاری چیز سے قطع تعلق کیا۔ دسمبر ۱۹۲۱ء میں مسلم لیگ کے اجلاس میں مولانا حسرت موہانی نے اپنے خطبہ صدارت میں مکمل سوراج کی تجویز پیش کی۔ پھر کانگریس کے اجلاس میں جو انہیں دنوں احمد آباد میں ہو رہا تھا یہی تجویز پیش کی لیکن مہاتما گاندھی کی مخالفت کی وجہ سے وہ تحریک وہاں سے خارج ہو گئی۔

۱۹۲۱ء تک مسلم لیگ کے رویہ اور عام مسلمانوں کے طرزِ عمل سے یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ جن مسلمانوں نے سیاست کا سبق ہندوؤں سے بہت بعد میں سیکھا تھا وہ اپنے خلوص اور جوش کی قوت سے چند برسوں میں اس دوڑ میں اپنے سب حریفوں سے آگے نکل گئے تھے اور انھوں نے مکمل آزادی کو اپنا نصب العین بنا کر ملک کی ہر قوم کے لوگوں کے کاندھے سے کاندھا ملا کر یہ سفر طے کرنے کی کوشش کی تھی۔ ملک کے مختلف حصوں میں ہندوؤں نے مسلمانوں پر جو مظالم توڑے تھے اُسے نظر انداز کر کے بھی مسلم لیگ آزادی کے راستہ پر قدم بڑھاتی رہی۔ یہاں تک کہ ۱۹۲۱ء میں اُس کے ایک رہنما نے آزادی کو اپنا نصب العین بتایا۔ لیکن سفر کی اس منزل پر آ کر یہ محسوس کیا گیا کہ جب تک مسلمان اپنے لئے ایک نیا راستہ نہ بنائیں اُن کی سیاسی جدوجہد کا انجام ناکامی ہوگا۔ چنانچہ مسلمانوں نے اپنے سفر کا رُخ بدل دیا۔

۱۹۲۱ء تک کی سیاسی زندگی میں مسلمانوں نے اپنے عمل اور جذبے کا جو مظاہرہ کیا اس کی جھلک ہمیں اس دور کی ادبی زندگی میں بھی نظر آتی ہے۔ مولانا محمد علیؒ، حکیم اجمل خاں، مولانا حسرت موہانی اور علامہ اقبالؒ کے کلام اس کے آئینہ ہیں۔ لیکن ایک آئینہ اور بھی ہے جس میں ہمیں صرف سیاست کی نہیں بلکہ مذہبی، اخلاقی اور تمدنی قدروں کی واضح تصویریں نظر آتی ہیں۔ یہ آئینہ اکبر الہ آبادی کا کلام ہے۔ اکبر الہ آبادی کے کلام کے پانچ دور کئے گئے ہیں۔ پہلے تین دور ۱۹۰۸ء تک ختم ہو جاتے ہیں۔ چوتھا دور ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۲ء تک قائم رہا اور پانچواں دور ۱۹۱۲ء سے اُن کے انتقال یعنی ۱۹۲۱ء تک۔ اکبر کے کلام کے دو ابتدائی دور تو بالکل غزل گوئی کے دور ہیں۔ تیسرے دور میں ملک کی سیاسی اور تمدنی زندگی کے متعلق ہلکی ہلکی ظریفانہ اور طنز آمیز چٹکیاں ہیں۔ لیکن چوتھے دور میں سیاسی معاملات اور خاص کر تمدنی، تعلیمی اور اخلاقی مسائل پر ایسی دقیق اور نکتہ رس طنز کی گئی ہے کہ اس کلام کو پڑھ کر مغربی تعلیم اور مغربی اخلاق کے متعلق مسلمانوں کے ایک خاص طبقہ کے ردِ عمل کا پتہ چلتا ہے اور بالواسطہ اس ردِ عمل کی روشنی میں خود اصل تحریکوں کے خدوخال بھی نظر آتے ہیں۔ تیسرے دور میں یہ رنگ اور بھی تیز ہے۔ اکبر نے سیاست، تعلیم اور اخلاق کے مختلف پہلوؤں سے متعلق جو پتہ کی باتیں کہی ہیں ان کی ہلکی سی جھلک ان کے ذیل کے شعروں میں مل سکتی ہے۔

کھینچو نہ کمانوں کو نہ تلوار نکالو جب توپ مقابل ہو تو تلوار نکالو

حریفوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں　　کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

اور اب چاہیے نیٹو کے واسطے کیا بات　　یہی بہت ہے مشرف ہوئے سلام سے ہم

حقیقت میں بھی اب یادِ خدا آتی نہیں اُن کو　　دُعا مُنہ سے نہ نکلی پاکٹوں سے عرضیاں نکلیں

آج بنگلے میں مرے آئی تھی آواز اذاں　　جی رہے ہیں ابھی کچھ اگلے زمانے والے

ہم ایسی کل کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں　　کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

شوقِ لیلائے سول سروس نے اس مجنون کو　　اتنا دوڑایا لنگوٹی کر دیا پتلون کو

تعلیم جو دی جاتی ہے ہمیں وہ کیا ہے فقط بازاری ہے　　جو عقل سکھائی جاتی ہے وہ کیا ہے فقط تیزابی ہے

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر　　خاتونِ خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں

اُٹھ گیا پردہ تو اکبر کا بڑھا کون ساحق　　بے پکارے جو مرے گھر میں چلا آتا ہے

بے حجابی مری ہمسائے کی خاطر سے نہیں　　صرف حکام سے ملنے میں مزا آتا ہے

نظر میں تیرگی ہے اور رگوں میں ناتوانی ہے　　ضرورت کیا ہے پردے کی جہاں بمبے کا پانی ہے

کیا پوچھتے ہو اکبر شوریدہ سر کا حال　　خفیہ پولس سے پوچھ رہا ہے کمر کا حال

۱۹۲۱ء میں اکبر کا انتقال ہو گیا اور ہماری سیاسی، تمدنی اور اخلاقی زندگی کے احساس کو شاعری کے پیکر میں محفوظ کرنے والا ہم میں نہیں رہا۔ اسی سال کے بعد سے ہماری سیاست کا رخ بھی بدلا۔ ۱۹۲۲ء میں شدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں شروع ہوئیں اس کے جواب میں مسلمانوں نے تبلیغ کا کام شروع کیا اور ۱۹۲۲ء سے لیکر ۱۹۲۶ء تک ہندوستان کے کونے کونے میں اتنی شدت سے بلوے ہوئے کہ ایسا محسوس ہونے لگا جیسے یہ آگ کبھی نہیں بجھے گی اور یہ طوفان کسی طرح نہیں تھمے گا۔ ان بلووں کے بعد مسلمانوں کو صاف صاف معلوم ہو گیا کہ ہندو مسلمانوں کی سیاسی، مذہبی، تمدنی اور اخلاقی زندگی کو نیست و نابود کر دینے کے درپے ہیں۔ انھوں نے ایک منظم سازش کے خلاف مضبوط محاذ قائم کرنے کے منصوبے بنانے شروع کیے۔ یہی زمانہ ہے جب خلافت اور جمعیتہ العلما والے بھی ہندوؤں سے الگ ہو گئے۔

اس کے بعد کئی سال مسلمانوں کی زندگی میں سخت کشمکش اور جدو جہد کے سال ہیں۔ مسلمانوں کو اب ایک طرف تو یہ خیال تھا کہ اپنی سیاست کی ایسی تنظیم کریں

جس سے ان کے مستقبل کی تعمیر ہو سکے اور دوسری طرف یہ کوشش کہ اپنی علمی تمدنی اور اخلاقی قدروں کو مٹنے سے بچائیں اس احساس نے ہندوستان کے مختلف حصوں میں کئی ایسے ادا
قائم کرائے یا ان کی نئے سرے سے تنظیم کی جن کے کارنامے ہماری تعلیمی اور تمدنی جدوجہد اور اس کی تشکیل میں خضر راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان مختلف اداروں میں سب سے نمایا
حیثیت جامعہ ملیہ اسلامیہ (۱۹۲۰ء) کے تمدنی اور تعلیمی کارناموں کو حاصل ہے جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اپنے تعلیمی اور تمدنی پروگرام کا ڈھانچہ اس طرح بنایا کہ اس میں اسلام
اخلاقی اور تمدن کی بلند ترین قدروں اور مغرب کے جدید سے جدید تعلیمی اصولوں کا امتزاج ہو۔ اس وسیع تعلیمی کام میں اخلاقی، تمدنی اور مذہبی زندگی کی تشکیل اور تعمیر کے
مختلف پہلوؤں کو وہی اہمیت دی گئی جو زندگی کے نظام میں انھیں حاصل ہونی چاہیئے۔ اس تعلیم نے مسلمانوں کو ایثار، محبت، آزادی اور مردانگی کے معنی سکھائے
اور اپنے تمدن کی روایتوں کو ان کے سارے حسن و لطافت کے ساتھ زندۂ جاوید بنانے کا ولولہ اور شوق پیدا کیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے علاوہ انجمن ترقی اردو
دار المصنفین اعظم گڈھ اور دار الترجمہ حیدر آباد اس طرح کے ادارے ہیں جن کی کوششوں نے ہمارے تمدن کی نشانیوں کو استحکام و ثبات دینے کی اہم خد
انجام دی۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے مختلف صوبوں میں زبان کے تحفظ اور ادب کی ترقی کے لئے مختلف طرح کی تحریکیں برابر جاری رہیں۔ ہندوستان کے ہر گوشے
سے ادبی روایات کی تبلیغ و ترویج کا کام اخبار اور رسالے کرتے رہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ اب مسلمان اردو کو اپنی قومی زبان اور اپنے تمدن اور تہذیب کی بہترین روایا
کا سرمایہ جانتے ہیں۔ کتابیں اب پہلے سے بہت زیادہ لکھی جاتی ہیں اس لئے کہ لوگ انھیں شوق سے خریدتے اور پڑھتے ہیں۔ پرانے رسالوں کی اشاعت بڑھ رہی ہے
ان کا معیار بلند ہو رہا ہے اور نئے رسالے منظر عام پر آ رہے ہیں اس لئے کہ قوم کے افراد اب ان کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اور انسانی کمی سے اخلاقی اور ذہنی
زندگی میں ایک خلا پیدا ہو جاتی ہے، سیاسی اور معاشی جدوجہد کا زور ہلکا معلوم ہونے لگتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ پچھلے بیس پچیس برس سے مسلمانوں کی سیاسی جماعت نے ادب اور شعر کی کسی تحریک پر براہ راست کوئی اثر نہیں ڈالا۔ لیکن پچھلی صدی کے آخر
اور موجودہ صدی کے ابتدائی زمانہ میں مسلمانوں میں حالات کے تقاضہ سے جو ذہنی بیداری پیدا ہوئی اس نے انھیں زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کی راہوں پر گامزن کر
سیاست مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کرتی رہی۔ تعلیمی مفکر قوم کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کے لئے وقت کی ضرورت کے مطابق نت نئے لائحہ عمل بناتے اور ان پر عمل کرتے
ادیب زندگی کی ہر کشمکش کے معنی و مفہوم کو سمجھ کر سیاسی، سماجی اور اخلاقی میلانات و رجحانات کی ترجمانی اور مصوری کرتے رہے اور قوم کو اپنے حوصلہ اور قوت
مطابق ہر میدان میں آگے بڑھتے ہوئے زمانہ کے ساتھ لانے کی پُر خلوص کوشش میں مصروف رہے۔

اس طرح گو سیاست اور ادب دونوں نے مل جل کر اپنا راستہ نہیں بنایا لیکن دونوں نے اپنے اپنے میدان میں ترقی اور بہبودی کی راہیں تلاش کیں اور زندگی
کی طرف بڑھتی رہی، بیداری کا آفتاب نصف النہار تک پہنچتا رہا۔ یہ سب کچھ بھی ہوتا رہا اور دشمنوں کی طرف سے مسلمانوں کی تہذیب، تمدن، ادب، زبان کو مٹانے کی کوششیں بھی ہوتی
تعلیمی اور تہذیبی ادارے ان تخریبی قوتوں کا مقابلہ بڑی ہمت اور جوانمردی سے کرتے رہے لیکن مسلمانوں کی عام بیداری نے دشمنوں کے منصوبے پورے نہیں ہونے دیئے لیکن تخ
کی قوتیں اتنی زیادہ تھیں کہ جب تک سیاست ان کا کوئی حل تلاش نہ کرے بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ اخلاقی، تمدنی اور تہذیبی روایات ایک ایک کرتے ختم ہو جائیں گی یا کم از کم
ضرور ہوگا کہ ان کے لئے آزادی سے پھلنے پھولنے کی راہیں ہمیشہ کے لئے بند ہو جائیں گی، اس موقع پر سیاست آگے بڑھی اور ۱۹۳۰ء میں علامہ اقبالؒ نے پہلی مرتبہ اس بات کا اظ
کہ اگر مسلمان اپنی تمدنی، تہذیبی اور اخلاقی روایات کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو انھیں اپنی ایک الگ ریاست بنانی ہوگی۔ دس برس کے سیاسی اتار چڑھاؤ کے بعد آخر ۱۹۴۰ء
مسلم لیگ نے لاہور میں پاکستان کا ریزولیشن پاس کیا اور اس کے بعد سے برابر اپنے نصب العین کے حصول کے لئے مخالف قوتوں سے لڑنا شروع کیا۔ مقابلہ سخت تھا
مخالفتوں کے طوفانوں میں بلا کی تندی تھی لیکن قیادت کی دانائی اور قوم کی نصف صدی کی بیداری نے ہر مشکل کو آسان بنا لیا۔ پاکستان کا نصب العین حاصل ہو گیا۔ مسلمانوں کو
سرزمین مل گئی جہاں وہ اپنے تمدن کی روایات کو، اپنے مذہب کے ارکان کو، اپنے اخلاق کے اقدار کو محفوظ کرنے کے منصوبے بنا سکتے ہیں۔ جہاں تعلیم کی تشکیل ایسے ہو
ہو سکتی ہے کہ ہر مسلمان وہ بن سکے جو بننے کی صلاحیت قدرت نے اس میں ودیعت کی ہے جہاں سیاست ایک ایسا نظام مرتب کر سکتی ہے جو ہر ایک کے لئے
اور رحمت ہو، جو دشمنوں کی دشمنی کو دوستی میں بدل سکے۔ جہاں ہر ایک کا عمل سب کے لئے ہو، جہاں سے دنیا انسانیت کا سبق سیکھے، جدھر
نظریں اس لئے اٹھیں کہ یہاں سے ہر منزل کا نشان ملتا ہے ———!

وقار عظیم

ہماری قومی زبان کی داستان

اُردو ہماری قومی زبان کیسے بنی یہ ایک نہایت دلچسپ اور سبق آموز داستان ہے!

اگر کسی زبان کی بابت یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ فلاں جگہ فلاں سال میں پیدا ہوئی تو اُردو کی بابت ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ تقریباً نو سو سال ہوئے ۱۰۲۷ء
ں جب سلطان محمود غزنوی نے لاہور کو (محمود پور بنا کر) اپنی مملکت میں شامل کیا، ظہور میں آئی۔ یوں اُردو کی بنیاد لاہور میں پڑی اور آج نو سو سال کے بعد
ہو رہی ہیں اپنی تہذیب کی عالی شان عمارت پر ہم اپنی اِس قومی زبان کا خوبصورت جھنڈا ہوا میں لہراتا دیکھتے ہیں۔ اِس وقت ہمارا دل گواہی دے
رہا ہے کہ ہماری تہذیب ہماری زبان کے لئے باعثِ وقار ہے اور ہماری زبان ہماری تہذیب کے لئے موجبِ آرائش!

اِس میں شبہ نہیں کہ اس سے صدیوں پہلے جب جنوبی ہند میں عرب تاجر مالا بار کے ساحل پر اُترے یا جب ۷۱۲ء میں محمد بن قاسمؒ نے اسلام کا
تح بن کر سندھ اور ملتان پر قبضہ کیا تو عربی الفاظ ہندوستان کی زبانوں میں سموئے جانے لگے۔ لیکن تازہ ترین مستند تحقیقات کے مطابق اُردو کی اصلی
یاد گیارھویں صدی میں لاہور ہی میں رکھی گئی۔ اِس بارے میں پروفیسر شیرانی، ناطق لکھنوی، ناظر کاکوروی، اِدارۂ ادبیاتِ اُردو حیدر آباد
ن اور پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی اپنی تصنیفات (پنجاب میں اُردو مطبوعہ ۱۹۲۸ء" - "نظم اُردو (۱۹۴۰ء)" - "ہندو ادیب (۱۹۴۰ء)
یخ ادبِ اُردو (۱۹۴۰ء)" اور "کیفیہ (۱۹۴۲ء)" میں واضح طور پر اعلان کر چکے ہیں کہ **اُردو کی ابتدا پنجاب سے ہوئی**۔ فارسی الفاظ اُس
ت کی پنجابی سے ملے اور یوں وقتی ضروریات کے ماتحت ایک نئی زبان نے جنم لیا۔ ہندوستان کا سب سے پہلا اردو شاعر مسعود بن سعد بن سلمان
۱۰۵۱ء تا ۱۱۳۱ء) تھا جس کی پیدائش و سکونت کا مقام لاہور تھا۔ شیخ فرید الدین گنج شکر (متوفی ۱۲۶۵ء) جو تیرھویں صدی میں پنجاب میں رہتے
ے فرماتے ہیں:-

وقتِ سحر وقتِ مناجات ہے — خیز در آں وقت کہ برکات ہے
نفس مبادا کہ بگوید ترا — خسپ چہ خیزی کہ ابھی رات ہے

پندرھویں صدی میں اُردو میں اس قسم کے پنجابی لفظ رائج تھے۔ کھنڈ، گدّی، گڈّی، آکھنا، لسنا، گنگلو، **پُرانی اُردو میں پنجابی**
شیریں آواز سُنئے:-

باغ دیکھل دجل سہے تو آما — بن صحبتِ یار خوش ندیسے (سلطان قلی قطب شاہ)
جب چمن میں جاکے پیارے تم نے زلفیں کھولیاں — لے گئی بادِ صبا خوشبو کی بھر بھر جھولیاں (آبرو)
داد و فریاد جا بجا کریئے — شاید اُس کے بھی دل میں جا کریئے (میر)
ہیگی طلب شرط یاں کچھ تو کیا چاہیئے — بیٹھے نہیں بنتے میاں کچھ تو کیا چاہیئے (میر)
خاک و خوں میں مَیں تڑپیں کیا کیا نہ رلیاں دیکھیاں — اے فلک باتیں تری کوئی نہ بھلیاں دیکھیاں (سودا)
وہ صورتیں الٰہی کس ملک بستیاں ہیں، — اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں (سودا)

اورنگ زیب کے عہد میں پنجاب میں مولانا عبدی نے (۱۶۶۳ء میں) "فقہ ہندی" تصنیف کی جس کی اُردو بالکل پنجابی نما ہے ولی دکنی (م ۱۷۴۴ء)
کلام میں ہندی، فارسی اور پنجابی کا ملاپ دیکھئے:-

یہ تِل تجھ مُکھ کے کعبے میں مجھے اسودِ حجر دستا زنخداں میں ترے مجھ چاہِ زمزم کا اثر دستا

دکن کی زبان میں اب تک پنجابی الفاظ کی ملاوٹ ہے چنانچہ پنڈت کیفی نے ۱۹۳۱ء میں اورنگ آباد وغیرہ کے عوام کی زبان سے پنجابی کے یہ لفظ سُنے: پیارے پیٹی (کوسا)، کیا (کہا)، ریا (رہا)، گھاگھرا (لہنگا)۔

حقیقت یہ ہے کہ جب مسلمان فاتحین لاہور سے آگے بڑھے اور بارھویں صدی میں دہلی اور چودھویں پندرھویں صدی میں گجرات اور دکن میں پہنچے تو جہاں جہاں یہ لوگ گئے اور ٹھہرے اُن کی پنجابی نما اُردو وہاں کی زبانوں اور فارسی سے مل کر بتدریج ترقی یافتہ اُردو کی شکل میں تبدیل ہوتی گئی۔ انیسویں صدی کے وسط میں ہماری یہ قومی زبان کامیابی کے ہزاروں مرحلے طے کر کے پھر ہمارے پاس پنجاب میں واپس آئی، ہم نے اِسے پہچان لیا اور اِسے اپنے سر آنکھوں پر بٹھایا اور آج بیسویں صدی کے وسط میں جب ہندوستان کی یہ رانی ہجرت کر کے اور بظاہر لُٹ لُٹا کر ہمارے ہاں پہنچی ہے تو کیا ممکن ہے کہ ہم اِسے دل میں جگہ دیتے ہوئے اس کے لئے اپنا جان و مال تک قربان نہ کر دیں گے؟ زمانے کے نئے حالات میں آج ہم اور یہ خوب سمجھ چکے ہیں کہ ہم اُردو زبان کے نام لیوا ہیں اور یہ ہماری علم بردار! ہم اِس کے ہیں یہ ہماری، یہ تعلق انشاءاللہ ہمیشہ قائم رہے گا!

اُردو زبان و ادب کے پانچ بڑے دَور ہیں۔ ابتدائی دَور ۱۰۲۷ء سے ۱۴۰۰ء تک جب اُردو مسلمان نوجوں کے ساتھ لاہور سے دہلی اور دہلی سے دکن میں پہنچی۔ اِس کے ساتھ بلکہ اس سے پہلے ہی مسلمان صوفیہ اور درویش اِسے ملک کے مختلف حصّوں میں پھیلا چکے تھے۔

اِس کے بعد ہے **دُوسرا دَور** جو اُردو نثر کا پہلا دَور تھا ۱۴۰۰ء سے ۱۸۰۰ء تک۔ اس زمانے میں حضرت گیسو دراز نے "معراج العاشقین" تصنیف کی جو اُردو نثر کی پہلی کتاب ہے۔ دکن میں پہلے بہمنی سلاطین (۱۳۴۷ء تا ۱۵۲۵ء) نے اور پھر عادل شاہیوں (۱۴۸۹ء تا ۱۶۸۶ء) اور قطب شاہیوں (۱۵۱۸ء تا ۱۶۸۶ء) نے اُردو کو نوازا چنانچہ ابراہیم عادل شاہ اوّل نے ۱۵۳۵ء کے قریب اِسے اپنی دفتری و عدالتی زبان قرار دیا۔ سلاطین مغلیہ کے عہد میں اُردو کو اَور ترقی ہوئی۔ اورنگ زیب کے عہد میں اُدھر اورنگ آباد اور اِدھر پنجاب میں اس کی آواز سنائی دی۔ ۱۷۳۲ء میں فضلی نے اپنی "دہ مجلس" لکھی اور ۱۷۴۳ء میں عیسائی مشنریوں نے انجیل کا ترجمہ اُردو میں کیا۔

تیسرا دور ۱۸۰۰ء سے شروع ہو کر ۱۸۵۷ء میں ختم ہُوا۔ ابتدائی انگریزی اقتدار کے اس زمانے میں دو مشہور ادارے وجود میں آئے: کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج (۱۸۰۰ء) جہاں پہلی دفعہ سرکاری طور پر اُردو نثر کی سرپرستی ہوئی اور چہار درویش اور دوسری کتابیں سادہ زبان میں لکھی گئیں اور دہلی میں دہلی کالج (جسے ۱۸۲۵ء میں ازسرِ نو منظم کیا گیا) جہاں تاریخ و ادب، فلسفہ و سائنس وغیرہ کی کتابیں زیادہ تر انگریزی سے ترجمہ کی گئیں۔ ۱۸۰۳ء میں شاہ عبدالقادر نے قرآن مجید کا ترجمہ کیا جو ۱۸۲۹ء میں شایع ہوا۔ ۱۸۳۵ء میں برطانوی حکومت نے فارسی کی بجائے اُردو کو عدالتی زبان بنا دیا۔ ۱۸۳۶ء میں دہلی سے پہلا اُردو اخبار جاری ہوا۔

اُردو کا **چوتھا دَور** ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے شروع ہو کر ۱۹۱۴ء کی عالمگیر جنگ پر ختم ہوا۔ اس زمانے میں بھی اُردو کے دو مشہور ادارے وجود میں آئے۔ سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ (۱۸۶۴ء) اور اورنٹیل کالج لاہور (۱۸۷۰ء)۔ غالب اور سرسیّد کی نثر سے مکالمے کا ظہور اور سنجیدہ خیالات کا مسلسل اظہار شروع ہوا۔ ۱۸۷۰ء میں سرسید نے تہذیب الاخلاق جاری کیا اور ۱۸۷۹ء میں حالی نے "مسدّس" لکھی اور ۱۸۹۰ء میں "مقدّمہ"۔ ملک بھر میں اخبارات و رسائل کثرت سے شائع ہونے شروع ہوئے۔ ۱۸۵۰ء میں لاہور سے اخبار "کوہِ نور" شائع ہوا۔ ۱۸۵۶ء میں وہاں محکمۂ تعلیم حکومتِ پنجاب وجود میں آیا، ۱۸۶۵ء میں انجمن پنجاب کی بِنا پڑی اور ۱۸۸۷ء میں اِدھر "پیسہ اخبار" اور اُدھر لکھنؤ سے "دل گداز" جاری ہوا۔ ۱۹۰۱ء میں لاہور میں شیخ عبدالقادر نے "مخزن" جاری کیا اور ۱۹۰۳ء میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے شعبۂ اُردو کی تشکیل ہوئی۔ سرسید کے علاوہ حالی، آزاد نذیر احمد، شبلی، شرر، سرشار وغیرہ اس دَور کے مشہور اُردو مصنفین تھے۔

اُردو زبان و ادب کا **پانچواں دَور** ۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم سے شروع ہو کر ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی تقسیم پر ختم ہوتا ہے۔ یہ زمانہ ہر لحاظ سے ہندوستان میں انتہائی سرگرمی کا زمانہ گزرا ہے۔ دارالمصنفین نے اُردو ادب کے لئے اپنا کام شروع کیا (۱۹۱۲ء)، اُدھر انجمن ترقیٔ اُردو کا نیا دَور مولوی عبدالحق کی سرکردگی میں شروع ہوا (۱۹۱۳ء) اور اس کے پانچ سال بعد جامعۂ عثمانیہ (۱۹۱۸ء میں) ظہور میں آئی۔ اِس دَور میں مختلف علوم و فنون کی متعدد مفید کتابیں چھپیں۔ لُغت کی نئی کتابیں مرتّب ہوئیں۔ قومی شاعری نے قوم کو جھنجھوڑا، جدید تنقید نے اُس کے ادیبوں کو خوابِ غفلت سے جگایا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین (۱۹۳۶ء) اور نئے ادب اور نئی شاعری والوں نے بھی اپنی مناسب و نامناسب چیخ پکار سے آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ قوم اور اُس کے ادیب بیدار رہوئے اور ترقی کا ایک نیا نصب العین اُس کے سامنے رُونما ہو گیا۔ سجاد حیدر یلدرم وحید الدین سلیم، پریم چند، آغا حشر، دیا نرائن نگم، راشد الخیری، سر تیج بہادر سپرو، مولوی عبدالحق، سلیمان ندوی، سر عبدالقادر، حسن نظامی، برجموہن کیفی، نیاز فتح پوری، ظفر علی خاں، سلطان حیدر جوش اور بیسیوں نوجوان اُدبا جن پر علم و ادب فخر کر سکتا ہے، اس حیات انگیز زمانے میں میدانِ اُردو میں اُترے۔

اُردو شاعری کے بھی بالعموم **پانچ دَور** سمجھے جاتے ہیں۔ **پہلا دَور مُوجدین** تا ۱۶۷۵ء جس میں امیر خسرو (۱۲۵۵ء تا ۱۳۲۵ء) اور سلطان محمد قلی قطب شاہ (۱۵۸۰ء تا ۱۶۱۱ء) زیادہ مشہور ہیں۔ **دوسرا دورِ متقدّمین** ۱۶۷۵ء تا ۱۷۷۵ء جس کا روشن ترین ستارہ ولی دکنی ہے (۱۶۶۸ء تا ۱۷۴۴ء)۔ **تیسرا دور متوسّطین** (۱۷۷۵ء تا ۱۸۲۵ء) جس میں دہلوی شعرا میر، سودا، میر حسن، درد وغیرہ اور لکھنوی شعرا انشا، مصحفی، جرأت اور ان سب کے علاوہ نظیر اکبر آبادی نمایاں ہے۔ **چوتھا دورِ متاخرین** (۱۸۲۵ء تا ۱۸۷۵ء) جب دہلی میں ذوق، غالب، مومن اور ظفر، لکھنؤ میں ناسخ، آتش، انیس اور دبیر اور رام پور میں امیر و داغ نے اپنے کلام کے جوہر دکھائے۔ اس کے بعد ہے **دورِ حاضر** جو فی الحقیقت لاہور میں ۱۸۷۴ء کے مشاعرے سے شروع ہوا اور شاید ۱۹۴۷ء میں ختم ہوا یا ابھی جاری ہے۔ یہی وہ ہمارا زمانہ ہے جس میں آزاد و حالی نے نام نہاد "نیچرل" شاعری کی بنیاد رکھی اور حالی و اکبر و اقبال نے قومی شاعری کے زور و قوت سے ایک سوئی ہوئی قوم کو اپنے صدیوں کے خوابِ غفلت سے جگا دیا۔ اسمٰعیل، چکبست، عظمت اللہ خاں، ناظر، نادر، نیرنگ، اعجاز، ہمایوں، محروم، سرور وغیرہ میں سے اکثر انہیں کے بنائے ہوئے رستے پر چلے بلکہ غزل گو شعرا کی غزلوں میں بھی کبھی نئے خیالات اور کبھی نئے طرزِ ادا نے ایک جدّت پیدا کر دی۔ چنانچہ جوہر، اصغر، فانی، حسرت، جگر وغیرہ کا اندازِ بیان بھی پرانی مقرّرہ راہ سے کچھ مختلف ہے۔ جوش شاعری میں ایک تازہ انقلاب کا مدعی ہوا اور نئی شاعری والوں نے ن۔ م۔ راشد کی قیادت میں ایک نئی قسم کی بغاوت کے بے قافیہ نعرے بلند کئے۔ ان کے علاوہ ہمارے بیسیوں ہونہار نوجوان شاعر ایسے ہیں جن کے کلام پر تبصرہ کرنے کے لئے ایک علیحدہ مقالے کی ضرورت ہے۔

اُردو زبان و ادب کے ادوار کی اس رسمی تقسیم کو چھوڑ کر اگر ہم **پچھلے پچاس برس پر ایک سرسری نظر** ڈالیں تو ہمیں صاف نظر آئے گا کہ بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ جیسے متمدّن دُنیا اَور سے اَور ہو گئی اسی طرح ہندوستان اور اہلِ اُردو بھی ایک نئی زندگی سے دوچار ہوئے۔ جنگِ روس و جاپان (۱۹۰۵ء) نے "عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا" دیا۔ تقسیمِ بنگال پر شورش برپا ہوئی۔ جنگِ بلقان و طرابلس نے مسلمانوں کو اکسایا (۱۹۱۱-۱۲ء) اور پھر دو عالمگیر لڑائیوں نے ۱۹۱۴-۱۸ء میں اور ۱۹۳۹-۴۵ء میں دنیا کو ایک بالکل نئی دُنیا بنا دیا۔ محکوم قوموں میں شورش اُٹھی، مظلوم طبقوں میں بے چینی پیدا ہوئی۔ نوجوانوں نے پُرانی روایات مٹا دینے کا تہیّہ بھی کر لیا اور اعلان بھی کر دیا، انھوں نے سماج، حکومت، مذہب سب کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کیا اور بہ بانگِ دہل کہا کہ آزادی سب چیزوں پر مقدّم ہے وہی حقیقت ہے اور حقیقت اَور کوئی چیز نہیں اور ہم پُرانی دنیا کی ہر پُرانی چیز کو بدل کر چین لیں گے۔

اس ذہنی **انقلاب** کا نیم مُردہ ہندوستان پر شدید اثر پڑا اور اس مُلک نے پہلی دفعہ اپنی قناعت اور تقدیر پرستی کے گھٹا ٹوپ کو اُتار پھینکنے کی تیاری کی۔ چنانچہ اقبالؔ نے پکارا کہ "یہ خاموشی کہاں تک لذّتِ فریاد پیدا کر" اور کہا کہ "ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانے میں"! وطنیت کا جذبہ اُبھرا، تشدّد اور عدمِ تشدّد دونوں حربے استعمال کئے گئے، مُلک کی دو بڑی قومیں پہلے مل کر حکومت سے لڑیں اور پھر آپس میں لڑنے لگیں فرد میں اپنے حقوق کا احساس پیدا ہوا، صنعتی ترقی کی وجہ سے مزدور منظّم ہوئے، شہری عورتوں میں تعلیم پھیلی اور اس کے ساتھ اپنی غلامی پر ناراضی کا جذبہ بیدار ہوا، متمدّن ممالک کے انقلابات اور بالخصوص اسلامی ممالک کی جنگِ آزادی اور روسی انقلاب سے متاثر ہو کر ہندو مسلم نوجوانوں کے ایک گروہ نے غیر حکومت کو اُلٹنے اور قدامت پسند سماج کو یکسر بدل ڈالنے کا ارادہ کر لیا۔ ہندوستانی ادب میں جنبش پیدا ہوئی اور اس نئی انقلابی ذہنیت کا گہرا اثر اُردو ادب پر پڑا اور بجائے ادب برائے ادب کے اب **ادب برائے زندگی** کا نعرہ بلند کیا گیا۔ **تغیّر پسندی** کی نئی روایت نے پُرانی ادبی روایات کو کھنگالا، ادب بجائے خارجیت کے اب داخلیت کی طرف مائل ہوا۔ بہت سے ادیبوں نے تحلیلِ نفسی کی طرف توجہ کی، وہ اب پرانی لکیر کے فقیر نہ رہے، اُن کے ادب میں اب گہرائی تلخی اور بے باکی کے عناصر پیدا ہونے لگے جو بعض اوقات عریاں نگاری کی حد تک پہنچ گئے۔ تاریخ و سیاست، مذہب و معاشرت، فلسفہ و طبیعات سب علمی مضامین میں تحقیق و تفحّص کی حس کام کرنے لگی اور قدامت پسندوں کو بھی اب اپنے اعتقادات کے جواز کے لئے دلائل و براہین سے کام لینا پڑا۔ اُدھر ادبی مضامین میں مقررہ راستوں کو چھوڑ کر اور بوسیدہ بندشوں کو توڑ کر ادیب مغرب کے نئے نویلے طریقوں کی طرف لپکے جیسا کہ نئی آزادی اور نقالی میں ہُوا کرتا ہے۔ اس سے تعمیر بھی ہوئی اور تخریب بھی مگر بہ حیثیتِ مجموعی اس سے ہمارے ادب کو بڑا فائدہ پہنچا۔ لمبی رام کہانیوں کی جگہ **نئے افسانے** نے لی جس میں زندگی کا پھیلاؤ اور گہرائی، دیہاتی زندگی کے مرقع، تجزیۂ نفس کی جھلکیاں اور کردار نگاری کی حقیقت بینی صاف نظر آنے لگی۔ **ڈرامے** بھی ایک نئے انداز سے لکھے جانے لگے جس کی ایک مثال امتیاز علی تاجؔ کا مشہور ڈراما "انارکلی" ہے۔ تنقید زیادہ تر صحیح قسم کی تنقید بن گئی اور ادبا میں اس قدر مقبول ہوئی کہ ہر اچھے رسالے میں تنقیدی مضامین کثرت سے شایع ہونے شروع ہوئے۔ آزادؔ، حالیؔ، شبلیؔ کے بعد مولوی عبدالحق، کیفیؔ، سر عبدالقادر، احسنؔ مارہروی اور بہت سے اَور قابل ادبا ادھر متوجہ ہوئے اور تنقید بجائے ایک خشک موضوع کے ایک دلچسپ اور مفید موضوع ہو گیا۔ اچھے نقاد محنت سے تحقیق کرنے، انصاف سے تجزیہ کرنے اور افراط و تفریط اور ذاتیات سے پرہیز کرنے لگے۔ اعلیٰ درجے کی **ظرافت** اُردو میں پہلی بار رُونما ہوئی۔ فرحت اللہ بیگ، فلک پیما، رشید احمد صدیقی، پطرس اور کئی اَور مزاح نگاروں نے اُردو ادب کو چار چاند لگائے۔ خواتین نے نظم و نثر میں اپنی قابلیت کے جوہر دکھائے جن کے زمرہ میں سیّدہ اختر، رابعہ خاتون، ز خ ش، حجاب امتیاز، بشیر النسا، صفیہ شمیم، زیب عثمانیہ، نذرِ سجاد، ح ب اور ڈاکٹر شائستہ سہروردی سی قابل انشاپرداز شامل ہیں۔

زمانے کے انقلاب کا اثر اس قدر دُور رس ہوا کہ **اُردو غزل** کے قالب میں بھی گاہے گاہے نئے الفاظ نئی تلمیحات اور نئے خیالات کا خوبی سے اظہار ہونے لگا۔ مگر انقلاب کا سب سے زیادہ اثر **جدید ادب** اور جدید شاعری میں ظہور پذیر ہوا جس کا مقصد ہی قدامت سے بیزاری اور جدّت پسندی تھا۔ یہاں صوری و معنوی دونوں حیثیتوں سے بغاوت کی گئی لیکن ماننا پڑے گا کہ بہت سی لغویات کے ساتھ بعض خوبصورت اور کارآمد چیزیں بھی اس ادب سے ہمیں ملیں جو ہمیں مستقبل کی ایک نئی راہ دکھا رہی ہیں۔ ممکن ہے بعض اصحاب نئے شعرا کی نظموں کو نظم کہنا ہی غلط سمجھیں لیکن کیا مثلاً مطلبی فریدآبادی کی "گاگر" والی دُھن قابلِ اعتنا نہیں: ؎

گاڑ لینا — کیسے بھائی — ایسے بھائی — ہتیا ہتیا
بوجھ اُٹھا لو — بوجھ اُٹھاؤ — ممل سرا کا — ہاں ہاں بھائی
ممل سرا کا اونچا کر لو — ہاں ہاں بھائی — بوجھ اُٹھا لو — بوجھ اُٹھایا

اسی طرح ن۔م۔ راشد کی جدید وضع کی نظم "اُس وادیٔ پنہاں پر" "جو مشرق و مغرب کے پار ہے" یا فیض کی نظم "چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز" ایک نئی ذہنیت کا نقشہ اور ایک نئی دنیا کا پتہ دیتی ہیں۔ بعض ترقی پسند ادیب جدید ادب کے مذموم رجحانات کا خود اعتراف کرتے ہیں۔ چنانچہ قاضی عبدالغفار نے تنبیہ کی ہے کہ "محض جدت کی خاطر جدت فضول ہے اور محض جنسیات کو جدید ادب کا اوڑھنا بچھونا بنا لینا ایسی افراط تفریط ہے جس سے شبہ ہوتا ہے کہ ہمارے بعض نام نہاد ترقی پسند ادیب یا تو ادنیٰ جنسی جذبات کی سوداگری کر رہے ہیں یا خود اپنی نفسیات کے گندے رجحانات سے لذت اندوز ہونا چاہتے ہیں یہ ایک مجرمانہ لغزش ہے"۔

اردو ادب میں یوں نئی تبدیلیاں ہو رہی تھیں کہ مخصوص حالات کے ماتحت بدقسمت ہندوستان کو پھر وہی **اردو ہندی جھگڑے** کا پرانا دورہ پڑ گیا۔ اردو ہندی کی مختصر کہانی یہ ہے کہ ۱۸۰۰ء سے پہلے یہ فی الحقیقت دو زبانیں نہ تھیں۔ فارسی و عربی کا ہندوستان کی مختلف پراکرتوں سے میل جول ہوا اور یوں وہ زبان پیدا ہوئی جسے ہندی، ہندوی، زبانِ دہلوی، زبانِ ہندوستان، ریختہ، ہندوستانی، اردو وقتاً فوقتاً مختلف نام دیئے گئے۔ ۱۸۰۰ء میں ایک انگریزی ہندوانہ سازش کے ماتحت للو لال جی نے فورٹ ولیم کالج کی چار دیواری میں بیٹھ کر اردو کتابیں لیں اور ان میں سے عربی فارسی لفظ نکال کر ان کی جگہ سنسکرت شبد جڑ دیئے اور یوں بیک جنبشِ قلم موجودہ شدھ سنسکرتی ہندی اپنے ناگری رسم الخط کے ساتھ وجود میں آ گئی۔ ۱۸۳۵ء میں فارسی کی جگہ اردو عدالتی زبان بنا دی گئی اور چونکہ اردو سب میں مقبول تھی کوئی آواز اس کے خلاف بلند نہ ہوئی۔ لیکن ۱۸۶۷ء میں صوبۂ بہار میں وہاں کی حکومت نے سرکاری دفاتر میں بجائے اردو کے کیتھی حروف جاری کر دیئے اور اس کی دیکھا دیکھی اسی سال بنارس میں چند سربرآوردہ ہندوؤں نے عدالتوں میں اردو کی بجائے ہندی رائج کرنے کی تحریک شروع کی۔ چنانچہ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے رسالہ "زبان کا مسئلہ" میں لکھا ہے کہ "انیسویں صدی کے نصفِ آخر میں اردو ہندی ایک دوسرے سے علیحدہ علیحدہ ہوئیں اس طرح کہ پہلے ہندوؤں میں اپنی قومیت کا شعور پیدا ہوا اور وہ زیادہ شدھ ہندی پر اور دیوناگری رسم خط پر اصرار کرنے لگے اور پھر مسلمانوں میں یہ شعور پیدا ہوا اور وہ اردو کو اپنی چیز سمجھنے لگے"۔ سرسید علی گڑھ کی تعلیمی سروے میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "جب سے ہندو صاحبوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اردو زبان اور فارسی کو جو مسلمانوں کی حکومت اور ان کی شاہنشہیٔ ہندوستان کی باقی ماندہ نشانی ہے مٹا دیا جائے اس وقت سے مجھ کو یقین ہو گیا کہ اب ہندو مسلمان باہم متفق ہو کر ملک کی ترقی اور اس کے باشندوں کی فلاح کا کام نہیں کر سکتے۔ میں نہایت درستی اور اپنے تجربے اور یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ہندو مسلمانوں میں جو نفاق شروع ہوا ہے اس کی ابتدا اسی سے ہوئی"۔ سرسید کی زندگی میں یہ فتنہ دب گیا مگر ان کی وفات کے بعد اپریل ۱۹۰۰ء میں یو۔پی کے لفٹننٹ گورنر میکڈانل نے عدالتوں میں ناگری حروف میں بھی درخواستیں لینے اور اعلان جاری کرنے کا ریزولیشن منظور کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اردو ہندی کی بحث سے صوبۂ متحدہ میں دونوں قوموں کے درمیان نفاق کی ایک خلیج قائم ہو گئی جو روز بروز بڑھتی گئی۔ نواب محسن الملک نے اردو کی تحریک میں حصہ لینا چاہا لیکن لفٹننٹ گورنر نے ان کو علی گڑھ کی تعلیمی گرانٹ بند کرنے کی دھمکی دے کر روک دیا۔ اسی روک تھام کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں میں اردو کے تحفظ اور اپنے دوسرے قومی حقوق کی حفاظت کے لئے ایک سیاسی انجمن قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا اور اسی سلسلے میں پہلے اکتوبر ۱۹۰۱ء میں لکھنؤ میں محمڈن پولیٹیکل آرگنائزیشن اور پھر دسمبر ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ میں آل انڈیا مسلم لیگ قائم کی گئی۔ ادھر ۱۹۱۰ء میں ہندی ساہتیہ سمیلن کی بنا ڈالی گئی اور اردو کے مقابل میں ہندی کے پرچار کا کام بڑے زور شور سے شروع کر دیا گیا۔ ۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۲ء تک ہندو مسلمانوں کے سیاسی تعلقات بہتر ہو گئے لیکن اس کے بعد پھر شدھی اور سنگھٹن کی تحریکات اور دیگر مہاسبھائی سرگرمیاں دونوں قوموں کے مسلسل فسادات کا باعث ہوئیں۔ ۱۹۳۱ء میں کانگرس نے ہندوستانی کے متعلق اپنی مبہم قرارداد منظور کی جسے ۱۹۳۶ء میں گاندھی جی نے ناگپور میں بھارتیہ ساہتیہ پریشد کی بنیاد ڈالتے ہوئے اپنی ہندی اتھوا ہندوستانی کی تحریک سے اور زیادہ مبہم اور اردو کے حق میں اور زیادہ ضرر رساں بنا دیا۔ اس کے بعد دس گیارہ برس تک اردو ہندی کے جھگڑے نے

تین چوتھائی صدی سے ایک موسمی پھوڑے کی طرح گاہے گاہے پھوٹتا رہا تھا ایک بھیانک صورت اختیار کرلی - ریڈیو میں فلموں میں دیسی ریاستوں میں برطانوی صوبوں میں جلسوں جلوسوں میں تقریروں تحریروں میں ہر جگہ اس فتنے نے اپنا سر اُٹھایا - گاندھی جی نے ۱۹۳۶ء سے کبھی ہندوستانی کے پردے میں اور کبھی براہِ راست ہندی کے پلیٹ فارم پر ہندی کا پرچار شروع کیا - فروری ۱۹۳۹ء میں دہلی ریڈیو پر "ہندوستانی کیا ہے ؟" کے عنوان کے ماتحت اُردو ہندی کے چھ لیڈروں نے تقریریں نشر کیں جس سے ہندی لیڈروں کی ہندوانہ ذہنیت بے نقاب ہوگئی - ۱۹۴۰ء میں ریاست کشمیر کی ہندی نواز پالیسی منظرِ عام پر آئی فروری ۱۹۴۵ء میں گاندھی جی نے وردھا میں ہندوستانی پرچار کانفرنس منعقد کی - یہ حالات دیکھ کر مولوی عبدالحق کی سرکردگی میں اُردو والوں نے اپنی سرگرمیوں کو تیز تر کردیا - اخبارات و رسائل نے احتجاج کیا، انجمنوں نے شور مچایا، کانفرنسوں نے دہائی دی، مشاعروں میں واویلا ہوا، مئی ۱۹۳۶ء میں لاہور میں انجمنِ اُردو پنجاب قائم ہوئی جس کے صدر پنڈت کیفی اور سکریٹری راقم الحروف تھا - اکتوبر ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقیٔ اُردو (ہند) کے زیرِ اہتمام ایک آل انڈیا اُردو کانفرنس علی گڈھ میں اور دسمبر ۱۹۳۹ء میں ایک کل ہند اُردو کانفرنس دہلی میں منعقد ہوئی - نومبر ۱۹۳۸ء میں انجمن کا دفتر دہلی میں منتقل کردیا گیا - اپریل ۱۹۳۹ء میں "ہماری زبان" جاری ہوا - دسمبر ۱۹۴۰ء میں پنجاب کے وزیرِ تعلیم نے اعلان کیا کہ پنجاب میں ذریعۂ تعلیم صرف اُردو ہے - ستمبر ۱۹۴۴ء میں مولوی عبدالحق نے اُردو یونیورسٹی کی تجویز پیش کی - فروری ۱۹۴۵ء میں حکومتِ ہند نے ریڈیو میں اُردو ہندی کا مسئلہ طے کرنے کے لئے ایک آل انڈیا ریڈیو کمیٹی مرتب کی مگر اُردو دشمنی کی تحریکات روز بروز بڑھتی گئیں - چنانچہ ستمبر ۱۹۴۶ء میں سردار پٹیل کے حکومتِ ہند میں قلمدانِ وزارت سنبھالنے کے بعد ریڈیو پر ہندی کا اثر نمایاں طور پر ظاہر ہونے لگا یہاں تک کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان دو ممالک انڈیا اور پاکستان میں منقسم ہوا جس کے ساتھ ہی گویا ملکی زبان بھی دو حصوں میں تقسیم ہوگئی -

اِس سارے بیان سے ظاہر ہے کہ اُردو ہندی کا جھگڑا محض ایک دو زبانوں کا جھگڑا نہ تھا بلکہ ایک **تہذیبی اور سیاسی مناقشہ** تھا - ہندوؤں کا ایک زبردست گروہ جو بالآخر برسرِ اقتدار آیا اِس پر مصر تھا کہ اُردو کو جو ہندوستان کی ملکی زبان بننے کی سب سے زیادہ صلاحیت رکھتی ہے ختم کردیا جائے کیونکہ اس میں مسلمانی تہذیب کا عنصر بھی موجود تھا - ہندی والوں نے ایک مصنوعی زبان گھڑلی اور اُسے ملک پر تھوپنا شروع کیا اس تعصب نے مشترکہ زبان کو تباہ کردیا - یہ بات اب مسلّمہ ہے کہ اُردو میں موجودہ ہندی کی بہ نسبت اصلی ہندی کے زیادہ الفاظ اور محاورات پائے جاتے ہیں اور وہ لوگوں کی عام بولی بلکہ دیہاتی بولیوں سے بھی زیادہ قریب ہے - مثلاً دیہات والے ہندو بھی پریوجن کے شبد کی بجائے مطلب یا مطبل کے لفظ کو زیادہ آسانی سے سمجھ لیتے ہیں - اگر کانگرس کے لیڈروں میں تعصب کم اور سمجھداری اور فراخ دلی زیادہ ہوتی اور اگر کانگرس اُردو کو ہندوستان کی قومی زبان تسلیم کرلیتی تو اغلب ہے کہ ہندوستان کبھی اس طرح تقسیم نہ ہوتا - اگر اُردو کو مشترک زبان بنانے کے دُور اندیشانہ اصول پر دیانت داری سے عمل کیا جاتا تو مسلمان مطمئن ہوجاتے کہ اِس ملک میں اُن کی تہذیب کا حصہ اور ان کی قومی زندگی محفوظ و مامون ہے - لیکن ایسا نہ ہونا تھا نہ ہوا - واقعہ یہ ہے کہ اگر ہندو مسلمانوں کی دو تہذیبوں کا اتصال ممکن نہ تھا اگر ظاہری ملاپ میں فی الحقیقت اندرونی پھوٹ ہی مضمر رہنی تھی تو جو ہوا اچھا ہوا، پھر امن کے لئے تفریق ہی بہتر اور مستقل اطمینان کے لئے علیحدگی ہی زیادہ مناسب تھی؛ خدا شرّے برانگیزد کہ خیرے ما دراں باشد! اگر اُردو کے گھوڑے کو زبردستی ہندی کی گائے یا ہندی اتھوا ہندوستانی کی بھینس ہی کے ساتھ جُتنا پڑتا تو نہ اِس گھوڑے میں یہ خوبصورتی اور پھُرتی رہتی اور نہ غالباً زبان کی گاڑی ہی کبھی رواں ہوسکتی - اب گھوڑا مزے سے اپنے میدان میں دوڑا کرے اور گائے بھینس اپنی چراگاہ میں چرا کریں - لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۝

کیا ہندوستان اور پاکستان کے علیحدہ علیحدہ ملک ہوجانے پر اُردو اور ہندی ان دو ملکوں میں بٹ جائیں گی ؟ بظاہر ایسا ہی معلوم ہوتا ہے،

ہم پاکستان والوں کو ضرورت نہیں کہ ہم اس معاملہ میں ہندوستان میں دخل درمعقولات دیں۔ یو۔پی میں اُردو کو علانیہ طور پر مٹانے
ہم اگست ۱۹۴۷ء ہی میں شروع کر دی گئی۔ ۵ نومبر کو ہندی یو۔پی اسمبلی کی سرکاری زبان بنا دی گئی۔ ستمبر میں دہلی میں انجمن ترقی اُردو (ہند)
تر دن دہاڑے لوٹا گیا۔ سال کے اخیر میں نیشنلسٹ مسلمانوں نے حضرت جوش ملیح آبادی کی زبان سے "صلہ یا سزا" کی فریاد بلند کی کہ "ہمارے
نے ہمارے ساتھ ایک ایسی زبردست دعبرتناک بے وفائی کی ہے جسے ہم نزع کی ہچکی تک معاف نہیں کر سکتے اور وہ ہے ہماری اُردو زبان
تمہ اور شہادت۔ کیا ہم نے اپنے قلم اور اپنی زبان کو استقلالِ وطن کی خاطر اسی لئے استعمال کیا تھا کہ ہمارا قلم توڑ دیا اور ہماری زبان کاٹ
جائے؟ کہاں ہیں اُردو کے نام لیوا؟ قبل اس کے کہ پانی سر سے اونچا ہو جائے ہر ممکن عجلت کے ساتھ بلا تفریقِ مذہب و ملت لکھنؤ میں جمع
ائیں اور انجمنِ تحفظ و ترویجِ اُردو کی بنیاد ڈال کر آندھی کی طرح کام شروع کر دیں اور اس وقت تک دم نہ لیں" وغیرہ وغیرہ جب متحدہ
دستان میں "بلا تفریقِ مذہب و ملت" کا یہ کام نہ ہو سکا اور "پانی بھی سر سے اونچا" ہو گیا تو اب اکھنڈ ہندوستان میں بھلا کیا ہوگا؟ ہندی والوں
راس "آندھی کی طرح کام شروع کرنے" کی آواز سنی ہو گی اور کچھ کہا ہوگا تو یہی کہا ہوگا کہ "چڑھی ہے یہ آندھی اُتر جائے گی"!

سو بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اُردو جو پاکستان کی طرف دھکیل دی گئی ہے ہندوستان میں ختم ہو جائے گی لیکن درحقیقت ابھی اس خلتے کا
اندازہ کرنا مشکل ہے۔ تین چار کروڑ مسلمان اپنی زبان کو چھوڑنے پر مجبور بھی کئے جائیں تو جلد اس سے دست بردار نہ ہو سکیں گے اور صرف
ان ہی نہیں تعلیم یافتہ ہندوؤں کا ایک خاصا گروہ بھی اس معاملے میں شش و پنج میں پڑ جائے گا وہ اُردو کا نام لینا چھوڑ دے اسے ہندوستانی
ندی کہہ لے ناگری رسمِ خط بھی سیکھ لے اور اُسے پسند کرنے لگے لیکن وہ "علم" اور "تعلیم" اور "زبان" اور "تقریر" اور "مطلب" اور "آسانی" اور
ل" سے جلد بے بہرہ نہ ہو سکے گا۔ اور اَن پڑھ ہندو اور سکھ بھی سبال (سوال)، انام (انعام)، ببج (چیز)، متبل (مطلب)، اِجّت (عزت)
(قبضہ) کو جلد نہ چھوڑ سکیں گے اور نہ پرشن، پرتسکار، وستو، پریوجن، آدریہ، ادھکار سے بہت جلد گہرا رشتہ ناتہ قائم کر سکیں گے۔ اور مثلاً
لے کے فارم کو گھسیٹر پیٹر، مٹی کو ماٹی اور پانی کو پانٹری کہنے والا کوئی کوئی تعلیم یافتہ سورما ہی نکلے گا۔

کرشن چندر نے اکتوبر ۱۹۴۷ء میں کل ہند ترقی پسند مصنفین کے خطبۂ صدارت میں کہا تھا کہ "میں اُردو کو مسلمانوں کی زبان نہیں سمجھتا ہوں
ں کے غالب حصے پر مسلم قوم کی تہذیبی چھاپ ہے۔ لیکن سب قوموں نے اس کی آبیاری مل کر کی ہے۔ اگر امریکہ اور انگلینڈ دو مختلف قومیں
لے ہوئے ایک دوسرے سے ہزاروں میل دُور رہتے ہوئے بھی ایک زبان رکھ سکتے ہیں اور اسے اپنی تہذیبی روح کا مرکز بنا سکتے ہیں تو
دوستان اور پاکستان ساتھ ساتھ رہتے ہوئے بھی کیوں اُس زبان کو اپنا نہیں سکتے جسے انھوں نے خود تعمیر کیا ہے پھیلایا ہے آگے بڑھایا ہے
، سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کی مختلف قوموں کو حقِ ارادیت دینے کے باوجود اور دوسری صوبائی زبانوں کو پروان چڑھانے کے باوجود ایک
ں زبان کی ضرورت باقی رہتی ہے جو اس ملک کی تمام قوموں کی زبان بن سکے۔ میرے خیال میں اُردو اس ضرورت کو کماحقہٗ طور پر پورا کرتی ہے
ہیں تمام پریشانیوں اور دقتوں اور مزاحمتوں اور سیاسی مناقشات کے باوجود اس کی ترویج و اشاعت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھنی چاہیئے۔"

حال میں اُردو کے ہندو سکھ ادیبوں کا ایک اعلان "مشترکہ کلچر کی محافظ اُردو زبان" کے حق میں جاری کیا گیا ہے جو رسالہ "ہمارا
سب" (لکھنؤ) کے فروری ۱۹۴۸ء نمبر میں شائع ہوا ہے اس پر سو سے زائد فن کاروں کے دستخط ہیں جن میں مفصلہ ذیل نام بھی شامل ہیں۔ کرشن چندر
ق گورکھپوری، کنھیا لال کپور، تلوک چند محروم، آنند نرائن ملاّ، راجندر سنگھ بیدی، بلونت سنگھ، تخت سنگھ، شمشیر سنگھ، گوربخش سنگھ طالب،
لٹر موہن سنگھ دیوانہ، ہری چند اختر، دوینیدر ستیارتھی، محمود جالندھری، ڈاکٹر تارا چند اور جگن ناتھ آزاد۔ یہ ہندو سکھ ادیب ہند کی مذہبی تقسیم
مخالفت کرتے ہوئے فرقہ وار فسادات اور تبادلۂ آبادی پر احتجاج کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اُردو زبان صرف مسلمانوں سے منسوب کر دی گئی ہے
لانکہ ماضی و حال میں ہندو سکھ ادیبوں نے اُردو ادب کی نشو و نما میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ پھر کہتے ہیں کہ ہمارے ملک کی رجعت پسند طاقتوں کے اُردو کش

اقدام سے ترقی پسند قوتیں ٹھٹک کر رہ گئی ہیں۔ ہندی اور اُردو دونوں زبانوں کا اپنا اپنا مقام ہے۔ دونوں زبانوں نے سماج کے ارتقا اور موجودہ آزادی کے حصول میں گراں قدر حصّہ لیا ہے اور اگر اُردو کو ختم کر دیا گیا تو ہندی تنہا یہ بوجھ نہ اُٹھا سکے گی۔ اس کا موزوں اور خوشگوار حل یہی ہے کہ ان دونوں زبانوں کو دوش بدوش چلنے دیا جائے۔" یہ بحرانی دَور دیر تک نہ رہے گا۔" پاکستان اور ہندوستان کا تہذیبی اور معاشرتی الحاق ضرور ہوگا۔" اِس خواہش کی تکمیل کے لئے اُردو زبان کی بقا اور زندگی اور بھی ضروری ہو جاتی ہے۔" ہم اُردو کے ترقی پسند ہندو سکھ ادیب دونوں ڈومینیوں میں جمہوری رُجحانات کو فروغ دینے کا تہیّہ کئے ہوئے ہیں، اس لئے دونوں ڈومینیوں کی حکومتوں کو چاہیئے کہ وہ ادیبوں اور شاعروں کی ترویج و اشاعت میں اپنے تعاون کی پیش کش کریں۔"

اب نئے حالات کے ماتحت دیکھنا ہے کہ کہاں تک اُردو کے یہ غیر مسلم احباب ہندوستان میں اپنی زبان کا تحفّظ کر سکیں گے اور کہاں تک مسلمانوں کو اُن کی تہذیبی زبان کے برقرار رکھنے کا حق دیا جائے گا۔ لیکن ایک بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ اگر اُردو پاکستان میں کماحقہٗ فروغ پائے گی تو اُس کی رنگ برنگی روشنیاں لازم طور پر خود بخود اُس کی سرحدوں کو پار کر کے اپنی تابانی سے ہندوستان کے ایک حصّے کو بھی منوّر کرتی رہیں گی۔ حسین اور مفید چیز کو کوئی قطعاً مٹا نہیں سکتا، **اُردو کی سودمندی** اور حُسن **ہندوستان میں** بھی اُس کی نشو و نما کا ضامن ہو سکیگا۔ غالب اور حالی اور اقبال اور نظیر اکبر آبادی اور اکبر الہ آبادی کے بیشتر حصۂ کلام کو ہندی رسمِ خط بھی اپنے سایۂ عاطفت میں لینے پر مجبور ہوگا۔ کیا مثلاً ایسے اشعار کو کبھی ہندوستان سے دیس نکالا دیا جا سکتا ہے؟

پڑے بھٹکتے ہیں لاکھوں پنڈت کروڑوں دانا ہزاروں سیانے
جو خوب دیکھا تو یار آخر خدا کی باتیں خدا ہی جانے

زندگی زندہ دلی کا نام ہے
مُردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا؟

کھیتوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا
کچھ کر لو نوجوانو اُٹھتی جوانیاں ہیں

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مُرادیں غریبوں کی بَر لانے والا

دل دے تو اِس مزاج کا پروردگار دے
جو رنج کی گھڑی بھی خوشی سے گزار دے

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے
ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

ذہن میں جو گھر گیا لا انتہا کیونکر ہوا
جو سمجھ میں آگیا پھر وہ خدا کیونکر ہوا

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے؟

اُٹھو مری دُنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو

ہندوستان میں اُردو پر جو گذرے گی سو گزرے گی لیکن یہاں بھی اگر ہم اُردو کو باعزت طور پر پھولتا پھلتا دیکھنا چاہتے ہیں تو اُس کی یہی سبیل ہے کہ ہم پاکستانی اُردو کو اپنی سر آنکھوں پر بٹھائیں اور اُسے ہر طرح مضبوط کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں۔ اس لحاظ سے **پنجاب** یعنی مغربی پنجاب ہی وہ خِطّہ ہے جس کا اُردو پہ حق سب پر فائق ہے اور جس کا **اُردو** کے متعلق اپنا فرض سب سے اہم ہے۔ کیا پنجاب نے تقسیم ملک سے برسوں پہلے مدت سے اُردو کے لئے اپنی آغوش وا نہیں کی؟ اپنی بولی کو نظر انداز کر کے بھی اس سے محبت نہیں کی؟ جبھی تو ایک الہ آبادی شاعر نے بے اختیار کہہ دیا تھا کہ **"مرکزِ زبانِ اُردو کا لاہور ہو گیا"**۔ یاد ہوگا کہ آزاد اور حالی نے کہاں آ کر اپنی نئی شاعری کی بنیاد رکھی؟ سید ممتاز علی نے کہاں آ کر "تہذیبِ نسواں" جاری کیا؟ سینکڑوں اور اہلِ زبان یہاں آ گئے۔ کیا آج بھی جو اہلِ زبان دہلی لکھنؤ وغیرہ سے ہجرت کر کے اِدھر آئے ہیں

اور قومی زبان کی خدمت کرنا چاہتے ہیں ہم اُن کا خیر مقدم نہ کریں گے؟ حالات ذرا درست ہو جائیں تو زندہ دلانِ پنجاب یقیناً اپنی صدق دلی و مروّت اور اُردو دوستی کا بیش از پیش ثبوت دیں گے۔ اور یہ کچھ اہلِ زبان پر احسان نہ ہوگا۔ پنجاب کو خود اُردو کی ضرورت ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی کو ایک پالا پوسا ہوا بچہ مل جائے اور بچہ نہیں بلکہ ایک ہوشیار و تنومند نوجوان دوست مل جائے جو عزیزوں سے بڑھ کر ہماری محبت کا دم بھرے اور ہمیں اپنے گرد و پیش کے حالات سے بخوبی آگاہ رکھے۔

پنجاب کو اُردو کی بے حد ضرورت ہے اتنی ضرورت کہ اس کے بغیر وہ ایک مہذب و ترقی یافتہ زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اوّل تو خود اُردو ہی پنجابی کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے؛ اُردو یہیں لاہور میں پیدا ہوئی۔ چنانچہ اندازہ کیا گیا ہے کہ اُردو اور پنجابی میں ۶۰ فی صدی الفاظ مشترک ہیں، دوسرے پچھلے نو سو سال میں آٹھ سو سال تک فارسی یہاں کی سرکاری و عدالتی زبان رہی اور پھر ایک سو سال سے اُردو نے اُس کی جگہ لے لی، خود سکھوں کے عہد میں بھی فارسی ہی یہاں کی حکومت کی زبان تھی اور وہی تہذیب و تعلیم کا ذریعہ تھی۔ تیسرے پنجاب میں پنجابی بولیوں اور اُردو کا وہی تعلق ہے جو آٹھ نو سو سال ہوئے انگلستان میں اینگلو سیکسن بولیوں اور انگریزی کا تھا۔ یعنی زبان کے لحاظ سے اُردو یہاں ایک قدرِ مشترک ہے۔ پنجابیوں کی تعلیم اور خط و کتابت کی زبان اُردو ہی ہے۔ ایک اَن پڑھ پنجابی دوسرے اَن پڑھ پنجابی کو اُردو میں خط لکھواتا ہے۔ مغربی پنجاب میں بھی لاہور والے بعض اضلاع کی پنجابی اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جب آج سے تیس پینتیس برس ہوئے میں ضلع مظفر گڑھ میں اپنی اراضیات دیکھنے گیا تو میں وہاں کی "ڈاہ ڈاہ تے ڈوہ" والی پنجابی بولی کو بہت کم سمجھ سکا اور جب مجھے غلط فہمی کا اندیشہ ہوا تو میں بہت جلد اُردو بولنے پر مجبور ہو گیا اور اسی طرح وہ لوگ اور میں ایک دوسرے کو بخوبی اور بآسانی اپنا مطلب سمجھا سکے۔ پنجاب کے شہروں میں عموماً ایک پنجابی دوسرے پنجابی سے کبھی پنجابی اور کبھی اُردو میں باتیں کرتا نظر آتا ہے۔ کہیں کہیں تعلیم یافتہ لوگوں نے پنجابی کو چھوڑ کر اُردو اختیار کر لی ہے۔ اس بارے میں اپنے گھر میں خود میرا تجربہ پوری طرح قابلِ تقلید تو نہیں لیکن دلچسپ ضرور ہے۔ جب تقریباً ستائیس برس ہوئے ہمارے یہاں پہلا بچہ پیدا ہوا تو اس خوشی میں ہم نے یہ ارادہ کیا کہ ہم اپنے بچے سے اُردو میں باتیں کیا کریں گے۔ چنانچہ ہم نے ایسا ہی کیا اور آج المنظر میں ایک عجیب نظارہ دیکھنے میں آتا ہے کہ میاں بیوی ایک دوسرے سے پنجابی میں بول رہے ہیں کہ لڑکی یا لڑکا بیچ میں آ جاتا ہے تو زبانوں کی مزید ار کھچڑی پکنے لگتی ہے، لڑکے لڑکی سے بے تکلف اُردو میں باتیں ہوتی ہیں اور آپس میں پھر پنجابی میں۔ پنجابی اُردو انگریزی کی یہ ملاوٹ ذوقِ سلیم کے لئے لُطف دِہ نہیں لیکن اتنا ضرور ہے کہ اس میں تکلّف کو مطلق دخل نہیں۔ میرے لئے اپنی بیوی سے پنجابی میں بات کرنا اسی قدر فطری اور پُر لطف ہے جس قدر بچوں سے اُردو میں باتیں کرنا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اگر تعلیم یافتہ پنجابی ذرا بھی توجہ کریں تو اپنی بولی کو بڑی حد تک اُردو بنا سکتے ہیں اور "اُردو بولو" کی تحریک پنجاب میں بتدریج کامیاب ہو سکتی ہے۔ اس کے لئے تعلیم اور توجہ اور قومی جذبے کو پھیلانے کی ضرورت ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس میں صبر اور ہمدردی اور رواداری بھی درکار ہے۔ اُردو میں پنجابی غلطیاں آہستہ آہستہ ہی دُور ہو سکتی ہیں "میں نے جانا ہے" کی طرح کی بعض غلطیوں کو تو اب غلطی نہ سمجھا جائے تو شاید بہتر ہوگا۔ لب و لہجہ بھی اپنے بس کی بات نہیں بلکہ لب و لہجہ اپنا ہی رہے تو بے تکلفی سے اُردو کا آزادانہ استعمال ہوگا۔ اس بارے میں اہلِ زبان کو تعلیم یافتہ پنجابیوں سے اور تعلیم یافتہ اصحاب کا اَن پڑھ لوگوں سے فراخ دلی کا سلوک کرنا قرینِ مصلحت ہے۔

آخیر میں یہ سب سے ضروری سوال پیدا ہوتا ہے کہ اُردو پنجاب بلکہ پاکستان بھر میں کیسے رائج کی جائے اور اُسے کس طرح ترقی دی جائے؟

اِس میں شبہہ نہیں کہ پاکستان کو بھی اُردو کی اتنی ضرورت ہے جتنی اُردو کو پاکستان کی، بالعموم کوئی قوم بغیر اپنی قومی زبان کے متحد و منظم

نہیں ہو سکتی۔ پاکستان کے پانچوں صوبوں میں پانچ مختلف زبانیں رائج ہیں اِن کو یکجا کرنے کے لئے ایک مشترک زبان کی اشد ضرورت ہے اور وہ زبان اُردو کے سوا کوئی دوسری نہیں ہو سکتی۔ پاکستان کی تعمیر لازم طور پر اسلام، اسلامی تہذیب اور اسلامی تہذیب کی مظہر اُردو ہی کی بنیاد پر استوار ہو سکتی ہے۔ اس بنیاد کے بغیر پاکستان بے معنی بھی ہے اور اُس کا قیام و استحکام بھی ممکن نہیں۔ اس لئے یہ بات مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے اولیں فرائض میں شامل ہونی چاہیئے کہ وہ عوام کو اُردو کی قومی اہمیت سے آگاہ کریں اور سمجھائیں کہ ہر سچّے پاکستانی کے لئے اُردو سیکھنی لازم ہے اور جو اُردو سے بے اعتنائی کرتا ہے وہ فی الحقیقت پاکستان سے بے اعتنائی کرتا ہے۔

یہ ہے **اُردو کی طاقت** پاکستان میں لیکن اُدھر اِس کی ایک **کمزوری** بھی ہے جسے ہمیں دُور کرنا ہے اور وہ یہ ہے کہ اُردو پاکستان کے کسی صوبے کی مادری زبان نہیں۔ پاکستان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے صوبوں میں اُردو کی تعلیم پھیلائے اور بتدریج اپنے باشندوں کو اُس سے آشنا کرے۔ اور اُردو کے لئے ضروری ہے کہ اُس کی ایک ٹکسال یا اکاڈمی قائم ہو جو صحتِ زبان اور توسیعِ زبان کی ضامن بنے اور اِس مطلب کے لئے تمام ضروری ذرائع استعمال میں لائے۔

فی الحال **صوبائی زبانیں** یا بولیاں اپنی اپنی جگہ قائم رہیں گی، اس میں ایک طرف بنگال ہے جہاں عام طور پر بنگالی کا دَور دَورہ ہوگا، تو وہاں بھی اُردو کو ایک لازمی زبان کی حیثیت مل جائے گی۔ اور دوسری طرف پنجاب ہے جہاں اُردو تقریباً ہر شعبۂ زندگی میں جاری و ساری ہو سکتی ہے۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ اُردو زبان و ادب کی جہاں بہت سی خوبیاں ہیں وہاں کئی کمیاں بھی ہیں۔ بے شک اُردو بہت ترقی کر چکی ہے، اُس کا ادب اور خصوصاً اُس کی شاعری دلکش ہے لیکن بہ حیثیت ایک آزاد اور ترقی چاہنے والے ملک کی قومی زبان کے جسے دنیا میں بڑے اور ترقی یافتہ ملکوں کے دوش بدوش کھڑا ہونا ہے اُردو زبان و ادب میں ابھی بہت سی کمیاں ہیں جن کا دور کرنا ہماری حکومت کا اور ہمارا فرض ہے۔ یہ کام صرف مسلسل توجہ اور مسلسل محنت سے ہو سکتا ہے۔ ایک زمانے میں اُردو کا رجحان ہندی کی طرف رہا پھر فارسی کی طرف ہوا، پھر انگریزی کی طرف، اب آزاد ہو کر وہ کیا رنگ اختیار کرے گی؟ اب اُسے صرف انگریزی سے خوشہ چینی نہیں کرنی اب اُسے دنیا کی مختلف زبانوں سے استفادہ کرنا ہوگا۔

اُردو کی ضروریات متعدد ہیں۔ لسانی ضروریات کے تحت میں ہمیں الفاظ سازی، اصطلاحات، توسیعِ زبان، صحتِ زبان اور آسانیٔ اظہار وغیرہ کی طرف توجہ دینا ہے۔ اس کے لئے ایک اکاڈمی کا قیام ضروری ہوگا۔ علمی و ادبی ضروریات کے ضمن میں مختلف علوم و فنون میں ترجمہ و تالیف و تصنیف کا کام کرنا ہے۔ تنقید نا اقتساب بھی انہیں سے متعلق ہیں نیز اس قسم کے ادبی نکتے کہ ہماری تلمیحات میں کہاں تک تبدیلی یا اضافے کی حاجت ہے۔ طباعتی ضروریات میں رسمِ خط کی اصلاح، ٹائپ کا مسئلہ وغیرہ امور قابلِ غور ہیں۔ اشاعتی ضروریات میں اُردو کو مقبولِ عام بنانا، تعلیم کو عام کرنا، زبان سیکھنے سکھانے کی آسانیاں پیدا کرنا اور نشر و اشاعت کی بہت سی دوسری راہیں نکالنا ہے۔ اُردو سیکھنے کے سلسلے میں ہمیں نہ صرف اپنے اَن پڑھ بھائیوں کو پڑھانا ہے بلکہ ضرورت سے زیادہ انگریزی پڑھے ہوؤں کو بھی، جن کی اُردو نوازی کا یہ عالم ہے کہ یوں تو

پیتے ہیں سبق ہنوز in The language of [illegible]   لیکن یہی کہ is went گیا اور was تھا!

ترقیٔ اُردو کے پروگرام میں مرکزی حکومت اور صوبائی حکومتوں کو اپنی اپنی جگہ کام کرنا ہوگا۔ سب سے پہلے **مرکزی حکومت** پاکستان کو فوراً اعلان کرنا چاہیئے کہ اُردو ہی پاکستان کی قومی و ملکی زبان ہے۔ اس سلسلے میں یکم دسمبر ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی تعلیمی کانفرنس میں قرار پایا کہ اُردو کو پاکستان کی لنگوا فرنکا تسلیم کیا جائے نیز اُردو کو سکولوں میں بطور ایک لازمی مضمون کے پڑھایا جائے۔ اور ۲۵ فروری ۱۹۴۸ء کو دستور ساز اسمبلی میں وزیر اعظم پاکستان نے **اعلان** کیا کہ "پاکستان کی ملکی زبان اُردو ہے اور کسی اور زبان کو یہ حیثیت حاصل نہیں"۔ اور پھر کہا کہ "ہمارے لئے یہ زندگی اور موت کا

سوال ہے۔" وزیر اعظم مشرقی بنگال نے اس کی پرزور تائید کی اور گو بنگال کے بعض مفسدہ پرداز اور تنگ نظر لوگوں نے اُردو کے خلاف اپنی آواز اٹھانے کی ناکام کوشش کی ہے اور ممکن ہے کہ آئندہ بھی کریں لیکن یہ ظاہر ہے کہ وہاں بھی بہت جلد انگریزی کی جگہ اُردو کو لینی ہوگی۔ اُردو سکولوں میں بطور ایک لازمی مضمون کے پڑھائی جائے گی اور مرکزی و صوبائی حکومتوں اور بالخصوص دوسرے پاکستانی صوبوں کے عوام سے رابطہ پیدا کرنے کے لئے بہت جلد بنگال کو اُردو ہی کا سہارا ڈھونڈنا پڑے گا۔ قومی ربط و ضبط کا یہ مرحلہ جلد یا بدیر اسی طرح طے ہوگا۔

حال ہی میں (۲۸ فروری کو) پہلے پاکستانی بجٹ پر بحث کے دوران میں مرکزی حکومت نے جو **اقبال اکاڈمی** قائم کرنے کا اعلان کیا ہے اِس سے صاف ظاہر ہے کہ مرکزی حکومت قومی انضباط کے سلسلہ میں علامہ مرحوم کے اسلامی و اجتماعی نظریات اور اُردو کی اہمیت سے بخوبی آگاہ ہے۔ اقبال ہی تھا جس نے سب سے پہلے پاکستان کا نصب العین قوم کے سامنے پیش کیا اور پھر اُس نے اپنے کلام میں اسلامی قومیت کے قیام و استحکام کی لوازمات پر روشنی ڈالی اور سمجھایا کہ ؎

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں ۔۔۔ جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
ولایت، پادشاہی، علمِ اشیا کی جہانگیری ۔۔۔ یہ سب کیا ہیں فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں

اِس لئے اپنے عزیز وطن کے اس شاعرِ اعظم کے خیالات و تصورات سے ہر پاکستانی کا بخوبی آگاہ ہونا حُبّ الوطنی کا ایک ضروری جزو قرار پایا ہے یعنی بنگال کے پاکستانیوں کو بھی اقبال سے اپنی حُبِ اسلامی کی پیاس بجھانی اور اپنی تعمیرِ حیات کے جذبے کو تقویت دینی ہے۔ علاوہ ازیں چونکہ مرکزی حکومت کو اپنے محکموں میں بجائے انگریزی کے اُردو رائج کرنی ہوگی اِس لئے اُسے جلد اپنے تعلیمی محکمے میں ایک **شعبۂ اُردو** کا اضافہ کرنا چاہیئے جو اُردو کو عملاً قومی زبان بنانے کا کام اپنے ذمہ لے۔ اس کے ذرائع و وسائل پر غور کرے اور صوبائی حکومتوں کو بھی اس اہم مسئلے کی طرف متوجہ کرے۔ مختلف صوبوں کے حالات مختلف ہیں اور وہاں اُردو کا کام لازماً مختلف طور پر ہوگا۔ چنانچہ پنجاب کے سوا دوسرں صوبوں میں اُردو اخبارات و رسائل کا اجرا، آسان اُردو کتابوں کی اشاعت اور اُردو کا مسلسل پروپیگنڈا ضروری ہوگا۔ خاص طور پر بنگال میں اُردو کے کام میں محنت و استقلال اور تالیفِ قلوب کی ضرورت پڑے گی۔ اُردو سے بنگالی اور بنگالی سے اُردو میں ترجمہ کرنے اور بنگالی کو اُردو رسمِ خط میں لکھنے کی طرف توجہ کرنی مفید ثابت ہوگی۔ سندھی، پشتو بلکہ پنجابی سے بھی سختی یا بے اعتنائی کا سلوک کرنے کی ضرورت نہیں، اگر ان زبانوں کے بولنے والے اپنی بولیاں پسند کریں، اپنے دیہاتی گیت گائیں، اپنے مقامی محاورات بھی استعمال کریں تو اُردو کے بہی خواہوں کو ان باتوں میں رکاوٹ پیدا نہ کرنی چاہیئے۔ کون سا پنجابی ہیر رانجھا یا سوہنی مہینوال کو مٹتے ہوئے دیکھنا پسند کرے گا۔ ان معاملات میں رواداری بلکہ حوصلہ افزائی اُردو کے حق میں مضر نہیں بلکہ ایک حد تک مفید ثابت ہوگی۔ جب ہم لوگوں کو اُن کے مقامی تعلقات میں آزاد چھوڑ دیں گے تو وہ تسکین پاکر زیادہ آسانی سے اپنے قومی و اجتماعی فرائض کو پورا کرسکیں گے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ حکومت کی طرف سے اور نجی تعلیمی و ادبی اداروں کی طرف سے اُردو کو قوم کے سب طبقوں میں پھیلانے اور ہر دلعزیز بنانے کا کام شب و روز جاری رہنا چاہیئے تاکہ اُردو کی ترقی کے لئے ایک سازگار قومی فضا پیدا ہو جائے۔

پنجاب کو **ترقیِ اُردو** کے قومی کام میں سب سے بڑھ کر حصّہ لینا ہے۔ متحدہ ہندوستان میں بھی پچھلی نصف صدی کے دوران میں صرف پنجاب ہی وہ صوبہ تھا جہاں انگریزی کے بعد دفتری، عدالتی اور تعلیمی زبان صرف اُردو تھی۔ اور اب پاکستان کے قیام کے بعد جب ہندی گورمکھی والوں کی رکاوٹیں رستے سے ہٹ چکی ہیں تو کوئی امر مانع نہیں کہ پنجاب والے متفق طور پر اُردو کی خدمت پر آمادہ نہ ہوجائیں۔ صحیح یہ ہے کہ اب اُردو کا سب سے بڑا دائرۂ عمل پنجاب ہے اور اُردو کا اصلی مرکز لاہور ہی ہوسکتا ہے۔ اس لئے اہلِ پنجاب کو فوراً اپنی حکومت اور عوام کی زندگی کے ہر شعبے میں اُردو کو عملی طور پر جاری کردینا چاہیئے۔ سب سے پہلے **حکومتِ پنجاب** کو چاہیئے کہ اُردو کو عملاً صوبے کی دفتری، عدالتی اور تعلیمی زبان

بنانے کا کام فوراً شروع کر دے۔ پنجاب اسمبلی کی زبان بھی اُردو اور صرف اُردو ہو۔ سرکاری طور پر اس پر عمل درآمد کرنے کے لئے تعلیمی وزارت میں ایک شعبۂ اُردو ہونا چاہیئے۔

دوسرے **محکمۂ تعلیم** کا فرض ہے کہ وہ سکولوں میں مکمل طور پر اُردو کو ذریعۂ تعلیم بنائے۔ جس قدر جلد ہو سکے لازمی اور مفت تعلیم رائج کرے جس کا ایک ضروری جزو مذہبی تعلیم ہو، تعلیم بالغاں کی مہم کو پھر چلائے۔ سکولوں کے ذریعے سے "اُردو بولو" کی تحریک شروع کرے۔ گشتی کتب خانے صوبے بھر میں پھیلا دیئے جائیں، اُردو تقریر و تحریر کے انعامی مقابلے ہوں، پاکستانی نصب العین اور قومی ضروریات کو مدِ نظر رکھ کر نیا درسی اور عوامی ادب پیدا کیا جائے جس کے لئے محکمے کے تحت میں ایک محکمۂ تصنیف و تنقید قائم ہو۔ سکولوں میں ابتدا سے اخیر تک اُردو ایک لازمی مضمون ہو اور انگریزی کا پڑھنا ہر طالب علم کے لئے ضروری نہ رہے۔

اُدھر **یونیورسٹی** کا فرض ہے کہ وہ جلد سے جلد قومی و اسلامی خیالات کی روشنی میں تعلیم کے نصاب کو از سرِ نو اُردو میں مرتب کرے، یاد رہے کہ دفتری و تعلیمی تمام شعبوں میں ہمیں حیدر آباد کی مساعی سے بیش بہا مدد مل سکتی ہے۔ کالجوں میں بھی اُردو ذریعۂ تعلیم ہونے کے علاوہ ایک لازمی مضمون ہو۔ یوں ہمیں انگریزی کی غلامی سے رہائی ملے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ غیر ملکی زبانیں سیکھنے کی ترغیب نہ دی جائے۔ بطور ایک آزاد قوم کے ہمیں دُنیا سے پہلے سے بھی زیادہ رابطہ قائم کرنا ہے۔ یونیورسٹی میں اُردو کا ایک محکمۂ ترجمہ اور تصنیف و تالیف کے لئے قائم کرنا چاہیئے نیز اُردو کی ایک وسیع اور شاندار لائبریری۔ علمی تحقیق کے لئے آسانیاں فراہم کی جائیں۔ انعامی مقابلے ہوں اور اُردو تصنیفات پر معقول معاوضہ اور انعام بھی دیا جائے۔

یہ تو سرکاری اور نیم سرکاری ادارے ہیں۔ اِن کے علاوہ **علمی و ادبی انجمنیں** جس طرح اُردو علم و ادب میں دلچسپی لیتی رہی ہیں اب موقع ہے اور ضرورت کہ وہ پہلے سے بہت زیادہ تن دہی، یکسوئی اور حُبِّ قومی کے بے پناہ جذبے کے ماتحت اپنے کام میں ایک نئے انداز اور ساتھ ہی ایک نئے پروگرام کے ساتھ منہمک ہو جائیں۔ اب ادبی حلقوں کا مقصد علمی زندگی سے فرار نہ رہے، اب شاعروں کا کام محض تفریحِ طبع نہ ہو اب ایوانِ ادب میں" وہ برہنہ جسم اب تک یاد ہے" نہ سنا جائے بلکہ یہ کہ" دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا"! یہ انجمنیں اور حلقے اگر ایک طرف علمی تحقیق و تفحص اور ادبی تخلیق و تنقید میں مصروف ہوں تو دُوسری طرف ان کا کام حکومت اور محکمۂ تعلیم اور یونیورسٹی کی کارکردگی میں دلچسپی لینا اور کبھی اُن پر کڑی مگر منصفانہ نکتہ چینی اور کبھی اُن کی مناسب حوصلہ افزائی کرنا ہو۔

آج کل ہم سیاسی رہنماؤں کا بہت شور و غل سُنتے ہیں لیکن **علما و اُدبا** کی مساعی بھی کسی قوم کو بنا اور بگاڑ سکتی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ اُن کی سرگرمیوں کے نتائج جلد جلد نظر آتے ہیں اور اِن کی کاوشیں ذرا دیر میں بار آور ہوتی ہیں۔ سیاست دانوں اور ادیبوں کے علاوہ اپنی قومی زبان کی اشاعت کرنا ہر **ہوش مند شہری** کا فرضِ منصبی ہونا چاہیئے۔ اس سے صحیح قسم کی تعلیم پھیل سکے گی اور یہی صحیح قومی تربیت کا واحد ذریعہ ہوگی۔ معلوم ہوا ہے کہ جبری فوجی خدمت کی طرح ہندوستان میں عنقریب ہر تعلیم یافتہ شخص سے جبراً کچھ مدّت کے لئے معلّمی کا کام لیا جائے گا، پاکستان کو چاہیئے کہ وہ بھی جلد اپنے ہاں یہ قانون رائج کرے۔ حصولِ تعلیم کے علاوہ عوام کو ترغیب دی جائے کہ وہ اُردو اخبارات اور کتابیں خریدیں اور جہاں تک ہو سکے اُردو میں گفتگو کریں۔ نجی اور تجارتی خط و کتابت انگریزی دان بھی عموماً اُردو میں کیا کریں اور ہمارے مصنفین بلکہ ہو سکے تو ہمارے شعرا بھی اُن موضوعات کی طرف متوجہ ہوں جو ہماری قوم کے لئے حیات بخش اور روح پرور ثابت ہوں نہ کہ غم افزا اور یاس انگیز! اُدھر ہمارے **اخبارات** تنگ نظرانہ خردہ گیری سے پرہیز کرتے ہوئے عام قومی مسائل کا حل پیش کریں اور آسان زبان اور سیدھے سادھے طرزِ بیان سے اپنے عوام سے ربط پیدا کرنے کی کوشش کریں اور ہمارے **رسائل** نہ صرف قوم کے علم و ادب کی تخلیق و اشاعت کریں بلکہ وہ قوم کے اخلاق کو جِلا دیں، قوم کے حوصلے کو بلند کریں اور اُسے آزادی

انی کے صحیح تصور سے آشنا کردیں!

ہماری قومی زبان کی داستان ختم ہوئی، اس رنگین داستان کے خاتمے پر اُردو کے ایک زندہ و زندہ دل شاعر کا یہ پیغام بے اختیار آتا ہے ؎

ہم نفس! عہدِ سلف کی یاد خوانی ہو چکی
چھوڑ اس قصّے کو رنگیں داستانی ہو چکی
کارنامے اگلے لوگوں کے کہاں تک گایئے
کرکے بھی دکھلایئے گا کچھ کہانی ہو چکی
کام کے میدان کی اب کھایئے چل کر ہوا
یعنی سیرِ باغِ الفاظ و معانی ہو چکی
ترجمہ کیجے عمل میں بھی اب اپنے علم کا
نکتہ سنجی ہو چکی معجز بیانی ہو چکی

صحنِ بُستاں اب بھی ہے فصلِ بہاراں اب بھی ہے
پھول خنداں اب بھی ہے بُلبُل غزل خواں اب بھی ہے
یاد رکھو لیس للانسان الا ما سعیٰ
کل جو نافذ تھا وہی آئینِ یزداں اب بھی ہے
کان اب بھی ہے وہی ہیرے نکلتے تھے جہاں
جس سے کل موتی برستے تھے وہ نیساں اب بھی ہے
آج بھی موجود ہے اگلوں کا تھا جو رہ نما
وہ حدیثِ ہادیٔ برحق وہ قرآں اب بھی ہے
طُور لبریزِ تجلّی دیدۂ موسیٰ کجاست؟
حسنِ عذرا جلوہ پیرا وامقِ شیدا کجاست؟

بشیر احمد

(پنجاب یونیورسٹی اُردو کانفرنس میں بتاریخ ۱۴ مارچ ۱۹۴۲ء پڑھا گیا)

پاکستان میں اردو

پاکستان میں اردو کی اہمیت کا سرسری طور پر تو ہر شخص کو احساس ہے۔ لیکن میرے خیال میں ابھی اس مسئلے کے حل کی ہی نہیں۔ بلکہ اسکی نوعیت کے تفصیلی تجزیہ کی ضرورت قائم ہے۔ تقسیم ہند سے پہلے جو فرض کر لیا جاتا تھا۔ کہ پاکستان کے وجود میں آتے ہی زبان کا مسئلہ خودبخود حل ہو جائیگا اور اردو اس نئے ملک کی عمومی زبان بن جائیگی۔ تازہ ترین حقائق کے پیش نظر یہ اُمید اتنی سہل الحصول معلوم نہیں ہوتی۔ یہ کہنا غالباً غلط نہیں ہوگا۔ کہ اردو کے پاکستان کی قومی اور تعلیمی زبان بننے کی راہ میں اب بھی قریب قریب ویسی ہی دشواریاں حائل ہیں۔ جیسی تقسیم ہند سے پہلے تھیں۔ بلکہ اس تقسیم سے ایک بنیادی دقت کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اردو پاکستان کے کسی صوبہ کی زبان نہیں ہے۔ ان معنوں میں جن میں وہ دہلی یوپی اور مشرقی پنجاب کے ایک حصہ کی زبان تھی۔ اس دقت کی زیادہ اہمیت اس لئے ہے۔ کہ کسی زبان کے زندہ رہنے کیلئے ضروری ہے کہ وہ ایک معتدبہ گروہ کی روزمرّہ کی بولی ہو۔ ورنہ زبان کا پودا گویا تازہ ہوا سے محروم ہو جاتا ہے۔ مشرقی پنجاب کے پاکستان سے نکل جانے کا جو نقصان پاکستان کو سیاسی طور پر ہوا ہے۔ میرے خیال میں اسی کے برابر یہ نقصان بھی ہے کہ ایک ایسا علاقہ جاتا رہا جو پاکستان میں اردو زبان کا زندہ مرکز بن سکتا تھا۔ میرے خیال میں اب ہمارے سامنے مسئلہ صرف یہی نہیں ہے کہ اردو کو ترقی کیسے دی جائے۔ بلکہ مسئلہ کی بنیادی حیثیت یہ ہو گئی ہے۔ کہ اردو بولنے والی نسلیں کیسے پیدا کی جائیں۔ اس کے علاوہ ایک سوال زبان کے معیار کا ہے۔ مشرقی پنجاب کے ہوتے ہوئے ممکن تھا کہ اس علاقے کی زبان پاکستان کی معیاری زبان بن جاتی۔ اب دہلی اور لکھنؤ کی مرکزیت ٹوٹ جانے سے پاکستان کیلئے اردو کی کوئی ٹکسال نہیں رہی۔

اس بنیادی دقت کے علاوہ اردو کے پاکستان کی زبان بننے میں جو دقتیں ہیں۔ اُن کی فہرست بھی خاصی طویل ہے۔ پاکستان کی آبادی کا تقریباً دو تہائی حصہ مشرقی بنگال میں ہے۔ اور اس علاقے کے باشندوں کا رویّہ اردو زبان کے متعلق کچھ بہت ہمدردانہ نہیں کہا جا سکتا۔ اس کی وجوہات جائز ناجائز ہر طرح کی ہیں۔ جائز وجوہات میں سے ایک یہ ہے کہ بنگال کا رسم خط دیوناگری ہے۔ جس کا عربی رسم خط سے اختلاف پاکستان کے وجود میں آنے سے پہلے ہی مخاصمت کا رنگ اختیار کر گیا تھا۔ بنگال کا ذخیرۂ الفاظ بھی اردو کی نسبت ہندی سے قریب تر ہے۔ لیکن ان لسانی وجوہات کے علاوہ بنگال کے رویّہ میں کسی قدر دخل اس حقیقت کا بھی ہے۔ کہ اہل بنگال کو اپنی صوبجاتی زبان پر، جو قابل قدر ادبی ذخیرہ کی مالک ہے، بہت فخر ہے اور غالباً انہیں یہ بھی احساس ہے، کہ اگر اردو کو پاکستان کی قومی زبان بنا دیا گیا تو مغربی پاکستان کے صوبوں بالخصوص پنجاب کو ایک قدرتی فائدہ حاصل ہو جائیگا۔ جس کا انہیں کوئی حق نہیں ہونا چاہئیے۔ بہر حال جو وجوہات بھی ہوں، بنگال کا موجودہ رویّہ پاکستان میں اردو کے عمومی رواج کیلئے سدّراہ ضرور ہے۔ اور اگر بالفرض بنگال اردو کو قبول بھی کر لے تاہم یہ مسئلہ حل طلب رہیگا کہ مغربی اور مشرقی پاکستان میں جغرافیائی بُعد کے باوجود زبان کی یکساں ترقی کن وسائل سے ممکن بنائی جا سکتی ہے۔ کیونکہ پاکستان کو ایک ہی اردو کی ضرورت ہے۔ دو کی نہیں۔

پھر یہ بھی ظاہر ہے۔ کہ پاکستان کے صوبوں کیلئے یہ مشکل ہوگا کہ صوبجاتی زبانوں سے جو آبادی کے بیشتر حصّے کی مادری زبان کی حیثیت رکھتی ہیں یک قلم قطع تعلق کر لیں۔ اس صورت حال میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اردو کا صوبجاتی بولیوں سے کیا رشتہ ہوگا۔ اور کتنے عرصے تک یہ کیفیت رہیگی کہ اردو کو اپنا اقتدار قائم کرنے اور اپنی صحیح جگہ حاصل کرنے کیلئے صوبجاتی زبانوں کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔

کیا اُردو کی حیثیت ثانوی زبان کی رہے گی۔ اور صوبجاتی بولیوں کی حیثیت بنیادی زبانوں کی یا اس کے برعکس۔

اس سلسلے میں ایک اُلجھن ایسی ہے۔ جسکا تعلق ایک طرف ہماری گذشتہ یک صد سالہ تاریخ سے ہے۔ اور دوسری طرف ہمارے بین الاقوامی تعلقات سے ہے۔ یہ اُلجھن انگریزی کے اس غیر معمولی اثر سے پیدا ہوئی ہے۔ جو اسے ہماری زندگی کے مختلف سرکاری تعلیمی اور تہذیبی شعبوں میں حاصل ہے۔ ابھی ایک عرصہ تک انگریزی سے یکسر قطع تعلق کرنا تو ممکن نظر نہیں آتا۔ لیکن آخرکار ایک دن اُردو کو انگریزی کی جگہ لینی ہے۔ اور ہمارے سامنے نہ صرف یہ مسئلہ درپیش ہے۔ نہ اس تبدیلی تک پہنچنے کیلئے کتنا عرصہ درکار ہوگا۔ اور ہمیں کن کن منزلوں سے گزرنا پڑیگا۔ بلکہ یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے۔ کہ پاکستان کیلئے بین الاقوامی معاملات کی زبان بھی اُردو ہوگی۔ یا کوئی اور زبان مثلاً انگریزی۔ موجودہ صورت تو یہ ہے۔ کہ ہم بین الاقوامی مذاکرات اور مراسلات میں انگریزی زبان استعمال کرتے ہیں۔ کیا ہم اس صورت کو قائم رکھنا پسند کرینگے یا اُردو یہ جگہ بھی حاصل کرے گی۔

یہاں تک میں نے مسئلہ کے صرف اس پہلو کا ذکر کیا ہے۔ جسکا تعلق اُردو کو پاکستان کی قومی اور بین الاقوامی زبان بنانے سے ہے۔ لیکن اس مسئلے کے کچھ اور پہلو بھی ہیں۔ جن میں بحالات موجودہ شاید سب سے زیادہ اہم یہ ہے۔ کہ پاکستان میں ذریعہ تعلیم کونسی زبان ہوگی۔ اگر اُردو کو پاکستان کی قومی اور تعلیمی زبان بنانا منظور ہو تو دیکھنا یہ ہے۔ کہ اسے عملی جامہ کتنے عرصے میں پہنایا جا سکتا ہے۔ بحیثیت تعلیمی زبان کے اس مسئلے کی تین شاخیں ہیں۔ مدرسے کی زبان یونیورسٹی کی زبان اور تعلیم بالغاں۔ ان تینوں پر علیحدہ علیحدہ غور کی ضرورت ہوگی۔ اس سلسلے میں یہ سوال بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ کہ آیا ذریعہ تعلیم کا فیصلہ صوبجاتی حکومتوں کے جواب پر چھوڑ دیا جائیگا۔ یا مرکزی حکومت اسے اپنی ذمہ داری قرار دیگی (موجودہ نظام کے ماتحت تعلیم ایک صوبجاتی محکمہ ہے) مسئلہ کے اس پہلو یعنی اردو کی تعلیمی حیثیت کے سلسلے میں بھی انگریزی اردو قضیئے کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ علوم و فنون کی اعلےٰ منزلوں کیلئے اس وقت ہمارے پاس اُردو کا ذخیرہ ناقابل ذکر ہے۔ اور انگریزی کا یا کسی اور مغربی زبان کا سہارا ڈھونڈنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

ذریعہ تعلیم سے گزر کر "پاکستان میں اُردو" کے مسئلہ پر کا تیسرا پہلو اس کی علمی اور ادبی حیثیت کا ہے۔ یہاں سوال یہ ہے کہ پاکستان میں اُردو کا بحیثیت علمی اور ادبی تصنیف کی زبان کے کیا مستقبل ہے۔ اس سوال کا جواب بہت حد تک تو اس پر منحصر ہے۔ کہ اُردو کی حیثیت قومی اور تعلیمی زبان کے لحاظ سے کیا ہوگی۔ لیکن مسئلے کے اس پہلو کی اپنی علیحدہ حیثیت بھی ہے۔ مثلاً یہ کہ اُردو میں علمی تصانیف کا معقول اور مستقل ذخیرہ پیدا کرنے کے کیا ذرائع اختیار کرنے چاہیئیں۔ پھر ادبی تصنیف و تالیف کے کام میں وہی مشکل حائل ہے جسکا ذکر قومی زبان کے مسئلہ کے سلسلہ میں ہو چکا ہے۔ ادبی تخلیق بالخصوص ناول، افسانہ اور ڈرامہ ایک زندہ روزمرہ کے بغیر ناممکن ہے۔ دہلی اور لکھنؤ کا روزمرہ جو اس وقت ہمارے کتابی ذخیرہ میں موجود ہے۔ غالباً بہت زیادہ عرصہ تک کام نہیں دے گا۔ اس کی جگہ لینے کیلئے ایک نیا روزمرہ درکار ہوگا۔ یہ کہاں سے آئیگا؟

مسئلہ کی نوعیت کا بیان جس حد تک میں اسے سمجھ سکا ہوں۔ میں نے مختصر طور پر آپ کے سامنے پیش کر دیا۔ مناسب تو غالباً یہ تھا۔ کہ یہ مقالہ اس منزل پر ختم ہو جاتا۔ اور صاحب صدر کی اجازت سے بحث کا آغاز ہو جاتا۔ جس میں آپ سب حضرات ان سوالات کا جواب تلاش کرنے میں میری رہنمائی کرتے۔ کیونکہ آپ سب اتفاق کرینگے کہ اس مسئلے کے تمام پہلوؤں کا جامع حل پیش کرنا کسی فرد واحد کے بس کا روگ نہیں۔ تاہم جس حد تک میں نے اس سوال پر غور کیا ہے۔ میں اس کے نتائج آپ کے سامنے پیش کئے دیتا ہوں:—

اُردو بےشک پاکستان کے کسی صوبے کی بول چال کی زبان نہیں ہے۔ لیکن اس کے برعکس کسی صوبے کی زبان بھی پاکستان کی

قومی زبان نہیں۔ صوبجاتی زبانوں میں آپس میں اتنا فرق ہے۔ اور ایک صوبے کے باشندوں کو دوسرے صوبے کی بولی کے قومی زبان بنائے جانے کے خلاف قدرتاً اس قدر تعصب ہوگا۔ کہ کوئی صوبجاتی زبان قومی زبان بنائی ہی نہیں جا سکتی۔ اس لئے یہ نتیجہ نکلتا ہے اردو ہی جو سب صوبوں میں سمجھی جاتی ہے۔ اور چند صوبوں میں لکھی پڑھی جاتی ہے۔ قومی زبان بن سکتی ہے۔ یہ بات یوں تو ایک فرسودہ حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن نظر یہ آتا ہے کہ نہ صرف پاکستان کے لوگوں بلکہ ارکانِ حکومت کے ذہنوں پر بھی یہ حقیقت ابھی پوری طرح نقش نہیں ہوئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ اردو کی پائیدگی کیلئے جتنی کوشش ہونی چاہیئے۔ وہ بالکل نہیں ہو رہی۔ میرے خیال میں اس بات کی اشد ضرورت ہے۔ کہ حکومت کسی قسم کے شک اور تذبذب کے بغیر اس امر کا قطعی فیصلہ کرلے کہ اردو ہی کو پاکستان کی زبان بننا ہے۔ اور فیصلہ کا مناسب طریقے سے اعلان کرکے نہ صرف لوگوں کو اس سے عہدہ برآ ہونے کیلئے تیار کرے بلکہ اسے عملی جامہ پہنانے کی ابتدائی پورے شد و مد سے شروع کر دے۔ لوگوں کو تیار کرنے کیلئے بالخصوص بنگال میں، سب سے زیادہ ضرورت پراپیگنڈا کی ہوگی۔ جسمیں ذیل کی باتیں خاص طور پر قابل شمار ہیں۔

۱۔ لوگوں کو اُن کی ایک قومیّت کا احساس دلایا جائے۔ قومی زبان کی ضرورت اور اس کا قومی حمیّت اور وقار سے جو تعلق ہے۔ وہ ان پر واضح کیا جائے۔ صوبجاتی احساس کے برعکس پاکستانی احساس ابھارا جائے۔ اور بتایا جائے کہ ہر آزاد قوم اور ملک کی اپنی قومی اور بین الاقوامی زبان ہوتی ہے۔

۲۔ یہ بات ثابت کی جائے۔ کہ سوائے اردو کے اور کوئی زبان پاکستان کی قومی زبان نہیں بن سکتی۔ مختلف صوبجاتی زبانوں کا آپس کا اختلاف اور اردو کا ہر صوبے میں سمجھا جانا اس امر کی کافی دلیل ہے۔

۳۔ اردو پاکستان اور ہندوستان کے درمیان رابطۂ اتحاد و مراسلت ہے۔

۴۔ اردو کو صوبجاتی زبانوں کی نسبت زیادہ آسانی سے پاکستان کے باہر بالخصوص اسلامی ممالک میں سمجھا جا سکتا ہے۔

۵۔ اردو عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ اور اس میں عربی کا نمایاں عنصر شامل ہے۔ اس لئے اردو قرآن شریف کے پڑھنے اور سمجھنے میں ممد ہو سکتی ہے۔

۶۔ شروع شروع میں لوگوں کو بالخصوص بنگال میں، یہ جتایا جائے کہ اردو کے قومی زبان بننے سے ان کی صوبجاتی زبانوں کی ترقی رد کنے کا نہ ارادہ ہے نہ خطرہ۔

۷۔ اردو اس سے پہلے عثمانیہ یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم ہونے کی وجہ سے کافی علمی ذخیرہ جمع کر چکی ہے۔

پراپیگنڈا کی نوعیت مختلف صوبوں میں مختلف ہوگی۔ کیونکہ ہر صوبے کے حالات میں کم و بیش فرق ہے۔ پنجاب اور صوبہ سرحد کے خاصے حصہ میں تحریری زبان اردو ہے۔ اگرچہ عام طور پر بولی نہیں جاتی۔ یہاں اردو کی اہمیت کا احساس دلانے کی اتنی ضرورت نہیں۔ جتنا اردو بولنے والا طبقہ پیدا کرنے کی ہے۔ اس کے برعکس بنگال میں اردو نہ بولی جاتی ہے نہ لکھی جاتی ہے اور نہ اسے عام لوگوں میں سمجھا جاتا ہے۔ وہاں پراپیگنڈا سب سے زیادہ زور سے اور دیر تک کرنا پڑیگا۔ پراپیگنڈا غالباً خاصے عرصے تک جاری رکھنا پڑیگا۔ لیکن اس سے دل برداشتہ نہیں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ قومی زبانیں دنوں میں نہیں بنا کرتیں سب سے زیادہ کوشش اس ضمن میں حکومت ہی کو کرنا ہوگی۔ اور اس میں پریس، سینما، اور ریڈیو تینوں وسائل سے فائدہ اٹھانا ہوگا۔ لیکن اس سلسلے میں غیر سرکاری اداروں (مثلاً انجمن ترقی اردو) اور شخصیتوں کی اعانت بھی ضرور حاصل کی جانی چاہیئے اور چیدہ چیدہ اداروں کی اس کام کیلئے حوصلہ افزائی کرنی چاہیئے۔

خاص پراپیگنڈا کے علاوہ اردو کو بحیثیت قومی زبان کے برسرِ اقتدار لانے اور ہر دلعزیز بنانے کیلئے اور کئی عملی قدم اٹھانے پڑیں گے چند ایک جو میری سمجھ میں آتے ہیں۔ انکا ذکر کرتا ہوں (۱) ڈھاکہ ریڈیو سے باقاعدہ اردو میں خبریں نشر ہونی چاہئیں (۲) پاکستان کے مرکزی ریڈیو اسٹیشن سے مشرقی بنگال کیلئے اردو میں خاص پروگرام نشر کئے جائیں جن میں سلیس سے سلیس اردو استعمال کی جائے اور مشرقی بنگال کیلئے خاص دلچسپی کا سامان مہیا کیا جائے (۳) بنگال کے ممتاز مصنفوں اور شاعروں کے حکومت کی سرپرستی کے ماتحت اردو میں وسیع پیمانے ترجمے کئے جائیں۔ اسی طرح اقبال، غالب اور دوسرے مصنفین کے بنگالی میں ترجمے کرا کے اہل بنگال کو اردو ادب اور زبان سے روشناس کرایا جائے۔ حکومت بنگال کے ان تمام مصنفوں کی جو اردو کی ترقی میں ہاتھ بٹانے کو تیار ہوں۔ حوصلہ افزائی کی جائے (۴) بڑے بڑے شہروں میں اردو کے بہی خواہوں کی انجمنیں قائم کی جائیں۔ جو ایک طرف تو اردو ادبیات کی ترقی کی کوشش کریں۔ اور دوسری طرف اردو کے قومی زبان ہونے کا پرچار کریں۔ مختلف صوبوں کی ادبی اور علمی شخصیتوں کو ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں آنے کی دعوتیں دیں۔ اور جلسے اور مشاعرے منعقد کریں۔ میرا خیال ہے۔ ان انجمنوں کا ایک مرکزی ادارے سے تعلق ہونا چاہیئے۔ تاکہ ان کی کوششیں مرکزی ہدایت کے ماتحت کام کر کے زیادہ سے زیادہ بارآور ہو سکیں۔

بنگال کے معاملے میں ایک بہت بڑی دقت رسم الخط کی ہے۔ اسے دور کرنے کیلئے خاص ذرائع کی ضرورت ہوگی۔ پہلا قدم تو یہاں بھی پراپیگنڈا کا ہے۔ ایک زبان ایک رسم الخط کا کلیہ ہر دلعزیز کرانا ہوگا۔ اردو رسم خط کو یہ فائدہ حاصل ہے کہ یہ عربی حروف میں لکھی جاتی ہے جس میں مسلمانوں کی مذہبی کتاب کا نزول ہوا۔ اس قدرتی فائدہ سے کام لیتے ہوئے بنگالی مسلمانوں کے ذہن نشین کرا دینا چاہیئے۔ کہ اردو رسم خط اختیار کرنے سے انہیں قرآن شریف پڑھنے میں کتنی آسانی ہو جائیگی۔ پراپیگنڈا کے علاوہ اس سلسلہ میں ایک عملی قدم یہ اٹھایا جا سکتا ہے کہ بنگال کی اکثر ہر دلعزیز کتابوں کو جوں کی توں اردو رسم خط میں تبدیل کرا کے رائج کیا جائے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ تعلیم بالغاں اور دوسرے تعلیمی ذریعوں سے عوام کو اردو رسم خط سکھانے کا انتظام کیا جائے۔

میں نے شروع میں عرض کیا تھا۔ کہ مشرقی پنجاب کے ضائع ہونے سے پاکستان میں اردو کی کوئی ٹکسال باقی نہیں رہی۔ یہ کمی پورا کرنے کیلئے دو ہی طریقے ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ کوئی مصنوعی ٹکسال بنائی جائے۔ دوسرے یہ کہ اردو بولنے والی نسلیں پیدا کی جائیں۔ میرا خیال ہے۔ ہمیں ان دونوں طریقوں کو ایک ہی راستے کی دو منزلیں سمجھ کر کام کرنا ہوگا۔ پہلے تو ایک مصنوعی ٹکسال قائم ہونی چاہیئے۔ یعنی ایک ادارہ ایسا ہو جو یہ فیصلہ دینے کے قابل ہو کہ صحیح اردو کونسی ہے۔ یہ ادارہ سرکاری بھی ہو سکتا ہے۔ اور غیر سرکاری بھی۔ میں غیر سرکاری ادارے کے حق میں ہوں۔ اگرچہ میں سمجھتا ہوں کہ حکومت کو اس ادارہ کے قائم کرنے میں نہ صرف مدد دینی ہوگی بلکہ پیش قدمی کرنی پڑیگی۔ اسے اردو اکیڈمی یا کوئی اَور نام دیا جا سکتا ہے۔ اور جب تک ہو سکے۔ یہ ادارہ یو پی کے اردو دان طبقہ سے رابطہ قائم رکھ سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ زبان کی ٹکسال کے علاوہ یہی ادارہ مختلف شہروں کی ادبی انجمنوں کیلئے جن کا میں نے ابھی ذکر کیا تھا۔ مرکزی ادارے کی حیثیت سے کام کر سکتا ہے۔ اس ادارے کا نظم و نسق مختلف صوبوں کی چیدہ چیدہ ادبی شخصیتوں کے ہاتھ میں ہونا چاہیئے۔ جو صوبجاتی تعصبات سے بالاتر ہوں۔

ٹکسال کی حیثیت سے اس ادارہ کا قیام شروع شروع میں اگرچہ ناگزیر ہے۔ لیکن انجام کار اس لحاظ سے اسکی قیمت مصنوعی سکوں کے ٹکسال کے برابر ہے۔ کیونکہ زبان کی اصلی ٹکسال بولتی نسلیں ہی ہو سکتی ہیں۔ اور بولتی نسلیں پیدا کرنے کیلئے پہل پنجاب اور صوبہ سرحد کے ضلع ہزارہ سے کی جا سکتی ہے کیونکہ ان دونوں علاقوں میں اردو عوام کی تحریری زبان تو پہلے سے ہی ہے۔ اور اردو ابتدائی جماعتوں میں ذریعہ تعلیم بھی ہے۔ اگر ذریعہ تعلیم کا مفہوم وسیع تر کر کے یہ لازمی قرار دیا جائے۔ کہ مدرسوں میں گفتگو کی زبان بھی اردو ہو تو کچھ عرصے تک بچے خود بخود اردو بولنے لگیں گے۔ یہاں میں یہ عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کہ ابتک عیسائی مشنری سکول اس لحاظ سے بیحد فائدہ مند ثابت ہوئے ہیں۔ پاکستان میں ان سکولوں کے مستقبل کے

متعلق کچھ کہا نہیں جا سکتا لیکن میری ناقص رائے یہ ہے۔ کہ ہمیں اور ہماری حکومت کو فی الحال ان سکولوں کی ہر ممکن حوصلہ افزائی کرنی چاہیئے۔ اردو بولتی نسلیں پیدا کرنے کیلئے دوسری تحریکیں مثلاً "اردو بولو" کی تحریک نسبتاً فروعی تحریکوں کا درجہ رکھتی ہیں۔ لیکن ان کے فائدہ بخش ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ تعلیم بالغاں کے ذریعہ بھی اس کوشش میں مدد لی جا سکتی ہے۔ اب تک ہم تعلیم بالغاں کو بالعموم پڑھائی لکھائی سکھلانے کا ذریعہ سمجھتے رہے ہیں۔ اب ہمیں اس کے مفہوم میں یہ اضافہ کرنا چاہیئے کہ صحیح زبان بولنے کی تعلیم بھی اسمیں شامل ہو سکے۔ پنجاب اور ہزارہ کے ساتھ ساتھ یہ کوشش کراچی میں شروع ہو جانی چاہیئے۔ اور بعد ازاں سندھ اور صوبہ سرحد کے باقی حصے ہیں۔ بنگال میں قدم ذرا احتیاط سے اٹھانے ہونگے۔

اردو کے صوبجاتی زبانوں سے رشتہ کا عام مسئلہ بہت کٹھن ہے۔ اور یہاں غالباً صوبجاتی فرق سب سے زیادہ نمایاں طور پر برقرار رکھنا پڑیگا۔ پنجاب اور ضلع ہزارہ میں تو مطمح نظر میرے خیال میں یہ ہونا چاہیئے۔ کہ اردو صوبجاتی زبان کی جگہ لے لے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ آخر موجودہ پنجابی اردو سے اتنی زیادہ مختلف نہیں جتنی چاسر اور اس سے پہلے کی انگریزی موجودہ انگریزی سے مختلف ہے۔ دوسرے علاقوں میں البتہ مقامی بولیوں کو غالباً برقرار رکھنا لازمی ہوگا۔ میرا خیال ہے۔ کہ جہاں جہاں پنجابی مقامی زبان ہے۔ وہاں صرف اردو زبان کو سرکاری طور پر تسلیم کیا جائے سوائے اس کے کہ پنجابی علاقوں کیلئے ریڈیو پر جو دیہاتی پروگرام ہوتے ہیں۔ انہیں پنجابی اور اردو ملے جلے ہونے چاہیئں۔ اگرچہ انہیں بھی آہستہ آہستہ اردو کا حصہ بڑھتا جانا چاہیئے۔ سندھی کا درجہ بھی انجام کار پنجابی کے لگ بھگ ہو جانا چاہیئے۔ جہاں تک پشتو کا تعلق ہے۔ اسکا درجہ قریب قریب غیر ملکی زبانوں کا ہے۔ اور ہمیں ریڈیو کے دیہاتی پروگراموں اور خبروں کا سلسلہ قائم رکھنا ضروری ہے لیکن پاکستان اگر ہو سکے تو اسکے ساتھ کے پشتوی علاقوں میں بھی اردو کو عام رواج دینا اور اُسے ذریعۂ تعلیم بنانا ضروری ہے۔ سیاسی لحاظ سے بھی اس کی بہت اہمیت ہے۔

اردو بولتی نسلیں پیدا کرنے اور اردو کو صوبجاتی زبانوں کے مقابلے میں برسر اقتدار لانے کیلئے بہت بڑی کوشش کی ضرورت ہے۔ خوش قسمتی سے مغربی پاکستان کی اخباری دنیا کی زبان انگریزی کے علاوہ زیادہ تر اردو ہی ہے۔ اس میدان میں مقامی زبانوں کے مقابلہ کو اور کم کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ لیکن اس سلسلہ میں سب سے ضروری اور اہم کام ہمارے تعلیمی نظام کی ترمیم ہے۔ فرائض حکومت کی موجودہ تقسیم کے ماتحت تعلیم ایک صوبجاتی محکمہ ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ پاکستان کی نئی ضرورتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے تعلیم کے نظم ونسق میں مرکزی حکومت کا بہت ہاتھ ہونا چاہیئے۔ یہ صرف پاکستان کی قومی زبان کے لحاظ سے ہی اہم نہیں بلکہ اور کئی نقطہ نظر ہیں۔ جن سے اسکی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ مثلاً ہمیں تعلیم کو اسلامی احکام کی ضروریات کی روشنی میں دیکھنا ہے۔ اور ضروری تبدیلیوں کا اندازہ لگانا ہے۔ یہ ایک مرکزی حکومت ہی کر سکتی ہے۔ اسے صوبوں کی مرضی پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اسی طرح پاکستان میں صنعتی تعلیم کی تجاویز پر غور اور انہیں عملی جامہ پہنانے کا کام بھی مرکزی حکومت ہی کر سکتی ہے۔ میرا خیال ہے اب وقت آگیا ہے کہ پاکستان میں مرکزی حکومت تعلیمی پالیسی کے معاملے میں موثر طور پر دخل اندازی شروع کرے۔ اور تمام تعلیمی نظام پر مختلف پہلوؤں سے نظر ثانی کرے جسمیں ایک نمایاں پہلو پاکستان کی قومی زبان کا ہونا چاہیئے۔ مرکزی محکمہ تعلیم میں ایک مختصر سا شعبہ اردو کی ترقی کیلئے مخصوص ہونا چاہیئے۔ اسے شعبۂ ترقی اردو کا نام دیا جا سکتا ہے۔ یہ اردو کی ترویج اور ترقی سے متعلق مختلف تجاویز سوچے اور انہیں عملی جامہ پہنائے۔ تعلیمی نظام کی نظر ثانی میں اردو انگریزی کے تعلق کے مسئلہ پر بھی پورا غور ہونا چاہیئے۔ اس مسئلہ کا کوئی تسلی بخش حل سمجھ میں نہیں آیا۔ اتنا البتہ واضح نظر آتا ہے کہ ابھی خاصے عرصے تک اردو اور انگریزی کو دوش بدوش چلنا ہوگا۔ میرا خیال ہے پاکستان میں اردو کو انگریزی کی جگہ لینے میں ابھی پندرہ سال کے قریب ضرور لگ جائیں گے۔ اس تبدیلی کیلئے ہمیں کن کن منزلوں سے گذرنا ہوگا یہ ماہرین کی ایک کمیٹی ہی فیصلہ کر سکتی ہے۔ اور حکومت پاکستان کو جلد ایک ایسا کمیٹی کو معرض وجود میں لانا چاہیئے۔ میں نے اپنی سمجھ کے مطابق ایک مختصر سا پندرہ سالہ "پروگرام" سوچا ہے۔ جو آپ کے سامنے پیش ہے۔

پہلے پانچ سال ۔ (۱) اردو کی تعلیم تمام پاکستان میں لازمی۔ پنجاب اور ضلع ہزارہ میں پہلی جماعت سے۔ اور باقی جگہوں میں تیسری جماعت سے، بنگال میں پانچویں جماعت سے۔ بنگال میں پانچویں تک بنگالی لازمی لیکن بنگالی اور اردو دونو رسم الخط کی تعلیم۔ چھٹی کے بعد انگریزی کی تعلیم لازمی۔ پنجاب میں ذریعہ تعلیم پہلی سے دسویں تک اردو۔ باقی صوبوں میں تیسری سے دسویں تک، بنگال میں پانچویں سے دسویں تک۔ ذریعہ تعلیم کا مفہوم یہ ہے کہ

مدرسوں میں گفتگو بھی اُردو میں ہو۔ کالج کی تعلیم انگریزی میں (ب) تمام مدرسوں میں اُردو میں تعلیم دے سکنے کی استعداد پیدا کی جائے۔ چھ مہینے یا سال کا کورس اس مقصد کیلئے جاری کیا جائے (ج) دفتری کارروائی انگریزی میں (د) بیرونی ممالک سے خط و کتابت انگریزی میں (ہ) بنگال میں اُردو رسم خط کی عام تدریس نہ صرف سکولوں میں بلکہ بذریعہ تعلیم بالغان۔ بنگالی ادب کا عربی حروف میں انتقال (و) علمی کتب کا اُردو میں ترجمہ ایک مقررہ پروگرام کے مطابق۔

دوسرے پانچ سال ۔ (ا) اُردو کی تعلیم تمام پاکستان میں پہلی سے لازمی (ب) ذریعہ تعلیم پہلی سے بی اے آرٹ تک اُردو، سوائے بنگال کے جہاں تیسری سے دسویں تک اُردو، بنگال میں پانچویں تک بنگالی لازمی لیکن رسم خط اُردو۔ دسویں کے بعد انگریزی اُن کیلئے لازمی، جو بعد میں سائنس پڑھنا چاہیں یا عربی فارسی کے بعد ایم اے کرنا چاہیں۔ سائنس والوں کیلئے اُردو میں مطلحات کی تعلیم (ج) دفتری کارروائی پنجاب میں اُردو میں، باقی صوبوں میں انگریزی میں پنجاب کے دوسرے صوبوں یا مرکز سے جو خط و کتابت ہو۔ وہ اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں درج ہو۔ تمام دفتری ملازموں کو اُردو کی تدریس، مدرسوں کی اُردو زبان کی تدریس کی تکمیل (د) تراجم کا دوسرا دور۔

تیسرے پانچ سال ۔ (ا) اُردو کی تعلیم پہلی جماعت سے لازمی (ب) ذریعہ تعلیم اُردو پہلی سے، سائنس کے طالبعلموں کیلئے دسویں سے انگریزی لازمی (ج) دفتری کارروائی اُردو میں، سوائے بنگال کے لیکن بنگال کی دوسرے صوبوں کے ساتھ مراسلت میں اُردو انگریزی دونوں بیرونی ممالک سے خط و کتابت۔ اسلامی ممالک سے اُردو میں معہ ترجمہ بزبان مکتوب الیہ۔ غیر اسلامی ممالک سے اُردو معہ ترجمہ انگریزی ـــــــ یہ خاکہ بہت ادھورا ہی اگر میں اسے پورا کر سکتا تو ماہرین کی کمیٹی کی ضرورت نہ رہتی لیکن اس روش کا کوئی پروگرام بنانا ہی پڑیگا۔ اسے نافذ کرنے کیلئے مرکزی حکومت کی زبردست کوشش درکار ہوگی۔ میرا خیال ہی یہ کام بھی شعبہ ترقی اُردو سنبھال سکتا ہی۔ ایک شرط جو اس پروگرام کے نفاذ کیلئے ضروری ہے یہ ہے کہ اُردو کے علمی ذخیرہ میں بے بہا اضافہ کیا جائے۔ غیر زبانوں کی بیشمار علمی کتابوں کا ترجمہ کرانا درکار ہوگا۔ یہ ترجمے بھی خاص پروگرام کے ماتحت ہونے چاہئیں کیونکہ پہلے ہندوستان میں جن دو ایک اداروں نے اس کام کا بیڑا اٹھایا تھا۔ انکی کوشش کسی باقاعدہ پروگرام کے فقدان کی وجہ سے اتنے قابلقدر نتائج پیدا نہیں کر سکیں جتنا اتنے ہی روپے اور محنت کے مصرف سے ممکن ہو سکتا تھا۔ میرا خیال ہے شعبہ ترقی اُردو کے ماتحت ایک دارالترجمہ کا وجود ضروری ہوگا۔

پاکستان میں اُردو رسم خط کے متعلق یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ رسم خط عربی اشکال میں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اس سے ایک طرف تو ٹائپ کی بے شمار دقتوں کا علاج ہو جائیگا۔ اور دوسرا اُردو کا پروپیگنڈا زیادہ آسانی سے ہو سکیگا۔ اس سے ہم دوسرے اسلامی ممالک کی زبان سے بھی بہت قریب تر ہو جائینگے

مقالہ ختم کرنے سے پہلے میں ان ناچیز تجویزوں کا جو میں نے پیش کی ہیں۔ مختصراً ذکر کئے دیتا ہوں تاکہ دوران بحث میں سہولت رہے۔

(۱) سب سے پہلے ضرورت اس بات کی ہے۔ کہ مرکزی حکومت قطعی طور پر اُردو کو پاکستان کی قومی زبان بنانے کا فیصلہ کرے۔ اور صوبجاتی حکومتوں پر مناسب طور پر یہ فیصلہ واضح کر دے (۲) دوسری ضرورت مناسب پروپیگنڈا کی ہے جس میں عوام کو قومی زبان کی اہمیت بتائی جائے اور یہ بتایا جائے کہ اُردو ہی قومی زبان بن سکتی ہے۔ یہ پروپیگنڈا مختلف صوبوں کے حالات کے مطابق ہونا چاہیئے۔ اس میں سرکاری اور غیر سرکاری کوششیں شامل ہونی چاہئیں۔ لیکن پیش قدمی حکومت کیطرف سے ہی ہونی چاہیئے (۳) بنگال میں خاص کوششوں کی ضرورت ہے۔ رسم خط کیلئے بنگالی تصانیف کو عربی حروف میں منتقل کرا کے رائج کیا جائے (۴) پنجاب اور ہزارہ میں اُردو ابھی سے مقامی زبانوں کی جگہ لینی شروع کرے بعد ازاں سندھ میں بھی پشتو کو غیر ملکی زبان کا درجہ حاصل ہو (۵) ایک مصنوعی ٹکسال قائم کی جائے۔ جو ہو تو غیر سرکاری لیکن جسے سرکاری مدد حاصل ہو۔ اسے اُردو اکیڈمی یا کوئی اور نام دیا جا سکتا ہے۔ اور اس کا کام ٹکسال کے علاوہ غیر سرکاری انجمنوں کو جو مختلف شہروں میں اُردو کی ترقی کیلئے قائم کی جائیں۔ مرکزی ہدایات دے اور ان کی کارگزاریوں کو ربط دے (۶) مرکزی حکومت تعلیمی نظم و نسق میں زیادہ حصہ لینا شروع کرے اور اسے صوبوں کی مرضی پر ہی نہ چھوڑ دے۔ محکمہ تعلیم میں ایک "شعبہ ترقی اُردو" ہو۔ جو اُردو کو پاکستان کی قومی اور تعلیمی زبان بنانے کیلئے مختلف ذرائع سوچے اور عمل میں لائے۔ اور مفید غیر سرکاری اداروں سے رابطہ قائم رکھے۔ اس شعبہ کے ماتحت ایک دارالترجمہ بھی ہو (۷) اُردو کو تعلیمی اور قومی زبان بنانے کا تفصیلی لائحہ عمل بنانے کیلئے ایک کمیٹی مقرر کی جائے۔ غالباً پندرہ سال میں اُردو پاکستان میں تعلیمی و دفتری زبان بن سکتی ہے۔ اور بین الاقوامی مراسلات میں بھی استعمال کی جا سکتی

[illegible]

پاکستان سے اُردو کی توقعات

اُردو زبان کے مورّخ، اُردو کی ابتدا کے متعلق تین نظریئے پیش کرتے ہیں، یعنی اس کی ابتدا دکن سے ہوئی، سندھ سے ہوئی اور پنجاب سے ہوئی، یہ تینوں نظریئے اس لئے قابلِ غور ہیں کہ ان ہی مقامات پر مسلمانوں کے قدم ہندوستان کی سرزمین سے مس ہوئے تھے۔ سواحل دکن، سندھ اور پنجاب میں مسلمانوں نے اپنی بود و باش کی اور حکومت قائم کرکے اپنے تمدّن اور تہذیب کی اشاعت کی تھی، لیکن اس میں کسی کو اختلاف نہیں ہے کہ اُردو مسلمانوں اور اہلِ ہند کے آپس کے ملاپ، بات چیت، خرید و فروخت، افہام و تفہیم کے باعث وجود میں آئی، اور پھر عام اشخاص کے ساتھ فقرا اور اولیا کے دستِ شفقت سے پروان چڑھی۔ شمال میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی اور جنوب میں بابا شرف الدین و نہتر اولیا اس وقت مقیم ہوئے تھے جبکہ مسلمان بادشاہوں نے اپنی فوج اور لشکر کے ساتھ ہندوستان کا رُخ بھی نہیں کیا تھا۔ ان کے علاوہ بابا فریدالدین شاہ بوعلی قلندر حضرت عین الدین گنج علم، شاہ امین الدین، حضرت سید محمد حسینی گیسو دراز وغیرہ اُردو کی ترویج میں جو حصہ لیتے رہے ہیں وہ فراموش نہیں ہو سکتا فقرا اور صوفیوں کے ساتھ ہمارے بادشاہوں نے بھی اُردو کی سرپرستی فرمائی ہے اور ان کی توجہ شاہانہ سے اُردو زبان میں برگ و بار پیدا ہوئے ہیں اور بالآخر اُردو دوابہ گنگ میں پہنچ کر منجھ گئی اور اپنا اثر ہندوستان کے شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک پھیلا دیا اور ایک عالمگیر زبان کی حیثیت حاصل کرلی۔ ڈاکٹر گلکرائسٹ نے ۱۸۰۲ء میں ہندی کا بیج بویا اور ناگری رسم خط میں اس کے لکھنے کی ابتدا کی، ورنہ اس کے پہلے ہندی اور اُردو کوئی علیٰحدہ زبانیں تصوّر نہ ہوتی تھیں اور نہ ناگری رسم خط مروج تھا۔ آج یہ اُردو اور ہندی نے جس طرح علیٰحدگی اختیار کرلی ہے وہ ظاہر ہے۔

پاکستان اور ہندوستان کی تقسیم نے ہندوستان میں تعصب اور تنگ نظری کی جو لہر اور فضا پیدا کردی ہے اور اُردو کی مخالفت میں جو کوششیں کی جارہی ہیں وہ قابلِ افسوس ہیں۔ یہاں ہمیں اس امر سے بحث نہیں ہے کہ اُردو کا مستقبل ہندوستان میں کیا ہوگا اور یہاں کے مسلمان اُردو زبان کو جو اُن کے تمدّن، تہذیب اور کلچر کی جان ہے کس طرح قائم رکھیں گے۔ یہاں ہم صرف پاکستان سے بحث کرتے ہیں۔

پاکستان میں اس وقت اُردو کے علاوہ سندھی، پنجابی، پشتو اور بنگالی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ مگر ان میں سے کوئی زبان بھی پورے پاکستان کی واحد زبان نہیں ہے، اگر کوئی زبان عام زبان کا درجہ رکھتی ہے تو وہ اُردو اور صرف اُردو ہے۔ اب اُردو کی ترقی پاکستان سے وابستہ ہے۔ اُس کی ترقی جہاں علم اشخاص کی کوشش اور جد و جہد سے ہو سکتی ہے وہاں حکومت کی سرپرستی اور حکومت کی توجہ بھی درکار ہے۔ جب تک حکومت کی توجہ نہ ہو اُردو ترقی نہیں کر سکتی۔

دنیا کی کسی ترقی یافتہ زبان کی ترقی کے متعلق غور کیا جائے تو یہ امر واضح ہوگا کہ اس زبان کی ترقی کا بڑا راز اس کا سرکاری زبان بن جانا رہا ہے جب تک کسی ملک میں وہاں کی زبان کو سرکاری زبان کا درجہ نہ مل جائے اس وقت تک اس کی ترقی نہیں ہو سکتی اس لئے ضرورت ہے کہ پاکستان میں اُردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے اور اس کو پاکستان کی عدالتی اور دیگر دفاتر کی سرکاری زبان قرار دیا جائے۔ ممکن ہے سرکاری زبان میں بعض اعتراض پیدا ہوں ان میں سے چند اعتراض یہ ہیں۔

(۱) عدالتوں کے لئے قانون کی کتابیں اور نظائر کی کتابیں اُردو میں نہیں ہیں۔

(۲) دوسرے دفاتر میں اصطلاحی الفاظ وغیرہ کی ضرورت ہے۔

(۳) نئی اداروں میں اُردو کی ترویج دشوار ہے۔
(۴) صوبہ وار زبانوں کا کیا اثر ہوگا۔

اس میں شک نہیں کہ یہ اعتراضات بجائے خود اہم ہیں لیکن ایسے نہیں جن کا تشفی بخش جواب نہ ہو۔ ان اعتراضات کے جواب کے لئے میں
بدرآباد کو بطور نمونہ پیش کرتا ہوں اور حیدرآباد کی گزشتہ اور موجودہ سرکاری زبان کا تذکرہ کرتا ہوں۔

حیدرآباد یا قلمرو نظام میں آج سے ستر سال پہلے عام طور سے سرکاری زبان فارسی تھی۔ عدالتوں اور دوسرے دفاتر میں فارسی زبان
ں کاروبار ہوتے تھے۔ سرکاری مراسلت اور دیگر سرکاری امور سب کچھ فارسی زبان میں طے ہوتے تھے۔ اضلاع اور دیہات میں وہاں کی مقامی
انیں تلنگی، مرہٹی اور کنڑی میں مراسلت ہوتی تھی اور اسی زبان میں دیہی دفاتر ہوتے تھے۔

۱۳۰۱ھ میں سرکار نظام کی جانب سے گشتی جاری ہوئی اور سرکاری زبان فارسی کے بجائے اُردو قرار دی گئی۔ عدالتوں اور دیگر دفاتر میں اُردو
ں کاروبار ہونے لگا۔ دیہات کے دفاتر رفتہ رفتہ اور اضلاع کے دفاتر احکام سرکار کے بعد اُردو ہوگئے۔ مگر اس کے بعد جب انگریزی کا زیادہ
اج ہوا تو فنی دفاتر تعمیرات، طبابت وغیرہ انگریزی میں اپنے کاروبار کرتے رہے حتی کہ ۱۳۳۷ھ میں جامعہ عثمانیہ قائم کی گئی اور ہر قسم کی تعلیم
دو میں ہونے لگی۔ اب عام طور سے عدالتوں (تعلقات اور اضلاع کی چھوٹی عدالتیں ہوں یا مستقر حیدرآباد کی بڑی عدالت یا عدالت العالیہ
ئی کورٹ) میں اُردو میں کاروبار ہوتا ہے۔ کسی قسم کی قانونی کوئی دقت رونما نہیں ہوتی۔ نہ صرف قانونی کتابیں اُردو میں موجود ہیں بلکہ برٹش
یا اور پریوی کونسل کے نظائر بھی اُردو میں پائے جاتے ہیں، اس موقع پر ایک واقعہ قلم بند کرنا موجب دلچسپی ہوگا کہ کئی سال پہلے مرحوم
س سر سلیمان جب حیدرآباد تشریف لائے تھے تو وہ ہائیکورٹ (عدالت العالیہ) کے معاینہ کے لئے گئے اور ایک اجلاس پر وکلا کی بحث
عت کرنے لگے جو اپنے مباحث میں نہ صرف برٹش انڈیا بلکہ پریوی کونسل کے نظائر بھی پیش کر رہے تھے۔ جب مرحوم کو اس کی اطلاع ہوئی کہ
ں فریق کے وکلا انگریزی سے واقف نہیں ہیں بلکہ انھوں نے اُردو ذخیرے سے اپنی بحث کا مواد تیار کیا ہے تو بڑی حیرت کا اظہار فرمایا تھا۔ ہم
حت سے یہ ظاہر ہو سکتا ہے کہ اگر پاکستان کی عدالتیں اُردو کر دی جائیں تو کوئی دشواری نہیں ہوگی بلکہ ان کو مطبوعہ قانونی مواد مل سکتا ہے اور
لتوں میں اُردو زبان رائج کی جا سکتی ہے۔

دوسرا اعتراض عدالت کے سوا دیگر دفاتر کی اصلاح وغیرہ سے متعلق ہے دیگر دفاتر میں مالگزاری اراضی، سروے یعنی بندوبست، کسٹم
کروڑگیری، اکسائز یعنی آبکاری وغیرہ کے دفاتر ہیں۔ حیدرآباد میں یہ دفاتر موجود ہیں اور اردو میں اپنے تمام کاروبار انجام دیتے ہیں۔ فنی
طلاحات اُردو میں موجود ہیں پاکستان میں بھی ان کو استعمال کیا جا سکتا ہے کوئی دقت پیدا ہونے کا اندیشہ نہیں ہے۔

تیسرا اعتراض فنی دفاتر تعمیرات، طبابت وغیرہ سے متعلق ہے۔ حیدرآباد کے جامعہ عثمانیہ میں انجینیرنگ، طبابت وغیرہ کی تعلیم اُردو
ہو رہی ہے اس کے کالج موجود ہیں۔ اگرچہ اس وقت پوری کتابیں اُردو میں نہیں ہیں تاہم کوشش کی جا رہی ہے، سردست انگریزی
یہ شعبے کام کرتے ہیں۔ پاکستان میں بھی اس پر عمل ہو سکتا ہے۔

آخری اعتراض صوبہ واری زبانوں کے متعلق ہے جو سردست بدستور رکھی جا سکتی ہے۔ آئندہ بتدریج اُردو کو اہمیت دی جائے مناسب
ال پاکستان سے سب سے پہلی اُردو کی توقع یہ ہے کہ اس کو سرکاری زبان قرار دی جائے اور تمام عدالتیں اور دفاتر میں اُردو میں
بار کرنے کے احکام نافذ ہوں۔

دوسری ضرورت یہ ہے کہ پاکستان کی یونیورسٹیوں کی زبان اُردو قرار دی جائے۔ تمام فنون اُردو میں پڑھائے جائیں۔ ایم۔ اے
اکٹریٹ کی ڈگریاں بھی اُردو وادب کے لئے مخصوص رہیں۔ تمام کالجوں میں جملہ فنون کی تعلیم اُردو میں دی جائے اور انگریزی زبان زاید

برقرار رکھی جائے تاکہ سردست فنون کی تعلیم کے لئے انگریزی کتابوں سے بھی استفادہ کیا جاتا رہے۔

جہاں اُردو سرکاری زبان قرار دی جائے وہاں تار برقی اور ریلوے وغیرہ میں بھی اُردو کو مروّج کر دیا جائے اُردو زبان میں تار برقی ہونا بھی اُردو کی ترقی کے لئے نہایت موثر ہے۔

پاکستان گورنمنٹ کو اس امر کی بھی ضرورت ہے کہ وہ ایسے اداروں اور انجمنوں کی سرپرستی فرمائے جو اُردو کی خدمت میں مصروف اور منہمک ہوں، اُردو کے ایسے مرکز قائم کئے جائیں جہاں شائقین ریسرچ کر سکیں۔ جس طرح پونہ میں بھنڈارکر ریسرچ انسٹیٹیوٹ اور سروینٹس آف انڈیا کے ادارے قائم ہیں۔ اسی طرح لاہور اور کراچی میں ایسے مرکزوں کا قائم ہونا ضروری ہے تاکہ اُردو زبان میں تحقیقاتی کتابیں مرتب ہو سکیں۔

جہاں یہ تمام امور پاکستان گورنمنٹ سے متعلق ہیں وہاں بعض ایسے امور بھی ہیں جو پاکستان کے مسلمانوں سے وابستہ ہیں اور اُن کی وجہ سے اُردو زبان کو ترقی ہو سکتی ہے۔ اگرچہ ان میں سے بعض امور بظاہر معمولی ہیں مگر ان کے اثرات اہم ہوتے ہیں۔

ہر وقت بات چیت اور گفتگو میں اُردو کو استعمال کیا جائے۔ خانگی گفتگو اور گھر کے اندر باہر دوستوں میں دفاتر میں غرض ہر جگہ اُردو میں بات چیت کی جائے اور اس طرح خط و کتابت اور مراسلت اُردو زبان ہی میں کی جائے۔

جو لوگ اُردو سے ناواقف ہیں اُن کو اُردو سکھائی جائے اور اس امر کی کوشش کی جائے۔ جو لوگ اُردو کو دشوار اور مشکل سمجھ کر دوسری زبان استعمال کر رہے ہیں اسے کو دور کیا جائے۔

بازار میں دوکانوں پر جو سائن بورڈ (ناموں کے بورڈ) آویزاں ہوتے ہیں وہ اُردو میں لکھے جائیں اور تجارتی خط و کتابت میں پتے وغیرہ بھی اُردو میں لکھے جائیں۔ اس طرح غیر ممالک میں اُردو کے اثرات پہنچ سکتے ہیں۔

جو فلم پاکستان میں بنائے جائیں یا ان کی نمائش کی جائے اُس میں اُردو کو فوقیت دی جائے۔ پہلے اُردو میں تحریر ہو اس کے بعد انگریزی میں۔ جن فلموں میں ناگری رسم الخط ہو اُس کو قطعاً ممنوع قرار دیا جائے۔

لاہور اور پنجاب کے بعض شہروں کے قطع نظر سندھ اور بنگال میں میں اُردو اخبارات و رسائل کی کمی ہے۔ اسی طرح پریس اور مطابع جو اُردو میں کتابیں شائع کریں موجود نہیں ہیں۔ اس امر کی ضرورت ہے کہ صاحب ثروت اشخاص اس جانب توجہ کریں اور اچھے اخبار، بلند معیار کے ماہوار رسالے اور اعلیٰ پیمانے کی کتابیں شائع کریں۔

اس کے ساتھ چھوٹی چھوٹی عام فہم سلیس اُردو کتابوں کی اشاعت بھی ضروری ہے تاکہ عام طور سے ہر شخص دلچسپی سے ان کا مطالعہ کر سکے۔ ایسی چھوٹی چھوٹی کتابیں جو تاریخی افسانوں، مشاہیر کے حالات، سائنس کے ابتدائی اُمور سے متعلق ہوں دلچسپ انداز میں سلیس زبان میں شائع کی جائیں اور ان کی قیمت کم سے کم رکھی جائے تاکہ لوگوں کو اُن کے مطالعہ میں دقت اور دشواری نہ ہو اور اُردو کی وسعت ہو سکے۔

کتب خانے قائم کئے جائیں جہاں اُردو کا کافی ذخیرہ فراہم کیا جائے۔ یہ تمام ایسے اُمور ہیں جن پر عمل کرنے سے اُردو کو ترقی ہو سکتی ہے اور بہت جلد اُردو کا شمار بین الاقوامی زبانوں میں ہو سکتا ہے۔

نصیر الدین ہاشمی

(سید منظور حسین بخاری منیجر پرنٹر پبلشر نے اتحاد پریس کپلی روڈ لاہور میں چھپوا کر ۲۳ لارنس روڈ سے شائع کیا۔ سرورق دین پریس میں چھپا)

بیادگار علامۂ فصیح آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی-اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لاء
جائنٹ ایڈیٹر: شیر محمد اختر
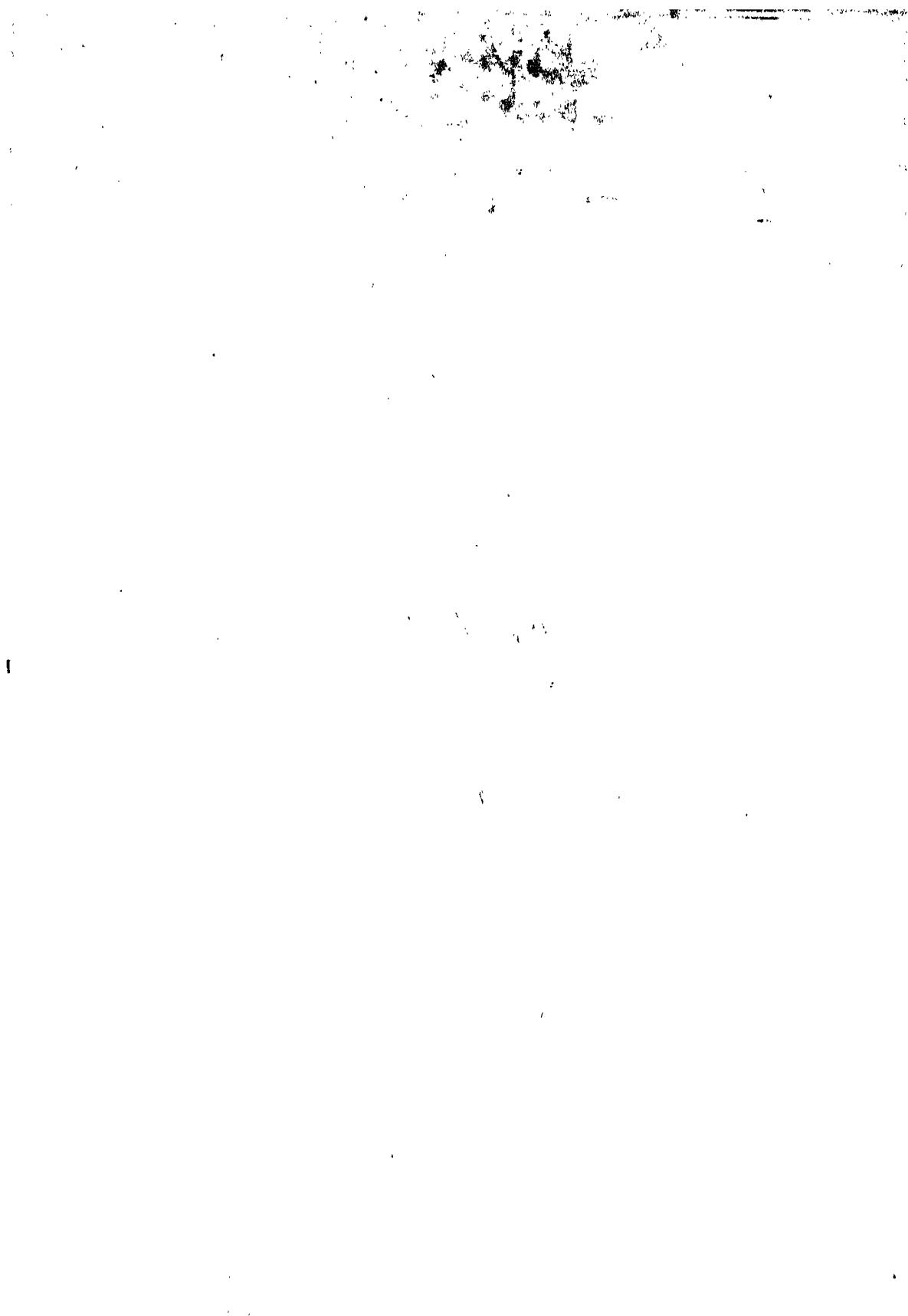
فہرستِ مضامین

ہمایوں، بابت ماہ مئی ۱۹۴۸ء

نمبر شمار	مضمون	صاحبِ مضمون	صفحہ
۱	بزمِ ہمایوں	بشیر احمد	۱۸۲
۲	ممتاز کی یاد میں	بشیر احمد	۱۸۳
۳	ممتاز شاہنواز	جناب خان بہادر میاں عبدالعزیز ایم۔اے، فلک پیما	۱۸۷
۴	اُردو (نظم)	جناب خواجہ دل محمد ایم۔اے	۱۸۸
۵	پاکستان میں اُردو کا مستقبل	محترمہ ڈاکٹر شائستہ سہروردی صاحبہ	۱۹۰
۶	جوانی (نظم)	جناب سید علی منظور صاحب حیدر آبادی	۱۹۳
۷	ڈاکو (افسانہ)	جناب ڈاکٹر محمد باقر صاحب ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی	۱۹۴
۸	سوگ (نظم)	" تابش صدیقی صاحب بی۔اے	۱۹۹
۹	یہ گیت	" سید مقبول حسین صاحب احمد پوری	۲۰۰
۱۰	آخری خدمت (افسانہ)	" محمد تقی صاحب ایم۔اے	۲۰۱
۱۱	غزل	محترمہ خورشید آرا بیگم صاحبہ (بیگم نواب صدیق علی خاں)	۲۰۸
۱۲	گاندھی جی کی عظمت	حضرت جوش ملسیانی	۲۰۹
۱۳	گاندھی جی کا فلسفۂ اخلاقیات	جناب سعید احمد رفیق صاحب ایم۔اے	۲۱۰
۱۴	سازش (نظم)	" حسن شہیر صاحب	۲۱۴
۱۵	خواب کا ویرانہ (افسانہ)	محترمہ شاہین صاحبہ	۲۱۵
۱۶	انتظار (نظم)	جناب سید حسن طاہر صاحب	۲۲۱
۱۷	محفلِ ادب		۲۲۲
۱۸	مطبوعات		۲۲۴
۱۹	اشتہارات		۲۲۶

سالانہ چندہ	ششماہی	فی پرچہ
۶ صہ	سے ر	۸ ر

بزمِ ہمایوں

۲۱ر اپریل کو پاکستان میں پہلی بار یومِ اقبال منایا گیا۔ بڑے اور چھوٹے شہروں میں بلکہ بعض قصبوں میں بھی عوام و خواص اس تقریب میں شامل ہوئے۔ مغربی پنجاب کی حکومت نے پنجاب میں اور مرکزی حکومت نے کراچی میں اس دن کو ایک قومی تعطیل قرار دیا۔ مختلف مقامات میں جلسے منعقد ہوئے جن میں اس عظیم المرتبت قومی شاعر کی زندگی اور پیغام پر تقریریں ہوئیں، مقالے پڑھے گئے اور مختلف طرح اظہارِ عقیدت کیا گیا۔ جو لوگ اقبال کے کلام کو سمجھتے تھے وہ اور جو نہ سمجھتے تھے وہ بھی ان جلسوں میں شریک ہوئے اور سب نے اس شرکت کو اپنے لئے موجبِ عزت سمجھا اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے تھا کیونکہ اقبال ہی پہلا شخص تھا جس نے پاکستان کا تخیل قوم کے سامنے (سنہ ۱۹۳۰ء میں) پیش کیا۔

اسلامی ہند کے رہنماؤں میں تین ہستیاں سب سے زیادہ ممتاز ہیں۔ سر سید جس نے ۱۸۵۷ء کے سانحہ کے بعد مسلمانوں کو مغربی تعلیم اور موجودہ دورِ تمدن میں اُن کی قومی ضروریات کی طرف متوجہ کیا۔ اقبال جس نے ہندوانی و مغربی تمدن کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرتے ہوئے مسلمانوں کو اُن کی اسلامی قومیت کے صحیح معنی ذہن نشین کرائے اور جناح جس نے ہندوستان میں اس قومیت کو عملی جامہ پہنایا۔

اقبال ۲۲ر فروری ۱۸۷۳ء کو پیدا ہوا اور ۲۱ر اپریل ۱۹۳۸ء کو انتقال کر گیا۔ ۶۵ برس کے اس عرصے میں ہندوستان کے مسلمان بہت سی آزمائشوں میں سے ہو کر گزرے اور اُن کے خیالات میں کئی تبدیلیاں ہوئیں۔ زمانے کے گوناگوں حالات کو دیکھ کر خود اقبال کے تصورات میں ایک انقلاب رونما ہوا جس نے شمالی ہند کے مسلمانوں کی قسمت کو بدل دیا۔ شروع میں اقبال نے ہندوستان سے اظہارِ عقیدت کیا۔ اُس کا ترانۂ ہندی "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" سارے ہندوستان میں مشہور ہو گیا۔ اُس کی نوائے دردنے دلوں کو بے حد متاثر کیا "وطن کی فکر کر ناداں! مصیبت آنے والی ہے"۔ "نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو"۔ "اُجڑا ہے تمیزِ ملت و آئیں نے قوموں کو"۔ "میرے اہلِ وطن کے دل میں کچھ فکرِ وطن بھی ہے"۔ مگر غیر مسلموں نے اس پُرخلوص مسلم شاعر کی فریاد کا جواب محض اپنے مُسلم کُش عمل سے دیا۔ اقبال نے دیکھ لیا کہ اگر مسلمان کو مسلمان ہو کر رہنا ہے تو ہندوستان کی وطنیت اُس کے لئے زہرِ قاتل ثابت ہوگی۔ "جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے"۔ اُدھر اقبال نے یورپ میں رہ کر یورپ کی مادی تہذیب کی اصلیت کو پہچانا اور تاڑ لیا کہ "یہ تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی"۔ اسی کے ساتھ اقبال نے یہ کہہ کر اسلام کے نشاۃ الثانیہ کا پیغام دیا ؂

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو اُلٹ دیا تھا سُنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا۔

اور اپنے درماندہ کارواں کو یقین دلایا کہ ؂ شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

اقبال نے مسلمانوں کو اپنے آپ میں اسلامی اوصاف پیدا کرنے اور ایک ہوس زدہ دنیا کی رہنمائی کے لئے تیار ہونے کی ترغیب دی: ؂

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

اُس نے مردِ مومن کو خود اپنی تقدیر بننے کی دعوت دی، اُسے بتایا کہ مسلمان کی منزل چرخِ نیلی فام سے پرے ہے، اُس کا مقام ہر مقام سے آگے ہے، اُس کی زندگی انقلاب کی پیامبر "نہایتِ اندیشہ و کمالِ جنوں" اور وہ "خود یگانہ اور مثالِ زمانہ گوناگوں" ہے اور اگر اس میں نمو کی جرأت ہو تو اُس کے لئے نہ فضا تنگ ہے نہ ملکِ خدا۔ اقبال نے یہ کہہ کر مسلمانوں کو مسلسل جد و جہد پر اُبھارا اور انھیں کامرانی کی بشارت دی کہ: ؂

وہی زمانے کی گردش پہ غالب آتا ہے جو ہر نفس سے کرے عمرِ جاوداں پیدا

اقبال کا پاکستان قائدِ اعظم کی کوشش اور خدا کے فضل و کرم سے مسلمانوں کو حاصل ہو گیا لیکن اس کا اصلی قیام و استحکام اہلِ پاکستان کی مسلسل مساعی ہی سے ممکن ہے۔ اس بارے میں اگر مسلمانوں نے تساہل سے کام لیا تو وہ یقیناً اس حاصل شدہ دولت کو کھو دیں گے، لیکن اگر قوم کا ایک ایک فرد "یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم" کا مظہر بن گیا تو اقبال کی یہ پیشین گوئی پوری ہو کر رہے گی کہ "خلیل اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا"۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ "یومِ اقبال" منانے والے اقبال کی ہدایات پر عمل کیوں کر کرتے ہیں؟

بشیر احمد

ممتاز کی یاد میں

۱۵ اپریل کو ۴ بجے سہ پہر میں المنظر میں گھنٹہ بھر آرام کرنے کے بعد بستر سے اُٹھا ہی تھا کہ میری بیوی اوپر میرے کمرے میں روتی ہوئی آئیں کہ آپ نے سنا کیا ہو گیا؟ تازی کا جہاز گر پڑا اور خدا جانے تازی کو کیا ہو گیا؟ جلد جلد ہم اپنی موٹر میں سوار ہو کر بیگم شاہنواز کے ہاں پہنچے۔ جہاں گول کمرہ میں وہ اور اُن کی والدہ اور میری خوش دامن لیڈی شفیع صاحبہ فرش پر بیٹھی تھیں۔ لیڈی صاحبہ اور ایک اور عزیزہ مصروفِ آہ و بکا تھیں اور بیگم شاہنواز خاموش بیٹھی کبھی کبھی صرف یہی کہے جاتی تھیں کہ "میری بچی کو کوئی نہ روئے، اُسے میں نے خدا کے سپرد کیا!" — ہمیں جلد ہی اُن کے چہرے اور آنکھوں سے معلوم ہو گیا کہ ہماری عزیز ممتاز اس جہان سے ہمیشہ کے لئے چل بسیں۔

بتیس تینتیس برس کی ساری لمبی داستان دل کو یاد آ گئی اور اُس کے گوناگوں نظارے آنکھوں میں پھر گئے اس عجیب و غریب لڑکی کی زندگی پہلے دن سے لیکر آخری دن تک ایک حیرت انگیز ڈراما تھا جس میں کئی غیر معمولی واقعات کچھ دُنیا کے سامنے اور زیادہ تر لوگوں کی نظروں سے اوجھل معرضِ ظہور میں آئے۔ اِن میں سے بعض واقعات دُنیا جانے گی اور بعض غالباً کبھی نہ جان سکے گی۔ لیکن اُس کی شخصیت مدتوں اس کی تصنیفات بالخصوص اس کی بعض دلکش انگریزی نظموں میں نور پاش ہوتی رہے گی۔

ممتاز جہاں میرے تایازاد بھائی میاں محمد شاہ نواز بیرسٹر ایٹ لا اور بیگم شاہ نواز ایم۔ایل۔اے کی بڑی بیٹی تھی، جو ۴ ار اکتوبر ۱۹۱۲ء کو لاہور میں پیدا ہوئی۔ یہ ابھی بمشکل چار پانچ برس کی تھی کہ اُس کی غیر معمولی شخصیت کے جوہر نمایاں ہونے لگے اور یہ اپنے والد کے چچا جسٹس میاں محمد شاہ دین (ہمایوں) اور بالخصوص اپنے نانا سر میاں محمد شفیع کی چہیتی بن گئی۔ شاعری کا مذاق بھی اس نے انہیں بزرگوں سے ورثے میں پایا۔ اِسی عمر میں اُس کی قوتِ ارادی کے کرشمے نظر آنے لگے۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ ماں نے بچی کو تادیب کے طور پر کونے میں یا باہر اندھیرے میں کھڑا کر دیا۔ لیکن دو دو تین تین گھنٹے کے بعد بھی وہ ننھی سی بلا ٹس سے مس نہ ہوئی اور اکثر بازی جیت گئی۔

تازی نے اپنی پہلی انگریزی نظم سات برس کی عمر میں لکھی اور بہت جلد وہ ایک شاعرہ کے طور پر مشہور ہو گئی۔ اِس وقت میرے سامنے اس کی ایک نظم "دوستی" ہے جو جولائی ۱۹۲۲ء میں شملہ میں لکھی گئی۔ Friendship is like sunshine .....

"دوستی سورج کی روشنی کی مانند ہے جس سے سارا روئے زمین چمک اُٹھتا ہے....."

ممتاز نے کوئین میری کالج لاہور میں تعلیم پائی اور ۱۹۲۸ء میں میٹرک کا امتحان اوّل درجے میں پاس کیا۔ بعد میں ۱۹۳۱ء میں وہ نئی دہلی میں لیڈی اِروِن کالج میں داخل ہوئی جہاں اس نے ۱۹۳۴ء میں خانہ داری (ہوم سائنس اور ڈومیسٹک اکانمی) کا ڈپلوما حاصل کیا اور امتحان میں سب لڑکیوں میں اوّل رہی۔ اپنی کالج کی پڑھائی کے علاوہ اس نے عام مباحثات میں اور ٹینس کے کھیل میں متعدد بار انعام اور تمغے حاصل کئے۔ سکول میں، کالج میں، پبلک میں، ہر کہیں اپنی ہم عمروں میں اس نے ایک نمایاں حیثیت حاصل کی، اور وہ ہمیشہ اپنے حلقے میں ایک رہنما تسلیم کی گئی جس کا اپنے گرد و پیش پر گہرا اثر پڑتا تھا۔

۱۹۳۰ء میں اُس کی ایک نظم What is the use of it all? (اس سب کچھ سے کیا حاصل؟) لندن کے مشہور اخبار سپکٹیٹر میں اس کی تصویر کے ساتھ چھپی اور اخبار مذکور نے اسے تین گنی کی رقم ہدیتہً پیش کی۔ اسی سال جب اُس کے نانا سر محمد شفیع گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے اپنے کنبے سمیت لندن گئے تو ممتاز بعد میں میاں عبد العزیز (فلک پیما) کے ساتھ ہم سفر

ہوکر اپنی اٹھارویں سالگرہ کے دن لندن جا پہنچی۔ وہاں اُس نے علمی و ادبی حلقوں میں چند ہی ہفتوں میں غیر معمولی شہرت حاصل کر لی اور وہ انگلستان کے بڑے بڑے مصنفین، شعرا اور فن کاروں کے دائرے میں شامل کر لی گئی۔ برنارڈ شا نے اُسے "ایک ذہین آفت" کہہ کر پکارا۔ اور اپنے نیم مزاحیہ انداز میں یہ حیرت انگیز پیش گوئی کی کہ "تمھارا انجام کچھ اچھا نہ ہوگا"۔ لائی سیئم کلب میں اُس کی نظم پر ہر طرف سے تحسین و آفرین کے پھول برسائے گئے اور شعرا کی کلب میں اس کے اعزاز میں خاص دعوت دی گئی جہاں اس کی نظموں نے تہلکہ مچا دیا۔

کالج سے فارغ ہونے کے بعد اُس نے نئے انداز کی کئی درسی کتابیں تصنیف کیں۔ ۱۹۳۶ء میں اُس کی ایک اردو کتاب "علم خانہ داری" شائع ہوئی اور ۱۹۳۷ء میں ہندوستان ریڈرز کا ایک سلسلہ انگریزی میں نکالا جو متعدد ریاستوں اور یونیورسٹیوں میں منظور ہو کر رائج ہو گیا۔

اس دوران میں اخبارات اور رسائل میں گاہے گاہے اس کی نظمیں شائع ہوتی رہیں۔ مسز سروجنی نائیڈو نے اُسے اپنی "رُوحانی بیٹی" کہہ کر یاد کیا۔ اور بالآخر جب ۱۹۴۴ء میں اُس نے اپنی نظموں کا ایک مختصر سا مجموعہ شائع کرنے کا ارادہ کیا تو "بُلبُلِ ہند" نے اس مجموعے کے لئے ایک دیباچہ اپنے خاص انداز میں لکھا۔ (۱۳ نومبر ۱۹۴۴ء)

اپنی عمر کے آخری دس سال میں ممتاز نے گاہے گاہے بعض لاجواب انگریزی نظمیں لکھیں جس سے اربابِ ذوق کے دائرے میں اُس نے بڑا نام پیدا کیا۔ لیکن اس زمانے میں اس نے جو معاشرتی اور سیاسی کام خاموشی اور استقلال سے سرانجام دیا اُس نے اہلِ بصیرت کے نزدیک اُس کی شہرت میں چار چاند لگا دیئے۔ وہ کئی نسوانی کمیٹیوں میں شریک ہوئی اور اس نے خاص طور پر مزدوروں کی تحریک میں نمایاں حصّہ لیا۔ چنانچہ امرتسر کی کلوں کے مزدوروں کے ہاں اُس نے معاشرتی فلاح کے چند مرکز کھولے۔ پنجاب میں مزدوروں کی فلاح خاص طور پر اُس کے پیشِ نظر رہی اور اُس نے اُن کے بڑے بڑے جلسوں میں اردو میں مؤثر تقریریں کیں۔

۱۹۴۲ء سے ممتاز مسلم لیگ میں شامل ہو گئی۔ پہلے تین سال میں اُس نے دہلی کی نسوانی مسلم لیگ کو منظّم کیا اور اس کے بعد وہ لاہور کی لیگی تحریک میں آ شامل ہوئی۔

ممتاز کی شخصیت کا انداز انقلابی تھا۔ چنانچہ فروری ۱۹۴۷ء میں جب خضری حکومت کے خلاف مسلم لیگ والوں نے اپنی مشہور تحریک شروع کی تو ممتاز پہلی عورت تھی جس نے حکومت کی لٹھ مار پولیس اور اشک آور گیس کا کامیابی سے مقابلہ کیا۔ اسی سلسلے میں اسے جیل بھیجا گیا جہاں اُس نے باوجود حکومت کی مساعی کے زنانہ جیل پر بے باکی سے مسلم لیگ کا سبز جھنڈا لہرا دیا اور اس پاداش میں زدوکوب کا نشانہ بنی۔

۱۹۴۷ء کے فرقہ وارانہ فسادات کے دوران میں وہ لاہور میں پسِ پردہ مسلم لیگ کی ایک زبردست سپاہی بنی رہی اور اسلحہ کی فراہمی اور تقسیم اور اس نوع کے دیگر خطرناک کاموں میں جس طرح ممتاز نے مسلسل چھ ماہ تک اندر ہی اندر کام کیا وہ بہت کم مردوں سے بھی ہو سکا۔ خطروں میں بے خطر اور خوف سے بے نیاز ہو کر جس طرح اس ۳۵ سالہ نوجوان خاتون نے کام کیا، وہ آپ اپنی نظیر ہے لیکن اسے صرف جاننے والے ہی جانتے ہیں کہ کیا ہوا اور کیونکر ہوا؟ وہ شہرت سے بے نیاز تھی اور عہدوں کی تمنّا سے یکسر پاک۔ اس کے ساتھ ہی غیر ملکی اخبارات کے نمائندوں، غیر ملکی سفیروں اور سیاحوں کو پاکستانی نقطۂ نظر سمجھانے میں وہ یدِ طولیٰ رکھتی تھی۔ ۱۹۴۶ء کے نازک اور خطرناک زمانے میں وہ دہلی اور لاہور میں کئی ایسے اصحاب سے جابجا ملاقات کرتی اور انھیں غیر معمولی طور پر متاثر کرتی رہی۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے قیام کے بعد جب مہاجرین کا مسئلہ پیچیدہ ہوتا گیا تو اُس نے لاہور میں پاکستانی عورتوں کی وہ رضاکارانہ جماعت قائم کی جس نے ۱۹۴۷ء کے موسمِ سرما میں بے حد مفید کام کیا۔ پھر نومبر ۱۹۴۷ء میں جب جنگ کے شعلے کشمیر کے محاذ پر بھڑک اُٹھے تو وہ بے باکانہ اس جنگ میں کود پڑی۔ چنانچہ بین الاقوامی سلامتی کونسل میں یہ واقعہ وثوق سے بیان کیا گیا کہ ممتاز شاہنواز ہی وہ منچلی خاتون تھی جس نے بارہ مولا میں پہنچ کر امریکنوں کو ہندوستانی طیاروں کی بے پناہ گولہ باری کے ہوتے ہوئے وہاں سے رہائی دلائی۔ اُس نے کشمیر کے لئے اور کیا کیا کیا؟ یہ کہانی آزاد کشمیر کے کارکنوں سے سُنئے۔

اپنی عمر کے آخری چند ماہ میں ممتاز کو پاکستان کے بعض کوتاہ اندیش افسروں کی خود غرضی پر انتہائی رنج اور تشویش تھی۔ لیکن اس نے اپنا ایک لمحہ بھی بیکاری میں کھونا نہ چاہا۔ چنانچہ جنوری سے لیکر مارچ ۱۹۴۸ء تک وہ انگریزی میں اپنے ایک سیاسی ناول کی تکمیل میں جسے اس نے چند برس پہلے لکھنا شروع کیا تھا روز و شب مصروف رہی۔ اس میں اس نے ۱۹۳۰ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک مسلمانانِ ہند کی سیاسی کش مکش کے پس منظر کے ساتھ لیگ اور پاکستان کی جد و جہد کا انتہا درجہ دلچسپ اور سبق آموز نقشہ پیش کیا ہے۔ اس کا ارادہ تھا کہ یہ کتاب اور اپنی نظمیں امریکہ میں جا کر چھپوائے جہاں ایک پبلشر سے معاملہ بھی طے ہو چکا تھا۔

اپنی کتاب ختم کرتے ہی ممتاز نے امریکہ جانے کی ٹھان لی۔ وہ کئی ماہ سے امریکہ میں متحدہ اقوام کے اکھاڑے میں ہندوستان و پاکستان کی کشتی دیکھ رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ پاکستان کے نقطۂ نظر کو دنیا میں واضح کرنے کے لئے لازم ہے کہ جلد سے جلد مغربی ممالک میں اور خاص طور پر امریکہ میں پاکستانی خیالات کی وضاحت اور اشاعت ایک وسیع پیمانے پر کی جائے۔ اس غرض سے وہ امریکہ میں تقریروں کے ایک سلسلے کا آغاز کرنے کو اپنے وطن سے نکلی۔ مگر وہاں قسمت کو کچھ اور منظور تھا۔

ممتاز ۸ را اپریل کو لاہور سے روانہ ہوئی اور ۱۴ر کی رات کو کراچی سے ہوائی جہاز پر سوار ہوئی۔ ۱۵ر کی رات کو لندن ہوتا ہوا اس کا جہاز صبح کے چار پانچ بجے شینن (آئرلینڈ) کے ہوائی اڈے پر پہنچا اور نیچے اترا۔ لیکن ابھی زمین پر نہ پہنچنے پایا تھا کہ کسی عمارت یا خدا جانے کس شے سے ٹکرا کر آگ کا ایک جہنم زار بن گیا جس کے شعلے آن کی آن میں تین سو فٹ تک بلند ہو گئے۔ فضا کی خاموشی میں چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا جب کہ گرد و پیش کی دنیا اس آتشِ بے پناہ سے جو ایک پاکستانی نوجوان عورت کے دہکتے ہوئے خوں گشتہ دل سے اٹھی ایک بقعۂ نور بن گئی۔

یوں جان دی ممتاز نے اپنے وطن کی راہ میں۔ وہ پاکستان کے مشاہیر میں شامل نہ تھی کیونکہ اس نے کبھی کسی عہدے کے حصول کے لئے تگ و دو نہ کی لیکن پرخلوص پاکستانی کارکنوں میں وہ یقیناً ایک ممتاز ترین حیثیت رکھتی تھی جس کی شاید دنیا کبھی قدر کرے! لیکن وہ کبھی خود "ممتاز" نہ بننا چاہتی تھی۔ اپنے پرخلوص کارکنوں کے حلقے میں وہ ہمیشہ تازی ہی رہی۔ ایک نیک نیت، سادہ مزاج اور اہلِ دماغ کی آنکھوں کو چندھیا دینے والی بے باک بے تاب لڑکی!

قوم کی عزت اور قوم کی خدمت اسے دل و جان سے زیادہ عزیز تھی۔ قوم کی راہ میں پرواز کرتے ہوئے ایک اجنبی میدان کی فضا میں پاکستانی آگ کا ایک روشن شعلہ بن کر نمودار ہوئی اور پھر ہمیشہ کے لئے روپوش ہو گئی۔ بلاشبہ وہ پاکستان کی ژان دارک تھی، ایک سچی مسلمان لڑکی جو اپنے وطن کی محبت میں پروانہ وار جل مری۔

پندرہ برس ہوئے میں نے اپنی "طلسمِ زندگی" میں ممتاز سے یوں خطاب کیا تھا۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھے تجھ سے انس کیوں ہے؟ میں سکون تو حرکت، میں اطمینان تو بے چینی، میں ہر موجودہ شے کو مقدّر سمجھنے والا، تو ہر مقرّر چیز سے یکسر منحرف، میں دستوروں کا پاسی ہائڑ تو نگر میں — انقلاب کا یم! پھر کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھے تجھ سے انس کیوں ہے؟" اور اخیر میں لکھا تھا کہ "ہاں میں دیکھتا ہوں کہ بندش کے پجاریوں اور امن کے مبلغوں کے خلاف جنگ کرنے میں تو سب سے زیادہ ممتاز ہے لیکن مجھ سے تیری جنگ اس کے رنگ میں ہے۔ اور اسی لئے نفرت تجھ سے نہیں بلکہ مجھے تیری جنگ سے ہے۔"

ممتاز تمام بڑے آدمیوں کی طرح متضاد صفات کا مجموعہ تھی۔ علمی شکوک اور عملی انقلاب کا بے پناہ جذبہ اس کی فطرت میں بیک وقت موجود تھا۔ اس کی انقلابی ذہنیت کا ذکر کرتے ہوئے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ باوجود اپنے اشتراکی میلانات کے وہ دل سے خدا پر یقین رکھتی تھی بلکہ میں نے بعض وقت اسے قرآن مجید میں سے فال نکالتے بھی دیکھا!

جون ۱۹۲۸ء میں اس نے ایک متصوفانہ نظم Awakening of The Soul ("بیداریٔ روح") لکھی۔ جس کا اردو نظم میں ترجمہ کر کے میں نے ہمایوں میں شائع کیا۔ اسی سال میں اس نے ایک نظم To mother (اپنی ماں سے) لکھی:-

Kind, sweet, unselfish as thou art ——— مہربان و پرمحبت نیک دن جانِ وفا —— اے مادرِ شیریں ادا

accept the tribute of my heart moth ——— آ لے لے تحفۂ ناچیز میرے پیار کا —— اے مادرِ شیریں ادا

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ممتاز کی اصلی شخصیت اور اس کی شاعری کا کمال ان کی انقلابی نظموں ہی میں رونما ہوتا ہے۔ ۱۹۴۱ء کی ایک نظم ہے

Day Dawns (نمودِ سحر) جو یوں شروع ہوتی ہے It is The hour of sunrise (یہ ہے سورج نکلنے کی گھڑی) اور پھر

The heart of the world is on fire	دنیا کا دل شعلہ زن ہو رہا ہے۔
Light strives with darkness	روشنی دست و گریباں ہے تاریکی سے
That the day be born	تاکہ دن نمودار ہو
For Humanity	نوعِ انسان کے لئے !

اخیر میں کس جوش سے کہتی ہے۔

O Thou! lost in the poppy dreams of the slave	اے تو کہ ایک غلام کے افیونی خواب میں کھو گیا ہے !
Awake! the dawn is here	بیدار ہو کہ صبح ہو چکی ہے
A splash of red across the sky.	سُرخی کا ایک چھینٹا آسمان کے اِس کنارے سے اُس کنارے تک
Thy comrades rise to greet the day,	تیرے ہم نوا اُٹھتے ہیں دن کا خیر مقدم کرنے کو
To meet the tyrants flames with faith,	ظالموں کے شعلے کا مقابلہ کرنے کو اپنے ایمان کے ساتھ
To leave the quiet hours behind,	پیچھے چھوڑتے ہوئے خاموش گھڑیوں کو
Forget the deep tranquility of home	بھُولے ہوئے گھر بار کے گہرے سکون کو
To give their eager lives so rich with dreams,	اپنی شوق بھری زندگیاں دینے کو تیار جو خوابوں سے مُرصّع ہیں
And all the gathered harvests of the years,	بلکہ اپنی عمر بھر کا جمع کردہ حاصل — یہ سبھی کچھ
There is no peace, nor rest, nor love	اب یہاں امن و امان کا سوال نہیں نہ آرام کا اور نہ محبّت کا۔
Until the fight be won.	جب تک کہ جنگ جیتی نہ جائے !

یہ تھا ممتاز کا نصب العین جس پر اُس نے عمل کر کے دکھا دیا! اس سوز و گداز سے بھری ہوئی نظم میں وہ دنیا کے لئے انقلاب کی آمد آمد دیکھتی ہے جس میں کمزوروں اور ظالموں کی آویزش جا بجا شدّت سے جاری ہے، وہ گھریلو زندگی کی خاموش گھڑیوں اور گہرے سکون کو ترک کر کے اپنی شوق بھری زندگی کو جو سنہرے خوابوں سے مرصّع رہی ہے بلکہ اپنی عمر بھر کے عزیز اندوختہ کو ان سب کو چھوڑ کر اور پھینک کر وہ اپنے پُرجوش ایمان کے ساتھ ظلم و ستم کے شعلوں کا مقابلہ کرنے کو اپنے گھر سے نکل کھڑی ہوتی ہے۔ وہ امن و امان کو آرام کو محبت تک کو ٹھکراتی ہوئی کارزارِ حیات میں داخل ہوتی ہے اور طاغوتی طاقتوں سے برسرِ پیکار ہو جاتی ہے کہ یا اس جنگ میں بازی جیت لے اور یا بے دھڑک اپنی جانِ عزیز کی قربانی دے دے !

اُسے تو جو کرنا تھا اُس نے کر دیا مگر اُس کے عزیزوں دوستوں کے لئے، اُس کے قوم و وطن کے لئے وہ خلا کبھی پُر نہیں ہو سکتا جو ممتاز کی ناگہانی موت نے پیدا کر دیا ہے جیسا کہ مسز سروجنی نائیڈو نے اس کی وفات پر اپنے برقی تعزیت نامے میں لکھا ہے: "افسوس صد افسوس کہ ایک ایسی ہستی جسے قدرت نے گوناگوں خوبیوں کا مجموعہ بنایا تھا یوں بے وقت اور ناگہانی طور پر ایک روح فرسا حادثے کا شکار ہو جائے۔ ممتاز جو مجھے بے حد عزیز تھی اور جس کے خداداد جوہر کی نمو کو میں ابتدا سے گہری دلچسپی کے ساتھ دیکھ رہی تھی اس کی موت میرے لئے ایک شدید ذاتی صدمہ ہے۔ میری دعا ہے کہ خدا کے دامنِ رحمت کا سایہ آپ سب کے دلوں کے لئے موجبِ تسلّی ہو!"

ممتاز کی دائمی جدائی میں اب خدا کی رحمت کے ساتھ جو امر ہمارے لئے موجبِ تسلّی ہو سکتا ہے وہ یہی ہے کہ ہم اُس انقلابی پیغام کو لوگوں تک پہنچائیں جو مرحومہ کا منتہا تھا اور پاکستان میں اپنی قوم کو اُس بلند ترین اخلاقی و روحانی مقام کی طرف لے چلیں جہاں پہنچ کر وہ دنیا کی نظروں میں ممتاز نظر آئے !

بشیر احمد

ممتاز شاہنواز

اپنے حلقۂ اثر میں عمر بھر بار بار کہتا چلا آیا ہوں کہ جس گروہ میں اس ہستی کی دلی عزت نہ ہو جس ہستی کے پاؤں تلے بہشت ہے، وہ گروہ بدنصیب ہے، زبوں حال ہے۔ اکثر سننے والے دقیانوسی قسم کی فرمانبرداری کو دلی عزت کا رتبہ عطا کرتے ہیں اور عزت کے اصلی مفہوم سے دانستہ یا نادانستہ بے خبر رہتے ہیں۔ ممتاز شاہنواز کی جس خصلت نے مجھے سب سے پہلے اس کی طرف متوجہ کیا وہ یہ افضل ترین خصلت تھی کہ ماں کی، نانی کی دلی عزت کرتے ہوئے اپنی عزت کی پوری نگہداشت کرتی۔ بزرگوں کو اختلاف ناگوار رہے۔ ہر ایک بزرگ کے دل میں نقش ہے کہ اولاد بے چون وچرا بلا سوچے سمجھے کہا مانتی چلی جائے۔ ممتاز کو اس کے ماحول والے باغی خیال کرتے۔ اس کی بغاوت کا ممد و معاون ہونے کا الزام برسوں سے مجھ پر عاید ہے۔ فدا لگتی بات یہ ہے کہ ممتاز باغی نہ تھی معقول پسند تھی۔ جب اس کی معقول پسندی کو کچلا جاتا تو میں ضرور اُسے بغاوت کی طرف مائل کرتا۔ وہ میری بات سن لیتی مگر روٹھ کر، خفا ہو کر، گریہ کر، سب کچھ کہہ سن کر ماں کی دلی عزت کو اُس نے ساری عمر اپنا ایمان بنائے رکھا۔ بہت کم ہیں جو ممتاز کی اس شاندار اسلامی آن کے اس قدر مداح یا آگاہ ہیں جتنا کہ میں ہوں۔

ممتاز کے نام کے ساتھ رسمی "مرحومہ" کا لفظ نہیں لکھتا۔ لیڈی شفیع کی لاڈلی، بیگم شاہنواز کی قرۃ العین، میں اُسے مرحومہ لکھوں؟ مجھے یقین ہے کہ جس طرح بعض لوگ بزرگوں کے نام سے چمکتے ہیں، یہ ماں بیٹیاں اور میاں محمد شفیع کا گھرانا ممتاز کے نام سے تابندہ ہیں۔ ممتاز کی لیاقت کا، قومی خدمت کا موازنہ سرِدست غیر ضروری ہے۔ اس کی کتاب اور نظمیں شایع ہوں گی تو دنیا کی سمجھ میں آجائے گا کہ مسلمان گھرانوں میں اس دل و دماغ کے نمونے صنفِ نازک میں کم ملتے ہیں۔

مجھے صرف یہ روشن کرنا ہے کہ ممتاز مسلمان خاتونوں کی آرزوئے مساوات کی پُرجوش اور پُرخلوص علمبردار تھی۔ سطحی نظریں صرف یہ دیکھتی تھیں کہ مصلحت سے بیگانہ اور موقع ناشناس تھی۔ بے مثال شخصیتیں اکثر اس قسم کی ذلیل عقل سے بالاتر ہوتی ہیں اور ممتاز کی خداداد ذہانت پر یہ عیب ہو نہیں سکتا تھا کہ وہ مصلحت پرست ہوتی۔ بعض کوتاہ بینوں نے ممتاز پر اعتراض کر کے اپنی کور ذوقی اور بدبینی کی عادت کا ثبوت دیا۔ ممتاز اُن کی جگت نیش زنی پر کبھی ہنس دیتی کبھی رو دیتی، ممتاز نے تحریراً، تقریراً، عملی کام میں اس نصب العین کو ہمیشہ مدنظر رکھا کہ صنفِ نازک کے اسلامی نمونے دنیا بھر میں کسی سے پیچھے نہ رہیں۔ اس وقت بھی مسلمانوں کی بدنصیبی سے ایسے لوگ موجود ہیں جو مسلمان خاتونوں کی زندگی کو خوابِ لحد کا نمونہ بنانا پسند کرتے ہیں۔ ممتاز اس قسم کے روحانی ڈاکوؤں کا مقابلہ کرنے سے نہ ڈرتی تھی۔ جس دلیر نے جیل خانہ پر پاکستان کا جھنڈا لہرایا، پاکستان اور اللہ اکبر کے نعروں سے لاہور کے گلی کوچے آباد کر دیئے، جو بارہ مولا کی جلتی آگ سے مصیبت زدگان کو بچا لائی، جس نے جو اس کے نزدیک حق تھا اُس سے کبھی مُنہ نہ موڑا وہ ہستی ہر مسلمان دوشیزہ کے لئے قابلِ فخر نمونہ تھی۔

اُس کی سرگرم ثابت قدمی کے مظاہرے جن آنکھوں نے دیکھے ہیں وہ آنکھیں پُرنم ہیں۔ یہ آنسو تھمتے تھمتے تھم جائیں گے مگر کاروانِ ہمت کی سالار ممتاز —— کو نگاہیں اور دل یاد رکھیں گے۔ پاکستان کے لئے عملی کام کرنے میں بہت مردوں سے پیش پیش تھی۔ اپنے یا کسی اور کے ذاتی اندوہ و حسرت کا ذکر عبث ہے ع نالۂ دارم کہ جز گوشم کسے نشنیدہ است، ممتاز کی طبیعت میں جلدی تھی۔ ہوائی جہاز کی آگ ختم ہونے سے پہلے وہ بہشت میں جا پہنچی جو ماں کی عزت سے ملتی ہے۔ اُس کی لیاقت کا یہ امتیازی نشان تھا۔

فلک پیما

اُردو

لطافتوں نے جو پایا جنم، بنی اُردو — سلاستیں ہوئیں یکجا بہم، بنی اُردو

فصاحتوں نے سجائے ارم بنی اُردو — بلاغتوں نے اٹھائے قلم، بنی اُردو

سخن نے گود میں جب اس کو جھوم جھوم لیا

سرور و کیف نے منہ اس کا چوم چوم لیا

قمر کی طلعتِ زیبا کرن ستاروں کی — گہر کی آب چمک کوندتے شراروں کی

ہنسی گلاب کی رنگینیاں بہاروں کی — چٹک کلی کی چہک خوشنوا ہزاروں کی

جو حسنِ ذوق سے ان سب کا امتزاج ہوا

بنی زبان زبانوں پہ اس کا راج ہوا

مہاجروں کے لئے اب وطن ہے پاکستان — سخن شناس و جہانِ سخن ہے پاکستان

زبانِ پاک ہے اُردو دہن ہے پاکستان — یہی ہے طوطیِ خوشخواں چمن ہے پاکستان

پھر آج چہرۂ لاہور ارغوانی ہے

یہ خاکِ پاک پھر اُردو کی راجدھانی ہے

یہ شہر ذرّوں میں جس کے مچلتے ہیں روماں — رہے فضاؤں میں جس کی سلیم و نور جہاں

حصارِ اکبرِ اعظم سے ہے جلال عیاں — ہیں پیر و مرشدِ ہجویر محوِ خواب یہاں

وہ بارگاہ فرشتے جہاں طواف کریں

خود آکے خواجۂ اجمیر اعتکاف کریں

یہیں وہ گھر ہے خدا کا جو خود ہے اپنی نظیر — مقام سجدۂ اورنگ زیب عالمگیر

منار جس کے ہیں عزم بلند کی تصویر   کہ جم گئے ہیں فضاؤں میں نعرۂ تکبیر
کشیدہ سر ہیں کہ مسلم کا بول ہو بالا
ہیں فرش سجدے میں سبحان ربی الاعلیٰ

بلند گنبدِ بیضا کی مرمریں پرواز   وہ گونج گونج اٹھے جس سے روح میں آواز
فراخ صحن میں قلبِ وسیع کا انداز   فراز وہ کہ شہوں کے جھکے جبینِ نیاز
وہ بامِ قدس کہ انوار جس پہ رقصاں ہیں
وہ در سکندر و اقبال جس کے درباں ہیں

بہارِ پھر رخِ اردو پہ کھل کے آئی ہے   زباں یہ کوثر و زمزم سے دھل کے آئی ہے
چمن کی آب ہے کانٹوں میں پل کے آئی ہے   خلا ملا سے محبت میں کھل کے آئی ہے
ہوا ہے گلشنِ لاہور مسکنِ اردو
بنے ہیں سینۂ بے کینہ مخزنِ اردو

مٹھاس اس میں ہے اقبال کے ترانوں کی   انیس و میر و حسن ایسے خوش بیانوں کی
نظیر و غالب و حالی سے نکتہ دانوں کی   زباں یہی تو ہے ملت کے پاسبانوں کی
دلوں کے جذبۂ پنہاں کی ترجماں ہے یہی
جو سن کے دل میں اتر جائے وہ زباں ہے یہی

لیا تھا اس نے جنم قلعۂ معلّیٰ میں   ہوا اب اس پہ ستم قلعۂ معلّیٰ میں
جمیں گے اس کے قدم قلعۂ معلّیٰ میں   گڑا رہے گا علم قلعۂ معلّیٰ میں
زبانیں دیتی رہیں گی اسے خراج ابھی
یہ دلّی والی دلوں پر کرے گی راج ابھی

دل محمد

پاکستان میں اُردو کا مستقبل

یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ کانگریس کے اُردو کے ساتھ سوتیلے برتاؤ نے ان لوگوں کو میدانِ سیاست میں لا کھڑا کیا جن کو کہ سیاست سے کوئی فطرتی لگاؤ نہیں تھا، جو ادبی اور علمی مزاج کے اشخاص تھے اور جو سیاست کے شور و شر سے الگ تھلگ زندگی پسند کرتے تھے۔ اُن سے اُردو دیکھی نہیں گئی اور وہ اُردو کے تحفظ کے لئے میدان سیاست میں اُتر آئے کیونکہ اُن کو یہ خطرہ نظر آنے لگا کہ اگر مسلمانوں کی تنظیم نہ ہوئی تو میں اُردو کو مٹا دیا جائے گا۔ ان کا یہ اندیشہ صحیح ثابت ہوا اور خود اس کے مولد و مسکن یعنی دہلی اور لکھنؤ سے ہی اُردو جلاوطن کر دی گئی۔

یہ گلبدن شہزادی جو دہلی سے اُجڑ کر لکھنؤ پہنچی تھی اور جہاں اُس کا ہاتھوں ہاتھ خیر مقدم کیا گیا تھا جہاں پر وہ نئے سرے سے آراستہ ہو کر ناز و ادا کی نئی نئی گھاتیں لے کر اور بھی موہنی ہو گئی تھی، اسی لکھنؤ میں اسے آج موت کا پیغام دے دیا گیا۔ لیکن اس کا رونا فضول ہے، یہ اسی لئے پاکستان بنایا گیا تاکہ مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کو ہندو فسطائیت کی بھڑکتی ہوئی آگ سے بچایا جائے۔ ہندو اکثریت کے سیلاب پر سے روکا جائے۔ ہندو آمریت کی ٹاپوں سے اُسے کچلنے نہ دیا جائے۔

خدا کا شکر ہے کہ مسلمانوں کی یہ کوشش کامیاب ہوئی اور پاکستان بن گیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ پاکستان میں اُردو کا مستقبل کیا ہوگا، دکھائی دیتا ہے اور کیا ہونا چاہیئے؟

پاکستان کو بنے ابھی آٹھ مہینے ہوئے ہیں اور یہ آٹھ مہینے اُسے اپنی بقا کے لئے جد و جہد میں صرف کرنے پڑے ہیں اور ہنوز خطرے کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ تاہم اس عرصے میں بھی ادب پسند اور ادب نواز لوگ ادب و شاعری سے یکسر غافل نہیں رہے ہیں۔ اخبار و رسالے کے ادارے پریشانیوں اور دقتوں کا سامنا کر کے میدان صحافت میں آ ہی گئے۔ کتابیں بھی چھپ رہی ہیں، اُردو کانفرنس بلائی گئی ہے، یوم اقبال منانے کی ہیں اور پاکستان کے پہلے ہی بجٹ میں اقبال اکیڈیمی کے لئے انتظام کیا گیا ہے۔ یعنی یہ ثبوت دیا گیا ہے کہ پاکستان ادب کی طرف سے بے پروا غافل نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ انشاء اللہ اُردو پاکستان میں پھولے پھلے گی۔ نئی دل آویزیاں سیکھے گی، نئے رنگ لائے گی، یہاں اس کی ترقی کا ایک شروع ہوگا۔ لیکن چند ایک مشکلیں اُس کو در پیش ہیں۔ ان کا اندازہ ابھی لگا لینے سے آئندہ چل کر رکاوٹ اور دشواری پیش نہیں آئے گی۔ پا جن صوبوں پر مشتمل ہے اُن میں سے کسی کی بھی زبان اُردو نہیں ہے۔ یہ بد قسمتی بھی ہے، لیکن ممکن ہے کہ آئندہ چل کر خوش قسمتی ثابت ہو، کیو صوبے کو یہ شکایت نہیں ہو سکتی کہ کسی اور صوبے کی زبان سیکھنے کے لئے اُسے مجبور کیا گیا بلکہ اُردو بحیثیت قومی زبان کے سیکھی جائے گی۔ لیکن کی سند، محاورہ کی صحت، روزمرہ کی صفائی کے لئے ہم کہاں جائیں گے؟ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہمیں ان باتوں کی پروا نہیں کرنی چاہیئے، بلکہ ایک عام فہم زبان رائج کرنے پر اکتفا کرنا چاہیئے ورنہ اُردو کبھی مقبول نہیں ہو سکتی۔ میری ناچیز رائے میں یہ رویہ غلط ہے۔ اُردو کو اس طرح صرف معمولی بول چال، راستہ دریافت کرنے، ہوٹل میں کھانے کا آرڈر دینے یا خرید و فروخت کرنے کا ذریعہ بنا کر چھوڑ دینا اُس پر سخت ظلم اس کے ادب کی سخت ناقدری ہوگی اور جو گراں بہا سرمایہ محاورہ و روزمرہ اور زبان دانی کا اس نے فراہم کیا ہے اس کو اس طرح برباد انتہائی وحشیانہ پن ہوگا۔

اس بارے میں پنجاب سب سے زیادہ خطا وار ہے۔ پاکستانی صوبوں میں پنجاب ہی ایک ایسا صوبہ ہے جہاں یو۔پی کے بعد اُردو

اور بولی جاتی ہے۔ لیکن اس کے بولنے اور لکھنے میں پنجابی ہی سب سے زیادہ سنگدلانہ بے پروائی سے کام لیتے ہیں اور جان جان کر چڑا
الفاظ کا غلط تلفظ کرتے ہیں ۔ اترا اترا کر کرخت لب و لہجہ میں گفتگو کرتے ہیں۔ محاورہ اور روزمرہ کو تو سمجھنے یا برتنے کی کبھی کوشش ہی نہیں
بلکہ یہ جانتے تک نہیں کہ محاورہ جاننا کوئی تعریف کی بات ہے یا روزمرہ سے زبان میں چاشنی پیدا ہوتی ہے۔
یہ رویہ حال کی پیداوار ہے، قدیم سکول کے پیرو اپنی زبان کی بہت نگہداشت کرتے تھے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کی زبان میں ویسی ہی نرمی
ت اور چاشنی پائی جاتی ہے جیسی یو۔ پی کے اردو دانوں کی زبان میں، پنجاب میں یو۔ پی کے بعد اردو سب سے زیادہ بولی جاتی ہے لیکن
ں اور بنگال، سی پی اور بہار، سرحد اور بلوچستان کے مسلمان اس بے دردانہ طور سے اردو کو قتل نہیں کرتے جس طرح پنجابی۔ کہا جائے گا
ور یہ مدراسی اور بنگالی پنجابیوں سے بھی زیادہ خراب اردو بولتے ہیں، یہ صحیح ہے لیکن وہ اپنی خراب اردو پر نازاں نہیں جیسے پنجابی، وہ اپنی
کو محسوس کرتے ہیں اور ہر وقت کوشاں رہتے ہیں کہ اس غلطی کی تلافی کریں ۔ اس کے برعکس پنجابی کبھی اس کی کوشش نہیں کرتے ۔ اگر کرتے تو
ھنو کی زبان دہلی کی طرح سند سمجھی جاتی ہے، لاہور کی زبان بھی کب کی سند ہو گئی ہوتی۔
خیر یہ تو گئی گذری باتیں تھیں۔ اب پاکستان میں نہ صوبجاتی تعصب کی گنجائش ہے اور نہ کسی کو اس کے قائم رکھنے کی خواہش ہے۔ پنجاب اردو
داری کا بیڑا اٹھا رہا ہے، اسے اٹھانا بھی چاہیئے۔ یہ اقبال کے وطن کے شایانِ شان بھی ہے۔ مغل حکومت کے پہلے پایہ تخت لاہور کو پاکستان
ب اور تاریخ کا مرکز بننا ہے۔ ان بکھرے ہوئے موتیوں کو سمیٹنا ہے جو ہندوستان میں لٹ گئے ۔ اس کی ناقدری کے ہاتھوں مسلی ہوئی پنکھڑیوں
ا کرنا ہے تاکہ ان کی خوشبو سے روحِ ادب پھر معطر ہو۔
لاہور کو اردو ادب اور اردو زبان کا مرکز بنانا چاہیئے ۔ لاہور والوں کی کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ ان کی زبان کی لطافت اور چاشنی دہلی اور
بات کر دے ۔ دنیا کی نظریں ہم پر لگی ہوئی ہیں ۔ ہر پہلو سے وہ ہمیں جانچ رہے ہیں۔ قوم کی زبان ہی اس قوم کی تہذیب کا آئینہ ہوتی ہے ۔ اردو
اپنی لطافت و نزاکت کی وجہ سے ہر ایک کا دل موہ لیتی ہے ۔ ابھی ایوان پاکستان میں جب لیاقت علی صاحب نے اردو میں تقریر کی ہے
بیرونی ملکوں کے سفیروں نے جو اردو سمجھ نہیں سکتے تھے مجھ سے کہا کہ اردو کتنی پیاری اور شستہ زبان معلوم ہوتی ہے ۔ اردو کی اس شستگی،
لافت اور اس نزاکت کو قائم رکھنا ہمارا فرض ہے ۔ اسے صرف دکانداری یا دربار کی زبان بنا کر چھوڑ دینا سخت بھونڈا پن اور حماقت
۔ جہاں تک میں اندازہ لگا سکتی ہوں اردو کی طرف سے کسی صوبہ کو کوئی تعصب نہیں ہے ۔ بنگال کی طرف سے جو احتجاج بنگالی کے لئے ہو رہا
س کی وجوہ کچھ اور ہی ہیں۔ جن کے سمجھنے کے لئے بنگال سے کماحقہٗ واقفیت چاہیئے اور اس کا اس وقت مغربی پاکستان میں فقدان ہے
تو کیا سرسری واقفیت بھی بنگالی سوسائٹی سے مغربی پاکستانیوں کو نہیں ہے ۔ بنگال مسلمانوں کی حکومت اور تہذیب کا مرکز اور
رہا ہے۔ ڈھاکہ، مرشد آباد، اور میدنی پور مغل اور پٹھان بادشاہوں کی حکومت کا مرکز رہے ہیں۔ وہاں کے امرا اور شرفا کی زبان، لباس
ہنا اور طرزِ معاشرت بالکل یو۔ پی کی طرزِ معاشرت سے مشابہ تھی۔ کلکتہ میں واجد علی شاہ کے لٹے ہوئے کاروان کے آجانے سے لکھنو کی تہذیب
کچھ اثر وہاں کے شرفا میں پایا جاتا ہے۔ اس محدود حلقے میں اردو ہی بولی جاتی ہے ۔ بنگالی کا بولنا یا سیکھنا عیب سمجھا جاتا تھا۔ بنگالی خاندانوں
ستے ناطے تک کو عار سمجھا جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو داں حلقے کے خلاف عام بنگالیوں میں ایک نفرت پیدا ہو گئی اور چونکہ شروع شروع میں
اقتدار بھی ان گھرانوں تک ہی محدود تھا۔ اب عوام کی جاگی ہوئی احساس خودی اس کو گوارا کرنے پر تیار نہیں اور اردو دان کے لئے اس محدود طبقے
ن ہونے کی وجہ سے مشکوک ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر اردو کو رائج کیا گیا تو اس طبقہ کو ان پر فوقیت رہے گی۔
ایک طرف تو اردو سے عام بنگالیوں کو یہ طبقاتی تعصب (class Prejudice) ہے، دوسری طرف ہندوؤں کی کوشش گزشتہ چالیس
ل سے ... ہے کہ مسلمانوں میں ہر طرح کی پھوٹ پیدا کی جائے۔ جس سے ان کی اسلامی یکجہتی اور قومیت کا شیرازہ بکھر جائے۔ اس لئے انھوں نے

یہ صوبہ میں عموماً اور بنگال میں خصوصاً صوبجاتی تعصب کو بڑھانے کی ہر ممکن کوشش کی اور اب جب کہ بنگال کے دو حصے ہو گئے ہیں مشرقی بنگال پاکستا
اس تعدد دُور اور اپنے نصف حصے اور اس طرح ہندوستان سے اس قدر قریب ہے ان کی زبردست کوشش یہ ہے کہ اس صوبجاتی تعصب کے ذریعہ
یہ وہ پاکستان کو توڑ سکیں۔

مشرقی بنگال کے مسلمان پاکستان کے سب سے زیادہ خواہشمند تھے۔ اُن کی حالت پاکستان کے ہر حصے سے زیادہ ناگفتہ ہے اور ان کی ترقی کی امیدیں
ستان سے وابستہ ہیں۔ ان کو ہر ممکن طریقے سے یہ جتلاتے اور بتلاتے رہنا چاہیئے کہ بنگالی کی حمایت پاکستان کی یکجہتی کو توڑنے کے لئے کرائی جا رہی ہے
ں سے پاکستان اور اسلام کو زبردست نقصان پہنچنے کا احتمال ہے اور اگر وہ اس دھوکے میں آ گئے تو بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ ایسا اس طرح اُردو سے
کی مغائرت دُور ہو جائے گی۔ مشرقی پاکستان والے عموماً اُردو سے اس قدر نابلد نہیں، جیسا کہ وہ خود یا مغربی پاکستان والے تصوّر کرتے ہیں۔ یہ
لاعلمی خود ہندو پروپیگنڈے کی کامیابی کی سند ہے۔ کسی غیر ملکی کے لئے اُردو زبان سیکھنے میں سب سے بڑی دشواری جو ہوتی ہے وہ رسم الخط کی
ہے۔ اُردو کا رسم الخط بے شک بہت ہی پیچیدہ ہے۔ لیکن بنگالیوں کو یہ دشواری پیش نہیں آئے گی، کیونکہ ان میں سے ہر ایک مسلمان بنگالی جو
حرف شناس ہے قرآن شریف ناظرہ پڑھا ہوا ہوتا ہے اور عربی رسم الخط سے واقف ہونے کی وجہ سے اُردو رسم الخط اس کے لئے اجنبی نہیں ہوگا۔

بنگال کے دیہات اور اضلاع میں اُردو جاننے والے نہ ہوں لیکن مغل حکومت کی یادگار فارسی کے تاثرات باقی ہیں۔ کابین نامے۔ شادی
ی کے رقعے فارسی میں لکھے جاتے ہیں۔ بولنے کی زبان عورتوں کی بنگالی ہے۔ لیکن اگر پڑھائی جائے گی تو اُردو ــ خود مسلمانوں کی بنگالی میں
ہزارہا الفاظ ادق فارسی اور عربی کے پائے جاتے ہیں بلکہ اس کثرت سے پائے جاتے ہیں کہ مسلمانی بنگلہ بالکل ایک جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔
س میں صرف حرفِ اضافی اور مصدروں کے سارے اسم وصفت فارسی اور عربی کے ہوتے ہیں۔ خفا، مزاج شریف، تشریف، عنایت نامے
جیسے الفاظ سے بنگالی شرفا کی زبان ناواقف نہیں۔ اس لئے اُردو ان کے لئے ناواقف یا اجنبی نہیں، یہ صرف پروپیگنڈا کا اثر ہے کہ وہ ایسا
سمجھنے لگے ہیں۔ ان کو اس پروپیگنڈے کے خطرے سے آگاہ کیا جائے گا، ان کو جتلایا اور بتایا جائے کہ وہ اُردو سے نامانوس نہیں ہیں بلکہ پروپیگنڈا
کے اثر سے ایسا سمجھتے ہیں اور اُردو انھیں بنگلہ کے بدلے نہیں بلکہ انگریزی کے بدلے سیکھنے کو کہا جاتا ہے تو یقین ہے کہ ان کا تعصب دُور ہو جائے گا۔

لیکن اس تعصب کو دُور کرنے کے لئے اُردو کے ہر ایک دلدادہ کو کوشش کرنی پڑے گی اور خود بڑی فراخ دلی اور بے تعصبی سے کام لینا پڑے گا
لیکن اُردو بین الپاکستانی زبان تب ہی بن سکے گی جب کہ بنگالی اسے منظور کر لیں۔ یہ ایک اتنا اہم اور ضروری کام ہے کہ اس کے لئے ہر ممکن کوشش
اور محنت ضروری ہے۔ پاکستان کی شیرازہ بندی کا انحصار اسی پر ہے۔

شائستہ سہروردی

قطعہ

بھینی بھینی مہک کی لپٹوں میں نغمہ زن ہے بہار کا افسوں
اور میں باوجود کوششِ ضبط خود بخود مسکرائے جاتا ہوں

تنویر بجنوری

جوانی

جوانی حسینوں کی ہنس مکھ جوانی — فقط شادمانی فقط کامرانی
جوانی ہے قدرت کی وہ مہربانی — جسے اہلِ دل کہتے ہیں زندگانی
نگاہوں کی مستی جوانی کا جوہر — جوانی ہے کیا؟ زندگانی کا جوہر
جوانی صباحت جوانی ملاحت — جوانی لطافت جوانی نفاست
جوانی سے وابستہ ہر زندہ دولت — نفاست لطافت صباحت ملاحت
جوانی صباحت کی شیریں زبانی — جوانی ملاحت کی شیوہ بیانی
جوانی کی خوش وضع بنیاد محکم — جوانی کا پرچم ہُوا ہی نہیں خم
یہ گلپاش موسم یہ گلپوش عالم — یہ دستِ حنائی یہ رنگین پرچم
مسرت جوانی کے گُن گا رہی ہے — جوانی کے پرچم کو لہرا رہی ہے
جوانی کے عالم میں دُنیا غزلخواں — جوانی کے موسم میں دل سب کا شاداں
دل آرا جوانی کے جاں بخش ارماں — جوانی کے قبضے میں درویش و سلطاں
جوانی کو آتا ہے قابو میں لانا — جوانی نے سیکھا ہے جادو جگانا
جوانی کا منظر سُنہرا سُنہرا — دسہرا بھی میسور کا سا دسہرا
پیامِ محبت جوانی کا چہرا — جوانی کے سر ہے محبت کا سہرا
جوانی محبت کی راہوں سے واقف — جوانی عداوت کی چالوں سے خائف
جوانی کی ہر نوجواں طرز دلکش — ادھر شرم رخ پر ادھر لب پہ غش غش
جسکی بات سُننے جواں سال مہوش — نظر اس تجلی پہ بھی کیا نہ ہو غش
سنبھلنے جو دے مجھ کو غش سے جوانی — جوانی کے جلوؤں کی دیکھوں روانی
جوانی کا پرتو نہاں بھی عیاں بھی — جوانی کا جلوہ وہاں بھی یہاں بھی
جوانی سے رخشاں زمیں بھی زماں بھی — جوانی سے تاباں کہیں بھی مکاں بھی

جوانی سے خالی کوئی گھر نہیں ہے
گراں تر جوانی بھی ارزاں تریں ہے

علی منظور

ڈاکو

"بزدل! کمینے!! تم غلط کہتے ہو یہ ڈاکو ہیں۔ ڈاکو بزدل نہیں ہوتا، نہ ہی کمینہ ہوتا ہے۔ ان لوگوں میں یہ دونوں کمزوریاں موجود ہیں۔ ڈاکو
ت اور ہمت سے کام لے کر خطرہ میں کود پڑتا ہے اور للکارتا ہوا دشمن پر حملہ کرتا ہے، مانا اُس کے پیش نظر ذاتی منفعت ہی ہوتی ہے لیکن
پوچھو تو ڈاکو اپنی جان پر کھیل کر ہی نفع حاصل کرتا ہے۔ تمہیں یاد ہے جس دن ہم بمبئی سے مدراسی بنئے کا سونا جہاز میں لے کر ڈم ڈم
پہنچے تھے تو کیا ہوا تھا؟ مدراسی بنیا کس طرح دانت نکالتا ہوا اپنی خوبصورت موٹر کار میں خوشی خوشی ہمارے جہاز کے قریب پہنچا تھا۔ ابھی میں
ز کا انجن بھی بند نہ کر پایا تھا کہ اُس کی موٹر سیمنٹ کی ہموار سطح پر تیرتی ہوئی جہاز کے بازو کے نیچے آکر رک گئی۔ جب تم نے اسے چار لاکھ
پے کے سونے کے ڈلے پکڑائے تو اُس نے ان ڈلوں کو کس پیار سے گود میں رکھتے ہوئے "تھینک یو" کہا تھا؟ سونا بخیریت پہنچنے کی خوشی میں اُس نے
رات ہمیں ڈنر پر بھی بُلایا تھا۔ لیکن ہم دونوں یہ کھانا نہ کھا سکے۔ مدراسی بنیا جب ڈم ڈم سے کلکتہ جا رہا تھا تو ایک جیپ نے ٹھیک سامنے
آکر بنئے کی موٹر کار کو ٹکر لگائی اور تھوڑی دیر بعد جب ہم اُسی راستے سے گزرے تو ہم نے دیکھا کہ بنئے کی موٹر کا انجن اور توند دونوں پچکے ہوئے
بنئے کا سر موٹر کے سامنے کے ٹوٹے ہوئے شیشے میں سے باہر نکلا ہوا کچھ اس قسم کی سعی میں مصروف نظر آتا تھا جیسے سینما ہال میں آگ لگنے پر
ب ترین EXIT (باہر نکلنے کا راستہ) میں سے لوگوں کے سر ایکدم باہر نکلنے لگتے ہیں اور ڈاکو چار لاکھ روپے کا سونا لے کر چمپت ہو گیا تھا۔
سکتے ہیں کہ، چار لاکھ کے لئے جان کی بازی لگا دی۔ ہو سکتا تھا کہ بنئے کی بجائے ڈاکو کا سر موٹر کا شیشہ توڑ کر باہر نکل جاتا اور اُس کی شہ رگ
جاتی۔ لیکن ڈاکو کا اندازہ صحیح نکلا۔ ٹھیک سامنے سے آکر اُس نے بنئے کی موٹر کو ٹکر لگائی اور بنیا اور بنئے کی موٹر چکنا چور ہو گئے۔ پولیس
کلکتہ میں موٹریں دوڑاتی رہی، لیکن جیپ والا ڈاکو نہ ملا۔ یہ لوگ تو بزدل، کمینے اور رذیل قسم کے چور ہیں، اِن کو ڈاکو کہنا ڈاکے
کی توہین ہے۔ بھاگے ہوئے لوگوں کی چھوڑی ہوئی جائداد کو غصب کرنا انتہا درجہ کی دنائت ہے اور ان سب لوگوں کے پیٹ دنائت کے
مادے سے بھرے ہوئے ہیں۔ ان کو چیر کر دیکھو ان میں شجاعت کا ایک قطرہ بھی نہیں ملے گا۔ شجاعت مردوں کو بخشی جاتی ہے چوروں
میں۔ تم چوروں کے غم میں خواہ مخواہ ہلکان ہو رہے ہو۔ قومیں چوروں سے نہیں بنا کرتیں، نہ ملت کے چور قوم کو نقصان پہنچا
تے ہیں —— بیرا! ایک گلاس اور لاؤ!"

افسروں کی میس (MESS) کے لاؤنج (گول کمرے) کے ایک کونے میں دو دھیمی دھیمی روشنیاں جل رہی تھیں۔ چند دن پہلے اس عمارت
دروازے پر رائل ایئر فورس کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ وہ بورڈ اکھاڑ دیا گیا لیکن پاکستان کا بورڈ ابھی تک نہیں لگا تھا۔ اس مکان کے سینکڑوں
مکین ہر نوع کے ہنگامے برپا کر کے رخصت کیا ہوئے اس ہنگامہ زار کی رنگینی بھی ساتھ لے گئے۔ صحن کے گلاب کے تختوں میں اب صرف
ے دبی ہوئی گھاس رہ گئی تھی۔ برآمدوں کے پھول اپنی ہستی سے مایوس ہو کر مرجھا سے گئے تھے۔ میس کے اندر بلیرڈ کی میز پر گرد اَٹ رہی تھی،
ں کے پتے چھوٹی میز پر بے جان سے پڑے تھے۔ شطرنج ایک کونے میں یُوں بکھری پڑی تھی جیسے سیاہ اور سفید مُہرے دونوں مات کھا گئے تھے
یوں فرنگی افسروں کی بجائے اب پاکستان کے صرف دو ہوا باز افسر اس کے مکین تھے۔ انگریزی رسالوں میں سے وطن آوارگان کی لڑکیوں
رنگین تصویریں کاٹ کر دیواروں پر چسپاں کی ہوئی تھیں وہ ان دونوں مکینوں کو وحشت آمیز انداز میں تک رہی تھیں۔ ایک نوشق فرنگی
فنکار کی بنائی ہوئی جو تصویر آتش دان کے اوپر رکھی ہوئی تھی وہ پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ میرے آرٹسٹ نے مجھے مشین گن دی تھی۔ ایک شوخ

اور چنچل فرنگی لڑکی گھٹنوں سے اوپر چُست لباس پہنے ہوئے اس انداز میں پیٹھ موڑ کر کھڑی ہوئی تھی جیسے کسی مشتاق دیدار کی ہزار منت وسماجت کے باوجود وہ اُس کی طرف مُنہ پھیرنے پر رضامند نہ ہوگی۔ مصوّر نے تصویر کے نیچے لکھا ہوا تھا۔

"جب میں سمندر پار چلا جاؤں گا تو پھر تم مجھے کبھی نہ بُلا سکو گی"

اور اب اس پیٹھ موڑ کر کھڑی ہونے والی چنچل لڑکی کا طنز آمیز تبسم گویا اس طرح کی کاز وریز ہنسی میں تبدیل ہو رہا تھا جیسے کوئی اسے بلائے تو یہ مُڑ ہوکر بلانے والے سے لپٹ ہی جائے گی۔ لیکن اب بُلانے والا تو سچ مچ سمندر پار چلا گیا تھا۔ یہی کمرہ جو اس وقت سگرٹ کے دھوئیں، مہمان لڑکیوں کی عطر بیز خوشبوؤں اور بُوئے شراب کی لپٹوں کے درمیان قہقہوں سے گونجا کرتا تھا قبرستان کی ہیبت لئے ہوئے تھا۔ ایک کونے میں بار (BAR) کے پیچھے سفید ریش آبدار (ساقی) کھڑا ہوا یہ سوچ رہا تھا کہ وہ لوگ کہاں گئے جو یہ کہا کرتے تھے ؎

کل کے لئے کر آج نہ خسّت شراب میں

یہ بھی کوئی بار ہے جس میں سینکڑوں پینے والوں کی بجائے اب صرف محمود پینے کے لئے آتا ہے۔ وہ پینے والے اور پلانے والے اب کہاں آئیں گے جو ہر شام اُسے مخاطب کر کے پکارا کرتے تھے ؎

ساقی گری کی شرم کرو آج ورنہ ہم ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جس قدر ملے

کیا پدڑی اور کیا پدڑی کا شوربہ۔ ایک پینے والا اور وہ بھی پاکستانی، کہاں تک پئے گا اور کب تک پئے گا۔ ایسے ساقی کی زندگی پر بھی ہے۔ آبدار کی نظریں سامنے رکھے ہوئے گلاس پر گڑ گئیں۔ یہ وہی گلاس تھا جو ایک رات پیمانے کی حیثیت سے ہزار مرتبہ بھرا گیا اور ہزار خالی ہوا۔ وہ بھی کیا دن تھے۔ مہمانوں والی رات کو لڑکیاں سرِ شام ہی پہنچ جاتیں۔ ہر طرح کی لڑکیاں، گوری، کالی اور سانولی۔ دیسی، ولایتی اور بین بین ——— آبدار مسکرا پڑا۔ ایک خاص قومیت کی لڑکیوں کے لئے اُس نے یہ لفظ خود ہی وضع کیا ہوا تھا۔ فلس کتنی شوخ تھی۔ کہربائی رنگ کا ناچ والا سایہ پہنے ہوئے وہ لاؤنج میں یوں داخل ہوتی جیسے حشر برپا کرنے کا ارادہ رکھتی ہو۔ دروازے سے داخل ہوتے ہی وہ جب نقرئی آواز سے پکارتی: "آبڈر ایک گملٹ"۔ تو سب بیرے گملٹ کا ایک ایک پیمانہ لے کر اُس کی طرف دوڑ پڑتے۔ پھر وہ لہرا کر ایک میز کے سامنے بیٹھ جاتی اور آگے بڑھے ہوئے قابوں میں سے ایک پیمانہ اُٹھا لیتی۔ اور اُس موٹی بھینس پر کتنا ترس آیا کرتا تھا جو بار کے پاس آکر "بابا جی! ایک گملٹ نہیں ملے گا؟" اس شراب کا بل گو اس بھینس کا دوست دیا کرتا تھا لیکن ہم یہی سمجھتے گویا اُسے خیرات میں شراب پلا رہے ہیں۔ شیریں کا کیا کہنا تھا، کبھی وہ ساری پہن کر آتی، کبھی سلوار قمیص اور کبھی خالص ولایتی لباس، جیسے ابھی ابھی ولایت سے آئی ہو۔ اور بین بین لڑکیاں اُس کو دیکھ کر کس طرح جلتی تھیں۔ جوانی ایسی جیسے کانٹے میں تُل رہی ہو، جسم ایسا موزوں کہ ہر لباس ایک نئی آرائش پیدا کرے۔ تو اسے دیکھ کر آپے سے باہر ہو جاتی اور اُس کے منہ پر کہہ دیتی "شیریں ہم یہ سوچ ہی رہے تھے کہ آج بجلی کس انداز سے کوندے گی"۔ شیریں صرف لب مسکرا دیتی۔ اور اپنے سنگیتر کے بازو میں بازو ڈالے ہوئے آگے بڑھ جاتی۔ پھر شام کی سیاہی لئے ہوئے اور دی پوڈر ملنے والی شیلا کتنی پیاری باتیں کرتی۔ نرجلی، پاشو، مس عزیز، منتھا اور خدا جانے کون کون سی لڑکیاں آبدار کو اُن کے گورے، کالے، لمبے اور چھوٹے قدوں والے دوستوں کے ساتھ یاد آتی رہیں۔ لیکن فرنگی کیا گئے میس کی رونق کو ساتھ لے گئے۔ آبدار کی آنکھوں سے سردی کی وجہ سے پانی کے دو قطرے بہ نکلے اور بار کے سارے منظر ایک دُھندلکا بن کے رہ گئے۔ اس نے پانی کے قطروں کو داڑھی سے صاف کرنے کے لئے ہاتھ پھیرا تو محمود نے پھر پکارا "آبدار ایک گلاس"

آبدار نے شراب گلاس میں اُنڈیلی اور سوڈے کی بوتل ساتھ طشتری میں رکھ کر محمود کے سامنے لے گیا۔ طشتری آگے بڑھا کر شراب میں سوڈا ملنے لگا تو چند لمحوں کے بعد محمود نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

"آبدار! ہم پینے نہیں ہیں کہ شراب کے بہانے سوڈا پئیں، وہ سب ڈومینین کے دانڈیا میں چلے گئے ہیں۔ اب گلاس میں شراب زیادہ

کرو اور سوڈا کم، اب تم شراب بیکار کیا کرو گے۔ اس میں میں تو صرف میں ہی پینے والا ہوں۔ یہ بدنصیب حامد تو پہلے بھی ترستا رہتا تھا اب پاکستان بن جانے کے باوجود ترستا رہے گا۔ اسے تو اب یہ غم کھائے جا رہا ہے کہ قوم کے چند کمیں پاکستان کو نہ لے ڈوبیں۔ بھلا کوئی پوچھے چند خواہ کتنے ہی بڑے قومی لیڈر کیوں نہ ہوں، اُن کے ذاتی افعال سے قوم کو کیا خطرہ ہے؟"

حامد خاموش بیٹھا ہوا اب تک محمود اور اُس مدھم روشنی کی طرف تک رہا تھا جو...... فانوس کی افسردگی میں بے جوڑی ہم آہنگی سے روشن ہونے کے باوجود روشنی نہیں پھیلا رہی تھی۔ بیرے کے بہے ہٹنے کے ساتھ ہی وہ چونک کر نشست سے کھڑا ہو گیا اور بولا۔

"محمود! بعض دفعہ تم لایعنی باتیں کہنے لگتے ہو، میں تو صرف یہی کہہ رہا تھا کہ ہم لوگوں کا مستقبل کیا ہے۔ پاکستان بننے کے بعد بھی ہم رشوت، زنا، چوری اور غبن سے باز نہیں آئے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنی صلاحیتیں رفتہ رفتہ ضائع کر رہے ہیں۔"

"دیکھو تم بڑے غبی ہو اور کم از کم بھولے انسان ضرور ہو۔ بھلا یہ تو بتاؤ کہ ہم میں صلاحیتیں پیدا ہی کب ہوئی تھیں جو ہم ضائع کر رہے ہیں۔"

"تو پاکستان ایسے ہی بن گیا ہے؟ صلاحیت کے بغیر ہم کو آزادی ایسے ہی مل گئی ہے؟"

"ہاں پاکستان ایسے ہی بن گیا ہے اور ہمیں آزادی ابھی تک نہیں ملی۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ پاکستان تو میری اور تمہاری کوششوں کے باوجود بن گیا ہے، یہاں تک کہ اُن آدمیوں کی کوشش کے باوجود بن گیا ہے جو اس وقت پاکستان کے اجارہ دار بنے بیٹھے ہیں۔ باقی رہی آزادی تو وہ تمہیں پہلے فرنگی کی غلامی میں حاصل تھی وہ قوم کے لیڈروں نے تم سے چھین لی ہے اب اگر تم شور مچاؤ تو گردن زدنی قرار دیئے جاؤ گے۔ سنو آزادی ملی ہے اُن لوگوں کو جنھوں نے قانون، سماج، رواج اور مذہب کی تمام قیود کو توڑ کر وہ لائحہ عمل اختیار کیا ہے جس سے میں شراب پی کر اور تم شراب نہ پینے کے باوجود انھیں ایک انچ پرے نہیں ہٹا سکتے۔ رہی میری اور تمہاری آزادی تو وہ ہندوستان سے آتے آتے راستے میں اسی طرح شہید ہو گئی ہے جیسے سڑک پر مرنے والے بے گور و کفن مہاجر۔"

حامد ٹہلتے ٹہلتے رُک گیا۔ "تم یا تو معموں میں باتیں کرتے ہو اور یا بہکنے لگتے ہو۔ بات کیا تھی اور تم کہاں جا نکلے۔"

محمود نے ایک ہی گھونٹ میں سارا گلاس ختم کرتے ہوئے کہا: "بیرا ایک اور لاؤ" اور پھر حامد سے مخاطب ہو کر بولا "اس شراب کی قسم جو ہمارے اتنے سالوں کی دوستی اور ہمدمی کے باوجود مجھ میں اور تم میں وجہ امتیاز بنی رہی ہے میں شراب پی کر کبھی نہیں بہکتا۔ صرف تمہیں ہمیشہ یہی گمان رہتا ہے۔ ہمیں صبح پرواز کے لئے نہیں جانا۔ لو آؤ آج کی رات ہم اپنے آپ اور پاکستان کو غور سے دیکھنے کی کوشش کریں۔ سب سے پہلے تو تمہیں اس بات پر اعتراض ہے کہ میں شراب کیوں پیتا ہوں، سنو اس کا جواب بالکل سادہ اور آسان ہے۔ پاکستان بننے کے باوجود پاکستانی حکومت اپنے خرچ پر یہ شراب انگلستان سے خریدتی ہے، جہاز پر لادتی ہے، بندرگاہ پہ اُتارتی ہے۔ گاڑی اور موٹروں پر سوار کر کے ہم تک پہنچاتی ہے کتنے مسلمان ہیں جو صرف یہی کام کر کے تنخواہ پاتے ہیں اور پھر یہ سارا خرچ اور محنت کرنے کے باوجود ہم سے کوئی نفع وصول نہیں کرتی، یہاں تک کہ اس پر ٹیکس بھی تقریباً معاف ہے اور ہمیں گھر بیٹھے بٹھائے یہ شراب اصل لاگت پر مل جاتی ہے۔ اس پر بھی اگر ہم شراب حکومت سے خرید کر نہ پئیں تو حکومت اپنی لاگت کہاں سے وصول کرے۔ پہلے تو میس میں نہ صرف لوگ خود پیتے تھے بلکہ دوسروں کو پلاتے تھے اور اس سے میس کی گرمیٔ محفل اور حکومت کے کاروبار کی رونق بازار قائم تھی اب گرمیٔ محفل کا قصہ تو ختم ہوا مجھ جیسے نہ پئیں تو رونق بازار بھی جاتی رہے گی۔ آخر تم ٹیکس دینے والوں کا روپیہ نالی میں تو نہیں بہا دینا چاہتے۔"

حامد مسکرا کر بولا۔ "محمود تم نے EVIL GENIUS (طاغوتی فراست) کا لفظ سنا ہے نا؟ بس......"

محمود بات کاٹ کر بولا "تم یہی کہنا چاہتے ہو کہ میں وہ ہوں۔ تم پھر ناراض ہو گئے۔ اچھا اگر تمہیں یہ وجہ پسند نہیں تو اور سنو۔ پاکستان بنے

سے پیشتر تمھارے ذہن رسا میں اکثر یہ خیال چکر لگاتا تھا کہ پاکستان بننے کے بعد اگر تمام میخانوں کو مسجدوں میں تبدیل نہیں کیا گیا تو وہاں جاموں کے جام ضرور تھادیئے جائیں گے۔۔۔۔۔؟

حامد چونک کر بولا "ابھی بہک رہے تھے اب بکنے لگے ہو"

محمود نے ایک قہقہہ لگایا "یاد رہا بگڑ گئے۔ اچھا بھائی تم یہ تو کہا کرتے تھے کہ پاکستان کو ہم DRY کر دیں گے اور تمام میخانے فرنگی راج کی آخری تاریخ کو بند ہونے کے بعد آزادی کی صبح آنے تک ملیامیٹ ہو جائیں گے۔ لیکن ہوا یہ کہ جہاں عام شہریوں نے بھاگنے والے ہندوؤں اور سکھوں کی موٹریں اور فرنیچر سے لے کر تھالیوں اور لوٹوں تک لوٹا۔ تمھاری قوم کے امیروں اور سرکردہ امیروں نے میخانے لوٹے۔ خود پی اور احباب کو پلائی اور جب دیکھا کہ ساکھ ٹوٹنے لگی ہے تو میخانے کے مالک بن بیٹھے تاکہ میخواری کا سلسلہ بھی جاری رہے اور پُرمنفعت کاروبار بھی چلتا رہے۔ قوم کے لیڈروں انگشت نمائی کون کر سکتا ہے۔ اب اگر ہم جیسے پاکستانی شراب نہ پئیں تو ان بیک وقت پاکستان اور میخانے کے اجارہ داروں کی گرم بازاری میں فرق نہ آجائے گا؟

"تو گویا تم ان میخانہ دار مسلمان اُمرا کے فائدے کے پیش نظر شراب پیتے ہو! یہ اُن سے ہمدردی کب سے پیدا ہو گئی ہے؟"

"ارے بھائی میری ہمدردی کا کیا ہے۔ ان لوگوں سے تمھاری قوم کو ہمیشہ ہمدردی رہی ہے۔ پاکستانی تو تم بنتے بنتے ہی بنو گے ابھی تک تو تم وہی مسلمان ہو جو خود پیتا تھا اور اگر خود نہیں پیتا تھا تو کم از کم ہندو ہمسائے اور فرنگی آقا کو خوش کرنے کے لئے انھیں پلاتا تھا۔ دیکھو میری اور تمھاری رگوں میں وہ خون دوڑ رہا ہے جو سو سال کی غلامی اور غلامی سے بدتر ہمسائگی سے گزشتہ تین نسلوں سے اس طرح سے متاثر ہو چکا ہے کہ پینے پلانے کو باعث فخر و مباہات سمجھتا ہے۔ ورنہ اگر اس میں کوئی بدی ہوتی تو پاکستان کے امرا سب سے پہلے ترک مے کا اعلان کرتے۔ پاکستان کے تمام میخانے کم از کم مسلمانوں کے لئے بند کر دیئے جاتے اور آج ہم بھی یہاں نہ بیٹھے ہوتے۔ یہ بوڑھا آبدار آج اس مَیں کے دروازے پر بھیک مانگ رہا ہوتا۔"

"تو اسے اور کوئی کام نہ ملتا؟"

"پاکستان میں اور کام کہاں ملتا ہے۔ اقبال نے پیشین گوئی نہیں کی تھی ؎

تیرے امیر مال مست تیرے غریب حال مست　　　بندہ ہے کوچہ گرد ابھی خواجہ بلند بام ابھی

یہ تو واقعات پر تبصرہ اور حقیقت کا اظہار تھا۔ بیچارہ آبداری چھوڑے تو در در ٹھوکریں کھاتا پھرے۔ پاکستان کے اس وسیع ملک میں اس کا کون پُرسان حال ہوگا۔"

"لیکن بھاگنے والے اتنے کام اور اتنی چیزیں پیچھے چھوڑ گئے ہیں کہ اگر ہم سب مل کر وہ کام کرنے لگیں تو بھی ہم سے نہ ہو سکیں گے اور اگر سب لوگ ان چیزوں کو اپنے آپ میں تقسیم کر لیں تو سب کے لئے کافی ہوں گی۔"

"میرے بھائی! منطقی طور پر تو یہ سب کچھ درست نظر آتا ہے لیکن تم اس حقیقت کو فراموش کر رہے ہو کہ پاکستان میں تمھاری منطق کی ٹانگ توڑنے والے بکثرت موجود ہیں۔"

"مطلب؟"

"مطلب یہ کہ کام تو بھاگنے والے بہت چھوڑ گئے لیکن نہ ہندوستان کے مہاجر نہ مقامی مہاجران کاموں کو کرنے کے لئے تیار ہیں۔ رہی چیزیں تو وہ جائدادوں سے لے کر گائیوں بھینسوں تک اس طرح بٹی ہیں کہ مہاجر بیچارے مُنہ دیکھتے رہ گئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے تم آج کل اخبار نہیں دیکھتے۔ اُس امیر کا ذکر پڑھا تھا جس کی چند سو ایکڑ بنجر زمین مشرقی پنجاب میں رہ گئی تھی اور اُس نے مغربی پنجاب میں زرخیز ترین زمیں ایک ایک انچ کا حساب کر کے حاصل کر لی ہے؟ اور پھر اس لیڈر کو کیا کہو گے جس نے مقامی مہاجر بن کر ایک مقامی میخانے پر قبضہ کر لیا ہے۔ اور اُن قائدین کو کیا کہو گے جنھوں نے کئی کارخانے زیر نگین کر لئے ہیں اور اپنے بھاگنے والے دوستوں کی سجی سجائی کوٹھیوں میں اپنی ٹوٹی پھوٹی کوٹھیوں سے نکل کر اس طرح منتقل ہو گئے ہیں جیسے پاکستان کو قائم کرنے کا سب سے بڑا مقصد ہی یہ تھا اور پاکستان قائم ہونے کے بعد سب سے پہلا کام یہی کرنا چاہئے تھا۔ مصیبت یہ

کہ جب تمھیں یہ باتیں بتائی جائیں تو تم فوراً یہ سوچنا شروع کر دیتے ہو کہ ان دُزدانِ قوم کے ہاتھوں قوم اور ملت کا حشر کیا ہوگا۔ حالانکہ میں کہ
تم سے یہ کہہ چکا ہوں کہ یہ لوگ نہ پہلے ڈاکو تھے نہ اب ہیں۔ یہ برطانوی شہنشاہیت میں بھی چوروں کا پارٹ ادا کرتے رہے ہیں اور اب بھی اسی
پر کاربند ہیں۔ قوم اور ملت میں جو تحریک سب سے زیادہ مقبول ہوتی رہی ہے یہ اس میں حصہ لیتے رہے ہیں اور سادہ دل مسلمان ان کے ہتھکنڈ
کبھی خبردار نہیں ہوا۔ ہر قسم کی سیاسی تحریک میں ان کی شمولیت کا مقصد صرف ایک ہی رہا ہے اور وہ نفس پرستی ہے۔ تم عمر خیام کو لاکھ بُرا کہو لیکن
تمھیں یہ ماننا ہی پڑے گا کہ پاکستان میں ان رکوع و سجود میں مصروف رہنے والے لیڈروں کی قلعی اُس نے نہایت بے باکانہ انداز میں کھولی ہے ؎

در مسجد اگرچہ بانیاز آمدہ ایم — حقا کہ نہ از بہر نماز آمدہ ایم
سجادۂ مسجد روزی دزدیدیم — آں کہنہ شدہ است و باز باز آمدہ ایم

دیکھو اگر تم نے تھوڑی سی پی ہوتی تو تم خیام کی اس رباعی سے شاید صحیح طور سے محظوظ ہو سکتے اور میرے ہم نوا ہو کر یہ کہنے پر مجبور
کہ یومِ حشر کو قوم انہی لیڈروں کا دامن پکڑ پکڑ کر کہے گی ؎

روزی کہ شود اِذَا السَّمَاءُ انْشَقَّتْ — واں دم کہ بود اِذَا النُّجُومُ انْکَدَرَتْ
من دامنِ تو بگیرم اندر عرصات — گویم صنما بِاَیِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ

"لیکن اس سے کیا حاصل؟ مزا تو جب تھا اگر ان مظلوم مہاجرین کا انتظام اس وقت کچھ ہو سکتا۔"

"انتظام تو ہو رہا ہے، تم اس سے آنکھیں بند کر لو تو تمھاری خوشی۔ اب تم ہی بتاؤ کہ ایک کیمپ میں ایک دن میں تیرہ سو آدمی
فوت ہو جائیں تو تمھاری قوم اور پاکستان کے اجارہ داران کا انتظام کر کیسے سکتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ اس کا حل صرف ایک ہی ہے اور
میرے تمھارے سامنے کیا گیا۔ فوج والوں کا بھلا ہو انھوں نے مشین سے ایک گہرا گڑھا کھود دیا اور بھنگیوں نے منڈاسے باندھ کر مُردہ
لاشوں کو اٹھا کر بے گور و کفن اس گڑھے میں پھینک دیا۔ اب تم شور مچا رہے تھے کہ ان کا جنازہ نہیں پڑھا گیا۔ دعائے خیر نہیں کہی گئی۔
آدمی ہوش کی دوا کرو، یہ غیر معمولی حالات ہیں، ان میں رسمی کارروائی کیسے ہو سکتی ہے اور پھر رسمی کارروائی کے لئے اسلام تقاضا ہی کب
" پھر وہی منطق شروع کر دی نا، جنازہ اور دُعا رسمی کارروائی نہیں، یہ ضروری فرض ہیں جو پورے ہونے چاہئیں۔ بہتر یہ ہوگا کہ تم اسلام
لئے اسلام کی آڑ نہ لیا کرو۔ جن آدمیوں کو مذہب سے پوری واقفیت نہیں انھیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ بار بار مذہب کا نام لیں۔"

" صاحب ہم تو آپ کے گریبان ٹھہرے، جب چاہا پکڑ لیا، لیکن دوست ان اسمبلی کے اراکین کو کیا کہو گے جنھوں نے ایک دو اُلٹی
تجویزوں کو منظور کرانے کے لئے اسلام اور شریعت کی آڑ ڈھونڈ لی ہے۔ خدا کی قسم یہ شریعت بل منظور کرنے والے آج شریعت سے اتنا
ڈرتے ہیں جتنا اسلام کے رائج ہونے کے وقت کفارِ مکہ اس بات سے ہراساں تھے کہ چور کو پکڑے جانے پر ہاتھ کاٹنے کی سزا دی گئی تو عمر بھر دا
کا یہ ٹیکہ نہ مٹا سکیں گے۔ اُن کے دل کہہ رہے تھے کہ ہم آج چوری کر کے اور چوری کی سزا پا کر دوسرے شہر میں آباد ہو جائیں تو ہمارے چوری
روپے سے بنے ہوئے محل کو دیکھ کر بھی کوئی ہمیں خاں صاحب اور شیخ صاحب کے خطاب سے کم نہیں پکارے گا۔ لیکن شریعت رائج ہو گئی تو
ہوئے ہاتھ کو کہاں چھپا سکیں گے؟ تم میری میخواری پر طعنہ زن ہو ان سے پوچھ کے دیکھو ؎

صد کار کنی کہ مے غلام است آں را

شراب سے تو پرہیز کے لئے اصرار کیا گیا ہے، ان لوگوں کو کیا کرو گے جن کے اعمال ہاتھ کٹنے سے لے کر سنگساری کی سزاؤں تک اترتے
میں شراب پیتا ہوں تو پاکستان کے ٹھیکیداروں کو قیمت ادا کرتا ہوں۔ لیکن یہ تو شراب بھی مفت پیتے ہیں اور پینے کے بعد مجھے
تمھیں تلقین کرتے ہیں کہ غیر مسلموں کو کچھ مت کہو، ان کو مت لوٹو، ان کو نقصان مت پہنچاؤ اور عورتوں اور بچوں پر ہاتھ نہ اُٹھا

ین کرنے والے خود کس حد تک اس نصیحت پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ شہر میں ہر طرف آگ لگ رہی تھی۔ غیر مسلم ہر سمت میں شہر سے بھاگ رہے
ا ہم دونوں ریلوے سٹیشن پر دہلی سے آنے والے دوستوں کو لینے گئے ہوئے تھے۔ یکایک کسی نامعلوم سمت سے ایک بم آکر گرا۔ پلیٹ فارم
ے ہوئے بھاگنے والے مسافر دیواروں کے ساتھ لگ کر سمٹ گئے۔ پھر ہر طرف گولی چلنے لگی اور دفعتہً ایک لڑکی تمہاری ٹانگوں سے لپٹ
س کے ساتھ ایک نوجوان تمہارے قدموں پر گر پڑا۔ "میں آپ کا شاگرد ہوں، آپ مجھے پہچانتے نہیں؟ میں ۱۹۴۲ء میں آپ کے پاس پڑھتا
یرا نام موہن لال ہے، آپ کو یاد نہیں، یہ میری بیوی ہے، ہمارے پاس اس صندوقچے میں سونا اور روپیہ ہے۔ آپ یہ سب لے لیجئے۔ یہ
صندوقچہ۔ بہت روپیہ ہے، بہت سونا ہے، سونے کے زیورات بھی ہیں۔ میری بیوی خوف سے مر جائے گی۔ آپ ہمیں بچا لیجئے، خدا کے
یں آپ کا شاگرد ہوں۔" گولیوں کی گونج میں تم ششدر کھڑے ہوئے دیکھ رہے تھے اور کچھ فیصلہ نہیں کر سکتے تھے کہ تمہیں کیا کرنا چاہیئے
نے لڑکی کو جھٹکا دے کر اپنی ٹانگوں سے الگ کر دیا۔ تم نے اپنے ریوالور کا توازن قائم رکھنے کے لئے اپنے ہاتھ کو ہلکی سی جنبش دی۔ موہن لال
کہا: "ہم آپ کے بچے ہیں۔" اور اُس کی بیوی بے تحاشہ چیختی جا رہی تھی۔ تم نے ایک اور جھٹکا دے کر لڑکی کو زمین پر سیدھا کھڑا کر دیا اور
طرح برسنے والی گولیوں میں سے اُسے گھسیٹتے ہوئے تم پلیٹ فارم سے باہر کی طرف بھاگنے لگے۔ لڑکی کا خاوند صندوقچہ لے کر تمہارے پیچھے
اکھڑی اکھڑی رفتار سے بھاگنے لگا۔ میں شور مچاتا رہا لیکن تم کسی کی کب سنتے تھے اور پھر اُسی رات تم نے مجھے بتایا کہ جس امیر کے یہاں تم اپنے
ر اور اُس کی بیوی کو پناہ کے لئے دے آئے تھے اُس نے دُوسرے دن تمہارے شاگرد، اس کی بیوی اور اُن کے صندوقچے کے حشر سے قطعی لاعلمی
ار کیا۔ لیکن پندرہ دن کے بعد تمہیں مشرقی پنجاب سے ایک خط کے ذریعہ سے یہ اطلاع ملی کہ تمہارا شاگرد وہاں پہنچ چکا ہے اور باقی چیزوں
پتہ نہیں۔ اب تم حسبِ معمول خواہ مخواہ پیچ و تاب کھاتے رہے لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ لو آؤ آج بھی غصہ تھوک دو۔ پاکستان کا غم
کا نہیں کہ تم اکیلے اسے اپنے دل میں سما سکو۔ اور پھر قوم کے چوروں کا غم کھانا تو ایک بے معنی سی کوشش ہے، اچھا شب بخیر،
ر بند کر دو، افسر جا رہے ہیں۔

محمد باقر

سوگ

پھولوں میں مہک نہیں رہی ہے
غنچوں کا نکھار لُٹ گیا ہے
افسوس بہار لُٹ گیا ہے

خاموش ہیں نغمہ ہائے سرخوش
جیسے کبھی تھے نہیں جہاں میں
اک عالمِ ہُو ہے گلستاں میں

گلشن کی ہوائیں دم بخود ہیں
ہر سمت ہے بے بسی کا عالم
ہر ایک روش ہے محوِ ماتم

اک آپ کی رخصتِ چمن سے
دنیا کا یہ حال ہو گیا ہے
خوشیوں کا وصال ہو گیا ہے

رباب ذوق شاخ دلّی میں پڑھی گئی)

تابش صدیقی

یہ گیت

ہمدم! یہ سہانے گیت لکھے، اُس دل کے لئے جس میں ہے دُکھن
جو سوزِ دروں کی تپش سے تپے
خود شمع ہو، خود ہی پروانہ
جو مستِ مئے غم ہو ایسا
دیوانہ بھی سمجھے دیوانہ!
ہر ذرّہ "انا المنصور" کہے، سُن لے جو کبھی اُس کی دھڑکن
یہ گیت لکھے اُس دل کے لئے!

اُس دل کے لئے یہ گیت لکھے—
جو اہلِ خرد کا رُعب نہ لے
(آتی ہو نہ جس کو پُرکاری)
جو کیفِ محبّت کو لے کر
ہو چھوڑ چکا دُنیا داری
یہ گیت لکھے اُس دل کے لئے!

جب لحنِ نوا پرور اُن کا
ہو کیفِ دروں سے شیر و شکر
ہے بس یہ دُعا، اے میرے خدا،
ہو آیۂ رحمت کا سا اثر
اُٹھ جائے فضاؤں سے یک دم، مایوس تصوّر کی چِلمن—
مِٹ جائے دلوں سے سب اَن بَن!
ہمدم! یہ سُہانے گیت لکھے، اُس دل کے لئے ہے جس میں دُکھن!

مقبول حسین احمد پوری

آخری خدمت

ماموں صاحب نے فلسفیانہ انداز میں کہا "اگر کچھ کھالو تو بہتر ہوگا۔" وہ کھُلتے ہوئے گندمی رنگ کے پستہ قد آدمی تھے۔ اُن کی آنکھیں چھوٹی مگر خوش قطع تھیں اور ان میں خوش مزاجی اور شرارت کی لطیف چمک تھی۔ ان کا ماتھا چوڑا گول اور اس قدر چمکدار تھا کہ وہ کسی نئی مشین کا ایک اہم پرزہ معلوم ہوتا تھا۔ ان کا جسم گٹھا ہوا اور بے حد پھرتیلا تھا، وہ کبھی نچلے نہ بیٹھتے تھے، کبھی زانو بدلتے، کبھی گردن پھرا پھرا کر ادھر اُدھر تیز نگاہیں دوڑاتے کبھی کسی گزرتے ہوئے بچے کے سر پر چپت رسید کرتے، کبھی اپنا چشمہ اتار کر اپنے ریشمی رومال سے صاف کرتے اور اگر کچھ نہیں تو دو تین کنکریاں اٹھاکر انھیں تیزی سے اچھالنے لگتے۔ اس میں ان کو خاص کمال حاصل تھا۔ چنانچہ جب میں بچہ تھا تو صرف اس کمال کی بنا پر ان کا دل سے مرید تھا۔ ایک ہاتھ سے تین انڈے اس صفائی سے اچھال سکتے تھے کہ دو انڈے ہوا میں ہوتے اور تیسرا ان کے ہاتھ میں۔ یہ کبھی آپس میں ٹکرا کر نہ ٹوٹتے تھے اور جب وہ کھیل بند کرتے تو تینوں انڈے اُن کے ہاتھ میں صحیح و سالم موجود ہوتے تھے۔ ہر طبقے اور ہر حیثیت کے لوگوں سے ان کی گہری دوستی تھی۔ اُن جیسے اچھا موٹر ڈرائیور شہر میں نہ تھا اور وہ روزانہ کسی نہ کسی موٹر یا موٹر سائیکل پر سوار ہوکر میرے گھر آیا کرتے تھے۔ ان کی ہر دلعزیزی ہم سب کے لئے باعثِ رشک تھی اور ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اخلاقی اصولوں سے انھیں دور کا واسطہ بھی نہ تھا۔ وہ ہر کام اچھا ہو یا بُرا بڑی خندہ پیشانی سے کرتے تھے اور کسی کا سخت سے سخت جرم اُن کو متعجب نہ کر سکتا تھا۔ انھوں نے دوبارہ ارشاد کیا "میاں چپکے سے کھالو، ورنہ بارہ بجے تک بھوکا مرنا پڑیگا بارہ بجے سے پہلے وہ وقت نہیں ہو سکتا۔" میں خاموش بیٹھا اپنے دل میں اُن کی علمی ذہانت کی داد دے رہا تھا۔

میں نے جعفر مرحوم کو جو اس وقت فوجی ہسپتال میں مرے پڑے تھے، صرف ایک بار دیکھا تھا۔ وہ بھی دُور کے رشتے سے میرے ماموں ہوتے تھے اور ماموں صاحب کے بھائی۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ ناشتہ کرنا چاہیئے یا نہیں۔ اس وقفے میں ماموں صاحب نہایت سکون کے ساتھ ایک بہت موٹے ٹوسٹ پر مکھن اور قیمہ پھیلا رہے تھے۔ ادرک اور بھُنی ہوئی پیاز کی خوشبو میری اشتہا کو بڑھاتی جا رہی تھی، آخر کار میں نے بھی ایک ٹوسٹ اُٹھا لیا مگر دل میں اپنے آپ پر لعنت کرتا جاتا تھا۔ مجھے جعفر مرحوم کے باپ احمد صاحب کا خیال آیا جو دور دراز پُورنیا سے آئے تھے اور یہاں کی ہر چیز پر فریفتہ تھے۔ الہ آباد ان کے لئے لندن سے کم نہ تھا، وہ یہاں کی ہر چیز کو حیرت اور استعجاب کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ مثلاً یہاں کا گرجا گھر، کیننگ روڈ کا صاف ستھرا بازار، کنارے دار سفید ساریوں میں ملبوس کالج جاتی ہوئی گوری گوری لڑکیاں، یہاں کے خوش پوشاک نوجوان جن کی ہر ادا سے خود اعتمادی ٹپکتی تھی اور جو آپس میں بھی بے تکان انگریزی بولتے تھے۔ میں نے سوچا "وہ کیا کہیں گے یہ خبر سن کر؟ اُن پر کیا گزرے گی؟" اور کھانے لگا۔

جعفر مرحوم فوج میں کلرک تھا۔ ایک دن اچانک اُس کے پیٹ میں سخت درد اُٹھا تھا اور اُس نے چیخ چیخ کر ساری بارک کو سر پر اُٹھا لیا تھا حتیٰ کہ اُس کے دوستوں نے اُسے فوجی ہسپتال میں پہنچا دیا تھا۔ وہاں کے ڈاکٹر صاحب قدامت پرست (؟) چکے تھے اور ان کی جنگ ۱۹۱۴ء کی طبی خدمات نہایت قابل قدر تھیں۔ جعفر کو انھوں نے تین مختلف مقامات پر چاک کیا اور بولے "میں نے سمجھا تھا کہ ان کی آنتوں میں یا تو گتھیاں پڑ گئی ہیں یا انھیں اپنڈی سائٹس ہے یا ان کی آنتوں میں پھوڑے ہیں۔ افسوس ہے کہ ان میں کوئی مرض نہ نکلا۔ اگر آپ لوگ کسی اور اسپشلسٹ کو دکھانا چاہتے ہوں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے، دکھا دیجئے۔" ڈاکٹر صاحب مریض اور اس کے اعزہ دونوں سے کافی آزردہ خاطر معلوم ہوتے تھے اور جواب کا انتظار کئے بغیر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ اس کے بعد جعفر مرحوم کی رگوں میں کئی گیلن گلوکوز ڈالا گیا اور اُن کے کئی انجکشن دیئے گئے۔ مگر ان دواؤں کا کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ بعض مریضوں میں اچھا ہونے کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی۔ اُس نے آنکھیں بند کئے ہوئے زبان سے ایک لفظ کہا "چلئے" اور اُس کے آنے کا انتظار کئے ہوئے بغیر مر گیا

[د]ویا جائے اُس نے صرف اُس قبول صورت نرس کو چڑانے کے لئے مانگی تھی جو اس کے مرنے کے ایک منٹ بعد چائے لیکر آگئی تھی اور آنکھوں میں آنسو [ب]ھرے ایک کونے میں کھڑی تھی۔ نرسوں کے بھی دل ہوتے ہیں اور جعفر بہت حسین لڑکا تھا۔ اب میں اور ماموں صاحب اس حادثہ کی خبر بدنصیب [ب]اپ کو سنانے والے تھے، اس لئے ناشتہ جلد اور پوشیدہ طور پر کرنا پڑا۔

ناشتہ سے فارغ ہوکر میں ساکت اور منتظر بیٹھ گیا کیونکہ یہ خبر پہنچانے کی مجھ میں ہمت نہ تھی۔ میں مٹھی باندھے اُس آہ وزاری کے طوفان کا انتظار کررہا تھا جو اب آنے والا تھا۔ آخرکار یہ طوفان ایک پھنسی پھنسی سی آواز کی شکل میں پھٹ پڑا۔ "ہائے جعفر۔ ہائے جعفر" اس قدر محتاط، روپے پیسے کے معاملے میں اس قدر باخبر آمدنی اور خرچ کے حساب میں اس قدر منہمک، یہ جسیم اور قوی ہیکل آدمی سارا ضبط کھو بیٹھا تھا۔ اُس کے بین سُنے نہیں جاتے تھے۔ وہ اپنے بیٹے کو پیار کی ہر اس اصطلاح سے پکار رہا تھا جو بہت چھوٹے بچوں کے لئے مخصوص ہیں۔ اس کا سارا جسم تھرتھرا رہا تھا اور اس کے چہرے پر آنسوؤں کا ایک چشمہ بہ نکلا تھا۔ اُس نے اپنا چہرہ ہاتھوں سے چھپا رکھا تھا، اس لئے آنسو اُس کی موٹی موٹی سفید اُنگلیوں کی درازوں میں سے نکل کر اُس کے ہاتھ کی پشت پر بہہ رہے تھے۔ میرا گلا گھُٹنے سا لگا۔ میری زبان چمڑے کی طرح موٹی اور خشک ہوگئی اور ایسا محسوس ہونے لگا جیسے میرا دم نکل جائے گا۔

ماموں صاحب جو موقع پر خاصے رقیق القلب بھی ہوجاتے ہیں آنسوؤں سے رو رہے تھے اور بڑے خلوص سے صبر و تحمل کی تلقین کرتے جاتے تھے "چچا دیکھئے کچھ تو ضبط کیجئے، اپنے دوسرے بچوں کا بھی تو خیال کیجئے، اس طرح تو آپ اپنی جان دے دیں گے۔ آخر ان آٹھوں کا دیکھنے والا بھی تو کوئی ہونا چاہیئے۔ جعفر آپ کا نہیں تھا، وہ خدا کی امانت تھی، اُس نے اپنی امانت آپ سے لے لی، آخر مرنا تو سب ہی کے لئے ہے، کوئی پہلے مرتا ہے کوئی پیچھے۔ یہ دن تو ہر ایک کو دیکھنا ہے۔"

لیکن رونے والے پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ تھا۔ احمد صاحب بہت زور سے چلّائے "میں بھی مرجاؤں گا، تم سُن لینا، میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ اے اللہ تو نے جعفر کو کیوں چھین لیا، وہ اسی وقت کیوں نہیں مرگیا تھا جب اُس کی ماں مری تھی، میں نے تو اسے ماں کی طرح پالا تھا۔ وہ تو میرے سینے پر سوتا تھا۔ ہائے میرا گورا بچہ!" وہ بیچارے اسی طرح چیختے رہے۔ اس عرصے میں بہت سے لوگ آگئے تھے۔ ایک باورچی تھا اور ایک کونے میں کھڑا بار بار ناک چھنک رہا تھا۔ اپنے راکھ بھرے ہاتھوں سے اُس نے اس قدر آنسو پونچھے تھے کہ اس کی آنکھیں سُرخ ہوگئی تھیں اور راکھ ہاتھوں سے چھوٹ کر چہرے پر منتقل ہوگئی تھی۔ دو موٹے موٹے دُکاندار اپنی دُکانیں چھوڑ کر آگئے تھے۔ ان میں ایک تو خاموش کھڑا رو رہا تھا، مگر دوسرا جو ذرا اتوُنی تھا مصیبت زدہ باپ کو سمجھا رہا تھا "سمجھ لو کہ یہ بھی ایک قرض تھا" غیر شعوری طور پر اُس کی زبان سے لین دین کی اصطلاحیں نکلنے لگیں۔ "اتنے دنوں تم کو قرض دیا تھا۔ تم نے قرض ادا کر دیا، اب تم آزاد ہوگئے۔ اب تو روتے روتے اگر تم مر بھی جاؤگے تو وہ واپس نہیں آئے گا۔ اب رونے سے کیا فائدہ؟"

اس عارضی دیوانگی سے سب کو ہوش میں لانا بھی ماموں صاحب ہی کا کام تھا۔ وہ اپنی کرسی پر سے اُچک کر کھڑے ہوگئے اور تیزی سے بولے "آخر اس غریب کا کچھ کام بھی تو کرنا ہے یا صرف روتے ہی پیٹتے رہیئے گا۔ وہاں اُس فوجی ہسپتال میں اس غریب کی میت بے گور و کفن پڑی ہے اور ہم لوگ یہاں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔" اس بیان کا سب پر بہت اثر ہوا، ہم لوگ سب اس مسئلے کی طرف متوجہ ہوگئے۔ رونا موقوف ہوگیا۔ احمد صاحب ایک بار بڑی زور سے چیخے اور لڑکھڑاتے ہوئے اپنے بہت بڑے ڈھیلے اور غلیظ اوورکوٹ کی طرف بڑھے جو ایک کیل پر لٹک رہا تھا۔ بڑی احتیاط اور انتہائی بے پروائی سے انھوں نے اس کی جیب سے ایک گندی کپڑے کی تھیلی نکالی، ذرا ہچکچائے اور پھر ایک جھٹکے سے تھیلی ماموں صاحب کی طرف بڑھا کر کہنے لگے "منّو میاں! یہ لو، اور جو تم سے بن پڑے کرو۔ اس وقت تو میں مسافر ہوں، تم لوگوں ہی کا سہارا ہے۔ اگر کچھ روپیہ کم پڑ جائے گا تو میں گھر پہنچ کر بھیج دوں گا۔" اس کے بعد انھوں نے بڑی تشویش سے آخری بار تھیلی کو دیکھا اور میں سمجھ گیا کہ اس میں جتنا روپیہ تھا وہ ضرورت سے بہت زیادہ تھا۔

ماموں صاحب تیزی سے کمرے کے باہر نکلے اور میں بھی اُن کے پیچھے لپکا کہ جہاں تک ممکن ہو تجہیز و تکفین کے مصارف پر نگاہ رکھوں۔ سڑک

پر گل کر ماموں صاحب نے ایک ٹیکسی کرائے پر لی اور میرے اعتراض کرنے سے پہلے ہی کہنے لگے: "ہسپتال چار میل دُور ہے۔ اگر تانگہ لیں گے تو بہت دیر ہوگی۔ میت خراب ہونے کا اندیشہ ہے۔" میں خاموش ہوگیا مگر ماموں صاحب لپک کر سامنے والی دُکان میں گئے اور ایک بلیک اینڈ وہائٹ سگریٹ کا ٹین خرید لائے۔ ٹیکسی میں بیٹھ جانے کے بعد انھوں نے اپنے مشاق ہاتھوں کی ایک حرکت سے سگریٹ کا ٹین کھولا۔ ایک میری طرف بڑھایا اور ایک خود جلاتے ہوئے بولے: "میاں یہ لوگ، یہ پورنیا والے سمجھتے ہیں کہ ہر کام مفت ہو سکتا ہے۔ خرچ کے نام سے ان کی جان نکلتی ہے۔ آخر کار تین ہی موقعے ہوتے ہیں جن میں دل کھول کر خرچ کرنا چاہیئے۔ پیدائش، شادی اور موت، ان موقعوں پر تو روپے کا خیال ہی نہیں کرنا چاہیئے اور تمھیں یہ تو قطعی اندازہ ہی نہیں ہے کہ یہ پنشن یافتہ اور سیر کتنے امیر ہوتے ہیں۔"

ظاہر تھا کہ ماموں صاحب بہت خوش تھے۔ جب کبھی وہ موٹر میں پھیل کر بیٹھے ہوئے سگریٹ پیتے ہوتے تو ان کے چہرے سے مسرت ٹپکی پڑتی۔ ان کی شخصیت بالکل بدل جاتی، خواہ وہ کسی کی موٹر ہو، اگر ماموں صاحب اس میں بیٹھے ہوں تو وہ قطعی اُن کی ملکیت ہو جاتی تھی۔ ان کی چھوٹی سے چھوٹی حرکت سے مالکانہ انداز کا اظہار ہوتا تھا، مثلاً اگر موٹر کا دروازہ کوئی اور بند کر دے تو وہ اسے کھول کر پھر سے بند کرتے۔ وہ سیٹ کے بائیں کونے میں گھُس کر گدی سے پیٹھ لگا کر اس اطمینان سے بیٹھتے گویا برسوں سے اسی موٹر میں بیٹھتے آئے ہوں۔ اُترتے وقت اس بے پروائی سے اُتر کر چل دیتے کہ جیسے موٹر پر سے چڑھنا اور اُترنا اُن کا چوبیس گھنٹے کا مشغلہ ہے۔ باوجود انتہائی کوشش کے میں ماموں صاحب کے ان کمالات کو کبھی نہ پا سکا۔ میں سیٹ کے اگلے کنارے پر ٹکا بیٹھا رہتا ہوں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دو چار منٹ میں اُترنا تو ہے ہی، پھر کہاں موٹر اور کہاں میں۔

فوجی ہسپتال کی عمارت نہایت بدنما، لمبی اور پست تھی۔ اس پردیسی کھپریل کی ٹیڑھی اونچی نیچی چھت ہندوستان کے افلاس کی شاہد تھی، اُس کی کچی دیواروں پر بڑی احتیاط سے سفیدی پھیری گئی تھی۔ چھوٹے چھوٹے کالے مدراسی سپاہی ملی دلی وردیاں پہنے پانچ پانچ چھ چھ کے گروہ میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے اور بیڑیاں سُلگا رہے تھے۔ چند سپاہی ایک بڑے اور سایہ دار گولڈ مہر کے نیچے لکڑی کے ایک بنچ پر بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کے پاس دوا کی ایک خالی بوتل تھی۔ گرد آلود سڑک سے کچھ فاصلے پر گنگا کا پانی دھوپ میں چمک رہا تھا۔ ہسپتال سے میت کا لانا بھی ایک مشکل مرحلہ تھا۔ لاریاں بہت مشکل سے ملتی تھیں۔ کیونکہ پٹرول ملنا تقریباً بند ہو گیا تھا۔ قبرستان ہسپتال سے دس میل دُور تھا اور قوم کے لوگوں سے یہ توقع فضول تھی کہ وہ جنازے کو اپنے کندھوں پر اتنی دور لے جائیں گے۔ دُوسرے یہ کہ قوم کے اتنے افراد وہاں موجود بھی نہ تھے۔

میں نے ہمت کر کے ایک کلرک سے پوچھا۔ "کیوں صاحب میت لے جانے کے لئے سرکاری ایمبولنس نہیں مل سکتی؟"

"ضرور مل سکتی ہے" اُس نے جوش سے کہا، "وہ مسلمان تھا" اگر ان کے ورثا چاہیں تو میت ہوائی جہاز میں رکھ کر اُن کے وطن بھیجی جا سکتی ہے اگر وہاں ہوائی جہاز اُترنے کی سہولتیں ہیں تو" اُس نے احتیاطاً یہ ٹکڑا جوڑا۔ میں بہت متاثر ہوا۔ آخر کار یہ فوج کا معاملہ تھا۔ گورنمنٹ ان لوگوں کے لئے سب کچھ کرتی ہے جو اس کے بچاؤ میں اپنی جانوں سے دریغ نہیں کرتے۔ البتہ ان چادروں کا مستعار لینا زیادہ دشوار ثابت ہوا جن میں میت لپیٹی ہوئی تھی۔ وہ سرکاری چادریں تھیں، ان کی واپسی کی ذمہ داری کون لیتا۔ میں نے اپنا نام پتہ وغیرہ درج کرا دیا اور وعدہ کیا کہ چادریں دُوسرے دن واپس ہو جائیں گی۔ "ان کے دھلوانے کی ضرورت نہیں۔ ایسے ہی واپس کر دیجیئے گا۔" کلرک نے مہربانی سے کہا۔ میں نے کہا "بہت اچھا شکریہ!" ایک سیاہ فام آدمی گٹھیا سی وردی پہنے ہوئے اپنی دو اُنگلیوں سے ایک گٹھری لٹکائے ہوئے لایا۔ گٹھری میں سے ایک گیرے رنگ کی قمیص کی دو آستینیں لٹک رہی تھیں۔ یہ بیچارے جعفر کے کپڑے تھے اور موت کی حقیقت کا ایک خاص انداز سے اظہار کر رہے تھے۔ سامنے میز پر مرحوم کا چشمہ رکھا ہوا تھا۔ جعفر ہمیشہ اسے لگائے رہتا تھا۔ اس وقت مجھے یہ بالکل غیر ممکن معلوم ہو رہا تھا کہ وہ چشمہ میز پر رکھا ہوا اور اُن کے شیشے کے پیچھے اُس کی نازک شرمیلی آنکھیں نہ ہوں۔

قبرستان ایک غبار آلود اور بے مرمت سڑک کے کنارے واقع تھا۔ سڑک میں اتنے گڑھے تھے کہ ایمبولنس اُس پر بہت دھیمی رفتار سے

ہچکولے کھاتی ہوئی چل رہی تھی۔ مجھے اس لاش پر رحم آنے لگا۔ کیونکہ ہمارا عقیدہ ہے کہ مُردے کا جسم ایک نوزائیدہ بچے کے جسم سے بھی زیادہ نازک ہوتا ہے۔ جب ہم قبرستان پہنچے تو دس بارہ آدمی میت کے استقبال کے لئے وہاں موجود تھے۔ ماموں صاحب نے اُتر کر بڑے خلوص کے ساتھ سب سے مصافحہ کیا اور اس داستانِ غم کو بڑے دردناک پیرائے میں بیان کرنے لگے "کیا بتائیں صاحب! ایک مصیبت آنے والی تھی آ گئی۔ نہ اس غریب کا دل کھول کر علاج کر سکے، وہ اپنے عزیزوں کو دیکھ سکا نہ دوستوں کو، ہائے کیا غربت کی موت ہوئی ہے۔ چچا کی حالت دیکھ کر تو کلیجہ پھٹتا ہے۔ بس ایک ہی لڑکا تھا، یعنی پہلی بیوی سے، دوسری بیوی سے ماشاءاللہ آٹھ اور ہیں، مگر آپ جانتے ہیں پہلے بچے کی بات ہی اور ہوتی ہے۔ ایسا نیک لڑکا تھا، سانا مگر اس پر بھی لاپرواہ تھا۔ دسمبر میں شادی ہونے والی تھی، کیا بتائیں صاحب، اب آپ لوگ اس غریب الوطن کی آخری خدمت انجام دیں، اس احسان کو ہم لوگ کبھی نہ بھولیں گے۔"

"واہ واہ صاحب! یہ تو ہمارا مذہبی فرض ہے۔" کئی آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں۔ "یہ تو ثواب ہے۔ ہر شخص اپنی آخرت بنانے کے خیال سے آتا ہے۔ اس میں احسان کا کیا سوال ہے۔"

ایک شخص جو قبرستان کا مجاور معلوم ہوتا تھا اور جس نے میت پر فوراً قبضہ کر لیا تھا، ماموں صاحب کے پاس آ کر چپکے چپکے باتیں کرنے لگا۔ ماموں صاحب نے جیب سے وہ تھیلی نکالی اور اُس کو علیحدہ لے گئے۔ میں بھی پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس آدمی کی شکل میں کبھی نہ بھولوں گا۔ اس کے چہرے پر اس منحوس پیشے کی پوری داستان گہرے نقوش میں کندہ تھی، اس کا قد بہت لانبا اور جسم بہت مضبوط تھا۔ اس کی کلائیوں کی موٹی موٹی رگیں اُبھری ہوئی تھیں اور ذرا سی جنبش سے حرکت کرنے لگتی تھیں، اس کا چہرہ بہت چوڑا، ناک بہت چپٹی اور رخساروں کی ہڈیاں بہت اونچی تھیں۔ چہرے پر بہت چھدرے بال تھے اور ان کا رنگ بھورا تھا، وہ اس قدر سخت تھے جیسے کسی پرانے برش سے نکال کر چپکائے گئے ہوں۔ چہرے کے خدوخال میں بلا کی درشتی تھی۔ ماموں صاحب کے گول چمکدار اور صحت مند چہرے کو وہ اس طرح دیکھ رہا تھا گویا دل میں یہ حساب لگا رہا ہو کہ یہ شخص کم از کم تیس برس اور جئے گا۔ یہ یہاں رہا اور مرا تو کہیں اچھی جگہ زمین لی جائے گی۔ کافی رقم ہاتھ آئے گی۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ یہ ابھی نہیں مر سکتا۔

ماموں صاحب کچھ ملتجیانہ انداز سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ "میں چاہتا ہوں کہ تم کو یکمشت روپیہ دے دوں۔ اس میں تجہیز و تکفین کے اخراجات، زمین کے دام، قبر کی کھدائی وغیرہ سب شامل ہو گی۔ بتاؤ کتنے میں سب کچھ ہو جائے گا۔ البتہ یہ خیال رکھنا کہ بیچارے غریب آدمی ہیں، سید ہیں، زیادہ خرچ نہیں سکتے۔ میں تمہیں سو روپے دیئے دیتا ہوں، کیوں؟"

مجاور نے کہا "ڈیڑھ سو دے دیجئے سب ہو جائے گا، اس سے کم میں میرا نقصان ہے۔" یہ اس فیصلہ کن طریقے سے کہا گیا کہ ماموں صاحب کچھ نہ کہہ سکے۔ روپے نکال کر اُس کے ہاتھ پر رکھ دیئے اور چلنے لگے۔ میں نے تھوڑی دُور ساتھ چلنے کے بعد کہا "ماموں اس کمبخت نے بہت روپے لے لئے۔" ماموں صاحب نے کہا "میاں یہی ہوتا ہے، یہ وقت سودا چکانے کا نہیں ہے۔ اگر میں ذرا بھی چوں چرا کرتا تو یہ موذی صاف کہہ دیتا کہ لاش کہیں دُھنیے جلاہوں کے قبرستان میں لے جاؤ، یہاں شرفا دفن ہوتے ہیں، مولوی رحمٰن صاحب جیسے عالم کے ساتھ اس نے یہی کیا تھا۔ سارے شہر میں سنسنی تھی۔ آخر چندہ کر کے پانچ سو روپے دیئے گئے تب ایسی جگہ قبر بنی جس پر سے تعزیئے گزرتے ہیں، پھر ہم تم کیا چیز ہیں۔ اچھا بھائی میں جاؤں، بیچارے چچا کو لے آؤں، کا رہنا بھی تو ضروری ہے۔ چاکلیٹ کھاؤ گے؟" یہ کہہ کر ماموں صاحب نے جیب سے چاکلیٹ کی ایک بہت بڑی تختی نکالی اور توڑ کر آدھی میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد جب مجھے ہوش آیا تو سخت تعجب ہوا کہ میں قریب قریب نادانستہ طور پر اُسے کھا رہا تھا۔ میں جلدی سے چاکلیٹ جیب میں رکھ پھر ان لوگوں میں آ کھڑا ہوا جو صرف ثواب کمانے کی غرض سے اتنی تکلیف اُٹھا کر اس اجل رسیدہ کے آخری رسوم ادا کرنے آئے تھے۔ یہ سیدھے سادے لوگ مجھ سے کس قدر مختلف تھے۔ میں دُنیا میں کسی کے کام نہ آتا تھا۔ اگر کسی پر کوئی قانونی مصیبت نازل ہوتی تو میں پوری فیس لئے بغیر اس کے کاغذات بھی نہ دیکھتا تھا۔ شادیاں ہوتیں تو جا کر دعوتیں ضرور کھا آتا، اگر کوئی مر جاتا تو تعزیت کے چند ٹوٹے

عاذ کہنے کے سوا ان کسی مرض کی دوا نہ تھا، اور یہ لوگ — ان بیچاروں کو نہ کوئی دعوت میں بلاتا تھا۔ نہ خوشی کے اور مواقع پر یاد کرتا تھا اور نہ مصیبت کے وقت کوئی ان کے گھر پر ازراہ ہمدردی جاتا تھا۔ مگر اس بُرے وقت میں جب لوگوں کے ہاتھ پیر مفلوج ہو جاتے ہیں۔ جب اُنھیں یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ میّت کے پیر مشرق کی طرف ہوتے ہیں یا جنوب کی طرف، جب انھیں یہ بھی علم نہیں ہوتا کہ میّت صابُون سے نہلائی جاتی ہے یا بیس سے یا بیر کی پتیوں سے، اس وقت یہ لوگ خندہ پیشانی سے بلا خوف و ہراس ان تمام رسوم کو ادا کرتے ہیں، جن کو ہم مغرب زدہ لوگ زندگی بھر بھولے رہتے ہیں مگر جن کے بغیر قبر میں جانے کی ہماری ہمت نہیں پڑتی۔

ان لوگوں کی ایک عجیب ہیئت تھی۔ ان کے پاجامے میلے تھے۔ جوتے پھٹے ہوئے تھے۔ اچکنوں پر پان اور سالن کے دھبّے تھے ٹوپیاں چکٹی تھیں اور داڑھیاں ایک عرصے سے قینچی کی حاجتمند، نہ یہ ہنس رہے تھے، نہ ان کے چہرے پر رنج ہی کے آثار تھے۔ البتّہ میت کے نہلانے اور کفنانے کے لئے جو سامان ضروری تھا اُسے وہ اس مہارت اور اطمینان سے استعمال کر رہے تھے جیسے ایک کلرک کچہری کے کاغذات اور فائیلوں کو۔

مجاور کا مکان اُس دالان سے تھوڑے فاصلے پر واقع تھا جہاں میّتیں نہلائی جاتی تھیں، یہ ایک کچّا مکان تھا اور چاروں طرف سے اس قدر بند تھا کہ اس میں کہیں ایک کھڑکی بھی دکھائی نہ دیتی تھی۔ البتّہ اس کے صحن کی دیوار بہت لمبی تھی اور اس کے بیچ میں ایک چھوٹا سا دروازہ تھا، جس پر ٹاٹ کا ایک پُرانا پردہ پڑا ہوا تھا۔ اس وقت اس دروازے کے سامنے سات آٹھ عورتوں اور پانچ چھ بچّوں کا ایک گروہ کھڑا تھا۔ تقریباً ہر بچّے کے ہاتھ میں کھانے کی کوئی نہ کوئی چیز تھی، روٹی کا ٹکڑا یا ایک کچّا امرود یا وہ مٹھائی جسے ہم پٹّی کہتے ہیں اور جو گڑ اور چنے کی دال سے بنتی ہے۔ ان میں سے ہر عورت اور بچّہ انتہائی غلیظ کپڑے پہنے تھا۔ سب بڑی دلچسپی سے ہم لوگوں کی طرف دیکھ رہے تھے اور آپس میں اشارے اور باتیں کرتے جاتے تھے۔

ان میں سے جس لڑکی پر میری نگاہ رُکی وہ کسی مجمع میں بھی جاذب توجّہ ہوتی اس کا قد اونچا اور جسم چھریرا تھا۔ عمر بیس سال کی رہی ہوگی۔ رنگ سانولا تھا مگر اس میں بلا کی کشش تھی۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں کسی جنگلی جانور کی آنکھوں کی طرح ہوشیار شفاف اور چمکدار تھیں۔ ہونٹ ذرا موٹے تھے مگر بُرے نہ معلوم ہوتے تھے۔ سب سے زیادہ دلکش اُس کے بال تھے جو بہت سیاہ گھنے اور گھنگھریالے تھے۔ شاید وہ عرصے سے بیمار رہی تھی کیونکہ اس کے بال نئے نکلے ہوئے معلوم ہوتے تھے اور بجائے پشت تک آنے کے صرف گردن تک آکر رہ گئے تھے جیسے باب (Bob) کرنے کے ارادے سے کاٹے گئے ہوں۔ اس کے کپڑے بہت ہی کثیف تھے، اُس نے تنگ چوڑی دار پاجامہ اور لمبا سفید کرتا پہن رکھا تھا۔ کرتے پر ایک بہت پُرانی غالباً ریشمی گہرے سُرخ رنگ کی واسکٹ پہن رکھی تھی جو اس قدر تنگ تھی کہ اُس کے سینے کے اُبھار کو صاف واضح کر رہی تھی۔ یہ واسکٹ ضرور کسی مرد کا تھا اور اس کے لئے خاصا لمبا بھی تھا ایک مختصر سا سیاہ دوپٹہ اس کی گردن میں پڑا تھا جس سے وہ بار بار اپنا مُنہ پونچھتی تھی۔

شام کے پانچ بج چکے تھے اور سورج امرودوں کے باغ کے پیچھے چھپ رہا تھا۔ جب میّت کے نہلانے کا کام شروع ہوا۔ وہی لڑکی تانبے کے دو میلے بڑے بڑے گھڑے اپنے دونوں ہاتھوں میں لٹکائے دروازے سے نکلی اور دالان کی طرف بڑھی جس کے دروں میں اب قناتوں کا پردہ لگا دیا گیا تھا۔ میں اسے دیکھنے لگا، وہ اس طرح چل رہی تھی جیسے اس کا سارا جسم لچکدار فولادی کمانی سے بنا ہو۔ اس نے بھی مجھے دیکھا۔ مگر اس کی آنکھوں میں ایک لامحدود حقارت اور بے توجہی کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ پانی کے بیسیوں گھڑے اسی طرح لاتی رہی۔ پانی لانے کی اس مشقت کا اس پر کوئی اثر نہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بغیر تکان کے چوبیس گھنٹے اسی طرح پانی لاسکتی تھی۔ مجاور کے مکان کے دروازے پر عورتوں کا گروہ اب بھی اسی طرح کھڑا تھا۔

شام ہو چکی تھی جب ایک ٹیکسی میں ماموں صاحب بیچارے جعفر کے والد کو لے کر تشریف لائے۔ ماموں صاحب نے ان کو ہاتھ پکڑ کر اُتارا اور پھر اُن کی کمر میں ہاتھ ڈال کر قریب قریب گود میں اُٹھائے ہوئے دالان کے سامنے ایک قبر کے چبوترے تک لائے اور اُنھیں وہاں بٹھا دیا۔

احمد صاحب کی شکل بالکل تبدیل ہوگئی تھی۔ پچھلے چند گھنٹوں میں وہ بالکل بوڑھے ہوگئے تھے۔ ان کے ہاتھ پاؤں لوتھ ہوگئے تھے اور ان کی آنکھیں آئی تھیں ان میں زور سے رونے کی طاقت بھی باقی نہ رہی تھی اور وہ سسک سسک کر خاموشی سے رو رہے تھے۔ اُن سے کسی نے نماز جنازہ کے لئے بھی نہ کہا البتہ جب میت کے آخری رسوم ادا ہوچکے اور تابوت قبر کے پاس اُتارا گیا تو غریب باپ کو اپنے بچے کے آخری دیدار کے لئے یہ ایسا کام تھا کہ مجھ میں تو کیا ماموں صاحب میں بھی اتنی ہمت نہ تھی کہ ان کو وہاں لے جاتے چنانچہ دو مضبوط دل والے انھیں وہاں پکڑ کر ہی وہ زمین پر بیٹھ گئے اور مُنہ پیٹ پیٹ کر رونے لگے۔ ان کے پاس الفاظ کا وہی محدود ذخیرہ تھا جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔ مگر اس بار ان کے غم کا طوفان زیادہ شدید تھا۔ وہ قبر میں کودنے کے لئے تیار ہوئے، انھوں نے سر زمین پر ٹپکا۔ آنکھیں پھوڑنے کے لئے اُنگلی آنکھوں پر لوگ انھیں جکڑے ہوئے تھے مگر ان کے جوش کا یہ عالم تھا کہ بار بار اپنے آپ کو چھڑا لیتے تھے۔ میں ان سے دور کھڑا آنکھوں پر رومال رکھے رو رہا تھا۔ ایک بار جب میں نے آنکھوں سے رومال ہٹایا تو یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ وہی لڑکی ہم لوگوں میں موجود تھی اور بڑی دلچسپی سے کو دیکھ رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب چمک تھی مگر چہرے پر نہ ہمدردی کے آثار تھے نہ افسوس کے، صرف ایک انہماک ناقابلِ تحلیل جذبہ تھا کہ اس کے چہرے سے ٹپکا پڑتا تھا۔

احمد صاحب کو لوگ پکڑ کر، قریب قریب اٹھا کر پھر اُسی چبوترے پر لے گئے جہاں وہ پہلے بیٹھے تھے۔ میں اور ماموں صاحب بھی اُن کے ساتھ ساتھ گئے۔ چبوترے پر پہنچ کر انھوں نے ایک عجیب حرکت کی جس سے کم از کم میرا تو خون خشک ہوگیا۔ انھوں نے دھماکے سے سر دو تین بار پتھر پر ٹپکا۔ ان کے ماتھے کی کھال بالکل کچل گئی تھی۔ وہ چند سیکنڈ تک بیٹھ کر ہلتے رہے اور پھر یکا یک بیہوش ہوکر گر پڑے۔ ہم چیخوں سے کئی آدمی دوڑ کر وہاں پہنچ گئے تھے۔ ان میں مجاور بھی تھا۔ اُس نے کہا "انھیں گھر میں لے چلئے انھوں نے تو سر پھوڑ لیا ہے" اُس مجاور نے جسمانی قوت کا ایسا مظاہرہ کیا جو مشکل ہی سے دیکھنے میں آتا ہے۔ اُس نے احمد صاحب کی بغلوں میں ہاتھ دے کر ایک میں اُنھیں اُٹھا لیا اور اپنے کندھے پر اس طرح ڈال لیا جیسے کوئی کسی بچے کو اُٹھاتا ہے۔ دالان کی پشت پر ایک چھوٹی سی کو جس میں ایک کھری چارپائی پڑی تھی۔ شاید یہ مجاور کی بیٹھک ہوگی۔ احمد صاحب کی پیشانی جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھی اور اس میں سے نکل رہا تھا۔ مجاور لوٹے میں پانی لایا۔ ہم لوگوں نے اُن کے چہرے سے خون دھویا اور اُن کی پیشانی پر ایک رومال باندھ کر اُن کو لانے کی ترکیبیں کرنے لگے۔

ماموں صاحب نے ٹھیک کہا تھا کہ رات کے بارہ بجے سے پہلے آخری رسوم ادا نہ ہوسکیں گی۔ چنانچہ جس وقت جعفر مرحوم کا مٹی ڈالا جا رہا تھا پورے بارہ بجے تھے۔ احمد صاحب ہوش میں آچکے تھے، انھیں زبردستی دو تین گھونٹ چائے پلائی گئی اور اب وہ آرام سے سو رہے تھے۔ مجاور نے اُن کے پلنگ پر سفید بچھونا بچھا دیا تھا۔ مجاوروں کے یہاں سفید چادروں کی کمی کبھی نہیں ہوتی۔ ماموں صاحب نے مناسب یہی سمجھا کہ احمد صاحب کو اس رات وہیں چھوڑ دیا جائے۔ انھوں نے کہا "اس وقت ان کو لے جانا سخت مصیبت ہے کہ گھر جائیں گے تو وہاں پہنچ کر اور روئیں گے۔ اس وقت انھیں نیند آگئی ہے۔ صبح تک طبیعت کچھ سنبھل جائے گی اور میں موٹر لا کر لے جاؤں گا۔ اس وقت تمھاری ممانی بھی پریشان ہوں گی۔" میں نے بھی یہ موقع غنیمت سمجھا اور تھوڑی دیر بعد گھر چلا آیا۔

دوسرے دن مجھے ایک مقدمہ کے سلسلے میں شہر سے باہر جانا تھا۔ موت اور اُس کے ساتھ جو رسوم وابستہ ہیں وہ میرے لئے اس قدر روح فرسا ہوتی ہیں کہ میں ان سے جتنی دور بھاگ سکتا ہوں بھاگ جاتا ہوں۔ چنانچہ جب میں دوسرے دن کانپور پہنچا تو وہاں ایک ہفتہ رُک گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس عرصے میں احمد صاحب پورنیا واپس جا چکے ہوں گے۔ جب میں واپس آیا تو واقعی وہ جا چکے تھے۔ اُسی شام کو ماموں صاحب آئے وہ حسبِ معمول خوش اور بشاش نظر آتے تھے۔ ان کی آنکھوں میں وہی شرارت آمیز ہنسی کھیل رہی تھی

یک اینڈ وہائٹ کا ایک نیا ٹین تھا اور گلے میں ایک بڑا خوبصورت اونی اسکارف، جو کسی طرح بھی چالیس روپے سے کم نہ رہا ہوگا۔
وچا بیچارے کا روپیہ ابھی تک چل رہا ہے۔
وں صاحب میرے خیالات کو بھانپ کر فوراً بولے "ہاں، یہ اُسی روپے میں سے خریدا تھا۔"
ں نے کہا "کم از کم کھاتو نہ کیجیئے۔" بولے "ارے میاں ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔ اس کے پاس بہتیرا روپیہ ہے۔ چالیس پچاس روپے میں
چ کردیئے تو کیا ہوا۔ کبھی تو کمبخت نے اپنے ہاتھ سے دس روپے بھی نہ دیئے۔

"کب گئے احمد صاحب؟" میں نے یہ پوچھا ہی تھا کہ ماموں صاحب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ میں نے کہا "اس میں ہنسنے کی
ہے۔" ماموں صاحب اور زور سے ہنسنے لگے اور پیٹ پکڑ کر دُہرے ہوگئے۔ جب ذرا ہنسی کم ہوئی تو بولے "بنّن میاں تم کو ایسی
وں کہ بھونچکّا ہوجاؤ۔" میں نے کہا "کیا ہوا ——؟" بولے "احمد چچا کل گئے، اور ان کے ساتھ ایک شخص اور بھی گیا۔"
ں نے پوچھا "کون ——؟"
ھوں نے کہا "وہی لڑکی حلیمن، وہ قبرستان کی ساحرہ"
ں نے کہا "کیا ——؟"
ہاں میاں، وہی لڑکی، تم نے بھی اُسے دیکھا ہوگا۔ کوئی مرد اُسے دیکھ کر بھول نہیں سکتا۔ وہی لڑکی جو اُس رات انھیں گھور گھور کر دیکھ رہی
تہ یہ ہوا کہ تم تو دوسرے دن بھاگ نکلے۔ جب میں صبح انھیں لینے پہنچا تو دیکھا کہ وہی لڑکی ان کی کوٹھری میں جھاڑو دے رہی ہے۔ جب
اُن سے چلنے کے لئے کہا تو بسور بسور کر کہنے لگے "میں اب یہاں سے نہیں جاؤں گا، میں جعفر کی قبر کا مجاور بن کر رہوں گا۔" میں نے کہا آپ
گئے ہیں، بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ گھر چلیئے، کیا یہ کوئی نرالی موت ہوئی ہے۔ وہ پھر رونے لگے مگر مجھے اُن کا رونا کچھ جھوٹا سا لگا۔ پھر
ں چاہتا ہوں کہ جب تک الہ آباد میں رہوں یہیں رہوں۔ اُسے اکیلا چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ دو تین روز بعد پورنیا چلا جاؤں گا
بہت اچھا آدمی ہے، مجھے کھلانے والنے کی کوئی تکلیف نہیں ہے۔ بس تم میرا سامان یہیں لا دو۔" خیر میں نے سامان پہنچا دیا۔ کل جب
ے لگے تو کیا دیکھتا ہوں کہ نئے ریشمی برقعے میں اُن کے ساتھ ایک محترمہ بھی ہیں۔ میں نے پوچھا "یہ کون ہیں؟" بولے "بھئی تمھاری
ما کی سخت تکلیف تھی۔ یہ بیچاری مجاور کی لڑکی بیوہ تھی، میں نے کہا تکلیف اٹھا رہی ہو۔ میرے ساتھ چلی جائے گی، اس کی پرورش بھی
ے گی اور گھر کا کام کاج بھی کرے گی۔" اور جانتے ہو اس بدمعاش مجاور کو کتنے روپے دیئے ہیں اُس لڑکی کے؟"
میں نے پوچھا "کتنے؟"
"سات سو روپیہ نقد اور پچیس روپیہ مہینہ تنخواہ، کھانا کپڑا علیٰحدہ۔"
میں نے پوچھا "آپ کو یہ سب کیسے معلوم ہوا؟"
ماموں صاحب بولے "فرحت میاں نے سارا معاملہ طے کیا انھوں نے مجھے بتایا۔"
"یہ کون بزرگوار ہیں؟" میں نے پوچھا۔
"وہی مولوی صاحب جنھوں نے تلقین پڑھائی تھی۔"

محمد تقی

(حلقہ اربابِ ذوق کراچی کے ایک جلسے میں پڑھا گیا)

مقامِ دوست

فضائے نیلگوں میں آسماں کی　　تبسّم پاشیوں میں کہکشاں کی

اُفق کے پار چھپتی روشنی میں　　زمیں پہ رقص پیرا چاندنی میں

تڑپتی بجلیوں کے سوزِ غم میں　　بھٹکتے بادلوں کے سرد دم میں

نوائے ساز کے جوشِ جواں میں　　جوانی کی اُمنگوں کے جہاں میں

کسی بیداد کش کے اشکِ خوں میں　　کسی بے درد کے دردِ دروں میں

کسی مایوس کی مجبوریوں میں　　کسی ناکام کی مہجوریوں میں

مقامِ دوست اے خورشید پایا

خورشید آرا بیگم

گاندھی جی کی عظمت

عظمتِ گاندھی پہ ابنائے وطن کو ناز ہے
کانگرس ہی کو نہیں ہر انجمن کو ناز ہے

وہ غریبوں کا سہارا وہ کسانوں کا رفیق
مہرباں تو مہرباں نامہربانوں کا رفیق

کس بلندی پر رہا اُس کا خرامِ زندگی
پست حالوں میں کہاں ایسا مقامِ زندگی

شان و شوکت اُس کے ترکِ آرزو سے شرمسار
جاہ و حشمت اس کے شوقِ جستجو سے شرمسار

گنجِ قاروں ایک مُردہ اس کا دفنایا ہوا
تاجِ شاہی اس کے استغنا کا ٹھکرایا ہوا

مشکلوں میں اس کی ہمت اس کی جرأت کامیاب
ہم نے دیکھی ہر جگہ اُس کی سیاست کامیاب

تیر سے تھا جس کو کچھ مطلب نہ تیغِ تیز سے
اس نہتے نے حکومت چھین لی انگریز سے

سب کو حیرت ہے کہ کیا اس نے یہ جادو کر دیا
بزدلوں میں کس طرح شیروں کا دم خم بھر دیا

قید خانہ اُس کے دم سے اک زیارت گاہ تھا
جیل میں بھی بندۂ کردہ چراغِ راہ تھا

اس کے لاغر جسم سے لرزاں جلالِ انگریز کا
ہیچ اس کے سامنے سارا کمال انگریز کا

زندگی اس شان کی تھی موت بھی اس شان کی
خدمتِ اہلِ وطن میں جان تک قربان کی

آہ اے مرحوم تیرا نیک ہونا جرم تھا
قوم کے اجزا کا گویا ایک ہونا جرم تھا

تیرے اُٹھ جانے سے تو سارا جہاں ماتم میں ہے
کون کہتا ہے فقط ہندوستاں ماتم میں ہے

اتحادِ باہمی کی وہ صدائیں اب کہاں
گلشنِ حبِّ وطن کی وہ ہوائیں اب کہاں

رہ نما کس کو بنائیں رہ نمائی ہو چکی
ناخداؤں سے اب ایسی ناخدائی ہو چکی

جوشؔ ملسیانی

گاندھی جی کا فلسفہ اخلاقیات

گاندھی جی کے متعلق یہ بالکل صحیح کہا گیا ہے کہ وہ رشیوں میں سب سے بڑے سیاست دان اور سیاست دانوں میں سب سے بڑے رشی تھے۔ وہ حقیقی
...میں ایک مفکّر نہ تھے بلکہ ایک سیاسی لیڈر اور مذہبی رہنما، لیکن انھوں نے اپنی سیاست اور مذہب کی بنیادیں اخلاقی اُصولوں پر رکھی ہیں اور اپنے
...خیالات میں اخلاقی اُصولوں کو سمو کر اہمسا اور عدم تشدد کی بنا پر زندگی کے مختلف شعبوں کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے موجودہ
...معاشی، سیاسی اور مذہبی مسائل کو نئے رنگ میں پیش کر کے ان کا نیا حل پیش کیا ہے اور یہ حل اخلاقی حل ہے، اس لئے ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں
...کا اپنا الگ فلسفۂ اخلاق تھا اور اس مضمون میں ہمارا مقصد اُن کے ان اخلاقی اصولوں پر ہی بحث کرنا ہے۔

مسائل اخلاق میں ہم گاندھی جی کو نطشے کا مدِ مقابل اور مہاتما بُدھ اور ٹالسٹائے کا جانشین کہہ سکتے ہیں۔ نطشے نے انسان میں مردانہ صفات
...خصوصیات کو خیر قرار دیا ہے اور اس کے مقابلہ میں بُدھ اور گاندھی وغیرہ نے نسوانی اور نازک صفات کو۔ گاندھی جی کے وہ اصول جن پر انھوں نے
...سے زیادہ زور دیا ہے تین ہیں۔ صداقت، اہمسا یا عدم تشدد اور عدم تعاون۔

اہمسا۔ ان تینوں اصولوں میں اہمسا کو سب سے زیادہ وقعت حاصل ہے۔ ہندو، بدھ اور جین مذاہب نے ہزاروں سال گزرے اہمسا پر
...زور دیا تھا۔ مہابھارت میں ہے کہ "اہمسا ہی اصل مذہب ہے۔ اہمسا کا مطلب صرف تکلیف نہ دینا اور جان سے نہ مارنا ہی نہیں ہے بلکہ دوسروں
...کے ساتھ بھلائی کرنا بھی اس میں شامل ہے۔ اصل اہمسا رحم اور قربانی ہے"۔ جین مت اہمسا کے صرف منفی پہلو پر زور دیتا ہے اور چھوٹے سے چھوٹے جانور
...کی جان لینا بھی جائز نہیں سمجھتا۔ بُدھ مت منفی اور مثبت دونوں پہلوؤں پر برابر زور دیتا ہے۔ اس میں ایک طرف جان لینے کی ممانعت ہے تو دوسری
...دوسروں کی جان کی حفاظت اور اُن کے ساتھ بھلائی کرنے کا حکم۔ گاندھی جی اس لفظ کو بہت ہی زیادہ وسیع اور عمیق مفہوم میں استعمال کرتے ہیں
...کے نزدیک اہمسا کے معنی دوسروں کی جان نہ لینے اور انھیں تکلیف نہ پہنچانے کے علاوہ دوسروں کی حفاظت کرنے کے بھی ہیں۔ وہ اس لفظ کو عدم
...تشدد کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں اور عدم تشدد بھی صرف اعمال میں نہیں بلکہ الفاظ اور خیالات تک میں بھی۔ صرف یہی نہیں کہ ہم دوسروں کے ساتھ
...نہ کریں بلکہ نہ دوسروں کے متعلق سخت و نازیبا الفاظ استعمال کریں اور نہ اُن کی برائی کا خیال دل میں لائیں اور یہی اصل اہمسا ہے۔

لیکن اعمال، الفاظ اور خیالات میں عدم تشدد برتنا اہمسا کا صرف منفی پہلو ہے اس کا اثباتی پہلو منفی پہلو سے بھی زیادہ باوقعت اور قابلِ لحاظ
...۔ اہمسا کے معنی دوسروں سے صرف بُرائی نہ کرنے اور برائی نہ چاہنے ہی کے نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ دوسروں سے بھی محبت کرنے کے ہیں۔ ہم خدا
...صرف صداقت کے ذریعہ پہنچ سکتے ہیں اور صداقت تک محبت کے راستہ۔ گاندھی جی کے لحاظ سے اہمسا ہم میں بے خوفی پیدا کر دیتی ہے۔ "صرف
...ایسی ہستی ہے جس سے ہمیں ڈرنا چاہیئے اور وہ ہستی ہے خدا کی۔ اگر ہم خدا سے ڈرتے ہیں تو اور کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر تم صداقت
...پر گامزن ہونا چاہتے ہو تو بے خوفی ایک لازمی شرط ہے۔ صداقت کے راستے پر بے خوفی سے گامزن رہنے کا نام ستیہ گرہ ہے۔ زندگی میں ہمیں نتائج
...سے بے پرواہ ہو کر صرف صداقت پر عمل پیرا ہونا چاہیئے۔ صداقت شر سے صلح نہیں کر سکتی اور اس لئے ستیہ گرہی کا فرض ہے کہ وہ شر کے ساتھ عدم تعاون
...سے پیش آئے لیکن تشدد کے ذریعہ نہیں بلکہ عدم تشدد کے ذریعہ"۔ گاندھی جی کے فلسفے میں ذرائع پر اتنا ہی زور دیا جاتا ہے جتنا مقصد پر۔ اعلیٰ سے اعلیٰ
...مقصد حاصل کرنے کے لئے بھی اگر تشدد دانہ ذرائع استعمال کئے جائیں گے تو اخلاقی طور پر اس کی کوئی وقعت نہ ہوگی۔

عدم تعاون۔ گاندھی جی شر سے مقابلہ کی بجائے اس سے عدم تعاون کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ مقابلہ میں تشدد کا ہونا لازمی ہے اور اُن کے

نزدیک تشدد چاہے وہ کسی شکل میں اور کسی مقصد کے لئے ہو، ناقابل قبول ہے۔ اس لئے شر سے مقابلہ کسی حالت میں بھی ٹھیک نہیں۔ شر کو ختم کرنے کا طریقہ اس سے عدم تعاون کرنا ہے نہ کہ مقابلہ "گناہ سے نفرت کرو نہ کہ گنہگار سے" ہمیں گنہگار کو ختم کرنے کی کوشش نہ کرنی چاہیئے بلکہ ہمارا فرض تو شر ختم کرنا ہے اور اس کا صحیح طریقہ اس سے عدم تعاون ہے۔ شر بذاتِ خود قائم نہیں رہ سکتا اور اگر ہم اس سے تعاون نہ کریں تو وہ بہت جلد ختم ہو جاتا ہے۔ کسی نظام کو روکنا اور اس پر حملہ کرنا جائز ہے، لیکن اس نظام کو چلانے اور عمل کرنے والوں سے مقابلہ کرنا خود اپنے سے مقابلہ کرنے کے مترادف ہے۔ کسی نظام پر بہترین طریقہ سے حملہ اس سے عدم تشددانہ طور پر تعاون کر کے کر سکتے ہیں۔ یہی وہ عدم تشددانہ عدم تعاون ہے جس نے سیاسی غیر ملکی حکومت کے شر کے خلاف سول نافرمانی کی شکل اختیار کی تھی۔

اہنسا اور عدم تعاون صرف انفرادی زندگی ہی میں ہماری رہنمائی نہیں کرتے بلکہ سیاسی، معاشی اور تمدنی زندگی میں بھی یہ اصول ہماری رہبر ہیں۔ گاندھی جی نے غیر ملکی حکومت کے خلاف سول نافرمانی کرتے ہوئے ان ہی اصولوں پر عمل کیا۔ سیاسی طاقت حاصل کرنے کے لئے گاندھی جی کا یہ ایک نیا تجربہ تھا اور حقیقت یہ ہے کہ بالکل ایک نئے قسم کا تجربہ تھا۔ تشدد ایک خراب نظام کو ختم تو کر سکتا ہے لیکن اخلاقی طور پر اس کا نتیجہ بہت برا ہوتا ہے جو پارٹی تشدد پر عمل کرتی ہے وہ اخلاقی سطح سے نیچے گر جاتی ہے۔ تشدد کا جواب تشدد ہی سے دیا جاتا ہے اور اس طرح ایک عرصے تک یہ چیز جاری رہ کر تمدنی زندگی کو برباد کر دیتی ہے، اس کے برخلاف عدم تشدد اور عدم تعاون کسی نظام کی برائیوں کو بالکل ختم کر دیتا ہے۔ یہ انسان کی طبیعت اور روح میں تغیر پیدا کر کے اس خراب نظام کو بالکل بدل دیتا ہے۔ سیاست کے علاوہ معاشی اور تمدنی زندگی میں بھی ان اصولوں پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ معاشی زندگی میں یہ اصول سرمایہ دارانہ نظام سے عدم تعاون اور گھریلو دستکاریوں کی ترقی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ تمدنی زندگی میں اس کا مطلب اونچے طبقے سے عدم تعاون ہے۔ جس نے دوسروں کو زندگی کے ابتدائی حقوق تک سے محروم کر رکھا ہے۔ غرض گاندھی جی کا سب سے بڑا ہتھیار عدم تشددانہ طور پر عدم تعاون ہے جنگ و مقابلہ۔ کیونکہ جنگ تو انسانوں کی ایک بڑی تعداد کا بے رحمانہ قتل ہے جو انسانی فطرت، صداقت اور عدم تشدد کے خلاف ہے۔ اس طرح عدم تشدد کی بنا پر قائم شدہ نئے نظام عالم میں نہ جنگ ہو گی اور نہ خونریزی۔

صداقت ۔ "میں نے اکثر اپنا مذہب 'مذہبِ صداقت' بیان کیا ہے۔ میں کچھ عرصے سے بجائے یہ کہنے کے کہ خدا صداقت ہے اپنے مذہب کو پوری طرح واضح کرنے کے لئے یہ کہنے لگا ہوں کہ صداقت خدا ہے۔" ان کے لحاظ سے خدا موجود ہے اور وہ صداقت و محبت ہے۔ تکمیل نفس صرف دوسروں کی خدمت کے ذریعہ ممکن ہے اور وہ اس طرح کہ ہم اپنے وجود کو تمام مخلوق انسان و حیوان میں مدغم کر دیں اور اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ زندگی ایک ہے۔ "خدا زندگی، صداقت، نور ہے۔ وہ محبت ہے، وہ خیرِ کل ہے، میرے نزدیک خدا صداقت و محبت ہے۔ خدا مجسم اخلاق ہے۔ خدا بے خوفی، روشنی اور زندگی کا اصل منبع ہے اور اس پر بھی وہ ان سب سے جدا اور پرے ہے۔ خدا ضمیر ہے۔ وہ ہم سے وہی برتاؤ کرتا ہے جو ہم دوسروں کے ساتھ کرتے ہیں۔ چاہے وہ انسان ہو چاہے حیوان۔ وہ ہمیں معاف کر دیتا ہے۔ وہ ہمیں ہمیشہ افسوس کرنے اور معافی مانگنے کے مواقع مہیا کرتا رہتا ہے۔ وہ دنیا کا سب سے بڑا جمہوریت پسند ہے اور اس نے ہمیں خیر و شر کے انتخاب میں بالکل آزاد چھوڑ دیا ہے۔"

دل کی صفائی ۔ گاندھی جی اپنے فلسفۂ اخلاق میں دل کی صفائی اور دل کی تبدیلی پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں۔ بغیر دل کی صفائی کے اہنسا، عدم تعاون اور صداقت ناممکن ہے۔ ایک وہ شخص جس کا دل صاف نہ ہو، نہ حقیقی معنوں میں عدم تعاون کی راہ پر گامزن ہو سکتا ہے اور نہ صداقت، نہ وہ اہنسا کے قابل ہے اور نہ عدم تشدد کے۔ "عالمِ کل اور روح صداقت کا مشاہدہ کرنے کے لئے یہ اشد ضروری ہے کہ انسان حقیر سے حقیر مخلوق سے اتنی ہی محبت کرے جتنی کہ اپنی ذات سے۔ جس شخص کے پیشِ نظر یہ مقصد اعلیٰ ہے وہ زندگی کے کسی شعبے میں کبھی بھی ناکام نہیں ہو سکتا اور یہی وجہ ہے کہ مجھ جیسے صداقت کے پجاری کو میدان سیاست میں آنا پڑا۔ دوسری مخلوق سے اپنی ذات کے برابر محبت کرنا بغیر دلی صفائی اور دلی تبدیلی کے ناممکن ہے۔" دلی صفائی ہی کا اصل مطلب اور مقصدِ زندگی کے ہر شعبہ میں راہ صداقت پر گامزن ہونا ہے۔ دلی صفائی کا اثر نہ صرف اپنی ذات پر اور اپنی زندگی پر ہوتا ہے

پر بھی ہوتا ہے اور اس طرح وہ شخص جو اپنے میں تبدیلی پیدا کر لیتا ہے اپنے پورے ماحول کو تبدیل کرنے میں زبردست معاون و مددگار ثابت ہوتا ہے۔

دلی صفائی کے اور بہت سے ذرائع میں سے ایک ذریعہ برت کا ہے۔ گاندھی جی نے دلی صفائی کے لئے اکثر خود برت رکھے۔ سیاسی اور تمدنی فضا کو شر سے محفوظ رکھنے اور شر کے بڑھتے ہوئے اثر کو روکنے کے بھی انھوں نے متعدد بار برت رکھے۔ انھوں نے سیاسی زندگی میں سب سے پہلے ہندو مسلم اتحاد کے لئے دہلی میں اکیس دن کا برت رکھا تھا اور پھر سب سے آخر میں بھی اسی شہر میں اور اسی مقصد کی خاطر برت رکھا۔ ان کے علاوہ اچھوتوں کو ہندوؤں سے علیحدہ نہ ہونے دینے۔ قضیہ راجکوٹ۔ ۱۹۴۳ء کا حکومت کے خلاف برت اور ہندو مسلم اتحاد کے لئے کلکتہ کا برت بھی بہت مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ جہاں تک چھوٹے موٹے برت کا تعلق ہے ان کی تعداد کا صحیح اندازہ کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ بہرحال اس کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ گاندھی جی کے برت کا نتیجہ دوسرے انسانوں کے دلوں کی تبدیلی ہوتا تھا یا دوسرے اشخاص صرف ان کی شخصیت کے دباؤ کی وجہ سے ان کی بات کو مجبوراً مان لیتے تھے۔

گاندھی جی محبت اور قربانی کی بنا پر ایک نئے قسم کے نظام کی بنیاد ڈالنا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہر فرد کو اس بات کا موقع ملے کہ جو صلاحیتیں قدرت نے اسے ودیعت کی ہیں وہ اسے بروئے کار لا سکے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اونچے درجے کو قوت کے ذریعہ ختم کرنا نہیں چاہتے۔ وہ تو جماعتی جنگ کے قائل ہی نہیں۔ نہ وہ اشتراکی ہیں، نہ اشتمالی، بلکہ اُن کا مقصد تو دلی تبدیلی ہے اور انھیں یقین ہے کہ دلی تبدیلی کے بعد امرا بذات خود اپنی خوشی سے غربا کے فائدے کے لئے وہ تمام دولت وقف کر دیں گے جو اُن کے مصرف میں نہیں آتی۔ ان کے نئے نظام میں قوت، طاقت اور تشدد کے لئے مطلق کوئی جگہ نہیں ہے۔ صرف محبت، اہنسا اور عدم تشدد کی بنا پر وہ ایک نئے نظام کی بنیاد رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ راہ باوجود لمبی ہونے کے سیدھی اور صاف ہے نہ اس میں انقلابات ہیں اور نہ فسادات۔ نہ خون کی ندیاں ہیں اور نہ جنگ کی ہولناکیاں۔ "میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ایک طریقے سے ہم سب چور ہیں۔ اگر میرے پاس کوئی ایسی چیز ہے جس کی مجھے فی الحال کوئی خاص ضرورت نہیں تو اُسے اپنے قبضہ میں رکھنے میں مَیں نے دوسروں کی حق تلفی کی ہے۔ قدرت ہمارا روزمرہ ضروریات کے لئے کافی اشیا مہیا کرتی ہے اور اگر ہم میں سے ہر ایک انسان صرف اپنی ضروریات کے مطابق لے اور اپنی ضروریات سے زیادہ پر قبضہ نہ جمائے تو نہ اس دُنیا میں مفلسی رہے اور نہ کوئی انسان فاقہ کشی سے کبھی جان ہی دے۔ میں نہ اشتراکی ہوں اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ امیروں سے اُن کا مال و دولت زبردستی چھین لوں۔ لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ انفرادی طور پر جو انسان اندھیرے سے روشنی میں آنا چاہیں گے انھیں یہی راہ اختیار کرنی پڑے گی۔ میں کسی کو زبردستی اُس کی ملکیت سے محروم کرنا نہیں چاہتا اگر میں ایسا کروں تو یہ اہنسا کے اصول کے خلاف ہوگا۔ تمھیں اور مجھے اپنی ملکیت کو اپنے قبضہ میں رکھنے کا اس وقت کوئی حق نہیں ہے جب کہ لاکھوں اور کروڑوں غریبوں کو تن ڈھکنے کو کپڑا اور پیٹ بھرنے کو روٹی نہ ملے۔ تمھیں اور مجھے اپنی ضروریات کو اپنے قابو میں کرنا چاہیئے۔ بلکہ ان میں سے بعض کو خود اپنی مرضی سے ترک کر دینا چاہیئے تاکہ غربا کے رہنے سہنے اور کھانے پینے کا انتظام ہو سکے۔"

گاندھی جی علم الحیات کے قوانین انتخاب طبعی، تنازع للبقا اور بقائے اصلح کو اخلاقی زندگی میں کوئی جگہ نہیں دیتے۔ بلکہ ان کے نزدیک شرافت، خدمت، عجز و انکساری، معافی، رحم، اخوانیت، ہمدردی، محبت اور انسانیت وغیرہ اصل قدریں ہیں نہ کہ قوت و طاقت، فخر، جنگ، اور فتح وغیرہ گاندھی جی کے خیال میں عزم للقوت قانون زندگی نہیں ہے بلکہ عزم للخدمت، غرض ہم دیکھتے ہیں کہ گاندھی جی کی اخلاقیات نطشے کی اخلاقیات سے نہ صرف مختلف بلکہ متضاد ہے۔ ایک مردانہ اور سخت صفات پر زور دیتا ہے اور دوسرا نسوانی اور نرم صفات پر، ایک کے لحاظ سے جو خیر ہے۔ دوسرے کے لحاظ سے وہ شر۔ اور جو پہلے کے لحاظ سے شر ہے وہ دوسرے کے لحاظ سے خیر۔ ان دونوں کے نظریات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ایک انسانی زندگی کے ایک پہلو پر اس قدر زور دیتا ہے کہ دوسرے کو بالکل فراموش کر دیتا ہے اور دوسرا تصویر کے صرف دوسرے رُخ کو دیکھتا ہے اور پہلے کی طرف بالکل متوجہ نہیں ہوتا۔ لیکن جب تک تصویر کے دونوں رُخ پوری طرح دیکھے اور سمجھے نہ جائیں صحیح نتائج پر پہنچنا ناممکن ہے۔

تنقید۔ جیسا کہ ابھی کہا جا چکا ہے گاندھی جی انسانی زندگی کے صرف ایک پہلو کی صفات پر زور دیتے ہیں اور دوسرے پہلو کو بالکل فراموش کر دیتے ہیں۔ اخلاقی قدریں صرف نسوانی اور نرم صفات پر مشتمل نہیں بلکہ مردانہ صفات بھی اُتنے ہی قابل قدر ہیں جتنے کہ نرم صفات۔ اگر زندگی میں

ہمدردی، محبت، عجز و انکساری، عدم تشدد، صداقت وغیرہ اخلاقی طور پر بہترین صفات ہیں تو طاقت و قوت، ہمت، بہادری وغیرہ کی وقعت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔

جہاں تک گاندھی جی کے بنیادی اصول عدم تشدد، عدم تعاون، صداقت اور دلی تبدیلی کا تعلق ہے یقیناً ان میں کافی صداقت موجود ہے لیکن عدم تشدد کو مقصد بالذات بنا لینا اور ہر اُس چیز کو جس میں تشدد کا شائبہ بھی موجود ہو اخلاقی طور پر شر سمجھ لینا منظور نہیں کیا جا سکتا۔ اچھے مقصد کے لئے بُرے ذرائع استعمال نہیں کئے جا سکتے لیکن ذرائع کی اچھائی یا بُرائی کو معیار بنا کر مقصد کو اس پر جانچنا بھی ٹھیک نہیں، مقصد بذاتِ خود اچھا ہوتا ہے یا بُرا۔ صرف اُس مقصد کو اچھا سمجھنا جس کے حاصل کرنے میں اچھے ذرائع استعمال کئے جائیں صحیح نہیں، اس چیز کو مان لینے کا تو یہ مطلب ہے کہ کوئی مقصد بذاتِ خود اچھا ہوتا ہی نہیں۔ وہ اچھا صرف اُسی صورت میں بن سکتا ہے جب اس کے حاصل کرنے کے لئے اچھے ذرائع استعمال کئے جائیں اور پھر اس سے زیادہ یہ کہ ان کے نزدیک ہر قسم کا تشدد شر ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک دشمن یا زہریلے جانور سے کسی کی جان بچانے کے لئے بمجبوری تشدد پر عمل کیا جائے تو نہ معلوم گاندھی جی کے لحاظ سے وہ فعل شر ہوگا یا نہیں، بہر حال خیر تو ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ اس میں بُرے ذرائع (تشدد) استعمال کئے گئے ہیں۔

شر میں ایک خاص جارحانہ قوت ہوتی ہے۔ گاندھی جی کا یہ خیال کہ شر بذاتِ خود قائم نہیں رہ سکتا اور اگر ہم اس سے تعاون نہ کریں تو وہ بہت جلد ختم ہو جاتا ہے صحیح نہیں، شر میں خود قائم رہنے بلکہ بڑھنے اور ترقی کرنے کی قوت موجود ہوتی ہے اسے ختم کرنے کیلئے صرف اس سے عدم تعاون کافی نہیں بلکہ مقابلہ ضروری ہے۔ عدم تعاون سے وہ ختم ہونے کے بجائے بڑھتا رہے گا۔ اس کے ختم کرنے کی صرف ایک ہی ترکیب ہے اور وہ ہے اس سے جنگ اور مقابلہ۔ اس کے خلاف جنگ کر کے ہی اسے ختم کیا جا سکتا ہے عدم تعاون کو بالذات مقصد بنا کر شر کے مقابلے سے پرہیز کرنا حقیقتاً شر کو بڑھنے کا موقع دینا ہے۔ عدم تشدد اور اہنسا خیر سہی، بہر حال خیرِ کل تو نہیں کہ اس کے بغیر کوئی چیز خیر ہی نہ ہو سکے۔ بعض اوقات شر کا تشدد آنہ طور پر مقابلہ کرنا ہمارا اخلاقی فرض ہوتا ہے اور ہم عدم تشدد اور عدم تعاون کے زیرِ سایہ اس فرض سے آزاد نہیں ہو سکتے۔ مقصد شر کو ختم کرنا ہے۔ اگر یہ مقصد عدم تشدد اور اہنسا کے ذریعہ حاصل ہو سکے تو بہتر ہے۔ لیکن اگر اس طرح حاصل نہ ہو سکے تو کیا اسے تشدد آنہ طور پر ختم کرنا ہمارا فرض نہیں؟ مقصد کو ذرائع پر سے قربان کر دینا اس سے زیادہ غلط ہے جتنا کہ ذرائع کو مقصد پر قربان کرنا۔

گاندھی جی ایک نئے نظام کی بنیاد ڈالنا چاہتے ہیں۔ یہ نظام کسی بیرونی طاقت کی قوت اور تشدد پر قائم نہیں ہوگا۔ بلکہ دلی تبدیلی، محبت اور اہنسا کی بنا پر وجود میں آئے گا۔ وہ سب سے زیادہ دلی تبدیلی پر زور دیتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ اگر انسان صداقت، اہنسا، عدم تشدد اور شر سے عدم تعاون کے اصولوں پر عمل کرے گا تو اس کا دل شر سے متنفر اور بالکل تبدیل ہو جائے گا۔ اس کے بعد نئے نظام کو قائم کرنے اور اُسے چلانے کے لئے نہ کسی بیرونی طاقت کی ضرورت ہوگی اور نہ تشدد کی، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس قسم کی تبدیلی ممکن ہے؟ اگر ہر انسان صداقت اور عدم تشدد کے اصولوں پر بذاتِ خود برضا و رغبت عمل کر سکتا تو دُنیا میں شاید شر کا وجود ہی نہ ہوتا اور اگر شر موجود ہوتا بھی تو نہایت حقیر مقدار میں جس کا مقابلہ نسبتاً آسان ہوتا۔ ہمارے سامنے جو مسئلہ ہے وہ تو یہی ہے کہ ہم ان اعلیٰ اُصولوں پر کس طرح عمل کریں اور جو چیزیں ہماری راہ میں حائل ہیں انھیں کس طرح دُور کریں۔ ہم اونچے طبقہ کو کس طرح اس بات پر آمادہ کر سکتے ہیں کہ وہ اُن تمام چیزوں کو جو اُن کے مصرف میں نہیں آتیں غربا کے لئے وقف کر دیں۔ وہ سرمایہ دار جن کی زندگی کا مقصد ہی غریب مزدوروں کے خون کا آخری قطرہ چوسنا ہے کس طرح اس قدر فراخ دل ہو سکتے ہیں کہ وہ اپنی دولت ان میں تقسیم کر دیں۔ پھر گاندھی جی کا یہ کہنا کہ ہم میں سے ہر ایک اپنی ضروریات کے مطابق لے عملی طور پر ہماری بالکل مدد نہیں کرتا۔ انسان کی ضروریات لامحدود ہیں اور یکے بعد دیگرے بڑھتی اور پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ دنیا کا شاید کوئی شخص بھی یہ نہ کہہ سکے کہ اس کے پاس اس کی ضروریات کے مطابق دولت ہے اور اسے مزید دولت کی ضرورت نہیں۔ ہر انسان جبلی طور پر جمع کرنے کا متمنی اور شوقین ہوتا ہے۔ اس میں جد و جہد، آگے بڑھنے، ترقی کرنے کا ایک جذبہ موجود ہوتا ہے جس کے بغیر زندگی زندگی نہیں رہتی۔ یہ جذبہ زندگی کے ہر شعبہ میں کار فرما ہوتا ہے۔ سیاسی زندگی میں یہ جذبہ طاقت حاصل کرنے کے درپے ہوتا ہے۔ معاشی زندگی میں دولت جمع کرنے، تمدنی زندگی میں اثر و رسوخ اور علمی زندگی میں قابلیت بڑھانے وغیرہ وغیرہ میں ظاہر ہوتا ہے، اگر یہ جذبہ انسانی زندگی میں موجود نہ رہے تو زندگی اور موت میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ گاندھی نے اس جذبہ کو زندگی میں کوئی خاص جگہ نہ دی اور نطشے نے اس کی وقعت میں مبالغہ آمیزی سے کام لیا ہے۔

سعید احمد رفیق

سازش

یہ ہندوستاں کی حسیں سرزمیں ہے
نہ جانے یہاں بارہا
کتنے گھوڑوں کی ٹاپوں سے
روندی گئی ہیں
امرکوٹ و چتوڑ و دلّی کی
پُر پیچ راہیں

اسی سرزمیں پہ
گرجتی ہوئی، تیز آہن کی جھنکار گونجی تھی
مغرب نے مشرق سے پھر کچھ کہا!

اور زنجیر کی چھم چھما چھم سے
بجنے لگے گوش — آواز آئی —
"اٹھو سونے والو سحر ہو چکی ہے
گجر بجنے والے ہیں
ناقوس کی یہ صدائیں
پہاڑوں کی چوٹی سے ٹکرا کے
پھر سرزمیں کی قیامت تک
[illegible]
[illegible]
[illegible]

جو کہ تاریخ کی ضربتِ ناشکیبا سے
گونجی تھی
مشرق کی سنگین تر وادیوں میں
پھر اک بار ٹکرا رہی ہے ہمالہ کی چوٹی سے
مغرب نے مشرق سے پھر کچھ کہا — ! اور —
زنجیر کی چھم چھما چھم سے
بجنے لگے گوش — آواز آئی — ؟

. . . .

محبّت نے انگڑائیاں لیں
تصوّر نے بڑھ کر ستاروں کو چوما

گری سر کے بل زندگی —
— زندگی خوفناک، آہنی، سرد روحوں کا
ستارے لگے ٹوٹنے آسماں سے
[illegible] نے انگڑائی لی
[illegible]
[illegible] زندگی [illegible]
یہ ہندوستاں کی [illegible]
نہ جانے یہاں کتنے
[illegible]
[illegible]

کے لی
زندگی
طرف باک
تنبیہ
کردیتے ہیں۔ اخلا

خواب کا ویرانہ

اُس نے آگے بڑھ کر ایک جھٹکے کے ساتھ کمبل کو اٹھا لیا۔ سگرٹ اور انگریزی تیل کی ملی جلی دھیمی دھیمی خوشبو سے اُس کا دماغ جیسے مہک اُٹھا۔ سفید
...ایسی چادر کی شکنیں درست کرتے ہوئے اُس کی نظریں سرہانے رکھے ہوئے تکیے سے ٹکرائیں اور اُسی پر جم کر رہ گئیں۔ تکیے کے غلاف کے وسط
...بز ریشم سے کڑھا ہوا ایک طوطا سبز سبز پتوں کے درمیان ایک شاخ پر اس انداز سے بیٹھا تھا جیسے شام کی بڑھتی ہوئی تاریکی میں کسی نرم اور لچکیلی
...پر بیٹھا اونگھ رہا ہو اور اچانک کوئی شریر بچہ کسی چھڑی سے شاخ کو چھیڑ دے اور طوطا چونک کر ٹیں ٹیں کرنے لگے۔ تمام غلاف سرخ سبز پھولوں کے
...سے پٹا پڑا تھا اور اوپر کے رُخ پر ایک شعر بھی کڑھا ہوا تھا۔

یہ تکیہ ـــ اُس نے دھیرے سے جھک کر اسے اُٹھا لیا۔ جب آپا نے اس کا غلاف تیار کیا تھا تو اُن کے سلیقے کی کیسی دھوم مچی تھی، امّاں نہال ہو ہو کر
...ب کو دکھاتی پھرتی تھیں ـــ "میری بچی، اللہ اُس کے نصیب اچھے کرے، دیکھو تو کیا اچھے کام بناتی ہے،" اور قریشیہ، بتول اور حمیدہ کی ماؤں نے تو مارے
...کے اپنی اپنی لڑکیوں کو ڈانٹ پلانی شروع کر دی تھی۔ "اللہ ماریوں سے کچھ بھی نہیں ہوتا، اب زرینہ بھی تو ہے ایسے ایسے غلاف بناتی ہے۔ نمائش میں
...تو یہ ڈھیروں انعام لے ـــ" مگر ایک مرتبہ جب اُس کی چچی نے اُسے اپنے یہاں بلایا تھا اور وہ آپا کی خوشامدیں کر کے وہ غلاف اپنے ساتھ لے گئی تھی تو چچی
...کے اونچے بال بنانے والی خوبصورت سی لڑکی ریحانہ اسے دیکھ کر بے تحاشا ہنس پڑی تھی ـــ "تمہارا غلاف ـــ بھئی، یہ تو آؤٹ آف فیشن
...ہو گیا ہے اب ـــ" اور وہ خاک بھی نہ سمجھتے ہوئے بُرا سا مان کر بولی تھی ـــ "واہ، نمائش میں رکھنے کے قابل ہے۔" اور ریحانہ پر پھر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔

"واقعی نمائش ہی کے قابل ہے۔ نمائش، ہی، ہی، کھی ـــ" وہ برابر ہنسے ہی چلی جا رہی تھی۔

"تو کوئی بات بھی ہو ہنسنے کی بھلا ـــ لو، واہ ـــ بات بھی ہو کوئی، واہ" وہ جھنجلا جھنجلا کر کھسیانے لگی تھی۔

یُوں تو خیر وہ ریحانہ کی بات سے متاثر ہونے والی نہیں تھی۔ مگر کل جب آپا تکیے پر وہ غلاف چڑھانے لگیں تو اُسے خیال آیا کہ ریحانہ آخر پڑھی لکھی ہے،
...ئی سب پڑھے لکھوں کی پسند بھی قریبًا ایک سی ہوتی ہے۔

"بھئی آپا، یہ غلاف تو ـــ" وہ کہتے کہتے رک گئی،

"ہاں کیا ہے اسے؟" آپا نے پوچھا۔

"...ہیں۔ بڑھیا ہیں" اُس نے ایک دم بات بدل دی۔

"...کے لئے اچھے ہی تو چاہئیں ـــ"

...گئی۔ بھلا وہ آپا سے کیسے کہہ دیتی کہ آپا یہ غلاف جو آپ بدل رہی ہیں اب پُرانے فیشن میں شمار ہونے لگے ہیں اور میں نہیں چا...
...جلد سے مجھے بدمذاق سمجھیں۔

...نہیں، میں نے یہ تکیہ بھلا اُٹھا کر کیوں نہیں رکھ دیا تھا، جانے انھوں نے کیا سوچا ہوگا اُسے دیکھ کر ـــ مگر اس پر رات
...نے اپنے دل کو سمجھا لیا۔

...مگر وہ اس دروازے سے داخل ہوئے ہوں گے تو ـــ، نہیں بھائی میز کی آڑ تھی، یہ بھی اچھا ہی تھا جو میں نے یہاں
...کر اطمینان کا سانس لیا۔

سازش

یہ ہندوستاں کی حسیں سرزمیں ہے
نہ جانے یہاں بارہا
کتنے گھوڑوں کی ٹاپوں سے
روندی گئی ہیں
امرکوٹ وچتوڑ و دلّی کی
پُر پیچ راہیں

اسی سرزمیں پہ
گرجتی ہوئی، تیز آہن کی جھنکار گونجی تھی
مغرب نے مشرق سے پھر کچھ کہا!

اور زنجیر کی چھم چھما چھم سے
بجنے لگے گوش — آواز آئی —
"اٹھو سونے والو سحر ہو چکی ہے
گجر بجنے والے ہیں
ناقوس کی یہ صدائیں
پہاڑوں کی چوٹی سے ٹکرا کے
پھر دم نہ لیں گی قیامت تک
آکاش گھومے گا محور پہ
ناچے گی سنگین توپوں کی چنگھاڑ!"

وہی اک صدا —
جو کہ تاریخ کی ضربتِ ناشکیبا سے
گونجی تھی
مشرق کی سنگین تر وادیوں میں
پھر اک بار ٹکرا رہی ہے ہمالہ کی چوٹی سے
مغرب نے مشرق سے پھر کچھ کہا — ! اور —
زنجیر کی چھم چھما چھم سے
بجنے لگے گوش — آواز آئی — ؟

. . . .

محبت نے انگڑائیاں لیں
تصور نے بڑھ کر ستاروں کو چوما

گری سر کے بل زندگی —
— زندگی خوفناک، آہنی، سرد روحوں کا مدفن
ستارے لگے ٹوٹنے آسماں سے
جہنم نے انگڑائی لی
ساز گونجے
دمادم لگی زندگی رقص کرنے
یہ ہندوستاں کی حسیں سرزمیں ہے
نہ جانے یہاں کتنے ایسے ہی
لاکھوں، ہزاروں ستارے
شب و روز دم توڑتے ہیں!

حسن شہیر

خواب کا ویرانہ

اُس نے آگے بڑھ کر ایک جھٹکے کے ساتھ کمبل کو اٹھالیا۔ سگرٹ اور انگریزی تیل کی ملی جلی دھیمی دھیمی خوشبو سے اُس کا دماغ جیسے مہک اُٹھا سفید
ـ رالیسی چادر کی شکنیں درست کرتے ہوئے اس کی نظریں سرھانے رکھے ہوئے تکیے سے ٹکرائیں اور اُسی پر جم کر رہ گئیں۔ تکیے کے غلاف کے وسط
ـ بز ریشم سے کڑھا ہوا ایک طوطا سبز سبز پتوں کے درمیان ایک شاخ پر کچھ اس انداز سے بیٹھا تھا جیسے شام کی بڑھتی ہوئی تاریکی میں کسی نرم اور لچکیلی
ـ پر بیٹھا اونگھ رہا ہو اور اچانک کوئی شریر بچہ کسی چھڑی سے شاخ کو چھیڑ دے اور طوطا چونک کر ٹیں ٹیں کرنے لگے۔ تمام غلاف سرخ سبز پھولوں کے
ـں سے پٹا پڑا تھا اور اوپر کے رُخ پر ایک شعر بھی کڑھا ہوا تھا۔

یہ تکیہ ـــ اُس نے دھیرے سے جھک کر اسے اُٹھالیا۔ جب آپا نے اس کا غلاف تیار کیا تھا تو اُن کے سلیقے کی کیسی دھوم مچی تھی، امّاں نہال ہو ہو کر
ـیک کو دکھاتی پھرتی تھیں ـــ "میری بچی، اللہ اُس کے نصیب اچھے کرے، دیکھو تو کیا اچھے کام بناتی ہے، اور قریشہ، بتول اور حمیدہ کی ماؤں نے تو مارے
ـں کے اپنی اپنی لڑکیوں کو ڈانٹ پلانی شروع کر دی تھی۔ "اللہ ماریوں سے کچھ بھی نہیں ہوتا' اب زرینہ بھی تو ہے ایسے ایسے غلاف بناتی ہے۔ نمائش میں
ـ تو یہ ڈھیروں انعام لے ـ" مگر ایک مرتبہ جب اُس کی چچی نے اُسے اپنے یہاں بلایا تھا اور وہ آپا کی خوشامدیں کر کے وہ غلاف اپنے ساتھ لے گئی تھی تو چچی
ـ دیچے اونچے بال بنانے والی خوبصورت سی لڑکی ریحانہ اسے دیکھ کر بے تحاشا ہنس پڑی تھی ـــ "تمھارا غلاف ـــ بھئی' یہ تو آؤٹ آف فیشن
ـ ہو گیا ہے اب ـــ" اور وہ خاک بھی نہ سمجھتے ہوئے بُرا سامان کر بولی تھی ـــ "واہ' نمائش میں رکھنے کے قابل ہے۔" اور ریحانہ پر پھر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔

"واقعی نمائش ہی کے قابل ہے۔ نمائش' ہی' ہی' کھی ـ" وہ برابر ہنسے ہی چلی جا رہی تھی۔

"تو کوئی بات بھی ہو ہنسنے کی بھلا ـ لو، واہ ـ بات بھی ہو کوئی' واہ" وہ جھنجلا جھنجلا کر کھسیانے لگی تھی۔

یُوں تو خیر وہ ریحانہ کی بات سے متاثر ہونے والی نہیں تھی۔ مگر کل جب آپا تکیے پر وہ غلاف چڑھانے لگیں تو اُسے خیال آیا کہ ریحانہ آخر پڑھی لکھی ہے
ـ اور بھئی سب پڑھے لکھوں کی پسند بھی قریباً ایک سی ہوتی ہے۔

"بھئی آپا' یہ غلاف تو ـــ" وہ کہتے کہتے رک گئی،

"ہاں کیا ہے اسے؟" آپا نے پُوچھا۔

"کچھ نہیں۔ بڑھیا ہیں" اُس نے ایک دم بات بدل دی۔

"پگلی' مہمانوں کے لئے اچھے ہی تو چاہئیں ـــ"

اور وہ چپ ہو گئی۔ بھلا وہ آپا سے کیسے کہہ دیتی کہ آپا یہ غلاف جو آپ بدل رہی ہیں اب پُرانے فیشن میں شمار ہونے لگے ہیں اور میں نہیں
کہ ہمارے مہمان ہیں' بلکہ خاص طور سے مجھے بدمذاق سمجھیں۔

اونہہ! کیسی بیوقوف ہوں میں' میں نے یہ تکیہ بھلا اُٹھا کر کیوں نہیں رکھ دیا تھا، جانے انھوں نے کیا سوچا ہو گا اُسے دیکھ کر ـــ مگر اس پر بھلا
نظر ہی کہاں پڑی ہو گی اُن کی۔ اُس نے اپنے دل کو سمجھایا۔

واہ' پڑی کیسے نہ ہو گی، اچھا بھلا اگر وہ اس دروازے سے داخل ہوئے ہوں گے تو ـــ 'نہیں بھائی میز کی آڑ تھی' یہ بھی اچھا ہی تھا جو میں
میز رکھ دیا تھا۔ اُس نے پلنگ کے گرد گھوم کر اطمینان کا سانس لیا۔

جانے آپا کو کیا ہو گیا ہے۔ ابھی جو وہ فرنی کی پرچیں نعمت خانے میں رکھ کر آئی ہے بھلا اُن پرپستوں کی ہوائیوں سے welcome لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کے منع کرنے پر بھی آپا اسی صفائی اور انہماک سے ویلکم بناتی رہیں۔ مگر جب وہ پرچوں کو نعمت خانے میں رکھنے گئی تو اُس نے انگلی سے ساری ہوائیوں کو خلط ملط کر دیا، اگرچہ انھیں ادھر اُدھر بکھیرتے ہوئے اسے بڑا دُکھ سا محسوس ہوا تھا۔ جانے آپا نے کس محنت سے لکھا تھا بیچاری، اُسے اُن پر ترس بھی آیا، لیکن اگر وہ دیکھ لیتے تو ——؟

سرد ہوا کا ایک جھونکا تیزی سے اندر داخل ہوا اور کھڑکی میں رکھی ہوئی کھلی تیل کی شیشی کو اُلٹ گیا۔ اُس نے جلدی سے آگے بڑھ کر تیل کی شیشی کو اٹھا لیا اور گرے ہوئے تیل کو کپڑے کے ایک چیتھڑے سے صاف کر کے پاس ہی اوندھے پڑے ہوئے آئینے کو اٹھا کر، سلیقہ سے کھڑکی میں رکھ کر جس اپنی صورت اس نے دیکھی تو اُسے لگا جیسے آئینے میں چھی کی دُبلی پتلی خوبصورت سی لڑکی ریحانہ جھانک رہی ہے۔ واقعی وہ ایسی خوبصورت ہے کیا؟ اسے آئینے پر یقین ہی نہ آ رہا تھا یہ اس کے ہونٹ آنکھیں، اور بھرے بھرے سُرخ و سفید رخسار —— وہ مسحور سی ہو کر آئینے میں گھورنے لگی۔

"ساجرہ —— اری ساجرہ! کہاں ہے تو ——" اُس کی ماں نے اُسے آواز دی۔

"ابھی آئی اماں ——" اُس نے کہا اور سہم کر جلدی سے آئینہ چھپا دیا، اگر اماں اسے آئینے میں اپنی صورت دیکھتے ہوئے دیکھ لیتیں تو؟ "جوان لڑکیاں آٹھوں پہر آئینہ نہیں دیکھا کرتیں ——!" ہونہہ! ویسے تو اماں کو جوانی کا بڑا احساس ہے، لیکن —— اونہہ! وہ تو ایسے آنکھیں بند کئے بیٹھی ہیں جیسے ہماری زندگی بہار کے خوشنما اور نوخیز پھولوں سے پٹی پڑی ہو۔ انھیں کیا پتہ کہ ہماری دنیا کتنی ویران ہے، اُف جیسے گرمیوں کی سنسان اور اداس دوپہر ہائے کیسی اداس ہوتی ہیں یہ دوپہریں —— اور انھیں کاٹنا کس قدر مشکل ہوتا ہے خصوصاً جب سارا گھر مزے سے پڑا سو رہا ہو تو تنہائی کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے اور دوپہریں کتنی طویل ہو جاتی ہیں —— مگر اُس کی آپا تو نہ جانے کس طرح اپنی عمر کی یہ پہاڑ سی دوپہریں گزار کر سہ پہر میں بھی کبھی کی قدم رکھ چکی تھیں۔ مگر وہ —— اُس نے ایک بار پھر آئینے میں جھانک کر دیکھا۔ کیا واقعی یہ سحر کار آنکھیں اُس کی ہیں، یہ موٹی موٹی سیاہ آنکھیں اوں، کھئی ہوں گی ——" وہ لاڈ سے ٹھنکی "میں تو یہاں کمرہ صاف کرنے آئی تھی —— تو یہ کوٹ کھونٹی پر لٹکا دوں ——" کوٹ کو اٹھاتے ہوئے وہ کھونٹی کی طرف بڑھ گئی۔ اور یہ قلم —— نہ چاہنے کے باوجود اُس نے کوٹ کی جیب میں سے آہستہ سے کھینچ لیا۔ اللہ! کتنا پیارا ہے یہ قلم، بالکل اُنہی کی طرح، وہ لجا گئی —— ارے اماں سن لیں تو کیا کہیں بھلا؟ مگر میں نے انھیں دیکھا ہے، ایک بار نہیں دسیوں بار، میں کل سے چھپ چھپ کر انھیں جھانک چکی ہوں، اب بڑی کہتی رہیں اماں! واہ —— وہ مسکرا کر پیار سے قلم پر ہاتھ پھیرتی رہی، اور بھئی دیکھیں اس اٹیچی میں کیا ہے، اس کا اشتیاق بڑھ لگا —— اوں ہوں، کسی کی چیزوں کو یوں دیکھنا ٹھیک نہیں —— وہ دو ہی قدم چل کر رک گئی —— مگر بھئی اٹیچی اچھی طرح بند بھی تو نہیں، کوئی جھ دینگر گھس گیا تو مفت میں غریب کے سوٹ کا ناس کر دے گا، اس نے ایک جھپاکے سے اٹیچی کا ڈھکنا اٹھا دیا۔ سینٹ کی ہلکی ہلکی خوشبو اس کے نتھنوں گھسنے لگی۔ سلیقے سے رکھی ہوئی رنگ برنگی ٹائیاں دیکھ کر اُسے محسوس ہوا جیسے وہ خوبصورت خوبصورت جھنڈیاں ہوں، رنگ برنگی لہراتی ہو جھنڈیاں، جو کسی شادی کے موقع پر حسین حسین پودوں کے پیچھے سے بار بار جھانکنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ چوکلیٹ رنگ کا پیارا سا سوٹ اُسے بہت ہی اچھا لگا اور یہ ہلکی ہلکی خوشبو جیسے کسی نے فضا میں عطر ہی عطر بکھیر دیا ہو، اُس کی آنکھیں نیند کے احساس سے بند ہونے لگیں اور مسحور ہو کر اُس نے اپنا سر اٹیچی پر ٹکا دیا۔ اسے محسوس ہوا جیسے اُس کی مضطرب روح میں جلتی ہوئی آگ کی رفتار کچھ دھیمی پڑ گئی ہے، لال لال اُٹھتے ہوئے شعلوں کی لپٹ کم ہو گئی ہے اور ایک عجیب ٹھنڈک اور سکون نے اُس کی جگہ پر کر لی ہے۔ مگر اُس کے دل کا خلا اور بھی وسیع ہوتا جا رہا ہے —— اور —— اسے محسوس ہوا جیسے اس کا وجود ہی ایک خلا ہو —— گہرا اور وسیع خلا —— کون جانے یہ باریک سی جھلّی جو بظاہر اُسے ڈھانپے ہوئے ہے وقت پھٹ جائے اور پھر —— اور پھر —— اُس نے بےچین ہو کر، اٹیچی کو اپنے سینے سے لگا کر زور سے بھینچ لیا۔

باورچی خانے کی چمنی میں سے نکلتے ہوئے، مُڑتے، بل کھاتے دھوئیں کا عکس، دیوار پر پڑ رہا تھا اور وہ اُسی لرزتے ہوئے عکس کو بڑے غور دا

سے دیکھ رہی تھی ۔ دھوئیں کے ساتھ ساتھ اُس کی نگاہیں بلا روک ٹوک آگے بڑھ جاتیں اور جب دُھواں اپنی دستوں میں پہنچ کر ادھر اُدھر گم ہو جاتا تو اُس کی نظریں ایک دم نیچے پلٹ آتیں ۔ گھر بھر میں سناٹا چھایا ہوا تھا ۔ اماں صحن کے دُوسری طرف اپنے مٹر کے پَودوں میں پانی دے رہی تھیں اور آپا چپ چاپ پلنگ پر بیٹھی بھیا کا سوئیٹر بُن رہی تھیں ۔ ابا کسی دوست سے ملنے اس کے گھر گئے ہوئے تھے اور مجو اور خورشید کو تو اس نے صبح سے دیکھا ہی نہ تھا ۔ البتہ کوّے کبھی کبھی کائیں کائیں کر کے خاموشی کو چیر دیتے تھے ۔ یا کبھی کوئی مرغی کٹکٹاتی ہوئی باورچی خانے میں گھس جاتی تو لمحہ بھر کے لئے اماں کی آواز گھر میں گونج جاتی، "لینا بھئی، مرغی کہیں دُودھ نہ کھول دیتے" اور پھر وہی خاموشی، وہی سکوت فضا پر مسلط ہو جاتا۔

"ابکے تو سردی ہی نہیں پڑی ۔ کیوں آپا ؟" اس نے خاموشی سے اکتا کر یونہی بات چھیڑنے کے لئے کہا۔

"ہاں، اور ذرا دیکھ تو سہی، چولھے میں آگ ہے کہ نہیں ، میرا تو خیال ہے ، کبھی کی بُجھ بھی چکی - بج بھی تو دو گئے ہیں، اونہہ ! کوئی کہاں تک انتظار کرے، آہی نہیں چکتے وہ ابا کے مہمان !"

"کام میں دیر ہو گئی ہو گی ۔" اُس نے ڈرتے ڈرتے آپا کے چہرے پر نگاہ ڈالی، خفگی اور بیزاری کی لہریں آپس میں ٹکرا رہی تھیں۔

"ہونہہ ! تو یہاں کوئی نوکر بیٹھا ہے اُن کا جس وقت جی چاہتا ہے چلے آتے ہیں مُنہ اُٹھا کر ۔ سرائے سمجھ رکھا ہے ۔ واہ !"

وہ خاموش بیٹھی رہی۔

"مجھ سے اب کھانا گرم نہ ہو سکے گا، کوئی بات بھی ہو، جیسے 'جیسے' اونہہ !" انھوں نے بیزاری سے سر جھٹک دیا۔

"میں گرم کر دوں گی آپا ۔" وہ دھیرے سے بولی۔

اور آپا کی آنکھوں میں محبت اُمڈ آئی ۔ "پگلی ! تکلیف تو تجھے بھی ہو گی ہی نا ؟'

"ٹھہرئیے میں کمرے میں جھانک کر دیکھتی ہوں، بس اب آہی رہے ہوں گے ۔"

وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی وہاں سے چلی گئی —— مردانے کا وہ چھوٹا سا کمرہ جس میں گھر بھر کا بہترین اثاثہ جمع تھا خاموشی میں ڈوبا ہوا معلوم ہوتا تھا ۔ گہرا سکوت اور مکمل خاموشی —— ہلکے نیلے سرسراتے ہوئے پردے آپس میں جیسے سرگوشیاں سی کر رہے تھے اور فرش پر بچھی ہوئی نموئی جاجم کے رنگ برنگے پھول جامد اور ساکت پڑے ایک دوسرے کو گھور رہے تھے ۔ سگرٹ اور تیل کی ہلکی ہلکی خوشبو غایب ہو چکی تھی اور ہوا جیسے اونگھ سی رہی تھی ۔ اُس نے سر اٹھا کر اپنے ماحول کے اس سناٹے اور تنہائیوں کو محسوس کیا اور پھر کھوئے ہوئے انداز سے کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی —— گلی بھی سنسان پڑی تھی، البتہ پرلی طرف ذرا فاصلے پر چند چھوٹے چھوٹے بچے فٹ بال کھیل رہے تھے ۔ ایک بار ایک چھوٹے سے بچے نے فٹ بال کے زور سے ٹھوکر ماری تو وہ گلی ہی کی طرف مکان کی دیوار سے لگی ہوئی مجو کی کیاری میں آ پڑا اور پھر جو بھاگ دوڑ مچی تو مجو کے سُرخ سُرخ لہلہاتے ہوئے پوپی کے سارے پھول بچوں کے پاؤں تلے آ کر کچلے گئے ۔ مجو کو یہ پھول اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھے ۔ انھیں پھولوں کی خاطر نہ اپنے سکول کے ماسٹر جی سے ایک بار پٹ بھی چکا تھا ۔ کھیلوں کے گھنٹے میں جب ماسٹر جی بچوں کو کھلانے کے بجائے انھیں پھولوں کے بیج دے کر بھیجتے کہ وہ گراؤنڈ صاف کر کے دم انھیں بو دیں ۔ ایک دن بیج بوتے بوتے اُس نے اور لڑکوں کی نظریں بچا کر تھوڑے سے بیج ایک پڑیا میں چھپا کر اپنی جیب میں رکھ لئے تھے مگر ہم نے اتفاقاً اُسے بیج چھپاتے دیکھ کر ماسٹر جی سے بڑھا چڑھا کر اُس کی شکایت لگا کر اُسے مار بھی پڑوا دی تھی ۔ لیکن اُس نے ماسٹر جی کے مارنے کے بعد بھی وہ بیج واپس نہیں کئے تھے —— وہ اُن پھولوں کی پنکھڑیاں نیچے کے رُخ باندھ کر ایک پتلی سی ڈنڈی بیچوں بیچ تاگے سے باندھ دیتا تھا اور ایک ننھی منّی سی گڑیا بن جاتی تو وہ یہ خوبصورت گڑیا اپنی عزیز ترین دوست جمیلہ کو دے دیتا جس کے صلے میں جمیلہ اپنے بھائی کی کرکٹ کھیلنے کی گیندیں اُسے چرا کر لا دیتی تھی، جسے خریدنے کے لئے بار بار مچلنے پر بھی وہ آج تک اماں سے پیسے حاصل نہ کر سکا تھا ۔

"میں بُلاتا ہوں مجو کو ۔" اُس کے دوست رفعت نے دھمکی دی اور چلا اُسے بُلانے ۔

اب کیا ہوگا؟ اُس نے سوچا "شاید مُجو ان بچوں کو پیٹے۔ شاید اپنی کیاری کی بربادی دیکھ کر خود ہی رونے لگے' یا شاید — !

دیکھئے افضل بھائی! — یہ ہیں ہماری آپا —" مُجو اسے کھڑکی میں کھڑا دیکھ کر بے تحاشہ چلّایا — وہ بے طرح گھبرا گئی۔ اس نے پلٹ

ما' وہ دروازے میں کھڑے مسکرا رہے تھے۔ عجیب گھبراہٹ اور پریشانی کے عالم میں' لمحہ بھر کے لئے وہ وہیں بے حس و حرکت کھڑی رہی اور پھر

ل کر وہاں سے بے تحاشہ بھاگی — اُس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ سارے بدن میں ایک ہلکی سی لرزش ہونے لگی تھی اور پیشانی پر پسینے

ے ننھے قطرے چمک رہے تھے۔

"اوہ! تمھاری آپا — تم ٹھیک کہتے ہو مُجو — سچ مچ بہت اچھی ہیں یہ تو!" اُن کی آواز نے اُن کا تعاقب کیا

"اور افضل بھائی' گاتی تو بہت ہی اچھا ہیں یہ!" پھر مُجو کی آواز آئی۔

اور وہ دھڑکتے ہوئے دل کو سنبھالتی باہر آکر چارپائی پر بے دم سی ہو کر گر پڑی۔ اگر ابا اُسے کمرے میں دیکھ لیتے تو پھر — تو کیا ہوتا — تو

ا دل سینے سے بُری طرح ٹکرانے لگا اور دم یوں پھولنے لگا گویا وہ کہیں دُور' بہت دُور سے بھاگ کر آرہی ہو۔

اس دن وہ تمام وقت اپنی نس نس میں ایک ناقابلِ فہم مسرت محسوس کرتی رہی۔ بات کرتے کرتے وہ مسکرا پڑتی اور چلتے چلتے ٹھہر کر گھبرائی

ہوں سے ادھر اُدھر دیکھنے لگتی اور پھر شرما کر آنچل سر پہ کھینچ لیتی۔ پورے دن دو متبسم لبوں کے نکلے ہوئے الفاظ نغمہ بن کر اس کے کانوں میں

ں گھومتے رہے اور ناچتی ہوئی شریر آنکھیں ذہن میں گھومتی رہیں۔ سارا دن ہوا مسرت سے سیٹیاں بجاتی دروازوں کے شیشوں سے ٹکراتی رہی

رڈیو رھم میں پڑا ہوا ٹاٹ کا پردہ جھوم جھوم کر رقص کرتا رہا۔ "اوہ! تمھاری آپا —" کام کرتے کرتے وہ چونک پڑتی۔ اس کا انگ انگ خوشی

ں ڈوب جاتا۔ گویا اُس نے اپنی زندگی کا مقصد پالیا ہو — مگر یہ سب کیوں؟ اجنبی ہونٹوں سے نکلے ہوئے چند الفاظ' آخر اس کے لئے اتنی اہمیت

ہوں رکھتے ہیں؟ مسکراتا ہوا انجانا چہرہ آخر کیوں بار بار اس کے ذہن میں گھوم رہا ہے اور کیوں آخر تھرکتی ہوئی سیاہ سیاہ پتلیاں اُس کے دل کے

خوابیدہ تاروں میں جھنکار پیدا کر رہی ہیں — آخر یہ سب کیوں' لیکن وہ صرف یہی جانتی تھی کہ اُس کی مضطرب اور بے چین روح سکون سے

آشنا ہو رہی ہے' اور بس — تمام گھر والوں کے رات کو اپنے بستروں میں دبک جانے کے بعد وہ آہستگی سے دروازہ کھول کر چپکے سے باہر صحن

میں نکل آئی۔ آسمان سیاہ سیاہ بادلوں سے گھرا ہوا تھا اور چند ٹمٹماتے ہوئے تارے آپس میں آنکھ مچولی سی کھیل رہے تھے۔ کبھی کوئی ستارہ اُبھر کر ڈوب

جاتا اور کبھی کوئی ڈوب کر اُبھر آتا۔ کتنی ہی دیر تک وہ کھڑی انھیں تکتی رہی' تکتی رہی — بلا مصرف' بلا مقصد — یکایک بادلوں کا ایک بڑا

سا ٹکڑا اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر بہت دُور چلا گیا اور اس کی جگہ روشن اور چمکدار ستارے جھلملانے لگے' بالکل اسی طرح جیسے اُس کے تاریک

اور اندھیرے دل میں مدت کے بعد' اچانک وہ سیاہ بادل کا ٹکڑا چھٹ جانے کے بعد' ننھے منے دیئے ٹمٹمانے لگے تھے۔

ٹہلتے ٹہلتے وہ مردانے کے اُس حصے کے بالکل قریب آگئی' جہاں اس کے دل کی اس نئی تحریک کا البیلا ٹھہرا ہوا تھا۔ مگر ایک مبہم سا خیال' ایک

موہوم سا خطرہ بجلی کی سی سُرعت سے اُس کے دل میں کوندگیا' لیکن کیا' اگر کسی نے اسے وہاں دیکھ بھی لیا تو وہ کہہ سکتی ہے کہ وہ غسلخانے کا دروازہ بند

کرنے آئی تھی — وہ اطمینان سے آگے بڑھ گئی' اُس کا جی چاہا کہ وہ کچھ گائے' یہ بتانے کے لئے کہ مُجو کچھ غلط نہ کہتا تھا' وہ واقعی بہت اچھا گاتی ہے اور

اُس کی آواز درحقیقت بہت دلکش اور پیاری ہے۔ مگر جانے وہ کیا سوچیں — کبھی خیال کریں کہ کیسی بے باک لڑکی ہے' کیسی —' مگر جب ہی

گانا جو اُس نے اپنے پڑوس کے ریڈیو پر سُنا تھا خود بخود اُس کے لبوں پر مچلنے لگا تو وہ چونک پڑی — "مجھے معلوم نہ تھا میری یہ حالت ہوگی" — وہ

سوچنے لگی کہ واقعی ان کے ہاں پہلے بھی آخر مہمان آتے ہی رہے ہیں۔ مگر ایسی حالت تو کسی کے آنے پر نہ ہوئی تھی۔ اگرچہ پچھلے چند ماہ سے ان کے ہاں کوئی نہ آیا

تھا' مگر کچھ عرصہ پہلے تو اُسے اچھی طرح یاد ہے' اُن کے ہاں اپنے عزیز رشتہ داروں' پڑوسیوں کے علاوہ محلے کی اور بھی بہت سی عورتوں کا میلا سا لگا رہتا

تھا جو گھر میں گھستے ہی اُس کی ماں پر سوالوں کی بوچھار شروع کر دیتی تھیں۔

"ہے ہے ان جوان جوان لونڈیوں کو ابھی تک بٹھا رکھا ہے تم نے؟"

"ارے کب تک بٹھائے رہوگی انھیں؟"

اور کوئی مولوی قسم کی تو آتے ہی وعظ شروع کردیتیں ——"اللہ تعالیٰ فرماتا ہے دو باتوں کے لئے جلدی نہ کرنا گناہ میں داخل ہے۔ قرض ادا نہ کرنا اور جوان لڑکیوں کا بیاہ نہ کرنا۔"

شروع شروع میں تو وہ خوش ہوئی تھی کہ چلو بلا سے ان بوڑھیوں کے کہنے سننے سے اماں کو کچھ خیال آجائے گا۔ مگر اماں نے تو ان کی باتوں کو سننے کی گویا قسم کھا رکھی تھی، اور اب وہ روز روز ایسی ہی باتیں سن سن کر تنگ آگئی تھی۔ اکثر اس کی دور پرے کی خالہ، چچی یا پھوپھی آکر اسے اس کی بے چارگی کا اس طرح احساس دلاتی تھیں کہ اس کا جی بے اختیار رو دینے کو چاہتا تھا اور وہ خاموشی سے جی ہی جی میں گھلتی ہوئی دعائیں مانگتی رہتی کہ ایسے مہمان تو اس کے یہاں آکر کبھی نہ پھٹکیں اور پھر جب کافی عرصہ تک نہ جانے کیوں ان کے ہاں کوئی نہ آیا تو کیسا اس کا جی تڑپتا کہ کوئی تو انھیں آکر جھانک ہی لے۔ کوئی بھی، آخر اس یکساں اور سپاٹ زندگی میں کوئی تو دلچسپی کی راہ نظر آئے۔ اور جب اس کا جی کسی سے ملنے کے لئے بہت ہی بےچین ہو جاتا تو وہ صحن میں نکل کر دھوپ میں بیٹھ جاتی اور کوئی اکا دکا کوا منڈیر پر بیٹھ کر کائیں کائیں کرتا ہوا نظر آجاتا تو وہ جھٹ سے اپنے ابا کے حجامت بنانے کے آئینے کا چھوٹا سا ٹکڑا جسے آئینہ ٹوٹ جانے پر اس نے سنبھال کر رکھ لیا تھا دھوپ میں کچھ اس طریقے سے نچاتی کہ اس کی روشنی کوے کی آنکھوں میں پڑ جاتی اور وہ وہاں سے اڑ جاتا تو کہتی —— "دیکھا آپا، آج ہمارے یہاں ضرور کوئی آئے گا کوا بولتا ہوا اڑا ہے۔" مگر تمام دن انتظار کرنے کے بعد بھی کوئی ان کے ہاں نہ آتا تو وہ بڑی مایوسی سے کہتی "اچھا بھئی، کل ضرور آئے گا کوئی —— میرا دل جو کہہ رہا ہے۔" اور آخر ایک دن اس کے دل نے سچ بول ہی دیا اور بھیا کا عزیز دوست افضل ان کے ہاں آگیا۔ افضل کو اپنی نوکری کے سلسلے میں اسی شہر میں کسی سے ملنا تھا اور بھیا بھی اسے بہت دن سے بلا رہے تھے۔ مگر جس دن اس کے دوست کو آنا تھا اسی دن بھیا کو کسی ضروری کام کی وجہ سے باہر جانا پڑ گیا۔ یہ کام اتنا غیر متوقع تھا کہ وہ افضل کو اطلاع تک نہ دے سکے اور ——

رات ہی سے اس کا جی اپنے کاہی دھنک لگے دوپٹے کو اوڑھنے کے لئے مچل رہا تھا اور صبح ہوتے ہوتے تو یہ جذبہ اور بھی گہرا ہو گیا مگر گھر وہ بلا کسی وجہ کے اسے اوڑھ بھی تو نہ سکتی تھی۔ اماں کی تو نہ جانے کیا عادت تھی کہ جہاں اس نے منہ ہاتھ دھو کر ذرا ڈھنگ کے کپڑے بدلے اور انھوں نے للکارا —— "اے ساجدہ کہاں چلی؟" اس وقت اس کا جی کٹ کر رہ جاتا، اس کا جی چاہتا کہ وہ بپھر کر کہے "خدا کے گھر——" اور ایک دم اسے خیال آگیا کہ آج تین بجے بعد دوپہر بتول کے یہاں میلاد شریف میں اس کا بلاوا ہے اور اب ایک بج چکا تھا۔ بس یہ ٹھیک ہے اب اماں کیونکر منع کر سکیں گی، کپڑے تھے ایسے ہی ایسے موقعوں کے لئے تو سنبھال کر رکھے جاتے ہیں۔ اگرچہ اماں نے تو اسے معمولی ململ ہی کا دوپٹہ بنا کر دیا تھا اب اس سے انھیں کیا کہ اس نے اپنے سلیقے سے اسے رنگ چن کر اور دھنک لگا کر اس قابل کر لیا تھا کہ وہ اچھے اچھے موقعوں پر بھی اسے اوڑھ سکتی تھی۔ یہ دھنک خریدنے کے لئے اس نے کتنی مشکلوں سے پیسے جمع کئے تھے۔ اپنے لمبے لمبے سیاہ بالوں میں کنگھی کرنے کے لئے اس نے دروازے کے شیشے میں جھانک کر دیکھا تو اسے اپنی شکل بہت ہی پیاری لگی۔ آنکھوں میں کاجل کی پتلی سی لکیر، اور شانوں پر سرسراتا ہوا رنگین دوپٹہ بہت ہی دلکش لگا تھرتھراتے ہوئے پتلے پتلے ہونٹ ——، اس نے خشکی سے انھیں مسل ڈالا' یہ اتنے خشک کیوں ہیں، اداس اور بے جان سے؟ اور یکایک اس کے ذہن میں چچی کی لڑکی ریحانہ ابھر آئی اور اس کے سرخ سرخ رسیلے لب بھی، جنھیں وہ لپ اسٹک سے رنگ لیتی تھی۔ کاش اس کے پاس بھی ہونٹوں کو رچانے والی وہ لالی ہوتی تو کتنا اچھا تھا، اس کے لال لال رنگے ہوئے ہونٹ کتنے پیارے لگتے، پھر تو وہ ریحانہ سے بھی زیادہ خوبصورت نظر آتی —— مگر —— اور کیسا برا ہوا کہ اماں نے اسے پانچویں کے بعد ہی سکول سے اٹھا لیا تھا۔ وہ سوچنے لگی، اگر صرف پانچ جماعتیں وہ اسے اور پڑھنے دیتیں تو وہ بھی ریحانہ ہی کی طرح اپنے لمبے لمبے بالوں کی دو چوٹیاں گوندھا کرتی، اپنے زردی مائل سفید ناخنوں کو بڑھا کر ان پر گلابی پالش

کیا کرتی اور اپنے پتلے پتلے ہونٹوں کو تنگ کر کے مزے سے انگریزی بولا کرتی، مگر اماں کو تو ــــ اُس نے بے بسی سے سامنے نظریں گاڑ دیں۔ سامنے میز پر ابا کی ٹائپ کرنے کی مشین میں ایک کاغذ چڑھا ہوا رکھا تھا، جیسے ابا ابھی ٹائپ کرتے کرتے کسی کام کے لئے یونہی چھوڑ کر چلے گئے تھے ــــ بھلا کیسے کرتے ہیں ابا ٹائپ ــــ اُس نے اُس پر یونہی انگلیاں پھیرنی شروع کر دیں۔ ایک بار جو اُس کی اُنگلی ایک حرف سے زور سے ٹکرائی تو کھٹ سے آواز نکلی اور فوراً ہی اُسے خیال آگیا کہ یہاں سے ٹائپ کرنے کی آواز ابا کے مہمان بخوبی سُن سکتے ہیں اور غیر ارادی طور پر اُس کی انگلیاں تیزی سے مشین پر گردش کرنے لگیں۔ وہ سوچ رہے ہوں گے کہ بھئی یہ لڑکی خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ پڑھی لکھی بھی خوب ہے اور کون جانے وہ ابا سے کچھ میرے متعلق بات چیت بھی ــــ اُس نے شرما کر آنچل سر پر کھینچ لیا۔ مگر وہ کہا جائیں، شاید وہ سوچیں کہ ابا ہی ٹائپ کر رہے ہیں ــــ پھر ــــ! اُس نے نھی کی اماں کو بلا وجہ آواز دے ڈالی۔

"کیسے جھاڑو دیتی ہو تم نھی کی اماں، اتنا میلا فرش ــــ!"

"مگر بٹیا یہ تو ــــ" نھی کی اماں حیرت سے اُسے تکنے لگیں۔ کیونکہ آج تو انھوں نے فرش بہت صفائی سے جھاڑا تھا۔

"بس رہنے دو، اتنے عرصے سے یہاں ہو اور ابھی تک ڈھنگ سے کام کرنا بھی نہ آیا تمہیں؟" وہ مصنوعی خفگی سے بولی۔

اور نھی کی اماں کے جانے کے بعد اُس نے اطمینان سے پھر مشین پر انگلیاں چلانا شروع کر دیں۔ "اب تو وہ جان گئے ہوں گے کہ ــ انگلیوں کی رفتار اور بڑھ گئی۔

"ارے کون ٹائپ خراب کر رہا ہے؟" ابا کی بھاری آواز گونجی ــــ "ارے مجو! نہیں باز آتا تو، میں نے تجھے صبح بھی منع کیا تھا کہ تو چیزوں کو مت چھیڑا کر ــــ"

"تو ــــ؟ کیا کر رہی ہے سحری!" وہ مجو کے بجائے سحری کو وہاں بیٹھے دیکھ کر رُک گئے۔

"کچھ بھی نہیں ابا ــــ" اُس کے لبوں کے گوشوں سے مسکراہٹوں کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں، یہ ابا نے اور بھی اچھا کیا، اب تو انھیں مر نام بھی معلوم ہو گیا ہو گا، اور ــــ

ابا نزدیک آگئے تھے۔

"ارے کیا کر رہی ہے پاگل، میرے سارے سرکاری کاغذ ناس کر دیئے۔ تجھے کس نے کہا تھا انھیں چھیڑنے کو ــــ ان کی کہیں کی ــ کی آواز تیز سے تیز تر ہو رہی تھی۔

شور وغل کی آواز سُن کر اماں بھی آگئیں ــــ "ارے کیا کر رہے ہو، ذرا دھیرے تو بولا کرو ــــ مہمان کیا کہیں گے بھلا ــــ؟" وہ گھٹی آواز میں بولیں۔

"مہمان ــــ؟ وہ تو صبح ہی چائے پی کر چلے گئے تھے، مگر یہ کاغذ ــــ" وہ سختی سے بولے۔

"صبح ہی چلے گئے تھے ــــ" وہ جیسے خواب میں بڑبڑائی۔ اُسے محسوس ہوا کہ اُس کے ویران اور اُداس دل میں جو ننھی ننھی نوخیز ارمانوں کی کلیاں خود بخود پھوٹ آئی تھیں، جڑیں پکڑنے سے پہلے ہی کسی بے درد ہاتھ نے انھیں اُکھیڑ دیا ہے ــــ اور پھر تپتے ہوئے ریگستان میں وہی گرم گرم لوؤں کے جھکڑ چلنے لگے۔

شاہین

انتظار

اُلجھ رہے ہیں تصوّر سے وسوسے کتنے
نہ جانے آج ابھی تک وہ کیوں نہیں آئی
کچھ ایسی بات نہیں پھر بھی دل پریشاں ہے

"غزل سناؤ کوئی دوست آج اچھّی سی"

"دل و دماغ میں کچھ مشعلیں جلائے ہوئے
ترے خیال سے بیٹھا ہوں لو لگائے ہوئے

"یہ مطلع واہ رے کتنا حسین خیال ہے یہ
بہت ہی خوب ہے اکبار پھر عنایت ہو"

.... "

"...................

"مذاقِ حُسنِ نظر اور کچھ نہیں ہمدم
مذاقِ حُسنِ نظر پر ہیں آپ چھائے ہوئے"

"تمھارا طرزِ ادا شاعری کی جان ہے دوست!"

میں سوچتا ہوں ابھی تک وہ کیوں نہیں آئی
ہر اک تاثرِ رنگیں بُلا رہا ہے اُسے،

"تمام عمر اُنھیں مجھ سے اجتناب رہا
خیال میں بھی وہ آئے تو کسمسائے ہوئے

"بڑی ہی پیاری غزل ہے، بڑی اچھوتی چیز
مبالغہ نہیں کچھ دوست، خوب کہتے ہو
تمھارے فکر کی کیا بات ہے مبارک ہو!"

نگاہ ڈھونڈ رہی ہے کسی کو اُس چھت پر
مری وہ شعرِ مجسّم بھی کاش آ جائے

حسن طاہر

محفلِ ادب

دِلی کا ایک پودا

پچھلے سال گرمی بھر ہر روز میں صبح کی سیر کے لئے پرانے قلعے تک جاتا تھا۔ وہیں ایک مالی سے میری ملاقات ہوگئی اور اسی مالی نے چند روز بعد میرے گھر کے سامنے والے لان میں پرانے قلعے سے ایک چنبیلی کا پودا لا کر لگا دیا۔ پودا اس قدر کمزور اور مختصر تھا۔ کہ مجھے اس کے پھلنے پھولنے کا کبھی خیال تک نہ آسکتا تھا مگر مالی کو اپنے پودے پر بہت اعتماد تھا۔ اسے یقین تھا۔ کہ یہ پودا بہت جلد جڑ پکڑ جائیگا۔ اور مجھے یقین تھا کہ چند روز بعد دلی کی مئی جون کی گرمی میں اس پودے کی گنتی کی چند شاخیں جل جائیں گی۔ لیکن آخر میں جیت مالی کی ہی ہوئی۔ واقعی پرانے قلعہ کا یہ پودا جڑ پکڑنے لگا۔ اس کی شاخوں میں نئی کونپلیں نکل آئیں۔ اور جب مالی نے جمنا کا پانی دے کر اسے سینچا تو اس چنبیلی کے پودے میں ہرے پتے نظر آنے لگے۔

جولائی کے مہینے میں اگرچہ بارش نہیں ہوئی لیکن اس کے باوجود مالی کی محنت نے اس پودے کو جلنے نہیں دیا۔ بلکہ مہینے کے آخر میں اس میں کلیاں نکل آئیں جس روز شام کو مالی نے چنبیلی کے وہ پھول توڑ کر مجھے دئے ہیں اس کی فاتحانہ مسکراہٹ دیکھنے سے تعلق رکھتی۔ اب میں بھی مالی کا قائل ہوگیا تھا۔ اور چنبیلی کے پودے سے میرا ایسا ہی قلبی تعلق پیدا ہوگیا تھا۔ جیسے کسی قریب المرگ مریض کے تیماردار اگرچہ اس سے کتراتے ہیں لیکن مریض کے شفا پانے سے انہیں ایک گونہ خوشی بھی ہوتی ہے۔

آخر اگست کا مہینہ شروع ہوگیا۔ اور ہمیں حکم ملا کہ ۱۵ اگست تک ہم دلی سے کراچی پہنچ جائیں۔ آہستہ آہستہ ہم نے سامان باندھنا شروع کیا۔ سامان کے بڑے بڑے عدد اور فرنیچر لکڑی کے صندوقوں اور کاٹ کے ٹکڑوں میں حفاظت سے بند کئے گئے اور روانگی سے کئی دن پہلے یہ سامان موٹر لاریوں اور چھکڑوں میں لاد لاد کر مال گودام میں بھیجا جانے لگا۔ مالی اب بھی اپنے مقررہ اوقات پر باغیچے کی دیکھ بھال کرنے کے لئے آتا تھا لیکن جب سے میری مصروفیت دوسرے کاموں کی وجہ سے بڑھی تھی۔ مجھے اس سے بات چیت کا موقعہ نہیں ملتا تھا۔ نہ مجھے اتنی فرصت تھی کہ چنبیلی کے پودے میں جو نئی کلیاں لگی تھیں۔ انہیں پھول بنتے دیکھوں۔ البتہ مالی اسی تندہی سے کُھرپی لئے باغیچے میں اِدھر اُدھر کھدائی کرتا رہتا تھا۔ آٹھویں دن جب ہمارے ہاں جمنا کا پانی ملنے کا نمبر آتا تھا۔ مالی اسی طرح پانی کا بڑا سا پائپ سانپ کی طرح اپنے جسم کے گرد باندھ کر لاتا اور تمام باغیچے اور لان کو پانی سے بھر دیتا۔ میں نے مالی سے کبھی کراچی جانے کا ذکر نہیں کیا مگر اسے نوکروں سے ہماری روانگی کا علم ہو چکا تھا ۱۳ اگست کو رات کے گیارہ بجے ہم گھر سے روانہ ہونے والے تھے۔ سارا سامان نئی دلی کے اسٹیشن پر جا چکا تھا۔ بس اب ہم گھر والے موٹر میں بیٹھنے والے تھے۔ گھر میں بالکل اندھیرا تھا۔ باغیچہ اور لان بھی خاموش تھا۔ ابھی میں نے موٹر کا دروازہ بند نہیں کیا تھا۔ اتنے میں خدا جانے کہاں سے مالی ہاتھ میں کچھ لئے گاڑی کے پاس آیا۔ مجھے فوراً یاد آیا کہ مالی کا انعام تو دینا بھول ہی گیا۔ مالی نے آگے بڑھ کر گاڑی میں کوئی چیز میرے قدموں کے پاس رکھ دی۔ میں نے کہا یہ کیا۔ مالی نے ہلکی آواز میں کہا۔ صاحب آپ کا چنبیلی کا پودا ہے۔ میں نے اسے ایک گملے میں لگا دیا۔ آپ اسے اپنے ساتھ دلی سے کراچی لے جائیے۔

رات کی تاریکی میں ہماری موٹر انڈیا گیٹ کے نیچے سے گذری تو سامنے پرانے قلعے کی دیواریں سائے کی طرح نظر آ رہی تھیں۔ لیکن ہمارا رُخ پرانے قلعے کی طرف نہیں بلکہ کراچی کی طرف تھا۔ نئی دلی کی سڑکیں بالکل خاموش تھیں سینما کا دوسرا شو ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ اس لئے سینما دیکھنے والے اکا دکا جو رات گئے نظر آ جاتے ہیں وہ بھی نہیں تھے البتہ سڑکوں اور بڑی بڑی دکانوں کے سامنے بجلی کی روشنی سے آنکھیں چکا چوند ہوئی جاتی تھیں۔ میں نے نئی دلی کی دکانوں اور سڑکوں کو بار بار دیکھا ہے۔ اور رات کے

ِاستوں پر چلا پھرا ہوں۔ مگر اس رات ان سڑکوں پر کچھ عجیب اداسی تھی۔ اور بڑی بڑی عمارتوں سے وحشت سی ٹپک رہی تھی۔ نئی دلی کے اسٹیشن پر ہماری گاڑی کھڑی تھی۔
، درجے میں ہمارا سامان رکھوایا معلوم ہوا کہ گاڑی صبح پانچ بجے چلے گی۔ رات کو بڑی مشکل سے نیند آئی۔ طبیعت صرف اس خیال سے پریشان تھی۔ کہ دلی میرا
ں وطن چھوڑ رہا ہوں۔ اور آخری رات اپنے گھر میں نہیں بلکہ ریلوے سٹیشن پر ریلوے ٹرین کے ایک ڈبے میں گزار رہا ہوں۔
ضان کا مہینہ تھا اس لئے رات کے تین بجے لوگ سحری کھا کر پلیٹ فارم پر پہنچنے لگے پریشان ہو کر میں بھی اٹھ بیٹھا صبح کی نماز کے بعد گاڑی چلی۔ بہت تھوڑے
چی جانے والوں کو رخصت کرنے آئے تھے۔ دو دن پہلے ایک ٹرین پر بم پھینکا جا چکا تھا اس لئے ہماری ٹرین کے چلنے کی اطلاع بہت محفوظ رکھی گئی تھی۔
چلی ہے تو صرف گنتی کے چند لوگ ہاتھ ہلا رہے تھے اور ایک لڑکا دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔
ب کالج کی مسجد کے سفید برج سامنے آئے اور ٹرین فراٹے بھرتی ان کے سامنے سے گزر گئی۔ میں نے کہا کہ اگر گاڑی کی رفتار یہی رہی تو کراچی کا سفر بہت جلد
۔ قدم شریف کی کھڑکی کے سامنے اب بہت سے مکان بن گئے ہیں لیکن کھڑکی کا راستہ بھی نظر آ گیا۔ قدم شریف کے قبرستان میں سے گاڑی گذری۔ پرانی ٹوٹی ہوئی
ہے آدھے ٹوٹ پھوٹ چکے ہیں۔ قبروں کے پتھر بھی ٹوٹ کر جھڑ گئے ہیں۔ چبوتروں پر گھاس اگ آئی۔ انہیں قبروں میں سنا جاتا ہے کہ استاد ذوق کی بھی قبر ہے
یاں سفید نورانی داڑھی ہاتھ میں تسبیح لئے ایک قبر پر بیٹھے تھے۔ جب ٹرین ان کے سامنے سے گذری تو مسافروں میں سے اکثر نے مل کر "پاکستان زندہ باد"
۔ بڑے میاں مسکرانے لگے اور ساتھ اٹھا کر دعا دی۔ گاڑی اب بھی اسی تیز رفتاری سے چلی جا رہی تھی۔ اور مجھے یقین تھا کہ کراچی کا سفر جلد طے ہو جائے گا۔
ام تک اس کی رفتار بدل گئی۔ ہر ہر قدم پر ٹھہرنے لگی اور ہر مقام پر ہمیں وحشتناک خبریں مل رہی تھیں۔ رات کے بارہ بجے پاکستان اور ہندوستان کو آزادی
، اس آزادی کے لئے سب نے مل کر کس قدر قربانیاں دی تھیں۔ مگر ہماری ٹرین کے مسافروں کے چہرے پر ہراس اور وحشت کے آثار نظر آ رہے تھے۔ ایک جگہ
اڑی کی روشنی گل کر کے سب مسافر زمین پر بیٹھ جائیں۔ کیونکہ پٹری کے دونوں طرف سے گولیاں چلنے کا خطرہ ہے۔ ہم نے اپنے ڈبے کی روشنی بجھا دی اور زمین پر لیٹ
بیٹھ گئے۔ اندھیرے میں میرا ہاتھ کسی چیز پر لگا لیکن میں اسے پہچان نہ سکا اور قریب سرے جا کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی تو اندازہ ہوا کہ دلی چنبیلی کا
دلی سے چلتے ہوئے مالی نے دیا تھا۔ اب مجھے اس کی کلیوں کی بھینی بھینی خوشبو آنے لگی۔ اس خوف و ہراس کے وقت جب میں نے گملے کو اپنے قریب کیا تو
ے کتنی تقویت ہوئی۔ اس کا اندازہ صرف میں ہی کر سکتا ہوں۔ رات کے بارہ بجے پاکستان اور ہندوستان میں آزادی کے جشن منائے جا رہے تھے۔ مگر میں اسی
ں میں لئے اندھیری گاڑی میں بیٹھا تھا۔ وہی پودا جس کی جڑ پرانے قلعے سے آئی تھی۔ اور جو جمنا کے پانی سے سیراب ہو کر دلی میں پلا بڑھا تھا۔ کراچی پہنچ کر
رہنے کے لئے مکان مل گیا۔ تو مکان صاف کرنے اور اس میں سامان لگانے سے پہلے میں نے مکان کے سامنے والے صحن میں ایک کونہ اینٹوں اور پتھروں
کیا۔ کھرپی موجود نہیں تھی۔ اس لئے ہاتھ سے ریتلی زمین ہموار کی۔ پھر ایک بڑے سے چاقو کی مدد سے زمین کو کھودا۔ اور جب اس زمین میں کوئی بالشت بھر
ن گیا۔ تو دلی کی مٹی جو اس گملے کے ساتھ آئی تھی اس مٹی سے میں نے یہ گڑھا بھر دیا۔ اور نہایت حفاظت سے چنبیلی کا پودا گملے میں سے نکال کر کراچی
منتقل کر دیا۔ اس کے چاروں طرف مٹی کی ایک چھوٹی سی منڈیر بنا دی۔ اور پھر اپنے ہاتھ سے سندھ کا پانی لا کر اس میں دیا۔
ں کے بعد ایک ہفتے تک اس پودے پر نہایت شدت اور سختی کا زمانہ گذرا۔ موت اور زندگی میں جیسے جنگ ہو رہی تھی۔ کبھی یہ مرجھانے لگتا تھا۔ اور کبھی
دیکھئے تو اس کے پتوں میں زندگی کے آثار نظر آنے لگتے تھے۔ صبح و شام میں اسے دھڑکتے ہوئے دل سے دیکھتا اور اس احتیاط سے اسے پانی دیتا تھا
، دینے والے نوآرے کی دھاریں اسے مجروح نہ کر دیں۔ یہ پودا گویا جاں بلب مریض تھا اور میں اس کا معالج اور تیماردار۔ بار بار خیال آتا کہ کسی مقامی
ار باغبان سے مشورہ کروں۔ مگر طبیعت نے گوارا نہ کیا۔ یہ دلی کا پودا تھا اور جی یہی چاہتا تھا۔ کہ اس کی نگہداشت میں ہی کروں۔ رات کو اکثر میں سوچتا تھا
ہ اس پودے کو کراچی کی زمین راس نہ آئی تو یہ کیسے جئے گا۔ مگر پھر دل نے یہی جواب دیا۔ کہ یہ پودا دلی کی مٹی اپنے ساتھ لایا ہے۔ ناسازگار فضا کے باوجود
ا۔ اسکی جڑوں میں اتنی طاقت ہے کہ نئی زمین میں جم جائیں چنانچہ یہی ہوا۔ پودے نے موت پر فتح پائی اور ایک روز صبح کو جب میں نے جا کر اسے دیکھا تو شاخ کے
یک ننھی سی کلی پھوٹ رہی تھی۔ پودے کی زندگی یقینی ہو گئی۔ دلی کے پودے نے کراچی کی زمین میں جڑ پکڑ لی اور اب وہ دن دور نہیں کہ یہ کلی کھل کر پھول بن جائے۔

آغا محمد اشرف
راچی)

مطبوعات

تصوّف اسلام

از عبدالماجد دریابادی، مولانا عبدالماجد مدیر "صدق" لکھنؤ کا نام محتاج تعارف نہیں، آپ صاحب تفسیر القرآن ہیں اور متعدد اسلامی کتب کے مصنف، یہ کتاب موصوف نے اسلامی تصوف اور قدما صوفیہ کی تعلیمات اور اُن کی تصانیف پر تبصرہ کے طور پر لکھی ہے۔

صوفیہ کا گروہ مسلمانوں میں ابتدا سے چلا آتا ہے۔ ان بزرگوں نے تمام مقاصد دُنیوی سے قطع نظر کر کے اپنا نصب العین ذکر خدا اور یاد الٰہی کو رکھا اور صدق وصفا، سلوک و احسان کے مختلف طریقوں پر عمل کرتے رہے۔ مسلمانوں کی ہدایت و راہ نمائی میں صوفیائے کرام کا بہت بڑا حصّہ ہے۔ مرورِ زمانہ سے تصوف کی موجودہ صورت وہ نہیں رہی جو ہونی چاہیئے تھی۔ مثال کے طور پر شیخ علی بن عثمان ہجویریؒ (حضرت داتا گنج بخشؒ) کی کتاب سے جن شرائط سماع کو نقل کیا گیا ہے "تصوّفِ اسلام" میں ان کو پڑھیں اور آج اُن کے مزار پر جو محفلِ سماع منعقد ہوتی ہے اُس کو دیکھیں تو اس سے اصل تصوّف اور موجودہ تصوّف کا فرق ظاہر ہو جاتا ہے۔

کتاب کے آخر میں ایک ضمیمہ "مرشد کی تلاش" شامل ہے جو ایک بہت بڑے سوال کا جواب ہے۔ اسلامی تصوف میں مرشد کا مقام بہت بلند ہے اور فنا فی اللہ کی پہلی سیڑھی، یہ کتاب بڑی اہمیت رکھتی ہے اور اس کا مطالعہ تصوّف کے گرد بدعات اور غیر اسلامی رسومات کے جالوں کو صاف کردے گا۔ ضخامت ۳۴۴ صفحات، بڑی تقطیع، قیمت دو روپیہ آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ:۔ منیجر دارالمصنفین اعظم گڑھ

ماہنامہ "طلوعِ اسلام"

جلد ۱ شمارہ ۲/۱ مرتّب:۔ محمد یونس۔

"طلوعِ اسلام" دہلی سے کئی برس تک شائع ہوتا رہا ہے اور مسلمانوں کی موجودہ بیداری میں اس کا کافی حصّہ ہے۔ فسادات کی وجہ سے اسے بھی ہجرت کر کے کراچی جانا پڑا۔ زیر تبصرہ نمبر فسادات اور پاکستان کے پس منظر اور مستقبل پر مبسوط مقالات ہیں۔ ہمیں امید ہے کتاب طلوعِ اسلام اپنے پروگرام کو باحسن پورا کرسکے گا اور مسلمانوں کی نئی سوسائٹی کی تشکیل میں نوجوانوں کی راہ نمائی کرے گا۔

موجودہ شمارے کی قیمت ۸/ ہے، سالانہ چندہ دس روپے، ملنے کا پتہ:۔ دفتر طلوعِ اسلام ۲۳/۱ نولر لائنز، نیپیر بیرکس، کراچی نمبر ۶

Arms and Jewellery of The Indian mughuls,

از عبدالعزیز بیرسٹر ایٹ لا، زیر تبصرہ کتاب ایک سلسلہ کی کڑی ہے، جو مصنّف مغل دربار کے بارے میں شائع کر رہے ہیں۔ اس سے قبل مغل دربار کے مختلف شعبوں پر وہ روشنی ڈال چکے ہیں۔ یہ کتاب مغل دربار کے ہتھیار اور زیورات پر ایک مبسوط تبصرہ ہے۔ کتاب جہاں موضوع کے لحاظ سے اہمیت رکھتی ہے، وہاں اس میں جو مواد پیش کیا گیا ہے وہ نہایت کاوش اور تحقیقات کا نتیجہ ہے۔ یہ کتاب مغلوں کی تاریخ میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔

طباعت، کاغذ اور گٹ اپ نہایت عمدہ ہے ضخامت ۴۱۰ صفحات قیمت چھ روپے، ملنے کا پتہ عبدالعزیز بار ایٹ لا ۶۵/۲ ٹمپل روڈ لاہور

گونج

از طفیل ملک۔ "ادب برائے زندگی" کی تفسیروں میں یہ کتاب ایک نیا اضافہ ہے۔ طفیل ملک کے افسانوں کا یہ مجموعہ سماج کے ان عام انسانوں کی داستان ہے جو بے بس اور بے کس ہیں۔ جن کی عورتیں باورچی خانے میں گٹھری بنی بیٹھی جلتی آگ میں بے مقصد پھونکیں مارتی رہتی ہیں اور مرد ماحول کے غلام ہیں، مگر اس کے باوجود یہ کردار کبھی کبھی گنگنا اٹھتے ہیں، اگرچہ یہ گنگنانا بے معنی ہی کیوں نہ ہو

ان کرداروں میں آپ کو دُنیا کا وہ بدنصیب انسان بھی ملے گا جسے بابو کہتے ہیں اور طفیل ملک نے اُسے "بابو لطیف" کا نام دے دیا ہے۔ انسانوں کی زبان سادہ اور صاف ہے۔ موضوع کو خوب نبھایا گیا ہے۔ طباعت، کاغذ اور کتابت معقول ہے۔ ضخامت ۲۴۰ صفحات قیمت دو روپے آٹھ آنے۔ ناشر عالمگیر بک ڈپو۔ لاہور

بہار اور اُردو شاعری

از پروفیسر محمد معین الدین دردائی۔ پروفیسر محمد معین الدین صوبۂ بہار کے فرزند ہیں۔ یہ کتاب لکھ کر انھوں نے اپنے صوبے کا حق ادا کیا ہے۔ اس کتاب میں بہاری شعرائے کرام کا ذکر اور اُن کے کلام پر تبصرہ ہے۔ اُردو کی نشوونما اور ترویج میں بہار کسی صوبے سے کم نہیں رہا۔ اس سے قبل شاید ایک ہی ایسی تصنیف (شعرائے بہار) ملتی ہے جس میں اسی نہج پر کوشش کی گئی ہے۔ یہ کتاب نقش ثانی کی حیثیت رکھتی ہے۔

پروفیسر محمد معین الدین علی گڑھ کے فارغ التحصیل ہیں اور نہایت خاموشی سے اُردو ادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔ انھوں نے یہ کتاب شائع کر کے وقت کی ضرورت کو پورا کیا ہے اور بہت سے گمنام شاعروں کو اُردو داں طبقے سے روشناس کرایا ہے، کاغذ، کتابت، طباعت خاصی ہے مجلّد ضخامت ۴۴۴ صفحات قیمت دو روپے چار آنے، ملنے کا پتہ:۔ طیّب حسن اینڈ برادرس، اسلامیہ بکڈپو۔ آرہ

مُسلم سماج

از فاطمہ ثریا حیدری۔ یہ ایک ناول ہے جو اسلامی ماحول کو پیش نظر رکھ کر لکھا گیا ہے۔ اُردو ادب میں ناول کی کمی ہے۔ اس لحاظ سے یہ ناول ایک اضافہ ہے۔ ناول کا موضوع "رومان" اور "حسن و عشق" کے جھمیلوں سے ہٹ کر "مسلم سماج" پر مرکوز ہے۔ جہاں تک زبان، قوت مشاہدہ اور دینی معلومات، مذہبی خیالات اور مخصوص فلسفۂ زندگی کا تعلق ہے، مصنفہ اس میں کامیاب ہیں، ان کی تحریر میں خلوص اور تسلسل ہے اور ان کی صلاحیت اُمید افزا ـــــ مگر ایک دو باتیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے ناول فنی طور پر کمزور رہ گیا ہے۔ ادب زندگی کا آئینہ دار ہونا چاہیئے زندگی میں سارے انسان نیکی کے پُتلے نہیں ہیں، مگر اس ناول کے کردار تو مجسم نیکی ہیں طرز بیان میں خطابت زیادہ ہے۔ ناول کی دنیا مثالی ہے اور مادّی دنیا اور اس کی حقیقتوں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ شاید اس کا باعث مصنفہ کے اپنے گھریلو ماحول کا اثر ہے۔

کاغذ، طباعت اور کتابت اچھی ہے۔ کتاب مجلّد ہے اور ضخامت ۲۳۰ صفحات قیمت تین روپے۔ ملنے کا پتہ:۔ بنگلہ نواب نثار یار جنگ بہادر۔ حمایت نگر۔ حیدر آباد دکن،

سب رس

از اختر الایمان ـــ اختر الایمان نے دل کی بات کہنے کے لئے ڈرامے کا روپ بھرا ہے۔ "سب رس" منظوم ڈراما ہے اور اس کے کردار انسان نہیں، بلکہ جانور ہیں اور آدم صرف ایک کردار ہے جو بدلیسی ہے۔ اختر نے اپنی سماج کا نقشہ جانوروں کی زبان سے پیش کیا ہے اور ہر جانور ایک انسانی صفت کا مظہر ہے۔

تقسیم ہند کے بعد شاید اب وہ پیغام جو اختر الایمان دینا چاہتے تھے بعد از وقت ہو جاتا ہے، مگر جہاں تک بنیادی جذبات کا تعلق ہے جن کا اظہار اس ڈرامے میں کیا گیا ہے اس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ کتابت، طباعت اور گٹ اپ نہایت عمدہ قیمت عہ ضخامت ۹۰ صفحات ناشر کتب پبلشرز لمیٹڈ، اٹلی بمبئی

اثر کے تنقیدی مضامین

از خان بہادر مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی۔ اثر لکھنوی ایک مسلم الثبوت شاعر ہیں۔ ان کی ذات رسمی تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ نے تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں۔ یہ کتاب انھی مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ مضامین زیادہ تر شاعری سے متعلق ہیں۔ ان میں بھی اثر کا اپنا رنگ ہے۔

کاغذ، کتابت اور طباعت خوب ہے۔ کتاب مجلّد، گرد پوش سے مزیّن ضخامت ۱۷۶ صفحات

ملنے کا پتہ نظامی پریس بک ایجنسی بدایوں

سید منظور حسین بخاری مینجر پرنٹر پبلشر نے اتحاد پریس بل روڈ لاہور میں چھپوا کر ۲۳ لارنس روڈ سے شائع کیا۔ سرورق ریوین پریس لاہور میں چھپا

Regd No. L 1363.

بیادگار علامہ فصیح آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ایڈیٹر : بشیر احمد، بی۔اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لاء
جائنٹ ایڈیٹر : شیر محمد اختر

فہرست مضامین

ہمایوں بابت ماہ جون ۱۹۴۸ء

نمبر شمار	مضمون	صاحب مضمون	نمبر صفحہ
۱	جہاں نما	شیر محمد اختر	۲۳۰
۲	حلقۂ اربابِ ذوق	جناب سر عبدالقادر بالقابہ	۲۳۲
۳	ممتاز شاہنواز کی یاد میں	عالی جناب راجہ صاحب آف محمود آباد	۲۳۴
۴	حیاتِ جاوداں (نظم)	جناب محمد ہادی حسین صاحب آئی سی ایس کمشنر ملتان	۲۳۵
۵	غزل	,, ضمیر اظہر صاحب بی۔اے	۲۴۵
۶	آوازیں (افسانہ)	,, ست پرکاش سنگر صاحب ایم۔اے	۲۴۶
۷	غزل	,, سلیم احمد صاحب	۲۵۳
۸	تجلیات	,, اثر صہبائی صاحب ایم۔اے۔ایل ایل۔بی	۲۵۴
۹	پاکستان میں اُردو	,, سلطان احمد صاحب ایم۔اے	۲۵۵
۱۰	زندگی کے رُخ (نظم)	,, قمر احمد فاروقی صاحب	۲۵۸
۱۱	بوجھ (افسانہ)	,, میرزا ریاض احمد صاحب بی۔اے آنرز	۲۵۹
۱۲	تاج محل (نظم)	,, اکرام صاحب لودھیانوی	۲۶۲
۱۳	احساسِ تنہائی (نظم)	,, طفیل صاحب ہوشیارپوری	۲۶۳
۱۴	ایک خط (افسانہ)	,, کشمیری لال ذاکر صاحب	۲۶۴
۱۵	زہر خند (نظم)	,, سید جابر نقوی صاحب نقوی ایم۔اے	۲۶۸
۱۶	اُردو زبان کے مؤرخ اور نقاد	,, جناب سید نصیر الدین صاحب ہاشمی	۲۶۹
۱۷	غزل	,, عشرت جلالی صاحب	۲۷۱
۱۸	اصغر کی یاد میں	ب	۲۷۲

چندہ سالانہ	ششماہی	فی پرچہ
۶ صر	سے /	۸ /

جہاں نما

آندرے ژید

اب کے سال ادب میں "نوبل پرائز" فرانسیسی ناول نگار آندرے ژید کو ملا ہے۔ ژید کی عمر اس وقت "ستتر" برس کی ہے۔ اس اعزاز نے ژید کے ادبی مقام کو جو اسے پہلے ہی سے حاصل ہے اور بھی بلند کر دیا ہے۔ یہ اعزاز عموماً ایسے ادیبوں کو ملتا ہے جو ادب میں کسی آدرشی طرزِ نگارش کے موجد ہوں اس کی مثال فرانسیسی ادیب رومین رولاں تھے۔ ژید کو آدرشی مصنف نہیں کہا جا سکتا بلکہ اس کی تو دنیا ہی اور ہے۔ اس کی طرزِ نگارش کو اگر "انفرادیت پسندی" کہا جائے تو زیادہ موزوں ہوگا۔ ژید کو محض ناول نگار کہنا اس کے مرتبے کو کم کرنا ہوگا۔ جہاں وہ بلند پایہ ناول نگار ہے وہیں وہ اعلیٰ درجے کا نقاد بھی ہے۔ اس نے کسی نئے دبستان کی بنیاد نہیں رکھی، لیکن ادیبوں کی نئی پود کو اس نے کافی حد تک متاثر ضرور کیا ہے۔ ژید نے ناولوں کے علاوہ ادبی مضامین لکھے ہیں۔ ڈرامے لکھے ہیں۔ اس نے سوویٹ روس کے متعلق سفرنامے لکھے ہیں جن سے ایک تہلکہ مچ گیا تھا۔ اس کے ادبی کارنامے یہیں ختم نہیں ہو جاتے اس نے تراجم بھی کئے ہیں۔ شیکسپیئر، کانریڈ، بلیک، وھیٹ مین، اور ٹیگور کے شاہکاروں کو فرانسیسی ادب میں منتقل کرنے کا سہرا اس کے سر ہے۔ ژید کے ادبی کارنامے جہاں بلند پایہ ہیں، وہاں ان کی تعداد بھی کافی ہے۔

اندرے ژید کا سب سے مشہور ناول "بداخلاق" (Immoralist) ہے۔ یہ ایک نوجوان کی سوانح حیات ہے جو اپنی بیماری اور موت کے خوف کی وجہ جمالیات کے آدرشی مقام سے گر کر لذتیت اور اخلاقی بدعنوانیوں میں کھو جاتا ہے اور یوں اس کی زندگی کا عقلی کردار جس کا کبھی وہ پکا معتقد تھا جبلی تقاضوں کے سامنے مجبور نظر آتا ہے۔ بیماری کے ایام میں اس کی نئی نویلی دلھن حد سے زیادہ اس کی خدمت گزاری کرتی ہے لیکن اس کے باوجود لذتیت کا گہرا اثر اس کے کردار میں موجود رہتا ہے۔ تبدیل آب و ہوا کے لئے وہ شہر بسکرا (Biskra) جاتا ہے اور وہاں عربی نژاد صحت مند لڑکوں کو چیزیں چراتے دیکھتا ہے۔ اس سے وہ اتنا متاثر ہوتا ہے کہ معقول بننے کا جامہ اُتار پھینکتا ہے اور ادنیٰ درجے کے شراب خانوں میں جانے لگتا ہے۔ آہستہ آہستہ نوجوان کی انفرادیت پسندی اس کے اخلاق کو برباد کر دیتی ہے۔ یہاں تک کہ جب اس کی طاعت گزار اور وفا شعار بیوی بیمار پڑتی ہے تو وہ اس سے بھی پہلوتہی کرتا اور اس قدر بے پروا ہو جاتا ہے کہ وہ بیچاری کس مپرسی کی حالت میں مر جاتی ہے۔

اس ناول میں ژید نے انفرادیت کی دنیا کو گلتے سڑتے پیش کیا ہے۔ اس ناول میں ایک ایسے نوجوان کا کردار پیش کیا گیا ہے جسے وہ بداخلاق یا صحیح معنوں میں اخلاق سے بےتعلق سمجھتا ہے جو سب سے الگ تھلگ اپنے مسلک پر چلا جا رہا ہے اور یوں خود اپنی بربادی کا سامان مہیا کرتا ہے۔ فنی لحاظ سے یہ ناول بہت ہی بلند ہے اور ادبی معیاروں پر پورا اُترتا ہے۔ اس میں انسانی ذہن کی گہرائیوں میں جھانک کر اس کے دبے ہوئے جذبات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

ژید کے ناولوں میں محرومی کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔ وہ بُرائی کو زندگی کا ایک ایسا مستقل اور ضروری جزو خیال کرتا ہے جسے زندگی سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اچھا ہے۔ دُوسرے ناولوں میں وہ زندگی کے اسی پہلو کو اجاگر کرتا ہے۔ وہ ادب میں تحلیل نفسی سے کام لینے کے فن میں پیش رو کا درجہ رکھتا ہے۔ جائس اور پروست اس کے پیرو کار ہیں۔ ژید نے تجزیاتی افسانوی ادب پر سب سے زیادہ اثر کیا ہے۔ اس کا موضوعِ سخن عقل پرستی کی بجائے جبلت اور قوت کی پرستش ہے۔ اس لحاظ سے ہم اُسے وائلڈ کا معتقد کہہ سکتے ہیں۔ ژید انفرادیت پسند ہے اور اس میں وہ حد سے بڑھ جاتا ہے جس کا لازمی نتیجہ جمود ہے حالانکہ ایک اعلیٰ فن کا لازمی جزو حرکت ہوتی ہے جو زندگی میں تابانی پیدا کرتی ہے۔ اس لحاظ سے ژید کے ناول اس معیار پر پورے نہیں اُترتے۔

...گی کے متعلق اُس کا نکتۂ نگاہ محدود ہے۔ وہ زندگی کے ایک کونے میں کھڑے ہو کر زندہ اور صحت مند انسانوں کو نہیں بلکہ مردہ دلوں کو دیکھتا ہے جو سرگوشیوں ...باتیں کرتے اور لذتِ نفس کی خاطر معقول پسندی کا دامن چھوڑ رہے ہوتے ہیں۔ ثریا میں ایک اور بات نظر آتی ہے۔ وہ اپنے کرداروں کی طرف داری ...ں کرتا اور نہ اُن کی مشکلات کا حل ہی تجویز کرتا ہے۔ اس کے نزدیک کہانی کا پیش کر دینا ہی گویا اس کے مشن کی تکمیل ہے۔

اردو ٹائپ اور اردو رسم الخط

پاکستان میں اردو کو قومی زبان قرار دیا گیا ہے۔ حکومت تعلیم، کاروبار اور دوسرے شعبہ ہائے زندگی میں جہاں پہلے انگریزی کو دخل تھا۔ اب اردو دخل ہوگا۔ جہاں تک اصول کا سوال ہے یہ فیصلہ نہایت اہم، مبارک اور باعثِ خوشی ہے۔ مگر عملی صورت میں بہت سی دشواریاں ہیں۔ سب سے بڑی دشواری ٹائپ کی ہے۔ ٹائپ کا مسئلہ اردو کے ہر بہی خواہ کے پیشِ نظر ہے۔ ہمایوں میں اس پر کافی لکھا جاتا رہا ہے۔ اردو ٹائپ موجود تو ہے۔ مگر سوال اس کے آسان بنانے کا ہے۔ جناب حسن عزیز جاوید نے اس سلسلے میں ایک تجویز بھیجی ہے جو ذیل میں درج کی جاتی ہے۔ ممکن ہے اس سے ٹائپ میں سہولت ہو سکے یا جوڑوں میں کمی کرنے کے متعلق کوئی تجویز سوجھ جائے۔

• بہت دنوں سے اردو ٹائپ اور اردو رسم الخط کا مسئلہ ہمارے لئے دردِ سر بنا ہوا ہے۔ ہمایوں کے صفحات میں بھی اس پر مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اگر ہم باتفاق یہ طے کر لیں کہ تمام دوسری زبانوں کے رسم الخط کی طرح ہم بھی حروف کو اُن کی ایک ہی شکل میں برتتے ہیں، ہم بھی ایسا ہی کریں تو یہ مسئلہ خاطر خواہ طور پر حل ہو جائے۔ دیوناگری، رومن اور تمام دوسرے رسم الخط اسی کے پابند ہیں۔ جوڑنے کے قواعد اور جوڑنے کی زحمتیں ہی ہیں جو اردو، فارسی اور عربی کو دنیا کی مشکل سے لکھی اور مشکل سے پڑھی جانے والی زبانیں بنائے ہوئے ہیں۔ اگر یہ ہو جائے تو لکھنے پڑھنے میں مطلق دقت نہ ہو، دنیا کا ہر فرد آسانی سے سیکھ لے، لکھ لے اور پڑھ لے، محض ۳۶ حروفِ تہجی یاد کرنے کی دیر ہے۔ ... کے ناخواندہ، جاہل دیہاتی بہت کم مدت میں خواندہ ہو جائیں۔ نتائج آگے چل کر بے حد شاندار نکلیں۔ ایشیا کے وہ تمام ملک جو ہمارے رسم الخط کے پابند ہیں اسے قبول کر لیں گے۔ اس کی اتباع پر مجبور ہوں گے اور کیا عجب ہے کہ ترکی بھی جس نے محض ہمارے املا کی ادق حیثیتوں کو مدِ نظر رکھ کر رومن طرزِ تحریر اختیار کی تھی اور اسے ایک وجہ موجّہ قرار دیا تھا پھر سے ہماری صف میں آ کھڑا ہو جائے۔ آپ دیکھیں گے کہ اگر رسم الخط کا بہترین سہل حل نکل آیا تو اردو کو نہ محض بین الایشیائی بلکہ بین الاقوامی زبان کا وہی مرتبہ حاصل ہو جائے گا جو انگریزی کو حاصل ہے کیونکہ انگریزی کی مانند اردو میں بھی تمام زبانوں کے الفاظ قبول کرنے کی صلاحیت ہے۔ ابھی تو ہم صرف ایک خصوصیت پر پھولے نہیں سماتے ہیں کہ ہماری زبان کی تحریر ایک قسم کا شارٹ ہینڈ ہے، کم جگہ میں زیادہ اور جلدی لکھا جاتا ہے۔ لیکن یہ نظر انداز کر دیتے ہیں کہ یہ شارٹ ہینڈ کتنی محنت سے اور کتنے دنوں میں اور کتنی مشق سے حاصل ہوتا ہے! دشواریوں کو ملحوظ رکھا جائے تو ماننا پڑے گا کہ شارٹ ہینڈ سے طوالت ہی بھلی۔

مثال:۔ مکرم بندہ، تسلیم، پاکستان کے قیام کے بعد سے آج تک آپ کا کوئی مکتوب موصول نہیں ہوا۔ اسے اس طرح لکھنا چاہیئے: "م ک ر م ب ن د ہ
ت س ل ی م پ ا ک س ت ا ن ک ے ب ع د س ے آ ج ت ک آ پ ک ا ک و ئ ی م ک ت و ب م و ص و ل ن ہ ی ں ہ و ا"

صرف تشدید گرا دی جائے اور دوسرے رموز و اوقاف اور زبر زیر پیش کو بھی اُڑا دیا جائے۔ مد کی بجائے ... پیش کی بجائے "و" زیر کی بجائے "ی" زبر کی بجائے کچھ نہیں ... کا اضافہ کیا جائے۔ دو زبر دو زیر دو پیش کی جگہ "ن" رہے۔ اس طرح زبان بے حد آسان، بالکل سادہ اور مقبولِ خاص و عام ہو جائے گی اور اردو عام فہم اور بین الایشیائی زبان کا بلند مرتبہ حاصل کرے گی۔ جو لوگ رومن رسم الخط استعمال کرنے کی صلاح دیتے ہیں وہ بھی اس طریقِ تحریر سے مطمئن ہو سکیں گے۔ کیونکہ ان کی غایت یہی ہے کہ حروف ہمیشہ ایک ہی شکل میں رہیں۔ نیز رومن رسم الخط ہماری ایشیائی زبانوں کے لئے ہرگز موزوں نہیں۔ مثلاً ایک لفظ مختلف الاشکال ہوتا ہے لیکن آواز اس کی ایک ہی ہوتی ہے اور اسے اگر رومن رسم الخط میں لکھا جائے تو ایک ہی شکل ہو گی حالانکہ بلحاظ معنی بہت بڑا فرق ہو جاتا ہے۔ نیچے کی ایک ہی مثال ملاحظہ ہو۔

صور سور نور

رومن رسم الخط کی بے چارگی اور بے بسی اور کی ایک ہی مثال سے روشن ہے۔"

شبیر محمد اختر

حلقۂ اربابِ ذوق

یہ خاموش کام کرنے والے نوجوانوں کی انجمن ہے جو ایک مدت سے اُردو کی خدمت میں مصروف ہے۔ اس انجمن کا نواں سالانہ جلسہ ۲۵ مارچ ۱۹۴۳ء کو وائی ایم سی اے لاہور میں منعقد ہوا۔ جلسے کی صدارت فرماتے ہوئے مسٹر عبد القادر مدظلہ نے ذیل کا خطبہ ارشاد فرمایا۔ **ایڈیٹر**

نئے لوگ پرانوں کو کبھی کبھی تبرک سمجھ کر پوچھ لیتے ہیں اور پرانے اگر ان میں کچھ ذوق باقی ہو تو نئے لوگوں سے ملنا تازگی ذوق کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ میں آپ حضرات کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اپنے حلقے کے سالانہ جلسے کی صدارت کے لئے مجھے یاد فرمایا اور مجھے خوشی ہے کہ گھڑی دو گھڑی کے لئے ہی سہی میں آپ جیسے سرگرم خادمانِ ادب کا شریک کار ہو رہا ہوں۔ آپ کے اس حلقے کا آغاز پہلے ایک محدود مقصد سے ہوا تھا کہ نئے رنگ کے مختصر افسانے لکھ کر ادب اُردو کی خدمت کی جائے اور آپ نے اس بزم کا نام بزم افسانہ گویاں تجویز کیا تھا۔ جس نے بعد کو موجودہ نام اپنے لئے پسند کیا۔ مگر رفتہ رفتہ اس مقصد کی توسیع ہوتی گئی۔ ڈراما افسانہ کے ساتھ حصہ پانے کا طلب گار ہوا۔ نظم نے کہا کہ صرف نثر ہی کیوں آپ کی توجہات کا مرکز بنے۔ نوجوان ادیبوں کو نظم حرّا کی طرف مائل دیکھ کر نظم مقفیٰ بولی میں نے کیا گناہ کیا ہے کہ مجھ سے کنارہ کشی کر رہے ہو؟ غزل نے پرانے حقوق جتا کر کہا کہ مجھے بھی نظر انداز نہ کیجئے۔ اس طرح آپ کا ذوق سخن ہمہ گیر ہوتا گیا اور اب آپ کے ہفتہ وار جلسے عموماً ادب کے گلہائے رنگا رنگ کا گلدستہ ہوتے ہیں۔

آپ کی بزم کی امتیازی صفت تنقید ہے۔ آپ کے یہاں جب کوئی مقالہ پڑھا جاتا ہے یا نظم پیش کی جاتی ہے۔ یا افسانہ یا ڈراما سنایا جاتا ہے تو مصنف کے روبرو اس کی تنقید کی جاتی ہے۔ لکھنے والے کے ہمسر اس پر آزادانہ نکتہ چینی کرتے ہیں اور اگر اس کے کام میں با اعتبار زبان یا با اعتبار فن کچھ نقص پاتے ہیں تو اپنے خیال کو بے تکلف بیان کر دیتے ہیں۔ البتہ یہ اصول مدِ نظر رکھنے کی تاکید ہے کہ تنقید کا لہجہ مخلصانہ اور دوستانہ ہو اور اس کا مقصد اصلاح ہو نہ کہ کسی کی دلآزاری۔ اس احتیاط کے باوجود میں نے سنا ہے کہ اس مجلس کی مختصر سی زندگی میں ایسے واقعات پیش آئے کہ بعض طبائع تنقید کی متحمل نہ ہو سکیں اور رکنیت سے دست بردار ہو گئیں۔ مگر آپ کی مجلس کے استقلال کی داد دینی پڑتی ہے کہ آپ اپنے قائم کردہ اصول پر کاربند رہے اور تعداد اراکین کے قائم رکھنے یا بڑھانے پر تنقید کے فوائد کو ترجیح دی۔

ایک اور اچھا اصول آپ کی مجلس نے شروع سے ملحوظ رکھا ہے کہ اپنے ہفتہ وار جلسوں پر سامعین کی کثرت یا قلت کا اثر نہیں ہونے دیا۔ تھوڑے اراکین حاضر ہوں تو بھی نظم یا نثر پیش کرنے والوں نے اپنا حوصلہ پست نہیں ہونے دیا، اپنا اپنا کلام سنایا اور دو دو تین تین نے تنقید کا فرض ادا کیا اور ہر سال آپ کے جلسوں کی تعداد چالیس اور پچاس کے درمیان ہو جاتی رہی۔ ملک میں ایسی انجمنیں کم ہوں گی جو باقاعدگی اور احساس فرض کی ایسی مثال پیش کر سکیں۔

آپ کے حلقے کی یہ جدت بھی خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ آپ ہر سال اُس برس کی بہترین نظموں کا ایک مجموعہ شائع کرتے رہے ہیں۔ پہلا مجموعہ ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا تھا۔ حلقے کی ایک سب کمیٹی ان نظموں کا انتخاب کرتی ہے اور اس میں زیادہ تر نئے نمونے کی نظمیں انتخاب میں آتی ہیں۔ سال بھر میں جو نظمیں مختلف ادبی رسالوں میں چھپتی ہیں۔ یہ انتخاب ان نظموں میں سے کیا جاتا ہے۔ چونکہ اس بزم کا ایک مقصد یہ ہے کہ نئے ادیبوں میں جو جو ہر قابل ہوں اُن کو نمایاں کیا جائے اور اُن کے نتائج فکر سے لوگوں کو روشناس کیا جائے، اس لئے اگر انتخاب شدہ نظموں میں زیادہ جدید شعرا کی نظمیں ہوں تو تعجب کی بات نہیں۔ مگر میں اُمید کرتا ہوں کہ انتخاب کرنے والی کمیٹیاں طرزِ قدیم کے شعرا پر بھی اپنی نظر التفات میں اصولِ مساوات ملحوظ رکھیں تاکہ طرزِ قدیم کے دلدادہ جن کی ابھی کافی تعداد ہے، بہترین نظموں کے مجموعوں کا اسی قدر شوق سے انتظار کریں، جس قدر شوق سے طرزِ جدید کے

وعواں کے منتظر رہتے ہیں ۔

نام نیک رفتگاں ضائع مکن   تا بماند نام نیکت برقرار

نے بہترین نظموں کو محفوظ رکھنے کا اہتمام کیا ہے، اسی طرح نثر کے بہترین مضامین کو جو آپ کے حلقے میں وقتاً فوقتاً پڑھے گئے ہیں جمع ہیے۔ اُن میں سے بعض مضامین رسالوں میں چھپے ہیں اور سب حلقہ کی کاوش کا نتیجہ ہیں۔ آپ کی سالانہ رپورٹوں میں یہ درج ہے کہ یہ جماعت طرح کم نہیں سمجھتی اور ادبی ترقی کے لئے اس کی اہمیت کی قائل ہے۔ مگر نثر کے مجموعے نہ چھپنے کی وجہ ارباب ذوق کی مالی ناداری بھی بیان کی گئی ہے۔ یہ دونوں عذر گذشتہ کوتاہی کی تلافی کے لئے کافی ہیں لیکن آئندہ معافی کے لئے کافی نہیں۔ کاغذ کمیاب تو ب نہیں اور روپیہ کی کمی کی تلافی بھی ممکن ہے۔ اگر آپ بعض خاص قدردانوں سے اپیل کرنے کا ارادہ کرلیں۔ آج تک آپ نے پبلک کئے بغیر اپنی ہمت سے اس کام کو چلایا ہے، لیکن کوئی بزم یا انجمن بغیر بیرونی معاونوں کے امداد کے اپنے مقاصد کی پوری توسیع نہیں تو بھی مقاصد حلقہ کی تکمیل کے لئے آخر پبلک کے سامنے آنا پڑے گا۔ خاص کر آپ کے مقاصد میں ایک مقصد آج تک تشنۂ تعمیل رہا ہے کے لئے روپیہ درکار ہے۔ وہ مقصد ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے "اُردو ادب اور صحافت کے ناسازگار ماحول کو صاف کرنا۔" پہلی میں یہ لکھا ہے کہ "اس سلسلے میں ہم نے کوئی کارروائی نہیں کی مگر اُمید ہے کہ اس سال سے کچھ نہ کچھ کیا جاسکے گا۔" مجھے معلوم نہیں بعد کے مقصد کے متعلق کچھ ہوسکا یا نہیں، لیکن یہ ظاہر ہے کہ بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ خدا کرے کہ آئندہ سالوں میں آپ کے پاس اس اہم مقصد کرنے کے وسائل مہیا ہوجائیں اور حلقۂ ارباب ذوق ہر اعتبار سے روز افزوں ترقی کرے۔

عبدالقادر

صاحبِ علم و فن و فہم و ادب ہیں درکار   باغِ اُردوئے معلیٰ میں تب آئے گی بہار

کیفی

ہفت اقلیم میں بجتا ہے اِسی کا ڈنکا   اب یہ نوبت ہے کہ ہر جا ہے زبانِ اُردو

بزم آفندی

"ہر زبان کو اپنا دوست سمجھ کر اُس کے الفاظ حاصل کیجیے اور اُردو زبان کو عام فہم اور سب قوموں کی خدمت کے قابل بنا دیجیے۔"

محمد اکبر خاں رئیس ہوتی

ممتاز شاہنواز کی یاد میں

ایک سانیٹ

سلام ہے تجھ پہ، اے مغنّی شاعرہ صبحِ مسرور کی؛
اسلامی ہند کی بیداریٔ عظیم کی صبح۔
اُس زندگی کے ساتھ جو ابھی نوعمر تھی، اُس جوانی کے ساتھ جو ابھی نوخیز تھی
تُو چلی گئی ہے طلوعِ آفتاب کے شعلوں سے بھی پرے
ایک نوزائیدہ سرزمین کے مستقبل کا خیر مقدم کرنے
جہاں سے تیری شیریں راگنیاں ہمیشہ سنائی دیں گی
انسانوں کے متوجہ کانوں کو، دیتی ہوئی
روح پرور پیام گزرے ہوئے ایام کا،
اُن ایام کا جب طارق نے جبل الطارق پر بلند کیا جھنڈا
ہلال اور تارے کا کہ زیر کرے ہسپانیہ کی قوی سلطنت کو۔
وہی من چلا دل تیرا کھینچ لایا تجھے
نئی دنیا کی طرف، یہاں رہنے کو
ایرا میں جو سرزمین آزادی ہے۔ اِس چٹان پہ
شیطان کی تو بلا شبہ ہوگی ہماری سنتری اور نگہدار!

(ترجمہ از انگریزی)

راجہ محمود آباد
لکھنؤ۔ ۱۷ر اپریل ۱۹۴۸ء

حیاتِ جاوداں کی بشارتیں

[ذیل کی دلکش نظم مشہور انگریزی شاعر ورڈزورتھ کی شہرۂ آفاق نظم Ode on Intimations of Immortality from Recollections of Early Childhood, کا ترجمہ ہے۔ یہ نظم یقیناً بطورِ ترجمہ کے بھی کامیاب ہے اور نئی شاعری میں ایک قابلِ قدر اضافہ بھی ہے۔ - ایڈیٹر]

یہ دنیا میکہ باغ و راغ و دشت و جوئبار،
یہ زمیں اور اُس کے نظارے تمام،
آشنا ہیں جن سے آنکھیں صبح و شام،
تھے مری نظروں میں نورِ عرش کے آئینہ دار،
جیسے اک دنیائے روشن خواب کی،
دلفروزی جلوۂ شاداب کی —
وہ زمانہ اب گیا گزرا زمانہ ہو گیا،
جو کچھ ان آنکھوں نے دیکھا ہے فسانہ ہو گیا۔
اب جدھر جاتا ہوں میں دن ہو کہ رات،
وہ نظر آتی نہیں پہلی سی بات،

اب بھی اگلی سی دھنک کی ہے بہار،
پھول اُسی صورت ہیں اب بھی گلعذار،
آسماں بے ابر ہوتا ہے تو اب بھی ماہتاب
چُپکے چُپکے مُسکرا کر دیکھتا ہے چار سو،
اب بھی ہے تاروں بھری راتوں میں سیمیں سطحِ آب،
ہے وہی خورشید کا اگلا سا حسنِ شعلہ رو —
پھر بھی یہ محسوس کرتا ہوں جدھر جاتا ہوں میں
کوئی شے تھی جس کو اب ڈھونڈے نہیں پاتا ہوں میں:
اک تجلی تھی کہ اس دُنیا سے رخصت ہو گئی،
اور کی کچھ اور اس دُنیا کی ہیئت ہو گئی۔

چہچہاتے ہیں خوشی کے گیت، سننا تو طیور!
اُن کے دل میں ہے مسرّت کا وفور،
ناچتی پھرتی ہیں ننھی ننھی بھیڑیں اس طرح
تھاپ پر ڈھولک کے مستِ رقص کوئی جس طرح —
ایسے میں گزرا تھا میرے دل میں اک غمگیں خیال۔
شکر ہے بروقت اظہار اُس کا میں نے کر دیا،
ڈھل گئی دل سے مرے گردِ ملال؛
ورنہ تھی اک راگنی بے وقت کی غم کی نوا —
وہ سوادِ کوہ سے آئی صدائے آبشار،
گھن گرج سے اُس کی گونج اٹھی فضائے کوہسار —
کافرِ نعمت ہوں گر ایسے میں میں پھر غم کروں،
محفلِ شادی کے ہنگامے میں کیوں ماتم کروں؟ —
لو اٹھی پھر خواب گاہِ استراحت سے نسیم،
پھر زمین و آسمان و بحر و بر
بن گئے لو، رشکِ خلدِ نعیم۔
رُت مناتے ہیں سبھی، کیا آدمی کیا جانور۔
ہر کسی کے دل میں ہے عیشِ بہار،
ایک دل میرا ہی کیوں ہو سوگوار؟
گائے جا، ہاں گائے جا، ننھے گڈریئے! گلے جا،
میرے دل کو اپنے گیتوں سے یونہی گرمائے جا
اے سدا خوش رہنے والی خلق، اے وحش و طیور!
سُن رہا ہوں میں تمھاری میٹھی میٹھی بولیاں،
ہنس رہا ہے جن سے ہم آہنگ ہو کر آسماں،
میرے دل میں ہے تمھارے جشنِ عشرت کا سرور
اور مرے سر پر تمھارے عیش کا تاجِ نشاط:
میری رگ رگ میں رواں ہے ایک رُوحِ انبساط —
حیف اگر اس وقت بھی میں ہوں حزیں
سج رہی ہے جب دُلھن سی خود زمیں،
اور ننھے ننھے گلچینوں کی لاکھوں ٹولیاں

دامنِ کہسار میں،
وادیِ گلزار میں،
پھول چُن چُن کر بھرے جاتی ہیں اپنی جھولیاں۔
کتنی دلخوش کن ہے یہ صبحِ بہار!
دھوپ کی جاں بخش گرمی میں ہے کیا بالیدگی،
گود میں ماں کی مہک اٹھتا ہے طفلِ شیرخوار؛
حیف اگر اس وقت میرے دل میں ہے رنجیدگی،
سُن رہا ہوں، گانے والو! میں تمہارے چہچہے،
ہنسنے والو؟ کھیلنے والو! تمہارے قہقہے ——
اک اکیلا پیڑ ہے لیکن مرا خارِ نگاہ
ایک تنہا کھیت ہے میری نظر کے سامنے۔
کہہ رہے ہیں دونوں مل کر میرے کانوں میں کہ "آہ!
کوئی شے تھی چھین لی جو گردشِ ایام نے۔
اور یہ جو پھول ہے تنہا مرے قدموں کے پاس
ہے کہانی اُس کی بھی بالکل اُسی صورت اُداس ——
کیا ہوا وہ جلوۂ شمعِ شبستانِ خیال.
کیا ہوا وہ خوابِ عشرت، وہ طلسماتِ جمال؟

زندگانی اپنی محض اک بیخودی، اک خواب ہے۔
یہ جو دنیا میں عدم آباد سے آتے ہیں ہم،
جاگتے میں، نیند آجاتی ہے سوجاتے ہیں ہم۔
یہ ہماری زیست کا جو کوکبِ شب تاب ہے،
روح کہتے ہیں جسے، یہ رہ چکا ہے جلوہ گر
اور ہی اک آسماں کے اوج پر
ڈوب کر اک بار پھر اُبھرا ہے یہ،
دُور کی طے کر کے رہ آیا ہے یہ ——
اپنی اگلی زندگی کی یادگاروں کو لئے۔
اور ازل کے نور کی پوشاک زیبِ تن کئے،
لے کے جلوؤں کی گھٹائیں ہمرکاب آتے ہیں ہم،

مبدءِ فیاض سے یوں فیض یاب آتے ہیں ہم۔
جب تک اپنے عہدِ طفلی کی رہیں معصومیاں
رہتی ہے نزدیک اپنے سر کے بامِ آسماں،
اور بغل میں اپنی سرحد عالمِ لاہوت کی۔
سن مگر بڑھتا ہے جیسے جیسے، ہوتی ہیں فزوں
ظلمتیں اس اپنے زندانخانۂ ناسوت کی،
رفتہ رفتہ غالب آجاتی ہے یہ دُنیائے دُوں۔
پھر بھی لمحاتِ طرب میں کوئی آوارہ کرن
آکے ہو جاتی ہے اپنی آنکھ پر جلوہ فگن؛
دیکھ پاتے ہیں ہم اپنی اصل کے آثار کو،
یعنی اپنے مطلعِ انوار کو ـــ
نوجوانی میں کہ مشرق کے اُفق سے دُور، ہم
سوئے مغرب روز و شب ہوتے ہیں مجبورِ سفر،
ہم پہ ہوتے ہیں ہنوز اسرارِ فطرت جلوہ گر،
لے کے چلتے ہیں جلو میں کاروانِ نور ہم ـــ
آخر اک دن جلوۂ ظاہر کی بھڑکیلی چمک
بن کے رہ جاتی ہے گویا پردہ اپنی آنکھ کا:
اپنے گرد و پیش کے نظارہائے آشنا
ہو کے رہ جاتے ہیں سدِّ راہِ انوارِ فلک۔

اپنی جھولی بھر کے رکھتی ہے کھلونوں سے زمیں۔
اُس کے دل میں ہم سے وابستہ مُرادیں ہیں ہزار،
ہے ہمارے ساتھ اُسے حد درجہ پیار
یہ بجا ہے وہ ہماری ماں نہیں ۔
وہ ہماری ماں نہیں ہے، پھر بھی ہم اُس کے لئے
کوکھ کے جائے نہیں تو گود کے پالے تو ہیں،
یعنی ہم دامن میں اُس کے کھیلنے والے تو ہیں۔
ماتما سے ماں کی وہ کچھ کم نہیں جس پیار سے
وہ ہمارے دل کے بہلانے کے کرتی ہے جتن

تاکہ اس دنیا میں ہو جائے ہمارا من مگن،
ہم کو اگلی زندگی بھولے سے بھی آئے نہ یاد،
ہو کے رہ جائے وہ اک سپنوں کی رنگیں رُوداد،
اور وہ شاہی قصر جو اپنا بسیرا تھا کبھی
ہم تک آنے پائے اُڑ کر پھر نہ اُس کی خاک بھی۔

دیکھنا وہ بھولا بھولا چھ برس کا نونہال،
اپنی نوزائیدہ خوشیوں میں سراپا مست حال،
اپنے ہاتھوں اپنے دل بہلاؤ کا ساماں کئے،
اپنے گرد اگرد اک جھرمٹ کھلونوں کا لئے،
ماں کے بوسوں سے مچل کر شوخیاں کرتا ہوا،
آنکھ روشن باپ کی، دل شادماں کرتا ہوا ——
اُس نے کھینچا ہے جو مٹّی پر وہ خاکہ دیکھنا،
ہے وہ اک چھوٹا سا ٹکڑا اُس کے خوابِ زیست کا،
اپنے نوآموختہ فن کی مدد سے وہ جسے
شکل کے سانچے میں ہے ڈھالے ہوئے:
یعنی کوئی جشنِ عشرت، کوئی شادی کی برات،
محفلِ ماتم کوئی یا کوئی غم کی واردات۔
محو دل آج اس کا ان باتوں میں ہے،
آج اِن کی دُھن میں وہ گاتا ہے گیت۔
کچھ کی کچھ ہو گی مگر کل اُس کی لے،
اور یہی باتوں کے ہوں گے اُس کے لب پر تذکرے،
جیسے اس دُنیا کے رن میں ہار جیت،
راہ و رسمِ دوستی و دشمنی،
کاروبارِ زندگی کے مخمصے۔
ایک دن ہو جائیں گے باسی یہ ذکر اذکار بھی۔
اور پھر ننھا سا یہ بہروپیا
اک نئے ہی شوق سے،
طرفہ لطف و ذوق سے،

رُوپ بھرے گا کوئی بالکل نیا۔
جس قدر "افراد" ہیں ناٹک بھا ہیں لیت کی،
رعشہ براندام ہے بہ کا بھی ہے جن میں شمار،
اُن کے رنگارنگ ملبوسات ہیں کہ مستعار،
وہ اداکاری کرے گا نت نئی۔
جیسے اُس کی زندگی کا مدّعا
ہو فقط نقالیٔ لا انتہا۔

اے کہ تیرے خدّ و خالِ ظاہری کی سادگی
کچھ نہیں محض ایک پردہ جس کے نیچے ہیں نہاں
روح کی پہنائیاں اور قلب کی گہرائیاں۔
اے حکیمِ کامل اے تلمیذِ رحمٰن فلسفی!
جس نے اپنا ورثۂ فطری ابھی کھویا نہیں۔
تو ہے اس اندھوں کی محفل میں وہ چشمِ پاک بیں
جانتی ہے دفترِ معنی کے جو اسرار کو،
دیکھتی ہے جلوۂ فطرت کے جو انوار کو،
جس کے آگے خود بخود ہیں وہ حقائق جلوہ گر
ڈھونڈتے پھرتے ہیں جن کو سُو بسو ہم عمر بھر
زندگی کی بے کراں ظلمات میں،
جیسے سرگرداں کوئی رہرو اندھیری رات میں۔
تجھ پہ غالب ہے تری ربّانیت کچھ اس طرح
روزِ روشن کا جہاں پر نُور طاری جس طرح،
جیسے آقا کا ہو بندے پر مکمّل اختیار،
یعنی اک قوّت کہ ممکن ہی نہیں جس سے فرار،
یہ تیا "ننھے سے بچے" جس کی نشانِ حریّت
آسماں زادوں کی آزادی کی ہے اک یادگار،
اے کہ جوبن پر ہے تیری زندگانی کی بہار،
کیوں ابھی سے کاروبارِ دہر میں مصروفیت؟
کھیل سمجھا ہے جسے ہو گی حقیقت ایک دن،

تو ذرا بڑھنے تو دے، اے جانِ من! کچھ اپنا سن۔
عمرِ آئندہ کو کیوں دیتا ہے، اے ناداں! صدا؟
اپنے آپ آئے گی وہ لے کر غلامی کا جُوا ــــ
اپنی راحت سے بھلا کیوں برسرِ پیکار رہے؟
کس لئے تو آپ اپنے درپئے آزار رہے؟
بخ کی صورت ایک دن دُنیا کا دستورِ عمل
کر کے رکھ دے گا ترے اعضائے روحانی کو شل۔

حبّذا! ہے اپنی خاکستر میں اک ایسا شرار
جو بجھائے بجھ نہیں سکتا کبھی۔
اے خوشا! ہے میرے دل میں یاد اک شے کی ابھی
تھی جو خود اک ہرتی پھرتی چھاؤں سی ناپائدار ــــ
مجھ کو جب آتا ہے اپنی عمرِ رفتہ کا خیال
میرے سینے میں اُمڈ آتا ہے جذبۂ شکر کا
اور میرے لب پہ آجاتا ہے اک جوشِ ثنا۔
شکر کچھ اُن سادہ معصومانہ خوشیوں کا نہیں
جن سے مالا مال تھے بچپن کے سال ــــ
یعنی وہ بے فکریاں، خوش باشیاں، آزادیاں،
نو دمیدہ بال اُمیدیں جو مرے سینے میں تھیں
نت نئی بیتابیوں سے پرفشاں؛
عہدِ طفلی کا وہ حُسنِ اعتقاد،
زندگانی پر وہ لُطفِ اعتماد ــــ
خوب تھے اپنی جگہ یہ عہدِ طفلی کے مزے،
پر ترانہ حمد کا لیکن نہیں اُن کے لئے۔
نغمہ سنج مدح ہوں میں اور ہی اک چیز کا،
اور ہی اک بات پر کرتا ہوں میں شکرِ خدا:
وہ حواسِ خمسہ کی پیہم سوال انگیزیاں،
عالمِ اشیا کی متواتر معمّا خیزیاں؛
وہ یکایک آنکھ سے چیزوں کا چھپ جانا کہیں

اک چھلاوا جیسے تھا موجود ابھی اور اب نہیں،
دل میں رہ رہ کر وہ اُٹھنے والے مبہم وسوسے،
جیسے نامعلوم و پُراسرار صحرا ہو کوئی،
اُس کی تنہا وسعتوں میں راہ پیما ہو کوئی
ہر قدم پر اپنے سائے سے بھی جو ڈر کر چلے۔
—— وہ جبلّی مقتضیاتِ بلند۔
جن کے آگے لرزہ براندام ہو نفسِ بشر
جیسے مجرم محتسب کو دیکھ کر ——
میں ہوں ان سب کے لئے احسانمند ——
وہ ہمارے سب سے پہلے واردات و کیفیات
وہ کسی عہدِ کہن کے دُھندلے دُھندلے واقعات
اصل میں چاہے وہ کچھ بھی کیوں نہ ہوں،
وہم کا اک شعبدہ ہی کیوں نہ ہوں،
پھر بھی اپنی زندگی کے مطلعِ انوار ہیں،
اپنی شب کی تیرگی میں صبح کے آثار ہیں۔
اُن سے بڑھتے ہیں ہمارے حوصلے۔
زندہ ہو جاتے ہیں دل میں ولولے۔
ان کے باعث ہم کو اس ہستی کے شور انگیز سال
ایسے لگتے ہیں کہ جیسے مختصر لمحات ہوں،
وہ سکوتِ جاوداں کا ہے جو بحرِ بے کراں
وسعتوں میں اس کی کچھ ناچیز سے قطرات ہوں ——
ان حقائق کو نہیں مطلق زوال،
ان کو حاصل ہے بقائے جاوداں
کوئی شے ان کو مٹا سکتی نہیں،
ان کی مشعل کو بجھا سکتی نہیں،
جیسے اپنی بے حسی و بے دلی،
کاروبارِ دہر میں محویتِ دیوانہ وار
بچپنے کے عہد کا انجان پن
نوجوانی کی وہ شوریدہ سری، دیوانگی،

عہدِ پیری کی وہ دُنیاداری و فرزانگی۔

ہے یہی باعث کہ مطلع صاف ہو' گاہے اگر'
چاہے ہم اُس قلزمِ باقی سے ہوں کتنے ہی دُور
ہم یہاں آئے ہیں جس کی وسعتیں کر کے عبُور'
پھر بھی آجاتی ہے ہم کو اک جھلک اُس کی نظر۔
ہم کو اُس کے پاس لے جاتا ہے پل بھر میں خیال'
اور ننھے ننھے بچے ہم کو اپنے سامنے
اُس کے ساحل پہ نظر آتے ہیں ہنستے کھیلتے۔
ہم کو دنیا ہے سنائی اُس کا غوغائے جلال۔

گاؤ گاؤ' اے پرندو' گاؤ تم خوشیوں کے گیت'
ناچو بھیڑو' تم بھی ہو کر مست حال'
تال پہ ڈھولک کی جیسے دے کے تال'
ناچو' گاؤ! ہے یہی موسم کی ریت۔
ہیں تخیل میں تمھارے جمگھٹے کے ساتھ ہم
رقص و نغمہ میں تمھارے ہم نوا و ہم قدم —
ہاں مناؤ رنگ رلیاں بھر کے جی'
خوش کرے گی دل ہمارا بھی تمھاری یہ خوشی —
کیا ہوا جاتا رہا گر اپنی آنکھوں کا وہ نور
جس کے دم سے تھا زمانہ میں تجلی کا ظہور؟
کچھ نہیں بگڑا اگر اپنے لیے جاتی رہی'
سبزے کے وہ لہلہانے کی گھڑی'
روئے گل کے تمتمانے کی گھڑی۔
اُس کے جانے کا کریں گے ہم نہ مطلق غم کبھی
بلکہ جو کچھ بچ رہا ہے اُس سے جی بہلائیں گے۔
ہم اسے سرچشمۂ تسکینِ خاطر پائیں گے۔
جیسے اپنا جذبۂ ہمدردیٔ نوعِ بشر
جو ودیعت ہم کو فطرت سے ہُوا

اور نہیں جس کو فنا۔
وہ خیالاتِ تسلّی آور و مرہم اثر
دل میں ہوتے ہیں جو آکر رُونما،
رنج و دردِ نوعِ انساں کے مناظر دیکھ کر،
جیسے اپنے آپ پھوٹے چشمۂ آبِ شفا؛
وہ یقیں جس کو کہ آتا ہے نظر
موت کے پردے میں بھی روئے حیات؛
زندگی کے وہ سبق آموز حکمت تجربات
جن سے بنتا ہے وہ قلبِ فلسفی
آشکارا جس پہ ہر رمزِ خفی۔

ہاں ابھی اے سبزہ زارو! کوہسارو! ندّیو!
مجھ کو قطعِ آشنائی کا نہ تم پیغام دو۔
میرے دل میں ہے تمھارا جذبۂ اُلفت ابھی،
ہاتھ سے البتہ میں نے جانے دی ہے اک خوشی،
اب میں تم سے روز و شب وابستۂ داماں نہیں
اور تمھارے قربِ پیہم کا میں اب خواہاں نہیں۔
یہ پہاڑی ندّیاں جو جھاگ اُڑاتی آتی ہیں
یہ کچھ اب پہلے سے بھی بڑھ چڑھ کے مجھ کو بھاتی ہیں،
جب میں ان کی طرح پھرتا تھا چٹانیں پھاندتا۔
جیسے کوئی رہروِ سیماب پا۔
ایک صبحِ نو کی معصوم اور سادہ روشنی
مجھ کو تو ویسی ہی لگتی ہے بھلی۔
ڈوبتے سورج کے گرداگرد یہ جو بدلیاں
ڈالتی ہیں جھٹپٹے کا ہالہ سا،
ماندسا اک رنگ اُس ہالہ میں ہوتا ہے عیاں؛
رنگِ نظارہ ہے یہ گویا اک ایسی آنکھ کا
سوانگ جس نے دیکھے ہیں رچتے ہوئے
آدمی کی ہستئِ دو رُوزہ کے ـــ

ہو چکی دوڑ اک نئی،
اے لو! بازی اور اک جیتی گئی۔
قلب انسانی ہے جو ہم کو مشیت نے دیا،
کم ہے جتنا بھی کریں ہم اُس کا شکرانہ ادا۔
اس کا غم اُس کی خوشی اس کی امید اور اُس کی یاس
ہے ہمارے لب پہ ان سب کے لئے شکر و سپاس ––
سچ تو یہ ہے دل ہی ہے اپنا مدار زندگی،
ایک دل ہی پر تو ہے سب انحصار زندگی ––
حال ہے اپنا تو یہ ادنیٰ سے ادنیٰ پھول بھی
کھل رہا ہو جو کہیں اگر مجھ کو آجائے نظر
میرے دل میں اس کی صورت دیکھ کر،
پیدا ہو جاتی ہے گہری سوچ سی،
اتنی گہری اتنی گہری، آنسوؤں کی بھی زباں
کر نہیں سکتی ہے پورے طور سے اس کو بیاں ––

محمد ہادی حسین

غزل

چمن چمن میں ترا ذکر عام کرتے ہیں
کبھی صبا، کبھی گل سے کلام کرتے ہیں
ترے خیال کا رنگین آسرا لے کر
کنار رنگ شفق میں قیام کرتے ہیں
کچھ ایسے لمحے بھی آتے ہیں ہجر میں جب ہم
ترے بغیر بھی تجھ سے کلام کرتے ہیں
وہ رسم عشق و محبت سے آشنا ہی نہیں
جو رسم عشق و محبت کو عام کرتے ہیں
ہے کس کا فیض تصور کہ آج مجھ کو ضمیر!
مہ و نجوم بھی جھک کر سلام کرتے ہیں

ضمیر اظہر

آوازیں

دور سے ایک آواز اس کے کان میں پڑی۔ وہ ان آوازوں کا عادی ہو چکا تھا۔ اُس کے کان اس سے مانوس ہو چکے تھے۔ کمرے سے باہر نکل کر انہیں سننے کی اس کے دل میں کوئی چاہ نہ تھی۔ میز پر کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔ دیوار پر پہاڑی منظر کی ایک دلکش تصویر لٹک رہی تھی اور کلاک کی ٹک ٹک اسے وقت کا احساس دلا رہی تھی۔ وہ پریشان خاطر تھا کیونکہ آج اسے سٹوڈنٹ کانگرس کے سالانہ جلسہ میں پڑھنے کے لئے تقریر لکھنی تھی۔ اس کانگرس کی صدارت اس کی مرضی کے خلاف اس پر ٹھونسی گئی تھی۔ طلباء کی اس جماعت کے اغراض و مقاصد محض سیاسی ہونے کی وجہ سے وہ اس عزت کو قبول کرنے سے ہچکچاتا تھا۔ وہ سیاسیات کو صرف ایک علمی شغل سمجھتا تھا۔ اس سے پرے کچھ نہیں۔ وہ عملی سیاسیات سے خائف رہتا۔ وہ جانتا تھا کہ گیندے کی کمال دالا سخت جان انسان ہی اس کھیل کے لئے موزوں ثابت ہو سکتا ہے۔ "دل کی ناتوانائی" بیشہ کی آسائش اور بدنامی کا خوف اسے اس راستہ پر گامزن ہونے سے روکتے تھے۔ اس پر یہ راز بخوبی منکشف ہو چکا تھا۔ کہ سیاست کے بھنور میں پھنس کر کوئی شریف انسان خیر و عافیت کی تمنا نہیں کر سکتا۔ اس کی عزت ہمیشہ غیر محفوظ رہتی ہے۔ عوام کی نگاہ اس کے راز ہائے مخفی پر لگی رہتی ہے۔ جن کو طشت از بام کرنے میں انہیں ایک خاص قسم کی لذت کا احساس ہوتا ہے۔ طلبا کی سیاسی سرگرمیاں اسے ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں۔ اس نے دیکھا تھا کہ تعلیم کا خوف۔ جنسی بھوک، اور لیڈرشپ کی تمنا۔ ان لوگوں کی سیاسیات کے متحرک ہوتے۔ ان کا وقتی جوش دیرپا نہیں رہتا۔ اسے ان کے دماغی ارتقا پر شک تھا۔ ان کی سنجیدگی محض عارضی ہوتی۔ ان کی علمیت سطحی۔ ان کے خیالات زندگی کی واقعیت پر نہیں بلکہ رومانیت اور محض جذبات پر مبنی ہوتے ہیں۔ ان کی سیاسیات اور عملی زندگی میں کتنا تضاد تھا۔ کہاں تو حریت پسندی کا پاک جذبہ اور کہاں توہمات کی بے جا قید۔ کہاں مساوات کا شور اور کہاں تفرقات کا نمونہ۔ ایک طرف اخوت کے نعرے دوسری طرف امتیازات کے دکھاوے۔ اخلاق ان کی زندگیوں کو چھو تک نہ گیا تھا۔ ضبط ان کی زندگی میں عنقا تھا۔ گویا علم اور عمل میں خدا واسطے کا بیر تھا۔ ان کا لائحہ عمل، ان کی غیر ذمہ دارانہ روش، اور ان کی ذہنی کی دیسی غلامی اسے اکثر پریشان کرتی۔ ان کی سیاسیات صرف ایک بات پر مرکوز تھی —— سٹرائیک —— پروفیسر کے خلاف، کام کے خلاف اور امتحانات کے خلاف۔

دور نعروں کی آواز اسے پھر سنائی دی۔

یہ نعرے روزانہ زندگی کا ایک حصہ بن گئے تھے۔ شور و شغل انسانی زندگی کا لابد جزو بن چکا تھا۔ گلیوں اور بازاروں میں ایک ہی بات کا تذکرہ تھا۔ گھروں اور کلبوں میں ایک ہی بات زیر بحث تھی۔ آج کتنے انسان سپرد تیغ ہوئے اور کتنے مکان نذر آتش ہوئے۔ قتال و جدال کے اعداد و شمار فرقہ وارانہ تناسب پر مبنی ہوتے تھے۔ مسلمان خوش ہوتے کہ ہندوؤں کو اقتصادی زک پہنچ رہی ہے۔ ہندو بغلیں بجاتے کہ مسلمانوں کو جانی نقصان پہنچ رہا ہے۔ انسان کے ہاتھوں۔ انسان پر قہر خدائی نازل ہو رہا تھا۔ اور انسان اس پر مطمئن تھا۔ فرقہ وارانہ جنگ ایک نئے اور انوکھے ڈھنگ سے لڑی جا رہی تھی۔ جس میں اصول و ضوابط کی پابندی اعتراف شکست کے مترادف تھی۔ شکست و فتح کا معیار مجروحین اور مقتولین کی تعداد پر مبنی تھا۔ نہتوں پر وار کرنا۔ عورتوں کی عصمت دری کر کے ان کو موت کے گھاٹ اتارنا۔ بچوں کو لقمۂ اجل اور بوڑھوں کو ہدف غیظ بنانا۔ اس جنگ کے قواعد اولین تھے۔ مکانوں کے ساتھ مکینوں کو سپرد خاک کرنا قابل تحسین گردانا جاتا تھا۔ اس جنگ کے اصول بین الاقوامی جنگ کے اصولوں سے مختلف تھے۔ جب کہ آخر الذکر جنگ میں فریقین ایک دوسرے کو جانے بغیر آپس میں الجھتے۔ اول الذکر فساد میں برسوں سے

ایک ہی پڑوس میں بسنے والے ایک دوسرے پر پل پڑتے ۔ کثیر التعداد فرقے والے کم تعداد فرقہ والوں پر اس طرح حملہ آور ہوتے جیسے بھیڑیوں کا ایک ہجوم بھیڑوں کے ایک غلّے پر ۔ بعض اوقات یہ لوگ پناہ میں آئے ہوئے کمزور لوگوں پر جذبۂ اخوت کا پُرزور اظہار کرتے اور ان کی اس سادہ لوحی کی پاداش میں ان کے اجسام کے پرخچے اڑا دیتے ۔ ان کے ہم مذہب شرفا ۔ بظاہر ان حملوں کی مذمت کرتے اور حملہ آوروں کی اس جارحانہ کارروائی کو بزدلی گردانتے ۔ لیکن بہ باطن وہ ان جلادوں کے سفاکانہ کارناموں پر خراجِ تحسین ادا کرتے ۔ تعداد مردوں کی ہنستی ہوئی زندگی کے چراغ یک لخت بجھ کر رہ جاتے ۔ بدنصیب عورتوں کی آنکھوں [illegible] اتنے آنسو نہ رہ پاتے ۔ جنہیں بہا کر وہ اپنے مرحوم خاوندوں اور بیٹوں کی یاد تازہ کر سکتیں ۔ لیکن جلادوں کی [illegible] انہیں اس لعنت سے رہائی دلاتیں اور رحمت باری بن کر ان کی روحوں کو بچھڑے ہوؤں کے ارواح سے ملا دیتیں ۔ یتیموں کے آنسوؤں اور معصوموں کے نالوں کو بھی یہی تلواریں تھما دیتیں ۔ خاندانوں کے خاندان صفحۂ ہستی سے معدوم ہو گئے ۔ گاؤں کے گاؤں پردۂ گیتی سے مٹ گئے ۔ لیکن تباہی و بربادی کے یہ مناظر انسانوں کو اس کی تخریبی کارروائی پر مبارکباد دے رہے تھے ۔ اور اس کامرانی پر اسے گوناگوں راحت محسوس ہوتی ۔

اخبارات میں بھی انہیں واقعات کو فوقیت ملتی ۔ صبح کا اخبار اب بھی اس کی میز پر دھرا تھا ۔ صفحۂ اول بھی قتل اور آتشزدگی کی وارداتوں سے پُر تھا ۔ کلکتہ میں بموں کی لڑائی ہو رہی تھی ۔ کانپور میں چاقو چل رہے تھے ۔ امرتسر میں گرفتاریاں ہو رہی تھیں ۔ لاہور میں مکان جلائے جا رہے تھے ۔ انسانی دماغ اپنا توازن کھو بیٹھا تھا ۔ دنیا کی تاریخ اس کی آنکھوں کے سامنے تیرنے لگی ۔ وہ اوقات جب انسان کی ذات پر ایسے مصائب نازل ہوتے تھے ۔ اس کے سامنے گھومنے لگے ۔ تاریخ انسانی کے دھندلکے گزرے سے ہے کہ جب حیوانیت اور انسانیت امتیازات سے بالا بالا تھیں ۔ بیسویں صدی کے ایٹم تک جب انسانی دماغ ارتقاء کے آخری زینے پر پہنچ چکا تھا ۔ انسانی زندگی میں صرف ایک ہی بات نمایاں تھی ۔ وہ تھا اس کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا مادۂ تخریب ۔ انسانی مذہب کی ترقی اسی تخریب کی ترقی تھی ۔ انسانی دماغ کا ارتقاء جنگ و جدل کے موجودہ طریقوں پر فوقیت تھا ۔ لیکن اسے انسانی حافظے کی کمزوری پر ہنسی آگئی ۔ دنیا کی قومیں اس کے ملک کی ان وارداتوں کو حیران کن نظروں سے دیکھتے تھے ۔ جیسے یہ کوئی گناہ ہائے کبیرہ ہیں ۔ اسے یاد آیا ۔ کہ کس طرح ایک سفر کے دوران میں ایک فرانسیسی خاتون اس معاملے پر اس کے ساتھ الجھ پڑی تھی ۔ اس کے ملک کی اس خانہ جنگی کو وہ جہالت سے منسوب کر رہی تھی ۔ اسے اس بات کا شک تھا ۔ کہ لوگوں کی یہ قدامت پسندی ان کی آزادی میں سدِ راہ ثابت ہوگی ۔ اسے یہاں کا مستقبل نہایت ہی تاریک نظر آ رہا تھا ۔ اور وہ ہمدردی کے آنسو بہانے والی ہی تھی ۔ کہ وہ اس پر پل پڑا ۔ بھلا کون سا ملک ان فسادات سے مستثنیٰ رہا ہے ؟ مذہبی خانہ جنگی کی آڑ میں انسانی خون کہاں نہیں بہا ؟ زمانہ وسطیٰ کے کرسٹانوں کے باہمی نزاع و فساد اب بھی دماغ سے نہیں اترتے ۔ اس نے اس خاتون سے مؤدبانہ پوچھا تھا کہ اگر وہ سینٹ بارتھولومیوں والے دن کے قتال و جدال کو بالکل بھول بیٹھی تھی ۔ جہاں صرف ایک پیرس شہر میں چوبیس گھنٹوں کے اندر ایک لاکھ سے زیادہ مرد و زن فرقہ وارانہ نزاع میں مارے گئے تھے اور جہاں مذہب کے نام پر بھائی نے بھائی پر تلوار اٹھائی باپ نے بیٹے کو موت کے گھاٹ اتارا اور خاوند نے بیوی کے خون سے ہولی کھیلی ۔ جہاں بچے ۔ بوڑھے ، اور عورتیں میں تمیز ناممکن تھا ۔ اس جارحانہ تسلط کی مثال دنیا بھر میں نہیں مل سکتی ۔ اس پر بھی وہ یورپ کی اعلیٰ تہذیب پر نازاں تھی ۔ جہاں انسانی دماغ کا توازن کسی صدی میں بھی قائم نہیں رہا ۔ کیا ہوا اگر آج ان لوگوں نے مذہب کے نام پر تلوار اٹھانا بند کر دیا ہے ۔ اب سیاسیات اور اقتصادیات انہیں کشت و خون کے کھیل میں بدمست رکھنے کے لئے کافی ہیں ۔ اگر یورپ نے دنیا کو سائنس کا معجزہ عنایت کیا تو سائنس کا ناجائز استعمال بھی دنیا کو سب سے پہلے اس ہی نے سکھایا ۔ اسے ایک ترقی کا آلہ کار بنانے کے بجائے اس نے اسے تخریبی کارروائی کے لئے استعمال کیا ۔ سائنس کا مناسب استعمال آج دنیا بھر کو گلزارِ جنت میں تبدیل کر سکتا تھا ۔ انسانی نسل اس دنیا ہی میں بہشتِ بریں کے مزے لوٹ سکتی تھی ۔ لیکن

پی تہذیب کی خود غرضیت اور ہوس پرستی نے دنیا کو بدترین دوزخ میں تبدیل کر دیا - سرمایہ داری اور ملوکیت پرستی اس تہذیب کے خاص تھے - اور بربادی و تباہی اس کے لازمی نتائج - تباہ کن لڑائیاں جو بے شمار ملکوں اور قوموں کو اپنے چنگل میں لپیٹ کر بربادی کے رقت انگیز نظارے پیدا کرتیں، یورپی تہذیب کا ہی نتیجہ تھیں - اسی تہذیب کی بدولت پچاس سال کے قلیل عرصے میں دو عظیم جنگیں ظہور پذیر ہوئیں - جنہوں نے دنیا کو ہلا دیا - اور اسے ایک غارت شدہ کرّے میں تبدیل کر دیا - آج بیماری، بے کاری اور فاقہ مستی اس تہذیب کی وراثت بن کر بدنصیب بنی آدم کو، یتیم بچوں اور مظلوم لڑکوں کو گھیرے ہوئے تھیں - اس کی اس مدلل بیانی نے اس خاتون کو مرعوب کر کے رہ دیا اس کے منہ پہ تالا لگ گیا -

اخبارات میں لیڈروں کے بیان دیکھتے - جنہیں پڑھ کر اس کے نتھنے غصے سے پھڑپھڑا اٹھتے - اس کا دل انہیں ہزار دگالیاں سناتا - ان ظالموں کی جارحانہ کارروائیاں ان تباہ کاریوں کے پس پردہ کام کرتیں - اور انسانی فطرت کے تاریک پہلو کا پکار پکار کر اظہار کرتیں جذبہ خود غرضی اور نفس پرستی کے ماتحت وہ لوگوں کو اپنا آلۂ کار بناتے - عوام کی جہالت اور کج روی کو وہ اپنی مطلب براری کے لئے استعمال کرتے اپنا الّو سیدھا کرنے کی غرض سے وہ ہزارہا لوگوں کی قربانی دینے سے بھی گریز نہ کرتے - جب پرامن طریقے ان کی مطلب پرستی کے راستے میں حائل ثابت ہوتے تو وہ لوگوں میں جذبۂ حقارت بھڑکاتے اور مذہبی انتہا کی آگ کو انگیخت کرتے - نفرت کی آگ خطرناک شعلے بن کر بھڑک اٹھتی - جس میں لیڈروں کی تکمیلِ حرص کے عوض عوام کے امن، ان کے اجسام اور گھربار پرخچے بن کر اڑ جاتے - بلا کسی وجہ کے لوگ ایک دوسرے پر جھپٹ پڑتے اور چشم زدن میں انسانی لاشوں کے انبار لگ جاتے - تہذیب پھر پیچھے کی طرف قدم اٹھاتی اور ایسا معلوم دیتا کہ زندگی بلندی سے تنزل کی طرف بھاگی جا رہی ہے - اس تباہی و بربادی میں لیڈروں کو کوئی نقصان نہ پہنچتا - اتنے کشت و خون کے بعد بھی وہ صحیح سلامت رہتے - عوام کے جذبات کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکانے والے بالکل محفوظ رہتے اور انہیں کوئی گزند نہ پہنچتی - مخالف گروہوں کے لیڈر باہمی تعلقات کو بحال رکھتے اور ان کا باہمی رشتہ برقرار رہتا - ان کا ملاقاتوں اور دعوتوں کا سلسلہ جاری رہتا - اس نے محسوس کیا تھا - کہ زیادہ کامیاب لیڈر بننے کے لئے زیادہ سفاکانہ اور سنگدلانہ طبیعت کی ضرورت ہے - وہ دل جس میں درد نہ ہو، جو جذبۂ محبت اور اشتی سے خالی ہو - لیڈر بننے کے لئے زیادہ موزوں ثابت ہو سکتا ہے -

دونوں اطراف کے لیڈر ایشور کا واسطہ دے کر لوگوں سے اپیل کرتے - اپنے کاز کی حمایت میں پروردگارِ عالم کا حوالہ دیتے اس کا نام لے کر عوام اپنے مخالفین پر حملہ آور ہوتے، اور اپنی فتح اور دشمن کی شکست کا باعث پروردگار کی نیرنگیاں بتاتے - اس جارحانہ قتل و غارت میں بھی خدا کا حوالہ دیا جاتا - کشت و خون میں بھی ایشور کو شاہد بنایا جاتا - یہ خیال اسے اکثر پریشانیوں میں دھکیل دیتا - وہ خدا پرست تھا - پوجا پاٹھ کے بغیر وہ دن کا کام شروع نہ کرتا - وہ اور اس کی بیوی بلا ناغہ سندھیا کرتے اور سکھ اور شانتی، دولت و صحت کی دعائیں کرتے - لیکن بارہا شک کا دھواں اس کے دل کی گہرائیوں سے نمودار ہوتا - اپنے معبود کی طاقت پر اسے شبہ گزرتا - وہ ان باغیانہ خیالات کو دبانے کی کوشش کرتا - لیکن وہ کسی نہ کسی دراڑ سے باہر نکل کر اس کی پریشانی کا موجب بن جاتے - اگر وہ اس دنیا کا خالق اور طاقت لامحدود کا مالک ہے تو اس کی تخریب کو کیوں نہیں روک سکتا؟ جنگ و جدل، قحط و طاعون، زلزلے اور طوفان کس طاقت کے ماتحت کام کرتے ہیں؟ کیا ان آفات پر اس کا کوئی بس نہیں؟ کیا وہ اپنی لامحدود طاقت کو ان مصائب کے انسداد کے لئے استعمال نہیں کر سکتا؟ کس بنا پر اپنے معبود کو سروشکتیمان اور عالم الغیب کا لقب دے اگر تخریب کا ذمہ دار بھی وہ ہے تو کن وجوہ کی بنا پر اس کی برتری کو تسلیم کیا جا سکتا ہے؟ اگر انسانی دل و دماغ اس ایشور کے عطا کردہ عطیے ہیں تو ان میں پیدا ہونے والے تخریبی خیالات کا کون ذمہ دار ہے؟

شعور پہلے کی نسبت نزدیک محسوس ہوا

بچے نے چیخ بلند کی۔ نیم وا آنکھوں سے آشا نے اس کی طرف دیکھا اور اسے سہلانا شروع کر دیا۔ اس کو چپ کراتے وقت اس کی سرخ چوڑیوں میں سے موسیقانہ آواز پیدا ہوتی۔ یہ چوڑیاں اس نے صرف ڈیڑھ سال پہلے پہنی تھیں اور اب بھی اس کی شادی کی یاد دلاتی تھیں کتنی کڑوی یاد تھی وہ بھی۔ والدین کی غیر حاضری میں بھلا شادی میں لطافت کہاں۔ دونوں کے والدین نے اس شادی پہ مہر رضامندی ثبت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ان دونوں نے ان کے احکام کو ٹھکرا دیا تھا۔ اس کے والدین نے شادی کے خوبصورت سپنوں کو پرورش دی تھی۔ وہ اسے اپنی ذات میں ایک عالی اور امیر خاندان کی لڑکی سے بیاہنا چاہتے تھے۔ سمترا پر ان دونوں کی آنکھ تھی۔ جو اعلےٰ تعلیم یافتہ نہ ہوتے ہوئے بھی ایک متمول خاندان کی اکلوتی لڑکی تھی۔ اس کے والدین جانتے تھے کہ سمترا کے جہیز کے ساتھ ان کا گھربار بھر جائے گا۔ اور کسی دن سمترا اپنے والد کے گھر کی اکیلی مالکہ ہوگی۔ اور وہ دولت بھی ان کے پاس آ جائے گی۔ وہ کئی سال ان لطیف خوابوں کو پالتے رہے۔ محلے کے لوگ اور ان کے رشتہ دار ان سے رشک کھاتے تھے۔ اس شادی کے بعد ان کے گھر کا نقشہ پلٹ جانا کتنا ضروری تھا لیکن اس نے جیسے ہوا کے ایک تیز جھونکے کی طرح ان کے چراغِ امید کو بالکل گل کر دیا۔ سمترا کے ساتھ شادی کرنے سے اس نے صاف اور غیر مبہم الفاظ میں انکار کر دیا۔ اس کے والدین نے اس کے انکار کو کوئی اہمیت نہ دی اور خاموش رہے۔ کچھ سال گذر جانے کے بعد جب شادی کی بات پختہ ہوگئی اور اس کے والد نے اسے خبر دی۔ وہ آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے فوراً جوشیلے انداز اور سخت الفاظ میں ایک خط انہیں لکھا اور اس میں اس نے صاف طور پر کہہ دیا کہ صرف والدین ہونے کی وجہ سے انہیں اسے بیچنے کا کوئی حق نہیں۔ جنم اور پرورش دینے کی وجہ سے وہ اس کے ضمیر کے ساتھ نہ کھیل سکتے تھے۔ اگر انہوں نے اس پر احسان کئے ہیں۔ تو صرف اپنے فرائض کو سرانجام دیا ہے اور وقت آنے پر وہ بھی اپنے فرائض کی سرانجامی سے کوتاہی نہ کرے گا۔ لیکن کچھ معاملات ایسے ہیں۔ جو بالکل انسان کی اپنی ذات سے وابستہ ہیں۔ اور جن میں وہ کسی قسم کی دخل اندازی گوارا نہیں کر سکتا۔ ایسے معاملات میں انسان خدا کی مخالفت کو بھی ٹھکرا سکتا ہے۔ شادی کوئی گائے بھینس کا سودا نہیں جس میں ان کی رضامندی کی کوئی وقعت نہ ہو۔ یہ تو رشتۂ الفت ہے۔ اور الفت کا وجود لڑکے لڑکی میں ہونا لازمی ہے، والدین میں نہیں۔ اسے سمترا سے کوئی محبت نہ تھی۔ اس کی دولت سے اسے کوئی سروکار نہ تھا۔ آشا کو وہ دل سے پیار کرتا تھا۔ اور محبت میں دولت کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ ایک چٹان کی طرح وہ اپنے فیصلہ پہ مستحکم کھڑا تھا۔ والدین کو سخت دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ ایسے شاندار رشتے کا ہاتھ سے نکل جانا کتنا دل شکن معاملہ تھا۔ شادی کا پختہ ہو کر ٹوٹ جانا دعوتِ ملامت تھی اور برادری کی نظر میں ایک ناقابلِ معافی گناہ۔ ان کی جھڑکیاں، ان کا رعب، ان کی دھمکیاں بے کار ثابت ہوئیں اور منتیں اور واسطے بے سود۔ ماں کے آنسو بھی اس کے عشق کو موم کر کے پگھلا نہ سکے۔ اس نے ان کو لکھ دیا کہ وہ دنیا کی تمام آسائشیں لے کر بھی سمترا سے شادی نہ کر سکتا تھا۔ اور ان گنت خطرات مول لے کر بھی آشا کو چھوڑ نہ سکتا تھا۔ آشا کو وہ آدھ سال سے جانتا تھا۔ جب اس نے کالج میں قدم رکھا تھا۔ وہ اس کے دل پر قابض تھی۔ اور دل ایک وقت میں ایک ہی شخص کی حکومت کو تسلیم کر سکتا ہے۔ سمترا کا اس پہ کوئی حق نہ تھا۔ کیونکہ ان دونوں نے آپس میں کسی کو نہ دیکھا تھا۔ اور نہ ہی محبت کے باہمی عہد و پیمان باندھے تھے لیکن آشا سے اس نے عہد کیا تھا۔ اگر وہ شادی کرے گا تو اس سے۔ وہ اپنے وعدہ کو توڑ کر بے وفا ہونا نہ چاہتا تھا۔ رشتہ داروں نے دل جرح کی۔ اور زمانے کی بگڑوی کی شکایت کی۔ محلے والوں نے آوازے کسے اور تعلیم نو پر لعنت بھیجی۔ وہ اس دلیل کو سن کر ہنس دیتا۔ پانی میں چھلانگ لگا کر بھلا کون نہیں بھیگتا۔ انگریزی ادب اور تاریخ اور سیاسیات کو پڑھ کر جن میں آزادانہ روش ہی کی تلقین ہے۔ صرف کوڑھ مغز انسان ہی متاثر ہوئے بنا رہ سکتے ہیں۔ یہ غلط ہے کہ انگریزی تعلیم غلامی کا سبق دیتی ہے۔ یہ شاید پڑھانے یا پڑھنے والوں کا قصور ہے کہ وہ سمندر کی گہرائیوں میں غوطہ نہیں لگاتے۔ نہیں تو برک۔ مل۔ چارلس بریڈلا۔ ویلز۔ شا اور ہکسلے جیسے مصنفوں کی

ی اسے ضرور ہضم کر لیں گے ۔ اس کے بعد اُشا اور مرنال کی باری آئے گی ۔ اور ظالم آگ انہیں بھی نہ چھوڑے گی ۔ اگلے دن لوگ آکر
ریدیں گے ۔ جہاں ان تیلیوں کے پنجرے ہی ان کے ہاتھ لگیں گے ۔ لیکن اگر اس کا اور مرنال کا جسم جھلس جائے اور اُشا بچ جائے تو ایسی
یں وہ ضرور اسے ہسپتال پہنچائیں گے ۔ اس کی مرہم پٹی کرانے اور اس کی جان بچانے کے لئے ۔ لیکن یہ تو اور بھی بُرا ہوگا ۔ اس کی پتی
کی شمع زندگی بجھ جانے کے بعد اُشا کی زندگی موت سے بھی بدتر ہوگی ۔ سوائے آفات اور مصائب کے اس میں رکھا ہی کیا ہوگا ۔ ایک
بن جائے گی ۔ جس میں سکون و راحت کا مکمل فقدان ہوگا ۔
ہسپتال میں جیسے ڈاکٹر اُسے تندرست کرنے میں کوشاں ہوں ۔ موت کے مُنہ سے بچا کر زندگی عطا کرنے کے لئے ۔ لیکن ظلم کی بھی تو حد
ہے ۔ اس کی بیماری کی مرہم صرف موت ہے ۔ جسے وہ کسی بھی قیمت پر حاصل کرنے کو تیار ہے ۔ وہ پرماتما سے ملتجی ہے کہ اُسے غم سے
ئے ۔ وہ دعا مانگتی ہے کہ اُسے راہِ نجات دلائیے ۔ لیکن پرماتما ہے کہ توجہ ہی نہیں دیتا ۔ دعا ہے کہ بے اثر رہتی ہے ۔ وہ نرسوں کی
مرّت بنتی ہے ۔ موت کے مُنہ میں دھکیلنے کے لئے ، ان کے پاس ایک چھوڑ ، بیسیوں دوائیں ہیں ۔ وہ ان کی کتنی ممنون ہوگی اس
ح انہیں دعائیں خیر دے گی ۔ لیکن وہ مسکرا دیتی ہیں ۔ مس ایشا اسے حوصلہ افزا کلمات سناتی ہے ۔ جنہیں سُن کر اس کا جگر پاش پاش
ہے ۔ ہسپتال کی وسیع دنیا میں کسی سچے ہمدرد کی تلاش میں اس کی آنکھیں پک جاتی ہیں ۔ اچانک اس کی نظر اپنے ساس سسر پہ پڑتی ہے
کی چارپائی کے پاس بیٹھے ہیں ۔ انہیں دیکھ کر وہ کانپ اٹھتی ہے ۔ کیا دعا کا یہی صلہ ہے ۔ پرماتما تو اُسے اُٹھا کیوں نہیں لیتا ۔ اس
نالے بن کر سوئے آسمان دوڑتی ہے ۔ لیکن پرماتما کو اتنی فرصت نہیں کہ توجہ دے اور اس کے پاس فالتو فرشتے بھی تو نہیں ۔ وہ ساس
مناک چہرے کی طرف ڈرتے ڈرتے تاکتی ہے ۔ اس کی قہر آلود نگاہوں کو دیکھ کر اس کے پاپ کانپنے لگ جاتے ہیں ۔ اس کی آنکھوں
ھلے زہر آلود تیر بن کر اس کے جگر کو چیر رہے ہیں ۔ وہ ان کے وار سے بچ سکتی اگر زمین پھٹ کر اس کو اپنے اندر جذب کر لیتی ساس آنکھوں
راہ گالیاں نکل رہی ہیں ۔ ساس کی نظروں میں وہ ایک خوبصورت ڈائن ہے جس نے اس کے بیٹے کو ہضم کر لیا ہے ۔ وہ ایک خوبصورت
ہے جس نے اس کے پوتے کو بھی نہیں چھوڑا ۔ جس لڑکے کو اس نے لاکھوں مصائب سہہ کر پالا ، وہ ایک خوبصورت ناگن کے
ت میں پھنس کر ان ہی سے بے گانہ ہوگیا ۔ اس نے ڈورے ڈال کر اس کے سگوں کا رشتہ تڑوا دیا ۔ اس کی نظروں میں وہ "کل جگی" ہے
نے اس کے خاندان کو بٹہ لگا دیا اور اسے نیست و نابود کر دیا ۔ اس نے خاندان کے چمکتے ہوئے چراغ کو گل کر دیا ۔ جواب ہرگز ہرگز
بلایا جاسکتا ۔

"کیا تم اس کی ماں ہے ؟ " ایک نرس بڑھیا کو مخاطب کر رہی ہے
"نہیں " ۔ وہ رکھائی سے جواب دیتی ہے ۔
" اور کون ہے ؟ "
" اپنے مرے ہوئے بیٹے کی ماں " بڑھیا آنکھوں میں آنسو بھر کر جواب دیتی ہے
یہ چوٹ اُشا کے لئے ناقابلِ برداشت ہے ۔ بڑھیا اس سے کوئی رشتہ جتانا نہیں چاہتی ۔ وہ اپنے مرے ہوئے بیٹے کی ماں ہے ، اس
ہ بیوی کی ساس نہیں ۔ نرس کچھ نہ سمجھ کر ایک طرف کو چل دیتی ہے ۔ لیکن اُشا کی چھاتی جیسے ایک زبردست بوجھ تلے دبی جارہی ہے
وارڈ اسے کھانے کو دوڑتا ہے ۔ تب اس کی نگاہ اپنے سسر پہ پڑتی ہے ۔ وہ خاموش بیٹھا زمین کی طرف دیکھ رہا ہے ۔ اس صدمہ نے
جیسے اس کی قوت گویائی چھین لی ہے ۔ بھوک اور پیاس کے خیال سے بے پروا ۔ وہ گم سم بیٹھا ہے ۔ کپڑے بدلنے کا اسے مطلق دھیان
۔ اس کی داڑھی بڑھ گئی ہے ۔ ڈھیلا کوٹ ، لپٹی ہوئی پگڑی ، میلا پاجامہ اور پھٹے ہوئے جوتے پہنے ۔ وہ کھویا کھویا پھرتا ہے ۔

آنکھیں خالی خالی سی رہتی ہیں ۔ جیسے ان کی چمک رخصت ہو چکی ہو ۔ کاروبار سب تباہ ہو گیا ہے ۔ ایک سانحہ نے جیسے زندگی کی
ب دَم بدل دیا ہے ۔ لیکن سانحہ کیا ہے؟ شادی یا موت؟ ساس سسر کے لئے شادی، آشا کے لئے موت ۔ ان کی نگاہوں میں وہ
رم ہے ۔ جس نے اپنے حسن کے جال میں ان کو ایک جادوگرنی کی طرح پھنسا لیا ۔ لیکن اس کا جرم اور بھی عیاں ہے کہ وہ خود ساتھ کیوں نہ جھلس
ہ ان کی نظروں میں ایک کانٹا بن کر کھٹک رہی ہے ۔

وہ ہسپتال کی زندگی سے اوب سی جاتی ہے ۔ ڈاکٹروں پر سے اس کا اعتقاد اٹھ جاتا ہے ۔ جن کو زندگی کی چاہ نہیں ۔ انہیں صحت مند
ی فکر میں رہتے ہیں ۔ اور جن کو اس کی سخت ضرورت ہو ۔ ان کا علاج ہی نہیں کر سکتے ۔ مجبوراً وہ گھر لوٹتی ہے ۔ لیکن یہاں آکر اسے اپنی شدید
کا احساس ہوتا ہے ہسپتال کی زندگی اور یہاں کی زندگی میں کتنا تضاد ہے ۔ وہاں وہ آرام سے لیٹی رہتی تھی ۔ وقت پر دوائی اور
ل جاتے تھے ۔ باہر کی دنیا سے اسے خبر تک نہ رہتی تھی ۔ لوگ اس کے بارے میں کیا سوچتے ہیں ۔ کیا باتیں کرتے ہیں ۔ اس بات کی
طلق پروا نہ تھی ۔ مگر اب جیسے ایک دم دشمنوں کے درمیان دھکیل دی گئی ہے ۔ شکاریوں کے درمیان ایک شکار آ گھرا ہے ۔ لیکن ان
ریوں میں نمایاں خاصیت ہے ۔ یہ شکار کو سسکا سسکا کر مارنے میں یقین رکھتے ہیں ۔ ان کے ہتھیار بھی انوکھے ہیں ۔ کبھی وہ زبان
ھیار استعمال کرتے ہیں ۔ کبھی خامشی کا ۔ کبھی آنکھوں کا ۔ کبھی اشاروں کا ۔ ساس اس سے بولتی تک نہیں جیسے اسے دیکھتے ہی ۔ اس کی
سی جاتی ہے ۔ اسے گھر کا کوئی کام کرنے کی اجازت نہیں ۔ وہ نہ کسی خوردنی شے کو چھو سکتی ہے ۔ نہ رسوئی کے نزدیک پھٹک سکتی ہے
کے کھانا کھانے کے برتن بھی جدا ہیں ۔ محلے کی عورتیں اس کے سائے تک سے گھبراتی ہیں ۔ اسے دیکھ کر وہ بچوں کو چھپا لیتی ہیں ۔
کا سایہ بھی کتنا خطرناک ہوتا ہے ۔ مندر میں جانے کی اسے ممانعت ہے ۔ ایک ملعون کی حاضری سے ٹھاکر بھی ناراض ہو سکتے

گھر اسے کھانے کو دوڑتا ہے ۔ وہاں رہنا اس کی قوت سے باہر ہو گیا ہے ۔ محلے میں اس کا کوئی ہمدرد نہیں ۔ وہ کسی کے
اپنا دل نہیں کھول سکتی ۔ نہ اس کی کوئی سہیلی ہے ۔ نہ سگا ۔ کسی کے پاس اتنا صبر نہیں کہ اس کی بات تک سن سکے ۔ سب جیسے
یں مصروف ہوں ۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا قیمتی ذخیرہ بھی ختم ہو جاتا ہے ۔ یہ سب اس کی قوتِ برداشت سے باہر ہے
ی دلی کلفت، برداشت کی حدوں کو پار کرتی نظر آتی ہے ۔ ایک عجیب خفیہ طاقت اس پر غالب آنے کی کوشش کرتی ہے ۔ اسے
ت کشمکش کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔ لیکن شکست کے سوائے کچھ بھی اس کے ہاتھ نہیں لگتا ۔ قوتِ غیبی اسے گھر چھوڑنے پر مجبور کرتی ہے ۔
ہر کے وقت، کڑاکے کی دھوپ میں ۔ ساس اسے جاتے دیکھتی ہے لیکن پوچھتی تک نہیں ۔ محلے والیاں اسے باہر نکلتے دیکھتی ہیں ۔ لیکن
تک نہیں ۔ کوئی بھی اسے منع نہیں کرتا ۔ جیسے خفیہ قوت' بیرونی حالات سے سازش میں ہو ۔ گاؤں سے باہر جا کر وہ کھیتوں میں پہنچتی
ے لیکن اس کے پیر تھمتے نہیں ۔ سورج پوری تیزی سے چمک رہا ہے ۔ اس کی تمازت زمین اور درختوں کو جھلس رہی ہے ۔ انسان، چوپائے
پرندے اس دھوپ میں باہر آنے کی تاب نہیں لا سکتے ۔ صرف ایک روح اس جلتی آگ میں گھوم رہی ہے ۔ افسردہ دل اور پریشان
ط ۔ سخت دھوپ اور غایت درجہ کی گرمی اسے سایہ اور ٹھنڈک ڈھونڈنے کے لئے بے چین کرتے ہیں ۔ اچانک' دور درختوں
یک جھرمٹ اسے مدعو کرتا سا معلوم ہوتا ہے ۔ وہ اس دعوت کو رد نہیں کرتی ۔ وہاں درختوں سے گھرا ہوا ایک کنواں ہے ۔ پانی کا سکون
ر خامشی، اس کی روحانی کلفت اور دماغی سوزش سے کتنے متضاد ہیں ۔ پانی کی ساکن گہرائیوں اور اس کی بے کیف زندگی میں کتنا تضاد ہے
جیسے یہ سکون اسے راہِ نجات کی ناقابلِ رد دعوت دے رہا ہے ۔

یک لخت بھیانک چیخوں نے اسے خواب سے چونکا دیا ۔ باہر سے کرخت آوازیں اس کے کان میں پڑ رہی تھیں "صاحب باہر نکلئے ۔

پ کے مکان کو آگ لگ گئی ہے" وہ بدحواس ہو رہا تھا ۔ اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے ۔ کچھ سوجھائی دینا بند ہو گیا ۔ وہ حیران تھا کہ اُسے ں کا پتہ کیوں نہ چل سکا ۔ اور کس طرح کرفیو کے اوقات میں مسلح پولیس کے پہرے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کسی نے اس کے مکان کو یوں آگ لگا دی ۔ لیکن اب سوچنے کا وقت نہ تھا ۔ جلدی سے اٹھ کر اس نے آشا کو جگایا ۔ حقیقت کو جان کر جیسے اس بے چاری کی روح قبض ہو گئی ۔ سب سے پہلے اسے مرنال کی فکر دامنگیر ہوئی ۔ اسے گود میں اٹھا کر وہ باہر کی طرف بھاگا ۔ محلے میں شور بلند تھا ۔ لوگ آگ پر پانی ڈال رہے تھے ۔ لیکن اس سے شعلوں کی بھوک اور بھی بھڑک اٹھتی تھی ۔ وہ بے تحاشا چاروں طرف بھاگ رہے تھے ۔ تیز ہوا اور آگ ملکیت ہستی میں ان کی معاون بن رہی تھی ۔ ان کی زد میں آکر دیواریں اور چھتیں منہدم ہو رہی تھیں ۔ ۔۔۔ ٹکڑے ٹکڑے ہو رہے تھے ۔ گھر کا سامان ۔۔۔ سیاہ ہو چکا تھا ۔ پھر بھی وہ ان بھیانک شعلوں سے لڑتا ہوا ۔۔۔ سنبھالے باہر کی طرف بھاگا ۔ اسے وہاں چھوڑ آشا کو لینے وہ پھر اندر گھس گیا ۔ لیکن محلے کے نوجوان اس کے مکان کے اندر رہا کر آشا کو باہر نکال لا رہے تھے ۔ اس بات سے بے خبر وہ تلاش میں سرگرداں رہا ۔ لیکن آخر زندگی اس کی روح جیسے فنا ہو گئی ۔ اس پر شعلے غضب ڈھا رہے تھے ۔

. . . .

ہسپتال زخمیوں سے بھرپور تھا ۔ فلک رسا نالے دلوں کو چیر رہے تھے ۔ روح فرسا چیخیں دیوار و در کو ہلا رہی تھیں ۔ بڑا ڈاکٹر زخمیوں کی چارپائیوں کے پاس سے گزر رہا تھا ۔ محلے کا چودھری ۔۔۔ سب کی کیفیات بیان کر رہا تھا ۔ ایک زخمی کے پاس جا کر وہ بولا ۔ " اور جناب ۔ اس بے چاری کا خاوند ۔۔۔ آگیا ۔ اور بچہ زخموں کی وجہ سے چل بسا ۔ شادی کو ابھی ڈیڑھ سال ہی ہوا تھا ۔"

ست پرکاش سنگر

غزل

جو کبھی آہ، تو اسے اہلِ درد کیا پایا ۔۔۔ بہت ہوا تو زمیں کانپی عرش تھرّایا

وہ غمِ ملائکہ غمِ اہلِ دہر کو سمجھے ۔۔۔ یہی بہت ہے اگر عشق نے یہی پایا

بجا کہ عشق ہے معصوم پر یہ کیا کم ہے ۔۔۔ کہ اس نگاہ نے تقصیر وار ٹھہرایا

بہت ہوا کہ بُری یا بھلی گزار گئے ۔۔۔ ستم نصیبوں کو جینا تو خیر کیا آیا

اب آرزو بھی تری ساتھ چھوڑے دیتی ہے ۔۔۔ یہ کس دیار میں مجھ کو مرا جنوں لایا

سلیم آج یہ آنکھوں میں اشک کیسے ہیں
کب اس کو بھول گئے تھے جو اب وہ یاد آیا

سلیم احمد

تجلّیات

ترے خیال سے شیریں خیال کیا ہوگا
جو تجھ میں محو ہیں اُن کو ملال کیا ہوگا!

بہشتِ عیش و طرب ہے ترا تصوّر بھی
یہ سوچتا ہوں کہ کیفِ وصال کیا ہوگا

ترے جمال کی رنگینیاں ہیں جس دل میں
خزاں کے جور سے وہ پائمال کیا ہوگا

ترے جمالِ گل افشاں کو جب زوال نہیں
تو میرے شوق و جنوں کو زوال کیا ہوگا

مآلِ عشق سے تو آشنا نہیں ناصح!
ہمیں خبر ہے ہمارا مآل کیا ہوگا

ابھی سے بے خودی و سرخوشی ہے صہبائی
پہنچ کے محفلِ جاناں میں حال کیا ہوگا

آثر صہبائی

پاکستان میں اُردو

اُردو نمبر نظر سے گذرا۔ زیر نظر شمارہ معیاری ادب کا ایک حسین وجمیل مرقع ہے ہر مضمون میں ہمایوں کے روائتی استقلال اور سنجیدہ
ری کی جھلک بدرجۂ اتم موجود ہے بنظر غائر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شمارے کے اکثر مقالے ہمایوں کو ایک ایسے مقام پر لے آئے
جہاں اُسے چند نئے مسائل کا عملی حل سوچنا ہے۔ ہمیں کامل توقع ہے کہ ہمایوں اپنے روائتی تدبر کو کام میں لاتے ہوئے پیش آئند لسانی
ائل کا حل بوجہ احسن ڈھونڈ نکالیگا۔ اور پاکستان کی تہذیبی۔ تمدنی اور لسانی وحدت کے قیام وبقا کے لئے اپنی امکانی قوتیں صرف
ے میں کوئی دریغ نہیں کرے گا۔

مملکت پاکستان میں اُردو کو قومی اور سرکاری زبان کا بلند منصب عطا کرنے اور اس زبان کی تعمیری سرگرمیوں کو تیز تر کرنے
لئے اُردو نمبر میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ مدیر ہمایوں مرکزی حکومت کے ایوان پر اُردو کا پرچم لہرا دینے کے لئے آرزو مند ہیں۔ اور
ائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب اپنے پیغام میں صرف اُردو کو پاکستانی قومیت کی جان قرار دیتے ہیں۔ جناب فلک پیما ہمایوں
ں اُردو سے وفاداری کا جذبہ بدرجۂ اتم موجود پاتے ہیں۔ جو خالص پنجابی ہونے کے باوجود آج تک اُردو سے ہمکنار ہے مسلمانوں
بیداری کا دور ایک بسیط مقالہ ہے جس کا مطالعہ ہر پاکستانی کے لئے لازم ہے۔ پاکستان میں اُردو ایک تعمیری پروگرام ہے جو
الہا سال کے تخریبی حملوں کی شکار اُردو کو جدید ادویات و اعمالِ جراحی سے تندرست کرنے کا مداوا اور اس خانماں برباد پناہ گزین
لئے مکان الاٹ کرانے کی تجویز کرتا ہے۔ پاکستان میں اُردو" نتیجہ فکر جناب نصیر الدین ہاشمی اس مضمون میں مقالہ نگار موصوف نے اُردو
پاکستان کی سرکاری زبان بنانے کے سلسلے میں چند اعتراضات کا اندیشہ فرمایا ہے۔ اور اپنے مزعومہ اعتراضات رفع کرنے کے لئے
یدر آباد کا رُخ کیا ہے۔ میں ان اعتراضات کا جواب دینے اور مقالہ نگار کے خدشوں کو دور کرنے کے لئے پنجاب ہی سے مدد لوں گا۔
ب سے پہلے اعتراضات درج کئے جاتے ہیں۔ اس کے بعد ہر اعتراض کا جواب فرداً فرداً ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔

۱۔ عدالتوں کے لئے قانونی کتب اور نظائر کی جلدوں کا فقدان۔

۲۔ دوسرے دفاتر میں اصطلاحی الفاظ وغیرہ کی عدم موجودگی۔

۳۔ فنی اداروں میں اُردو کی ترویج کی دشواری۔

۴۔ صوبائی زبانوں کی رقیبانہ چشمک۔

اوّل) **پاکستان کی عدالتوں کے لئے قانونی کتابوں کا فقدان:**۔ اس ضمن میں عرض ہے کہ ۱۹۱۴ کی جنگ سے پہلے بیشتر بلکہ
مام تر قانونی تعلیم اُردو میں تھی۔ جہاں آپ بی۔اے۔ایل۔ایل۔بی کا سائن بورڈ دیکھتے تھے وہاں بی۔او۔ایل وکیل کا بورڈ
ہوتا تھا۔ انگریزی تعلیم کے رواج سے حالات نے پلٹا کھایا اور رفتہ رفتہ انگریزی نے اُردو کی جگہ لینی شروع کی۔ ہمارے دیکھنے کی
بات ہے کہ اُردو وکیل عدالت کو کہتا ہے کہ میں انگریزی نہیں جانتا اور انگریزی وکیل کو لامحالہ اُردو میں تقریر کرنی پڑتی ہے۔ قانون
ی بنیادی کتب تعزیراتِ ہند اور ضابطہ دیوانی و فوجداری شمس العلما مولانا نذیر احمد دہلی کی ترجمہ شدہ ابتداء سے رائج ہیں۔ تمام
قانونی اصطلاحات مقرر ہیں۔ جب قانون اُردو میں موجود ہے تو نظائر کے ڈھالنے میں تو چنداں دشواری کا سامنا نہیں ہونا چاہیئے۔

قبلہ ہاشمی صاحب کی خدمت میں التماس ہے کہ پنجاب اور صوبہ سرحد میں تو یقیناً اور سندھ میں غالباً اُردو و انگریزی دونوں مقررشدہ
عدالتی زبانیں ہیں اور اس امر کے لئے کسی جد بد کش مکش کی ضرورت نہیں۔ انگریزیت کا غلبہ برادران وطن کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ کہ اُن
کی ہندی و پنجابی یہ بار نہ اٹھا سکتی تھیں۔ اور اس لئے علوم مشرقی کی ڈگریاں دم گھٹ کر مر گئیں
چوہدری نصر اللہ خاں صاحب سیالکوٹ (والد بزرگوار سر ظفر اللہ خاں) اور مولوی فضل دین صاحب گوجرانوالہ اپنے زمانے کے نامی وکیل
تھے۔ ان کے کتب خانے ان کے نونہالوں کے پاس محفوظ پڑے ہیں۔ تمام قانونی کتب اُردو میں ہیں۔ اور نظائر سے بیاض بھرے پڑے ہیں۔
جو پریس کی زینت بن سکتے ہیں۔ کسی عدالت میں تشریف لے جائیے اور دیکھئے کہ عرائض نویس کس زبان میں قانون لکھ رہے ہیں۔
ہاں عدالتوں میں انگریزی کو تقویت دینے والی ٹائپ رائٹر مشین ضرور ہے۔ کام کی زیادتی اور نقل کی سہولت کے باعث ٹائپ
رائٹر اور ٹائپ رائٹر کی خاطر انگریزی اختیار کرنی پڑی۔ اب حال یہ ہے کہ بیان اُردو اور پنجابی میں ہوتا ہے۔ اور تحریر اُردو اور انگریزی
دونوں میں یا ایک میں، جرح پھر اُردو یا پنجابی میں۔ بحث انگریزی میں فیصلہ انگریزی میں محض شارٹ ہینڈ اور ٹائپ کی خاطر۔
اُردو شارٹ ہینڈ۔ پولیس میں رائج ہے۔ اُردو ٹائپ رائٹر کے متعلق بھی کوئی اچھی صورت انشاءاللہ پیدا ہو جائے گی۔ ضرورت ایجاد کی
ماں ہے! اس طرح انگریزوں اور مغلوں نے ضابطے قائم کئے۔ آپ بھی کریں۔ وہ تیار شدہ کتابیں گھر سے نہیں لائے تھے۔ سب کچھ ضرورت
نے کرایا۔

دوم۔ اصطلاحی الفاظ اور دفاتر کی مشکلات:۔ اس مشکل کے رفع کرنے کے لئے بھی حیدر آباد جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بلکہ سرے
سے مشکل کا وجود ہی نہیں۔ محکمہ مال میں پٹواری سے لے کر افسر مال بلکہ فنانشل کمشنر تک کا ریکارڈ شیر شاہ اور اکبر کے آئین پر مبنی ہے۔ تمام قسم
کے الفاظ مروج و مستعمل ہیں۔ جمعبندی۔ محال۔ پرگنے۔ کھتونی۔ کھیوٹ۔ انتقال آراضی۔ پٹہ۔ خود کاشت۔ چاہی بارانی۔ گرداور قانونگو
تحصیلدار۔ افسر مال۔ مہتمم۔ بندوبست وغیرہ۔ فرمائیے کس لفظ کی ضرورت ہے۔ پولیس میں تھانہ چوکی۔ حوالات۔ ضمنی۔ تلاشی۔ برآمد
مچلکہ۔ ضمانت۔ تھانیدار سپاہی۔ غرضیکہ ہر قسم کے الفاظ آپ کی خدمت کو حاضر ہیں۔ تھانے میں تشریف لے جائیے تمام ریکارڈ اُردو میں ملے گا
دفتروں میں مسل۔ نتھی۔ پیشکار۔ پیادہ۔ اہلمد۔ سررشتہ دار۔ ناظر سب وفادار خادم ہیں۔ خط و کتابت میں یادداشت۔ گشتی مراسلہ۔ نیم سرکاری
روبکار۔ وغیرہ شامل مسل ہیں۔ تار رسانی کا اُردو کوڈ آپ حیران ہوں گے جموں اور کشمیر کے داخلی تار گھروں میں اب تک رائج تھا
سوم [illegible] تعلیم کے لئے بھی حیدر آباد جانے کی ضرورت نہیں معاملہ گھر بیٹھے ہو سکتا ہے:۔ خود انگریزی زبان جو گنجینہ
علوم ہے اصطلاحات سے بے بہرہ تھی۔ تمام ایسے الفاظ لاطینی اور یونانی بلکہ عربی زبان سے اخذ کئے گئے ہیں۔ انگریز ریاضی دان
کو الجبرا کے لئے جو خالص عربی لفظ ہے کوئی لفظ نہ مل سکا۔ یہ لفظ جبر و مقابلہ کا مخفف ہے۔ عربی میں ریاضی کی تمام اصطلاحات
موجود ہیں۔ اقلیدس کے تمام مقالے جن پر موجودہ جیومیٹری کی بنیاد رکھی گئی۔ عربی اصطلاحات سے پُر ہیں۔ یہی اصطلاحات
اُردو میں بھی جذب کی جاسکتی ہیں۔ پُرانے مڈل کا نصاب موجودہ انٹرنس کے نصاب کے برابر تھا۔ اور تمام مضامین اُردو میں
تھے۔ کتب اب تک پرانے مدارس میں موجود ہیں۔ حیدر آباد جانے کی ضرورت نہیں۔ حیدر آباد نے بیشک شاندار کام کیا ہے۔
کے طور پر "مقیاس الحرارت" کے قدیم لفظ کو "تپش نما" کر دیا۔ اور اس طرح سادگی کی طرف رجوع کیا اور وہاں کے معاندانہ ماحول
میں اس قسم کی سلاست کی ضرورت بھی تھی۔ لیکن پاکستان اب اس لعنت سے پاک ہے۔ اور پھر بابائے اُردو کے پیغام پر نظر دوڑائیے
جو اسی شمارے میں کسی جگہ درج ہے۔ اگر اصطلاحات میسّر نہیں تو کیوں نہ عام فہم انگریزی اصطلاحات ہی اپنائی جائیں جو
تدریجی ارتقا کے قدرتی نیچے ہیں۔ اور مقیاس الحرارت اور تپش نما کی جگہ کیوں نہ تھرمامیٹر ہی استعمال کر لیا جاوے جو بلا

عام فہم وفصیح تر ہے۔ جب خود ہمایوں اُردو نمبر کو "شمارہ" سے عام فہم سمجھ کر اختیار کر لیتا ہے۔ اور اکیڈیمی کے لفظ کو اپنایا جا سکتا ہے تو پھر سادہ انگریزی اصطلاحات کو جن میں ہمارے پروفیسر دسترس رکھتے ہیں، کیوں نہ اختیار کر لیا جاوے۔ تاکہ "تدریجی" منزل میں ان بوڑھے بزرگوں کو بھی سر دردی نہ کرنی پڑے۔ اور مستقل الفاظ تیار ہونے تک کام میں رکاوٹ اور دقت پیدا نہ ہو۔

طبی تعلیم میں بھی تاریخ میرے بیان کی شاہد ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں اسی لاہور کے میڈیکل کالج میں ڈاکٹری کی تعلیم اُردو میں ہوتی تھی۔ محض اُردو جاننے والے ڈاکٹر پروفیسر بھی بن جاتے تھے۔ چنانچہ مشہور ڈاکٹر رحیم یار خاں ایسے ہی بزرگ تھے۔ جن کے مجربات انگریز بھی تسلیم کرتے تھے۔ اس وقت کے نصاب کی کتب اور دیگر تصنیفات اُردو میں موجود ہیں۔ حیوانات کے ڈاکٹروں کی اکثریت اب بھی اُردو نصاب والوں کی ہے۔ انگریزی نصاب چند سالوں سے وجود میں آیا ہے۔

اسی طرح اوورسیر بھی اُردو میں تعلیم پاتے تھے۔ بلکہ پنجاب یونیورسٹی تو علوم مشرقی کے لئے ہی وجود میں آئی تھی۔ تمام دنیا کی کتب کا ترجمہ اُردو میں ہو سکتا ہے۔ صرف قدردانوں کی ضرورت ہے۔ طریقۂ تعلیم میں نولٹن صاحب اور وائٹ صاحب جیسے معلموں کو اپنی کتب اصول تعلیم اور فن تعلیم کی صورت میں اُردو میں ڈھلوانی پڑیں۔ فلسفۂ تعلیم و دیگر کتب اس موضوع پر موجود ہیں۔

چہارم صوبہ وار زبانوں کی چھیڑ خانی: یہ مشکل بھی سراسر خیالی ہے۔ اُردو انگریزی کی جگہ پر آ رہی ہے۔ کسی اور زبان کی جگہ نہیں لے رہی جس طرح پہلے انگریزی کی موجودگی میں صوبجاتی زبانیں پھلتی پھولتی رہیں۔ اسی طرح اب بھی وہ مقامی طور پر نشو و نما پاتی رہیں گی۔ بلکہ ضلع وار بولیوں کو بھی اُردو کی ترویج و اشاعت نے اب تک کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ موجودہ کشمکش عارضی ہے سابقہ رکاوٹ ہندی پنجابی کے باعث تھی۔ اور انہیں کے مربی موجودہ کشمکش کو ہوا دے رہے ہیں۔ لیکن ان کے منصوبے خاک میں مل جائیں گے۔ جب سکاٹ لینڈ کی زبان انگریزی کو علمی زبان برداشت کر سکتی ہے تو ہماری صوبجاتی زبانیں کیوں نہیں اُردو کے زیر سایہ رہ سکتیں۔ ۱۵ اگست سے پہلے پنجاب کے گورنمنٹ گرلز اسکولوں کے حصۂ مڈل میں ریاضی کی تعلیم انگریزی میں ہوتی تھی۔ اس لئے کہ ہندی۔ پنجابی اور اُردو ریاضی کی تین جماعتیں نہ بنانی پڑیں۔ یہ تعصب کی ستم ظریفی تھی ورنہ چھٹی جماعت سے انگریزی کی ابتدا شروع ہوتی تھی۔ اور اسی جماعت سے ریاضی انگریزی عبارت میں طالبات پر نازل ہو جاتی۔ یہ ایک لطیفہ ہے لیکن حیرت ہے کہ پاکستان اپنی چھ ماہ کی عمر میں بھی اس بدعت کو رفع نہیں کر سکا۔ ہندی پنجابی والے نہ رہے۔ ان کی طالبات نہ رہیں لیکن ان کا خوف ابھی تک طاری ہے۔ اور ریاضی انگریزی میں جاری ہے۔ حالانکہ قلم کی ایک ادنیٰ جنبش سے اس کو ہٹایا جا سکتا تھا۔ مسلما[ن] بچیاں پہلے ہی ریاضی کی طرف کم مائل ہوتی ہیں۔ اور انگریزی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنا دینا بچیوں کی مشکل کو دشوار تر بنا دیتا ہے۔ پاک[ستان] بننے پر ریاضی کی جماعتیں بالکل خالی ہو گئیں۔ کیونکہ یہ ہندو طالبات کا اجارہ تھا۔ خالی اُستانیوں نے رو پیٹ کر ایک دو لڑ[کیاں] تیار کیں۔ لیکن وہ انگریزی زبان کو نہ سمجھنے کے باعث رو رہی ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ ہمسایہ مشن سکولوں میں ریاضی اُردو میں ہو[تی ہے]

اس بیان سے بخوبی واضح ہو گیا کہ اُردو کے رائج کرنے میں مشکلات محض خیالی ہیں۔ بشرطیکہ دور سابق کی بدعتوں کو رفع [کیا] جائے۔ گذشتہ ایام میں لسانی تعصب کا اتنا زور تھا کہ ریلوے اسٹیشنوں پر ہندی کے علیحدہ بورڈ بنا کر تختوں کے ساتھ لگا[ئے] گئے اور اب پاکستان میں ہزاروں روپے خرچ کر کے ان پر روغن کئے جا رہے ہیں۔ حالانکہ ان کو اتار پھینکنا چاہیئے۔

اصل مشکل جو اُردو کے رائج ہونے میں حائل ہے وہ اس مثال سے زیادہ روشن ہو سکتی ہے۔ زبان کی ٹکسال مقرر ہونی چاہ[یئے] لیکن نوخیز ادیبوں کی غلطیاں مشفقانہ طور پر نمایاں کرنی چاہئیں اور محسوس کرنا چاہیئے کہ زبان کا آب و ہوا اور گلے کی بناوٹ سے گہرا لگاؤ۔ اور جس طرح ایک انگریز تمام عمر محنت کر کے اُردو کا تلفظ ٹھیک ٹھیک ادا نہیں کر سکتا اسی طرح ایک پنجابی بھی بعض امور میں اہل زبان کی پوشی اور رواداری کا محتاج ہے۔ محترم ہاشمی صاحب کا مشکور ہوں کہ انہوں نے اس موضوع کا آغاز کر کے مجھ ایسے ہیچ میرز کو اظہار کا موقع دیا۔ اُمید ہے کہ آپ میرے اس اقدام کو اسی نیک جذبے کے ماتحت تصور فرمائیں گے جس جذبے کے ماتحت آپ نے اس موضوع

زندگی کے رُخ

چاند تاروں نے کہا

"زیست رخشندہ عزائم کی بلندی ہی سے ہے
ذوقِ پرواز سے ہوتی ہے نمودِ پرواز
یہ نشیب اور فراز
صرف انساں کی کوتاہ نگاہی ہی سے ہے
یہ زماں اور مکاں
یہ نرالے زنداں
تُو نے تعمیر کئے اپنے لئے
یہ شب و روز، یہ نظروں کے حدود
ماورٰی اِن سے ہے انساں کا وجود
دیکھتے آئے ازل سے اب تک
دیکھتے جائیں گے جانے کب تک
کُرّہ ارض پہ اک معرکۂ ہست و عدم
ہاں مگر زندہ و پائندہ رہے
تھے جو شرمندۂ سعئ پیہم"

رہ گزاروں نے کہا

"کارواں کتنے یہاں سے گزرے؟
کتنے ہیں نقشِ قدم
کچھ نمایاں ہیں تو کچھ ہیں مدّھم
زندگی منزلِ مقصود کی جانب ہے رواں"

لالہ زاروں نے کہا

"زندگی داغ تمام
دلِ خوں گشتہ و چشمِ نمناک"

گلعذاروں نے کہا

"نوجوانی کا ہے مفہوم فقط نغمہ و رنگ
حسن ہے ایک سُرورِ ابدی کا پیغام
زندگی حسن سے ہے حسن ہے شایانِ حیات"

قمر احمد

بوجھ

سرگنگارام ہسپتال میں آئے ہوئے اُسے ایک مہینہ گذر چکا تھا۔ لیکن ابھی تک گھر سے اُسے کوئی لینے نہ آیا تھا۔ ہر شام سونے سے پہلے وہ دعائیں کرتی اور ہر صبح وہ اس اُمید پر اٹھتی کہ شائد آج اُسے کوئی لینے آیا ہو۔ لیکن ایک مہینہ گذر چکا تھا۔ انتظار کرتے کرتے ایک طویل اور اُداس انتظار! ہر صبح جب دروازے پر لوگ جمع ہوتے تاکہ وہ اپنی اپنی کھوئی ہوئی عورتوں کو گھر لے جائیں تو آسیہ کی بے تاب اور اُداس نگاہیں ان میں گھومتیں جیسے ابھی اس سے کوئی کہہ دے گا "آسیہ تمہارا باپ آیا ہے۔ تمہیں لینے کے لئے۔ چلو اپنے گھر تمہاری ماں تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ فریدہ تمہیں ہر وقت یاد کرتی رہتی ہے۔ تمہارے بغیر گھر سونا ہے۔ چلو اپنے گھر جس کی دیواریں تمہارے قدم چومنے کے لئے بیتاب ہیں۔ تم نے بہت دکھ سہے ہیں۔ لیکن غم کے بادل چھٹ گئے ہیں۔ آسیہ اب تمہیں ہم سے کوئی نہیں چھین سکتا!" اور پھر اُسے خیال آتا اگر اُسے کوئی بھی نہ لینے آیا تو وہ کہاں جائے گی۔ اس کا کونسا گھر ہے؟ کیا وہ ٹھوکریں پھر پیٹ آئیں گی؟ کیا یہ غم کی شامیں کبھی ختم نہ ہوں گی؟ اور یونہی مستقبل کے سائے اس کے سامنے تاریک سے تاریک تر ہونے لگے۔ اور اسے کبھی کبھی یوں احساس ہوتے جیسے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ان اتھاہ گہرائیوں میں کھوئی رہے گی۔ مشرقی پنجاب سے یہاں پہنچ کر ان کھوئی ہوئی عورتوں کے حوصلے کتنے بڑھ گئے تھے۔ وہ اپنے وطن پہنچ گئی تھیں۔ وطن جو اتنی قربانیوں کے بعد لیا گیا تھا۔ وطن جس کی تعمیر میں انہوں نے اپنا سب کچھ مٹا دیا تھا اپنا خون، اپنے بچے، اپنے بھائی، اپنے والدین، اپنے خاوند، اور اب اپنے وطن میں پہنچے ہوئے اُسے ایک مہینہ گذر چکا تھا اور وہ انتظار کرتے کرتے تھک گئی تھی۔ مایوس ہو گئی تھی۔ اِس کے ماں باپ مر چکے ہیں؟ عجیب عجیب طرح کے خیالات ہر لمحہ اُسے پریشان کرتے رہتے وہ بہت زیادہ اُداس رہنے لگی تھی۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ اس کے ماں باپ کے ساتھ سلیم نے بھی اُسے بُھلا دیا ہوگا۔ وہ اس کا ہونے والا شوہر تھا۔ اور اگر یہ انسانی قہر نازل نہ ہوتا تو وہ کب کے ایک ہو گئے ہوتے۔ پھر اُسے وہ رات یاد آئی جب اس بربریت کے دور سے چند روز پہلے ایک سہانی رات۔ چاند کی دودھیا روشنی میں دو دھڑکتے دلوں نے ہمیشہ اکٹھے رہنے کی قسم کھائی تھی۔ اور وہ بہت دیر تک خاموش رہے تھے۔ جیسے آنے والے ان مسرت بھرے لمحوں کے متعلق سوچ رہے ہوں۔ جب وہ ہوں گے اور ان کا پیار پھر اُسے وہ دن یاد آیا۔ جب اِنسانیت نے شیطان کا روپ دھارا تھا۔ گولیوں سے سینے چھلنی ہو رہے تھے۔ بچوں کی چیخوں اور عورتوں کے نالوں سے فلک میں شگاف پڑنے لگے تھے۔ مظلومیت کی انتہا ہو چکی تھی۔ لیکن ظالم ہاتھوں میں فرق نہ آیا تھا۔ اور اُن کی آنکھیں ابھی بے گناہوں کے لہو سے پوری طرح سیراب نہ ہوئی تھیں۔ پھر اُسے وحشی درندوں نے زبردستی اس کے گھر والوں سے چھین لیا تھا۔ وہ چیختی چلاتی رہی تھی۔ ایک زخمی پرندے کی طرح۔

اس واقعہ کو تین مہینے گذر چکے تھے۔ دُکھ اور کرب رنج و غم اور ذلت و بیچارگی کے تین مہینے۔ اور ابھی تک وہ اُسی بوجھ تلے دبی ہوئی تھی۔ اور شائد...... آج تنہائی اُسے سخت پریشان کر رہی تھی۔ آج وہ اکیلی رہ گئی تھی۔ کیونکہ اس کی دونوں سہیلیاں زبیدہ اور حمیدہ صبح جا چکی تھیں۔ حمیدہ ہر وقت آسیہ کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ حمیدہ! اس نے سوچا کتنی اچھی تھی۔ ہمدرد اور مظلوم۔ اس کی وجہ سے اُسے کتنا سہارا تھا۔ ہر وقت وہ اُسے حوصلہ دیتی رہتی تھی۔ کبھی بڑی بہن بن کے۔ کبھی ماں۔ حمیدہ نے کتنے ظلم سہے تھے لیکن پھر بھی وہ ہر وقت خوش رہتی تھی۔ وہ دو مہینے سکھوں کے پاس رہی تھی۔ اور اس کی پھول ایسی جوانی مرجھا

گئی تھی۔ اس کی دو بچیوں اور خاوند کو اس کے سامنے شہید کیا گیا تھا۔ اور اس نے اُف تک نہ کی تھی۔ وہ کبھی کتنی خوبصورت تھی۔ مگر اب ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گئی تھی۔ ایک ایسا جسم جس میں صرف چند روز اور جینے کی سکت ہو۔ اِن دو مہینوں میں اس پر کیا گذری تھی جب وہ سناتی تو ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ اِنسانیت کا مرثیہ کہہ رہی ہو۔ آنسوؤں اور آہوں میں اُس نے اپنی کہانی کہی تھی۔ اور مگر اسی ایک اُمید پر جی رہی تھی کہ ایک دن وہ ضرور اپنے بھائیوں سے جا ملے گی۔ اپنے ہم وطن بھائیوں سے جو اس سے ہمدردی کر سکیں گے جو اس کے زخموں پر مرہم رکھ سکیں گے۔ جو اس کے دکھوں میں برابر کے شریک ہوں گے اور اسی لئے وہ ہر وقت خوش رہتی تھی اس کی موجودگی سے آسیہ میں بھی ایک یقین سا پیدا ہو گیا تھا۔ اور آج چلتے وقت حمیدہ نے اسے کہا تھا۔ "آسیہ خُدا پر بھروسہ رکھو۔ دکھ کے دن کبھی ہمیشہ نہیں رہتے۔ تو ضرور اپنے گھر جائے گی۔ کوئی ماں اپنی بیٹی کو آپ سے جُدا نہیں دیکھ سکتی۔ لیکن دیکھ مجھے بھول نہ جانا۔ ہم نے زندگی کا نہایت مختصر مگر اہم حصہ ایک ساتھ بسر کیا ہے جس نے ہمیں ایک دوسرے کا غمگسار اور سچا ہمدرد بنا دیا ہے۔ بولو مجھے ملو گی نا؟" حمیدہ کو اس کا باپ اور بھائی لینے آئے تھے۔ اور جب وہ پھاٹک سے نکلکر باہر جانے لگی تو دونوں بہنوں کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا آئیں۔ "کبھی میں بھی اس طرح گھر جا سکوں گی۔ اپنے گھر" اور ایک ٹوٹتی ہوئی آہ کی طرح آسیہ اپنے بستر پر گر پڑی۔ اور بجلی کی مدّھم روشنی میں اس نے دیکھا کہ اُس کے سامنے دُور دُور تک عورتیں پڑی ہوئی تھیں۔ مُردہ اور بے جان عورتیں۔ عورتیں جن کی چھاتیاں کٹی ہوئی تھیں۔ عورتیں جو اپنی نسائیت کھو بیٹھی تھیں۔ جو اپنا حُسن گنوا بیٹھی تھیں۔ عورتیں جن کے چہروں اور جسموں پر انسانیت سوز ظلم اور بربریت کی خونیں داستانیں لکھی ہوئی تھیں۔ عورتیں جو مُٹھی بھر ہڈیوں کے سوا کچھ بھی نہ تھیں عورتیں جن کے چہروں پر کرب تھا۔ عورتیں جو سوچ رہی تھیں کہ اِس نئے نظام میں ان کے لئے کونسی جگہ ہے۔ گونگی۔ بہری اور اندھی عورتیں۔ زخمی اور اپاہج عورتیں۔ ان میں سبھی تھیں۔ گاؤں کی گنوار جاہل عورتیں۔ شہر کی پڑھی لکھی مہذب گھرانوں کی عورتیں لیکن اس وقت اُن میں کوئی فرق نہیں تھا۔ کوئی امتیاز نہ تھا۔ اس وقت وہ صرف یہ جانتی تھیں وہ سگی بہنیں ہیں۔ ان سب نے مل کر ظلم سہے ہیں۔ اس وقت ان کے چہروں پر صرف ایک ہی جذبہ تھا۔ نفرت کا جذبہ۔ ایک ابدی نفرت کا جذبہ۔

اسپتال سے کئی عورتیں جا چکی تھیں اور ان کی جگہ نئی عورتیں آ گئی تھیں۔ آخر ایک دن یہ بھی چلی جائیں گی۔ آسیہ نے دل میں سوچا اور وہ اکیلی رہ جائے گی۔ یونہی ہر روز راہ تکتے تکتے۔ لیکن کبھی کبھی اُسے خیال آتا اور ایک ننھی سی اُمید کی کرن اس کی سیاہ تنہائیوں میں چمک اٹھتی۔ وہ سوچتی اُسے بھی ایک دن کوئی لینے آئے گا۔ وہ بھی ایک دن اپنے گھر جائے گی۔ اس دن وہ کتنی خوش ہوگی، کتنی خوش۔ اپنے ماں باپ سے مل کر جن کی وہ سب سے لاڈلی بیٹی ہے۔ چھوٹی فریدہ سے مل کر۔ اسلم اور اصغر سے مل کر۔ اور سلیم ..... سلیم اس نے سوچا کتنا اداس ہوگا۔ سلیم، اپنا بھولا بھالا سلیم۔ جو صرف تڑپانا جانتا تھا۔

اور پھر وہ دن آ ہی گیا جب اُسے لینے آ گئے۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ لیکن یہ سچ تھا۔ اپنے آس کا باپ کھڑا تھا۔ وہ کتنا کمزور اور بوڑھا ہو گیا تھا۔ مگر اس کی آنکھوں میں اَب بھی وہی پُرانی شفقتِ پدری کروٹیں لے رہی تھی۔ اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی تھی۔ وہ اپنے سارے غم بھلا بیٹھی۔ جب باپ بیٹی ملے تو دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ آنسو، جن میں ماضی کی بے پناہ محبت ناچ رہی تھی۔ جن میں باپ کی پُرخلوص محبت تھی۔ وہ دونوں اس طرح چمٹے رہے۔ جیسے انہیں پھر کوئی ایک دوسرے سے جُدا نہ کر دے اور چلتے وقت آسیہ نے سکینہ سے وہی الفاظ دُہرائے۔ جو حمیدہ نے چلتے وقت آسیہ سے کہے تھے۔ الفاظ جن میں ایک پیار، تسلّی اور ٹوٹا ہوا سا اطمینان تھا۔ آسیہ نے یہ الفاظ ہنستے ہوئے کہے تھے۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ اِن الفاظ میں کتنا جھوٹ ہے۔ وہ جانتی تھی کہ وہ سکینہ کو دھوکا دے رہی ہے۔ کیونکہ سکینہ کا باپ ایک مُلّا قسم کا سخت مذہبی آدمی تھا۔ اور سکینہ نے اُسے بتایا تھا وہ کبھی برداشت

نہیں کرے گا۔ کہ اس کی لڑکی جو دو مہینے ایک پرائے دیس میں اجنبی لوگوں کے پاس رہی ہے۔ اب اس کے گھر میں رہے سو وہ اُسے اپنی جھوٹی عزت پر کلنک کا ٹیکہ خیال کرے گا۔ وہ جھوٹی عزت جو اس نے جھوٹ فریب۔ ریاکاری اور نمائش کے بدلے مستعار لی تھی، وہ ایسی عزت پر جو اس کے گھر کو چاندی سے بھر دے اپنی دوسری لڑکیاں بھی قربان کر سکتا تھا لیکن پھر بھی آسیہ نے کہا "ایک دن ضرور آئے گا جب تو اپنے گھر جائے گی سکینہ۔ مجھے یاد رکھنا اور یہ کہتے کہتے دونوں کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئیں"۔ اور سکینہ نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ خدا تجھے خوش رکھے آسیہ۔ تجھے زندگی کی تمام راحتیں حاصل ہوں تیرے یہ ہمدردی کے الفاظ میں تمام عمر نہ بھولا سکوں گی۔ سکینہ کی آواز میں رقت تھی۔ ایک ایسی رقت جو [illegible] دل کے سوز کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ خدا حافظ آسیہ۔ اور پھر سکینہ اندر چلی گئی۔ اس کی آنکھوں میں اب تک آنسو تھے۔

گھر پہنچ کر وہ اپنی ماں سے ملی۔ ماں جس کا اس نے دودھ پیا تھا اور جس کی گود میں پل کر وہ جوان ہوئی تھی۔ ماں جس کے چہرے کی جھریوں میں پہلی محبت لوٹ آئی تھی جب وہ بچی تھی وہ اپنی ماں کی گود میں مچل مچل جاتی تھی اور وہ اُسے چمکارتی اور پیار کرتی تھی پھر وہ چھوٹی فریدہ سے ملی اور اصغر کو گود میں اٹھا کر پیار کیا۔ اسلم شہید ہو چکا تھا۔ اور پھر وہی آنسو لوٹ آئے۔ آنسو جو مسلسل تین مہینوں سے اس کی آنکھوں میں خشک نہیں ہوئے تھے۔ اور آہستہ آہستہ کچھ [illegible] گئی۔ اور نئی خوشیوں میں محو ہو گئی۔ اس نے خیال کیا جس منزل کی اُسے تلاش تھی وہاں وہ پہنچ چکی۔

اُسے گھر آئے ہوئے ایک ہفتہ گذر چکا تھا مگر سلیم ابھی تک اسے ملنے کے لئے نہیں آیا تھا۔ فریدہ نے اُسے بتایا کہ سلیم اب اُن کے ہاں بہت کم آتا ہے۔ وہ اپنی خالہ کے ہاں رہتا ہے۔ اور اس کی شادی نعیمہ سے ہو رہی ہے۔ تو [illegible] یہ کو یوں محسوس ہوا جیسے گھر کی چھت اس پر گر پڑی ہے۔ نعیمہ سے سلیم کی شادی! یہ خیال اسے آج تک نہ آ [illegible] تھا۔ کہ سلیم [illegible] اور کا بھی ہو سکتا ہے۔ اور وہ کبھی سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ سلیم اس کو دھوکہ دے سکتا ہے۔ امیدوں کے محل [illegible] دم نیچے آگرے لیکن ایک بار پھر وہ امید کا سہارا لیکر اُٹھی اور اپنی منزل کی طرف بڑھی "سلیم ضرور آئے گا"۔ اس نے دل میں کہا وہ ضرور آئے گا۔ اور سلیم آیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے آسیہ نے انہیں خوشی کے آنسو جانا۔ اور اس کے سینے سے چمٹ گئی۔ ایک بار پھر آسیہ کی اداس زندگی میں خوشی اور امید کے دیئے جل اُٹھے۔ جیسے زندگی کی ویران راہوں پہ چلتے چلتے۔ تھک کر سہانے کے لئے کوئی سایہ نظر آجائے اور یونہی دم میں بیٹھے بیٹھے کچھ قرار سا آجائے۔ کچھ تسکین سی۔ پھر وہی دن لوٹ آئے تھے۔ وہ پرانی بہاریں دن اور چاندنی راتیں [illegible] انہوں نے مل کر زندگی کے وہ گیت گائے تھے جو بہار کی گھنگھور گھٹاؤں سے متاثر ہو کر گائے جاتے ہیں۔ جو اُبھرے ہوئے سورج کی گلابی کرنوں کو دیکھ کر گائے جاتے ہیں۔ نہ مٹنے والے گیت۔

ڈرائینگ روم میں سلیم کے ابا آسیہ کے ابا سے باتیں کر رہے تھے۔ [illegible] باتیں آسیہ نے [illegible] سوچا سلیم کے ابا آ رہے ہوں گے۔ سلیم اور آسیہ ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ بس جانتا ہوں ان کی جلد از جلد شادی ہو جائے۔ اور وہ نہ جانے کس جذبے کے زیر تحت اُٹھی۔ اور دروازے کے پیچھے کھڑی ہو کے ان کی باتیں سننے لگی۔ سلیم کے ابا کہ [illegible] "بات یہ ہے۔ بھئی غلام محمد یہاں میری عزت کا سوال ہے۔ تمہاری لڑکی دو مہینے باہر دشمنوں کے پاس رہی ہے [illegible] اب اس کا اعتبار نہیں رہا۔ اور پھر یہ سنا ہے کہ آسیہ حاملہ بھی ہے۔ "کیا کیا" پھر اس نے اپنے باپ کی کانپتی ہوئی آواز سنی۔ ساری دنیا جانتی ہے۔ اور سلیم بھی اسی لئے ....

آسیہ کو یوں محسوس ہوا جیسے اک بھونچال سا آگیا ہو۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس سے اس کا سرمایہ حیات چھین لیا گیا ہو۔ عورت کے پاس صرف یہی ایک عزت ہی تو ہوتی ہے جس کا سہارا لے کر وہ اپنے لئے زندگی میں کوئی مقام پیدا کر سکتی ہے۔ اور اس

وقت اس بڈھے نے بھی اس سے چھین لیا تھا۔ اور کس بے رحمی سے۔ اور اُسے یوں محسوس ہوا جیسے صرف اِس کی عصمت پر ہی نہیں بلکہ اُن ہزاروں لاکھوں مظلوم عورتوں کی عصمت پر ایک کاری ضرب ہے۔ جو ابھی تک ہسپتال میں پڑی ہوئی اپنے گھر والوں کا انتظار کر رہی ہیں۔ اور جو ابھی تک پرائے دیس میں اپنے بھائیوں اور اپنے بزرگوں سے ملنے کی اُمید پر جی رہی ہیں جو اپنی جانیں بچانے کے لئے انہیں پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ اُن کی یہ شرافت یہ عزت اس وقت کہاں تھی۔ آسیہ کا جی چاہا کہ وہ چیخے۔ اپنے پھیپھڑوں کی طاقت سے چلائے۔ کہ جس اپاہج سوسائٹی اور جس لنگڑے نظام کا تم نے سہارا لیا ہے۔ سلیم کا اس کا فرق ہے۔ سلیم؟ مکار! بزدل!!

وہ جانتی تھی اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرنا عبث ہے یہاں اس کی کوئی نہیں سُنے گا۔ سلیم ڈرپوک تھا۔ اس نے آسیہ کو دھوکا دیا تھا۔ وہ جھوٹے نظام کا ایک رکن تھا۔ ایک سلیم تو کیا اُس ایسے ہزاروں نوجوان کبھی اپنے بزرگوں کے سامنے کھڑے ہو کر سچ بولنے کی جرأت نہ کر سکیں گے۔ بزرگ۔ لمبی لمبی داڑھیوں اور مکروہ چہروں والے بزرگ جو ایک اپنی جھوٹی شرافت اور اپنے بیکار مذہب کا سہارا لے کر کئی معصوم اور بیگناہ زندگیوں کا گلا گھونٹ رہے ہیں۔ وہ جانتی تھی کہ ان بے گناہوں اور معصوموں کے نالے اور چیخیں کبھی ان فرشتہ صورت بزرگوں کی آواز سے بلند نہ ہو سکیں گی۔ امیدوں کے محل آخری بار گر پڑے۔

اس کے سامنے عورتیں چیخ رہی تھیں۔ مُردہ اور بے جان عورتیں۔ عورتیں جن کی چھاتیاں کٹی ہوئی تھیں۔ جن کے چہروں پر ظلم اور استبداد کی خونیں داستانیں کندہ تھیں۔ زخمی اور اپاہج عورتیں۔ گونگی اور بہری عورتیں۔ عورتیں جن کی آنکھوں سے آنسو ہمیشہ کے لئے خشک ہو چکے تھے۔ عورتیں جن کے ہونٹوں سے مسکراہٹ اڑ کر ہمیشہ کے لئے ناپید ہو چکی تھی۔ بے گناہ اور معصوم عورتیں جنہیں یہ نظام کسی صورت قبول نہیں کر رہا تھا۔ جن کے لئے اس ماتم کدے میں کوئی جگہ نہ رہی تھی۔ زندگی کی تمام راہیں مسدود ہو چکی تھیں۔ اِنسانیت کے دروازے بند ہو چکے تھے۔ اور جو سوسائٹی کے لئے ایک مُسلسل بوجھ بن چکی تھی۔ ایک مُسلسل اور ابدی بوجھ۔

آسیہ نے سوچا اب وہ قیامت تک اِس بوجھ کے نیچے چیختی اور چلاتی رہیں گی۔

میرزا ریاض

تاج محل

مرمریں فرش، یہ مینار، یہ گنبد، یہ کلس — یہ منقش در و دیوار، یہ فردوس بریں
عہدِ رفتہ کی محبت کے فسانے ہیں جواں — ایک رومان کی تفسیر ہے کس درجہ حسیں

اس کی تعمیر ہے مومن کی خودی کا اظہار — کتنا دل کش ہے یہ اسرارِ محبت کا ظہور
یہ تو مانا کہ جھلک اس میں ہے شاہی کی مگر — اس کی آغوش میں پلتے رہے لاکھوں مزدور

میری محبوب! ادھر آ کہ بنائیں ہم بھی — اک نیا تاج محل اپنے حسیں ارماں کا
عشق فانی نہیں، باقی ہے، اگر ہو کامل — موت سے پاک ہے بے باک ضمیر انساں کا

جذبۂ شوق زر و سیم کا محتاج نہیں — قیس و فرہاد کے افسانۂ رنگیں کو تو دیکھ
عشق پختہ ہو تو بن سکتے ہیں سو تاج محل — دیکھ اسرارِ محبت کے اس آئیں کو تو دیکھ

اکرام لودھیانوی

احساسِ تنہائی

چشمۂ نور میں نہائی رات   لے کے انگڑائی مسکرائی رات
موتیوں کا لباس پہنے ہوئے   بزمِ ارض و سما پہ چھائی رات

چاند زُہرا کے گیت سُنتا ہے   سرِ و فورِ طرب سے دُھنتا ہے
دل مرا آنسوؤں کی کرنوں سے   ٹوٹے سپنوں کے جال بُنتا ہے

حسن کی کائنات کا منظر   کتنا پیارا ہے رات کا منظر
قابلِ دید ہے مگر اے دوست   میرے غم کی حیات کا منظر

طفیل ہوشیارپوری

ایک خط

(جو بٹوارے سے پہلے لکھا گیا)

"جن لوگوں کے پالے پڑے ہو وہ بُرے ہی سہی لیکن اس نئے ماحول سے بغاوت کرکے بھاگ مت آنا۔ زندگی کس قدر تلخ ہے اس کا تھیر ہے۔' تمہارے خط کو شروع سے آخر تک پڑھتا چلا گیا۔ مجھے یہ محسوس بھی نہ ہوا کہ میں نے چار صفحوں کی عبارت اتنی جلد پڑھ ڈالی ہے۔ صرف دماغ میں گونجتا رہا۔ اس ایک فقرے نے میرے ذہن میں ایک ایسی دُھند بھر دی کہ سارا ماحول مجھے تاریک اور گھٹا گھٹا سا نظر آنے لگا۔ بھی مان ہی لیا نہ کہ جن لوگوں کے پالے پڑا ہوں وہ بُرے ہیں۔ تم ہمیشہ میری باتوں کو مبالغہ آمیزی کا طوفان کہہ کر سُنی ان سُنی کر دیتے ہو۔ تم دُنیا کے ہر فعل میں شاعری ہی کرتا ہوں۔ بے شک میں شاعر ہوں، حسّاس طبیعت کا مالک ہوں۔ دھوئیں کی ایک ہلکی سی لکیر کو دیکھ کر آگ کے تصور کر بیٹھتا ہوں۔ چاہے وہ ہلکی سی لکیر کسی بجھتے ہوئے چراغ کے آخری سنبھالے ہی کی امین ہو۔ لیکن چراغ کی تھرتھراتی ہوئی لَو بھی تو آگ ہی ہے۔

تم ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ میں نے دنیا کا ابھی مطالعہ نہیں کیا۔ زندگی میں صرف کانٹے ہی نہیں پھول بھی تو ہیں۔ لیکن کب مجھے کانٹا نہ چبھا بلبلا نہ اُٹھا، تم پھول کہتے ہو میں نے تو ایک غنچہ تک بھی نہ دیکھا۔ مجھے تو قدم قدم پر کانٹے ہی ملے۔ دُور سے نظر آنے والے دلفریب پھول پاس کانٹوں کے گچھے نظر آئے۔ میں نے کانٹوں سے ہی جھولیاں بھر لیں۔ دُنیا سے نامراد جانا دل کو نہ بھایا۔۔۔ وقت کے پاس صرف آنسو نہیں ہیں لیکن جو فقط آہوں اور آنسوؤں سے ہی کھیلا ہو وہ کیا سمجھے گا تمہارے اس فلسفے کو ۔۔۔ ریگستان میں تپتی ہوئی ریت ہی نہیں ہر بھی ملتے ہیں۔ لیکن کتنے ہیں ایسے مسافر جنھیں نخلستان تک پہنچنے کی مہلت زندگی نے دی ہے ۔۔۔ شکستیں انسان کی زندگی کو مکمل کرتی سہی، لیکن زندگی شکستوں کی مسلسل ٹھوکروں کو نہ سہہ کر ٹوٹ بھی تو سکتی ہے۔ سپنوں کا یہ رنگ محل گر کر چُور بھی تو ہو سکتا ہے۔ صرف تنکا کر ہی اپنی طاقت ختم کر دینا بھی تو انسانی زندگی کی معراج نہیں۔ خیر اپنے اس تازہ خط میں تم نے تسلیم کر ہی لیا ہے کہ زندگی تلخ ہے اور ہے اس کا بھی مجھے اندازہ ہے۔ یا تو تم اس ڈگر سے بھٹک کر کہیں اور چلے گئے ہو۔ یا میری بہکی بہکی باتیں اب سچائیاں بن کر تمہارے سامنے ان دو میں سے کون سی بات ٹھیک ہے۔ یہ میں تجسس سے پوچھتا ہوں، زیادہ قیاس آرائیاں نہیں کر سکتا۔ ان پہیلیوں کو بوجھنے کا مجھے ڈھنگ

تم تو یہ بھی کہا کرتے تھے کہ ماحول انسان خود بناتا ہے،' انسان ماحول کی پیداوار ہے۔ میرے اس نظریے سے تم نے کبھی اتفاق نہ کیا ا ماحول! یہ کس نے بنایا ہے؟ اس نئے ماحول کی تخلیق میں نے تو نہیں کی۔ میرے یہاں آنے سے پہلے ہی یہ بن چکا تھا۔ قیدخانہ مکمل تھا اس کو ٹھونسنا باقی تھا اور اب اگر قیدخانہ اپنے تاثرات قیدی کے ذہن و جسم پر مرتسم کرتا جائے تو یہ قیدی کی جلد قبول کر لینے کی کمزوری ہے یا شدت۔ تم اسے قیدی ہی کی کمزوری کہو گے لیکن دراصل تاثرات کی شدت ہی اس معمّے کا صحیح حل ہے۔ سخت ہتھوڑے کی چوٹ سے میں دھنس جائے گا یا ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔ دونوں حالتوں میں اُس کی ہستی خطرے میں ہے۔ خواہ بیرونی قوت بڑی ہو اور خواہ ہر۔ یہ نیا ماحول میرے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی مکمل ہو چکا تھا۔

جس مکان میں میں رہتا ہوں اُس کے بالکل سامنے ایک آٹا پیسنے کی مشین ہے۔ تیل کافی مقدار میں نہ ملنے کی وجہ سے وہ سارا د صرف شام کے وقت چلتی ہے اور سورج غروب ہونے تک فضا میں تیل کی بُو پھیلاتی رہتی ہے۔ کئی دفعہ اس طرف کی کھلتی ہوئی کھڑکی تپا اکثر اوقات کام سے فارغ ہو کر وہیں بیٹھے ہوئے مشین سے آٹا پسانے والے لوگوں کو دیکھتا رہتا ہوں۔ آنے والوں میں بیشتر حصّہ

مرد کھیتوں میں مصروف ہونے کے باعث یہاں نہیں آسکتے۔ عورتوں میں بھی زیادہ تر ادھیڑ یا جوان ہی نظر آتی ہیں۔ اُن کے پہنچنے تک کہیں مشین بند ہی نہ ہو جائے — مشین کا مالک ایک سکھ ہے۔ اُس نے کہہ رکھا ہے کہ آج کل مشین کا کوئی اعتبار نہیں۔ وہ کسی وقت بھی بند کی جا سکتی ہے۔ اس کے نزدیک کے دیہات کے لوگ دل میں اُمید و بیم کی کش مکش لئے ہوئے آتے ہیں۔ ان کے کان مشین کی دھک دھک کی طرف لگے ہوتے ہیں اور پاؤں تھوڑی دور دو گرد ڈھلکی ہوئی تہوں سے گرد اُچھالتے آگے بڑھتے جاتے ہیں۔ سروں پر گٹھڑیاں اُٹھائے اور دونوں ہاتھوں سے انھیں سنبھالے جوان عورتیں اُس گلی میں سے گزرتی ہیں اور مشین کے احاطے میں داخل ہو کر دالان میں آہنی چھت سے لٹکے ہوئے بڑے سے دھرم کنڈے کے قریب لا پھینکتی ہیں، اور پھر سردار صاحب کی کرخت آواز سُنائی دیتی ہے۔

"کئی بار تمھیں کہا ہے کہ جلدی آیا کرو۔ یہ دیکھو پہلے ہی کتنے دانے پڑے ہیں۔ آج تو نہ پس سکے گی تمھاری گندم —" اور دُور سے آس لگائے آئے ہوئے معصوم چہرے اور معصوم دل ایک دم نا اُمیدی کی سیاہی سے اُلٹ جاتے ہیں۔

"مگر ہمارے گھر تو آج آٹا بالکل ختم ہو چکا ہے اور پھر سورج ڈوبنے . . . . ."

"اچھا اچھا زیادہ باتیں نہ کرو۔ یہ ہوئے اٹھتیس سیر ایک پاؤ" سردار صاحب ترازو کی بڑی سی سوئی کی طرف دیکھ کر اُن سے مخاطب ہوتے ہیں۔

"لیکن سردار جی میں تو دانے ٹوپے سے تول کر لایا ہوں۔ پورے بیس ٹوپے تھے، راہ میں ایک ٹوپہ کم کیسے ہو گیا؟" — ایک سہمی سی نڈھال آواز سنائی دیتی۔

"تو تمھارا ٹوپہ چھوٹا ہو گا۔ تم نے ٹوپے بھی تو کئی بنا رکھے ہیں۔ دانے بیچنے کے لئے اور خریدنے کے لئے اور، یہ دیکھو کنڈے کی سوئی —" اور وہ معصوم دیہاتی لوگ یہ سوچتے سوچتے کہ ہر بار اُن کا ہی ٹوپہ غلط ہوتا ہے، مشین والے کا کنڈا ہر دم صحیح رہتا ہے خاموش ہو جاتے ہیں اور سہم کر ایک طرف اپنی باری کے انتظار میں بیٹھ رہتے ہیں۔ گندم کے ایک ایک دانے کو نگلنے کے لئے تگ و دو جاری ہے، ایک ایک دانے پر اپنی ملکیت جمانے کے لئے ایک دُوسرے کا گلا گھونٹا جاتا ہے۔ لیکن ماحول کے جبر میں یہ سب کچھ ہنسی خوشی ہوتا ہے۔ دیہاتی لوگ اتنا کچھ ہونے پر بھی سردار صاحب کے شکر گزار ہیں۔ نہیں تو انھیں آٹا کون پیس کر دے — اور مشین فضا میں اپنا کسیلا دھواں چھوڑتی ہوئی چلتی رہتی ہے۔ کبھی کبھار جب کسی پٹے کے ٹوٹ جانے کے باعث وہ یکلخت رک جاتی ہے تو فضا میں ایک ہیبت ناک خاموشی طاری ہو جاتی ہے اور سردار صاحب پھر کسی دیہاتی کو کوسنے دینا شروع کر دیتے ہیں۔

مکان کے دکھن کی طرف اُفق تک پھیلتی ہوئی سپاٹ زمینیں ہیں جن میں سے فصل کاٹ لی گئی ہے۔ صبح سویرے ان میں ہل جوتنے کے لئے کسان گھر سے باہر نکل جاتے ہیں۔ اُن زمینوں میں کہیں کہیں کیکر کے درخت یا کانٹے دار جھاڑیاں ہیں۔ یہی انعام ہے دھرتی ماتا کے سینے کو کرید کرید کر اپنا دُکھ سنانے کا محنت کا پھل کانٹے ہی ہیں۔ صرف مجھے ہی نہیں، رات دن محنت کرنے والے کسانوں کو بھی کانٹے ہی ملتے ہیں۔ وہ ان کانٹے دار درختوں سے اپنے کھیت کی حفاظت کے لئے باڑ تیار کرتے ہیں لیکن ساہوکار کے لمبے لمبے بھیانک مضبوط ہاتھ ان کانٹوں کو روندتے ہوئے آگے بڑھ کر فصل کے خوشے خوشے پر اپنی مُہر لگا دیتے ہیں اور کسانوں کی معصوم اُمیدوں کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ کسان اپنے ننگے بچوں کی طرف دیکھتے ہیں جو سوکھی ہوئی روٹی کا ٹکڑا لئے کر منڈیر پر بیٹھے ان کتوں کی طرح چباتے دکھائی دیتے ہیں جو گندگی کے کسی ڈھیر سے پائی ہوئی ہڈی کو چبا چبا کر اپنا منہ زخمی کر رہے ہوں۔ اُن کی نظر اپنی گھر والیوں پر بھی پڑتی ہے جو دھوپ میں ننگے پاؤں سر پر پانی کی طرح نیلی چھاچھ، تنور کی روٹیاں اور سُرخ مرچیں اُٹھائے گاؤں سے کوس ڈیڑھ کوس دُور اپنے مردوں کی بھوک مٹانے آتی ہیں۔ اُن کی آنکھیں اپنے بیلوں کی طرف بھی اُٹھتی ہیں جن کی گردنوں پر سیکڑوں برس کی بھوک کے نشان ہیں۔ تکان اور گرمی سے نڈھال وہ رائے کی تلاش میں ادھر اُدھر گردنیں موڑتے ہیں اور کبھی کبھار ان کا دھیان اپنے جسم کی طرف بھی جاتا ہے جس پر موٹے سے کھدر کی ایک میلی سی چادر کے سوا کچھ بھی نہیں، جسم جو دھوپ اور جاڑے کی شدت سہہ سہہ کر سوکھے ہوئے چمڑے کی طرح اکڑ چکا ہے — یہ سب کچھ دیکھ کر ان کی نظریں پھر دھرتی ماتا کے سینے پر جھک جاتی ہیں جسے کرید کرید کر وہ اپنا دکھ سناتے ہیں۔ دھرتی ماتا کا دل بھی شاید پتھر ہو چکا ہے

وہ اُن کے دُکھ میں شریک نہیں ہوتی۔

مکان کے پورب کی طرف ایک بڑا سا کھنڈر ہے۔ کہتے ہیں کسی زمانے میں یہ محل تھے۔ یہ چھوٹی اینٹ کی پرانی عمارت اب گر چکی ہے ایک آدھ دیوار کسی اور حادثے کی منتظر کھڑی ہے۔ چاندنی رات میں وہ دیواریں کسی دیو کے کھلے ہوئے جبڑوں کی مانند دکھائی دیتی ہیں اور مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میرا مکان اور اس کے پیچھے پیچھے سارا گاؤں غیر ارادی طور پر اُس کے کھلے ہوئے جبڑوں کی طرف رینگ رہا ہے۔ سب سے آگے میں ہوں اور جبڑوں میں چبائے جانے کا انتظار کر رہا ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس محل میں ایک کنواری شہزادی زہر کھا کر مر گئی تھی۔ یہ آج سے کئی سو برس پہلے کی بات ہے۔ وہ کسی ملازم سے محبت کرتی تھی اور اس کے باپ نے اس ملازم کو قتل کرا دیا تھا۔ اب اُس شہزادی اور اس کے چاہنے والے کی روحیں بھوت بن کر اس کھنڈر میں رہتی ہیں۔ کتنے توہم پرست ہیں ہم لوگ! زندگی میں ایک دوسرے کو نہ مل سکنے والوں کو موت کے بعد مل جانے کا یقین دلایا جاتا ہے اور پھر انھیں بھوت کہہ کر پکارتے ہیں۔ سوچتا ہوں محبت کا ازلی جذبہ فنا تو نہیں ہوا لیکن وقت کی کروٹوں کے ساتھ ساتھ بدل ضرور گیا ہے۔ شاید آگے بھی بدلتا رہے گا اور ایک وقت آئے گا جب مرد اور عورت کے ایک لمحہ کے جنسی ملاپ ہی کو محبت کہہ کر پکارا جائے گا سماجی اور اقتصادی بندھن شاید رہیں یا نہ رہیں مگر یہ جنسی تشنگی حیوانی صورت اختیار کرتی ہوئی سمٹ کر ضرور ایک نقطے پر پہنچ جائے گی۔ اتنا وسیع اور پُرانا موضوع آخر ایک جگہ پر آ کر رُک جائے گا ——— کئی دفعہ اُس کھنڈر کو دیکھ کر مجھے اپنی زندگی پر بھی نظر دوڑانے کا موقع مل جاتا ہے

ابھی چند دن ہوئے پربھا کا خط بھی آیا تھا، لکھا تھا۔

"میں تمھیں ملنے کے لئے بہت بے چین ہوں۔ جی میں آتا ہے کہ اس ماحول سے بھاگ کر تمھارے پاس پہنچ جاؤں اور تمھاری خدمت کروں۔ تمھاری لاأبالی طبیعت کا مجھے ہر گھڑی کھٹکا لگا رہتا ہے۔ تم سرد راتوں میں اپنی صحت کا خیال کئے بغیر دُور دُور گھومتے رہتے ہو۔ گرمیوں کی تیز دوپہروں کو نہ جانے کن کن ویران اور بھیانک جگھوں میں مارے مارے پھرتے ہو۔ آخر تمھیں کھنڈروں سے اتنی الفت کیوں ہے؟"

پربھا بھی اپنے ماحول سے بھاگنا چاہتی ہے۔ میرے خیال میں دنیا کا ہر متنفس فرار چاہتا ہے۔ زندگی کے اس خونخوار بھیڑیے کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا صرف میرے ہی لئے نہیں سب کے لئے مشکل ہے۔ وہ بھاگ کر میرے پاس آنا چاہتی ہے۔ وہ اس ماحول میں داخل ہونا چاہتی ہے جس سے میں چند ہی روز میں بیزار ہو گیا ہوں۔ میں خود کسی اور ماحول کا متلاشی ہوں۔ اگر وہ اسی طرح میرے پیچھے پیچھے بھاگتی رہی تو کیا کبھی مجھے پکڑ سکے گی؟ شاید نہیں، میں تو کسی بھی ماحول سے مطمئن نہیں ہوں اور وہ ——— ؟ اور پھر اس آنکھ مچولی کے کھیل میں جیت کس کی ہوگی؟ اسے میری لاأبالی طبیعت کا کھٹکا لگا رہتا ہے۔ کاش اسے کوئی بتلائے کہ دوپہروں کو مارا مارا پھرنے کی بجائے اب سکول کی چار دیواری میں بند رہ کر مجھے پڑھانا پڑتا ہے لڑکوں کے اُلٹے سیدھے بہانے سننا پڑتے ہیں۔ کبھی کبھی انھیں پیٹنا بھی پڑتا ہے۔ انھیں جانوروں کی طرح سدھانا پڑتا ہے تاکہ وہ اپنے مالکوں کی عزت کریں۔ جہاں اُن کے اُستاد ملیں وہ جھک جائیں۔ ہر انسان دوسرے انسان کو جھکا کر خوش ہوتا ہے ——— رہیں سرد راتیں، وہ اس کھنڈر کو دیکھ کر اپنی زندگی کی شکستہ محرابوں کی نظارگی میں بیت جاتی ہیں۔ مجھے کیوں کھنڈروں سے پیار ہے اس کا جواب اُسے آج تک مل جانا چاہیئے تھا۔ جانے کیوں نہیں ملا؟ کھنڈروں سے اس لئے پیار کرتا ہوں کہ میں خود ایک کھنڈر میں پناہ گزین ہوں، میری زندگی ایک کھنڈر ہے جس میں رہ کر میں حادثات کی ٹھوکروں سے بچنے کی ناکام کوشش کر رہا ہوں۔ اگر تمھیں کبھی پربھا ملے تو اسے توہم پرست ہندوستانیوں کی طرح یقین دلاؤ کہ اگر زندگی میں نہیں تو موت کے بعد ہم ایک دوسرے کو ضرور ملیں گے۔ آخر وہ بھی تو ایک ہندوستانی ہے۔ میری بات چھوڑو، میں تو کچھ بھی نہیں نہ ہندوستانی، نہ عیسائی، نہ ہندو، نہ مسلمان، میں تو انسان بھی نہیں۔ انسانیت کی تعریف ہی سے مجھے چڑ ہے۔ تم سے بھی یہی درخواست ہے کہ مجھے انسان کہنا چھوڑ دو ——— میں اب ایک بھوت بن چکا ہوں اور میری زندگی میرا کھنڈر ہے جس میں میں رہ رہا ہوں۔

تین طرفوں کا ذکر میں نے کر دیا ہے۔ اب صرف ایک طرف اور باقی ہے ——— پچھم ——— جس طرف سورج غروب ہوتا ہے۔ جانے کیوں مجھے

م سے نفرت ہے۔ اس پر میرا بس نہیں۔ پچھم کو دیکھ کر مجھے زندگی کے انحطاط کا خیال آتا ہے۔ پچھم —— جس کے اُفق میں سورج ڈوب کر دنیا کو رات
گہرے سمندر میں ڈبو دیتا ہے۔ ہوا کی ہر لہر، ہر گھٹا، غرض ہر شے جو پچھم سے تعلق رکھتی ہے مجھے بُری لگتی ہے —— اور میرے مکان کے پچھم میں رہتی
، ایک خوبصورت لڑکی جو کسی کے بھی سپنوں کی دنیا کو آباد کر سکتی ہے۔ وہ میری ویران دنیا کو بھی بسانا چاہتی ہے وہ ہر صبح اپنی چھت پر چڑھ کر
رے کمرے کی کھڑکی سے جھانکتی ہے اور میں بے سُدھ سویا رہتا ہوں۔ دماغی الجھنوں سے نجات پا کر مشکل سے پچھلے پہر آنکھ لگتی ہے۔ بعض دفعہ نیند ٹوٹ
ی جاتی ہے اور اس گھڑی میری نیند سے بھری آنکھیں حسن و جوانی کا ایک خوبصورت مرقع دیکھتی ہیں۔ وہ امیر گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کا چھوٹا بھائی
ارے ہی سکول میں پڑھتا ہے اور اسی جماعت میں ہے جسے میں پڑھاتا ہوں۔ وہ اُس کے ہاتھ کبھی کبھی میرے گھر اپنے باغ کے میوے بھی بھیج دیتی ہے۔ لیکن
ں نے نوکر کو ہدایت کر رکھی ہے کہ وہ کوئی بھی ایسا پھل میرے استعمال میں نہ لائے۔ مجھے نہ جانے کیوں محبت اور محبت کرنے والوں سے بھی نفرت ہوتی
ہا رہی ہے۔ محبت اپنا راستہ تیزی سے طے کرتی ہوئی اس نقطے پر پہنچنا چاہتی ہے جس کا میں نے اسی خط میں کہیں ذکر کیا ہے۔ وہی اس کی منزل ہے۔ میں
سے روکنا بھی نہیں چاہتا اور نہ اس کے ساتھ چلنا ہی چاہتا ہوں۔ تم پوچھنا چاہو گے کہ آخر میں چاہتا کیا ہوں ——؟ میں فقط اپنی ذاتی الجھنوں میں کھو کر
سب کچھ بھول جانا چاہتا ہوں۔ بس صرف کانٹے مانگتا ہوں پھول نہیں۔ پھول ہنس کر میرا مذاق اُڑاتے ہیں، کانٹے میری رگِ جان کے قریب جا سکتے ہیں۔ پھول
ی خوشبو میرے دماغ میں بھاپ کی مانند اٹھتے ہوئے جذبات میں مل کر کھو جاتی ہے۔ کانٹے کی چبھن انھیں شدّت بخشتی ہے۔

ابھی کل صبح وہ نہا کر بال سکھانے چھت پر چڑھی تھی، میں ابھی بستر ہی میں تھا اور یونہی لیٹے لیٹے عمر خیام کی چند رُباعیاں پڑھ رہا تھا۔ اچانک اُس
کی طرف آنکھ اٹھی، وہ ہنس دی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ایک حسین ساقی نے جام بھر کر میرے لبوں سے لگا دیا ہے اب مجھے پی ہی جانا چاہیے۔ اس طرح
کی گئی درخواست کو ٹھکرانا انسانیت نہیں۔ اور انسانیت کا لفظ ذہن میں آتے ہی میں تڑپ سا اُٹھا، کیا اُس لڑکی کا باپ بھی انسان کہلانے کا مستحق
ہے جو ایک دو روز پہلے ایک کسان کو اُس کے بیوی بچّوں سمیت صرف اس لئے اپنی زمین سے بے دخل کر رہا تھا کہ اُس نے وقت پر اُسے گندم بیچنے
کو نہیں کہا، اُس نے بازار کے بھاؤ پر نظر نہیں رکھی اور بھاؤ کے اچانک گر جانے سے اُسے نقصان اٹھانا پڑا۔ وہ ایک بہت بڑا رئیس ہے، وہ پچھم میں
رہتا ہے۔ مجھے اس سے نفرت ہے —— اور میں نے کھڑکی بند کر دی، اور خیام کی رباعیاں دور پھینک دیں۔ پورب کی طرف سے آتی ہوئی کرنوں نے
آہستہ آہستہ اُس کے بال سکھا دیئے ہوں گے۔ وہ اور تھوڑی دیر وہاں ٹھہر کر نیچے چلی گئی ہو گی۔ میں نے پھر اس کی طرف دھیان نہیں دیا۔ اتنی امیر ہو کر
بھی وہ لڑکی بھوکی ہے اس کے آس پاس نظر آنے والے سب آدمی غریب کسان ہیں۔ وہ اس کے نزدیک گنوار اور کمینے ہیں۔ ابھی وہ محبت میں معیار چاہتی ہے،
فی الحال وہ اُن سے محبت کرنا اپنی توہین سمجھتی ہے، اُس کی نگاہ انتخاب ایک سکول ماسٹر پر پڑی ہے جو ہر صبح سوٹ پہن کر اس کے گھر کے سامنے سے گزرتی
ہوئی سڑک پر سے ہوتا ہوا سکول جاتا ہے۔ اُسے یہ معلوم نہیں کہ یہ سب سوٹ مجھے تمھارے بیاہ کی بدولت ملے ہیں ورنہ میں بھی شاید دوسرے استادوں
کی طرح ٹخنوں سے اونچے پاجامے اور شکن آلود کرتے پہن کر ہی لڑکے پڑھاتا —— مجھے اس کی بھوک دیکھ کر سکون ہوتا ہے۔ وہ بھی ایک دن کسی ملازم
سے محبت کرے گی۔ اُس کی بھوک کسی بھی معیار کو زیادہ دیر تک قائم نہ رہنے دے گی۔ اُس کا باپ جو ایک کسان کا ذرا سا قصور معاف نہیں کر سکتا اس
ملازم کو قتل کرانے سے نہیں چوکے گا۔ وہ لڑکی بھی زہر کھا کر خودکشی کر لے گی —— میرے مکان کے پچھم میں نظر آنے والی عظیم عمارت بھی اب نہ سہی اب سے
سو برس بعد ایک کھنڈر بن جائے گی۔ پورب اور پچھم دونوں طرف کھنڈر ہی کھنڈر نظر آئیں گے۔ سورج کھنڈر کی اوٹ سے طلوع ہو کر کھنڈر ہی
کی شکستہ دیواروں کے پیچھے ڈھلکتا ہوا افق کی پہنائیوں میں گم ہو جائے گا۔ اس وقت تک سردار صاحب کی مشین شاید آٹا پیس کر تھک چکی
ہو گی اور دکھن میں نظر آنے والی سپاٹ زمینوں نے شاید اپنے مفلوک الحال بچوں کی آہ و زاری سے متاثر ہو کر انھیں چھاتی سے
لگا لیا ہو گا ——!

کشمیری لال ذاکر

زہر خند

تصورات کے مٹتے ہوئے نقوشِ جمیل
خیال و خواب کی موہوم جلوہ گاہوں میں
فسانۂ غمِ ہستی سنا رہے ہیں ابھی
ردائے یاد میں لپٹے ہوئے حسین لمحے
شبِ سیاہ میں شمعیں جلا رہے ہیں ابھی
یہ خوابگاہِ تمنا کی سرد ویرانی
اسی نگاہ کا مدفن ہے جس کے پہلو میں
بہارِ ناز کی رعنائیاں ہیں محوِ خرام
نگاہِ وقت کے تیور بدل گئے یکسر
دیارِ شوق میں تنہائیاں ہیں محوِ خرام
مگر یہ قصۂ امروز و دوش کیا معنی؟
یہ شکوۂ غمِ پنہاں خروش کیا معنی
درِ اُمید ابھی زندگی پہ بند سہی
تبسموں کی بہاریں اگر نصیب نہیں
جوابِ یورشِ آلام زہرخند سہی

سید جابر نقوی

اُردو زبان کے قدیم مورّخ اور نقّاد

اب اُردو زبان کے مورخوں اور نقادوں کا ایک خاص گروہ پیدا ہو گیا ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سنہ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کے بعد اس شعبہ کی جانب توجہ کی گئی ہے۔ اب تک تاریخ زبان اُردو اور تنقید کے متعلق جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان کی تعداد ایک سو سے زیادہ ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ ہمارے بیان سے واضح ہے یہاں ہم اُردو زبان کے قدیم مورخ اور نقادوں کا تذکرہ کریں گے۔ یہ واقعہ ہے کہ ابتدا میں کوئی کتاب تاریخ زبان اُردو کی نہیں لکھی گئی البتہ تذکرے لکھے جاتے تھے انہی کو تاریخ اور تنقید کا درجہ دیا جا سکتا ہے، اگرچہ ان میں پوری طرح تاریخی مواد ہوتا تھا اور نہ تنقیدی۔ ابتدائی تذکرے ہیں اُن میں سے بعض یہ ہیں۔

(۱) نکات الشعرا از میر تقی میرؔ (سنہ ۱۱۶۵ھ) (۲) گلشن گفتار از خواجہ خان حمید (سنہ ۱۱۶۵ھ) (۳) تذکرہ فتح علی گردیزی (سنہ ۱۱۶۵ھ) (۴) مخزن نکات از قائم چاند پوری سنہ ۱۱۶۸ھ (۵) چمنستان شعرا از لچھمی نرائن شفیق سنہ ۱۱۷۵ھ (۶) گل عجائب از تمنا سنہ ۱۱۹۴ھ (۷) گلزار ابراہیم از علی ابراہیم خاں سنہ ۱۱۹۸ھ

یہ تذکرے ہیں جو بارہویں صدی پر ختم ہوتے ہیں۔ اس کے بعد تیرھویں صدی ہجری میں کئی تذکرے لکھے گئے جن کی صراحت غیر ضروری معلوم ہوتی ہے۔ یہی تذکرے ہیں جن کو تاریخ زبان اُردو بھی کہا جا سکتا ہے اور تنقیدی سرمایہ بھی۔ لیکن ایک نام بارہویں صدی کا ایسا پیش کیا جا سکتا ہے جن کو زبان کا مورخ اور نقاد بجا طور پر لکھا جا سکتا ہے اور یہ مولانا محمد باقر آگاہ ویلوری (ارکاٹ) ہیں۔ مولانا کا انتقال سنہ ۱۲۲۰ھ میں ہوا مگر ان کی تصانیف کا آغاز سنہ ۱۱۸۴ھ سے ہو چکا تھا۔ آپ عربی اور فارسی کے جید عالم اور شاعر تھے۔ تصانیف کی تعداد (۲۰۳) ہے جو عربی، فارسی اور اُردو پر مشتمل ہیں۔ ان میں پندرہ کتابیں اُردو ہیں۔ آگاہ کی عربی قابلیت اس سے واضح ہوگی کہ انھوں نے آزاد بلگرامی کی کتاب سبحۃ المرجان پر چار سو اعتراضات مرتب کیے تھے۔ مگر ان اعتراضات کے باوجود دونوں کی بڑی دوستی تھی۔ وہ آج کل کا زمانہ نہیں تھا کہ تنقید اکثر ذاتیات پر مبنی ہوتی تھی۔

آگاہ کی اُردو کی کتابیں سب کی سب منظوم ہیں اور سیر، فقہ، عقاید اور مناقب پر مشتمل ہیں۔ البتہ ایک دو عشقیہ مثنویاں ہیں اور ایک کلیات بھی ہے۔ آگاہ کے متعلق ہم نے اپنی کتابوں اور مضامین میں صراحت سے روشنی ڈالی ہے اس لئے یہاں اس کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی کہ تفصیل کے ساتھ آگاہ کا تعارف کرایا جائے ان کو یہاں بحیثیت مورخ زبان اُردو اور ایک نقاد کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ آگاہ نے کوئی خاص کتاب تاریخ زبان اُردو یا تنقید کے متعلق نہیں لکھی گئی۔ بلکہ اپنی کئی ایک نظم کی کتابوں میں پندرہ بیس صفحہ کا دیباچہ لکھا ہے، اُس میں تاریخ زبان بھی موجود ہے اور تنقیدی مواد بھی ملتا ہے۔ ایک مختصر اقتباس یہاں پیش کیا جاتا ہے جس سے آگاہ کی تاریخ اور تنقید کا حال واضح ہو سکتا ہے۔

> جب تک ریاست سلاطین دکن کے قائم تھے زبان ان کی (دکھنی) درمیان اون کے خوب رائج اور طعن شماتت سے سالم تھی اکثر شعرا ان کے مثل نشاطی، فراقی، خوشنود، غواصی، ذوقی، ہاشمی، شغلی، بحری، نصرتی، مہتاب وغیرہم کہ بے حساب ہیں اپنی زبان میں قصائد و غزلیات و مثنویات و مقطعات نظم کئے اور داد سخنوری کا دے، لیکن نصرتی ملک الشعرا تنگ نظری سے مبرا ہے۔ جب شاہان دہلی نے حیدرآباد وغیرہ کو تسخیر کیے طرز روزمرہ دکھنی بہ محاورہ ہندی سے تبدیل پانے لگے تا آنکہ رفتہ رفتہ اس بات سے لوگوں کو شرم آنے لگی۔
>
> ہندوستان میں مدت تک زبان ہندی کہ اوسے برج بھاکا بولتے ہیں رواج رکھتی ہے اگرچہ لغت سنسکرت اون کی اصل مخزن فنون و فروع و اصول ہے پیچھے محاورہ برج میں الفاظ عربی و فارسی تدریج داخل ہونے لگے اور اسلوب خاص کو اوس کی کھونے لگے سبب سے اس آمیزش کے یہ زبان ریختہ سے مسمیٰ ہوئی۔

جیسا کہ ثنائی و ظہوری نظم و نثر فارسی میں بانی طرز جدید کے ہوئے ہیں، ولی گجراتی غزل ریختہ کی ایجاد میں سبھوں کا ابتدا اور اُستاد ہے۔ بعد اُس کی جو سخن سنجان ہند بزرگ گئے بے شبہ اس نہج کو اُس سے لئے اور من بعد اوس کو باسلوب خاص مخصوص کر دیئے اور وا سے اُردو کے بھاکا سے موسوم کئے، اب یہ محاورہ معتبر شہروں میں ہند کی جیسا کہ شاہجہان آباد، لکھنؤ و اکبر آباد وغیرہ رواج تمام پایا اور جوں چاہئے سبھوں کی من بھایا اواخر عہد محمد شاہی سے اس عصر تک اس فن میں اکثر مشاہیر شعرا عرصہ میں آئے اور اقسام منظومات کو جلوے میں لائے مثل درد، مظہر، فغاں، دردمند، یقین، سوزاں، اکبر آرزو، سودا تاباں وغیرہم لیکن ان سبھوں سے کوئی بھی مثنوی مقید نہیں کہا فقط غزلیات و قصائد و مقطعات پر اکتفا کیا۔ بارے اس عصر میں حسن دہلوی نے ایک مثنوی مختصر لکھا ہے۔"

اس اقتباس سے آگاہ کے مورخ زبان ہونے کی تصدیق ہو سکتی ہے انھوں نے ریختہ اور اردو دکھنی کے متعلق صراحت کر دی ہے۔ اگرچہ ان کی صراحت تشنہ کہی جا سکتی ہے، مگر جو ابتدائی تاریخ زبان ہے اس سے زیادہ توقع رکھنا درست نہ ہوگا۔ اب ہم آگاہ کو ایک نقاد کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں ان کی تنقید سودا اور نصرتی پر ہوئی ہے اس کا نمونہ بھی بطور اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"اور بوجھ اے بھائی کہ ان سب شعرا میں بعض فقط شاعر ہیں اور بعض شاعر کے ساتھ چاشنیٔ عشق و عرفان میں بھی ماہر ہیں مثل مولانا شاہ ندیم اللہ ندیم و قاضی محمود بحری تخلص صاحب من لگن شعرائے دکن سے اور مرزا مظہر جان جاناں و خواجہ میر درد شعرائے ہند سے بعد ازیں مخفی نہ رہے تمام ریختہ گویوں میں سودا اعتباری زیادہ پایا بعض اس قدر اس کے باب میں دفتر اغراق کا کھولتے ہیں کہ از بس بیچارہ کو سب شعرائے ریختہ گو بلکہ تمام ادبائے فارسی سے افضل و بہتر بولتے ہیں، اور وا عجب بل وا حسرتا کہ ملک الشعرا نصرتی کو نہیں مانتے اور قدر اس کے سحر حلال کی نہیں جانتے۔ بڑی دستاویز اُن کی یہ ہے کہ زبان اُس کی کج مج ہے۔ زہے دریافت و خوش سخن فہمی و عجب سمجھ۔ آیا نہیں جانتے کہ اتفاق سے شعرائے عرب و عجم و ہند کے معنی جان سخن آبدار اور مستعار ہے،...... (اس کے بعد نصرتی کے گلشن عشق اور علی نامہ سے چند شعر نقل کئے گئے ہیں) ...... تعصب کو ایک طرف رکھ کر سب کلیات سودا کو بغور نظر ملاحظہ کر کر انتخاب کرے اور ان سبھوں کو یک داستان گلشن عشق یا علی نامہ سے مقابلہ دیوے تا اندازے اس کے بواقعی واقف ہوئے۔ سودا کو چھوڑ دے، جس فارسی گو شاعر سے چاہے خواہ قصائد میں خواہ مثنوی میں اپنے سوا زنہ میں لاوے۔ بالفعل بھی مہر و ماہ یکتائے فن طرازی عاقل خاں رازی کیتن کہ قصہ مہر و مد مالتی کا ہے گلشن عشق سے مواجہ کر دیکھے تا معنی مثل دکھنی کے ہات کنگن کو آرسی کیا خوب سمجھے۔

کہا نصرتی سن کے یہ دلولہ ملا بعد مدت کے مجکو صلہ
کہا سودا آگہی انصاف سے کہ صدقے کرو مجکو آگاہ کے

باوجود ان سب مراتب کے ہم انصاف کرتے ہیں کہ مرزا رفیع سودا قصائد و غزل کے بڑا سخن تراش و صاحب تلاش ہے۔ محاورہ شستہ و صاف ہیں یگانہ زمانہ اور شوخیٔ مزاج و رنگینیٔ طبیعت میں، پر افسوس کہ ہجو ہائے رکیک سے آشنا اور ازمتانت و تمکین سے بیگانہ تھا۔۔۔"

اس تفصیل سے مولانا باقر آگاہ کی تنقید کا نمونہ بھی واضح ہو جاتا ہے۔ آگاہ کے بعد۔ پھر جو تذکرے شعرا کے لکھے گئے اُن میں بھی طرز قدیم کو ملحوظ رکھا گیا کوئی نئی بات پیدا نہیں کی گئی۔

اس کے بعد مولانا محمد حسین آزاد کا زمانہ آتا ہے۔ آپ کا آب حیات ۱۸۸۰ء میں تیار ہوا۔ اگرچہ عصر حاضر کے کئی ایک نقاد "آب حیات" پر اعتراض کرتے ہیں مگر حق یہ ہے کہ مولانا نے جو کچھ لکھا تھا وہ اُن کے زمانے کے معلومات کے لحاظ سے تھا اور مولانا نے

اس زمانے کے فضا اور ماحول کے خلاف جدید راستہ اختیار کیا تھا۔ بہرحال میں "آب حیات" کو تاریخ و تنقید اُردو کی ایک بہت اچھی کتاب قرار دیتا ہوں۔ اس کے مفید ہونے سے ہرگز اختلاف نہیں کیا جا سکتا۔

"آب حیات" کے شایع ہونے کے چار برس کے بعد بابو برج بخی لال صاحب دہلوی نے "اُردو زبان کی تاریخ" کے نام سے ایک کتاب شائع کی ہے اس میں انھوں نے اُردو کی ابتدا اور نشو و نما پر صراحت سے روشنی ڈالی ہے۔ چنانچہ اس کے بعض عنوانات حسب ذیل ہیں۔

(۱) زبان کی اصلیت — (۲) زبان کی ابتدائی حالت — (۳) ہندوستانی زبانوں کا پھیلاؤ

(۴) ایرین اور اُن کی زبانوں کا بیان — (۵) سنسکرت اور اُس کی شاخوں کا بیان — (۶) پراکرت کی خاص باتیں

(۷) پراکرت کی ترقی — (۸) پراکرت کا تنزل — (۹) بھاکا یا ہندی کا جنم

(۱۰) برج بھاکا سے اُردو کا جنم اور اُس کی حال تک کی ترقی — (۱۱) اُردو زبان کے دَور وغیرہم

جہاں تک میرا خیال ہے بابو برج بخی لال نے ہی علمی اور سائنٹی فک اصول کے لحاظ سے پہلی مرتبہ اُردو زبان کی ترقی پہ اُردو زبان میں روشنی ڈالی ہے ان کی اس کتاب کے پہلے اس قسم کا کوئی ذخیرہ اُردو میں نہیں تھا۔

"آب حیات" کی اشاعت کے کئی سال بعد یعنی سنہ ۱۳۲۰ھ میں ایک دوسری کتاب "آبحیات" ہی کے طرز پر حکیم عبدالحیٔ صاحب نے "گل رعنا" کے نام سے شائع فرمائی۔ جنگِ عظیم سنہ ۱۹۱۴ء کے پہلے اسی قدر ذخیرہ تاریخ و تنقید اُردو زبان کے متعلق موجود تھا سنہ ۱۹۱۴ء کے بعد جو کتابیں لکھی گئی ہیں وہ بہت زیادہ ہیں اور اب ایک مستقل فن کی حیثیت سے تاریخ اور تنقید پہ روشنی ڈالی جا رہی ہے۔ کئی ایک اصحاب علم اور اربابِ قلم اس موضوع کو اپنا محور بنائے ہوئے ہیں۔

نصیر الدین ہاشمی

غزل

ہر خوشی محدود، ہر غم ناتمام — زیست ہے مجبوریٔ پیہم کا نام

اُف وہ دو نظروں کا ٹکرانا کہیں — اتفاقاً جیسے ٹکرا جائیں جام

بے نیازِ منّتِ ساقی تو ہو — خود بخود گردش میں آجائیں گے جام

نظروں ہی نظروں میں با صد احتیاط — ہائے وہ مجبور پیغام و سلام

دیکھ دیوانے کی باتوں پر نہ جا

لازمی ہے دل کی عشرت ترک تمام

عشرت جلالی

اصغر کی یاد میں

آٹھ برس گزر گئے،
کیا تیری یاد پرانی ہو گئی؟
کیا اُسی کو تازہ کرنے ہمارے دلوں میں
وہ چلی گئی تیرے پاس
جو تیری ہم سفر اور ہم نوا رہی مغرب کی سرزمین میں
نو برس ہوئے؟
تم دونوں بے نواؤں کے حامی تھے
تم کمزوروں کی طاقت تھے اور مظلوموں کا سہارا،
تم اُن کے لئے اپنے گیت گاتے تھے اور اُنہیں کے لئے اپنی آواز بلند کرتے تھے۔
تیرا نغمہ شیریں تھا اور اُس کا نغمہ آتشیں
تجھ میں پانی کی شیرینی و روانی تھی اُس میں آگ کی تیزی و تابانی،
لیکن اس آگ اور پانی کو ایک دوسرے سے دلی محبت تھی:
یہ آگ اس پانی سے اور بھڑکتی تھی
اور یہ پانی اس آگ سے اور چمکتا تھا!
پھر یہ پانی کیوں رُک گیا
اور یہ آگ کیوں بجھ گئی؟
ہم کیا جانیں؟
شاید تم جانتے ہو اور تم سمجھتے ہو اب
کہ ایسا کیوں ہوا؟
ہم نے تو فقط یہی دیکھا اور یہی جانا
کہ تو دریائے وحدت کے آبِ رواں میں ڈوب گیا
اور وہ آتشِ حقیقت کے شعلوں میں جل گئی
یعنی راہِ حق میں تو ڈوب مرا، وہ جل مری،
اصغر زندہ باد — ممتاز زندہ باد!

(عطیہ فیضی)

سید [illegible] نے اتحاد پریس پل روڈ میں چھپوا کر ۲۲ لارنس روڈ سے شائع کیا۔ — سرورق رپن پریس میں چھپا

Regd. No. L.1363.

بیادگارِ عمدۃ الفصحا آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لاء
جائنٹ ایڈیٹر: شیر محمد اختر

فہرست مضامین

ہُمایوں، ماہ جولائی ۱۹۴۸ء

نمبر شمار	مضمون	صاحب مضمون	صفحہ
۱	بزمِ ہُمایوں	بشیر احمد	۲۷۳
۲	جہاں نما	بشیر محمد اختر	۲۷۵
۳	غیرت سوز (نظم)	جناب سید علی منظور صاحب	۲۷۷
۴	نظیر اکبرآبادی ایک انگریز مستشرق کی نظر میں	” اکرام قمر صاحب ایم۔اے	۲۷۸
۵	کشمیر (نظم)	” سید جعفر طاہر صاحب بی۔اے	۲۸۱
۶	از سرِ نَو (افسانہ)	” محترمہ اختر جہاں صاحبہ	۲۸۲
۷	غزل	” قمر ہاشمی صاحب	۲۸۶
۸	ادیب (ایک گفتگو)	” آغا بابر صاحب بی۔اے (آنرز)	۲۸۷
۹	غزل	” عرش بدایونی	۲۸۹
۱۰	ساس اور بہو (نظم)	” شاد عارفی	۲۹۰
۱۱	کتاب خانہ ارسطو جاہ کی بعض نادر کتابیں	” سید آغا حسین صاحب بی۔اے	۲۹۱
۱۲	تجزیہ (نظم)	” ناظر الحسینی صاحب	۲۹۶
۱۳	خیر مقدم (نظم)	” اختر ہوشیارپوری صاحب بی۔اے ایل ایل بی	۲۹۷
۱۴	غزل	” حباب ترمذی صاحب	۲۹۷
۱۵	خواہ مخواہ (ڈرامہ)	” غیاث احمد گدی صاحب	۲۹۸
۱۶	غزل	” مضطر اکبرآبادی صاحب	۳۰۱
۱۷	غدّارِ وطن کے نام (نظم)	” صادق نیازی صاحب کاشمیری	۳۰۲
۱۸	سُراغ (افسانہ)	” پرکاش پنڈت صاحب	۳۰۳
۱۹	فریبِ نظر	” پروفیسر محمد صدیق کلیم	۳۱۰
۲۰	مطبوعات		۳۱۱

چندہ سالانہ ۶ صہ — ششماہی ۳ سے — فی پرچہ ۸ ر

بزمِ ہمایوں

اُردو کا مسئلہ تھوڑا ہی زمانہ ہوا ہندوستان میں ایک ضروری اور خطرناک ملکی مسئلہ تھا۔ اب بھی "ہندوستان" میں یہ ایک خطرناک مسئلہ ہے گو کہتے ہیں کہ اب یہ "غیر ضروری" ہو چکا ہے لیکن پاکستان میں اب یہ ایک دلچسپ اور تعمیری مسئلے کی حیثیت اختیار کر رہا ہے۔

اُردو پاکستان کی قومی زبان تسلیم ہو چکی ہے البتہ اس اعلان پر عمل ہونا باقی ہے۔ ہم خوش ہیں کہ اس عمل کی کم از کم ابتدا ضرور ہو رہی ہے' اُدھر کراچی میں محکمۂ تعلیم کی سرپرستی میں تعلیمی ماہرین اور یونیورسٹیوں کے نمائندے جمع ہو کر مستقبل کا تعلیمی خاکہ تیار کر رہے ہیں' اِدھر صوبوں میں نئی تعلیم کی داغ بیل ڈالی جا رہی ہے۔ مغربی پنجاب میں محکمۂ تعلیم نے ایک نئی نصاب کمیٹی مقرر کی ہے جس کے تحت بیسیوں کمیٹیاں کام کر رہی ہیں اور یونیورسٹی نے اپنے حلقے میں آئندہ کے نصاب پر غور کرنا شروع کیا ہے' یہ کمیٹیاں اور بورڈ خوب سمجھ رہے ہیں کہ زمانہ بدل گیا ہے' اب ہمارا ایک نیا ملک ہے اور ایک قوم جس کا نصب العین واضح ہو سکتا ہے اور ہمارا تعلیمی نظام لازمی طور پر اس قومی نصب العین کے مطابق ہونا چاہیئے۔ ان کمیٹیوں میں کام کرتے ہوئے ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ قومی اختلافات اور نئے نظام کے مشکل اور دلچسپ مسائل جس طرح زندگی کے دوسرے شعبوں میں موجود ہیں اسی طرح تعلیم کے حلقے میں بھی نمایاں ہیں' اختلافات حوصلہ شکن نہیں ہوتے اور نہ مضر ہوتے ہیں بشرطیکہ ہماری قومی وابستگی اور ملکی وفاداری میں کوئی شک شبہ نہ ہو۔ آج کل اگر کوئی دقت ہے تو یہی کہ بعض ملکی خطرات کے ہوتے ہوئے اختلافات ایک حد تک غیر مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ تاہم یہ بات ظاہر ہے کہ ہم خطرات کی وجہ سے ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے نہیں رہ سکتے' ہمیں ہر شعبۂ زندگی میں کام کرنا ہے' عجب نہیں کہ ہمارے خطرات ایک عرصہ کے لئے ہمارے سر سے نہ ٹلیں' عجب نہیں کہ ہمیں جنگ بھی جاری رکھنی پڑے اور زمانۂ امن کا کاروبار بھی ساتھ ساتھ چلانے پڑیں۔ اُدھر میدانِ جنگ گرم رہے' اِدھر تعلیم گاہیں معروف رہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے اور ہمیں آج یہی کرنا اور کر دکھانا ہے۔

تعلیمی کمیٹیوں میں وہ بھی ہیں جو ابھی مغربی تخیل اور طریق کار سے چمٹے رہنا چاہتے ہیں جنھیں انگریزی کو طلاق دیتے سخت رنج ہوتا ہے اور وہ بھی ہیں جو تعلیم کو یکسر مذہبی رنگ میں ڈبو دینا چاہتے ہیں۔ بہترین راہ اعتدال کی راہ ہے۔ پاکستان بن گیا' اب ہمیں اسے مضبوط بنانا ہے۔ اس کی بنیادیں یقیناً پاکستانی اور اسلامی ہوں گی۔ ہمیں اپنے نوجوانوں کو اپنی نئی ملکی و قومی خصوصیات سے آگاہ کرنا ہے۔ انھیں ایک نئے ملک کی شہری ضروریات سے واقف کرنا ہے۔ جس طرح ہماری قومیت دنیائے حاضر میں ایک انوکھی شے ہے کہ اس کی بنیاد مذہب پر رکھی گئی ہے' اسی طرح یہ بھی ظاہر ہے کہ اس قومیت کو دنیائے حاضر ہی میں نشو و نما پانا ہے اُسے پیچھے کو نہیں بھاگنا اُسے آگے کی سمت سعی کرنی ہے' اُس کی روح اسلامی ہو گی اُس کا جسم پاکستانی۔ اسلام کو ہمیں ایک تو یا تہ شکل نہیں دینی بلکہ ایک زندہ حقیقت بنا کر دنیا کے سامنے پیش کرنا ہے۔ لہٰذا ہمیں قدیم و جدید کے بہترین عناصر کو یکجا کرنا اور اس مجموعے سے ایک شاندار مرکب تیار کرنا ہے جسے دیکھ کر نئی دنیا مذہب کے نام سے خائف نہ ہو نہ اُس کا مضحکہ اُڑائے بلکہ اُسے اس میں اپنی کھوئی ہوئی روح پھر مل جائے۔

تعلیمی کمیٹیوں کو اس امر کا احساس ہو رہا ہے کہ اب جلد یا بدیر اُن کے مختلف مضامین کا ذریعۂ تعلیم و امتحان انگریزی کی بجائے اُردو ہو کے رہے گی اس کے بغیر چارہ نہیں۔ میٹرک تک کی تعلیم تو آئندہ سال ہی سے تمام تر اُردو میں دی جا سکتی ہے۔ اعلیٰ تعلیم بھی چار یا پانچ سال میں اُردو کا جامہ پہن سکتی ہے بشرطیکہ ہم نیک نیتی سے اپنی زبان کو اپنانا اور اس کے ذریعے کام کرنا چاہیں۔ سُستی یا بے اعتنائی سے کچھ نہ ہو گا۔ اس کے لئے یہ اشد ضروری ہے کہ ہم تعلیمی معیار بڑھانے کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کو جھنجھوڑیں اور نئی راہ پر لگائیں جو مغربیت کے دلدادہ ہو کر اپنے قومی خصائص سے بے بہرہ بلکہ متنفر ہو چکے ہیں۔ پاکستان کی زندگی اب ایک رنگین ڈرائنگ روم کی فضا میں سانس نہ لے گی' لیکن اُدھر وہ تاریک حجروں میں بھی محبوس نہیں رہ سکے گی۔ اس کے لئے ایک ہی جگہ ہے ایک کھلا میدان اور اس کی تازہ ہوا۔۔۔!

بشیر احمد

جہاں نُما

ایشیا کا مستقبل

دوسری جنگِ عظیم کا خاتمہ اس لحاظ سے تو ہو چکا ہے کہ اب آلاتِ جنگ سے کام نہیں لیا جا رہا لیکن اقتصادی جنگ جاری ہے۔ کل کے اتحادی آج پھر حریف بنتے جا رہے ہیں۔ روس اور اُس کے حامی ایک طرف ہیں اور دوسری طرف امریکہ، برطانیہ اور اِن کے معاونین۔ اس نئی کش مکش سے انسانیت کو پھر ایک اور خطرہ لاحق ہو رہا ہے اور وہ تیسری جنگ ہے۔ اس کا اثر یورپ اور بلقانی ریاستوں تک محدود نہیں بلکہ ترکی، عرب، ایران، شام، افغانستان، انڈیا، چین، کوریا، جاپان اور ایشیا کے باقی حصے بھی اس خطرہ کو بُری طرح محسوس کر رہے ہیں۔ دُنیا کی سیاست میں ایک نئی صورت رونما ہو گئی ہے۔ اگر روس اور امریکہ کے درمیان جنگ چھڑ گئی تو اس کی کامیابی کا انحصار ایشیا پر ہو گا۔ اس کی پوزیشن سیاسی، اقتصادی اور جنگی لحاظ سے بہت اہم ہے۔

مغرب کے لوگ بھی اب ایشیا کا مطالعہ نئے زاویۂ نگاہ سے کرنے لگے ہیں۔ حال ہی میں ایک مشہور امریکی صحافی اڈمانڈ ٹیلر نے، جو امریکہ کے جنگی محکمے میں ایک معزز عہدہ پر رہ چکا ہے اور جو جنگ کے دوران میں ہندوستان میں بھی رہا ہے، ایک کتاب "Richer by India" لکھی ہے جس کے چند اقتباسات اُس کے نئے زاویۂ نگاہ کو پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ "شہنشاہیت" کے متعلق لکھا ہے :-

"فرنگی جو مشرق میں آباد ہو گئے تھے اُن کا ملکی لوگوں (natives) کے خلاف ہونا ایک سیاسی حقیقت تھا، بخلاف اس کے کہ ملکی لوگ اور وجہ سے فرنگی صاحب کے خلاف تھے..... ملکی لوگ فرنگیوں کی بعض باتوں کے خلاف احتجاج کرتے تھے اور صاحب ہر اس بات سے نفرت کرتے اور خوف کھاتے تھے جو ان ملکی باشندوں میں پائی جاتی۔"

"ایشیا کے انقلابات دوسرے انقلابات کی طرح اقتصادی اور سیاسی تھے۔ یہ روٹی اور طاقت کے لئے جدوجہد تھی۔ مغرب کے انقلابات سے زیادہ ان میں ایک اور اہمیت پائی جاتی ہے اور وہ انسانی عظمت کا حصول ہے۔ ہم نے انھیں چار باتوں کی آزادی کا وعدہ دلایا تھا لیکن انھوں نے اس کے علاوہ پانچویں بات کا بھی مطالبہ کیا اور یہ وہ بات تھی جسے ہم نے بالکل نظر انداز کر رکھا تھا یعنی نسلی تحقیر سے آزادی۔"

"..... یہ صاحب کی بدتمیزی تھی جس کی وجہ سے ملکی لوگوں کو نقصان پہنچا اور اُن سے اُن کی متاعِ عزیز ذاتی عظمت چھن گئی۔ جب تک صاحب کے کردار کی اصلاح نہیں ہوتی اس وقت تک ایشیا کی نو آبادیات کا مسئلہ حل نہیں ہو گا۔ کیونکہ مشرق کے ثقافتی معیار کے مطابق صاحب "لادین" ہے۔" (صفحہ ۱۰۲)

مصنف نے جنگ کے نظارے کئے ہیں۔ وہ "ایک دنیا" کے تصور کو جنگ کے ختم کرنے کا ذریعہ سمجھتا ہے اور یہ اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک ایشیا کا تعاون حاصل نہ ہو اور اس کے لئے ضرورت ہے کہ انسانی عظمت اور برابری کے اصول پر یہ تعاون حاصل کیا جائے۔ چنانچہ مصنف لکھتا ہے۔

"دنیا کے اتحاد کی آخری منزل کے ماسوا مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ وقت میں مختلف حکومتوں کے درمیان توازن قائم رکھنے کے لئے ایشیا ایک نہایت اہم جزو ہے..... اگر چین کی جنگ کا انجام صلح میں ہو جائے اور وہاں نہ روس کا ہاتھ رہے اور نہ امریکہ کا تو اس پرانے دیس کے لوگوں کی ایک نئی آواز سنائی دے گی....... مغربی ذہن کو یہ سوچتے شاید دھچکا لگے کہ ایشیا کی پس ماندہ قوم جو ابھی نو آبادیات کے درجہ سے اُبھر رہی ہے بھلا کیسے مغرب کی دیو ہیکل قوتوں میں مصالحت کرانے کا کام سر انجام دے سکتی ہے۔ لیکن اب یہ کوئی اَن ہونی بات نہیں رہی ایسا ہو کر رہے گا اور موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ یہ ممکن ہے۔"

کتاب کا آخری باب "انسان کی جانب واپسی" (Back to man) نہایت اہم ہے۔ چنانچہ ایشیا کے سماجی، اقتصادی، سیاسی اور ثقافتی انقلاب

کا مطالعہ کرنے کے بعد مصنف نے انسان کے مستقبل کو بھی زیر نظر رکھا ہے۔ اُسے مستقبل کے انسان پر پورا یقین ہے ــــ وہ لکھتا ہے:۔

"اپنے بھائی سے برسر پیکار ہونا خود اپنے آپ سے جنگ کرنا ہے۔ اپنے وارثوں سے دُور ہو جانا تو اپنے تئیں قطع کرنا ہے۔ اس سماج میں جس کا انسان ایک رکن ہے پورے طور سے حصہ لینا اس کے اندر کے کل کو مکمل کرتا ہے۔ اس شخص کی اپنی ذات کے ایک اور معنی ہو جاتے اور اُس کے اپنے ممکنات بڑھ جاتے ہیں۔"

یہ نیا زاویۂ نگاہ پُر معنی اور پُر لطف ہے۔ رُوس کا خدشہ امریکہ میں بُری طرح محسوس کیا جا رہا ہے اور یہ کتاب اُس کی آئینہ دار ہے۔

اُردو کا نیا وطن

"اُردو زبان نے پنجاب میں جنم لیا، دکن میں بڑھی اور دہلی لکھنؤ میں پروان چڑھی۔ اب زمانے کے ہاتھ سے مجبور ہو کر وہ پھر اپنے ابتدائی وطن پنجاب میں لوٹ آئی ہے۔ وہ اچھی بھلی بس رہی تھی کہ اُسے دیس نکالا دیا گیا۔ پنجاب نے اُردو کو سر آنکھوں پر جگہ دی ہے۔ جتنا عرصہ وہ نئے دیس میں رہی پنجاب برابر اُس کی خدمت کرتا رہا۔ چنانچہ بابائے اُردو نے پنجاب یونیورسٹی اُردو کانفرنس میں اس کا ذکر یوں فرمایا ہے:۔

"پنجاب نے جو اُردو کی خدمت کی ہے اُس کا اعتراف نہ کرنا ہر درجہ کی ناشکری ہوگی۔ حق یہ ہے کہ اس نے اُردو کوشی اور اُردو نوازی کا وہ کام کیا ہے جو برِّاعظم پاک ہند کا کوئی صوبہ نہ کر سکا۔ جس کثرت سے اُردو کے اخبار اور رسالے یہاں سے نکلتے ہیں اور کہیں سے نہیں نکلتے اور کمیت ہی میں نہیں کیفیت میں بھی دوسرے سب اخباروں سے سبقت لے گئے ہیں۔ سر شیخ عبدالقادر، مولوی ظفر علی خاں، مہر، میاں بشیر، حمید نظامی جیسے اخبار نویس اور کہاں ہیں۔ نوائے وقت کے بعض مضامین پڑھ کر مجھے حیرت ہوتی تھی۔ قطع نظر معلومات کے ان کی زبان و بیان کی روانی اور قوت کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ اُردو زبان ان کی نہیں ہے۔ یہ تو اس وقت کی باتیں ہیں۔ اس سے بہت پہلے بھی پنجاب کے اُردو اخبار کوہ نور، پنجابی اخبار، اخبار عام اور ان کے بعد رفیق ہند، وکیل، وطن، پیسہ اخبار وغیرہ اپنے اپنے زمانے میں بہت مقبول اور بااثر رہے ہیں اور آج تک یہاں بہت سے ادیب اور شاعر اور انشا پرداز ایسے ہیں کہ جن کے کلام اور افکار کو پڑھ کر مسرت ہوتی ہے۔ ان میں جدت اور تازگی ہے۔ یہ ہونہار نوجوان آئندہ اُردو ادب میں نام پیدا کریں گے۔ علاوہ عام ادبی رسالوں کے مثلاً ہمایوں، ادبی دنیا وغیرہ جو یادگار بشیر مرحوم مخزن کی ذریات ہیں علمی رسالوں کی طرف بھی توجہ ہو رہی ہے۔ ابھی حال میں رسالہ "نفسیات" اور نفسیات پر چند کتابیں میری نظر سے گزریں جو بعض نوجوانوں نے لاہور سے شائع کی ہیں۔ ان میں علمی مطالب مناسب، سادہ اور صاف زبان میں ادا کئے ہیں۔ "اُردو بولو" کی تحریک کچھ عرصہ سے پنجاب کے شہروں میں مقبول ہوتی جا رہی ہے۔ یہ مبارک تحریک ہماری قومی زبان کے حق میں بڑا کام کرے گی۔ آپ میں مولوی محمد شفیع، پروفیسر ڈاکٹر اقبال اور ان کے شاگرد اور اب استاد ڈاکٹر سید عبداللہ جیسے اہل تحقیق اور مولوی ظفر علی خاں، پطرس، احمد شجاع، تاج، سالک، عابد علی وغیرہم جیسے ادیب بھی موجود ہیں۔

یہ سب کچھ ہوتے ہوئے ہم کیسے کہیں کہ اُردو پنجاب کی زبان نہیں۔ زبان کا نہ کوئی مذہب ہوتا ہے نہ اس کی کوئی ذات اور قوم ہوتی ہے اور نہ کوئی وطن ہوتا ہے جو کوئی اس کی تحصیل میں محنت کرتا ہے، اسے بولتا ہے اور صحت اور فصاحت سے لکھتا ہے اُسی کی زبان ہے اور وہی زباندان اور اہل زبان ہے۔ وہ پودا جسے مولوی محمد حسین آزاد، مولانا حالی، ماسٹر پیارے لال، رینڈ کرگانی وغیرہ بزرگوں نے سینچا تھا آج آپ کی کوششوں سے تناور درخت ہوتا نظر آتا ہے۔ اس پر بھی کہنے والے کا یہ کہنا کہ اہل پنجاب کی اصل زبان اُردو نہیں ہے، غلط نہیں ہے، لیکن میں ان سے پوچھتا ہوں کہ کیا عربوں کی آمد سے قبل اہل مصر کی زبان عربی تھی، کیا عراق و شام اور مراکش اور شمالی افریقہ کے دوسرے علاقوں کے باشندے عربی بولتے تھے؟ لیکن آج ان تمام ممالک کے باشندوں کی مادری زبان عربی ہے۔ اسی طرح ایک دن آنے والا ہے جب اہل پنجاب کی زبان اُردو ہوگی اور یہ دیکھتے رہ جائیں گے۔ مجھے اور آپ میں سے بہت سوں کو یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوگا لیکن میرے اس قول کی تصدیق آپ کی آئندہ نسلیں اپنے عمل سے کریں گی۔ یہ سب کچھ جو اب تک پنجاب میں ہوا ہے اور ہو رہا ہے بہت حوصلہ افزا اور قابل تحسین ہے۔"

(قومی زبان ۱۸ رجون ۱۹۵۴ء)

اُردو کو مقبول عام بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ "اُردو بولو"، "اُردو پڑھو اور اُردو لکھو" کی تحریک کو تقویت دی جائے تاکہ مغربی پنجاب کے عوام اُردو زبان سے اس قدر مانوس ہو جائیں کہ یوپی سے آئے ہوئے مہاجرین پنجابی بولنے پر مجبور نہ ہوں۔

شبیر محمد اختر

غیریت سوز

جام پر جام ہر دم چڑھاتا رہوں شمع سے شمع پیہم جلاتا رہوں
شام سے صبح تک جگمگاتا رہوں صبح سے شام تک لہلہاتا رہوں

دامنِ طور میں گنگناتا رہوں
وادیٔ نور میں مسکراتا رہوں

میں زمان و مکاں کا نہیں پاسباں بندشِ این و آں میری حد میں کہاں
چھوڑ دوں کیوں نہ پابندیٔ این و آں توڑ دوں کیوں نہ قیدِ زمان و مکاں

میں تقید سے دامن بچاتا رہوں
نورِ مطلق سے ہی لو لگاتا رہوں

بیدلی بیخودی اصطلاحات ہیں اصطلاحات ہیں یا خرافات ہیں
یہ خرافات ہیں یا روایات ہیں یہ روایات ہیں یا حجابات ہیں!

ان حجابات کو میں اٹھاتا رہوں
شان ہر آن اپنی دکھاتا رہوں

مل گئی مجھ کو نادانیوں کی سزا خود شناسی کی اب پا رہا ہوں جزا
غیر کا وہم برسوں رہا جانگزا خود پرستی کا اب لے رہا ہوں مزا

خود پرستی کی لذت میں پاتا رہوں
خود شناسی کے جوہر دکھاتا رہوں

کر دیا نقشِ باطل کو میں نے فنا بڑھ گیا اور بھی اعتبارِ "انا"
اپنی دنیا میں کی میں نے اپنی ثنا "قائلِ ظاہر" ہیں "حالِ باطن" بنا

شان اپنے انا کی دکھاتا رہوں
آپ ہی رنگ اپنا جماتا رہوں

ہوں کلیسا میں جاکر کبھی ارمغاں صومعہ مجھ کو سمجھے کبھی رازداں
مسجدوں میں کبھی میں ہوں خطبہ خواں مندروں میں کبھی جاکے دے دوں اذاں

عینیت کے مناظر دکھاتا رہوں
غیریت کے مناظر کو ڈھاتا رہوں

کو بکو سو بسو گھومتا جاؤں میں گھوم کر اپنے مرکز پہ آ جاؤں میں
بزمِ آفاق میں پھیلتا جاؤں میں یوں خدا کی خدائی پہ چھا جاؤں میں

اپنے زیرِ اثر ان کو لاتا رہوں
جامِ توحید جن کو پلاتا رہوں

اپنے ہاتھوں امنگوں کو دفنائے جو غیر کا گیت وہ مردہ دل گائے تو
کوئی حیرت نہیں لیکن اے شعلہ خو یہ گوارا نہیں مجھ شرر بار کو

خرمنِ غیر کو میں جلاتا رہوں
عارفانہ تصور جماتا رہوں

علی منظور

نظیر اکبر آبادی

ایک انگریز مستشرق کی نظر میں!

جب انگریزوں نے ہندوستان کے برِ اعظم میں پاؤں جمانا شروع کئے تو انھوں نے سیاسی مصلحتوں کی بنا پر یہاں کے عوام کی زبان سے قریب ہونا چاہا۔ چنانچہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ اور دلی کالج کا قیام اسی جہت میں ایک کوشش تھی۔ علاوہ ازیں انگریزی سے ہندوستانی اور ہندوستانی سے انگریزی کے مختلف لغت بھی تیار کئے گئے۔ ان فرہنگوں کے مرتب کرنے والوں میں دو نام نمایاں ہیں، ایک پلاٹس کا اور دوسرا ڈاکٹر ایس ڈبلیو فیلن کا۔ ان فرہنگوں کو دیکھ کر بیساختہ یہ جملہ میرے مُنہ سے نکل جاتا ہے کہ کاش خود اہلِ ملک نے اپنی زبان کے لئے اتنی محنت اور کاوش کی ہوتی! ــــ ان دونوں مولفوں کی فرہنگیں آج کل قریب قریب نایاب ہیں۔

کوئی چار برس کا عرصہ ہوتا ہے کہ میں مرکزی حکومت میں مترجم ہو کر آیا، تو ان ڈکشنریوں کے دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا۔ ایک دن ڈاکٹر فیلن کی "اے نیو ہندوستانی انگلش ڈکشنری" کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ دیکھا کہ ایک طویل دیباچہ بھی شامل ہے۔ اسے پڑھنا شروع کیا اور یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ ایک انگریز نے اُردو زبان کے پہلے عوامی شاعر کی قدر و قیمت کو کس طرح پہچانا ہے۔ سنہ اشاعت پر نظر گئی تو ۱۸۷۹ء نظر آیا۔ اس سے یہ تعجب اور بھی بڑھ گیا۔ یہ وہ دَور تھا جب اُردو کے تذکرہ نگار اور شعر و سخن کے ناقد نظیر اکبر آبادی کو قابلِ اعتنا ہی نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ اُنیسویں صدی تو کجا آپ بیسویں صدی کے اوائل کے کسی بھی تذکرہ کو اٹھا کر دیکھ لیجئے، نظیر اکبر آبادی کا نام شاذ ہی ملے گا۔ غالباً رام بابو سکسینہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے ادبی تذکرہ میں نظیر کو جگہ دی۔

ان دنوں محترم جناب ظہیر الدین احمد بھی دلی ہی میں تھے۔ انھوں نے نظیر اکبر آبادی پر کافی تحقیق کی ہے۔ میں نے اُن سے استفسار کیا کہ فیلن کی یہ تحریر بھی آپ کی نظر سے گزری ہے؟ انھوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ میرا جی اور دُوسرے دوستوں سے بھی پوچھا۔ سب کے لئے وہ تحریر نئی بھی تھی اور تعجب انگیز بھی۔ چنانچہ میں نے فیلن کے دیباچہ کا یہ حصہ نقل کر لیا کہ ڈکشنری تو نایاب ہے، لیکن نظیر اکبر آبادی کے متعلق تحقیق کرنے والوں کے لئے یہ حصہ کافی قیمتی ہے، اس لئے اسے اُردو میں پیش کر دینا چاہیئے۔

ڈاکٹر فیلن اپنے دیباچہ میں یہ بتاتے ہوئے کہ میں نے الفاظ و محاورات کے معانی سمجھانے کے لئے کہاں کہاں سے مثالیں لی ہیں لکھتے ہیں۔

"کہاوتوں، گیتوں، ناٹکوں، پہیلیوں وغیرہ کے علاوہ میں نے بہت سی مثالیں کبیر کے ضرب الامثال دوہوں (ساکھیوں اور شبدوں) کی دی ہیں۔ کبیر سولھویں صدی عیسوی کا ایک بہت بڑا مذہبی مصلح، طنز نگار اور معلم اخلاق تھا۔ مطبوعہ ادب میں سے میں نے سب سے زیادہ مثالیں نظیر اکبر آبادی کے شعروں کی دی ہیں۔ صرف یہی وہ ہندوستانی شاعر ہے جو مغرب کے صحیح شعری معیار پر پورا اُترتا ہے لیکن خود ہندوستان کی لفظ پرست دُنیا اسے شاعر بھی تسلیم نہیں کرتی۔

"صرف نظیر ہی وہ شاعر ہے جس کے شعروں کی رسائی عوام تک ہے۔ ہر گلی کوچے میں اور بالخصوص اس کے وطن آگرہ میں اُس کے شعر پڑھے اور گائے جاتے ہیں۔ عیسائی مبلغ بھی اس کے کلام سے آشنا ہیں۔ چنانچہ جب وہ گلی گلی گھوم کر تبلیغ کرتے ہیں تو کبیر کے دوہوں کے ساتھ ساتھ نظیر کے شعر بھی پیش کرتے ہیں اور سامعین پر ان شعروں کا کافی اثر ہوتا ہے۔ نظیر میں ذہن اور احساس کی وہ تمام خصوصیتیں موجود ہیں جو ایک صاحب

...راک (Romanticism) میں پائی جاتی ہیں۔ اس کی نظمیں آپ بیتی ہیں، اس میں انسان اپنی مکمل انفرادیت کے ساتھ زندہ، چلتا پھرتا، اٹھتا
...تا دکھائی دیتا ہے۔ وہ صحیح معنوں میں آزاد مشرب تھا اور وہ اس کا ذکر بھی کرتا ہے۔ بہت سے افراد تارک الدنیا ہونے کا اعلان کرتے
...لیکن نظیر فی الواقع ایک تارک الدنیا اور بیراگی تھا۔ اسے مقسوم کے انعامات یا حادثات کی کچھ پروا نہ تھی۔ اُسے کسی چیز کی خواہش نہ تھی
...نہ کسی مرد کو خاطر میں لاتا تھا اور نہ کسی عورت کو۔ عورت سے بس اسے اتنی دلچسپی تھی کہ دُور ہی دُور سے اس کی تعریف کی جائے۔ خوش قسمتی پر
...نازاں نہ ہوتا تھا اور بد قسمتی پر متاسف نہ ہوتا۔ وہ اپنی "کھال میں مست" رہنے کا علمبردار تھا۔ اُس نے اپنے شعروں اور دوسری تحریروں کو
...محفوظ رکھنے کی کوشش نہیں کی۔ کہتے ہیں وہ اپنے شاگردوں اور دوستوں کی فرمائش پہ شعر کہتا، پھر ان نظموں کو ادھر اُدھر پھینک دیتا،
...س کے شاگرد اور دوست ہی ان نظموں کو اٹھا اٹھا کر محفوظ رکھتے۔

"وہ وسیع معنوں میں غیر مقلد، طبّاع، اقلیت پسند اور صلح کل تھا۔ اُس کے ادراک کی ہمہ گیری کا اندازہ ان مختلف النوع موضوعوں سے
...ہوتا ہے جن پر اُس نے خامہ فرسائی کی ہے۔ اُس نے عام باتوں سے شاعری پیدا کی ہے ——— کوئی دوسرا ہندوستانی شاعر اس کے لئے
...آمادہ نہیں ہوا، یا شاید کسی اور میں اس کی صلاحیت ہی نہ تھی ——— نظیر کی یہی خصوصیت ملکی ناقدوں کے نزدیک اس کے شاعر نہ ہونے کی
...بین دلیل ہے وہ کہتے ہیں کہ نظیر نے کبھی کوئی شاعری کی ہے۔ اُس نے تو آٹے دال، مکھیوں اور مچھروں جیسی عام چیزوں پر قلم اُٹھایا ہے۔
اس کی نظر کی وسعت اور تخیل کی قوت کا مزید ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ اُس نے ایک ہی چیز کی مختلف حالتوں کے مختلف مرقعے پیش
...کئے ہیں۔ اس کی نظمیں ایک نگار خانہ ہیں جس میں ایک دیوار پر ہندوستانی عوام کے کھیلوں اور تفریحوں کی، دُوسری پر درد و کرب کی، تیسری پر
...ذہنی کیفیات کی اور چوتھی پر قلبی واردات کی مُنہ بولتی تصویریں آویزاں نظر آتی ہیں۔

نظیر کو فطرت کے ہر منظر اور انسانیت کے ہر رُخ سے محبت تھی۔ وہ ہر چیز میں خیر کا پہلو دیکھتا تھا۔ وہ عوام کے ساتھ ہنستا، قہقہے لگاتا اور
...ٹھٹھے مارتا ہے۔ وہ ان کے کھیلوں اور تفریحوں سے لُطف اندوز ہوتا ہے۔ وہ ان کے درد کو محسوس کرتا ہے۔ صرف وہی ایک ہندوستانی شاعر ہے
جس نے بچوں کی محبت پر لکھا ہے۔ غریب اور بد قسمت لوگوں پر ترس کھایا ہے اور دنیا کے ٹھکرائے ہوئے لوگوں کو گلے لگایا ہے۔ اُس نے "آدمی نامہ"
کے عنوان سے انسان پر ایک نہایت عمدہ نظم لکھی ہے۔ اُس کے آخر میں وہ کس مؤثر انداز میں کہتا ہے ؎

اچھا بھی آدمی ہی کہاتا ہے اے نظیر
اور سب میں جو بُرا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

افلاطونی محبت کی اُس نے جس انداز میں تصویر کشی کی ہے وہ اتنی عمدہ ہے کہ نظیر ہی کا حصّہ ہے۔ نظیر کے کلام کا بہترین حصّہ کسی مطبوعہ مجموعے میں
نہیں ملتا بلکہ اس کے آزاد مشرب عقیدت مندوں اور ان پڑھ لوگوں کے ہونٹوں سے سنائی دیتا ہے۔ جن کا قلب انسانی فطرت کو محسوس کرتا ہے۔
جس کی نظیر نے عکاسی کی ہے۔ یہ خصوصیت نظیر ہی کے کلام کو حاصل ہے کہ ان پڑھ عوام کو حفظ ہے۔ وہ شعرا جن کے کلام چھپ بھی چکے ہیں
اور ناقد بھی ان کے کلام کے مدح خواں ہیں، ان کے کلام کو یہ شرف حاصل نہیں۔ وہ تو ان کے پڑھے لکھے ثنا خوانوں کو بھی یاد نہیں۔ لوگوں کے
ٹھٹھ کے ٹھٹھ نظیر کی مقبول عام نظمیں سنتے ہیں اور سر دُھنتے ہیں۔ ہندوستان میں جن کو شاعر سمجھا جاتا ہے، اُن کے عالم اور سخن فہم مداح بھی ان کے
کلام سے اس طرح حظ نہیں اُٹھاتے ——— اَن پڑھ محظوظ ہو تو اس کا اظہار زیادہ شدید اور راسخ ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کے قلبی محرکات زیادہ صحیح
اور سچے اور اُس کا ممدوح تعریف و ثنا کا زیادہ سزاوار ہوتا ہے۔

نظیر کا قلب اتنا پاکیزہ ہے اور وہ اپنے موضوع کو اس نفاست سے نبھاتا ہے کہ اگر کسی تصویر کی تکمیل کے لئے کوئی عریاں پہلو پیش کرنا
ضروری ہوتا ہے تو اس عریانی کو وہ اس خوبصورتی سے بیان کرتا ہے کہ وہ عوام بھی اس کو دیکھ نہیں پاتے جن کے لئے فحاشی پر اُتر آنا کوئی عار نہیں

اگر اُسے کسی پاکیزہ جذبے کے احسن و ارفع پہلو کو نمایاں کرنے کے لئے صنعتِ تضاد سے کام لینا پڑتا ہے تو ہوسناکی کی تصویر کو قاری کے ذہن پر مسلط نہیں ہونے دیتا کہ اُس کی آنکھیں پاکیزہ پہلو کی طرف اُٹھیں ہی نہیں۔ پاکیزہ پہلو کو وہ قاری کے سامنے بتدریج پیش کرتا آتا ہے۔ وہ فحش سے فحش موضوع پر قلم اُٹھاتا ہے، اُس کی صحیح تصویر کشی کے لئے تیزی اور شوخی سے بھی کام لیتا ہے۔ لیکن عریانی انداز کی لطافت اور نفاست میں چھپ کر رہ جاتی ہے اور اندازِ بیان کی یہی وہ خوبی ہے جو ہر شخص سے داد کی طالب ہی نہیں بلکہ اُسے حاصل کر لیتی ہے۔

نظیر نے اپنی مادری زبان کے خزینوں کو اپنا کافی زیرِ بار کیا ہے۔ اس ضمن میں اُس نے وہ کچھ کیا ہے جو صرف چاسر اور شیکسپیر جیسے زبان و ادب کے بادشاہ ہی کر سکے ہیں۔ اُس نے ہندی الفاظ سے نہایت برجستہ ترکیبیں اختراع کی ہیں اور انتہائی خود اعتمادی سے کام لیتے ہوئے لفظوں کو نئی نئی بندشوں اور معنوں میں استعمال کیا ہے اور ہمیشہ کامیاب رہا ہے۔

نظیر نے اپنے کسی بھی موضوع کے کسی بھی پہلو سے بے اعتنائی نہیں برتی۔ اس کی نظموں کا بیشتر حصہ ایک وسیع النظر مطالعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے خیال کی گہرائی ایک دُوسرے کے معنی تبلاتے ہوئے لفظوں کی بندشوں کی گرفت، جتنا زیادہ غور کیا جائے اُتنی ہی زیادہ واضح ہوتی جاتی ہے۔

ہندوستان کے نقاد صرف لفظوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ چنانچہ ان کی قوتِ فکر اِتنی ناقص ہے کہ وہ نظیر کے کلام کی وسعت اور معانی تک پہنچ نہیں پاتے اور اس کی بندشوں اور ترکیبوں کے اپنے انہی معانی کے ساتھ رائج ہو نکلنے کی صلاحیت کو بھی محسوس نہیں کر سکتے۔

ہندوستانی زبان پڑھنے والے اہلِ مغرب کے لئے یہ شاعر بالکل اجنبی ہے۔ کیونکہ ہندوستان کے عالم نقاد اور شاعر نظیر کو اس قابل ہی نہیں سمجھتے کہ اُس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھا جا سکے یا اُس کا نام ہی زبان پر لایا جا سکے۔"

(حلقۂ اربابِ ذوق شاخ راولپنڈی میں پڑھا گیا)

اکرام قمر

سجدے

جیل خانوں میں قیدیوں کو دریاں بُنتے برسوں دیکھتا رہا ہوں۔ ایک جیلخانہ میں قیدی جا نماز بُن رہے تھے۔ ہر نمازی کے لئے الگ سجادہ بڑی شان سے نمودار تھا خدا جانے کن رسمی ریلکے سجدوں سے یہ جا نماز گھسے گی؟

سچے دلوں کے سچے سجدے خوبصورت جا نماز کے محتاج نہیں ہوتے وقت بے وقت ادا ہوتے رہتے ہیں اور قبول کرنے والا اپنا خزانہ بھرتا رہتا ہے۔ اس خزانے میں مردوں کے سجدے کم ہوتے ہیں، لیڈروں کے ہرگز نہیں ہوتے۔

ماؤں کے ہوتے ہیں جو چھوٹے بچوں کی مُسکراہٹ دیکھ کر بغیر سر جھکائے بے اختیار دل سے نکلتے ہیں غرض کے سجدے مطلب کی دعائیں کسی شمار میں نہیں۔ سجدے وہی اچھے جن پر خوشی کی مُہر ہو۔ خوشیوں میں صرف وہی خوشی گنتی میں آتی ہے جو سچے عجز والے دل سے نکلیں۔ امیروں کی خوشیاں بھی رائیگاں جاتی ہیں۔ محض بہلاوا ہیں۔

فلک پیما

کشمیر

گماں غلط ہے کہ ہوگا طلوعِ مہرِ مبیں
یہ شکستہ گام، فسردہ قمر، ندیدہ رات
یہ لڑکھڑاتی ہوئی دست و پا بریدہ حیات
سوادِ نور کی جانب بڑھے یہ ناممکن
اگر تو چاہے کہ اب دن چڑھے یہ ناممکن
گھٹا گھٹا سا فلک ہے دھواں دھواں سی زمیں
ہے آج لرزہ بر اندام چرخِ نیلوفریں
ہیں ڈبڈبائی ہوئی عرش و فرش کی آنکھیں
وہ لے رہا ہے زمانہ تھکی تھکی سانسیں
سفینہ اپنا کنارے لگے امید نہیں
سیاہ پوش گل و لالہ غنچہ و نسریں
سیاہیاں ہیں کہ روئے چمن پہ رقصاں ہیں
تباہیاں ہیں کہ دشت و دمن پہ رقصاں ہیں
حسیں فضاؤں میں رہ رہ کے آگ اٹھتی ہے
غمیں ہواؤں میں رہ رہ کے جاگ اٹھتی ہے
نوائے درد، نوائے الم، نوائے حزیں
ہے ایک زلزلہ بالائے عرش زیرِ زمیں
یہ تیرتی ہوئی لاشیں[1] فضا کے دامن میں
لٹک رہے ہیں جنازے[2] خلا کے آنگن میں
دلِ وجود بھی ہے اس بھنور میں گم اے دوست
فسونِ کُن ہے نہ اعجازِ حرفِ قُم اے دوست
رہا نہیں لبِ عیسیٰ[3] کی جنبشوں پہ یقیں

نظر نواز خلاؤں نے کروٹیں بدلیں،
فضا اگلنے لگی سرخ سرخ انگارے
جھلس جھلس کے گرے فرشِ خاک پر تارے
پگھل پگھل کے گرے تاجِ کبریا کے نگیں
مگر یہ دورِ قیامت بھی ہے طرب آگیں
یہ رقصِ روحِ فنا، رقصِ زندگی ہے دوست
گماں غلط ہے کہ یہ دورِ آخری ہے دوست
جہاں میں آج سے پہلے بھی زلزلے آئے
جبینِ وقت پہ لہرائے موت کے سائے
کبھی کلیسا اٹھا، اہلِ سومنات اٹھے
بدل بدل کے نئے روپ حادثات اٹھے
گروہ ہم کہ زمانے میں سرفراز رہے
مدام فاتحِ میدان و ہر محاذ رہے
بھلا ہمیں کوئی کیا آج آزمائے گا
جو آزمانا بھی چاہے تو منہ کی کھائے گا
سنا کہ دیس کے جانباز جنگ جیت گئے
مرے حبیب قیامت کے لمحے بیت گئے
وہ دیکھ سامنے آتے ہیں زندگی کے امیں
یہی وہ مردِ مجاہد ہیں جو کہ میداں میں
اجل کے ساز پہ گاتے ہیں نغمۂ شیریں
اٹھ اور ترانۂ خوش آمدید گا اے دوست
حیاتِ نو کی ولادت پہ مسکرا اے دوست
سنا کہ میرا قیامت پہ اعتقاد نہیں

جعفر طاہر

[1] ہوائی جہاز [2] پیراشوٹ [3] مراد تمام عیسائی قومیں ہیں۔

از سرِ نو

خالد پھر چونک پڑا۔ وہ ہلکی سی کھلکھلاہٹ! بھلا دھوکا کیوں ہوتا؟ سائمہ کی ہنسی کو تو وہ ہزاروں قہقہوں میں پہچان سکتا تھا۔ اس کی ہلکی سی کھلکھلاہٹ اب بھی قہقہوں کے ہجوم کو چیرتی پھاڑتی خالد کے کانوں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی تھی، وہ اس کھلکھلاہٹ سے اس قدر مانوس تھا جیسے خود ہی ہنس پڑا ہو۔ خالد نے جلدی سے فوارہ بند کر دیا۔ آخر خود ہی کیوں نہ جا کر دیکھ لے۔ یہ الجھن تو نہ رہے گی۔ لیکن وہ تو نہانے کی غرض سے غسل خانہ میں آیا تھا۔ بالفرض سائمہ آئی بھی ہے تو فوراً ہی تو نہیں چلی جائے گی۔ برسوں بعد آئی ہے، شاید چند روز رہے۔ دوسرے ہی لمحے وہ اپنا تولیہ کرسی پہ ہی بھول آنے کے خیال سے فوراً باہر جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ لیکن جب فوارہ بند کرتے ہوئے اس کی نظریں غیر ارادی طور پر کھونٹی کی طرف اٹھیں تو وہاں بالکل صاف ستھرا تولیہ ٹنگا تھا۔ شاید زندگی میں پہلی بار اس کی یہ خواہش پوری ہوئی تھی ورنہ ہر مرتبہ غسل خانے میں داخل ہونے سے پہلے وہ خصوصاً اپنے تولئے کا خیال رکھتا تھا۔ اُسے پتہ تھا کہ غسل خانے میں کبھی اُجلا تولیہ نہیں مل سکتا اور عام تولیہ جس سے ہر کوئی مُنہ پونچھ لیتا ہو۔ توبہ توبہ اور اگر وہ عام تولیہ خشک بھی ہو تب بھی خالد کی طبیعت گوارا نہیں کرتی تھی۔ پھر خود اسی کے چہرے کی نمی سے جذب شدہ جراثیم از سرِ نو تازگی حاصل کر لیتے ہوں گے اسے بھی رحمتِ خداوندی کہیئے یا اتفاق کہ غسل خانے میں صاف ستھرا تولیہ ٹنگا مل جائے۔ خالد مسکرا دیا۔ آج وہ نہانے میں خلافِ معمول پھرتی سے کام لے رہا تھا۔ اُس نے فوارہ پوری رفتار سے کھول دیا اور اس پر کروڑوں موتی ٹوٹ پڑے پھر وہ پانی کے موتیوں کو اپنے ہاتھوں میں جمع کرنے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ یہ کھیل وہ بچپن سے کھیلتا آ رہا تھا۔ بیماری کے زمانے میں خالد کی طبیعت چاہتی تھی کہ فوارے کے نیچے کھڑے ہو کر اپنا چہرہ اوپر کر کے آنکھیں بند کر لے جیسا وہ اکثر نہانے کے دوران میں کیا کرتا تھا۔ پانی کی ٹھنڈی بوچھاڑ سے اُس کا چہرہ شل ہو جاتا لیکن وہ مسکراتا رہتا۔ آج بھی وہ مسلسل مسکرا رہا تھا۔ لیکن فوارہ کے اس کھیل میں خالد کی طبیعت بالکل نہیں لگ رہی تھی۔ کوئی شغل بھی ہو؟ اب وہ بچہ تو نہیں رہا تھا۔ یہ کھیل تو بچوں کے ہوتے ہیں۔ برآمدے سے برابر باتوں کی آواز آ رہی تھی، باتیں اور قہقہے ـــ قہقہے اور باتیں! ـــ لیکن سائمہ! وہ اب خاموش بیٹھی تھی؟ خالد نے کھونٹی پر سے تولیہ اتارا۔ اس کے بازوؤں پر پانی کے قطرے چمک رہے تھے۔ آج خالد کی مسکراہٹ نے بھی اس کے ساتھ غسلِ صحت کیا تھا۔ اس کی مسکراہٹ شاید پہلی بار اس قدر ہلکی پھلکی ہو گئی تھی ـــ بیماری کے زمانے میں یہی احساس کس قدر وزنی ہوتا تھا کہ وہ مسکرا رہا ہے۔ لیکن آج خالد برابر مسکرا رہا تھا اور بالکل غیر محسوس طریقے پر ـــ غسل خانے سے نکلتے ہوئے اس کا دل دھڑکنے لگا۔ چند سکنڈ بعد ہی وہ ایک نہایت حسین اور خوشگوار حادثے سے دوچار ہونے والا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے وہ یکایک سنجیدہ ہو گیا اور اس نے اپنی رفتار ہلکی کر دی۔ وہ بالکل انجان بن کر سائمہ کے سامنے جانا چاہتا تھا۔ جیسے اُس کی آمد سے قطعی لاعلم ہو۔ لیکن غسل خانے سے نکلتے ہی برآمدے میں بلا مقصد چلے جانا مناسب نہ تھا۔ خالد نے ڈریسنگ ٹیبل سے کنگھا اٹھا لیا اور آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ برآمدے سے باتوں کی آواز برابر چلی آ رہی تھی۔ رضیہ، سعیدہ اور اس کی امی بدستور باتوں میں مشغول تھیں۔ لیکن سائمہ صرف ایک ہی بار ہنس کر چپ ہو گئی تھی۔ سائمہ بھلا خاموش بیٹھنے والی ہے۔ اگر بولتی نہیں تو ہنستی رہتی ہے اور ہنستی نہیں تو باتیں کرتی رہتی ہے ـــ خالد نے کنگھا میز پر پٹخ دیا اور پھر اس کا دل بے اختیار چاہنے لگا کہ وہ برآمدے میں چلا جائے۔ سائمہ حسبِ معمول مسکرا کر اس کا خیر مقدم کرے گی اور حسبِ عادت سوالات کی بوچھاڑ کر دے گی، یہاں تک کہ وہ گھبرا جائے گا ـــ نہ معلوم اب کس قسم کے سوالات کرے ـــ "سکول جاتے ہو؟" ـــ "بیمار کیوں ہو جاتے ہو تم؟" وغیرہ لیکن اب تو وہ کالج جاتا تھا اور آج ہی اس کے انٹر میں کامیابی کی اطلاع آئی تھی۔ شاید وہ سب سے پہلے اس کامیابی پر مبارکباد دے گی۔ تعجب نہیں جو رضیہ اور سعیدہ کے ساتھ اس نے بھی اُسے پہنانے کے لئے پھولوں کا ہار گوندھا ہو ـــ خالد کے پاس اب بہت سی شکایتیں

ہوگئی تھیں۔ اُسے یقین تھا کہ وہ یہ شکایتیں ضرور سائمہ کے سامنے پیش کر سکے گا۔ اب خالد پہلے کی طرح بیوقوف سا لڑکا نہیں رہا تھا۔ اتنے لمبے عرصے میں اُس نے اپنی بہت سی خراب عادتیں سُدھاری تھیں۔ اب وہ بزرگوں کے سامنے بے تحاشہ آتی ہوئی ہنسی پر قابو پا لیا کرتا تھا۔ اس کے برعکس سائمہ میں ہنسی پر قابو پانے کی قوت بالکل نہ تھی۔ حالانکہ سائمہ خالد سے کئی سال بڑی تھی۔ اب خالد اس بیوقوفانہ سوال پر بہت شرمندہ ہوا کرتا تھا کہ "سائمہ باجی میں نے آپ کو کبھی روتے ہوئے نہیں دیکھا"۔ اس سوال پر سائمہ ہنس پڑی لیکن رضیہ خالد سے بے طرح ناراض ہوگئی تھی۔ اور سائمہ کے جانے کے بعد سعیدہ نے خالد کو خوب ڈانٹا تھا۔ اس ڈانٹ ڈپٹ کے چند روز بعد جب خالد فٹ بال کھیل کر واپس آ رہا تھا تو سائمہ کے گھر کے سامنے وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ اسے خواہ مخواہ خیال آیا کہ سائمہ آپا کے کمرے میں جھانک کر دیکھے، وہ اس وقت کیا کر رہی ہوں گی۔ اور جب خالد نے ڈرتے ڈرتے کھڑکی میں سے کمرے کے اندر جھانکا تو سائمہ نہایت معصومانہ انداز میں جانماز پر دو زانو بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ دعا کے لئے اُٹھے ہوئے تھے اور آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے آنسو سائمہ کے رخساروں پر ڈھلک آئے، نہ معلوم اس قدر خلوص دل سے کیوں دعائیں کی جا رہی تھیں اور کس لئے؟ خالد مسکرانے لگا۔ سائمہ اس سے پہلے کبھی اتنی معصوم اور حسین نظر نہ آئی تھی۔ وہ ہنستے ہوئے بھی اتنی خوبصورت نہ لگتی تھی۔ خالد سوچنے لگا اور اکثر سائمہ کو ہنستے دیکھ کر اُسے یہی خیال آیا کرتا۔ اس روز وہ پاگلوں کی طرح سائمہ کو روتے دیکھتا رہا۔ یہ بھی نہ پوچھا کہ وہ کیوں رو رہی تھی۔ لیکن اب تو خالد کو روتے ہوئے آدمی کو تسلی دینے کی صلاحیت آگئی تھی۔ وہ اب سائمہ کے آنسو خشک کر سکتا تھا۔ اگر وہ روتی۔ خدا نہ کرے خالد کو یہ بھی پتہ ہو گیا تھا کہ رونا کیسے بُرے حالات میں آیا کرتا ہے ——!

برآمدے میں سے اب بھی بدستور باتوں کی آواز آ رہی تھی، ہنسی کے بعد باتیں اور باتوں کے بعد ہنسی۔ لیکن سائمہ نہیں ہنس رہی تھی کیا؟ پہلے تو سائمہ بے تحاشا ہنسا کرتی تھی۔ رضیہ اور سعیدہ کے قہقہوں میں سائمہ کا قہقہہ اُردو کی مشہور نظم "بارش کا پہلا قطرہ" کا مضمون پیش کرتے ہوئے

آتے ہو تو آؤ لو چلا میں

کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کے بعد تو قہقہے موسلا دھار برس پڑتے۔ لیکن ان قہقہوں کے آغاز و انجام سے بے خبر ہونے کی وجہ سے وہ بہت جلد اکتا جاتا تھا۔ ان قہقہوں کا مقصد خالد کی سمجھ سے بالاتر تھا — تینوں لڑکیوں کے قہقہے مل کر ایک اچھا خاصہ گورکھ دھندا بن جاتے تھے۔ خالد چاہتا تھا کہ صرف سائمہ ہی ہنستی رہے۔ وہ خالد کا مذاق اُڑاتی، لیکن مذاق اُڑانے کا ڈھنگ اتنا بامحل اور دوستانہ ہوتا تھا کہ خالد کو کبھی بُرا نہ معلوم ہوا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ سائمہ سے باتیں کرتے ہوئے اُسے کبھی اپنی کم مائگی اور چھوٹے پن کا احساس نہ ہوتا تھا۔ خالد کو سائمہ کی یہی عادت بہت پسند تھی۔ ملائمت اور توجہ! جب کبھی مستقبل کا ذکر چھڑ جاتا اور سب اپنے آئندہ کے پروگرام ایک دوسرے کو بتاتے تو رضیہ اور سعیدہ کے لمبے چوڑے ارادے اور مغرورانہ اور چھچھورے پن کی باتیں سُن کر وہ دل ہی دل میں جھنجھلا جاتا۔ محض اس لئے کہ وہ چاہتی تھیں کہ دوسرے لوگ خواہ مخواہ رشک کیا کریں۔ اس کے برعکس سائمہ اپنے آئندہ کے متعلق نہایت سادگی اور وثوق سے بتایا کرتی۔ اس کے لب و لہجہ میں اتنی صداقت اور معصومیت ہوتی تھی کہ خالد کو بجائے رشک کے ایک طرح کی بے پایاں خوشی کا احساس ہوتا۔ جیسے یہ ارادے خود اُسی کے اپنے ہوں۔ گویا سائمہ کے بلند عزائم ایک دعوت عامہ تھے۔ وہ انفرادی طور پر سارے نیک ارادوں پر اپنا دعویٰ نہیں رکھتی تھی بلکہ اس قدر بلند اور شاندار مستقبل ہر شخص کا ورثہ ہونا چاہیے۔

طویل علالت اور مسلسل غفلت میں بھی خالد کو سائمہ کی موجودگی کا احساس رہتا تھا۔ وہ یہ بھی یاد رکھنے میں کامیاب ہو جاتا تھا کہ سائمہ آج کتنی مرتبہ اس کے کمرے میں آئی ہے اور کل نہیں آئی تھی۔ خالد کی خفیف قوت سامعہ اس کے قہقہوں کے بے شمار موتی اب بھی اپنے دامن میں بھر لیا کرتی تھی۔ لیکن جوں جوں وہ ہوشیار ہوتا گیا اُسے سائمہ کی غیر موجودگی کا احساس ہونے لگا —— ایک دن شاید وہ نیند میں تھا کہ یکایک اسے معلوم ہوا جیسے سائمہ آئی ہے۔ اس کی مخصوص خوشبو اور ریشمی کپڑوں کی سرسراہٹ اُسے بالکل اپنے ہی قریب محسوس ہوئی۔ خالد نے انتہائی کوشش کی لیکن سائمہ پر ایک نظر ڈالنے کا خیال اس کے پپوٹوں کو سہارا نہ دے سکا۔ اس نے سائمہ کے سرد ہاتھ کا لمس اپنی پیشانی پر محسوس کیا۔ ٹھہر ٹھہر کر تو اب [illegible]

"خالد میاں تمہاری سائرہ آپا آئی ہیں۔" رضیہ کی آواز آئی، لیکن خالد کے ہونٹ تو جیسے ایک دُوسرے سے چپک کر رہ گئے تھے۔

"میں جانتی ہوں خط لکھنے کی تو تم چور ہو۔" خالد نے جلدی سے آنکھیں کھول لیں۔ رضیہ کے اس فقرے سے خالد نے اندازہ لگا لیا تھا کہ سائرہ کہیں جا رہی ہے۔

"ارے نہیں بھئی تمھیں تو ہر ہفتہ خط لکھا کروں گی ——" سائرہ رضیہ سے مخاطب تھی۔ اگر وہ خالد کی طرف متوجہ ہوتی تو خالد ضرور پوچھ لیتا کہ وہ کہاں جا رہی ہے اور کیوں جا رہی ہے؟ —— خالد میں اتنی بھی سکت نہ تھی کہ وہ سائرہ کو مخاطب کر لیتا۔ دوسرے ہی لمحے رضیہ اور سائرہ کسی بات پر ہنستی ہوئی چلی گئیں —— اور خالد رضیہ پر جھنجھلا کر رہ گیا۔ اگر اُس نے یہ کہا تھا کہ سائرہ آپا آئی ہیں تو یہ بھی بتا دیتی کہ سائرہ آپا کہاں جا رہی ہیں؟ جیسے خالد کا سائرہ کے جانے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ کس قدر نامعقول ہیں رضیہ آپا۔ اگر سائرہ نے کسی نہ کسی تعلق کی بنا پر اس کی مزاج پرسی کی تھی تو الوداع کہنے کی ضرورت کیوں نہ سمجھی؟ اسے ڈر تھا کہ اگر اس نے سائرہ کے متعلق رضیہ سے پوچھا تو وہ حسب عادت جھڑک دیگی "تمھیں کیا مطلب!" وہ رضیہ کے اس فقرے سے بہت ڈرتا تھا۔ خالد کے جذبات رضیہ کی جھڑکیوں سے ٹکر نہ لے سکتے تھے —— جوں جوں خالد رو بصحت ہوتا گیا۔ اسے سائرہ کی جستجو بڑھتی گئی۔ لیکن وہ سائرہ کے متعلق کسی سے بھی ایک لفظ پوچھنے کی جرأت نہ رکھتا تھا۔

کسی نہ کسی دن ایسا بھی ہوا کرتا تھا کہ خالد گھر میں قدم رکھتے ہی سائرہ کی موجودگی کی سی فضا محسوس کرتا۔ رضیہ اور سعیدہ کے لبوں پر وہ سائرہ کے ذکر و اذکار کے نقش قدم پہچان لیا کرتا تھا۔ خالد کو فوراً معلوم ہو جاتا کہ ان کے لب ابھی ابھی "سائرہ" کہہ چکے ہیں —— وہ گھنٹوں مزید تذکرہ کا منتظر رہتا ——

امتحان کے زمانے میں ایک گرم سی دوپہر کو جب وہ کمرے میں داخل ہوا تو رضیہ اور سعیدہ صوفے پر بیٹھی تھیں۔ رضیہ کے ہاتھ میں خط تھا اور سعیدہ اُس پر جھکی ہوئی تھی۔ دونوں مسکرا رہی تھیں، دونوں کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور چہرے دمک اُٹھے تھے۔ ضرور سائرہ کا خط آیا ہوگا۔ خالد بوجھل قدم اٹھاتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ابھی شیروانی کھونٹی پر لٹکا رہا تھا کہ رضیہ کی آواز آئی۔ "ارے بھئی خالد میاں! بڑے بد اخلاق ہو تم! سائرہ کو بھولوں بھی یاد نہیں کرتے۔ دیکھو اس نے شکایت لکھی ہے۔"

"جی! —— ابھی آیا ——" وہ تجاہل عارفانہ اختیار کرکے رضیہ سے مزید پوچھنا چاہتا تھا۔ لیکن کمرے میں داخل ہوتے ہی سعیدہ نے عجیب بے موقع سوال کر ڈالا "کیسا پرچہ ہوا؟" خالد کی طبیعت پر اوس پڑ گئی۔ سعیدہ نے گفتگو کا رُخ ہی یکایک بدل ڈالا تھا۔ وہ کیسے پوچھ لیتا کہ مجھ سے کس کو شکایت ہے؟ (یہ جانتے ہوئے بھی کہ سائرہ کا خط آیا ہے ظاہر ہے کہ اُسی نے شکایت لکھی ہوگی) لیکن اب وہ بات سعیدہ کے نامعقول سوال نے رفع دفع کر دی تھی۔

"تم کھوئے کھوئے کیوں بیٹھے ہو؟ کیا پرچہ اچھا نہیں ہوا؟"

"جی نہیں تو —— اچھا خاصہ ہو گیا۔ یونہی ذرا تھک گیا ہوں۔" خالد نے کھسیانی مسکراہٹ سے کہا۔ سعیدہ نے لفافہ میز کی دراز میں رکھ دیا تھا۔ اُس نے شاید یہ نہ سوچا ہوگا کہ خالد میز کی دراز میں سے خط نکال کر پڑھ سکتا ہے۔ پھر وہ اپنی احمقانہ باتوں پر دل ہی دل میں ہنس دیا۔ بھلا انھیں کیا پتہ کہ خالد سائرہ کے خط کے لئے اس قدر بے چین ہے۔ ان کی نظر میں تو خالد وہی بے پروا اور بد اخلاق سا لڑکا تھا۔ جو سائرہ کو کبھی بھولوں بھی یاد نہیں کرتا —— اب وہ رضیہ سے کیسے کہہ دیتا کہ سائرہ آپا اُسے کس قدر یاد آتی ہیں۔ اس کا دل بے اختیار چاہتا کہ وہ سائرہ کے متعلق سب کچھ پوچھ ڈالے۔ آخر سائرہ آپا ہیں کہاں؟ کب آئیں گی؟ وہ سائرہ کو خط لکھے گا۔ آخر خط لکھنے میں حرج ہی کیا ہے؟ سائرہ کو وہ رضیہ ہی کی طرح سمجھتا تھا۔ لیکن رضیہ سے زیادہ سمجھنے کی جرأت اُس میں نہ تھی۔ خالد چاہتا تھا کہ رضیہ اور سعیدہ کی طرح سائرہ بھی اس کی زندگی میں خاص "دخل" حاصل کر لے —— یکایک خالد کو احساس ہوا جیسے وہ تمام گھر میں اکیلا ہے۔ نہ جانے سب لوگ کہاں چل دیئے تھے۔ وہ جلدی سے اُٹھا میز کی دراز

لفافہ جوں کا توں رکھا تھا۔ اُس نے ہاتھ بڑھایا لیکن پھر ٹھٹھک گیا۔ خالد کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور ٹانگیں بےطرح لرز اٹھی تھیں۔ حلق خشک ہو گیا۔ اس نے دراز بند کر دی اور پیشانی کے پسینے کو رومال سے پونچھتا ہوا باہر آ گیا۔ اُس دن کے بعد بھی کئی مرتبہ خالد میز کی طرف سائرہ کا خط نکالنے کی غرض سے گیا لیکن یہ مہم اس سے سر نہ ہو سکی۔ پھر تو اسے ہر جگہ سائرہ کے خط پڑے ملتے تھے۔ اکثر بستر پر، سنگار میز پر، بعض مرتبہ تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے سائرہ کے خط اس کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں ——— وہ بوکھلا جاتا۔ خالد کے دل میں گھر کی ہوئی سائرہ کی قدر و منزلت نے یہ کبھی گوارا نہ کیا کہ وہ اس کے خط چرا کر پڑھنے کی ذلیل حرکت کرے۔

اور جب گرمیوں کی چھٹیاں آئیں تو وہ دوبارہ ٹائیفائڈ میں مبتلا تھا ——— اپنی علالت کے دوران میں وہ اکثر رضیہ سے بہکی بہکی باتیں کرتا کہ وہ اصل بدقسمت ہے۔ کچھ دن سے خالد کو خواہ مخواہ اپنی بدقسمتی کا احساس ہونے لگا تھا۔ رضیہ اسے سمجھاتی بھلا اس میں بدقسمتی کی کیا بات ہے؟ علالت تو محض اتفاق سمجھنا چاہیئے۔ جب رضیہ خالد سے بہت ہی پیار کی باتیں کرتی تو خالد کے تجسّس آمیز جذبات مچل اُٹھتے کہ سائرہ کے متعلق پوچھ ڈالے۔ لیکن عین اس وقت جب خالد الفاظ کو گھسیٹ گھسیٹ کر لبوں تک لاتا رضیہ ضرور کسی کام سے باہر چلی جاتی اور خالد جِز بِز ہو کر رہ جاتا ——— اس سے کبھی نہیں پوچھا جائے گا، وہ کبھی نہیں پوچھ سکتا۔

اب بھی وہ سوچ رہا تھا کہ آخر خود ہی برآمدے میں کیوں نہ چلا جائے۔ بالکل انجان بن کر جیسے سیدھا غسل خانے ہی سے آ رہا ہو۔ خالد پھر سنگار میز کے ساتھ جا کھڑا ہوا ——— وہ کھلکھلاہٹ سچ مچ سائرہ ہی کی تھی۔ لیکن وہ صرف ایک ہی بار کھلکھلا کر رہ گئی تھی۔ رضیہ اور سعیدہ برابر باتیں کئے جا رہی تھیں۔ حسبِ معمول ہنس بھی رہی تھیں۔ ان کے ہار اب تیاری پر تھے۔ شاید سائرہ اخبار پڑھنے میں محو ہو یا فوراً ہی چلی گئی ہو ——— وہ بوکھلا سا گیا۔ ممکن ہے چلی گئی ہو۔ دروازے میں رضیہ سے ٹکر ہوتے ہوتے بچی

"ارے خالد میاں! اب نہا کر آئے ہو! ———"

"رضیہ آپا ——— کیا ——— کیا! ——— وہ .... " دوسرے ہی لمحے پھولوں کا ڈھیر اس کے گلے کا ہار ہو گیا ——— خالد کے لبوں پر بیتابانہ آئے ہوئے الفاظ بوجھل مسکراہٹ کے قدموں تلے روندے گئے۔ وہ باوجود انتہائی کوشش کے کچھ نہ کہہ سکا ——— لیکن پھر کبھی سہی، وہ ضرور پوچھے گا ——— خالد سوچ رہا تھا.... شائد سائرہ نہیں آئی، اگر آتی تو وہ بھی ضرور اس کے لئے پھولوں کا ہار گوندھ کر لاتی ——— آ کر آتی؟ ——— لیکن وہ کھلکھلاہٹ سائرہ کے ہلکے سے قہقہے کو تو وہ ہزاروں قہقہوں میں پہچان سکتا تھا۔

اختر جہاں

پرواز

بارِ غم سے دلِ ناکام ہے پژمردہ۔ نڈھال

ایک بھیگے ہوئے ٹھٹھرے سے پرندے کی مثال

جس کو پرواز ہوئی جاتی ہو اک بوجھ۔ وبال

(رحیم)

غزل

ترا آنسو مری قسمت کا ستارا تو نہیں — یعنی آلام و مصائب کا سہارا تو نہیں

بات ہی اور ہے یہ تو کہ تجھے پا نہ سکا — ڈھونڈتے ڈھونڈتے میں آج بھی ہارا تو نہیں

تیز ہو جاتی ہے جب سانسوں کی آواز تو میں — چونک پڑتا ہوں کہیں تو نے پکارا تو نہیں

تیری خاموش نگاہی تری آواز کا رس — میرے جذبات کی تسکیں کا سہارا تو نہیں

ایک بجلی سی رگ و پے میں تڑپ جاتی ہے — تیری نظروں میں نہاں کوئی شرارا تو نہیں

اُن کی آنکھوں کے چمکتے ہوئے ڈوروں میں ندیم — میری آزردگیٔ دل کا نظارا تو نہیں

تیری آنکھوں سے جو ٹپکا ہے ترے دامن پہ — فلکِ حسن کا ٹوٹا ہوا تارا تو نہیں

اُن کی دزدیدہ نگاہی میں قمرؔ پوشیدہ
کہیں تجدیدِ محبت کا اشارا تو نہیں

قمر ہاشمی

(انجمن ترقی پسند مصنفین ٹونک میں پڑھی گئی)

ادب

(ایک گفتگو)

آغا بابر۔ پاکستان کے قیام کے بعد ہر شعبہ ملت کی تعمیر کے لئے نیا پروگرام مرتب کر رہا ہے۔ کانفرنسیں ہو رہی ہیں، کہیں خوراک کا جھنجھٹ ہے کہیں آبادکاری کی مصیبت ہے۔ ہر کس و ناکس پر ملت کی خدمت کا جذبہ طاری ہے۔ ان حالات میں ادیب اور فن کار کی طرف سوسائٹی دیکھ رہی ہے کہ یہ لوگ کب اور کس طرح موجودہ حالات کا ردِ عمل پیش کرتے ہیں۔ آپ فرمائیے عسکری صاحب، کیا سماج کی توقعات ادیبوں اور فن کاروں سے بجا ہیں یا نہیں؟

حسن عسکری۔ سماج کا ادیبوں اور فن کاروں سے کچھ توقعات رکھنا تو ضرور بجا ہے اور اپنے ادیبوں کو قبول کرنے سے پہلے سماج یہ پوچھنے میں بھی حق بجانب ہے کہ انھوں نے سماج کے لئے کیا کیا ہے۔ مگر اصلی بات دیکھنے کی یہ ہے کہ سماج کی توقعات ہیں کیا؟ کیا سماج ادیب سے یہ پوچھ رہی ہے کہ تم نے حکومت یا سیاسی جماعتوں کے محکمہ نشر و اشاعت کا کام کیوں نہیں سنبھالا، یا سماج چاہتی ہے کہ ادیب اپنا کام کریں؟ سماج کی توقعات پر غور کرنے سے پہلے ہیں دیکھنا یہ ہے کہ ادیب کا اصلی کام کیا ہے؟ کیوں ساحر صاحب آپ اس بارے میں کیا فرماتے ہیں؟

ساحر لدھیانوی۔ یہاں بات ادب کے مختلف نظریوں کی طرف چلی جائے گی، یعنی وہی ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کی بحث۔ ہم میں سے بعض ادیب ایسے بھی ہیں جو ادب یا ادیب کے کسی سماجی فریضے کو تسلیم نہیں کرتے۔ جہاں تک میری رائے کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ ادیب کا ایک سماجی فریضہ ہے اور ہر ادیب شعوری یا غیر شعوری طور پر زندگی کے کسی نہ کسی نظریئے کا مبلغ ہوتا ہے۔ اب یہ بحث الگ ہے کہ وہ نظریہ مجموعی طور پر سماج کو آگے بڑھنے میں مدد دیتا ہے یا انحطاط کی طرف لے جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ دوسرے لوگوں کی طرح ادیب اور فن کار بھی سماج کا ایک حصہ ہیں اور ان کا فرض ہے کہ اپنے افکار سے سماج کو صحت مند بنانے میں ترقی پسند سماجی قوتوں کی مدد کریں۔

آغا بابر۔ تو اس طرح تو ادب سے نشر و اشاعت کا کام لینا ہوا۔ کئی لوگ یہ سمجھنے لگیں گے کہ ادب محض پروپیگنڈا ہے اور عسکری صاحب تو پہلے ہی گھبرا رہے ہیں کہ ادیب صرف محکمہ نشر و اشاعت ہی بن کر نہ رہ جائیں اور اپنے ذہنی تجربات کے بجائے کہیں کھاد کی خصوصیات اور ٹریکٹر کے فوائد ہی اپنے تحریروں میں بیان نہ کرنے لگیں۔ کیوں عسکری صاحب؟

حسن عسکری۔ نہیں صاحب! اتنا تو مجھے بھی تسلیم ہے کہ سماج ادیب سے صحت مندی کا مطالبہ ضرور کرتی ہے۔ اس کی تصریح میں اس طرح کرتا ہوں کہ دنیا میں صرف ایک سوال ایسا ہے جس کا کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا۔ اور وہ یہ کہ آخر انسان زندہ کیوں رہے؟ چونکہ حیاتیاتی قوانین کے ماتحت انسان زندہ رہنے اور زندہ رہنے کی خواہش کرنے پر مجبور ہے، اس لئے انسانیت کی آخری قدر یہ ہو گئی ہے کہ جو چیز انسانیت کو زندہ رہنے میں مدد دیتی ہے وہی سب سے اچھی ہے۔ ہے تو یہ ایک طرح کی خود غرضی۔ مگر یہ ایسی حیاتیاتی خود غرضی ہے جس سے مفر ممکن نہیں چنانچہ اگر سماج ادیب سے صحت مندی کا مطالبہ کرے تو حق بجانب ہے۔ مگر دقت اس میں پڑتی ہے کہ آخر صحت مندی کا معیار کیا ہو؟ اور کون مقرر کرے۔ سماج یا ادیب؟

آغا بابر۔ اگر آپ یہی بات پوچھتے ہیں تو صاحب میں تو یہی کہوں گا کہ یہ کام ادیب کا ہے۔

ساحر لدھیانوی۔ میرا خیال ہے کہ اس سلسلے میں ادیب کو سماج سے الگ کر کے سوچنا غیر ضروری ہے۔ کیونکہ ادیب کی اپنی ذات بھی بہر حال

سماج ہی کا ایک حصّہ ہے اور جہاں تک صحت مندی کے معیار کا تعلق ہے وہ ہم مختلف سماجی نظریوں کی افادی حیثیت کو سامنے رکھ کر ہی قائم کر سکتے ہیں۔ نظریوں کی یہ افادی حیثیت وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے مثلاً ایک نظریہ جو آج سے دس سال پہلے کار آمد اور مفید تھا ہو سکتا ہے کہ آج وہ انسانیت کے لئے نقصان دہ ہو۔ مثال کے طور پر ایک وقت تھا جب ہمارے ملک کے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں نے ہمارے ساتھ مل کر غیر ملکی اقتدار کے خلاف جنگ کی۔ لیکن آج ہمارے دیس کے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کا یہ ترقی پسند رول ختم ہو چکا ہے آج ہمیں ان قوتوں کا ساتھ دینا ہے جو سرمایہ داری اور جاگیرداری کا خاتمہ چاہتی ہیں۔ فسادات نے ہمارے سامنے کئی ایک بالکل نئے مسائل بھی لا کھڑے کئے ہیں۔ ان میں پناہ گزینوں کا مسئلہ اور مشرقی پنجاب سے آئی ہوئی اغوا شدہ عورتوں کے مسائل سب سے اہم ہیں۔ ہمیں ان پناہ گزینوں کو زندہ رہنے کے وسائل اور اُن لٹی ہوئی عورتوں کو ان کی کھوئی ہوئی سماجی حیثیت واپس دلانی ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر ہماری سماجی زندگی میں توازن نہیں پیدا ہو سکتا۔ اور ادب چونکہ ہمارے اقتصادی نظام اور سماج سے کوئی باہر کی چیز نہیں۔ اس لئے اس امر میں شک و شبہہ کی گنجائش نہیں کہ خود ہمارے ادب کا ارتقا بھی اسی صورت میں ممکن ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اچھا ادب وہی فن کار پیدا کر سکتا ہے جو زندگی کی آگے بڑھتی ہوئی تحریکوں اور انسانیت کی دلی اُمنگوں کا عکاس ہو۔ جہاں تک کھاد اور ٹریکٹر کو موضوع بنانے کا تعلق ہے ضروری نہیں کہ ان موضوعات پر اچھا ادب پیش نہ کیا جا سکے۔ بنگال کا قحط بجائے خود ہمارے ملک کی تاریخ کا کوئی حسین واقعہ نہیں ہے۔ لیکن کرشن چندر کا افسانہ "ان داتا" یقیناً اس قابل ہے کہ اسے اچھے ادب میں شامل کیا جائے۔ لیکن بنگال ہی کے قحط سے متعلق بعض دُوسرے ادیبوں نے بھی لکھا ہے جو فنی معیار پر پورا نہیں اُترتا۔ اس لئے میرے خیال میں یہ کہنا صحیح نہیں کہ خوبصورت چیز صرف خوبصورت موضوعات پر ہی لکھی جا سکتی ہے۔ کیونکہ میں ایسے ادیبوں کی تخلیقات کا بھی حوالہ دے سکتا ہوں جو جنت جیسی خوبصورت چیز کو بھی فنی عجز کے باعث بھونڈے طریقے سے پیش کرتے ہیں۔

آغا بابر۔ میرے خیال میں آپ ایک ہی سانس میں بہت سی باتیں کہہ گئے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ادب کا معجزہ اور کرشمہ یہی ہے کہ وہ ایک خوبصورت چیز کو بھونڈا بنا دے اور ایک بھونڈی چیز کو حسین شے بنا دے اور اگر آپ کو کہیں یہ کرشمہ نظر آتا ہے تو یہ ادیب کے حسّاس ذہن و قلب کا نتیجۂ فکر ہے مگر جہاں تک ادب میں افادی حیثیت کا تعلق ہے اُس کی حدیں بھی تو ہمیں قائم کرنی چاہئیں۔ اگر ادب میں افادیت کی کوئی حد قائم نہ کی جائے تو پھر کئی ادیب جس طرح عسکری صاحب نے فرمایا ہے ایسا ادب بھی پیدا کریں گے جسے ہم ادب تو نہیں کہہ سکیں گے بلکہ وہ نشر و اشاعت کا ایک حصّہ بن کر رہ جائے گا۔ آپ ہی نے ایک مثال دی ہے کہ بنگال کے قحط کے متعلق اور بھی ادیبوں نے لکھا مگر چونکہ اس میں آمد کم تھی اور آورد زیادہ' اس لئے وہ چیز اپنا کوئی مقام پیدا نہ کر سکی۔ لہذا اگر ادیبوں نے افادیت ہی کو پیش نظر رکھ کر قلم اٹھایا تو ایمانداری کی بات ہے کہ اس راہ پر بہتوں کے پاؤں پھسل جانے کا احتمال ہے۔ ادب میں رنگ چوکھا تو اسی وقت آتا ہے جب آواز دل سے اُٹھے۔ صرف نعرے کی خاطر نعرہ بلند نہ کیا جائے اور اگر افادیت کا خیال رکھ کر ادب پیش کرنا ہے تو پھر معاف کیجئے ایسا ادب پیش کرنے والے یہی کوشش کریں گے کہ نہ ہینگ لگے نہ پھٹکری مگر رنگ چوکھا آئے۔ جو میں سمجھتا ہوں ادب کا مضحکہ اُڑانے کی بات ہے۔

حسن عسکری۔ آپ اجازت دیں تو میں آپ کی بات کو دوسرے لفظوں میں بیان کر دوں۔ ادب اُس تجربے سے پیدا ہوتا ہے جو ادیب حاصل کر چکا ہو نہ کہ اس تجربے سے جو ادیب حاصل کرنا چاہتا ہو۔ خواہ ادیب نے کسی پروگرام کے ماتحت لکھا ہو یا کسی پروگرام کے بغیر۔ اگر یہ چیزیں اُس کے ذہنی اور تخیلی تجربے میں آ چکی ہیں تو وہ سچا ادب پیدا کر سکے گا ورنہ نہیں۔ اگر ادیب نے سچا ادب پیدا کر دیا ہے تو اس میں تھوڑا سا پروپیگنڈا شامل ہونے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ اگر سچے ادب کے ساتھ ساتھ سماج کی خدمت بھی ہوتی چلے تو اس پر کسے اعتراض ہو گا؟

ساحرلدھیانوی - جی ہاں! اور پھر عسکری صاحب، پروپیگنڈا کس دَور کے ادب میں نہیں رہا۔ مصیبت صرف یہ ہے کہ فراری رُجحان رکھنے والے ادیب انحطاط پسندیدی کو تو آرٹ کہہ کر سینے سے لگا لیتے ہیں اور اس ادب پر خالص پروپیگنڈے کا لیبل لگا دیتے ہیں جس میں انسانیت کو جدوجہد کے لئے اُبھارا گیا ہو۔

آغا بابر - سکون کہتا ہے کہ آپ انسانیت کو جدوجہد کے لئے نہ اُبھاریئے مگر اس بات کا خیال رکھئے کہ ادب کے آئینے پر بال نہ آئے۔ باقی رہی فراری رجحان کی بات تو میرا خیال ہے کہ پنجاب کی حالیہ مصیبت نے ہم ادیبوں کو حقیقت اور واقعیت کے بالکل سامنے لا کھڑا کیا۔ ہم لاکھ آنکھیں بند کریں مگر فرار کی صورت نظر نہیں آتی۔ حقیقت ہمارے سامنے، ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑی ہے۔ اب رومان ایک طرف دبک گیا ہے اور میں سمجھتا ہوں اِن تازہ وارد مصائب نے ہم میں حقیقت سے دوچار ہونے کی جرأت ضرور پیدا کر دی ہے۔ ادیب زندگی کو جس زاویے سے چاہیں دیکھنے کی کوشش کریں مگر یہ خصوصیت ان میں اب مشترک ضرور ہو گئی ہے اور وہ یہی جیسا کہ میں نے عرض کیا حقیقت سے دوچار ہونے کی جرأت اور یہ جرأت ایک نیک فال ہے۔ فضا تیار ہے۔ اسباب مہیا ہیں۔ زندگی نئے سے نئے روپ میں جلوہ گر ہے۔ ادیب اور فن کار اُس سے جس طرح متاثر ہوں گے اور جن نئے نئے زاویوں سے اُسے دیکھیں گے آرٹ کی ندی تھامے نہ تھمے گی اور اُسے اسیر کرنے کی کوشش بھی اکارت جائے گی ؎

نالہ پابندِ نے نہیں ہے　　　فریاد کی کوئی لے نہیں ہے

فریاد اگر فریاد ہے تو وہ اثر کئے بغیر نہ رہے گی اور اگر نالہ پابندِ نے ہے تو پھر آپ خود اندازہ لگا لیجئے کہ اُس کا حشر کیا ہوگا؟

(پاکستان ریڈیو لاہور سے نشر ہوا)

آغا بابر

غزل

تری چشمِ ملتفت کا وہ کمالِ ساحرانہ　　　ابھی تک لُٹا رہا ہوں دُرِ اشک کا خزانہ

غمِ مستقل نے بخشا مجھے ضبط کا خزانہ　　　بڑا مہرباں رہا ہے مرے حال پر زمانہ

کبھی سر بسر تغافل کبھی ہر نظر توجہ　　　کوئی کیا سمجھ سکے گا تری طرزِ ساحرانہ

غمِ عشق کے تصدق غمِ عشق کے تصرف　　　مرا ہر نفس کہانی مری ہر نظر فسانہ

یہ اُمنگ آندھیوں کی یہ ہجوم بجلیوں کے　　　کہیں بن رہا ہے شاید سرِ شاخ آشیانہ

مرے دل کی وسعتوں کا کوئی مرتبہ تو دیکھے　　　غمِ دو جہاں کا مرکز غمِ عشق کا نشانہ

مری سجدہ ریزیوں پر کبھی سوچ ہنسنے والے　　　کہیں کھنچ کے آ نہ جائے ترا سنگِ آستانہ

کوئی لمحہ اور رہتیں جو ادھر کسی کی نظریں　　　مری ٹھوکروں میں ہوتی ابھی گردشِ زمانہ

مجھے چھوڑ کر تڑپتا کوئی اُٹھ کے جا رہا ہے
کہیں ختم ہو نہ جائے اسی باب پر فسانہ

عرش بدایونی

ساس اور بہو

اُدھر مُنہ پھیر لو اندھے کہارو
بہن ڈولے سے دولہن کو اُتارو
بلے گا سب کو "حق" چیخیں نہ مارو

میں صدقے جاؤں آنکھوں پر بٹھا لوں
بلائیں لیکے سینہ سے لگا لوں
ذرا ٹھہرو گلوری تو چبا لوں

اسی کمرے میں شمعیں تو جلادو
گھسے آتے ہیں بچّوں کو ہٹادو
"مری گڑیا" کو تکیہ سے بٹھادو

غلاف اس گاؤ پر بوٹے روپلے کا
بُرا لگتا ہے اس مسند پہ "چیکا"
کسے آتا نہیں ہے یاد میکہ

پتیلی ہے، وہ لوٹا پڑا ہے
اری پھوہڑ یہ گھر کا رنگ کیا ہے
بڑی دولہن سے دو جوتے سوا ہے

مری بیزار سے مونی جڑی ہے
زباں گز بھر کی چھاتی پر پڑی ہے
تری خالہ۔ تمہارے مُنہ پر کھڑی ہے

سُنوں کب تک آزادی کا دُکھڑا
دکھاتی پھر زمانے بھر کو مُکھڑا
مرا دل کون دن؟ پردے سے اُکھڑا

نظر افزا سینما اور تھیٹر!!
رسالے، ریڈیو، پھوٹا مقدر!!
تجھے کرنا بھی ہے محمود کا گھر

میں کیا ہوں تمہیں وہ جلادن مری ساس
جو پیچھے بات پہلے ... ستیاناس
کبھی اُترا ہو شاید سر سے خنّاس

مٹھائی، ہار، خوشبو، تیرا شوہر
جو لاتا ہے تو شرماتا ہے گھر بھر
خدا بخشے! اپٹک دیتیں وہ لیکر

کہا کیا؟ اب نہیں ہے وہ زمانہ
تنزل ہے ترقی کا بہانہ
خدایا! ناک اور چوٹی بچانا

شاد عارفی

کتاب خانۂ ارسطو جاہ کی بعض نادر قلمی کتابیں!

عزیز القدر[1]! میں یہ خط دریائے جہلم کے کنارے سے لکھ رہا ہوں۔ ابھی ابھی دریا کو عبور کیا ہے۔ مہر خان محمود میرے ساتھ ہے۔ تقریباً ایک بجے دن کا وقت ہے۔ عون والی گھڑی رات ذرا بند ہو گئی تھی۔ اس لئے ٹھیک وقت نہیں کہہ سکتا۔ ہم نے دریا ابھی ابھی عبور کیا ہے گھاٹ کے نزدیک ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے جس پر ملاحوں کے چھوٹے چھوٹے بچے کھیل رہے ہیں۔ دریا کے بیچ ہم لوگ پہنچے تو مجھے دریائے ستلج کی مشہور گزرگاہ تھاڑا یاد آئی جہاں سے ارسطو جاہ بہادر اور شریف العلما مرحوم حج کے لئے مع ایک بڑے قافلے کے روانہ ہوئے تھے۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں ہمارے مورثِ اعلیٰ میر محمد جعفر خاں اور نواب سید فقیر اللہ خاں شہنشاہ شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے عہد میں فوجدار تھے۔ تلونڈی اور تھاڑا اُن کے ایلاق و قشلاق کا کام دیتے تھے اور اب ۱۵ اگست کے بعد وہ ساری حکایات و روایات ختم ہوئیں۔

اونٹ مع اسباب اپنے نئے مقام کی طرف جا رہے ہیں۔ تھوڑے عرصہ میں سارا قافلہ اسی سمت روانہ ہوگا۔ یہ گاؤں تھل کے صحرا کے بالکل ملحق اور یہاں سے نزدیک ہے۔

دریائے جہلم میں کوئی خاص کیفیت نہیں، نہ وہ شور ہی ہے جو ہمالیہ کی برفانی چوٹیوں سے اترتے وقت دریائے ستلج میں پیدا ہوتا ہے۔ یہ علاقے میدانی ہیں۔ ممکن ہے کہ سکون اسی لئے ہو یا برسات کا موسم شور کے لئے ضروری ہو۔ بالکل اداس سا دریا ہے۔ ہمارے نزدیک ملاحوں نے آگ سلگا رکھی ہے۔ کچھ آدمی اُس کے گرد بیٹھے ہوئے حقہ پی رہے ہیں۔ میں جھونپڑی کے پاس بیٹھا تمھیں پنسل کے ساتھ خط لکھ رہا ہوں۔ چاہتا تھا کہ خط کو ذرا رنگین کرنے کی کوشش کروں۔ لیکن کیا کیا جائے دوپہر کا وقت ہے۔ سورج بادلوں میں چھپا ہوا ہے۔ ہلکے ہلکے برسنے والے بادل آسمان گھیرے ہوئے ہیں۔ بارش ابھی ابھی تھمی ہے۔ زمین بھیگی ہوئی اور گیلی ہے۔ اگر شام ہوتی تو سورج سے اُس کے کئی رنگ مستعار لیتا۔ دریائے جہلم کی رنگین شام کے متعلق ایک خاصہ مقالہ لکھ دیتا۔ لیکن گو مگو مشکل دگرنہ گو مگو مشکل والا معاملہ ہے۔

جھونپڑی میں دس پندرہ بھیڑیں ہیں۔ اُن کے صاف ستھرے بچے ادھر اُدھر کھیل رہے ہیں۔ یہ "لیلے" مجھے ٹامس ہارڈی کے اُس ناول کی یاد دلا رہے ہیں جو کہ اُس نے دور کسی سکاٹ لینڈ کے جنگل کے کنارے پر لکھنا شروع کیا تھا۔ جس کا عنوان ہے فار فرام دی میڈنگ کراوڈ

اس سے زیادہ قدیم وضع کی جھونپڑی کبھی نہیں دیکھی۔ بالکل کسی افریقیائی جھونپڑی کے مشابہ ہے۔ جس کی تصویر ہم نے اُس کتاب میں دیکھی تھی جو ایک ہندوستانی سیاح نے ہمیں دارالسلام سے بطور تحفہ بھیجی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کپاس کے بڑے بڑے ڈنٹھل باندھ کر رکھ دیئے گئے ہیں۔ اس گزرگاہ کے ملاح یہاں قیام پذیر ہیں گویا اُن کا یہ سرکاری مکان ہے۔ مناظر کچھ پھیکے پھیکے ہیں۔ اگر مجھے ایک ماہ سے زیادہ ٹھہرنا ہوا تو ممکن ہے کہ دریائے چناب اور دریائے جہلم کی گزرگاہوں کے کچھ حالات اور ان کی دو چار شاموں کی رومانی کیفیات تحریر کر سکوں۔ عموماً غروب ہوتے ہوئے سورج کی آخری الوداعی کیفیت زیادہ جاذبِ نظر ہوتی ہے اور اکثر لوگ اس سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں۔

سردی کچھ زیادہ ہے۔ ہمارے ساتھ ایک پرانے نابینا بازدار کا لڑکا بھی آیا ہے۔ بازدار مذکور رات بھر مجھے قصے اور حکایات سناتا رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں اگر اس فن میں کوشش کرتا تو اچھا خاصہ بازدار بن جاتا۔ اس بازدار نے مجھے سیاہ چشم و گلال چشم جانوروں کے قصے سنائے۔ اور پہرہ بنانے، طعمہ دینے کے متعلق بہت سی باتیں سنائیں۔ ہر ایک جانور کی علیحدہ علیحدہ صید کے تذکرے کئے۔ اُن کے اقسام چرز، یوزم، عقابی

---

[1] یہ خط مصنف نے اپنے بیٹے کے نام لکھا ہے۔ (ایڈیٹر)

تری ناک، جانوروں کے حالات، ان کے پرزور بطا قتور، بُزدل اور پر جگر کرنے کے طریقے بیان کئے۔ غرضیکہ میں ایک رات کے لئے آج سے تیس برس پیشتر کے ماحول میں تھا۔

میں نے اس بازدار کی حکایات سے خوب لُطف اُٹھایا۔ پرانے زمانے کو یاد کرتا رہا۔ غالب کا نسخہ حمیدیہ میرے پاس ہے۔ اتفاقاً کتاب کھل گئی تو یہ شعر نکلا ؎

ہوں ز خود رفتۂ بیدائے خیال بھول جانا ہے۔ نشانی میری

بیدائے خیال بھی کیا خوب ترکیب ہے۔

آگ بڑے زور سے جل رہی ہے۔ اگر ٹیگور اس منظر کو دیکھتا تو کسی دریا کے کنارے پر یا دریائے گنگا کی وادیوں میں کسی نوجوان ہندو بیوہ کی لاش کے اونچے سُرخ شعلوں سے اس آگ کو تشبیہ دیتا یا شاید کہہ دیتا کہ یہ آگ چودھویں رات کے چاند کے مشابہ ہے۔ جب کہ پورا چاند مہیب اور سیاہ پہاڑوں کے پیچھے سے برآمد ہو رہا ہو اور شاعر اُسے جھیل کے کنارے سے دیکھے جبکہ جھیل بالکل خاموش ہو۔ کنول کے سفید پھول جھیل کی سطح پر آہستہ آہستہ بہ رہے ہوں اور رات کے پرندے جھیل کی مرمریں اور شفاف لہروں پر کبھی کبھی آگرتے ہوں۔

ہم نے اپنے سفر کو جاری رکھا اور گاؤں میں آپہنچے۔ دوپہر کو آرام کیا، شام ان ٹیلوں کو دیکھنے گیا جن کے سلسلے ڈیرہ جات میانوالی اور سرگودہا تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ان ٹیلوں کے دیکھنے کے بعد واقعی قرآن مجید کے ان الفاظ کی تفسیر معلوم ہوئی جو کہ ہمارے پیش نظر نواں شہر ضلع جالندھر میں پاکستان میں بڑے بڑے لق و دق جنگل اور عظیم الشان وسائل موجود ہیں اور اُس خدا کا ہزار ہزار شکر ہے جو ہمیں اُن ہیبت ناک مصائب سے نکال کر یہاں لے آیا۔ کوہ شوالک کے وہ سلسلے جو ہمالیہ کی ملحقہ وادیوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جیسا کہ اونہ، گڑھ شنکر اور روپڑ وغیرہ میں۔ یہ ٹیلے بالکل اسی طرح ہیں۔ یا یوں سمجھو کہ فیروز پور جھرکا کے جھر میں ہم چلے جا رہے ہیں۔ جس جگہ چشمے پر بیٹھ کر ہم نے کھانا کھایا تھا اور میر صاحب نے مچھلیاں پکڑی تھیں، وہاں سے دائیں طرف کو جو اونچا پہاڑ ہے۔ اُسی طرح کے سر بفلک ٹیلے اس ریگستان میں موجود ہیں۔ جھاڑیاں چاروں طرف نظر آرہی ہیں اور دُور دُور تک دریائے جہلم کے کنارے سامنے کھلے ہوئے ہیں۔ لہروں کا سماں قابل دید ہے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے قلمی شاہنامے کی سب مُو قلم تصویریں ایک جگہ پھیلا دی گئی ہیں۔ بالکل نیچے ایک کھجوروں کا نخلستان ہے۔ کئی کھیت ایک کنوئیں سے سیراب ہو رہے ہیں۔ چاروں طرف سے کھجوروں کے جھنڈ اسے گھیرے ہوئے ہیں۔ سیر ین کے وہ مناظر یاد آرہے ہیں جو کہ دریائے دجلہ و فرات کے نخلستانوں کے مشابہ ہیں۔ تمہیں یاد ہوگا کہ تمہارے ایک دوست نے ہمیں مصر سے بغداد کے مناظر کی بعض تصویریں بھیجی تھیں۔

آج یہاں ایک میلہ ہو رہا ہے۔ سب سے اونچے ٹیلے پر ایک پیر کا مزار ہے، اس لئے آج کبڈی وغیرہ کے کھیل پیر مذکور کی عزت افزائی کے لئے کئے جا رہے ہیں ـــ نوجوان کشتی اور کبڈی وغیرہ کے دیکھنے میں مصروف ہیں۔ مجھے پرسی بی شیلے کی وہ نظم یاد آئی ہے، جس کا عنوان ہے "ایک ماہی گیر لڑکا" میں نے اس کا ترجمہ بھی کیا تھا لیکن وہ بھی اپنے ساتھ نہیں لاسکا۔

میں حیران کھڑا ہوا اپنے ماضی کو یاد کر رہا ہوں۔ ایک وہ زمانہ تھا جبکہ عمِ مرحوم کے ہمراہ شام کو سیر کے لئے جگراؤں سے جانب شرقی نہر سرہند کے غربی کنارے پر جایا کرتے تھے۔ سیر میں بھائی صاحب قبلہ، سید آغا حسن شہید، اور میں ہمراہ ہوتے تھے۔ عم مرحوم علمی نکات اور کتاب خانہ کی بعض نادر کتب کا ذکر فرمایا کرتے تھے۔ جناب شریف العلما اور رار سطوجاہ بہادر مرحوم کی روایات کا تذکرہ ہوتا۔ ایرانی مہمانوں کی آمد پر جو اہتمام کیا جاتا تھا اُس کا ذکر فرماتے تھے۔ غرضیکہ سیکڑوں علمی مطالب و مباحث درمیان میں آتے تھے۔ سفر عراق و ایران کے حالات بیان فرماتے تھے۔ مشہد مقدس سے کربلا معلی تک جو مناظر راستے میں آتے تھے، جن جن ایرانی ہوٹلوں اور آرامگاہوں میں قیام فرمایا تھا اُس کے حالات اکثر بیان فرماتے تھے۔ اُسی دن سے

یے ہر جند۔قزوین وغیرہ مقامات سے ایک خاص اُنس ہے۔ اللہ اللہ! وہ بھی کیا زمانہ تھا۔ مشہور انگریزی شاعر کولرج نے جنگ کے متعلق اپنی ایک
ظم میں کچھ اظہار خیال کیا ہے۔ جس کا آزاد ترجمہ لکھتا ہوں، کہتا ہے۔

"جنگ ایک خوفناک اور بھیانک بربریت ہے جسے جُرم کی کوئی پروا نہیں۔ بلکہ باپ سے بچّوں کو چھین لیتی ہے اور اُن کو
تباہ و برباد کر دیتی ہے۔ اُن کے والدین کو قتل و غارت کرتی ہے۔ خدا کی بسائی ہوئی خوبصورت دُنیا کو لُوٹ لیتی ہے۔ رات کے
تمام آرام و چین کو ملیامیٹ کرتی ہے اور دن کی آسائشوں کو مصیبتوں سے بدل دیتی ہے۔"

اسی طرح جنگ نے ہمارے ساتھ کیا۔ مگر افسوس یہ ہے کہ جنگ بالکل یک طرفہ تھی اور ہم بالکل غیر مسلح کر دیئے گئے تھے۔ بخیر وہ زمانہ بھی
گزر گیا۔ اور بقول تمہارے اسی خدا کی مہربانی ہر وقت چاہیئے جس کو ہم خطرے میں خوب جانتے تھے اور انسانیت اور شرافت اسی میں ہے کہ آئندہ
بھی جبکہ خطرہ نہیں رہا ہم اُس خدا کو نہ بھولیں۔

یہاں سے کچھ غیر مسلسل خیالات شروع ہوتے ہیں۔ جن کا ذکر کر دینا میں مناسب جانتا ہوں۔ ممکن ہے کہ وہ ہماری گزشتہ روایات کے حامل ہو سکیں
مشہور امریکن تنقید نگار ایمرسن ایک جگہ لکھتا ہے کہ "دوست دراصل وہی لوگ ہیں جن کے سامنے آپ بلند آواز میں سوچ سکیں"۔ اس لئے آج میں چاہتا
ہوں کہ قدرے بلند آواز میں اظہار خیال کروں۔

کچھ اپنے شوق، کچھ دُکھ درد کے قصے، کچھ پرانی یادیں بعض بچپن کی ... پرانی قلمی کتابیں، اور چند نادر تصاویر یاد آ رہی ہیں۔ یہی غیر مربوط خیالات
اس خط کے لکھنے کا باعث ہو رہے ہیں۔ مجھے یقین واثق ہے کہ تم اِن جذبات کی روح کو بھی پڑھ سکو گے۔ ایک زمانہ تھا کہ تمہارے پڑدادا جناب شریف العلما
مولوی سید شریف حسین اعلی اللہ مقامہٗ زندہ تھے۔ اپنی کوٹھی واقع جگراؤں میں ان کا قیام رہتا تھا۔ دوپہر اور رات کے کھانے کے لئے گھر تشریف
لے جایا کرتے تھے۔ چائے دونوں وقت کوٹھی میں تیار ہوتی تھی۔ شکر اس زمانے میں تھیلیوں میں بند ہو کر لدھیانہ سے آیا کرتی تھی۔ روسی اور چینی چائے
کے ظروف اور روسی سماوار لاہور اور پشاور سے طلب فرمایا کرتے تھے۔ ۱۸۷۲ء میں حیدر آباد دکن اور نجف اشرف سے واپس تشریف لا کر ان کے معمولات
اسی طرح نہایت پابندیٔ اوقات سے سرانجام پاتے تھے۔ نواب مختار الملک بہادر سر سالار جنگ اوّل چونکہ جدّ امجد جناب ارسطو جاہ بہادر مرحوم
کے خاص دوست تھے اُن کی طلب پر حیدر آباد دکن میں تشریف لے گئے تھے۔ جیسا کہ میں نے اپنے ایک مضمون "میر انیس کا سفر دکن" میں اس کا تذکرہ
کیا ہے۔ وہاں سے واپس تشریف لا کر اسی طرح پابندیٔ اوقات سے عمر بسر کی۔ کبھی کبھی اپنے پروگرام میں ترمیم بھی فرمایا کرتے تھے۔ مثلاً کسی معزز
مہمان کی آمد پر اپنی رہائش گاہ کے کچھ حصے خالی فرما دیا کرتے تھے۔ حضرت ارسطو جاہ بہادر کا بھی یہی قاعدہ تھا۔ سید جمال الدین افغانی جگراؤں میں
تشریف لائے تو کتاب خانے کے پاس اُن کو ارسطو جاہ نے نہایت عزت و احترام کے ساتھ مہمان رکھا اور گھنٹوں کوٹھی کے بڑے ہال میں ایران
افغانستان اور رُوس کے پولیٹیکل معاملات کے متعلق آپس میں باتیں کرتے رہے۔

ارسطو جاہ بہادر کو علوم ریاضی اور علم ہیئت کا بے حد شوق تھا۔ سر چارلس ٹریولین پرنسپل دہلی کالج کی فرمائش پر بعض علم ہیئت کی انگریزی
کتب کا ترجمہ اُردو میں کیا تھا۔ ممکن ہے کہ وہ تراجم کلکتے کے مدرسے سے کبھی شائع کئے گئے ہوں۔ میں نے اس کا ایک مسوّدہ اپنے کتاب خانے میں
دیکھا تھا۔ ارسطو جاہ بہادر کچھ عرصہ کے لئے دہلی کالج میں علوم ریاضی کے استاد مقرر ہوئے تھے۔ لیکن مولوی رشید الدین خاں معلم اوّل کے استعفے
دینے پر مستعفی ہو گئے تھے۔ مولانا مرحوم نے جمعے کی تعطیل نہ کرنے کے باعث استعفیٰ دیا تھا۔ سر چارلس ٹریولین کی یہ خواہش تھی کہ ارسطو جاہ کو معلم
اوّل مقرر کرے لیکن انھوں نے انکار فرما دیا۔ اور مولانا رشید الدین خاں کی معیت میں گوالیار، ہوشنگ آباد اور بھوپال تشریف لے گئے۔ میرے
پاس اُس وقت کی ایک بیاض موجود تھی، افسوس ہے کہ اس حادثۂ عظیمہ میں ہم وہ بھی کھو آئے۔ میاں فوجدار محمد خاں، میاں کریم محمد خاں اور نواب
سکندر بیگم صاحبہ نے ان ہر دو اصحاب کو اپنی علمی مجالس اور پولیٹیکل معاملات میں اپنا شریک کار رکھا، اُنہی ایام میں امیر لاہوری مشہور

شاعر اور رتاں نواب سکندر بیگم صاحبہ کے پاس موجود تھے۔ میری بیاض میں امیر لاہوری کے ہاتھ کی لکھی ہوئی بعض غزلیں موجود تھیں۔ ایک شعر مجھے اب تک یاد ہے ؂

شب چاندنی تھی، مے تھی، اگر کسی تھی چنی ہوئی ۔۔۔ پر اس پہ تم جو آئے خوشی چوگنی ہوئی

غالب نے اپنا مشہور قلمی کلیات اردو میاں فوجدار محمد خاں کی خدمت میں بھیجا تھا۔ جو کہ حال ہی میں نواب صاحب بھوپال نے نسخۂ حمیدیہ کے نام سے شائع کیا ہے۔ اسی زمانے میں بھوپال کے خاندان سے نواب ایاز محمد خاں ارسطو جاہ بہادر کے شاگرد تھے۔ نہیں کہہ سکتا کہ ان کی اولاد میں اس وقت کون برسر اقتدار ہے۔ کتاب خانے کی بعض کتب اکبر اعظم۔ شہنشاہ جہانگیر۔ بیرم خان خانخاناں۔ عبدالرحیم خاں اور شاہ عالم ثانی نے وقتاً فوقتاً ہمارے مورث اعلیٰ کو تحفہ میں دی تھیں اور بعض کتابیں علامہ فیضی کی سرکار سے سید محمود کو ملی تھیں۔ اُن میں سے چند کتب علوم ریاضی اور علم ہیئت سے تعلق رکھتی تھیں۔

اب میں اپنی بعض کتب کا مختصراً ذکر کرتا ہوں۔

اوّل:۔ الصّور عبدالرحمٰن صوفی اندلسی کی مشہور تصنیف ہے۔ مغل آرٹ کی ۲۷ تصاویر اس میں موجود ہیں۔ وہ تصاویر ڈاکٹر فابری کیوریٹر وکٹوریہ میوزیم لاہور نے ملاحظہ کی تھیں۔ چونکہ عجائب گھر کی پرانی قلمی تصاویر میں مغل آرٹ کا فقدان ہے۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب موصوف وہ کتاب عاریتاً عجائب گھر میں رکھنے کے لئے مانگتے تھے۔ یہ کتاب شاہان مغل کے کتاب خانوں میں رہ چکی ہے اور نہایت نایاب چیز ہے۔ تمہارے جدّ امجد ۱۸۷۲ء میں حیدر آباد دکن تشریف فرما تھے تو جناب عزیز لکھنوی کے دادا حکیم مرزا محمد علی مرحوم بھی وہاں موجود تھے۔ مرزائے موصوف جناب ارسطو جاہ بہادر کے دوست تھے۔ الصّور کا یہ مشہور نسخہ اُس وقت جگراؤں میں تھا۔ شریف العلما نے جناب میرزا کی فرمائش پر حیدر آباد طلب فرمایا تھا کیونکہ حیدر آباد کے بعض علما کو اُس کے دیکھنے کا بے حد شوق تھا۔ ایسا نایاب نسخہ حیدر آباد کے کسی کتاب خانے میں موجود نہیں تھا۔ یہ اندلسی ہیئت دان سواد مغرب میں از بس مشہور ہے۔ اُس نے پیشین گوئی کی تھی کہ اڑھائی سو برس بعد آسمان کے ایک برج میں کچھ نیو بلا قسم کے ستارے روشن ہو جائیں گے اس پیشین گوئی کا ذکر موجودہ امریکن ہیئت دانوں نے بھی کیا ہے۔ یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی اور ٹھیک اسی زمانے میں وہ سیاہ اور تاریک ستارے اُن سیاہ موتیوں کی طرح چمکنے لگے جو کہ عزیٰ اور ہبل کی آنکھوں میں جڑے ہوئے تھے جن پر کفار عرب کو بڑا ناز تھا۔

۲۔ دوسری کتاب اسی مصنف کی اسطرلاب کے علم میں ہے۔ اسطرلاب یونانی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنی ہیں ستاروں کے راستوں کی بلندیوں اور فاصلوں کی پیمائش کا علم۔ یہ کتاب اکبر اعظم کی پیدائش کے وقت شہنشاہ ہمایوں کے قبضے میں تھی اور جب اس نیک دل شہنشاہ نے اپنی مشہور رصدگاہ دہلی میں قائم کی تھی تو اسی کتاب سے استفادہ کیا تھا۔ اس پر احمد آباد گجرات کے کتاب خانے کی مہر ثبت ہے۔ اکبر اعظم کے مشہور لائبریرین علی مراد کی تحویل میں رہ چکی ہے۔ عبدالرحیم خان خاناں اور شہنشاہ جہانگیر کی مواہیر بھی موجود ہیں ۱۰۰۹ھ میں علی مراد موصوف کے قلم سے مواہیر محولہ بالا کے نیچے یہ عبارت درج ہے۔ "داخل کتاب خانۂ خاصہ شد" اس میں نقوش اور چارٹ نہایت مکمل بنے ہوئے ہیں۔ جن سے زیچ وغیرہ بنانے میں امداد ملتی ہے۔ اور ستاروں کی پیمائش کی جاتی ہے۔ یہ کتاب بھی شہنشاہ جہانگیر نے تحفے میں دی تھی۔

۳۔ علاوہ ازیں مُلّا محمد باقر داماد فخر الیشیا اعلی اللہ مقامہٗ کی مشہور تصانیف قبسات اور اُفق المبین جو کہ علامہ ممدوح کی مواہیر سے مزیّن ہیں۔ ہمارے پاس موجود ہیں۔ یہ مشہور ریاضی دان اپنے زمانے میں فرد وحید تھا اور تقدس اور پرہیزگاری میں بھی یگانۂ آفاق تھا۔ انگلیوں کے جلانے کا قصہ تم نے متعدد بار پڑھا ہوگا۔ غالباً بیباک ہاہلی نے بھی اس کو نظم کیا ہے۔ ان کی تصنیف اسلامی ریاضیات میں میرے پاس موجود ہے۔ جس کے متعلق میرے ایک ریاضی دان دوست نے مجھے بتایا تھا کہ اس کے دوائر کو اور اقلیدس کی شکلوں کو سمجھنے کی قابلیت علوم ریاضیات کے کسی ایم۔ اے کو نہیں ہے۔ صرف کیمبرج یونیورسٹی کے رنگلر اسے سمجھ سکیں گے۔ مجھے علم نہیں کہ پاکستان میں اس وقت کون سے ایسے اصحاب ہیں۔ ڈاکٹر

عمر حیات پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور سے میں نے ایک دفعہ ذکر کیا تھا۔ اگر اُن سے ملنے کا اتفاق ہو تو وہ کتا آنھیں ضرور دکھانا۔ اس کتاب کو سر شاہ سلیمان فیڈرل کورٹ کے جج کسی زمانے میں دیکھنا چاہتے تھے اور میرے پاس فیروز پور جھرکا ضلع گوڑگانواں میں آنے کے لئے تیار تھے۔ لیکن کتاب اس وقت جگراؤں میں تھی اس لئے مرحوم اس کتاب کو نہ دیکھ سکے۔ میرے دوست ڈاکٹر رضی الدین صدیقی نے جو کہ دورانِ جنگ میں علومِ ریاضیات میں نوبل پرائز کے لئے نامزد کئے گئے تھے۔ کوڈاکنال سے تحریر فرمایا تھا کہ اگر سر شاہ محمد سلیمان کا اچانک اور بے وقت انتقال نہ ہوتا تو انھوں نے اکثر اسلامی علوم کی اور خصوصاً علوم ریاضی کی کتب شائع کرنے کا التزام کیا ہوا تھا۔

۴۔ اِسی طرح عجائب المخلوقات کا ایک نسخہ ہمارے پاس موجود ہے جو کہ ہمارے مورثِ اعلیٰ میر محمد جعفر خاں کو شاہ جہاں نے سولہ برس کی عمر میں عنایت فرمایا تھا۔ جب کہ انھوں نے ایک پہاڑی راجہ کو گرفتار کر کے شہنشاہ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ غالباً یہ راجہ بلاسپور کا مورثِ اعلیٰ تھا۔ اس راجہ کی جان بخشی بھی بحکم شاہ جہاں موصوف نے کردی تھی اور دوبارہ ریاست میں جاکر اُسے متمکن بہ ریاست بھی کیا تھا۔ اس راجہ نے نواب جعفر خاں کے دہلی واپس آنے سے بیشتر کچھ تحائف پیش کئے تھے۔ اُن میں سے اُنھوں نے صرف ایک ایرانی تلوار پسند فرمائی تھی۔ جس سے راجہ مذکور کی بدولت کے اہرن کو کاٹا تھا۔

۵۔ ایک نسخہ آئینِ اکبری بڑا ہی بیش قیمت موجود ہے۔ یہ کتاب ابوالفضل کی زندگی میں لکھی گئی تھی۔ ممکن ہے علامہ ممدوح نے خود بھی دورانِ کتابت اس اُسے ملاحظہ کیا ہو۔ افسوس ہے کہ اُس کا صفحۂ اوّل غائب ہے۔ نہیں معلوم کس طرح ضائع ہوا۔ چونکہ باتصویر اور منقش تھا اس لئے غالباً کسی نے نکال لیا۔ کاغذ کی نوعیت سے صاف پتہ چلتا ہے کہ حلب یا بیروت کا بنا ہوا ہے۔ کاغذ خاص طور سے بیروت سے شہنشاہ اکبر کے خوشنویس کاتبوں اور مصوّروں کے استعمال کے لئے منگوایا جاتا تھا۔

۶۔ مولانا عبدالرزاق لاہجی کی مشہور تصنیف گوہرِ مراد چار سو برس کی لکھی ہوئی موجود ہے۔ اس کا خط اور کاغذ ایرانی ہیں۔ ڈاکٹر براؤن نے اپنی کتاب تاریخ ادبِ ایران میں کسی جگہ گوہرِ مراد کے پُرانے نسخوں کا ذکر کیا ہے اور رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی فہرست میں اس نسخہ کا ذکر ہے۔

۷۔ ایک رسالہ مابعد الطبیعات میں موجود ہے۔ جس پر شہنشاہ جہانگیر کے لائبریرین قلیچ کی مہر ثبت ہے۔ اس کے متعلق علامہ اقبال مرحوم نے ہمارے دادا مرحوم کو ایک خط کے دوران میں لکھا تھا کہ "افسوس! جگراؤں آنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا ورنہ آپ کے کتاب خانے کے نوادر دیکھ کر مجھے دلی مسرت ہوتی۔"

۸۔ مرزا غالب کی مشہور تاریخ کا وہ مسودہ جو انھوں نے ۱۸۵۲ء میں ارسطو جاہ بہادر مرحوم کی خدمت میں ارسال کیا تھا جس کا ذکر مسٹر اکرام آئی سی ایس نے اپنی کتاب غالب نامہ میں کیا ہے۔

۹۔ کتاب عوارف المعارف ہمارے پڑنانا شیخ شہاب الدین سہروردی کی تصنیف ہے اور مجدد الف ثانی کے بڑے بیٹے شیخ محمد صادق

---

[1] کتب خانہ ارسطو جاہی لارڈ کرزن کے مشہور کتاب خانہ ہائے مشرق میں درج ہے۔ یہ کتاب خانہ بھی مشرقی پنجاب کے خونی واقعات کے دوران میں غارت ہو گیا اور وہی حشر ہوا جو عموماً پرانے کتاب خانوں کا ہوا کرتا ہے۔ لارڈ ہارڈنگ نے اس کتاب خانے کا ملاحظہ سکھوں کی لڑائیوں کے دوران میں ۱۸۴۶ء میں کیا تھا۔ حضرت غالب مرحوم نے اپنے ایک قطعہ میں اُن لڑائیوں کا ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

دشتے کہ بر کنارۂ دریائے ستلج است   گردید جلوہ گاہِ دو سدِّ سکندری

لارڈ موصوف نے ایک رات ہمارے یہاں بسر کی تھی۔ جناب ارسطو جاہ بہادر سے سر ہنری لارنس سر جان لارنس اور سر ولیم میکیسن کے متعلق مشورہ کیا تھا ارسطو جاہ بہادر نے سر ہنری لارنس کے ریذیڈنٹ پنجاب مقرر کرنے کیلئے صلاح دی تھی۔ ایڈورڈ ہنری یا سر ہنری لارنس اور سر جارج کلارک نے اس کتاب خانے کی بعض قلمی کتب سے استفادہ کیا تھا۔

سرہندی نے اُسے ۱۰۲۴ھ/۱۶۱۵ء میں بہ عہدِ جہانگیر بادشاہ کتابت کیا ہے۔ یہ کتاب خط نوریں قلم میں ہے۔ خط نہایت پختہ ہے۔ میں نے اس نسخے کے متعلق دیرہ ہوئی ایک مضمون اخبار "انقلاب" لاہور میں لکھا تھا۔

۱۰۔ شاہنامہ فردوسی۔ یہ شاہنامہ شہزادہ دارا شکوہ کے لیئے لکھا گیا تھا۔ نہایت درجہ خوش قلم ہے اعلیٰ قسم کا کاغذ لگایا گیا ہے۔ تصاویر کے لیئے بھی وہی کاغذ استعمال کیا گیا ہے جو کتابت کے لیئے۔ جدول سنہری اور منقش۔ کام اپنی آپ نظیر ہے۔ تقریباً بارہ سو سنہری صفحات پر یہ کتابت کا شاہکار ختم ہوا ہے۔ ۔۔ ۵۰ کے قریب بڑے بڑے سائز کی قلمی تصاویر ہیں جو کہ ایرانی آرٹ کا نہایت نفیس نمونہ ہے۔ یہ کتاب نہایت درجہ کمیاب اور بیش قیمت ہے اور واقعی نفیس ترین آرٹ اس کی تیاری میں صرف ہوا ہے۔ محمود کی ہجو کے مکمل اشعار دیباچے میں موجود ہیں۔ فردوسیؒ کے روضے اور قبر کی اندرونی تصاویر سے بھی اسے مزیّن کیا گیا ہے۔

۱۱۔ ایک مختلف قطعات کا البم بھی ہمارے پاس موجود ہے۔ یہ قطعات مختلف اوقات میں شاہانِ مغلیہ کے خوشنویس کاتبوں نے تحریر کیئے ہیں اور بوقلموں اور رنگارنگ جدولوں سے اُسے آراستہ کیا گیا ہے۔ محمد حسین کشمیری۔ میر علی کاتب۔ محمد ہاشم عنبریں قلم۔ شیریں رقم کاتبوں نے اس مجموعے میں جابجا کتابت کی ہے۔ یہ بھی آرٹ کا بہترین نمونہ ہے۔ حافظ محمود شیرانی مرحوم اس مجموعے کو دیکھنے کے لیئے جگراؤں کئی دفعہ تشریف لائے تھے۔ بعض قطعات میں پھولوں کے قدرتی رنگ اس وقت تک محفوظ ہیں۔ حالانکہ سیکڑوں برس گزر چکے ہیں۔ مغل رنگ سازوں کا یہ طرۂ امتیاز تھا کہ اُن کے رنگوں میں اب بھی وہی کیفیت ہے جو اُن کی مشہور عمارتوں میں پائی جاتی ہے۔ تم تاج محل کو چاندنی رات میں دیکھ لو یا مغل زمانے کے باریک نقش و نگار والی تصاویر کو دیکھو طرزِ نگارش اور محرابوں کی بناوٹ یکساں ہوگی۔ اب رخصت چاہتا ہوں بقول غالب علیہ الرحمہ ؎

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں | ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

سید آغا حسین

تجزیہ

میں نے دیکھا تھا دمکتے ہوئے رخساروں پر | حسرت آلود ضیا بار ستاروں کا ہجوم
نظر آئی تھی مجھے شوخ نگاہوں میں ہنسی | مگر اس طرح کہ جیسے کوئی کمسن مظلوم
حرم و دیر میں اربابِ وفا کو میں نے | واقعہ یہ ہے کہ ہوتے ہوئے دیکھا بدنام
جانتا ہوں کہ غریبی کی سیہ راتوں میں | بارہا حُسن ہوا اہلِ ہوس میں نیلام

میں نے دیکھا نہ تھا انساں کو درندہ ہوتے

میں نے دیکھا نہ تھا یہ قتل، یہ خونیں منظر | یہ چمکتی ہوئی تلوار یہ طوفانِ ستم،
میں نے دیکھا نہ تھا اس سطحِ زمیں پر اب تک | حکمرانی کا نیا ڈھونگ بعنوانِ ستم،
میں نے دیکھا نہ تھا انساں کے تمدّن کا زوال | اُس زمیں پر جسے تہذیب کا مرکز کہیئے
میں نے دیکھا ہے! اُبھرتے ہوئے شیطانوں کو | آہ اس دَور میں اخلاق کا ماتم کہیئے

ایسے انساں سے تو حیوان بہت اچھے ہیں

ناظر الحسینی

خیر مقدم

صبح کے ہوتے ہی ظلمت کا فسوں ٹوٹ گیا
چار سو پھیل گئے نور و ضیا کے سلسلے

نیلگوں جھیل سے زر کار سفینے میں سوار
دیکھتے دیکھتے شہزادۂ خاور ابھرا

اب دھندلکے کا زمانے میں نشاں کوئی نہیں
اب اجالا ہی اجالا ہے جدھر آنکھ اٹھائیں

جیسے ماحول پہ مطرب کے رسیلے نغمے
میٹھے سپنوں کا حسیں جال سا بن دیتے ہیں

اور اس نور کے طوفان کے پیچھے پیچھے
ابھی کچھ دیر میں وہ آج یہاں آئے گی

وہ مگر آج سے پہلے کہیں آئی ہی نہیں
اور راہوں کے خم و پیچ سے ناواقف ہے

سوچتا ہوں کہ بھٹک جائے نہ وہ رستے سے
کیوں نہ کچھ کوس پہ جا کر میں اسے لے آؤں؟

اختر ہوشیار پوری

غزل

وہ روبرو ہیں نظامِ حواس برہم ہے
نہ اب دماغِ مسرت نہ فرصتِ غم ہے

چمن میں بادۂ گلگوں کا دور پیہم ہے
مری نگاہ میں ہر پھول ساغرِ جم ہے

فضائے دہر میں دونوں کا ایک عالم ہے
فلک پہ مہر ہے لرزاں زمیں پہ شبنم ہے

الٰہی خیر! یہ کیا آج ان کا عالم ہے
لبوں پہ موجِ تبسم نگاہ برہم ہے

پکارتا ہے سرِ راہ کوئی دیدہ و دل
یہ کس کے مژدۂ آمد کا خیر مقدم ہے

جفا شعار سہی مہرباں نہیں نہ سہی
کسی کی اک نگہِ التفات کیا کم ہے

خوشا نصیب کہ تنہا نہیں میں شامِ فراق
کسی کی یاد ہے اور اضطرابِ پیہم ہے

تجھے خدا کی قسم اے نگاہِ بے پروا
ترے بغیر نظامِ حیات برہم ہے

وہ "ہند" کہتے تھے سب جس کو جنتِ دنیا
حباب! آج وہی سرزمیں جہنم ہے

حباب ترمذی

خواہ مخواہ!

ایک ایکٹ کا ڈراما

افراد

رازی - ثریا - احسان - زیب - وقت سہ پہر

[ایک خوبصورت لیکن مختصر کمرہ - داہنی طرف مغربی دیوار میں ایک دروازہ ہے جو اندر کو کھلتا ہے - دوسری جانب ایک دروازہ ہے جو باہر کی جانب کھلتا ہے - باہر کھلنے والے دروازے سے ملحقہ ایک کھڑکی ہے - دروازے بند ہیں لیکن کھڑکی کھلی ہوئی ہے - ریشمی پردہ بھی الگ ہے - دروازوں پر بھی ریشمی پردے پڑے ہوئے ہیں - پردہ اٹھنے پر کمرے کے وسط میں رازی اور ثریا ایک صوفے پر بیٹھی مصروفِ گفتگو نظر آتی ہیں]

رازی - مجھے معلوم ہے، اس وقت میں خود اسی سوچ میں ہوں! انھوں نے مجھ سے تو اس کا ذکر نہیں کیا ہے - لیکن میں جانتی ہوں... ثریا! وہ کھڑکی بند کر دو - لوگ آ جا رہے ہیں - (ثریا دروازہ بند کر کے واپس اپنی جگہ پر بیٹھ جاتی ہے)

ثریا - لیکن آپا یہ تو ٹھیک بات نہیں - پھر تمھارا کیا بنے گا؟ یوں چپکے بیٹھے حالات سے صلح کر لینا تو عقلمندی نہیں؟

رازی - تم چاہتی ہو کہ میں کمینہ عورتوں کی طرح اُن سے لڑوں جھگڑوں دنیا بھر کے ہنگامے اٹھاؤں؟ پھر اس سے کچھ بنتا بھی تو نظر نہیں آتا - وہ دوسری شادی کر رہے ہیں - اُن کے نزدیک ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ میں بانجھ ہوں - اُن کے بعد اُن کا نام لینے والا کوئی نہ ہوگا - انھیں اولاد کی ضرورت ہے جو میں پوری نہیں کر سکتی - سوت کی مخالفت کر کے ذلیل ہونا نہیں چاہتی -

ثریا - تو مطلب یہ ہوا کہ تم خود چاہتی ہو؟

رازی - سچ پوچھو تو بہن میں بھی یہی چاہتی ہوں - گھر میں بال بچے ہوں گے - کچھ چہل پہل ہو جائے گی - آئندہ زندگی میں انھیں کچھ سہارا بھی تو چاہیئے، میں اس لائق نہیں ہوں، اچھا وہ فیروزہ کو بیاہ لائیں - ویسے انھیں فیروزہ ہے بھی بہت پسند --- ثریا! تمھیں معلوم نہیں - انھوں نے تو انتہائی کوشش کی تھی کہ فیروزہ ہی سے ان کی شادی ہو - پہلے ہی سے محبت تھی ان دونوں میں، ان کی یہ دیرینہ خواہش بھی پوری ہو جائے گی - والدین کے ہوتے جو مجبوری تھی، وہ اب نہیں رہی - اب کون بولنے ---،

ثریا - (بات کاٹتے ہوئے) ہاں اب کون بولنے والا ہے --- بیگم تو خود ہی سوکن کے استقبال کو چشم براہ ہیں -

(رازی ہنستی ہے)

رازی - تمھیں معلوم نہیں ان کا سلوک میرے ساتھ اس قدر اچھا ہے کہ میں نہیں چاہتی کہ اُن کی خوشی میں روک بنوں - ثریا میری سب سے بڑی خوشی یہی ہے کہ وہ خوش رہیں -

ثریا - آپا میں چھوٹی ہوں - تمھارے سامنے میرے تجربات وشاہدات محدود ہیں - لیکن میں اتنا ضرور جانتی ہوں - تم جس گمان میں ہو، تمھیں ایک ایک قہقہے، ایک ایک مسکراہٹ کے بدلے سو سو آنسو نہ بہانے پڑے تو میرا نام - سوت کی ڈاہ سے "مٹی" بھی سیاہ ہو جاتی ہے آپا! تمھیں سابقہ نہیں پڑا ہے جب پڑے گا تب اسی طرح ہنس ہنس کر باتیں کرنا -

رازی - (ہنستی ہے جیسے کوئی بات ہی نہیں) اچھا تمھیں سابقہ پڑا ہے نا - بگی،

(ثریا مُنہ پھُلائے خاموش بیٹھی رہتی ہے۔ رازی کنکھیوں سے دیکھتی ہوئی میز پر سے نامکمل سویٹر اٹھا کر بُننے لگتی ہے۔ کچھ دیر خاموشی رہتی ہے) بھئی ثریا! تم نے چائے وائے تو پی نہیں (ملازمہ کو آواز دیتی ہے) زینب! یہ دیکھو ثریا آئی ہیں۔ کچھ چائے وائے ملے گی یا دوسری بیگم کے آنے سے پہلے ہی سب ٹھاٹ لُٹتے جا رہے ہیں بیچاری اسی سوگ میں دُبلی ہوئی جا رہی ہے (ہنستی ہے) اتنی دیر میں زینب آجاتی ہے) بھئی جلدی بھیجو ثریا بی بی خفا ہیں۔

ثریا۔ (روٹھ جانے کے انداز میں) جی ہاں چلئے ہی پینے تو آتی ہوں یہاں آپ تو ہماری کوئی نہیں۔ آپ کے دکھ درد کا ہمیں کوئی احساس ہی نہیں۔

رازی۔ ثریا! تو کیا واقعی تم لوگوں کو یہ سُن کر تکلیف ہوئی۔ ارے تکلیف تو مجھے ہونی چاہیئے۔ آنسو تمھاری آنکھوں میں کیوں بھلا؟ اور کس کس کو غم ہوا یہ خبر سن کر؟ اماں جان کیا کہہ رہی تھیں؟

ثریا۔ کل ہی ہم لوگوں کو محمود بھیا نے بتایا۔ تب سے امی نے کچھ نہیں کھایا پیا۔ روتے روتے آنکھیں لال ہوگئی ہیں اُن کی، وہ تو ساتھ ہی آرہی تھیں۔ ابا جان دورے پر گئے ہوئے ہیں۔ امی کہتی ہیں کہ تمھارے ابا جان کو آ لینے دو۔ بات کی ٹوہ لگا کر معلوم کرلیں۔ سچ ہے یا جھوٹ۔ پھر تو رازی کو عمر بھر کے لئے لے آؤں گی اور اِس کا مُنہ بھی دولھا بھائی کو نہ دیکھنے دوں گی۔ شام تک دونوں آجائیں تو کچھ عجب نہیں۔ ورنہ کل تو ضرور آئیں گے۔

(وقفہ)

(زینب ٹرے میں چائے اور مٹھائی لے آتی ہے اور میز پر رکھ کر میز ثریا کے قریب کر دیتی ہے)

زینب۔ لو بیٹی کچھ ناشتہ کرلو۔

ثریا۔ (میز کو پرے ڈھکیلتے ہوئے) لے جاؤ۔ میں چائے کی بھوکی نہیں۔ نہیں پیتی تمھاری چائے،

رازی۔ (زینب سے) تم جاؤ [وقفہ۔ زینب چلی جاتی ہے] (ثریا سے) اوہو! رہنے دو یہ ناز نخرے۔ چپ چاپ عصرانہ کرلو۔ ورنہ دونگی کان پکڑ کر دو طمانچے۔ لو کھاؤ اب! (ثریا آہستہ آہستہ کھانے لگتی ہے)

لیکن ثریا! یہ بات محمود کو کیسے معلوم ہوئی؟

ثریا۔ (ہاتھ روک کر) واہ آپا! وہ تو کہتے ہیں سارے شہر میں مشہور ہے

(وقفہ)

رازی۔ خیر جو نصیبوں میں ہے ہو کے رہے گا۔ قسمت کا لکھا کون ٹال سکتا ہے بہن! (ثریا کی طرف کنکھیوں سے دیکھتی ہے)

ثریا۔ آپا! تم تو زندہ درگور ہو جاؤ گی۔ دولھا بھائی نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھیں گے۔ فیروزہ، میں نے اُسے دیکھا ہے۔ ہر وقت بنی ٹھنی رہتی ہے اور تم سیدھی سادی پردے میں رہنے والی۔ وہ تمھیں ایک روز بھی ٹکنے نہیں دے گی آپا۔ جانے کیا کیا تکلیفیں اٹھانی پڑیں گی تمھیں۔ (آواز رندھ جاتی ہے جیسے رو پڑے گی)

رازی۔ (افسردہ لہجہ میں) لیکن تم کیوں اس قدر غمگین ہو ثریا؟ یُوں میرے دکھ بانٹ سکوگی۔ پگلی کہیں کی (وقفہ) لو یہ حلوہ کھاؤ۔

ثریا۔ نہیں آپا! اب مجھ سے کچھ نہیں کھایا جائے گا۔

رازی۔ ارے کھاؤ بھی۔ خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو۔

ثریا۔ نہیں آپا، اب نہیں۔

(زینب داخل ہوتی ہے۔ کچھ دیر رازی کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہتی ہے جب یقین ہو جاتا ہے کہ رازی نہیں روکے گی تو ٹرے اٹھا کر لے جاتی ہے۔ کچھ دیر خاموشی رہتی ہے۔ رازی بظاہر سویٹر بُننے میں محو ہے۔ افسردہ ثریا میز کی پالش کو اپنے ناخن سے کرید رہی ہے۔ کبھی کبھی رازی سویٹر سے نظر ہٹا کر ثریا کی دیکھ لیتی ہے اور مسکرا کر پھر سویٹر بُننے لگتی ہے)

ثریا۔ آپا کیا وہ بالکل آمادہ ہیں؟

رازی۔ (سویٹر کو میز پر ڈال دیتی ہے اور انگلیاں چٹخاتی ہے) ہاں قطعی! ان دنوں ان کا رویّہ بھی میرے ساتھ کچھ ٹھیک نہیں۔ بات بات پر آنکھیں نکالتے ہیں۔ ہر کام میں نقص نکالے جاتے ہیں (رقت انگیز لہجے میں) ثریا میں تو خود عاجز آتی جا رہی ہوں اس زندگی سے کہاں ہر وقت پیار بھرے لہجے میں گفتگو۔ نقصان بھی ہو جائے تو مسکرا کے رہ جانا کہاں اب یہ جھڑکیاں۔ اچھا ہے وہ فیروزہ کو بیاہ لائیں۔ روز روز کی ان گھرکیوں سے تو نجات ملے گی (لمبی سانس لیتی ہے)

ثریا - تم کتنی بھولی ہو آپا -!

(باہر والے دروازے پر دستک ہوتی ہے)

رازی - (اٹھتے ہوئے) لو ثریا تمھارے دولھا بھائی بھی آگئے، (بلند آواز سے) آتی ہوں -

(رازی اٹھ کر دروازہ کھولتی ہے - ایک ۲۸ برس کا خوبصورت نوجوان سیاہ سوٹ میں ملبوس اندر داخل ہوتا ہے چہرے سے مسکراہٹ پھوٹی پڑتی ہے - آنکھوں پر بغیر فریم کی عینک ہے اور ہاتھوں میں ایک سبز رنگ کی فائل - اندر آتے ہی ثریا پر نظر پڑتی ہے)

احسان - اوہ خو! ثریا آئی ہے - شکر خدا - آج کیسے راستہ بھول گئیں آپ! مزاج اچھا ہے نا؟

(ثریا چپ چاپ منہ پھلائے بیٹھی رہتی ہے)

رازی - ثریا بیچاری پہ پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے اور آپ کو مذاق سوجھا ہے

احسان - (حیران ہو کر) کیوں؟ — کیا ہوا — ؟ خیر تو ہے - کہیں اس کی منگنی تو نہیں ٹوٹ گئی؟

(ثریا کے گال سرخ ہو جاتے ہیں)

رازی - یہ آپ کی دوسری شادی کی خبر سن کر آئی ہے آپ کے ارادوں کی خبر ان لوگوں کو پورے ایک ماہ کے بعد آج ملی ہے - اماں جان نے جب سے سنا ہے کچھ کھایا پیا نہیں - دن بھر روتی رہی ہیں شاید وہ لوگ شام تک آئیں -

(رازی ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ جاتی ہے)

احسان - (دلچسپی سے) اچھا جب ہی منہ پھلائے بیٹھی ہیں ہماری بیگم صاحبہ - لیکن اس سے بھئی ثریا تمھیں کوئی تکلیف نہ ہوگی — تمھاری آمد و رفت میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالے گا - (ثریا بدستور بیٹھی ہے - احسان ثریا کی طرف قدرے شوخی سے دیکھتا ہے - پھر قدرے سنجیدگی سے) وہ تو تم جانتی ہی ہو - آٹھ برس کے بعد بھی آج گھر سونا سونا ہی رہتا ہے بال بچوں کے بغیر زندگی کتنی خشک معلوم ہوتی ہے - تم جانو -

(قریب والی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے — ثریا کی طرف پھر شوخی سے دیکھتا ہے)

ثریا - (طنز سے) جی ضرور، کیوں نہیں؟

احسان - (دو سرخ رنگ کے ننھے موزے نکالتے ہوئے) اچھا لو بھئی رازی! یہ موزے سنبھالو -

رازی - (جھینپ کر) آپ بھی -

ثریا - (قدرے تعجب سے) یہ کیا بھائی جان!

احسان - یہ ..... یہ تمھاری نئی بھابی آئے گی نا - پھر... پھر تمھارا بھتیجا ہوگا .... اس کے لئے -

(رازی پھر جھینپ جاتی ہے)

ثریا - (تلخ لہجہ میں) جی! ابھی سے ہم لوگوں کو جلانے کا سامان کیا جا رہا ہے -

(رازی اور احسان ہنستے ہیں)

احسان - لو بھئی ...... میں چلا .... ایک نہایت ہی ضروری کام

رازی - (ٹوک کر) چائے تو پی لیجئے - باتوں باتوں میں میں بالکل بھول ہی گئی -

احسان - جی! اب کیوں یاد رہے گا - (مسکراتا ہے) تمھاری سوت جو لانے جا رہا ہوں - (کرسی سے اٹھتا ہے) بھئی رازی اب ثریا کو پریشان نہ کرنا (پیار سے ثریا کے بال کھینچتے ہوئے) بیچاری بھولی بھالی! اچھا خدا حافظ! (باہر والے دروازے سے نکل جاتا ہے رازی دروازے تک ساتھ جاتی ہے - احسان جب باہر چلا جاتا ہے تو دروازے کی چٹخنی لگا کر واپس اپنی جگہ آکر بیٹھ جاتی ہے)

رازی - (آپ ہی آپ) چائے بھی نہ دے سکی آج انھیں -

ثریا - کیا بات ہے آپا! دولھا بھائی کہہ رہے تھے پریشان نہ کرنا -

رازی - (ہنستی ہے) کچھ نہیں ثریا -

ثریا - کچھ بات ضرور ہے - تم کہتی تھیں اُن کا سلوک ٹھیک نہیں، وہ تو بہت خوش خوش باتیں کر رہے تھے -

رازی - ان کی شادی ہونے والی ہے نا، اسی لئے .... (ثریا جیسے پھر اُداس ہو جاتی ہے - رازی ہنستی ہے - ضبط کا دامن ہاتھوں سے چھوٹ جاتا ہے - ثریا کے گال میں چٹکی لیتے ہوئے کہتی ہے)

پگلی خوش ہونے کی بات ہی ہے - اب وہ شادی وادی نہیں کریں گے -

ثریا - (کچھ نہ سمجھتے ہوئے) کیوں؟ ابھی تو تم کہہ رہی تھیں کہ ......

رازی - (بات کاٹ کر) تجھے بنا رہی تھی -

ثریا - تو کیا یہ بات جھوٹ ہے - (وقفہ) تم بھی بڑی وہ ہو آپا خواہ مخواہ اتنی دیر سے مجھے ستا رہی تھیں -

رازی - بات سچ تھی - مگر خدا کا شکر ہے اب انھیں ضرورت نہیں رہی (مسکراتی ہے)

ثریا - (نہ سمجھتے ہوئے مسکراتی ہے) ضرورت نہیں رہی؟

رازی - میری بھولی بہن (ثریا کے کان میں کچھ کہتی ہے) پگلی!

ثریا - تو تم نے اب تک بتایا نہیں ہم لوگوں کو'

رازی - ہمیں بھی تو پرسوں یقین آیا -- طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی - لیڈی ڈاکٹر آئی تو - . (چہرہ سُرخ ہو جاتا ہے)

ثریا - (خوش ہوتے ہوئے) جی یہ بات ہے - موزے ابھی سے خریدے جا رہے ہیں' واہ دولھا بھائی -

(موزے کو اٹھا کر ہلاتی ہے - رازی شرما جاتی ہے)

رازی - پگلی! ادھر لا موزے -

(ثریا کے گالوں پر پیار بھرا ہلکا سا طمانچہ لگاتی ہے)

ثریا - لو میں چلی : امی بھوکی ہوں گی - ان کا روزہ افطار کراؤں -

رازی - (شانے پکڑ کر بٹھلاتے ہوئے) ارے ثریا! تمھیں میری قسم!

ثریا - (اُٹھتی ہے) نہیں آپا! ہاں وہ موزے سنبھال کر رکھنا؟ سمجھیں!

(دونوں قہقہہ لگا کر ہنستی ہیں)

(پردہ گرتا ہے)

غیاث احمد گدی

غزل

یہ موسم رنگ و بو یہ ساون یہ لغزشوں کا حسین مہینہ
جو اذن ہو ساقیا تو ٹکرائیں آبگینے سے آبگینہ

کسی کی ہلکی سی مسکراہٹ نے رنگِ گلشن بدل دیا ہے
عرق عرق ہے جمالِ شبنم گلوں کے ماتھے پہ ہے پسینہ

ازل سے اب تک ہے ایک ہی رنگ زیست کے بحرِ بیکراں کا
وہی تلاطم وہی تموج وہی تھپیڑے وہی سفینہ

یہ پارساؤں کی انجمن بھی عجیب ہی انجمن ہے جس میں
نہ کیف و کم ہے نہ رقص و رم ہے نہ شعر و نغمہ نہ جام و مینا

جو تیرے نزدیک آ رہا ہے اُسی سے تو دور ہو رہی ہے
بتا تو اے منزلِ محبت بھلا یہ ہے کون سا قرینہ

میں شکوہ آخر کروں تو کیونکر مجھے بہت کچھ دیا ہے اُس نے
لبالب اشکوں سے میری آنکھیں غموں سے آباد میرا سینہ

یہ صبحدم رفتہ رفتہ سورج اُبھر رہا ہے اُفق پہ مضطر
کہ ہے کسی میگسار کے ہاتھ میں چھلکتا سا آبگینہ

مضطر اکبرآبادی

ثریا۔ تم کتنی بھولی ہو آپا۔!

(باہر والے دروازے پر دستک ہوتی ہے)

رازی۔ (اُٹھتے ہوئے) لو ثریا تمہارے دولہا بھائی بھی آگئے، (بلند آواز سے) آتی ہوں۔

(رازی اُٹھ کر دروازہ کھولتی ہے۔ ایک ۲۸ برس کا خوبصورت نوجوان سیاہ سوٹ میں ملبوس اندر داخل ہوتا ہے چہرے سے مسکراہٹ پھوٹی پڑتی ہے۔ آنکھوں پر بغیر فریم کی عینک ہے اور ہاتھوں میں ایک سبز رنگ کی فائل۔ اندر آتے ہی ثریا پر نظر پڑتی ہے)

احسان۔ اوہو! ثریا آئی ہے۔ شکر خدا۔ آج کیسے راستہ بھول گئیں آپ! مزاج اچھا ہے نا؟

(ثریا چپ چاپ منہ پھلائے بیٹھی رہتی ہے)

رازی۔ ثریا بیچاری پر پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے اور آپ کو مذاق سوجھا ہے

احسان۔ (حیران ہو کر) کیوں؟ — کیا ہوا —؟ خیر تو ہے۔ کہیں اس کی منگنی تو نہیں ٹوٹ گئی؟

(ثریا کے گال سُرخ ہو جاتے ہیں)

رازی۔ یہ آپ کی دوسری شادی کی خبر سن کر آئی ہے آپ کے ارادوں کی خبر ان لوگوں کو پورے ایک ماہ کے بعد آج ملی ہے۔ اماں جان نے جب سے سُنا ہے کچھ کھایا پیا نہیں۔ دن بھر روتی رہی ہیں شاید وہ لوگ شام تک آئیں۔

(رازی ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ جاتی ہے)

احسان۔ (دلچسپی سے) اچھا جب ہی منہ پھلائے بیٹھی ہیں ہماری بیگم صاحبہ۔ لیکن اس سے بھئی ثریا تمہیں کوئی تکلیف نہ ہوگی — تمہاری آمد و رفت میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالے گا۔ (ثریا بدستور بیٹھی ہے۔ احسان ثریا کی طرف قدرے شوخی سے دیکھتا ہے۔ پھر قدرے سنجیدگی سے) وہ تو تم جانتی ہی ہو۔ آٹھ برس کے بعد بھی آج گھر سونا سونا ہی رہتا ہے بال بچوں کے بغیر زندگی کتنی خشک معلوم ہوتی ہے۔ تم جانو۔

(قریب والی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے — ثریا کی طرف پھر شوخی سے دیکھتا ہے)

ثریا۔ (طنز سے) جی ضرور کیوں نہیں؟

احسان۔ (دو سرخ رنگ کے ننھے موزے نکالتے ہوئے) اچھا تو بھئی رازی! یہ موزے سنبھالو۔

رازی۔ (جھینپ کر) آپ بھی۔

ثریا۔ (قدرے تعجب سے) یہ کیا بھائی جان!

احسان۔ یہ ...... یہ تمہاری نئی بھابی آئے گی نا۔ پھر ... پھر تمہا بھتیجا ہوگا ..... اس کے لئے۔

(رازی پھر جھینپ جاتی ہے)

ثریا۔ (تلخ لہجہ میں) جی! ابھی سے ہم لوگوں کو جلانے کا سامان کیا جا رہا ہے۔

(رازی اور احسان ہنستے ہیں)

احسان۔ لو بھئی ...... میں چلا .... ایک نہایت ہی ضروری کا

رازی۔ (ٹوک کر) چائے تو پی لیجئے۔ باتوں باتوں میں میں بالکل بھول ہی گئی۔

احسان۔ جی! اب کیوں یاد رہے گا۔ (مسکراتا ہے) تمہاری سو جلانے جا رہا ہوں۔ (کرسی سے اٹھتا ہے) بھئی رازی اور ثریا کو پریشان نہ کرنا (پیار سے ثریا کے بال کھینچتے ہوئے) بیچاری بھولی بھالی! اچھا خدا حافظ! (باہر والے دروا سے نکل جاتا ہے رازی دروازے تک ساتھ جاتی ہے۔ اح جب باہر چلا جاتا ہے تو دروازے کی چٹخنی لگا کر واپس اپنی آ کر بیٹھ جاتی ہے)

رازی۔ (آپ ہی آپ) چائے بھی نہ دے سکی آج انھیں۔

ثریا۔ کیا بات ہے آپا! دولہا بھائی کہہ رہے تھے پریشان نہ کرنا

رازی۔ (ہنستی ہے) کچھ نہیں ثریا۔

ثریا۔ کچھ بات ضرور ہے۔ تم کہتی تھیں اُن کا سلوک ٹھیک نہیں وہ تو بہت خوش خوش باتیں کر رہے تھے۔

رازی۔ ان کی شادی ہونے والی ہے نا اسی لئے .... (ثریا پھر اُداس ہو جاتی ہے۔ رازی ہنستی ہے۔ ضبط کا دامن ہا سے چھوٹ جاتا ہے۔ ثریا کے گال میں چٹکی لیتے ہوئے کہتی

پگلی خوش ہونے کی بات ہی ہے۔ اب وہ شادی وادی نہیں کریں گے۔

ثریا۔ (کچھ نہ سمجھتے ہوئے) کیوں؟ ابھی تو تم کہہ رہی تھیں کہ......

رازی۔ (بات کاٹ کر) تجھے بنا رہی تھی۔

ثریا۔ تو کیا یہ بات جھوٹ ہے۔ (وقفہ) تم بھی بڑی وہ ہو آپا خواہ مخواہ اتنی دیر سے مجھے ستا رہی تھیں۔

رازی۔ بات سچ تھی۔ مگر خدا کا شکر ہے اب انھیں ضرورت نہیں رہی

(مسکراتی ہے)

ثریا۔ (نہ سمجھتے ہوئے مسکراتی ہے) ضرورت نہیں رہی؟

رازی۔ میری بھولی بہن (ثریا کے کان میں کچھ کہتی ہے) پگلی!

ثریا۔ تو تم نے اب تک بتایا نہیں ہم لوگوں کو۔

رازی۔ ہمیں بھی تو پرسوں یقین آیا — طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی۔ لیڈی ڈاکٹر آئی تو — (چہرہ سُرخ ہو جاتا ہے)

ثریا۔ (خوش ہوتے ہوئے) جی یہ بات ہے۔ موزے ابھی سے خریدے جا رہے ہیں، واہ دولھا بھائی۔

(موزے کو اٹھا کر ہلاتی ہے۔ رازی شرما جاتی ہے)

رازی۔ پگلی! ادھر لا موزے۔

(ثریا کے گالوں پر پیار بھرا ہلکا سا طمانچہ لگاتی ہے)

ثریا۔ لو میں چلی: امی بھوکی ہوں گی۔ ان کا روزہ افطار کراؤں۔

رازی۔ (شانے پکڑ کر بٹھاتے ہوئے) ارے ثریا، تمھیں میری قسم!

ثریا۔ (اٹھتی ہے) نہیں آپا! ہاں وہ موزے سنبھال کر رکھنا؟ سمجھیں!

(دونوں قہقہہ لگا کر ہنستی ہیں)

(پردہ گرتا ہے)

غیاث احمد گدی

غزل

یہ موسمِ رنگ و بُو، یہ ساون، یہ لغزشوں کا حسیں مہینہ
جو اذن ہو ساقیا تو ٹکرائیں آبگینے سے آبگینہ

کسی کی ہلکی سی مسکراہٹ نے رنگِ گلشن بدل دیا ہے
عرق عرق ہے جمالِ شبنم گلوں کے ماتھے پہ ہے پسینہ

ازل سے اب تک ہے ایک ہی رنگ زیست کے بحرِ بیکراں کا
وہی تلاطم وہی تموّج وہی تھپیڑے وہی سفینہ

یہ پیار ساؤں کی انجمن بھی عجیب ہی انجمن ہے جس میں
نہ کیف و کم ہے نہ رقص و رم ہے نہ شعر و نغمہ نہ جام و مینا

جو تیرے نزدیک آ رہا ہے اُسی سے تو دور ہو رہی ہے
بتا تو اے منزلِ محبّت بھلا یہ ہے کون سا قرینہ

میں شکوہ آخر کروں تو کیونکر مجھے بہت کچھ دیا ہے اُس نے
لبالب اشکوں سے میری آنکھیں غموں سے آباد میرا سینہ

یہ صبحدم رفتہ رفتہ سورج اُبھر رہا ہے اُفق پہ مضطر
کہ ہے کسی میگسار کے ہاتھ میں چھلکتا سا آبگینہ

مضطر اکبر آبادی

ثریا۔ تم کتنی بھولی ہو آپا۔!

(باہر والے دروازے پر دستک ہوتی ہے)

رازی۔ (اٹھتے ہوئے) لو ثریا تمھارے دولھا بھائی بھی آگئے۔ (بلند آواز سے) آتی ہوں۔

(رازی اُٹھ کر دروازہ کھولتی ہے۔ ایک ۲۸ برس کا خوبصورت نوجوان سیاہ سوٹ میں ملبوس اندر داخل ہوتا ہے جس کے چہرے سے مسکراہٹ پھوٹی پڑتی ہے۔ آنکھوں پر بغیر فریم کی عینک ہے اور ہاتھوں میں ایک سبز رنگ کی فائل۔ اندر آتے ہی ثریا پر نظر پڑتی ہے)

احسان۔ اوہ خو! ثریا آئی ہے۔ شکر خدا۔ آج کیسے راستہ بھول گئیں آپ! مزاج اچھا ہے نا؟

(ثریا چپ چاپ منہ پھلائے بیٹھی رہتی ہے)

رازی۔ ثریا بیچاری پر پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے اور آپ کو مذاق سوجھا ہے۔

احسان۔ (حیران ہوکر) کیوں؟ — کیا ہوا — ؟ خیر تو ہے۔ کہیں اس کی منگنی تو نہیں ٹوٹ گئی؟

(ثریا کے گال سُرخ ہو جاتے ہیں)

رازی۔ یہ آپ کی دوسری شادی کی خبر سن کر آئی ہے آپ کے ارادوں کی خبر ان لوگوں کو پورے ایک ماہ کے بعد آج ملی ہے۔ اماں جان نے جب سے سُنا ہے کچھ کھایا پیا نہیں۔ دن بھر روتی رہی ہیں شاید وہ لوگ شام تک آئیں۔

(رازی ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ جاتی ہے)

احسان۔ (دلچسپی سے) اچھا جب ہی منہ پھلائے بیٹھی ہیں ہماری بیگم صاحبہ۔ لیکن اس سے بھئی ثریا تمھیں کوئی تکلیف نہ ہوگی — تمھاری آمد و رفت میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالے گا۔ (ثریا بدستور بیٹھی رہتی ہے۔ احسان ثریا کی طرف قدرے شوخی سے دیکھتا ہے۔ پھر قدرے سنجیدگی سے) وہ تو تم جانتی ہی ہو۔ آٹھ برس کے بعد بھی آج گھر سونا سونا ہی رہتا ہے جہاں بچوں کے بغیر زندگی کتنی خشک معلوم ہوتی ہے۔ تم جانو۔

(قریب والی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے — ثریا کی طرف پھر شوخی سے دیکھتا ہے)

ثریا۔ (طنز سے) جی ضرور، کیوں نہیں؟

احسان۔ (دو سرخ رنگ کے ننھے موزے نکالتے ہوئے) اچھا تو بھئی رازی! یہ موزے سنبھالو۔

رازی۔ (جھینپ کر) آپ بھی۔

ثریا۔ (قدرے تعجب سے) یہ کیا بھائی جان!

احسان۔ یہ...... یہ تمھاری نئی بھابی آئے گی نا۔ پھر...... پھر تمھارا بھتیجا ہوگا ..... اس کے لئے۔

(رازی پھر جھینپ جاتی ہے)

ثریا۔ (تلخ لہجہ میں) جی! ابھی سے ہم لوگوں کو جلانے کا سامان کیا جا رہا ہے۔

(رازی اور احسان ہنستے ہیں)

احسان۔ لو بھئی...... میں چلا...... ایک نہایت ہی ضروری کام

رازی۔ (ٹوک کر) چائے تو پی لیجئے۔ باتوں باتوں میں میں بالکل بھول ہی گئی۔

احسان۔ جی! اب کیوں یاد رہے گا۔ (مسکراتا ہے) تمھاری سوت جولانے جا رہا ہوں۔ (کرسی سے اٹھتا ہے) بھئی رازی اب ثریا کو پریشان نہ کرنا (پیار سے ثریا کے بال کھینچتے ہوئے) بیچاری بھولی بھالی! اچھا خدا حافظ! (باہر والے دروازے سے نکل جاتا ہے رازی دروازے تک ساتھ جاتی ہے۔ احسان جب باہر چلا جاتا ہے تو دروازے کی چٹخنی لگا کر واپس اپنی جگہ آکر بیٹھ جاتی ہے)

رازی۔ (آپ ہی آپ) چائے بھی نہ دے سکی آج انھیں۔

ثریا۔ کیا بات ہے آپا! دولھا بھائی کہہ رہے تھے پریشان نہ کرنا۔

رازی۔ (ہنستی ہے) کچھ نہیں ثریا۔

ثریا۔ کچھ بات ضرور ہے۔ تم کہتی تھیں اُن کا سلوک ٹھیک نہیں وہ تو بہت خوش خوش باتیں کر رہے تھے۔

رازی۔ ان کی شادی ہونے والی ہے نا، اسی لئے...... (ثریا جیسے پھر اُداس ہو جاتی ہے۔ رازی ہنستی ہے۔ ضبط کا دامن ہاتھوں سے چھوٹ جاتا ہے۔ ثریا کے گال میں چٹکی لیتے ہوئے کہتی ہے)

پگلی خوش ہونے کی بات ہی ہے۔ اب وہ شادی دادی نہیں کریں گے۔

ثریا۔ (کچھ نہ سمجھتے ہوئے) کیوں؟ ابھی تو تم کہہ رہی تھیں کہ......

رازی۔ (بات کاٹ کر) تجھے بنا رہی تھی۔

ثریا۔ تو کیا یہ بات جھوٹ ہے۔ (وقفہ) تم بھی بڑی وہ ہو آپا خواہ مخواہ اتنی دیر سے مجھے ستا رہی تھیں۔

رازی۔ بات سچ تھی۔ مگر خدا کا شکر ہے اب انھیں ضرورت نہیں رہی (مسکراتی ہے)

ثریا۔ (نہ سمجھتے ہوئے مسکراتی ہے) ضرورت نہیں رہی؟

رازی۔ میری بھولی بہن (ثریا کے کان میں کچھ کہتی ہے) پگلی!

ثریا۔ تو تم نے اب تک بتایا نہیں ہم لوگوں کو۔

رازی۔ ہمیں بھی تو پرسوں یقین آیا ۔۔ طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی۔ لیڈی ڈاکٹر آئی تو ۔ (چہرہ سرخ ہو جاتا ہے)

ثریا۔ (خوش ہوتے ہوئے) جی یہ بات ہے۔ موزے ابھی سے خریدے جا رہے ہیں، واہ دولھا بھائی۔

(موزے کو اٹھا کر ہلاتی ہے۔ رازی شرما جاتی ہے)

رازی۔ پگلی! ادھر لا موزے۔

(ثریا کے گالوں پر پیار بھرا ہلکا سا طمانچہ لگاتی ہے)

ثریا۔ لو میں چلی: امی بھوکی ہوں گی۔ ان کا روزہ افطار کراؤں۔

رازی۔ (شانے پکڑ کر بٹھلاتے ہوئے) ارے ثریا، تمھیں میری قسم!

ثریا۔ (اٹھتی ہے) نہیں آپا! ہاں وہ موزے سنبھال کر رکھنا؟ سمجھیں!

(دونوں قہقہہ لگا کر ہنستی ہیں)

(پردہ گرتا ہے)

غیاث احمد گدی

غزل

یہ موسم رنگ و بو یہ ساون یہ لغزشوں کا حسیں مہینہ
جو اذن ہو ساقیا تو ٹکرائیں آبگینے سے آبگینہ

کسی کی ہلکی سی مسکراہٹ نے رنگِ گلشن بدل دیا ہے
عرق عرق ہے جمالِ شبنم گلوں کے ماتھے پہ ہے پسینہ

ازل سے اب تک ہے ایک ہی رنگ زیست کے بحرِ بیکراں کا
وہی تلاطم وہی تموج وہی تھپیڑے وہی سفینہ

یہ پارساؤں کی انجمن بھی عجیب ہی انجمن ہے جس میں
نہ کیف و کم ہے نہ رقص و رم ہے نہ شعر و نغمہ نہ جام و مینا

جو تیرے نزدیک آ رہا ہے اسی سے تو دور ہو رہی ہے
بتا تو اے منزلِ محبت بھلا یہ ہے کون سا قرینہ

میں شکوہ آخر کروں تو کیونکر مجھے بہت کچھ دیا ہے اس نے
لبالب اشکوں سے میری آنکھیں غموں سے آباد میرا سینہ

یہ صبحدم رفتہ رفتہ سورج ابھر رہا ہے افق پہ مضطر
کہ ہے کسی میگسار کے ہاتھ میں چھلکتا سا آبگینہ

مضطر اکبرآبادی

غدّارِ وطن کے نام

ایک وطن دوست دوشیزہ کا مکتوب

لکھا ہے تم نے مجھے ازرہِ خلوص و وفا — کہ تجھ پہ میں دل و ایماں نثار کرتا ہوں
ہر ایک صبح کو رہتا ہوں تیری یاد میں گم — ہر ایک شب کو ترا انتظار کرتا ہوں
ترے خیال تری دھن ترے تصوّر سے — تسلّیٔ دلِ اُمیدوار کرتا ہوں
تری اُمید کرم کے خیال میں دن رات — ترے خیال سے کسبِ قرار کرتا ہوں
ترے نقوشِ خد و خال پر نظر کرکے — ستائشِ قلمِ کردگار کرتا ہوں
تری طلب کا تری مستقل محبت کا — خود اپنی روح سے قول و قرار کرتا ہوں

یقین کرے کہ ہمرنگ روزگار نہیں
مرا مزاج تلوّن کا رازدار نہیں

بجا کہ مجھ سے تمھیں دعویٔ محبت ہے — بجا کہ تم کو حقیقت میں مجھ سے اُلفت ہے
بجا کہ دلکش و رنگیں ہیں خط و خال مرے — بجا کہ حسن مرا بہترین صنعت ہے
بجا کہ میرا تبسم ہے انبساط انگیز — بجا کہ میرا تصوّر نویدِ راحت ہے
بجا کہ تم کو مرے بُعد سے ہے بے تابی — بجا کہ تم کو مرے قرب کی ضرورت ہے
بجا کہ میرا تغافل ہے آتشِ دوزخ — بجا کہ میرا تلطّف بہارِ جنت ہے
تم اپنے عشق کا لیکن مجھے یقیں نہ دلاؤ — تمھارے ذوقِ غلامی سے مجھکو نفرت ہے
جو اپنی قوم کا ہمدرد و غمگسار نہ ہو — وہ مجھ سے عشق کرے یہ مری اہانت ہے

وہ مردِ حُبِّ وطن سے جو بے قرار نہیں
جہاں میں اُس کی محبت کا اعتبار نہیں

صادق نیازی کاشمیری

سُراغ

ب بیکسانہ انداز میں جب اس نے اپنے تئیں چائے کی ایک مخصوص دکان کے سامنے پڑے ہوئے بنچ پر آگرایا۔ تو اسے محسوس ہوا وہ
ک چکا ہے۔
سکاوٹ واضمحلال سے نجات حاصل کرنے کا اس کے پاس ایک ہی سہل اور آزمودہ طریقہ تھا کہ وہ اپنی پریشانیوں سے وقتی طور پر منہ موڑ لے اور
اکی چاشنی میں اُبلی ہوئی کڑوی کسیلی چائے کا گلاس گھونٹ گھونٹ کر کے اپنے حلق سے نیچے اتار لے لیکن وہ جانتا تھا کہ آج وہ چائے نہیں
۔اس کے پاس صرف ایک دُونی رہ گئی ہے جسے وہ کسی ناگہانی ضرورت کے لئے محفوظ رکھ چھوڑنا چاہتا ہے۔
کیوں چائے نہیں پیوگے آج" ۔لائل پور میں اپنا سب کچھ لٹا کر آئے ہوئے گڑ کی چاشنی میں چائے کی پتیوں کو دوا اُبالے دے کر دو دو آنے
ں بیچنے والے مانک چند منگے شاہ نے اس سے پوچھا۔ "کچھ پتہ چلا"؟
سر کو منفی کی ہلکی سی جنبش دے کر بے مقصد طور پر اس نے قریب ہی زمین پر لکڑوں بیٹھے اور نیم دراز حالت میں لیٹے ہوئے بارہ افراد
ں ایک کنبے کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ جن میں بحث چل رہی تھی کہ رات تو جیسے تیسے کٹ ہی جائے گی۔ کل صبح بھی اگر بچوں کے لئے دودھ
نہ آیا تو کیا ہوگا۔ پھر اس نے نگاہیں یوں پھیر لیں جیسے اُسے اُن سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اور ان سردار صاحب کی طرف دیکھنے لگا۔ جو اس
س ہی بنچ پر بیٹھے پھونکیں مار مار کر چائے پی رہے تھے اور ضلع شیخوپورہ میں اپنی چالیس بیگھے زمین، تین جوڑی نسلی بیل، بیسیوں ڈھور
اناج سے بھرے ہوئے کوٹھوں کی داستانِ غم سُناتے ہوئے بار بار عجیب رازدارانہ طور پر اس فقرے پر رُکتے تھے۔ "لالہ زندگی
تو ایک بار ضرور وہاں جاؤں گا"۔ پاؤں سے چپل اتار کر ٹانگیں سمیٹتے ہوئے وہ آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔
پچھلے ڈیڑھ مہینے سے وہ امرتسر میں آیا ہوا تھا۔ حکومت کی طرف پناہ گزینوں کے لنگر سے دو کچی یا جھلسی ہوئی چپاتیوں اور سڑی بسی
کے لئے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ دھکے کھانے کے بعد اپنی بوڑھی ماں، جوان بہن اور معصوم بھائی کی تلاش میں مارے مارے پھرنا اس کا معمول
دا تھا۔ ضلع سیالکوٹ کے ایک دُور افتادہ گاؤں میں رہنے والی وہ تین روحیں اس کی روح کو بُری طرح اسیر کئے ہوئے تھیں۔ ہر صبح اُمید کی
ایک جیتی جاگتی لہر محسوس طور پر اس کے دل و دماغ میں حلول کرنے لگتی۔ حالات کی ناموافقت تلخیوں اور بے پناہیوں کے باوجود اسے محسوس
ا جیسے وہ تینوں بے بس و بیکس ہستیاں امرتسر کی کسی سڑک کے کنارے، کسی سائبان کے نیچے، کسی جلے ہوئے شکستہ مکان کی دہلیز پر
ی پُرحسرت، بے چین اور منتظرانہ نگاہوں سے ہر راہ گیر کی طرف دیکھ رہی ہیں۔ کسی غیر مغلوب خواہش کے زیر اثر وہ سوچنے لگتا۔ کہ آج
تک ہی جب وہ ان کے سامنے جا کھڑا ہو تو انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آئے گا۔ ماں لپک کر اُسے چھاتی سے لگا لے گی۔ پھوٹ پھوٹ
رونا شروع کر دے گی۔ وہ اُسے دلاسا دے گا کہے گا۔ "ماں صرف ہم ہی تو مصیبت زدہ نہیں۔ ہزاروں لاکھوں انسان برباد و بے خانماں
ہو چکے ہیں۔ دنیا پر کیا کیا گذری ہے۔ دیکھی جاتی ہے نہ سُنی۔ ہمیں تو اپنی زندگی، اپنی عزت کی خیر منانی چاہیئے۔" ننھا بھاشی بھیا بھیا چلاتا
اُس کی ٹانگوں سے لپٹ کر جھولنے لگے گا۔ اپنی گود میں اٹھا کر اور گال پر ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے وہ اسے کہے گا "کم بخت، سب
سے زیادہ تو مجھے تمھاری فکر تھی۔ میں سوچتا تھا کہیں تم لوگ کسی پیدل قافلے کے ساتھ نہ چل کھڑے ہوں۔ تم سے تو دو قدم بھی نہ چلا جائیگا"
دتری البتہ حسب عادت خاموش رہے گی۔ نہ جانے کیوں وہ ہر وقت اس سے شرماتی رہتی ہے۔ پچھلے برس اچھا بھلا اس کے لئے بر

تلاش کیا تھا۔ اپنے گھر اٹھ گئی ہوتی تو اُس کی طرف سے تو کچھ اطمینان رہتا۔ لیکن ماں —— وہ ماں سے کہنے لگا۔ ان دنوں تو بڑے بڑے سیٹھ ساہوکار بغیر ایک کوڑی تک لئے دیئے سروں کے بوجھ اُتار رہے ہیں۔ زمانے کی حالت کس سے پوشیدہ ہے۔ اب وہ پہلی سی باتیں کہاں —— اور اسی لہر کے لامحدود تاثرات دلجمعی، جوش اور جدوجہد کے زیر اثر وہ سڑکوں گلیوں اور ہر اس مقام کی جہاں اس علاقے سے آئے ہوئے لوگوں کی خبر ملتی، خاک چھانتا پھرتا۔ لیکن شام کے وقت جب مضطرب و مایوس، اُداس اور نڈھال اپنے تئیں وہ چائے کی اس دکان کے سامنے پڑے ہوئے بنچ پر آگرتا تو اُسے زمین و آسمان گھومتے ہوئے محسوس ہونے۔ اس کا دل سیکڑوں ہیبت ناک و مہلک وساوس میں گرفتار رہتا لیکن منگے شاہ کے میٹھے الفاظ "چائے نہیں پیو گے آج —— کچھ پتہ چلا —— ؟" اُس کے لرزیدہ خیالات اور گھومتے ذہن کو ٹھکانے پر لے آتے۔ اس وسیع و عریض دنیا میں اب ایک منگے شاہ ہی ایسا شخص تھا جسے وہ اپنا ہمدرد و غمگسار، دوست و مہربان، جو کچھ بھی کہنا چاہتا کہہ سکتا تھا۔ سوا اس کے باقی ساری دنیا اس کے لئے بیگانہ تھی۔ بے اعتنائی و مغائرت سے لبریز دنیا کا کون سرپھرا انسان چل کر اُسے پوچھنے آتا کہ بھائی تم اتنے پریشان کیوں ہو۔ صبح سے تم نے کچھ کھایا پیا بھی ہے یا نہیں۔ رات کہاں سوؤ گے۔ تمہارے پاس تو کوئی کپڑا لتّا بھی دکھائی نہیں دیتا —— منگے شاہ نے سونے کے لئے دکان کے سامنے والا وہ بنچ اور بنچ کے علاوہ ایک پھٹی پُرانی دری جس کے متعلق وہ کہتا تھا کہ لائلپور سے چلتے وقت وہ بالکل کوری تھی بچھونے کے لئے اُسے دے رکھی تھی اور حال ہی میں جب کیمپ افیسر نے ضرورتمند لوگوں میں رضائیاں بانٹنے کا اعلان کیا تو یہ منگے شاہ کی سفارش ہی کا کرشمہ تھا کہ آدھی رات کے وقت جگا کر ایک بالکل نئی رضائی اُس پر ڈال دی گئی تھی۔ اس کے اصرار کے باوجود ایک بار منگے شاہ نے اُس سے چائے کے دام بھی نہ لئے تھے۔ اور جب دکان بڑھانے میں منگے شاہ کا ہاتھ بٹاتے ہوئے وہ اپنے لواحقین کے کھوج نہ ملنے کی روئداد بڑے رحم طلب لہجے میں کہتا ہوا اُس سے پوچھتا —— "شاہ جی! آپ کا دل کیا گواہی دیتا ہے —— " تو منگے شاہ بڑی خود اعتمادی کے ساتھ جواب دیتا "اُن کا بال تک بیکا نہ ہوگا۔ تم تو خواہ مخواہ ہلکان ہو رہے ہو"

تو کیا وہ سچ مچ خواہ مخواہ ہلکان ہو رہا ہے۔ بازوؤں کے تکیئے پر سر رکھے، آسمان کی طرف تکتے ہوئے آدھی رات تک وہ سوچتا رہتا —— ان کا بال تک بیکا نہیں ہوا —— لیکن اُسے یقین نہ آتا۔ ہر روز اسے سیکڑوں ایسے لوگوں سے واسطہ پڑتا تھا جن کے متعلقین کی آمد کی خبر بھی انھیں مل چکی ہوتی تھی۔ اس کے باوجود وہ ان معتبر خبروں کو افواہوں سے تعبیر کرتے اور برابر پوچھ پڑتال میں سرگرداں رہتے۔ اس سلسلے میں کم و بیش جتنے بھی لوگوں سے اس کا واسطہ پڑا وہ سبھی اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے اپنے ہی آلام کی طولانی داستان بیان کرنا شروع کر دیتے تھے۔ ہر کسی کے ایک ہی قسم کے جذبات تھے۔ وہی انسان پر پڑی ہوئی خدا کی پھٹکار کے جذبات۔ ذمہ دار لوگوں کی کم فہمی اور ناوقت شناسی کے جذبات۔ انھیں اس حالت تک پہنچانے والوں کا لہو پی لینے کے جذبات قریب قریب ایک ہی قسم کی داستانیں تھیں۔ قتل و غارت کی داستانیں اغوا و درندگی کی داستانیں، فاقوں اور خدائی قہر کی داستانیں —— شروع شروع میں اس قسم کی کوئی داستان سنتے وقت اُس کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا تھا اور اس کے دماغ میں کئی باغی و بے ہنگم خیالات کروٹیں لینا شروع کر دیتے تھے لیکن رفتہ رفتہ اس کا جی کڑا ہوتا گیا اور اب وہ ایک ایسے دور میں تھا جہاں بڑی سے بڑی خونیں داستان بھی اس پر اثر انداز نہ ہو سکتی تھی۔ البتہ وہ نامعلوم خوف، موہوم اندیشہ اب بھی بدستور مرض مزمن کی طرح اس کے ذہن پر مسلط تھا۔ بلکہ جوں جوں دن گزرتے جاتے تھے اس کی دلی کیفیت مایوسی کی جانب مائل ہوتی جا رہی تھی۔ صبح سے شام تک کا وقفہ کھوج تحقیق میں گزر جاتا، چلتے چلتے پاؤں شل ہو جاتے۔ جسم کچے پھوڑے کی طرح دُکھنے لگتا۔ ہر گام پر نا اُمیدی اور مایوسی ہوتی، پھر بھی ہزاروں ہمجنسوں کی اپنے سے بھی بدتر حالت دیکھ کر اُس کے مخدوش خیالات اتنی تندی اختیار نہ کرتے۔ لاشعوری طور پر اُسے حاسدانہ سی مسرت کے ساتھ کچھ اس طرح کا یقین ہونے لگتا کہ اُس کی آج کی کاوش اکارت جا ہی نہیں سکتی۔ کوئی نہ کوئی غیر معمولی اور دل خوش کن واقعہ از خود پیش آ جائے گا۔ کسی معجزانہ طور پر اُس کی دلی مراد بر آئے گی۔ لیکن یہ تمام طفل تسلیاں

م ہوتے ہی دلگیر و تلخ خود فریبی میں تبدیل ہو جاتی ۔۔۔ خلجان، لاچاری و خستگی کی حالت میں وہ چائے کی دکان کے سامنے رکھے ہوئے بنچ پر آ گرتا۔
سردار صاحب کی جگہ اب ایک بوڑھی عورت اپنے پانچ چھ برس کے مریل و مدقوق پوتے کو جسے وہ کھدر کی میلی کچیلی چادر میں لپیٹے تھی چائے
نے کے ساتھ ساتھ گالیاں بھی دے رہی تھی ۔۔۔ ٹی بی مرا میرے دشمن، میرے جان کے لاگو ۔ تم کیوں بچ رہے ۔ ہیجا ہو جائے تجھے ۔ تجھے کسی کی
یے"۔ پھر ایک گھونٹ خود بھر کر منگے شاہ سے مخاطب ہوئی ۔" پرسوں ماں اس کی ہیضے سے ۔۔ گئی ۔ حرامزادہ دونوں وقت چائے مانگتا ہے ۔۔ لٹا پٹا کر آئے
ں ۔۔۔ چائے میں دودھ نہیں ڈالتے لالہ ۔۔۔"
دودھ ۔۔۔ غیر ارادی طور پر فوراً اس کے دل میں شورش پیدا ہوئی کہ وہ اپنے پھیپھڑوں کی پوری قوت کے ساتھ چلا کر کہنے لگے ۔۔۔" دودھ، لالہ
نری کا پوت ہے مائی، اس سے چائے میں اور دودھ ڈلوانے کی توقع بے کار ہے ۔ اتنا کیا کم ہے کہ اس نے دو آنے میں پانی کا گلاس نہیں دیا ۔ چائے
ں ہے ۔۔۔" لیکن وہ نا ملائم اور اہانت آمیز الفاظ اس کے منہ سے نکلتے نکلتے رہ گئے ۔۔۔ منگے شاہ غرض کا پتلا ہے ۔ انسانیت اُسے چھو بھی نہیں
ں ۔ اس قسم کے بیسیوں احساسات وہ اکثر و بیشتر محسوس کر چکا تھا اور کسی مناسب موقع پر ان کا اظہار بھی کرنا چاہتا تھا لیکن نہ جانے وہ کون سا
معلوم جذبہ تھا جس کے تحت اس قسم کے الفاظ اس کی زبان سے ادا ہوتے ہوتے رہ جاتے تھے ۔ جیب میں ہاتھ ڈال کر اس نے دو نی کو ٹٹولا، مسلا اور پھر
تھ باہر نکال لیا ۔ وہ اتنا گرا ہوا تو نہ تھا ۔ کاش لالہ نے آج اُسے جھوٹے منہ ہی سے مفت چائے پینے کی دعوت دی ہوتی۔
بڑھیا اسی طرح بکتی جھکتی اپنے پوتے کو اٹھا کر سڑک کی اُس بے پناہ بھیڑ اور تاریکی میں جو ہر لحظہ گہری ہوتی جا رہی تھی کہیں گم ہو گئی ۔ بنچ کے قریب
ین پر ڈیرا ڈالے بارہ افراد پر مشتمل ایک کنبہ پاؤ بھر دودھ حاصل کرنے کی ترکیبوں پر غور کرتے کرتے لمبی تان چکا تھا، ان سے ذراہٹ کر ایک اور
بہ ۔۔۔ اور اُن سے ذراہٹ کر ایک اور ۔۔۔ درختوں کے کٹے ہوئے بے جان ٹھنوں کی طرح یہاں وہاں ادھر اُدھر انسان ہی انسان گرے پڑے
تھے ۔ سڑک ابھی چلتے پھرتے ٹھنوں سے بدستور اٹی ہوئی تھی لیکن دن کے وقت کا سا ہنگامہ ۔ دھکا پیل ۔ شور و شغب بالکل نہ تھا ۔ شاید لوگ شور
پا مچا کر تھک چکے تھے اور اب کسی ابدی سکون کی تلاش میں خاموش، سر جھکائے رواں دواں چلے جا رہے تھے ۔ کہیں دُور کسی کے قے کرنے کی آوازیں
واضح طور پر سنائی دے رہی تھیں ۔ یہ تاریکی اور تعفن میں لپٹی ہوئی فضا، یہ پُراسرار سکوت، اُس نے سوچا کل میں بھی ہیضے کا ٹیکہ کرا لوں گا۔
حکومت کی طرف سے جہاں ہر کس و ناکس کو ہیضے اور پلیگ کے ٹیکے مفت کئے جاتے اور روٹی کپڑا مفت تقسیم ہوتا تھا ۔ رہنے کے لئے
چھولداریاں بھی لگوا دی گئی تھیں ۔ لیکن ہیضے اور پلیگ کا ٹیکہ لگوانا اتنا ہی آسان کام تھا جتنا کسی چھولداری میں سر چھپانے کی جگہ حاصل کرنا مشکل،
پھر چھولداریاں تو صرف کنبوں کے لئے مخصوص تھیں ۔ افسروں کے آگے پیچھے پھرنے کے علاوہ کم از کم آٹھ افراد کے نام رجسٹر میں درج کرانا لازم
تھا ۔ اور ان آٹھ افراد میں بھی جب تک نصف کے قریب عورتیں اور بچے نہ ہوتے تھے بات نہ بنتی تھی ۔ منگے شاہ کے کنبے کا ایک فرد بن کر وہ چھولداری
میں جگہ حاصل کر سکتا تھا، اگر منگے شاہ کو چھولداری میں رہنا منظور ہوتا، لیکن اُسے تو ایک پکا مکان مل چکا تھا جس میں پانی کا نل اور بجلی لگی ہوئی تھی
وہ ایک اکیلی جان تھی، چھولداری کا خیال خواب میں بھی نہیں آسکتا تھا ۔ کاش اُسے سردی ڈس لے اور وہ ٹھٹھر ٹھٹھر کر مر جائے ۔ حکومت اس کے لئے
کچھ کرنے سے معذور تھی اور وہ تو یہ بھی جانتا تھا کہ بیسیوں افسر اد پر مشتمل کنبے کیوں یخ بستہ زمین اور کھلے آسمان کو چھولداریوں پر ترجیح دیتے تھے۔
وہ آج تک احساس کمتری کا شکار نہ ہوا تھا ۔ وہ صرف ساٹھ روپے ماہوار پر ایک کارخانے میں کلرکی کرنے کے باوجود شہنشاہیت سی محسوس
کرتا رہا ۔ سینہ پھلا کر اپنے دوستوں اور واقفکاروں کی تنگ دستی پر اظہار افسوس کیا کرتا ۔ اب وہ کیوں اپنی ہی نظر میں خود کو گرا دے ۔ پناہ گزینوں
میں ہاتھی ہوئی ایک ہی رنگ اور وضع کی پوشاک زیب تن کر کے اپنی کس مپرسی کا ڈھنڈورہ پیٹتا پھرے ۔ اس کے لئے یہی کیا کم تھا کہ اپنے سر اور
چہرے کے گرد مفلر لپیٹ کر وہ لنگر سے دو روٹیاں لے آتا تھا ۔ پھر اسے چھولداری میں جگہ حاصل کرنے کی اتنی خواہش بھی تو نہ تھی ۔ صرف رات کاٹنے
کے لئے اسے چھ فٹ جگہ درکار تھی اور منگے شاہ نے ساڑھے سات فٹ لمبا اور اڑھائی فٹ چوڑا بنچ اسے عنایت کر رکھا تھا ۔ جس کے قریب ہی

سُلگتی یا بُجھی ہوئی بھٹی کی جاں بخش گرمی جب تک وہ جاگتا رہتا اس کے جسم کو گرمائے رکھتی تھی۔ آج سے ڈیڑھ ماہ پیشتر کی اس پُرو قار شہنشاہیت کا احساس تو اُسے نہ ہوتا لیکن قریب ہی زمین پر پڑے ٹھٹھرتے یا بھٹی پر آگ تاپنے کی غرض سے جمع ہونے والوں کی لاچاریاں دیکھ کر اُسے ایک گونہ مسرت ضرور ہوتی اور وہ سوچتا کہ اب بھی اُس کا رتبہ ہزاروں سے بہتر ہے۔

اس بہتر رتبے کا تلخ احساس اُسے اس وقت ہوتا جب وہ دیکھتا کہ وہ لوگ جو اپنا سب کچھ گنوا کر آئے تھے، جن کے پاس جینے تک کا بہانہ نہ رہ گیا تھا، جو احساسِ کمتری کا شکار تھے، لنگر سے زیادہ سے زیادہ روٹیاں حاصل کرنے کے لئے جھگڑا کرتے، بھیس بدلتے تھے۔ جو ایک ہی رنگ ایک ہی قسم کی پوشاک پہن کر اپنی ڈھٹائی کی کھلے بندوں نمائش کرتے اور افسروں کی جھڑکیاں اور پولیس والوں کی گالیاں سُننے کے باوجود اسی ڈگر پر چلے جا رہے تھے۔ یہ لوگ ایک ایسی قناعت — ایک ایسے اطمینان کا سرچشمہ دکھائی دیتے تھے گویا صدیوں سے وہ اسی حالت میں رہتے آ رہے ہیں۔ اُن کے ساتھ کچھ بھی نہیں ہوا — اور واقعی وہ سوچتا، ان کے ساتھ ہوا کیا ہے۔ وہ وہاں گھاس چھیلتے تھے، بان بٹتے تھے، قلابازیاں لگاتے تھے۔ بھاڑ جھونکتے تھے — ان کا ہر بوڑھا، ہر بچہ بحفاظت پہنچ چکا تھا۔ بچے چھولداریوں میں کلیلیں کرتے تھے اور بوڑھے چھولداریوں کے باہر حقے گڑگڑاتے ہوئے نوجوانوں کو اپنی زندگی پھر سے مرتب کرنے سے پیشتر کچھ دن سکھ کا سانس لینے کی تلقین کرتے اور کہتے کہ جو وقت گزر جائے وہی غنیمت ہے۔ ساری عمر ہاتھ پیر توڑنے ہی کے لئے تو ہے۔

کاش اس کی بوڑھی ماں، اس کی جوان بہن اور اس کا وہ معصوم بھائی بھی بحفاظت پہنچ چکا ہوتا۔ وہ بار بار خیال کرتا۔ پھر اسے کس بات کی پرا تھی، کیا غم تھا۔ وہ کبھی انھیں چھولداریوں میں دھکے نہ کھانے دیتا۔ ٹوکری اٹھاتا — بھیک مانگتا — لیکن نہیں اسے ٹوکری اُٹھانے یا بھیک مانگنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کے پاس علم تھا، لیاقت تھی، تجربہ تھا۔ عزت کی دو روٹیاں کمانا کون سی بڑی بات تھی۔

یکایک اُسے خیال آیا کہ اس کے جیب میں پڑی ہوئی دونی بھلا کب تک اس کا ساتھ دے گی۔ کل سے اُسے کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہوگا۔ اس کے کپڑے بھی تو انتہائی غلیظ ہو چکے ہیں۔ ایک دونی کے صابن سے تو بمشکل ایک قمیص ہی دُھلے گی۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر پھر سے دونی کو مسلنا شروع کر دیا — یہ بالکل غیر اختیاری طور پر ہوا۔ دونی اس کے ہاتھ کے ساتھ ہی جیب سے باہر نکل آئی۔ جسے اُس نے عجیب شانِ بے نیازی سے منگے شاہ کے آگے پھینک دیا "لو، پلاؤ چائے"

دھواں دھار چائے سے لبالب بھرا ہوا گلاس اُس کے ہاتھ میں تھا۔ پہلا گھونٹ پیتے ہی جہاں اسے جانفزا توانائی کا احساس ہوا وہاں اس کی وحشتگی کے جذبات بھی شدت اختیار کر گئے جیسے دانستہ طور پر اُس سے کسی فعلِ شنیع کا ارتکاب ہو رہا ہو۔ اُس کے رگ و ریشے میں ایک ہیجان کروٹیں لینے لگا۔ بالکل ایک بچے کی سی معصومیت کے ساتھ، اُس نے منگے شاہ کی طرف دیکھا جو دکان بڑھانے کی فکر میں برتنوں کو سمیٹ رہا تھا۔ لیکن منگے شاہ اس کی طرف متوجہ نہ تھا۔ دوسرے گھونٹ کے ساتھ اُس کے رخساروں پر سے لڑھکتے ہوئے دو آنسو چائے کے گلاس میں جا گرے۔

منگے شاہ کے دکان بڑھا کر چلے جانے کے بعد بھی کافی دیر تک وہ اپنی ٹانگوں میں سر دیئے بچوں کی طرح روتا رہا۔ نہ جانے پھر اُس نے دری کی تہ بچھ کو سرکا کر بھٹی کے قریب کیا۔ آج پہلی بار اُسے سمجھ نہ آ رہی تھی کہ اس کے ساتھ کتنا بڑا ظلم، کتنی بے انصافی و ستم کوشی ہوئی ہے۔ اُس کی زندگی کس قدر کھوکھلی اور بے حس و حرکت ہو کر رہ گئی ہے۔ کس طرح وہ لگاتار ڈیڑھ مہینے سے ذلت و آوارگی کی زندگی کے ساتھ سمجھوتہ کئے ہوئے ہے اور ایک ناقابلِ حل عقدے کو دل میں جگہ دیئے بھٹکتا رہا ہے — باوجودیکہ اُس نے اپنے آپ کو اپنے لا انتہا خیالات کی لہروں کے رحم پر چھوڑنا کبھی گوارا نہ کیا تھا اور ہمیشہ ہی سے ان لہروں میں اُلجھ کر گم ہو جانے کے بزدلانہ خیال سے اُسے نفرت تھی۔ وہ بخوبی جانتا تھا کہ بالکل بے معنی دبے سر و پا باتیں بھی انسانی ذہن پر کس بری طرح اثر انداز ہوتی ہیں۔ لیکن اس وقت وہ سچ مچ خیالات کی رو میں بہہ رہا تھا۔ یکے بعد دیگرے لہروں کے لامتناہی ریلے اُمڈ رہے تھے اور لہروں کے اس بے ہنگم ہجوم، اس لا یعنی شور میں وہ اپنے تئیں بالکل بے قابو، بالکل بے سکت پا رہا تھا —

ماں کا پُرشفقت چہرہ کبھی نہ دیکھ سکے گا۔ ماں کے محبت بھرے کلمات کبھی نہ سُن سکے گا۔ زندگی میں ساوتری کبھی اس کے سامنے نہ ہوگی۔ ننھے عاشق کا بھیّا بھیّا کہنا اس کے کانوں میں کبھی نہ گونجے گا ——— گاؤں کا وہ چھوٹا سا گھر جو پشت در پشت سے ان کا اپنا تھا اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ وہ بھولی بھالی فضا، وہ تقویت بخش مٹی جس میں اس کا بچپن نہایا تھا۔ جہاں اُس نے جوانی کا ترش اور میٹھا پھل چکھا تھا۔ جہاں کھیتوں میں چھپ کر اس نے کنواریوں کے گیت سنے تھے۔ شیریں، رسیلے اور غمگین گیت۔ گیت جو ان کے کنوارے جذبات کی ترجمانی کرتے تھے۔ جن میں باپ کے گاؤں میں رہ کر تمام عمر کنوارپنے میں گزار دینے کی آرزو ہوتی تھی۔ جن میں اپنی ہونے والی نند اور ساس کے سلوک کے اندازے کے ساتھ ساتھ خاوند کی آمد و محبت کی تعریف ہوتی تھی۔ اور جن میں نسوانی حجاب، سماج کی قیود اور حد بندیاں اور اپنے نامراد عاشق کو سو سو تسلیاں پنہاں ہوتی تھیں۔ یہ بھی تو ......

جیسے وہ کسی انتہائی بلندی سے لڑھک کر گر پڑا ہو۔ گھبرا کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ دری جھاڑ کر اُس نے بنچ پر بچھائی اور بنچ کو سرکا کر بھٹی کے قریب کیا۔ پھر بنچ پر بیٹھ کر اور رضائی کو اپنے ارد گرد اچھی طرح لپیٹ کر ہاتھ سینکنے لگا۔

دیپو ——— دیپو کی یاد نے یکلخت لہروں کو گرداب کی صورت میں منتقل کر دیا تھا۔ اور اُسے ایک دم محسوس ہونے لگا تھا گویا اُس کے پاؤں سے کوئی غیر معمولی وزن باندھ دیا گیا ہو اور وہ نیچے ہی نیچے کسی اتھاہ گہرائی میں غرق ہوتا جا رہا ہو۔ دیپو کی یاد کو اُس نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دل سے نکال دینے کی جدوجہد کی تھی۔ یعنی وہ اسے اور اس سے متعلق ہر بات کو اپنی زندگی کے دائرے سے خارج کر دینا چاہتا تھا۔ اس کی خاطر اُس نے ماں کے منع کرنے کے باوجود گھر کے سکھ آرام کو لات مار کر شہر جا کر رہنے کی ٹھانی تھی اور اس وقت تک دوبارہ گاؤں نہ گیا تھا جب تک دیپو کا بیاہ نہ ہو گیا اور وہ سسرال چلی گئی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ دیپو کو کسی قسم کی شکایت کا موقع ملے۔ پچھلے دو برس سے دیپو سے اس کی کبھی ملاقات نہ ہوئی تھی اور نہ وہ ملاقات کا خواہاں تھا۔ ان طویل دو برسوں میں اتنا اسے یقین ہو چکا تھا کہ دیپو کی یاد آسانی سے فراموش کی جانے والی یادوں میں سے نہیں ——— جب کبھی اُسے دیپو کا خیال آیا، وہ کئی کئی دن تک دل شکستہ و مغموم رہا۔ اس کے دوستوں نے اُس کی حالت کے پیش نظر کئی فرضی معاشقے اُس سے منسوب کر رکھے تھے۔ لیکن اُس نے کبھی کسی کو اپنے دل کا راز نہ بتایا ——— "میں رو رو کر ساری عمر گزار دوں گی" ——— برگد کے بوڑھے پیڑ کی چھاؤں میں دیپو نے اُسے آنسو بھری آنکھوں سے الوداع کہتے ہوئے کہا تھا۔

"لیکن بدنامی ——" اور وہ اُسے کسی قیمت پر بدنام نہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ دیپو جسے وہ بدنام نہ کرنا چاہتا تھا۔ جسے اُس نے آج تک چھونے سے بھی احتراز کیا تھا۔ جس کی یاد اس کے ذہن کو محبت کے نورانی جذبات سے منوّر کئے رہتی تھی اور اس کے تباہ حال ہو جانے کے باوجود جس کی یاد نے اس کے دل میں اس کی غیر معمولی قربانی کا پُر تمکنت احساس قائم کیا ہوا تھا۔ وہی دیپو ——— ہاں وہی حسن و جوانی کا مخزن، وہی پاکدامنی اور پاکبازی کا مرقع آج ان وحشی اور درندہ لوگوں میں پھنسا ہوا تھا جنھیں انسانیت اور انسانیت سے متعلق کسی تلخ و ملائم جذبے سے کوئی سروکار نہ تھا جنھوں نے دل و دماغ میں بسی ہوئی ماضی کی رنگین اور سنہری یادوں کو ملیامیٹ کرنے کا اجارہ لے رکھا تھا۔ جنھوں نے مستقبل کے خوش آئند خوابوں پر ایسی درندگی کی مہریں ثبت کر دی تھیں اور جنھوں نے حال کے صبر و شکر پر خونی ڈاکہ ڈالا تھا ——— دیپو، اسی دیپو کے دالدنے ——— عورتوں کو درندوں کے چنگل سے نجات دلانے والے دفتر کے سامنے دیپو کے اغوا کی بھیانک واردات سے اُسے آگاہ کیا تھا اور انتہائی جبر سے کام لیتے ہوئے اس نے اس وقت بھی کوئی ایسا لفظ مُنہ سے نہ نکالا تھا جس سے دیپو کے ساتھ اس کا کوئی تعلق ظاہر ہو ——— وہ دیپو کو کسی قیمت پر بھی بدنام نہ کرنا چاہتا تھا۔

عورتوں کو چھڑا کر لانے والے دفتر کے سامنے دس دس بارہ بارہ برس کی معصوم لڑکیاں سے کر پچیس پچاس برس تک کی ادھیڑ عمر کی عورتیں تک کے باپ بھائی، خاوند اور بیٹے دن بھر ایک [illegible]

مرتبہ ضرور وہاں سے ہو آتا تھا۔ اگرچہ اس کا وہاں جانے کا مقصد بھی انھیں سیکڑوں عزت لٹائے ہوئے لوگوں ہی کا ساتھا جن کی مائیں، بہنیں بیویاں اور بیٹیاں اغوا کر لی گئی تھیں۔ لیکن اس کے دل کی بلاوجہ کی خود اعتمادی اسے ان کی طرح چلا چلا کر اپنی ماؤں، بیٹیوں، بہنوں اور بیویوں کا چرچا کرنے سے باز رکھتی تھی، اس کی ماں، اس کی بہن کا حشر ــــ اس کے دل کو کچھ یونہی غیر معمولی سا یقین تھا۔ ہرگز ــــ ہرگز ــــ

لیکن اُس دن اپنے گاؤں کے بے جوڑ جوان جودھا سنگھ کی زبانی اُس کی پر درد تباہی اور بربادی، اُس کی لٹی ہوئی عزت و آبرو کا حال سن کر اور اس شخص کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اس کے دل کو بہت دھچکا لگا تھا۔ پورے دو روز تک اس کی وہ کھوکھلی خود اعتمادی ڈانوا ڈول رہی تھی۔ جودھا سنگھ چوپال میں اپنی لاٹھی کے سُم کو زمین میں گاڑتے ہوئے فخریہ کہا کرتا تھا ــــ "رونا کتوں کا کام ہے جوان ــ میری بوٹی بوٹی کاٹ ڈالو۔ مجال ہے جو سی تک کر جاؤں ــــ"

جودھا سنگھ جس کی لاٹھی کے چرچے بیس بیس کوس تک ہر زبان پر تھے۔ جس کے گاؤں میں کبھی چوری نہ ہوئی تھی۔ جس کے گاؤں کے ہر فرد کو دُوسرے گاؤں والے صرف اس لئے عزت کی نظر سے دیکھتے تھے کہ وہ جودھا سنگھ کے گاؤں کا رہنے والا ہے اور جس نے بیس بیس دشمنوں کو ایک وقت میں اکیلے پچھاڑ دیا تھا، آج وہی جودھا سنگھ حیران تھا کہ کس طرح اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی عورت پر ہاتھ ڈالا گیا اور اس نے اُف تک نہ کی۔ کس طرح اس کی دونوں جوان بہنوں کو حملہ آور گھسیٹ کر لے گئے اور وہ خاموشی سے ان کا منہ دیکھتا رہ گیا اور آج وہ رو رہا تھا، رو رہا تھا اور کہہ رہا تھا ــــ "میں خود حیران ہوں کہ اس وقت کھیت میں چھپ جانے کا خیال مجھے کیسے آیا۔ کیوں نہ میں نے وہاں ہی جان دے دی"

آج از سرِ نو ان تمام واقعات کی تصویریں آنکھوں کے سامنے آتے ہی اس کا دل اور بھی تشویشناک وسوسوں میں گرفتار ہو گیا۔ اس کی لایقینی کو ٹھیس پہنچی اور اسے اپنا ہر سانس رُکتا محسوس ہونے لگا۔ لیکن ان تمام باتوں کی تلخ اہمیت کا شدید احساس ہونے کے باوجود وہ انھیں دل میں جگہ نہ دینا چاہتا تھا۔ اُسے اب بھی یقین تھا کہ اس کی ماں، اس کی بہن، اس کا بھائی بالکل محفوظ ہیں اور امرتسر کی کسی سڑک کے کنارے، کسی سائبان کے نیچے کسی چولھے ہوئے شکستہ مکان کی دہلیز پر کھڑے ــــ وہ تن کر سیدھا لیٹ گیا۔ رضائی کو اچھی طرح اوڑھ لینے کے بعد حسبِ معمول اُس نے اپنی آنکھیں آسمان پر گاڑ دیں۔ لیکن آسمان پر ستارے نہ تھے، آسمان ابر آلود تھا ــــ آج بارش ہو گی ــــ بارش کے خیال نے لمحہ بھر کے لئے اُسے اور پریشان کر دیا۔ اور جیسے سچ مچ ہی بوندا باندی شروع ہو گئی ہو، اس نے منہ پر رضائی ڈال لی۔ اس طرح رضائی منہ پر ڈال کر اُسے سونے کی عادت نہ تھی۔ اس کا سانس اور بھی گھٹنے لگا کہ منہ پر سے رضائی سرکاتے ہوئے پھر اُس نے گہرے تاریک خلا میں اپنی آنکھیں بھٹکانا شروع کر دیں۔

غیر شعوری طور پر اس کے ذہن کے پردے پر اس کے پریشان خیالات نے اپنا عکس ڈالنا شروع کیا اور خاموش خنک فضا شیطانی قہقہوں سے لرزہ براندام ہو اٹھی۔ تلواروں، نیزوں، کلہاڑیوں، بندوقوں اور بموں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ عورتوں، بچوں، جوانوں اور بوڑھوں کی دل خراش چیخیں، رقت آمیز ہاؤ ہو واضح ہوتی گئی۔ اللہ اکبر اور ست سری اکال کے فلک شگاف نعرے آپس میں گڈمڈ ہو گئے اور اُس نے دیکھا کہ وہ خود بھی ایک ننگی تلوار ہاتھ میں لئے انتہائی جوش کے عالم میں کسی نامعلوم سمت کو لپکا جا رہا ہے ــــ گھبرا کر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور اُس کی انگلیاں خود بخود اُس کے کانوں میں جا گھسیں ــــ نہیں، وہ اس قدر وحشی نہیں ہے۔ وہ انسانیت سے گرے ہوئے کسی فعل کا مرتکب نہیں ہو سکتا ــــ ناممکن!

ایکا ایکی اسے خیال آیا کہ اس دن اسے کیا ہو گیا تھا جب منگے شاہ کے ذرا سا اکسانے پر سچ مچ اُس نے تلوار ہاتھ میں لے لی تھی اور مسلم پناہ گزینوں سے بھری ہوئی ایک گاڑی پر حملہ کرنے کی نیت سے اس ہجوم میں جا شامل ہوا تھا جو کلہاڑیوں، تلواروں، نیزوں اور بندوقوں سے مسلح جوق در جوق ایک مقررہ مقام کی طرف بڑھا جا رہا تھا۔ اس کے ضمیر نے اُسے کوئی ملامت نہیں کی تھی بلکہ اُسے کچھ اس طرح محسوس ہوا تھا گویا اس کے اندر کوئی نئے جگنگا اٹھی ہو۔ لیکن بعد میں وہ اپنی اس حرکت پر کس قدر نادم ہوا تھا اور اس ندامت و پشیمانی کے زیرِ اثر نہ اُسے کھانا سوجھا نہ رات بھر اچھی

طرح نیند آ سکی تھی، جیسے وہ اپنے آپ سے چھپتا پھر رہا ہو اور کوئی تیز اور تند روشنی اس کا تعاقب کر رہی ہو۔ اُسے تعجب ہوا تھا کہ کس طرح کسی کے ہاتھوں مرنے یا اُسے اپنے ہاتھوں مار ڈالنے کے لئے ہم کسی وقت بھی آمادہ ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اسے سمجھ نہ آئی تھی کہ آخر وہ کون سے دل ہوتے ہیں جو خونریزی سے کانپ جاتے تھے ـــــ یہ ہتھے اور بے گناہ لوگوں کے سروں کو نیزوں پر اُچھالنا۔ ان کے خاک و خون میں لتھڑے ہوئے جسموں کو پاؤں تلے روندنا، کمسن بچوں کو ہوا میں اچھال کر تلواروں کی دھاروں پر روکنا۔ عورتوں کی دودھ بھری چھاتیاں کاٹ کر انھیں برہنہ نچانا یہ سب کیا تھا، یہ اس متمدن انسان کے جذبات تھے جو صدیوں سے منجھتے چلے آ رہے ہیں۔ اس بنی آدم کی کارگزاری تھی جسے فطرتاً امن پسند کہا جاتا ہے، اور جب وہ مردانگی کا جوہر دکھلانے سے پہلے ہی پلٹ آیا تھا تو منکے شاہ نے اس کی بزدلانہ حرکت پر تعجب و افسوس کا اظہار کرتے ہوئے غلیظ ترین گالی کے ساتھ کہا تھا" ان ملیچھوں پر تمھارا ہاتھ نہیں اٹھتا، جنھوں نے تمھاری بوڑھی ماں، تمھاری نوجوان بہن اور تمھارے معصوم بھائی ـــ"

لیکن اس دفعہ منکے شاہ کی ان اشتعال انگیز باتوں کی اس نے ذرا بھر بھی پروا نہ کی تھی ـــــ چاہے جو کچھ ہو، اس نے فخریہ اپنے آپ سے کہا تھا ـــــ "میں اس قدر وحشی نہیں ہوں ـــــ"

نہیں، وہ اس قدر وحشی نہیں ہے ــ چند لمحے پیشتر کے بے ہنگم خیالات سے گھبرا کر اُس کی موندی ہوئی آنکھیں پھر کھُل گئیں اور کانوں میں ٹھونسی ہوئی انگلیاں بھی اس نے باہر نکال لیں اور اپنی توجہ کو تمام اطراف سے سمیٹ کر ایک مرکز پر لانے کی کوشش کرنے لگا۔ صبح کس حیلے سے اسے کچھ پیسے دستیاب ہو سکتے ہیں۔ اس طرح تو کام نہیں چلے گا۔ لیکن اسے فوراً محسوس ہوا کہ وہ اس وقت کسی بھی ایک چیز کے بارے میں سوچ سکنے کے موڈ میں نہیں ہے۔ اس کا ذہن ٹھکانے پر نہیں، اور ذہن کا ایک آدھ لمحے کے لئے بھی ٹھکانے پر نہ ہونا ـــــ اس کا تقریباً ہر رنہی کا تجربہ تھا ـــ متواتر کئی دنوں کے غیر معمولی کرب و بے چینی کا موجب بن جاتا ہے ـــــ وہ اب سوئے گا۔

لیکن کوشش کے باوجود اپنے پر غنودگی کی کیفیت طاری کرنے میں وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کے وہ پریشان اور درد انگیز خیالات بدستور عجیب سرعت کے ساتھ اس کے دل و دماغ کو اپنی گرفت میں لیتے گئے۔ ذہن کو بیسوں جھٹکے دینے کے بعد بالآخر تنگ آ کر اُس نے اپنے تئیں اپنے ان واضح و غیر واضح خیالات کے سپرد کر دیا...... سپردگی کے عالم میں سب سے پہلے اُس نے دیو کے برہنہ جسم کو متعدد بھیڑیوں کے حلقے میں گھرے دیکھا ـــ جیسے اس کی بوٹی بوٹی نوچ لینے کی کوشش کو عمداً نامکمل چھوڑ دیا گیا ہو۔ اس نے دیکھا کہ دیو کے جسم سے جگہ جگہ خون رس رہا ہے۔ اس کے رخساروں سے، اس کی چھاتیوں سے، اس کی رانوں سے خون کی دھاریں بن رہی ہیں، جوان اور صحتمند خون کی دھاریں، لیکن وہ خاموش ہے، خاموش مبہوت اور ساکت، گویا اس کی قوت گویائی چھن گئی ہو، گویا وہ ایک بُت، ایک بے جان لاش ہو ـــ پھر بھیڑیوں کا وہ ایڑیاں اُچھال اُچھال کر ناچنا اور وحشیانہ قہقہے لگاتا ہوا ہجوم نہ جانے کہاں غایب ہو گیا اور اُس نے دیکھا دیو پوری پوشاک میں ملبوس ہے جس میں اس کے پیکر کا جہانتاب حسن برسوں اُس کی پاکدامنی و پاکبازی پر دلالت کرتا رہا تھا۔ اور ایک نہایت ہی پرسوز نغمہ اس کے لبوں پر تھرک رہا ہے اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے ہیں ـــ اور ـــ لیکن نہیں یہ اس کا واہمہ تھا، وہ دیو نہ تھی وہ اس کی اپنی بہن ساوتری تھی، ساوتری جو ہمیشہ اس سے شرماتی رہتی تھی جس کی شادی کے بارے میں پچھلے برس ماں کے ساتھ اُس نے مشورہ کیا تھا۔ پھر دفعتاً ساوتری کی بغل سے اس کی لاٹھی ٹیکتی ہوئی بوڑھی ماں بھی نمودار ہو گئی اور کہیں سے ننھا سبھاش بھی چلا آیا۔ ایک طرف ساوتری کو اپنی بغل میں لئے اور دُوسری طرف ننھے سبھاش کا ہاتھ تھامے ماں نے چلنا شروع کیا۔ ابھی انھوں نے دوسرا قدم ہی اٹھایا تھا کہ یکلخت شور و شغب کا ایک طوفان اُمنڈ آیا۔ تلواریں، نیزے اور برچھیاں چمکنے لگیں۔ بندوقوں اور بموں کے دھماکے زمین آسمان میں گونجنے لگے اور نہ معلوم کہاں سے آ کر منکے شاہ کے پر غضب الفاظ بھی اس کے کانوں میں پھٹنے لگے ـــ" ان ملیچھوں پر تمھارا ہاتھ نہیں اُٹھتا۔ ان ملیچھوں پر جنھوں نے تمھاری بوڑھی ماں، تمھاری جوان بہن، تمھارے معصوم بھائی ـــــ"

"نہیں" ـــ وہ تڑپ کر اُٹھ بیٹھا، اور دہشتناک نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ لیکن اندھیرے میں اُسے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ فضا بدستور ساکت تھی ـــ ساکن اور تاریک!

پرکاش پنڈت

فریبِ نظر

سوزِ اُلفت کا آسرا لے کر
دل کو رازِ حیات مِل نہ سکا

عمر اتنی گزار دی میں نے
تلخیٔ زیست دُور ہو نہ سکی

حُسن کی جانگداز راہوں پر
زندگی یوں فریب دیتی ہے

دل کی دنیا نثار کی میں نے
اپنی بخشش کو چھین لیتی ہے

زندگی کے حسین لمحوں میں
سرمدی زیست مجھ کو مِل نہ سکی

میری محبوب گیت گاتی تھی
ایک دُھندلا سا خواب ہو جیسے

چاندنی آبشار میں دُھل کر
روز و شب یوں گزار دیتا ہوں

ہدیۂ شوق لے کے آتی تھی
زندگی اک سراب ہو جیسے

تلخیٔ زیست کا وجود نہ تھا
اب بھی میرے حسین خوابوں میں

پاس وادی میں تھی رہِ تکمیل
مدبھری لے میں گیت گاتی ہے

سرمدی زیست طوف کرتی تھی
میری محبوب جس کی آنکھوں میں

اپنی تخئیل کی حسیں تمثیل
عہدِ رفتہ کا خواب باقی ہے

زندگی کے حسین لمحوں کی
سرمدی زیست اور وہ تکمیل

زندگی خود رقیب بن بیٹھی
اپنی تخئیل کی حسیں تمثیل

یاں میسر نہ ہو سکی تکمیل
دُور تاروں کی رہگذار میں ہے

منزلِ عشق نا تمام رہی
کہکشاں کے حسین غبار میں ہے

محمد صدیق کلیم

مطبوعات

جدید معلوماتِ سائنس

حصّہ اوّل - از آفتاب حسن ام ایس سی (علیگ) بی ایس سی (لندن)

اُردو ادب میں سائنٹفک مضامین کی کمی کو بڑی شدت سے محسوس کیا جا رہا ہے اور یہ احساس اُردو کی ترقی کا پہلا زینہ ہے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیئے بہت سے اُردو کے بہی خواہ اور خادم کام میں لگے ہوئے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب اسی کام کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ یہ کتاب دس ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب کائنات پر دوسرا ہماری زمین، تیسرا زمین کے خزانے، چوتھا حیات کے کرشمے۔ پانچواں انسان، چھٹا صحت، ساتواں نباتی دُنیا، آٹھواں حیوانی دُنیا، نواں قوت کے کرشمے اور دسواں صنعت (کاغذ سازی) پر ہے۔

کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ سائنس کے ادق مضامین کو نہایت سلیس، شگفتہ اور عام فہم زبان میں بیان کیا گیا ہے تاکہ معمولی پڑھا لکھا آدمی کائنات اور اُس کے تمام شعبوں سے واقفیت حاصل کر سکے۔ کتاب میں بیسوں قلمی اور عکسی تصویریں ہیں جن سے مضامین کے سمجھنے میں کافی مدد مل سکتی ہے۔

یہ کتاب ایک سلسلے کی پہلی کڑی ہے اور ہم فخر سے اس کتاب کا مقابلہ انگریزی "دائرۃ المعارف" قسم کی کتابوں سے کر سکتے ہیں۔ یہ کتاب انجمن ترقی اُردو کی طرف سے شائع کی گئی ہے۔ آفتاب حسن صاحب نے اس کتاب کی تصنیف سے جہاں اُردو ادب پر احسان کیا ہے، وہیں آپ نے سائنسی مضامین کو اُردو میں منتقل کرنے کے لیئے ایک راستہ بھی کھول دیا ہے۔

ضخامت ۲۷۰ صفحات جلد پوش رنگین مجلد قیمت نو روپے شائع کردہ انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی

ماہنامہ نقوش لاہور

ایڈیٹر ہاجرہ مسرور، احمد ندیم قاسمی

اُردو زبان کی نشو و نما اور ترقی میں رسائل نے بہت زیادہ حصہ لیا ہے۔ ہر روز بیسیوں کی تعداد میں نئے نئے رسائل شائع ہوتے رہتے ہیں، جس سے اُردو کی ہر دلعزیزی کا پتہ چلتا ہے

"نقوش" کا پہلا نمبر ہمارے سامنے ہے۔ ہم نہایت خوشی اور فخر سے اس پرچہ کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ یہ کوشش جہاں اُردو ادب میں ایک اضافہ ہے۔ وہیں "کتاب سازی" کی صنعت کے لحاظ سے بھی قابل قدر ہے۔ ہاجرہ مسرور اور احمد ندیم قاسمی کا نام "نقوش" کے بلند معیار کا ضامن ہے اور اس کا اپنا دعوٰی ہے کہ نقوش "زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ ہے"۔ زیر تبصرہ نمبر نہایت احتیاط سے مرتب کیا گیا ہے، اور اُن ساری خصوصیات کا حامل ہے جو ایک زندہ ادب کا خاصہ ہیں۔

نقوش کا سرورق نہایت خوبصورت اور رنگین ہے۔ قیمت فی پرچہ ایک روپیہ سالانہ چندہ دس روپے ملنے کا پتہ ادارہ فروغ اُردو لاہور

ماہنامہ ماہِ نو کراچی

ایڈیٹر سید وقار عظیم ایم۔ اے

پاکستان پبلیکیشنز کی طرف سے یہ ماہنامہ جاری کیا گیا ہے۔ اُردو پاکستان کی قومی زبان قرار پا چکی ہے ضرورت تھی کہ مرکز کی طرف سے ایک ایسا بلند پایہ پرچہ جاری کیا جائے جو پاکستان کی ثقافتی، ادبی، سماجی اور دوسری تحریکات کا آئینہ دار ہو — اُردو کی ترقی کے سلسلے میں ایک "ٹکسال" کی بھی ضرورت ہے، جہاں سے زبان کو صحت کی سند حاصل ہو سکے۔ ہمیں اُمید ہے کہ "ماہِ نو" کے ذریعے یہ کام نہایت اچھی طرح پورا کیا جا سکتا ہے۔

سید وقار عظیم کی شخصیت تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ کی زیر ادارت "ماہِ نو" کا جاری ہونا اس بات کی ضمانت ہے کہ جہاں "ماہِ نو" اُردو ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے، وہیں وہ اُردو کی بڑھتی ہوئی لسانی مشکلات کا حل بھی پیش کرتا رہے گا۔

یہ پرچہ بانصویر ہے۔ اس وقت تک تین نمبر شائع ہو چکے ہیں۔ اس میں لکھنے والے صرف پاکستان کے نامور ادیب ہی نہیں بلکہ برّاعظم ہندوستان کے نامور ادیب بھی شامل ہیں اور یوں یہ ماہنامہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان اُردو زبان کی توسیع اور ترقی کی ایک مبارک کڑی ہے۔

کتابت، طباعت نہایت عمدہ، کاغذ سفید انگریزی گٹ اَپ کافی قابلِ توجہ قیمت فی پرچہ ۸ رسالانہ ۶ ملنے کا پتہ پوسٹ بکس ۱۵۱۷ کراچی

تعلیمی ماہنامہ آموزش لاہور

ایڈیٹر سید بشیر ہاشمی

یہ تعلیمی ماہنامہ پرنسپل سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور کی زیر ادارت شائع ہو رہا ہے اور اس کا پہلا پرچہ (بابتہ ماہ مئی ۱۹۴۸ء) ہمارے سامنے ہے۔

"حصولِ پاکستان کے بعد ملّتِ اسلامیہ پاکستان کے سلسلے میں جو ذمہ داریاں اور مشکلات سامنے ہیں اُن سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اب تک مصلحتوں کا شکار ہو کر مسلمان تعلیم میں ہمیشہ پیچھے رہے اور جو تعلیم انھیں ملتی بھی رہی وہ بہت ناقص تھی۔ "آموزش" کا مقصد استقلالِ پاکستان میں اپنے فرض کو بوجوہ احسن تکمیل دینا ہے۔ نظامِ تعلیم میں جس قدر کمزوریاں ہیں انھیں حتی المقدور جلد از جلد رفع کرنے کی کوشش کر کے ایسے انتظامات کرنا ہے جس سے ملّتِ اسلامیہ پاکستان زندہ تر اور پائندہ تر ہو جائے۔"

زیرِ نظر شمارہ مندرجہ بالا مقاصد کا آئینہ دار ہے۔ ہم اس نیک کوشش کا خیر مقدم کرتے ہیں "آموزش" کے اجرا سے ایک اہم ترین قومی ضرورت پوری ہوئی ہے۔ سید بشیر ہاشمی پرنسپل ٹریننگ کالج لاہور ایک ماہرِ تعلیم کے ساتھ ساتھ بہت بڑے پایہ کے ادیب بھی ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ان کی زیر ادارت "آموزش" اپنے مقاصد میں کامیاب ہوگا۔

کتابت، طباعت اور کاغذ نہایت اعلیٰ، سرورق سادہ مگر پُرکار رسالانہ چندہ چھ روپے ملنے کا پتہ کتاب منزل لاہور

محمل

مرتبہ: موحد بدایونی

اُردو افسانہ نویسوں میں خواتین کا مقام کافی بلند ہے اور ان میں کئی صفِ اوّل کی لکھنے والی بھی ہیں۔ "محمل" خواتین کے افسانوں کا مجموعہ ہے جس میں عصمت، حجاب، مسز عبدالقادر، ڈاکٹر رشید جہاں، صدیقہ بیگم، خدیجہ مستور، حمیدہ سلطانہ، تسنیم سلیم چھتاری، زیب کا ایک ایک افسانہ شامل ہے۔ یہ سب کی سب نامور افسانہ نویس خواتین ہیں، اور اس لحاظ سے یہ مجموعہ نہایت کامیاب ہے۔ ایک مرد نے اسے مرتب کر کے اپنی فرض شناسی کا ثبوت دیا ہے۔

گٹ اَپ نہایت اچھی ہے۔ ضخامت ۲۵۶ صفحات قیمت تین روپے ناشر نظامی پریس بک ایجنسی بدایوں

شاہکار لاہور

سالنامہ ۱۹۴۸ء — قیمت دو روپے ضخامت ۱۶۰ صفحے

ایوانِ حیدرآباد

سالنامہ ۱۹۴۸ء — قیمت دو روپے ضخامت ۲۶۰ صفحات

ادبِ لطیف لاہور

سالنامہ ۱۹۴۸ء — قیمت دو روپے چار آنے ضخامت ۲۳۲

تینوں سالنامے ہمارے پیشِ نظر ہیں ان میں پوری پوری کوشش کی گئی ہے کہ ادب کی بدلتی اقدار کا لحاظ رکھ کر ایسا ادب پیش کیا جائے جو زندگی کا آئینہ دار ہو۔ کاغذ کی قلت اور دوسری دقتوں کے باوجود اس قدر ضخیم سالناموں کا شائع کرنا بذاتِ خود ایک بہت بڑا کام ہے۔

(سید منظور حسین بخاری منیجر پرنٹر پبلشر نے اتحاد پریس پل روڈ میں چھپوا کر ۳۲ لارنس روڈ لاہور سے شائع کیا، سرورق دین محمدی پریس میں چھپا)

Regd No. L.1363.

بیادگار علامہ فصیح آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔اے (اکسن) بیرسٹر ایٹ لاء
جائنٹ ایڈیٹر: شیر محمد اختر

فہرست مضامین

ہمایوں، ماہ جولائی ۱۹۴۸ء

نمبر شمار	مضمون	صاحب مضمون	صفحہ
۱	بزم ہمایوں	بشیر احمد	۲۷۴
۲	جہاں نما	بشیر محمد اختر	۲۷۵
۳	غیرت سوز (نظم)	جناب سید علی منظور صاحب	۲۷۷
۴	نظیر اکبرآبادی ایک انگریز مستشرق کی نظر میں	" اکرام قمر صاحب ایم۔اے	۲۷۸
۵	کشمیر (نظم)	" سید جعفر طاہر صاحب بی۔اے	۲۸۱
۶	از سر نو (افسانہ)	" محترمہ اختر جہاں صاحبہ	۲۸۲
۷	غزل	" قمر ہاشمی صاحب	۲۸۶
۸	ادیب (ایک گفتگو)	" آغا بابر صاحب بی۔اے (آنرز)	۲۸۷
۹	غزل	" عرش بدایونی	۲۸۹
۱۰	ساس اور بہو (نظم)	" شاد عارفی	۲۹۰
۱۱	کتاب خانہ ارسطو جاہ کی بعض نادر کتابیں	" سید آغا حسین صاحب بی۔اے	۲۹۱
۱۲	تجزیہ (نظم)	" ناظر الحسینی صاحب	۲۹۶
۱۳	خیر مقدم (نظم)	" اختر ہوشیارپوری صاحب بی۔اے ایل ایل بی	۲۹۷
۱۴	غزل	" حباب ترمذی صاحب	۲۹۷
۱۵	خواہ مخواہ (ڈرامہ)	" غیاث احمد گدی صاحب	۲۹۸
۱۶	غزل	" مضطر اکبرآبادی صاحب	۳۰۱
۱۷	غدار وطن کے نام (نظم)	" صادق نیازی صاحب کاشمیری	۳۰۲
۱۸	سراغ (افسانہ)	" پرکاش پنڈت صاحب	۳۰۳
۱۹	فریب نظر	" پروفیسر محمد صدیق کلیم	۳۱۰
۲۰	مطبوعات		۳۱۱

چندہ سالانہ ۶ صہ — ششماہی ۳ سے ر — فی پرچہ ۸ ر

بزمِ ہمایوں

اُردو کا مسئلہ تھوڑا ہی زمانہ ہوا ہندوستان میں ایک ضروری اور خطرناک ملکی مسئلہ تھا۔ اب بھی "ہندوستان" میں یہ ایک خطرناک مسئلہ ہے گو کہتے ہیں کہ اب یہ "غیر ضروری" ہو چکا ہے لیکن پاکستان میں اب یہ ایک دلچسپ اور تعمیری مسئلے کی حیثیت اختیار کر رہا ہے۔

اُردو پاکستان کی قومی زبان تسلیم ہو چکی ہے البتہ اس اعلان پر عمل ہونا باقی ہے۔ ہم خوش ہیں کہ اس عمل کی کم از کم ابتدا ضرور ہو رہی ہے، اُدھر کراچی میں محکمہ تعلیم کی سرپرستی میں تعلیمی ماہرین اور یونیورسٹیوں کے نمائندے جمع ہو کر مستقبل کا تعلیمی خاکہ تیار کر رہے ہیں، اِدھر صوبوں میں نئی تعلیم کی داغ بیل ڈالی جا رہی ہے۔ مغربی پنجاب میں محکمہ تعلیم نے ایک نئی نصاب کمیٹی مقرر کی ہے جس کے تحت بیسیوں کمیٹیاں کام کر رہی ہیں اور یونیورسٹی نے اپنے حلقے میں آئندہ کے نصاب پر غور کرنا شروع کیا ہے، یہ کمیٹیاں اور بورڈ خوب سمجھ رہے ہیں کہ زمانہ بدل گیا ہے، اب ہمارا ایک نیا ملک ہے اور ایک قوم جس کا نصب العین واضح ہو سکتا ہے اور ہمارا تعلیمی نظام لازمی طور پر اس قومی نصب العین کے مطابق ہونا چاہیئے۔ ان کمیٹیوں میں کام کرتے ہوئے ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ قومی اختلافات اور نئے نظام کے مشکل اور دلچسپ مسائل جس طرح زندگی کے دوسرے شعبوں میں موجود ہیں اسی طرح تعلیم کے حلقے میں بھی نمایاں ہیں، اختلافات حوصلہ شکن نہیں ہوتے اور نہ مضر ہوتے ہیں بشرطیکہ ہماری قومی وابستگی اور ملکی وفاداری میں کوئی شک شبہ نہ ہو۔ آج کل اگر کوئی دقت ہے تو یہی کہ بعض ملکی خطرات کے ہوتے ہوئے اختلافات ایک حد تک غیر مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ تاہم یہ بات ظاہر ہے کہ ہم خطرات کی وجہ سے ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے نہیں رہ سکتے، ہمیں ہر شعبۂ زندگی میں کام کرنا ہے، عجب نہیں کہ ہمارے خطرات ایک عرصہ کے لئے ہمارے سر سے نہ ٹلیں، عجب نہیں کہ ہمیں جنگ بھی جاری رکھنی پڑے اور زمانۂ امن کا کاروبار بھی ساتھ ساتھ چلانے پڑیں۔ اُدھر میدانِ جنگ گرم رہے، اِدھر تعلیم گاہیں معروف رہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے اور ہمیں آج یہی کرنا اور کر دکھانا ہے۔

تعلیمی کمیٹیوں میں وہ بھی ہیں جو ابھی مغربی تخیل اور طریق کار سے چمٹے رہنا چاہتے ہیں جنہیں انگریزی کو طلاق دیتے سخت رنج ہوتا ہے اور وہ بھی ہیں جو تعلیم کو یکسر "مذہبی" رنگ میں ڈبو دینا چاہتے ہیں۔ بہترین راہ اعتدال کی راہ ہے۔ پاکستان بن گیا، اب ہمیں اسے مضبوط بنانا ہے۔ اس کی بنیادیں یقیناً پاکستانی اور اسلامی ہوں گی۔ ہمیں اپنے نوجوانوں کو اپنی نئی ملکی و قومی خصوصیات سے آگاہ کرنا ہے۔ انھیں ایک نئے ملک کی شہری ضروریات سے واقف کرنا ہے۔ جس طرح ہماری قومیت دنیائے حاضر میں ایک انوکھی شے ہے کہ اُس کی بنیاد مذہب پر رکھی گئی ہے، اسی طرح یہ بھی ظاہر ہے کہ اس قومیت کو دنیائے حاضر ہی میں نشو و نما پانا ہے اُسے پیچھے کو نہیں بھاگنا اُسے آگے کی صرف سعی کرنی ہے، اُس کی روح اسلامی ہو گی اُس کا جسم پاکستانی۔ اسلام کو ہمیں ایک بوسیدہ شکل نہیں دینی بلکہ ایک زندہ حقیقت بنا کر دنیا کے سامنے پیش کرنا ہے۔ لہٰذا ہمیں قدیم و جدید کے بہترین عناصر کو یکجا کرنا اور اس مجموعے سے ایک شاندار مرکب تیار کرنا ہے جسے دیکھ کر نئی دنیا مذہب کے نام سے خائف نہ ہو نہ اُس کا مضحکہ اُڑائے بلکہ اُسے اِس میں اپنی کھوئی ہوئی روح پھر مل جائے۔

تعلیمی کمیٹیوں کو اس امر کا احساس ہو رہا ہے کہ اب جلد یا بدیر اُن کے مختلف مضامین کا ذریعۂ تعلیم و امتحان انگریزی کی بجائے اردو ہو کے رہے گی اس کے بغیر چارہ نہیں۔ میٹرک تک کی تعلیم تو آئندہ سال ہی سے تمام تر اُردو میں دی جا سکتی ہے۔ اعلیٰ تعلیم بھی چار یا پانچ سال میں اردو کا جامہ پہن سکتی ہے بشرطیکہ ہم نیک نیتی سے اپنی زبان کو اپنانا اور اس کے لئے کام کرنا چاہیں۔ سستی یا بے اعتنائی سے کچھ نہ ہو گا۔ اس کے لئے یہ اشد ضروری ہے کہ ہم تعلیمی معیار بڑھانے کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کو جھنجھوڑیں اور نئی راہ پر لگائیں جو مغربیت کے دلدادہ ہو کر اپنے قومی خصائص سے بے بہرہ بلکہ متنفر ہو چکے ہیں۔ پاکستان کی زندگی اب ایک رنگین ڈرائنگ روم کی فضا میں سانس نہ لے گی، لیکن اُدھر وہ تاریک حجروں میں بھی محبوس نہیں رہ سکے گی۔ اس کے لئے ایک ہی جگہ ہے ایک کھلا میدان اور اُس کی تازہ ہوا ---!

بشیر احمد

جہاں نُما

ایشیا کا مستقبل

دوسری جنگِ عظیم کا خاتمہ اس لحاظ سے تو ہو چکا ہے کہ اب آلاتِ جنگ سے کام نہیں لیا جا رہا، لیکن اب اقتصادی جنگ جاری ہے۔ کل کے اتحادی آج پھر حریف بنتے جا رہے ہیں۔ روس اور اُس کے حمایتی ایک طرف ہیں اور دوسری طرف امریکہ برطانیہ اور اِن کے معاونین۔ اس نئی کش مکش سے انسانیت کو پھر ایک اور خطرہ لاحق ہو رہا ہے اور وہ تیسری جنگ ہے۔ اس کا اثر یورپ اور بلقانی ریاستوں تک محدود نہیں بلکہ ترکی، عرب، ایران، شام، افغانستان، انڈیا، چین، کوریا، جاپان اور ایشیا کے باقی حصے بھی اس خطرہ کو بُری طرح محسوس کر رہے ہیں۔ دُنیا کی سیاست میں ایک نئی صورت رونما ہو گئی ہے۔ اگر روس اور امریکہ کے درمیان جنگ چھڑ گئی تو اس کی کامیابی کا انحصار ایشیا پر ہوگا۔ اس کی پوزیشن سیاسی، اقتصادی اور جنگی لحاظ سے بہت اہم ہے۔

مغرب کے لوگ بھی اب ایشیا کا مطالعہ نئے زاویہ نگاہ سے کرنے لگے ہیں۔ حال ہی میں ایک مشہور امریکی صحافی اڈمانڈ ٹیلر نے، جو امریکہ کے جنگی محکمے میں ایک معزز عہدہ پر رہ چکا ہے اور جو جنگ کے دوران میں ہندوستان میں بھی رہا ہے، ایک کتاب "Richer by India" لکھی ہے۔ جس کے چند اقتباسات اُس کے نئے زاویہ نگاہ کو پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ "شہنشاہیت" کے متعلق لکھا ہے:-

"فرنگی جو مشرق میں آباد ہو گئے تھے اُن کا ملکی لوگوں (natives) کے خلاف ہونا ایک سیاسی حقیقت تھا، بخلاف اس کے کہ ملکی لوگ اور وجہ سے فرنگی صاحب کے خلاف تھے..... ملکی لوگ فرنگیوں کی بعض باتوں کے خلاف احتجاج کرتے تھے اور صاحب ہر اس بات سے نفرت کرتے اور خوف کھاتے تھے جو اِن ملکی باشندوں میں پائی جاتی۔"

"ایشیا کے انقلابات دوسرے انقلابات کی طرح اقتصادی اور سیاسی تھے۔ یہ روٹی اور طاقت کے لئے جدوجہد تھی۔ مغرب کے انقلابات سے زیادہ ان میں ایک اور اہمیت پائی جاتی ہے اور وہ انسانی عظمت کا حصول ہے۔ ہم نے انھیں چار باتوں کی آزادی کا وعدہ دلایا تھا لیکن انھوں نے اس کے علاوہ پانچویں بات کا بھی مطالبہ کیا اور یہ وہ بات تھی جسے ہم نے بالکل نظر انداز کر رکھا تھا یعنی نسلی تحقیر سے آزادی۔"

"..... یہ صاحب کی بدتمیزی تھی جس کی وجہ سے ملکی لوگوں کو نقصان پہنچا اور اُن سے اُن کی متاعِ عزیز ذاتی عظمت چھن گئی۔ جب تک صاحب کے کردار کی اصلاح نہیں ہوتی اس وقت تک ایشیا کی نو آبادیات کا مسئلہ حل نہیں ہوگا کیونکہ مشرق کے ثقافتی معیار کے مطابق صاحب "لادین" ہے۔" (صفحہ ۱۰۲)

مصنف نے جنگ کے نظارے کئے ہیں۔ وہ "ایک دنیا" کے تصور کو جنگ کے ختم کرنے کا ذریعہ سمجھتا ہے اور یہ اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک ایشیا کا تعاون حاصل نہ ہو اور اس کے لئے ضرورت ہے کہ انسانی عظمت اور برابری کے اصول پر یہ تعاون حاصل کیا جائے۔ چنانچہ مصنف لکھتا ہے۔

"دنیا کے اتحاد کی آخری منزل کے ماسوا مجھے یُوں معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ وقت میں مُختلف حکومتوں کے درمیان توازن قائم رکھنے کے لئے ایشیا ایک نہایت اہم جزو ہے..... اگر چین کی جنگ کا انجام صلح میں ہو جائے اور وہاں نہ روس کا ہاتھ رہے اور نہ امریکہ کا تو اس پرانے دیس کے لوگوں کی ایک نئی آواز سنائی دے گی....... مغربی ذہن کو یہ سوچتے شاید دھچکا لگے کہ ایشیا کی پس ماندہ قوم جو ابھی نو آبادیات کے درجہ سے اٹھ رہی ہے بھلا کیسے مغرب کی دیو ہیکل قوتوں میں مصالحت کرانے کا کام سر انجام دے سکتی ہے۔ لیکن اب یہ کوئی ان ہونی بات نہیں رہی ایسا ہو کر رہے گا اور موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ یہ ممکن ہے۔"

کتاب کا آخری باب "انسان کی جانب واپسی" (Back to man) نہایت اہم ہے۔ چنانچہ ایشیا کے سماجی، اقتصادی، سیاسی اور ثقافتی انقلاب

کا مطالعہ کرنے کے بعد مصنف نے انسان کے مستقبل کو بھی زیر نظر رکھا ہے۔ اُسے مستقبل کے انسان پر پورا یقین ہے۔ —— وہ لکھتا ہے:-

"اپنے بھائی سے برسرِ پیکار ہونا خود اپنے آپ سے جنگ کرنا ہے۔ اپنے وارثوں سے دُور ہو جانا تو اپنے تئیں قطع کرنا ہے۔ اس سماج میں جس کا انسان ایک رکن ہے پورے طور سے حصہ لینا اس کے اندر کے کل کو مکمل کرتا ہے۔ اس شخص کی اپنی ذات کے ایک اور معنی ہو جاتے اور اُس کے اپنے ممکنات بڑھ جاتے ہیں۔"

یہ نیا زاویۂ نگاہ پُر معنی اور پُر لطف ہے۔ روس کا خدشہ امریکہ میں بُری طرح محسوس کیا جا رہا ہے اور یہ کتاب اُس کی آئینہ دار ہے۔

اُردو کا نیا وطن

اُردو زبان نے پنجاب میں جنم لیا۔ دکن میں بڑھی اور دہلی لکھنؤ میں پروان چڑھی۔ اب زمانے کے ہاتھ سے مجبور ہو کر وہ پھر اپنے ابتدائی وطن پنجاب میں لوٹ آئی ہے۔ وہ اچھی بھلی بس رہی تھی کہ اُسے دیس نکالا دیا گیا۔ پنجاب نے اُردو کو سر آنکھوں پر جگہ دی ہے۔ جتنا عرصہ وہ دیس میں رہی پنجاب برابر اُس کی خدمت کرتا رہا۔ چنانچہ بابائے اُردو نے پنجاب یونیورسٹی اُردو کانفرنس میں اس کا ذکر یوں فرمایا ہے۔

"پنجاب نے جو اُردو کی خدمت کی ہے اُس کا اعتراف نہ کرنا حد درجہ کی ناشکری ہوگی۔ حق یہ ہے کہ اُس نے اُردو کوشی اور اُردو نوازی کا وہ کام کیا ہے جو برِ اعظم پاک و ہند کا کوئی صوبہ نہ کر سکا۔ جس کثرت سے اُردو کے اخبار اور رسالے یہاں سے نکلتے ہیں اور کہیں سے نہیں نکلتے اور کمیت ہی میں نہیں کیفیت میں بھی دوسرے سب اخباروں سے سبقت لے گئے ہیں۔ سر شیخ عبد القادر، مولوی ظفر علی خاں، مہر، میاں بشیر، حمید نظامی جیسے اخبار نویس اور کہاں ہیں۔ نوائے وقت کے بعض مضامین پڑھ کر مجھے حیرت ہوتی تھی۔ قطع نظر معلومات کے ان کی زبان و بیان کی روانی اور قوت کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ اُردو زبان ان کی نہیں ہے۔ یہ تو اس وقت کی باتیں ہیں۔ اس سے بہت پہلے بھی پنجاب کے اُردو اخبار کوہ نور، پنجابی اخبار، اخبار عام اور ان کے بعد رفیقِ ہند، وکیل، وطن، پیسہ اخبار وغیرہ اپنے اپنے زمانے میں بہت مقبول اور باثر رہے ہیں۔ اس وقت یہاں بہت سے ادیب اور شاعر اور انشا پرداز ایسے ہیں کہ جن کے کلام اور افکار کو پڑھ کر مسرت ہوتی ہے۔ ان میں جدت اور تازگی ہے۔ یہ ہونہار نوجوان آئندہ اُردو ادب میں نام پیدا کریں گے۔ علاوہ عام ادبی رسالوں کے مثلاً ہمایوں، ادبی دنیا وغیرہ جو بادشاہِ مرحوم مخزن کی ذریات ہیں علمی رسالوں کی طرف بھی توجہ ہو رہی ہے۔ ابھی حال میں رسالہ "نفسیات" اور نفسیات پر چند کتابیں میری نظر سے گزریں جو بعض نوجوانوں نے لاہور سے شائع کی ہیں۔ ان میں علمی مطالب مناسب سادہ اور صاف زبان میں ادا کئے ہیں۔ "اُردو بولو" کی تحریک کچھ عرصہ سے پنجاب کے شہروں میں مقبول ہوتی جا رہی ہے۔ یہ مبارک تحریک ہماری قومی زبان کے حق میں بڑا کام کرے گی۔ آپ میں مولوی محمد شفیع، پروفیسر ڈاکٹر اقبال اور ان کے شاگرد اور اب استاد ڈاکٹر سید عبد اللہ جیسے اہلِ تحقیق اور مولوی ظفر علی خاں، پطرس، احمد شجاع، تاج، سالک، عابد علی وغیرہم جیسے ادیب بھی موجود ہیں۔

یہ سب کچھ ہوتے ہوئے ہم کیسے کہیں کہ اُردو پنجاب کی زبان نہیں۔ زبان کا نہ کوئی مذہب ہوتا ہے نہ اس کی کوئی ذات اور قوم ہوتی ہے اور نہ کوئی وطن ہوتا ہے۔ جو کوئی اس کی تحصیل میں محنت کرتا ہے اسے بولتا ہے اور صحت اور فصاحت سے لکھتا ہے اُسی کی زبان ہے اور وہی زباندان اور اہلِ زبان ہے۔ وہ پودا جسے مولوی محمد حسین آزاد، مولانا حالی، ماسٹر پیارے لال، پنڈت گوند گانی وغیرہ بزرگوں نے سینچا تھا آج آپ کی کوششوں سے تناور درخت ہوتا نظر آتا ہے۔ اس پر بھی کہنے والے کا یہ کہنا کہ اہلِ پنجاب کی اصل زبان اُردو نہیں ہے غلط نہیں ہے، لیکن میں ان سے پوچھتا ہوں کہ کیا عربوں کی آمد سے قبل اہلِ مصر کی زبان عربی تھی، کیا عراق و شام اور مراکش اور شمالی افریقہ کے دوسرے علاقوں کے باشندے عربی بولتے تھے؟ لیکن آج ان تمام ممالک کے باشندوں کی مادری زبان عربی ہے۔ اسی طرح ایک دن آنے والا ہے جب اہلِ پنجاب کی زبان اُردو ہو گی اور یہ ہو کے رہے گا۔ مجھے اور آپ میں سے بہت سوں کو یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوگا لیکن میرے اس قول کی تصدیق آپ کی آئندہ نسلیں اپنے عمل سے کریں گی۔ یہ سب کچھ جو اب تک پنجاب میں ہوا ہے اور ہو رہا ہے بہت حوصلہ افزا اور قابلِ تحسین ہے۔"

("قومی زبان" ۲۸ جون ۱۹۴۸ء)

اُردو کو مقبولِ عام بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ "اُردو بولو، اُردو پڑھو اور اُردو لکھو" کی تحریک کو تقویت دی جائے تاکہ مغربی پنجاب کے عوام اُردو زبان سے اس قدر مانوس ہو جائیں کہ یو۔ پی سے آئے ہوئے مہاجرین پنجابی بولنے پر مجبور نہ ہوں۔

شیر محمد اختر

غیریت سوز

جام پر جام ہر دم چڑھاتا رہوں شمع سے شمع پیہم جلاتا رہوں
شام سے صبح تک جگمگاتا رہوں صبح سے شام تک لہلہاتا رہوں

دامنِ طُور میں گنگناتا رہوں
وادیٔ نور میں مُسکراتا رہوں

ہیں زمان و مکاں کا نہیں پاسباں بندشِ این و آں میری حد ہے کہاں
چھوڑ دوں کیوں نہ پابندیٔ این و آں توڑ دوں کیوں نہ قیدِ زمان و مکاں

میں تقیّد سے دامن بچاتا رہوں
نُورِ مطلق سے ہی لَو لگاتا رہوں

بیدلی بیخودی اصطلاحات ہیں اصطلاحات ہیں یا خُرافات ہیں
یہ خرافات ہیں یا روایات ہیں یہ روایات ہیں یا حجابات ہیں؟

ان حجابات کو میں اُٹھاتا رہوں
شان ہر آن اپنی دکھاتا رہوں

مل گئی مجھ کو نادانیوں کی سزا خود شناسی کی اب پا رہا ہوں جزا
غیر کا وہم برسوں رہا جانگزا خود پرستی کا اب لے رہا ہوں مزا

خود پرستی کی لذّت میں پاتا رہوں
خود شناسی کے جوہر دکھاتا رہوں

کر دیا نقشِ باطل کو میں نے فنا بڑھ گیا اور بھی اعتبارِ "اَنا"
اپنی دنیا میں کی میں نے اپنی ثنا "قائلِ ظاہر" ہیں "حالِ باطن" بنا

شان اپنے اَنا کی دکھاتا رہوں
آپ ہی رنگ اپنا جماتا رہوں

ہوں کلیسا میں جا کر کبھی ارمغاں صومعہ مجھ کو سمجھے کبھی رازداں
مسجدوں میں کبھی میں ہوں خطبہ خواں مندروں میں کبھی جا کے دے دوں اذاں

عینیت کے مناظر دکھاتا رہوں
غیریت کے منادر کو ڈھاتا رہوں

کو بکو سو بسو گھومتا جاؤں میں گھوم کر اپنے مرکز پہ آجاؤں میں
برملا آؤں میں پھیلا جاؤں میں یوں خدا کی خدائی پہ چھا جاؤں میں

اپنے زیرِ اثر اُن کو لاتا رہوں
جامِ توحید جن کو پلاتا رہوں

اپنے ہاتھوں اُمنگوں کو دفنائے جو غیر کا گیت وہ مردہ دل گائے تو
کوئی حیرت نہیں لیکن اے شعلہ خو یہ گوارا نہیں مجھ شرر بار کو

خرمنِ غیر کو میں جلاتا رہوں
عارفانہ تصوّر جماتا رہوں

علی منظور

نظیر اکبر آبادی

ایک انگریز مستشرق کی نظر میں!

جب انگریزوں نے ہندوستان کے برِ اعظم میں پاؤں جمانا شروع کئے تو انھوں نے سیاسی مصلحتوں کی بنا پر یہاں کے عوام کی زبان سے قریب ہونا چاہا۔ چنانچہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ اور دلّی کالج کا قیام اسی جہت میں ایک کوشش تھی۔ علاوہ ازیں انگریزی سے ہندوستانی اور ہندوستانی سے انگریزی کے مکمل لغت بھی تیار کئے گئے۔ ان فرہنگوں کے مرتب کرنے والوں میں دو نام نمایاں ہیں، ایک پلاٹس کا اور دوسرا ڈاکٹر ایس ڈبلیو فیلن کا۔ ان فرہنگوں کو دیکھ کر بیساختہ یہ جملہ میرے منہ سے نکل جاتا ہے کہ کاش خود اہلِ ملک نے اپنی زبان کے لئے اتنی محنت اور کاوش کی ہوتی! — ان دونوں مولفوں کی فرہنگیں آج کل قریب قریب نایاب ہیں۔

کوئی چار برس کا عرصہ ہوتا ہے کہ میں مرکزی حکومت میں مترجم ہوکر آیا، تو ان ڈکشنریوں کے دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا۔ ایک دن ڈاکٹر فیلن کی "اسے نیو ہندوستانی انگلش ڈکشنری" کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ دیکھا کہ ایک طویل دیباچہ بھی شامل ہے۔ اسے پڑھنا شروع کیا اور یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ ایک انگریز نے اردو زبان کے پہلے عوامی شاعر کی قدر و قیمت کو کس طرح پہچانا ہے۔ سنہ اشاعت پر نظر گئی تو ۱۸۷۹ء نظر آیا۔ اس سے یہ تعجب اور بھی بڑھ گیا۔ یہ وہ دور تھا جب اردو کے تذکرہ نگار اور شعر و سخن کے ناقد نظیر اکبر آبادی کو قابلِ اعتنا ہی نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ انیسویں صدی تو کیا آپ بیسویں صدی کے اوائل کے کسی بھی تذکرہ کو اٹھا کر دیکھ لیجئے، نظیر اکبر آبادی کا نام شاذ ہی ملے گا۔ غالباً رام بابو سکسینہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے ادبی تذکرہ میں نظیر کو جگہ دی۔

ان دنوں محبِ محترم جناب ظہیر الدین احمد بھی دلّی ہی میں تھے۔ انھوں نے نظیر اکبر آبادی پر کافی تحقیق کی ہے۔ میں نے اُن سے استفسار کیا کہ کیا فیلن کی یہ تحریر بھی آپ کی نظر سے گزری ہے؟ انھوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ میراجی اور دوسرے دوستوں سے بھی پوچھا۔ سب کے لئے وہ تحریر نئی بھی تھی اور تعجب انگیز بھی۔ چنانچہ میں نے فیلن کے دیباچہ کا یہ حصہ نقل کر لیا کہ ڈکشنری تو نایاب ہے، لیکن نظیر اکبر آبادی کے متعلق تحقیق کرنے والوں کے لئے یہ حصہ کافی قیمتی ہے، اس لئے اسے اردو میں پیش کر دینا چاہیے۔

ڈاکٹر فیلن اپنے دیباچہ میں یہ بتاتے ہوئے کہ میں نے الفاظ و محاورات کے معانی سمجھانے کے لئے کہاں کہاں سے مثالیں لی ہیں لکھتے ہیں۔

"کہاوتوں، گیتوں، ناٹکوں، پہیلیوں وغیرہ کے علاوہ میں نے بہت سی مثالیں کبیر کے ضرب الامثال دوہوں (ساکھیوں اور شبدوں) کی دی ہیں۔ کبیر سولہویں صدی عیسوی کا ایک بہت بڑا مذہبی مصلح، طنز نگار اور معلم اخلاق تھا۔ مطبوعہ ادب میں سے میں نے سب سے زیادہ مثالیں نظیر اکبر آبادی کے شعروں کی دی ہیں۔ صرف یہی وہ ہندوستانی شاعر ہے جو مغرب کے صحیح شعری معیار پر پورا اُترتا ہے لیکن خود ہندوستان کی لفظ پرست دنیا اسے شاعر بھی تسلیم نہیں کرتی۔

"صرف نظیر ہی وہ شاعر ہے جس کے شعروں کی رسائی عوام تک ہے۔ ہر گلی کوچے میں اور بالخصوص اس کے وطن آگرہ میں اس کے شعر پڑھے اور گائے جاتے ہیں۔ عیسائی مبلغ بھی اس کے کلام سے آشنا ہیں۔ چنانچہ جب وہ گلی گلی گھوم کر تبلیغ کرتے ہیں تو کبیر کے دوہوں کے ساتھ ساتھ نظیر کے شعر بھی پیش کرتے ہیں اور سامعین پر ان شعروں کا کافی اثر ہوتا ہے۔ نظیر میں ذہن اور احساس کی وہ تمام خصوصیتیں موجود ہیں جو ایک صاحب

اک ([illegible]) میں پائی جاتی ہیں۔ اس کی نظمیں آپ بیتی ہیں، اس میں انسان اپنی مکمل انفرادیت کے ساتھ زندہ، چلتا پھرتا، اُٹھتا
نا دکھائی دیتا ہے۔ وہ صحیح معنوں میں آزاد مشرب تھا اور وہ اس کا ذکر بھی کرتا ہے۔ بہت سے افراد تارک الدنیا ہونے کا اعلان کرتے
لیکن نظیر فی الواقع ایک تارک الدنیا اور بیراگی تھا۔ اسے مقسوم کے انعامات یا حادثات کی کچھ پروا نہ تھی۔ اُسے کسی چیز کی خواہش نہ تھی
کسی مرد کو خاطر میں لاتا تھا اور نہ کسی عورت کو۔ عورت سے بس اسے اتنی دلچسپی تھی کہ دُور ہی دُور سے اس کی تعریف کی جائے۔ خوش قسمتی پر
نازاں نہ ہوتا تھا اور بد قسمتی پر متأسف نہ ہوتا۔ وہ اپنی "کھال میں مست" رہنے کا علمبردار تھا۔ اُس نے اپنے شعروں اور دوسری تحریروں کو
محفوظ رکھنے کی کوشش نہیں کی۔ کہتے ہیں وہ اپنے شاگردوں اور دوستوں کی فرمائش پہ شعر کہتا، پھر ان نظموں کو ادھر اُدھر پھینک دیتا۔
کے شاگرد اور دوست ہی ان نظموں کو اٹھا اُٹھا کر محفوظ رکھتے۔

"وہ وسیع معنوں میں غیر متقلد، طباع، اقلیت پسند اور صلح کل تھا۔ اُس کے ادراک کی ہمہ گیری کا اندازہ ان مختلف النوع موضوعوں سے
ہوتا ہے جن پر اُس نے خامہ فرسائی کی ہے۔ اُس نے عام باتوں سے شاعری پیدا کی ہے —— کوئی دوسرا ہندوستانی شاعر اس کے لئے
وہ نہیں ہوا، یا شاید کسی اور میں اس کی صلاحیت ہی نہ تھی —— نظیر کی یہی خصوصیت ملکی ناقدوں کے نزدیک اس کے شاعر نہ ہونے کی
دلیل ہے وہ کہتے ہیں کہ نظیر نے بھی کوئی شاعری کی ہے۔ اُس نے تو آٹے دال، مکھیوں اور مچھروں جیسی عام چیزوں پر قلم اُٹھایا ہے۔

اس کی نظر کی وسعت اور تخیل کی قوت کا مزید ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ اُس نے ایک ہی چیز کی مختلف حالتوں کے مختلف مرقعے پیش
کئے ہیں۔ اس کی نظمیں ایک نگار خانہ ہیں جس میں ایک دیوار پر ہندوستانی عوام کے کھیلوں اور تفریحوں کی، دُوسری پر درد و کرب کی، تیسری پر
ہی کیفیات کی اور چوتھی پر قلبی واردات کی مُنہ بولتی تصویریں آویزاں نظر آتی ہیں۔

نظیر کو فطرت کے ہر منظر اور انسانیت کے ہر رُخ سے محبت تھی۔ وہ ہر چیز میں خیر کا پہلو دیکھتا تھا۔ وہ عوام کے ساتھ ہنستا، قہقہے لگاتا اور
ٹھٹھے مارتا ہے۔ وہ ان کے کھیلوں اور تفریحوں سے لُطف اندوز ہوتا ہے۔ وہ ان کے درد کو محسوس کرتا ہے۔ صرف وہی ایک ہندوستانی شاعر ہے
جس نے بچوں کی محبت پر لکھا ہے۔ غریب اور بد قسمت لوگوں پر ترس کھایا ہے اور دنیا کے ٹھکرائے ہوئے لوگوں کو گلے لگایا ہے۔ اُس نے "آدمی نامہ"
کے عنوان سے انسان پر ایک نہایت عمدہ نظم لکھی ہے۔ اُس کے آخر میں وہ کس مؤثر انداز میں کہتا ہے ؎

اچھا بھی آدمی ہی کہاتا ہے اے نظیر
اور سب میں جو بُرا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

افلاطونی محبت کی اُس نے جس انداز میں تصویر کشی کی ہے وہ اتنی عمدہ ہے کہ نظیر ہی کا حصّہ ہے۔ نظیر کے کلام کا بہترین حصّہ کسی مطبوعہ مجموعے میں
نہیں ملتا بلکہ اس کے آزاد مشرب عقیدت مندوں اور ان پڑھ لوگوں کے ہونٹوں سے سنائی دیتا ہے۔ جن کا قلب انسانی فطرت کو محسوس کرتا ہے۔
جس کی نظیر نے عکاسی کی ہے۔ یہ خصوصیت نظیر ہی کے کلام کو حاصل ہے کہ اَن پڑھ عوام کو حفظ ہے۔ وہ شعراء جن کے کلام چھپ بھی چکے ہیں
ورنا قدر بھی ان کے کلام کے مدح خواں ہیں، ان کے کلام کو یہ شرف حاصل نہیں۔ وہ تو ان کے پڑھے لکھے ثنا خوانوں کو بھی یاد نہیں۔ لوگوں کے
ٹھٹھ کے ٹھٹھ نظیر کی مقبول عام نظمیں سنتے ہیں اور سر دُھنتے ہیں۔ ہندوستان میں جن کو شاعر سمجھا جاتا ہے، اُن کے عالم اور سخن فہم مداح بھی ان کے
کلام سے اس طرح حظ نہیں اُٹھاتے —— اَن پڑھ محظوظ ہو تو اس کا اظہار زیادہ شدید اور پُرشور ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کے قلبی محرکات زیادہ صحیح
اور سچے اور اُس کا مداح تعریف و ثنا کا زیادہ سزاوار ہوتا ہے۔

نظیر کا قلب اتنا پاکیزہ ہے اور وہ اپنے موضوع کو اس نفاست سے نبھاتا ہے کہ اگر کسی تصویر کی تکمیل کے لئے کوئی عریاں پہلو پیش کرنا
ضروری ہوتا ہے تو اس عریانی کو وہ اس خوبصورتی سے بیان کرتا ہے کہ وہ عوام بھی اس کو دیکھ نہیں پاتے جن کے لئے فحاشی پر اُتر آنا کوئی عار نہیں

اگر اُسے کسی پاکیزہ جذبے کے احسن و ارفع پہلو کو نمایاں کرنے کے لئے صنعتِ تضاد سے کام لینا پڑتا ہے تو ہوسناکی کی تصویر کو قاری کے ذہن پر مسلط نہیں ہونے دیتا کہ اُس کی آنکھیں پاکیزہ پہلو کی طرف اٹھیں ہی نہیں۔ پاکیزہ پہلو کو وہ قاری کے سامنے بتدریج پیش کرتا آتا ہے و فحش سے فحش موضوع پر قلم اٹھاتا ہے، اُس کی صحیح تصویر کشی کے لئے تیزی اور شوخی سے بھی کام لیتا ہے۔ لیکن عریانی انداز کی لطافت اور نفاست میں چھپ کر رہ جاتی ہے اور اندازِ بیان کی یہی وہ خوبی ہے جو ہر شخص سے داد کی طالب ہی نہیں بلکہ اُسے حاصل کر لیتی ہے۔

نظیر نے اپنی مادری زبان کے خزینوں کو اپنا کافی زیر بار کیا ہے۔ اس ضمن میں اُس نے وہ کچھ کیا ہے جو صرف چاسر اور شیکسپیر جیسے زبان و ادب کے بادشاہ ہی کر سکے ہیں۔ اُس نے ہندی الفاظ سے نہایت برجستہ ترکیبیں اختراع کی ہیں اور انتہائی خود اعتمادی سے کام لیتے ہوئے لفظوں کو نئی نئی بندشوں اور معنوں میں استعمال کیا ہے اور ہمیشہ کامیاب رہا ہے۔

نظیر نے اپنے کسی بھی موضوع کے کسی بھی پہلو سے بے اعتنائی نہیں برتی۔ اس کی نظموں کا بیشتر حصّہ ایک وسیع النظر مطالعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے خیال کی گہرائی ایک دُوسرے کے معنی تبلتے ہوئے لفظوں کی بندشوں کی گرفت، جتنا زیادہ غور کیا جائے اتنی ہی زیادہ واضح ہوتی جاتی ہے۔

ہندوستان کے نقّاد صرف لفظوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ چنانچہ ان کی قوّتِ فکر اِتنی ناقص ہے کہ وہ نظیر کے کلام کی وسعت اور معانی تک پہنچ نہیں پاتے اور اس کی بندشوں اور ترکیبوں کے اپنے انہی معانی کے ساتھ رائج ہو نکلنے کی صلاحیت کو بھی محسوس نہیں کر سکتے۔

ہندوستانی زبان پڑھنے والے اہلِ مغرب کے لئے یہ شاعر بالکل اجنبی ہے۔ کیونکہ ہندوستان کے عالم نقّاد اور شاعر نظیر کو اس قابل ہی نہیں سمجھتے کہ اُس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا جا سکے یا اُس کا نام ہی زبان پر لایا جا سکے۔"

(حلقۂ اربابِ ذوق شاخ راولپنڈی میں پڑھا گیا)

اکرام قمر

سجدے

جیل خانوں میں قیدیوں کو دریاں بُنتے برسوں دیکھتا رہا ہوں۔ ایک جیلخانہ میں قیدی جا نماز بُن رہے تھے۔ ہر نمازی کے لئے الگ سجادہ بڑی شان سے نمودار تھا خدا جانے کن رسمی ریا کے سجدوں سے یہ جا نماز گھسے گی؟

سچّے دلوں کے سچّے سجدے خوبصورت جا نماز کے محتاج نہیں ہوتے وقت بے وقت ادا ہوتے رہتے ہیں اور قبول کرنے والا اپنا خزانہ بھرتا رہتا ہے۔ اس خزانے میں مردوں کے سجدے کم ہوتے ہیں لیڈروں کے ہرگز نہیں ہوتے۔

ماؤں کے ہوتے ہیں جو چھوٹے بچّوں کی مُسکراہٹ دیکھ کر بغیر سر جھکائے بے اختیار دل سے نکلتے ہیں غرض کے سجدے مطلب کی دعائیں کسی شمار میں نہیں۔ سجدے وہی اچھے جن پر خوشی کی مُہر ہو۔ خوشیوں میں صرف وہی خوشی گنتی میں آتی ہے جو سچّے عجز والے دل سے نکلیں۔ امیروں کی خوشیاں بھی رائیگاں جاتی ہیں۔ محض بہلاوا ہیں۔

فلک پیما

کشمیر

گماں غلط ہے کہ ہوگا طلوعِ مہرِ مبیں
یہ سُست گام - فسردہ قمر ندیدہ رات
یہ لڑکھڑاتی ہوئی دست و پا بریدہ حیات
سوادِ نور کی جانب بڑھے یہ ناممکن
اگر تو چاہے کہ اب دن چڑھے یہ ناممکن
گھٹا گھٹا سا فلک سے دھواں دھواں سی زمیں
ہے آج لرزہ بر اندام چرخِ نیلوفریں
ہیں ڈبڈبائی ہوئی عرش و فرش کی آنکھیں
وہ لے رہا ہے زمانہ تھکی تھکی سانسیں
سفینہ اپنا کنارے لگے امید نہیں
سیاہ پوش گل و لالہ غنچہ و نسریں
سیاہیاں ہیں کہ روئے چمن پہ رقصاں ہیں
تباہیاں ہیں کہ دشت و دمن پہ رقصاں ہیں
حسیں فضاؤں میں رہ رہ کے آگ اٹھتی ہے
غمیں ہواؤں میں رہ رہ کے جاگ اٹھتی ہے
نوائے درد، نوائے الم، نوائے حزیں
ہے ایک زلزلہ بالائے عرش زیرِ زمیں
یہ تیرتی ہوئی لاشیں[1] فضا کے دامن میں
لٹک رہے ہیں جنازے[2] خلا کے آنگن میں
دلِ وجود بھی ہے اس بھنور میں گم اے دوست
فسونِ کُن ہے نہ اعجازِ حرفِ قُم اے دوست
رہا نہیں لبِ[3] عیسیٰ کی جنبشوں پہ یقیں

نظر نواز خلاؤں نے کروٹیں بدلیں ۔
فضا اگلنے لگی سُرخ سُرخ انگارے
جُھلس جُھلس کے گرے فرشِ خاک پر تارے
پگھل پگھل کے گرے تاج کبریا کے نگیں
مگر یہ دورِ قیامت بھی ہے طرب آگیں
یہ رقصِ روحِ فنا، رقصِ زندگی ہے دوست
گماں غلط ہے کہ یہ دورِ آخری ہے دوست
جہاں میں آج سے پہلے بھی زلزلے آئے
جبینِ وقت پہ لہرائے موت کے سائے
کبھی کلیسا اُٹھا اہلِ سومنات اُٹھے
بدل بدل کے نئے روپ حادثات اُٹھے
گروہ ہم کہ زمانے میں سرفراز رہے
مدام فاتحِ میدان و ہر محاذ رہے
بھلا ہمیں کوئی کیا آج آزمائے گا
جو آزمانا بھی چاہے تو مُنہ کی کھائے گا
سُنا کہ دیس کے جانباز جنگ جیت گئے
مرے حبیب قیامت کے لمحے بیت گئے
وہ دیکھ سامنے آتے ہیں زندگی کے امیں
یہی وہ مردِ مجاہد ہیں جو کہ میداں میں
اجل کے ساز پہ گاتے ہیں نغمۂ شیریں
اُٹھ اور ترانۂ خوش آمدید گا اے دوست
حیاتِ نو کی ولادت پہ مسکرا اے دوست
سُنا کہ میرا قیامت پہ اعتقاد نہیں

جعفر طاہر

---

[1] ہوائی جہاز [2] پیراشوٹ [3] مراد تمام عیسائی قومیں ہیں۔

ازسرِنو

خالد پھر چونک پڑا۔ وہ ہلکی سی کھلکھلاہٹ! بھلا دھوکا کیوں ہوتا! سائمہ کی ہنسی کو تو وہ ہزاروں قہقہوں میں پہچان سکتا تھا۔ اس کی ہلکی سی کھلکھلاہٹ اب بھی قہقہوں کے ہجوم کو چیرتی پھاڑتی خالد کے کانوں تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئی تھی، وہ اس کھلکھلاہٹ سے اس قدر مانوس تھا جیسے خود ہی ہنس پڑا ہو۔ خالد نے جلدی سے فوارہ بند کر دیا۔ آخر خود ہی کیوں نہ جا کر دیکھ لے۔ یہ الجھن تو نہ رہے گی۔ لیکن وہ تو نہانے کی غرض سے غسل خانہ میں آیا تھا۔ بالفرض سائمہ آئی بھی ہے تو فوراً ہی تو نہیں چلی جائے گی۔ برسوں بعد آئی ہے، شاید چند روز رہے۔ دوسرے ہی لمحے وہ اپنا تولیہ کرسی پہ ہی بھول آنے کے خیال سے فوراً باہر جانے کے لئے تیار ہوگیا۔ لیکن جب فوارہ بند کرتے ہوئے اس کی نظریں غیر ارادی طور پر کھونٹی کی طرف اٹھیں تو وہاں بالکل صاف ستھرا تولیہ ٹنگا تھا۔ شاید زندگی میں پہلی بار اس کی یہ خواہش پوری ہوئی تھی ورنہ ہر مرتبہ غسل خانے میں داخل ہونے سے پہلے وہ خصوصاً اپنے تولیے کا خیال رکھتا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ غسل خانے میں کبھی اُجلا تولیہ نہیں مل سکتا اور عام تولیہ جس سے ہر کوئی منہ پونچھ لیتا ہو۔ توبہ توبہ اور اگر وہ عام تولیہ خشک بھی ہو تب بھی خالد کی طبیعت گوارا نہیں کرتی تھی۔ پھر خود اسی کے چہرے کی نمی سے جذب شدہ جراثیم ازسرِنو تازگی حاصل کر لیتے ہوں گے اسے بھی رحمتِ خداوندی کہیئے یا اتفاق کہ غسل خانے میں صاف ستھرا تولیہ ٹنگا مل جائے۔ خالد مسکرایا۔ یا آج وہ نہانے میں خلافِ معمول پھرتی سے کام لے رہا تھا۔ اُس نے فوارہ پوری رفتار سے کھول دیا اور اس پر کروڑوں موتی ٹوٹ پڑے پھر وہ پانی کے موتیوں کو اپنے ہاتھوں میں جمع کرنے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ یہ کھیل وہ بچپن سے کھیلتا آ رہا تھا۔ بیماری کے زمانے میں خالد کی طبیعت چاہتی تھی کہ فوارے کے نیچے کھڑے ہو کر اپنا چہرہ اوپر کر کے آنکھیں بند کر لے۔ جیسا وہ اکثر نہانے کے دوران میں کیا کرتا تھا۔ پانی کی ٹھنڈی بوچھاڑ سے اُس کا چہرہ شل ہو جاتا لیکن وہ مسکراتا رہتا۔ آج بھی وہ مسلسل مسکرا رہا تھا۔ لیکن فوارہ کے اس کھیل میں خالد کی طبیعت بالکل نہیں لگ رہی تھی۔ کوئی شغل بھی ہو! اب وہ بچہ تو نہیں رہا تھا۔ یہ کھیل تو بچوں کے ہوتے ہیں۔ برآمدے سے برابر باتوں کی آواز آرہی تھی، باتیں اور قہقہے ——— قہقہے اور باتیں! ——— لیکن سائمہ! وہ اب خاموش بیٹھی تھی؟ خالد نے کھونٹی پر سے تولیہ اتارا۔ اس کے بازوؤں پر پانی کے قطرے چمک رہے تھے۔ آج خالد کی مسکراہٹ نے بھی اس کے ساتھ غسل صحت کیا تھا۔ اس کی مسکراہٹ شاید پہلی بار اس قدر ہلکی پھلکی ہوگئی تھی ——— بیماری کے زمانے میں یہی احساس کس قدر روزنی ہوتا تھا کہ وہ مسکرا رہا ہے۔ لیکن آج خالد برابر مسکرا رہا تھا، اور بالکل غیر محسوس طریقے پر ——— غسل خانے سے نکلتے ہوئے اس کا دل دھڑکنے لگا۔ چند سکنڈ بعد ہی وہ ایک نہایت حسین اور خوشگوار حادثے سے دوچار ہونے والا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے وہ یکایک سنجیدہ ہوگیا اور اس نے اپنی رفتار ہلکی کر دی۔ وہ بالکل انجان بن کر سائمہ کے سامنے جانا چاہتا تھا۔ جیسے اُس کی آمد سے قطعی لاعلم ہو۔ لیکن غسل خانے سے نکلتے ہی برآمدے میں بلا مقصد چلے جانا مناسب نہ تھا۔ خالد نے تپائی پر سے کنگھا اٹھا لیا اور آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ برآمدے سے باتوں کی آواز برابر چلی آرہی تھی۔ رضیہ، سعیدہ اور اس کی امی بدستور باتوں میں مشغول تھیں۔ لیکن سائمہ صرف ایک ہی بار ہنس کر چپ ہوگئی تھی۔ سائمہ بھلا خاموش بیٹھنے والی ہے۔ اگر بولتی نہیں تو ہنستی رہتی ہے اور ہنستی نہیں تو باتیں کرتی رہتی ہے ——— خالد نے کنگھا میز پر پٹخ دیا اور پھر اس کا دل بے اختیار چاہنے لگا کہ وہ برآمدے میں چلا جائے۔ سائمہ حسبِ معمول مسکرا کر اس کا خیر مقدم کرے گی اور حسبِ عادت سوالات کی بوچھاڑ کر دے گی، یہاں تک کہ وہ گھبرا جائے گا۔ نہ معلوم اب کس قسم کے سوالات کرے ——— "سکول جاتے ہو؟" ——— "بیمار کیوں ہو جاتے ہو تم؟" وغیرہ لیکن اب تو وہ کالج جاتا تھا اور آج ہی اس کے انٹر میں کامیابی کی اطلاع آئی تھی۔ شاید وہ سب سے پہلے اس کامیابی پر مبارکباد دے گی۔ تعجب نہیں جو رضیہ اور سعیدہ کے ساتھ اس نے بھی اُسے پہنانے کے لئے پھولوں کا ہار گوندھا ہو ——— خالد کے پاس اب بہت سی شکایتیں

ہو گئی تھیں۔ اُسے یقین تھا کہ وہ یہ شکایتیں ضرور سائرہ کے سامنے پیش کر سکے گا۔ اب خالد پہلے کی طرح بیوقوف سا لڑکا نہیں رہا تھا۔ اتنے لمبے عرصے اُس نے اپنی بہت سی خراب عادتیں سُدھار لی تھیں۔ اب وہ بزرگوں کے سامنے بے تحاشہ آتی ہوئی ہنسی پر قابو پالیا کرتا تھا۔ اس کے برعکس سائرہ میں ی پہ قابو پانے کی قوت بالکل نہ تھی۔ حالانکہ سائرہ خالد سے کئی سال بڑی تھی۔ اب خالد اُن بیوقوفانہ سوال پہ بہت شرمندہ ہوا کرتا تھا کہ "سائرہ یں نے آپ کو کبھی روتے ہوئے نہیں دیکھا۔" اس سوال پر سائرہ ہنس پڑی لیکن رضیہ خالد سے بے طرح ناراض ہو گئی تھی۔ اور سائرہ کے جانے کے رسیدہ نے خالد کو خوب ڈانٹا تھا۔ اس ڈانٹ ڈپٹ کے چند روز بعد جب خالد فٹ بال کھیل کر واپس آ رہا تھا تو سائرہ کے گھر کے سامنے وہ ٹھٹک ہ گیا۔ اسے خواہ مخواہ خیال آیا کہ سائرہ آپا کے کمرے میں جھانک کر دیکھے' وہ اس وقت کیا کر رہی ہوں گی۔ اور جب خالد نے ڈرتے ڈرتے کھڑکی میں سے ے کے اندر جھانکا تو سائرہ نہایت معصومانہ انداز میں جانماز پر دو زانو بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ دعا کے لئے اُٹھے ہوئے تھے اور آنکھیں آنسوؤں سے لبریز یں۔ دیکھتے ہی دیکھتے آنسو سائرہ کے رخساروں پر ڈھلک آئے' نہ معلوم اس قدر خلوص دل سے کیوں دعائیں کی جا رہی تھیں اور کس لئے؟ خالد سکرانے لا۔ سائرہ اس سے پہلے کبھی اتنی معصوم اور حسین نظر نہ آئی تھی۔ وہ ہنستے ہوئے بھی اتنی خوبصورت نہ لگتی تھی۔ خالد سوچنے لگا اور اکثر سائرہ کو ہنستے دیکھ ُسے یہی خیال آیا کرتا۔ اس روز وہ پاگلوں کی طرح سائرہ کو روتے دیکھتا رہا۔ یہ بھی نہ پوچھا کہ وہ کیوں رو رہی تھی۔ لیکن اب تو خالد کو روتے ہوئے آدمی کو لی دینے کی صلاحیت آگئی تھی۔ وہ اب سائرہ کے آنسو خشک کر سکتا تھا۔ اگر وہ روتی۔ خدا نہ کرے خالد کو یہ بھی پتہ ہو گیا تھا کہ رونا کیسے بُرے حالات میں یا کرتا ہے ———!

برآمدے میں سے اب بھی بدستور باتوں کی آواز آ رہی تھی، ہنسی کے بعد باتیں اور باتوں کے بعد ہنسی۔ لیکن سائرہ نہیں ہنس رہی تھی کیا؟ پہلے و سائرہ بے تحاشا ہنسا کرتی تھی۔ رضیہ اور سعیدہ کے قہقہوں میں سائرہ کا قہقہہ اُردو کی مشہور نظم "بارش کا پہلا قطرہ" کا مضمون پیش کرتے ہوئے

آتے ہو تو آؤ لو چلا میں

کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کے بعد تو قہقہے موسلادھار برس پڑتے۔ لیکن ان قہقہوں کے آغاز و انجام سے بے خبر ہونے کی وجہ سے وہ بہت جلد اکتا جاتا تھا۔ ان قہقہوں کا مقصد خالد کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ تینوں لڑکیوں کے قہقہے مل کر ایک اچھا خاصہ گورکھ دھندا بن جاتے تھے۔ خالد چاہتا تھا کہ صرف سائرہ ہی ہنستی رہے۔ وہ خالد کا مذاق اُڑاتی، لیکن مذاق اُڑانے کا ڈھنگ اتنا با محل اور شائستہ ہوتا تھا کہ خالد کو کبھی بُرا نہ معلوم ہوا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ سائرہ سے باتیں کرتے ہوئے اُسے کبھی اپنی کم مائگی اور چھوٹے پن کا احساس نہ ہوتا تھا۔ خالد کو سائرہ کی یہی عادت بہت پسند تھی۔ ملائمت اور توجہ! جب کبھی مستقبل کا ذکر چھڑ جاتا اور سب اپنے آئندہ کے پروگرام ایک دوسرے کو بتاتے تو رضیہ اور سعیدہ کے لمبے چوڑے ارادے اور مغرورانہ اور چھچھورے پن کی باتیں سُن کر وہ دل ہی دل میں جھنجھلا جاتا۔ محض اس لئے کہ وہ چاہتی تھیں کہ دوسرے لوگ خواہ مخواہ رشک کیا کریں۔ اس کے برعکس سائرہ اپنے آئندہ کے متعلق نہایت سادگی اور وثوق سے بتایا کرتی۔ اس کے لب و لہجہ میں اتنی صداقت اور معصومیت ہوتی تھی کہ خالد کو بجائے رشک کے ایک طرح کی بے پایاں خوشی کا احساس ہوتا۔ جیسے یہ ارادے خود اُسی کے اپنے ہوں۔ گویا سائرہ کے بلند عزائم ایک دعوت عامہ تھے۔ وہ انفرادی طور پر سارے نیک ارادوں پر اپنا دعویٰ نہیں رکھتی تھی بلکہ اس قدر بلند اور تابناک مستقبل ہر شخص کا ورثہ ہونا چاہیئے۔

طویل علالت اور مسلسل غفلت میں بھی خالد کو سائرہ کی موجودگی کا احساس رہتا تھا۔ وہ یہ بھی یاد رکھنے میں کامیاب ہو جاتا تھا کہ سائرہ آج کتنی مرتبہ اس کے کمرے میں آئی ہے اور کل نہیں آئی تھی۔ خالد کی نحیف قوت سامعہ اس کے قہقہوں کے بے شمار موتی اب بھی اپنے دامن میں بھر لیا کرتی تھی۔ لیکن جوں جوں وہ ہوشیار ہوتا گیا اُسے سائرہ کی غیر موجودگی کا احساس ہونے لگا —— ایک دن شاید وہ نیند میں تھا کہ یکایک اسے معلوم ہوا جیسے سائرہ آئی ہے۔ اس کی مخصوص خوشبو اور ریشمی کپڑوں کی سرسراہٹ اُسے بالکل اپنے ہی قریب محسوس ہوئی۔ خالد نے انتہائی کوشش کی لیکن سائرہ پر ایک نظر ڈالنے کا خیال اس کے پپوٹوں کو سہارا نہ دے سکا۔ اُس نے سائرہ کے سرد ہاتھ کا لمس اپنی پیشانی پر محسوس کیا۔ "ٹمپریچر تو اب ملا ہوا جا رہا ہے"

"خالد میاں تمہاری سائمہ آپا آئی ہیں" رضیہ کی آواز آئی، لیکن خالد کے پپوٹے تو جیسے ایک دُوسرے سے چپک کر رہ گئے تھے۔

"میں جانتی ہوں خط لکھنے کی تو تم چور ہو" خالد نے جلدی سے آنکھیں کھول لیں۔ رضیہ کے اس فقرے سے خالد نے اندازہ لگا یہ جا رہی ہے۔

"ارے نہیں بھئی تمہیں تو ہر ہفتہ خط لکھا کروں گی ―" سائمہ رضیہ سے مخاطب تھی۔ اگر وہ خالد کی طرف متوجہ ہوتی تو خالد ضرور کہاں جا رہی ہے اور کیوں جا رہی ہے؟ ― خالد میں اتنی بھی سکت نہ تھی کہ وہ سائمہ کو مخاطب کر لیتا۔ دوسرے ہی لمحے رضیہ اور سائمہ ہنستی ہوئی چلی گئیں ― اور خالد رضیہ پر جھنجھلا کر رہ گیا۔ اگر اُس نے یہ کہا تھا کہ سائمہ آپا آئی ہیں تو یہ بھی بتا دیتی کہ سائمہ آپا کہاں جا خالد کا سائمہ کے جانے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ کس قدر نامعقول ہیں رضیہ آپا۔ اگر سائمہ نے کسی نہ کسی تعلق کی بنا پر اس کی مزاج پرسی کی تھی تو ضرورت کیوں نہ سمجھی، اسے ڈر تھا کہ اگر اس نے سائمہ کے متعلق رضیہ سے پوچھا تو وہ حسب عادت جھڑک دیگی "تمہیں کیا مطلب!" وہ رضیہ سے بہت ڈرتا تھا۔ خالد کے جذبات رضیہ کی جھڑکیوں سے ٹکر نہ لے سکتے تھے ― جوں جوں خالد رو بصحت ہوتا گیا۔ اسے سا گئی۔ لیکن وہ سائمہ کے متعلق کسی سے بھی ایک لفظ پوچھنے کی جرأت نہ رکھتا تھا۔

کسی نہ کسی دن ایسا بھی ہوا کرتا تھا کہ خالد گھر میں قدم رکھتے ہی سائمہ کی موجودگی کی سی فضا محسوس کرتا۔ رضیہ اور سعیدہ کے لبوں کے ذکر و اذکار کے نقش قدم پہچان لیا کرتا تھا۔ خالد کو فوراً معلوم ہو جاتا کہ ان کے لب ابھی ابھی "سائمہ" کہہ چکے ہیں ― وہ گھ کا منتظر رہتا ―

امتحان کے زمانے میں ایک گرم سی دوپہر کو جب وہ کمرے میں داخل ہوا تو رضیہ اور سعیدہ صوفے پر بیٹھی تھیں۔ رضیہ کے ہاتھ سعیدہ اُس پر جھکی ہوئی تھی۔ دونوں مسکرا رہی تھیں، دونوں کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور چہرے دمک اُٹھے تھے۔ ضرور سائمہ کا خط بوجھل قدم اٹھاتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ابھی شیروانی کھونٹی پر لٹکا رہا تھا کہ رضیہ کی آواز آئی۔ "ارے بھئی خالد میاں! بڑے بدا کو بھولوں بھی یاد نہیں کرتے۔ دیکھو اس نے شکایت لکھی ہے۔"

"جی! ― ابھی آیا ―" وہ تجاہل عارفانہ اختیار کر کے رضیہ سے مزید پوچھنا چاہتا تھا۔ لیکن کمرے میں داخل ہوتے ہی سعیدہ سوال کر ڈالا "کیسا پرچہ ہوا؟" خالد کی طبیعت پر اوس پڑ گئی۔ سعیدہ نے گفتگو کا رُخ ہی یکایک بدل ڈالا تھا۔ وہ کیسے پوچھ لیتا کہ شکایت ہے؟ (یہ جانتے ہوئے بھی کہ سائمہ کا خط آیا ہے ظاہر ہے کہ اُسی نے شکایت لکھی ہو گی) لیکن اب وہ بات سعیدہ کے رفع دفع کر دی تھی۔

"تم کھوئے کھوئے کیوں بیٹھے ہو؟ کیا پرچہ اچھا نہیں ہوا؟"

"جی نہیں تو ― اچھا خاصہ ہو گیا۔ یونہی ذرا تھک گیا ہوں" خالد نے کھسیانی مسکراہٹ سے کہا۔ سعیدہ نے لفافہ میز دیا تھا۔ اُس نے شاید یہ نہ سوچا ہو گا کہ خالد میز کی دراز میں سے خط نکال کر پڑھ سکتا ہے۔ پھر وہ اپنی احمقانہ باتوں پر دل ہی دل بھلا انھیں کیا پتہ کہ خالد سائمہ کے خط کے لئے اس قدر بے چین ہے۔ ان کی نظر میں تو خالد وہی بے پروا اور بد اخلاق سا لڑکا تھا بھولوں بھی یاد نہیں کرتا ― اب وہ رضیہ سے کیسے کہہ دیتا کہ سائمہ آپا اُسے کس قدر یاد آتی ہیں۔ اس کا دل بے اختیار چاہتا کہ سب کچھ پوچھ ڈالے۔ آخر سائمہ آپا ہیں کہاں؟ کب آئیں گی؟ وہ سائمہ کو خط لکھے گا۔ آخر خط لکھنے میں حرج ہی کیا ہے؟ سائمہ کو سمجھتا تھا۔ لیکن رضیہ سے زیادہ سمجھنے کی جرأت اُس میں نہ تھی۔ خالد چاہتا تھا کہ رضیہ اور سعیدہ کی طرح سائمہ بھی اس کی زندگی حاصل کرے ― یکایک خالد کو احساس ہوا جیسے وہ تمام گھر میں اکیلا ہے۔ نہ جانے سب لوگ کہاں چل دیئے تھے۔ وہ جلدی

ہی لفافہ جوں کا توں رکھا تھا۔ اُس نے ہاتھ بڑھایا لیکن پھر ٹھٹھک گیا۔ خالد کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور ٹانگیں بےطرح لرز اٹھی تھیں۔ حلق خشک ہوگیا تھا۔ اس نے دراز بند کردی اور پیشانی کے پسینے کو رومال سے پونچھتا ہوا باہر آگیا۔ اُس دن کے بعد بھی کئی مرتبہ خالد میز کی طرف سائرہ کا خط نکالنے کی غرض سے گیا لیکن یہ مہم اس سے سر نہ ہوسکی۔ پھر تو اسے ہر جگہ سائرہ کے خط پڑے ملتے تھے، کارنس پر، سنگار میز پر، بعض مرتبہ تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے سائرہ کے خطوط اس کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں ——— وہ بوکھلا جاتا۔ خالد کے دل میں گھر کی ہوئی سائرہ کی قدر و منزلت نے یہ کبھی گوارا نہ کیا کہ وہ اس کے خطوط چرا کر پڑھنے کی ذلیل حرکت کرے۔

اور جب گرمیوں کی چھٹیاں آئیں تو وہ دوبارہ ٹائیفائڈ میں مبتلا تھا ——— اپنی علالت کے دوران میں وہ اکثر رضیہ سے بہکی بہکی باتیں کرتا کہ وہ دراصل بدقسمت ہے۔ کچھ دن سے خالد کو خواہ مخواہ اپنی بدقسمتی کا احساس ہونے لگا تھا۔ رضیہ اسے سمجھاتی، بھلا اس میں بدقسمتی کی کیا بات ہے؛ علالت کو تو محض اتفاق سمجھنا چاہیئے۔ جب رضیہ خالد سے بہت ہی پیار کی باتیں کرتی تو خالد کے تجسّس آمیز جذبات مچل اُٹھتے کہ سائرہ کے متعلق پوچھ ڈالے۔ لیکن عین اس وقت جب خالد الفاظ کو گھسیٹ گھسیٹ کر لبوں تک لاتا رضیہ ضرور کسی کام سے باہر چلی جاتی اور خالد جزبز ہو کر رہ جاتا ——— اس سے کبھی نہیں پوچھا جائے گا، وہ کبھی نہیں پوچھ سکتا۔

اب بھی وہ سوچ رہا تھا کہ آخر خود ہی برآمدے میں کیوں نہ چلا جائے۔ بالکل انجان بن کر جیسے سیدھا غسل خانے میں سے آرہا ہو۔ خالد پھر سنگار میز کے ساتھ جا کھڑا ہوا ——— وہ کھلکھلاہٹ سچ مچ سائرہ ہی کی تھی۔ لیکن وہ صرف ایک ہی بار کھلکھلا کر رہ گئی تھی۔ رضیہ اور سعیدہ برابر باتیں کیے جا رہی تھیں، حسب معمول ہنس بھی رہی تھیں۔ ان کے ہار اب تیاری پر تھے۔ شاید سائرہ اخبار پڑھنے میں محو ہو یا فوراً ہی چلی گئی ہو ——— وہ بوکھلا سا گیا۔ ممکن ہے چلی گئی ہو۔ دروازے میں رضیہ سے ٹکر ہوتے ہوتے بچی

"ارے خالد میاں! اب نہا کر آئے ہو! ———"

"رضیہ آپا ——— کیا ——— کیا! ——— وہ ....." دوسرے ہی لمحے پھولوں کا ڈھیر اس کے گلے کا ہار ہوگیا ——— خالد کے لبوں پر بے تابانہ آئے ہوئے الفاظ بوجھل مسکراہٹ کے قدموں تلے روندے گئے۔ وہ باوجود انتہائی کوشش کے کچھ نہ کہہ سکا ——— لیکن پھر کبھی سہی، وہ ضرور پوچھے گا ——— خالد سوچ رہا تھا.... شاید سائرہ نہیں آئی، اگر آتی تو وہ بھی ضرور اس کے لئے پھولوں کا ہار گوندھ کر لاتی ——— اگر آتی؟ ——— لیکن وہ کھلکھلاہٹ سائرہ کے ہلکے سے قہقہے کو تو وہ ہزاروں قہقہوں میں پہچان سکتا تھا۔

اختر جہاں

پرواز

بارِ غم سے دلِ ناکام ہے پژمردہ۔ نڈھال
ایک بھیگے ہوئے ٹھٹھرے سے پرندے کی مثال
جس کو پرواز ہوئی جاتی ہو اک بوجھ۔ وبال

(رحیم)

غزل

ترا آنسو مری قسمت کا ستارا تو نہیں یعنی آلام و مصائب کا سہارا تو نہیں

بات ہی اور ہے، یہ تو کہ تجھے پا نہ سکا ڈھونڈتے ڈھونڈتے میں آج بھی ہارا تو نہیں

تیز ہو جاتی ہے جب سانسوں کی آواز تو میں چونک پڑتا ہوں کہیں تو نے پکارا تو نہیں

تیری خاموش نگاہی تری آواز کا رس میرے جذبات کی تسکیں کا سہارا تو نہیں

ایک بجلی سی رگ و پے میں تڑپ جاتی ہے تیری نظروں میں نہاں کوئی شرارا تو نہیں

اُن کی آنکھوں کے چمکتے ہوئے ڈوروں میں ندیم میری آزردگی دل کا نظارا تو نہیں

تیری آنکھوں سے جو ٹپکا ہے ترے دامن پر فلکِ حسن کا ٹوٹا ہوا تارا تو نہیں

اُن کی دزدیدہ نگاہی میں قمرؔ پوشیدہ
کہیں تجدیدِ محبت کا اشارا تو نہیں

(انجمن ترقی پسند مصنفین ٹونک میں پڑھی گئی)

قمر ہاشمی

ادب

(ایک گفتگو)

آغا بابر: پاکستان کے قیام کے بعد ہر شعبۂ ملت کی تعمیر کے لئے نیا پروگرام مرتب کر رہا ہے۔ کانفرنسیں ہو رہی ہیں، کہیں خوراک کا جھنجھٹ ہے کہیں آبادکاری کی مصیبت ہے۔ ہر کس و ناکس پر ملت کی خدمت کا جذبہ طاری ہے۔ ان حالات میں ادیب اور فن کار کی طرف سوسائٹی دیکھ رہی ہے کہ یہ لوگ کب اور کس طرح موجودہ حالات کا ردِ عمل پیش کرتے ہیں۔ آپ فرمایئے عسکری صاحب، کیا سماج کی توقعات ادیبوں اور فن کاروں سے بجا ہیں یا نہیں؟

حسن عسکری: سماج کا ادیبوں اور فن کاروں سے کچھ توقعات رکھنا تو ضرور بجا ہے اور اپنے ادیبوں کو قبول کرنے سے پہلے سماج یہ پوچھنے میں بھی حق بجانب ہے کہ انھوں نے سماج کے لئے کیا کیا ہے۔ مگر اصلی بات دیکھنے کی یہ ہے کہ سماج کی توقعات ہیں کیا؟ کیا سماج ادیب سے یہ پوچھ رہی ہے کہ تم نے حکومت یا سیاسی جماعتوں کے محکمہ نشر و اشاعت کا کام کیوں نہیں سنبھالا' یا سماج چاہتی ہے کہ ادیب اپنا کام کریں؟ سماج کی توقعات پر غور کرنے سے پہلے ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ ادیب کا اصلی کام کیا ہے؟ کیوں ساحر صاحب آپ اس بارے میں کیا فرماتے ہیں؟

ساحر لدھیانوی: یہاں بات ادب کے مختلف نظریوں کی طرف چلی جائے گی، یعنی وہی ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کی بحث۔ ہم میں سے بعض ادیب ایسے بھی ہیں جو ادب یا ادیب کے کسی سماجی فریضے کو تسلیم نہیں کرتے۔ جہاں تک میری رائے کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ ادیب کا ایک سماجی فریضہ ہے اور ہر ادیب شعوری یا غیر شعوری طور پر زندگی کے کسی نہ کسی نظریئے کا مبلغ ہوتا ہے۔ اب یہ بحث الگ ہے کہ وہ نظریہ مجموعی طور پر سماج کو آگے بڑھنے میں مدد دیتا ہے یا انحطاط کی طرف لے جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ دُوسرے لوگوں کی طرح ادیب اور فن کار بھی سماج کا ایک حصّہ ہیں اور ان کا فرض ہے کہ اپنے افکار سے سماج کو صحت مند بنانے میں ترقی پسند سماجی قوتوں کی مدد کریں۔

آغا بابر: تو اس طرح تو ادب سے نشر و اشاعت کا کام لینا ہوا۔ کئی لوگ یہ سمجھنے لگیں گے کہ ادب محض پروپیگنڈا ہے۔ اور عسکری صاحب تو پہلے ہی گھبرا رہے ہیں کہ ادیب صرف محکمہ نشر و اشاعت ہی بن کر نہ رہ جائیں اور اپنے ذہنی تجربات کے بجائے کہیں کھاد کی خصوصیات اور ٹریکٹر کے فوائد ہی اپنے تحریروں میں بیان نہ کرنے لگیں۔ کیوں عسکری صاحب؟

حسن عسکری: نہیں صاحب! اتنا تو مجھے بھی تسلیم ہے کہ سماج ادیب سے صحت مندی کا مطالبہ ضرور کرتی ہے۔ اس کی تصریح میں اس طرح کرتا ہوں کہ دنیا میں صرف ایک سوال ایسا ہے جس کا کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا۔ اور وہ یہ کہ آخر انسان زندہ کیوں رہے؟ چونکہ حیاتیاتی قوانین کے ماتحت انسان زندہ رہنے اور زندہ رہنے کی خواہش کرنے پر مجبور ہے، اس لئے انسانیت کی آخری قدر یہ ہو گئی ہے کہ جو چیز انسانیت کو زندہ رہنے میں مدد دیتی ہے وہی سب سے اچھی ہے۔ ہے تو یہ ایک طرح کی خود غرضی۔ مگر یہ ایسی حیاتیاتی خود غرضی ہے جس سے مفر ممکن نہیں۔ چنانچہ اگر سماج ادیب سے صحت مندی کا مطالبہ کرے تو حق بجانب ہے۔ مگر دقت اس میں پڑتی ہے کہ آخر صحت مندی کا معیار کیا؟ اور کون مقرر کرے۔ سماج یا ادیب؟

آغا بابر: اگر آپ سچی بات پوچھتے ہیں تو صاحب میں تو یہی کہوں گا کہ یہ کام ادیب کا ہے۔

ساحر لدھیانوی: میرا خیال ہے کہ اس سلسلے میں ادیب کو سماج سے الگ کر کے سوچنا غیر ضروری ہے۔ کیونکہ ادیب کی اپنی ذات بھی بہرحال

سماج ہی کا ایک حصہ ہے اور جہاں تک صحت مندی کے معیار کا تعلق ہے وہ ہم مختلف سماجی نظریوں کی افادی حیثیت کو سامنے رکھ کر ہی قائم کر سکتے ہیں۔ نظریوں کی یہ افادی حیثیت وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے مثلاً ایک نظریہ جو آج سے دس سال پہلے کارآمد اور مفید تھا ہو سکتا ہے کہ آج وہ انسانیت کے لئے نقصان دہ ہو۔ مثال کے طور پر ایک وقت تھا جب ہمارے ملک کے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں نے ہمارے ساتھ مل کر غیر ملکی اقتدار کے خلاف جنگ کی۔ لیکن آج ہمارے دیس کے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کا یہ ترقی پسند رول ختم ہو چکا ہے آج ہمیں ان قوتوں کا ساتھ دینا ہے جو سرمایہ داری اور جاگیرداری کا خاتمہ چاہتی ہیں۔ فسادات نے ہمارے سامنے کئی ایک بالکل نئے مسائل بھی لا کھڑے کئے ہیں۔ ان میں پناہ گزینوں کا مسئلہ اور مشرقی پنجاب سے آئی ہوئی اغوا شدہ عورتوں کے مسائل سب سے اہم ہیں۔ ہمیں ان پناہ گزینوں کو زندہ رہنے کے وسائل اور ان لٹی ہوئی عورتوں کو ان کی کھوئی ہوئی سماجی حیثیت واپس دلانی ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر ہماری سماجی زندگی میں توازن نہیں پیدا ہو سکتا۔ اور ادب چونکہ ہمارے اقتصادی نظام اور سماج سے کوئی باہر کی چیز نہیں۔ اس لئے اس امر میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ خود ہمارے ادب کا ارتقا بھی اسی صورت میں ممکن ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اچھا ادب وہی فن کار پیدا کر سکتا ہے جو زندگی کی آگے بڑھتی ہوئی تحریکوں اور انسانیت کی دلی امنگوں کا عکاس ہو۔ جہاں تک کھاد اور ٹریکٹر کو موضوع بنانے کا تعلق ہے، ضروری نہیں کہ ان موضوعات پر اچھا ادب پیش نہ کیا جا سکے۔ بنگال کا قحط بجائے خود ہمارے ملک کی تاریخ کا کوئی حسین واقعہ نہیں ہے۔ لیکن کرشن چندر کا افسانہ "ان داتا" یقیناً اس قابل ہے کہ اسے اچھے ادب میں شامل کیا جائے۔ لیکن بنگال ہی کے قحط سے متعلق بعض دوسرے ادیبوں نے بھی لکھا ہے جو فنی معیار پر پورا نہیں اترتا۔ اس لئے میرے خیال میں یہ کہنا صحیح نہیں کہ خوبصورت چیز صرف خوبصورت موضوعات پر ہی لکھی جا سکتی ہے۔ کیونکہ میں ایسے ادیبوں کی تخلیقات کا بھی حوالہ دے سکتا ہوں جو جنت جیسی خوبصورت چیز کو بھی فنی عجز کے باعث بھونڈے طریقے سے پیش کرتے ہیں۔

نا بابر ۔ میرے خیال میں آپ ایک ہی سانس میں بہت سی باتیں کہہ گئے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ادب کا معجزہ اور کرشمہ یہی ہے کہ وہ ایک خوبصورت چیز کو بھونڈا بنا دے اور ایک بھونڈی چیز کو حسین شے بنا دے اور اگر آپ کو کہیں یہ کرشمہ نظر آتا ہے تو یہ ادیب کے حساس ذہن و قلب کا نتیجۂ فکر ہے مگر جہاں تک ادب میں افادی حیثیت کا تعلق ہے اس کی حدیں بھی تو ہمیں قائم کرنی چاہئیں۔ اگر ادب میں افادیت کی کوئی حد قائم نہ کی جائے تو پھر کئی ادیب جس طرح عسکری صاحب نے فرمایا ہے ایسا ادب بھی پیدا کریں گے جسے ہم ادب تو نہیں کہہ سکیں گے بلکہ وہ نشر و اشاعت کا ایک حصہ بن کر رہ جائے گا۔ آپ ہی نے ایک مثال دی ہے کہ بنگال کے قحط کے متعلق اور بھی ادیبوں نے لکھا مگر چونکہ اس میں آمد کم تھی اور آورد زیادہ، اس لئے وہ چیز اپنا کوئی مقام پیدا نہ کر سکی۔ لہٰذا اگر ادیبوں نے افادیت ہی کو پیش نظر رکھ کر قلم اٹھایا تو ایمانداری کی بات ہے کہ اس راہ پر بہتوں کے پاؤں پھسل جانے کا احتمال ہے۔ ادب میں رنگ چوکھا تو اسی وقت آتا ہے جب آواز دل سے اٹھے۔ صرف نعرے کی خاطر نعرہ بلند نہ کیا جائے اور اگر افادیت کا خیال رکھ کر ادب پیش کرنا ہے تو پھر معاف کیجئے ایسا ادب پیش کرنے والے یہی کوشش کریں گے کہ نہ ہینگ لگے نہ پھٹکری مگر رنگ چوکھا آئے۔ جو میں سمجھتا ہوں ادب کا مضحکہ اڑانے کی بات ہے۔

سن عسکری ۔ آپ اجازت دیں تو میں آپ کی بات کو دوسرے لفظوں میں بیان کر دوں۔ ادب اس تجربے سے پیدا ہوتا ہے جو ادیب حاصل کر چکا ہو نہ کہ اس تجربے سے جو ادیب حاصل کرنا چاہتا ہو۔ خواہ ادیب نے کسی پروگرام کے ماتحت لکھا ہو یا کسی پروگرام کے بغیر۔ اگر یہ چیزیں اس کے ذہنی اور تخیلی تجربے میں آ چکی ہیں تو وہ سچا ادب پیدا کر سکے گا ورنہ نہیں۔ اگر ادیب نے سچا ادب پیدا کر دیا ہے تو اس میں تھوڑا سا پروپیگنڈا شامل ہونے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ اگر سچے ادب کے ساتھ ساتھ سماج کی خدمت بھی ہوتی چلے تو اس پر کیسے اعتراض ہوگا؟

ساحر لدھیانوی - جی ہاں! اور پھر عسکری صاحب، پروپیگنڈا کس دَور کے ادب میں نہیں رہا مصیبت صرف یہ ہے کہ فراری رُجحان رکھنے والے ادیب انحطاط پسندی کو تو آرٹ کہہ کر سینے سے لگا لیتے ہیں اور اس ادب پر خالص پروپیگنڈے کا لیبل لگا دیتے ہیں جس میں انسان کو جدوجہد کے لئے اُبھارا گیا ہو۔

آغا بابر - کون کہتا ہے کہ آپ انسانیت کو جدوجہد کے لئے نہ اُبھاریئے مگر اس بات کا خیال رکھئے کہ ادب کے آئینے پر بال نہ آئے۔ باقی رہی فرار رجحان کی بات تو میرا خیال ہے کہ پنجاب کی حالیہ مصیبت نے ہم ادیبوں کو حقیقت اور واقعیت کے بالکل سامنے لا کھڑا کیا۔ ہم لاکھ آنکھیں بند کریں مگر فرار کی صورت نظر نہیں آتی۔ حقیقت ہمارے سامنے، ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑی ہے۔ اب رومان ایک طرف دبک گیا اور میں سمجھتا ہوں اِن تازہ وارد مصائب نے ہم میں حقیقت سے دوچار ہونے کی جرأت ضرور پیدا کر دی ہے۔ ادیب زندگی کو جس زاویئے سے چاہیں دیکھنے کی کوشش کریں مگر یہ خصوصیت ان میں اب مشترک ضرور ہو گئی ہے اور وہ یہی جیسا کہ میں نے عرض کیا حقیقت سے دوچار ہونے کی جرأت اور یہ جرأت ایک نیک فال ہے۔ فضا تیار ہے۔ اسباب مہیا ہیں۔ زندگی نئے سے نئے روپ میں جلوہ گر ہے۔ ادیب اور فن کار اُس سے جس طرح متاثر ہوں گے اور جن نئے نئے زاویوں سے اُسے دیکھیں گے آرٹ کی ندی تھامے نہ تھمے گی اور اُسے اسیر کرنے کی کوشش بھی لا حاصل جائے گی ؎

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے نالہ پابندِ نے نہیں ہے

فریاد اگر فریاد ہے تو وہ اثر کئے بغیر نہ رہے گی اور اگر نالہ پابندِ نے ہے تو پھر آپ خود اندازہ لگا لیجئے کہ اُس کا حشر کیا ہو گا؟

(پاکستان ریڈیو لاہور سے نشر ہوا)

آغا بابر

غزل

تری چشمِ ملتفت کا وہ کمالِ ساحرانہ
ابھی تک لُٹا رہا ہوں گُہرِ اشک کا خزانہ

غمِ مستقل نے بخشا مجھے ضبط کا خزانہ
بڑا مہرباں رہا ہے مرے حال پر زمانہ

کبھی سر بسر تغافل کبھی ہر نظر توجہ
کوئی کیا سمجھ سکے گا تری طرزِ ساحرانہ

غمِ عشق کے تصدق غمِ عشق کے تصرّف
مرا ہر نفس کہانی مری ہر نظر فسانہ

یہ اُمنگ آندھیوں کی یہ ہجوم بجلیوں کے
کہیں بن رہا ہے شاید سرِ شاخ آشیانہ

مرے دل کی وسعتوں کا کوئی مرتبہ تو دیکھے
غمِ دو جہاں کا مرکز غمِ عشق کا نشانہ

مری سجدہ ریزیوں پر کبھی سوچ ہنسنے والے
کہیں کھنچ کے آ نہ جائے ترا سنگِ آستانہ

کوئی لمحہ اور رہتیں جو ادھر کسی کی نظریں
مری ٹھوکروں میں ہوتی ابھی گردشِ زمانہ

مجھے چھوڑ کر تڑپتا کوئی اُٹھ کے جا رہا ہے
کہیں ختم ہو نہ جائے اسی باب پر فسانہ

عرش بدایونی

ساس اور بہو

اُدھر مُنہ پھیر لو اندھے کہارو
بہن ڈولے سے دولہن کو اُتارو
بلے گا سب کو حق "چیخیں" نہ مارو

میں صدقے جاؤں آنکھوں پر بٹھا لوں
بلائیں لے کے سینہ سے لگا لوں
ذرا ٹھہرو گلوری تو چبا لوں

اسی کمرے میں شمعیں تو جلا دو
گُھسے آتے ہیں بچوں کو ہٹا دو
مُری "گڑیا" کو تکیہ سے بٹھا دو

غلاف اس گاؤ پر بوٹے روپے کا
بُرا لگتا ہے اس مسند پہ "چیکا"
کسے آتا نہیں ہے یاد میکہ

پتیلی ہے، وہ لوٹا پڑا ہے
اری پھوہڑ یہ گھر کا رنگ کیا ہے
بڑی دولہن سے دو جوتے سوا ہے

مری بیزار سے موتی جڑی ہے
زباں گز بھر کی چھاتی پر پڑی ہے
تری خالہ تیرے مُنہ پر کھڑی ہے

سُنوں کب تک آزادی کا دُکھڑا
دکھاتی پھر زمانے بھر کو مکھڑا
مرا دل کون دن، ہر پردے سے اُکھڑا

نظر افزا سینما اور تھیٹر!!
رسالے، ریڈیو، پھوٹا مقدر!!
تجھے کرنا بھی ہے محمود کا گھر

میں کیا ہوں تھیں وہ جلا دن مری ساس
جو پیچھے بات پہلے... ستیا ناس
کبھی اُترا ہو شاید سر سے خناس

مٹھائی، ہار، خوشبو، تیرا شوہر
جو لاتا ہے تو شرماتا ہے گھر بھر
خدا بخشے اپٹک دیتیں وہ لیکہ

کہا کیا؟ اب نہیں ہے وہ زمانہ
تنزل ہے ترقی کا بہانہ
خُدایا! ناک اور چوٹی بچانا

شاد عارفی

کتاب خانہ ارسطو جاہ کی بعض نادر قلمی کتابیں!

عزیز القدر! [1] میں یہ خط دریائے جہلم کے کنارے سے لکھ رہا ہوں - ابھی ابھی دریا کو عبور کیا ہے - مہر خان محمد میرے ساتھ ہے - تقریباً ۱۱ بجے دن کا وقت ہے - عون والی گھڑی رات ذرا بند ہو گئی تھی - اس لئے ٹھیک وقت نہیں کہہ سکتا - ہم نے دریا ابھی ابھی عبور کیا ہے گھاٹ کے نزدیک ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے جس پر ملاحوں کے چھوٹے چھوٹے بچے کھیل رہے ہیں - دریا کے بیچ ہم لوگ پہنچے تو مجھے دریائے ستلج کی مشہور گزرگاہ تھاڑا یاد آئی جہاں سے ارسطو جاہ بہادر اور شریف العلما مرحوم حج کے لئے مع ایک بڑے قافلے کے روانہ ہوئے تھے - یہی وہ جگہ تھی جہاں ہمارے مورثِ اعلیٰ میر محمد جعفر خاں اور نواب سید فقیر اللہ خاں شہنشاہ شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے عہد میں فوجدار تھے - تلونڈی اور تھاڑا اُن کے ایلاق و قشلاق کا کام دیتے تھے اور اب ۱۵ اگست کے بعد وہ ساری حکایات و روایات ختم ہوئیں -

اونٹ مع اسباب اپنے نئے مقام کی طرف جا رہے ہیں - تھوڑے عرصہ میں سارا قافلہ اسی سمت روانہ ہوگا - یہ گاؤں تھل کے صحرا کے بالکل ملحق یہاں سے نزدیک ہے -

دریائے جہلم میں کوئی خاص کیفیت نہیں نہ وہ شور ہی ہے جو ہمالیہ کی برفانی چوٹیوں سے اُترتے وقت دریائے ستلج میں پیدا ہوتا ہے - یہ علاقہ میدانی ہیں - ممکن ہے کہ سکون اسی لئے ہو یا برسات کا موسم شور کے لئے ضروری ہو - بالکل اداس سا دریا ہے - ہمارے نزدیک ملاحوں نے آگ تاپنے کے لئے روشن کر رکھی ہے - کچھ آدمی اُس کے گرد بیٹھے ہوئے حقہ پی رہے ہیں - میں جھونپڑی کے پاس بیٹھا تمھیں پنسل کے ساتھ خط لکھ رہا ہوں - جی چاہتا تھا کہ خط کو ذرا رنگین کرنے کی کوشش کروں - لیکن کیا کیا جائے دوپہر کا وقت ہے - سورج بادلوں میں چھپا ہوا ہے - ہلکے ہلکے برسنے والے بادل گھیرے ہوئے ہیں - بارش ابھی ابھی تھمی ہے - زمین بھیگی ہوئی اور گیلی ہے - اگر شام ہوتی تو سورج سے اُس کے کئی رنگ مستعار لیتا - دریائے جہلم کی شام کے متعلق ایک خاصہ مقالہ لکھ دیتا - لیکن گو نُم مشکل و گرنہ گو نُم مشکل والا معاملہ ہے -

جھونپڑی میں دس پندرہ بھیڑیں ہیں - اُن کے صاف ستھرے بچے ادھر اُدھر کھیل رہے ہیں - یہ لیلے مجھے ٹامس ہارڈی کے اُس ناول کی یاد دلا رہے ہیں جو کہ اُس نے دور کسی سکاٹ لینڈ کے جنگل کے کنارے پہ لکھنا شروع کیا تھا جس کا عنوان ہے فار فرام دی میڈنگ کراوڈ اس سے زیادہ قدیم وضع کی جھونپڑی کبھی نہیں دیکھی - بالکل کسی افریقیائی جھونپڑی کے مشابہ ہے - جس کی تصویر ہم نے اُس نے اُس کتاب میں دیکھی تھی جو ایک ہندوستانی سیاح نے ہمیں دارالسلام سے بطور تحفہ بھیجی تھی - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کپاس کے بڑے بڑے ڈنٹھل باندھ کر رکھ گئے ہیں - اس گزرگاہ کے ملاح یہاں قیام پذیر ہیں گویا اُن کا یہ سرکاری مکان ہے - مناظر کچھ پھیکے پھیکے ہیں - اگر مجھے ایک ماہ سے زیادہ ٹھہرنا ہو ممکن ہے کہ دریائے چناب اور دریائے جہلم کی گزرگاہوں کے کچھ حالات اور ان کی دو چار شاموں کی رومانی کیفیات تحریر کر سکوں - عموماً غروب ہوتے سورج کی آخری الوداعی کیفیت زیادہ جاذبِ نظر ہوتی ہے اور اکثر لوگ اس سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں -

سردی کچھ زیادہ ہے - ہمارے ساتھ ایک پرانے نابینا بازدار کا لڑکا بھی آیا ہے - بازدار مذکور رات بھر مجھے قصے اور حکایات سناتا رہا - میں نے محسوس کیا کہ میں اگر اس فن میں کوشش کرتا تو اچھا خاصہ بازدار بن جاتا - اس بازدار نے مجھے سیاہ چشم و گلال چشم جانوروں کے قصے سنائے اور پہرہ بنانے، طعمہ دینے کے متعلق بہت سی باتیں سنائیں - ہر ایک جانور کی علیحدہ علیحدہ صید کے تذکرے کئے - اُن کے اقسام جرّہ، بوزہ

---

[1] یہ خط مصنف نے اپنے بیٹے کے نام لکھا ہے - (ایڈیٹر)

تری ناک، جانوروں کے حالات، ان کے پرزور، طاقتور، پرُعمل اور پرجگر کرنے کے طریقے بیان کئے۔ غرضیکہ میں ایک رات کے لئے آج سے تیس برس پیشتر کے ماحول میں تھا۔

میں نے اس بازدار کی حکایات سے خوب لُطف اُٹھایا۔ پرانے زمانے کو یاد کرتا رہا۔ غالب کا نسخہ حمیدیہ میرے پاس ہے۔ اتفاقاً کتاب کھُل گئی تو یہ شعر نکلا ؂

ہوں زخود رفتۂ بیدائے خیال بھول جانا ہے۔ نشانی میری

بیدائے خیال بھی کیا خوب ترکیب ہے۔

آگ بڑے زور سے جل رہی ہے۔ اگر ٹیگور اس منظر کو دیکھتا تو کسی دریا کے کنارے پر یا دریائے گنگا کی وادیوں میں کسی نوجوان ہندو بیوہ کی لاش کے اونچے سُرخ شعلوں سے اس آگ کو تشبیہ دیتا یا شاید کہہ دیتا کہ یہ آگ چودھویں رات کے چاند کے مشابہ ہے۔ جب کہ پورا چاند مہیب اور سیاہ پہاڑوں کے پیچھے سے برآمد ہو رہا ہو اور شاعر اُسے جھیل کے کنارے سے دیکھے جبکہ جھیل بالکل خاموش ہو۔ کنول کے سفید پھول جھیل کی سطح پر آہستہ آہستہ بہ رہے ہوں اور رات کے پرندے جھیل کی مرمریں اور شفاف لہروں پر کبھی کبھی آ گرتے ہوں۔

ہم نے اپنے سفر کو جاری رکھا اور گاؤں میں آ پہنچے۔ دوپہر کو آرام کیا، شام ان ٹیلوں کو دیکھنے گیا جن کے سلسلے ڈیرہ جات میانوالی اور سرگودہا تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ان ٹیلوں کے دیکھنے کے بعد واقعی قرآن مجید کے ان الفاظ کی تفسیر معلوم ہوئی جو کہ ہمارے پیش نظر نواں شہر ضلع جالندھر میں بھی پاکستان میں بڑے بڑے لق و دق جنگل اور عظیم الشان وسائل موجود ہیں اور اُس خدا کا ہزار ہزار شکر ہے جو ہمیں اُن ہیبت ناک مصائب سے نکال کر یہاں لے آیا۔ کوہ شوالک کے وہ سلسلے جو ہمالیہ کی ملحقہ وادیوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جیسا کہ اونہ، گڑھ شنکر اور روپڑ وغیرہ ہیں۔ یہ ٹیلے بالکل اسی طرح ہیں۔ یا یوں سمجھو کہ فیروز پور جھرکا کے جھر میں ہم چلے جا رہے ہیں۔ جس جگہ چشمے پر بیٹھ کر ہم نے کھانا کھایا تھا اور میر صاحب نے مچھلیاں پکڑی تھیں، وہاں سے دائیں طرف کو جو اونچا پہاڑ ہے۔ اُسی طرح کے سر بفلک ٹیلے اس ریگستان میں موجود ہیں۔ جھاڑیاں چاروں طرف نظر آ رہی ہیں اور دُور دُور تک دریائے جہلم کے کنارے سامنے کھُلے ہوئے ہیں۔ لہروں کا سماں قابل دید ہے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؂

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام • کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے قلمی شاہنامے کی سب ہو قلم تصویریں ایک جگہ پھیلا دی گئی ہیں۔ بالکل نیچے ایک کھجوروں کا نخلستان ہے۔ کئی کھیت ایک کنوئیں سے سیراب ہو رہے ہیں۔ چاروں طرف سے کھجوروں کے جھنڈ اسے گھیرے ہوئے ہیں۔ سیر بین کے وہ مناظر یاد آ رہے ہیں جو کہ دریائے دجلہ اور فرات کے نخلستانوں کے مشابہ ہیں۔ تمہیں یاد ہوگا کہ تمہارے ایک دوست نے ہمیں مصر سے بغداد کے مناظر کی بعض تصویریں بھیجی تھیں۔

آج یہاں ایک میلہ ہو رہا ہے۔ سب سے اونچے ٹیلے پر ایک پیر کا مزار ہے، اس لئے آج کبڈی وغیرہ کے کھیل پیر مذکور کی عزت افزائی کے لئے کئے جا رہے ہیں ۔۔ نوجوان کشتی اور کبڈی وغیرہ کے دیکھنے میں مصروف ہیں۔ مجھے پرسی بی شیلے کی وہ نظم یاد آئی ہے، جس کا عنوان ہے "ایک ماہی گیر لڑکا" میں نے اس کا ترجمہ بھی کیا تھا لیکن وہ بھی اپنے ساتھ نہیں لا سکا۔

میں حیران کھڑا ہوا اپنے ماضی کو یاد کر رہا ہوں۔ ایک وہ زمانہ تھا جبکہ عمّ مرحوم کے ہمراہ شام کو سیر کے لئے جگراؤں سے جانب شرق نہر سرہند کے غربی کنارے پر جایا کرتے تھے۔ سیر میں بھائی صاحب قبلہ، سید آغا حسن شہید، اور مَیں ہمراہ ہوتے تھے۔ عمّ مرحوم علمی نکات اور کتاب خانے کی بعض نادر کتب کا ذکر فرمایا کرتے تھے۔ جناب شریف العلما اور ارسطو جاہ بہادر مرحوم کی روایات کا تذکرہ ہوتا۔ ایرانی مہمانوں کی آمد پر جو اہتمام کیا جاتا تھا اُس کا ذکر فرماتے تھے۔ غرضیکہ سیکڑوں علمی مطالب و مباحث درمیان میں آتے تھے۔ سفر عراق و ایران کے حالات بیان فرماتے تھے۔ مشہد مقدس سے کربلا معلّٰی تک جو مناظر راستے میں آتے تھے، جن جن ایرانی ہوٹلوں اور آرامگاہوں میں قیام فرمایا تھا اُس کے حالات اکثر بیان فرماتے تھے۔ اُسی دن سے

مجھے بیر جند۔ قزوین وغیرہ مقامات سے ایک خاص اُنس ہے۔ اللہ اللہ! وہ بھی کیا زمانہ تھا۔ مشہور انگریزی شاعر کولرج نے جنگ کے متعلق اپنی ایک نظم میں کچھ اظہار خیال کیا ہے۔ جس کا آزاد ترجمہ لکھتا ہوں، کہتا ہے۔

"جنگ ایک خوفناک اور بھیانک بربریت ہے جسے جُرم کی کوئی پروا نہیں۔ ماں باپ سے بچوں کو چھین لیتی ہے اور اُن کو تباہ و برباد کر دیتی ہے۔ اُن کے والدین کو قتل و غارت کرتی ہے۔ خدا کی بسائی ہوئی خوبصورت دُنیا کو لُوٹ لیتی ہے۔ مات کے تمام آرام و چین کو ملیا میٹ کرتی ہے اور دن کی آسائشوں کو مصیبتوں سے بدل دیتی ہے۔"

اسی طرح جنگ نے ہمارے ساتھ کیا۔ مگر افسوس یہ ہے کہ جنگ بالکل یک طرفہ تھی اور ہم بالکل غیر مسلح کر دیئے گئے تھے۔ خیر وہ زمانہ بھی گزر گیا۔ اور بقول تمھارے اسی خدا کی مہربانی ہر وقت چاہیئے جس کو ہم خطرے میں خوب جانتے تھے اور انسانیت اور شرافت اسی میں ہے کہ آئندہ بھی جبکہ خطرہ نہیں رہا ہم اُس خدا کو نہ بھولیں۔

یہاں سے کچھ غیر مسلسل خیالات شروع ہوتے ہیں۔ جن کا ذکر کر دینا میں مناسب جانتا ہوں۔ ممکن ہے کہ وہ ہماری گزشتہ روایات کے حامل ہو سکیں مشہور امریکن تنقید نگار ایمرسن ایک جگہ لکھتا ہے کہ "دوست دراصل وہی لوگ ہیں جن کے سامنے آپ بلند آواز میں سوچ سکیں"۔ اس لئے آج میں چاہتا ہوں کہ قدرے بلند آواز میں اظہار خیال کروں۔

کچھ اپنے شوق، کچھ دُکھ درد کے قصّے، کچھ پرانی یادیں بعض بچپن کی ... پرانی قلمی کتابیں، اور چند نادر تصاویر یاد آ رہی ہیں۔ یہی غیر مربوط خیالات اس خط کے لکھنے کا باعث ہو رہے ہیں۔ مجھے یقین واثق ہے کہ تم اِن جذبات کی روح کو بھی پڑھ سکو گے۔ ایک زمانہ تھا کہ تمھارے پڑدادا جناب شمس العلما مولوی سید شریف حسین اعلی اللہ مقامہٗ زندہ تھے۔ اپنی کوٹھی واقع جگراؤں میں ان کا قیام رہتا تھا۔ دوپہر اور رات کے کھانے کے لئے گھر تشریف لے جایا کرتے تھے۔ چائے دونوں وقت کوٹھی میں تیار ہوتی تھی۔ شکر اس زمانے میں تھیلیوں میں بند ہو کر لدھیانہ سے آیا کرتی تھی۔ روسی اور چینی چائے کے ظروف اور روسی سماوار لاہور اور پشاور سے طلب فرمایا کرتے تھے۔ ۱۸۷۴ء میں حیدر آباد دکن اور نجف اشرف سے واپس تشریف لا کر ان کے معمولات اسی طرح نہایت پابندیٔ اوقات سے سرانجام پاتے تھے۔ نواب مختار الملک بہادر سر سالار جنگ اوّل چونکہ جدّ امجد جناب ارسطو جاہ بہادر مرحوم کے خاص دوست تھے اُن کی طلب پر حیدر آباد دکن میں تشریف لے گئے تھے۔ جیسا کہ میں نے اپنے ایک مضمون "میر انیس کا سفر دکن" میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ وہاں سے واپس تشریف لا کر اسی طرح پابندیٔ اوقات سے عمر بسر کی۔ کبھی کبھی اپنے پروگرام میں ترمیم بھی فرمایا کرتے تھے۔ مثلاً کسی معزز مہمان کی آمد پر اپنی رہائش گاہ کے کچھ حصّے خالی فرما دیا کرتے تھے۔ حضرت ارسطو جاہ بہادر کا بھی یہی قاعدہ تھا۔ سید جمال الدین افغانی جگراؤں میں تشریف لائے تو کتاب خانے کے پاس اُن کو ارسطو جاہ نے نہایت عزت و احترام کے ساتھ مہمان رکھا اور گھنٹوں کوٹھی کے بڑے ہال میں ایران افغانستان اور رُوس کے پولیٹکل معاملات کے متعلق آپس میں باتیں کرتے رہے۔

ارسطو جاہ بہادر کو علوم ریاضی اور علم ہیئت کا بے حد شوق تھا۔ سر چارلس ٹریولین پرنسپل دہلی کالج کی فرمائش پر بعض علم ہیئت کی انگریزی کتب کا ترجمہ اُردو میں کیا تھا۔ ممکن ہے کہ وہ تراجم کلکتے کے مدرسے سے کبھی شائع کئے گئے ہوں۔ میں نے اس کا ایک مسودہ اپنے کتاب خانے میں دیکھا تھا۔ ارسطو جاہ بہادر کچھ عرصہ کے لئے دہلی کالج میں علوم ریاضی کے استاد مقرر ہوئے تھے۔ لیکن مولوی رشید الدین خاں معلّم اوّل کے استعفے دینے پر مستعفی ہو گئے تھے۔ مولانا مرحوم نے جمعے کی تعطیل نہ کرنے کے باعث استعفیٰ دیا تھا۔ سر چارلس ٹریولین کی یہ خواہش تھی کہ ارسطو جاہ کو معلّم اوّل مقرر کریں لیکن انھوں نے انکار فرما دیا۔ اور مولانا رشید الدین خاں کی معیّت میں گوالیار، ہوشنگ آباد اور بھوپال تشریف لے گئے۔ میرے پاس اُس وقت کی ایک بیاض موجود تھی، افسوس ہے کہ اس حادثۂ عظیمہ میں ہم وہ بھی کھو آئے۔ میاں فوجدار محمد خاں، میاں کرم محمد خاں اور نواب سکندر بیگم صاحبہ نے ان ہر دو اصحاب کو اپنی علمی مجالس اور پولیٹکل معاملات میں اپنا شریک کار رکھا، اُنھی ایّام میں امیر لاہوری مشہور

شاعر اور رسالہ نواب سکندر بیگم صاحبہ کے پاس موجود تھے ۔ میری بیاض میں امیر لاہوری کے ہاتھ کی لکھی ہوئی بعض غزلیں موجود تھیں۔ ایک شعر مجھے اب تک یاد ہے ۔

شب چاندنی تھی مے تھی مگر کس قدر تھی ہوئی ۔۔۔ پر اس پہ تم جو آئے خوشی چوگنی ہوئی

غالب نے اپنا مشہور قلمی کلیات اردو میاں فوجدار محمد خاں کی خدمت میں بھیجا تھا ۔ جو کہ حال ہی میں نواب صاحب بھوپال نے نسخۂ حمیدیہ کے نام سے شائع کیا ہے ۔ اسی زمانے میں بھوپال کے خاندان سے نواب ایاز محمد خاں ارسطو جاہ بہادر کے شاگرد تھے ۔ نہیں کہہ سکتا کہ ان کی اولاد میں اب کون برسر اقتدار ہے ۔ کتاب خانے کی بعض کتب اکبر اعظم ۔ شہنشاہ جہانگیر ۔ بیرم خان خانخاناں ۔ عبدالرحیم خاں اور شاہ عالم ثانی نے وقتاً فوقتاً ہمارے مورثان اعلیٰ کو تحفہ میں دی تھیں اور بعض کتابیں علامہ فیضی کی سرکار سے سید محمود کو ملی تھیں ۔ اُن میں سے چند کتب علوم ریاضی اور علم ہیئت سے تعلق رکھتی تھیں ۔

اب میں اپنی بعض کتب کا مختصراً ذکر کرتا ہوں ۔

اوّل :۔ الصّور عبدالرحمٰن صوفی اندلسی کی مشہور تصنیف ہے ۔ مغل آرٹ کی ۴۷ تصاویر اس میں موجود ہیں ۔ وہ تصاویر ڈاکٹر فابری کیوریٹر وکٹوریہ میوزیم لاہور نے ملاحظہ کی تھیں ۔ چونکہ عجائب گھر کی پرانی قلمی تصاویر میں مغل آرٹ کا فقدان ہے ۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب موصوف کتاب عاریتاً عجائب گھر میں رکھنے کے لئے مانگتے تھے ۔ یہ کتاب شاہانِ مغل کے کتاب خانوں میں رہ چکی ہے اور نہایت نایاب چیز ہے ۔ ہمارے جد ۱۸۷۵ء میں حیدر آباد دکن تشریف فرما تھے تو جناب عزیز لکھنوی کے دادا حکیم مرزا محمد علی مرحوم بھی وہاں موجود تھے ۔ مرزا ئے موصوف جناب ارسطو جاہ بہادر کے دوست تھے ۔ الصّور کا یہ مشہور نسخہ اُس وقت جگراؤں میں تھا ۔ شریف العلماء نے جناب میرزا کی فرمائش پر حیدر آباد طلب فرمایا تھا کیونکہ حیدر آباد کے بعض علما کو اس کے دیکھنے کا بے حد شوق تھا ۔ ایسا نایاب نسخہ حیدر آباد کے کسی کتاب خانے میں موجود نہیں تھا ۔ یہ اندلسی ہیئت دان سواد مغرب میں اس لئے مشہور ہے اُس نے پیشین گوئی کی تھی کہ اڑھائی سو برس بعد آسمان کے ایک برج میں کچھ نیو بلا نسٹم کے ستارے روشن ہو جائیں گے ۔ اس پیشین گوئی کا ذکر موجودہ امریکن ہیئت دانوں نے بھی کیا ہے ۔ یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی اور ٹھیک اسی زمانے میں وہ سیاہ تاریک ستارے اُن سیاہ موتیوں کی طرح چمکنے لگے جو کہ عزیٰ اور ہبل کی آنکھوں میں جڑے ہوئے تھے جن پر کفار عرب کو بڑا ناز تھا ۔

۲ ۔ دوسری کتاب اسی مصنف کی اسطرلاب کے علم میں ہے ۔ اسطرلاب یونانی زبان کا لفظ ہے ۔ جس کے معنی ہیں ستاروں کے راستوں کی یاد اور فاصلوں کی پیمائش کا علم ۔ یہ کتاب اکبر اعظم کی پیدائش کے وقت شہنشاہ ہمایوں کے قبضے میں تھی اور جب اس نیک دل شہنشاہ نے اپنی مشہور رسدگاہ دہلی میں قائم کی تھی تو اسی کتاب سے استفادہ کیا تھا ۔ اس پر احمد آباد گجرات کے کتاب خانے کی مُہر ثبت ہے ۔ اکبر اعظم کے مشہور لائبریرین علی مراد کی تحویل میں رہ چکی ہے ۔ عبدالرحیم خان خاناں اور شہنشاہ جہانگیر کی مواہیر بھی موجود ہیں ۹۰۹ھ میں علی مراد موصوف کے قلم سے مہر محولہ بالا کے نیچے یہ عبارت درج ہے ۔ "داخل کتاب خانۂ خاصہ شُد" اس میں نقوش اور چارٹ نہایت مکمل بنے ہوئے ہیں ۔ جن سے زیچ بنانے میں امداد ملتی ہے ۔ اور ستاروں کی پیمائش کی جاتی ہے ۔ یہ کتاب بھی شہنشاہ جہانگیر نے تحفے میں دی تھی ۔

۳ ۔ علاوہ ازیں مُلّا محمد باقر داماد فخر ایشیا اعلی اللہ مقامہٗ کی مشہور تصانیف قبسات اور اُفق المبین جو کہ علامہ صلابح کی مواہیر سے ہیں ۔ ہمارے پاس موجود ہیں ۔ یہ مشہور ریاضی دان اپنے زمانے میں فرد وحید تھا اور تقدس اور پرہیزگاری میں بھی یگانۂ آفاق تھا ۔ انگلیوں کے ۔۔ کا قصہ تم نے متعدد بار پڑھا ہوگا ۔ غالباً بیباک ماہلی نے بھی اس کو نظم کیا ہے ۔ ان کی تصنیف اسلامی ریاضیات میں میرے پاس موجود ہے جس کے متعلق میرے ایک ریاضی دان دوست نے مجھے بتایا تھا کہ اس کے دوائر کو اور اقلیدس کی شکلوں کو سمجھنے کی قابلیت علوم ریاضیات کے کسی ایم ۔ اے کو نہیں ہے ۔ صرف کیمبرج یونیورسٹی کے رینگلر اسے سمجھ سکیں گے ۔ مجھے علم نہیں کہ پاکستان میں اس وقت کون سے ایسے اصحاب ہیں ۔ ڈاکٹر

مرحیات پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور سے میں نے ایک دفعہ ذکر کیا تھا۔ اگر اُن سے ملنے کا اتفاق ہو تو وہ آنکھیں ضرور دکھانا۔ اس کتاب کو سر شاہ
ان فیڈرل کورٹ کے جج کسی زمانے میں دیکھنا چاہتے تھے اور میرے پاس فیروز پور جھرکا ضلع گوڑگانواں میں آنے کے لئے تیار تھے۔ لیکن کتاب
بت جگراؤں میں تھی اس لئے مرحوم اس کتاب کو نہ دیکھ سکے۔ میرے دوست ڈاکٹر رضی الدین صدیقی نے جو کہ دورانِ جنگ میں علومِ ریاضیات
بل پرائز کے لئے نامزد کئے گئے تھے۔ کوڈاکنال سے تحریر فرمایا تھا کہ اگر سر شاہ محمد سلیمان کا اچانک اور بے وقت انتقال نہ ہوتا تو انھوں نے اکثر
ی علوم کی اور خصوصاً علوم ریاضی کی کتب شائع کرنے کا التزام کیا ہوا تھا۔

۴۔ اسی طرح عجائب المخلوقات کا ایک نسخہ ہمارے پاس موجود ہے جو کہ ہمارے مورثِ اعلیٰ میر محمد جعفر خاں کو شاہ جہاں نے سولہ برس کی عمر میں
ت فرمایا تھا۔ جب کہ انھوں نے ایک پہاڑی راجہ کو گرفتار کر کے شہنشاہ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ غالباً یہ راجہ بلاسپور کا مورثِ اعلیٰ تھا۔ اس
ن بخشی بھی بحکم شاہ جہاں موصوف نے کر دی تھی اور دوبارہ ریاست میں جاکر اُسے متمکن بہ ریاست بھی کیا تھا۔ اس راجہ نے نواب جعفر خاں
ہلی واپس آنے سے پیشتر کچھ تحائف پیش کئے تھے۔ اُن میں سے اُنھوں نے صرف ایک ایرانی تلوار پسند فرمائی تھی۔ جس سے راجہ مذکور
ہے کے اہرن کو کاٹا تھا۔

۵۔ ایک نسخہ آئینِ اکبری بڑا ہی بیش قیمت موجود ہے۔ یہ کتاب ابوالفضل کی زندگی میں لکھی گئی تھی۔ ممکن ہے علامہ ممدوح نے خود بھی دورانِ کتابت
سے ملاحظہ کیا ہو۔ افسوس ہے کہ اُس کا صفحۂ اوّل غائب ہے۔ نہیں معلوم کس طرح ضائع ہوا۔ چونکہ با تصویر اور منقش تھا، اس لئے غالباً کسی نے نکال
اغذ کی نوعیت سے صاف پتہ چلتا ہے کہ حلب یا بیروت کا بنا ہوا ہے۔ کاغذ خاص طور سے بیروت سے شہنشاہ اکبر کے خوشنویس کاتبوں اور
روں کے استعمال کے لئے منگوایا جاتا تھا۔

۶۔ مولانا عبدالرزاق لاہجی کی مشہور تصنیف گوہر مراد چار سو برس کی لکھی ہوئی موجود ہے۔ اس کا خط اور کاغذ ایرانی ہیں۔ ڈاکٹر براؤن نے
اب تاریخ ادب ایران میں کسی جگہ گوہر مراد کے پُرانے نسخوں کا ذکر کیا ہے اور رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی فہرست میں اس نسخہ کا ذکر ہے۔

۷۔ ایک رسالہ مابعد الطبیعات میں موجود ہے۔ جس پر شہنشاہ جہانگیر کے لائبریرین قلیچ کی مہر ثبت ہے۔ اس کے متعلق علامہ اقبال مرحوم نے
ے دادا مرحوم کو ایک خط کے دوران میں لکھا تھا کہ "افسوس! جگراؤں آنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا ورنہ آپ کے کتاب خانے کے نوادر
ر مجھے دلی مسرت ہوتی"۔

۸۔ مہر نیمروز غالب کی مشہور تاریخ کا وہ مسودہ جو انھوں نے ۱۸۵۲ء میں ارسطو جاہ بہادر مرحوم کی خدمت میں ارسال کیا تھا جس کا ذکر
اکرام آئی سی ایس نے اپنی کتاب غالب نامہ میں کیا ہے۔

۹۔ کتاب عوارف المعارف ہمارے پڑنانا شیخ شہاب الدین سہروردی کی تصنیف ہے اور مجدد الف ثانی کے بڑے بیٹے شیخ محمد صادق

ب خانہ ارسطو جاہی لارڈ کرزن کے مشہور کتاب خانہ ہائے مشرق میں درج ہے۔ یہ کتاب خانہ بھی مشرقی پنجاب کے خونی واقعات کے دوران میں غارت ہو گیا اور وہی حشر ہوا
ا پرانے کتاب خانوں کا ہوا کرتا ہے۔ لارڈ ہارڈنگ نے اس کتاب خانے کا ملاحظہ سکھوں کی لڑائیوں کے دوران میں ۱۸۴۶ء میں کیا تھا۔ حضرت غالب مرحوم
نے ایک قطعہ میں اُن لڑائیوں کا ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

دشتے کہ بر کنارہ دریائے ستلج است — گردید جلوہ گاہِ دو سدِ سکندری

لارڈ موصوف نے ایک رات ہمارے یہاں بسر کی تھی۔ جناب ارسطو جاہ بہادر سے سر ہنری لارنس، سر جان لارنس اور سر ولیم میکیس کے متعلق مشورہ کیا تھا۔ ارسطو جاہ بہادر
ر ہنری لارنس کے ریذیڈنٹ پنجاب مقرر کرنے کیلئے صلاح دی تھی۔ ایڈورڈ ہنری پامر ہنری لارنس اور سر جارج کلارک نے اس کتاب خانے کی بعض قلمی کتب سے استفادہ کیا تھا۔

سرہندی نے اُسے ۱۶۱۴ء میں بہ عہدِ جہانگیر بادشاہ کتابت کیا ہے۔ یہ کتاب خط قوسِ قلم میں ہے۔ خط نہایت پختہ ہے۔ میں نے اس نسخے کے متعلق دیرہوئی ایک مضمون اخبار "انقلاب" لاہور میں لکھا تھا۔

۱۰۔ شاہنامہ فردوسی۔ یہ شاہنامہ شہزادہ دارا شکوہ کے لئے لکھا گیا تھا۔ نہایت درجہ خوش قلم ہے اعلیٰ قسم کا کاغذ لگایا گیا ہے۔ تصاویر کے لئے بھی وہی کاغذ استعمال کیا گیا ہے جو کتابت کے لئے۔ جدول سنہری اور منقش۔ کام اپنی آپ نظیر ہے۔ تقریبًا بارہ سو سنہری صفحات پر یہ کتابت کا شاہکار ختم ہوا ہے۔ ۔۔۔ ۵۰ کے قریب بڑے سائز کی قلمی تصاویر ہیں جو کہ ایرانی آرٹ کا نہایت نفیس نمونہ ہے۔ یہ کتاب نہایت درجہ کمیاب اور بیش قیمت ہے اور واقعی نفیس ترین آرٹ اس کی تیاری میں صرف ہوا ہے۔ محمود کی ہجو کے مکمل اشعار دیباچے میں موجود ہیں۔ فردوسیؒ کے روضے اور قبر کی اندرونی تصاویر سے بھی اسے مزین کیا گیا ہے۔

۱۱۔ ایک مختلف قطعات کا البم بھی ہمارے پاس موجود ہے۔ یہ قطعات مختلف اوقات میں شاہانِ مغلیہ کے خوشنویس کاتبوں نے تحریر کئے ہیں اور بوقلموں اور رنگا رنگ جدولوں سے اُسے آراستہ کیا گیا ہے۔ محمد حسین کشمیری۔ میر علی کاتب۔ محمد ہاشم عنبریں قلم۔ شیریں رقم کاتبوں نے اس مجموعے میں جابجا کتابت کی ہے۔ یہ بھی آرٹ کا بہترین نمونہ ہے۔ حافظ محمود شیرانی مرحوم اس مجموعے کو دیکھنے کے لئے جگراؤں کئی دفعہ تشریف لائے تھے۔ بعض قطعات میں پھولوں کے قدرتی رنگ اس وقت تک محفوظ ہیں۔ حالانکہ سیکڑوں برس گزر چکے ہیں۔ مغل رنگ سازوں کا یہ طرۂ امتیاز تھا کہ اُن کے رنگوں میں اب بھی وہی کیفیت ہے جو اُن کی مشہور عمارتوں میں پائی جاتی ہے۔ تم تاج محل کو چاندنی رات میں دیکھ لو یا مغل زمانے کے باریک نقش و نگار والی تصاویر کو دیکھو طرزِ نگارش اور محرابوں کی بناوٹ یکساں ہوگی۔ اب رخصت چاہتا ہوں بقول غالب علیہ الرحمہ ؎

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

سید آغا حسین

تجزیہ

میں نے دیکھا تھا دمکتے ہوئے رُخساروں پر
حسرت آلودہ دنیا بار ستاروں کا ہجوم

نظر آئی تھی مجھے شوخ نگاہوں میں ہنسی
مگر اس طرح کہ جیسے کوئی کمسن مظلوم

حرم و دیر میں اربابِ وفا کو میں نے
واقعہ یہ ہے کہ ہوتے ہوئے دیکھا بدنام

جانتا ہوں کہ غریبی کی سیہ راتوں میں
بارہا حُسن ہوا اہلِ ہوس میں نیلام

میں نے دیکھا نہ تھا انساں کو درندہ ہوتے

میں نے دیکھا نہ تھا یہ قتل یہ خونیں منظر
یہ چمکتی ہوئی تلوار یہ طوفانِ ستم،

میں نے دیکھا نہ تھا اس سطحِ زمیں پر اب تک
حکمرانی کا نیا ڈھونگ بعنوانِ ستم،

میں نے دیکھا نہ تھا انساں کے تمدن کا زوال
اُس زمیں پر جسے تہذیب کا مرکز کہیئے

میں نے دیکھا ہے اُبھرتے ہوئے شیطانوں کو
آہ اس دور میں اخلاق کا ماتم کہیئے

ایسے انساں سے تو حیوان بہت اچھے ہیں

ناظر الحسینی

خیر مقدم

صبح کے ہوتے ہی ظلمت کا فسوں ٹوٹ گیا
چار سو پھیل گئے نور و ضیا کے سائے
نیلگوں جھیل سے زرکار سفینے میں سوار
دیکھتے دیکھتے شہزادۂ خاور ابھرا
اب دھندلکے کا زمانے میں نشاں کوئی نہیں
اب اجالا ہی اجالا ہے جدھر آنکھ اٹھائیں
جیسے ماحول پہ مطرب کے رسیلے نغمے
میٹھے سپنوں کا حسیں جال سا بُن دیتے ہیں
اور اس نور کے طوفان کے پیچھے پیچھے
ابھی کچھ دیر میں وہ آج یہاں آئے گی
وہ مگر آج سے پہلے کہیں آئی ہی نہیں
اور راہوں کے خم و پیچ سے ناواقف ہے
سوچتا ہوں کہ بھٹک جائے نہ وہ رستے سے
کیوں نہ کچھ کوس پہ جا کر میں اسے لے آؤں

اختر ہوشیارپوری

غزل

وہ روبرو ہیں نظامِ حواس برہم ہے
نہ اب دماغِ مسرت نہ فرصتِ غم ہے

چمن میں بادۂ گلگوں کا دورِ پیہم ہے
مری نگاہ میں ہر پھول ساغرِ جم ہے

فضائے دہر میں دونوں کا ایک عالم ہے
فلک پہ مہر ہے لرزاں زمیں پہ شبنم ہے

الٰہی خیر! یہ کیا آج اُن کا عالم ہے
لبوں پہ موجِ تبسم نگاہ برہم ہے

بچھا رہا ہے سرِ راہ کوئی دیدہ و دل
یہ کس کے مژدۂ آمد کا خیر مقدم ہے

جفا شعار سہی مہرباں نہیں نہ سہی
کسی کی اک نگہِ التفات کیا کم ہے

خوشا نصیب کہ تنہا نہیں ہیں شامِ فراق
کسی کی یاد ہے اور اضطرابِ پیہم ہے

تجھے خدا کی قسم اے نگاہِ بے پروا
ترے بغیر نظامِ حیات برہم ہے

وہ "ہند" کہتے تھے سب جس کو جنتِ دنیا
حباب! آج وہی سرزمیں جہنم ہے

حباب ترمذی

خواہ مخواہ!

ایک ایکٹ کا ڈراما

افراد

رازی - ثریا - احسان - زینب - وقت سہ پہر،

[ایک خوبصورت لیکن مختصر سا کمرہ - داہنی طرف مغربی دیوار میں ایک دروازہ ہے جو اندر کو کھلتا ہے - دوسری جانب ایک دروازہ ہے جو باہر کی جانب کھلتا ہے - باہر کھلنے والے دروازے سے ملحقہ ایک کھڑکی ہے - دروازے بند ہیں لیکن کھڑکی کھلی ہوئی ہے - ریشمی پردہ بھی الگ ہے - دروازوں پر بھی ریشمی پردے پڑے ہوئے ہیں - پردہ اٹھنے پر کمرے کے وسط میں رازی اور ثریا ایک صوفے پر بیٹھی مصروفِ گفتگو نظر آتی ہیں)

رازی - مجھے معلوم ہے، اس وقت میں خود اسی سوچ میں تھی۔ انھوں نے مجھ سے تو اس کا ذکر نہیں کیا ہے - لیکن میں جانتی ہوں... ثریا! وہ کھڑکی بند کر دو - لوگ آ جا رہے ہیں - (ثریا دروازہ بند کر کے واپس اپنی جگہ پر بیٹھ جاتی ہے)

ثریا - لیکن آپا یہ تو ٹھیک بات نہیں - پھر تمھارا کیا بنے گا؟ یوں چپکے بیٹھے حالات سے صلح کر لینا تو عقلمندی نہیں؟

رازی - تم چاہتی ہو کہ میں کمینہ عورتوں کی طرح اُن سے لڑوں جھگڑوں دنیا بھر کے ہنگامے اٹھاؤں؟ پھر اس سے کچھ نتیجہ بھی تو نظر نہیں آتا - وہ دوسری شادی کر رہے ہیں - اُن کے نزدیک ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ میں بانجھ ہوں - اُن کے بعد اُن کا نام لینے والا کوئی نہ ہوگا - انھیں اولاد کی ضرورت ہے جو میں پوری نہیں کر سکتی - سوت کی مخالفت کر کے ذلیل ہونا نہیں چاہتی -

ثریا - تو مطلب یہ ہوا کہ تم خود چاہتی ہو؟

رازی - سچ پوچھو تو بہن میں بھی یہی چاہتی ہوں - گھر میں بال بچے ہوں گے - کچھ چہل پہل ہو جائے گی - آئندہ زندگی میں انھیں کچھ سہارا بھی تو چاہیئے، میں اس لائق نہیں ہوں، اچھا وہ فیروزہ کو بیاہ لائیں - ویسے انھیں فیروزہ سے بھی بہت پسند — ثریا! تمھیں معلوم نہیں - انھوں نے تو انتہائی کوشش کی تھی کہ فیروزہ ہی سے ان کی شادی ہو - پہلے ہی سے محبت تھی ان دونوں میں، ان کی یہ دیرینہ خواہش بھی پوری ہو جائے گی - والدین کے ہوتے جو مجبوری تھی، وہ اب نہیں رہی - اب کون بولنے ——،

ثریا - (بات کاٹتے ہوئے) ہاں اب کون بولنے والا ہے — بیگم تو خود ہی سوکن کے استقبال کو چشم براہ ہیں -

(رازی ہنستی ہے)

رازی - تمھیں معلوم نہیں ان کا سلوک میرے ساتھ اس قدر اچھا ہے کہ میں نہیں چاہتی کہ اُن کی خوشی میں روک بنوں، ثریا میری سب سے بڑی خوشی یہی ہے کہ وہ خوش رہیں -

ثریا - آپا میں چھوٹی ہوں - تمھارے سامنے میرے تجربات و مشاہدات محدود ہیں - لیکن میں اتنا ضرور جانتی ہوں - تم جس گمان میں ہو، تمھیں ایک ایک قہقہے، ایک ایک مسکراہٹ کے عوض آنسو بہانے پڑے تو میرا نام - سوت کی ڈاہ سے "مجنی" بھی سیاہ ہو جاتی ہے آپا! تمھیں سابقہ نہیں پڑا ہے جب پڑے گا تب اسی طرح ہنس ہنس کر باتیں کرنا -

رازی - (ہنستی ہے جیسے کوئی بات ہی نہیں) اچھا تمھیں سابقہ پڑا ہے نا - بگی،

(ثریا منہ پھلائے خاموش بیٹھی رہتی ہے۔ رازی کنکھیوں سے دیکھتی ہوئی میز پر سے نامکمل سویٹر اٹھا کر بننے لگتی ہے۔ کچھ دیر خاموشی رہتی ہے) بھئی ثریا! تم نے چائے وائے تو پی نہیں (ملازمہ کو آواز دیتی ہے) زینب! یہ دیکھو ثریا آئی ہیں۔ کچھ چائے وائے ملے گی یا دوسری بیگم کے آنے سے پہلے ہی سب ٹھاٹ اُلٹے جا رہے ہیں بیچاری اسی سوگ میں دُبلی ہوئی جا رہی ہے) ہنستی ہے اتنی دیر میں زینب آجاتی ہے) بھئی جلدی بھیجو ثریا بی بی خفا ہیں۔

ثریا ۔ (روٹھ جانے کے انداز میں) جی ہاں چائے ہی پینے تو آتی ہوں یہاں آپ تو ہماری کوئی نہیں۔ آپ کے دکھ درد کا ہمیں کوئی احساس ہی نہیں۔

رازی ۔ ثریا! تو کیا واقعی تم لوگوں کو یہ سُن کر تکلیف ہوئی۔ ارے تکلیف تو مجھے ہونی چاہیئے۔ آنسو تمھاری آنکھوں میں کیوں بھلا؟ اور کس کس کو غم ہوا یہ خبر سن کر؟ اماں جان کیا کہہ رہی تھیں؟

ثریا ۔ کل ہی ہم لوگوں کو محمود بھیا نے بتایا۔ تب سے امی نے کچھ نہیں کھایا پیا۔ روتے روتے آنکھیں لال ہو گئی ہیں اُن کی، وہ تو ساتھ ہی آ رہی تھیں۔ ابا جان دورے پر گئے ہوئے ہیں۔ امی کہتی ہیں کہ تمھارے ابا جان کو آ لینے دو۔ بات کی ٹوہ لگا کر معلوم کر لیں۔ سچ ہے یا جھوٹ۔ پھر تو رازی کو عمر بھر کے لئے لے آؤں گی اور اُس کا مُنہ بھی دولھا بھائی کو نہ دیکھنے دوں گی۔ شام تک دونوں آجائیں تو کچھ عجب نہیں۔ ورنہ کل تو ضرور آئیں گے۔

(وقفہ)

(زینب ٹرے میں چائے اور مٹھائی لے آتی ہے اور میز پر رکھ کر میز ثریا کے قریب کر دیتی ہے)

زینب ۔ لو بیٹی کچھ ناشتہ کر لو۔

ثریا ۔ (میز کو پرے دھکیلتے ہوئے) لے جاؤ۔ میں چائے کی بھوکی نہیں۔ نہیں پیتی تمھاری چائے،

رازی ۔ (زینب سے) تم جاؤ [وقفہ ۔ زینب چلی جاتی ہے] (ثریا سے) اوہو! رہنے دو یہ ناز نخرے ۔ چپ چاپ عصرانہ کر لو۔ ورنہ دوں گی کان پکڑ کر دو طمانچے۔ لو کھاؤ اب! (ثریا آہستہ آہستہ کھانے لگتی ہے)

لیکن ثریا! یہ بات محمود کو کیسے معلوم ہوئی؟

ثریا ۔ (ہاتھ روک کر) واہ آپا! وہ تو کہتے ہیں سارے شہر میں مشہور ہے

(وقفہ)

رازی ۔ خیر جو نصیبوں میں ہے ہو کے رہے گا۔ قسمت کا لکھا کون ٹال سکتا ہے بہن! (ثریا کی طرف کنکھیوں سے دیکھتی ہے)

ثریا ۔ آپا! تم تو زندہ درگور ہو جاؤ گی۔ دولھا بھائی نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھیں گے۔ فیروزہ، میں نے اُسے دیکھا ہے۔ ہر وقت بنی ٹھنی رہتی ہے اور تم سیدھی سادی پردے میں رہنے والی۔ وہ تمھیں ایک روز بھی ٹکنے نہیں دے گی آپا۔ جانے کیا کیا تکلیفیں اٹھانی پڑیں گی تمھیں۔ (آواز رندھ جاتی ہے جیسے رو پڑے گی)

رازی ۔ (افسردہ لہجہ میں) لیکن تم کیوں اس قدر غمگین ہو ثریا؟ یوں میرے دکھ بانٹ سکو گی۔ پگلی کہیں کی (وقفہ) لو یہ حلوہ کھاؤ۔

ثریا ۔ نہیں آپا! اب مجھ سے کچھ نہیں کھایا جائے گا۔

رازی ۔ ارے کھاؤ بھی۔ خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو۔

ثریا ۔ نہیں آپا، اب نہیں۔

(زینب داخل ہوتی ہے۔ کچھ دیر رازی کو ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہتی ہے جب یقین ہو جاتا ہے کہ رازی نہیں روکے گی تو ٹرے اٹھا کر لے جاتی ہے۔ کچھ دیر خاموشی رہتی ہے۔ رازی بظاہر سویٹر بننے میں محو ہے۔ افسردہ ثریا میز کی پالش کو اپنے ناخن سے کرید رہی ہے۔ کبھی کبھی رازی سویٹر سے نظر ہٹا کر ثریا کی دیکھ لیتی ہے اور مسکرا کر پھر سویٹر بننے لگتی ہے)

ثریا ۔ آپا کیا وہ بالکل آمادہ ہیں؟

رازی ۔ (سویٹر کو میز پر ڈال دیتی ہے اور انگلیاں چٹخاتی ہے) ہاں قطعی! ان دنوں ان کا رویّہ بھی میرے ساتھ کچھ ٹھیک نہیں۔ بات بات پر آنکھیں نکالتے ہیں۔ ہر کام میں نقص نکالے جاتے ہیں (رقت انگیز لہجے میں) ثریا میں تو خود عاجز آتی جا رہی ہوں اس زندگی سے کہاں ہر وقت پیار بھرے لہجے میں گفتگو۔ نقصان بھی ہو جائے تو مسکرا کے رہ جانا۔ کہاں اب یہ جھڑکیاں۔ اچھا ہے وہ فیروزہ کو بیاہ لائیں۔ روز روز کی ان گھرکیوں سے تو نجات ملے گی (ہنسی ضبط کر لیتی ہے)

خواہ مخواہ!

ایک ایکٹ کا ڈراما

افراد

رازی - ثریا - احسان - زیب - وقت سہ پہر،

[ایک خوبصورت لیکن مختصر سا کمرہ - داہنی طرف مغربی دیوار میں ایک دروازہ ہے جو اندر کو کھلتا ہے - دوسری جانب ایک دروازہ ہے جو باہر کی جانب کھلتا ہے - باہر کھلنے والے دروازے سے ملحقہ ایک کھڑکی ہے - دروازے بند ہیں لیکن کھڑکی کھلی ہوئی ہے - ریشمی پردہ بھی الگ ہے - دروازوں پر بھی ریشمی پردے پڑے ہوئے ہیں - پردہ اٹھنے پر کمرے کے وسط میں رازی اور ثریا ایک صوفے پر بیٹھی مصروفِ گفتگو نظر آتی ہیں)

رازی - مجھے معلوم ہے، اس وقت میں خود اسی سوچ میں ہوں انھوں نے مجھ سے تو اس کا ذکر نہیں کیا ہے - لیکن میں جانتی ہوں... ثریا! وہ کھڑکی بند کر دو - لوگ آ جا رہے ہیں - (ثریا دروازہ بند کر کے واپس اپنی جگہ پر بیٹھ جاتی ہے)

ثریا - لیکن آپا یہ تو ٹھیک بات نہیں - پھر تمھارا کیا بنے گا؟ یوں چپکے بیٹھے حالات سے صلح کر لینا تو عقلمندی نہیں؟

رازی - تم چاہتی ہو کہ میں کمینہ عورتوں کی طرح اُن سے لڑوں جھگڑوں دنیا بھر کے ہنگامے اٹھاؤں؟ پھر اس سے کچھ بنتا بھی تو نظر نہیں آتا - وہ دوسری شادی کر رہے ہیں - اُن کے نزدیک ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ میں بانجھ ہوں - اُن کے بعد اُن کا نام لینے والا کوئی نہ ہوگا - انھیں اولاد کی ضرورت ہے جو میں پوری نہیں کر سکتی - سوت کی مخالفت کر کے ذلیل ہونا نہیں چاہتی -

ثریا - تو مطلب یہ ہوا کہ تم خود چاہتی ہو؟

رازی - سچ پوچھو تو بہن میں بھی یہی چاہتی ہوں - گھر میں بال بچے ہوں گے - کچھ چہل پہل ہو جائے گی - آئندہ زندگی میں انھیں کچھ سہارا بھی تو چاہیئے' میں اس لائق نہیں ہوں، اچھا وہ فیروزہ کو بیاہ لائیں - ویسے انھیں فیروزہ سے بھی بہت پسند ——— ثریا! تمھیں معلوم نہیں - انھوں نے تو انتہائی کوشش کی تھی کہ فیروزہ ہی سے ان کی شادی ہو - پہلے ہی سے محبت تھی ان دونوں میں' ان کی یہ دیرینہ خواہش بھی پوری ہو جائے گی - والدین کے ہوتے جو مجبوری تھی، وہ اب نہیں رہی - اب کون بولنے ———'

ثریا - (بات کاٹتے ہوئے) ہاں اب کون بولنے والا ہے ——— بیگم تو خود ہی سوکن کے استقبال کو چشم براہ ہیں -

(رازی ہنستی ہے)

رازی - تمھیں معلوم نہیں ان کا سلوک میرے ساتھ اس قدر اچھا ہے کہ میں نہیں چاہتی کہ ان کی خوشی میں روک بنوں ثریا میری سب سے بڑی خوشی یہی ہے کہ وہ خوش رہیں -

ثریا - آپا میں چھوٹی ہوں - تمھارے سامنے میرے تجربات و مشاہدات محدود ہیں - لیکن میں اتنا ضرور جانتی ہوں - تم جس گمان میں ہو' تمھیں ایک ایک قہقہے' ایک ایک مسکراہٹ کے تو ... آنسو نہ جھلکے پڑے تو میرا نام - سوت کی ڈاہ سے "مجنبتی" بھی سیاہ ہو جاتی ہے آپا! تمھیں سابقہ نہیں پڑا ہے جب پڑے گا تب اسی طرح ہنس ہنس کر باتیں کرنا -

رازی - (ہنستی ہے جیسے کوئی بات ہی نہیں) اچھا تمھیں سابقہ پڑا ہے نا - بیگی'

(ثریا منہ پھلائے خاموش بیٹھی رہتی ہے۔ رازی کنکھیوں سے دیکھتی ہوئی میز پر سے نامکمل سویٹر اٹھا کر بننے لگتی ہے۔ کچھ دیر خاموشی رہتی ہے) بھئی ثریا! تم نے چائے وائے تو پی نہیں (ملازمہ کو آواز دیتی ہے) زینب! یہ دیکھو ثریا آئی ہیں۔ کچھ چائے وائے ملے گی یا دوسری بیگم کے آنے سے پہلے ہی سب ٹھاٹ الٹے جا رہے ہیں۔ بیچاری اسی سوگ میں دبلی ہوئی جا رہی ہے) ہنستی ہے اتنی دیر میں زینب آجاتی ہے) بھئی جلدی بھیجو ثریا بی بی خفا ہیں۔

ثریا۔ (اٹھ جانے کے انداز میں) جی ہاں چائے ہی پینے تو آتی ہوں یہاں آپ تو ہماری کوئی نہیں۔ آپ کے دکھ درد کا ہمیں کوئی احساس ہی نہیں۔

رازی۔ ثریا! تو کیا واقعی تم لوگوں کو یہ سُن کر تکلیف ہوئی۔ ارے تکلیف تو مجھے ہونی چاہیئے۔ آنسو تمھاری آنکھوں میں کیوں بھلا؟ اور کس کس کو غم ہوا یہ خبر سن کر؟ اماں جان کیا کہہ رہی تھیں؟

ثریا۔ کل ہی ہم لوگوں کو محمود بھیا نے بتایا۔ تب سے امی نے کچھ نہیں کھایا پیا۔ روتے روتے آنکھیں لال ہوگئی ہیں اُن کی، وہ تو ساتھ ہی آ رہی تھیں۔ ابا جان دورے پر گئے ہوئے ہیں۔ امی کہتی ہیں کہ تمھارے ابا جان کو آلینے دو۔ بات کی ٹوہ لگا کر معلوم کرلیں۔ سچ ہے یا جھوٹ۔ پھر تو رازی کو عمر بھر کے لئے لے آؤں گی اور اُس منہ بھی دولھا بھائی کو نہ دیکھنے دوں گی۔ شام تک دونوں آجائیں تو کچھ عجب نہیں۔ ورنہ کل تو ضرور آئیں گے۔

(وقفہ)

(زینب ٹرے میں چائے اور مٹھائی لے آتی ہے اور میز پر رکھ کر میز ثریا کے قریب کر دیتی ہے)

زینب۔ لو بیٹی کچھ ناشتہ کرلو۔

ثریا۔ (میز کو پرے دھکیلتے ہوئے) لے جاؤ۔ میں چائے کی بھوکی نہیں۔ نہیں بیٹی تمھاری چائے،

رازی۔ (زینب سے) تم جاؤ [وقفہ۔ زینب چلی جاتی ہے] (ثریا سے) ادھر ہو! رہنے دو یہ ناز نخرے۔ چپ چاپ عصرانہ کرلو۔ ورنہ دونگی کان پکڑ کر دو طمانچے۔ لو کھاؤ اب! (ثریا آہستہ آہستہ کھانے لگتی ہے)

لیکن ثریا! یہ بات محمود کو کیسے معلوم ہوئی؟

ثریا۔ (ہاتھ روک کر) واہ آپا! وہ تو کہتے ہیں سارے شہر میں مشہور ہے۔

(وقفہ)

رازی۔ خیر جو نصیبوں میں ہے ہو کے رہے گا۔ قسمت کا لکھا کون ٹال سکتا ہے بہن! (ثریا کی طرف کنکھیوں سے دیکھتی ہے)

ثریا۔ آپا! تم تو زندہ درگور ہو جاؤ گی۔ دولھا بھائی نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھیں گے۔ فیروزہ، میں نے اُسے دیکھا ہے۔ ہر وقت بنی ٹھنی رہتی ہے اور تم سیدھی سادی پردے میں رہنے والی۔ وہ تمھیں ایک روز بھی ٹکنے نہیں دے گی آپا۔ جانے کیا کیا تکلیفیں اٹھانی پڑیں گی تمھیں۔ (آواز رندھ جاتی ہے جیسے رو پڑے گی)

رازی۔ (افسردہ لہجہ میں) لیکن تم کیوں اس قدر غمگین ہو ثریا؟ یوں میرے دکھ بانٹ سکو گی۔ پگلی کہیں کی (وقفہ) لو یہ حلوہ کھاؤ۔

ثریا۔ نہیں آپا! اب مجھ سے کچھ نہیں کھایا جائے گا۔

رازی۔ ارے کھاؤ بھی۔ خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو۔

ثریا۔ نہیں آپا، اب نہیں۔

(زینب داخل ہوتی ہے۔ کچھ دیر رازی کو ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہتی ہے جب یقین ہو جاتا ہے کہ رازی نہیں دیکھے گی تو ٹرے اٹھا کر لے جاتی ہے۔ کچھ دیر خاموشی رہتی ہے۔ رازی بظاہر سویٹر بننے میں محو ہے۔ افسردہ ثریا میز کی پالش کو اپنے ناخن سے کرید رہی ہے۔ کبھی کبھی رازی سویٹر سے نظر ہٹا کر ثریا کو دیکھ لیتی ہے اور مسکرا کر پھر سویٹر بُننے لگتی ہے)

ثریا۔ آپا کیا وہ بالکل آمادہ ہیں؟

رازی۔ (سویٹر کو میز پر ڈال دیتی ہے اور انگلیاں چٹخاتی ہے) ہاں قطعی! ان دنوں ان کا رویّہ بھی میرے ساتھ کچھ ٹھیک نہیں۔ بات بات پر آنکھیں نکالتے ہیں۔ ہر کام میں نقص نکالے جاتے ہیں (رقت انگیز لہجے میں) ثریا میں تو خود عاجز آتی جا رہی ہوں اس زندگی سے کہاں ہر وقت پیار بھرے لہجے میں گفتگو۔ نقصان بھی ہو جائے تو مسکرا کے رہ جانا۔ کہاں اب یہ جھڑکیاں۔ اچھا ہے وہ فیروزہ کو بیاہ لائیں۔ روز روز کی ان گھرکیوں سے تو نجات ملے گی (لمبی سانس لیتی ہے)

ثریا - تم کتنی بھولی ہو آپا -!

(باہر والے دروازے پر دستک ہوتی ہے)

رازی - (اٹھتے ہوئے) لو ثریا تمھارے دولہا بھائی بھی آ گئے، (بلند آواز سے) آتی ہوں -

(رازی اٹھ کر دروازہ کھولتی ہے - ایک ۲۸ برس کا خوبصورت نوجوان سیاہ سوٹ میں ملبوس اندر داخل ہوتا ہے بشرے سے مسکراہٹ پھوٹی پڑتی ہے - آنکھوں پر بغیر فریم کی عینک ہے اور ہاتھوں میں ایک سبز رنگ کی فائل - اندر آتے ہی ثریا پر نظر پڑتی ہے)

احسان - اوہ خو! ثریا آئی ہے - شکر خدا - آج کیسے راستہ بھول گئیں آپ! مزاج اچھا ہے نا؟

(ثریا چپ چاپ منہ پھلائے بیٹھی رہتی ہے)

رازی - ثریا بیچاری پر پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے اور آپ کو مذاق سوجھا ہے۔

احسان - (حیران ہو کر) کیوں؟ --- کیا ہوا ---؟ خیر تو ہے - کہیں اس کی منگنی تو نہیں ٹوٹ گئی؟

(ثریا کے گال سرخ ہو جاتے ہیں)

رازی - یہ آپ کی دوسری شادی کی خبر سن کر آئی ہے آپ کے ارادوں کی خبر ان لوگوں کو پورے ایک ماہ کے بعد آج ملی ہے - اماں جان نے جب سے سنا ہے کچھ کھایا پیا نہیں - دن بھر روتی رہی ہیں شاید وہ لوگ شام تک آئیں -

(رازی ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ جاتی ہے)

احسان - (دلچسپی سے) اچھا جب ہی منہ پھلائے بیٹھی ہیں ہماری میم صاحبہ - لیکن اس سے بھئی ثریا تمھیں کوئی تکلیف نہ ہوگی --- تمھاری آمد و رفت میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالے گا - (ثریا بدستور بیٹھی ہے - احسان ثریا کی طرف قدرے شوخی سے دیکھتا ہے - پھر قدرے سنجیدگی سے) وہ تو تم جانتی ہی ہو - آٹھ برس کے بعد بھی آج گھر سونا سونا ہی رہتا ہے بال بچوں کے بغیر زندگی کتنی خشک معلوم ہوتی ہے - تم جانو -

(قریب والی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے --- ثریا کی طرف پھر شوخی سے دیکھتا ہے)

ثریا - (طنز سے) جی ضرور، کیوں نہیں؟

احسان - (دو سرخ رنگ کے ننھے موزے نکالتے ہوئے) اچھا لو بھئی رازی، یہ موزے سنبھالو -

رازی - (جھینپ کر) آپ بھی -

ثریا - (قدرے تعجب سے) یہ کیا بھائی جان!

احسان - یہ ..... یہ تمھاری نئی بھابی آئے گی نا - پھر ... پھر تمھارا بھتیجا ہوگا .... اس کے لئے -

(رازی پھر جھینپ جاتی ہے)

ثریا - (تلخ لہجہ میں) جی! ابھی سے ہم لوگوں کو جلانے کا سامان کیا جا رہا ہے -

(رازی اور احسان ہنستے ہیں)

احسان - لو بھئی ..... میں چلا ... ایک نہایت ہی ضروری کام

رازی - (ٹوک کر) چائے تو پی لیجئے - باتوں باتوں میں میں بالکل بھول ہی گئی -

احسان - جی! اب کیوں یاد رہے گا - (مسکراتا ہے) تمھاری سوت بلوانے جا رہا ہوں - (کرسی سے اٹھتا ہے) بھئی رازی اب ثریا کو پریشان نہ کرنا (پیار سے ثریا کے بال کھینچتے ہوئے) بیچاری بھولی بھالی! اچھا خدا حافظ! (باہر والے دروازے سے نکل جاتا ہے رازی دروازے تک ساتھ جاتی ہے - احسان جب باہر چلا جاتا ہے تو دروازے کی چٹخنی لگا کر واپس اپنی جگہ آ کر بیٹھ جاتی ہے)

رازی - (آپ ہی آپ) چائے بھی نہ دے سکی آج انھیں -

ثریا - کیا بات ہے آپا! دولہا بھائی کہہ رہے تھے پریشان نہ کرنا -

رازی - (ہنستی ہے) کچھ نہیں ثریا -

ثریا - کچھ بات ضرور ہے - تم کہتی تھیں ان کا سلوک ٹھیک نہیں وہ تو بہت خوش خوش باتیں کر رہے تھے -

رازی - ان کی شادی ہونے والی ہے نا اسی لئے .... (ثریا جیسے پھر اداس ہو جاتی ہے .. رازی ہنستی ہے - ضبط کا دامن ہاتھوں سے چھوٹ جاتا ہے - ثریا کے گال میں چٹکی لیتے ہوئے کہتی ہے)

پگلی خوش ہونے کی بات ہی ہے۔ اب وہ شادی وادی نہیں کریں گے۔

ثریا۔ (کچھ نہ سمجھتے ہوئے) کیوں؟ ابھی تو تم کہہ رہی تھیں کہ......

رازی۔ (بات کاٹ کر) تجھے بنا رہی تھی۔

ثریا۔ تو کیا یہ بات جھوٹ ہے۔ (وقفہ) تم بھی بڑی وہ ہو آپا خواہ مخواہ اتنی دیر سے مجھے ستا رہی تھیں۔

رازی۔ بات سچ تھی۔ مگر خدا کا شکر ہے اب انھیں ضرورت نہیں رہی (مسکراتی ہے)

ثریا۔ (نہ سمجھتے ہوئے مسکراتی ہے) ضرورت نہیں رہی؟

رازی۔ میری بھولی بہن (ثریا کے کان میں کچھ کہتی ہے) پگلی!

ثریا۔ تو تم نے اب تک بتایا نہیں ہم لوگوں کو'

رازی۔ ہمیں بھی تو پرسوں یقین آیا۔ طبیعت اچانک خراب ہوگئی تھی۔ لیڈی ڈاکٹر آئی تو۔ (چہرہ سرخ ہوجاتا ہے)

ثریا۔ (خوش ہوتے ہوئے) جی یہ بات ہے۔ موزے ابھی سے خریدے جا رہے ہیں' واہ دولھا بھائی۔

(موزے کو اٹھا کر ہلاتی ہے۔ رازی شرما جاتی ہے)

رازی۔ پگلی! ادھر لا موزے۔

(ثریا کے گالوں پر پیار بھرا ہلکا سا طمانچہ لگاتی ہے)

ثریا۔ لو میں چلی! امی بھوکی ہوں گی۔ ان کا روزہ افطار کراؤں۔

رازی۔ (شانے پکڑ کر بٹھاتے ہوئے) ارے ثریا، تمھیں میری قسم!

ثریا۔ (اٹھتی ہے) نہیں آپا! ہاں وہ موزے سنبھال کر رکھنا؟ سمجھیں!

(دونوں قہقہہ لگا کر ہنستی ہیں)

(پردہ گرتا ہے)

غیاث احمد گدی

غزل

یہ موسمِ رنگ و بو یہ ساون یہ لغزشوں کا حسیں مہینہ
جو اذن ہو ساقیا تو ٹکرائیں آبگینے سے آبگینہ

کسی کی ہلکی سی مسکراہٹ نے رنگِ گلشن بدل دیا ہے
عرق عرق ہے جمالِ شبنم گلوں کے ماتھے پہ ہے پسینہ

ازل سے اب تک ہے ایک ہی رنگ زیست کے بحرِ بیکراں کا
وہی تلاطم وہی تموج وہی تھپیڑے وہی سفینہ

یہ پارساؤں کی انجمن بھی عجیب ہی انجمن ہے جس میں
نہ کیف و کم ہے نہ رقص و رم ہے نہ شعر و نغمہ نہ جام و مینا

جو تیرے نزدیک آ رہا ہے اسی سے تو دور ہو رہی ہے
بتا تو اے منزلِ محبت بھلا یہ ہے کون سا قرینہ

میں شکوہ آخر کروں تو کیونکر مجھے بہت کچھ دیا ہے اس نے
لبالب اشکوں سے میری آنکھیں غموں سے آباد میرا سینہ

یہ صبحدم رفتہ رفتہ سورج ابھر رہا ہے افق پہ مضطر
کہ ہے کسی میگسار کے ہاتھ میں چھلکتا سا آبگینہ

مضطر اکبرآبادی

غدّارِ وطن کے نام

ایک وطن دوست دوشیزہ کا مکتوب

لکھا ہے تم نے مجھے از رہِ خلوص و وفا — کہ تجھ پہ میں دل و ایماں نثار کرتا ہوں
ہر ایک صبح کو رہتا ہوں تیری یاد میں گم — ہر ایک شب کو ترا انتظار کرتا ہوں
ترے خیال تری دھن ترے تصوّر سے — تسلّیٔ دلِ اُمیدوار کرتا ہوں
تری اُمید کرم کے خیال میں دن رات — ترے خیال سے کسبِ قرار کرتا ہوں
ترے نقوشِ خد و خال پر نظر کر کے — ستائشِ قلمِ کردگار کرتا ہوں
تری طلب کا تری مستقل محبّت کا — خود اپنی روح سے قول و قرار کرتا ہوں

یقین کر لے کہ ہمرنگ روزگار نہیں
مرا مزاج تلوّن کا رازدار نہیں

بجا کہ مجھ سے تمہیں دعویٔ محبّت ہے — بجا کہ تم کو حقیقت میں مجھ سے اُلفت ہے
بجا کہ دلکش و رنگیں ہیں خطّ و خال مرے — بجا کہ حُسن مرا بہترین صنعت ہے
بجا کہ میرا تبسّم ہے انبساط انگیز — بجا کہ میرا تصوّر نویدِ راحت ہے
بجا کہ تم کو مرے بُعد سے ہے بے تابی — بجا کہ تم کو مرے قرب کی ضرورت ہے
بجا کہ میرا تغافل ہے آتشِ دوزخ — بجا کہ میرا تلطّف بہارِ جنّت ہے
تم اپنے عشق کا لیکن مجھے یقیں نہ دلاؤ — تمہارے ذوقِ غلامی سے مجھکو نفرت ہے
جو اپنی قوم کا ہمدرد و غمگسار نہ ہو — وہ مجھ سے عشق کرے یہ مری اہانت ہے

وہ مرد حُبِّ وطن سے جو بے قرار نہیں
جہاں میں اُس کی محبّت کا اعتبار نہیں

صادق نیازی کاشمیری

سُراغ

عجیب بکیسانہ انداز میں جب اس نے اپنے تپتی چائے کی ایک مخصوص دکان کے سامنے پڑے ہوئے بنچ پر آگرایا۔ تو اسے محسوس ہوا وہ بہت تھک چکا ہے۔

تھکاوٹ واضمحلال سے نجات حاصل کرنے کا اس کے پاس ایک ہی سہل اور آزمودہ طریقہ تھا کہ وہ اپنی پریشانیوں سے وقتی طور پر چھٹکارا پانے کے لئے سیاہ گڑ کی چاشنی میں اُبلی ہوئی کڑوی کسیلی چائے کا گلاس گھونٹ گھونٹ کر کے اپنے حلق سے نیچے اتار لے لیکن وہ جانتا تھا کہ آج وہ چائے نہیں پی سکتا۔ اس کے پاس صرف ایک دُونی رہ گئی ہے جسے وہ کسی ناگہانی ضرورت کے لئے محفوظ رکھ چھوڑنا چاہتا ہے۔

"کیوں چائے نہیں پیو گے آج"۔ لائل پور میں اپنا سب کچھ لٹا کر آئے ہوئے گڑ کی چاشنی میں چائے کی پتیوں کو دو اُبالے دے کر دو دو آنے کی گلاس بیچنے والے مانک چند منگے شاہ نے اس سے پوچھا۔ "کچھ پتہ چلا"؟

سر کو منفی کی ہلکی سی جنبش دے کر بے مقصد طور پر اس نے قریب ہی زمین پر اکڑوں بیٹھے اور نیم دراز حالت میں لیٹے ہوئے بارہ افراد پر مشتمل ایک کنبے کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ جن میں بحث چل رہی تھی کہ رات تو جیسے تیسے کٹ ہی جائے گی۔ کل صبح بھی اگر بچوں کے لئے دودھ میسر نہ آیا تو کیا ہو گا۔ پھر اس نے نگاہیں یوں پھیر لیں جیسے اُسے اُن سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اور ان سردار صاحب کی طرف دیکھنے لگا جو اس کے پاس ہی بنچ پر بیٹھے پھونکیں مار مار کر چائے پی رہے تھے اور ضلع شیخوپورہ میں اپنی چالیس بیگھے زمین، تین جوڑی نسلی بیل، بیسیوں ڈھور ڈنگر۔ اناج سے بھرے ہوئے کوٹھوں کی داستانِ غم سُناتے ہوئے بار بار عجیب رازدارانہ طور پر اس فقرے پر رُکتے تھے۔ "لالہ زندگی رہی تو ایک بار ضرور وہاں جاؤں گا"۔ پاؤں سے چپل اتار کر ٹانگیں سمیٹتے ہوئے وہ آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

پچھلے ڈیڑھ مہینے سے وہ امرتسر میں آیا ہوا تھا۔ حکومت کی طرف پناہ گزینوں کے لنگر سے دو کچی یا جلی ہوئی چپاتیوں اور سڑی بسی دال کے لئے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ دھکے کھانے کے بعد اپنی بوڑھی ماں، جوان بہن اور معصوم بھائی کی تلاش میں مارے مارے پھرنا اس کا معمول بنا ہوا تھا۔ ضلع سیالکوٹ کے ایک دور افتادہ گاؤں میں رہنے والی وہ تین روحیں اس کی روح کو بُری طرح اسیر کئے ہوئے تھیں۔ ہر صبح اُمید کی ایک جیتی جاگتی لہر محسوس طور پر اس کے دل و دماغ میں حلول کرنے لگتی۔ حالات کی ناموافقت تلخیوں اور بے پناہیوں کے باوجود اسے محسوس ہوتا جیسے وہ تینوں بے بس و بیکس ہستیاں امرتسر کی کسی سڑک کے کنارے، کسی سائبان کے نیچے، کسی جلے ہوئے شکستہ مکان کی دہلیز پر کھڑی پُر حسرت، بے چین اور منتظرانہ نگاہوں سے ہر راہ گیر کی طرف دیکھ رہی ہیں۔ کسی غیر مغلوب خواہش کے زیر اثر وہ سوچنے لگتا۔ کہ آج اچانک ہی جب وہ ان کے سامنے جا کھڑا ہو تو انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آئے گا۔ ماں لپک کر اُسے چھاتی سے لگا لے گی۔ پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دے گی۔ وہ اُسے دلاسا دے گا کہے گا۔ "ماں صرف ہم ہی تو مصیبت زدہ نہیں۔ ہزاروں لاکھوں انسان برباد و بے خانماں ہو چکے ہیں۔ دنیا پر کیا کیا گذری ہے۔ دیکھی جاتی ہے نہ سُنی۔ ہمیں تو اپنی زندگی اپنی عزت کی خیر منانی چاہیئے"۔ ننھا بھائی بھیا بھیا چلاتا ہوا اس کی ٹانگوں سے لپٹ کر جھولنے لگے گا۔ اپنی گود میں اٹھا کر اور گال پر ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے وہ اسے کہے گا "کم بخت سب سے زیادہ تو مجھے تمھاری فکر تھی۔ میں سوچتا تھا کہیں تم لوگ کسی پیدل قافلے کے ساتھ نہ چل کھڑے ہوں تم سے تو دو قدم بھی نہ چلا جائیگا"۔ ساوتری البتہ حسب عادت خاموش رہے گی۔ نہ جانے کیوں وہ ہر وقت اس سے شرماتی رہتی ہے۔ پچھلے برس اچھا بھلا اس کے لئے بر

تلاش کیا تھا۔ اپنے گھر اٹھ گئی ہوتی تو اُس کی طرف سے تو کچھ اطمینان رہتا۔ لیکن ماں ـــ وہ ماں سے کہنے لگا۔ ان دنوں تو بڑے بڑے سیٹھ ساہوکار بغیر ایک کوڑی تک لئے دیئے سروں کے بوجھ اتار رہے ہیں۔ زمانہ کی حالت کس سے پوشیدہ ہے۔ اب وہ پہلی سی باتیں کہاں ـــ اور اسی لہر کے لامحدود تاثرات دلجمعی، جوش اور جد و جہد کے زیر اثر وہ سڑکوں، گلیوں اور ہر اس مقام کی جہاں اس علاقے سے آئے ہوئے لوگوں کی خبر ملتی، خاک چھانتا پھرتا۔ لیکن شام کے وقت جب مضطرب و مایوس، اُداس اور نڈھال اپنے تئیں وہ چائے کی اس دکان کے سامنے پڑے ہوئے بنچ پر آ گرتا تو اُسے زمین و آسمان گھومتے ہوئے محسوس ہوتے۔ اس کا دل سیکڑوں ہیبت ناک و مہلک وساوس میں گرفتار ہوتا لیکن منگے شاہ کے میٹھے الفاظ۔ "چلئے نہیں ہو گئے آج ـــ کچھ پتہ چلا ـــ؟" اُس کے لرزیدہ خیالات اور گھومتے ذہن کو ٹھکانے پر لے آتے۔ اس وسیع و عریض دنیا میں اب ایک منگے شاہ ہی ایسا شخص تھا جسے وہ اپنا ہمدرد و غمگسار، دوست و مہربان، جو کچھ بھی کہنا چاہتا کہہ سکتا تھا۔ سوا اس کے باقی ساری دنیا اس کے لئے بیگانہ تھی۔ بے اعتنائی و مغائرت سے لبریز دنیا کا کون سر پھرا انسان چل کر اُسے پوچھنے آتا کہ بھائی تم اتنے پریشان کیوں ہو۔ صبح سے تم نے کچھ کھایا پیا بھی ہے یا نہیں۔ رات کہاں سوؤ گے۔ تمہارے پاس تو کوئی کپڑا لتا بھی دکھائی نہیں دیتا ـــ منگے شاہ نے سونے کے لئے دکان کے سامنے والا وہ بنچ اور بنچ کے علاوہ ایک پھٹی پُرانی دری جس کے متعلق وہ کہتا تھا کہ لائلپور سے چلتے وقت وہ بالکل کوری تھی بچھانے کے لئے اُسے دے رکھی تھی اور حال ہی میں جب کیمپ افیسر نے ضرورتمند لوگوں میں رضائیاں بانٹنے کا اعلان کیا تو یہ منگے شاہ کی سفارش ہی کا کرشمہ تھا کہ آدھی رات کے وقت جگا کر ایک بالکل نئی رضائی اُس پر ڈال دی گئی تھی۔ اس کے اصرار کے باوجود ایک بار منگے شاہ نے اُس سے چائے کے دام بھی نہ لئے تھے۔ اور جب دکان بڑھانے میں منگے شاہ کا ہاتھ بٹاتے ہوئے وہ اپنے لواحقین کے کھوج نہ ملنے کی روئداد بڑے رحم طلب لہجے میں کہتا ہوا اُس سے پوچھتا ـــ "شاہ جی! آپ کا دل کیا گواہی دیتا ہے ـــ" تو منگے شاہ بڑی خود اعتمادی کے ساتھ جواب دیتا "اُن کا بال تک بیکا نہ ہوگا۔ تم تو خواہ مخواہ ہلکان ہو رہے ہو"

تو کیا وہ سچ مچ خواہ مخواہ ہلکان ہو رہا ہے۔ بازوؤں کے تکئے پر سر رکھے آسمان کی طرف تکتے ہوئے آدھی آدھی رات تک وہ سوچتا رہتا ـــ ان کا بال تک بیکا نہیں ہوا ـــ لیکن اُسے یقین نہ آتا۔ ہر روز اسے سیکڑوں ایسے لوگوں سے واسطہ پڑتا تھا جن کے متعلقین کی آمد کی خبر بھی انھیں مل چکی ہوتی تھی۔ اس کے باوجود وہ ان معتبر خبروں کو افواہوں سے تعبیر کرتے اور برابر پوچھ پڑتال میں سرگرداں رہتے۔ اس سلسلے میں کم بیش جتنے بھی لوگوں سے اس کا واسطہ پڑا وہ سبھی اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے اپنے ہی آلام کی طولانی داستان بیان کرنا شروع کر دیتے تھے۔ ہر کسی کے ایک ہی قسم کے جذبات تھے۔ وہی انسان پر پڑی ہوئی خدا کی پھٹکار کے جذبات۔ ذمہ دار لوگوں کی کم فہمی اور ناوقت شناسی کے جذبات۔ انھیں اس حالت تک پہنچانے والوں کا لہو پی لینے کے جذبات قریب قریب ایک ہی قسم کی داستانیں تھیں قتل و غارت کی داستانیں اغوا و درندگی کی داستانیں، فاقوں اور خدائی قہر کی داستانیں ـــ شروع شروع میں اس قسم کی کوئی داستان سنتے وقت اُس کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا تھا اور اس کے دماغ میں کئی باغی دبے منگم خیالات کروٹیں لینا شروع کر دیتے تھے لیکن رفتہ رفتہ اس کا جی کڑا ہوتا گیا اور اب وہ ایک ایسے دور میں تھا جہاں بڑی سے بڑی خونیں داستان بھی اس پر اثر انداز نہ ہو سکتی تھی۔ البتہ وہ نامعلوم خوف، موہوم اندیشہ اب بھی بدستور مرض مزمن کی طرح اس کے ذہن پر مسلط تھا۔ بلکہ جوں جوں دن گزرتے جاتے تھے اس کی دلی کیفیت مایوسی کی جانب مائل ہوتی جا رہی تھی۔ صبح سے شام تک کا وقفہ کھوج تحقیق میں گزر جاتا، چلتے چلتے پاؤں شل ہو جاتے۔ جسم کچے پھوڑے کی طرح دُکھنے لگتا۔ ہر گام پر نا اُمیدی اور مایوسی ہوتی، پھر بھی ہزاروں ہمجنسوں کی اپنے سے بھی بدتر حالت دیکھ کر اُس کے مخدوش خیالات اتنی شدت اختیار نہ کرتے۔ لاشعوری طور پر اُسے حاسدانہ سی مسرت کے ساتھ کچھ اس طرح کا یقین ہونے لگتا کہ اُس کی آج کی کاوش اکارت جا ہی نہیں سکتی۔ کوئی نہ کوئی غیر معمولی اور دل خوش کن واقعہ از خود پیش آ جائے گا۔ کسی معجزانہ طور پر اُس کی دلی مراد بر آئے گی۔ لیکن یہ تمام طفل تسلیاں

شام ہوتے ہی دلگیر و تلخ خود فریبی میں تبدیل ہو جاتی — خلجان، لاچاری، دخستگی کی حالت میں وہ چائے کی دکان کے سامنے رکھے ہوئے بنچ پر آگرتا۔
سردار صاحب کی جگہ اب ایک بوڑھی عورت اپنے پانچ چھ برس کے مریل و مدقوق پوتے کو جسے وہ کھدر کی میلی کچیلی چادر میں لپیٹے تھی چائے
پلانے کے ساتھ ساتھ گالیاں بھی دے رہی تھی — "لے پی مرا میرے دشمن، میرے جان کے لاگو۔ تم کیوں بچ رہے۔ ہیجا ہو جائے تجھے سب کو کسی کی
آئے"۔ پھر ایک گھونٹ خود بھر کر منگے شاہ سے مخاطب ہوئی۔ "پرسوں ملی اس کی ہیجے — رگئی۔ حرامجادہ دونوں بکھت چائے مانگتا ہے۔ لٹا پٹا کر آئے
ہیں — چائے میں دودھ نہیں ڈالتے لالہ —"
دودھ — غیر ارادی طور پر فوراً اس کے دل میں شورش پیدا ہوئی کہ وہ اپنے پھیپھڑوں کی پوری قوت کے ساتھ چلا کر کہنے لگے —" دودھ لالہ
کمتری کا پوت ہے مائی، اس سے چائے میں اور دودھ ڈلوانے کی توقع بے کار ہے۔ اتنا کیا کم ہے کہ اس نے دو آنے میں پانی کا گلاس نہیں دیا۔ چائے
دی ہے —" لیکن وہ نا ملائم اور اہانت آمیز الفاظ اس کے منہ سے نکلتے نکلتے رہ گئے — منگے شاہ غرض کا پتلا ہے۔ انسانیت اسے چھو بھی نہیں
گئی۔ اس قسم کے بیسیوں احساسات وہ اکثر و بیشتر محسوس کر چکا تھا اور کسی مناسب موقع پر ان کا اظہار بھی کرنا چاہتا تھا لیکن نہ جانے وہ کون سا
نامعلوم جذبہ تھا جس کے تحت اس قسم کے الفاظ اس کی زبان سے ادا ہوتے ہوتے رہ جاتے تھے۔ جیب میں ہاتھ ڈال کر اس نے دونی کو ٹٹولا، مسلا اور پھر
ہاتھ باہر نکال لیا۔ وہ اتنا گرا ہوا تو نہ تھا۔ کاش لالہ نے آج اسے بھولے منہ ہی سے مفت چائے پینے کی دعوت دی ہوتی۔
بڑھیا اسی طرح بکتی جھکتی اپنے پوتے کو اٹھا کر سڑک کی اس بے پناہ بھیڑ اور تاریکی میں جو ہر لحظہ گہری ہوتی جا رہی تھی کہیں گم ہو گئی۔ بنچ کے قریب
زمین پر ڈیرا ڈالے بارہ افراد پر مشتمل ایک کنبہ پاؤ بھر دودھ حاصل کرنے کی ترکیبوں پر غور کرتے کرتے لمبی تان چکا تھا، ان سے ذرا ہٹ کر ایک اور
کنبہ — اور ان سے ذرا ہٹ کر ایک اور — درختوں کے کٹے ہوئے بے جان ٹھنوں کی طرح یہاں وہاں ادھر ادھر انسان ہی انسان گرے پڑے
تھے۔ سڑک ابھی چلتے پھرتے ٹھنوں سے بدستور اٹی ہوئی تھی لیکن دن کے وقت کا سا ہنگامہ۔ دھکا پیل۔ شور و شغب بالکل نہ تھا۔ شاید لوگ شور
مچا کر تھک چکے تھے اور اب کسی ابدی سکون کی تلاش میں خاموش سر جھکائے رواں دواں چلے جا رہے تھے۔ کہیں دور کسی کے قے کرنے کی آوازیں
واضح طور پر سنائی دے رہی تھیں۔ یہ تاریکی اور تعفن میں لپٹی ہوئی فضا، یہ پراسرار سکوت، اس نے سوچا کل میں بھی ہیضے کا ٹیکہ کرا لوں گا۔
حکومت کی طرف سے جہاں ہر کس و ناکس کو ہیضے اور پلیگ کے ٹیکے مفت کئے جاتے اور روٹی کپڑا مفت تقسیم ہوتا تھا۔ رہنے کے لئے
چھولداریاں بھی لگوا دی گئی تھیں۔ لیکن ہیضے اور پلیگ کا ٹیکہ لگوانا اتنا ہی آسان کام تھا جتنا کسی چھولداری میں سر چھپانے کی جگہ حاصل کرنا مشکل۔
پھر چھولداریاں تو صرف کنبوں کے لئے مخصوص تھیں۔ افسروں کے آگے پیچھے پھرنے کے علاوہ کم از کم آٹھ افراد کے نام رجسٹر میں درج کرانا لازم
تھا۔ اور ان آٹھ افراد میں بھی جب تک نصف کے قریب عورتیں اور بچے نہ ہوتے تھے بات نہ بنتی تھی۔ منگے شاہ کے کنبے کا ایک فرد بن کر وہ چھولداری
میں جگہ حاصل کر سکتا تھا، اگر منگے شاہ کو چھولداری میں رہنا منظور ہوتا، لیکن اسے تو ایک پکا مکان مل چکا تھا جس میں پانی کا نل اور بجلی لگی ہوئی تھی۔
وہ ایک اکیلی جان تھی، چھولداری کا خیال خواب میں بھی نہیں آ سکتا تھا۔ کاش اسے سردی ڈس لے اور وہ ٹھٹھر ٹھٹھر کر مر جائے۔ حکومت اس کے لئے
کچھ کرنے سے معذور تھی اور وہ تو یہ بھی جانتا تھا کہ بیس بیس افراد پر مشتمل کنبے کیوں یخ بستہ زمین اور کھلے آسمان کو چھولداریوں پر ترجیح دیتے تھے
وہ آج تک احساس کمتری کا شکار نہ ہوا تھا۔ وہ صرف ساٹھ روپے ماہوار پر ایک کارخانے میں کلرکی کرنے کے باوجود شہنشاہیت سی محسوس
کرتا رہا۔ سینہ پھلا کر اپنے دوستوں اور واقفکاروں کی تنگ دستی پر اظہار افسوس کیا کرتا۔ اب وہ کیوں اپنی ہی نظر میں خود کو گرا دے۔ پنا ہگزینوں
میں بانٹی ہوئی ایک ہی رنگ اور وضع کی پوشاک زیب تن کر کے اپنی کس مپرسی کا ڈھنڈورہ پیٹتا پھرے۔ اس کے لئے یہی کیا کم تھا کہ اپنے سر اور
چہرے کے گرد مفلر لپیٹ کر وہ لنگر سے دو روٹیاں لے آتا تھا۔ پھر اسے چھولداری میں جگہ حاصل کرنے کی اتنی خواہش بھی تو نہ تھی۔ صرف رات کاٹنے
کے لئے اسے چھ فٹ جگہ درکار تھی اور منگے شاہ نے ساڑھے سات فٹ لمبا اور اڑھائی فٹ چوڑا بنچ اسے عنایت کر رکھا تھا۔ جس کے قریب ہی

سُلگتی یا بجھی ہوئی بھٹی کی جاں بخش گرمی جب تک وہ جاگتا رہتا اس کے جسم کو گرمائے رکھتی تھی۔ آج سے ڈیڑھ ماہ پیشتر کی اس پر وقار شہنشاہیت کا احساس تو اُسے نہ ہوتا لیکن قریب ہی زمین پر پڑے ٹھٹھرتے یا بھٹی پر آگ تاپنے کی غرض سے جمع ہونے والوں کی لاچاریاں دیکھ کر اُسے ایک گونہ مسرت ضرور ہوتی اور وہ سوچتا کہ اب بھی اُس کا رتبہ ہزاروں سے بہتر ہے۔

اس بہتر رُتبے کا تلخ احساس اُسے اس وقت ہوتا جب وہ دیکھتا کہ وہ لوگ جو اپنا سب کچھ گنوا کر آئے تھے، جن کے پاس جینے تک کا بہانہ نہ رہ گیا تھا، جو احساس کمتری کا شکار تھے، لنگر سے زیادہ سے زیادہ روٹیاں حاصل کرنے کے لئے جھگڑا کرتے، بھیس بدلتے تھے۔ جو ایک ہی رنگ ایک ہی قسم کی پوشاک پہن کر اپنی ڈھٹائی کی کھلے بندوں نمائش کرتے اور افسروں کی جھڑکیاں اور پولیس والوں کی گالیاں سُننے کے باوجود اسی ڈگر پر چلے جا رہے تھے۔ یہ لوگ ایک ایسی قناعت — ایک ایسے اطمینان کا سرچشمہ دکھائی دیتے تھے گویا صدیوں سے وہ اسی حالت میں رہتے آ رہے ہیں۔ اُن کے ساتھ کچھ بھی نہیں ہوا — اور واقعی، وہ سوچتا، ان کے ساتھ ہوا کیا ہے۔ وہ وہاں گھاس چھیلتے تھے، بان بٹتے تھے، قلابازیاں لگاتے تھے۔ بھاڑ جھونکتے تھے — ان کا ہر بوڑھا، ہر بچہ بحفاظت پہنچ چکا تھا۔ بچے چھولداریوں میں کلیلیں کرتے تھے اور بوڑھے چھولداریوں کے باہر حقے گڑگڑاتے ہوئے نوجوانوں کو اپنی زندگی پھر سے مرتب کرنے سے پیشتر کچھ دن سکھ کا سانس لینے کی تلقین کرتے اور کہتے کہ جو وقت گزر جائے وہی غنیمت ہے۔ ساری عمر ہاتھ پیر توڑنے ہی کے لئے تو ہے۔

کاش اس کی بوڑھی ماں، اس کی جوان بہن اور اس کا وہ معصوم بھائی بھی بحفاظت پہنچ چکا ہوتا۔ وہ بارہا خیال کرتا۔ پھر اسے کس بات کی پڑی تھی، کیا غم تھا۔ وہ کبھی انھیں چھولداریوں میں دھکے نہ کھانے دیتا۔ ٹوکری اٹھاتا — بھیک مانگتا — لیکن نہیں اسے ٹوکری اُٹھانے یا بھیک مانگنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کے پاس علم تھا، لیاقت تھی، تجربہ تھا۔ عزت کی دو روٹیاں کمانا کون سی بڑی بات تھی۔

یکایک اُسے خیال آیا کہ اس کے جیب میں پڑی ہوئی دونّی بھلا کب تک اس کا ساتھ دے گی۔ کل سے اُسے کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہوگا۔ اس کے کپڑے بھی تو انتہائی غلیظ ہو چکے ہیں۔ ایک دونّی کے صابن سے تو بمشکل ایک قمیص ہی دُھلے گی۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر پھر سے دونّی کو مسلنا شروع کر دیا — یہ بالکل غیر اختیاری طور پر ہوا۔ دونّی اس کے ہاتھ کے ساتھ ہی جیب سے باہر نکل آئی۔ جسے اُس نے عجیب شانِ بے نیازی سے منگے شاہ کے آگے پھینک دیا "لو، پلاؤ چائے"

دھواں دھار چائے سے لبالب بھرا ہوا گلاس اُس کے ہاتھ میں تھا۔ پہلا گھونٹ پیتے ہی جہاں اسے جانفزا توانائی کا احساس ہوا وہاں جارحانہ وحشت کے جذبات بھی شدت اختیار کر گئے جیسے دانستہ طور پر اُس سے کسی فعل شنیع کا ارتکاب ہو رہا ہو۔ اُس کے رگ و ریشے میں ایک ہیجان کروٹیں لینے لگا۔ بالکل ایک بچے کی سی معصومیت کے ساتھ، اُس نے منگے شاہ کی طرف دیکھا جو دکان بڑھانے کی فکر میں برتنوں کو سمیٹ رہا تھا۔ لیکن منگے شاہ اس کی طرف متوجہ نہ تھا۔ دوسرے گھونٹ کے ساتھ اُس کے رخساروں پر سے لڑھکتے ہوئے دو آنسو چائے کے گلاس میں جا گرے۔

منگے شاہ کے دُکان بڑھا کر چلے جانے کے بعد بھی کافی دیر تک وہ اپنی ٹانگوں میں سر دیئے بچوں کی طرح روتا رہا۔ نہ بنچ پر اُس نے دری اور نہ بنچ کو سرکا کر بھٹی کے قریب کیا۔ آج پہلی بار اُسے سمجھ نہ آ رہی تھی کہ اس کے ساتھ کتنا بڑا ظلم، کتنی بے انصافی و ستم کوشی ہوئی ہے۔ اُس کی زندگی کس قدر کھوکھلی اور بے حس و حرکت ہو کر رہ گئی ہے۔ کس طرح وہ لگاتار ڈیڑھ مہینے سے ذلت و آوارگی کی زندگی کے ساتھ سمجھوتہ کئے ہوئے ہے اور ایک ناقابل حل عقدے کو دل میں جگہ دیئے بھٹکتا رہا ہے — باوجودیکہ اُس نے اپنے آپ کو اپنے لاانتہا خیالات کی لہروں کے رحم پر چھوڑنا کبھی گوارا نہ کیا تھا اور ہمیشہ ہی سے ان لہروں میں اُلجھ کر گم ہو جانے کے بزدلانہ خیال سے اُسے نفرت تھی۔ وہ بخوبی جانتا تھا کہ بالکل بے معنی و بے سر و پا باتیں بھی انسانی ذہن پر کس بری طرح اثر انداز ہوتی ہیں۔ لیکن اس وقت وہ سچ مچ خیالات کی رو میں بہہ رہا تھا۔ یکے بعد دیگرے لہروں کے لاتناہی ریلے اُٹھ رہے تھے اور لہروں کے اس بے ہنگم ہجوم، اس لایعنی شور میں وہ اپنے تئیں بالکل بے قابو، بالکل بے سکت پا رہا تھا — کیا

ں کا پُرشفقت چہرہ کبھی نہ دیکھ سکے گا۔ ماں کے محبت بھرے کلمات کبھی نہ سُن سکے گا۔ زندگی میں ساوتری کبھی اس کے سامنے نہ ہوگی۔ ننھے
ں کا بھیّا بھیّا کہنا اس کے کانوں میں کبھی نہ گونجے گا — گاؤں کا وہ چھوٹا سا گھر جو پشت در پشت سے ان کا اپنا تھا اس کی آنکھوں کے
گھوم گیا۔ وہ بھولی بھالی فضا، وہ تقویت بخش مٹی جس میں اس کا بچپن نہایا تھا۔ جہاں اُس نے جوانی کا ترش اور میٹھا پھل چکھا تھا۔ جہاں
نوں میں چھپ کر اس نے کنواریوں کے گیت سنے تھے۔ شیریں، رسیلے اور عمیق گیت۔ گیت جو ان کے کنوارے جذبات کی ترجمانی کرتے تھے جن
پ کے گاؤں میں رہ کر تمام عمر کنوار پنے میں گزار دینے کی آرزو ہوتی تھی۔ جن میں اپنی ہونے والی نند اور ساس کے سلوک کے اندازے کے ساتھ ساتھ
بنا کی آمد و محبت کی تعریف ہوتی تھی۔ اور جن میں نسوانی حجاب، سماج کی قیود اور حد بندیاں اور اپنے نامراد عاشق کو سو سو تسلیاں پنہاں ہوتی تھیں
ہی تو . . . . . .

جیسے وہ کسی انتہائی بلندی سے لڑکھڑا کر گر پڑا ہو۔ گھبرا کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ دری جھاڑ کر اُس نے بنچ پر بچھائی اور بنچ کو سرکا کر بھٹی کے قریب
پھر بنچ پر بیٹھ کر اور رضائی کو اپنے ارد گرد اچھی طرح لپیٹ کر ہاتھ سینکنے لگا۔

دیپو — دیپو کی یاد نے یکلخت لہروں کو گرداب کی صورت میں منتقل کر دیا تھا۔ اور اُسے ایک دم محسوس ہونے لگا تھا گویا اُس کے پاؤں
وئی غیر معمولی وزن باندھ دیا گیا ہو اور وہ نیچے ہی نیچے کسی اتھاہ گہرائی میں غرق ہوتا جا رہا ہو۔ دیپو کی یاد کو اُس نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے
سے نکال دینے کی جدوجہد کی تھی۔ یعنی وہ اسے اور اس سے متعلق ہر بات کو اپنی زندگی کے دائرے سے خارج کر دینا چاہتا تھا۔ اس کی خاطر اُس
ان کے منع کرنے کے باوجود گھر کے سکھ آرام کو لات مار کر شہر جا کر رہنے کی ٹھانی تھی اور اس وقت تک دوبارہ گاؤں نہ گیا تھا جب تک دیپو کا
نہ ہو گیا اور وہ سسرال چلی گئی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ دیپو کو کسی قسم کی شکایت کا موقع ملے۔ پچھلے دو برس سے دیپو سے اس کی کبھی ملاقات نہ
تھی اور نہ وہ ملاقات کا خواہاں تھا۔ ان طویل دو برسوں میں اتنا اسے یقین ہو چکا تھا کہ دیپو کی یاد آسانی سے فراموش کی جانے والی یادوں میں
نہیں — جب کبھی اُسے دیپو کا خیال آیا، وہ کئی کئی دن تک دل شکستہ و مغموم رہا۔ اس کے دوستوں نے اُس کی حالت کے پیش نظر کئی
نے معاشقے اُس سے منسوب کر رکھے تھے۔ لیکن اُس نے کبھی کسی کو اپنے دل کا راز نہ بتایا — "میں رو رو کر ساری عمر گزار دوں گی" — برگد کے
ھے پیڑ کی چھاؤں میں دیپو نے اُسے آنسو بھری آنکھوں سے الوداع کہتے ہوئے کہا تھا۔

"لیکن بدنامی —" اور وہ اُسے کسی قیمت پر بدنام نہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ دیپو جسے وہ بدنام نہ کرنا چاہتا تھا۔ جسے اُس نے آج تک چھونے
بھی احتراز کیا تھا۔ جس کی یاد اس کے ذہن کو محبت کے نورانی جذبات سے منور کئے رہتی تھی اور اس کے تباہ حال ہو جانے کے باوجود جس کی
نے اس کے دل میں اس کی غیر معمولی قربانی کا پُرتمکنت احساس قائم کیا ہوا تھا۔ وہی دیپو — ہاں وہی حسن و جوانی کا مخزن، وہی پاکدامنی
پاکبازی کا مرقع آج ان وحشی اور درندہ لوگوں میں پھنسا ہوا تھا جنھیں انسانیت اور انسانیت سے متعلق کسی تلخ و ملائم جذبے سے کوئی سروکار
تھا جنھوں نے دل و دماغ میں بسی ہوئی ماضی کی رنگین اور سنہری یادوں کو ملیا میٹ کرنے کا اجارہ لے رکھا تھا۔ جنھوں نے مستقبل کے خوش آئند
ابوں پر اپنی درندگی کی مہریں ثبت کر دی تھیں اور جنھوں نے حال کے صبر و شکر پر خونی ڈاکہ ڈالا تھا — دیپو، اسی دیپو کے والد نے — عورتوں
درندوں کے چنگل سے نجات دلانے والے دفتر کے سامنے دیپو کے اغوا کی بھیانک واردات سے اُسے آگاہ کیا تھا اور انتہائی جبر سے کام لیتے ہوئے
ں نے اس وقت بھی کوئی ایسا لفظ مُنہ سے نہ نکالا تھا جس سے دیپو کے ساتھ اس کا کوئی تعلق ظاہر ہو — وہ دیپو کو کسی قیمت پر بھی بدنام
کرنا چاہتا تھا۔

عورتوں کو چھڑا کر لانے والے دفتر کے سامنے دس دس بارہ بارہ برس کی معصوم لڑکیوں سے لے کر پینتیس چالیس برس تک کی ادھیڑ عمر کی عورتوں
لے کے باپ، بھائی، خاوند اور بیٹے دن بھر ایک جمِ غفیر کی صورت میں موجود رہتے تھے۔ دیپو کے والد سے ملاقات کے بعد وہ خود بھی دن میں ایک

مرتبہ ضرور وہاں سے ہو آتا تھا۔ اگرچہ اس کا وہاں جانے کا مقصد بھی انہیں سینکڑوں عزت لٹائے ہوئے لوگوں ہی کا سا تھا جن کی مائیں، بہنیں بیویاں اور بیٹیاں اغوا کر لی گئی تھیں۔ لیکن اس کے دل کی بلا وجہ کی خود اعتمادی اسمان کی طرح چلا چلا کر اپنی ماؤں، بیٹیوں، بہنوں اور بیویوں کا چرچا کرنے سے باز رکھتی تھی، اس کی ماں، اس کی بہن کا حشر —— اس کے دل کو کچھ یونہی غیر معمولی سا یقین تھا۔ ہرگز —— ہرگز ——

لیکن اُس دن اپنے گاؤں کے بے جوڑ جوان جودھا سنگھ کی زبانی اُس کی پردرد تباہی اور بربادی، اُس کی لٹی ہوئی عزت و آبرو کا حال سن کر اور اس شخص کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اس کے دل کو بہت دھچکا لگا تھا اور پورے دو روز تک اس کی وہ کھوکھلی خود اعتمادی ڈانوا ڈول رہی تھی۔ جودھا سنگھ چوپال میں اپنی لاٹھی کے سُم کو زمین میں گاڑتے ہوئے فخریہ کہا کرتا تھا —— "رونا کتوں کا کام ہے جوان —— میری بوٹی بوٹی کاٹ ڈالو۔ مجال ہے جو سی تک کر جاؤں ——"

جودھا سنگھ جس کی لاٹھی کے چرچے بیس بیس کوس تک ہر زبان پر تھے۔ جس کے گاؤں میں کبھی چوری نہ ہوئی تھی جس کے گاؤں کے ہر فرد کو دُوسرے گاؤں والے صرف اس لئے عزت کی نظر سے دیکھتے تھے کہ وہ جودھا سنگھ کے گاؤں کا رہنے والا ہے اور جس نے بیس بیس دشمنوں کو ایک وقت میں اکیلے پچھاڑ دیا تھا، آج وہی جودھا سنگھ حیران تھا کہ کس طرح اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی عورت پر ہاتھ ڈالا گیا اور اس نے اُف تک نہ کی۔ کس طرح اس کی دو جوان بہنوں کو ملا کر اور گھسیٹ کر لے گئے اور وہ خاموشی سے ان کا مُنہ دیکھتا رہ گیا اور آج وہ رو رہا تھا، رو رہا تھا اور کہہ رہا تھا —— "میں خود حیران ہوں کہ اس وقت کھیت میں چھپ جانے کا خیال مجھے کیسے آیا۔ کیوں نہ میں نے وہاں ہی جان دے دی"

آج از سرِ نو ان تمام واقعات کی تصویریں آنکھوں کے سامنے آتے ہی اس کا دل اور بھی تشویشناک وسوسوں میں گرفتار ہو گیا۔ اس کی لایقینی کو ٹھیس پہنچی اور اسے اپنا ہر سانس رُکتا محسوس ہونے لگا۔ لیکن ان تمام باتوں کی تلخ اہمیت کا شدید احساس ہونے کے باوجود وہ انھیں دل میں جگہ نہ دینا چاہتا تھا۔ اُسے اب بھی یقین تھا کہ اس کی ماں، اس کی بہن، اس کا بھائی بالکل محفوظ ہیں اور امرتسر کی کسی سڑک کے کنارے کسی سائبان کے نیچے انگیٹھی جلے ہوئے شکستہ مکان کی دہلیز پر کھڑے —— وہ تن کر سیدھا لیٹ گیا۔ رضائی کو اچھی طرح اوڑھ لینے کے بعد حسبِ معمول اُس نے اپنی آنکھیں آسمان پر گاڑ دیں۔ لیکن آسمان پر ستارے نہ تھے، آسمان ابر آلود تھا —— آج بارش ہوگی —— بارش کے خیال نے لمحہ بھر کے لئے اُسے اور پریشان کر دیا۔ اور جیسے سچ مچ ہی بوندا باندی شروع ہو گئی ہو، اس نے مُنہ پر رضائی ڈال لی۔ اس طرح رضائی مُنہ پر ڈال کر اُسے سونے کی عادت نہ تھی۔ اس کا سانس اور بھی گھٹنے لگا کہ مُنہ پر سے رضائی سرکاتے ہوئے پھر اُس نے گہرے تاریک خلا میں اپنی آنکھیں بھٹکانا شروع کر دیں۔

غیر شعوری طور پر اس کے ذہن کے پردے پر اس کے پریشان خیالات نے اپنا عکس ڈالنا شروع کیا اور خاموش خنک فضا شیطانی قہقہوں سے لرزہ براندام ہو اُٹھی۔ تلواروں، نیزوں، کلہاڑیوں، بندوقوں اور بموں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ عورتوں، بچوں، جوانوں اور بوڑھوں کی دل خراش چیخیں، رقت آمیز ہاؤ ہو واضح ہونے لگی۔ اللہ اکبر اور ست سری اکال کے فلک شگاف نعرے آپس میں گڈمڈ ہو گئے اور اُس نے دیکھا کہ وہ خود بھی ایک ننگی تلوار ہاتھ میں لئے انتہائی جوش کے عالم میں کسی نامعلوم سمت کو لپکا جا رہا ہے —— گھبرا کر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور اُس کی اُنگلیاں خود بخود اُس کے کانوں میں جا گھسیں —— نہیں، وہ اس قدر وحشی نہیں ہے۔ وہ انسانیت سے گرے ہوئے کسی فعل کا مرتکب نہیں ہو سکتا —— ناممکن!

ایکا ایکی اسے خیال آیا کہ اس دن اسے کیا ہو گیا تھا جب منگے شاہ کے ذرا سا اکسانے پر سچ مچ اُس نے تلوار ہاتھ میں لے لی تھی اور مسلم بنا کر بیوی سے بھری ہوئی ایک گاڑی پر حملہ کرنے کی نیت سے اس ہجوم میں جا شامل ہوا تھا جو کلہاڑیوں، تلواروں، نیزوں اور بندوقوں سے مسلح جوق در جوق ایک مقررہ مقام کی طرف بڑھا جا رہا تھا۔ اس کے ضمیر نے اُسے کوئی ملامت نہیں کی تھی بلکہ اُسے کچھ اس طرح محسوس ہوا تھا گویا اس کے اندر کوئی شے جگمگا اٹھی ہو۔ لیکن بعد میں وہ اپنی اس حرکت پر کس قدر نادم ہوا تھا اور اس ندامت و پشیمانی کے زیرِ اثر نہ اُسے کھانا سوجھا نہ رات بھر اچھی

رح نیند آ سکی تھی، جیسے وہ اپنے آپ سے چھپتا پھر رہا ہو اور کوئی تیز اور تند روشنی اس کا تعاقب کر رہی ہو۔ اُسے تعجب ہوا تھا کہ کس طرح ی کے ہاتھوں مرنے یا اُسے اپنے ہاتھوں مار ڈالنے کے لئے ہم کسی وقت بھی آمادہ ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اسے سمجھ نہ آئی تھی کہ آخر وہ کون سے ل ہوتے ہیں جو خونریزی سے کانپ جاتے تھے —— یہ نہتے اور بے گناہ لوگوں کے سروں کو نیزوں پر اُچھالنا۔ ان کے خاک و خون میں تھڑے دئے جسموں کو پاؤں تلے روندنا، کمسن بچوں کو ہوا میں اچھال کر تلواروں کی دھاروں پر روکنا۔ عورتوں کی دودھ بھری چھاتیاں کاٹ کر انہیں رہنہ نچانا یہ سب کیا تھا، یہ اس متمدن انسان کے جذبات تھے جو صدیوں سے منجھتے چلے آرہے ہیں۔ اس بنی آدم کی کارگزاری تھی جسے فطرتاً من پسند کہا جاتا ہے، اور جب وہ مردانگی کا جوہر دکھلانے سے پہلے ہی پلٹ آیا تھا تو منگکے شاہ نے اس کی بزدلانہ حرکت پر تعجب و افسوس کا اظہار کرتے ہوئے غلیظ ترین گالی کے ساتھ کہا تھا "ان ملیچھوں پر تمہارا ہاتھ نہیں اٹھتا، جنھوں نے تمہاری بوڑھی ماں، تمہاری نوجوان بہن اور تمہارے معصوم بھائی —"

لیکن اس دفعہ منگکے شاہ کی ان اشتعال انگیز باتوں کی اس نے ذرا بھر بھی پروا نہ کی تھی ——۔ چاہے جو کچھ ہو، اس نے فخریہ اپنے آپ سے ہا تھا — "میں اس قدر وحشی نہیں ہوں —"

نہیں، وہ اس قدر وحشی نہیں ہے — چند لمحے پیشتر کے بے ہنگم خیالات سے گھبرا کر اُس کی موندی ہوئی آنکھیں پھر کھل گئیں اور کانوں میں ٹھونسی ہوئی انگلیاں بھی اس نے باہر نکال لیں اور اپنی توجہ کو تمام اطراف سے سمیٹ کر ایک مرکز پر لانے کی کوشش کرنے لگا۔ صبح کس حیلے سے اسے کچھ پیسے دستیاب ہو سکتے ہیں۔ اس طرح تو کام نہیں چلے گا۔ لیکن اسے فوراً محسوس ہوا کہ وہ اس وقت کسی بھی ایک چیز کے بارے میں سوچ سکنے کے موڈ میں نہیں ہے۔ اس کا ذہن ٹھکانے پر نہیں، اور ذہن کا ایک آدھ لمحے کے لئے بھی ٹھکانے پر نہ ہونا —— اس کا تقریباً ہر روز ہی کا تجربہ تھا — متواتر کئی دنوں کے غیر معمولی کرب و بے چینی کا موجب بن جاتا ہے —— وہ اب سوئے گا۔

لیکن کوشش کے باوجود اپنے پر غنودگی کی کیفیت طاری کرنے میں وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کے وہ پریشان اور درد انگیز خیالات بدستور عجیب سرعت کے ساتھ اس کے دل و دماغ کو اپنی گرفت میں لیتے گئے۔ ذہن کو بیسوں جھٹکے دینے کے بعد بالآخر تنگ آکر اُس نے اپنے تئیں اپنے ان واضح و غیر واضح خیالات کے سپرد کر دیا...... سپردگی کے عالم میں سب سے پہلے اُس نے دیوو کے برہنہ جسم کو متعدد بھیڑیوں کے حلقے میں گھرے دیکھا — جیسے اس کی بوٹی بوٹی نوچ لینے کی کوشش کو عمداً نامکمل چھوڑ دیا گیا ہو۔ اس نے دیکھا کہ دیوو کے جسم سے جگہ جگہ خون رس رہا ہے۔ اس کے رخساروں سے، اس کی چھاتیوں سے، اس کی رانوں سے خون کی دھاریں بہہ رہی ہیں، جوان اور صحتمند خون کی دھاریں، لیکن وہ خاموش ہے، خاموش مبہوت اور ساکت، گویا اس کی قوت گویائی چھن گئی ہو، گویا وہ ایک بُت، ایک بے جان لاش ہو۔ پھر بھیڑیوں کا وہ ایڑیاں اُچھال اُچھال کر ناچتا اور وحشیانہ قہقہے لگاتا ہوا ہجوم نہ جانے کہاں غائب ہو گیا اور اُس نے دیکھا دیوو پوری پوشاک میں ملبوس ہے جس میں اس کے پیکر کا جہانتاب حسن برسوں اُس کی پاکدامنی و پاکبازی پر دلالت کرتا رہا تھا۔ اور ایک نہایت ہی پرسوز نغمہ اس کے لبوں پر تھرک رہا ہے اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں — اور — لیکن نہیں یہ اس کا واہمہ تھا، وہ دیوو نہ تھی وہ اس کی اپنی بہن ساوتری تھی، ساوتری جو ہمیشہ اس سے شرماتی رہتی تھی جس کی شادی کے بارے میں پچھلے برس ماں کے ساتھ اُس نے مشورہ کیا تھا۔ پھر دفعتاً ساوتری کی بغل سے اس کی لاٹھی ٹیکتی ہوئی بوڑھی ماں بھی نمودار ہو گئی اور کہیں سے ننھا سبھاش بھی چلا آیا۔ ایک طرف ساوتری کو اپنی بغل میں لئے اور دُوسری طرف ننھے سبھاش کا ہاتھ تھامے ماں نے چلنا شروع کیا۔ ابھی انھوں نے دوسرا قدم ہی اٹھایا تھا کہ ایکلخت شور و شغب کا ایک طوفان اُمنڈ آیا۔ تلواریں، نیزے اور برچھیاں چمکنے لگیں، بندوقوں اور بموں کے دھماکے زمین و آسمان میں گونجنے لگے اور نہ معلوم کہاں سے آ آ کر منگکے شاہ کے پرغضب الفاظ بھی اس کے کانوں میں پھٹنے لگے — "ان ملیچھوں پر تمہارا ہاتھ نہیں اُٹھتا۔ ان ملیچھوں پر جنھوں نے تمہاری بوڑھی ماں، تمہاری جوان بہن، تمہارے معصوم بھائی ——"

"نہیں" — وہ تڑپ کر اُٹھ بیٹھا، اور دہشتناک نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ لیکن اندھیرے میں اُسے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ فضا بدستور ساکن تھی — ساکن اور تاریک!

پرکاش پنڈت

مرتبہ ضرور وہاں سے ہو آتا تھا۔ اگرچہ اس کا وہاں جانے کا مقصد بھی انھیں سیکڑوں عزت لٹائے ہوئے لوگوں ہی کا سا تھا جن کی مائیں، بہنیں بیویاں اور بیٹیاں اغوا کر لی گئی تھیں۔ لیکن اس کے دل کی بلاوجہ کی خود اعتمادی اسے ان کی طرح چلا چلا کر اپنی ماؤں، بیٹیوں، بہنوں اور بیویوں کا چرچا کرنے سے باز رکھتی تھی، اس کی ماں، اس کی بہن کا حشر ــــ اس کے دل کو کچھ یونہی غیر معمولی سا یقین تھا۔ ہرگز ــــ ہرگز ــــ

لیکن اُس دن اپنے گاؤں کے بے جوڑ جوان جودھا سنگھ کی زبانی اُس کی پردرد تباہی اور بربادی، اُس کی لٹی ہوئی عزت و آبرو کا حال سن کر اور اس شخص کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اس کے دل کو بہت دھچکا لگا تھا اور پورے دو روز تک اس کی وہ کھوکھلی خود اعتمادی ڈانوا ڈول رہی تھی۔ جودھا سنگھ چوپال میں اپنی لاٹھی کے سُم کو زمین میں گاڑتے ہوئے فخریہ کہا کرتا تھا۔ــ "رونا کتوں کا کام ہے جوان ــ میری بوٹی بوٹی کاٹ ڈالو۔ مجال ہے جو سی تک کر جاؤں ــ"

جودھا سنگھ جس کی لاٹھی کے چرچے بیس بیس کوس تک ہر زبان پر تھے۔ جس کے گاؤں میں کبھی چوری نہ ہوئی تھی۔ جس کے گاؤں کے ہر فرد کو دوسرے گاؤں والے صرف اس لئے عزت کی نظر سے دیکھتے تھے کہ وہ جودھا سنگھ کے گاؤں کا رہنے والا ہے اور جس نے بیس بیس دشمنوں کو ایک وقت میں اکیلے پچھاڑ دیا تھا، آج وہی جودھا سنگھ حیران تھا کہ کس طرح اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی عورت پر ہاتھ ڈالا گیا اور اس نے اُف تک نہ کی۔ کس طرح اس کی دونوں جوان بہنوں کو حملہ آور گھسیٹ کر لے گئے اور وہ خاموشی سے ان کا مُنہ دیکھتا رہ گیا اور آج وہ رو رہا تھا، رو رہا تھا اور کہہ رہا تھا ــــ "میں خود حیران ہوں کہ اس وقت کھیت میں چھپ جانے کا خیال مجھے کیسے آیا۔ کیوں نہ میں نے وہاں ہی جان دے دی"

آج از سر نو ان تمام واقعات کی تصویریں آنکھوں کے سامنے آتے ہی اس کا دل اور بھی تشویشناک وسوسوں میں گرفتار ہو گیا۔ اس کی لایقینی کو ٹھیس پہنچی اور اسے اپنا ہر سانس رُکتا محسوس ہونے لگا۔ لیکن ان تمام باتوں کی تلخ اہمیت کا شدید احساس ہونے کے باوجود وہ انھیں دل میں جگہ نہ دینا چاہتا تھا۔ اُسے اب بھی یقین تھا کہ اس کی ماں، اس کی بہن، اس کا بھائی بالکل محفوظ ہیں اور امرتسر کی کسی سڑک کے کنارے، کسی سائبان کے نیچے کسی جلے ہوئے شکستہ مکان کی دہلیز پر کھڑے ــــ وہ تن کر سیدھا لیٹ گیا۔ رضائی کو اچھی طرح اوڑھ لینے کے بعد حسب معمول اُس نے اپنی آنکھیں آسمان پر گاڑ دیں۔ لیکن آسمان پر ستارے نہ تھے، آسمان ابر آلود تھا ــــ آج بارش ہو گی ــــ بارش کے خیال نے لمحہ بھر کے لئے اُسے اور پریشان کر دیا۔ اور جیسے سچ مچ ہی بوندا باندی شروع ہو گئی ہو، اس نے مُنہ پر رضائی ڈال لی۔ اس طرح رضائی مُنہ پر ڈال کر اُسے سونے کی عادت نہ تھی۔ اس کا سانس اور بھی گھٹنے لگا کہ مُنہ پر سے رضائی سرکاتے ہوئے پھر اُس نے گہرے تاریک خلا میں اپنی آنکھیں جھپکانا شروع کر دیں۔

غیر شعوری طور پر اس کے ذہن کے پردے پر اس کے پریشان خیالات نے اپنا عکس ڈالنا شروع کیا اور خاموش خنک فضا شیطانی قہقہوں سے لرزہ براندام ہو اٹھی۔ تلواروں، نیزوں، کلہاڑیوں، بندوقوں اور بموں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ عورتوں، بچوں، جوانوں اور بوڑھوں کی دل خراش چیخیں، رقت آمیز ہاؤ ہو واضح ہونی گئی۔ اللہ اکبر اور ست سری اکال کے فلک شگاف نعرے آپس میں گڈمڈ ہو گئے اور اُس نے دیکھا کہ وہ خود بھی ایک ننگی تلوار ہاتھ میں لئے انتہائی جوش کے عالم میں کسی نامعلوم سمت کو لپکا جا رہا ہے ــــ گھبرا کر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور اُس کی انگلیاں خود بخود اُس کے کانوں میں جا گھُسیں ــــ نہیں، وہ اس قدر وحشی نہیں ہے۔ وہ انسانیت سے گرے ہوئے کسی فعل کا مرتکب نہیں ہو سکتا ــــ ناممکن!

یکایک اسے خیال آیا کہ اس دن اسے کیا ہو گیا تھا جب منگے شاہ کے ذرا سا اکسانے پر سچ مچ اُس نے تلوار ہاتھ میں لے لی تھی اور مسلم پناہ گزینوں سے بھری ہوئی ایک گاڑی پر حملہ کرنے کی نیت سے اس ہجوم میں جا شامل ہوا تھا جو کلہاڑیوں، تلواروں، نیزوں اور بندوقوں سے مسلح جوق در جوق ایک مقررہ مقام کی طرف بڑھا جا رہا تھا۔ اس کے ضمیر نے اُسے کوئی ملامت نہیں کی تھی بلکہ اُسے کچھ اس طرح محسوس ہوا تھا گویا اس کے اندر کوئی شے جگمگا اٹھی ہو۔ لیکن بعد میں وہ اپنی اس حرکت پر کس قدر نادم ہوا تھا اور اس ندامت و پشیمانی کے زیر اثر نہ اُسے کھانا سوجھا نہ رات بھر اچھی

طرح نیند آسکتی تھی، جیسے وہ اپنے آپ سے چھپتا پھر رہا ہو اور کوئی تیز اور تند روشنی اس کا تعاقب کر رہی ہو۔ اُسے تعجب ہوا تھا کہ کس طرح کسی کے ہاتھوں مرنے یا اُسے اپنے ہاتھوں مار ڈالنے کے لئے ہم کسی وقت بھی آمادہ ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اسے سمجھ نہ آئی تھی کہ آخر وہ کون سے دل ہوتے ہیں جو خونریزی سے کانپ جاتے تھے —— یہ ہتّے اور بے گناہ لوگوں کے سروں کو نیزوں پر اُچھالنا۔ ان کے خاک و خون میں تھڑے ہوئے جسموں کو پاؤں تلے روندنا، کمسن بچوں کو ہوا میں اچھال کر تلواروں کی دھاروں پر روکنا۔ عورتوں کی دودھ بھری چھاتیاں کاٹ کر انہیں برہنہ نچانا یہ سب کیا تھا، یہ اس متمدن انسان کے جذبات تھے جو صدیوں سے منجھتے چلے آرہے ہیں۔ اس بنی آدم کی کارگزاری تھی جسے فطرتاً امن پسند کہا جاتا ہے، اور جب وہ مردانگی کا جوہر دکھلانے سے پہلے ہی پلٹ آیا تھا تو منگے شاہ نے اس کی بزدلانہ حرکت پر تعجب و افسوس کا اظہار کرتے ہوئے غلیظ ترین گالی کے ساتھ کہا تھا "ان ملیچھوں پر تمھارا ہاتھ نہیں اٹھتا، جنھوں نے تمھاری بوڑھی ماں، تمھاری نوجوان بہن اور تمھارے معصوم بھائی —"

لیکن اس دفعہ منگے شاہ کی ان اشتعال انگیز باتوں کی اس نے ذرا بھر بھی پروا نہ کی تھی —— چاہے جو کچھ ہو، اس نے فخریہ اپنے آپ سے کہا تھا —" میں اس قدر وحشی نہیں ہوں ——"

نہیں، وہ اس قدر وحشی نہیں ہے — چند لمحے پیشتر کے بے ہنگم خیالات سے گھبرا کر اُس کی موندی ہوئی آنکھیں پھر کھُل گئیں اور کانوں میں ٹھُونسی ہوئی انگلیاں بھی اس نے باہر نکال لیں اور اپنی توجہ کو تمام اطراف سے سمیٹ کر ایک مرکز پر لانے کی کوشش کرنے لگا۔ صبح کس حیلے سے اسے کچھ پیسے دستیاب ہو سکتے ہیں۔ اس طرح تو کام نہیں چلے گا۔ لیکن اسے فوراً محسوس ہوا کہ وہ اس وقت کسی بھی ایک چیز کے بارے میں سوچ سکنے کے موڈ میں نہیں ہے۔ اس کا ذہن ٹھکانے پر نہیں، اور ذہن کا ایک آدھ لمحے کے لئے بھی ٹھکانے پر نہ ہونا —— اس کا تقریباً ہر رنہی کا تجربہ تھا — تواتر کئی دنوں کے غیر معمولی کرب و بے چینی کا موجب بن جاتا ہے —— وہ اب سوئے گا۔

لیکن کوشش کے باوجود اپنے پر غنودگی کی کیفیت طاری کرنے میں وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کے وہ پریشان اور دردانگیز خیالات بدستور عجیب سرعت کے ساتھ اس کے دل و دماغ کو اپنی گرفت میں لیتے گئے۔ ذہن کو بیسوں جھٹکے دینے کے بعد بالآخر تنگ آکر اُس نے اپنے تئیں اپنے ان واضح و غیر واضح خیالات کے سپرد کر دیا۔ ... سپردگی کے عالم میں سب سے پہلے اُس نے دیپو کے برہنہ جسم کو متعدد بھیڑیوں کے حلقے میں گھرے دیکھا — جیسے اس کی بوٹی بوٹی نوچ لینے کی کوشش کو عمداً نامکمل چھوڑ دیا گیا ہو۔ اس نے دیکھا کہ دیپو کے جسم سے جگہ جگہ خون رس رہا ہے۔ اس کے رخساروں سے، اس کی چھاتیوں سے، اس کی رانوں سے خون کی دھاریں بہ رہی ہیں، جوان اور صحتمند خون کی دھاریں، لیکن وہ خاموش ہے، خاموش مبہوت اور ساکت، گویا اس کی قوت گویائی چھن گئی ہو، گویا وہ ایک بُت، ایک بے جان لاش ہو۔ پھر بھیڑیوں کا وہ ایڑیاں اُچھال اُچھال کر ناچتا اور وحشیانہ قہقہے لگاتا ہوا ہجوم نہ جانے کہاں غائب ہو گیا اور اُس نے دیکھا دیپو پوری پوشاک میں ملبوس ہے جس میں اس کے پیکر کا جہانتاب حسن برسوں اُس کی پاکدامنی و پاکبازی پر دلالت کرتا رہا تھا — اور ایک نہایت ہی پرسوز نغمہ اس کے لبوں پر تھرک رہا ہے اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے ہیں — اور — لیکن نہیں یہ اس کا واہمہ تھا، وہ دیپو نہ تھی وہ اس کی اپنی بہن ساوتری تھی، ساوتری جو ہمیشہ اس سے شرماتی رہتی تھی جس کی شادی کے بارے میں پچھلے برس ماں کے ساتھ اُس نے مشورہ کیا تھا۔ پھر دفعتاً ساوتری کی بغل سے اس کی لاٹھی ٹیکتی ہوئی بوڑھی ماں بھی نمودار ہو گئی اور کہیں سے ننھا سبھاش بھی چلا آیا۔ ایک طرف ساوتری کو اپنی بغل میں لئے اور دُوسری طرف ننھے سبھاش کا ہاتھ تھامے ماں نے چلنا شروع کیا۔ ابھی انھوں نے دوسرا قدم ہی اٹھایا تھا کہ یکلخت شور و شغب کا ایک طوفان اُمنڈ آیا۔ تلواریں، نیزے اور برچھیاں چمکنے لگیں۔ بندوقوں اور بموں کے دھماکے زمین آسمان میں گونجنے لگے اور نہ معلوم کہاں سے آ کر منگے شاہ کے پرغضب الفاظ بھی اس کے کانوں میں پھٹنے لگے — " ان ملیچھوں پر تمھارا ہاتھ نہیں اُٹھتا۔ ان ملیچھوں پر جنھوں نے تمھاری بوڑھی ماں، تمھاری جوان بہن، تمھارے معصوم بھائی ——"

"نہیں" — وہ تڑپ کر اُٹھ بیٹھا، اور دہشتناک نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ لیکن اندھیرے میں اُسے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ فضا بدستور ساکن تھی — ساکن اور تاریک!

پرکاش پنڈت

فریبِ نظر

سوزِ الفت کا آسرا لے کر — دل کو رازِ حیات مل نہ سکا
عمر اتنی گزار دی میں نے — تلخیٔ زیست دُور ہو نہ سکی
حُسن کی جانگداز راہوں پر — زندگی یوں فریب دیتی ہے
دل کی دنیا نثار کی میں نے — اپنی بخشش کو چھین لیتی ہے

زندگی کے حسین لمحوں میں — سرمدی زیست مجھ کو مل نہ سکی
میری محبوب گیت گاتی تھی — ایک دُھندلا سا خواب ہو جیسے
چاندنی آبشار میں ڈھل کر — روز و شب یوں گزار دیتا ہوں
ہدیۂ شوق لے کے آتی تھی — زندگی اک سراب ہو جیسے

تلخیٔ زیست کا وجود نہ تھا — اب بھی میرے حسین خوابوں میں
پاس وادی میں تھی رہِ تکمیل — مدبھری لے میں گیت گاتی ہے
سرمدی زیست طوف کرتی تھی — میری محبوب جس کی آنکھوں میں
اپنی تخئیل کی حسیں تمثیل — عہدِ رفتہ کا خواب باقی ہے

زندگی کے حسین لمحوں کی — سرمدی زیست اور وہ تکمیل
زندگی خود رقیب بن بیٹھی — اپنی تخئیل کی حسیں تمثیل
یاں میسّر نہ ہو سکی تکمیل — دُور تاروں کی رہگذار میں ہے
منزلِ عشق ناتمام رہی — کہکشاں کے حسیں غبار میں ہے

محمد صدیق کلیم

مطبوعات

جدید معلوماتِ سائنس حصّہ اوّل - از آفتاب حسن ایم ایس سی (علیگ) بی ایس سی (لندن)

اُردو ادب میں سائنٹفک مضامین کی کمی کو بڑی شدت سے محسوس کیا جارہا ہے اور یہ احساس اُردو کی ترقی کا پہلا زینہ ہے - اس کمی کو پورا کرنے کے لئے بہت سے اُردو کے بہی خواہ اور خادم کام میں لگے ہوئے ہیں - زیرِ تبصرہ کتاب اسی کام کا ایک بہترین نمونہ ہے - یہ کتاب دس ابواب پر مشتمل ہے - پہلا باب کائنات پر دوسرا ہماری زمین، تیسرا زمین کے خزانے، چوتھا حیات کے کرشمے - پانچواں انسان، چھٹا صحت، ساتواں نباتی دُنیا، آٹھواں حیوانی دُنیا، نواں قوت کے کرشمے اور دسواں صنعت (کاغذ سازی) پر ہے -

کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ سائنس کے ادق مضامین کو نہایت سلیس، شگفتہ اور عام فہم زبان میں بیان کیا گیا ہے تاکہ معمولی پڑھا لکھا آدمی کائنات اور اس کے تمام شعبوں سے واقفیت حاصل کر سکے - کتاب میں بیسوں قلمی اور عکسی تصویریں ہیں جن سے مضامین کے سمجھنے میں کافی مدد مل سکتی ہے -

یہ کتاب ایک سلسلے کی پہلی کڑی ہے اور ہم فخر سے اس کتاب کا مقابلہ انگریزی "دائرۃ المعارف" قسم کی کتابوں سے کر سکتے ہیں - یہ کتاب انجمن ترقی اُردو کی طرف سے شائع کی گئی ہے - آفتاب حسن صاحب نے اس کتاب کی تصنیف سے جہاں اُردو ادب پر احسان کیا ہے، وہیں آپ نے سائنسی مضامین کو اُردو میں منتقل کرنے کے لئے ایک راستہ بھی کھول دیا ہے -

ضخامت ۲۷۴ صفحات جلد پوش رنگین مجلّد قیمت نو روپے شائع کردہ انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی،

ماہنامہ نقوش لاہور ایڈیٹر ہاجرہ مسرور، احمد ندیم قاسمی،

اُردو زبان کی نشوونما اور ترقی میں رسائل نے بہت زیادہ حصّہ لیا ہے - ہر روز بیسیوں کی تعداد میں نئے نئے رسائل شائع ہوتے رہتے ہیں، جس سے اُردو کی ہر دلعزیزی کا پتہ چلتا ہے

"نقوش" کا پہلا نمبر ہمارے سامنے ہے - ہم نہایت خوشی اور فخر سے اس پرچہ کا خیر مقدم کرتے ہیں - یہ کوشش جہاں اُردو ادب میں ایک اضافہ ہے - وہیں "کتاب سازی" کی صنعت کے لحاظ سے بھی قابلِ قدر ہے - ہاجرہ مسرور اور احمد ندیم قاسمی کا نام "نقوش" کے بلند معیار کا ضامن ہے اور اس کا اپنا دعویٰ ہے کہ نقوش "زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ ہے" زیرِ تبصرہ نمبر نہایت احتیاط سے مرتب کیا گیا ہے، اور اُن ساری خصوصیات کا حامل ہے جو ایک زندہ ادب کا خاصّہ ہیں -

نقوش کا سرورق نہایت خوبصورت اور رنگین ہے - قیمت فی پرچہ ایک روپیہ سالانہ چندہ دس روپے ملنے کا پتہ ادارہ فروغ اُردو لاہور

ماہنامہ ماہِ نو کراچی ایڈیٹر سید وقار عظیم ایم - اے

پاکستان پبلیکیشنز کی طرف سے یہ ماہنامہ جاری کیا گیا ہے - اُردو پاکستان کی قومی زبان قرار پا چکی ہے ضرورت تھی کہ مرکز کی طرف سے ایک ایسا بلند پایہ پرچہ جاری کیا جائے جو پاکستان کی ثقافتی، ادبی، سماجی اور دوسری تحریکات کا آئینہ دار ہو — اُردو کی ترقی کے سلسلے میں ایک "ٹکسال" کی بھی ضرورت ہے، جہاں سے زبان کو صحت کی سند حاصل ہو سکے - ہمیں اُمید ہے کہ "ماہِ نو" کے ذریعے یہ کام نہایت اچھی طرح پورا کیا جا سکتا ہے -

سید وقار عظیم کی شخصیت تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ کی زیرِ ادارت "ماہِ نو" کا جاری ہونا اس بات کی ضمانت ہے کہ جہاں "ماہِ نو" اُردو ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے، وہیں اُردو کی بڑھتی ہوئی لسانی مشکلات کا حل بھی پیش کرتا رہے گا۔

یہ پرچہ با تصویر ہے۔ اس وقت تک تین نمبر شائع ہو چکے ہیں۔ اس میں لکھنے والے صرف پاکستان کے نامور ادیب ہی نہیں بلکہ بڑے ہندوستان کے نامور ادیب بھی شامل ہیں اور یوں یہ ماہنامہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان اُردو زبان کی توسیع اور ترقی کی ایک مبارک کڑی ہے۔

کتابت، طباعت نہایت عمدہ۔ کاغذ سفید انگریزی گیٹ اپ کافی قابلِ توجہ قیمت فی پرچہ ۸ رسالانہ ۶ ملنے کا پتہ پوسٹ بکس ۱۵۷ کراچی

تعلیمی ماہنامہ آموزش لاہور

ایڈیٹر سید بشیر ہاشمی

یہ تعلیمی ماہنامہ پرنسپل سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور کی زیرِ ادارت شائع ہو رہا ہے اور اس کا یہ پرچہ (بابتہ ماہ مئی ۱۹۴۸ء) ہمارے سامنے ہے۔

"حصولِ پاکستان کے بعد ملّتِ اسلامیہ کو تعلیم کے سلسلے میں جو ذمہ داریاں اور مشکلات سامنے ہیں اُن سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اب تک مصلحتوں کا شکار ہو کر مسلمان تعلیم میں ہمیشہ پیچھے رہے اور جو تعلیم انھیں ملتی بھی رہی وہ بہت ناقص تھی۔ "آموزش" کا مقصد استقلال پاکستان میں اپنے فرض کو بوجوہ احسن تکمیل دینا ہے۔ نظامِ تعلیم میں جس قدر کمزوریاں ہیں انھیں حتی المقدور جلد از جلد رفع کرنے کی کوشش کر کے ایسے انتظامات کرنا ہے جس سے ملّتِ اسلامیہ پاکستان زندہ تر اور پائندہ تر ہو جائے۔"

زیرِ نظر شمارہ مندرجہ بالا مقاصد کا آئینہ دار ہے۔ ہم اس نیک کوشش کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ "آموزش" کے اجرا سے ایک اہم ترین تعلیمی ضرورت پوری ہوئی ہے۔ سید بشیر ہاشمی پرنسپل ٹریننگ کالج لاہور ایک ماہرِ تعلیم کے ساتھ ساتھ بہت بڑے پایہ کے ادیب بھی ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ان کی زیرِ ادارت "آموزش" اپنے مقاصد میں کامیاب ہوگا۔

کتابت، طباعت اور کاغذ نہایت اعلیٰ، سرورق سادہ مگر پُرکار رسالانہ چندہ چھ روپے ملنے کا پتہ کتاب منزل لاہور

محمل

مرتبہ:۔ موحد بدایونی

اُردو افسانہ نویسوں میں خواتین کا مقام کافی بلند ہے اور ان میں کئی صفِ اوّل کی لکھنے والی بھی ہیں۔ "محمل" خواتین کے افسانوں کا مجموعہ ہے، جس میں عصمت، حجاب، مسز عبدالقادر، ڈاکٹر رشید جہاں، صدیقہ بیگم، خدیجہ مستور، حمیدہ سلطانہ، سلیم چھتاری، زیب کا ایک ایک افسانہ شامل ہے۔ یہ سب کی سب نامور افسانہ نویس خواتین ہیں اور اس لحاظ سے یہ مجموعہ نہایت کامیاب ہے۔ ایک مرد نے اسے مرتب کر کے اپنی فرض شناسی کا ثبوت دیا ہے۔

گیٹ اپ نہایت اچھی ہے۔ ضخامت ۲۵۶ صفحات قیمت تین روپے ناشر نظامی پریس بک ایجنسی بدایوں

شاہکار لاہور سالنامہ ۱۹۴۸ء قیمت دو روپے ضخامت ۱۶۰ صفحے

ایوان حیدرآباد سالنامہ ۱۹۴۸ء قیمت دو روپے ضخامت ۲۶۰ صفحات

ادبِ لطیف لاہور سالنامہ ۱۹۴۸ء قیمت دو روپے چار آنے

تینوں سالنامے ہمارے پیشِ نظر ہیں ان میں پوری پوری کوشش کی گئی ہے کہ ادب کی بدلتی اقدار کا لحاظ رکھ کر ایسا ادب پیش کیا جائے جو زندگی کا آئینہ دار ہو۔ کاغذ کی قلت اور دُوسری دقتوں کے باوجود اس قدر ضخیم سالناموں کا شائع کرنا بذاتِ خود ایک بہت بڑا کام ہے۔

(سید منظور حسین بخاری منیجر پرنٹر پبلشر نے اتحاد پریس مل روڈ میں چھپوا کر ۳۲ لارنس روڈ لاہور سے شائع کیا۔ سرورق رپن پریس میں چھپا)

ستمبر ۱۹۴۸ء

Regd. No. L.1363.

بیادگار عمدۃ الفصحاء آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی-اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لاء
جائنٹ ایڈیٹر: شیر محمد اختر

فہرست مضامین

ہمایوں، ماہ ستمبر ۱۹۴۸ء

صفحہ	صاحب مضمون	مضمون	نمبر شمار
۳۵۴	بشیر احمد	بزم ہمایوں	۱
۳۵۷	حضرت اثر صہبائی ایم۔ اے ایل ایل بی	تجلیات	۲
۳۵۸	؍ علی منظور حیدر آبادی	رسم دیرینہ	۳
۳۶۰	جناب محترمہ صفیہ شمیم صاحبہ ملیح آبادی	آہ ممتاز شاہنواز	۴
۳۶۱	؍ آزر بدنیش	تقطیع اشعار	۵
۳۷۹	؍ ڈاکٹر مسعود حسین صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ ڈی	غزل	۶
۳۸۰	؍ سید محمد یوسف صاحب	ٹرام میں (افسانہ)	۷
۳۸۴	؍ عظیم قریشی صاحب	تخیل کی موت	۸
۳۸۵	؍ مقبول حسین صاحب احمد پوری	تین ترجمے	۹
۳۸۶	؍ محترمہ شاہین صاحبہ	علاج (افسانہ)	۱۰
۳۹۱	؍ مخمور جالندھری صاحب	لمحاتِ فرصت (نظم)	۱۱
۳۹۲		مطبوعات	۱۲

سالانہ چندہ	ششماہی	فی پرچہ
۶ صر	۳ ؍	۸ ؍

بزمِ ہمایوں

پاکستان کی آزادی کا پہلا سال،

پاکستان نے اپنی عمر کا پہلا سال پورا کر لیا۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۸ء کو پاکستان کی پہلی سال گرہ تھی!

دُنیا کی تاریخ میں غالباً کسی ملک نے اپنی آزادی اتنی آسانی سے حاصل نہیں کی اور پھر کسی ملک کو اپنی آزادی کے پہلے سال میں شدید مشکلات کا اِس طرح سامنا نہیں کرنا پڑا جیسا کہ پاکستان کو۔ چنانچہ یہ بات اب دُنیا بھر کے سامنے واضح ہو چکی ہے کہ اُدھر برطانیہ نے اِدھر ہندوستان نے تقسیمِ ہند اور پاکستان کے قیام کو نہ صرف خوش دلی سے تسلیم نہ کیا بلکہ اِن دونوں نے اس کے قیام و استحکام میں ہر طرح کے روڑے اٹکائے۔ یوں کہنے کو برطانیہ نے ہندوستان کی تقسیم میں غیر جانبداری برتی لیکن فی الحقیقت اُس نے ہر طرح پاکستان کو نقصان پہنچایا مثلاً سرحداتی کمشنوں کے فیصلے صریح بے انصافی پر مبنی تھے۔ اگر اُن میں انصاف برتا جاتا تو نہ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا قتلِ عام ہوتا اور نہ کشمیر کا مسئلہ موجودہ صورت اختیار کرتا۔ لیکن اس کو محض برطانیہ کی شاطرانہ چال کہہ کر مطمئن ہو جانا غلط ہے۔ ہندوؤں اور سکھوں کے ہر دلعزیز لیڈروں کی ایک گہری سازش کے ماتحت چھ سات یا شاید آٹھ دس لاکھ مسلمانوں کے قتلِ عام کے ساتھ ساتھ نہ صرف اقتصادی طور پر پاکستان کا خاتمہ کرنے کی مسلسل کوشش کی گئی بلکہ اُدھر کشمیر میں فوج کشی کی گئی اور افغانستان اور سرحدی علاقے میں ساز باز کا جال پھیلایا گیا اور اِدھر خود پاکستان میں فسادی عناصر کو ہر طرح اُبھارنے کا کام در پردہ جاری رکھا گیا۔ مشرقی پنجاب اور دہلی وغیرہ سے آنے والے ساٹھ لاکھ مسلمان مہاجرین مغربی پنجاب میں داخل ہوئے۔ قریب تھا کہ صنعت و تجارت کا سلسلہ ٹوٹ جائے، نظم و نسق کی بنیادیں ہل جائیں، اسلامی یگانگت ختم ہو جائے اور ہمت و حوصلہ پست ہو کر ایک نئی قوم کا شیرازہ تار تار ہو جائے۔ منطقی، شاید عقلی طور پر بھی ایسا ہو جانا چاہیے تھا لیکن کہیئے کہ "اتفاقات ہیں زمانے کے" یا یہ کہ خدا کا فضل شامل ہوا، قوم گری لیکن اتنی نہ گری کہ اُبھر نہ سکے، رہنما لڑکھڑائے لیکن نہ اتنے کہ سنبھل نہ سکیں، خود غرضی، خویش پروری، رشوت ستانی، کاہلی سب درست، یہ کیڑے قوم کو گھن کی طرح لگے، اب بھی حالت خاصی غیر تسلی بخش ہے، اب بھی اندرونی و بیرونی خطرات قوم کو گھیرے ہوئے ہیں۔ لیکن قائدِ اعظم اور بعض اور لیڈروں نے بُرے سے بُرے حالات میں بھی ہمت ہاری نہ ہوش کھویا۔ اور سب سے بڑی وجہ قوم کے زندہ رہنے کی یہ ہوئی کہ قوم نے زخم خوردہ اور نقاہت زدہ ہوتے ہوئے بھی اپنی قومیت کو سینے سے لگائے رکھا۔ اپنے دین و تہذیب کی محبوب متاع کو گرتے گرتے بھی اپنے ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ پاکستان دُور دُور پھیلا ہوا، اُس میں صوبجاتی علیحدگی، نسلی امتیاز، لسانی افتراق اس کے کئی رہنے والے سُستی اور زیاں کاری اور مایوسی کا شکار، لیکن اُدھر غیر مسلموں کے تعصب و تنگ نظری کے کارنامے اور اِدھر صدیوں کی بیچارگی و ظلم کے بعد حاصل شدہ دولتِ آزادی اور ایک صحیح قسم کی جمہوری اسلامی مملکت قائم کرنے کی شاندار ممکنات! ان آسمانی جھلکیوں نے قوم کے خود غرض مایوس منتشر لوگوں کو یکجا کر دیا اور ؎

اک آواز میں سوتی بستی جگا دی
نئی اک لگن سب کے دل میں لگا دی

یہ بستی پاکستان ہے۔ یہ آواز اسلام کی آواز ہے اور یہ لگن سچے اسلام کی لگن ہے، جو مغربی جمہوریت سے بہتر ایک برادرانہ جمہوریت اور روسی اشتراکیت سے بہتر ایک روحانی اشتراکیت ہے۔

پاکستان پہلے سال میں اتنی مشکلات میں گھر گیا، اس پر اتنی مصیبتیں آ پڑیں، حکومت کی کل کے بعض پُرزے کچھ ایسے جمے اور معاشرت کی گاڑی کے پہیئے کچھ ایسے ہلے کہ معلوم ہوا گویا قوم کی قوم اپنی زندگی کی راہ پر رُک جانے اور گر جانے کو ہے، لیکن نہیں غور سے دیکھو تو باوجود ہزار دقتوں اور رُکاوٹوں کے یہ کل بھی کچھ نہ کچھ گھومتی رہی اور یہ گاڑی بھی کچھ نہ کچھ چلتی ہی رہی۔ پاکستان جمعیت اقوام کا رکن بنا اور فلسطین و کشمیر کے بارے میں اُس کے نمائندوں نے اپنی قابلیت کے وہ جوہر دکھائے کہ بین الاقوامی حلقوں میں اس نو عمر قوم کی فطنت و ذکاوت کی دھوم مچ گئی اور اس کے عزائم و حق طلبی سے کچھ ہمدردی پیدا ہو گئی۔ مہاجرین قافلے در قافلے ہزاروں مرے لاکھوں اب بھی بے دردی اور بے اطمینانی کا شکار ہو رہے ہیں۔ ان کی بحالی اور دلجوئی ایک پسماندہ قوم سے نہ ہو سکے گی لیکن انشاء اللہ قوم اُبھرے گی

اس مسئلہ کو حل کرکے رہے گی۔ اُدھر جنگِ کشمیر میں ہندوستان سی سرمایہ دار منظم قوم کی فوج چند بہادر قبائلیوں اور پاکستانی فوج کے چند بے سروسامان لیکن پُر عزم دستوں کو شکست دے کر باہر نہ نکال سکی۔ کم مایہ پاکستانی قوم نے دُنیا کو اپنا جوہر دکھا دیا۔ نومبر میں پاکستان کی پہلی تعلیمی اور دسمبر میں پہلی صنعتی کانفرنس منعقد ہوئی۔ عورتوں نے اپنی حقوق طلبی کے مظاہرے کئے اور پنجاب اسمبلی میں شریعت بل منظور ہوا۔ قائدِ اعظم نے صوبجاتی تعصب کو کم کرنے کی ترغیب دی اور اُردو کی قومی زبان ہونے کی حیثیت پر زور دیا۔ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے کام میں ضرورت سے زیادہ آہستگی سے کام لیا گیا اور قانون ساز اسمبلی میں بعض مفید قوانین منظور کرنے کی طرف کچھ توجہ دی گئی۔ صوبوں میں بھی جنبش کے آثار نظر آئے۔ پنجاب تو بمشکل مہاجرین کا مسئلہ نبٹانے کی سعی کرتا رہا۔ مشرقی بنگال نے مغربی بنگال میں جذب کئے جانے کی سعی کا سدِباب کیا، سندھ کا وزیرِ اعظم برطرف ہوا، سرحد میں عبد الغفار خاں اور اُس کے ساتھیوں کی سرکوبی کی گئی۔ بلوچستان میں خود اختیاری حکومت کی طرف ایک ذرا سا قدم بڑھایا گیا۔ اُدھر مرکز میں اقبال اکادمی کے قیام کی تیاریاں ہوئیں۔ بنیادی حقوق کی کمیٹی نے پاکستانیوں کے لئے انصاف، مساوات اور رواداری کے اصول وضع کئے۔ پاکستان کے مرکزی سرکاری بنک کا قیام عمل میں آیا۔ ساتھ ہی اسلامی ممالک سے تعلقات استوار کرنے کے سلسلے میں دار السلطنت میں چار ثقافتی ادارے بنائے گئے اور ماہِ اگست میں قائدِ اعظم نے اپنے پیغامِ عید میں دنیا بھر کے اسلامی ممالک کو ایک متحدہ محاذ قائم کرنے کی دعوت دی اور پاکستانیوں کو اتحاد و تنظیم کا سبق دیا اور پھر پاکستان کی سالگرہ کے دن انھیں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ قدرت نے تمھیں قسم قسم کی نعمتوں سے مالا مال کیا ہے اب یہ تمھارا کام ہے کہ اپنی متفقہ مساعی سے تم اس پر ایک شاندار تعمیر کھڑی کر دکھاؤ۔ یُوں اس نوزائیدہ سلطنت خداداد پاکستان نے اپنی عمر کا پہلا سال پورا کیا۔ ابھی اس میں بہت سی کمیاں ہیں، کشمیر کا مسئلہ ابھی حل نہیں ہوا، نظم و ضبط میں سیکڑوں خامیاں ہیں، اربابِ اقتدار اور امیر طبقے میں سے اکثر اصحاب نے اپنے فرائض اور ایثار کی ضرورت کا صحیح احساس نہیں کیا۔ ترقی پرور اسلامی جذبہ ابھی ابھرنے نہیں پایا، خدا کرے بیرونی حالات ذرا درست ہوں اور اندرونی سازشیں دب جائیں کہ اسلام کی انقلابی روح اس نئی مملکت کے رگ و ریشہ میں تیزی سے دوڑ جائے۔

پاکستان اور اُس کے ادیبوں کے فرائض

پاکستان کے معنی ہیں ایک اسلامی مملکت ایسی جس میں مسلمانوں کے دین و تہذیب کی حفاظت ہو سکے اور انھیں کما حقہٗ فروغ حاصل ہو۔ یہ وہ تہذیب ہے جس میں مسلم و غیر مسلم دونوں کے حقوق و فرائض مساوی ہیں [اور جو انسانیت کی بلند ترین اقدار کی محافظ و ضامن ہے۔] یہی ہے وہ پاکیزہ مقصد جس کے لئے پاکستان قائم ہوا۔ یہی ہے اس کا وہ نصب العین جس کے لئے قربانیاں دی گئیں اور بوقتِ ضرورت ہمیشہ دی جائیں گی! جو شخص اس بنیادی مقصد کا قائل نہیں وہ سچا پاکستانی نہیں، جو ادیب علانیہ یا مخفی طور پر اس بنیاد کو اکھاڑنے کے درپے رہے اُسے پاکستان کا شہری بننے کا حق حاصل نہیں اور سچا پاکستانی ادیب وہی ہے جو آڑے وقتوں میں جب پاکستان کی ہستی خطرے میں ہو۔ جب اُس کی تہذیب پر کھُلے یا چھُپے حملے ہو رہے ہوں۔ اُس کے سبز و سفید جھنڈے کو بلند رکھے اور عوام و خواص کے دل میں اُس کی محبت اور اُس سے دلی لگاؤ پیدا کرنے میں ممد و معاون ہو۔ تھوڑے عرصے سے اس سلسلے میں اُردو کے بعض رسالوں اور اخباروں میں ایک دلچسپ اور اہم مباحثہ جاری ہے کہ کیا ایک ادیب کو اپنی ریاست کا وفادار ہونا چاہئیے؟ کسی ہوشمند آدمی کو جو ایک متمدن ریاست کا باشندہ ہو اس وفاداری سے انکار نہیں ہو سکتا البتہ یہ سوال ضرور کیا جا سکتا ہے کہ اس وفاداری کی نوعیت کیا ہے؟ اس کا جواب بھی صاف ہے کہ کسی ادیب بلکہ کسی عام شہری پر بھی یہ واجب نہیں کہ وہ حکومت وقت کی ہر بات کو سراہے، قومی و ملکی وفاداری کا تقاضا یہ ہونا چاہئیے کہ اچھی باتوں کو پسند کیا جائے اور بُری باتوں کو ناپسند اور پھر اپنی پسند و ناپسند کو عملی جامہ پہنایا جائے لیکن اس طرح کہ اس سے قوم کو بہ حیثیت قوم کے تقویت پہنچے نہ کہ ضعف، وہ دنیا کی نظروں میں سربلند ہو جائے نہ ذلیل،

جب پاکستان بنا تو بعض ہندوستانی کمیونسٹوں نے اعلان کیا کہ ہمیں مذہبی بنا پر بنی ہوئی ریاست منظور نہیں، تھوڑے دنوں کے بعد انھوں نے ہندوستان اور پاکستان میں اپنی الگ الگ کمیونسٹ پارٹیاں بنا لیں لیکن اُن کے بعد ترقی پسند ادیب دوستوں نے اب بھی یہی رٹ لگائی "کہ کیا ہم نے اس دن کے لئے جد و جہد کی تھی کہ ہمیں مذہب کی بنا پر تقسیم کر دیا جائے؟" اُن کی "فکرِ رسا" نے دیکھا کہ "پاکستان پیدا ہو رہا ہے اُس نفرت کی کوکھ سے جو مسلمان کو ہندو کی اقتصادی برتری نے عطا کی ہے" اس کے پیدا ہوتے ہی اُن کی طبعِ لطیف پر یہ گراں گزرا کہ "آخر انسانیت کی لاش کو فرقہ پرستی کے گدھ کب تک نوچتے رہیں گے؟" لیکن چند ہی ماہ کے بعد اُن کی

"روشنی طبع" نے جو عوام کی ادبی رفیق ہی نہیں سیاسی مشیر بھی ہے "بعد اطمینان اعلان کیا کہ اب نئے حکمران اپنے اصلی روپ میں عوام کے سامنے آتے جاتے ہیں اور قومیت کے وہ محل جکنا چور ہو رہے ہیں جن کی بنیاد مذہب کے غلط نظریئے پر رکھی گئی تھی" وہ تو شکر ہے کہ پاکستان کے ترقی پسندوں ہی میں سے بعض "تنزل پسند" بھی پیدا ہو گئے جنہوں نے جنگ کشمیر کے سلسلے میں قبائلی استبدادیت کی حمایت میں ایک اپیل شائع کی" لیکن خالص ترقی پسندوں کے نزدیک اس "المیہ پہلو" کا ایک "خوشگوار پہلو" بھی تھا اور وہ یہ کہ ان کی تحریک کو اب "ستھرے ستھرے ادیب میسر آگئے" جو "دونوں ریاستوں کے سیاسی رُخ پر کڑی اور واضح نظر رکھنے لگے"۔ اس "واضح اور کڑی نظر" کا جائزہ لیتے ہوئے قدرت اللہ صاحب شہاب کے مشہور افسانے "یا خدا" کے دیباچے میں ممتاز شیریں صاحبہ نے ان ادیبوں کے "تنگ رستے" کا خوب تجزیہ کیا ہے اور اُن کی اس اُمید پر کہ عنقریب ایک نیا انسان جنم لیگا روس اور امریکہ کی جوع الارض کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا ہے کہ آخر یہ انسان کب پیدا ہوگا؟ اور پھر انھیں مشورہ دیا ہے کہ اب جبکہ پاکستان بن چکا ہے وہ عملی اور تعمیری افسانے لکھ کر قوم کو اُبھاریں۔ "متحدہ ہندوستان کے ان ستھرے ادیبوں" کی شوخیٔ تحریر پر "نقوش" کی تازہ ترین فریاد قابل داد ہے کہ پاکستان کے ظہور میں آتے ہی چند گروہوں نے پاکستان کے خلاف محض اس لئے زہر اُگلنا شروع کر دیا ہے کہ "وہ ان کی نظر میں خالص اسلامی مملکت ہے"۔ ان جناب کو شاید معلوم نہیں کہ تقسیم ہند کا مطالبہ دو قومی نظریے کی بنا پر کیا گیا تھا" ان دونوں قوموں کی ثقافت براہِ راست ان کے مذہبی عقاید و روایات سے وابستہ تھی اس لئے اسے مذہبی تقسیم کہا جائے گا۔ "متحدہ ہندوستان کا نعرہ لگاتے ہوئے وہ یہ نہیں سوچتے کہ اگر ایسا ہوا تو پاکستان وہاں کی آدھی آبادی ایک دوسرے کو بھنبھوڑ کے دھر دے گی"۔ خلاق ترقی پسند فن کاروں کو اس کوتاہ نظری کا شکار نہ ہونا چاہیئے۔ "ہم پاکستان کے وفادار ہیں"۔ "ہم اپنے ملک کی حدوں میں کسی بیرونی حکومت کی مداخلت گوارا نہیں کر سکتے اور پاکستان کی محبت ہم سے ازل کی محبت کو نہیں چھین سکتی"۔ شاید اسی تبصرے کو دیکھ کر "سنگ میل" نے لکھا ہے کہ "نقوش میں قدیم و جدید نظریات کا تصادم نظر آتا ہے"۔ لیکن اسے تصادم کیوں کہا جائے تعاون کیوں نہ سمجھا جائے۔ ادیب عوام سے اپنی وابستگی میں ضرور استواری دکھائیں یعنی "یہ استواری بشرط وفاداری ہونا چاہیئے یعنی اپنی ریاست سے اپنی قوم سے اپنے تمدن و روایات سے وفاداری۔ حسن عسکری صاحب نے اس سلسلے میں خوب لکھا ہے کہ "جب قوم کی موت و زندگی کا سوال درپیش ہو تو ادیب بھی ایک عام انسان بن جاتا ہے"۔ "اور اگر واقعی ادب کا مطالبہ (ترقی پسند) ادیبوں سے یہی ہے کہ پاکستان سے ہمدردی نہ رکھیں تو قوم کو نہ ایسے ادب کی ضرورت ہے اور نہ ایسے ادیبوں کی"۔ "البتہ خود پاکستان کے ادیبوں کو اپنے رویئے پر ضرور نظر ثانی کرنی پڑے گی"۔ "قوم آپ کو قبول کرنے سے پہلے یہ ضرور پوچھے گی کہ آپ کے دل میں اپنے عوام کا کتنا درد اور اُن کی کتنی عزت ہے"۔ ایم اسلم صاحب نے بھی جو ترقی پسندوں کے حلقے میں ناپسند کئے جاتے ہیں تعمیری پہلو پر زور دیتے ہوئے لکھا ہے کہ "پاکستان کے ادیب کا اس وقت سب سے بڑا فرض قوم میں زندگی کی ایک نئی روح پھونکنا ہے"۔ "اگر اس کے دل میں قوم کا درد ہے تو اسے آواز بلند کرنی پڑے گی۔ انتقام کے لئے نہیں بلکہ آنے والے دور کے لئے قوم کو تیار کرنے کے لئے"۔ "عزت اور آبرو کے ساتھ رہنے کے لئے قربانی کی ضرورت ہے"۔ اخلاق کو بلند کرنے کی کوشش کرو اور اپنی قوم کو تنظیم پر ابھارو۔

اخیر میں ہم پھر ایک بار صحیح ترقی پسندی اور عوام کی بہتری کا واسطہ دے کر اشتراکی ترقی پسندوں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنے اس اعلان کو کہ پاکستان کی حکومت دشمنِ عوام ہے اور ہم پاکستان کو تسلیم نہیں کرتے واپس لے لیں اور اپنے اس عزم کو کہ اُس کے تعلیمی اور ادبی رسالوں اخباروں کا مقاطعہ کیا جائے ترک کر دیں اس کی بجائے اُن کی تحریروں سے پاکستان کی محبت ظاہر ہو اور وہ اسلامی ترقی پسندی کے ادیبوں سے تعاون کریں۔ پھر وہ دیکھیں کہ پاکستان میں کس طرح ایک روحانی معاشی انقلاب کی صحیح بنیادیں استوار ہو سکتی ہیں۔ اور اپنے پاکستان کے ادیبوں سے اور اپنے علما اور امرا اور اربابِ حکومت سے ہم با ادب استدعا کرتے ہیں کہ اگر آپ پاکستان کی اسلامی مملکت کو غیر مسلم فاشیت پسندوں کی دست برد سے اور انتہا پسند کمیونسٹوں کے زمین دوز زہریلے پروپیگنڈے سے بچانا چاہتے ہیں اگر آپ اپنی قوم کو عہد حاضر کی اُن جدیدیت پرستوں کا شکار ہو جانے سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں تو خدارا اسلام کی تغیر پسند روح کو اپنے رگ و پے میں دوڑنے دیجئے۔ الارضُ لِلّٰہ کا نعرہ لگا کر سرمایہ داری کا خاتمہ کیجئے۔ اپنی مرصّع سُست رَو زندگیوں کو یکسر بدل ڈالئے، سادگی و راستی کو اپنا شعار بنایئے اور وقت کے انقلابی تقاضوں کا لحاظ رکھتے ہوئے پاکستان کے ذریعے دنیا کو اسلام کی اُس روحانی اشتراکیت کی جھلک پھر ایک بار دکھا دیجئے جس نے تیرہ سو سال ہوئے پرانی فرسودہ دُنیا کو ایک قطعاً نئی دُنیا بنا دیا تھا!

بشیر احمد

ہمایوں اپنے مقالہ نگاروں اور شاعروں سے توقع رکھتا ہے کہ آئندہ وہ زیادہ تر ایسے موضوعات پر اپنے خیالات کا اظہار کریں جو موجودہ حالات میں قوم کے لئے مفید ثابت ہوں۔

تجلّیات

راز ہے یہ طلسم بود و نبود
جذبۂ عشق سے ہے اِس کی کشود

چشمِ دل میں ہو نورِ عشق اگر
شش جہت میں ہے، تو ہی تو موجود

راستے بے شمار ہیں لیکن
سب کی ہے تو ہی منزلِ مقصود

وقفِ تسبیح انجم و مہ و مہر
آسمانِ کبود سر بسجود

صبحِ گلپوش غرقِ سجدۂ شوق
شامِ مدہوش غرقِ رقص و سرود

بحر و بر آدم و وحوش و طیور
سب پجاری ہیں اور تو معبود

اپنے لطف و کرم سے دے مجھکو
بالِ جبریل و نغمۂ داؤدؑ

اثرؔ صہبائی

رسمِ دیرینہ

جلیل

۱
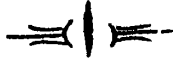
شروع ہی سے ہے دلدادۂ رسوم بشر
اِدھر مراسمِ دُنیا رسومِ دیں ہیں اُدھر

بشر کی زندہ دلی ہے رسوم کے بس ہیں
جُدا جدا ہیں مگر ہر مقام کی رسمیں

ذوی العقول ہیں پروردۂ جہانِ رسوم
خرد از آنِ بشر ہے بشر از آنِ رسوم

مزے حیات کے پابندیٔ رسوم میں ہیں
حسیں رسوم کو تاباں نجوم سمجھائیں

مزے رسوم کے موقع محل پہ لیتا ہوں
ہر اختراعِ سلف کی میں داد دیتا ہوں

قدیم تر ہے ضیافت کی رسم دُنیا میں
برادرانِ وطن گر اسی پہ غور کریں

ضیافت اپنے افادات خود ہی کہہ دے گی
خلوصِ داعی و مدعو کا جائزہ لے گی

بصد خلوص دل افروز ہو گیا یہ خیال
نہ دی کسی کو بھی دعوت گزر گئے دو سال

۲

بس اس کے ساتھ ہی دعوت کا اہتمام کیا
یہ اہتمام جو کرنا تھا، خُوب کام کیا

بُھلا دیا تھا جنھیں آئے وہ عزیز بھی یاد
بُلا کے شاد ہُوا میں، عزیز آ کر شاد

لحاظِ سن کا ہر اک نے کیا بطرزِ قدیم
دُعا سلام قدمبوس بندگی تسلیم

کسی نے نام پہ کی اکتفا بوقتِ خطاب
کسی نے صرف میاں کہہ دیا کسی نے جناب

چچا کو دیکھ کے خالد نے پیش کرسی کی — چچا نے دے کے دعائیں مزاج پرسی کی

سلام کرنے لگا کوئی دونوں ہاتھوں سے — کسی کے دل کو لُبھایا کسی نے باتوں سے

کہیں ادب کا، کہیں بے تکلفی کا ظہور — ہر ایک بات کا ہر اک عزیز کو ہے شعور

کسی کو دیکھ کے اُٹّھا کوئی پئے تعظیم — کہا کسی نے اشارے سے بیٹھ جاؤ ندیم

۳

بنا ہے طفلِ دو سالہ کا ترجماں کوئی — کہ دُور سب کی سمجھ سے ہے اس کی خوش گوئی

ہوئے نصیب مجھے ایسے ایسے نظّارے — ضیا سے جن کی خصائل سنور گئے سارے

بجبر خود ہی دُھلایا جو میں نے سب کا ہاتھ — اُجاگر اور زیادہ ہوئے دلی جذبات

یہ دلنواز جماعت یہ جانفروز سماں — یہ اکل و شرب یہ صدق و صفا یہ دسترخواں

اُدھر ہیں تیس اِدھر تیس جملہ مہماں ساٹھ — مری نگاہ سے دیکھے کوئی اب اُن کا ٹھاٹھ

جلائے چشم "طرب کے مجسّمے" ہیں آج — شگفتہ حال شگفتہ جبیں شگفتہ مزاج

زبانِ حال سے یہ کہہ رہی ہے زندہ دلی — نشاط عُمر گرانمایہ بے سوال ملی

ملا جو وقت مداراتِ اقربا کے لئے — "ادب[1] کے لطف اُٹھائے مزے دعا کے لئے"

ہر ایک رسم ہے مرغوبِ دل ہر آئینہ
چُنی ہے میں نے مثالاً یہ رسمِ دیرینہ

علی منظور

[1] معرعہ حضرت داغ دہلوی کا مصرع ہے "ستم کے لطف اُٹھائے مزے جفا کیلئے" صرف دو لفظ بدل دوں تو کیا یہ مصرع میرا ہو جائے گا؟ بنا بریں تضمین کی علامت بنا دی گئی ہے۔

آہ ممتاز شاہنواز

الوداع ممتاز اے ممتازِ ملت الوداع — الوداع اے نازشِ بزمِ اخوت الوداع

تیری ہستی قومِ خستہ کے لئے اکسیر تھی — مضطرب سینے میں تیرے حسرتِ تعمیر تھی

حشر تک زندہ رہیں گی تیری خدماتِ عظیم — باغِ پاکستان کی تھی روح پرور تو شمیم

پیکرِ علم و عمل اے ملک و ملت کا جمال — رونقِ بزمِ ادب اے حاملِ فضل و کمال

تجھ سے قائم آبرو تھی ملکِ پاکستان کی — تجھ سے روشن تھیں فضائیں بزمِ انگلستان کی

تیری طوفانی تمنائیں رہینِ برق و باد — تیری ہستی تھی سراسر اجتہاد و اجتہاد

تیری ہستی جوہرِ انسانیت ممتاز تھی — قوم کی تو چارہ ساز و چارہ گر دمساز تھی

تیری شمعِ زیست سے تھا فرقِ مشرق نابدا — تیرے سینے میں شرارِ آگہی تھا بیقرار

کس طرف گم ہو گئی وہ گلستانوں کی بہار — کس اندھیرے میں ہوئی روپوش برقِ بیقرار

کیا ہوئی ممتاز تیری گلفشانی کیا ہوئی — جس سے دل سرشار تھا وہ خوش بیانی کیا ہوئی

اے شہیدِ ملک و ملت اے پرستارِ وطن — پیکرِ سوزِ عمل اے افتخارِ انجمن

عالمِ نسواں جگا کر کیا غضب تو سو گئی — بزم ابھی جمنے نہ پائی تھی کہ سونی ہو گئی

بجھ گئی شمعِ وطن ہر سو اندھیرا ہو گیا

رات ابھی ڈھلنے نہ پائی تھی سویرا ہو گیا

صفیہ شمیم ملیح آبادی

تقطیع اشعار

سال نامہ ہمایوں بابت ۱۹۴۶ء میں میرا ایک مضمون بہ عنوان "پنگل" شایع ہوا تھا - اُس میں مَیں نے عرض کیا تھا کہ تقطیع میں دشواریاں
لئے پیدا ہو جاتی ہیں کہ پہلی منزل چھوڑ کر دوسری منزل سے ابتدا کی جاتی ہے یعنی بہ جائے اس کے کہ تقطیع اشعار کے وقت پہلے اصول یا اجزا یا مقطع
(Syllables) دریافت کئے جائیں اور پھر رکن، ابتدا ارکان سے کی جاتی ہے - اس مضمون میں بطور مثال چند شعروں کی تقطیع بھی
پیش کی گئی تھی - اس وقت جو کچھ عرض کیا گیا تھا وہ ضروریاتِ مضمون کے لئے کافی تھا، اُس سے مفصل بحث کرنے کا خیال کھٹک رہا تھا چنانچہ فرصت
ملی تو ادھر متوجہ ہُوا - غور و خوض کا نتیجہ نذرِ ناظرین ہے - اس کے قطعی صحیح اور مکمل ہونے کا دعویٰ نہیں - یہ صرف تجربہ ہی بتا سکتا ہے کہ اس میں کیا کیا خامیاں
ہیں اور وہ کیوں کر دُور کی جا سکتی ہیں - جو کچھ عرض کیا جا رہا ہے وہ قابلِ عمل ضرور ہے -

بہت سی وہ باتیں دہرانی پڑی ہیں جو ہر تصنیف عروض میں ملتی ہیں، لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جدت کا دعویٰ نہیں، مسلمات عروض ہی اس طریقے
کی اساس و بنیاد ہیں - اُن میں جو ترمیم پیش کی جا رہی ہے وہ "انقلاب آور" نہیں ہے - بلکہ قدیم بنیادوں کو استوار و محکم کرتی ہے - اس لئے قدیم اصول
و مسلّمات کا اعادہ محلِ نظر نہ ہونا چاہیئے -

اصول یا اجزا یا مقطع (Syllables) تقطیع کے سنگِ بنیاد ہیں - انہیں سے ارکان بنائے گئے ہیں - صرف دو ہی قسم کے اصول یعنی سبب
اور وتد مفید مطلب ہیں اور انھیں سے کام لینا مقصود ہے - لیکن ان کو تین قسموں میں منقسم کرنا ضروری ہے - جو یہ ہیں -

(۱) سببِ خفیف (۲) سببِ ثقیل (۳) سببِ متوسط

(۱) وتدِ مجموع یا مقرون (۲) وتدِ مفروق (۳) وتدِ کثرت

بہ غرضِ سہولت ان کے لئے یہ علامتیں کام میں لائی گئی ہیں :-

(۱) سببِ خفیف = سَخ (۲) سببِ ثقیل = ثَق (۳) سببِ متوسط = سَم

(۱) وتدِ مجموع یا مقرون = وم (۲) وتدِ مفروق = وق (۳) وتدِ کثرت = وک

ایک اور علامت بھی استعمال کی گئی ہے "وکُم" - اس کا مطلب ہے کہ وتدِ کثرت کا حرفِ آخر مرفوع یا مضموم ہے -

سببِ خفیف = ایک حرف متحرک مع ایک حرفِ ساکن - مثلاً شب - دَم - دِل - گُل

سببِ ثقیل = ایک حرف متحرک کے بعد ہی دُوسرا حرفِ متحرک - اس کی مثال اُردو کے کسی ایک لفظ سے تو پیش
نہیں کی جا سکتی، ہاں فارسی میں اس قسم کے چند لفظ ملتے ہیں - اُردو میں یہ لفظوں کے بیچ میں آتا ہے -

سببِ متوسط = ایک حرف متحرک کے بعد دو ساکن مثلاً - دُور - چار - پاس +

وتدِ مجموع یا مقرون = دو متحرک حرفوں کے بعد ایک ساکن مثلاً - کرم - برس - جگر +

وتدِ مفروق = دو متحرک حرفوں کے درمیان ایک ساکن اس کی اور سببِ ثقیل کی ایک ہی کیفیت ہے - اس لئے مثال نہیں دی جا سکتی -

وتدِ کثرت = دو متحرک حرفوں کے بعد دو ساکن - مثلاً قصور - فتور - مزدور

صحیح صحیح تقطیع کرنے کے لئے نہایت ضروری ہے کہ شعر بلحاظ ترنم عروضی بالکل صحیح صحیح یعنی موزوں پڑھا جائے - اگر ترنم عروضی میں غلطی

تقطیع کا غلط ہونا لازمی ہے۔ کیونکہ عروض کا دار و مدار کلیتہً آواز پر ہے۔ اگر کسی وجہ سے آواز ہی میں خطا ہو گئی تو شعر کی موزونی رخصت ہو جائے گی اور اپنے ساتھ ساتھ صحیح صحیح تقطیع کی صلاحیت کو بھی لے جائے گی۔ رہ بر ہی گمراہ ہو گیا تو پھر جن کی رہ بری کر رہا ہے وہ کیوں نہ بھٹکتے پھریں گے۔

چوں کہ تقطیع کا دار و مدار کلیتہً اصوات پر ہے جو بذریعہ علاماتِ اصوات یعنی حروف ظاہر کی جاتی ہیں اس لئے ماہرانِ عروض نے چند قاعدے ایسے مقرر کئے ہیں جن سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ علامتوں سے کیوں کر آوازوں کو معیّن و مشخّص کیا جاتا ہے۔ انھوں نے ایسی سب علامتوں کو چھوڑ دیا ہے جو کسی وجہ سے لکھی گئی ہیں مگر معاونِ تلفظ نہیں۔ اسی لئے وہ کہتے ہیں کہ عروض حروفِ ملفوظی سے بحث کرتا ہے اُسے حروفِ مکتوبی سے غرض نہیں۔ مطالعۂ اجزائے ارکان سے یہ بہ آسانی سمجھ میں آ سکتا ہے کہ اُن کی تعمیر میں حروفِ متحرکہ و غیر متحرکہ کو دخل ہے۔ نوعیتِ حرکات کو کوئی دخل نہیں۔ اسی لئے پُل۔ پِل۔ اور پَل۔ تینوں سببِ خفیف ہیں۔ اب

قاعدہ اوّل یہ قرار پایا کہ اجزائے ارکان میں صرف یہ دیکھو کہ جس قسم کا جزو زیرِ بحث ہے اُس میں تعدادِ حروفِ متحرکہ اور ساکنہ میں مطابقت ہے یا نہیں یعنی حرفِ متحرک کی جگہ متحرک۔ اور ساکن کی جگہ ساکن ہے یا نہیں۔ یہ طریقہ وزنِ عروضی دریافت کرنے کا ہے۔ وزنِ صرفی میں حرفوں کے متحرک اور ساکن ہونے ہی پر نظر نہیں ہوتی بلکہ یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ اعراب میں بھی مطابقت ہے یا نہیں۔ مثلاً ضَرَبَ کا وزن ہے فَعَلَ۔ چوں کہ فَعَلَ کے تینوں حرف مفتوح ہیں اس لئے ضَرَبَ کے بھی تینوں حرف مفتوح ہونے چاہئیں۔ اگر نہ ہوں گے تو یہ نہ کہا جا سکے گا کہ ضَرَبَ بروزن فَعَلَ ہے۔ لیکن عروضی اس کی پروا نہ کرے گا۔ وہ صرف یہ دیکھے گا کہ متحرک حرف کی جگہ متحرک اور ساکن کی جگہ ساکن ہے یا نہیں۔ وہ اختلافِ اعراب سے چشم پوشی کرے گا۔ وہ "الٰہی" کا وزن "فعولن" بتائے گا حالانکہ اختلافِ اعراب موجود ہے۔

قاعدہ دوم۔ چوں کہ تقطیع محض آواز سے واسطہ رکھتی ہے اس لئے اُن حرفوں کا دریافت کرنا بھی لازم ہے جو تحریر میں آتے مگر تلفظ میں نہیں آتے ہیں یا جو اپنے ماقبل یا مابعد سے مل جاتے ہیں۔ یہ حروف سات ہیں۔

(۱) الف (۲) نونِ غنہ (۳) واوِ معدولہ (۴) ہائے مختفی (۵) واوِ عاطفہ جو اپنے ماقبل سے ملا کر پڑھا جائے (۶) حروفِ مخلوط کی ہ اور ی (۷) الف و لام تنکیری جب ترکیب میں واقع ہوں۔

(۱) الف۔ اگر دو لفظوں میں سے دوسرے لفظ کا پہلا حرف الف ہو اور وہ پہلے لفظ سے ملا کر اس طرح پڑھا جائے کہ الف کی حرکت لفظِ اوّل کے حرفِ آخر پر منتقل ہو جائے تو یہ الف شمار میں نہ آئے گا۔ مثلاً۔

دیکھا نہ قدِ سرو کو پھر ہم نے چمن میں جس دن سے دل اُس قامتِ چالاک سے باندھا (نظیر اکبر آبادی)

دوسرے مصرع میں "دل اُس" "دِلُس" پڑھا جائے گا اس لئے الف تقطیع میں نہ آئے گا۔

(۲) نونِ غنہ اگر لفظ کے آخر میں ہو گا تو شمار نہ ہو گا ؎

بلبل نے ہو کے نازاں کل یوں کہا جو ہم سے (ایضاً)

"نازاں" اور "یوں" کے نونِ غنہ تقطیع سے خارج ہیں۔ آخرِ مصرع میں حسبِ ضرورت کبھی حذف کیا جاتا ہے اور کبھی نہیں۔

(۳) واوِ معدولہ بھی تقطیع سے حذف کر دیا جاتا ہے اس کا باعث وہی اصول موضوعہ ہے کہ جو حرف بولا نہ جائے گا وہ تقطیع کے لئے بیکار ہے کیوں کہ وہ علامتِ صوت کا مرتبہ نہیں رکھتا۔ مثلاً

مرے دل کی تو ہے یہی خوشی تو جفا کرے میں وفا کروں (ایضاً)

تقطیع میں "خوشی" کو "خُشی" لیں گے۔

(۴) ہائے مختفی۔ یہ صرف فارسی کے لفظوں میں آتی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اپنے حرفِ ماقبل کی حرکت کو ظاہر کرے۔ چونکہ فارسی

کرت کا ماخذ ایک ہی ہے اور سنسکرت میں بہت کم لفظ ایسے ہیں جن کا حرف آخر ساکن ہے اس لئے فارسی کا بھی یہی حال تھا۔ لیکن ایران نے
بی رسم الخط اختیار کیا تو اس حرکت کو ظاہر کرنے کے لئے عربی ہی سے یہ قاعدہ بھی لے لیا کہ لفظ کے حرفِ آخر کی حرکت ظاہر کرنے کو اُس میں
ائے ہوز بڑھا دے۔ اس لئے یہ حرف تقطیع میں نہیں آتا ؎

کبھو ملک کبھو بس لبِ کبھو پیالہ ٹیک (ایضاً)

"کی ہ اس کی مثال ہے۔ فارسی کے بہت سے ایسے لفظ بھی اس کی زد میں آ گئے جن میں ہائے مختفی نہیں ہے مثلاً۔ بندہ۔ خندہ۔ لیکن ایرانیوں
پر قناعت نہیں کی۔ عربی کے بعض لفظوں میں جو تائے مدور آخر میں آتی ہے اور جسے وہ مثل ہائے ہوز پڑھتے ہیں مثلاً۔ تجربہ کعبہ۔ مدینہ وغیرہ۔
بھی انھوں نے اپنی زبان کا قاعدہ جاری کر دیا اور تقطیع سے گرانے لگے۔ شعرائے اردو نے اُن کی تقلید کی ؎

لحظہ لحظہ عیش و عشرت دم بہ دم رقص و سرود (ایضاً)

لفظ کی ہ تقطیع میں نہ آئے گی۔

(۵) واو عاطفہ۔ یہ بھی اگر اپنے حرفِ ماقبل سے مل کر اُس کو متحرک کر دے تو اپنی ہستی مٹا دیتی ہے۔ مثال بالا میں "رقص و سرود" تقطیع میں
"رقصُ سرود" لیا جائے گا۔

(۶) حروف مخلوط جن سے مراد ہیں وہ حرف جن کی آوازوں میں ہائے ہوز یا یائے تحتانی مل جاتی ہے۔ مثلاً۔ گھر۔ پیاس۔ کیوں۔ حرف مخلوط
حرف کا اعتبار رکھتا ہے۔ جن حرفوں میں ہائے ہوز کی آواز ملی ہوئی ہے۔ مثلاً بھ۔ جھ وغیرہ۔ ہندی میں اُن کے لئے ایک ہی علامت ہے۔
دو میں اُن کو دو حرف ملا کر بنایا گیا ہے، اس لئے تحریر میں باوجود دو حرف ہونے کے تقطیع میں اُن کو ایک ہی حرف تسلیم کیا گیا ہے۔ جن حرفوں میں
یحتانی ملی ہوئی ہے وہ تو ہندی میں بھی دو حرف ملا کر لکھے جاتے اور ایک ہی حرف تصور کئے جاتے ہیں۔ مثالیں ؎

دیکھ عقد ثریا ہمیں انگور کی سوجھی | کیوں بادہ کشاں ہم کو بھی کیا دور کی سوجھی (ایضاً)

(۷) الفاظ عربی میں الف و لام تنکیری ــــ اگر حروف قمری کے پہلے آئیں تو الف نہیں بولا جاتا۔ اگر حروف شمسی کے پہلے آئیں تو دونوں حرف حذف
ہو جاتے ہیں۔ مگر یہ اس وقت ہوتا ہے جب یہ حرف دو لفظوں کو ملائیں۔ ورنہ حروف قمری کے پہلے دونوں بولے جاتے ہیں اور حروف شمسی کے
صرف لام گر جاتا ہے۔ مثلاً۔ فی الحقیقت اور عظیم الشان ؎

ادائیں غمزے کی ہیں جتاتی کہ فی الحقیقت اگر کسی نے | رکھا ہے دل طاقِ آسماں پر لیا ہے وہ اس سے اُتار ہم نے (ایضاً)
وہ عظیم الشان مکان دیتی تھیں جن کی رفعتیں | ہنس کے طاقِ آسماں کو طاقِ ابرو سے جواب (ایضاً)

قاعدہ سوم۔ ایک حرف متحرک کے ساتھ دو ساکن ہوں گے تو ساکن دوم متحرک مانا جائے گا (بہ شرطیکہ حشو میں واقع ہو) یعنی سببِ متوسط
مد مفروق کا درجہ رکھے گا۔ اور تین ساکن ہوں گے تو تیسرا ساکن حذف کر دیا جائے گا۔ مثالیں ان کی اشعار ذیل کے الفاظِ خط کشیدہ ہیں ؎

ہم جو کرتے ہیں عشق پیری میں | خوب رو بار بار ہنستے ہیں
جو قدیمی ہیں یار دوست نظیر | وہ بھی بے اختیار ہنستے ہیں

لفظ کثرت کا حرفِ آخر بھی اسی قاعدے کے تحت میں آتا ہے کیونکہ پہلے حرفِ متحرک کے بعد دوسرے حرف متحرک کے ساتھ دو ساکن آتے ہیں۔ اس سے
کثرو کم بنتا ہے۔

قاعدہ چہارم۔ بعض لفظ ایسے ہیں کہ اُن کے بولنے میں بعض آوازیں مُنہ سے نکلتی ہیں مگر اُن کے لئے حرف نہیں لکھے جاتے، ایسے حرف تقطیع
میں شمار کئے جاتے ہیں۔ مثلاً۔ آنا = اانا۔ اسی طرح اگر کسرۂ اضافت ذرا زیادہ بڑھا جائے یعنی اُس سے یائے تحتانی کی آواز پیدا ہو تو وہ کسرہ تقطیع

میں بائے ساکن متصور ہوگا۔ حرف مشدد بھی دو حرفوں کا اعتبار رکھتا ہے۔ الفاظ خط کشیدہ دیکھو۔

تو آپ جس کو سمجھتا ہے عطش غفلت سے وہ موج آب نہیں ہے فقط ہے موج سراب (نظیر اکبرآبادی)
کثرت اہل نشاط و جوش نوشا نوش سے از زمیں تا آسماں شور نے و چنگ و رباب (ایضاً)
وہ تجمل، وہ تموّل، وہ تفوّق، وہ غرور وہ تحشّم، وہ تنعّم، وہ تعیّش، وہ شباب (")

قاعدہ پنجم۔ بعض اوقات اُن لفظوں کو جن کے آخر میں حروفِ علت میں سے کوئی حرف ہوتا ہے اس طرح پڑھتے ہیں کہ ان کے ماقبل پر صرف زبر، زیر یا پیش کی حرکت محسوس ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں یہ حروفِ علت تقطیع میں نہیں آتے۔ جیسے اس شعر میں ؎

وہ گورا پنڈا اور اُس میں سُرخی گر خدا نے تے سر سے تاپا کیا ہے میدہ تو موتیوں کا اور اُس کو گوندھا شہاب میں ہے (ایضاً)

گورا، نے، سے، تو اور کو سے حروف آخر پڑھنے میں نہیں آتے اس لئے تقطیع میں بھی نہ آئیں گے۔

اس قسم کا حرف اپنے سے پہلے یا بعد کے سبب خفیف وغیرہ سے مل کر جزو بناتا ہے۔ اس کے قاعدے درج ذیل ہیں۔

(۱) ایک حرف متحرک اگر سخ اور سخ یا سخ سخ اور سخ سخ کے درمیان آئے گا تو اپنے بعد کے سخ سے مل کر وم بنائے گا۔

فریب دانہ نہ کھاتا میں زیرِ نہار آ رندے مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلان۔

ترنم	=	فَ	رے	بِ	دا	نَ	نَ	کھا	تا	مَ	زی	نَ	ہا	ری رند
اجزائے صوتی	=	فَ سخ		بِ سخ		نَ نَ		سخ سخ		مَ سخ		نَ سخ		سخ سم
اجزائے عروضی	=	وم		وم		سق		سخ سخ		وم		وم		سخ سم
ارکان	=	مفاعلن				فَع		لا تن		مفا		علن		فَع لان

قلم پھر شہادت کی اُنگلی اُٹھا = فعولن فعولن فعولن فعَل

قَ	لم	پھِ	ر	شَ	ہا	دت	کِ	اُنگ	لی	اُ	ٹھا

قَ سخ سخ شَ سخ سخ کِ سخ سخ اُ سخ

وم سخ وم سخ وم سخ وم

فعولن فعو لن فعو لن فعَل

(۲) ایک حرف متحرک سخ اور سم کے درمیان سم سے مل کر وک بناتا ہے

نہ تو تاب دل میں جفا کی ہے نہ وفا کی طرزہ ہے یار میں = متفاعلن، متفاعلن متفاعلن متفاعلان

نَ تُ تا بَ دل مِ جَ فا کِ ہے نَ وَ فا کِ طر زِہ یا رُ میں

نَ تُ سخ ب سخ م جَ سخ کِ سخ نَ وَ سخ کِ سخ زَہ سخ رَ سم

سق سخ دم سق سخ وم سق سخ دم سق سخ وک

مُتَ فا علن مت فا علن مت فا علن مت فا علان

(۳) اگر ایک حرف متحرک سخ کے آگے اور ایک اُس کے پیچھے آئے گا تو اس اجتماع سے وکم بنے گا۔ بہ شرطیکہ پہلے حرف سے کسی اور جزو بنانے کا کام نہیں لیا جا چکا ہے۔ اگر لیا جا چکا ہے تو دوسرا حسب محل وقوع اپنے ماقبل سے مل کر وق یا مابعد سے مل کر وم یا وک بنائے گا۔

تڑپ رہا ہوں میں نیم بسمل = فعولُ فعلن فعولُ فعلن

تَ ڑپ ر ہا ہو مَ نی مَ بس مل

تَ سخ رَ سخ سخ مَ سخ مَ سخ سخ

وکم سخ سخ وکم سخ سخ

فعولُ فع لن فعولُ فع لن

جی میں ہے اُس کی کاکلِ پُرخم کو دیکھیے = مفعولُ فاعلاتُ مفاعیلُ فاعلن

جی مے ہَ اُس کِ کا کُ لِ پُر خم کُ دے کھِ یے

سخ سخ ہَ سخ کِ سخ کُ لِ سخ سخ کُ سخ کھ سخ

سخ دق وکم سخ وم دق وم سخ وم

مف عولُ فا علات مفا عیلُ فا علن

مومن ہے زبانِ عرضِ احوال = مفعولُ مفاعلن مفاعیل۔

مو مِن ہَ زَ با نِ عر ضِ اَح وال

سخ سخ ہ زَ سخ نِ سخ ضِ سخ سم

سخ دق وم وم وم سم

مف عولُ مفا علن مفا عیل

ہے چرخ جب سے ابلقِ ایام پر سوار = مفعولُ فاعلات مفاعیلُ فاعلات

ہے چر خَ جب سِ اَب لَ قِ اَیّ یامَ پَرَ سَ وار

سخ سخ خَ سخ سِ سخ لَ قِ سخ سخ مَ سخ سَ سم

سخ دق وکم سخ وم دق سخ وک

مف عولُ فاعلاتُ مفا عیلُ فا علات

(۴) اگر دو یا دو سے زیادہ "سخوں" کے بعد ایک ایسا سخ آئے جس کے آگے پیچھے ایک ایک حرف متحرک ہو تو پہلا حرف متحرک اپنے ماقبل سے مل کر وق بنائے گا۔

آتا ہے صبح اُٹھ کر تیری برابری کو = مفعولُ فاعلاتن مفعول فاعلاتن

آ تا ہَ صُب حَ اُٹھ کر تے ری بَ را بَ ری کو

سخ سخ ہَ سخ حَ سخ سخ سخ سخ بَ سخ بَ سخ سخ

سخ دق وم سخ سخ دق سخ وم سخ

مف عولُ فا علا تن مف عولُ فا علا تن

(۵) اگر دو متحرک حرف اور سخ یا سخ سخ بار بار آئیں گے تو حروفِ متحرکہ سے سق بنے گا۔

مرا دشمن اگرچہ زمانہ رہا = فَعِلُن فَعِلُن فَعِلُن فَعِلُن

بِ رَ دش مَ نَ گر ہِ زَ ما نَ رَ ہا

بِ رَ سخ مَ نَ سخ ہِ زَ سخ نَ رَ سخ

سق سخ سق سخ سق سخ سق سخ

فعِ لن فعِ لن فعِ لن فعِ لن

پئے دُنیا یونہی بک بک کے عبث جان کھپائی = فَعِلاتن فَعِلاتن فَعِلاتن فَعِلاتن

پَ ئے دُن یا ئی وِ بک بک کِ عَ بث جا نَ کھ پا ئی

پَ ئے سخ سخ ئی وِ سخ سخ کِ عَ سخ سخ نَ کھ سخ سخ

سق سخ سخ سق سخ سخ سق سخ سخ سق سخ سخ

فعِ لا تن فعِ لا تن فعِ لا تن فعِ لا تن

(۶) اگر سخ سے پہلے دو حروف متحرکہ اور اس کے بعد ایک سخ دو حروف متحرکہ کے درمیان آئے گا۔ تو دونوں حروف متحرکہ سق اور سخ کے حرف متحرک مابعد سے ملنے سے وق بنے گا۔

مجھے بے خودی یہ تونے بھلی چاشنی چکھائی = فَعِلاتُ فاعلاتن فَعِلاتُ فاعلاتن

مُ جھ بے خُ دی یہ تو نے بھَ لِ چا شُ نی چَ کھا ئی

مُ جھ سخ خُ سخ یہ سخ سخ بھَ لِ سخ شُ سخ چَ سخ سخ

سق وق سخ دم سخ سق وق سخ دم سخ

فعِ لاتُ فا علا تن فعِ لاتُ فا علا تن

(۷) دو متحرک حرف سخ یا سخ سخ اور سخ یا سخ سخ یا سخ سخ سم کے درمیان آئیں گے تو پہلا اپنے ماقبل سے مل کر وق اور دوسرا اپنے مابعد سے دم بنائیں گے، بہ شرطیکہ ان سخوں میں سے کسی سے جزو نہیں بنایا جا چکا ہے۔ اگر بنایا جا چکا ہے تو ان حروف متحرکہ سے سق بنے گا۔

دل سعئ رنگیں سے لب رہِ زۂ سودا کا = مفعولُ مفاعیلن مفعولُ مفاعیلن

دل سع ئِ نے رن گی سے لب رے زَہ سو دا کا

سخ سخ ئِ نے سخ سخ سخ سخ سخ زَہ سخ سخ سخ

سخ وق دم سخ سخ سخ وق دم سخ سخ

مف عولُ مفا عی لن مف عولُ مفا عی لن

کچھ تو دے اے فلکِ ناانصاف = فاعلاتن فَعِلاتن فَعِلات

کچھ تُ دے اے فَ لَ کے نا اِن صاف

سخ تُ سخ سخ فَ لَ سخ سخ سخ سم

سخ دم سخ سق سخ سخ سخ سم

فا علا تن فعِ لا تن فعِ لات

قاعدہ ششم۔ بعض جگہ بحر کے رکن میں سکون ہوتا ہے اور شعر میں اس جگہ حرف متحرک ہوتا ہے ایسی صورت میں تقطیع کی

رورت کے باعث متحرک کو ساکن کر لیتے ہیں جیسے ؎ تم نے بات نہ مانی میری — اس میں بات نہ میری کو باتن میری خیال کریں گے۔

مروجہ کتب عروض میں آٹھ ارکان سالم اور اٹھارہ ارکان مزاحف تسلیم کئے گئے ہیں لیکن درحقیقت یہ اتنے ہی نہیں ہیں۔ بقول مصنف دائق البلاغت ۳۵ ہیں۔ یہ تصنیفات ارکانِ سالم کا تجزیہ کرکے یہ تو بتاتی ہیں کہ اُن میں کون کون سے اجزا کس کس ترتیب سے آئے ہیں لیکن مزاحفات کی ترتیب اجزا کا ذکر نہیں کرتیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ارکانِ سالم تختۂ مشق ترمیم ہیں۔ اس بے اعتنائی کی یہ کوئی معقول وجہ نہیں۔ اور جو طریقۂ تقطیع پیش کیا جا رہا ہے اُس سے تو اس کا اخراج ممکن ہی نہیں۔ اس لئے ذیل میں سالم اور مزاحف دونوں طرح کے ارکان کے اجزا درج کئے جاتے ہیں۔

رکن	اجزا
۱۔ فع	سخ
۲۔ فعلن	سخ سخ
۳۔ مفعولن	سخ سخ سخ
۴۔ مفعولاتُ	سخ سخ وق
۵۔ مُستفعلان	سخ سخ وک
۶۔ مُستفعلن	سخ سخ وم
۷۔ مُفتعلن	سخ ستق سخ
۸۔ فِعلان	سخ سم
۹۔ فِعلات	″
۱۰۔ مفعول	″
۱۱۔ مفعولُ	سخ وق
+ مُس تفع لن	سخ وق سخ
۱۲۔ فاعلاتْ	سخ وک
۱۳۔ فاعلان	″
۱۴۔ فاعلاتُ	سخ وکم
۱۵۔ فاعلن	سخ وم
۱۶۔ فاعلاتن	سخ وم سخ
۱۷۔ فاعلیان	سخ وم سم
۱۸۔ فَعَ	ستق
۱۹۔ فَعِلن	ستق سخ
۲۰۔ فَعِلاتن	ستق سخ سخ
۲۱۔ مُتَفاعلن	ستق سخ وم
۲۲۔ مُتَفاعلان	ستق سخ وک
۲۳۔ فَعِلان	ستق سم
۲۴۔ فَعِلات	ستق وق
+ مُتَ فاعِ لن	ستق وق سخ
۲۵۔ فاعِ-لاتْ-لانْ-یان	سم
۲۶۔ فاعِ	وق
+ فاعِ لن	وق سخ
+ فاعِ لاتن	وق سخ سخ
+ فاعِ لی یان	وق سخ سم
+ فاعِ لاتْ	وق سم
+ فاعِ لان	″
+ فاعِ لاتُ	وق وق
+ مُفتَ عِلن	وق وم
۲۷۔ فَعول	وک
۲۸۔ فَعولُ	وکم
۲۹۔ فَعَل	وم
۳۰۔ فَعولن	وم سخ
۳۱۔ مَفاعیلن	وم سخ سخ
۳۲۔ مفاعیلان	وم سخ سم
۳۳۔ مَفاعَلتن	وم ستق سخ
۳۴۔ مَفاعیل	وم سم
۳۵۔ مفاعیلُ	وم وق
۳۶۔ مَفاعِلن	وم وم

+ دیکھو نمبر ۶-۲۱-۱۶-۱۷-۱۲-۱۳-۱۴-۱۱ اور ۷ جن کے ٹکڑے اس طرح بھی ہو سکتے ہیں۔

بہ غرض سہولت ارکان کے اسباب و اوتاد کی مختلف قسموں کو یک جا کیا جاتا ہے، اس سے تعین ارکان میں بھی مدد ملے گی۔

سخ = تعِ - تن - عو - عی - فا - فعَ - فِع - مُس - مُت - لا - تُن -

ستی = تَعَ - عِلَ - فِعِ - مُتَ -

سم = تان - عول - عیل - فاع - لات - لان - یان -

وق = فاعِ - مُفتَ - عولُ - تفعِ - لاتُ - عیلُ -

وم = عِلا - عِلُن - عِلی - فَعَل - فَعو - مفا -

وک = عِلاث - علاث - فَعول

وکم = فَعولُ

بحر خواہ سالم ہو خواہ مزاحف، مثمن ہو، مسدس ہو یا مربع، قریب قریب ہر رکن کے بعد پڑھنے والا ٹھہر جاتا ہے۔ ہر رکن کے بعد نہیں ٹھہرتا تو اکثر دو دو یا تین تین رکنوں کے بعد ٹھہر جاتا ہے اور اس طرح خود بہ خود مصرع کے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ اسے وقفہ یا سکتہ کہنا چاہیے۔ یہ سنسکرت میں یتی (यति) اور انگریزی میں "سیزورا" (caesura) کہلاتا ہے۔ اس کا خیال رکھنا نہایت ضروری ہے کیونکہ یہ دریافت رکن میں بہت مدد دیتا ہے۔ مثلاً۔

جو پیشِ نظر وہ گل اندام ہوگا ۔۔۔ تو دامن نگہ کا شفق فام ہوگا (نظیر اکبر آبادی)

ندھڑک ہو جو نکلنا تو سرِ خطر پہ ٹھوکر ۔۔۔ جو نظر گزر سے ڈرنا تو جھجک جھجک کے چلنا (")

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وقفہ یا سکتہ مصرع کے دو ٹکڑے کر دیتا ہے اور مصرع کے پہلے ٹکڑے کے ارکان اس کے دوسرے ٹکڑے میں دُہرا دیے جاتے ہیں۔ اس صورت میں مصرع کے جزوِ اوّل کے ارکان پہلے دریافت کر لینا تقطیع میں بہت مدد دیتا ہے۔ ؎ مجھے بے خودی یہ تو نے بھلی چاشنی چکھائی۔ اس کی تقطیع سطور بالا میں دیکھو

سطور بالا میں کہا جا چکا ہے کہ عروض کا تعلق اصوات سے بالخصوص ہے۔ اس لئے لفظوں کے صوتی ٹکڑے کئے بغیر تقطیع کا صحیح صحیح کرنا ناممکن ہے۔ حقیقت یہی اسباب و اوتاد تک رسائی کا ذریعہ ہیں۔ پہلے ہر لفظ کے صوتی اجزا معین کر لینے پھر اسباب و اوتاد بنانے چاہئیں۔ سبب اور وتد ان سے سبب کے ٹکڑے نہیں کئے جا سکتے کیونکہ حقیقتہً وہ ایک صوتِ مرکب ہے۔ جس کو عروض عربی سبب خفیف، عروض سنسکرت گرُو (गुरु) اور عروض انگریزی جزو موکد (accented syllable) سے موسوم کرتا ہے۔ لیکن جیسے عروض عربی وتدِ مفروق یا مجموع ہوتا ہے وہ دو اصوات کا مجموعہ ہے جس کی ترکیب میں ایک صوتِ مفرد [جسے سنسکرت میں لگھو (लघु) اور انگریزی میں جزو غیر موکد (unaccented syllable) کہتے ہیں] اور ایک صوتِ مرکب داخل ہیں۔ دراصل یہ دو مقطعات کے برابر ہے۔ مثلاً بَرَس (سال) ایک مفرد آواز کو بَ ظاہر کرتی ہے اور ایک مرکب آواز کو رَس۔ اس لئے چاہیے کہ پہلے مصرع کے اجزائے صوتی معین کئے جائیں اور وہ اس طرح۔

کوہ میں لالہ نہیں، آہ یہ خونِ فرہاد ۔۔۔ جوش میں آن کے پتھر کے تئیں چیر کھلا (نظیر اکبر آبادی)

ترنم = کو ہَ مے لا لَ نَ ہی آ ہَ یہ خو نے فر ہا دہ

اجزائے صوتی = سخ ہَ سخ سخ لَ نَ سخ سخ ہَ یہ سخ سخ سخ سم

اجزائے عروضی = سخ وم سخ ستی سخ سخ ستی سخ سخ سخ سم

ارکان = فا علا تن فع لا تن فع لا تن فع لان

ترنم = جو ش سے آ نَ کِ پت تھر کِ تَ ئی چی رَ کھ لا
اجزائے صوتی = سخ ش سخ سخ نَ کِ سخ سخ کِ تَ سخ سخ رَ کھ سخ
اجزائے عروضی = سخ وم سخ سق سخ سخ سق سخ سخ سق سخ
ارکان = فا علا تن فع لا تن فع لا تن فع لن

اجزائے صوتی سے اسباب و اوتاد بنانے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ یہ سوچنا ہی نہیں پڑتا کہ لفظ کا کون سا ٹکڑا اپنے پہلے یا پچھلے لفظ سے ملے گا۔ تعین اجزائے صوتی کے بعد توجہ تمام تر اس نقطے پر مرکوز ہو جاتی ہے کہ کن کن اجزا کو ملا کر اسباب و اوتاد بنائے جائیں یہ طریقہ انگریزی اور سنسکرت سے مشابہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ حسنِ اتفاق ہے کہ غور و خوض نے اس منزل پر پہنچا دیا ورنہ دونوں طریقوں میں جو فرق ہے ظاہر ہے۔ انگریزی اور سنسکرت اجزائے صوتی دریافت کرتے ہی فوراً ارکان بنا ڈالتی ہیں، مگر یہاں اجزائے صوتی دریافت کرنے کے بعد اصول بنائے جاتے ہیں، پھر اُن سے ارکان۔

اردو زبان کی مروجہ بحریں متقارب۔ متدارک۔ کامل۔ رمل۔ رجز۔ ہزج۔ خفیف۔ سریع۔ مجتث۔ منسرح اور مضارع ہیں۔ اُن کی تقطیع کی مثالیں درج ذیل ہیں۔ باقی بحریں اردو میں بہت کم رائج ہیں۔ اس لئے نظر انداز کر دی گئیں۔ لیکن اس طریقے سے اُن کی تقطیع بھی کی جا سکتی ہے کیونکہ تقدیم و تاخیر کے ساتھ ان میں وہی ارکان ہیں جو بحورِ مروجہ میں آ چکے ہیں۔

بحرِ متقارب

مرے خونِ ناحق کی دے گی گواہی — فعولن فعولن فعولن فعولن۔

ترنم = م رے خو نَ نا حق کِ دے گی گ وا ہی
اجزائے صوتی = م سخ سخ نَ سخ سخ کِ سخ سخ گ سخ سخ
اجزائے عروضی = وم سخ وم سخ وم سخ وم سخ
ارکان = فعو لن فعو لن فعو لن فعو لن

پرستش کے قابل ہے تو اے کریم — فعولن فعولن فعولن فعول۔

پَ رَس تِش کِ قا بل ہَ تو اے کَ ریم
پَ سخ سخ کِ سخ سخ ہَ سخ سخ کَ سم
وم سخ وم سخ وم سخ وک
فعو لن فعو لن فعو لن فعول

قلم پھر شہادت کی انگلی اُٹھا — فعولن فعولن فعولن فعَل

ق لم پھر ش ہا دت کِ اُنگ لی اُٹھا
ق سخ سخ ش سخ سخ کِ سخ سخ اُ سخ
وم سخ وم سخ وم سخ وم
فعو لن فعو لن فعو لن فعَل

اے وائے قسمت دیکھا نہ تجھ کو — فعلن فعولن فعلن فعولن

اے وا ئے قس مت وشے کھا نَ تجھ کو

سخ سخ ئے سخ سخ سخ سخ نَ سخ سخ

سخ سخ دم سخ سخ سخ دم سخ

فِع لن فعو لن فِع لن فعو لن

تڑپ رہا ہوں میں نیم بسمل = فعولُ فِعلُن فعولُ فِعلُن۔

تَ ڑپ رہا ہو مَ نی م بس مل

ت سخ ر سخ سخ م سخ م سخ سخ

وکم سخ سخ وکم سخ سخ

فعو لُ فِع لن فعو لُ فِع لن

اُلٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا = فِعلن فاع فعولُن فِعلن فاع فعولن فاع فُعَل

اُل ٹی ہو گَ ئی سب تد بی رے کچھ نَ دَ وا نے کا مَ کِ یا

سخ سخ سخ گَ ئی سخ سخ سخ سخ سخ نَ دَ سخ سخ مَ کَ سخ

سخ سخ دق دم سخ سخ سخ دق دم سخ دق دم

فِع لن فاع فعو لن فِع لن فاع فعولن فاع فُعَل

بحرِ متدارک

کیا کروں میں گلہ یار نے کیا کیا = فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن

کا کَ رُو ںے گَ لہ یا رَ نے کا کِ یا

سخ کَ سخ سخ گَ سخ سخ رَ سخ سخ کِ سخ

سخ دم سخ دم سخ دم سخ دم

فا علن فا علن فا علن فا علن

کب تک ہم کو غم میں رکھے = فِعلن فِعلن فِعلن فِعلن

کب تک ہم کو غم میں رک کھے

سخ سخ سخ سخ سخ سخ سخ سخ

فِع لن فِع لن فِع لن فِع لن

مرادِ دشمن اگرچہ زمانہ رہا = فَعِلُن فَعِلُن فَعِلُن فَعِلُن

مِ رَ دُش مَ نَ گر چِ زَ ما نَ رَہا

مِ رَ سخ م نَ سخ چِ ز سخ نَ رَ سخ

ستق سخ ستق سخ ستق سخ ستق سخ

فِع لن فِع لن فِع لن فِع لن

گئے دونوں جہان کے کام سے ہم نہ ادھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے = فَعِلُن آٹھ بار

گ ئے دو نُں جَ ہا نَ کِ کا مَ سِ ہم نَ اِدھر کِ رَہے نَ اُدھر کِ رَہے

گ ئے سخ نُ جَ سخ نَ کِ سخ مَ سِ سخ نَ اِ سخ کِ رَ سخ نَ اُ سخ کِ رَ سخ

سق سخ سق سخ سق سخ سق سخ سق سخ سق سخ سق سخ سق سخ

فَعِ لُن فَعِ لُن فَعِ لُن فَعِ لُن فَعِ لُن فَعِ لُن فَعِ لُن فَعِ لُن

اُلٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا = فِعْلُن سات بار اور فِع

اُل ٹی ہو گی سب تد بی رے کچھ نہ دوا نے کا م کیا

سخ سخ سخ سخ سخ سخ سخ سخ سخ سخ سخ سخ سخ سخ سخ

فِع لُن فِع لُن فِع لُن فِع لُن فِع لُن فِع لُن فِع لُن فِع

بادِ خزاں کے قدموں سے باغ ہوا تھا خارستان = فِعْلن فِعلن فِعلن فِع فِعلن فِعلن فِعلن فاع

با دِ خ زا کے قد مو سے با غ ہ وا تھا خا رس تان

سخ سخ سخ سخ سخ سخ سخ سخ سخ سخ سخ سخ سخ سم

فِع لن فِع لن فِع لن فِع فِع لن فِع لن فِع لن فاع

بحرِ ہزج

بڑے موذی کو مارا نفسِ اَمّارہ کو گر مارا = مفاعیلن چار بار

بَ ڑے مو ذی کُ ما را نف سِ اَم ما رہ کُ گر ما را

بَ سخ سخ سخ کُ سخ سخ سخ سِ سخ سخ سخ کُ سخ سخ سخ

دم سخ سخ دم سخ سخ دم سخ سخ دم سخ سخ

مفا عی لن مفا عی لن مفا عی لن مفا عی لن

جنوں نے کچھ نہ چھوڑا آخر اپنے جیب و داماں میں = مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلان

جُ نو نے کچھ نَ چھو ڑا آ خ رپ نے جے بُ دا ما میں

جُ سخ سخ سخ نَ سخ سخ سخ خ سخ سخ سخ بُ سخ سخ سم

دم سخ سخ دم سخ سخ دم سخ سخ دم سخ سم

مفا عی لن مفا عی لن مفا عی لن مفا عی لان

دلِ معنیٔ رنگیں سے لبریز ہے سودا کا = مفعولُ مفاعیلن مفعولُ مفاعیلن

دل مع نِ ئے رن گی سے لب رے زَ ہَ سو دا کا

سخ سخ نِ ئے سخ سخ سخ سخ سخ زَ ہَ سخ سخ سخ

سخ وق دم سخ سخ سخ دق دم سخ سخ

مف عولُ مفا عی لن مف عولُ مفا عی لن

عہ قاعدہ ششم دیکھو۔

بھولا ہوں جہاں کو میں سرشار اسے کہتے ہیں = مفعول مفاعیلن مفعول مفاعیلان

بھو لا ہُ جَ ہا کو مے سر شا ر سِ کہ تے ہیں

سخ سخ ہُ جَ سخ سخ سخ سخ سخ سخ رِس سخ سخ سم

سخ دق دم سخ سخ سخ دق دم سخ سم

مف عولُ مفا عی لن مف عولُ مفا عی لن

ہے بادہ کشوں کے لئے اک عیب تائید = مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلُ مفاعیل

ہے با دَ کَ شو کے لِ ئے اک عے بَ ہِں تا ئید

سخ سخ دَکَ سخ سخ لِ ئے سخ سخ بَ ہِں سخ سم

سخ دق دم دق دم دق دم سم

مف عولُ مفا عیلُ مفا عیلُ مفا عیل

بزمِ غیر سے اُٹھنا یار کا تعجب ہے = فاعلن مفاعیلن فاعلن مفاعیلن

بز مَ غے رَ سے اُٹھ تا یا رَ کا تَ عج جُب ہے

سخ مَ سخ رَ سخ سخ سخ سخ رَ سخ تَ سخ سخ سخ

سخ دم دم سخ سخ سخ دم دم سخ سخ

فا علن مفا عی لن فا علن مفا عی لن

جفا پیشہ ستم گرفتنہ خو ہے = مفاعیلن مفاعیلن فعولن

جَ فا پے شہ ہِں تم گر فِت نَ خو ہے

جَ سخ سخ سخ ہِں سخ سخ سخ نَ سخ سخ

دم سخ سخ دم سخ سخ دم سخ

مفا عی لن مفا عی لن فعو لن

اگرچہ پیر ہے لیکن ہے بے پیر = مفاعیلن مفاعیلن مفاعیل۔

اَگر چے پِی رَ ہے لے کن ہَ بے پیر

اَ سخ سخ سخ رَ سخ سخ سخ ہَ سخ سم

دم سخ سخ دم سخ سخ دم سم

مفا عی لن مفا عی لن مفا عیل

مومن ہے زمانِ عرضِ احوال = مفعولُ مفاعلن مفاعیل۔

مُو مِن ہَ زَ مانِ عرضِ اح وال

سخ سخ ہَ زَ سخ نِ سخ ضِ سخ سم

سخ دق دم دم دم سم

مف عولُ مفا علن مفا عیل

بحرِ رمل

ہم ظفر ہیں اُس پہ مفتوں خوار رسوا زار و مجزوں = فاعلاتن چار بار۔

ہم ظَ فر ہے اُس پہِ مف تو خا رُ رُس وا زا رُ مج زو

سخ ظَ سخ سخ سخ پہِ سخ رَ سخ سخ سخ سخ رَ سخ سخ

سخ دم سخ سخ دم سخ سخ دم سخ سخ دم سخ

فا علا تن فا علا تن فا علا تن فا علا تن

اس طرح دل کو محبت تجھ سے ہے اے شعلہ رُو = فاعِلاتُن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن۔

اس طَ رح دل کو مُ حب بَت تجھُ سِ ہے اے شعُ لَ رُو

سخ طَ سخ سخ سخ مُ سخ سخ سخ سِ سخ سخ سخ لَ سخ

سخ دم سخ سخ دم سخ سخ دم سخ سخ دم

فا علاتن فا علا تن فا علا تن فا علن

مجھے بے خودی یہ تو نے بھلی چاشنی چکھائی = فَعِلاتُ فاعِلاتُن دو بار۔

مُ جھ بے خُ دی یے تو نے بھَ لِ چا شَ نی چَ کھا ئی

مُ جھ سخ خُ سخ یے سخ سخ بھَ لِ سخ شَ سخ چَ سخ سخ

سق دق سخ دم سخ سق دق سخ دم سخ

فَعِ لاتُ فا علا تن فَعِ لاتُ فا علا تن

پئے دُنیا یونہی بک بک کے عبث جان کھپائی = فَعِلاتُن چار بار۔

پَ ئے دُن یا یُ ہِ بک بک کِ عَ بث جا نَ کھَ پا ئی

پَ ئے سخ سخ یُ ہِ سخ سخ کِ عَ سخ سخ نَ کھَ سخ سخ

سق سخ سخ سق سخ سخ سق سخ سخ سق سخ سخ

فَعِ لا تن فَعِ لا تن فَعِ لا تن فَعِ لا تن

شہر سے گاہ نکل جاتا ہوں صحرا کی طرف = فاعِلاتُن فَعِلاتُن فَعِلاتُن فَعِلُن۔

شہ رَ سے گا ہَ نِ کل جا تَ ہُ صح را کِ طَ رف

سخ رَ سخ سخ ہَ نِ سخ سخ تَ ہُ سخ سخ کِ طَ سخ

سخ دم سخ سق سخ سخ سق سخ سخ سق سخ

فا عِلا تن فَعِ لا تن فَعِ لا تن فَعِ لن

کہ ہے خورشید ترا چہرہ وہ کرمک شب تاب = فَعِلاتُن فَعِلاتُن فَعِلاتُن فَعِلان۔

کِ ہَ خُر شی دَ تِ را چہ رَ وُ کر مک شب تاب

کِ ہَ سخ سخ دَ تِ سخ سخ رَ وُ سخ سخ سخ سم

سق سخ سخ سق سخ سخ سق سخ سخ سخ سم

فَعِ لا تن فَعِ لا تن فَعِ لا تن فَعِ لان

حمد بے حد اُس خدائے پاک کو = فاعلاتن فاعلاتن فاعلن۔

حَم دَ بے حد اُس خُ دائے پاک کو

سخ دَ سخ سخ سخ خُ سخ سخ سخ کَ سخ

سخ دم سخ سخ دم سخ سخ دم

فا علا تن فا علا تن فا علن

کہتے ہیں زن نے عرب کی ایک رات = فاعلاتن فاعلاتن فاعلات۔

کہ تِ ہے زن نے عَ رَب کی اے کَ رات

سخ تِ سخ سخ سخ سخ عَ سخ سخ سخ کَ سم

سخ دم سخ سخ دم سخ سخ دک

فا علاتن فا علا تن فا علا ت

کچھ تو دے اے فلکِ ناانصاف = فاعِلاتُن فعِلاتُن فعِلات۔

کچُھ تُ دے اے فَ لَ کے نا اِن صاف

سخ ت سخ سخ فَ لَ سخ سخ سخ سم

سخ دم سخ ستی سخ سخ سخ سم

فا علا تن فِعِ لا تن فِعِ لات

حسُن کے ناز اُٹھانے کے سوا = فاعلاتن فعِلاتُن فعِلن

حسُ نَ کے نا زُ اُٹھا نے کِ سِ وا

سخ نَ سخ سخ زُ اُ سخ سخ کِ سِ سخ

سخ دم سخ ستی سخ سخ ستی سخ

فا علا تن فِعِ لا تن فِعِ لُن

+

ہم سے اور حسُنِ عمل کیا ہوگا = فاعلاتُن فعِلاتُن فعِلُن

ہم سِ ار حسُ نِ عَ مل کا ہو گا

سخ سِ سخ سخ نِ عَ سخ سخ سخ سخ

سخ دم سخ ستی سخ سخ سخ سخ

فا علا تن فِعِ لا تن فِعِ لن

بحرِ رجز

طرزِ آنکھ کی نرگس میں ہے خم زلف کا سنبل میں ہے = مُستَفعِلُن چار بار

طر زا کھ کی نر گس مِ ہے خم زُل فَ کا سُن بُل مِ ہے

سخ سخ کھ سخ سخ سخ مِ سخ سخ سخ فَ سخ سخ سخ مِ سخ

سخ سخ دم سخ سخ دم سخ سخ دم سخ سخ دم

مس تف علن مس تف علن مس تف علن مس تف علن

ہر چند ظاہر تھیں تری سب خلق میں بےباکیاں = مُستَفعِلُن مُستَفعِلُن مُستَفعِلُن مستفعلان

ہر چن دَ ظا ہر تھی تِ ری سب خل قِ مے بے با کَ یاں

سخ سخ دَ سخ سخ سخ تِ سخ سخ سخ قِ سخ سخ سخ کَ سم

سخ سخ دم سخ سخ دم سخ سخ دم سخ سخ دک

مس تف علن مس تف علن مس تف علن مس تف علان

ہَ مُس کِ باتَ کِ قا ئِل ہَ اے ظَ فر جس نے
ہَ سخ کِ سخ تَ کِ سخ سخ ہَ سخ ظَ سخ سخ سخ
دم دم سق سخ سخ یم دم سخ سخ
مفا علن فَعِ لاتن مفا علن فِعلن

سُننے سمجھنے کو بات حق نے دیئے گوش و ہوش = بحر منسرح مُفتَعَلُن فاعلات دوبار
سُن نِ سَ مجھ نے کُ بات حق نِ دیئے گوشُ ہوش
سخ نِ سَ سخ سخ کُ سخ ت سخ نِ دِ سخ سخ ش سم
دق دم سخ وک دق دم سخ وک
مُفتَ عَلُن فا علات مُفتَ علن فا علات

مرد کو سچ بولنا جزوِ ہی ایمان کا = مُفتَعَلُن فاعلن دوبار
مَرَ دَ کُ سچ بولَ نا جز وَ ہَ ای ما نَ کا
سخ دَ کُ سخ سخ لَ سخ سخ وَ ہَ سخ سخ نَ سخ
دق دم سخ وم دق دم سخ وم
مفت علن فا علن مفت علن فا علن

آکہ مری جان کو قرار نہیں ہے = مفتَعَلُن فاعلاتُ مُفتَعَلُن فِع
آ کِ مِ ری جا نَ کو قَ را رَ نَ ہی ہے
سخ کِ مِ سخ سخ نَ سخ قَ سخ رَ نَ سخ سخ
دق دم سخ دکم دق دم سخ
مُفتَ عَلُن فا علاتُ مفت علن فِع

سوزِ دل شرح کر کروں سر محفل = بحر خفیف فاعلاتن مفاعلن فعلاتن۔
سوزِ دل شرح کر کَ رُوس رِ مح فل
سخ زِ سخ سخ ح سخ کَ سخ س رِ سخ سخ
سخ دم سخ دم دم سق سخ سخ
فا علاتن مفا علن فَعِ لا تن

ہاں مرے نوشین ہم اُس کا نام = فاعلاتن مفاعلن فِعلات۔
ہا مَ ہے نو ش نے ہَ مُس کا نام
سخ مَ سخ سخ س سخ ہَ سخ سخ سم
سخ دم سخ دم دم سخ سم
فا علا تن مفا علن فِع لات

کی خدانے جو یہ زبان عطا = فاعلاتن مفاعلن فَعِلُن۔

کی خ دا نے جُ یہ زَ با نَ عَ طا

سَخ خ سَخ سَخ جُ سَخ زَ سَخ نَ عَ سَخ

سَخ دم سَخ دم دم سَق سَخ

فا علا تن مفا علن فَعِ لن

اے دل نہ جا زلفوں میں اُس صنم کی = بحر سریع مُستَفعِلُن مستفعلن فعولن۔

اے دل نَ جا زُل فو مِ اُس صَ نَم کی

سَخ سَخ نَ سَخ سَخ سَخ مِ سَخ صَ صَخ سَخ

سَخ سَخ دم سَخ سَخ دم دم سَخ

مُس تَف علن مس تِف علن فعو لن

صدر کے بازار میں تھا اک دبنگ = مُفتَعِلُن مفتعلن فاعلات۔

صدر کِ با زا رِ مِ تھا اک د بنگ

سَخ رِ کَ سَخ سَخ رَ مِ سَخ سَخ دِ سَخ

سَخ سَق سَخ سَق سَخ سَخ دک

یا مف تع لن مف تع لن فا علات

یا وَق دم وَق دم سَخ وک

مُفتَ علن مُفتَ علن فاعلات

نزلہ سے اک شخص کو تھا دردِ سر = مُفتَعِلُن مُفتَعِلُن فاعلن۔

نز لِ سِ اک شخ ص کُ تھا در دِ سر

سَخ لِ سِ سَخ سَخ صَ کُ سَخ سَخ دِ سَخ

وَق دم وَق دم سَخ دم

مفتَ علن مفت علن فا علن

ڈرا کے کہا بھلا ہے بھلا خفا جو ہوا ذرا وہ صنم = بحر وافر مفاعَلَتُن چار بار

ڈ را کِ کَ ہا بھ لا ب بھ لا خ فا جُ ذَ را وُ ہ وا وُ صَ نم

دِ سَخ کَ کَ سَخ بھ سَخ ب بھ سَخ خ سَخ جُ ذَ سَخ ہ سَخ وُ صَ سَخ

دم بق سَخ دم سَق سَخ دم سَق سَخ دم سَق سَخ

مفا عَلَ تن مفا عل تن مفا عل تن مفا عل تن

آرٹ بدلیش

غزل

آپ کی شوخیٔ گفتار سے جی ڈرتا ہے
آج تک ایک جفاکار سے جی ڈرتا ہے

جس کی آنکھوں میں محبت نہ مروّت نہ جنوں
اس جفا پیشہ ستمگار سے جی ڈرتا ہے

بخشئے! اس دلِ بے چارہ میں اب تاب نہیں
میری سرکار! بہت پیار سے جی ڈرتا ہے

مدّتوں گھرے خیالوں میں جہاں کھویا رہا
آج اُس سایۂ دیوار سے جی ڈرتا ہے

پھر وہی جرأتِ پرواز کہاں سے لاؤں
اب تو ہر کوششِ بے کار سے جی ڈرتا ہے

چوم تو لوں میں ترے نرم سے ہاتھوں کو مگر
اپنے جذبات کے اظہار سے جی ڈرتا ہے

اب محبّت کبھی پابند نہو پائے گی
کیا بتاؤں، انھیں افکار سے جی ڈرتا ہے

ہم نے مسعود کو دیکھا ہے ملول اور اُداس
اُس کا ہر شوخ طرحدار سے جی ڈرتا ہے

مسعود حسین

ٹرام میں

[موجودہ تمدن کی ضروریات میں سے لٹریچر کی ایک وہ قسم ہے جس کے سمجھنے کے لئے دماغ پر زور نہ دینا پڑے اور جو دل کی تفریح اور تسلی کا باعث ہو۔ اس میدان میں فکاہت کے ساتھ ساتھ ادبیت یا بالفاظ دیگر ادب کی افادیت کو برقرار رکھنا ہی کامیابی کا معیار ہے۔ فکاہت صرف ادب کو جو کہ زندگی کے حقائق کے ساتھ وابستہ ہے، پڑھنے یا سننے والے تک پہنچانے کا ایک ذریعہ ہے۔ مقصود بالذات نہیں، زندگی کے حقائق سے گریز کرنے اور انھیں فراموش کرنے کے لئے فکاہت کا استعمال کرنا ادب کا خون کرنا ہے۔ عربی لٹریچر میں بہت بڑا ذخیرہ ایسے مواد کا ملتا ہے جس کی غرض محفل میں گرمی اور مجلس میں لطف پیدا کرنا ہے، یہ مواد بیشتر دلچسپ تاریخی قصوں، مجذوبوں اور بے وقوفوں کی حکایتوں اور انسان اور حیوان کے نادر خصائص پر مشتمل ہے۔ فارسی ادب بھی دلچسپ مگر سبق آموز حکایتوں سے مالامال ہے۔ گو ان کا بیشتر حصہ محض خیالی ہے، انگریزی میں فکاہت کو سوسائٹی کے عیوب اُجاگر کرنے کے لئے جس طریقہ پر استعمال کیا گیا ہے، وہ ایک قابل تقلید نمونہ ہے، افسوس ہے کہ ہمارے بعض کم مایہ مضمون نگار زندگی کا گہرا مطالعہ کرنے کے بجائے حسی لذتوں اور مادی دلچسپیوں میں گم ہوکر رہ جاتے ہیں۔ بسا اوقات پختہ کاروں کی مزاحیہ تحریریں بھی محض "گدگدیاں" ہوتی ہیں، جن سے پھیپھڑوں کی تھوڑی بہت ورزش تو ضرور ہو جاتی ہے، لیکن اخلاقی غذا بالکل نہیں ہوتی۔ ذیل میں حضرت علی الطنطاوی کی ایک عربی ریڈیائی تقریر کا ترجمہ ہدیۂ ناظرین ہے جس میں "لذت" اور "افادیت" دونوں کو بیک وقت برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔]

کل میں ٹرام میں بیٹھا جا رہا تھا، سوچتا تھا آپ سے گفتگو کا کون سا موضوع ہو جو دلچسپ بھی ہو اور مفید بھی، تاکہ یہ گفتگو نہ تو محض لذیذ و خالی از فائدہ بن جائے اور نہ ہی مفید مگر بے لذت ثابت ہو۔ مگر ٹھنڈی ہوا جو سیدھی مُنہ کو لگتی اور طمانچہ کا کام کرتی تھی، کسی موضوع کو دماغ میں قرار نہ پکڑنے دیتی۔ چنانچہ میں اُٹھا کہ دروازہ بند کردوں۔ مگر دروازہ پر میرا قابو نہ چلا، بہت زور لگایا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ سیکڑوں جتن کئے مگر بے نتیجہ بالآخر اسے چھوڑ اپنی جگہ آ بیٹھا۔ بعد ازاں ایک نوجوان داخل ہوا، جس کے پٹھے بل کھائے شانے چوڑے اور طاقت صاف نمایاں تھی۔ اس نے بھی دروازے کو کھینچنا چاہا مگر ہار گیا۔ تب اُس نے دونوں ہاتھوں سے دروازہ پکڑا اور اپنی ساری طاقت پہونچوں میں سمیٹ کر رکھ دی، یہاں تک کہ اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور رگیں پھول اٹھیں۔ مگر دروازہ جوں کا توں ہی رہا۔ آخر اُس نے شرم سے اپنی گردن جھکالی اور ہم سے نظریں چار کئے بغیر بیٹھ گیا۔ پھر ایک بڈھا، ایک ادھیڑ عمر کا آدمی اور دو عورتیں سوار ہوئیں اور باوجودیکہ ان میں سے ہر ایک نے ہماری طرح زور آزمائی کی لیکن کوئی بھی کامیاب نہ ہوا۔

یہ دیکھ کر زمانہ قدیم کے ارشمیدس کے انداز میں، میرے بھی مُنہ سے نکلا: "یوریکا" موضوع مل گیا۔ میں (ٹرام میں) اپنی گفتگو کا موضوع بناؤں گا۔ اس لئے کہ حضرات! ٹرام انسانوں کی نمائش گاہ اور قوم کا آئینہ خانہ ہے، تفریح کے طلبگار کے لئے، تفریح گاہ اور سبق سیکھنے والے کے لئے بمنزلہ ایک مدرسہ کے ہے، وہ ایک سینما ہے جس کے ہیرو ایسے لوگ ہوتے ہیں، جو کسی مصنف کی لکھی ہوئی روایت کو اسٹیج نہیں کرتے بلکہ اپنی فطرت کی جو خدا نے پیدائش کے ساتھ انھیں عنایت کی نیز اپنی طبیعت، اور اپنے اخلاق کی نمائش کرتے ہیں)۔ ساتھ ہی (ٹرام میں) ہر چھوٹی بات زندگی کی بڑی حقیقت کی ایک مثال ہوتی ہے جس طرح کہ یہ بند دروازہ ہماری زندگی کے ابواب میں سے ایک بڑے باب کی سُرخی ہے، اور ہماری تربیت کا ایک کھُلا ہوا نقص ہے۔ اس لئے کہ بہت ممکن ہے کہ دروازہ کو ڈھکیلنے کے لئے ہم میں سے دو آدمیوں کی پوری قوت درکار نہ ہوتی، لیکن ہم نے ایک ایک کرکے قوت آزمائی، ہم جب بھی

کام کرنا چاہتے ہیں یا کوئی اصلاح ہمارے پیش نظر ہوتی ہے تو ہمارا طرزِ عمل بالکل ایسا ہی ہوتا ہے۔ فرداً فرداً کوشش کرتے ہیں اور علیحدہ علیحدہ
بڑھنا چاہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مقصد تک نہیں پہنچ پاتے اور منزل سے دور رہتے ہیں۔ انفرادیت ہمارے آداب میں جم چکی ہے۔ آپ دیکھیں گے
میں سے ایک فرد وہ کام کرتا ہے جو جماعت نہیں کر پاتی۔ لیکن جب ہم اکٹھا ہوتے ہیں تو ایک دوسرے کو گراتا اور اس پر حکم چلاتا ہے۔ پھر
ہم اس صورتِ حال سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہیں تو خط کے ایک سرے سے دوسرے سرے پر جا پڑتے ہیں حتیٰ کہ حدِ اعتدال سے گزر جاتے
اور دائرہ امکان سے خارج ہو جاتے ہیں۔ ہم یہ چاہنے لگتے ہیں کہ تعمیر فراہم کرنے سے قبل گھر بنالیں اور افراد کی اصلاح کرنے سے پہلے ملت کی
اصلاح کر ڈالیں جیسے کہ ملت کوئی مستقل مخلوق ہو جو طول عرض گہرائی اور اونچائی رکھتی ہو، نہیں نہیں حضرات! ملت آپ ہم کے سوا کچھ نہیں
تک ہم میں سے ہر ایک اپنی اصلاح نہیں کرے گا ملت کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔

یہ ہمارے اندر ایک بڑا عیب ہے جس کا کہ اس چھوٹے سے واقعہ سے پتہ چلتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتیں بھی کس قدر معنی خیز ہوتی ہیں۔

ایک مرتبہ میں ٹرام میں سوار ہوا، ہجوم بہت تھا اور مسافر بھرے ہوئے تھے، نہ تو ٹرام کے فرش کا رنگ دکھائی دیتا تھا اور نہ ہی اژدہام کے
سبب اس کا طول و عرض پہچان پڑتا تھا۔ میرے بازو کی سیٹ پر ایک بڈھا سن رسیدہ آدمی بیٹھا تھا جو میرے خیال میں ۷۰ ویں سال میں ہوگا۔ وہ
اپنے ساتھ ایک اوتھلے برتن میں جس میں نہ تو تلی ہی تھی اور نہ ڈھکن، پتلا دودھ لئے تھا۔ جب کبھی ٹرام ہلتی یا آدمی حرکت کرتے تھے اس میں سے
ایک بوندیں چھلک کر میرے کپڑوں پر گرتی تھیں۔ زمانہ جنگ میں میری زینت کا سامان یہی کپڑے تھے اور مجھ جیسے ملازمت پیشہ کے لئے دوسرے
کپڑے بنوانا ناممکن تھا۔ میں اپنے کپڑے سمیٹتا اور ہٹنے کی کوشش کرتا تھا تاکہ اس بڈھے آدمی کو میری تکلیف کا احساس ہو اور وہ مجھے بچانے کا
خیال رکھے لیکن اس کو ذرا خیال نہ ہوا اور مطلق پروا نہ کی، بالآخر میں نے اس سے کہا۔ "چچا صاحب! آپ نے بہت تکلیف دی ...... یہ دودھ
گرا دیا ......" جواب میں اس نے کیا کیا کہ اتنی زور سے چلایا کہ تمام ٹرام والے میرے گرد اکٹھا ہو گئے اور کہنے لگا "خدا سے ڈر، یہ کفر، یہ کفرانِ
نعمت؟ تو نعمت کی قدر نہیں پہچانتا؟ یہ پاک دودھ ہے، کوئی نجاست تو نہیں ہے جو تیرے اوپر حرام ہو۔"

میں اس کو چھوڑ آدمیوں کے بیچ میں گھس گیا اور جہاں اور لوگ کھڑے تھے جا کر کھڑا ہو گیا۔ جہاں ایک دوسرے سے چھل رہے تھے
اور سانس ٹکراتا تھا۔ یہاں تک کہ میرا دم گھٹنے لگا۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک نہایت فیشن ایبل نوجوان ہے ...... منہ میں گرگٹ کی دم
کی طرح ایک کالا موٹا سگار دبائے ہوئے ہے اور اس میں سے جو دھواں نکل رہا ہے اس کی بدبو ایسی ہی ہے جیسی کہ گوبریلے کی گندی ہوا کی، وہ
آکر میرے سامنے کھڑا ہو گیا اور قریب تھا کہ آگ سے میری ناک چھینک دے، میں نے اس سے کہا "بھائی جان! ذرا دیکھ کر" وہ زور سے بولا "شخصی
آزادی اور کیا ہے؟ تمھیں بولنے کا کیا حق ہے؟" اور اسی قسم کا ہذیان بکتا چلا گیا۔

میں نے سوچا کہ یہ ہمارے عیوب میں سے ایک اور عیب کی مثال ہے، ہم مسائل کو الٹی شکل دیتے اور انھیں غلط سمجھتے ہیں، نہ تو بڈھے نے
دین کو سمجھا اور حلال حرام کا فرق پہچانا قبل اس کے وعظ کہے اور فتویٰ صادر کرے اور نہ اس نوجوان نے مدنیت کو جانا اور شہریوں کے احوال کو
دیکھا۔ قبل اس کے کہ وہ ہذیان بکے اور فلسفہ بگھارے۔ دین انسانوں کی ایذا رسانی سے روکتا ہے اور مدنیت کی رو سے ٹرام میں سگریٹ پینا
ممنوع ہے۔ لیکن ہم وہ باتیں لے بیٹھتے ہیں جنھیں ہم نہیں جانتے اور ان مسائل میں گفتگو کرنے لگتے ہیں جن کے متعلق ہمیں کچھ علم نہیں ہوتا۔ اس طرح
ہماری زندگی میں ایک چیز اور اس کی ضد دونوں پائی جاتی ہیں، ہماری زندگی متناقض چیزوں کا مجموعہ ہے جس میں بہت سی باہم اختلاف رکھنے
رکھنے والی باتیں اکٹھا ہو گئی ہیں جیسا کہ عبوری دور کا عام قاعدہ ہے۔

ایک مرتبہ ٹرام میں ایک بڑھیا سوار ہوئی جو اپنی نمائشی زینت کی بدولت جوان بنی ہوئی تھی، اس کے چہرہ پر اتنے خطوط کھنچے ہوئے تھے اور
اتنے بہت سے رنگ تھے کہ لڑائی کا نقشہ معلوم ہوتا تھا۔ اس کی آنکھوں کے اوپر دو کمان دار کالے خط تھے، گالوں پر دو سرخ قطعے تھے اور ہونٹ تو

ایسے لگتے تھے کہ کھوتنے ہوئے پانی میں ڈوب کر جل گئے اور ان میں سے خون نکل کر بہت بری شکل میں باہر جم گیا، وہ ہونٹ نہ تھے بلکہ معاذ اللہ [illegible]
تھیں جنھوں نے صورت بگاڑ رکھی تھی، دونوں ہاتھوں کے ناخن بھیڑیے کی طرح جس نے ابھی ابھی بکری کے بچے کو پھاڑ کھایا ہو، لمبے سرخ اور ڈر[illegible]
تھے۔ یہ عورت آکر مردوں کے حصے میں کھڑی ہوگئی جو آدمیوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس سے لگا ہوا عورتوں کا کمرہ خالی تھا اور اس کا دروازہ کھلا [illegible]
لوگوں نے تعجب سے اس عورت کو دیکھا اور بے پروائی کے ساتھ نظریں پھیرلیں۔ اس پر وہ بولی۔ "تم میں ایک بھی مودّب نہیں جو عورت [illegible]
جگہ دے کتنے عیب کی بات ہے۔"

اس پر ایک آدمی نے کہا۔ "یہ عورتوں کا کمرہ خالی ہے، تشریف رکھیئے۔"

وہ عورت ہمارے آگے ہاتھ جھٹک کر بولی۔ "تم سب بڑے ہی رجعت پسند وحشی ہو، ابھی تک تم نے تہذیب نہیں سیکھی۔"

ایک مرتبہ میں نے دو نوجوانوں کو دیکھا جو میرے سامنے ٹرام کے ڈبے میں داخل ہوئے۔ وہ دونوں بغیر آستینوں کی قمیصیں پہنے ہوئے تھے [illegible]
کے پاجاموں سے پنڈلیاں کھلی ہوئی تھیں، ان میں سے ایک نے اپنے آپ کو سیٹ پر دے مارا اور ایسا لیٹ گیا جیسے دلھن اپنی مسہری پر [illegible]
نے سٹیج پر ناچنے والی عورت کے انداز میں ایک ٹانگ دوسری ٹانگ پر رکھ لی۔ پھر ان دونوں نے ملی جلی بازاری عربی اور فرنچ اور انگریزی میں با[illegible]
کرنا شروع کیا۔ بیچ بیچ بیہودہ قہقہے اور مخنثانہ اشارے بھی چلتے گئے۔ ادب کے بارے میں ان کی رائے یہ تھی کہ زبانیت، عقاد اور مازنی کی [illegible]
ایک ترجمان کی محتاج ہوتی ہیں اس لئے کہ وہ بہت مشکل ہوتی ہیں اور بغیر ڈکشنری کی مدد کے سمجھ میں نہیں آتیں۔ اس کے بعد انھوں نے کچھ امتحا[illegible]
تعلیم اور اسی کے ساتھ ساتھ عشق و محبت، تماشا گھر اور تفریح گاہوں کی بابت گفتگو شروع کی، یہاں تک کہ مجھ سے صبر نہ ہو سکا اور [illegible]
ٹرام میں سوار ہو گیا۔ . . . . . .

یہ ہمارے مردوں اور عورتوں کے ایک مخصوص طبقے کی دو مثالیں تھیں۔ یہ طبقہ گھروں میں کتنا ہی چھپا رہے لیکن ٹرام اس کا پردہ فا[illegible]
ہے۔ یہ طبقہ ملت میں ایسا ہی ہے جیسے بنیادوں میں ڈائنامائٹ، جسم میں زہر اور آنکھ میں کرکرک، اور گو یہ طبقہ ہمارے درمیان کم تعداد ہے اور [illegible]
کوئی قوم ان جیسے لوگوں سے پاک ہو پھر بھی مصلحین کا فرض ہے کہ وہ اس کی طرف سے غفلت نہ برتیں اور اس کی اصلاح میں سُستی نہ کریں [illegible]
کہ ہماری ملت اس وقت اپنی آزادی کو دوبارہ حاصل کرنے میں لگی ہوئی ہے اور اپنی عظمت کے ٹوٹے ہوئے سلسلے کو دوبارہ جوڑنے کے لئے سرگرم عمل [illegible]
اور عظمت صرف با اخلاق اور صاحب علم نوجوانوں اور عقل اور عفت سے متصف عورتوں ہی کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہے۔

لیکن ٹرام میں ایک تکلیف دہ اور دل آزار مناظر کے مقابلہ میں ایسے مناظر بھی ہوتے ہیں جو مسرت اور فرحت بخشتے ہیں۔ کل ٹرام میں [illegible]
ایک فلاح سے میری ملاقات ہوئی جو اپنے مخصوص لباس لمبے کرتے اور ٹوپی میں تھا۔ میرے ساتھ میرا ایک دوست تھا جو مصر سے بیرونی نوجوان [illegible]
اور عرب لیگ کے بارے میں گفتگو کر رہا تھا، اس فلاح نے بھی سیاست، بڑی بڑی طاقتوں کے باہمی نزاع، مشرق قریب کے پوزیشن اور اس سے [illegible]
توقعات پر بولنا شروع کیا، اس نے مصر، شام، عراق، مغرب، حجاز اور یمن کے حالات پر جُدا جُدا رائے زنی کی، یہ فی البدیہہ تقریر آدھ گھنٹے سے زیا[illegible]
رہی۔ جس دوران میں ٹرام نے فسطاط سے شبرا تک کا راستہ طے کیا۔ اگر کوئی سیاسی بڑے سے بڑے کلب میں دعوت دے کر ایسی تقریر کہتا تو [illegible]
یقیناً داد دیتے ہوئے نکلتے۔

میں نے ٹرام میں ایک اور فلاح کو دیکھا۔ کنڈکٹر جب اس کے پاس سے گزرا تو اس نے "یا آفندی" کہہ کر خطاب کیا۔ اس پر وہ فلاح بولا۔ "ا[illegible]
کوئی نہیں رہا۔ فلاحین ہی ملک کے حاکم ہیں۔" کیا خوب بیداری ہے اور کتنی بڑی بات ہے! سب سے بڑا دن وہی ہوگا جب فلاح فی الواقع ملک [illegible]
ہو جائیں جب مصر میں نہ تو کوئی بدیشی کمپنی رہے، نہ کوئی بدیشی بنک اور نہ کوئی مصری بھیک مانگنے والا۔ جب مصری پردیسیوں کی بہ نسبت [illegible]
صاف ستھرے صحت کا خیال رکھنے والے زندگی کو سمجھنے والے اور جانبازی میں سبقت کرنے والے ہو جائیں گے، ان شاء اللہ یہ دن جلد آنے والا ہے۔

رات و خواتین! ٹرام لوگوں کے اخلاق اور مختلف ممالک کی طبیعتوں کو پیش کرتی ہے۔ وہ ایک مدرسہ ہے، جہاں انسان اپنے ساتھی کی بُرائیوں
ں سے پرہیز کرتا ہے اور اچھائیوں کو دیکھ کر انھیں اختیار کرتا ہے اور مزید براں دقیق مطالعہ کرنے والا فہم انسانی کے مختلف ابواب سے جو
نے آتے ہیں لطف اندوز ہوتا ہے۔

ڈرامے کا ایک باب ملاحظہ ہو۔ دو دوست خالی نشستیں چھوڑ کر آپ کے آس پاس ایک دائیں جانب اور دوسرا بائیں جانب بیٹھتے ہیں،
پرائیویٹ معاملات کی بابت آپ کے سر پر گفتگو کرتے ہیں۔ انھیں آپ کا کچھ خیال اور پروا نہیں، گویا کہ آپ ایک کرسی یا تکیہ ہیں یا یوں سمجھئے
کان جھروکہ ہیں جس سے وہ باتیں کرتے ہیں)۔

دوسرا باب: ایک لمبا چوڑا آدمی ہے اس کو ٹرام کے سوا اور کہیں خربزہ کے بیج کھانا پسند نہیں آتا وہ دانتوں سے بیج چباتا اور زبان سے چھلکے
جاتا ہے۔ چھلکے اگر آدمیوں پر نہیں پڑتے تب بھی کم از کم وہ اپنے کریہہ منظر اور بدتمیزی سے تکلیف پہنچاتا ہے۔

ایک اور آدمی آپ کے پیچھے سے آتا ہے۔ آپ ٹرام کے ایک کونے میں کھڑے ہوئے ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ آپ اس کو گزرنے کا راستہ دیں، جہاں آپ
آپ کی جگہ پر قابض ہو جاتا ہے اور آپ کو حیران کر دیتا ہے، اس حال میں کہ آپ کو پتہ نہیں کہ آپ کہاں کھڑے ہوں۔

ایک مزدور ہے جس کے کپڑوں میں تیل لگا ہوا ہے یا مٹی بھری ہوئی ہے۔ آپ سفید کپڑے پہنے ہوئے ہوں لیکن وہ برابر آپ سے چھلتا جائے گا۔
کہ تیل اور مٹی آپ کے لگا دے۔ اگر آپ نے کچھ کہا تو جواب دے گا: کیوں؟ کیا ہم بنی آدم نہیں ہیں؟

ایک بھاری بھرکم موٹی گردن والی عورت ہے، وہ سوار ہوتی ہے۔ ایک بچہ اس کی گردن پر ہے۔ دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ رہی ہے اور اُس کے
یک ٹوکری ہے جس میں مچھلی، پیاز اور ککڑی لئے ہے، وہ فرش پر بیٹھ جاتی ہے اور دس آدمیوں کے کھڑے ہونے کی جگہ گھیر لیتی ہے۔ پھر برا بگڑ لیا
تی ہے کہ اُس نے اُس کے کپڑے پر پیر رکھ دیا۔ اور اُس نے اس کے لڑکے کو چھو دیا۔

ایک بڈھا بکواسی ہے جو راستہ بھر لوگوں کی مذمت کرتا جاتا ہے کہ انھیں یہ نہیں معلوم کہ ٹرام کے آگے سے اُترتے ہیں اور پیچھے سے سوار ہوتے
وہ لوگوں کی جہالت اور عدم تربیت پر تعجب کرتا جاتا ہے، یہاں تک کہ جب اپنے سٹیشن پر پہنچتا ہے تو اپنی لمبی تقریر بھول جاتا ہے اور آگے
ترنے کے بجائے پیچھے سے اُترتا ہے۔

ایک آدمی رومی مُرغے کی طرح پھولا ہوا اور طاؤس کی طرح اکڑا ہوا آپ کے سامنے آکر بیٹھتا ہے، پھر اس کے سوا اور کسی چیز سے راضی نہیں
لہ پیٹ آگے نکالے، سر پیچھے رکھے اور آپ کے مُنہ کے بالمقابل ٹانگیں اٹھائے، یہاں تک کہ اس کے جوتے آپ کے سامنے ہوں اور اس کے کنارے
بقریب آپ سے چھلنے لگیں اور اس پر یہ کہ جہاں کنڈکٹر کو دیکھا جھٹ نیچے اُتر گیا اور ٹکٹ کی قیمت بھی نہ دی۔

ایک کلاہ و دستار والے شیخ صاحب ہیں، انھیں خدا کی یاد ایک لمبی سی تسبیح پر راس آتی ہے جسے وہ اپنے ہاتھ سے اُٹھائے رہتے ہیں تاکہ سب
اسے دیکھتے رہیں۔ مسواک کی سنت پر عمل کرنے کے لئے بھی ٹرام ہی ہے۔ چنانچہ جب وہ جیب سے ایک موٹی لمبی مسواک نکالتے ہیں اور نہایت
طریقہ سے دانت صاف کرتے ہیں، پھر مسواک کو اپنی انگلیوں سے نچوڑتے اور زمین پر تھوکتے ہیں اور اگر کوئی کچھ اعتراض کرے تو دین اور
اق کے مٹ جانے کا ماتم کرنے لگتے ہیں۔

اس فلم کا ایک اور باب ملاحظہ ہو: اس کا اداکار ٹرام کا ڈرائیور ہے۔ وہ سٹیشن پر رُک کر ایک رکابی فول اور روٹی خریدتا ہے۔ پھر کھاتے
ئے سُست چال سے چلتا ہے۔ یہاں تک کہ جب اس کو دیر ہو جاتی ہے اور وقت نکل جاتا ہے تو پاگل کی طرح جلدی کرتا ہے اور اتنا نہیں ٹھہرتا
عورت اپنے بچے کو سوار کرے اور پھر خود سوار ہو۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچہ ٹرام میں خوفزدہ روتا چلا تا رہ جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عنقریب کود
ے گا۔ اُس کی ماں ٹرام کے پیچھے پیچھے دوڑتی ہے اور لوگ ہر طرف سے چلاتے ہیں۔

نیز ٹرام میں ہر ملک کے لوگوں کی طبیعت اور وہاں کی زندگی کا نمونہ ملتا ہے۔ چنانچہ شام میں چڑھنے اُترنے میں دھکم دھکا اور نشستوں کی طرف بڑھنے میں سخت مقابلہ ہوتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں کے لوگوں کو جنگ وجدال کئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہاں ٹرام کی ایک ابتدا ہوتی ہے اور ایک انتہا اور لوگ ایک ساتھ اترتے چڑھتے ہیں۔ اس کے برخلاف مصر میں اکثر ٹرامیں دائرہ کی شکل میں چلتی ہیں، رہٹ کی طرح چکر لگاتی اور دن کی طرح مسلسل گردش کرتی رہتی ہیں ان کی کوئی ابتدا اور انتہا نہیں ہوتی، اور لوگ ہر جگہ اُترتے چڑھتے رہتے ہیں۔ ساتھ ہی مصر کے لوگ ملنسار اور صلح پسند ہیں۔ فرسٹ کلاس میں جب جگہ خالی ہوتی ہے تو آپ دیکھیں گے کہ ہر ایک دوسرے کو بیٹھنے کے لئے کہتا ہے۔ اس کے علاوہ شام اور بیروت میں درجہ اوّل اور درجہ دوم کے سواروں میں بہت کم فرق ہوتا ہے اور لباس یا گفتگو میں فرق قریب قریب ناپید ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف مصر میں یہ فرق کھلا اور واضح ہوتا ہے اس لئے کہ تفاوت ہر چیز میں مصر کا شعار ہے۔ شام میں ساحلی نیز اندرونی علاقہ میں بڑے بھاری مالدار لوگ نہیں ہیں لیکن ساتھ ہی بالکل مفلس اور فقیر لوگ بھی بہت کم ہیں۔ اسی طرح وہاں بہت بڑے علما نہیں ہیں، لیکن جہالت بھی شدید اور عام نہیں ہے۔ مصر کا حال یہ ہے کہ یہاں انتہائی ثروت اور انتہائی فقر ہے، یہاں علم ہے اور جہل بھی، ایک طرف محل ہیں تو دوسری طرف جھونپڑیاں، بلکہ یہاں آپ کو ایک سڑک ایسی ملے گی جس کے شروع میں تھیٹر اور تفریح گاہیں ہیں، آپ کو ایسا معلوم ہوگا کہ گویا آپ پیرس میں ہیں۔ درمیان میں بینک اور صرّافے ہیں گویا کہ وہ نیویارک کا ایک حصہ ہے اور اس کے آخر میں آپ فلاکت کی گلیوں میں سے ایک گلی یا میدان پائیں گے۔ شام میں ٹرام ہر مظاہرہ کا ہدف اور ہر اسٹرائک کا نشانہ ہوتی ہے جا اگر جمہور حکومت کے خلاف کوئی احتجاج کرتے ہیں تو ٹرام کو توڑ ڈالتے ہیں۔ اگر طلبہ کی وزارت تعلیم سے کوئی مانگ ہوتی ہے تو ٹرام میں آگ لگا دیتے ہیں اور اگر عوام کو ردّی کے خراب ہونے یا ٹیکس کے بھاری ہونے کی شکایت ہوتی ہے تو وہ ٹرام چکنا چور کر دیتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ٹرام بدیشی اقتصادی برتری کی علامت ہے اور اہلِ شام کے لئے بیرونی اقتدار نا قابل برداشت ہے خواہ اس کا تعلق حکومت سے ہو یا مالیات سے!

ٹرام کی گفتگو بہت لمبی اور گفتگو کا وقت مختصر ہے اور میں کافی سے زیادہ طول بھی چکا ہوں، اُمید ہے کہ اگر آپ اُکتا گئے ہوں گے تو معاف کریں گے میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے صبر سے سُنا۔

سید محمد یوسف

تخیّل کی موت

تخیّل میں لُطفِ سراسیمگی ہے

تخیّل میں نغموں کی آوارگی ہے

تخیّل غمِ عشق کی سادگی ہے

تخیّل تو انساں کی تھی آگہی،

تخیّل کو مرگِ زبوں کھا گئی،

عظیم قریشی

تین ترجمے

۱

رہ و رسم حرم نامحرمانہ — کلیسا کی ادا سوداگرانہ
تبرک ہے مرا پیراہن چاک — نہیں اہل جنوں کا یہ زمانہ (اقبال)

(ہندوستانی میں)

ہے آن ریت[1]، ریت کعبے کی — بتخانے کی ادا بنیے کی
یہ مری ٹوٹی آس بہت ہے — دنیا نہیں اب من موجے[2] کی

۲

Take of me what is not my own,
My love, my beauty and my Poem,
The pain is mine, mine
own alone........

(اردو میں)

نہیں جو مرا، مجھ سے سب لیلو، بھائی
محبت مری، حسن و اشعار میرے
مگر یہ مرا غم، مری خاص شے ہے
(گوارا نہیں مجھ کو اس کی جدائی)!

۳

جہان رنگ و بو فہمیدنی ہست — درین وادی بسے گل چیدنی ہست
ولے چشم از درون خود نہ بندی — کہ در جان تو چیزے دیدنی ہست (اقبال)

(عام فہم اردو میں)

رنگ سوگندھ کی پیاری دنیا — سمجھنے لائق ہے، یہ مانا
بہتیرے اس باغ کے پھول بھی — چن لینے میں فائدہ جانا
پھر بھی موند نہ آنکھ خود[3] ہی سے — اس میں رتن ہے ایک سہانا!

مقبول حسین احمد پوری

[1] ریت معنی رسم، و ریت یعنی رسم و رواج [2] من موجے یعنی بے فکرے، رند [3] سروپ

علاج

لمحہ بھر کے لئے اس کی آنکھیں یوں چمک اُٹھیں جیسے بے شمار ننھی ننھی روشنیوں کا عکس اس کی نگاہوں میں اُتر آیا ہو۔ مگر فوراً ہی اس کی نگاہوں کی وہ چمک معدوم ہو گئی۔ اُس نے کسی عجیب جذبے کے تحت ہاتھ میں پکڑی ہوئی پنسل بے اختیار چبا ڈالی اور پھر خوفزدہ سی ہو کر اسے دُور پھینک دیا۔ اور وہ اُکتا کر آرام کرسی پہ پہلو بدلنے لگی۔ آخر آج سے پہلے اُس نے اس اُداس اور دم گھونٹ دینے والے سناٹے کو محسوس کیوں نہیں کیا؟ کیوں آخر وہ اب تک خزاں کی تلخی سے بے خبر رہی، آخر کیوں؟ اس نے اپنی مضمحل نگاہیں لان کی گھاس پر گاڑ دیں۔ اُس لان کی گھاس پر، جہاں کی تراشی ہوئی سبز سبز گھاس بے حد خوبصورت لگتی تھی اور جہاں کی ہلکی پھلکی ہوائیں بھینی بھینی خوشبوؤں سے مہکتی رہتی تھیں۔ جب وہ لوگ اس کوٹھی میں آئے تھے تو وہ یہ سمجھ ہی نہ سکی تھی کہ آخر وہ اس جگہ رہ کیونکر سکے گی۔ کوٹھی کے چاروں طرف بھٹنے سے ناچتے رہتے تھے۔ گرمی کی شدت سے جُھلسی ہوئی جھاڑیوں، بے جان اور مُرجھائے ہوئے خود رَو پودوں کو دیکھ کر بے حد وحشت ہوتی تھی۔ نیم اور سرس کے اونچے اونچے گھنے درختوں نے کبھی پانی کی شکل بھی نہ دیکھی تھی اور پانی نہ ملنے کی وجہ سے ان کے سبز سبز پتوں نے سیاہی مائل سبز رنگ اختیار کر لیا تھا۔ کوٹھی کی چھتوں اور دیواروں پر ہر وقت حسرت برستی رہتی تھی اور بڑے بڑے نیولے اور مکروہ چھپکلیاں بلا تکلف ادھر اُدھر دوڑتی پھرتی تھیں۔ مگر آبا کو یہ کوٹھی اس لئے بہت پسند تھی کہ وہ بے حد کھلی اور فراخ تھی اور دُور دور تک نیلا شفاف آسمان بلا کسی روک ٹوک کے نظر آتا رہتا تھا۔ امّی نہال تھیں کہ شہر کی تنگ و تاریک فضا سے باہر انھیں کشادہ صحن والی کوٹھی مل گئی ہے، اور بھیّا ـــــ وہ تو خیر اس قسم کے معاملوں میں دخل ہی نہ دیتے تھے۔ البتہ اس عجیب فضا میں آ کر اس کا دم بہت گھٹتا تھا اور کئی دن کی بحث مباحثے کے بعد اُس نے اپنے لئے وہ کمرہ منتخب کیا تھا جس کے ساتھ ہی تھوڑی سی بنجر زمین پڑی تھی۔ جسے اُس نے بے حد محنت کے بعد ایک خوشنما لان میں تبدیل کر لیا تھا۔ شروع شروع میں وہ اپنا تمام وقت لان میں صرف کرتی رہی۔ کبھی سبزی کے بیج بوئے جا رہے ہیں تو کبھی "فلاکس کے" اس وقت نیلے نیلے پھولوں والی گھنی جھاڑیوں کی شاخوں کو تراشا جا رہا ہے، تو اب سویٹ پیز کے پھولوں پر فوارے سے پانی گرایا جا رہا ہے۔ سویٹ پیز کے پھول تو اسے بے حد پسند تھے، پیازی، آسمانی، سفید اور کاسنی رنگ برنگے کھلتے ہوئے پھول اتنے پیارے لگتے جیسے کسی ننھی سی گڑیا نے قوسِ قزح کے رنگوں کی فراک پہن لی ہو۔ اپنا سارا وقت پھولوں میں صرف کر کے، جب وہ مٹی کے نیچے سے جھانکتی ہوئی کونپلوں کو سر اُبھارتے دیکھتی تو اس کی آنکھیں مسرت سے ناچنے لگتیں۔ اس کا امتحان سر پر ہوتا یا امّی کی ڈانٹ اس کا پیچھا کر رہی ہوتی، خواہ آبا کی نگاہیں اُسے گھور رہی ہوتیں یا آپا کی سہیلیوں کے طنزیہ قہقہے گونج رہے ہوتے۔ وہ لان میں بیٹھ کر اسی فکر میں گھلتی رہتی کہ سنگترے کے پودے پر جو کیڑا لگ گیا ہے اُسے تلف کرنے کے لئے اُس پر راکھ ڈالی جائے، یا جڑوں میں ڈی۔ ڈی۔ ٹی (D.D.T) چھڑکا جائے۔ کبھی ایسا ہوتا کہ زور کی آندھی کے ساتھ بارش ہونے لگتی۔ یہ خیال کئے بغیر کہ ابھی چند دن پہلے ہی اس پر نمونیہ کا شدید حملہ ہو چکا ہے۔ وہ اپنے پودوں کو دیکھنے کے لئے تیزی سے باہر نکل جاتی۔ اور بھیّا جل کر کہتے "جانے کمبخت میں کس مالن کی روح آ گئی ہے کسی وقت بونے جوتنے سے ہی فرصت نہیں ملتی"۔ لیکن اب اتنے شوق سے لگائی ہوئی گھاس سوکھ چکی تھی، اور ننھے منے پھولوں کے وہ تختے جو چند دن پہلے لہلہایا کرتے تھے اُجڑے اُجڑے اور ویران نظر آ رہے تھے۔ البتہ کہیں کہیں کوئی اکا دکا پھول اب بھی کھلا ہوا تھا۔ اُس کا جی چاہا کہ وہ جھپٹ کر انھیں بھی نوچ ڈالے۔ عجیب وحشت سی برس رہی تھی اُن پر ـــــ درختوں کے زرد زرد مرجھائے ہوئے پتے بڑے دردناک انداز میں کھڑکھڑا کھڑکھڑا کر فضا کو اور بھی اُداس بنا رہے تھے۔ مگر اس تکلیف دہ سناٹے کے باوجود ایک سکون، ایک قسم کی طمانیت اس کی روح پر چھا رہی تھی۔ چھائے جا رہی تھی۔ ہلکا ہلکا نشہ اور دبا دبا غرور اس کے دل و دماغ میں سرایت کئے جا رہا تھا، اس کے دماغ میں اس و[قت]

ست کشمکش جاری تھی جو کبھی اُسے مطمئن اور کبھی بیقرار کر دیتی تھی۔

آندھی کا ایک تیز جھونکا آیا اور سرس کے خشک اور مرجھائے ہوئے بے شمار پتے اس کے اوپر گرنے لگے۔ پتوں کے طوفان سے بچنے کے لئے اُس نے
ان ہو کر ساری کا پلو اپنے منہ پر ڈال لیا اور بے چینی سے میز پر رکھے ہوئے خطوط کے انبار کو گھورنے لگی۔ ان خطوط کو دیکھ کر اسے اپنی تمام بیتی ہوئی
یاد آگئیں، وہ تمام باتیں جو بچپن سے لے کر اب تک اُس کے ساتھ ہوتی آئی تھیں، جب وہ بالکل ہی بچی تھی۔ دبلی پتلی اور بات بات پر منہ بسور دینے
خاموش سی لڑکی ـــ اُسے اچھی طرح یاد تھا اس کے بھرے پُرے گھر میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جو اُسے پیار کرتا ہو۔ کوئی ایسا نہ تھا، جو اس سے سیدھے
بات کرتا ہو۔ بلکہ اکثر بات بے بات اُسے ڈانٹ بھی سہنا پڑتی۔ گرمیوں کی پہاڑ ایسی لمبی سنسان دوپہروں میں اس کا جی سونے کو نہ چاہتا تو وہ سب کی نگاہیں
بچتی چھپاتی مکان کے پچھواڑے والے باغ میں آم کے پیڑ پر چڑھ جاتی اور مزے سے ڈال پر جھولا کرتی اور اس وقت تک جھولتی رہتی جب تک امی
آواز اس کے کان سے نہ ٹکراتی۔ اونہہ، کیا مصیبت ہے، وہ جھنجھلا جھنجھلا کر پکارتیں، دو منٹ سونا بھی مشکل ہے، بیمار پڑ گئی تو اور شامت آئے گی،
ری۔" اور وہ اُسے گھسیٹتے ہوئے لاکر پلنگ پر پٹخ دیتیں "خبردار جو اٹھی اب۔" اور جب وہ خاموشی سے یونہی پلنگ پر ادھر اُدھر کروٹیں بدلتی، تو
خفا ہو کر جھڑک دیتیں "بھئی آرام سے سوؤ نا!" اور وہ سوچتی، اللہ جانے کیا مزہ آتا ہے انھیں تمام وقت سونے میں۔ چوبیس گھنٹے سونا اور البم میں
نئی تصویریں لگانا۔ بس یہی تو دو کام تھے ان کے اور کتنی بُری ہوتی تھیں اُن دنوں آپا۔ کیا مجال جو اسے کبھی ڈھنگ سے البم دیکھنے دیا ہو۔ ایک
ن جب اس کا جی بہت ہی مچلا تو وہ چپکے سے آپا کی غیر موجودگی میں اُن کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ ابھی رائٹنگ ٹیبل کی دراز کو کھولا ہی تھا کہ وہ
گئیں "بدتمیز کہیں کی" انھوں نے غصے سے کہا ـــ "ستیاناس کر دیا میرے کمرے کا۔ بول پیٹوں اب تجھے!" وہ اس کے منہ پر تھپڑ مارتے ہوئے بولیں
اور وہ سوچتی مارتے ہوئے بھی مارنے کی اجازت لینا عجیب سی بات ہے نا!" یوں تو خیر وہ ان کے کمرے میں پھٹکتی بھی نہیں تھی۔ مگر بات یوں تھی کہ بھائی
جان نے ان دنوں نیا نیا کیمرہ خریدا تھا اور چاؤ میں آکر اس کی بھی ایک تصویر اُتار ڈالی تھی۔ جب وہ پرنٹ ہو کر آئی تو کیسا اس کا جی تڑپا تھا کہ وہ اپنی
تصویر کو تو کم از کم ہاتھ میں لے کر دیکھ لے۔ مگر آپا نے ڈانٹ دیا کہ تم خراب کر دو گی۔ اور یہ بھائی جان، کیا مجال جو اس سے ڈھنگ سے بات بھی کر لیں
اس دن، اسے یاد آیا، وہ شام کتنی پیاری تھی، سورج ڈوب چکا تھا اور موسم ابر آلود۔ آسمان پر بادلوں کے سفید سفید ٹکڑے تیرتے ہوئے بڑے خوبصورت
معلوم ہو رہے تھے۔ دہکتے ہوئے سُرخ سُرخ پھولوں سے لدا ہوا انار کا درخت کتنا آرٹسٹک دکھائی دے رہا تھا اور بھائیجان کھڑکی میں کھڑے بڑے
معنی خیز طریقے سے مسکراتے ہوئے گنگنا رہے تھے۔ "اٹھلاتی ہوئی چال سے بھونچال مچا دو۔" اس نے چونک کر دیکھا جھکی ہوئی خمدار ٹہنیوں کے
درمیان سعیدہ اپنی دانست میں بڑے انداز سے چل رہی تھی۔ گرتی پڑتی آنچل سنبھالتی، اونہہ! کیا نزاکت ہے، وہ اکتا گئی اور بھائی جان کے پاس
جا کر بڑے پیار سے بولی تھی "بھائی جان چلئے گھومنے چلتے ہیں؟" لیکن بھائی جان نے اُسے ڈانٹ دیا تھا۔ بھاگ یہاں سے بدتمیز ـــ" جی ہاں بدتمیز
اُسے رونا آگیا۔ بھلا گھومنے میں کیا بدتمیزی تھی، اور امی بھی تو روز یہی کہتی تھیں کہ "ہمیں شام کو ضرور سیر کے لئے جانا چاہیئے۔" اس نے بڑی معصومیت
سے سوچا، امی کی بھلی کہی ـ اس نے فوراً ہی اپنے خیال کی تردید بھی کر دی۔ وہ تو ہمیشہ سے خود ہی کسی بات کو کہہ کر فوراً اسے بدل دینے کی عادی تھیں
اُس دن بھی جب وہ انہی کے کہنے پر کھانے کے کمرے سے نہ جانے کیا چیز لینے گئی تھی تو میز پر رکھا ہوا کانچ کا نیلادان جو چچا جان ایران سے لائے تھے
زمین پر گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور اس کا ایک بڑا سا ٹکڑا اس کے ہاتھ میں چُبھ گیا۔ وہ درد کی شدت سے بلبلا اٹھی اور بے اختیار ہاتھ کو پکڑ کر زمین پر
بیٹھ گئی تھی۔ "کمبخت! مرتی ہی کیوں ہے تو ایسی جگہ جا کر" امی نے آتے ہی دوا لگانے کے بجائے اُسے دھڑا دھڑ پیٹ ڈالا، اور وہ اپنے درد اور کلب
کو بھول کر حیرت سے سوچنے لگی تھی، یہاں نہ جاؤں، وہاں نہ جاؤں، تو آخر کروں کیا؟ اور پھر اس جگہ تو سبھی آتے ہیں، وہ خاموشی سے باغ کے کسی کونے
جا کر بیٹھ جاتی اور سوچنے لگتی کہ آخر اسے کوئی پیار کیوں نہیں کرتا۔ اُسے تو سب سے محبت تھی، مگر اُس سے کوئی بھی پیار نہیں کرتا تھا۔ جب بھیا اُس
آنکھوں کے سامنے اُسے نظر انداز کرتے ہوئے آپا سے پیار کرتے، تو آپا سے شدید محبت ہونے کے باوجود وہ ان کے متعلق بہت بُری بُری باتیں سوچ

لگتی۔ اور اُس کی پلکوں پر بے اختیار رُوٹے موٹے آنسو لرزنے لگتے۔ بات بات پر اس کا دل بھر آتا تھا اور معصوم آنکھیں ہر وقت آنسوؤں سے لبریز رہتی تھیں اور کبھی کبھی تو اُن میں سُرخی اس حد تک بڑھ جاتی کہ امّی سوچتیں کہ اس کی آنکھیں دکھنے آ گئی ہیں۔ ایسے وقت میں اُسے بُری طرح یاد آنے لگتے۔ کتنے اچھے تھے وہ۔ سفید سلک کی قمیص اور نیلی ٹائی میں ان کا مسکراتا ہوا چہرہ اس کے ذہن میں گھومنے لگتا۔ رنگ برنگے اور لہراتے ہوئے ربن اس کی نگاہوں میں پھرنے لگتے اور مجید بھائی کے سرخ سرخ کانپتے ہوئے لب اُس کی سرد پیشانی کو پھر سے چھونے لگتے جیسے دو مضبوط باہوں کے درمیان وہ بالکل بے بس سی ہو جاتی۔ "ہائے کیا کرتے ہیں مجید بھائی چھوڑیئے نا!"

"میں تمھیں نہیں چھوڑوں گا، تم میری گڑیا ——" نہ جانے بھیّا اس وقت کہاں سے نکل آئے تھے "میں تمھیں ایسا نہیں سمجھتا تھا" وہ مجید بھائی کو مخاطب کرتے ہوئے بولے تھے۔ پھر سارے گھر میں تہلکہ مچ گیا تھا مگر وہ کچھ بھی تو نہ سمجھ سکی تھی۔ شام کو مجید بھائی خاموشی سے سوٹ کیس اٹھائے دروازے سے نکل رہے تھے، ان کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں جیسے وہ تمام دن روتے رہے ہوں، انھیں جاتے دیکھ کر بھی انھیں نہ روکا تھا البتہ اس کا جی چاہا تھا کہ وہ دوڑ کر مجید بھائی کی ٹانگوں سے لپٹ جائے اور رو رو کر کہے "مجید بھائی آپ نہ جایئے، خدا کے لئے نہ جایئے مجید بھائی۔ صرف آپ ہی تو مجھے پیار کرتے ہیں، آپ —— " مگر بھیا کی غضبیلی آنکھیں دیکھ کر وہ ڈر گئی تھی اور انھیں یوں گھورنے لگی تھی گویا کہہ رہی ہو "تم کتنا بنتے ہو بھیّا، اگر پیار کرنا بُری بات ہے، تو تم آخر آپا کی سہیلی سعیدہ کو اس کے گھر پہنچانے کے لئے کار میں اسے اپنے ساتھ کیوں لے جاتے ہو، اور سعیدہ کے کسی دن اگلی سیٹ پر بیٹھنے سے انکار کر دینے پر تم اسے گھسیٹتے ہوئے کیوں لا کر وہیں بٹھاتے ہوئے اُسے پیار کر لیتے ہو اور جب خفا ہو کر عجیب انداز سے مسکرا پڑتی ہے تو تم کیوں خوشی سے جھوم پڑتے ہو —— ؟ اور آپا آپ کے نذیر کو بھی تو میں خوب جانتی ہوں کیوں وہ آپ سے وقت پوچھنے کے لئے بار بار آ جاتا ہے؟ حالانکہ اس کی کلائی پر ہر وقت گھڑی بندھی رہتی ہے۔ کیوں وہ بار بار اسے چابی دینا بھول جاتا ہے؟ اور بھابی اور بھائی جان، اونہہ! آپ سب لوگ جھوٹے ہیں، بالکل عجیب سے —— مگر وہ خاموشی سے انھیں جاتے دیکھتی رہی۔ ان کے جانے کے بعد بھیّا پر جھپٹی تھی "اب آیئے گا کبھی ہم سے اپنے سوٹ پر استری کروانے، کبھی جو کر جائیں۔ وہ غصّے سے انھیں گھورتی رہی انھوں نے ہی تو اس کے اتنے اچھے سے مجید بھائی کو بھجوایا تھا۔ وہ رو رو کر مجید بھائی کی واپسی کی دعائیں مانگتی رہی تھی۔ مگر وہ تو اب کسی کے بھی نہیں تھے۔ وہ اپنے آپ کو بالکل ہی بے سہارا سمجھنے لگی تھی، اس کا جی چاہتا تھا کوئی تو اسے بھی پیار کرے، اس سے بھی محبت کرے کوئی! اور پھر ایسے وقت میں جب اسے ظہیر کی تھوڑی سی محبت ملی تو اسے بہت بھلی معلوم ہوئی۔ چند ہی دن میں وہ اپنے آپ کو اُس سے بہت قریب محسوس کرنے لگی۔ بہت ہی نزدیک، اسے محسوس ہوتا گویا وہ اپنی زندگی میں، جس نامعلوم چیز کی کمی کو شدت سے محسوس کر رہی تھی وہ اب مل گئی ہے۔ اس کی بےچین روح میں جو ہر وقت کانٹے سے چبھتے رہتے تھے وہ اب مائل بہ سکون ہو گئے ہیں اور کبھی وہ سکون سے کسی باغ کے کونے میں بیٹھ کر سوچتی، تو اسے ہنسی آ جاتی۔ آخر پہلے اس کی آنکھوں میں بات بات پر آنسو کیوں چھلک آتے تھے۔ وہ دل ہی دل میں مسکراتی رہتی، اپنی پرانی اپنی نادانی پر۔ اب ہر گھڑی اس کے کانوں میں مدہوش کن نغمے دھیمی دھیمی آواز سے رس گھولتے رہتے اور فضا ناچتی ہوئی محسوس ہوتی۔ ان دنوں وہ چوبیس گھنٹے خواب سا دیکھنے لگی تھی۔ بڑے خوبصورت، اور حسین خواب۔ بس ہر گھڑی خواب آتے رہتے اور جاتے رہتے دبے قدموں۔ بالکل ایسے جیسے Mimosa Bella Balla کی جھکی جھکی ڈالیاں ہوا کی خفیف سی سرسراہٹ سے جھومنے لگیں اور نو دُوسرے جھونکے سے بل کھاتی ہوئی واپس لوٹ جائیں۔ ان دنوں اس کی نیند بھی تو اُڑ گئی تھی، کسی طرح آتی ہی نہ تھی۔ حالانکہ چند دن پہلے امتحان کی تیاری کے لئے اسے رات کو جاگنے کی ضرورت ہوتی تھی، تو نیند زبردستی اس کی آنکھوں میں جیسے گھسی پڑتی تھی۔ تنگ آ کر وہ کافی کی چار پیالیاں چڑھا جاتی، مگر نیند کمبخت تھی کہ روکے نہ رکتی تھی۔ لیکن اب تو نہ جانے اسے کیا ہو گیا تھا۔ وقت گذارنے کے لئے وہ کبھی کوئی کتاب اور کبھی کوئی رسالہ پڑھنے لگتی۔ مگر مشکل تو یہ تھی، کہ وہ افسانوں میں جس ماحول کو تلاش کرنا چاہتی تھی، وہ اسے ڈھونڈے بھی نہ ملتا تھا۔

وہ ایسے افسانے پڑھے جنھیں پڑھ کر وہ کسی اور ہی دنیا میں پہنچ جائے۔ ایسی دنیا جو پردوں کی سرسراہٹوں سے بے نیاز ہو۔ جہاں خوبصورت چوکھٹوں میں سجی ہوئی دلفریب سینریوں کے بجائے ہنستے مسکراتے پھول ناچ رہے ہوں۔ پھر وہ ناچتے ناچتے بے دم ہو کر گرنے لگیں۔ دھیرے دھیرے ۔۔۔ ایک کے بعد دو، دو کے بعد، جیسے ہلکی ہلکی پھوار سی پڑ رہی ہو، اور ان سب کے درمیان وہ بیٹھی بیٹھی اونگھتی رہتی، اونگھتی رہتی ۔۔۔ مگر وہ رسالہ اٹھا کر دیکھتی تو وہاں کارل مارکس اور فرائڈ کے چیلے جھانکتے نظر آتے۔ مختلف طریقوں اور عجیب عجیب زاویوں سے، وہ جھنجھلا کر رسالہ پٹک دیتی پھر اٹھا لیتی، پھر رکھ دیتی، اس دن بھی اسی الجھن میں مبتلا، دیوار پر نظریں لگائے وہ بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ پاس ہی کھلی ہوئی کتاب پڑی ہوئی تھی اور وہ نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔ "کہو بھئی، کیا کر رہی ہو، یہ افسانہ پڑھا تم نے؟" "کون سا؟" وہ چونک کر بولی تھی۔ محویت میں اسے معلوم ہی نہ ہو سکا کہ ظہیر کب اس کے کمرے میں داخل ہو گیا تھا۔ وہ ذرا سنبھل کر مسہری کے سرہانے سے ٹیک لگا کر نیم دراز سی ہو گئی۔

"دیکھو میں بتاتا ہوں" مسہری کے ڈنڈے پر جھکے جھکے ظہیر نے رسالے کے ورق الٹنے کے لئے کچھ اس طرح ہاتھ بڑھائے کہ وہ اس کے بازوؤں کے حلقے میں آ گئی، اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور سارے بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔ اس کا جی چاہا کہ ظہیر کے بازوؤں کا حلقہ بالکل بند ہو جائے اور وہ اپنا بے سہارا سر اس کے بازوؤں میں چھپا دے۔ اس کے پپوٹے بوجھل ہونے لگے۔ جیسے اسے نیند آ رہی ہو۔ مگر فوراً ہی اس کی نگاہوں میں مجید بھائی پھر گئے، بھیا کی غصیلی آنکھیں اور مجید بھائی حسرت کی زندہ تصویر ۔۔۔ اُف! وہ لرز گئی، خدا نہ کرے جو ظہیر بھی یونہی ۔۔۔!

وہ دن اب دھندلی یادیں بن چکے تھے۔ لیکن وہ واقعہ اب بھی اس کے ذہن میں نکلتے سورج کی طرح جگمگا رہا تھا۔ ایک روز وہ اور ظہیر ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے، ظہیر سگرٹ کا دھواں اڑاتا ہوا کھڑکی سے باہر آسمان میں تیرتے ہوئے بادلوں کے ٹکڑوں کو گھور رہا تھا اور خود وہ اپنی کلائی میں جھنجھناتی ہوئی چوڑیوں سے کھیل رہی تھی۔

"تو آپ نہیں جائیں گے سلمیٰ کی شادی میں؟" خاموشی سے اکتا کر اس نے یونہی بات چھیڑنے کو پوچھا۔

"نہیں بھئی، مجھے کام ہے!" اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔

"آخر ایسا کیا کام ہے، چلئے نا، میری اتنی عزیز دوست ہے وہ"

"وہ تو ٹھیک ہے، مگر ۔۔۔"

"کچھ نہیں" اس نے شکایت آمیز نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا "آپ میرے لئے اتنی سی بات بھی نہیں کر سکتے۔"

"تمھارے لئے ۔۔۔" ظہیر سنگدلانہ طریقے پر ہنس دیا۔ "مگر بھئی میں پوچھتا ہوں تمھیں میں کیا خاص بات ہے؟"

وہ چونک پڑی۔ اس نے خاموشی سے ظہیر کی نگاہوں میں گھورا۔ مگر وہاں سوائے اندھیرے کے وہ کچھ بھی نہ پا سکی۔ "بات ۔۔۔؟ کچھ نہیں کچھ بھی نہیں ۔۔۔" اس نے مایوسی سے نظریں نیچی کر لیں۔

"میں تمھاری نگاہوں کے والہانہ پن سے ناواقف نہیں تزئین" ظہیر سنجیدگی سے بولا۔ "اور نہ ہی تمھارے دل میں چھپے ہوئے خیالات سے پوشیدہ ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تم بُری ہو، تم بہت اچھی ہو۔ تم بہت ہی اچھی ہو تزئین" وہ جلدی سے بولا۔ "لیکن تم میرے لئے آج بھی اتنی ہی اجنبی ہو جتنی دو سال پہلے تھیں۔ اس خلیج کو پار کرنے کے لئے بہت محنت کی ضرورت ہے اور بہت ممکن ہے کہ تم پھر بھی کنارے کو نہ پا سکو۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے تزئین! ۔۔۔" وہ سر جھکائے خاموشی سے سنتی رہی۔ شفق کی رنگینیاں فضا میں بکھر کر سمٹ چکی تھیں اور دور افق سے پھر وہی مٹیالے بادل امڈے چلے آتے تھے۔ یکایک اس کا جھکا ہوا سر اٹھا اور مدت کے بھولے بسرے آنسو ایک بار پھر خود بخود اس کی آنکھوں میں جھلملانے لگے۔ اس نے ایک حسین خواب دیکھا تھا جو بکھر چکا تھا ۔۔۔!!

جیسے کڑکڑاتے ہوئے جاڑے میں، بارش کے بعد گھرے ہوئے بادلوں میں سے یکدم کسی ٹکڑے کے چھٹ جانے کے بعد سورج کی گرم گرم کرنیں

سے سر اُبھارنے لگتی ہیں اور مُرجھائے ہوئے بے جان چہروں پر ایک دم رونق آ جاتی ہے۔ بالکل ایسے ہی عارف اُس کی مضمحل زندگی میں داخل ہو گیا۔ اُس مردہ چہرے پر پھر سے رونق آگئی۔ وہ اب ظہیر کو بالکل بھول چکی تھی، ظہیر اس کی زندگی میں بہت ہی قلیل عرصے کے لئے آیا تھا، بالکل ایسے جیسے دو راہگیر ک پر چلتے ہوئے اکٹھے ہو جائیں "بھئی میکلوڈ روڈ کس طرف ہے؟" ایک دوسرے سے پوچھے اور دوسرا راستہ بتا کر اپنی راہ لے لے۔ مگر ظہیر تو اسے راہ دکھا یونہی ادھر اُدھر بھٹکنے کو چھوڑ گیا تھا۔ اُس سے علیحدہ ہوتے ہوئے اسے یوں محسوس ہوا تھا گویا وہ اب ہمیشہ اسی اندھیرے میں بھٹکتی رہے گی۔ انجانے ستوں پر یونہی ماری ماری پھرتی رہے گی۔ لیکن جلد ہی عارف نے اس کی زندگی کی نازک اور بھٹکتی ہوئی بیل کو سہارا دے ڈالا۔ جب پہلی بار عارف گرمیوں کی چھٹیاں کے ہاں گزارنے آیا تو وہ اسے بے حد اچھا لگا۔ اتنا اچھا کہ وہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ وہ احمق ہی تو تھی جو اب تک ظہیر کے خیال کو دل سے نہ بھلا سکی۔ اگر عارف کو پہلے ہی دیکھ لیتی تو —— اور پھر اسے تو صرف محبت چاہیئے تھی خواہ کسی کی ہو، —— اور اسے عارف کی بے پناہ محبت مل گئی تھی۔

آج عارف نے اسے پھر ایک طویل خط لکھا تھا —— ! تم کہتے ہو عارف کہ میری آنکھیں بے حد رسیلی ہیں، ایسا محسوس ہوتا ہے گویا دو ننھی ننھی شفاف کٹوریاں رس چھلکنے کو تیار ہو۔ میں جانتی ہوں تم شاعر نہیں، لیکن تم واقعی شاعر ہو عارف —— ! میری آنکھیں کس قدر سوئی سوئی سی رہتی ہیں۔ کھوئی کھوئی خوابیدہ نگاہیں، کہیں راستے کا تعین ہی نہیں ہوتا ادھر اُدھر بھٹکتی رہتی ہیں، اور تم کہتے ہو کہ تم میری کھوئی کھوئی نگاہوں کی گھنیری پلکوں میں اُلجھ گئے ہو۔ اور تم ہاتھ پیر مارنے کے باوجود وہاں سے نہیں نکل سکے۔ کتنی عجیب بات! ہاں البتہ ہونٹ مجھے اپنے ہمیشہ سے پسند ہیں۔ اور جب ان پر لپ سٹک لگا کر میں آئینے میں دیکھتی ہوں تو وہ مجھے اتنے پیارے لگتے ہیں کہ بے اختیار میرا جی چاہتا ہے کہ میں انھیں چوم لوں۔ مگر انہی انگلیوں کو جنھیں تم نے اس قدر سراہا ہے جنھیں ننھی منی رنگین بلوریں نلکیوں سے تشبیہ دی ہے، انھیں انگلیوں کو دیکھ کر ایک مرتبہ ظہیر نے کہا تھا "یہ تمہارے چھوٹے سے ہاتھ پر رکھی ہوئی لمبی لمبی انگلیاں [illegible] کس قدر مضحکہ خیز لگتی ہیں"۔ لیکن تمھیں میری بُری چیزوں سے بھی پیار ہے۔ شاید اس لئے کہ تمھیں خود مجھ سے بے حد محبت ہے۔ تم نے لکھا ہے کہ اگر زندگی کے اس طویل سفر میں میں تمہارا ساتھ دوں تو یہ راستہ کس قدر حسین ہو جائے گا اور ہم کھوئے کھوئے سے انھیں راستوں پر چلتے رہیں گے چلتے رہیں گے ساتھ —— ساتھ —— ! مگر —— ، وہ اپنی گود میں رکھے ہوئے اس کے خط کو گھورتے ہوئے بولی —— تم ہی کہو عارف میں اپنی محبت کا گلا کیسے گھونٹ دوں؟ اوہ یقین مانو عارف میں ان لڑکیوں میں ہرگز نہیں ہوں جو شادی کو محبت کی موت سمجھتی ہیں۔ شادی تو میرے نزدیک محبت کی معراج ہے۔ مگر میں یہ سمجھتے ہوئے بھی تم سے شادی کرنے پر رضامند نہیں۔ کیوں؟ آشا کا خیال ہے کہ اگر میں نے تم سے شادی نہ کی تو یہ ایک انتقام ہوگا، جو میں تمہارے پردے میں ظہیر سے لے رہی ہوں گی۔ مگر تم تو جانتے ہو نا کہ یہ بات کس قدر غلط اور بے بنیاد ہے، اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ تم پہلے شخص ہو جو میری محبت کے شکنجے میں اس بُری طرح جکڑے گئے ہو۔ میری آنکھیں ہمیشہ سے محبت کی تلاش میں ادھر اُدھر گھومتی رہی ہیں، اور اب جال میں شکار کو پھانس کر خود ہی جال کا منہ کھول دینا کس قدر احمقانہ بات ہوگی۔ محبت کے لئے ترسا ہوا انسان آج خود کسی کو محبت کیلئے ترسا رہا ہے، واقعی دلچسپ بات ہے تم سے شادی نہ کر کے مجھے کتنا دکھ ہوگا۔ تم اس کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔ مگر یہ دُکھ اس خوشی کے مقابلے میں کہیں کم ہوگا جو مجھے یہ سوچ کر ہوا کرے گی کہ مجھ میں بھی وہ صلاحیتیں موجود ہیں جو ایک مغرور اور بے نیاز شخص کا سر ایک کمزور عورت کے سامنے جھکوا سکتی ہیں۔ میرے ہاتھوں میں بھی ایک مضبوط انسان کی زندگی ہے۔ جسے میں اپنے کمزور و ناتوان بازوؤں میں جس طرف جی چاہے موڑ سکتی ہوں۔ تم اپنی اہمیت سے ناواقف تو نہ ہوگے۔ زہرہ، بلقیس، الماس اور اور بھی بہت سی لڑکیاں، جن کے مجھے اب نام بھی یاد نہیں، تمہاری ایک نظر التفات پر کیا کچھ کر گزرنے کو تیار ہیں، لیکن میں —— مجھے معلوم ہے تم میرے اس خیال پر بھی جھنجھلا گئے اور مارے جھنجھلاہٹ کے اپنے ہونٹ کاٹنے لگو گے۔ لیکن تم شاید یہ سن کر اور بھی جھنجھلاؤ کہ قلوبطرہ سے لیکر ہر معمولی عورت کے دل میں اس خواہش کا جذبہ کتنا گہرا ہوتا ہے، کتنا عمیق اور میں —— مجھے واقعی اس وقت خود پر رشک آ رہا ہے عارف!

وہ مسکرائی اور ایک ایک کر کے عارف کے تمام خطوط بے پروائی سے پھاڑ ڈالے اور کھڑکی کے باہر انھیں ہواؤں میں اُڑاتے ہوئے اس نے محسوس کیا جیسے زندگی میں کوئی اُلجھن نہیں، کوئی پریشانی نہیں، اور وہ نرم نرم ہواؤں میں ایک روئی کے گالے کی طرح اُڑتی پھر رہی ہے۔

شاہین

لمحاتِ فرصت

(ڈبلیو۔ایچ۔ڈیویز کی نظم Leisure)

یہ زندگی کیا ہے اگر آلام کے ہاتھوں
رُکنے کی ہو فرصت، نہ نظاروں کی ہو مہلت
ہم۔شاخوں کے سائے میں کریں رُک کے تماشا
چرتی ہوئی بھیڑوں کو نہ ہو اتنی فراغت

جاتے ہوئے ویرانے میں مہلت نہ ہو اتنی
دیکھیں کہ ہری گھاس میں رہتی ہے گلہری
کس طرح کوئی دانہ فراغت نہ ہو اتنی

جب دھوپ چمکتی ہو فراغت نہ ہو اتنی
دیکھیں کہ رواں چشمے تاروں سے بھرے ہیں
جس طرح فلک رات کو۔ فرصت نہ ہو اتنی
ہم مڑ کے نظارہ کریں۔ فرصت نہ ہو اتنی
کس طرح نظر حسن کی شوخی سے بھری چال
کرتی ہے حسیں رقص۔ فراغت نہ ہو اتنی

رُک جائیں یہ دیکھیں۔ ہمیں مہلت نہ ہو اتنی
کس طرح اُترتا ہے ان آنکھوں سے تبسم
ہونٹوں کے کناروں پر۔ فراغت نہ ہو اتنی

یہ زندگی کیا ہے اگر آلام کے ہاتھوں
رُکنے کی ہو فرصت نہ نظارے کی ہو مہلت
دم لے لیں ٹھہر جائیں۔ نہ ہو اتنی فراغت

مخمور جالندھری

مطبوعات

چی باتیں

عبدالماجد دریا آبادی ۔ مسلمان ایک نئے دور میں سے گزر رہے ہیں، انھیں آزادی تو میسر آگئی ہے لیکن ابھی انھیں ایک ایسے اسلامی ماحول کی ضرورت ہے جو قرآن مجید کے احکام اور سرورِ کائنات صلعم کے اسوۂ حسنہ کی روشنی میں تشکیل پائے ۔ مغربی تہذیب ۔زیر اثر رہ کر وہ اپنے درخشندہ ماضی کو بھول چکے ہیں حالانکہ وہ ماضی صرف ماضی نہیں بلکہ اس میں روشن مستقبل پنہاں ہے

"سچی باتیں" مولانا عبدالماجد دریا آبادی مدیر "سچ" و "صدق" کے مضامین کا مجموعہ ہے جسے حکیم ہلال اکبری صاحب نے مرتب کیا ہے ۔ کتاب کے ن ابواب ہیں ۔ آیاتِ بینات ۔ احادیث طیبہ اور اسوۂ حسنہ ۔ یہ مضامین ایک مسلمان کی زندگی سے ہر پہلو سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے ذریعے سلام کو سمجھنے اور اس پر کاربند ہونے میں بہت مدد مل سکتی اور مذکورہ بالا ضرورت پوری ہو سکتی ہے ۔ یہ کوشش نہایت مبارک ہے ۔ کاغذ کتابت اور باعت معقول ہے کتاب مجلد اور ضخامت ۳۳۲ صفحات قیمت تین روپے چودہ آنے ۔ ملنے کا پتہ دکن پبلشرز اینڈ پرنٹرز لمیٹڈ حیدر آباد دکن

سلامی تحریک کا مجاہد

از محمد جعفر تھانیسری ۔ ۱۸۵۷ء کے جہاد آزادی کے بعد فرنگی حاکم نے مسلمانوں پر جو ستم توڑے ہیں وہ ایک خونچکاں داستان ہے ۔ مسلمانوں پر وہ امتحان کا زمانہ تھا ۔ برباد ہو کر بھی مسلمان مردِ مجاہد رہتا ہے ۔ چنانچہ اسی زمانے میں اسمٰعیل یدؒ نے اپنی ایک جماعت تیار کی جو فرنگیوں کے خلاف صف آرا ہوئی مگر انھیں کامیابی نہ ہو سکی ۔ اس جماعت کے ایک رکن محمد جعفر تھانیسری بھی تھے ۔

یہ کتاب ان کی خود نوشت ہے ۔ یہ کتاب تیسری بار نئے نام سے شائع کی جا رہی ہے ۔ اس مردِ مجاہد نے اسلام کی راہ میں کیا کیا سختیاں جھیلیں ان کو ھ کر مسلمان کا ایمان تازہ ہوتا ہے ۔ بیس برس کالے پانی میں قید گزار کر یہ مردِ مجاہد زندہ سلامت لوٹے مگر ان کے پائے استقلال میں خم نہ آیا ۔ یہ سب کچھ نوں نے اپنے خدا کی خوشنودی کیلئے کیا ۔ یہ کتاب مسلمانوں میں جوش اور اسلامی روح پیدا کرنے میں بہت مفید ثابت ہوگی ۔ کاغذ کتابت اور چھپائی خاصی ہے اب مجلد ہے ضخامت ۱۶۰ صفحات قیمت ایک روپیہ بارہ آنے ناشر دکن پبلشرز اینڈ پرنٹرز لمیٹڈ حیدرآباد دکن

لاصہ نگاری

از ڈاکٹر سید حامد حسن بلگرامی ۔ اردو ہماری قومی زبان قرار پا چکی ہے ۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارا سارا دفتری کاروبار اردو میں ہوگا ۔ دفتری کاروبار میں خلاصہ نگاری (Precise writing) بہت ضروری ہوتا ہے تاکہ طویل خط و کتابت پند الفاظ میں یوں لکھا جا سکے کہ اصل مطلب اور مرکزی خیال برقرار رہے ۔ خلاصہ نگاری سکولوں میں بھی رائج ہے اور ماہرین تعلیم اسے تعلیم کا اہم جزو خیال کرتے ہ ۔ انگریزی میں اس موضوع پر کافی کتابیں ہیں اردو میں "خلاصہ نگاری" پہلی کتاب ہے جو اس موضوع پر لکھی گئی ہے ۔ مصنف نے خلاصہ نگاری کے فوائد پر بہت میل سے لکھا ہے اور پھر اردو ادب سے عبارات لے کر ان کا خلاصہ کیا ہے ۔ آخر میں فرہنگ بھی شامل ہے ۔ یہ کتاب طالب علموں کے لئے بے حد مفید ہے ۔

کاغذ کتابت اور طباعت نہایت عمدہ ہے ضخامت ۲۰۰ صفحات قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ ناشر آکسفورڈ یونیورسٹی پریس (انڈیا برانچ)

ردو ہندی رسم الخط

محمد الیاس برنی ۔ اس کتاب میں اردو ہندی رسم الخط پر محققانہ اور عالمانہ بحث کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اردو رسم الخط ہندی سے زیادہ آسان ہے اور اردو کے مقابل ہندی حروف کی تعداد ڈیوڑھی ہے ۔ حروف کی اشکال و علامات کی تعداد کا فرق س سے بھی زیادہ ہے مصنف نے بڑی کاوش سے اردو رسم الخط کی خوبیاں اجاگر کی ہیں ۔ یہ کتاب بڑی دلچسپ اور اہم ہے ۔ موجودہ سیاسی حالات میں جب ہندی کو زبردستی ٹھونسا جا رہا ہے کتاب کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے گٹ اپ اچھی ہے ضخامت ۱۴۰ صفحات بلا قیمت ۔ ملنے کا پتہ پروفیسر محمد الیاس برنی بیت السلام سیف آباد حیدرآباد دکن

(سید منظور حسین بخاری پرنٹر پبلشر مینجر نے اتحاد پریس بل روڈ لاہور میں چھپوا کر ۳۲ لارنس روڈ سے شائع کیا سرورق رہبر پریس میں چھپا)

ہمایوں

قائد اعظم نمبر

اکتوبر ۱۹۴۸ء

قائد اعظم محمد علی جناح

"اسلام ہر مسلمان سے توقع رکھتا ہے کہ وہ اپنی قوم کی طرف اپنا فرض ادا کرے" (قائداعظم)

فہرست مضامین

جلد ۵۴ — نمبر ۴

ہمایوں بابت ماہ اکتوبر ۱۹۴۸ء

ایڈیٹر: بشیر احمد بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لاء — جائنٹ ایڈیٹر: بشیر محمد اختر

نمبر شمار	مضمون	صاحب مضمون	نمبر صفحہ
۱	قائداعظم	بشیر احمد	۳۹۴
۲	قائداعظم (نظم)	جناب حفیظ ہوشیارپوری صاحب ایم۔ اے	۳۹۶
۳	آہ قائداعظم	محترمہ جہاں آرا بیگم شاہنواز صاحبہ	۳۹۷
۴	قائداعظم اور مسلم خواتین	محترمہ گیتی آرا بیگم بشیر احمد صاحبہ	۴۰۱
۵	حضرت قائداعظمؒ کی یاد میں (نظم)	حضرت آثر صہبائی ایم۔ اے، ایل ایل بی	۴۰۲
۶	لاجواب شخصیت	جناب میاں عبدالعزیز صاحب ایم۔ اے، فلک پیما	۴۰۳
۷	آہ قائداعظم	، مولوی اظہار الحسن صاحب بی۔ اے، ایل ایل بی	۴۰۵
۸	زندہ باد اے قائداعظم (نظم)	، احمد ندیم قاسمی صاحب بی۔ اے	۴۰۷
۹	محمد علی جناح	بشیر احمد	۴۰۸
۱۰	قائداعظم (نظم)	جناب اختر ہوشیارپوری صاحب بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی	۴۱۰
۱۱	پاکستان کی بنیادیں بہت گہری ہیں	جناب پروفیسر عبدالغفار صاحب' ایم۔ اے	۴۱۱
۱۲	"ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناح"	د ب	۴۱۶
۱۳	قائداعظم کی زندگی کے اہم واقعات	بشیر احمد	۴۱۷
۱۴	وقت نہ تھا (نظم)	جناب طفیل ہوشیارپوری صاحب	۴۲۳
۱۵	قائداعظم کے ارشادات	بشیر احمد	۴۲۴

سالانہ چندہ	ششماہی	فی پرچہ
صہ	۳/	۸/

قائدِ اعظم

قائدِ اعظم! اس نام میں کتنی دلکشی ہے کس قدر رعب ہے کتنی بے پناہ قوّت ہے!

ہم اُس سے پیار کرتے تھے، ہم اُس سے ڈرتے تھے، ہمیں اُس سے تقویت ملتی تھی، یہ سبھی کچھ!

ہمیں اُس نے جگایا، پُچکارا، اُکسایا، اُبھارا! ہمیں اُس نے کاموں میں لگا دیا: ہمارے دل گرمائے، ہماری رُوح لرز گئی!

ہم غلام تھے اُس نے ہمیں آزاد کیا، ہم منتشر تھے اُس نے ہمیں جمع کیا، منظم کیا!

سرد و گرم زمانہ دیکھے ہوئے وہ سرد بھی تھا اور گرم بھی: سکون کا پُتلا، تہوّر کا مجسمہ:-

"جس سے جگرِ لالہ کو ٹھنڈک ہو وہ شبنم دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طُوفاں!"

اپنی محبت بھری باتوں سے اُس نے ہمارا دل موہ لیا، اپنی آتشیں تقریروں سے اُس نے ہمارے تن بدن میں آگ لگا دی!

اُس نے کہا: "میں چاہتا ہوں مسلمان اپنے اوپر بھروسہ کرنا سیکھیں اور اپنی قسمت کا خود فیصلہ کریں۔"

اُس نے کہا: "مسلمانوں کا صرف ایک ہی حلیف ہے: مسلم قوم اور صرف ایک ہی مددگار ہے: خدا!"

وہ یہ کہہ کر مسکرایا کہ "پاکستان ایک ایسا نصب العین ہے جس کے لئے جینے میں بھی مزا ہے اور مرنے میں بھی مزا۔"

اور پھر اپنے جوشِ خلوص میں کہا کہ "جب قربانی کا وقت آئے گا تو میں پہلا شخص ہوں گا کہ اپنے سینے میں گولی کھانے سے نہ جھجکوں گا۔"

ہم کب بھول سکتے ہیں یہ باتیں ـــــ اُس کی وہ میٹھی سرگوشیاں، اُس کا وہ سبک لہجہ، اُس کی وہ گرجتی آواز، اور آہ اُس کی وہ جرأت اور اُس کا وہ تجربہ اور پھر اُس کی وہ معلومات جو ہمارے لئے ایک خزانہ تھیں انمول!

اُس نے ہمیں بتایا کہ "ایک طلسمی طاقت تمہارے ہاتھ میں ہے" کیونکہ "تم اگر قرآن مجید کو اپنا آخری و قطعی رہبر بنا لوگے تو دنیا کی کوئی طاقت تم کو مغلوب نہ کر سکے گی۔"

اُس نے کہا "یاد رکھو کوئی فرد یا قوم بغیر محنت اور مصیبت اور قُربانی کے کچھ حاصل نہیں کر سکتی۔"

اُس نے بتا دیا کہ "تمہاری یہ جدوجہد بڑی طویل ہے اور سخت، اسے خوب سمجھ لو۔" لیکن ساتھ ہی یہ بھی سمجھایا کہ ہم یہ جدوجہد کسی کو نقصان پہنچانے کے لئے نہیں کر رہے بلکہ محض اس لئے کہ اِس مُلک میں عزت و وقار کے ساتھ آزاد انسان بن کر رہ سکیں۔"

پھر نصیحت کی کہ "اپنے اللہ سے عہد کرو کہ تم جیو گے تو ملّت اور پاکستان کی سربلندی کے لئے اور مرو گے تو انھیں کی آزادی و ناموس کی خاطر۔"

پاکستانی فوج سے اُس نے یُوں خطاب کیا کہ "خدا تعالےٰ تمہیں اور مجھے ہر مسلمان کو اسلام کی عزت پر سر کٹانے کا جذبہ اور توفیق عطا کرے۔"

مگر اُس نے ہمیں بشارت بھی دی کہ "خدا ہمارے ساتھ ہے اور ہم یقیناً کامیاب ہوں گے۔" اور "پاکستان برقرار رہنے کے لئے قائم ہوا ہے۔" او

پاکستان کا چراغ روشن ہو چکا ہے، اب اس چراغ کو مخالف ہوائیں نہیں بجھا سکتیں!"

اور پھر اُس کا آخری پیغام جو اُس نے ہمیں اپنی رحلت سے ستائیس دن پہلے دیا گیا تھا یہ کہ "مجھے اپنی قوم پر کامل اعتماد ہے کہ وہ ہر موقع پر اسی تاریخ کی عظیم الشان روایات اور شان و شوکت کو زندہ کر دکھائے گی۔"

اور اسی پیغام کے آخری الفاظ تھے کہ "قدرت نے تمھیں سب کچھ عطا کیا ہے۔ پاکستان کی بنیاد رکھی جا چکی ہے، اب اُس کی تعمیر تمھارے ہاتھوں میں ہے، جاؤ اِسے جلد سرانجام دو، خدا حافظ! پاکستان زندہ باد!"

ایسی تھیں اُس کی دل نشین باتیں! ایسے تھے اُس کے روح پرور قول! اب یہ باتیں ہم کس سے سُنیں گے؟ اب ہم کس کی خفگی سے شرمندہ شادماں ہو سکیں گے؟ اب ہم کس کی ہمت افزائی سے آسمان پر چڑھ جائیں گے؟

اُس نے برسوں دنوں کو راتوں کو ہمیں بُلایا وہ خود ہمارے پاس آیا، ہمیں جھنجھوڑا: اٹھو زمانہ خطرناک ہے، دیکھو دُنیا کس تیزی سے چل رہی ہے! ہم نے اُس کی یہ باتیں کچھ سُنی کچھ اَن سُنی کر دیں، ہم نے اُس کا کہا کچھ کیا اور کچھ نہ کیا۔ وہ چلاتا ہی رہا وہ سمجھاتا بجھاتا ہی رہا، کبھی کبھی وہ رُوٹھا بھی، کبھی کبھی اُس نے ہمیں بُرا بھلا بھی کہا لیکن آخر میں اکثر وہ ہماری کوتاہیوں پر چُپ ہی رہا صرف کبھی کبھی بولا، شاید وہ ہماری فکر میں مستغرق اور کثرتِ کار سے چُور تھا لیکن اُس کے بول اب بھی اُسی طرح جاندار تھے اور حوصلہ آفریں!

خدا نے اُس کو ہمیں دیا، ہم نے اُس کی قدر جانی پر نہ جانی، اُس کی باتیں مانیں پر نہ مانیں۔ آخر ہم بچّے تھے، باپ کی زندگی میں کھیل کود میں رہے یا پھر اِس آسائش میں مگن کہ وہ موجود ہے۔

لیکن قدرت نے کہا: مجھے یہ منظور نہیں، تمھیں آزاد کیا، تمھیں سب کچھ دیا، تم بڑے ہو گئے، اب بھی چھوٹے بنتے ہو؟ تمھارا قائد ایک نعمت تھا، لیکن نعمت وہی ہے جو ہمیشہ نہ رہے، اُس کے جسم و جان تمھارے دُکھ میں گھُل گئے سو میں نے اُسے سُکھ دیا، میں نے اُسے اپنے پاس بُلا لیا، اب تم کفرانِ نعمت نہ کرو، اب تم نفس پرستی چھوڑ دو اور اُٹھو اور قوم کو سنبھالو۔ ابھی وقت ہے، جو ملا ہے اُس کے مستحق بنو، یہ مانا کہ مشکلیں تمھیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں، کیوں نہ ہو اِس وقت تم کئی نعمتوں سے مالامال ہو، طاغوتی طاقتیں رشک و حسد سے تم پر پیچ و تاب کھاتی ہیں، تمھاری اپنی ہوا و ہوس تمھارے اپنے شکوک و شبہات تمھارے سدِ راہ ہیں لیکن اپنے "ایمان و اتحاد اور انضباط" کے بل پر تُم اِن سب کو شکستِ فاش دے سکتے ہو پھر یہ تساہل کیوں اور یہ مایوسی کس لئے ——— اے لَا تَقْنَطُوْا پر یقین رکھنے والو! آؤ اور اب اپنے کردار میں اپنے قائد کی سی قوت و یکرنگی پیدا کرو اور خوف و ہراس سے بے نیاز ہوتے ہوئے اپنی قُربانیوں سے اسلام کے ہلالی پرچم کو چار چاند لگا دو!

بشیر احمد

قائد اعظمؒ

کارواں سالار اگرچہ قائدِ اعظم نہیں — سرنگوں اے ملّتِ بیضا ترا پرچم نہیں

رہنمائے کارواں ہے قائدِ اعظم کی یاد — غم کی تاریکی میں اُس کی روشنی کچھ کم نہیں

ہر قدم پر اک نئی منزل ہے اب بھی منتظر — ہر نظر میں گرچہ اب وہ کیف کا عالم نہیں

نقشِ پا کو دیکھ کر آگے بڑھائے جا قدم — ملّتِ ناشاد تجھ کو فرصتِ ماتم نہیں

دیکھ تو مُڑ کر ذرا اے گرم رفتارِ فنا — کوئی سر ہے جو ترے نقشِ قدم پر خم نہیں؟

احترام اس میں ہے تیرے ذوقِ نظم و ضبط کا — زلفِ ہستی تیرے ماتم میں اگر برہم نہیں

راستوں کے پیچ و خم میں یاد آئے گا سدا — رونقِ ہستی ترے جانے سے مانا، کم نہیں

آہ یہ پیارا وطن، تیری امیدوں کا چمن — آج کانٹے بھی جہاں بے گوہرِ شبنم نہیں

ہم پہ اب تیری امانت کی حفاظت فرض ہے — کون کہتا ہے کہ اس خدمت کے قابل ہم نہیں

امتیازِ ظاہر و باطن کوئی دیکھے حفیظ

دل میں ہے محشر بپا آنکھیں شریکِ غم نہیں

حفیظ ہوشیارپوری

آہ قائدِ اعظمؒ

(چند ذاتی تاثّرات)

۱۲ ستمبر ۱۹۴۸ء سوا آٹھ بجے صبح ٹیلیفون :- "ہمارے محترم قائدِ اعظم رات کو وفات پا گئے !"

قائدِ دائمی مفارقت دے گئے - میں بُت بن کر ایک ایک کا مُنہ تک رہی تھی - میری مرحوم بچّی کے خواب کی اصل تعبیر آج معلوم ہوئی - شروع اپریل ۱۹۴۸ء میں چار بجے کے قریب وہ گھبرائی ہوئی میرے کمرے میں آئی - خاصا گرم دن تھا میں کمرے میں پلنگ پر لیٹی ہوئی اخبار کا مطالعہ کر رہی تھی - تازی ہرے پر انتشار تھا - میرے پاس بیٹھ گئی اور کہنے لگی - "بے جی ! ابھی ابھی پڑھتے پڑھتے میری آنکھ لگ گئی اور میں نے ایک عجیب خواب دیکھا اس یا معنی ہیں ؟ دیکھتی کیا ہوں کہ قائدِ اعظم انواع و اقسام کے کھانوں سے بھرا ہوا ایک خوان لئے ہوئے چلے آ رہے ہیں - میں دُور سے دیکھ کر بھاگی ہ اتنا بوجھ اکیلے اٹھائے آ رہے ہیں کچھ چیزیں میں لے لوں - پاس پہنچ کر میں نے دو تین قاب ہاتھ میں لینے کے لئے بازو پھیلائے تو کیا دیکھتی ہوں یک طرف سے تین آدمی جو مسلمان معلوم ہوتے تھے فوجی وردیوں میں ملبوس چلے آ رہے ہیں - میں نے آواز دی کہ اِدھر آؤ اور یہ چیزیں اٹھاؤ - وہ ہ آئے تو دیکھتی ہوں کہ وہ مسلمان نہیں ہیں اور انھوں نے پستول نکال لئے - یہ دیکھتے ہی میں قائدِ اعظم کے بالکل سامنے کھڑی ہو گئی اور میں نے گھبرا کر نوں ہاتھ اُن کے کندھوں پر رکھ کر باوازِ بلند کہا "قائدِ اعظم پہلے میں !" اُسی وقت میری آنکھ کھُل گئی - وہ اپنی آواز اب تک میرے کانوں میں گونج ی ہے - آہ تازی ! پانچ مہینے سے بھی تین دن کم آج تمھارا خواب پورا ہو گیا -

کراچی خود آئے - اچانک وفات پائی - دس بج کر ۲۵ منٹ پر دل کی حرکت بند ہو گئی - ریڈیو پکار پکار کر اس خبر کا اعلان کر رہا تھا اور میرے سوؤں کا دریا بہ رہا تھا - کیا بیان نہ دوں گی ؟ بیان ! محبوب قائد کی دائمی مفارقت پر ؟ کسی لُغت سے وہ کون سے الفاظ نکالوں گی جو میرے ں کی حالت کا نقشہ الفاظ میں کھینچ سکیں اور میرے جذبات کی ترجمانی کر سکیں ؟ خون کے آنسو رونے والے عزیز کیسے ایک محبوب ترین ہستی کی وفات بیان دے سکتے ہیں ؟

زندگی کے گزشتہ تیس سال کے تمام واقعات ایک فلم کی طرح آنکھوں کے سامنے گزرنے لگے !

سنہ ۱۹۱۹ء شملہ :-

چمپا طہوترہ ملنے کو آئی - کہنے لگی کہ رات کو سیسل ہوٹل کے ایک ڈنر میں باتوں باتوں میں مسٹر جناح کے سامنے آپ سب کے پردہ سے باہر آنے کا ذکر ہوا تو وہ مسکراتے ہوئے فرمانے لگے کہ شفیع کے گھرانے کی یہ مسلمان خواتین اگر پردہ سے باہر آئی ہیں تو خدا کرے کہ وہ اکثر بے پردہ عورتوں کی طرح صرف سا ی تیتریاں بننا اپنا شعار نہ بنائیں بلکہ مفید کاموں میں نمایاں حصّہ لیں ۔" اُس وقت کے اُس کے وہ الفاظ میرے دل میں ایسا گھر کر گئے کہ زندگی بھر ہمیشہ یاد رہے -

سنہ ۱۹۲۲ء شملہ :-

شام کو رتیؔ (مسز جناح) کا ایک رقعہ ملا کہ تمھاری والدہ اور والد آج سیسل میں ایک کھانے میں شریک ہونے کے لئے آ رہے ہیں - کیا اچھا ہو اگر تم بھی ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ - شام کو ہم سیسل گئے تو قائدِ اعظم اپنے کمرے کے سامنے ہمیں ملے اور جب میں رتی سے ملنے لگی تو ہنس کر فرمانے لگے "کیا تم نے رتی کی پیشانی پر یہ زلف و کاکل دیکھی ہے جو آج اُس نے خاص تمھارے لئے نکالی ہے ؟" میں نے کہا کہ میں اس کی دل سے قدر کرتی ہوں وہ شام مجھے ہمیشہ یاد رہے گی

میں نے مسٹر جناح کی تقریریں سُنی تھیں۔ اُن کی باوقار مؤثر شخصیت کو بارہا دیکھا تھا۔ کئی مرتبہ مل چکی تھی مگر ان کو کھانے کی میز پر ایک میزبان کی حیثیت سے بامذاق گفتگو میں حصہ لیتے اور کس آسانی سے بازی جیتتے پہلی مرتبہ دیکھا اور سُنا۔ ہم صرف چھ آدمی تھے۔ سچ یہ ہے کہ میں اس دن سے اُن کی بے مثال فہم و فراست اور ذکاوت کی قائل ہوگئی اور میرے دل میں اُن کی شخصیت نے ایک خاص جگہ لے لی۔

مارچ ۱۹۲۹ء نئی دہلی:۔

مسٹر جناح اور والد مرحوم (سر محمد شفیع) دونوں نے مل کر میرے یہاں کھانا کھایا اور ایک بجے رات تک باتیں ہوئیں اور اُس شام کو اُس اتحاد کی بنا ڈالی گئی جس کا نتیجہ گول میز کانفرنس میں مسلم وفد کے کام کی نمایاں کامیابی تھی۔

نئی دہلی سنہ ۱۹۳۰ء:۔

لیڈی مسٹر نے سر حبیب اللہ کو ایک الوداعی ڈنر دیا جس میں میرے شوہر مرحوم تازی اور میں تینوں شریک ہوئے۔ تازی کو قائد اعظم کے بائیں طرف جگہ ملی۔ ڈنر میں کافی لوگ شریک تھے۔ میں سر حبیب اللہ کے بائیں طرف بیٹھی تھی۔ اچانک کیا دیکھتی ہوں کہ میز کے اردگرد بیٹھے ہوئے سب مہمان خاموش تھے ایک کونے میں مسٹر جناح اور تازی میں بحث ہو رہی ہے۔ ہم بھی خاموش ہوگئے اور چند منٹ سُننے کے بعد سر حبیب اللہ مجھے کہنے لگے کہ زندگی میں آج پہلی مرتبہ مباحثے میں مسٹر جناح کو اپنا جواب مل گیا۔ تازی اُس وقت سترہ برس کی تھی۔ نفس مضمون بہت نفیس تھا۔ سب بہت محظوظ ہوئے اور بحث خاصی دلچسپ رہی۔

جنوری سنہ ۱۹۳۱ء لندن:۔

مُسلم وفد کے جلسہ میں جو آغا خاں کے کمرے میں ہو رہا تھا ایک ایسا ضروری خط پیش ہُوا جس کے صحیح ہونے پر ہندوستان کے مسلمانوں کے مستقبل کا دارومدار تھا۔ مسٹر جناح شروع میں موجود نہ تھے۔ جب وہ آئے اور انھوں نے خط کا مطالعہ کیا تو الفاظ کی ایک نہایت ضروری غلطی نکالی۔ یہ غلطی ایسی تھی کہ اگر وہ الفاظ ویسے ہی رہ جاتے تو مسلم حقوق کو بہت ضعف پہنچتا۔ یہ بات کسی کے ذہن میں نہ آئی تھی سب ششدر رہ گئے اور اُس دن میں اُن کی بے مثال قابلیت کی قائل ہوگئی۔ آہ! خوب یاد ہے، انھوں نے غلطی نکالی اور والد مرحوم نے اُسی وقت ان الفاظ کی بجائے موزوں الفاظ پیش کر دیئے۔

نومبر سنہ ۱۹۳۱ء:۔

ہُوس آف لارڈز اور ہوس آف کامنز کی مشترکہ کمیٹی میں مسلم وفد کے چند ممبروں کو تقریریں کرنی تھیں۔ بزرگ اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے اور میں خاموش بیٹھی سُن رہی تھی۔ انگریزوں کی اتنی خوشامد کیوں؟ یہ باعث عزت نہیں۔ کچھ دل میں جوش سا آگیا اور جب میری باری آئی تو میں نے بالکل دوسرا رُخ لے کر تقریر کی۔ میری تقریر کے بعد ایک پارلیمنٹ کے ممبر نے آہستہ سے میرے کان میں کہا کہ آج اس جگہ تمھاری تقریر نے تمھارے وفد کی عزت رکھ لی ہے۔ میں نے اپنے ممبروں کو دیکھا تو سب کے چہروں پر ناپسندیدگی کا اظہار تھا۔ اچانک میری نگاہ قائد اعظم کے چہرے کی طرف گئی تو اُن کے چہرے پر ہلکا سا تبسم تھا اور پسندیدگی صاف ظاہر ہو رہی تھی۔ اُس وقت میرے دل کو کس قدر خوشی حاصل ہوئی۔ وہ مجھے خوب یاد ہے۔

۱۹۳۱ء لندن:۔

ایک ایسے رہنما کو اسلامی حقوق کی ایسی بزور محافظت کرتے ہوئے دیکھ کر میرا دل بے حد خوش ہوتا تھا۔ اس کا انکشاف مجھ پر ان روزمرہ کے مُسلم وفد کے جلسوں میں دن بدن ہو رہا تھا۔ ایک دن میں نہ رہ سکی اور میں نے اُن کی خدمت میں عرض کیا مسٹر جناح آپ اپنے ان خیالات کو کھُلے طور سے پبلک کے سامنے کیوں پیش نہیں کرتے۔ دوسری قوموں کے اخبارات تو آپ کو اب تک اور ہی رنگ میں پیش کرتے رہتے ہیں۔ ہنس کر فرمانے لگے کہ سر دست انھیں ایسا ہی سمجھنے دو۔ وہ وقت آئے گا جب یہ پبلک کے سامنے پیش ہوں گے اور انھیں خود بخود معلوم ہو جائے گا۔

جون ۱۹۳۳ء:۔

شام کو ایک کھانے میں میں نے سُنا کہ مسٹر جناح چالٹھ میں ایک گھر خرید کر لندن میں سکونت پذیر ہو رہے ہیں۔ میں نے تمام رات بستر میں کروٹیں

لیتے ہوئے گزاری۔ کسی کل چین نہ آتا تھا جس شخصیت کے ساتھ قوم کی تمام اُمیدیں وابستہ تھیں اگر اُس نے وطن کو خیرباد کہہ دی تو پھر قوم کا خدا ہی حافظ ہے ہماری کشتی کا کوئی ناخدا باقی نہ رہے گا۔

الصبح میں نے محترمہ مس فاطمہ جناح کو ٹیلیفون کیا اور کہا کہ مجھے مسٹر جناح سے آج ہی چند ضروری باتیں کرنی ہیں اُن سے کچھ وقت میرے لئے مانگیں۔ انھوں نے اُسی روز لنچ کے لئے کہا۔ میں سلیکٹ کمیٹی کے جلسے کے بعد سیدھی ڈیڑھ بجے وہاں پہنچی۔ اُن کا گھر میری جائے قیام سے آٹھ میل دور تھا۔ قائداعظم گول کمرے میں صوفے پر بیٹھے کاغذات کا مطالعہ کر رہے تھے۔ مس جناح مجھے اُن کے پاس لے گئیں اور انھوں نے مجھے سامنے کے صوفے پر بٹھا لیا۔ میں نے چھوٹتے ہی انھیں بتایا کہ میں نے شام کو کیا سُنا اور کیسے بےچین رات گزاری۔ میں نے عرض کیا کہ والد مرحوم جا چکے۔ قوم کی کشتی منجدھار میں ہے۔ آپ کے بغیر کوئی ناخدا نہیں رہا۔ آپ ہی ایک ایسی خداداد شخصیت اور قابلیت کے مالک ہیں جو اس کشتی کو ڈوبنے سے بچا سکتے ہیں۔ خدارا اگر یہ ارادہ ہے تو اسے ترک کیجئے اور ہندوستان واپس چلئے۔ جواب میں فرمانے لگے کہ کیا سچ مچ تم ایسا سمجھتی ہو (?"Do you really Think so")

میں نے کہا مسٹر جناح میں صرف ایسا ہی نہیں سمجھتی بلکہ آج آپ کو لینے کے لئے آئی ہوں اور آپ سے واپس جانے کا وعدہ لئے بغیر یہاں سے نہ ہلوں گی اس کے بعد تین بجے تک باتیں ہوئیں۔ آہ! کیا الفاظ تھے۔ پھول برس رہے تھے۔ میں نے اتنے تھوڑے وقت میں کیا کچھ نہ سیکھا؟

۱۹۳۷ء و ۱۹۳۸ء :۔ لکھنؤ اور کلکتہ کے لیگ کے اجلاس:۔

وہ معرکۃ الآرا تقریریں۔ لیگ کا عوامی تحریک بننا۔ قوم میں ایک نئی روح کا پیدا ہونا اور وہ شخصیت جو ہر لحاظ سے سب پر فوقیت لئے ہوئے تھی، اس کی ہستی قوم کے لئے ایک بیش قیمت نعمت تھی۔

مارچ ۱۹۴۰ء :۔

لاہور کا اجلاس اور پاکستان کا ریزولیوشن۔ خاکساروں کا معاملہ۔ لوگوں کا وہ دریا جو سیلاب کی طرح اُمڈ آیا تھا اور سیماب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ شہر لاہور میں مسلمانوں کو بندوق کا نشانہ بنایا گیا "وزارت مُردہ باد" کے نعروں سے پنڈال گونج رہا تھا۔ وہی ہستی اور وہی شخصیت تھی جس نے اس خوش اسلوبی سے اس مشکل وقت کو نبھایا اور اجلاس کو ان دقتوں میں ایسا کامیاب بنایا۔ قائداعظم کی ایک ہی تقریر سے لوگ ایسے متاثر ہوئے کہ ایک آواز بھی اُس کے خلاف نہ اُٹھ سکی۔ کیا نظارہ تھا! کیا وہ کبھی فراموش ہو سکتا ہے؟

قائداعظم کے اعزاز میں بیگم عزیز کی ڈنر پارٹی نئی دہلی ۱۹۴۲ء :۔

میز پر بیٹھے ہوئے میں نے کہا کہ میں ایک ہزار روپیہ لیگ فنڈ میں دوں گی جس دن تازی لیگ کی ممبر بنے گی۔ قائداعظم ہنس دیئے اور فرمایا کہ تمھارے ایک ایک سے وہ دو آنے جو تازی لیگ کے اصولوں کی قائل ہو کر خود بخود ممبر بن کر مجھے دے گی مجھے زیادہ عزیز ہوں گے۔ وہ جانتے تھے کہ تازی نے تحریک میں حصہ لیا تو پھر اُس کے صبح و شام اُسی کے لئے وقف ہو جائیں گے۔ چنانچہ یہی ہُوا۔

جون ۱۹۴۵ء :۔

ویول کی تجاویز کے سلسلے میں دو مرتبہ قائداعظم سے مفصل باتیں ہوئیں۔ خضر کو بھی جا کر دو دفعہ ملی۔ افسوس اُس نے ایک نہ مانی۔ گاندھی جی سے بھی ملی۔

اکتوبر ۱۹۴۶ء :۔

امریکہ جاؤ۔ تار آیا۔ نئی دہلی پہنچی۔ کس شفقت سے پیش آئے۔ خدا حافظ کہا۔ چھ دن نئی دہلی میں انتظار کیا۔ ہوائی جہاز میں جگہ دینے سے گورنمنٹ آف انڈیا نے انکار کر دیا۔ اُن کو خبر دی۔ انھوں نے اسی وقت بلا لیا۔ اس دن ان کی دلیری اور جرأت کا جو انکشاف مجھ پر ہوا کیا میں کبھی فراموش کر سکتی ہوں۔ جس سختی سے ٹیلیفون پر انھوں نے انگریز سکریٹری سے گفتگو کی وہ قائداعظم ہی کا حصہ تھی۔ دل خوش ہو گیا ہمیں جگہ ملی اور ہم وقت پر نیویارک جا پہنچے۔

اپریل ۱۹۴۷ء :۔

وائسرائے کے محل میں کھانا۔ قائد اعظم، مس جناح، وزیر اعظم، بیگم لیاقت علی، مہاراجہ پٹیالہ اور میں۔ عجیب مجمع تھا۔ بعد میں اُس کی حقیقت معلوم ہوئی۔ اُس شام کی گفتگو پر سے نقاب اُٹھ دوں تو شاید لارڈ مونٹ بیٹن کو اپنے چند فقرے یاد آکر ندامت ہو مگر بزرگوں کے ہوتے بیان دینے کی مجھے کیا ضرورت ہے؟ دوسرے دن جب میں قائد کی خدمت میں حاضر ہوئی تو مہاراجہ پٹیالہ کی شرائط معلوم ہو کر حیران رہ گئی۔

اکتوبر ۱۹۴۷ء :-

امریکہ سے مجھے دعوت ملی کہ اسّی ہزار روپیہ لو اور تمام براعظم کا دورہ کرو۔ پبلک پاکستان کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے بیقرار ہے۔ قائد کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ دعوت نامہ پیش کیا۔ فرمایا۔ میں تمھیں جانے سے نہیں روکتا بے شک جاؤ مگر دوستانہ مشورہ چاہتی ہو تو وہ یہ ہے کہ تم ایک دستور ساز اسمبلی کی رُکن ہو۔ ایک ایسے رُکن کو جو صوبہ اور مرکزی اسمبلیوں کا ممبر ہو اپنے کام میں منہمک ہونا چاہئے اور ایسے اِدھر اُدھر کے کام دوسروں کے لئے چھوڑ دینے چاہئیں۔ تمھیں اس کی ضرورت نہیں۔ اپنے ٹھوس کام میں حصہ لے کر اُسے کامیاب بناؤ اور ایک راستہ جو تم نے اختیار کیا ہے اُس پر گامزن رہو۔ میں نے دلی شکریہ ادا کیا اور کہا کہ مجھے تو قوم کی خدمت کرنی ہے۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ باتیں ہوئیں اور انھوں نے اپنی زندگی کے کئی واقعات سنائے جب انھیں اسمبلی کی شرکت سے ہٹانے کے لئے کوشش کی گئی۔ مگر انھوں نے کسی کی نہ سنی اور ایک ہی شاہراہ پر ٹھوس کام کرتے چلے گئے۔ وہ عزیزانہ مشورے لینے اب کس کے پاس جائیں گے؟ آہ قائد!

مارچ ۱۹۴۸ء :- اور وہ آخری ملاقات!

گورنر جنرل کے محل میں لنچ۔ پنجاب کے وزرا اور چار اور ہم لوگ۔ ان کے دائیں ہاتھ پر بیٹھنے کی عزت میرے حصہ میں آئی۔ اُن کی وہ گفتگو۔ خدا جانے کیا خیال دل میں آیا۔ ہم سب ہمہ تن گوش سُن رہے تھے۔ لیگ کا عوامی تحریک بننا جہاں دس ہزار چندہ جمع کرنا بھی مشکل تھا اور اِدھر مختلف فنڈوں میں آج کروڑوں کی رقمیں ہیں۔ پھر اُن کا وہ نقشہ اتارنا کہ جب حکومت ہاتھ میں آئی تو پندرہ اگست کو خزانے میں کتنے کروڑ روپیہ تھا۔ پھر وہ قتل عام اور غارتگری چاروں طرف اور پھر فسادات کی بھرمار اور پھر چھ ہی مہینے میں بجٹ میں فاضلہ اور چاروں طرف تعمیری کام۔ اتنے قلیل عرصے میں مسلمانوں کی زندگی کے نقشے کا پلٹنا۔ غلامی سے آزادی۔ بحری بری اور ہوائی فوج کے مالک۔ اپنا جھنڈا اپنی وزارت اور خود مختاری۔ اور یہ حریت یہ آزادی کس نے دلوائی۔ اُس ناتوان جسد خاکی نے جس نے خدا تعالےٰ پر بھروسہ کرکے ہلالی پرچم ہاتھ میں لے کر لا الٰہ الا اللہ کا نعرہ بلند کیا۔

وہ قائد جو ۱۹۳۶ء میں اپنے ایک ساتھی لیاقت علی خاں اور ایک اٹاچی کیس کے ساتھ لاہور آیا تھا آج اُس کی جرأت وقابلیت کی بدولت دُنیا میں پاکستان جیسی سب سے بڑی اسلامی مملکت وجود میں آئی۔ یہ اُس کی دیانت یہ اُس کی راست گوئی یہ اُس کے عزم، اُس کے ایک آہنی دیوار بن کر اپنے مقصد کے حصول کے لئے کھڑا ہو جانے کا صلہ تھا۔ جو رب العزت نے زندگی میں قائد اعظم کو عطا کیا۔ ایک سچے کے یہی وہ اوصاف ہیں جو باری تعالےٰ کو پیارے ہیں اور انھیں کو عزیز رکھنا اور انھیں کو اپنا نصب العین بنانا اب ہر پاکستانی مسلمان کا فرض ہے۔ یہ سبق ہمارے قائد نے ہم کو دیا اور یہ سبق اب ہم کو ازبر کرنا ہے۔

پاکستان کی زیست کے لئے ہر ممکن قربانی کرنے کو پاکستان کا بچہ بچہ تیار ہے۔

آہ قائد اعظم!

جہاں آرا شاہنواز

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں

یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جُدا ہوتے نہیں

قائدِ اعظم اور مُسلم خواتین

کیسی جاذب تھی ہمارے قائد ہمارے محبوب رہبر کی شخصیت، جس نے بغیر تلوار، فوجی طاقت یا پولیس کے اپنی سیاسی فہم و فراست اور اپنی موثر و مدلل تقریروں سے ملت اسلامیہ کے دل و دماغ پر ایک طلسمی کیفیت طاری کر دی اور سات سال کے قلیل عرصے میں اُسے منزل مقصود تک پہنچا دیا۔ کیسی دلربا تھی وہ عظیم الشان ہستی جس کے مقناطیسی اثر سے بوڑھے، جوان، عورتیں اور بچے امیر و غریب سب اُس کے دیدار کے لئے کھنچے چلے آتے تھے اور ہزاروں کروڑوں انسان اُس کے فرمان پر جان و مال قربان کرنے کو تیار تھے، تاریخ شاہد ہے کہ کبھی کسی شخص کو اس قدر مقبولیت اور اس حد تک ایک قوم کا اعتماد حاصل نہیں ہوا۔ دس کروڑ مسلمانوں کو اپنے قائد کی قیادت پر پورا بھروسہ تھا کیونکہ وہ صادق تھا امین تھا، پاکباز تھا محنتی اور جفاکش تھا، اس کا عزم چٹان کی طرح مضبوط تھا۔ وہ دلیر اور نڈر تھا۔ اُس کی سیاست فریب اور دروغ سے پاک تھی۔ وہ راستبازی اور خلوص کا مجسمہ تھا۔ ملت کا درد اُس کی رگ رگ میں سما گیا تھا صد حیف کہ وہ دل درد آشنا نہ رہا۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں جب مسلم قوم کا شیرازہ بکھرا پڑا تھا۔ غلامی اور پستی کی تاریکیوں نے مسلمانوں کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ انتخابات میں کانگرس کو شاندار کامیابی ہو رہی تھی اور ہندو امپیریلزم ہندوستان پر چھا جانے کو تھا اس وقت ہمارے قائد اعظم نے موقعے کی نزاکت کو جانچا۔ اس نکتہ رس، اس نبض شناس نے قوم کی بیماری کی تشخیص کرتے ہوئے ملتِ اسلامیان ہند کو ایک مرکز، ایک سیاسی پلیٹ فارم اور ایک جھنڈے تلے جمع ہونے کے لئے پکارا۔ قوم نے اُس کی راستبازی، دیانت داری، خلوص اور غیر معمولی سیاسی قابلیت دیکھتے ہوئے اپنی سیاست کی باگ ڈور اس کے سپرد کر دی۔ پٹنہ میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ۱۹۳۸ء میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں ہمارے قائد ملت نے ایک مرکزی مسلم لیگ کمیٹی خواتین قائم کر کے سب صوبوں سے نمائندہ خواتین نامزد کیں۔ ان خواتین کو ہدایت دی گئی کہ وہ اپنے اپنے صوبوں میں جا کر مسلم لیگ کی صوبہ خواتین کمیٹیاں اور ضلع سب کمیٹیاں قائم کریں۔ مسلمان عورتوں کو مسلم لیگ کی دو آنہ ممبر بنائیں اور مسلم خواتین میں سیاسی شعور پیدا کریں۔ کھلے اجلاس میں یہ تجویز ایک ریزولیوشن کی حیثیت سے پیش کی گئی اور بالاتفاق رائے پاس ہوئی۔ اس اقدام سے ہمارے قائد اعظم نے مسلمان عورت کو سیاست کا رستہ دکھایا ہمیں سیاسی سرگرمیوں میں اپنے بھائیوں کے دوش بدوش مصروف کار ہونے کی تلقین کی۔ اس طرح ہماری واحد سیاسی جماعت نے مسلمان عورت کو سیاسات میں ایک باعزت حیثیت دے کر گویا اس کی ہستی کو تسلیم کیا۔ اُدھر صوبائی اور مرکزی مسلم لیگ کونسل میں سربرآوردہ کارکن مسلم لیگی خواتین نامزد کی گئیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مسلمان عورتیں ہندوستان میں سیاست کے میدان میں ایک بڑی تعداد میں گرمجوشی کے ساتھ صف آرا ہو گئیں۔

لاہور میں سنہ ۱۹۴۰ء میں جب آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں دو لاکھ کے عظیم الشان مجمع میں پاکستان کا ریزولیوشن پاس ہوا تو مسلم لیگی عورتوں نے ہزاروں کی تعداد میں اپنے قائد پر پورا اعتماد ظاہر کرتے ہوئے، پاکستان کے حصول میں جان و مال قربان کرنے کا حلف اُٹھایا۔ لاہور وہ پہلا مقام تھا جہاں صوبہ کمیٹی خواتین نے قائد اعظم کو ایک بڑے خواتین کے اجتماع میں مدعو کر کے انھیں ایڈریس دیا اور اپنے صوبے کے کام کی رپورٹ پیش کی۔ مسلم لیگ گرلز نیشنل گارڈز نے مُسلم ترانے گاتے ہوئے اپنے قائد کو سبز ہلالی جھنڈے کے ساتھ سلامی دی۔

ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناح — ملت ہے جسم جاں ہے محمد علی جناح

مسلم لیگی خواتین کا یہ جوش و خروش اور نوجوان مسلمان لڑکیوں کا جذبۂ عمل دیکھ کر ہمارے قائد اعظم بہت مسرور ہوئے۔ لگاتار تین سال قائد اعظم کی تشریف آوری پر ہم شاندار جلسے منعقد کر کے اپنے محبوب رہبر کو مدعو کرتے رہے اور ان کو اپنی کارگزاریوں کی رپورٹ دیتے رہے۔ قائد اعظم ہماری سرگرمیوں سے بہت خوش تھے۔ انھوں نے ہمیشہ ہماری جدوجہد میں ہماری حوصلہ افزائی کی اور پاکستان کی مہم میں ہماری کوششوں کو سراہا اور ہمیں آزادی کی جنگ جاری رکھنے کو کہا۔ ہم جب ان سے ملنے کے لئے جاتے تو یہ پیغام دیا کرتے کہ میں مسلم خواتین کو ترقی یافتہ اقوام کی عورتوں کے ہم پایہ دیکھنے کا خواہش مند ہوں۔ محنت و جاں فشانی اور خلوص کے ساتھ اپنی قوم کی خدمت کرتی چلی جاؤ اور اتحاد و تنظیم اور عمل کا ثبوت دو۔ ہمارے قائد ہمیشہ ہم سے انتہائی خندہ پیشانی اور تپاک سے پیش آتے رہے۔ افسوس صد افسوس کہ وہ دل جو ملتِ بیضا کے لئے بے قرار رہتا تھا سپردِ خاک کر دیا گیا۔ ہماری کشتی کو منجدھار میں چھوڑ کر ہمارا ناخدا اپنے خالق و مولا سے جا ملا۔ اب ہمیں نوزائیدہ سلطنت پاکستان کے ایک سال کے ننھے بچے کو جیسے وہ ہمارے سپرد کر گیا ہے شب و روز محنت و جانفشانی اور ایثار و قربانی سے پرورش کرنا، تربیت دینا اور پروان چڑھانا ہے ——
پاکستان کا معمار اعظم یہ تعمیر ہمارے حوالے کر گیا ہے کہ ہم اُسے ایک شاندار محل اور ایک مستحکم و خوش حال مملکت بنا کر دنیا پر ثابت کر دیں کہ ہم ایک آزاد ملک کے ایک آزاد باشندے ہیں جو آزادی کا صحیح مفہوم سمجھنے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں!

پاکستان زندہ باد

گیتی آرا بیگم بشیر احمد

ہیں اور غلامِ غلامانِ نہرو میں ان کا شمار ہے۔ صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ محمد علی جناح صاحب نے کانگرس سے علیحدگی اس لئے اختیار کی کہ کانگرس دادابھائی نیروجی والی کانگرس نہ رہی بلکہ کالی ماتا بن گئی۔ جناح صاحب کی آنکھوں کے سامنے بڑے سے بڑے کانگرسی لیڈر اپنا مطلب نکالنے کے لئے انگریزوں کے سامنے جھک جاتے۔ جو شخص نہ جھکا اور کبھی نہ جھکا وہ محمد علی جناح تھا۔

۳۱-۱۹۳۰ء والی لندن گول میز کانفرنس میں جناح صاحب کو جن دقتوں کا مقابلہ کرنا پڑا، مجھے اس کا ذاتی علم ہے۔ آزاد مزاج جناح نہ ہزہائی نس آغاخاں کی طرف جھکے نہ کسی اور طرف سرکے۔ اس خودداری کا نتیجہ یہ تھا کہ آخر ہزہائی نس آغاخاں سترہ سال بعد جناح صاحب کی طرف جھکے۔

ایک دفعہ نہیں سو دفعہ اس لاجواب شخصیت کے کڑے کڑے امتحان ہوئے۔ کچھ سال لارڈ ولنگڈن کے زمانہ میں جناح صاحب کو لندن میں قیام کرنا پڑا۔ آخر قوم کو جب کوئی اور نظر نہ آیا تو جناح صاحب ہی سے التجا کی گئی۔ کیا شخصیت تھی!! نہ ہٹا، نہ بدلا، نہ جھکا، اور ہمیشہ آگے بڑھا۔ شاید ہی کوئی اور شخص ہندوستان کے مسلمانوں میں ایسا ہوا ہوگا جس میں خودداری کی یہ شان ایسے نمایاں طریق سے دیکھنے میں آئی ہو۔

مولانا حالی مرحوم کے ایک مصرع میں خفیف سی تبدیلی کردیں تو جناح صاحب کی جھلک دکھائی دے جاتی ہے۔ ؎

تھی زمیں اُس کی الگ اور آسماں سب سے الگ

پاکستان بن گیا اور پاکستان بنانے والا رخصت ہوگیا مگر اس کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی کہ وہ نامۂ اعمال جو اگست ۱۹۴۷ء کے بعد سے غصب، رشوت اور چوری سے سیاہ ہوئے ختم ہوں۔ پاکستان بنانے والا، قوم کو آزاد تو کر گیا مگر لغو حرکتوں سے روکنے کا کام پورا نہ ہو سکا۔ یہ ناقابلِ ذکر جرائم اُس کے قلبِ نازک پر متواتر ضربِ شدید لگاتے رہے۔

اور آخر وہ دل سیاہ کاروں کی سینہ زوریوں کو دیکھتے دیکھتے بیٹھ گیا۔ بجھ گیا۔ جس دل کو انگریز کی سیاست، دشمن کی شرارت نہ دبا سکی وہ دل خود اپنے آدمیوں کی غفلت کا شکار رہا۔

وہ تو ہمیشہ

لاجواب

تھا اب قوم صمٌ بکمٌ ہے۔

عبدالعزیز

آہ قائد اعظمؒ

قائد اعظم رحلت فرما گئے۔ پاکستان یتیم ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون، پاکستان بننے سے کچھ پہلے اور پاکستان بننے کے بعد قوم پر ایک سے ایک بڑھ کر مصیبتیں آئیں کہ اللہ کی پناہ۔ لیکن قائد اعظم کی وفات!

مصائب اور تھے پر دل کا جانا عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

پاکستان کا تصور بتعبیر محمد علی جناح کے' دل نہیں مانتا۔ زبانِ برق سے سُنا کہ قائد اعظم انتقال فرما گئے۔ دل نے کہا نہیں قائد اعظم نہیں مر سکتے جب تک پاکستان زندہ ہے، پاکستان کی تاریخ زندہ ہے' قائد اعظم زندہ ہیں، زندۂ جاوید ہیں ؎

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے جب مسلمانوں پر پہلا کوہ الم ٹوٹا اور ہمارے ہادی و پیشوا محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر آخرت اختیار فرمایا تو فرطِ غم کا یہ عالم تھا کہ فاروقِ اعظمؓ بھی حواس کھو بیٹھے۔ اس وقت صدیق اکبرؓ نے یاد دلایا "جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو پوجتا تھا وہ سُن لے کہ محمدؐ کا انتقال ہو گیا لیکن جو اُس خدا کی عبادت کرتا تھا جس کے محمدؐ رسول تھے اُس کو سمجھ لینا چاہئے کہ خدا حی و قیوم ہے۔" اس تنبیہ نے بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا۔ اور مسلمانوں نے صبر کی سل اپنے سینوں پر رکھ لی۔ آج محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا نام لیوا محمد علی جناح دنیا سے اُٹھ گیا۔ مسلمان رنج و الم سے بے حال ہیں محمد علی جناح کا جسم فانی تھا، ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ لیکن ان کی روح' ان کا پیام باقی ہے۔ محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے قرآن چھوڑا تھا۔ اُس نے ہماری حفاظت کی محمد علی جناح نے پاکستان چھوڑا ہے اس کی ہم حفاظت کریں۔

قاید اعظم نے یہ ثابت کر دیا کہ ابھی معجزوں کا دور ختم نہیں ہوا۔ پاکستان —— دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کا قیام بیسویں صدی عیسوی کا زندہ معجزہ ہے۔ قاید اعظم سے پہلے ہندوستان کے مسلمان ایک قوم تو کیا جماعت بھی نہ تھے۔ ایک گروہ گم کردہ راہ' ہر شخص کی اپنی ڈفلی اپنا راگ۔ تتر بتر بھیڑ کی طرح جدھر منہ اُٹھا چل دیئے۔ یہ قاید اعظم کا اعجاز تھا کہ اس بے حس بے مقصد گروہ کو ایک طاقتور قوم بنا دیا' بنا ہی نہیں دیا' دُنیا سے تسلیم بھی کرا لیا۔ جب اس مردِ مجاہد نے پاکستان کا نعرۂ مستانہ بلند کیا تو غیروں نے کیا اپنوں نے بھی مجذوب کی بڑ سمجھا۔ دنیا کے ہر پیغام حق کی طرح پہلے اس کا مضحکہ اُڑایا گیا' پھر مخالفت ہوئی اور بالآخر تسلیم کر لینے کے سوا چارہ نظر نہ آیا اور دیکھتے ہی دیکھتے دیوانے کا یہ خواب ایک ٹھوس حقیقت بن گیا قوموں کی تاریخ میں سات برس کا عرصہ بھی کوئی عرصہ ہے؟

عزت مآب لیاقت علی خاں نے فرمایا ہے کہ قائد اعظم ایسے وقت میں ہم سے جدا ہوئے ہیں جب ہمیں سب سے زیادہ ان کی رہنمائی کی ضرورت تھی اس میں شک نہیں کہ دل کو احساس کچھ ایسا ہی ہوتا ہے لیکن میں تو اس سانحہ میں بھی قدرت کا یہ اشارہ پنہاں دیکھتا ہوں کہ پاکستان کے مشن کی تکمیل ہو گئی بقائے پاکستان کی ضمانت خود خالق اکبر نے قبول فرمالی، قائد اعظم کی ضرورت نہ رہی' ان کا کام ختم ہو گیا' اس لئے انھیں اٹھا لیا گیا۔ قائد اعظم نے پاکستان کی صرف بنیاد ہی نہیں رکھی بلکہ اس کی زندگی کے پہلے سال کو جو شاید زندگی کا سب سے نازک دور ہو (ضائع ہونے والے بچے اکثر پہلے سال کے دوران میں ہی ضائع ہو جاتے ہیں) کامیابی سے پورا کر گئے۔ جب کچھ نہ تھا تو انھوں نے پاکستان بنا دیا، اب تو خدا کے فضل سے بہت کچھ ہے۔ کہ ہم اسے قائم نہ رکھ سکیں گے' قائد اعظم موجود تھے تو ہمیں اُن پر تکیہ تھا۔ ہم ان پر بھولے ہوئے تھے' ہمارے پاس حریفوں کے ہر طلسم کا ایک ہی توڑ تھا محمد علی جناح، اب وہ نہیں ہیں تو ہمیں انھیں کے درس کے مطابق اتحاد' عزم اور ایمان سے کام لے کر پاکستان کو ناقابل تسخیر عظیم الشان مملکت بنانا ہے۔ اور اگر

ان کی جدائی کا احساس ہی ہم میں یہ اتحاد، عزم اور ایمان پیدا کر دے تو پھر اس جواں بخت پیر مرد کی زندگی کی طرح اس کی موت بھی ہماری تقدیر کو استوار کر دے گی۔

" لکھی جائیں گی کتاب دل کی تفسیریں بہت" قائد اعظم پر لوگ بہت کچھ کہیں گے اور بہت کچھ لکھیں گے لیکن پھر بھی کافی نہ کہہ سکیں گے اور کافی نہ لکھ سکیں گے میں تو صرف چند معمولی واقعات قلم بند کر کے اس تحریر کو جو ایک غمزدہ دل کا خراج عقیدت ہے، ختم کرتا ہوں۔ یہ واقعات بجائے خود اہم نہیں لیکن قائد مرحوم کی سیرت کے آئینہ دار ضرور ہیں۔ مسلم لیگ کی نشاۃ ثانیہ کا دور ہے، فروری ۱۹۳۸ء کا زمانہ ہے، غازی آباد مسلم لیگ کی دعوت پر قائد اعظم تشریف لائے ہیں۔ اس چھوٹے سے قصبہ میں جس پیمانہ پر اُن کا استقبال سرانجام ہو گیا اُسے خود ممدوح نے لفظ "شاہانہ" سے تعبیر فرمایا تھا جلسہ کے بعد ضیافت چائے کے دوران میں راقم الحروف کو مقامی لیگ کے سکریٹری کی حیثیت سے فخر ہم کلامی حاصل ہوا۔ کچھ اس شفقت سے گفتگو فرمائی کہ یہ احساس بھی نہ ہونے پایا کہ میں اس عظیم المرتبت انسان کے روبرو ہوں جو ہندوستان کے گورنر جنرل امریکہ کے سابق پریسیڈنٹ ہوور اور چین کے سالار اعظم چیانگ کائی شیک سے بھی اپنے ہی پروگرام کے ماتحت ملاقات کرتا ہے ورنہ انکار کر دیتا ہے۔ دوران گفتگو میں اکثر "مائی بوائے" (My boy) ارشاد فرما کر عزت افزائی فرمائی۔ کم سواد کہتے ہیں قائد اعظم کی خودداری خود بینی کی حد تک بڑھی ہوئی تھی۔ انھیں کون سمجھائے کہ جسے وہ خود بینی سمجھتے ہیں وہ قائد اعظم کا سیاسی حربہ تھا۔ وہ اپنے وقار سے قوم کا وقار بڑھاتے تھے۔

۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ کے تاریخی اجلاس لاہور کی صدارت کے لئے قائد اعظم دہلی سے تشریف لے جا رہے تھے۔ غازی آباد کے اسٹیشن پر راقم الحروف اور چند اور مشتاقان زیارت حاضر ہیں، انھیں میں ایک دس سال کا بچہ بھی ہے، اس کے ہاتھوں میں بھی پھولوں کا ہار ہے، قائد اعظم مسکراتے ہوئے گاڑی سے اُترتے ہیں۔ بچہ ہار پہنانا چاہتا ہے، قائد اعظم جھک کر ہار پہن لیا تو بچے سے پوچھا تم کیوں آئے ہو جواب ملتا ہے آپ کو دیکھنے۔ پھر سوال فرماتے ہیں، مجھے دیکھنے کیوں آئے ہو بچے نے جواب دیا قوم کے لئے۔ قائد اعظم کی زبان سے بیساختہ شاباش نکلا اور چہرہ فرط مسرت سے کھل اُٹھا بچے کی پیٹھ ٹھونکی اور ارشاد فرمایا: مسلمانوں کے بچوں میں بھی اب قوم کا احساس ہو گیا ہے۔

مخالف اجتماعات میں تقریر کرتے ہوئے لیڈروں کا عجیب عالم ہوتا ہے۔ میں نے دیکھا ہے ذرا سا ہنگامہ ہو جائے، ہنگامہ نہیں بے ترتیبی ہی ہو جائے تو پنڈت نہرو آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ بھائی پرمانند جب ہندو مہا سبھا کے صدر تھے تو ایک مرتبہ غازی آباد تشریف لائے۔ کانگریسیوں نے مخالفانہ مظاہرہ کیا، کچھ نہ پوچھئے بھائی جی پر کیا عالم گزرا مارے غصے کے دیوانے سے ہو گئے۔ قائد اعظم کے جوہر ایسے موقعوں پر اور نمایاں ہو جاتے تھے جس زمانہ میں پنڈت نہرو نے ہندوستان میں فرقہ وارانہ مسئلہ کے وجود ہی سے انکار کر دیا تھا اور فرمایا تھا کہ خوردبین سے دیکھنے پر بھی یہ مسئلہ نظر نہیں آتا۔ قائد اعظم میرٹھ تشریف فرما ہوئے۔ مسلم ہوسٹل کے طلبا نے کالج میں مدعو کیا۔ ہندو طالب علم اس بات پر تل گئے کہ جلسہ نہ ہونے دیں گے۔ کرنل او ڈائل پرنسپل کی صدارت میں جلسہ شروع ہوا۔ قائد اعظم تشریف فرما ہو چکے تو ایک طرف سے آواز آئی Traitor (غدار) یہ نعرہ گویا ہنگامہ برپا کرنے کا سگنل تھا۔ ہندو طلبا نے شور و غل سے آسمان سر پر اُٹھا لیا، مسلم طلبا بھی اس طوفان بدتمیزی پر برافروختہ ہو چلے تھے قریب تھا کہ آویزش ہو جائے۔ اسی عالم میں قائد اعظم کھڑے ہو گئے اور خطاب فرمانا شروع کیا، اتنی سلجھی ہوئی تقریر ارشاد کی اور اس پُرسکون انداز میں کہ ہر شخص عش عش کر اُٹھا۔ آپ نے مخالف طلبا کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ لوگ مستقبل کے لیڈر ہیں۔ اقلیت کا مسئلہ آئندہ آپ ہی کو طے کرنا ہے یہ مسئلہ کچھ ہندوستان ہی کیلئے مخصوص نہیں دنیا کے دوسرے ممالک بھی اس سے دوچار ہوئے ہیں کینیڈا کی مثال آپ کے سامنے ہے انگریزی اور فرانسیسی نسل کے باشندوں میں کیا کچھ اختلافات تھے اس مسئلہ کے وجود سے انکار کرنا تنگ نظری ہے آپ عجیب جج ہیں کہ یک طرفہ فیصلہ کئے دیتے ہیں آپ تو تعلیم یافتہ افراد ہیں آپ کو مسئلہ کے دونوں پہلو دیکھنا ہیں جو لوگ آپ کو یک طرفہ فیصلہ کرنے کی تعلیم دیتے ہیں وہ آپ کے ساتھ دوستی نہیں کرتے، آپ دوسرے فریق کی بات سننے سے انکار کیوں کرتے ہیں۔ سنئے اور سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ تقریر انگریزی میں تھی۔ مجھے اس کا ایک جملہ اب تک یاد ہے فرمایا تھا۔

You are grown up men. I am not going to put you in my pocket and carry you away. Why don't you listen?

آپ نوجوان ہیں، میں آپ کو اپنی جیب میں رکھ کر تو نہیں لے جاؤں گا آپ سنتے کیوں نہیں؟ اس جلسہ میں قائد اعظم نے اپنی پوری تقریر اقلیت کے مسئلہ اور دُنیا کے ممالک نے اسے کس طرح حل کیا، اس موضوع پر ارشاد فرمائی۔ میں نے دیکھا کہ چند ہی منٹ بعد پانی سا پڑ گیا، خاموشی طاری ہو گئی اور جلسہ بخیر و خوبی ختم ہوا۔

محمد اظہار الحسن

زندہ باد اے قائدِ اعظم

دُنیائے اسلام کا ضیغم
اُس کا ہر فرمان مسلّم
اُس کی ہر رائے مستحکم
جو بولو [illegible]، بولو باہم
زندہ باد اے قائدِ اعظم

کشتی لوگ ڈبو بیٹھے تھے
اور کنارا کھو بیٹھے تھے
ہار چکے تھے، رو بیٹھے تھے
تُو لے آیا اُن کو لبِ یم
زندہ باد اے قایدِ اعظم

دُنیا گونجی تکبیروں سے
قیدی نکلے زنجیروں سے
ایماں اُلجھا تقدیروں سے
حیراں حیراں، عالم عالم
زندہ باد اے قائدِ اعظم

شمعِ رسالت کا پروانہ
ہر فن، ہر حکمت میں یگانہ
غیروں کے تیروں کا نشانہ
تیروں کی ترکیب کا محرم
زندہ باد اے قائدِ اعظم

کتنا دلکش ہے یہ منظر
کس نے تاریکی سے اُبھر کر
صدیوں کے دھندلائے اُفق پر
کھولا سبز ہلالی پرچم
زندہ باد اے قائدِ اعظم

احمد ندیم قاسمی

محمد علی جناح

[illegible] جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر (دہلی)

۱۸۵۷ء کے غدر کے وقت جب ہندوستان میں مسلمانوں کے تمدن کو زوال آمادہ ہوئے ڈیڑھ سو سال گزر چکے تھے اور جب انگریزوں نے ہند کے دارالسلطنت میں ہزار سالہ اسلامی حکومت کا آخری نشان مٹا دیا کسے معلوم تھا کہ اس کے اُنیس سال بعد کراچی کے ایک معمولی مسلمان تاجر کے ہاں کرسمس کے دن ایک لڑکا پیدا ہوگا جو ستر برس کی عمر میں انگریزوں اور ہندوؤں کی شاطر و مالدار قوموں کو مات دے کر ہندوستان میں مسلمانوں کی غافل و قلاش قوم کے لئے دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کی بنیاد ڈالے گا؟ دنیا نے اس قسم کے انقلاب بہت کم دیکھے ہیں کہ ایک بھوکی ننگی نہتی قوم دو سرمایہ دار قوموں کو جن میں ایک مسلح بھی ہو ایک پورا ملک خالی کر دینے پر مجبور کر دے اور پھر ایک ایسے زمانے پر جب مذہب پر پھبتیاں کسی جاتی ہوں قومیت کی بنا ایک مذہبی تہذیب پر رکھے۔ پاکستان جو ۱۹۴۷ء میں یوں وجود میں آیا محمد علی جناح کی ہفت سالہ مساعی کا نتیجہ تھا۔ مغربی تعلیم کی گود میں پلے ہوئے ایک ہندوستانی مسلمان کا یہ کارنامہ فی الحقیقت ایک معجزے سے کم نہیں۔

محمد علی جناح کی سیاسی زندگی کی داستان بے حد دلچسپ ہے۔ اکیس سال کی عمر میں انھوں نے وکالت شروع کی جس میں انھوں نے اپنی لگاتار محنت استقلال سے بالآخر خاصا نام پیدا کر لیا اور پھر تیس سال کی عمر میں میدان سیاست میں قدم رکھا۔ جہاں وہ اپنی حریت پسندی جرأت اور بصیرت کے لئے مشہور ہو گئے۔ اس کے جلد بعد وہ امپیریل کونسل کے ممبر منتخب ہوئے۔ کانگریس میں کونسل میں مختلف کانفرنسوں میں ہر جگہ اُن کے پیش نظر صرف یہ امر تھا کہ کس طرح انگریزی حکومت سے ہندوستانیوں کے لئے حقوق حاصل کئے جائیں اور ہندوستان کی مختلف جماعتوں میں مفاہمت کرائی جائے۔ چنانچہ انہی کی مساعی سے ۱۹۱۶ء میں کانگریس اور لیگ کے درمیان میثاق لکھنؤ ہوا اور اس کے نتیجہ کے طور پر برطانوی حکومت ہندوستانیوں کو کچھ ملکی حقوق دینے پر مجبور ہو گئی لیکن جلد ہی کانگریس میں گاندھی جی کا اثر بڑھا اور اُن کی عدم تعاون کی تحریک کے زور پکڑنے پر جناح نے جو ہمیشہ آئینی جنگ کے حامی تھے کانگریس سے علیحدگی اختیار کی۔ اس کے باوجود انھوں نے مرکزی اسمبلی میں اور اُس کے باہر بھی حکومت کی مخالفت اور ہندو مسلم اتحاد کی کوششیں سولہ برس تک برابر جاری رکھیں لیکن سب بے سود۔ آخر مایوس ہو کر انھوں نے ہندوستان کو خیرباد کہی اور انگلستان میں مقیم ہونے کا ارادہ کر لیا (۱۹۳۱ء)۔

اس وقت ہندوستانی مسلمان عجیب کس مپرسی کی حالت میں تھے، جب انھیں اور کوئی سبیل اپنے فلاح کی نظر نہ آئی تو انھوں نے جناح کو ایک بجز بھیجا (۱۹۳۳ء) کہ اس مشکل کے وقت میں قوم کی باگ ڈور صرف آپ سنبھال سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ ہندوستان واپس آئے انھیں مسلم لیگ کا مستقل صدر چنا مرکزی اسمبلی میں انھوں نے ایک آزاد مسلم پارٹی منظم کی۔ ۱۹۳۵ء کے آئین کے نفاذ کے اگلے سال انھوں نے ایک مسلم لیگ الیکشن بورڈ مرتب کیا اور جب ۱۹۳۷ء میں کانگریس سے سمجھوتہ نہ ہو سکا تو انھوں نے طول و عرض ملک میں صوبہ صوبہ پھر کر مسلمانوں کو مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع کرنے کی کوشش کی۔ اس تگ و دو میں انھیں نہ صرف سرکاری اور کانگرسی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا بلکہ خود مسلمانوں کے متعدد گروہوں اور افراد نے اُن کے رستے میں روڑے اٹکائے۔ مگر جناح وہ شخص نہ تھا جو ایک بار مصمم ارادہ کر لینے کے بعد ہمت ہار دیتا۔

۱۹۳۷ء کے انتخابات میں کانگریس ہر جگہ بازی لے گئی اور سات آٹھ صوبوں میں اُس کی حکومت قائم ہو گئی لیکن ادھر جناح نے بھی مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے ساری مسلم قوم کو اتحاد کی دعوت دی اور اسلام کا نام لے کر ایک منتشر جماعت کو صف آرا کر دیا۔ دو تین سال ہی میں لیگ کی تحریک ایک آگ کی طرح شہروں میں بلکہ دیہات تک پھیل گئی۔ اس پر بھی جب جناح نے کانگریس کو اپنی ہٹ پر قائم پایا تو لاہور میں ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو اعلان کر دیا کہ اب ہندوستان کے مسلمانوں کا نصب العین اپنی اکثریت کے صوبوں میں اپنی جداگانہ آزاد حکومت قائم کرنا ہوگا۔ یہ تھا پاکستان کا مطالبہ جس پر پہلے انگریز مسکرائے اور ہندو جھنجھلائے لیکن سات

عرصے میں ان دونوں کو جناح کے آگے گھٹنے ٹیک دینے پڑے۔ پاکستان کا مطالبہ جناح کے عزم، مسلمانوں کی بیداری، انگریزوں کی بے اعتنائی اور ہندوؤں کی تنگ ذ روز بروز زیادہ مضبوط ہوتا گیا۔ پہلے ۱۹۴۲ء میں کرپس کی تجاویز میں ایک ذرا سی رعایت مسلمانوں کے لئے رکھی گئی، دو سال بعد گاندھی نے جناح سے گفت و شنید کی اپنے ہیر پھیر سے جناح کو پرچانا چاہا، ۱۹۴۵ء میں ویول کی تجاویز میں مسلمانوں کو اونچی ذات کے ہندوؤں کے برابر نمائندگی دے کر پھسلایا گیا، ۱۹۴۶ء میں وزارتی ن نے ہندو اور مسلم صوبوں کی علیحدہ گروپ بندی کا جال پھیلا کر مسلم لیگ کو پھنسانا چاہا لیکن کانگریس کی ہٹ دھرمی اور تنگ خیالی نے متحدہ ہند کا بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا۔ پہلے ۱۹۴۵-۴۶ء کے انتخابات میں مسلم لیگ ملک بھر میں عدیم النظیر فتح حاصل کر چکی تھی، اب اُدھر بہار میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا اور اس کے چار ماہ بعد اِدھر پنجاب میں مسلمانوں وں نافرمانی کی تحریک شروع ہوئی جس نے دنیا پر ثابت کر دیا کہ مسلمان اب ایک بیدار اور منظم سیاسی جماعت ہیں۔ جناح اجنبی حکمرانوں کی اس فریب کاری، ہمسایہ قوم کے تعصب اور اپنی قوم کی اس عصبیت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اُن کا پاکستان کا عزم پہلے سے اور زیادہ راسخ ہو گیا اور انھوں نے علانیہ طور پر کہہ دیا کہ ہندوستان سلمانوں کے لئے اب صرف دو ہی راستے ہیں —— "پاکستان یا تباہی!"

۳ر جون ۱۹۴۷ء کو برطانیہ نے ہندوستان کے لئے اپنا نیا منصوبہ پیش کیا اور ہندوستان و پاکستان کی آزادی ۱۵ اگست سے تسلیم کر لی۔ مگر پاکستان جو بغیر خون کا قطرہ گرائے زیادہ تر قائد اعظم کی مسلسل مساعی سے قائم ہوا دشمنوں کی نظر میں جلد ایک خار کی طرح کھٹکنے لگا۔ چنانچہ اسے تباہ کرنے کی مختلف طرح کوشش کی گئی، مشرقی پنجاب پانچ چھ لاکھ نہتے مسلمانوں کو بے دریغ قتل کر دیا گیا جس سے ساٹھ لاکھ مسلمانوں کو ہجرت کر کے مغربی پنجاب آنا پڑا، ساتھ ہی کشمیر کا فریب کارانہ الحاق کر کے ہندوستانی ہیں اُس پر قابض ہو گئیں اور جموں میں مسلمانوں کے قتل کا بازار گرم ہوا جس سے مجبور ہو کر پاکستانی فوج اپنے ہم مذہب بھائیوں کی امداد کو کشمیر کی سرحد پر جا پہنچی۔ ادھر چونکہ کستان ابھی ایک نوزائیدہ سلطنت تھی اُسے مختلف نوع کے اقتصادی، معاشرتی اور تعلیمی مسائل سے دوچار ہونا پڑا۔ ان واقعات کے ہوتے یہ قائد اعظم ہی کی ذات ر اُس پر عوام کا کلی اعتماد تھا جس سے پاکستان اپنی تازہ بنیادوں پر مضبوطی سے قائم رہا۔

یہ صورت حال تھی کہ اچانک ۱۱ر ستمبر ۱۹۴۸ء کو قائد اعظم محمد علی جناح عالم بقا کو سدھارے۔ یوں وہ اپنی قوم سے رخصت ہوئے لیکن اس کیلئے اپنی عظیم الشان یادگار چھوڑ گئے پاکستان!

محمد علی جناح ایک زبردست سیرت کے مالک تھے، وہ ہمیشہ اپنے اصول پر سختی سے کاربند رہے سیاسی حلقوں میں ان کا عزم ضرب المثل ہو گیا، مخالفین نے اسے ہٹ پکارا، کے ہزاروں نکتہ چین پیدا ہو گئے بلکہ سچ یہ ہے کہ ایک قوم کی قوم ان کی دشمن ہو گئی لیکن اس سے ان کے ارادوں میں ذرہ برابر بھی فرق نہ آیا۔ نہ عہدے کا لالچ نہ روپے طمع نہ دنیا کی لعن طعن کوئی شے انھیں اپنے جادۂ مستقیم سے اِدھر اُدھر نہ ہٹا سکی۔ بعض لوگوں نے انھیں بدمزاج کہا، بعض نے مغرور، بعض نے ان پر خود پسندی کا الزام لگایا لیکن انھیں نہ ستائش کی تمنا تھی نہ صلے کی پروا، نہ عتاب کا ڈر تھا نہ طاقت کا خوف۔ سچ یہ ہے کہ وہ عدل و انصاف کے سب سے بڑے مؤید اور حق پسندی و راست بازی کے سب سے بڑے مجاہد تھے۔ میدان سیاست میں قدم رکھنے کے بعد دس برس تک انھوں نے آزادی کی راہ میں کانگریس کا ساتھ دیا لیکن جب مسلمانوں کے مطالبات کی سچائی اُن پر واضح ہوئی تو انھوں نے بیس برس اسی کوشش میں گزار دیئے کہ کسی طرح ہندو مسلمانوں میں اور لیگ کانگریس میں مصالحت ہو جائے۔ پھر جب انھوں نے ہزار بار آزما کر دیکھ لیا کہ ہندو لیڈر کسی طرح مسلمانوں کو اِن کے حقوق نہیں دینا چاہتے بلکہ اکھنڈ ہندوستان میں اُن کی جداگانہ ہستی ہی کو ملیا میٹ کر دینا چاہتے ہیں جب انھوں نے اس خطرے کو بھانپ لیا تو وہ خود سب سے بڑے "فرقہ پرست" بن گئے اور انھوں نے مسلمانوں کی علیحدگی پر اصرار کیا اور کہا کہ پاکستان مسلمان قوم کے لئے زندگی اور موت کا سوال ہے! پاکستان کی ہفت سالہ جنگ میں محمد علی جناح نے سر دھڑ کی بازی لگا دی اور اپنی بے نظیر قابلیت اور جرأت اور استقلال سے آخر یہ میدان مار لیا۔

جناح کی قانونی و سیاسی قابلیت مسلمہ تھی۔ یہ اُن کی غیر معمولی ذہانت اور مسلسل محنت کا نتیجہ تھی۔ ان کی تقریر اور مباحثہ کی صلاحیت بے نظیر تھی۔ اُن کا لہجہ کبھی پرسکون ہوتا کبھی پرجوش، اُن کی زبان سادہ تھی اور پُر زور۔ اس پر اُن کی قوت تجزیہ اور تنقیدی بصیرت سونے پہ سہاگہ کا کام دیتی تھی۔ محمد علی جناح کو مسلمانوں کے مستقبل پر کامل اعتماد تھا اور اپنی قوم سے بے حد محبت تھی۔ وہ کسی کی رعایت نہ کرتے تھے، قومی مفاد کے سامنے وہ ذاتی لحاظ کو کبھی خاطر میں نہ لاتے، اسی لئے بالخصوص پچھلے چند برس میں اُن کی ذاتی زندگی عموماً ایک طرح کی تنہائی میں گزری لیکن اس تنہائی کو انھوں نے خود شاید کم ہی محسوس کیا ہو، وہ آخر تک روز و شب قومی کاموں میں منہمک رہے اور یہی کام کرتے کرتے انھوں نے خوشی سے جان دے دی!

بلاشبہ محمد علی جناح دُنیا کی عظیم ترین ہستیوں میں سے تھے!

بشیر احمد

قائدِ اعظمؒ

اُف وہ دُھندلائی ہوئی گرد سے ہر سمت فضا — کہیں ملتا نہ تھا منزل کا ہمیں کوئی سراغ
دُور تک ایک گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا تمام — کوئی رہبر تھا نہ رستہ نہ ستارا نہ چراغ
دفعتہً ایسے میں اک پیرِ جواں فکر اُٹھا — مشعلِ راہ بنی جس کی جبینِ بے داغ
تلخیٔ دردِ گراں بار کا افسوں ٹوٹا — اور مہکنے لگے ہر سمت بیابان کہ راغ

قافلے چلنے پہ آجائیں تو رُکتے کب ہیں — لاکھ طوفان اُٹھیں لاکھ دُھندلکے چھائیں
جھلملاتے بھی ہیں بجھتے بھی ہیں محفل میں دیئے — یہ مگر تاروں کے پرچم کہ سدا لہرائیں
یہی جھونکے ہیں جو پھولوں کو سلا دیتے ہیں — یہی جھونکے ہیں جو پیغامِ بہاراں لائیں
زندگی بڑھتے ہوئے تند تھپیڑوں کا ہے نام — آؤ اے زخم رسیدو! کہ کہیں ٹکرائیں

کیا ہُوا آج اگر قائدِ اعظم نہ رہا — بڑھ کے ان تیرہ فضاؤں میں اُجالا کر دو
آرزو آہوں سے اشکوں سے نہیں ہے مربُط
اپنے پرچم کو ستاروں سے بھی اونچا کر دو

اختر ہوشیار پوری

پاکستان کی بنیادیں بہت گہری ہیں

بعض عظیم الشان ہستیوں کو یہ منفرد شرف حاصل ہوتا ہے کہ ان کی ذات ان کی قوم، ملک اور اداروں کے ساتھ ایسی مماثلت کامل اختیار کر لیتی ہے کہ لوگ آخر الذکر کی بجائے اول الذکر کا نام لینا کافی سمجھتے ہیں اور ایسے اشخاص کو جو صدمہ پہنچتا ہے، اسے ان کی قوم یا ملک کے صدمے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ مماثلت کامل بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ اور اس کی شدت کے ساتھ ساتھ ملک و قوم کی نفسیات پر ایسے اشخاص کے ذاتی واردات کا اثر بھی شدید اور شدید تر ہوتا جاتا ہے۔ اس مماثلت کا ایک کم روشن پہلو یہ ہے کہ یہ سطحی نظر رکھنے والوں کے لئے اس حقیقت کو فراموش کرنا ممکن بنا دیتی ہے کہ کسی قائد کی حیات اور اس کی قوم کی بقا لازم و ملزوم نہیں ہیں۔

قائد اعظم محمد علی جناح بھی ان معدودے چند ہستیوں میں سے تھے جنہیں ایک پوری قوم تصور کیا جا سکتا ہے اور کیا جا رہا ہے۔ وہ پاکستان کے بانی و معمار اور اسے تصور کی دنیا سے واقعیت کے عالم میں لانے والے تھے۔ ان کے فقید المثال عزم و ثبات اور ان کی مسلسل قربانیوں اور ان تھک کوششوں نے عالم اسلام کی سب سے بڑی سلطنت کو خلعت وجود عنایت کیا اور دنیا محمد علی جناح اور دس کروڑ مسلمانان ہند کو ایک ہی چیز سمجھنے لگی۔ آج تک کسی سلطنت کے بانی کو اپنی ریاست سے وہ مماثلت حاصل نہیں ہوئی جو قائد اعظم کو نصیب ہوئی ہے۔ اور آج سے دو سو برس کے بعد بھی جب کوئی شخص پاکستان کا ذکر کرے گا۔ تو اس کے ساتھ ہی اس کی زبان پر قائد اعظم کا نام آئے گا۔ یہی وجہ ہے کہ آج جبکہ باری تعالیٰ نے انہیں ہمارے درمیان سے اٹھا لیا ہے، ہم عجیب قلق و اضطراب کے عالم میں ہیں۔ اکثر مسلمان سوچتے ہیں کہ اب ہمارا پاکستان کا ملت ہندیہ اسلامیہ کا کیا حشر ہوگا۔ غیر مسلموں کا رد عمل جو پاکستان کے وجود کی صحت اور لابدیت کے کبھی پوری طرح قائل ہو ہی نہیں سکے زیادہ واضح ہے۔ ہمارے ہمسایہ مملکت اور دیگر مغربی اقوام کے اکثر افراد یہی سمجھتے ہیں کہ پاکستان کی بقا قائد اعظم کی حیات پر منحصر تھی اور اب اس کی تباہی یقینی ہے۔ اس جماعت کا ایک اہم مظاہرہ قائد اعظم کی وفات حسرت آیات کے چند گھنٹے بعد ہی کیا گیا۔ رائیٹر نیوز ایجنسی نے ۱۲ ستمبر کو خبر دی کہ "امریکہ کے سیاسی حلقوں میں یہ امر موضوع بحث بنا ہوا ہے کہ آیا قائد اعظم کی وفات کے بعد تقسیم ہند برقرار رہ سکے گی یا نہیں" بی۔ بی۔ سی سے تبصرہ کیا گیا کہ "اب پاکستان میں مسٹر جناح کی قوت عمل رکھنے والا کوئی آدمی نہیں جو اس ملک کو سنبھال سکے۔" رینالڈ نیوز نے رائے ظاہر کرتے ہوئے کہا: "مسٹر جناح کے بعد پاکستان کی بقا کے بارے میں سخت شبہ ہے۔ اس کا وجود ہی ناقابل تصور معلوم ہوتا ہے۔"

فی الحقیقت اس مغالطے کی اساس اس بے بنیاد تصور پر ہے کہ دو قوموں کا نظریہ قائد اعظم کے دماغ کی ایجاد ہے، پاکستان کا منصوبہ انہی کی فکر رسا کا مرہون منت ہے۔ انہوں نے ہی مسلمانوں کی انفرادی قومی حیثیت کا جس کا فی الاصل کوئی وجود نہیں نعرہ بلند کیا اور ایک اقلیتی فرقے کے لئے ایک علیحدہ ریاست حاصل کر کے ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔ "ہندوستان ٹائمز" قائد اعظم کو خراج تحسین ادا کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "انہوں نے خوابوں کو حقیقت بنا دیا اور حقیقتوں کو خواب" کچھ مسلمانوں کا بھی یہی خیال ہے لیکن اگر بانی پاکستان کی سب سے بڑی تعریف یہی ہے کہ انہوں نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا تو یہ تعریف نہیں تنقیص ہے کیونکہ ناممکن شے کبھی ممکن نہیں ہو سکتی اور اس قسم کا تصور شاعرانہ مبالغے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ قائد اعظم کی صحیح عظمت اس حقیقت میں مضمر ہے کہ انہوں نے انفرادی قومی حیثیت کے اس احساس کو جو اسلام کے اصل اصول میں سے ہے اور جو مسلمانوں کے دلوں سے کلیتاً کبھی زائل نہیں ہوا ابھارا اور اسے شدید تر صورت دی اس سے پیشتر وہ جمود کی حالت میں تھا۔ لیکن قائد اعظم کی اللہ نے اس کے لئے قلم باذن اللہ کا کام کر دکھایا۔

پاکستان اس حقیقت کی ایک ٹھوس صورت ہے کہ مسلم و غیر مسلم کا اتحاد ناممکن العمل ہے۔ مسلمان اپنی ہستی کو غیر مسلموں میں مدغم نہیں کرسکتا اور اس کی بنیاد اسلام کی صریح تعلیمات پر ہے۔ اسلام بنی نوع انسان کو دو فریقوں میں منقسم کرتا ہے ایک فریق وہ ہے جو دین حق کا قائل ہے اور دوسرا وہ جو اس سے منکر ہے انہی کو فریق فی الجنۃ و فریق فی السعیر کا نام دیا گیا ہے۔ اسلام اس تقسیم کے علاوہ کسی دوسری تقسیم کا قائل نہیں رنگ نسل حسب و نسب اور جغرافیائی حدود اس کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ ایک مسلمان اور دوسرے مسلمان میں واحد وجہ مشترک اسلامی اصول و عقائد ہیں۔ تمام مسلمان خواہ وہ عربی ہوں یا عجمی۔ ترکی ہوں یا چینی۔ یورپی ہوں یا افریقی ایک دوسرے سے کسی قسم کا رشتہ یا تعلق نہ رکھنے کے باوجود بھائی بھائی ہیں اور ان کا ان تمام اشخاص سے جو اسلام کے منکر ہوں کوئی واسطہ نہیں خواہ وہ ان کے والدین ہوں یا بھائی بہن۔ قریبی ہمسائے ہوں یا عزیز ترین رشتہ دار۔ اسلام اپنے ہر پیرو سے یہ مطالبہ کرتا ہے۔ کہ وہ اپنے اور غیر مسلموں کے درمیان ایسی ہی حد فاصل کھینچ دے جیسی ابوبکرؓ نے اپنے اور اپنے بیٹے کے درمیان کھینچ دی تھی۔ ان کے ایک صاحبزادے نے اسلام قبول کرنے کے بعد ایک روز ان سے کہا کہ میں جنگ بدر میں آپ کے مقابل ہوا تھا۔ اگر میں چاہتا تو آپ کو قتل کر ڈالتا لیکن میں نے رعایت پدری کو ملحوظ خاطر رکھا۔ ابوبکرؓ نے فرمایا اگر تم میرے بس میں ہوتے تو میں تمہیں کبھی زندہ نہ چھوڑتا۔ یہ امتیاز رواداری و مدارات کے منافی نہیں ہے غیر مسلموں سے مہربانی و برابری کا برتاؤ کرنا از بس ضروری ہے اور دنیاوی امور میں ان سے اشتراک عمل میں کوئی ہرج نہیں لیکن کسی ایسے مقصد کے لئے جو جماعت ملی پر اثر انداز ہو ان سے اتحاد یا ان میں ادغام ہرگز جائز نہیں۔ اور یہی عالمگیر وحدت اسلامیہ پاکستان کی تخلیق کا موجب ہوئی ہے اور اسی لئے پاکستان کا موقف غیر مسلم اقوام کی سمجھ میں نہیں آتا خواہ وہ مشرقی ہوں یا مغربی۔

اس انفرادیت نے اسلام کو ایک مخصوص کلچر دیا جو اپنی ممتاز خصوصیات اور واضح تعریفات کے باوجود اتنا درجہ وسیع۔ لامحدود اور لچکدار ہے یہ کلچر جہاں بھی پہنچا وہاں کی پرانی ثقافت پر چھا گیا۔ اور ہر قدیم تہذیب پر اسلامی تہذیب کی نہ مٹنے والی مہر لگ گئی۔ مصر عراق۔ ایران۔ شام وغیرہ سب پرانی تہذیبوں کے گہوارے تھے لیکن نصف صدی کے عرصے میں ہی اسلامی کلچر نے انہیں اپنے رنگ میں کچھ اس طرح رنگ دیا کہ آج تک وہ صورت مٹنے نہیں پائی ہزارہا سالہ قدیم روایات مٹ گئیں اور ماحول یکسر بدل گیا۔ مغربی تہذیب کے بادل نے ظاہری شکل میں قدرے تغیر ضرور پیدا کیا ہے۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ ان ممالک کی ثقافت آج بھی اسلامی ثقافت نہیں ہے گرد وہ کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو اور جالے کتنے ہی پڑے کیوں نہ ہوں یہ ذرا نہ ہٹائیے تو اسلام کی جوہری خصوصیات آج بھی جھلکتی نظر آئیں گی۔

لیکن بدقسمتی سے ہندوستانی تہذیب پر اسلامی ثقافت کا ٹھپہ کما حقہ نہیں لگ سکا۔ اور اسی لئے پاکستان کی ضرورت پیش آئی۔ ہندوستان میں اسلام وہ ہمہ گیر انقلاب نہیں پیدا کرسکا۔ جو اس نے اور ملکوں میں کر دکھایا۔ اور اس کی وجہ یہی تھی۔ کہ ہندی تہذیب اسلامی کلچر سے پوری طرح متاثر نہیں ہوئی۔ اور جہاں بھی یہ صورت حال رہی اسلام اپنی شان صحیح طریق پر برقرار رکھ سکا چین کی مثال سامنے ہے۔ وہاں بھی اسلام کو چینی تہذیب کو تسلی بخش طریق پر متاثر کرنے کا موقعہ نہیں مل سکا اسی لئے چینیوں میں وہ انفرادیت نہیں پیدا ہوئی جو ہندوستانی مسلمانوں میں ہے۔ ہندوستان میں اسلام کی اس ناکامی کی متعدد وجوہات نہیں جن میں فاتح مسلمانوں کا ترک یا تاتاری قوموں سے تعلق رکھنا جو زیادہ راسخ العقیدہ نہ تھیں۔ اور تبلیغ اسلامی کا ناکافی انتظام زیادہ نمایاں ہیں۔ اسلام ہندوستان میں ایک ایسی تہذیب سے مقابل ہوا جس کی بنیاد ذات پات۔ چھوت چھات۔ عدم مساوات۔ محدودیت اور تنگ نظری پر تھی۔ جبکہ اسلامی ثقافت کا اصل اصول اخوت و مساوات تھا۔ اگر مسلمان بادشاہ تبلیغ کی طرف پوری توجہ دیتے اور اس تندہی کے شمہ کا بھی اظہار کرتے جس سے عیسائی تبلیغی انجمنیں کام کرتی ہیں۔ تو کوئی وجہ نہ تھی۔ کہ ہندوستان میں بھی مصر و عراق کی تاریخ نہ دہرائی جاتی اور یہاں بھی اسلامی اکثریت وجود میں آجاتی اگر ایسا ہو جاتا تو پاکستان کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا لیکن مسلمان بادشاہ بقول آزاد ملک ترک و تاتاری تھے جنہیں خود بھی پیغمبر عرب کے دین پر زیادہ اعتقاد نہیں تھا۔ انہوں نے زیادہ توجہ ملک گیری یا عیش کوشی کی طرف دی حتیٰ کہ اورنگزیب جیسے شخص نے بھی تبلیغ کا کوئی باقاعدہ انتظام نہیں کیا عام ہندوؤں نے مسلمانوں کو صرف فاتحوں بادشاہوں اور عیاشیوں کی حیثیت سے دیکھا اور ان پر اسلام کی سچائی ظاہر نہ ہو سکی۔ تبلیغ اسلام کے متعلق جو فرائض تھے بھی سر انجام دیئے صوفیائے کرام نے دیئے۔

اسلام کی عدم تبلیغ نے ہندوؤں کو موقعہ دیا کہ وہ چھوت چھات کے آہنی دائرے کو اور تنگ کریں اور انہوں نے مسلمانوں کے خلاف مختلف طریقوں سے نفرت

پھیلا کر اپنے قومی وجود کو قائم رکھا۔ چنانچہ آج ہندو اپنے مذہب کی قوت مزاحمت پر ناز کرتے ہیں لیکن یہ فی الحقیقت مسلمانوں کی غفلت کا نتیجہ ہے۔ چھوت چھات کا یہ چکر اچھوتوں کے سلسلے میں زیادہ کامیاب نہیں ہو سکا اور انھوں نے جوق در جوق اسلام قبول کر لیا۔ دوسرے ہندو قوم اکال الامم مشہور تھی اور مسلمانوں سے پہلے آنے والے تمام حملہ آوروں کو اپنے اندر جذب کر چکی تھی۔ اس نے مسلمانوں کو بھی حتی المقدور نگلنے کی کوشش کی لیکن اس میں کامیاب نہ ہو سکی گو اس کی قربت و ہمسائگی نے بہت سے اسلامی اصولوں کی صورت مسخ کر دی اور مسلمانوں میں مختلف قسم کی خرافات جاری کر دیں۔ اس ناکامی اور مسلمانوں کے سیاسی غلبے نے اس کی آتش نفرت کو اور بھی تیز تر کر دیا جو آج تک نہیں بجھ سکی اور نہ ہی بجھ سکتی ہے۔ اس زاویہ نظر کے شدید اختلاف کے باعث ہندو مسلمانوں میں ہمیشہ باہمی آویزش رہی اور اسلامی ہند کی تاریخ میں کوئی دور ایسا نہیں گزرا جس میں دونوں قوموں میں اتحاد تو کجا قابل ذکر مفاہمت بھی ہو سکی ہو۔ ہر زمانے میں اسلامی اقتدار کے خلاف بغاوت ہوئی اور حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کی گئی اور اس قسم کی کوششیں کرنے والے ہی ہندوؤں کے ہیرو ہیں خواہ وہ رانا پرتاپ ہو یا سیواجی مرہٹہ۔ اکبر کے زمانے میں جو مصنوعی ملاپ کی جھلک نظر آتی ہے اس کی حقیقت بھی فقط یہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنی مذہبی و قومی خصوصیات کو خیرباد کہہ دیا تھا اور ہندو تہذیب کی طرف مائل ہو گئے تھے ورنہ مسلمان اپنے مذہب پر قائم رہ کر کبھی ہندو سے اتحاد نہیں کر سکتا۔ اسلامی اقتدار کے زوال کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کی نفرت بھی شدید تر ہوتی گئی اور اس نے زیادہ جارحانہ صورت اختیار کر لی مرہٹے اور سکھ خواہش انتقام ہی کے دو روپ تھے۔ یہ جارحانہ ذہنیت مرہٹہ شہنشاہیت اور سکھا شاہی کی شکل اختیار کر کے اسلامی ہند کی تباہی کے درپے ہوئی لیکن احمد شاہ ابدالی نے اس خواہش کو خاک میں ملا دیا اور اسلامی اقتدار کا زوال مرہٹوں اور سکھوں کی شورہ پشتیوں کے ایک ناگوار وقفے کے بعد انگریزوں کے عروج پر منتج ہوا۔ ایک تیسرے عنصر کی حکومت اور سیاسی اقتدار کے فقدان نے اب اس عداوت کو ایک نیا رنگ دیا۔ انگریز مسلمانوں سے خوف زدہ اور بدظن تھا کیونکہ وہ اس کا جانشین یا زیادہ صحیح الفاظ میں اس کے حق کا غاصب تھا۔ اس لئے اس نے ہندو کو ترقی کے تمام مواقع دیئے اور آخرالذکر نے بھی اسے اپنے سابق فاتح سے بالواسطہ طریق پر انتقام لینے کا اچھا ذریعہ خیال کیا چنانچہ اس نے زندگی کے ہر میدان پر قبضہ کر لیا اور مسلمان کچھ انگریزوں کے عتاب کی وجہ سے کچھ اپنے اقتدار کے خاتمہ کے غم کے باعث اور کچھ غیر ملکی تسلط سے نفرت کے سبب پیچھے رہ گئے۔ اس نصف صدی نے مسلمانوں کو معاشی اقتصادی صنعتی سیاسی ہر طریق پر ہندوؤں کا دست نگر کر دیا۔ بیسویں صدی کے آغاز نے ایک نئے انقلاب کو جنم دیا ہندوستانیوں میں بیداری اور خودی کا احساس پیدا ہونے لگا۔ اپنے ملک پر خود حکومت کرنے کی خواہش نے پر پرزے نکالے اور مسلمانوں کیلئے آزمائش کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ اب تک ہندو انگریزوں کے لاڈلے تھے اور مسلمان معتوب اس لئے ہندوؤں کا صرف معاشی و اقتصادی میدانوں پر قبضہ تھا۔ لیکن اب انھیں سیاسی استیلا کی بھی سوجھی۔ جمہوریت کے جدید اصولوں کی وجہ سے ان کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ وہ اکثریت میں ہونے کی وجہ سے ہندوستان کے حاکم ہو سکتے ہیں اور مسلمانوں سے جو حساب چکانا باقی رہتا ہے اس طریق پر احسن طریق سے چکایا جا سکتا ہے چنانچہ ہندو شہنشاہیت کا خیال پھر ان کے دل میں کروٹیں لینے لگا اور دبی ہوئی امنگیں پھر ابھرنے لگیں یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندوؤں کو اپنی قدیم عظمت کی نیم حقیقی اور نیم فرضی داستانوں پر اتنا یقین راسخ ہے کہ ان کا اعتقاد کبھی متزلزل نہیں ہو سکتا۔ ان کی نگاہ ہمیشہ قدیم تاریخ ہند کے اس زمانے پر لگی رہتی ہے جب ہندوستان پر چندر گپت یا اشوک کا راج تھا یا جب افغانستان ہندوستان کا ایک حصہ تھا۔ وہ تاریخ کو دوبارہ دہرانا چاہتے ہیں خواہ یہ بظاہر کتنا ہی ناممکن کیوں نہ ہو ان کا دماغ اس حقیقت کی طرف متوجہ نہیں ہوتا کہ اس زمانے کے حالات بالکل مختلف تھے اور ہندو سلطنتوں کی بقا غیر ممالک کی ہندوستان کی طرف سے کم و بیش بے پروائی کا نتیجہ تھی۔ بہرحال انھوں نے سیاسی اقتدار کے دوبارہ حصول کے لئے جدوجہد شروع کی اور کامیابی کیلئے نہایت چالاکی سے زمین ہموار کی۔ انھوں نے مسلمانوں کیلئے متحدہ قومیت کا دام ہمرنگ زمین بچھایا اور انھیں یہ کہہ کر تسکین دینے کی کوشش کی کہ ہم تم ایک ہی قوم سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے ہمارا راج بھی تمھارا ہی راج ہوگا۔ حالانکہ وہ اپنے ہزار سالہ عمل سے اس متحدہ قومیت کی صریح تکذیب کر چکے تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کو ہمیشہ اچھوتوں سے بدتر سمجھا ان سے کبھی مساویانہ برتاؤ نہیں کیا انھیں غیر ملکی، غاصب حملہ آور جور اور ڈاکو سمجھا اور ایسے لوگوں کو اپنا ہیرو بنایا جنھوں نے اسلامی اقتدار کے استیصال کے لئے سرتوڑ کوششیں کیں۔ پھر بھلا متحدہ قومیت پر کون یقین کر سکتا تھا جب کہ قوم کی

اقرب بہ صحت تعریف یہ ہو کہ "وہ ایک زندہ روح اور ایک روحانی اصول ہے۔ اس کے پاس قدیم روایات کا مشترکہ ورثہ ہوتا ہے۔ اکٹھے رہنے اور مشترک ورثہ کو برقرار رکھنے کی آرزو ہوتی ہے۔ وہ کوششوں قربانیوں اور عقیدت کے ایک طویل ماضی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ پرانی سنہری روایتوں کا سرمایہ سنبھال کر رکھنے اور مشترکہ قوت ارادی کے مظاہرے کی خواہش۔ مل جل کر بڑے بڑے کارنامے کر چکے ہونے اور آئندہ بھی ایسے جوہر دکھلانے کی آرزو متحدہ قومیت کی تشکیل کے لئے لابدی ہیں۔ متحدہ قوم کے افراد آپس میں اُلفت اور دیگر اقوام سے اسی تناسب کے مطابق بغض رکھتے ہیں" ہندوؤں اور مسلمانوں میں ان امور میں سے ایک امر بھی مشترک نہیں۔

یہ فریب کچھ دنوں ضرور کارگر رہا حتیٰ کہ بانیٔ پاکستان بھی ابتدا میں اسی غلط فہمی میں مبتلا رہے کہ ہندوؤں کی نیت نیک ہے لیکن جس طرح یہ بھید کچھ دوسرے لوگوں پر کھل گیا تھا ان پر بھی منکشف ہو گیا۔ ہندوؤں کی اس ذہنیت نے مسلمانوں میں بھی بیداری پیدا کی اور انھیں اپنی انفرادیت کے اس اُصول کا جسے وہ مدت ہوئی بھول چکے تھے۔ پھر احساس کرایا۔ مسلمانوں کی اس بیداری نے ہندوؤں کے جذبۂ عناد کو اور بھی شدید کر دیا۔ جب تک مسلمان چپ تھے ہندو بھی خاموش تھے کیونکہ انھیں بے مزاحمت انتقام لینے کا موقع مل رہا تھا لیکن مسلمانوں کے احساس حقیقت نے ان کے سنہرے خوابوں کو درہم برہم کر دیا اور وہ جنگ شروع ہوئی جسے پاکستان کی جدوجہد کہتے ہیں۔ یہ ایک تاریخی چیز ہے اور اس کا بیان تحصیل حاصل۔ جو بات اہم ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنی انفرادی قومی ہستی ثابت کر دی اور اپنے لئے ہندوستان کا ایک ٹکڑا حاصل کر لیا۔ اس طرح اسلام نے ہندوستان میں تین دور دیکھے۔ اقتدار کا دور۔ انگریز کی غلامی اور ذہنی انحطاط کا دور۔ بیداری اور سیاسی اقتدار کے دوبارہ حصول کا دور۔ اس طرح یہ ثابت ہو گیا کہ پاکستان اسلام کی بنائی ہوئی ایک نہایت اہم حقیقت کی ٹھوس شکل ہے اور مسلمانانِ ہند کی دیرینہ آرزو کی تکمیل۔ یہ قائداعظم کی اختراع نہیں وہ صرف اس کے بانی ہیں اور انھوں نے اپنی کوشش اور خدا کی اعانت سے اسلام کے ایک ضروری مطالبے کو عملی صورت دی ہے۔ یہ خواب ہرگز نہ تھا گو مسلمانوں کے انحطاط کے باعث اس کا حصول بظاہر ناممکن نظر آتا تھا اس لئے جو لوگ اس وہم میں مبتلا ہیں کہ پاکستان کی بقا کا انحصار قائداعظم کی حیات پر تھا وہ قائداعظم کے ساتھ انصاف کر رہے ہیں نہ پاکستان کے ساتھ۔ پاکستان مسلمانوں کے ایک اہم عقیدے کا روپ ہے اور جب تک اسلام یا مسلمانوں کی انفرادی قومی حیثیت کا عقیدہ زندہ ہے پاکستان کی تباہی یا موت کی بھی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ دشمنان اسلام کی یلغار یا خود غرض مسلمانوں کی غداری اس کی حدود میں تغیر و تبدل یا اس کے عارضی اختلال کا باعث ہو لیکن اسے دنیا سے نہیں مٹایا جا سکتا۔ پولینڈ کئی مرتبہ مٹا اور کئی مرتبہ بنا لیکن آج بھی پولینڈ پولینڈ ہی ہے۔ جب ایک ایسے ملک کا یہ حال ہے جس کی تخلیق میں مذہبی و نفسیاتی عقاید و حقائق نے کوئی خاص حصہ نہیں لیا۔ تو پاکستان کا وجود کیونکر محو کیا جا سکتا ہے جب یہ مسلمانوں کے دل پر نقش فی الحجر ہے۔ فوجی تسخیر کسی ملک کو عارضی طور پر تباہ کر سکتی ہیں لیکن جب تک قوم میں جذبۂ آزادی باقی ہے اسے ختم نہیں کر سکتیں، آج مسلمانانِ پاکستان کی بہت بڑی اکثریت پاک کے لئے زندگی اور موت کا کھیل کھیلنے کے لئے تیار ہے پھر اس کے خاتمے کی پیش گوئی کیونکر کی جا سکتی ہے۔ جب تک ملت کا دل بحیثیت مجموعی صحیح و سالم ہے پاکستان زندہ ہے اب انفرادی قومی ہستی کا تصور اسلامی اقتدار کے عہد کے تصور سے زیادہ مستحکم اور پائدار ہے۔ حکومت کے زمانے میں ہم بے پروائی کا ثبوت دیتے رہے اور عیش و عشرت میں مشغول رہے اپنی انفرادی حیثیت ثابت کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ سوائے حضرت مجدد الف ثانیؒ اور چند دیگر بزرگوں کے کسی کو جداگانہ قومیت کا شدید احساس نہیں ہوا لیکن اب انگریز کی ڈیڑھ سو برس کی غلامی اور ذہنی انحطاط سے پیدا شدہ تباہی نے ہمیں بہت چوکنا کر دیا ہے اور پنجاب و دہلی کے قتل عام نے ہماری آنکھیں کھول دی ہیں ہم نے ہندو کو اس کے اصلی رُوپ میں دیکھ لیا ہے۔ سر رادھا کرشنن کی زبان سے ہندو روحانیت اور گاندھی کے مُنہ سے اہنسا پرمو دھرما کا نعرہ لگانے والا ہندو در اصل وہی برہمن ہے جو محض وید کے ۔۔۔ لفظ کے جرم میں شودر کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈالتا ہے اس کی جوع الارض اور شہنشاہیت پرستی کا برہنہ رقص ہم کشمیر و حیدر آباد میں دیکھ رہے ہیں۔ یہ حقائق ہمیں کبھی فراموش نہیں ہو سکتے اور اسلام کی عزت کو برقرار رکھنے کی خواہش کبھی سُست نہیں پڑ سکتی۔

جب تک یہ جذبہ موجود ہے قائداعظم بھی زندہ ہیں اور پاکستان بھی زندہ ہے!

پروفیسر عبدالغفار

رازداں رخصت ہُوا

لُٹ گئی ہے گلشنِ اسلام کی رنگیں بہار
چھن گئی اہلِ حرم سے دولتِ صبر و قرار

بجھ گیا ہے آج اپنی بزم کا روشن چراغ
بڑھ رہے ہیں یاس کے سائے قطار اندر قطار

کھو دیا ہے ایشیا نے اپنا فرزندِ عظیم
ذرّے ذرّے کے دلِ مضطر سے اُٹھتا ہے غبار

ہو گیا خورشیدِ مشرق آج پنہاں زیرِ خاک
ہے فضا میں ہر طرف تاریکیٔ غم آشکار

چار سو برپا ہے اک فریاد پاکستان میں
رو رہے ہیں مرد و زن پیر و جواں بے اختیار

آہ وہ سالارِ ملت! آہ وہ معمارِ قوم
آہ وہ اسلام کی عظمت مسلماں کا وقار

وہ ہمارا قائدِ اعظم، ہمارا رہنما
وہ تمناؤں کا مرکز۔ وہ دلوں کا تاجدار

ہو گئی ہے آج ساری قوم پاکستاں یتیم
اُٹھ گیا ہے سر سے بابائے شفیق و غم گسار

شمع روشن تھی تو پروانے بھی محوِ رقص تھے
جل بجھے ہیں شمع گُل ہونے پہ ہم پروانہ وار

فرطِ درد و غم سے بوجھل ہو رہی ہے کائنات
ہم نہیں روتے ہیں تنہا۔ رو رہی ہے کائنات

آج ملّت چُپ ہے۔ ملّت کی زباں خاموش ہے
کارواں گم سُم ہے۔ میرِ کارواں خاموش ہے

جس کے دم سے تھے جوان و پیر ہنگامہ طراز
آج وہ پیرانہ سالی میں جواں، خاموش ہے

جس کا اک اک لفظ گرماتا رہا اپنا لہُو
آج وہ آتش زباں جادو بیاں خاموش ہے

جس کی دھڑکن سے کروڑوں دھڑکنیں وابستہ تھیں
وہ دلِ دیوانۂ اسلامیاں خاموش ہے

جس نے بخشا تھا ہمیں اپنے تدبّر سے وطن
آج وہ اپنے وطن کا پاسباں خاموش ہے

ہم نشیں کس کو سُنائیں داستانِ دردِ دل
داستانِ درد، دل کا ترجماں خاموش ہے

ہو سکے گی دل میں کیا بیدار کوئی آرزو
آج اپنی آرزوؤں کا جہاں خاموش ہے

اک سکوتِ مرگ طاری ہو گیا ہے قوم پر
قوم کی جاں۔ قوم کی روحِ رواں خاموش ہے

رازِ ہستی کا بتا کر رازداں رخصت ہُوا
پھول برسا کر چمن سے باغباں رخصت ہُوا

کرم حیدری

مِلّت کا پاسباں ہے محمدؐ علی جناح

مِلّت کا پاسباں ہے محمد علی جناح ۔۔۔ مِلّت ہے جسم، جاں ہے محمدّ علی جناح

صد شکر پھر ہے گرمِ سفر اپنا کارواں ۔۔۔ اور میرِ کارواں ہے محمدّ علی جناح

بیدار مغز، ناظمِ اسلامیانِ ہند ۔۔۔ ہے کون؟ بیگماں ہے محمدّ علی جناح

تصویرِ عزم، جانِ وفا، روحِ حُرّیت ۔۔۔ ہے کون؟ بے گُماں ہے محمدّ علی جناح

رکھتا ہے دل میں تابِ وتواں نو کروڑ کی ۔۔۔ کہنے کو ناتواں ہے محمدّ علی جناح

رگ رگ میں اس کی ولولہ ہے حُبِ قوم کا ۔۔۔ پیری میں بھی جواں ہے محمدّ علی جناح

لگتا ہے ٹھیک جاکے نشانے پہ اُس کا تیر ۔۔۔ ایسی کڑی کماں ہے محمدّ علی جناح

مِلّت ہوئی ہے زندہ پھر اُس کی پکار سے ۔۔۔ تقدیر کی اذاں ہے محمدّ علی جناح

غیروں کے دل بھی سینے کے اندر دہل گئے ۔۔۔ مظلوم کی فغاں ہے محمدّ علی جناح

اے قوم! اپنے قائدِ اعظم کی قدر کر ۔۔۔ اِسلام کا نشاں ہے محمدّ علی جناح

عُمرِ دراز پائے، مُسلماں کی ہے دُعا
مِلّت کا ترجماں ہے محمدّ علی جناح

بشیر احمد

یہ نظم آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ (پاکستانی) اجلاس منعقدہ لاہور ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء میں میاں بشیر احمد (سکرٹری مجلس استقبالیہ) کی طرف سے پیش کی گئی تھی

قائداعظم محمد علی جناح
کی
زندگی کے اہم واقعات

سنہ ۱۸۷۶ء:- پیدائش: ۲۵ دسمبر (بروز کرسمس) اُن کے والد ایک متموّل خوجہ تاجر تھے۔ ابتدائی تعلیم: سندھ مدرسے میں داخل ہوئے جہاں اُنھوں نے قرآن مجید بھی پڑھا پھر مشن ہائی سکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا (سنہ ۱۸۹۲ء)

۹۶-۱۸۹۲ء:- انگلستان میں تقریباً چار سال قیام جہاں بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔

سنہ ۱۸۹۶ء:- واپس آکر کراچی میں وکالت شروع کی۔ اس وقت اُن کے والد کی مالی حالت بہت تنگ تھی لیکن نوجوان بیرسٹر نے محنت کرنے اور کامیاب ہونے کا مصمم ارادہ کر لیا۔

۱۸۹۷ء:- بمبئی جا کر کام شروع کیا اور باوجود ابتدائی ناکامیوں کے مسلسل محنت کی۔ آٹھ دس سال میں اُن کی آمدنی خاصی ہو گئی۔ سنہ ۱۹۰۶ء میں وہ بمبئی ہائیکورٹ کے ایڈووکیٹ ہو گئے اور بتدریج ہندوستان کے مشاہیر وکلا میں شمار ہونے لگے۔

سنہ ۱۹۰۶ء:- دادا بھائی نوروجی کے پرائیویٹ سکریٹری بن گئے اور سیاسیات میں حصّہ لینے لگے۔ چنانچہ اسی سال انھوں نے کلکتہ کانگرس میں "وقف علی الاولاد" کے موضوع پر اپنی پہلی پبلک تقریر کی۔ وہ دل سے کانگرسی ہو کر اعتدال پسندوں کے ساتھ مل کر سیاسی کام کرنے لگے۔

سنہ ۱۹۰۹ء:- بمبئی کے مسلم حلقے کی طرف سے امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے ممبر منتخب ہوئے۔ کونسل اور بعد میں مرکزی اسمبلی کے مباحثات میں نمایاں حصّہ لیا اور اپنی فصیح البیانی دلیری اور آزادیٔ رائے کے لئے مشہور ہو گئے۔

سنہ ۱۹۱۰ء:- ہندو مسلم اتحاد کانفرنس میں حصّہ لیا (دسمبر سنہ ۱۹۱۰ء و جنوری سنہ ۱۹۱۱ء) جو ناکام رہی۔ اس وقت سے لے کر تاحال ایک عمر اسی جستجو میں گزار دی کہ کسی طرح ان دو قوموں میں باعزت سمجھوتہ ہو جائے۔ گوکھلے نے انھیں "ہندو مسلم اتحاد کا سفیر" کہا۔

سنہ ۱۹۱۲ء:- مسلم لیگ کی درخواست پر لیگ کونسل میں شرکت کی جہاں لیگ کے دستور میں یہ اہم تبدیلی تجویز کی گئی کہ اب لیگ کا مطمحِ نظر "سلف گورنمنٹ" ہوگا۔

سنہ ۱۹۱۳ء:- امپیریل کونسل میں اپنا اوقاف بل پیش کیا۔ یہ ایک غیر سرکاری ممبر کا پہلا بل تھا جو قانون بنا۔ لکھنؤ میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں حصہ لیکر سلف گورنمنٹ کی قرارداد کے حق میں تقریر کی (مارچ)۔ اسی سال کے اواخر میں انگلستان میں مولانا محمد علی اور سید وزیر حسن کی ترغیب پر مسلم لیگ کے باقاعدہ رکن بن گئے۔ گوکھلے کے ساتھ انگلستان گئے (اپریل)۔ کانگرس اور لیگ میں وزیر ہند کی کونسل کے خلاف تقریر کی (دسمبر)۔

سنہ ۱۹۱۴ء:- انڈیا کونسل کی اصلاح کے سلسلے میں کانگرسی وفد کے رکن بن کر پھر انگلستان گئے (مئی)۔

سنہ ۱۹۱۵ء:- مسلم لیڈروں سے اپیل کی کہ وہ سب مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہوں (نومبر)۔

۱۶-۱۹۱۵ء:- انھیں کی مساعی سے دسمبر سنہ ۱۹۱۵ء میں بمبئی میں اور دسمبر سنہ ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ میں کانگرس اور لیگ کے اجلاس بیک وقت ایک ہی شہر میں منعقد ہوئے اور دونوں قوموں کے لیڈروں نے مل کر دونوں جلسوں میں شرکت کی۔

سنہ ۱۹۱۶ء:- بمبئی پراونشل کانفرنس (احمد آباد) کے صدر کی حیثیت سے ہندوؤں سے اپیل کی کہ وہ جداگانہ نیابت کی مخالفت نہ کریں (اکتوبر

ملکی اصلاحات پر امپیریل کونسل کے ۱۹ ممبروں کی مشہور یادداشت کے تیار کرنے میں حصہ لیا۔ مسلم لیگ کے نویں سالانہ اجلاس کی صدارت کی جہاں انھیں کی کوششوں سے کانگرس اور لیگ کے درمیان لکھنؤ کا مشہور میثاق ہوا جس کی رُو سے کانگرس نے فرقہ وار نیابت کو تسلیم کیا۔

۱۹۱۷ء :- ہوم رول لیگ کے قیام میں مسز بیسنٹ کے معاون بنے۔ کانگرس اور لیگ کے مشترکہ جلسے میں حصہ لیا جس میں خود اختیاری حکومت پر زور دیا گیا (جولائی) اور جس کے اثر سے برطانیہ نے اگست میں ذمہ دار حکومت کا مشہور اعلان کیا۔ نومبر میں وہ کانگرس اور لیگ کے مشترکہ وفد کے رکن بن کر نئی دہلی میں وزیر ہند سے ملے جو اُن سے بے حد متاثر ہوئے۔

۱۹۱۸ء :- مجوزہ سیاسی اصلاحات پر نکتہ چینی کی کہ وہ ناکافی اور جمہوریت کے منافی ہیں (جولائی)۔ ولنگڈن گورنر بمبئی کی مجوزہ الوداعی تقریب پر دوسرے محبان وطن کے رہنما بن کر ٹاؤن ہال میں زبردست مخالفانہ مظاہرہ کیا اور جلسے کو منتشر کرانے میں نمایاں حصہ لیا جس سے ملک بھر میں ان کی دلیری کی دھاک بندھ گئی (۱۱ر دسمبر) اور آگے چل کر اس واقعہ کی یاد میں جناح ہال تعمیر کیا گیا۔ ایک پارسی خاتون مس پیٹیٹ سے شادی کی جنھوں نے شادی سے پہلے اسلام قبول کیا (۱۹ر اپریل)۔

۱۹۱۹ء :- رولٹ بل کے خلاف احتجاج کے طور پر امپیریل کونسل سے استعفیٰ دے دیا (مارچ)۔ مسلم لیگ کے مستقل صدر ہوئے (دسمبر)۔

۱۹۲۰ء :- لیگ کے خاص اجلاس کی صدارت کی اور عدم تعاون کا فیصلہ حاضرین پر چھوڑ دیا (ستمبر)۔ ناگپور کانگرس میں ہزاروں کے مجمع میں تن تنہا عدم تعاون کی قرارداد کی مخالفت کی۔ اور اس تحریک سے الگ ہو گئے۔ بایں ہمہ اس کے بعد بھی ملکی مفاد کے خیال سے انھوں نے عموماً گورنمنٹ کی مخالفت کی اور ہندو مسلم اتحاد کی مساعی میں پیش پیش رہے۔

۱۹۲۱ء :- نئی مرکزی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے جہاں انھوں نے اپنی نیشنلسٹ پارٹی بنائی اور ۱۹۲۵ء تک درجہ نوآبادیات کے حصول کے لئے کوشاں رہے۔ مارچ میں موڈیمین کمیشن کی رپورٹ میں دوعملی حکومت کے خلاف اختلافی نوٹ لکھا۔

۱۹۲۴ء :- مسلم لیگ کے پندرھویں سالانہ اجلاس (لاہور) کی صدارت کی اور نیم مردہ لیگ میں جان ڈالنے کی کوشش کی (مئی)۔ اتحاد کانفرنس (بمبئی) میں ہندو مسلم اتحاد پر تقریر کی (نومبر)۔

۱۹۲۵ء :- آل پارٹیز کانفرنس میں خاصا حصہ لیا (جنوری)۔ مرکزی اسمبلی میں اپنی آزاد پارٹی بنائی تاکہ سوراجیوں کی تخریبی کارروائیوں سے علیحدہ رہیں لیکن گورنمنٹ کی پالیسی کی متعدد بار مذمت کی۔

۱۹۲۶ء :- اسمبلی میں مزید اصلاحات کے لئے ایک شاہی کمیشن کے تقرر کا مطالبہ کیا۔ جداگانہ نیابت کی علانیہ حمایت کی۔

۱۹۲۷ء :- دہلی میں مسلم لیڈروں کی ایک اہم کانفرنس کی صدارت کی جس میں محض اُن کے اثر سے "تجاویز دہلی" منظور کی گئیں جن کی رُو سے مسلمانوں نے چند شرائط پر مشترکہ انتخاب منظور کر لیا (مارچ) لیکن مہاسبھائیوں نے اس فیاضانہ پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ سائمن کمیشن کے تقرر پر جس میں کوئی ہندستانی نہ لیا گیا تھا انھوں نے کمیشن کے مقاطعہ میں پہلا قدم اٹھایا۔

۱۹۲۸ء :- نہرو کمیٹی کی رپورٹ کے سلسلے میں مسلم لیگ کی طرف سے کلکتہ کنونشن میں چند اہم مسلم مطالبات پیش کئے لیکن کانگریسیوں نے انھیں رد کر دیا (دسمبر)۔

۱۹۲۹ء :- مسلم لیگ (دہلی) میں اپنے مشہور چودہ نکات پیش کئے (مارچ) جو اس کے بعد گیارہ برس تک مسلمانان ہند کے متفقہ سیاسی مطالبات تسلیم کئے گئے۔ برطانیہ کے وزیر اعظم کو ایک اہم خط لکھا (جون) کہ برطانیہ ہندوستان کو درجہ نوآبادیات عطا کرے اور ہندوستانی نمایندوں کو بلا کر اُن سے گفت و شنید کرے۔ (چنانچہ اکتوبر میں وائسرائے نے مطلوبہ اعلان کیا)

۱۹۳۰ء :- دُوسرے مسلم لیڈروں کے ساتھ مل کر گول میز کانفرنس لندن میں نمایاں حصہ لیا (۱۹۳۰ء، ۱۹۳۱ء) جہاں ہندو لیڈروں کے رویے پر اُنھیں "اپنی عمر میں سب سے زیادہ صدمہ پہنچا"۔ اور انھوں نے لندن میں ہی سکونت اختیار کرنے کا ارادہ کر لیا۔ چنانچہ چار سال تک وہیں مقیم رہے اور وکالت کا کام کرتے رہے لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ مسلمان "انتہائی خطرے میں ہیں" اُن سے واپسی کی درخواست کی گئی تو وہ فوراً ہندوستان

واپس آ گئے (۲ اپریل ۱۹۳۴ء)۔ اس سے پہلے بھی انھوں نے متعدد بار گرمیوں کا موسم انگلستان میں گزارا۔

۱۹۳۴ء:۔ مسلم لیگ کونسل کا نمایندہ جلسہ (دہلی) میں انھیں باتفاق رائے لیگ کا مستقل صدر منتخب کیا گیا (مارچ)

۱۹۳۵ء:۔ نئی مرکزی اسمبلی میں ان کی آزاد پارٹی کا رویہ عموماً فیصلہ کن ثابت ہوتا رہا۔ یہاں انھوں نے اپنے اثر سے کام لے کر "فرقہ وارانہ فیصلہ" کو منظور کرایا (فروری) لیکن صدر کانگرس کے ساتھ گفتگوئے مصالحت بے نتیجہ ثابت ہوئی (مارچ) اس کے باوجود انھیں کی ترغیب پر دو سال تک اسمبلی میں لیگ اور کانگرس نے مل کر کام کیا۔ (۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۶ء)

۱۹۳۶ء:۔ شہید گنج کے سلسلے میں لاہور جا کر مصالحت کی کوشش کی (مارچ) مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس (بمبئی) کو اپنی رہنمائی سے کامیاب بنایا (اپریل) لیگ نے آئندہ انتخابات لڑنے کے لئے ان کی صدارت میں ایک پارلیمنٹری بورڈ قائم کیا جس پر وہ ملک بھر کا دورہ کر کے لیگ کی کامیابی میں معاون ثابت ہوئے اور جب کانگرس نے سات صوبوں میں حکمراں ہو کر مسلم قوم کو ملیامیٹ کر دینے کا منصوبہ باندھا (۱۹۳۷ء) تو اس نازک وقت میں ہندوستان کے مایوس و منتشر مسلمانوں کو جس شخص نے ابھارا اور سیدھی راہ پر لگا دیا وہ بلاشبہ محمد علی جناح ہی تھے۔ اس وقت سے لے کر آج تک اسلامی ہند کی تاریخ فی الحقیقت محمد علی جناح کے سوانحِ حیات میں منعکس نظر آتی ہے۔

۱۹۳۷ء:۔ ان کے متعدد بیانات کہ باوجود ہندو لیڈروں کے بے بنیاد الزامات کے "میں ہمیشہ ہندو مسلم مفاہمت کے لئے تیار رہوں" (مارچ اپریل) اسلامی ہند کے مسائل کے بارے میں علامہ اقبال اور مسٹر جناح میں خط و کتابت (مئی ۱۹۳۶ء سے نومبر ۱۹۳۷ء تک) اقبال کا خط ان کے نام (۲۱ جون) کہ "اس وقت سارے ہندوستان میں صرف آپ ہی ایک ایسے مسلمان ہیں جس سے قوم یہ توقع رکھ سکتی ہے کہ وہ اسے اس طوفان میں سے جو شمال مغربی ہند اور شاید سارے ہند پر ٹوٹنے والا ہے صحیح سلامت بچا کر اس کی رہنمائی کرے گا۔" انھیں کی کوشش سے مسلم لیگ کا شاندار پچیسواں[۲۵] اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا (اکتوبر) جناح نو کروڑ مسلمانانِ ہند کے محبوب رہنما اور قائدِ اعظم تسلیم کئے گئے اور ان کی قیادت میں مسلم لیگ عوام کی جماعت بن گئی اور مسلمانوں نے ایک مستقل قوم کی باوقار حیثیت حاصل کر لی۔ مسٹر جناح کے حیات بخش خطبات سے مسلم قوم میں زندگی کی نئی رَو دوڑی اور اُن کے باطل سوز بیانات سے مخالفین کے منصوبے خاک میں مل گئے۔ اُن کی شبانہ روز سرگرمی ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۸ء تک قوم کے آڑے آئی۔ انھوں نے دورے کئے تقریریں کیں قوم کو کوسا ابھارا اور زندہ کر دیا۔ گاندھی اور جناح میں اکتوبر ۱۹۳۷ء سے اپریل ۱۹۳۸ء تک خط و کتابت ہوئی۔

۱۹۳۸ء:۔ مسلم یونیورسٹی یونین میں تقریر (فروری) اس کے بعد وہ ہر سال کئی بار علی گڑھ اور دوسرے مقامات میں جا کر مسلم طلبا کو بیدار اور قومی خدمت پر آمادہ کرتے رہے۔ کلکتہ میں لیگ کے خاص اجلاس کی صدارت کی (اپریل) اور کراچی میں لیگ کانفرنس کی (اکتوبر)۔ گاندھی اور بوس سے ملاقات (اپریل مئی)۔ بوس سے خط و کتابت (مئی تا اکتوبر) یہ تمام لیگی کانگرسی مراسلات اس نکتہ پر آ کر ختم ہوتی رہیں کہ کانگرس کو اس سے انکار تھا اور لیگ کو اس پر اصرار کہ صرف لیگ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ پٹنہ میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس[۲۶] کی صدارت کی (دسمبر)۔

۱۹۳۹ء:۔ بیان دیا کہ لیگ فیڈریشن کی مخالفت کرے گی (جولائی) تقریر کی کہ جمہوریت ہندوستان کے لئے موزوں نہیں (اگست) جنگِ عالمگیر کے اعلان کے بعد وائسرائے سے متعدد ملاقاتیں۔ مسلمانانِ ہند کو پیغامِ عید کہ "اسلام ہر مسلم سے توقع رکھتا ہے کہ وہ اپنی قوم کی طرف اپنا فرض ادا کرے" کانگرس کے استعفیٰ دینے پر مسلمانوں کو ہدایت کہ وہ طول و عرضِ ہند میں نہایت امن پسندی کے ساتھ "یومِ نجات" منائیں۔ (دسمبر)

۱۹۴۰ء:۔ گاندھی سے ملاقات (فروری) مسلم لیگ کے ستائیسویں سالانہ اجلاس کی صدارت کی جس میں پاکستان کی مشہور قرارداد منظور ہوئی (۲۳ مارچ) غیر مسلموں کے ہزاروں اعتراضات کا دنداں شکن جواب دیتے رہے۔ وائسرائے کو کچھ تجاویز بھیجیں جن سے متاثر ہو کر وائسرائے کی کونسل کی توسیع کی گئی گو غلط طور پر (جولائی) دہلی میں تقریر کہ مسلمان بوقتِ ضرورت سول نافرمانی کی تحریک میں دخل دینے سے نہ جھجکیں گے (نومبر)۔

۱۹۴۱ء:۔ لاہور میں طلبا کی کانفرنس پاکستان کی صدارت اور نوجوانانِ پنجاب کی حوصلہ افزائی (یکم مارچ) علی گڑھ یونین میں تقریر کہ علی گڑھ [illegible]

اسلحہ خانہ ہے اور تم اس کے بہترین سپاہی ہو" (۱۰ رمارچ) بابو راجندر پرشاد سے خط و کتابت (اپریل) مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس (مدراس) کی صدارت کی اور قوم کے سامنے دوسرا پنج سالہ منصوبہ پیش کیا (اپریل) سپرو سے خط و کتابت (جنوری تا مارچ) دو قوموں کے نظریئے پر بحث۔ وائسرائے کی کونسل کی توسیع اور بعض لیگیوں کے تقرر پر جناح کا احتجاج اور انضباطی کارروائی (جولائی و اگست) جس سے لیگ افتراق و تباہی سے بچ گئی۔ آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے سالانہ اجلاس (ناگپور) کی صدارت (دسمبر): نوجوانوں کو نصیحت کہ "ایمان، اتحاد اور انضباط کے اصول کو اپنا عنوان حیات بنا لو ـــ"[۲۸]

۱۹۴۲ء: سراج گنج کانفرنس میں مسلمانانِ بنگال کو انتباہ (فروری)۔ عام قومی فنڈ کے لئے اپیل (۲۱ رمارچ) کرپس سے ملاقات (۲۵ رمارچ) مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس (الہ آباد) کی صدارت کی اور کرپس کی تجاویز پر روشنی ڈالی۔ پاکستان کے متعلق راج گوپال اچاریہ سے گفتگو (جون و نومبر)۔ کانگریس کی "بغاوت" پر بیان کہ یہ نہ صرف برطانیہ کی مخالفت ہے بلکہ مسلمانوں کی مخالفت بھی ہے اور کانگریس سے اپیل کہ اگر وہ اسلامی ہند کے مطالبہ پاکستان کو مان لے تو لیگ قومی جنگ میں شریک ہونے پر آمادہ ہوگی (جولائی و اگست) پنجاب کا دورہ (نومبر) اور یہ اعلان کہ پاکستان میں غیر مسلموں کے ساتھ برابر کا سلوک کیا جائے گا اور حکومت کا پہلا فرض غریبوں کی نگہداشت ہوگا۔ مسلمانوں کو تنبیہ کہ "تمہیں تین چیزوں کی ضرورت ہے تعلیم، تجارت اور تلوار"۔ اسی سال مسٹر جناح کی سرپرستی میں دہلی سے روزنامہ "ڈان" کا اجرا ہوا (اکتوبر)۔

۱۹۴۳ء:۔ اسماعیلیہ کالج بمبئی میں تقریر کہ پاکستان اسلامی رواداری کے اصولوں پر مبنی ہوگا (فروری)۔ لیگ کے سالانہ اجلاس (دہلی) کی صدارت (اپریل)۔ حکومت کو تنبیہ اور ہندوؤں سے مصالحت کی پُر زور اپیل۔ مسٹر جناح پر ایک خاکسار نے اچانک قاتلانہ حملہ کیا لیکن انہوں نے نہایت دلیری سے اپنے آپ کو بچا لیا (بمبئی ۲۶ رجولائی)۔ اس پر ملک بھر سے ہمدردی کے پیغامات موصول ہوئے۔ بنگال کے قحط کے لئے اپیل (جولائی) اکالی لیڈر سے ملاقات (دسمبر)۔ لیگ کے سالانہ اجلاس (کراچی) کی صدارت اور خطبے میں مجلسِ عمل اور دوسری اہم لیگی کمیٹیوں کے قیام کا مشورہ۔

۱۹۴۴ء:۔ پنجاب میں جا کر یونینسٹ سیاست کی الجھنوں سے لیگ کو آزاد کیا (مارچ اپریل)۔ کشمیر میں قیام اور مظلوم کشمیری مسلمانوں کی حوصلہ افزائی (جون)۔ پاکستان کی اقتصادی منصوبہ بندی کے لئے لیگ کی تعمیری کمیٹی نامزد کی (اگست) اور اس کے ایک جلسے میں تقریر کی کہ ہمارا مطمح نظر سرمایہ دارانہ نہیں بلکہ اسلامی ہونا چاہیئے (نومبر)۔ راج گوپال اچاریہ سے خط و کتابت اور اُس کے نام نہاد "پاکستانی فارمولہ" کی بنا پر گاندھی سے ملاقات (دسمبر) جو ناکام رہی۔

۱۹۴۵ء:۔ احمد آباد میں تقریر (جنوری) کہ پاکستان کی جنگ فی الحقیقت سارے ہندوستان کی آزادی کی جنگ ہے۔ مسٹر جناح کی خرابیٔ صحت کے باعث لیگ کا سالانہ اجلاس ملتوی کیا گیا (مارچ)۔ یوم پاکستان (۲۳ رمارچ) پر قائداعظم کا پیغام کہ "پاکستان ہماری مٹھی میں ہے"۔ وائسرائے اور وزیر ہند کو بحری تار کہ اگر بغیر مسلم لیگ سے مشورہ کئے حکومت کوئی نیا دستور عائد کرے گی تو اسلامی ہند اُس کا پورا مقابلہ کرے گا۔ (اپریل)۔ شملہ کانفرنس میں شرکت (۲۵ رجون تا ۱۴ رجولائی) جو کانگریس اور لیگ میں سمجھوتہ نہ ہو سکنے کے باعث ناکام رہی۔ آنے والی انتخابی مہم لڑنے کے واسطے مسلم لیگ فنڈ کے لئے اپیل اور ہر مسلمان سے درخواست کہ وہ جلد سے جلد لیگ میں آ شامل ہو ـــ (اگست)۔ قائداعظم نے مسلمانانِ ہند کے نام (۹ رستمبر کو) یہ پیغام عید بھیجا کہ "اس نازک موقعہ پر" میں ہر مسلمان سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ قوم کے لئے سبھی کچھ نثار کر دینے پر آمادہ ہو جائے اور یہ اخیر میں دعا کی اور یہ اُمید ظاہر کی کہ وہ وقت دُور نہیں جب ہم ایک آزاد و خود مختار پاکستان میں رہ کر اپنی عید منایئں گے"۔ کوئٹہ میں جناح کی تقریر (۱۰ راکتوبر) کہ "جب قربانی کا وقت آئے گا تو میں سب سے پہلے اپنے سینے میں گولی کھاؤں گا"۔ صوبہ سرحد کا دورہ اور پشاور میں شاندار استقبال (۱۹ تا ۲۶ رنومبر) یکم دسمبر:۔ مرکزی اسمبلی کے انتخاب میں جناح کی شاندار کامیابی (جناح کو ۳۶۰۲ اور لال جی کو ۱۲۶ ووٹ ملے)۔ ۲۵ ردسمبر:۔ اپنی سالگرہ پر قائداعظم کا پیغام قوم کے نام: "کام کرو

کام کرو اور مسلسل کام کئے جاؤ۔ انتخابات میں مکمل کامیابی حاصل کرو اور ہمیشہ متحد رہو۔" (۳۱ دسمبر) مرکزی اسمبلی میں مسلم لیگ کی سو فی صدی کامیابی پر قوم کو مبارکباد اور ۱۱ جنوری کو جشنِ فتح منانے کی ہدایت۔

۱۹۴۶ء:۔ ۱۷ جنوری:۔ اسلامیہ کالج لاہور میں تقریر کہ مسلم لیگ پنجاب میں آزادی کی علمبردار ہے۔ بنگال (۱۵ فروری) اور آسام (۳ مارچ) کا دورہ۔ لاہور میں نئے مسلم لیگی ممبران اسمبلی سے جناح کا خطاب (۲۰ مارچ) یوم پاکستان پر پیغام (۲۳ مارچ) کہ ہم مسلمان پاکستان کے حصول کا عزم کر چکے ہیں اگر ہو سکا تو اسے مصالحت سے حاصل کریں گے اور اگر یوں نہ ہو سکا تو ہم اپنا خون بہانے سے بھی دریغ نہ کریں گے۔ وزارتی مشن سے جناح کی گفت و شنید اور خط و کتابت (مارچ تا جون)۔ دہلی میں نئی اسمبلیوں کے مسلم لیگی ممبران کے اجتماع میں جناح کی ولولہ انگیز تقریر (۷ اپریل) کہ مسلم لیگ کو انتخابات میں عدیم المثال کامیابی ہوئی ہے اور اب ہم یکے بعد دیگرے فتح حاصل کرتے ہوئے اپنے نصب العین پاکستان کو پالیں گے۔ شملہ کانفرنس (۵ تا ۱۲ مئی) میں شرکت۔ ۱۶ مئی کی برطانوی اسکیم پر بیان (۲۲ مئی) وزارتی مشن کی کانگرس نوازی پر بیان (۲۷ جون) کانگرس نے گروپ بندی کی غلط توجیہہ کی ہے۔ بمبئی میں مسلم لیگ کونسل میں مسٹر جناح کی پرجوش تقریر (۲۹ جولائی) کہ اب ہم آئینی طریق کار کو خیر باد کہہ چکے ہیں۔ جناح کا بیان (۱۸ اگست) کہ مسلم لیگ کانگرس سے تعاون کرنے سے انکار نہیں کرتی لیکن ہتھیار ڈالنے سے ضرور انکار کرتی ہے۔ عید پر قوم کے نام پیغام (۲۸ اگست) کہ "منظم ہو جاؤ مشکلوں کا مردانہ وار مقابلہ کرو خدا ہمارے ساتھ ہے اور ہم یقیناً کامیاب ہوں گے"۔ جناح کی ملاقاتیں وائسرائے سے (ستمبر اکتوبر) اور لیگی ممبروں کی عارضی حکومت میں شمولیت (۱۵ اکتوبر)۔ ۵ نومبر (بہار میں مسلمانوں کے قتل عام کے بعد) عید الاضحیٰ پر جناح کا پیغام کہ اب ضرورت ہے کہ اسلامی ہند کی ذہنیت میں ایک انقلابی تبدیلی پیدا ہو جائے۔ ۱۱ نومبر: جناح کی اپیل مسلم اکثریت کے صوبوں سے کہ وہ ہندوؤں کی زیادتی سے برافروختہ ہو کر بدلہ لینے کا خیال ترک کر دیں۔ ۱۴ نومبر پریس کانفرنس میں جناح کا بیان کہ فرقہ وارانہ فسادات کی روک تھام کا واحد طریقہ پاکستان کا قیام ہے۔ ۳ تا ۶ دسمبر لندن میں گول میز کانفرنس میں جناح کی موجودگی کا انقلاب انگیز اثر، برطانوی حکومت نے اپنے بیان میں اور بعد میں پارلیمنٹ میں گروپ بندی کے بارے میں لیگی نقطۂ نظر کی حمایت کی۔ ۴ دسمبر: لندن میں عالمگیر پریس کانفرنس میں جناح کا بیان کہ پاکستان ہی ہندوستان کی مصیبتوں کا واحد حل ہے۔ ۱۶ دسمبر قاہرہ میں عرب لیڈروں سے جناح کے مذاکرات: عرب پاکستان کے حامی بن گئے۔ ۲۵: جناح کی ستروین سالگرہ پر ہندوستان بھر سے پیغامات مبارکباد۔ مسلم تاجران بمبئی کا برقیہ جناح کے نام: "تم سلامت رہو ہزار برس + ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار"۔ صدر مدراس مسلم لیگ کا قول کہ اورنگ زیب کے بعد جناح اسلامی ہند کی سب سے بڑی شخصیت ہے"۔ جناح کا پیغام قوم کے نام: "مسلمانو اپنے قومی اتحاد اور تنظیم کو قائم رکھو تو تم یقیناً کامیاب ہو گے اور اپنے نصب العین پاکستان کو پالو گے!"

۱۹۴۷ء:۔ ۲۳ مارچ یوم پاکستان پر قوم کے نام پیغام۔ ۵ اپریل نئے وائسرائے مونٹ بیٹن سے ملاقات۔ ۱۵ جناح اور گاندھی کی مشترکہ اپیل تشدد کے خلاف۔ ۶ مئی: گاندھی کی ملاقات جناح سے۔ ۳ جون: ہندوستان کی آزادی کے لئے نیا برطانوی منصوبہ جسے مسٹر جناح نے اپنی مجلس عاملہ کے سامنے پیش کیا۔ ۹ جون آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل نے یہ منصوبہ منظور کر لیا: قائداعظم کی اپیل پاکستان فنڈ کے لئے۔ ۱۷: یہ بیان کہ ریاستیں ہندوستان یا پاکستان جس سے چاہیں الحاق کر سکتی ہیں۔ ۴ اگست: مسٹر جناح پاکستان کے اور مونٹ بیٹن ہندوستان کے گورنر جنرل مقرر ہوئے۔ ۷: قائداعظم کراچی پہنچ گئے۔ ۱۰: پاکستان دستور ساز اسمبلی کا افتتاح۔ ۱۱ اگست: پاک اسمبلی میں مسٹر جناح کی تقریر کہ پاکستان میں ہم کسی مذہب و ملت میں امتیاز نہ کریں گے اور عوام کی بہتری ہمارے پیش نظر رہے گی۔ ۱۲: مسٹر جناح کو سرکاری طور پر قائداعظم کا خطاب ملا۔ ۱۵: پاکستان کے قیام پر قائداعظم کا پیغام قوم کے نام۔ ۱۸: پیغام عید۔ ۲۸: لاہور میں ورود اور ہندوستان و پاکستان کی مشترکہ کانفرنس میں شرکت ۳۱: فرقہ وارانہ فسادات کے متعلق نشری تقریر کہ پاکستان مشرقی پنجاب کے تمام مسلمانوں کو جگہ دے گا خواہ وہ دیوالیہ ہی کیوں نہ ہو جائے۔ ۱۰ ستمبر قومی فنڈ کے لئے قائداعظم کی اپیل۔ ۲۲ اکتوبر: پاکستان کے متعلق ایک اہم بیان۔ ۲۶: قائداعظم لاہور میں۔ ۳۰: تین لاکھ کے اجتماع میں تقریر

یکم نومبر: لاہور میں مشترکہ دفاعی کونسل کا اجلاس جس میں ہر دو ڈومینیوں کے گورنر جنرلوں نے شرکت کی ۔ ۲۷ر نومبر: پاکستان تعلیمی کانفرنس کی طرف قائداعظم کا پیغام کہ ہمیں علمی و صنعتی تعلیم کی ضرورت ہے اور ایسی تعلیم کی جو نوجوانوں کی سیرت اور اخلاق کو مضبوط بنائے ۔ ۱۳ر دسمبر: کراچی میں آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا آخری اجلاس ۔ ۱۴ر آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا آخری اجلاس اور مسلم لیگ کی پاکستان مسلم لیگ اور ہندوستانی مسلم لیگ میں تقسیم ۔ ۱۹: قائداعظم کا بیان کہ برطانیہ پاکستان سے سرد مہری کا برتاؤ کر رہا ہے نیز یہ کہ اس نے فلسطین کے بارے میں کما حقہٗ کوشش اور توجہ نہیں کی ۔ ۲۵ر: اپنی اکہترویں سالگرہ پر قائداعظم کا پیغام ۔

۱۹۴۸ء: ۔ ۲ر فروری: قائداعظم کی تقریر کہ مہاجرین کا مسئلہ حل کرنے کے لئے صنعتی ترقی بہت کارآمد ثابت ہوگی ۔ ۴ر: یہ افواہ ۱۵ر اگست کے بعد نواب بھوپال قائداعظم کی جگہ گورنر جنرل ہوں گے ۔ ۲۱: قائداعظم کی تقریر پاکستانی فوجیوں کے سامنے کہ تمہارا فرض ہے کہ تم اسلامی جمہوریت اور انصاف پسندی کے محافظ بنو اور دنیا میں امن قائم کرنے اور عوام کی حالت بہتر بنانے میں ممد و معاون ہو ۔ ۳۰ر جنوری: گاندھی جی کے قتل پر قائداعظم کا اظہار افسوس ۔ ۱۱ر مارچ: ایک اخباری نمائندے کو یہ بیان کہ ہندوستان کو پاکستان سے برابری کا سلوک کرنا چاہیئے ۔ انھیں عالمگیر سیاست میں تعاون کرنا چاہیئے اور مل کر پاکستان و ہندوستان کے فوجی تحفظ میں حصہ لینا چاہیئے ۔ ۲۱: قائداعظم کی تقریر ڈھاکہ میں: دشمنوں اور منافقوں اور کمیونسٹوں کو انتباہ اور بنگالیوں کے سامنے اعلان کہ پاکستان کی قومی و ملکی زبان اردو ہوگی ۔ ۱۱: اپریل ۔ صوبہ سرحد کا دورہ ۔ ۱۶ر جون کوئٹہ میں بیان کہ پاکستانیوں کو صوبائی تعصب اور علیحدگی ترک کر دینی چاہیئے ۔ یکم جولائی: کراچی میں پاکستان کے سرکاری بنک کا افتتاح اور تقریر کہ مغرب کے اقتصادی نظام نے دنیا کے لئے لاینحل مسائل پیدا کر دیئے ہیں اور جنگ آزمائی کی عادت راسخ کر دی ہے پس ہمیں اپنے اقتصادی نظام کو مساوات اور معاشری عدل کے اسلامی اصولوں پر قائم کرنا چاہیئے تاکہ نوع انسان امن و امان میں پھلے پھولے ۔ ۴ر جولائی: قائداعظم واپس کوئٹہ پہنچے اور چند روز کے بعد ایک طویل علالت میں مبتلا ہو گئے ۔ ۶ر اگست: عید پر قائداعظم کا پیغام پاکستان اور دنیائے اسلام کے لئے کہ ہر مسلمان پاکستان کی خدمت دیانتداری خلوص اور بے غرضی سے کرے اور یہ کہ تمام اسلامی ملکوں کو پوری طرح متحد ہو جانا چاہیئے تاکہ دنیا کی مجالس میں ان کی آواز غور اور توجہ سے سُنی جائے ۔ ۸ر اگست برطانوی اخبار برمنگھم پوسٹ کا قیام پاکستان کے پہلے سال پر تبصرہ کہ "مسٹر جناح پاکستان کا اولیں اور بے بہا اثاثہ ہیں اور اپنے حقیقت بین عزائم اور وحدتِ مقصد کے لئے عدیم المثال واقع ہوئے ہیں ۔ ۱۴ر اگست: پاکستان کی پہلی سالگرہ پر جشنِ استقلال کے موقع پر قوم کے نام پیغام کہ ہم نے اس پہلے سال میں بڑے عزم و ہمت کا ثبوت دیا ہے ۔ بڑی بڑی مشکلات کو حل کیا ہے اور اب یہ قوم کا کام ہے کہ اس مضبوط بنیاد پر وہ جلد سے جلد ایک شاندار تعمیر کھڑی کر دکھائے ۔ ۱۷ر اگست: عراقی سفیر کا بیان کہ قائداعظم اسلامی دنیا کے سب سے بڑے رہنما ہیں ۔ ۱۱ر ستمبر: ۲ بجے سہ پہر قائداعظم کوئٹہ سے پرواز کرتے ہوئے کراچی پہنچے اور ۲۵ - ۱۰ بوقتِ شب حرکتِ قلب بند ہو جانے کے سبب عالمِ بقا کو سدھارے ۔ اِنّا للّٰہ وانا الیہ راجعون ۔

بشیر احمد

یہ وقت نہ تھا

اے قائدِ اعظم پاکستاں سے جانے کا یہ وقت نہ تھا — فردوس کے دامن میں راحت فرمانے کا یہ وقت نہ تھا

حالات کا رخ کس جانب ہے حالات کی رو کیا کہتی ہے — کیا اس اُلجھی ہوئی گتھی کو سُلجھانے کا یہ وقت نہ تھا

منجدھار سے ملّت کی کشتی تم ساحل تک تو لے آئے — ساحل پہ کشتی چھوڑ کے تنہا جانے کا یہ وقت نہ تھا

دانستہ یا نادانستہ کچھ بھول ہوئی تھی کیا ہم سے — ٹھکرا کے چلے ہو جس کے عوض ٹھکرانے کا یہ وقت نہ تھا

دنیائے نظر ششدر ششدر برہم برہم شیرازۂ دل — اے دستِ قضا ایسا صدمہ پہنچانے کا یہ وقت نہ تھا

یہ وقت کے بہتے دریا کی موجوں نے کیوں چُپ سادھی ہے — کیا حشر کوئی اُٹھے گا حشر اُٹھانے کا یہ وقت نہ تھا

ناشاد مُسلماں کے دل کو ماحول کے جلتے دامن میں — یہ دُکھ سہنے کی تاب نہ تھی غم کھانے کا یہ وقت نہ تھا

احساسِ وفا شرمندہ ہے احساسِ عقیدت نادم ہے — ہم ساتھ تمہارے ہی جاتے مرجانے کا یہ وقت نہ تھا

ظاہر ظاہر باطن باطن یکساں یکساں پیہم پیہم — خوں گشتہ دلوں کے پلکوں پر لہرانے کا یہ وقت نہ تھا

ہر آہ مچلتا شعلہ ہے ہر اشک دہکتا انگارہ — ملّت کو دردِ جدائی سے تڑپانے کا یہ وقت نہ تھا

رفتارِ زمانہ دیکھ کے نبضیں ڈوب رہی تھیں عالم کی — فطرت کے سُنہرے ابرو پر بل آنے کا یہ فسقت نہ تھا

یاد آتا ہے رہ رہ کے ہمیں ایثار ترا اخلاص ترا — یہ دولت قوم کے ہاتھوں سے چھن جانے کا یہ وقت نہ تھا

کجلائی ہوئی غمناک فضا پر سناٹا سا چھایا ہے — اے موت عدم کا افسانہ دُہرانے کا یہ وقت نہ تھا

نا سازیٔ ہوائے عالم کا رُخ پل میں پلٹ کر رکھ دیتے — دھیان اس کی طرف اک پل کیلئے بھی لانے کا یہ وقت نہ تھا

زندہ جذبوں زندہ ارمانوں میں جو کروٹ لیتا ہے — اُس خون کو ہم گرما دیتے گرمانے کا یہ وقت نہ تھا

رہ اَٹی ہوئی ہے کانٹوں سے ہر سمت اندھیرا چھایا ہے
منزل پہ امیرِ منزل کے سو جانے کا یہ وقت نہ تھا

طفیل ہوشیارپوری

قائدِاعظم کے ارشادات

۱۹۱۶ء سے پہلے :- "اخلاقی قوت، دلیری، محنت اور استقلال یہ وہ چار ستون ہیں جن پر انسانی زندگی کی ساری عمارت تعمیر کی جاسکتی ہے۔ اور ناکامی وہ لفظ ہے جسے میں جانتا ہی نہیں۔"

خطبہ صدارت سالانہ اجلاس آل انڈیا مسلم لیگ، منعقدہ لکھنؤ (دسمبر ۱۹۱۶ء) :- "ہم مسلمان رعائتیں نہیں چاہتے۔ مسلمانوں کے لئے لازم ہے کہ وہ خودداری سیکھیں۔"

نوجوانوں کو پیغام (۱۹۱۷ء): "مسلمانوں کو میرا پیغام یہ ہے کہ اپنے ہندو بھائیوں کے ساتھ مل کر کام کرو اور ہندوؤں کو میرا پیغام ہے کہ اپنے پسماندہ بھائی کی مدد کرو۔"

انتخابی منشور (۱۹ ستمبر ۱۹۲۳ء) :- "ایک بات کا میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ عوام کی بھلائی اور ہندوستان کی بہبود جس طرح اب تک میرا نصب العین رہا ہے آئندہ بھی اسی طرح میرے پیش نظر رہے گا۔ مجھے مطلق خواہش نہیں کہ حکومت سے کوئی نوکری یا رتبہ یا خطاب حاصل کروں۔ میرا واحد مقصد صرف یہ ہے کہ حتی المقدور ملک کی خدمت کرتا رہوں۔"

بمبئی کرانیکل کے نمائندہ کو بیان (۱۹۲۳ء) :- "آزادی صرف اخلاقی قوت کے بڑھانے، مل جل کر کام کرنے اور آزادی کے حصول کے لئے لوگوں کے مصمم ارادہ کر لینے سے حاصل ہو سکتی ہے۔"

خطبہ صدارت مسلم لیگ سالانہ اجلاس منعقدہ لاہور (۲۵ مئی ۱۹۲۴ء) :- "جب تک ہندو مسلمان آپس میں سمجھوتہ نہیں کریں گے غیروں کی دفتری حکومت جوں کی توں قائم رہے گی۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ جس روز ہندو مسلمانوں میں اتحاد ہو جائے گا اسی روز ہندوستان کو ذمہ دار نوآبادیاتی حکومت مل جائے گی۔ میرے نزدیک سوراج اور ہندو مسلم اتحاد ہم معنی الفاظ ہیں۔"

مرکزی اسمبلی میں تقریر (۱۱ مارچ ۱۹۲۶ء) :- "(حکومت سے خطاب) آخر تم کیا چاہتے ہو کہ میں کیا کروں؟ یہ کہ سب جماعتیں متفق الرائے ہو جائیں! میں تم سے پوچھتا ہوں کیا تمھارا دیانت داری سے یہ خیال ہے کہ ہندوستان میں یہ ممکن ہے یا ہو سکے گا یا دنیا کے کسی اور ملک میں بھی یہ ہو سکتا ہے کہ تمام جماعتیں متفق الرائے ہو جائیں اور جب تک یہ نہ ہو حکومت وقت ٹس سے مس نہ ہو۔"

انگلستان سے واپسی پر بیان (اکتوبر ۱۹۲۸ء) "ہندوستان کے لئے صرف ایک امید باقی ہے ہندو مسلمانوں میں اتحاد۔ ہندوؤں کو

چاہیئے کہ وہ زیادہ فیاضانہ اور آزادانہ رویّہ اختیار کریں اور مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ زیادہ اعتماد کریں۔"

نہرو رپورٹ کے سلسلے میں کانگرس کی کلکتہ کنونشن میں تقریر (۲۸ر دسمبر ۱۹۲۸ء) "ہم تمام اسی زمین کے بچے ہیں، ہمیں ایک دُوسرے کے ساتھ مل جل کر رہنا ہے، ہمیں ایک دُوسرے کے ساتھ مل کر کام کرنا ہے اور ہم میں جیسے بھی اختلافات ہیں، کم از کم اتنا تو ہو کہ ہم باہمی کدورت کو اور نہ بڑھائیں۔ اور اگر ہم متفق نہیں ہو سکتے تو کم از کم ہم اسی بات پر متفق ہو جائیں کہ ہم میں کچھ اختلافات ہیں۔ لیکن ہاں ہم یہ کوشش کریں کہ ہم ایک دوسرے سے جدا بھی ہوں تو دوستانہ طور پر۔ میری بات پر یقین کرو کہ ہندوستان مطلق ترقی نہ کر سکے گا جب تک ہندو مسلم متحد نہ ہو جائیں گے پس کوئی منطق یا فلسفہ یا جھگڑا ٹنٹا ایسا نہیں ہونا چاہیئے جو باہمی مفاہمت کے رستے میں روڑا اٹکانے کا موجب ہو اور مجھے تو کسی اور بات سے اتنی خوشی نہ ہوگی جتنی ہندو مسلم اتحاد کی تکمیل سے۔"

ریمزے میکڈانلڈ وزیرِاعظم انگلستان کے نام خط (۱۹ر جون ۱۹۲۹ء): "ہندوستان نے برطانیہ کے وعدوں پر اعتبار کھو دیا ہے۔ سو سب سے پہلی بات جس پر میں آپ سے غور کرنے کے لئے کہوں گا یہ ہے کہ کس طرح برطانیہ کی نیک نیتی پر ہندوستان کا اعتبار پھر پیدا کیا جائے۔"

مسلم لیگ کونسل منعقدہ دہلی کے خاتمے پر ایک اخباری نمائندے کو بیان (اپریل ۱۹۳۴ء) "فرقہ دارانہ فیصلہ پر مسلمانوں کا اصرار صرف اس امر کا اظہار ہے کہ انھیں یقین ہو جائے کہ ملکی مطالبے میں اُن کے تحفظات شامل ہوں۔ ملکی خود اختیاری حکومت کا مطالبہ کرنے میں مسلمان کسی اور جماعت سے کسی طرح بھی پیچھے نہیں ہیں۔"

جمعیتہ العلما کانفرنس دہلی میں تقریر (اپریل ۱۹۳۶ء): "ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمان نہ صرف اس پر راضی ہیں بلکہ وہ تمام دُوسری جماعتوں کی بہ نسبت اس بات کے زیادہ خواہش مند ہیں کہ اوروں کے ساتھ مل کر مادرِ ہند کی آزادی کے لئے جنگ کریں۔ آج کل یہ فیشن ہو گیا ہے کہ قوم کی خدمت کرنے والوں کو بُرا بھلا کہا جائے۔ میں فرقہ پرست کہلانے سے نہیں ڈرتا۔ میری رائے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو علیحدہ علیحدہ منظم ہونا چاہیئے۔ جب وہ دونوں یوں منظم ہو جائیں گے تو ایک دوسرے کو زیادہ اچھی طرح سمجھ سکیں گے اور پھر ہمیں مفاہمت کے لئے برسوں انتظار نہ کرنا پڑے گا۔ سو تم طعن و تشنیع پر کان نہ دھرو۔ میں آٹھ کروڑ انسانوں کو اُبھارنے کی کوشش کر رہا ہوں اور اگر ان لوگوں کی تنظیم بہتر ہوگی تو یقیناً یہ ملکی جنگ کے لئے زیادہ مفید ثابت ہو سکیں گے۔"

تقریر سالانہ اجلاس آل انڈیا مُسلم لیگ بمبئی (اپریل ۱۹۳۶ء): "اگر کانگرس چاہتی ہے کہ ہندوستان میں برطانیہ کا غلبہ قائم رہے تو پھر وہ شوق سے اپنی موجودہ پالیسی کو جاری رکھے۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے وہ نہ صرف اپنی قوم کی طرف بلکہ ملک کی طرف بھی اپنا فرض ادا کرتے رہیں گے۔ خواہ کانگرس کی خواہش کچھ ہو مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ اپنے آپ کو منظم کریں اور کانگرس کو مجبور کر دیں کہ وہ خود اُن سے تعاون کرنے کے لئے کہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آٹھ کروڑ مسلمان آپس میں متحد ہو جائیں تو وہ ہندوؤں کے ساتھ دو رفیق بن کر نہ سہی دو اقوام بن کر سمجھوتہ کر سکتے ہیں۔"

لارڈ لنلتھ گو کے پہلے نشری پیغام پر بیان (اپریل ۱۹۳۶ء):۔ "مجھے اُمید ہے کہ وائسرائے تعاون و خیر خواہی کی عام تعریف پر عمل نہ کریں گے یعنی سر تسلیم خم کرو اور جو ہم کہیں کئے جاؤ۔ میں تعاون کو کچھ اور سمجھتا ہوں۔ آپس میں احترام و اعتماد پیدا نہیں ہو سکتا جب تک ہندوستان سے مساویانہ سلوک نہ کیا جائے اور اُسے برطانوی سلطنت میں برابر کا شریک نہ بنایا جائے۔"

لاہور میں تقریر (۱۱ اکتوبر ۱۹۳۶ء):۔ "میں پچھلے مہینوں میں کئی بار لاہور آیا ہوں اور میں دیکھتا ہوں کہ یہاں کے مسلمان سیاسی تعلیمی اور معاشی طور پر تمام دوسرے صوبوں سے پیچھے ہیں۔ تمہارا صوبہ سب سے زیادہ افسردہ ہے۔ تمہارے بعض لیڈر جو بڑے بڑے عہدوں پر متمکن ہیں خود غرض ہیں اور گورنمنٹ کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنے ہوئے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ تعلیم یافتہ مسلمانوں سے تعاون کریں۔ وہ صرف عوام کو اپنی اغراض کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ یہاں کے بعض اخبارات ہمارے مقاصد اور ہماری پالیسی کو ہمیشہ غلط طور سے پیش کرنے پر اُدھار کھائے بیٹھے ہیں، انھیں لیگ کی پالیسی پر اعتراض نہیں تاہم وہ ہم پر معترض ہیں کہ ہم مسلمانوں میں پھوٹ ڈال رہے ہیں، کیوں؟ محض اسی لئے کہ ہم ایک فرقہ دار جماعت بنا رہے ہیں اور اُن کی پارٹی "غیر فرقہ وارانہ" ہے۔ یاد رکھو کہ جب تک جداگانہ نیابت موجود ہے پارٹیاں محض فرقہ وارانہ طور پر ہی بن سکتی ہیں۔ ہمارا مدعا یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کی ایک ایسی مضبوط آل انڈیا جماعت بنائیں جس کی مختلف صوبوں میں شاخیں ہوں اور جس کے ارکان اپنی جماعت کے قواعد و ضوابط کے پوری طرح پابند ہوں۔ یہ بات نہیں ہے کہ ہم پنجاب میں ایک مسلم حکومت بنا کر ہندوؤں اور سکھوں پر ظلم کرنا چاہتے ہیں۔ پنجاب کی حکومت میں اگر مسلمانوں کا غلبہ ہوگا تو وہ یقیناً انصاف و حق پسندی کو پیش نظر رکھیں گے ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کو منظم کرکے ایک ترقی پرور اور قوم پرست مسلمان جماعت کی تشکیل کریں جو ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ مل کر ملک کی آزادی کی طرف قدم بڑھائے۔ میں ووٹروں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ محض دوستی یا برادری کی بنا پر اپنا ووٹ نہ دیں بلکہ اُس پالیسی اور پروگرام کو دیکھیں جس پر کاربند رہنے کا کسی امیدوار نے عہد کیا ہے۔ اخیر میں میں بزور سب سے درخواست کرتا ہوں کہ آؤ اور مسلم لیگ کے ممبر بن جاؤ اور مسلمانوں کی اس سب سے پرانی سیاسی جماعت کی مدد کرو جو مدت دراز سے مسلمانوں کی خدمت کر رہی ہے!"

جواہر لال نہرو کے اس بیان پر کلکتہ میں تقریر کہ ملک میں اب صرف دو جماعتیں ہیں برطانوی حکومت اور کانگرس (مارچ ۱۹۳۷ء) "نہیں! اس ملک میں ایک اور تیسری جماعت بھی ہے (یعنی مسلم لیگ) ہم یہ برداشت نہ کریں گے کہ کوئی ہم پر حکم چلائے ہم ہر ترقی پسند اور حریت نواز جماعت کے ساتھ جس کا پروگرام اور پالیسی ہمارے ساتھ مطابقت رکھتی ہو تعاون کرنے کو آمادہ ہیں۔ لیکن ہم کسی پارٹی کے ضمیمہ بردار بننے پر تیار نہیں ہیں۔ ہاں ہم ہندوستان کی بہبود کے لئے ہمیشہ برابر کے شریک بن کر کام کرنے پر رضامند ہیں۔"

خطبۂ صدارت سالانہ اجلاس ۲۵ آل انڈیا مسلم لیگ لکھنؤ (۱۵ اکتوبر ۱۹۳۷ء):۔ "آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ اجلاس اپنی اہمیت کے لحاظ سے مسلم لیگ کی تیس سال سے زائد زندگی کے اہم ترین اجلاسوں میں شمار ہونا چاہیئے۔ میں چاہتا ہوں کہ موقع ہاتھ سے نکل جانے سے پہلے مسلمان یہ مفید سبق سیکھ لیں کہ اُن کے سامنے ایک صاف راہِ عمل کھلی ہے۔ انھیں سمجھ لینا چاہئے کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ دیگر معاملات سے قطع نظر کرکے وہ اپنا سارا وقت اور ساری ہمت اپنی تنظیم اور اپنی قوت کے بڑھانے پر صرف کر دیں۔" "میں چاہتا ہوں کہ مسلمان اپنے اوپر بھروسہ کریں۔ اور اپنی قسمت کا خود فیصلہ کریں۔ ہمیں ایسے آدمی درکار ہیں جو صاحب ایمان اور صاحب عزم ہوں۔ جن میں ہمت و استقلال ہو اور جو ایسی باتوں کو منوانے کے لئے جنھیں وہ امر حق سمجھتے ہوں تن تنہا جنگ کرنے کو تیار ہوں، خواہ اس وقت ساری دنیا ہی ان کے خلاف کیوں

اکثریت کے ساتھ کسی سمجھوتے یا مفاہمت کا امکان نہیں۔ باعزت سمجھوتا ہمیشہ برابر کے فریقین میں ہو سکتا ہے اور جب تک دونوں فریق
سرے کی عزت اور طاقت محسوس نہ کرنے لگیں سمجھوتے کی کوئی اصلی صورت پیدا نہیں ہوتی۔ کمزور جماعت کی طرف سے صلح جوئی کی پیش کش
ی کمزوری کا اعتراف اور اپنے حقوق میں مداخلت کی دعوت دینے کے برابر ہے۔ تمام تحفظات اور معاہدے ایک ردی کاغذ کے ٹکڑے سے
یعت نہیں رکھتے جب تک اُن کی پشت پر کوئی طاقت نہ ہو۔ سیاست کے معنی ہیں طاقت۔ عدل انصاف یا مروت کے نعرے لگانے سے کچھ
ں آتا۔ ذرا دنیا کی قوموں پر نظر ڈالو، ذرا دیکھو کہ یہاں کیا کچھ ہو رہا ہے؟ حبش کا کیا حال ہوا؟ چین اور سپین میں کیا ہو رہا ہے؟ اور
ی کے المناک حالات کا تو ذکر ہی کیا، اس کے متعلق میں پھر عرض کروں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ مسلمان اس صورتِ حال پر غور و فکر کریں اور تمام
نان میں ایک متحدہ پالیسی اختیار کر کے اور اس پہ نہایت وفاداری سے قائم رہ کر اپنی قسمت کا فیصلہ آپ کریں۔ ایک اور صرف ایک صورت
ں کو بچا سکتی ہے اور اُن کو اُن کی گئی گزری طاقت دلا سکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ پہلے اپنی گم شدہ روح کو پھر ڈھونڈ پائیں اور اپنی اس اعلیٰ
، اور بلند اصولوں کی محافظت کرنا سیکھیں جو اُن کی عظیم الشان وحدت کا سنگ بنیاد ہیں اور جن کے بل پر وہ باہم ایک سیاسی جماعت کی
، اختیار کئے ہوئے ہیں۔ تمھیں اُن آوازوں اور طعنوں سے متاثر نہ ہونا چاہیئے جو مسلمانوں کے خلاف استعمال کئے جاتے ہیں مثلاً فرقہ پرست
اور رجعت پسند۔ آج دنیا میں بدترین ٹوڈی وہ مسلمان ہے جو بلا شرط کانگرس کے آگے ہتھیار ڈال دے اور اپنی ہی قوم کو لعنت ملامت کرنے
با کرتے ہی وہ قوم پرستوں کا سردار قرار دیا جاتا ہے۔ یہ پھبتیاں۔ آوازے اور طعنے اس لئے استعمال کئے جاتے ہیں کہ مسلمان اپنے آپ کو کمزور
ہ کرنے لگیں اور خود اپنی نظروں میں حقیر اور ذلیل ہو جائیں۔

ہندوستان کے مسلمانوں سے ہر صوبے ہر ضلع ہر تحصیل اور ہر قصبے کے مسلمانوں سے میں کہتا ہوں کہ ان کا اولیں فرض یہ ہے کہ وہ عوام کی بھلائی
ایک تعمیری اور اصلاحی پروگرام بنائیں اور مسلمانوں کی معاشری آقتصادی اور سیاسی ترقی کے طریقے اور ذرائع اختیار کریں۔ ہم ہر جماعت اور ہر
، ساتھ ہر قسم کے علمی اور تعمیری پروگرام میں جو صوبوں یا ملک کے مفید ہو تعاون کرنے پر تیار رہوں گے۔ میں منت اور استدعا کرتا ہوں کہ ہر مسلمان
رت اور بچہ ایک متحدہ پلیٹ فارم پر ایک کے مشترکہ جھنڈے کے نیچے آ جمع ہو۔ آؤ اور سیکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں جلد سے جلد مسلم لیگ کے
ں جاؤ۔ اپنے آپ کو منظم کرو اور اپنی قوت اور اپنے اتحاد کو مضبوط تر بناؤ۔ تم اپنے میں قواعد داں تجربہ کار سپاہیوں کی سی قوت پیدا کرو۔ جماعت کی
اپنی ذمہ داری اور رفاقت کا احساس پیدا کرو۔ اپنی قوم و وطن سے وفاداری کرو اور ایمانداری سے اُن کی خدمت کرو۔ یاد رکھو کوئی فرد یا قوم
ہ عصبیت اور قربانی کے کچھ حاصل نہیں کر سکتی۔ اس وقت ایسی قوتیں موجود ہیں جو ممکن ہے تم کو ڈرائیں دھمکائیں اور مرعوب کریں اور ممکن ہے
اُن کے ہاتھوں سخت تکلیفیں بھی پہنچیں لیکن یاد رکھو آتشِ ظلم کی اس بھٹی میں جس میں تم کو ڈالا جائے گا جہاں تم کو طرح طرح کی اذیتیں دی
ں گی۔ تم کو متزلزل کرنے کے لئے دھمکیاں دی جائیں گی۔ خوف دلایا جائے گا اس پر بھی اگر تم ثابت قدم رہے اگر تم نے ان مصیبتوں اور سختیوں
انہ وار مقابلہ کیا اور تم برابر ایماندار اور وفادار بنے رہے تو اسی طرح ایک ایسی قوم پیدا ہو گی جو اپنی گزشتہ عظمت اور تاریخ کی لاج رکھے گی اور
بل میں نہ صرف ہندوستان کی بلکہ دنیا بھر کی تاریخ کو کہیں زیادہ پُر عظمت اور شاندار بنا دے گی۔ ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمانوں کو کسی طاقت
رنے کی مطلق ضرورت نہیں۔ اُن کا مستقبل اُن کے ہاتھ میں ہے اور وہ ایک مسلک و مضبوط منظم و متحد قوت بن کر ہر خطرے کا مقابلہ کر سکتے ہیں
ہر قسم کی مخالفت سے جو اُن کے متحدہ محاذ اور خواہشات کو توڑنے اور مٹانے کے لئے کی جائے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ ایک طلسمی طاقت تمھارے اپنے
یں میں ہے۔ لو اب اپنے اہم فیصلے کرو۔ ممکن ہے کہ یہ فیصلے سخت ہوں اور دیر پا اور دُور رس فیصلہ کرنے سے پہلے خوب سوچ سمجھ لو۔ لیکن جب ایک بار
ہ کر چکو تو سب کے سب متحد ہو کر اُس پر مضبوطی سے کھڑے ہو جاؤ۔ اپنی قوم کے لئے سچے بنو اور وفادار رہو۔ پھر مجھے یقین کامل ہے کہ تم ضرور کامیاب ہو جاؤ گے"

مسلم یونیورسٹی یونین علی گڑھ میں تقریر (۵ فروری ۱۹۳۸ء) :- "صاحبِ صدر! جس چیز نے آج میرا حوصلہ بڑھایا ہے وہ پیغامِ اُمید ہے جو آپ نے آج مجھے دیا اور وہ روحِ شباب ہے جو آپ نے میرے دل میں پھونکی۔ میں کچھ واقعات آپ کو بتانا چاہتا ہوں۔ ۱۹۲۴ء سے لے کر آج تک خود اختیاری حکومت کی طلب میں مسلمان کسی دوسری قوم سے پیچھے نہیں رہے۔ اُس وقت سے لے کر ہندو مسلم مسئلے کو طے کرنے کی بہت سی کوششیں کی گئیں۔ اس وقت مجھ میں کسی قسم کا گھمنڈ نہ تھا اور میں کانگرس کے آگے ہاتھ پھیلاتا تھا۔ لیکن گول میز کانفرنس کے اجلاسوں میں مجھے انتہائی صدمہ ہوا۔ ہندوؤں کے رویئے سے میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اتحاد کی امید بے کار ہے۔ چنانچہ میں اپنے ملک کے متعلق مایوس ہو گیا۔ صورتِ حال بہت خراب تھی۔ مسلمان اس بنجر زمین کی طرح تھے جس کا کوئی والی وارث نہ ہو۔ ان کے لیڈر یا تو برطانوی حکومت کے چاپلوس ملازم تھے اور یا کانگرسی لشکر کے خدمت گزار۔ میں اس قدر مایوس اور غمگین ہوا کہ میں نے لندن میں سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ چار برس کے بعد جب میں نے دیکھا کہ مسلمان سخت ترین خطرے میں ہیں تو میں نے ہندوستان آنے کا ارادہ کر لیا (۱۹۳۴ء) یہاں آ کر مجھ سے وہی سلوک کیا گیا جو ایک بھکاری سے کیا جاتا ہے۔ پھر ۱۹۳۵ء میں میں نے صدر کانگرس سے گفت و شنید شروع کی، ۱۹۳۶ء میں میں نے کانگرس سے پھر کہا کہ خیر جو ہوا سو ہوا اب فرقہ وارانہ فیصلہ کی بابت یہ تلخ جھگڑا چھوڑ دو اور آؤ ہم مل کر ملک کے زیادہ اہم مسئلے کی طرف متوجہ ہوں۔ سو ان تمام مساعی میں ناکام ہو کر میں نے سوچا کہ اب حالات کا تقاضا کیا ہے؟ نئے دستور کی آمد آمد ہے ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۶ء تک ہوا تو یہ ہوا کہ کچھ بھی نہ ہو سکا۔ اس سخت نا امیدی میں بغیر اور سوچے میں نے آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس اپریل میں بمبئی میں طلب کیا جہاں لیگ نے صوبائی انتخابات لڑنے کا فیصلہ کیا۔ انتخابات میں ہم خاصی حد تک کامیاب رہے۔" "ہم محض قول و قرار اور خیر خواہی کے اظہار پر انحصار نہیں کر سکتے۔ سیاسیات کی دنیا کا دستور ہے کہ اگر آپ طاقتور ہوں گے تو آپ کے لئے خیر خواہی، پیار محبت اور پاسِ خاطر سبھی کچھ ہو گا ورنہ کچھ بھی نہیں۔ سو میری درخواست آپ سے یہی ہے کہ لیگ کے پلیٹ فارم پر آیئے۔ اگر مسلمان آپس میں متحد ہوں گے تو آپ کی اُمید اور اندازے سے کہیں پہلے سمجھوتہ ہو جائے گا اور آپ کی طاقت کی وجہ سے دُنیا آپ کے مطالبہ آزادی کو تسلیم کر لے گی"۔ برطانوی حکومت، کانگرس رجعت پسند مسلمان اور مولوی اِن چاروں سے رہائی پانے کے بعد کیا میں اپنے نوجوانوں سے درخواست کر سکتا ہوں کہ اب آپ اپنی عورتوں کو قید و بند سے چھڑائیں۔ یہ قطعاً ضروری ہے۔ اس سے میرا مطلب یہ نہیں کہ ہم مغرب کی نقالی کریں اور اُن کی بیہودگیاں اختیار کریں۔ میرا مطلب ہے کہ اب لازم ہے کہ ہم اپنی عورتوں کو نہ صرف اپنی معاشرتی زندگی میں بلکہ اپنی سیاسی زندگی میں بھی حصہ دار بنائیں۔ جنابِ صدر! آج آپ نے مجھے ایک شاندار پیغامِ امید دیا ہے۔ سو ہاں قدم بڑھایئے آگے کو قدم بڑھایئے پھر دنیا کی کوئی طاقت آپ کی راہ میں حائل نہ ہو سکے گی۔ مسلم لیگ نے آزادی حاصل کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے مگر یاد رہے کہ یہ آزادی صرف اربابِ قوت و اقتدار کے لئے نہ ہو گی بلکہ یہ ان لوگوں کے لئے بھی ہو گی جو آج کمزور و مظلوم ہیں۔"

گاندھی جی کو خط (۵ نومبر ۱۹۳۷ء) :- "مجھے آپ کا یہ خیال معلوم کر کے افسوس ہوا کہ آپ میری لکھنؤ والی تقریر کو اعلانِ جنگ سمجھتے ہیں وہ محض اپنے بچاؤ کے لئے کی گئی ہے۔ براہِ کرم اسے دوبارہ پڑھیئے اور اُسے سمجھنے کی کوشش کیجیے۔"

گاندھی جی کو خط (۱۵ فروری ۱۹۳۸ء) "قومیت کسی ایک خاص فرد کا اجارہ نہیں اور آج کل تو اس کی تعریف کرنی بھی بہت مشکل ہے۔"

گاندھی جی کو خط (۳ مارچ ۱۹۳۸ء) "آپ کے خط سے مجھے یہ پتہ نہیں چل سکا کہ آپ کی رائے میں ابھی آپ کو روشنی نظر آئی ہے یا نہیں اور سمجھوتے کا وقت ابھی آیا ہے یا نہیں؟"

گاندھی جی کو خط (۲۱ جنوری ۱۹۴۰ء): "آپ کی منطق غلط ہے کیونکہ آپ شروع ہی ایک ہندوستانی قوم کے نظریئے سے کرتے ہیں جس کا کہیں وجود نہیں۔" "آپ کے مضمون میں بہت کچھ ہے جو فقط تخیل کا نتیجہ ہے۔ اس کی کچھ تو یہ وجہ ہے کہ آپ شیوگاؤں میں الگ تھلگ زندگی گزارتے ہیں اور کچھ یہ کہ آپکے افکار و اعمال پر "اندرونی آواز" چھائی ہوئی ہے۔ حقائق سے آپ کو بہت کم واسطہ پڑتا ہے۔ وہ حقائق جنھیں ایک معمولی انسان عملی سیاسیات پکارتا ہے۔ کیا میں کسی طرح یہ توقع کر سکتا ہوں کہ آپ وہ کام کریں گے جو آپ کے لئے موزوں ہے اور ایک سراب کے پیچھے دوڑنا چھوڑ دیں گے۔"

پنڈت جواہر لال نہرو کو خط (۱۲ اپریل ۱۹۳۸ء): "جیسا کہ آپ خود بڑی دیانت داری سے کہتے ہیں آپ کے نفس کو بین الاقوامی حالات سے ہندوستان کے حقائق سے بہت دور پڑے رہتے ہیں۔" "آپ کے لہجے اور الفاظ سے وہی تکبّر اور فوجی سپرٹ ٹپکتی ہے گویا کہ کانگرس ایک مختار کل طاقت ہے اور اس لئے آپ بڑے حاکمانہ انداز میں فرماتے ہیں کہ ہاں مسلم لیگ بھی ایک اہم فرقہ وار جماعت ہے۔" "یہاں میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ میری رائے میں جب تک کانگرس مسلم لیگ کو اپنے برابر کی جماعت تسلیم نہ کرلے گی اور اس حیثیت سے اُس سے ہندو مسلم سمجھوتے کے لئے گفتگو نہ کرے گی ہمیں اس کے لئے انتظار کرنا پڑے گا اور اس دوران میں فقط اپنی اصلی طاقت پر انحصار کرنا ہوگا۔"

خطبۂ صدارت سالانہ اجلاس آل انڈیا مسلم لیگ پٹنہ (۲۶ دسمبر ۱۹۳۸ء): "مسلمان نوجوان اور میرے عزیز دوست مسلمان نوجوانو! یہ سب کانگرس کے جھوٹے نعروں سے مرعوب و مسحور ہوگئے تھے۔ یہ تھی ۱۹۳۶ء میں حالت۔ لیکن میں خوش ہوں کہ آج حالات بدل گئے ہیں۔ اب کانگرس کی قلعی بالکل کھل چکی ہے۔ کانگرس مسلمانوں سے کوئی سمجھوتہ نہیں کرنا چاہتی۔ میں سب کو مطلع کردینا چاہتا ہوں کہ ہم مسلمان کوئی عطیہ نہیں چاہتے۔ مسلمان کوئی رعایت نہیں مانگتے۔ ہندوستان میں قومی شعور کی اہم صفت پیدا ہو چکی ہے۔ یہ ہے وہ طاقت جو ان کی پشت پر کام کر رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ مسلمان اپنے میں یہی طاقت پیدا کریں۔ یہ ایک بہت بڑا کام ہے اور تم نے بمشکل ابھی اسے شروع ہی کیا ہے۔ لیکن مجھے اپنی کامیابی کی بڑی امید ہے۔"

"ہم مسلمانانِ ہند نے ارادہ کرلیا ہے کہ ہم اپنے مکمل حقوق لے کر رہیں گے۔ مسلمانوں کو زیادہ عرصے تک دھوکے میں نہیں رکھا جا سکتا۔ مسلمانوں کا اور مسلم لیگ کا صرف ایک ہی حلیف ہے اور وہ مسلم قوم ہے اور ایک اور صرف ایک ہی ہے جس سے وہ مدد کے متوقع ہیں اور وہ خدا ہے۔" "اب فیصلہ کرنا تمہارے اختیار میں ہے تمام ذمہ داری تمہاری ہوگی۔ اس وقت تم موت و حیات کی کش مکش میں مبتلا ہو سو معمولی اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر اپنی توجہ منعطف نہ ہونے دو۔ آج صبح ہی چند نوجوان میرے پاس آئے اور کہا کہ فلاں فلاں اشخاص لیگ میں کیوں شامل ہیں؟ میں ان نوجوانوں اور دوسرے لوگوں سے یہ کہتا ہوں کہ لیگ ابھی وہ نہیں جو اسے ہونا چاہیئے۔ میں تسلیم کرنے کو تیار ہوں کہ ایسے لوگ لیگ میں شامل ہیں جو لوگوں کے سچے لیڈر نہیں۔ لیکن مسلم لیگ تمام مسلمانوں کی جماعت ہے۔ یہ تمہاری جماعت بھی ہے۔ پس اس میں آکر شریک ہو جاؤ اور اگر اس میں کوئی خرابی ہے تو آؤ اور اُسے درست کرو۔ اس لئے میں ہر ایک سے درخواست کرتا ہوں کہ آؤ مسلم لیگ میں آؤ، یہ تمہاری اپنی جماعت ہے۔ یہ کسی خاص شخص کی جائداد نہیں یہ تمہاری اپنی جماعت ہے اور تم اسے جیسی بھی چاہو بنا سکتے ہو۔ مجھے بہت خوشی ہے کہ مسلمانوں میں خاصی بیداری پیدا ہو گئی ہے۔ وہ حقیقی مسائل کو سمجھنے لگے ہیں۔ یہ بلا شبہ ایک شاندار آغاز ہے۔ اس آغاز کے بعد اب اگر تم اپنی طاقتوں کو جمع کرو اور ایک منظم فوج کی طرح اُن سے کام لو تو فتح یقیناً تمہاری ہوگی۔"

یومِ عید پر تقریر (۱۳ نومبر ۱۹۳۹ء) "ماہِ رمضان کی ریاضت آج خدا کے حضور ہمارے دلوں کے ایک غیر فانی انکسار پر منتج ہوگی۔ لیکن ہمارا انکسار ایک کمزور دل کا انکسار نہ ہوگا۔ وہ لوگ جو دل کی کمزوری کو سراہتے ہیں وہ گویا خدا اور رسولؐ دونوں پر الزام دھرتے ہیں کیونکہ تمام مذاہب کا ایک

نمایاں اصُول جو بظاہر باطل مگر درحقیقت صحیح ہے یہ ہے کہ وہ لوگ جو منکسر المزاج ہوں گے انھیں کو قوت حاصل ہوگی اور اسلام میں تو اس کا ایک خاص مفہوم ہے کیونکہ اسلام کے معنی ہی ہیں عمل - رمضان کی ریاضت سے ہمارے رسولؐ کا مقصد یہ تھا کہ ہمیں عمل کے لئے ضروری طاقت حاصل ہو عمل کے لئے لازم ہے کہ ہم دوسروں سے راہ و رسم رکھیں قرآن کریم کی رُو سے عبادت اور روزمرہ کی زندگی میں گہرا تعلق ہے - تم کو معلوم ہے کہ ہم کتنے عجیب و غریب مواقع دیئے جاتے ہیں کہ ہم اپنے ہم جنسوں سے تعلق پیدا کریں اُن کے حالات کو نگاہ غور سے دیکھیں - اُن کی ضروریات سمجھیں اور پھر اُن کی خدمت کریں - اور دیکھو کہ یہ سب مواقع نماز کے آئین کے ذریعے پیدا کئے گئے ہیں جو انسان کی معاشرتی حس کی تکمیل کرنے کے لئے وضع کیا گیا ہے قرآن میں انسان کو خدا کا خلیفہ پکارا گیا ہے - اس کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح خدا نوع انسان سے سلوک کرتا ہے اسی طرح ہم بھی دوسروں سے کریں یعنی محبت اور درگزر کرنا سیکھیں - وہ روحانی نور جو ماہ رمضان کے نماز و روزہ نے ہمارے دلوں میں روشن کیا ہے، اس کا بہترین مظاہرہ یہی ہے کہ ہم اپنے گھروں میں اپنی قوم کے اندر اور اپنے ملک میں جس میں مختلف مذاہب کے پیرو موجود ہیں مکمل اتحاد و یک جہتی پیدا کریں اور اپنی خانگی یا پبلک زندگی دونوں میں اپنی ذاتی اغراض کے لئے نہیں بلکہ اپنے تمام ہم وطنوں اور بالآخر تمام نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لئے مصروف عمل ہوں یہ ایک عظیم الشان نصب العین ہے اور اس کے لئے بہت کوشش اور قربانی کی ضرورت ہے - نوجوان مجھ سے اکثر پوچھا کرتے ہیں کہ ہم کس طرح ملک کی خدمت کرسکتے ہیں آج میں اُن سے یہ کہوں گا کہ مستقبل میں ہمارے کچھ حقوق و مطالبات ہوں گے - مگر ان کے متعلق ہم کو ضد یا ہٹ سے کام نہ لینا چاہیئے - کیونکہ ضد اور ہٹ اُس رُوحِ الفت و رواداری کی نفی کردے گی جس سے آج عید کے دن ہمارے دل معمور ہونے چاہئیں - ہم میں سے ہر ایک اپنے وطن کی خدمت اپنی ہی نفسی ریاضت سے کرسکتا ہے اور وہ اس طرح کہ ہم میں سے ہر ایک اپنے آپ سے یہ پوچھے کہ کیا میں اپنی عادات میں باقاعدگی رکھتا ہوں؟ کیا میں وقت پر سوتا ہوں؟ سڑک پر غلاظت تو نہیں پھینکتا؟ اپنے کام میں دیانت دار اور سچا ہوں؟ کیا میں دُوسروں کی حتی القدور مدد کرتا ہوں؟ کیا میں لوگوں سے رواداری کا سلوک کرتا ہوں؟ یہ بظاہر چھوٹی چھوٹی باتیں معلوم ہوتی ہیں لیکن فی الحقیقت انہیں سے وہ ریاضتِ نفس ہوسکتی ہے جو سب اقوام کی متحدہ مساعی کے ذریعے سے ہمارے ملک کو ایک زیادہ عظیم الشان ملک بنانے میں کام آئے گی - آخر میں مَیں آپ سب کو تاکید کے ساتھ کہوں گا کہ یہ کبھی نہ بھولئے کہ اسلام ہر مسلمان سے توقع رکھتا ہے کہ وہ اپنی قوم کی طرف اپنا فرض ادا کرے۔"

ٹائمز اینڈ ٹائیڈ (لندن) میں مقالہ (۱۹ جنوری ۱۹۴۰ء):- "جمہوری دستور ہندوستان کے لئے قطعاً ناموزوں ہے، وہ انگلستان کے سے ممالک کے لئے موزوں ہوسکتا ہے جہاں ایک متجانس قوم بستی ہو نہ کہ ہندوستان کے لئے جہاں مختلف اور متضاد عناصر پائے جاتے ہیں - اس لئے ہمیں ایک ایسے دستور کی تشکیل ضروری ہے جو اس حقیقت پر مبنی ہو کہ ہندوستان میں دو مختلف قومیں آباد ہیں۔"

لارڈ لنلتھگو وائسرائے ہند کے خط کے جواب میں (۲۳ فروری ۱۹۴۰ء):- "آپ کے اس بیان سے (کہ ہندوستان کا دستور طے کرتے وقت مسلمانوں کی حیثیت کا خیال رکھا جائے گا) مسلم لیگ کا نکتہ حل نہیں ہوا کیونکہ اس سے صرف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہندوستان کے نو کروڑ مسلمانوں سے محض کچھ معمولی سا مشورہ لیا جائے گا اور اسلامی ہند کا مقدر اور مستقبل طے کرنے کا آخری اختیار برطانیہ کے ہاتھ میں ہوگا - ہم بہت افسوس سے کہتے ہیں کہ ہم اس پوزیشن کو منظور نہیں کرسکتے۔"

مسلم لیگ کونسل میں تقریر (۲۵ فروری ۱۹۴۰ء):- "لوگ مجھ سے پُوچھتے ہیں ہمارا نصب العین کیا ہے؟ یہ تو ایک بالکل سیدھی بات ہے - برطانیہ ہندوستان پر حکومت کرنا چاہتا ہے - مسٹر گاندھی اور کانگرس ہندوستان اور اسلامیان ہند دونوں پر حکومت کرنا چاہتے ہیں

ہم کہتے ہیں کہ ہم نہ برطانیہ کو مسلمانوں پر حکومت کرنے دیں گے نہ مسٹر گاندھی کو۔ ہم خود آزاد ہونا چاہتے ہیں۔"

مسلم یونیورسٹی یونین علی گڑھ میں تقریر (۶ مارچ ۱۹۴۰ء) :۔ "کسی دوسرے شخص پر بھروسہ کرنا بیکار ہے۔ ہمیں صرف اپنے آپ پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔ میں سب کا دوست بننے کو تیار ہوں مگر انحصار کروں گا تو صرف اپنی ذاتی قوت پر۔ مسلم لیگ نے اس وقت تک معقول کام کیا ہے مگر ابھی اس کی ابتدا ہے تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ فی الحقیقت ہندوستان میں بھی اس وقت جنگ ہی ہو رہی ہے۔ میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ شانہ بشانہ کھڑے ہو جاؤ اور مسلم لیگ کے ساتھ مل کر کام کرو ایک مضبوط و مستحکم فولادی پیکر کی طرح اپنی جگہ پر قائم رہو اپنی قوم کی تنظیم کرتے جاؤ، اس کی تربیت کئے جاؤ، دقتوں کی فکر نہ کرو، مسلمانوں کو منظم کر کے سب کو یکجا کر دو، اُن کو پابندیٔ کار سکھاؤ اور اس طرح اُن کو ایک ایسی حیرت انگیز سیاسی فوج بنا دو کہ ملک ہند نے کبھی دیکھی سنی نہ ہو۔ ایسا کرنے کے تو یقیناً تم جلد اپنی آزادی کی منزل مقصود تک پہنچ جاؤ گے !"

مولانا ابوالکلام آزاد کو تار (۱۲ جولائی ۱۹۴۰ء) :۔ "آپ کا تار ملا۔ میں جواب میں آپ پر اعتماد ظاہر نہیں کر سکتا۔ کیونکہ آپ اسلامی ہند کا اعتماد کھو چکے ہیں۔ کیا آپ اتنا نہیں سمجھ سکتے کہ آپ کو کانگرس کا ایک نمائشی ("شو بوائے") مسلمان صدر بنایا گیا ہے تاکہ اُسے بظاہر قومی رنگ دے کر دوسرے ملکوں کو دھوکا دیا جا سکے ؟ آپ نہ مسلمانوں کے نمائندے ہیں نہ ہندوؤں کے۔ کانگرس ایک ہندو جماعت ہے۔ اگر آپ میں ذرا بھی خودداری ہے تو فوراً استعفیٰ دے دیجئے۔ آپ نے اب تک لیگ کے خلاف جو کچھ آپ سے ہو سکا کیا۔ آپ جانتے ہیں کہ آپ قطعاً ناکام رہے ہیں۔ بس اب اس کام سے ہاتھ اٹھا لیجئے۔"

لاہور پہنچنے کے بعد اخبار نویسوں کے سامنے بیان (۲۱ مارچ ۱۹۴۰ء) :۔ "مسلم لیگ کا اجلاس لاہور اسلامی ہند کی تاریخ میں ایک نئے باب کا افتتاح کرے گا۔"

منٹو پارک میں اسلامی پرچم لہراتے وقت تقریر (۲۱ مارچ ۱۹۴۰ء ۴½ بجے شام) :۔ "جتنی بڑی قوم ہوگی اتنی ہی زیادہ مشکلات کا اُسے سامنا کرنا پڑے گا۔ مجھے اپنی قوم پر پورا اعتماد ہے اور مجھے یقین کامل ہے کہ مسلمان متحد ہو کر دنیا کی تمام مشکلات و تکالیف کا کامیابی سے مقابلہ کریں گے۔"

خطبہ صدارت سالانہ اجلاس ۲۷ آل انڈیا مسلم لیگ لاہور (۲۲ مارچ ۱۹۴۰ء) "خواتین و حضرات! گزشتہ ۱۵ ماہ میں ہم نے بہت ترقی کی ہے اسلامی ہند اب بیدار و ہوشیار ہو گیا ہے اور مسلم لیگ نے ایک ایسے مضبوط ادارے کی حیثیت حاصل کر لی ہے کہ کوئی شخص بھی اسے فنا نہیں کر سکتا۔ آدمی آتے جاتے رہیں گے لیکن لیگ ہمیشہ قائم رہے گی۔ جنگ چھڑ جانے کے بعد ہماری یہ حالت تھی کہ ایک طرف کنواں تھا اور دوسری طرف کھائی تھی۔ لیکن کوئیں یا کھائی سے اب ہمیں ڈرنا نہ چاہیئے۔ بہرحال ہم یقیناً ہندوستان کی آزادی کے طالب ہیں لیکن یہ آزادی تمام ہند کی آزادی ہونی چاہیئے نہ یہ کہ ایک جماعت کو آزادی مل جائے اور مسلمان اور دوسری اقلیتیں بدستور غلام بنی رہیں۔ سنئے پچھلے دنوں جناب گاندھی نے کہا کہ "میرے لئے ہندو مسلمان پارسی اور ہریجن سب برابر ہیں۔ قائد اعظم میرے بھائی ہیں"۔ ہاں فرق صرف یہ ہے کہ بھائی گاندھی کے تین ووٹ ہیں اور میرا صرف ایک ووٹ ہے۔" آئندہ آئین کے متعلق ہم صاف کہتے ہیں کہ ہم نو کروڑ مسلمانوں کے مستقبل اور مقدر کو کسی دوسرے منصف کے ہاتھ میں نہیں چھوڑ سکتے اپنے معاملہ میں ہم خود اور صرف ہم ہی اپنے آخری ثالث بننا چاہتے ہیں۔ ایک بات بالکل صاف ہے۔ یہ ہمیشہ غلط سمجھا جاتا رہا کہ مسلمان ایک اقلیت ہیں

مسلمان ایک اقلیت نہیں ہیں بلکہ ہر اعتبار سے ایک قوم ہیں۔ ایک ہزار سال سے ہندو مسلمانوں کی دو قومیں ایک دوسرے سے دوچار رہی ہیں مگر ان کے اختلافات اسی پرانی شدت سے قائم ہیں۔ اُن کی نسبت یہ توقع رکھنا کہ ایک جمہوری آئین کے جبری دباؤ سے وہ ایک واحد قوم بن جائے گی سراسر غلطی ہے۔ ہندوستان کا سیاسی مسئلہ دو فرقوں کا مسئلہ نہیں بلکہ صریحاً دو قوموں کا مسئلہ ہے اور اس کا فقط ایک ہی حل ہے کہ ہندوستان کو دو مختار قومی ریاستوں میں تقسیم کر کے یہاں کی دونوں بڑی قوموں کے قومی وطن متعین کئے جائیں۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ یہ دو قومیں آپس میں دشمنی رکھیں بلکہ اس سے اُن کی باہمی رقابت اور ایک دوسرے پر غلبہ پانے کی خواہش مٹ کر ان کے باہمی تعلقات سُدھر جائیں گے۔ یاد رکھو اسلام اور ہندو دھرم محض دو مذہب نہیں ہیں بلکہ درحقیقت وہ دو مختلف اور متمیز معاشری نظام ہیں اور یہ ایک خواب موہوم ہے کہ ہندو اور مسلمان مل کر کبھی ایک مشترک قومیت کی تخلیق کر سکتے ہیں۔ ہندو مسلمانوں کا مذہبی فلسفہ۔ رسم و رواج۔ علم و ادب سب جُدا جُدا ہیں، زندگی کے بابت اُن کے تصورات مختلف ہیں، ان کی روایات مختلف اُن کی قومی حکایات، ان کے ہیرو ان کے کارنامے سب الگ الگ ہیں۔ ایسی دو قوموں کو ایک ہی مملکت میں اکٹھا جوڑ دینے سے یوں کہ ایک ہمیشہ اقلیت میں رہے اور دوسری اکثریت میں لازم طور پر یہی نتیجہ ہوگا کہ آپس کی رنجشیں بڑھیں گی اور آخر کار وہ مملکت اور اس کی حکومت کا ڈھانچہ دونوں خاک میں مل جائیں گے۔ تاریخ میں ہمیں بہت سی ایسی مثالیں ملتی ہیں (دنیا میں اگر اور جگہ ایک ہی خطۂ زمین میں مثلاً بلقان میں کئی قوموں کے کئی ملک یا جزیرہ نما آئبیریا میں دو قوموں کے لئے دو ملک سپین اور پرتگال بن سکتے ہیں تو پھر ہندوستان میں ایسا کیوں نہیں کیا جا سکتا؟) جس قسم کی جمہوریت کے ارباب کانگرس شیدائی ہیں اس کا نتیجہ صرف یہی ہوگا کہ اسلام میں جو کچھ فی الحقیقت قابل قدر و قیمت ہے وہ سب کا سب قطعاً برباد ہو جائے گا۔ اقلیت سے جو مراد لی جاتی ہے اور اُس کے جو معنی سمجھے جاتے ہیں مسلمان اس معنی میں ہرگز ایک اقلیت نہیں ہیں۔ قومیت کی خواہ کوئی سی تعریف کرو مسلمان ہر طرح سے ایک جداگانہ قوم ہیں اور اس لئے انھیں لازمی طور پر ان کا وطن اُن کی مملکت اور اُن کی خود مختار ریاست ملنی چاہیے۔ ہم مسلمان چاہتے ہیں کہ ہم ایک آزاد قوم بن کر اپنے ہمسایوں کے ساتھ مل کر امن و امان اور ہم آہنگی سے زندگی بسر کریں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہماری قوم اپنی روحانی تمدنی، اقتصادی معاشری اور سیاسی زندگی کو کامل ترین نشوونما بخشے اور اس غرض سے وہ طریقِ عمل اختیار کرے جو اس کے نزدیک بہترین ہو اور اور جو ہمارے اپنے نصب العین کے مطابق اور ہماری قوم کی اپنی افتادِ طبع کے حسب حال ہو۔ دیانت داری کا یہ تقاضا ہے اور ہماری قوم کے کروڑوں افراد کے مفاد کا مطالبہ بھی یہی ہے کہ ہم ایک ایسے عزت مند اور پُرامن سمجھوتے کی تلاش کو اپنا ایک پاک فرض قرار دیں جو سب کے لئے منصفانہ ہو سکے بایں ہمہ یہ بھی لازم ہے کہ ہم دوسروں کی دھمکیوں اور جبر و تشدد سے متاثر ہو کر اپنے مقصد و منتہا سے ایک لمحے کے لئے بھی دست کش نہ ہوں۔ ہمیں تیار رہنا چاہیے کہ ہم تمام ممکن مشکلات اور نتائج کا مقابلہ کریں اور اپنے نصب العین تک پہنچنے میں کسی قسم کی قربانی سے بھی جو ہمیں دینی پڑے مطلق دریغ نہ کریں

خواتین و حضرات! یہ ہے وہ کام جو ہمیں درپیش ہے۔ میں نے اس کو واضح کر دیا ہے، کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ کس قدر بڑا اور عظیم الشان کام ہے؟ کیا سمجھتے ہیں کہ آزادی یا خود مختاری محض دلائل سے حاصل نہیں ہو سکتی؟ آخر سمجھدار مسلمان اپنی آزادی کے لئے کیا کچھ کرنے کو تیار ہیں۔ میں آپ کو بتا چاہتا ہوں کہ جب تک یہ خواہش آپ کے رگ و ریشے میں خون بن کر نہ دوڑنے لگے گی۔ جب تک آپ ہر قسم کی قربانی کرنے پر آمادہ نہ ہو جائیں گے اپنی ملّ کے لئے بے غرضی، جوش اور خلوص کے ساتھ کام کرنے پر تیار نہ ہو جائیں گے آپ کبھی اپنے مقصد کو نہ پا سکیں گے۔ سو دوستو! اس بات کا پکا ارادہ کیجیے پھر اپنے کام کی تجاویز سوچیے اور اپنی ملت کو منظم کیجیے اپنی جماعت کو مضبوط کرو اور یوں مسلمانانِ ہند کو ایک زبردست منظم و متحد قوم بنا دیجیے۔ میں سمجھ ہوں کہ ہمارے عوام بیدار ہو چکے ہیں صرف انھیں آپ کی رہنمائی کی حاجت ہے سو آئیے اور اسلام کے خادم بن جائیے اور اپنی قوم کو اقتصادی معاشرتی تعلیمی اور سیاسی غرض ہر پہلو سے منظم کر دکھائیے۔ اگر آپ ایسا کریں گے تو مجھے یقین ہے کہ آپ ایک [illegible] طاقت بن جائیں گے جسے ہر شخص چون و چرا تسلیم کر لے گا!"

بشیر احمد

(باقی)

(سید منظور حسین بخاری پرنٹر پبلشر مینجر نے اتحاد پریس بل روڈ لاہور میں چھپوا کر ۳۲ لارنس روڈ لاہور سے شائع کیا۔ صرف سرورق رپن پریس میں چھپا)

بشیر احمد

بیادگارِ علامۂ فصیح آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

فہرستِ مضامین

جلد ۵۴

نمبر ۵

ہمایوں بابت ماہ نومبر ۱۹۴۸ء

ایڈیٹر: بشیر احمد بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لاء

جائنٹ ایڈیٹر: شیر محمد اختر

نمبر شمار	مضمون	صاحبِ مضمون	نمبر صفحہ
۱	نئے ارادے	بشیر احمد	۴۳۴
۲	بزمِ ہمایوں	ب ل	۴۳۶
۳	نئی راہ (نظم)	جناب کرم حیدری صاحب ایم۔اے	۴۴۰
۴	قائدِ اعظمؒ کی موت اور قوم کا عزم	بشیر احمد	۴۴۱
۵	غروبِ ماہتاب	محترمہ "شیریں" صاحبہ	۴۵۲
۶	قائدِ اعظمؒ (تاریخِ وفات)	جناب حفیظ ہوشیارپوری صاحب ایم۔اے	۴۵۳
۷	محفل سے اُٹھ کے انجمن آرا کدھر گیا؟	" کشفی ملتانی صاحب	۴۵۴
۸	ارشاداتِ قائدِ اعظم	بشیر احمد	۴۵۵
۹	غزل	جناب عبدالمتین عارفؔ صاحب بی۔اے	۴۶۱
۱۰	حضرت بایزید	" میاں عبدالعزیز صاحب فلک پیما	۴۶۲
۱۱	رُباعیات	" جلال مرزاخانی صاحب	۴۶۳
۱۲	"یا تو خود آشکار ہو" (سعادت حسن منٹو)	ب ل	۴۶۴
۱۳	پاکستان میں شخصی آزادی	جناب محمد حسن عسکری صاحب	۴۶۵
۱۴	"۱۷ ستمبر ۱۹۴۸ء" (نظم)	" خاطر غزنوی صاحب	۴۶۶
۱۵	عنوان سے دُور دُور (افسانہ)	محترمہ اختر جہاں صاحبہ	۴۶۷
۱۶	اجل سے (نظم)	" نسیمہ درز صاحبہ	۴۶۹
۱۷	غزل	جناب تابش صدیقی صاحب بی۔اے	۴۷۰
۱۸	غزل	" باقی صدیقی صاحب	۴۷۱
۱۹	مطبوعات		۴۷۲

عکسِ تحریرِ قائدِ اعظم رح

چندہ سالانہ ۶ صہ

ششماہی ۳ سے ر

فی پرچہ ۸

ہمایوں اپنے قارئین سے توقع رکھتا ہے کہ وہ اُس کی ترقی میں عملی دلچسپی لیں گے اور مدیر ہمایوں کو اپنی تجاویز سے مطلع

نئے ارادے

ہمایوں کی شکل وصورت میں آج کچھ تبدیلی نظر آتی ہے، ہم چاہتے ہیں کہ یہ تبدیلی محض ظاہری نہ ہو، باطنی بھی ہو اور یہ اس لئے کہ آج نئے حالات کے ماتحت کچھ نئے ارادے ہمارے دل میں موجزن ہو رہے ہیں!

آج تک ہمایوں اپنی بعض قدیم روایات سے وابستہ رہا بلکہ چپکے چپکے اُن پر فخر بھی کرتا رہا۔ اُن کی وجہ سے اُس نے اُردو کی محفل میں کچھ وقار حاصل کیا اور اُنہیں کی وجہ سے وہ بعض حلقوں میں مشہور ہو گیا اور بعض حلقوں میں بدنام۔ اب جو کچھ تبدیلی ہم ہمایوں میں کرنا چاہتے ہیں وہ نہ کسی نئی شہرت کی تمنا کے سبب سے ہے نہ کسی پُرانی بدنامی کے ڈر کے باعث ہے۔

ہمایوں کی بعض روایات جہاں تک ہمارے بس میں ہے قائم رہیں گی۔ ہمیں اس بات پر فخر ہے کہ اُردو کی پوری تاریخ میں صرف ہمایوں وہ رسالہ ہے جو ستائیس سال سے ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا رہا۔ پچھلے سال بھی علمی و ادبی رسائل میں فقط ہمایوں وہ رسالہ تھا جو باوجود بیسیوں دقتوں کے شدید فرقہ وارانہ فسادات کے دوران میں ہر ماہ اپنے مقررہ وقت پر نکلا۔ اُمید ہے کہ آئندہ بھی ہمیں یہ توفیق حاصل رہے گی۔ ہمایوں ارتقا کا قائل رہے انقلاب کا علم بردار نہیں اگرچہ اُسے اِس امر کا اعتراف ہے کہ جو ارتقا جمود بن کر رہ جائے وہ انقلاب کے پاؤں تلے کچلے جانے کا مستحق ہے۔ ہمایوں عُریانی سے متنفر ہے اگرچہ اُسے اِس بات کا اقرار ہے کہ محض بندش اور اخفا سے نہ خرابیوں کا علاج ممکن ہے اور نہ خوبیوں کو فروغ مل سکتا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ ہمایوں اعتدال کی راہ پر قائم ہے، وہ قدیم و جدید کے امتزاج کا حامی ہے، وہ اپنی قوم کے سامنے اسلامی تہذیب اور پاکستان کے اُس نصب العین کو واضح کرنا چاہتا ہے جو اُس کے خیال میں اس دم بدم بدلتی ہوئی دنیا میں اسلام کی ازلی قدروں کو وقت کے نت نئے سانچے میں ڈھالتا چلا جائے اور جس سے بلا امتیازِ مذہب و ملّت خواص کی بھلا اور عوام کی بہتری کی صورت رُونما ہو جائے!

لیکن آج ہمایوں کو اس امر کا احساس بھی ہو رہا ہے کہ اُس کی بعض پرانی روایات کے ساتھ ساتھ اب حالات کے نئے تقاضے سے نئی راہیں تلاش کرنے اور نئے مسائل کو حل کرنے کے لیے زیادہ وسعتِ نظر اور تیز رفتاری کی ضرورت ہے۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کے قیام کے بعد جس طرح ہماری قوم اور خصوصًا ہمارے اکابر نے اس سیاسی و تہذیبی انقلاب کا پُورا احساس نہ کیا اسی طرح ہمارے علما و اُدبا بھی عملًا اس سے عہدہ برآ نہ ہو سکے۔ ہمایوں بھی اپنی پُرانی ڈگر پر چلتے ہوئے زیادہ تر اپنی معمولی علمی و ادبی مصروفیتوں میں منہمک رہا۔ پاکستان کے قیام کی پہلی سالگرہ کے بعد ہمیں اس بات کا احساس ہوا کہ پاکستانی ادیبوں نے اپنی آزادی کا پہلا سال ایسے ہی گزر جانے دیا۔ چنانچہ ستمبر کی بزمِ ہمایوں میں بعض ترقی پسند اُدبا کی تخریبی کارروائیوں کی طرف توجہ دلا کر ہم نے اپنے ادیبوں سے بالعموم اور ہمایوں کے مقالہ نگاروں اور شاعروں سے بالخصوص یہ استدعا کی تھی کہ وہ اِس آڑے وقت میں اپنی ادبی سرگرمیوں سے قوم کی جدوجہد اور ترقی میں ایک نئے انداز سے حصّہ لیں۔ یہ آواز اوروں نے بھی بلند کی اور آج ہم دیکھتے ہیں کہ پاکستانی ادیبوں میں قومی بیداری کے آثار صاف طور پر ظاہر ہو رہے ہیں۔

اِس کے بعد قائدِ اعظم ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے اور ساتھ چند اور سیاسی پیچیدگیاں بھی پیدا ہو گئیں۔ قوم غم میں ڈوبی، ڈر سے کانپی، لیکن خدا کا شکر ہے کہ اسی غم وخوف کے اندر سے اُس کے دل میں نیا احساس پیدا ہوا۔ اب اگر ہمارے اربابِ اقتدار اور اصحابِ فکر اپنا اپنا فرض سرانجام دیں تو یہ نیا احساس ایک نئے عزم اور یہ عزم ایک پیہم عمل کی صورت اختیار کر سکتا ہے۔ قوموں کی زندگی میں ایسے نازک اور خطرناک اوقات بیش بہا ہوتے ہیں اور ایک شاندار مستقبل کا پیش خیمہ بن سکتے ہیں

کیا ہم اس موقع سے فائدہ اٹھائیں گے؟

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے ہم ایک نئے ملک کے شہری بن گئے، ہماری قوم آزاد ہوگئی۔ صحیح ادب ہمیشہ زندگی کے ساتھ بدلتا ہے۔ اب ہمارے ادیبوں کی ذمہ داریاں بدرجہا بڑھ گئی ہیں۔ انھیں صحیح اسلامی نصب العین اور پاکستانی قومیت کو فروغ دینا ہے۔ انھیں قوم کی آزادی کو برقرار رکھنا اور مستحکم کرنا ہے۔ انھیں اکابر و عوام کے درمیان جو خلیج حائل ہے اسے پاٹنا ہے اور قوم کے مختلف طبقوں کو ایک دوسرے سے مربوط کرکے قوم کو مضبوط بنانا ہے۔ انھیں قوم کو آزادی کا مصرف بتانا ہے، حال کی تخریب میں مستقبل کی تعمیر کرنی ہے، لوگوں کو امید دلانی اور اُن کے دلوں میں ولولہ پیدا کرنا ہے۔ یہ اور اسی طرح کے اور قومی کام انھیں جرأت و دلیری سے لیکن ساتھ ہی احتیاط اور حکمت عملی سے سرانجام دینے ہیں۔ خذ ما صفا پر عمل کرتے ہوئے انھیں قوم کے لئے قدیم و جدید کا ایک صحت بخش مرکب تیار کرنا ہے، افراط و تفریط کے درمیان انھیں اعتدال اور سلامت روی کی راہ دکھانی ہے۔ انھیں لوگوں کو تعلیم دینی ہے، اُن کی تربیت کرنی ہے اور متضاد عناصر کو ایک حد تک ہموار اور ہم آہنگ کرنا ہے۔

ہمایوں کے موضوعات اب کیا ہوں گے؟ اس کی بابت سردست کسی قسم کی چھوٹی یا لمبی فہرست پیش کر دینا غلط ہوگا۔ یوں تو سب قسم کی معلومات ایک ترقی پرور قوم کے لئے مفید ہوتی ہیں۔ لیکن ہمارے انشا پردازوں کو فی الحال یہ دیکھنا چاہیے کہ قوم کے لئے اس وقت کس قسم کی علمی و ادبی، معاشرتی و روحانی، اقتصادی و سیاسی معلومات کی زیادہ ضرورت ہے؟ پاکستان کی ترقی کن کن مادی و اخلاقی ذرائع سے ہو سکتی ہے؟ پھر ان مضامین کی شکل کچھ ہو، وہ قومی تاریخ سے متعلق ہوں یا حالات حاضرہ سے، تنقیدی مضامین ہوں یا افسانے، نظمیں ہوں یا ادب لطیف لیکن اُن سے قوم کے افراد اُبھریں نہ کہ رُکیں وہ محض اُن کی تفریح طبع یا دماغی عیاشی یا ذہنی موشگافی کا سامان نہ ہوں بلکہ فنی و ادبی اوصاف رکھتے ہوئے وہ اُن میں جینے اور کام کرنے اور ایک بلند قومی و انسانی منتہا تک پہنچ جانے کی اُمنگیں پیدا کر دیں۔ تقطیع اشعار پر پندرہ پندرہ صفحے لمبے اور ایسے ہی اور دقیق بھاری بھرکم مضامین کے لئے اب ہمایوں میں جگہ نہ نکل سکے گی۔ خالص ادبی مضامین کے لئے ہمایوں کا دروازہ بالکل بند نہ ہوگا لیکن ہم ایسے مضامین کا اور بھی خیر مقدم کریں گے جو کسی نہ کسی طرح قوم و ملک کے تعمیری کاموں میں اُن کے لئے زیادہ سود مند ثابت ہو سکیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ان تبدیلیوں کے لئے خاص توجہ درکار ہے اور محنت اور وقت۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم نے اپنے قائد اعظم (اکتوبر) نمبر ہی سے اپنا فرض ادا کرنا شروع کر دیا ہے لیکن بغیر ہمارے محترم مقالہ نگاروں کے تعاون و مشقت اور ہمارے قارئین کی دلچسپی و وابستگی کے یہ کام بخوبی سرانجام نہ ہو سکے گا۔ اس کے لئے ہم بے تابی سے منتظر رہیں گے۔ ہم نئے انشا پردازوں کو خاص طور پر دعوت دیتے ہیں اور اپنے قارئین سے اہل ہمایوں کا حلقہ زیادہ وسیع کرنے کی مہم میں مسلسل مدد چاہتے ہیں۔

ہم کیا کریں اور کس طرح؟ ہمایوں کی ظاہری صورت، حجم، کتابت، طباعت، قیمت وغیرہ میں کہاں تک کوئی تبدیلی ہو یا نہ ہو ان امور پر ہم بھی غور کر رہے ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے معاونین بھی غور کریں۔ اور پھر وہ ان کے اور دوسری چیزوں کے متعلق ہمیں جلد اپنے خیالات اور مشوروں سے مستفید کریں۔ ہمارے اُن کے درمیان جو خاموشی کا ایک زرّیں رشتہ قائم ہے ہم چاہتے ہیں کہ اب اُس میں ہم نوائی و ہمدردی کی ایک برقی رَو دوڑ جائے!

بشیر احمد

بزمِ ہمایوں

"قدیم و جدید"

اگست کی بزمِ ہمایوں میں پاکستان میں قدیم و جدید خیالات کی کش مکش کا ذکر ہوا تھا اور یہ سوال کیا گیا تھا کہ کیا ہم قدامت کے حامی ہوں یا جدّت کے علم بردار ؟ اس پر میں نے یہ خیال پیش کیا تھا کہ "ہمارے ملک اور قومیت کی بنیاد کا اہم ترین جزو مذہبی عنصر ہے" اور یہی ہے جو پاکستان کے مختلف حصّوں اور مختلف الخیال مسلمانوں کے درمیان ایک مضبوط کڑی کا کام دے سکتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی میں نے اس بات پر زور دیا تھا کہ جہاں اسلام مادّیت پرستی سے رُوگردانی کرتا اور صحیح رُوحانیت کی ترجمانی کرتا ہے وہاں وہ قدامت پرستی کا مخالف اور حریّت و مساوات کے "جدید" نظریات کا پہلا علم بردار رہا ہے۔ یہ ہے ہمارا وہ "مذہبی نظام جو پاکستان کی روح ہے" جس میں "نئی سے نئی قدریں اور نئی سے نئی صلاحیتیں" ہیں اور ہمارا اولیں فرض ہے کہ ہم اُسے اپنی زندگیوں میں جاری و ساری کریں کیونکہ اسی میں ہمارے لئے دین و دنیا کی فلاح ہے اور اسی سے اسلام کا وہ دعویٰ از سرِ نو ثابت ہوگا کہ وہ سب حالات و اوقات کی ضروریات و ترقیات کا کفیل ہے۔ ہم محض اپنے بعض علما کے نظریات کے پابند نہیں ہوسکتے نہ دوسرے اسلامی ممالک کے تمام رسوم و قواعد کی پیروی ہمارے لئے لازم ہے بلکہ آپس میں فروعی مسائل پر اختلافات رکھتے ہوئے بھی ہم اسلام کے بنیادی اصولوں پر متحد ہوسکتے ہیں اور اُن کی بنیاد پر ہم اپنے مقامی حالات کے مطابق پاکستان کی شاندار تعمیر استوار کرسکتے ہیں!

میں نے جن خیالات کا اظہار یوں کیا تھا اُس کے متعلق ہمارے محترم دوست میاں عبدالعزیز "فلک پیما" رقم طراز ہیں:۔ "اگست کے ہمایوں میں میاں بشیر احمد صاحب نے مسلمانوں کی بہتری کے لئے ایک نہایت پُرخلوص خطبہ لکھا ہے، میاں صاحب موصوف کی کوئی بات خلوص سے خالی نہیں اور یہی وجہ ہے کہ میاں صاحب کی عزت اور بعض دلوں میں اُن سے محبت مستقل طور پر جاگزیں ہیں۔ میاں صاحب فرماتے ہیں کہ مذہبی نظام پاکستان کی رُوح ہے۔ بجا مگر بعض علما اب تک مُصر ہیں کہ جو رُوح ابن سعود نے حجاز کے جسم میں ٹھونسی ہے وہ چنداں قابلِ قدر نہیں۔ ایران کے مروّجہ نظام کی نسبت کہنا کہ وہ مذہبی نظام ہے شاید مبالغہ ہو۔ پاکستان اپنی نئی رُوح کو مصر سے مراکو سے یا حجاز سے اسلامی سبق سکھائے یا پاکستان کا "مذہبی نظام" اور "خالص اصلی مسلمانیت" اور اسلامی ممالک سے مختلف ہوگی؟ یہ صاف ظاہر ہے کہ جب تک علما متفق نہ ہوں رُوح کی تعلیم انتشار کا راستہ لے گی۔ علما مل کر نہ بیٹھیں تو جہلا کیا کریں؟ اس وقت جاہلوں کی طفیل علما پل رہے ہیں، اگر یہ درست نہیں تو مثال پیش کی جائے کہ فلاں عالم نے پیٹ پر پتھر باندھ کر مسجد تعمیر کی، جاہلوں نے تو رات رات میں مسجد بنا دی۔ میاں صاحب کا ارشاد ہے "سچ یہ ہے کہ زمانہ اسلام کی آزمائش کر رہا ہے" کیا یہ کہنا غلط ہے کہ اسلام آزمائش سے بالاتر ہے؟ اسلام تو صدیوں سے آزمایا جا رہا ہے اور شروع ہی میں ہر قسم کی آزمائش میں پورا اُترا۔ سچ یہ ہے کہ زمانہ علمائے اسلام کی آزمائش کرکے مایوس ہوچکا ہے، علمائی زمانہ من حیث الجماعت بہت پیچھے ہیں، تبلیغ اور متحدہ کوششوں سے دُور۔ اسلام کی نسبت غلط فہمیاں ہمارے علما کے نااہل ہونے کا کھلا اشتہار ہیں۔ زمانہ کوئی چیلنج نہیں دے رہا بلکہ ببانگِ دہل کہہ رہا ہے کہ گزشتہ سو سوا سو سال میں اسلام اور اسلامی ادبیات کی جو خدمت فرنگی نژاد مستشرقین نے کی ہے اُس کا سواں حصہ بھی پرانی کتابیں سستے داموں بیچنے والوں نے پورا نہیں کیا۔ مسلم ممالک میں اگر کوئی مرض ہے تو وہ ہے علم سے کنارہ کشی اور مسائل فروشی پر ۔ ۔ ۔"

میرے محولہ بالا خیالات کے متعلق پروفیسر سعادت علی خاں لکھتے ہیں:۔ "میں نے اگست کی بزمِ ہمایوں دو تین بار پڑھی یہ نئی اور پرانی تہذیب کی تفریق

[illegible] قائد اعظم کے انتقال سے پہلے لکھا گیا تھا [illegible] طرح شائع کیا جاتا ہے۔

عموماً کسی ایک ذہنی کیفیتوں کا نتیجہ ہوتی ہے جن میں دماغی کاہلی، لاعلمی، نقّالی، خبطِ کمتری وغیرہ شامل ہیں۔ کبھی کبھی یہ تفریق سوچے سمجھے ہوئے دیانت پر بھی بنی ہوتی ہے اور گو اس اختلاف سے مجھے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو میں اسے قابلِ قدر سمجھتا ہوں کیونکہ یہ ایک ایسی ذہنی کیفیت کا حامل ہو، میں سچائی کو پالینے اور اُس کی روشنی میں اپنے نظریئے کو بدل لینے کی اہلیت ہوتی ہے اور یہ اُن مکروہ کیفیتوں سے قطعاً جدا ہے جن کی وجہ سے ہمارے تن آسان اخلاقی، سماجی یا سیاسی فرض سے بچنے کے لئے محض یہ کہہ کر الگ ہو جاتے ہیں" اونہہ، پُرانا دقیانوسی نظریہ" جن تمدّنی، معاشرتی، اقتصادی، سیاسی اور اخلاقی اصولوں کی دعوت اسلام دیتا ہے وہ محض تیرہ سو برس پرانے نہیں بلکہ وہ تو اتنے پرانے ہیں جتنا کہ انسان خود اور اسی لئے اتنے ہی نئے جتنا کہ انسان بلکہ انسان سے بھی زیادہ نئے کیونکہ ابھی انسان مجموعی طور پر اپنی ارتقا میں اتنی بلندی پر نہیں پہنچا کہ ان اصولوں پر پوری طرح عمل پیرا ہو سکے۔ قرآن بار بار کہتا ہے کہ میں تمہارے سامنے زندگی کا وہی لائحۂ عمل پیش کرتا ہوں جو اس سے پہلے بہترین انسانوں نے بنی نوعِ انسان کے سامنے پیش کیا لیکن جسے تم بھول جاتے ہو۔ تاریخ شاہد ہے اور موجودہ حالات بھی بتا رہے ہیں کہ یہ اصول حقیقتہً کامیابی اور ترقی کے ضامن ہیں اور انھیں چھوڑ کر تباہی اور بربادی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ پیغمبرِ خدا اور صحابۂ کرام کی زندگی اور اُن کے کارنامے اور اب موجودہ مغربی قوموں کی تباہی زدہ ترقی اور ایشیائی قوموں کی موت زدہ پستی میرے نظریئے کی دلیل ہیں۔ دنیائے اسلام میں ایک مدت کے بعد بیداری اور زندگی کے آثار نمودار ہو رہے ہیں، وہی آثار جنھیں ترجمانِ حقیقت کی آنکھ نے کئی برس پہلے مشاہدہ کیا تھا۔ دل بڑی شدت سے چاہتا ہے کہ یہ بیداری اور یہ زندگی کی صراطِ مستقیم پر گام زن ہوتی ہوئی "وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ" کی شان کو دہرائے۔

اِس کے لئے ایک بات کی اشد ضرورت ہے اور وہ یہ کہ چند ایک مخلص دیانت دار لوگ جو بے لوث خدمت کے جذبے سے معمور، مشرقی و مغربی علوم سے بہرہ ور، گزشتہ اور موجودہ حالات سے باخبر اور سیکھنے اور سکھانے کے لئے ہر وقت تیار ہوں اُن ہمہ گیر اصولوں کا مطالعہ کریں جو اسلام نے ہر لحاظ سے مکمل اور کامیاب زندگی کے لئے دنیا کے سامنے پیش کئے، اور پھر یہ اصحاب باہمی تبادلۂ خیالات اور مشورے کے بعد مناسب طریق سے اِن اصولوں کی اشاعت کریں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ہمایوں میں یہ اپیل شائع کر دیں کیونکہ بزمِ ہمایوں ہی اس خط کی محرک ہوئی ہے۔ یہ اپیل انشاء اللہ رائگاں نہ جائے گی اور چند ایک اصحاب اس کام کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ یہ کام مسجد کے مُلّاجی کا نہیں ہے اور نہ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے اُن پیشہ ور علما کا ہے جو اپنے پہلے سے طے شدہ نقطۂ نظر سے پرے دیکھ ہی نہیں سکتے اور جن کا بہت سا وقت اپنے ہی طبقے کے دوسرے ارکان کی نکتہ چینی کرنے میں ضائع ہو جاتا ہے۔ میرے ذہن میں ایسے اصحاب خاص طور پر ایسے نوجوان اصحاب ہیں جو دیانت داری سے اپنی رائے پیش کریں اور جب اُن کے سامنے ایک ایک بہتر نقطۂ نظر پیش کیا جائے تو اسی طرح دیانت داری سے اِس میں ترمیم کرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ یہ وقت جیسا کہ علامہ مرحوم کا ارشاد ہے اجتہاد کا ہے نہ کہ جمود کا۔ ہم یہ نہیں سوچتے کہ ہماری طرف سے اپنے برگزیدہ اصحاب کی بہترین عزت افزائی اِس میں ہے کہ ہم اُن کے نقشِ پا پہ چلیں اور جس طرح انھوں نے اپنے زمانے کے حالات کے مطابق اسلامی اصولوں کی روشنی میں اپنے ہم عصروں کی رہنمائی کی تھی ہم بھی اُسی منبعِ حیات کی طرف رجوع کر کے اپنے زمانے کے حالات کے مطابق اپنے لوگوں کی خدمت کریں۔ اندھادھند تقلید عزت کی نشانی نہیں بلکہ اخلاقی اور رُوحانی سُستی اور موت کی۔ خط لکھنے کے بعد میں "فاؤسٹ" پڑھنے لگ گیا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ گوئٹے میرے خیال کی تائید یوں کرے گا: "جو کچھ تمھیں اپنے آبا و اجداد سے ملا ہے وہ گویا قرضے میں ملا ہے، اگر تم واقعی اُس پر قبضہ کرنا چاہتے ہو تو اُسے از سرِ نو کماؤ، وہ شے جو کام نہ دے محض ایک شدید رکاوٹ ہے، ہر لمحے کی ضرورت کام کی چیز خود پیدا کرتی ہے اور پھر اُسے مبارک جان کر کام میں لاتی ہے۔"!

عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ کچھ عرصے سے اور خاص طور پر اِس گزشتہ اگست کے مہینے میں جو پاکستان کی سالگرہ کا مہینہ تھا متعدد دوستوں نے مری میں مختلف پاکستانی مسائل پر غور و خوض اور تبادلۂ خیالات کرنے کے لئے چند "مذاکرات" منعقد کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ اور یہ محض اتفاق نہیں، ایک عرصے سے پاکستان کے جوان اور بوڑھے مرد اور عورتیں اپنے قومی مسائل کو حل کرنے کے لئے بے تاب نظر آتے ہیں اور کسی تنظیم کے آرزومند ہیں جو انھیں اس دشوار گزار چند قدم آگے بڑھنے میں مدد دے، پھر پڑھنے لکھنے والوں اور ادیبوں اور شاعروں کی تنظیم شاید یہی ہوتی ہے کہ اکٹھے ہوئے نظمیں اور مقالے

مباحثے، مذاکرے کئے کرائے۔ اِس طرزِ فکر و عمل کی نسبت عموماً کہا جاتا ہے اور درست کہا جاتا ہے کہ "نشستند و گفتند و برخاستند"۔ گو اب بھی ہمارے ہاں زیادہ تر یہی حالت جاری ہے لیکن اب کم از کم بعض اوقات مباحثے محض دلچسپی کے لئے نہیں ہوتے بلکہ سمجھدار لوگوں کا شوق ایک ایسی صورت اختیار کر لیتا ہے جس میں ایک مذاکرہ کے ذریعے کسی قومی مسئلے کا حل دریافت کرنے کی دلی خواہش اور کاوش پائی جاتی ہے۔ یہ کاوش قومی صحت مندی کی نشانی ہے بشرطیکہ اس میں وسیع نظری اور رواداری کی صفات اور خود عمل اور محنت کرنے کا جذبہ پایا جائے۔ مری میں پہلے ۲۲ اگست کو چند نوجوان "ادبی لوگ" نے ایک مذاکرہ "ادیب اور ریاست سے وفاداری" کے عنوان سے منعقد کیا جس میں علاوہ اِن نوجوانوں کے اسلم صاحب اور ہم نے حصہ لیا۔ اِس مجلس میں اُن نوجوانوں نے بھی جو ایک نیم انقلاب کے حامی تھے یہی کہا کہ پاکستان سے وفاداری اور اسلام سے محبت اُن کے تمام نظریات کی اصل الاصول ہے۔ اِس سے پہلے چند اور نوجوانوں نے ۳۰ جولائی کو ایک بڑے اجتماع میں جو فاطمہ بیگم صاحبہ کی صدارت میں منعقد ہوا اس مباحثہ میں حصہ لیا تھا کہ "اِس ایوان کی رائے میں عورت کا صحیح مقام اُس کا گھر ہے"۔ مباحثے میں پہلا انعام ایک نوجوان خاتون نے حاصل کیا جس نے نہایت کامیابی سے اِس تجویز کی مخالفت کی، فریقین نے جس اعتدال پسندی اور سلامت روی سے اس بحث کو نباہا اُس سے ہماری قوم کے استقلال و تہذیب کا ایک بیّن ثبوت فراہم ہوا۔

"اِسلام اور پاکستان"

۴ ستمبر کو میرے ہاں چند احباب نے "اسلام اور پاکستان" کے موضوع پر مذاکرہ میں حصہ لیا۔ اس مختصر سے مجمع میں چند ترقی یافتہ مولوی صاحبان، لاہور کے کالجوں کے دو ایک جن سائنس اقتصادیات اور ریاضی کے پروفیسر، پاکستان کی سرکاری کمیٹیوں کے چند نمائندے (جن میں اقوامِ متحدہ کے اجلاس پیرس میں شریک ہونے والے ایک پاکستانی نمائندے بھی تھے) کچھ پنشن یافتہ سرکاری ملازمین اور کچھ دیگر صاحبِ ذوق احباب شامل تھے۔ پہلے مقرر نے جو ایک صحیح قسم کے مشہور مذہبی مبلغ ہیں کہا کہ آج کل جو شریعت کا اتنا چرچا ہو رہا ہے وہ پاکستان کے لئے ایک فطری امر ہے لیکن کیا محض آئینی طور پر چند قوانین کے رائج کر دینے سے شریعت کا نفاذ ہو جائے گا؟ ہرگز نہیں آنحضرتؐ نے کیا کیا، انھوں نے اپنے اخلاق و کردار میں بہترین زندگی کا ایک نمونہ پیش کیا جس کے اثر سے ایک بلند اخلاق و نیک کردار جماعت وجود میں آگئی۔ فرض محض اِس کی نہیں کہ ہم نماز روزہ کے پابند ہو جائیں اور مسائل کی مین میکھ نکالیں، قرآنِ کریم شاہد ہے کہ خدا کو ہماری ایسی نمازوں اور ایسے روزوں کی ضرورت نہیں جن کے ساتھ نیکی اور راست بازی اور ایثار کا عملی مظاہرہ نہ ہو۔ مردِ مومن وہ ہے جس میں تقویٰ ہو اور جو خدا کو گویا ہر وقت اپنے رُوبرو پائے۔ اسلام نے بلند ترین اخلاق کے عمل سے تمام معاشی و سیاسی مسائل کو حل کر دیا۔ خوفِ خدا، بھائی بندی، عملی ہمدردی، باہمی مشورت۔ اِن کے امتزاج سے پیغمبرِ اسلام نے وہ نظام پیدا کیا جسے ہم اسلامی کلچر کہہ سکتے ہیں۔ یہ وہ اسلامی کلچر ہے جسے ہمیں ازسرِ نو حاصل کرنا ہے۔ یہ حاصل ہوا تو پھر پاکستانیوں کو دُنیا کی کسی طاقت سے ڈرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اِس کے بعد دیگر مقررین نے اِس زندگی بخش نظریے سے اتفاق ظاہر کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ کہا گیا کہ یہ سب کچھ درست ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ اِس کا حصول کیونکر ہو؟ یہ سیرت کیسے پیدا ہو۔ ہمارے اکثر اربابِ حل و عقد اور اعلیٰ ترین اخلاق کا نمونہ نہیں، نہ اُن میں ایثار بدرجۂ اتم موجود ہے، دوسرے افسروں اور صاحبِ اثر لوگوں میں کہیں بددیانتی خویش پروری، غرور یا بے اعتنائی یا پھر مایوسی کا شکار ہیں، اِن کو کیسے راہِ راست پر لایا جائے؟ سیاست دانوں میں مذہبی جذبہ نہیں، مذہبی رہنماؤں میں سیاسی شعور نہیں، صحیح قسم کی تعلیم دی جائے جس میں سینما اور ریڈیو بھی مناسب احتساب کے ماتحت حصہ لیں، پریس کی اصلاح ہو، اُس کا مطمحِ نظر قومی ترقی ہو نہ کہ کسی خاص گروہ یا پارٹی یا کابینہ کی حمایت۔ اعتراض کیا گیا کہ یہ سب کچھ بھی درست ہے، لیکن اِس کے لئے برسوں کی مدت درکار ہے، قومی سیرت بنتے بنتے بنتی ہے اور اُدھر زمانہ تیز رفتاری کے ساتھ گام زن ہے، وہ ہمارے لئے نہ ٹھہرے گا، مقابلہ ہے رقابت ہے قوموں کے معرکے میں پاکستان کو حصہ لینا ہے اور بہت جلد حصہ لینا ہے، کیا ہم اس کے لئے تیار ہیں؟ بڑی ضرورت اس امر کی ہے کہ ایک گروہ یا جماعت ایسی منظرِ عام پر آئے جس میں صحیح اسلامی کردار کے جیتے جاگتے نمونے ہوں جس کا مدعا نہ جلبِ منفعت ہو اور نہ عہدوں پر قبضہ کرنا، جس میں پاکستان کی انتہائی محبت اور عوام کی بھلائی کا بے تاب جذبہ تڑپ رہا ہو۔ اِس کے جواب میں کہا گیا کہ یہ بھی درست ہے لیکن اِس قدر مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ کہنا کہ آج کل کی جمہوریت ایک شیطانی چرخہ ہے اور ہمیں اِس نظام کو یکسر بدل دینا چاہیئے انتہا پسندی ہے۔ اِس نظام میں جو باتیں اِسلامی رُوح کے منافی ہیں اُنہیں خارج کر دیجیئے، اور وہ جن سے قوم کی تنظیم ہوتی ہے اُنہیں کام میں لایئے، اُس کے ذریعے سے عوام کو تعلیم بھی دیجیئے اور اُن سے رابطہ بھی پیدا کیجیئے۔ اِس نظریے

بزمِ ہمایوں سمیر

اظہار بھی ہوا کہ صرف اقتصادی حد تک اشتراکیت کے اصولوں کو اپنایا جائے کیونکہ اس کے بغیر اسلامی رُوح عملی طور پر قوم میں حلول نہ کرے گی اور ان سے اجتناب عموماً وہ لوگ کرتے ہیں جو یا اپنی مالی حالت پر قانع ہیں یا اپنی اندوختہ دولت کو قومی مفاد کے لئے چھوڑنے پر تیار نہیں۔ یہ اپیل بھی کی گئی کہ اس وقت حُسنِ اتفاق سے قوم کی باگ ڈور اُس شخص کے ہاتھ میں ہے جس پر ساری قوم کو مکمل اعتماد ہے، اِس غیر معمولی وقت میں قائدِ اعظم سے درخواست کی جائے کہ وہ اپنے آمرانہ اختیارات سے کام لے کر غلط قسم کے لوگوں کو برطرف کر دیں اور تمام اہم عہدوں پر صرف قابل اور ایثار پیشہ اصحاب کا تقرر کیا جائے۔ مسلمان قوم کو شاید ایسا موقع پھر نہ ملے، ہمارا مستقبل شاندار ہو سکتا ہے بشرطیکہ ہمارے عزائم خلوص اور ہمت پر مبنی ہوں اور ہم اِس نازک وقت میں جلد از جلد مل کر یکسوئی اور ایمانداری سے مفید قومی کاموں میں مصروفِ عمل ہو جائیں۔

ظاہر ہے کہ اِس وقت ہم اہلِ پاکستان ایک نہایت نازک دَور میں سے ہو کر گزر رہے ہیں۔ ہم صدیوں کے غافل اور زیاں کار لوگ دیکھتے دیکھتے ایک آزاد قوم بن گئے۔ بلاشبہ آج ہم سیکڑوں مشکلات میں گھرے ہوئے ہیں، ہمارے پڑوس میں ایک ہوشیار رقیب قوم موجود ہے جس کے ساتھ ہم اِس وقت جنگ و امن کے دو رنگے سیاہ و سفید رشتے سے بندھے ہوئے ہیں، اِسلامی ممالک ہماری طرف ہمدردی کی نگاہیں ڈال رہے ہیں اور دُنیا ہمیں کچھ حیرانی اور نکتہ چینی سے اور کچھ مسکراتے اور گھورتے ہوئے دیکھ رہی ہے۔ اِدھر اپنے گھر میں ہم ہیں اور بیسیوں اقتصادی اور سیاسی اور معاشرتی مسائل اور مختلف خیال کے مذہبی اور لامذہب اصحاب اور مختلف قسم کے فلاکت زدہ اور خود غرض اور بے غرض اور معصوم لوگ۔ کشمیر کی جنگِ آزادی، مہاجرین کا مسئلہ، بڑھتی ہوئی قیمتیں، سیلاب کی تباہ کاریاں، وبائیں، بے روزگاری، غدّاری، مذہبی تنگ نظری، اشتمالی تخریب کاری، عہدوں کی بھوک، تن آسانی، اور سب سے بڑھ کر ایک نفسا نفسی اور بے راہ روی یہ ہیں اور ہم۔

یہ ایک نازک گھڑی ہے لیکن ساتھ ہی یہ ایک شاندار ساعت بھی ہے، ہماری قوم غافل ہو لیکن اب اتنی غافل بھی نہیں، زیادہ سوچنے والی نہ ہو، لیکن اب حالات کو کچھ سمجھتی بھی ہے۔ وہ خطرات و مشکلات میں حکومت کی وفادار ہے لیکن چند فوری خطروں اور ہنگامی مصیبتوں کے ٹل جانے پر اب وہ خاموشی و انکسار سے کام نہ لے گی بلکہ بیداری سے پورے شجاعت اور ہمت سے انقلاب کی طرف قدم بڑھائے گی اور ضرور بڑھائے گی۔ اِس قوم کے پاس ایک شاندار رُوحانی ہدایت نامہ اور لائحۂ عمل ہے جس سے اِس نے صدیوں رُوگردانی کی، یہ ہے اُس کی کمیوں کی وجہ اور اُس کے انتشار کا سبب لیکن موجودہ دم بدم بدلتی ہوئی دُنیا میں یہ لائحۂ عمل یقیناً اِس کے حریت پسند اور مساوات طلب جمہور کو ایک انقلابی نظام کی طرف لے چلے گا۔ ہمارا قومی شاعر پہلے ہی کہہ چکا ہے: "گیا دورِ سرمایہ داری گیا"۔ اور یہ طوفان جب اٹھے گا تو ہمارے اکثر اُمرا برضا و رغبت خود اُس کی بڑھتی ہوئی رَو میں بہہ نکلیں گے، وہ خود غرض سہی لیکن اب نہ اتنے کوتاہ اندیش رہیں گے اور نہ قوم سے غدّاری کریں گے۔ آج کس کے دل میں نہیں کھٹکتا کہ قوم ڈوبی تو وہ بھی ڈوب جائے گا؟

آج ہمارے حالات کچھ خراب سہی لیکن اِن پر قابو پانے کی قوت بھی قدرت نے ہمیں عطا کی ہے، ہم آزاد ہیں، آزادوں کو مشکلیں پڑتی ہیں اور آزاد ہی پھر اِن مشکلوں کو آسان کیا کرتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے جس نے ایک تن آسان قوم کو حادثات سے دوچار کر دیا۔ اب اگر خدا نے چاہا تو یہ قوم اِن اُبھرتی ہوئی موجوں پر سوار ہو کر طوفانِ حیات کو اپنے زیرِ نگین کرے گی۔ آج اگر ہر شخص اپنی جگہ اور اپنے اپنے حلقے میں محنت و تعاون سے کام کرنے کا تہیہ کر لے تو انشاء اللہ قوم کا بیڑا پار ہو کر اُس کا پھریرا جلد اپنے سبز و سفید رنگوں کے ساتھ فضائے عالم میں لہرانے لگے گا: ؎

یوں ہاتھ نہیں آتا وہ گوہرِ یک دانہ
آزادی و یک رنگی اے ہمّتِ مردانہ!

بشیر احمد

نئی راہ

راہ بھی نئی نئی، راہ گیر بھی نئے
خادموں کے بھیس ہیں، شاہ و میر بھی نئے

اہلِ کارواں نحیف، سامنے سفر طویل
ہمتیں ہیں مختصر، زادِ راہ بھی قلیل

مشکلیں ہیں چار سو، آفتیں ہیں رُوبرو
تاک میں ہیں راہزن، گھات میں ہیں کینہ جُو

راہ غیر مختتم، ہولناک پیچ و خم
بڑھ رہا ہے اضطراب لحظہ لحظہ دم بدم

نالہ گرم گرم ہے، آہ سرد سرد ہے
دل اُداس اُداس ہے، رنگ زرد زرد ہے

آہ قوم بے خبر نکتہ ناشناس ہے
حریّت کے قصر کی، خون پر اساس ہے

راہِ حریّت میں ہے سوز بیش، ساز کم
پھُول ہیں کہیں کہیں، خار ہیں قدم قدم!

کرم حیدری

قائدِ اعظم کی موت اور قوم کا عزم

…ِ اعظم کی ناگہانی موت نے پاکستان کے طول و عرض میں تھوڑی دیر کے لئے ایک زلزلہ سا برپا کر دیا، دل ہل گئے، رُوحیں کانپ گئیں، ہمارا
… ہمارا ہمدرد دوست، ہمارا زبردست رہنما جس سے اک دُنیا لرزتی تھی جس کی حفاظت میں ہم تمام خطروں سے بے پروا رہتے تھے ہمیں
… دیا۔ اب ہم کیا کریں گے؟ ہماری زندگی تہ و بالا ہو گئی، کیا تھا اور کیا نہ گیا!
…سرے دن صُبح ہمارے اخبارات ماتمی لباس پہنے آئے :۔ "عالمِ اسلام کا نیّرِ درخشاں غروب ہو گیا، دُنیا کی سب سے بڑی مسلم مملکت
…فانی سے رخصت ہو گیا۔" "پاکستان یتیم ہو گیا۔ ہاتھ کانپ رہے ہیں قلم لرز رہا ہے، آنکھوں سے آنسو رواں ہیں اور دل غم سے ماندہ
… ہو رہے ہیں۔" "قوم کا باپ آج مر گیا۔ وہ پاکستان کے لئے جیا اور اُس نے پاکستان کے لئے ہی جان دی۔" "برسوں کی مشقت اور
… کے بعد جو قائدِ اعظم نے قوم کے لئے کیں اُن کے مضمحل جسم نے بسترِ خاک پر آرام پایا اور اُن کی رُوح خدائے پاک کے
…ت میں جا پہنچی۔"
…ائدِ اعظم کی موت نے دُور و نزدیک ہر کہ و مہ پر کیسا اثر کیا اس کا کچھ اندازہ اِن دو غیر معمُولی خبروں سے ہوتا ہے کہ اِدھر پنجاب
…پنڈی کے ایک گاؤں میں ایک مزدور عورت نے یہ غمناک خبر سنتے ہی آہ کی اور جان دے دی اور اُدھر مشرقی بنگال میں
… کے قریب ایک گھرانے کے پانچ افراد اسی صدمے سے چل بسے۔ قائدِ اعظم کی موت کے بعد اُن کے آخری دیدار کے وقت ہزاروں
…کی گھٹی گھٹی سسکیاں دبی دبی آہیں اور دلدوز نالے اُن کی دلی حالت بتا رہے تھے۔ ایک پاکستانی وزیر بچّے کی طرح بلک بلک کر
…ا ایک غیر ملکی سفیر کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ جنازے کے آخری جلوس میں پانچ چھ لاکھ آدمیوں نے شرکت کی۔ چوتھے
…رجنرل کے مکان پر قرآن خوانی کی مجلس میں ایک لاکھ آدمیوں نے حصہ لیا اور دُعائے مغفرت کی۔ اُدھر قائدِ اعظم کی تربت ہر
…کھوں عقیدت مندوں کی زیارت گاہ بن گئی!
…یہ تو پاکستانی مسلمانوں کی حالت تھی۔ غیر مسلم پاکستانیوں نے بھی قائدِ اعظم کی وفات کو بے حد محسوس کیا۔ نئی دہلی میں ایک ہندو
…ین نے کہا کہ پاکستان میں ہندوؤں کا سب سے بڑا دوست مر گیا۔ پاکستانی عیسائی طلبا کی لیگ نے اپنی یہ قرارداد پیش کی
…اعظم جیسا بڑا مسلمان لیڈر آج تک اس دُنیا میں پیدا نہیں ہُوا، انھوں نے لوگوں کے دلوں پر حکمرانی کی اور وہ صاحبِ عمل
…میں یکتا تھے۔ ہم حلف اُٹھاتے ہیں کہ ہم اُن کے اُصولوں کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کریں گے۔"
ہندوستان میں دوست دشمن سب نے قائدِ اعظم کی عظمت کا اعتراف کیا۔ سرت چندر بوس نے کہا: مسٹر جناح ایک بڑے وکیل،
…یکے لئے ایک بڑے کانگرسی، مسلمانوں کے ایک بڑے لیڈر اور دُنیا کے ایک بڑے سیاست دان تھے لیکن اُن کی اصلی بڑائی اس میں
… وہ ایک زبردست صاحبِ عمل تھے۔ مسز سروجنی نیڈو گورنر یو پی نے مس فاطمہ جناح کو لکھا کہ "ہزارہا سوگوار لوگوں نے
…قائد کے حضور اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے لیکن میں اپنے رنج و الم کی درد انگیز خاموشی میں تمھیں اپنی یاد اور محبت کا ایک
…بہار پھول بھیجتی ہوں کہ تم اسے میرے فوت شدہ محبوب دوست کی قبر پر چڑھا دینا۔" ہندوستان کے وہ اخبارات جو ہمیشہ
…اعظم کے خلاف زہر اُگلتے رہے اُن کی موت پر اُن کے مدّاح ہو گئے۔ ہندوستان ٹائمز نے لکھا کہ "مسٹر جناح کے عزم بالجزم کے سامنے

حقائق مٹ گئے اور خواب و خیال حقیقت بن کر دنیا کے سامنے آ گئے۔ وہ پُر خلوص نیت کے مالک تھے۔ ممکن ہے تاریخ اُن کی فرقہ پرستی کی بنا پر انھیں نشانۂ تنقید بنائے لیکن تاریخ انھیں فراموش ہرگز نہیں کر سکتی کیونکہ انھوں نے خود تاریخ بنائی۔" پربھات نے لکھا "ہمیں یہ اعتراف کر لینا چاہیئے کہ متحدہ ہندوستان کی تمام طاقتیں اس ایک شخص سے شکست کھا گئیں اور انگریزوں کو بھی مسٹر جناح نے ہی تقسیم ہند پر مجبور کیا۔ غیر جانب دار تاریخ لکھنے والے مجبور ہوں گے کہ محمد علی جناح کو دنیا کے بڑے آدمیوں میں شمار کریں۔ یقیناً وہ ایک بڑے آدمی تھے، نہ ہوتے تو تاریخ کا رُخ نہ پلٹ سکتے۔ اُن کی موت مسلمانوں کو زندگی بخشنے والی ثابت ہو سکتی ہے، لاکھوں مسلمان نوجوان اُن کا نام لے کر میدان میں اُتر آئیں گے۔" ملاپ نے لکھا کہ "متحدہ ہندوستان نے مسٹر جناح سے زیادہ مضبوط زیادہ ارادہ ور اور زیادہ سخت آدمی آج تک پیدا نہیں کیا۔ مسٹر جناح نے اپنے سامنے جو آدرش رکھا اُس پر چٹان کی طرح قائم رہے۔ مخالفتوں کے طوفان، نکتہ چینی کی آندھیاں، ناموافق حالات کے بھونچال کوئی بھی انھیں اُس جگہ سے نہ ہلا سکا جہاں وہ ایک بار کھڑے ہو گئے۔ اُنھوں نے کہا ہندوستان اور برطانیہ کو دو قوموں کی تھیوری تسلیم کرنی پڑے گی اور آخر دونوں نے عملی طور پر اس تھیوری کو تسلیم کیا۔ انھوں نے کہا پاکستان بن کے رہے گا اور آخر کار وہ دن آیا جب وہ بات جسے ہم لغویت کی انتہا کہتے تھے اصلیت بن کے ہمارے سامنے آ گئی۔ اُنھوں نے کہا کہ آبادیوں کا تبادلہ ہونا چاہیئے اور آخر کار یہ تبادلہ ہوا اور اس طرح ہوا کہ دُنیا لرز اُٹھی۔" "جس جگہ کو انھوں نے اپنی منزل بنا لیا وہاں وہ پہنچ کر رہے۔" بندے ماترم نے لکھا: "متحدہ ہند کے دس کروڑ مسلمانوں کے مسلم لیگی لیڈروں میں جناح صاحب ہی ایک ایسے لیڈر تھے جنھیں دنیا کی کوئی طاقت خرید نہ سکتی تھی۔" "پاکستانی عوام کے دلوں پر اگر کسی ایک شخص کا قبضہ تھا تو وہ جناح صاحب ہی تھے۔" ہند (کلکتہ) نے اُن کی بابت لکھا: "خوش قسمت ہے وہ شخص جس کی قابلیت کا لوہا اُس کی زندگی میں اور مرنے کے بعد بھی دوست اور دشمن دونوں کو ماننا پڑے۔ اُن کا ذاتی کیرکٹر بہت بلند تھا۔" رنگا آئر نے جو سابقہ مرکزی اسمبلی میں حزبِ مخالف کا ایک ممتاز رکن تھا کہا: "کوئی یہ بات نہیں بھول سکتا کہ کس طرح قائدِ اعظم کی گرجتی ہوئی آواز لیجسلیٹو اسمبلی کے ایوان میں کانگرس کی حمایت میں بلند ہوا کرتی تھی۔ اُن کی زندگی قربانیوں کا ایک خطبہ تھی۔ گاندھی اور جناح سے انسان ہم پھر کبھی نہ دیکھیں گے۔"

مغربی اخبارات و اکابر نے قائدِ اعظم کو دل کھول کر خراجِ تحسین ادا کیا۔ اُن کی وفات سے تقریباً ایک ماہ پہلے پاکستان اور ہندوستان کی آزادی کی پہلی سالگرہ پر تبصرہ کرتے ہوئے برمنگھم پوسٹ نے لکھا تھا کہ "جناح پاکستان کا اوّلین اور بے بہا اثاثہ ہے۔" "وہ اپنے عزائم میں حقائق پسند اور اپنی وحدتِ مقصد میں عدیم النظیر واقع ہوئے ہیں۔" اُن کی رحلت کے بعد برطانیہ کے ہر روزانہ اور ہفتہ وار اخبار نے اُن کے متعلق طویل مقالے لکھے اور اُن کی داستانِ حیات بیان کرتے ہوئے ان کے عزمِ راسخ سعیِ مسلسل اور انتہائی دیانت داری کی داد دی۔ ٹائمز (لندن) نے لکھا کہ "مسٹر جناح صرف قائدِ اعظم ہی نہیں تھے وہ محض اُس اسلامی ملت کے معمار ہی نہ تھے جو انھیں کی مساعی سے معرضِ وجود میں آئی بلکہ وہ اُن کے تخیلات پر حکمرانی کرتے تھے اور انھیں ان کا مکمل اعتماد حاصل ہو چکا تھا۔ اُن کا انتقال ہندوستان اور پاکستان کے لیئے ایک نازک موقع ہے جب پُر سکون اور دلیرانہ تدبّر کی انتہائی ضرورت آ پڑی ہے۔" ڈیلی اکسپرس نے لکھا کہ: "یہ نیا ملک اس وقت اپنی سخت ترین آزمائش سے دوچار ہے۔" مانچسٹر گارڈین نے کہا کہ: "مسٹر جناح کی موت سے ایشیا کی صورتِ حال میں ایک نیا تذبذب پیدا ہو گیا ہے۔" لندن کے ایک ہال میں اُس ادارے کے قریب جہاں ۵۵ برس پیشتر ایک نوجوان طالب علم محمد علی جناح نے قانونی تعلیم حاصل کی تھی ایک عظیم الشان جلسۂ تعزیت منعقد کیا گیا۔ اس میں نوئیل بیکر نے کہا کہ پاکستانیوں نے جتنی دشواریوں کے بعد آزادی حاصل کی ہے اتنی دشواریاں کسی اور قوم کو پیش نہیں آئیں۔ ایک ناممکن سی چیز کا حاصل ہو جانا محض قائدِ اعظم محمد علی جناح کی مساعی ہی کا نتیجہ ہے اس لیئے پاکستان جو کچھ بھی حاصل کرے گا اسے قائدِ اعظم کے کام ہی کا ایک حصہ سمجھا جائے گا۔ ہم یہ کہنے میں برحق ہیں کہ انھوں نے اپنی قوم کے لیئے جان دی۔ سر ظفر اللہ خاں نے اس مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے کہا

پاکستان صرف ایک فردِ بشر کا کارنامہ ہے اور یہ دنیا کی سیاسی تاریخ میں ایک انوکھا واقعہ ہے۔ ایک ایسے شخص کا جو آرام و آسائش کا عادی ہو چکا تھا ۶۴ برس کی عمر میں ایک ایسے عسیر الحصول نصب العین کو اپنے سامنے رکھ کر اس کے لئے کامیابی سے جدوجہد کرنا بڑی جرأت و شجاعت کا کام تھا اور پھر اس نصب العین کا تقریباً سات برس میں حاصل ہو جانا ایک ایسا واقعہ ہے جس پر دنیا ہمیشہ حیرت زدہ رہے گی۔ قائداعظم ہی تھے جنھوں نے اس نصب العین کو تشکیل دی اور اسے اپنے قوم کے سامنے رکھا اور اس کے حصول میں انھیں نہ صرف برطانوی حکومت اور نیشنل کانگرس دونوں سے ٹکر لینی پڑی بلکہ اپنی قوم کی بعض جماعتوں کی شدید مخالفت کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ مسٹر گریبن نے لندن سے ڈان کو تار بھیجا کہ "قائداعظم اپنے تمام رقیبوں سے بازی لے گئے۔ نہرو کبھی کبھی اپنے شکوک کا شکار رہا، پٹیل بھی کبھی کبھی خواہش اور مصلحت کے درمیان ڈانواڈول ہوتا رہا، گاندھی نے اپنی لیڈری میں گاہے گاہے نہ سمجھ آنے والی قلابازیاں کھائیں جن سے اُس کے پیروتک بھی حیران و پریشان ہوئے لیکن ان سب کے مقابل میں صرف ایک جناح تھا جو پاکستان اور مسلم قوم کی آزادی کے بارے میں پورا مستقل مزاج اور اٹل ہو کر رہا۔ لانبا، دبلا پتلا، باوجود اپنے بڑھاپے کے ایک تیر کی طرح سیدھا، سفید بالوں والا، انتہادرجہ جمیل و حسین ایسا تھا جناح جسے اُس کے پیرو دل و جان سے چاہتے تھے۔ نازک مزاج، امیر طبع، ہمیشہ خودداری کی ایک پُراسرار عبا میں ملبوس رہنے والے جناح نے خوب تاڑ لیا کہ آزاد ہندوستان سے گاندھی کی مراد وہاں کے تمام باشندوں پر ہندو انہ تسلط ہے۔ اس سے چند برس پہلے پاکستان کے اصول کا اظہار اقبال شاعر نے ضرور کیا تھا لیکن وہ جناح ہی تھا جس نے مسلم لیگ کو اور اس مطالبے کو ایک زندہ قوت اور ایک بین الاقوامی حقیقت بنا کر دکھا دیا۔ اُس کے کام میں جتنی قوت ہوتی تھی اتنی ہی چابکدستی بھی تھی، یہاں تک کہ آخر کار کانگرس کو بھی اعتراف کرنا پڑا کہ ہندوستان کے مسئلے کا اس کے سوا کوئی حل نہیں کہ پاکستان کے وجود کو تسلیم کر لیا جائے۔ ۹ جون ۱۹۴۷ء کو نئی دہلی میں ہزاروں مسلمان اُس کے گرد جمع ہو گئے اور انھوں نے نعرے لگائے "شہنشاہِ پاکستان زندہ باد" بظاہر یہ درست نہ تھا مگر سچ یہ ہے کہ حقیقت یہی تھی۔" کرپس نے پیغام بھیجا کہ "مسٹر جناح کے پُرخلوص عقیدوں اور واضح مقاصد نے انھیں اپنی قوم کا رہنما بنا دیا۔ مجھے اس بات کا پورا احساس ہے کہ اُن کی شخصیت اور قیادت کی یاد کو پاکستان میں کس شدت سے محسوس کیا جائے گا لیکن مجھے یہ بھی یقین ہے کہ ان کے پیرو پاکستان کی پُرامن ترقی اور خوشحالی کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دیں گے۔" مس فاطمہ جناح کے نام اُن کے بھائی کی وفات پر ہمدردی کا تار بھیجتے ہوئے کرپس نے کہا کہ "خود پاکستان اُن کی مستقل یادگار رہے۔" امریکی صدر ٹرومن نے لکھا "پاکستان کا خواب دیکھنے اور پھر اُسے حقیقت بنا دینے والے، ایک مملکت کے معمار، دنیا کی سب سے بڑی مسلم قوم کو وجود میں لانے والے یہ تھے مسٹر جناح اور اس کارنامے کے دوران میں جیسی انتہائی الفت و محبت اور وفاداری ان کو حاصل ہوئی وہ تاریخ میں شاذونادر ہی کسی شخص کو نصیب ہوئی۔" امریکی سکرٹیری آف سٹیٹ مارشل نے کہا کہ "مسٹر محمد علی جناح نوعِ انسان کے ایک بے مثل و یکتا لیڈر تھے اور اُن کی راہ نما غیر معمولی شخصیت کا فقدان صرف اُن کے اپنے ملک میں ہی نہیں بلکہ ساری انجمنِ اقوام میں شدت سے محسوس کیا جائے گا۔"

اسلامی ممالک میں قائداعظم کی وفات کو دنیائے اسلام کے لئے ایک ناقابلِ تلافی نقصان سمجھا گیا۔ اخوان المسلمین (مصر) مفتی یروشلم صدر انڈونیشیا مسلمانانِ برما، اسماعیلیان برلش گائنا وغیرہ سب نے اپنے انتہائی رنج کا اظہار کیا۔ ایرانی روزنامہ اخبار ستارہ نے لکھا کہ "قائداعظم نے عالمِ اسلام کے لئے بالعموم اور پاکستان کے لئے بالخصوص جو خدمات سرانجام دی ہیں وہ عدیم المثال ہیں۔ اُن کی خارجی حکمت عملی اتنی کامیاب تھی کہ پاکستان نے دنیا کی قوموں میں بالعموم اور عالمِ اسلام میں بالخصوص ایک امتیازی مقام حاصل کر لیا۔ اخبار کیہان نے لکھا کہ جناح نے ایک ملک اور قوم کی تخلیق کی۔ دنیا میں ہمیں کوئی ایسا حکمران نظر نہیں آتا جس نے یہ عدیم النظیر کارنامہ سرانجام دیا ہو۔" اور آخر میں کہا کہ "قائداعظم کی رحلت عالمِ اسلام کے لئے ایک عظیم سانحہ ہے۔" طہران کی مسجد سپہ سالار میں ایک ہزار اشخاص نے ان کی یاد میں قرآن خوانی کی مجلس میں حصہ لیا۔ پاکستان میں افغانی سفیر مارشل شاہ ولی خان نے قائداعظم کی قبر کی زیارت کرتے ہوئے کہا کہ "آج ہم اسلامی دنیا کی ایک عظیم المرتبت شخصیت

کے مرقد پر پھول چڑھانے آیا ہوں۔ یہ پھول جو میں لایا ہوں ایسے نہیں کہ کبھی کمھلا جائیں کیونکہ یہ اُس کلمۂ ربانی کے نسخے ہیں جو آپ کے ہمسایہ ملک کے مسلمان بھائیوں نے اپنے ہاتھ سے لکھے ہیں۔ یہ پھول تیرہ سو سال سے تر و تازہ ہیں اور خدا کے فضل و کرم سے ہمیشہ ایسے ہی رہیں گے۔" پھر کہا کہ "اگرچہ قائدِ اعظم ہم میں موجود نہیں ہیں لیکن میرے دل میں وہ محبت بدستور موجود ہے جو مجھے اُن سے رہی ہے۔ اُس محبت نے آج مجھے اُن کی مستقل یادگار پاکستان سے پہلے سے بھی زیادہ وابستہ کر دیا ہے۔" مصر نے بھی اپنا خراجِ تحسین ادا کیا اور "شاہ فاروق کی طرف سے گہری ہمدردی کے ساتھ ماتمی ہار" مرحوم کی قبر پر چڑھایا گیا۔

غرض قائدِ اعظم کی رحلت پر دُنیا کے کونے کونے سے ہزاروں پیغام مسلمانوں اور غیر مسلموں نے پاکستان کے اربابِ حکومت اور مس فاطمہ جناح وغیرہ کے نام بھیجے جن سے اُس دلی عقیدت اور احترام کا پتہ چلتا ہے جو اکابرِ عالم کے دلوں میں قائدِ اعظم کے لئے جاگزیں تھا۔ جب غیروں کی یہ حالت تھی تو اہلِ پاکستان کے دلوں کا کیا حال ہوگا؟

پاکستان کے شہر شہر اور گاؤں گاؤں میں ہر جگہ صفِ ماتم بچھ گئی اور اس کا دُور رس اثر ہر جگہ عیاں ہوا۔ سچ یہ ہے کہ ان دِنوں کی عام اطلاعات اور اخباری مقالات اور رنج پرور بیانات اپنی غیر معمولی اہمیت اور خلوص و صداقت کے باعث ہماری قوم کے لئے ایک تاریخی حیثیت حاصل کر چکے ہیں اور ان کا اعادہ اور ان پر ایک غائر نظر ہماری قومی بیداری کے سلسلے میں بصیرت افروز ثابت ہوگی۔ لائل پور سے اطلاع آئی کہ "بانیٔ پاکستان حضرت قائدِ اعظم کی موت کی خبر یہاں ہر ایک کے دل پر ایک بجلی گراتے ہوئے پہنچی۔ ریڈیو کے اعلان کے ساتھ ہی عورتوں بچوں اور مردوں نے دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیا اور اس طوفانِ گریہ میں لوگ گھروں سے باہر نکل آئے اور کوچوں اور بازاروں میں ماتم کا غل بلند ہوا۔ مشرقی بنگال سے اطلاع آئی کہ "کل شام کو ڈھاکے کے وسیع میدان میں بیس ہزار آنکھوں نے جن سے آنسوؤں کی لڑیاں جاری تھیں قائدِ اعظم کو پردۂ سیمیں پر چلتے پھرتے دیکھا۔ یہ مارچ میں اُن کے مشرقی بنگال کے دورہ کی فلم تھی۔ اخیر میں جب ہوائی جہاز پردۂ سیمیں پر گھن گرج کے ساتھ روانہ ہوتا دکھائی دیا تو اس جمِ غفیر میں قیامت کا کہرام مچ گیا اور لوگ روتے ہوئے اپنے گھروں کو چل دیئے لیکن اُن کی سُوجی ہوئی آنکھوں کے پیچھے وہ عزم جھلکتا تھا جس کا پیغام قائدِ اعظم کی زندگی سے انھیں ملا تھا۔" مشرقی پاکستان کی "بوائے سکاوٹ ایسوسی ایشن" نے اپنے "چیف سکاوٹ" "محمد علی جناح" کے لئے یہ تعزیتی قرارداد منظور کی کہ "ہم اس بات کا عہد کرتے ہیں کہ جو کام قائدِ اعظم نے ہمیں بتایا اور جس مقصد کے لئے انھوں نے اپنی جان دی ہم اُس کے حصول میں اپنا تن من دھن لگا دیں گے۔" صوبے کی سکرٹریٹ کے دفتری عملے نے تجویز کی کہ "جب تک ہمارا ملک ایسا ہی عظیم الشان ملک نہ بن جائے جس کی تمنا قائدِ اعظم کو تھی ہم چین سے نہ بیٹھیں گے۔" انجمن خواتین اسلام کے جلسے میں عورتوں نے عہد کیا کہ "ہم تعمیرِ پاکستان کے لئے مردوں کے شانہ بشانہ کام کر کے قائدِ اعظم کے پیغام کے مطابق عملی جد و جہد کے لئے تیار ہیں۔" بنگال اسمبلی کی خاص کمیٹی نے جو زمینداری ختم کرنے کے متعلق غور کر رہی ہے ارادہ کیا کہ "ہم اُمنگوں کے ساتھ آگے بڑھیں گے اور ناامیدی کبھی ہمارے بازو شل نہ کر سکے گی۔" مولانا اکرم خاں ناظمِ لیگ نے ڈھاکے میں دو لاکھ کے مجمع میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "میں آہ و بکا اور گریہ و زاری کا قائل نہیں۔ بے شک محمد علی جناح اِس دُنیا سے اُٹھ گئے لیکن قائدِ اعظم اپنے پیغام اپنی مثال اور اپنے لازوال کام کی بدولت زندۂ جاوید ہو چکے ہیں۔ اس لئے اگر آپ لوگوں کو اُن سے سچی محبت ہے تو آپ نئے حوصلوں کے ساتھ اُن کے بتائے ہوئے اصُولوں پر عمل پیرا ہوں۔" اور آخر میں کہا کہ "جو روح مرنے والے کی کوششوں سے پھونکی جا چکی ہے وہ غیر فانی ہے اور اس سے پاکستان کا مستقبل روشن تر ہے۔" سرینگر میں باوجود حکومت کے امتناعی حکم کے مسلمان عورتوں نے اکٹھے ہو کر نمازِ جمعہ ادا کی اور قائدِ اعظم کی روح کے لئے دعائے مغفرت کی۔ ملتان میں صدر مسلم لیگ نے اپیل کی کہ "مسلمان تمام لہو و لعب کو خیرباد کہہ کر سپاہیانہ زندگی بسر کرنے کا تہیہ کر لیں۔" مسلمانانِ دکن کے ہر دلعزیز رہنما سید قاسم رضوی نے کہا "حیدرآباد کے لوگو! آپ کا سب سے شفیق دوست اُٹھ گیا۔ لیکن اگر دنیا کے مسلمان بالعموم اور پاکستان اور حیدرآباد کے مسلمان بالخصوص اس نصب العین

کے لئے اپنی زندگی وقف کر دیں جس کے لئے قائدِ اعظم نے انتھک کوشش کرتے ہوئے اپنی جان نثار کر دی تو اُن کے رخصت ہونے سے ہمیں جو صدمہ پہنچا ہے وہ اس قدر ناقابلِ تلافی ثابت نہیں ہوگا۔"

لاہور کے متعلق "امروز" کے ایک نامہ نگار نے لکھا کہ ۱۲ ستمبر کو شہر میں "ہر طرف ایک سناٹا تھا۔ لوگ بازوؤں پر ماتمی نشان لگائے حزن و ملال کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ لیکن حزن و ملال کے ساتھ ساتھ احساسِ ذمہ داری بھی عام تھا۔ جہاں یہ سوال عام تھا کہ اب کیا ہوگا؟ وہاں یہ جواب بھی عام تھا کہ اللہ مالک ہے۔ پھر وہ لکھتا ہے کہ "میں نے ایک قلی سے پوچھا اب کیا ہوگا؟ کہنے لگا ہمارا باپ مر گیا، اللہ نے ہم کو تلوار دی تھی واپس لے لی۔ مگر ہم پاکستان فتح کر چکے ہیں تلوار چلی گئی مگر تلوار دینے والا تو موجود ہے" یہ قلی دلّی کا ایک مہاجر تھا۔ لاہور میں جگہ جگہ کئی چھوٹے جلوس بھی نکلے جو پُر امن تھے اور گاہے گاہے قائدِ اعظم زندہ باد کے نعرے لگاتے تھے۔

اہلِ صحافت نے اپنی اہم ذمہ داری کا پورا احساس کرتے ہوئے قوم کو صحیح راہ پر چلنے کی تبلیغ کی۔ "ڈان" نے لکھا "بابائے قوم مر گیا ہے۔ لیکن قوم زندہ ہے، پاکستان کا بانی مر گیا لیکن پاکستان زندہ ہے۔ اس کا کام ہو چکا تھا وہ کام جیسا تاریخ میں کم ہی کوئی کر سکا۔ دس برس سے کم عرصے میں اس نے ایک منتشر گروہ کو متحد کر دیا، اُسے منظم کر کے ایک بڑی قوم بنا دیا اُن کے سامنے ایک بلند تخیّل بطور نصب العین کے رکھا اور پھر اس تخیّل کو حقیقت کر دکھایا۔ قوم کو اُس سے محبت تھی اور اُسے پاکستان سے عشق تھا پس ہمارے لوگوں کو ایک لمحہ کے لئے بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ ہمارے لئے پاکستان سب چیزوں پر مقدّم ہے اور پاکستان توقع رکھتا ہے کہ ہم میں سے ہر ایک شخص اپنا فرض ادا کرے اور اپنے کام میں اور اپنی جگہ پر مضبوطی سے قائم رہے خواہ ایسا کرنے میں اس پر مصیبت کا پہاڑ ہی کیوں نہ ٹوٹ پڑے۔ خدا کی مرضی یہی تھی کہ ایسے وقت میں جب ہمارا ملک اور قوم مہیب خطرات سے گھرے ہوئے ہیں وہ قائدِ اعظم کو اس دُنیا سے اُٹھا لے۔ قائدِ اعظم کے ہوتے ہم ان مصائب پر خدا کے فضل سے غالب آجاتے اور اب قائدِ اعظم کے بغیر بھی ہم خدا ہی کے فضل و کرم سے ضرور اُن پر غالب آجائیں گے۔ قائدِ اعظم رحلت کر گئے لیکن آج ہمارے رہنما ایسے لوگ ہیں جنھیں خود قائدِ اعظم ہی نے تربیت دی۔ یہ لوگ اپنا کام انشاء اللہ بخوبی سرانجام دیں گے۔ ہم قوم کے سامنے ایک نعرہ پیش کرتے ہیں جو ہمیں اُس شاندار مقدّر کی طرف گام زن ہونے میں مدد دے گا جو ہمارے محبوب مرحوم قائد نے ہمارے لئے تخلیق کیا اور ہمارے سامنے رکھا:۔ "قائدِ اعظم مُردہ باد پاکستان زندہ باد!"

پاکستان ٹائمز نے لکھا: "قائدِ اعظم ہمارے باپ ہمارے بھائی ہمارے حبیب و ہم راز ہمارے ہم مسلک و ہم راہ ہمارے مشیر و قائد سبھی کچھ تھے۔ تکلیف کی گھڑیوں میں لاکھوں اُن کے نام سے تسلی پاتے تھے اور خوشی کے وقت میں وہ دل ہی دل میں اُن کے لئے دعا کرتے تھے۔ اور اب وہ رحلت کر گئے اور قوم اُن کی شفقت اور اُن کی دانش مندی سے اُن کی شیرازہ بند رہنمائی اور اخلاقی و سیاسی امور میں ان کی پاکیزہ ترین راست بازی سے محروم ہو گئی۔ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اس وقت ہمیں کئی قسم کی فکر و تشویش ہے، قوم کی آزادی کے لئے نئے نئے خطرے ہیں۔ لاکھوں مہاجرین ابھی مارے مارے پھر رہے ہیں، ہندوستان و پاکستان کے تعلقات بد سے بدتر ہوئے جاتے ہیں۔ اس نازک وقت میں ہمارا راستہ صاف ہے۔ ہمیں اس راہ پر چلنا چاہیئے جو قائدِ اعظم نے ہمارے لئے صاف کی۔ آج کے اس غمِ جانکاہ کے اندر سے جو قوم کے اوپر چھایا ہُوا ہے ایک ایسی نئی جرأت اور ایک ایسے نئے عزم کے پیدا کرنے کی ضرورت ہے جو ہمیں اس شاندار کام میں لگا دے جسے خود قائدِ اعظم نے شروع کیا یعنی ایک آزاد ترقی پرور اور مضبوط پاکستان کی تعمیر جس میں ہمارے عوام عزت سے اپنی زندگیاں بسر کر سکیں جہاں اُن میں وہ تمام نیکیاں پیدا ہو سکیں جو ایک شریفانہ آزادی سے پرورش پاتی ہیں اور جہاں وہ خوف اور دکھ درد اور افلاس سے جن کے نیچے وہ صدیوں دبے رہے ہمیشہ کے لئے رہائی پالیں۔"

امروز نے لکھا: "یہ اُس کی موت ہے جس نے کروڑوں کو حیاتِ نَو بخشی۔ جس نے دس کروڑ کی ایک مایوس و شکست خوردہ قوم کے مُردہ

جسموں میں تازہ روح پھونک دی۔ وہ ہم میں ایک ایسا غیر متزلزل عزم ایسا اٹل ارادہ ایسی ناقابلِ تسخیر ہمت پیدا کر گیا ہے جسے دنیا کی کوئی قوت مغلوب نہیں کر سکتی۔ ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ قائدِ اعظم کے فیضِ مربیت سے ہمیں خود آگہی کی جو دولت نصیب ہوئی وہ ہم میں موجود ہے جب تک ہماری روح غیر مغلوب اور ہمارا عزم پائندہ ہے پاکستان زندہ ہے اور جب تک پاکستان زندہ ہے ہمارا محبوب رہنما بھی زندہ ہے۔ اس کی مقدس یاد ایک چمکتے ہوئے نشان ایک روشن ستارے ایک مشعلِ نور اور روشنی کے ایک مینار کی طرح ہمارے سامنے رہے گی۔ آج پاکستان کے گورنر جنرل ہم سے رخصت ہو چکے ہیں مگر وہ قائدِ اعظم جو ہمارے دل کے اندر رہتے ہیں کبھی مر نہیں سکتے۔ وہ آج بھی زندہ ہیں ہم جب چاہیں انھیں اپنے دل کی بینائی میں دیکھ سکتے ہیں۔ وہ دیکھئے اطمینان سے بیٹھے کتنی میٹھی آواز میں کہہ رہے ہیں "اتحاد، ایمان، تنظیم"، ہاں بے باکی سے آگے بڑھو، ہمیں پاکستان کو دنیا کی سب سے طاقتور اور مضبوط مملکت بنانا ہے۔ خدا پر بھروسہ رکھو۔ فتح تمھارے قدم چومے گی"۔ پاکستان کا قیام سچ مچ ایک معجزہ ہے اور یہ معجزہ قائدِ اعظم جیسی عظیم الشان شخصیت کے ہاتھوں ہی ہو سکتا تھا جو ہندوستانی مسلمانوں کی قسمت کے آسمان پر ایک روشن ستارے کی طرح نمودار ہوئی۔ بجلی بن کر چمکی، بادل بن کر گرجی اور پھر بادل کی طرح برس کر قوم کی کشتِ ویران میں زندگی کی لہر دوڑا گئی۔

نوائے وقت نے لکھا: "قائدِ اعظم اُن زندۂ جاوید ہستیوں میں سے ہیں جنھیں موت کا بے رحم ہاتھ بھی نہیں مٹا سکتا۔ اُن کا خاکی جسم ہمارے درمیان نہیں مگر جو مشعل انھوں نے روشن کی ہے وہ صدیوں تک ہماری راہ نمائی کرتی رہے گی۔ پاکستان کو محمد علی جناح کی شخصیت سے جدا نہیں کیا جا سکتا اگر پاکستان زندہ ہے تو محمد علی جناح زندہ ہیں۔ خدمت، بے غرض خدمت، مسلسل خدمت! یہی قائدِ اعظم کا پیغام ہے جو وہ اپنے کام چھوڑ گئے ہیں۔ اب اُن کی موت کے بعد سات کروڑ پاکستانیوں کا فرض ہے کہ وہ مل کر اس کام کو مکمل کرنے کی کوشش کریں جسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش میں قائدِ اعظم نے اپنی جانِ عزیز جان آفریں کے سپرد کی۔ یہ کام استحکامِ پاکستان ہے۔ قائدِ اعظم کی بہترین یادگار پاکستان ہے اور اُن سے محبت کا بہترین مظاہرہ اسے مضبوط بنانے کی سعی! قائدِ اعظم زندہ باد۔ پاکستان پائندہ باد!"

زمیندار نے لکھا: "آج قائدِ اعظم بانیٔ پاکستان ہم میں موجود نہیں لیکن اُن کی روح اُن کا کام اُن کے خیالات اُن کے اقوال اور اُن کا غیر فانی عزم ہمیشہ ہماری رہنمائی کرتے رہیں گے۔ اِس وقت جب کہ خدا نے انھیں اپنے پاس بلا لیا خدائے عزّ و جل کے حضور میں کھڑے ہو کر ہم میں سے ہر ایک مسلمان بچے بوڑھے جوان اور عورت کو عہد کرنا چاہیئے کہ ہم قائدِ اعظم کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے پاکستان کے استحکام کیلئے جد و جہد کریں گے۔"

"**پاکستان کے ادیبوں کا عزمِ جہاد**" ہمارے دو مشہور انشا پردازوں کے اس اعلان سے ظاہر ہوا کہ "وقت کا اہم ترین تقاضا یہ ہے کہ قوم کے ہر طبقے اور ہر فرد کی پوری اخلاقی علمی اور ذہنی قوت ایک مرکز پر جمع ہو جائے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ قوم کو وقت کی نزاکت کا احساس ہے۔ اگر پاکستان کے دشمنوں نے ہماری قوم کو میدانِ جنگ میں اُترنے پر مجبور کر دیا تو جن انسانی تصورات کا نام پاکستان ہے اور انسانی زندگی کی جو آزادی ہم نے اپنی روح کی رہنمائی میں حاصل کی ہے اس کے تحفظ کی خاطر ہم تلوار اٹھانے سے بھی دریغ نہ کریں گے۔" قائدِ اعظم کی موت پر اپنے قومی جھنڈے کو سرنگوں ہوتے ہوئے دیکھ کر ایک پاکستانی ادیب نے کہا "یہ جھنڈے سرنگوں کرنے کا وقت نہیں، یہ جھنڈے سربلند کرنے کا وقت ہے۔" اس نے دیکھا کہ "لوگوں میں ہر ایک کا رنگ زرد تھا مگر روح سرخ یاقوت تھی چمکتی اور دمکتی ہوئی۔" "اس ماتم میں فوج کی للکار بھی تھی اور اس میں ضبط و نظم کی خاموش صدا بھی تھی جو ایک سوگوار مگر زندہ قوم میں ہو سکتی ہے اور ہونی چاہیئے۔" اس پر یہ ادیب پکار اُٹھا کہ "ہمارا جھنڈا قائدِ اعظم نہیں ہمارا جھنڈا پاکستان ہے۔ پاکستان بھی نہیں اس لئے کہ یہ بھی بہت محدود ہے، ہمارا جھنڈا اسلام ہے۔" سو "یہ جھنڈے سرنگوں کرنے کا وقت نہیں، یہ جھنڈے سربلند کرنے کا وقت ہے۔" (امروز مورخہ ۱۶ اور ۱۴ ستمبر)

قائدِ اعظم کی وفات نے جہاں عوام کو بے حد متاثر کیا وہاں اُس نے ہمارے کئی اربابِ حکومت کے دلوں میں بھی اپنی نئی ذمہ داری کا سچا اور شدید احساس پیدا کر دیا۔ وزیرِ اعظم پاکستان خان لیاقت علی خان نے (۱۲ ستمبر کو) اس جانکاہ واقعہ کے ۲۴ گھنٹے بعد اپنی نشری تقریر

ما: ہماری قوم کا لیڈر ہمارے عوام کا رہنما اور معمارِ پاکستان چل دیا۔ قائدِ اعظم جنھوں نے دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کی بنا ڈالی تاریخ
نھیں بلاشبہ دنیا کی عظیم ترین ہستیوں میں شمار کرے گی۔ اُن کے آہنی عزم اور استقلال نے ہر مسلمان کے سینے میں قوم کے لئے ایک جذبۂ سوزاں
یدا کر دیا۔ انھوں نے پاکستان کے نصب العین کے لئے دن رات محنت کی وہ ہمیشہ اخوت، مساوات اور آزادی کے علمبردار رہے۔ اب جب
۔ قائدِ اعظم ہم میں موجود نہیں ہیں ہمارا فرض ہے کہ ہم اسی صراطِ مستقیم پر گامزن رہیں جو انھوں نے ہمیں دکھائی تاکہ ہم اپنی منزلِ مقصود تک
پا پہنچیں۔ آج دنیا بھر کے مسلمان مشکلات کے نرغے میں پھنسے ہوئے ہیں لیکن اس سے ہمیں گھبرانا نہ چاہیئے۔ آیئے ہم وہ کام کریں جو قائدِ
اعظم چاہتے کہ ہم کریں یعنی ہم دن رات محنت کریں ہم اپنے باہمی اختلافات کو مٹا دیں اور پاکستان کے تحفظ کے لئے تن من دھن کی بازی لگا دیں
آج ملت پر نہایت کڑا وقت آپڑا ہے اور اس کا امتحان لیا جا رہا ہے۔ میں اور میرے ساتھی وزیر آج از سرِ نو اپنی زندگیاں پاکستان کی خدمت
کے لئے وقف کرتے ہیں اور خدا کو حاضر ناظر جان کر یہ حلف اٹھاتے ہیں کہ ہم ہمت اور عزم و استقلال کے ساتھ اس کام کو جاری رکھیں گے جس
کے لئے قائدِ اعظم نے اپنے تئیں وقف کر دیا تھا"۔ قوم کے نام (۱۲ ستمبر کو) پیغام دیتے ہوئے انھوں نے اپنے اور دوسرے وزرا کے اس عہد کو پھر دہرایا
اور کہا کہ "ہمارا کام اور ہمارا مقصد اپنے اس نوزائیدہ ملک کا استحکام ہے جس کے معمار قائدِ اعظم تھے۔ بانیٔ پاکستان اور اپنے مرحوم قائد کی خدمت
میں اپنی محبت و عقیدت پیش کرنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ ہم انھیں ارفع و اعلیٰ مقاصد کو پیشِ نظر رکھیں جو انھوں نے ہمارے سامنے رکھے اور
پاکستان کو ویسا ہی بنا دیں جیسا کہ وہ چاہتے تھے"۔ وزیرِ اعظم نے خود غرض اور مطلب پرست افسروں کو تنبیہ کی کہ یا وہ اپنا رویّہ درست کریں یا سمجھ
لیں کہ پاکستان میں ان کے لئے کوئی جگہ نہیں اور پھر عوام سے اپیل کی کہ اگر حکومت اور عوام دونوں اپنی اپنی جگہ وہ کام کریں جس سے پاکستان کی
بنیادیں مضبوط ہوں اور اس کی خوش حالی میں اضافہ ہو تو ایسا کام ہی ہمارے بابائے ملت کی اصلی یادگار ہوگا"۔ قائدِ اعظم کی رحلت کے دس دن
بعد (۲۲ کو) وزیرِ اعظم نے اپنی نشری تقریر میں کہا کہ: "دشمن نے یہ کہہ کر ملتِ اسلامیہ کو چیلنج دیا ہے کہ قائدِ اعظم کی وفات کے بعد ہماری قوم کا شیرازہ
بکھر جائے گا اور پاکستان قائم نہ رہ سکے گا۔ میں آج دشمن کے اس چیلنج کو قبول کرتا ہوں کیونکہ مجھے یقین ہے کہ میری قوم ایک زندہ قوم ہے اور وہ
پاکستان کی حفاظت و بقا کے لئے اپنی جان تک لڑا دے گی۔ بعض لوگ پریشان ہو کر ایک دوسرے سے یہ پوچھ رہے ہیں کہ اب کیا ہوگا؟ اُن کا
خیال ہے کہ پاکستان کا وجود محض قائدِ اعظم پر منحصر تھا لیکن کسی قوم کی ہستی بھی محض ایک شخص پر مبنی نہیں ہوتی۔ ایک قومی لیڈر کو کامیابی اُسی
وقت حاصل ہو سکتی ہے جب خود کسی قوم میں راہِ راست پر چلنے کی صلاحیت موجود ہو اور وہ اس کی بتائی ہوئی راہ پر چلنے کی قابلیت رکھتی ہو۔
اگر ہماری قوم اس صلاحیت سے محروم ہوتی تو قائدِ اعظم کبھی پاکستان کے حصول میں کامیاب نہ ہو سکتے۔ میں اپنی قوم کی قابلیتوں سے خوب آگاہ ہوں
اور مجھے یقین ہے کہ ہم تمام مشکلات پر قابو پالیں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے دشمنوں کی اُمیدیں پوری نہیں ہوئیں۔ اس کے برعکس ہمارے عوام میں
اتحاد و یک جہتی اور ذمہ داری کا احساس پہلے سے کہیں زیادہ ہو گیا ہے۔ یہاں تک کہ بعض ایسے لوگ جو حکومت سے اختلاف رکھتے تھے میرے
پاس آئے اور انھوں نے ملک کے لئے اپنی خدمات پیش کیں۔ انھوں نے خوب سمجھ لیا کہ اس نازک موقع پر سب اختلافات کو بالائے طاق رکھ
دینا چاہیئے۔ اور ہم سب کو متحد ہو جانا چاہیئے تاکہ ہمارا ملک خوب مضبوط اور طاقتور ہو جائے۔ آپ یہ سُن کر خوش ہوں گے کہ پاکستانیوں نے
گزشتہ دس دن میں جس صبر، ہمت اور استقلال کا ثبوت دیا ہے اس سے دنیا کی نظروں میں ہماری قوم کا وقار بدرجہا بڑھ گیا ہے"۔
پھر کہا کہ "میں خوب سمجھتا ہوں کہ بعض لوگوں کو یہ خطرہ ہے کہ شاید ہماری آزادی کسی جانب سے معرضِ خطر میں پڑ جائے۔ میں قوم کو یقین دلاتا ہوں
کہ ہماری بری، بحری اور ہوائی فوجیں اعلیٰ درجہ کی ہیں اور میں اپنی قوم اور ملک کو فاقہ کرتے دیکھ لوں گا لیکن ان کی آزادی کے تحفظ کے لئے کوئی
دقیقہ باقی نہ چھوڑوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر پاکستان پر کسی طرف سے حملہ ہوا تو ہر پاکستانی ایک ایک انچ زمین کے لئے اپنے خون کا آخری قطرہ
تک بہانے کے لئے تیار ہوگا۔ پھر بتایا کہ قائدِ اعظم کے ساتھ بارہ برس کی رفاقت میں میں نے چند نہایت اہم باتیں سیکھی ہیں۔ اول یہ کہ اپنی

زبان سے کوئی ایسی بات نہ کہو جس پر پوری طرح عمل کرنے سے تم قاصر رہو۔ دوسرے اپنے ذاتی تعلقات و رُجحانات کو قومی مفاد میں خلل انداز نہ ہونے دو اور اس معاملے میں دوسروں کے کہنے کی قطعاً پروا نہ کرو۔ اور تیسرے اگر تم سمجھتے ہو کہ کسی بات میں تم راستی پر ہو تو دشمن کے آگے خواہ وہ کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو ہرگز نہ جھکو۔ خدا نہ کرے اگر پاکستان ختم ہوجائے تو ساری اسلامی دنیا کا وجود خطرے میں پڑ جائے۔" پھر کہا کہ "یاد رکھو آج آپ اور آپ کی حکومت دو الگ الگ چیزیں نہیں، بلکہ وہ ایک ہی کل کے دو پُرزے ہیں اور اگر ان میں سے ایک بھی کام نہ کرے گا تو ساری کل رک جائے گی۔ پس پاکستان کی حفاظت کے بارے میں آپ میں سے ہر ایک کا فرض ہے کہ دل سے اُس کے ساتھ تعاون کرے جب تک آپ کو اپنی حکومت پر اعتماد ہے آپ کا فرض ہے کہ آپ اُس کے ہر حکم کو بلاچون وچرا تسلیم کریں اور قایدِ اعظم کے یہ الفاظ یاد رکھیں "ایمان اتحاد اور تنظیم"۔ انھیں خوبیوں نے ہمیں پاکستان لے کے دیا اور انھیں سے وہ آئندہ بھی قائم رہے گا"۔ اخیر میں کہا کہ آپ میں سے ہر ایک اپنے آپ سے پوچھے کہ کیا میں اس وراثت کا اہل ہوں جو قائدِ اعظم نے ہمارے لئے چھوڑی ہے۔ اگر آپ پاکستان کے خیر خواہ ہیں اور اپنی دھن کے پکے ہیں تو آپ واقعی اس کے اہل ہیں اور آپ کا مستقبل روشن ہوگا۔ پاکستان کا مستقبل آپ کا اپنا مستقبل اور آپ کے بچوں کا مستقبل اور آپ کی تہذیب کا وجود یہ سب آپ ہی کے ہاتھوں میں ہے۔ مجھے یقین ہے آپ اپنا فرض اس طرح ادا کریں گے کہ آئندہ نسلیں اسے کبھی نہ بھولیں گی۔ ہر پاکستانی کو اس بات کا تہیہ کر لینا چاہیئے کہ وہ پاکستان کو قائم رکھنے کے لئے اپنا جان ومال سب کچھ نثار کردے گا۔ یقین رکھیئے کہ پاکستان قائم ہوچکا ہے اور قائم رہے گا۔ پاکستان زندہ باد!"

دوسرے پاکستانی اکابر نے بھی اپنے خیالات کا کچھ اسی انداز میں اظہار کیا۔ نئے گورنر جنرل الحاج خواجہ ناظم الدین نے قوم کا شکریہ ادا کرتے ہوئے خدا سے دعا کی کہ وہ انھیں قائدِ اعظم کے نقشِ پا پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ عبدالقیوم خاں وزیرِ اعظم سرحد نے اپیل کی کہ "اے پاکستان کے مسلمانو! اپنے چھوٹے چھوٹے اختلافات کو بھول جاؤ اور باہم قدم سے قدم ملا کر آگے کی طرف بڑھتے چلو۔ کامیابی تمھارے قدم لینے کے لئے خود آگے بڑھ رہی ہے"۔

وزیرِ اعظم مشرقی بنگال نے کہا کہ "ہر پاکستانی کے دل میں اب ایک نیا عزم موج زن ہے"۔ وزیرِ اعظم مغربی پنجاب نے کہا کہ "قایدِ اعظم کی عظمت کا صحیح اعتراف یہ ہے کہ یہ عظمت اب ہمارے طرزِ عمل اور قوتِ عمل سے ظاہر ہو تاکہ ہم صحیح طور پر خدا کی نعمتوں کے قابل ثابت ہوسکیں"۔ چودھری غلام عباس رہنمائے کشمیر نے کہا کہ "چاروں طرف کی تاریکی میں ہماری روشنی "اتحاد تنظیم اور ایمان" کی وہ مشعل ہے جو ہم نے قائدِ اعظم سے ورثے میں پائی۔ آؤ اب اس کی پیروی میں ہم اپنا تن من سب کچھ نثار کردیں"۔ فضل الرحمٰن صاحب نے بوائے سکاوٹ ایسوسی ایشن سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ "بڑے آدمی کبھی نہیں مرتے، اُن کے جسم خاک میں مل جائیں لیکن اُن کی روحیں ہمیشہ آنے والی نسلوں کے دلوں میں زندہ رہتی ہیں۔ قائدِ اعظم کی روح بھی ہمیشہ زندہ رہے گی اور ہمارے لئے روشنی کے ایک مینار کا کام دے گی!"

قائدِ اعظم کی نمازِ جنازہ ختم ہونے پر مولانا شبیر احمد عثمانی نے اپنی تقریر میں اپنے غمگین بھائیوں کو صبر کی تلقین کی اور فرمایا کہ "شہنشاہ اورنگ زیب کے بعد ہندوستان نے اتنا بڑا مسلمان پیدا نہیں کیا جس کے غیر متزلزل ایمان اور اٹل ارادے نے دس کروڑ شکست خوردہ افراد کی مایوسیوں کو کامرانیوں میں بدل دیا"۔

قائدِ اعظم کے انتقال کے پورے دو ہفتے بعد وزیرِ اعظم پاکستان نے مغربی پاکستان میں تین ہزار میل کا دَورہ کرکے لاہور، پشاور، راولپنڈی اور کوئٹہ میں اپنی ولولہ انگیز تقریروں سے پانچ لاکھ پاکستانیوں کو مخاطب کیا جس سے ملک کے طول وعرض میں اُمید وعزم کی ایک لہر دوڑ گئی۔ لاہور میں انھوں نے کہا کہ: "قائدِ اعظم نے قوم میں اتنا اعتماد اور بھروسہ حاصل کرلیا تھا کہ اُن کی زندگی میں قوم نے خود سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ لیکن آج پاکستان کا ہر باشندہ محسوس کرتا ہے کہ پاکستان کے دفاع کی ذمہ داری اس کے اپنے کندھوں پر آپڑی ہے۔ قائدِ اعظم کی موت کے بعد

قوم میں پہلے سے زیادہ اتحاد جرأت اور خود اعتمادی کے اوصاف پیدا ہوگئے ہیں۔ خطرات کے احساس نے قوم کو اندرونی و بیرونی تمام مخالف طاقتوں کے خلاف ایک چٹان کی طرح مضبوط کر دیا ہے۔" پھر سست اور زیاں کار اصحاب کو تنبیہ کی کہ "یہ وقت ہوٹلوں اور گھروں میں بیٹھ کر حکومت پر نکتہ چینی کرنے کا نہیں۔ لوگوں کو چاہیئے کہ وہ میدان میں نکلیں اور کامل عزم اور حوصلے کے ساتھ حکومت کو پاکستان کے دفاع و استحکام میں پوری پوری مدد دیں اب عوام اور حکومت دو مختلف چیزیں نہیں بلکہ عوام ہی حاکم اور عوام ہی محکوم ہیں۔"

پشاور میں خان لیاقت علی خاں نے کہا کہ "پاکستان کی بنیاد قطعی طور پر اسلامی اصولوں پر رکھی گئی ہے۔ جہاں غیر مسلموں کو پورے شہری حقوق حاصل ہوں گے اور پھر بتایا کہ اسلامی ممالک سے ہمارے تعلقات روز بروز خوشگوار ہوتے جاتے ہیں۔"

راولپنڈی میں انھوں نے کہا کہ کشمیر اور پاکستان میں گہرا جغرافیائی، معاشی مذہبی اور تہذیبی رشتہ قائم ہے اور وہ کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے اور پھر اس بات پر زور دیا کہ ہندوستان اور پاکستان میں اس وقت تک دوستانہ تعلقات قائم نہیں ہو سکتے جب تک کشمیر کا منصفانہ طریقے پر فیصلہ نہ ہو جائے۔ کوئٹہ میں آخری تقریر میں انھوں نے کہا کہ ہماری لغت میں اعترافِ شکست کا لفظ ناپید ہے۔ پاکستان برابر قائم رہے گا اس کے لئے دس لاکھ افراد کی قربانی دی جا چکی ہے۔ پھر ہندوستان میں مسلمان اقلیت کی طرف اشارہ کرکے انھوں نے کہا کہ جب کسی قوم کو روحانی، اقتصادی، اخلاقی اور تہذیبی حیثیت سے ختم کر دیا جائے تو وہ فنا ہو جاتی ہے۔ اور اخیر میں اپنی پاکستانی قوم سے کہا کہ حکومت ملکی تحفظ کے لئے عوام کو بجائے مکھن روٹی کے توپ و تلوار کی پیش کش کرے گی۔ اس طویل دورے کے خاتمے پر کراچی میں بیان دیتے ہوئے وزیر اعظم نے کہا کہ "میں اپنے دورے سے پوری طرح مطمئن ہو کر آیا ہوں۔ میں دیکھتا ہوں کہ ہر شخص پاکستان کو ایک مقدس امانت سمجھتا ہے جو قائد اعظم نے ہمارے لئے چھوڑی ہے اور محسوس کرتا ہے کہ اب اس کا فرض ہے کہ وہ پاکستان کو ہر معنی میں دنیا کے عظیم ترین ممالک میں شامل ہونے کے قابل بنا دے۔" ۸ راکتوبر کو لندن جانے سے پہلے وزیر اعظم نے قوم کو مخاطب کرکے کراچی سے ایک تقریر نشر کرتے ہوئے مشرقی بنگال والوں کو یقین دلایا کہ مشرقی و مغربی پاکستان ہمیں یکساں طور پر عزیز ہیں اور پھر ہر پاکستانی سے تحفظِ وطن کے کام میں حصہ لینے کی اپیل کی اور کہا کہ "پاکستان کی حفاظت حکومت کے نزدیک اور سب چیزوں پر مقدم ہے۔"

غلام محمد پاکستانی وزیر خزانہ نے ۹ راکتوبر کو ایک پر مغز و معنی خیز نشری تقریر کی اور کہا کہ "پاکستان امن چاہتا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ عوام کے معیارِ زندگی کو بلند کرنے کی طرف اپنی توجہ مبذول کر سکے۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہ کروڑوں آدمی جس ذلیل قسم کی زندگی بسر کر رہے ہیں اُسے بہتر بنانے کے لئے دونوں ملکوں میں صلح کے تعلقات کا استحکام لازم ہے اور دونوں ملکوں میں صلح کا قیام اس پر مبنی ہے کہ کشمیر کا مسئلہ حل ہو اور اقلیتوں سے اچھا سلوک کیا جائے۔" پھر کہا کہ "قائد اعظم اس وقت ہم میں موجود نہیں لیکن اُن کی قومی آواز کی زبردست پکار پاکستان کے کونوں میں ہمیشہ گونجتی رہے گی اور ہمیں برابر اس کام کی تکمیل کے لئے ابھارتی رہے گی جس کا آغاز انھوں نے اس بلند حوصلگی سے کیا۔" پھر سمجھایا کہ "وہ کام جو ہمارے سامنے ہے کوئی معمولی سا کام نہیں۔ پس ہمیں خوش خیالی یا خود فریبی میں نہ کھو جانا چاہیئے۔ اب ہمارے لئے مطمئن ہو کر پڑ رہنے کی گنجائش نہیں، ہمیں ہر وقت چوکس رہنا پڑے گا کیونکہ آزادی کا تقاضا ہے کہ ہم تمام وقت ہوشیار رہیں۔ ایک کمزور ملک کو دیکھ کر قزاق طاقتوں کے منہ میں، خواہ مخواہ پانی بھر آتا ہے۔ یہ یاد دلایا کہ ہمارے لاکھوں بھائی مر گئے تاکہ ہم آزاد رہ سکیں سو اب دنیا کو یہ کہنے کا موقع نہ دو کہ اُن کی قربانی اکارت گئی بلکہ اپنے آپ کو منظم کرو اور ہر قسم کے ایثار کے لئے بخوشی تیار ہو جاؤ۔" انھوں نے کہا کہ "اب ہمیں چاہیئے کہ ہم ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے لگ کر کام کریں اور سب تیاری کریں اور تنظیم کریں اور اپنا ایک مخصوص لائحہ عمل بنالیں۔ ہر پاکستانی مرد عورت اپنی اپنی جگہ ملک کے مشترک مفاد کے لئے کچھ نہ کچھ کام کر سکتا ہے۔ پس ہر شخص کو چاہیئے کہ وہ ہر روز تھوڑا سا وقت اپنی قوم کی خدمت کے لئے وقف کر دے۔ اس کام کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں مثلاً نیشنل گارڈ یا شہری دفاع میں شرکت، معاشرتی خدمت، ہاتھ سے

کاتنا اور بُننا، اَن پڑھ لوگوں کو پڑھانا، کھیتوں یا کارخانوں میں کام کرنا وغیرہ۔" اخیر میں انھوں نے تنبیہ کی کہ وہ لوگ جو خوش قسمتی سے امیر ہیں یا اچھے عہدوں پر فائز ہیں یا جو لوگوں کے لیڈر بننا چاہتے ہیں اور اُن پر اثر ڈال سکتے ہیں انھیں بھولنا نہ چاہیئے کہ اُن کے کندھوں پر بڑی بھاری ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔ مثلاً سرمایہ داروں کو چاہیئے کہ ملک کے دفاع کے لئے بغیر کسی کے مانگے روپیہ دیں اور دل کھول کر دیں کارخانہ داروں کو چاہیئے کہ وہ بنیادی اور نئی صنعتوں کے قیام کی طرف متوجہ ہوں۔ سرکاری ملازموں کو چاہیئے کہ وہ اپنے آپ کو عوام کا خادم سمجھیں نہ کہ اُن کے آقا اور سیاست دانوں کو چاہیئے کہ وہ ایک دوسرے سے لڑنا جھگڑنا چھوڑ دیں اور سیاست کی رَو میں نہ بہہ جائیں۔"
وزیر خزانہ نے کہا کہ "یاد رکھو جمہوریت صرف ایک آزاد فضا میں فروغ پا سکتی ہے اور رائے عامہ ہی ہے جو اقتدار کو چند اشخاص کا آلہ کار بننے سے روک سکتی ہے۔ یہ لازم ہے کہ اقتدار عوام کے ہاتھوں میں ہو اور عوام ہی کے مفاد کے لئے استعمال ہو۔ یاد رکھو کہ ہماری فلاح ہر وقت شکوے شکایت کرنے اور بکواس کرنے میں نہیں بلکہ کام اور محنت سے کام کرنے میں مضمر ہے!"

پاکستان کی تعلیم یافتہ عورتوں میں حب الوطنی کا جذبہ جوش مار رہا ہے اور وہ قوم کے مختلف مسائل اور مشکلات میں اپنا فرض ادا کرنے کے لئے بیقرار نظر آتی ہیں۔ بیگم لیاقت علی خاں نے (۲۶ ستمبر کو) لاہور میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ایک مضبوط خوش حال اور ترقی پذیر پاکستان ہی پاکستان کے معمار اعظم محمد علی جناح کی بہترین یادگار ہو سکتا ہے اور بیگم عورتوں کو جنگِ آزادی کی یاد دلائی جس میں انھوں نے نمایاں حصہ لیا تھا ہوشیار کیا کہ اس نازک وقت میں وہ خاموش و مطمئن ہو کر نہ بیٹھ رہیں بلکہ قومی رضا کار بن کر قسم قسم کے کاموں میں مصروف ہو جائیں۔" خوشی کی بات ہے کہ پنجاب اسمبلی میں دستور ساز اسمبلی میں امریکہ میں فرانس میں جہاں جہاں موقع ملا ہے ہماری عورتیں ہر جگہ جا کر اپنے خلوص اور قابلیت کے جوہر دکھا رہی ہیں۔ حال ہی میں (۳۰ ستمبر و یکم اکتوبر کو) اقوام متحدہ کے جلسوں میں بیگم شائستہ اکرام اللہ نے ہندوستان میں مسلمانوں کے حالِ زار پر اور عام انسانی حقوق کے بارے میں فصیح و بلیغ تقریریں کیں۔ بیگم صاحبہ نے جو خود اُردو کی ایک مشہور انشا پرداز ہیں یہ بھی کہا کہ ہندوستان میں علاوہ انسانی قتل و غارت کے اُردو زبان بھی تباہی کے گھاٹ اُتاری جا رہی ہے اور یہ ایک قسم کا تہذیبی قتلِ عام ہے جس کی طرف متحدہ اقوام کو خاص طور پر متوجہ ہونا چاہیئے۔" قائد اعظم مسلمان عورتوں کے لئے صحیح قسم کی آزادی کے زبردست حامی تھے۔ اس حمایت و تائید کی یاد مدتوں ہماری عورتوں کے دل میں چٹکیاں لیتی رہے گی اور انھیں جدوجہد کے لئے اُبھارتی رہے گی۔ ایک مشہور نسوانی کارکن (امروز مورخہ ۲۰ ستمبر میں) لکھتی ہیں کہ "کئی مرتبہ مسلم لیگ کمیٹی خواتین کی طرف سے میں نے اپنے محبوب رہنما سے مستورات کے لائحہ عمل کے متعلق سوال کئے۔ کیا مسلم خواتین کو سیاست کے میدان میں مصروفِ عمل ہونا چاہیئے؟ کیا مسلمان عورت کو ہر ایک لائف میں حصہ لینا چاہیئے؟ ہر بار اس کا جواب مجھے ہمارے قائد اعظم نے یہی دیا کہ میں اپنی بہن فاطمہ جناح کو ہر موقع پر اسی لئے اپنے ہمراہ لے جاتا ہوں کہ میں اپنی قوم پر واضح کر دوں کہ مسلمان عورت کو ترقی یافتہ اقوام کی عورتوں کی طرح زندگی بسر کرنا ہے۔" ہمارے قائد نے مسلمان عورت کے دل میں سیاسی شعور پیدا کر کے ہمیں ترقی کی راہ پر گامزن کر دیا۔ مُردہ دلوں میں جان ڈال کر ہمارے گلے میں آزادی کا ہار پہنا دیا تاکہ ہم خودداری اور عزت و آبرو کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں۔"

قوم اور اربابِ حکومت کا کس طرح ایک دوسرے کے ساتھ تعاون ہو رہا ہے یہ جا بجا مختلف قسم کی نئی سرگرمیوں سے ظاہر ہے۔ پچھلے سال باوجود کوشش کے لاہور میں لوگ قومی تحفظ کی طرف سے غافل تھے لیکن اب قائد اعظم کی وفات اور حیدر آباد کی شکست کے بعد اُن میں بجائے مایوسی کے قومی کاموں کے لئے ایک نئی اُمنگ اور نئی لگن پیدا ہو رہی ہے جو ہمارے روشن مستقبل کی آئینہ دار ہے۔ اِدھر لاہور اور مختلف شہروں میں سول ڈیفنس کمیٹیاں بن رہی ہیں ہزاروں لوگ خوشی خوشی صبح صبح اُٹھ کر نیشنل گارڈ کی قواعد میں حصہ لیتے ہیں اور اُدھر پاکستان کی مرکزی حکومت نے شہری حفاظت (سول ڈیفنس) کے لئے ایک مستقل محکمہ کھول دیا ہے (۲۳ ستمبر) اور شہروں میں رضاکار رائفل کلب جاری کرنے کا انتظام ہو رہا ہے۔ حکومت نے عوام کو متنبہ کیا ہے کہ آج کل کی جنگ میں صرف فوج ہی حصہ نہیں لیتی بلکہ ملک کی ساری کی ساری آبادی کو

اُس میں شریک ہونا پڑتا ہے اور عوام کے ہمت و حوصلے کی دفاع میں غایب درجہ اہمیت ہے۔ عوام نے حکومت کی اس آواز پر لبیک کہی ہے اور پاکستان میں روز بروز ایک نئی زندگی کے آثار نظر آرہے ہیں۔

حکومتِ پاکستان نے **قائدِ اعظم کی یادگار** قائم کرنے کے لئے ایک قومی سکیم کا اعلان کیا ہے۔ (۱۸ ستمبر) جس کے تحت میں ایسے قومی ادارے جاری کئے جائیں گے جو قوم کی روحانی، اخلاقی، ذہنی اور مادی ترقی میں ممد و معاون ثابت ہوسکیں۔ چنانچہ کراچی میں علاوہ ایک عالیشان مقبرے کے ایک عظیم الشان مسجد ایک اسلامی دارالعلوم ایک وسیع کتب خانہ اور ایک فنی و صنعتی ادارہ قائم کیا جائے گا اور اس سلسلے میں ایک قائدِ اعظم یادگار فنڈ کھول دیا گیا ہے۔ حکومت کے پیشِ نظر یہ کام بھی ہے کہ قائدِ اعظم کی بڑی بڑی رنگین تصاویر تیار کرا کے تمام سرکاری و قومی اداروں میں آویزاں کی جائیں۔ کسی نے یہ بھی کہا ہے کہ ایک قومی عجائب خانہ جلد قائم کیا جائے جہاں بابائے ملت کے تمام خطوط دستاویزیں اور فوٹو اور ذاتی سامان کو نہایت احتیاط سے سنبھال کر رکھ لیا جائے کیونکہ آنے والی نسلوں کے لئے اُن کی بے حد اہمیت ہوگی۔ ان کے علاوہ اس عجائب خانہ میں وہ تمام چیزیں بھی اکٹھی کر دی جائیں جو کسی نہ کسی صورت میں مملکتِ پاکستان کی تشکیل سے وابستہ رہی ہیں۔ یقین ہے کہ قائدِ اعظم رحمہ کی ہزاروں یادگاریں جابجا قائم ہوں گی اور اس طرح قوم اُن کے نام سے مختلف طور پر مستفید ہوسکے گی۔ مثلاً ڈھاکہ میں ایک جناح ہال کی تعمیر کے لئے تحریک کی گئی ہے اور اسی طرح کیپ ٹاؤن کے مسلمان ان کی یاد میں ایک کتب خانہ اور چند اور ادارے قائم کر رہے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس ایک سرچشمہ سے جو صرف ظاہری طور پر خشک ہوا ہے فیضِ عام کی ہزاروں نہریں جاری ہو رہی ہیں جو ملک و ملت کو مدتوں سرسبز و شاداب کرتی رہیں گی۔

قائدِ اعظم کی وصیت کے مطابق اُن کی جائداد کا بیشتر حصہ ہندوستان و پاکستان کے مختلف اسلامی تعلیمی اداروں میں تقسیم کیا جائے گا بلکہ بمبئی یونیورسٹی کو انھوں نے جو عطیہ دیا ہے اُس سے غیر مسلم بھی مستفید ہوں گے۔ اس کارِ خیر سے قائدِ اعظم کی وسعتِ نظر بے تعصبی اور دور اندیشی کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی قوم کو راہ دکھائی ہے کہ مسلمانوں کا روپیہ کس طرح مفید طور پر صرف کیا جا سکتا ہے۔ اور جس طرح دوسری آزاد قومیں علاوہ سرکاری ذرائع کے افراد کی فیاضی اور ایثار سے اپنے اداروں کو مالا مال کرتی ہیں اسی طرح پاکستان کے مسلمان بھی اپنی تعمیرِ ملی کے ایک ایک شعبہ میں خود حصہ لے کر اسے فروغ دیں اور کمال پر پہنچائیں۔

جیسا کہ مذکورہ بالا واقعات و اقتباسات سے ثابت ہوتا ہے قائدِ اعظم نے اپنی زندگی میں ہندوستان کے مسلمانوں کے دل میں گھر پیدا کر لیا تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ اب اُن کی موت اہلِ پاکستان کے دل و دماغ میں ایک زبردست انقلاب برپا کر رہی ہے۔ آدمی کی قدر مرنے کے بعد ہوتی ہے عموماً ایسا ہی ہوتا ہے لیکن کبھی کبھی اس کی قدر اُس کے جیتے جی بھی ہوتی ہے اور اس کے مرنے کے بعد دوست دشمن دونوں اُس کی خوبیوں کے معترف ہو جاتے ہیں۔ قائدِ اعظم ایک ایسے ہی غیر معمولی انسان تھے۔ جب تک وہ جئے اُن کی قوم اُن پر جان چھڑکتی رہی اور جب وہ مرے تو ایک دنیا اُن کا ماتم کرنے لگی اور اُن کے مخالفین نے بھی کہا کہ یہ وہ شخص تھا جس نے تاریخِ عالم کا رُخ موڑ دیا!

قائدِ اعظم کو اُن کی قوم نے فی الحقیقت ایک آمر کے جملہ اختیارات سونپ دیئے تھے لیکن انھوں نے کئی موقعوں پر ان اختیارات کے استعمال سے عمداً پرہیز کیا۔ قوم اُن کے پیچھے چلی لیکن بعض اہم امور میں وہ بھی قوم کے جذبات و اعتقادات کے پیچھے ہو لئے۔ ۱۹۳۷ء اور ۱۹۴۷ء کا قائدِ اعظم ۱۹۱۷ء اور ۱۹۲۷ء کے مسٹر جناح سے بعض باتوں میں ایک بالکل مختلف انسان تھا۔ مسلم لیگ کے اجلاس دہلی (مئی ۱۹۴۳ء) میں انھوں نے امیروں اور سرمایہ داروں کو تنبیہ کی کہ وہ اپنے لالچ اور خود غرضی کو چھوڑ دیں اور بتایا کہ مسلم لیگ امیروں کو زیادہ امیر کرنے کے لئے جد و جہد نہیں کر رہی اور پاکستان کا دستور ملت کے عوام وضع کریں گے۔ پھر پاکستان کے حصول پر (۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کو) انھوں نے دستور ساز اسمبلی

میں کہا کہ "پاکستان کو عام لوگوں کی بہتری پر سب سے زیادہ توجہ کرنی چاہیئے"۔ جولائی ۱۹۴۶ء میں انھوں نے کہا کہ "اگر ہم قرآن مجید کو اپنا آخری اور قطعی رہبر بنا کر شیوۂ صبر و رضا پر کاربند رہیں تو ہمیں دنیا کی کوئی طاقت یا کئی طاقتوں کا مجموعہ بھی مغلوب نہیں کر سکتا"۔ مارچ ۱۹۴۷ء میں انھوں نے کتنے انکسار و خلوص سے فرمایا کہ "کچھ لوگ اسے میری کوششوں کا نتیجہ سمجھتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ مسلمانانِ ہند کا اس قدر جلد متحد ہو جانا خدا کے فضل و کرم کا نتیجہ اور قرآنِ کریم کی تعلیمِ اخوت کا زندہ معجزہ ہے۔ پاکستان کے مطالبے سے ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کو ان کی اکثریت کے علاقے میں اسلامی تعلیمات کے مطابق آزادی کی فضا میں سانس لینے کا موقع دیا جائے"۔ اور تو اور خود اہلِ مغرب نے اب پاکستان میں مذہبی عنصر کی اہمیت و افادیت کو تسلیم کر لیا ہے۔ پاکستان کی آزادی کی پہلی سالگرہ پر لندن کے مشہور ہفتہ وار اخبار سپکٹیٹر نے لکھا کہ "پاکستان اپنے پہلے سال کے کارنامے پر بجا طور سے فخر کر سکتا ہے۔ اس کی کمزوریاں جن کی بابت پیش گوئی کی گئی تھی کہ وہ کبھی اسے ایک حقیقت نہ بننے دیں گی ان کو اس حیرت انگیز سیاسی اتحاد اور قومی جوش نے مٹا کے رکھ دیا ہے جس کی بنیاد ایک مشترک مذہب پر قائم ہے"۔

قائداعظم کا ہاتھ ہمیشہ اپنی قوم کی نبض پر تھا۔ یہ مریض اُن کے علاج پر اپنے بسترِ مرگ سے اُٹھ بیٹھا اور اُٹھ کر ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ اُدھر دنیا کے میدان میں اس کا مقابلہ فوراً ہی ایسے اچھوں سے آپڑا۔ قائد نے اسے اس مقابلے پر اُبھارا اور وہ اپنے معرکے میں کامیاب بھی ہو گیا اور بے وقت سستانے لگا۔ وہ یہ سمجھا کہ قوموں کی زندگی ایک دن کا ذکر نہیں ہوتا بلکہ ایک مسلسل جنگ ہوتی ہے جس میں انہماک قوت آفریں ہے اور جس سے اجتناب کئی قسم کے خطروں کا حامل ہوتا ہے۔

پاکستان کی آزادی کے پہلے سال میں خطرات اور مصائب چاروں طرف سے اہلِ پاکستان پر ٹوٹ پڑے، ان کی اپنی غفلتوں اور خود غرضیوں نے ان میں اور اضافہ کر دیا۔ لیکن قائداعظم کی غیر متوقع موت نے انھیں چونکا دیا، ہوشیار کر دیا۔ اب اگر مسلمان قوم اپنے ایثار و محنت اور اتحاد و جرأت سے واقعی اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا سیکھ لے تو کیا عجب ہے کہ وہ کام جو ہمارے محبوب رہنما اپنی زندگی میں پورا نہ کر سکے اُن کی موت سے سرانجام ہو جائے — پھر دنیا کہے کہ قائداعظم مر گئے مگر ہاں مر کر اپنی قوم کو صحیح معنوں میں زندہ کر گئے!

بشیر احمد

غروبِ ماہتاب

وہ عظیم ترین فخرِ روزگار انسان، وہ سراپا عمل پر جوش ہستی، وہ ہزاروں کا مقابلہ کرنے والا مجسمۂ استقلال و ثبات، وہ وقت کی نبض پہچاننے والا نکتہ شناس عالی دماغ سیاست دان، دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت کا وہ بانی۔ سفینۂ ملت کا وہ دلیر اور مشاق ملاح، دس کروڑ انسانوں کا محبوب قائد، غلامی کی گہری تاریکی میں وہ اپنے بے قرار جذبۂ عمل سے یکایک آزادی کے ماہِ تاباں کی نورانی کرنیں بکھیرنے والا!

اُس کے غروب پر آج:

"شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو"

(۱۲ ستمبر ۱۹۴۸ء ۶ بجے صبح)

شیریں

جناب حفیظ ہوشیار پوری نے ہمایوں کے "قائداعظم نمبر" پر مدیر ہمایوں کو ایک مضمون پڑھ کر ہمیں مطلع فرمایا ہے کہ مضمون ذیل عنوان سے قائداعظم کی تاریخ وفات نکلتی ہے: "جناب قائداعظم کی زندگی کے اہم واقعات" = ۱۹۴۸ء

قائدِ اعظمؒ

تاریخِ وفات

(کلامِ بیدل سے)

۱

"خامشی ہائم جہانے راپسوزِ دل گرفت — آخر از ضبطِ نفس صبحِ قیامت واشدم"

"عرصۂ آزادی از جوشِ غبارم تنگ بود — بر سرِ خود دامنے افشاندم و صحرا شدم"

جاں سپارم ہم بہ خاموشی بگویم یا جہاں — "عالمے را جمع کردم کایں قدر یکتا شدم"

۶۵۹ + ۱۸۸۹ = ۱۹۴۸ء

۲

از سکوتِ غم مپرسید اے حریفانِ سخن — در ہجومِ رنج و غم تابِ سخن گم کردہ ام

دردِ محرومی نمایاں از "سراغِ قائد" است — "صد نگہ چوں شمع در راہِ انجمن گم کردہ ام"

دل برفت و برلب آمد گفتۂ بیدل حفیظ — "آنچہ من گم کردہ ام نایافتن گم کردہ ام"

۱۳۶۷ھ

۳۴

۱۴۰۱ - ۳۴ = ۱۳۶۷ھ

حفیظ ہوشیارپوری

محفل سے اُٹھ کے انجمن آرا کدھر گیا!

(حضرت قائدِ اعظمؒ کی وفات سے متاثر ہو کر)

محفل سے اُٹھ کے انجمن آرا کدھر گیا؟ جنت نگاہ تھا جو نظارا کدھر گیا؟

وہ جو نمودِ صبح کی روشن دلیل تھا گردوں سے ٹوٹ کر وہ ستارا کدھر گیا

پھیلی ہوئی تھی جس کی گلستاں میں چاندنی واحسرتا! وہ چاند ہمارا کدھر گیا

منجدھار سے نکال کے کشتی کہاں لگائیں ساحل کہاں گیا وہ کنارا کدھر گیا

دیوانہ وار ڈھونڈ رہی ہے جسے نظر وہ اپنی زندگی کا سہارا کدھر گیا

چلتا تھا جس کے دم سے مرا کاروانِ زیست اُس چشمِ نیم وا کا اشارا کدھر گیا

دیدار کے لئے مری آنکھیں ترس گئیں وہ یارِ دلنواز و دل آرا کدھر گیا

کشفی بطورِ طنز لگے پوچھنے رقیب
فرماؤ اب وہ ناز تمھارا کدھر گیا

کشفی ملتانی

قائدِ اعظم کے ارشادات

(گزشتہ سے پیوستہ)

یونیورسٹی ہال لاہور میں یوم اقبال پر تقریر (۲۵ مارچ ۱۹۴۰ء، ۱۱ بجے صبح) "اقبال نے ہندوستان کے مسلمانوں میں سیاسی اور قومی شعور پیدا کرنے میں بڑی بھاری خدمت سرانجام دی ہے اور آج اُس کے قومی گیت ہندوستان کے کونے کونے میں گائے جاتے ہیں۔ اقبال دُنیا بھر میں مشہور ہے اور اُس کا شمار عظیم ترین شعراء میں ہوتا ہے اور ہمیں اپنے ایسے بڑے شاعر اور ایسے بڑے آدمی پر بجا طور پر فخر ہے۔ اقبال میرا پرانا دوست تھا۔ جب میں اپریل ۱۹۳۶ء میں پنجاب میں آیا تو پہلا شخص جس سے میں ملا وہ اقبال تھا۔ میں نے اپنے خیالات اُس کے سامنے پیش کئے اُس نے فوراً لبیک کہی اور اُس وقت سے تادمِ مرگ اقبال ایک چٹان کی طرح میرے ساتھ کھڑا رہا۔ اقبال کی شاعری زندہ رہے گی جب تک بھی اُردو زبان زندہ ہے۔ ایک دفعہ میں علی گڑھ سے بمبئی کا سفر کر رہا تھا کہ راستے میں گاڑی ایک چھوٹے سے سٹیشن پر ٹھہری۔ وہاں میں نے کیا دیکھا کہ دیہاتی سینکڑوں کی تعداد میں جمع ہیں اور مل کر اقبال کا ترانہ گا رہے ہیں: چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا۔ مسلمانوں کے لئے اقبال شیکسپیئر سے بھی بڑا تھا۔ کارلائل کی بابت مشہور ہے کہ جب اُس سے کہا گیا کہ "اگر تمہیں برطانیہ اور شیکسپیئر میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کا اختیار دے دیا جائے تو تم کیا کرو گے تو اُس نے فوراً کہا کہ میں شیکسپیئر کو کسی قیمت پر نہ دوں گا" میرے پاس گو سلطنت نہیں ہے لیکن اگر مجھے سلطنت مل جائے اور اقبال اور سلطنت میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کی نوبت آئے تو میں بلا تامل اقبال کو منتخب کروں گا۔"

بمبئی پراونشل مسلم لیگ کانفرنس کی طرف پیغام (۲۶ مئی ۱۹۴۰ء) "آل انڈیا مسلم لیگ نے مسلمانانِ ہند کو ٹھیک رستے پر لگا دیا ہے۔ اس نے انہیں ایک جھنڈا، ایک پلیٹ فارم، ایک پالیسی اور ایک مفید پروگرام دیا ہے اور آخر کار اُس نے اسلامی ہند کے لئے ایک نصب العین پیش کیا اور اُسے اپنی قرارداد نمبر ۱ سے واضح کر دیا ہے تاکہ وہ ہر قسم کی قربانی کرتے ہوئے اُس کے لئے جنگ کریں اور اُسے حاصل کر لیں کیونکہ اسی پر اُن کی اصلی نجات ہے۔ حیرت کا مقام ہے کہ مسٹر گاندھی اور راج گوپال اچاریہ سے آدمی قرارداد لاہور کی بابت کہیں کہ یہ ہندوستان کی چیر پھاڑ ہے اور ایک نھنے بچے کے دو ٹکڑے کرنا ہے۔ بلاشبہ ہندوستان کو خود قدرت نے تقسیم کر رکھا ہے۔ مسلم ہند اور ہندو ہند ہندوستان کے نقشے پر پہلے سے موجود ہیں۔ پھر میں سمجھ نہیں سکتا یہ چیخ پکار کیسی ہے۔ کہاں ہے وہ ملک جسے ٹکڑے ٹکڑے کیا جا رہا ہے؟ کہاں ہے وہ قوم جس کی قومیت چھینی جا رہی ہے؟ ہندوستان متعدد قومیتوں پر مشتمل ہے اور اس کے علاوہ اُس میں سینکڑوں بڑی اور چھوٹی ذاتیں بھی ہیں۔ پھر کہاں ہے وہ مرکزی قومی حکومت جس کے اختیارات میں رخنہ اندازی کی جا رہی ہے؟

کہا جاتا ہے کہ ہم فرقہ واری پیدا کر رہے ہیں۔ کیوں۔۔؟ اس لئے کہ ہم ہندو مسلمانوں کو اپنا اپنا وطن دلا رہے ہیں تاکہ وہ پہلو بہ پہلو دو معزز قوموں اور دو باوقار ہمسایوں کی طرح رہ سکیں؟ پھر کہا جاتا ہے کہ ہم غیر ملکوں سے سازباز کریں گے؟ جب ہمیں ہمارا قومی وطن مل جائے گا اور وہاں ہم اپنی ہی قومی حکومت بنا لیں گے تو کیا ممکن ہے کہ ہم اپنی سرحدوں کی حفاظت نہ کریں۔ اور کہا جاتا ہے کہ یہ منصوبہ قابلِ عمل نہیں تو کیا خوفناک صوبے اس وقت موجود نہیں ہیں جہاں ہندو اور مسلمان اپنا اپنا غلبہ رکھتے ہیں؟ ہاں یہ اور بات ہے کہ کانگرس اسلامی ہند پر مرکزی حکومت کا غلبہ چاہتا ہے۔ ہمارا منصوبہ اہمسا اور چرخے سے زیادہ قابلِ عمل ہے اور سچ تو یہ ہے کہ وہ رام راج یا سوراج سے یا مسٹر گاندھی کی مکمل

آزادی سے بہتر ہے۔ آخر میں ہم سے یہ کہا جاتا ہے کہ ہمارا منصوبہ خود مسلمانوں کے لئے مفید نہیں۔ یقیناً اس بات کو تو خود اسلامی ہند پر چھوڑ دینا چاہیئے کہ وہ خود سوچ سمجھ کر اس کا فیصلہ کرلے۔ کانگرس کی طرف سے یہ اعتراض بھلا نہیں معلوم ہوتا اور لیگ کی قرارداد کے سلسلے میں خانہ جنگی کا کیوں ذکر کیا جائے؟ یہ پرلے درجہ کی شرارت ہے۔ اس سے کوئی جنگ نہ چھڑنی چاہیئے ہاں کانگرس خود چھیڑنا چاہے تو اور بات ہے۔ ہمارے نصب العین میں ہندوستان کی آزادی اور خود مختاری مضمر ہے، اس سے ملک کو جلد تر آزادی ملے گی۔ خدا کرے مسٹر گاندھی کی سوچی ہوئی "خانہ جنگی" برپا نہ ہو بلکہ سمجھدار ہندو مسلمان قراردادِ لاہور کے حل کو تسلیم کرلیں۔ ہمارا مقصد کسی دُوسرے فرقے یا قوم کو گزند پہنچانا نہیں۔ ہم تو اس ملک میں آزاد انسانوں کی سی باعزت زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں اور ہم آزاد اسلام اور آزاد ہندوستان کے علمبردار ہیں۔"

دہلی میں تقریر (نومبر ۱۹۴۰ء):۔ "مسلمان اب بچے نہیں رہے وہ اب جوان ہوگئے ہیں۔ اُن کی جو حالت تین برس پہلے تھی اب اُس سے وہ قطعاً اور بنیادی طور پر مختلف ہیں اور مجھے سو فی صدی یقین ہے کہ پانچ برس کے بعد وہ اور بھی مختلف ہو جائیں گے۔"

نئی دہلی میں مسلم طلبا کی کانفرنس میں تقریر (نومبر ۱۹۴۰ء):۔ "یہ قطعاً لازم ہے کہ ہندو ہندو راج کا خواب ترک کردیں اور ہندوستان کو ہندوؤں کے وطن اور مسلمانوں کے وطن میں تقسیم کرنے پر راضی ہوجائیں۔ آج ہم آمادہ ہیں کہ ہندوستان کا چوتھائی حصہ لے لیں اور باقی تین چوتھائی اُن کے لئے چھوڑ دیں۔ اگر وہ یونہی سودا بازی کرتے رہیں گے تو ممکن ہے کہ وہ اپنا یہ تین چوتھائی بھی نہ لے سکیں۔ آج ہمارا منتہا پاکستان ہے جس کی خاطر مسلمانانِ ہند جئیں گے اور ضرورت پڑی تو مرنے پر بھی تیار ہوں گے۔ یہ سودا بازی کا مُہرہ نہیں ہے۔ ہماری ساری اُمیدیں مُسلم قوم کے نوجوانوں سے وابستہ ہیں۔"

اخباری بیان (۱۲ جنوری ۱۹۴۱ء):۔ "تحفظات دستوری ہوں یا دُوسرے قطعاً بے سود ہیں۔ جب تک مرکز میں ایک فرقہ وارانہ ہندو اکثریت رہے گی تحفظات محض کاغذی تحفظات ہوں گے۔ اس لئے حالات کو دیکھتے ہوئے مسلمانوں کی علیحدگی سے زیادہ موزوں حل فرقہ وار مسئلے کا اور کوئی نہیں۔ اور کسی بیرونی اسلامی طاقت سے خطرہ بے معنی ہے، کیا یہاں کے مسلمان اپنے ملک میں جس میں وہ خود حکومت کر رہے ہوں گے باہر سے کسی اسلامی طاقت کو بلانا چاہیں گے کہ وہ آکر اُن پر حکومت کرے؟ اسلامی ممالک میں بھی عام میلان یہی ہے کہ اپنے ملک میں اپنی حکومت ہو۔ ہندو ہندوستان کے لئے مسلم ہندوستان نہ صرف ایک ہمدرد ہمسایہ ثابت ہوگا بلکہ بیرونی حملے کی صورت میں اُس کی شمال مغربی سرحد کا محافظ بھی ہوگا۔"

خطبۂ صدارت۔ اجلاس پاکستان پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن لاہور (۲ مارچ ۱۹۴۱ء):۔ "پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی یہ دعوت میرے لئے ایک ہم خیال ہستی کا بلاوا تھا جسے میں نے دلی مسرت سے قبول کیا۔ میں واقعی خوش ہوں کہ پنجاب کے مسلمان اب بیدار ہیں، اور نوجوانوں کا ایک چھوٹا سا گروہ اپنی محنت سے یہ کانفرنس منعقد کر رہا ہے۔" "میں سمجھتا ہوں میرا یہ خیال درست ہے کہ آج مسلم لیگ نے مسلمانانِ ہند کو ایک باوقار مرتبے تک پہنچا دیا ہے۔ انھیں اس ملک میں ایک عزت کی جگہ مل گئی ہے۔ اس نے مسلمان عوام میں ربط و ضبط کی روح پھونک دی ہے اور ان میں وہ خودداری اور خود اعتمادی پیدا کردی ہے جس کی انھیں سخت ضرورت تھی۔ آج اسلامی ہند دفتری حکومت کے پنجے سے رہائی پا چکا ہے چنانچہ وہ لوگ جو مسلمانوں پر زبردستی لیڈر بنا کر ٹھونسے گئے تھے اور جو مسلمانوں کے لیڈر بن کر خوب اکڑ اکڑ کر چلتے پھرتے تھے مگر دراصل دفتری حکومت کے کارندے تھے اب اپنی قوت کھو چکے ہیں۔ اور وہ لوگ بھی جو گاندھی ٹوپی سجا کر کانگرس کے پلیٹ فارم پر نمبردار کے ساتھ اینٹھتے تھے بے بس ہوگئے ہیں۔

اور کچھ نہیں کر سکتے۔ اب مسلمان آپ اپنے مالک بن گئے ہیں۔ وہ خود اپنے پلیٹ فارم کے گرد وہ خود اپنے جھنڈے کے گرد جمع ہو گئے ہیں اور اب وہ آپ ہی اپنی پالیسی پر عمل پیرا ہوں گے تاکہ اس نصب العین تک جا پہنچیں جو انھوں نے خود اپنے لئے متعین کیا ہے۔ تاہم ابھی ہمیں بہت کچھ کرنا ہے اور اس لئے میں تم جوانوں اور بوڑھوں مردوں اور عورتوں سب سے درخواست کرتا ہوں کہ آؤ ہم سب مصروفِ کار ہو جائیں۔ یاد رکھو پہلا کام جو ہمیں کرنا ہے یہ ہے کہ ہم اسلامی ہند میں اپنی حکومت قائم کریں اور یہ ہم محض قرارداد میں منظور کرنے سے نہیں کر سکتے۔ سمجھتے ہو اس کے کیا معنی ہیں؟ اس کے معنی ہیں کہ ہم ایک مستقل قوم ہیں اور ایک قوم کے لئے ایک مملکت کا ہونا لازم ہے۔ نرا اپنے آپ کو ایک قوم کہہ دینے سے کیا حاصل ہو گا؟ کوئی قوم محض ہوا میں نہیں بستی۔ وہ زمین پر رہتی ہے سو لازم ہے کہ وہ کسی زمین پر حکومت کیے اور اس کا ایک اپنا علاقہ اور ایک اپنی خود مختار ریاست ہو۔ یہ ہے وہ چیز جس کی تمھیں حاجت ہے۔

خوب یاد رکھو۔ یہ کوئی معمولی سا کام نہیں ہے۔ مغل سلطنت کے زوال کے بعد یہ سب سے بڑا اور مہتم بالشان کام ہے جو تم نے اپنے ذمے لیا ہے۔ اچھی طرح سمجھ لو کہ اس مقصد کے حصول کے لئے تمھیں تمام متعلقہ وسائل کی ضرورت ہے اور بڑی تیاری کی ضرورت ہے۔ مجھے یہ کہنے کی اجازت دو کہ تمھیں محض خیال آرائیوں سے متاثر نہ ہونا چاہئے محض نعروں میں نہ کھو جانا چاہئے۔ ہم مسلمان برباد شدہ اقوام کے زمرے میں شامل ہیں۔ ہم بدترین زمانہ دیکھ چکے ہیں اور میں خوش ہوں کہ اب اس ملک میں مسلمان قوم کی احیا اور حیاتِ نو کے آثار صاف طور پر عیاں ہو رہے ہیں سو اب ہماری یہ حالت ہے کہ ہم ابھی ابھی جاگے ہیں۔ ہم ابھی آنکھیں کھول رہے ہیں۔ لیکن میرے نوجوان دوستو! تم ابھی ایک بیمار آدمی ہو، ابھی تمھیں بیماری سے افاقہ ہو رہا ہے، پوری طرح صحتمند ہونے سے پہلے ابھی تمھیں اس عبوری وقت سے گزرنا ہے اور تدریج صحتمند اور طاقتور بننا ہے۔ یہ تم کیسے کرو گے؟ اس کام کے لئے کوئی عام مقررہ شاہ راہ نہیں کہ آسانی سے تم اپنی منزل پر جا پہنچو۔ سب سے پہلے تمھیں قوم کے تعمیری کاموں کی طرف اپنی توجہ کرنی ہو گی۔ اُن میں ایک تعلیم ہے جس کے بغیر ایک قوم اندھیرے میں ٹامک ٹوئیے مارا کرتی ہے تعلیم کے ساتھ سب باتیں اُس پر روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہیں۔ دوسرے یہ لازم ہے کہ ایک قوم اپنی اقتصادی حالت کو سُدھارے اور تجارت و صنعت و حرفت میں ترقی کرے اور پھر جب وہ تعلیم یافتہ ہو جائے اور مالی حیثیت سے مضبوط تو اُس کے لئے لازم ہے کہ وہ آپ اپنی حفاظت کرے۔ بیرونی حملہ آوروں کے خلاف اور اندرونی امن و امان قائم رکھنے کے لئے۔ یہ ہیں وہ تین ستون جن پر کسی قوم کی ہستی کا انحصار ہے اور کسی قوم کی طاقت اُسی نسبت سے ہوتی ہے جس نسبت سے کہ اُس کے یہ تین ستون مضبوط ہوں۔ آج ان تینوں کے لحاظ سے قوموں کی جماعت میں تمھارا درجہ سب سے پست ہے۔ یہ ہے تمھارا پروگرام۔ پس بہت بڑھ بڑھ کر باتیں نہ بناؤ اور نہ ڈینگیں مارو کیونکہ ہمیں ایسی باتوں کی ضرورت نہیں ہمیں دھمکیوں کی حاجت نہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ اوّل تو ہمارا ادّعا دیانت داری اور انصاف پر مبنی ہے اور دوسرے جو لوگ طاقتور ہوتے ہیں اور اپنے آپ پر بھروسہ کرنا سیکھ لیتے ہیں انھیں مطلق ضرورت نہیں ہوتی کہ وہ فضول دھمکیاں دیں اور ڈینگیں مارتے رہیں، اس لئے آؤ جہاں تک ہو سکے ہم اپنے مخالفین کو دلائل سے قائل کریں اور مفاہمت کی ترغیب دیں۔ میں خوب جانتا ہوں کہ ہمارے دلائل اور ہماری ترغیبات ہمیشہ کامیاب نہیں ہوتیں لیکن پھر بھی لازم ہے کہ اس بارے میں ہر ممکن کوشش کئے جائیں۔ ہمیں اُن لوگوں کے خلاف کوئی غیر ضروری تلخی پیدا کرنی چاہئیے جو فی الحال لاہور کی قرارداد پاکستان کے مخالف ہیں۔ ہم کیوں ایسا کریں؟ مجھے یقین ہے کہ خود ان مخالفین کو آخرکار یہ احساس ہو جائے گا کہ ہندوستان کے انتہا درجہ پیچیدہ مسئلے کا جس کی دُنیا بھر میں کوئی نظیر موجود نہیں یہی واحد اور یہی بہترین حل ہے۔ سو اگر تم چاہتے ہو کہ تم جلد سے جلد اپنے مقصد و منتہا کو پا لو تو جس طرح میں نے ابھی کہا ہے آؤ اُٹھو اور اپنی قوم کی بنیادوں کو تعمیر کرنا شروع کر دو۔

پاکستان کے خلاف طرح طرح کے فضول اعتراضات ہو رہے ہیں کہ اس سے ہندوستان ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا، یہ اسلام کے خلاف ہے، یہ مالی حیثیت سے غریب ملک ہو گا، یہاں کی ہندو سکھ اقلیتیں کیا کریں گی، مسلمان ہندوستان پر حملہ کر دیں گے، ہندوستان کی حفاظت کیسے ہو گی؟

رہ وغیرہ۔ اِس قسم کی بے معنی باتوں سے لوگوں کو بھڑکانا ہمارے مخالفین کے شایانِ شان نہیں۔ برائے خدا یہ تو بتاؤ کہ قرارداد لاہور کس طرح ،اسلام کے خلاف ہے؟ اور اچھا اگر بالفرض مالی حیثیت سے ہم قدرے غریب بھی ہوگئے تو حرج نہیں ایک سمجھدار آدمی کی طرح ہم اپنے اخراجات کو ں آمدنی کے مطابق کرلیں گے۔ اور اگر ہندو مسلمانوں کے حملے سے اتنے ہی خائف ہیں تو ذرا یہ بھی سوچیں کہ اِن نو کروڑ آدمیوں کو اُن کی مرضی کے ف ہندوستان میں رکھنے سے کیا یہ خطرہ نہیں کہ کہیں اس بظاہر متحدہ ہندوستان میں اُٹھ کر یہ سارے ملک پر ہی نہ چھا جائیں۔ نہیں یہ شبہات تراضات سب فضول ہیں۔ آؤ ہم دو اچھے ہمسائے ہوکر رہیں ہم دو دوست بن کر رہیں اور پھر دنیا بھر سے صاف کہہ دیں کہ جاؤ ہندوستان میا ہمت دو۔

ایک اور ضروری معاملہ ہے اور وہ سکھوں کے فرقے سے تعلق ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ سکھ کیوں خواہ مخواہ پاکستان سے ڈر رہے ہیں۔ سکھوں کی بت بہ نسبت متحدہ ہندوستان کے پاکستان میں کہیں زیادہ بہتر ہوگی۔ متحدہ ہندوستان میں وہ ایسے ہوں گے جیسے سمندر میں ایک قطرہ لیکن یہ پنجاب میں اور سارے پاکستان میں اُن کی حیثیت ایک اہم مضبوط جماعت کی ہوگی۔ اس لئے میرے سکھ دوستوں کو اس پر غور کرنا چاہیئے۔

مسلمانانِ ہند کے مسئلے کا واحد حل یہی ہے کہ ہندوستان کو تقسیم کیا جائے تاکہ دونوں قومیں اقتصادی، معاشری، تمدنی اور سیاسی لحاظ سے اپنی اپنی یات و میلانات کے مطابق نشو و نما پائیں۔ ہماری جد و جہد کا منشا یہ ہے کہ مسلمانوں کی قومی آرزو کو اظہار و ترقی کے تمام مواقع حاصل ہوں۔ یہ ہماری گی اور موت کا معرکہ ہے اور ہم محض مادی فوائد کے لئے نہیں لڑ رہے بلکہ ہم تو اس لئے جنگ کر رہے ہیں کہ مسلمان قوم کی روح زندہ و برقرار رہے اکہ طرح کھوئی نہ جائے۔ اسی لئے میں نے بار بار یہ بات دہرائی ہے کہ یہ مسلمانوں کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ اور پاکستان کوئی سودا بازی ہیں۔ مسلمانوں کو اِس حقیقت کا پورا پورا احساس ہو چکا ہے۔ اگر ہم اس جنگ میں شکست کھا جائیں گے تو سب کچھ کھو بیٹھیں گے۔ آؤ ہم اس طرح ب المثل کو اپنا مقولہ بنالیں کہ:۔

روپیہ کھویا جائے تو کچھ نہیں کھویا جاتا۔

حوصلہ کھویا جائے تو بہت کچھ کھویا جاتا ہے۔

عزت کھوئی جائے تو تقریباً سب کچھ

لیکن روح کھوئی جائے تو سبھی کچھ ہی کھو دیا جاتا ہے!"

مُسلم یونیورسٹی یونین علی گڑھ میں تقریر (۱۰ مارچ ۱۹۴۱ء): "پچھلے سال جب میں نے تم کو مخاطب کیا تھا تو ابھی قرارداد لاہور ہ نہ ہوئی تھی۔ لیکن میں نے یہ دیکھ لیا تھا کہ جو نصب العین اِس قرارداد میں مذکور ہے، تم لوگ اُس کے اظہار کے لئے بے قرار تھے۔ ہندوستان کے دوسرے توں میں بھی مجھے یہی احساس نظر آیا۔ اِس کا مطلب ہے کہ میں نے صرف یہ کام کیا کہ وہ آرزو جو اسلامی ہند کے دل میں چھپی ہوئی تھی نے دلیری سے اُس کا اظہار کردیا۔ لیکن اس تجویز پر غور کرنے کی تکلیف اٹھائے بغیر کانگرس اور دُوسرے ہندو حلقے اُسے دیکھتے ہی دیوانے ہوگئے گویا ئی ہیبت ناک خواب ہے یا کوئی خطرناک وحشی جانور۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان صدیوں سے یہیں موجود رہا ہے آج بھی یہیں موجود ہے اور روزِ قیامت تک یہیں موجود رہے گا۔ یہ ہم سے لے لیا گیا تھا۔ ہمیں فقط اُسے واپس لینا ہے۔ ہندوؤں کو اِس پر کیا حق حاصل ہے؟ ہمیں اپنی ملکیت پر حق لنے سے کون روک سکتا ہے؟ سچ یہ ہے کہ خود ہندوؤں کو اِس سے فائدہ پہنچے گا۔ آخر مسلم لیگ کیا چاہتی ہے؟ صرف یہی کہ وہ طبقے جہاں مسلم آبادی صاف اکثریت حاصل ہے، انھیں الگ کرکے آزاد ریاستیں قائم کی جائیں؛ اور جہاں جہاں ضرورت ہو صوبوں کی موجودہ حدود میں ردّ و بدل کیا جائے۔ پاکستان ایک خیالی منزلِ مقصود نہیں بلکہ عملی لحاظ سے یہی ایک چیز ہے جس کے ذریعے تم اِس ملک میں اسلام کو قطعاً فنا ہو جانے سے بچا سکتے ہو۔

اس کے لئے ابھی ہمارا سفر طول طویل ہے۔ پاکستان موجود تو ہے لیکن ابھی ہمیں اس کو قبضے میں لانا ہے۔ آزادی ہاتھ زیادہ آسانی سے آجاتی ہے لیکن اس کا سنبھالنا مشکل ہوتا ہے۔ ہمیں اپنے آپ کو تیار کرنا ہوگا، سو اپنے آپ کو طاقتور بناؤ۔ اپنی قوم کو تعلیم میں، تجارت اور صنعت و حرفت میں اور حفاظت ملک کے لئے تیار کرو۔ علی گڑھ اسلامی ہند کا اسلحہ خانہ ہے اور تم لوگ اس کے بہترین سپاہی ہو۔ سو جاؤ دیہات میں نکل جاؤ۔ وہاں عوام کو تعلیم دو اور اُن کو ہر طرح سے ترقی کرنے میں مدد دو۔ انھیں سمجھاؤ کہ ہماری منزل مقصود کیا ہے؟ بہت سے لوگ انھیں گمراہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تم ان کو یہ باتیں خوب سمجھا دو۔ پھر وہ یقیناً اپنی منزلِ مقصود کی طرف چل نکلیں گے۔ اب وقت آگیا ہے کہ تم روز بروز بیش از بیش اپنی توجہ تعمیری پروگرام کی طرف مبذول کرو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اپنی تعطیلات میں اس طرح کے عملی کام کرو مثلاً خواندگی کی توسیع، معاشرتی اصلاحات، اقتصادی بہتری اور قوم میں پہلے سے زیادہ سیاسی شعور اور انضباط پیدا کرنا۔ انگلستان میں اور کانگرسی حلقوں میں بھی ہماری تجویز پر سنجیدگی سے غور کیا جا رہا ہے۔ پس آؤ ہم منزلِ مقصود کی طرف قدم بڑھائیں۔ وقت قریب ہے اور جب تم واقعی تیار ہو جاؤ گے تو میں تمھیں بتاؤں گا کہ اب کیا کرنا چاہیئے؟"

خطبۂ صدارت سالانہ اجلاس آل انڈیا مسلم لیگ مدراس (اپریل ۱۹۴۱ء):۔ "سلطنت مغلیہ کے زوال سے کر آج تک مسلمانانِ ہند کبھی اتنے منظم اور سیاسی لحاظ سے اتنے بیدار اور زندہ و پُرشعور نہیں ہوئے جتنے کہ اس وقت ہیں۔ مسلمانوں نے اب ایک قومی علم کھڑا کیا ہے۔ ایک پلیٹ فارم قائم کیا ہے یعنی اپنی ساری جماعت کے کمل اتحاد کا اظہار کیا ہے اور اس کا ثبوت بھی پیش کیا ہے اور پھر صاف لفظوں میں انھوں نے اپنی منزلِ مقصود کی تعیین کر دی ہے حالانکہ اس سے پہلے وہ محض اندھیرے میں اُسے ڈھونڈ رہے تھے، وہ منزل پاکستان ہے۔ پہلے پانچ برس میں مسلمان لیگ کے جھنڈے تلے منظم ہوئے ہیں۔ یہ گویا ہمارا پہلا پنجسالہ منصوبہ تھا۔ اب آئندہ پانچ برس کے لئے ہمیں اپنا دوسرا پنج سالہ منصوبہ مرتب کرنا ہے۔ یہ ہے تعلیمی ترقی، معاشرتی اصلاح، اقتصادی بہتری اور مسلمانوں کی سیاسی تربیت۔ یاد رکھو کوئی شخص کسی بات میں کامیاب نہیں ہو سکتا، جب تک وہ اس کے لئے محنت اور وہ بھی محنتِ شاقہ نہ کرے۔ مستقبل پر غور کرو، کیا تم "بیڑی والے" اور "پھیرے والے" ہی رہنا چاہتے ہو یا کیا تم ملک کے صنعتی و تجارتی نشو و نما میں حصہ لینے کے خواہاں ہو؟

ہر ایک مسلمان جو لیگ کی فوج میں بھرتی ہو، ایک سپاہی کی طرح تربیت حاصل کرنی چاہیئے تاکہ وہ اعلیٰ درجہ کا رکن بن جائے اور اس سپاہی لشکر میں افسر بھی ہونے چاہئیں کیونکہ جب تک افسر نہ ہوں گے سپاہیوں کی رہنمائی کس طرح ہوگی۔ یاد رکھو سب سے بڑا کام جو اس وقت ہمیں درپیش ہے یہ ہے کہ ہم نہ صرف اس ملک کی سیاسیات، سیاسی زبان اور سیاسی طریق کار سے بخوبی واقف اور اُن کے ماہر ہوں بلکہ اس معاملے میں ہم دنیا بھر کے حالات سے بخوبی آگاہ ہوں تاکہ وقت آنے پر ہم ہر قسم کی ناگہانی ضروریات سے عہدہ برآ ہو سکیں۔

حضرات! ہم ایسے اہم یا دشوار مسائل کے حل کرنے میں جو ہماری قومی حیات و ممات سے تعلق رکھتے ہیں ہمیشہ اس طرح کامیاب نہیں ہو سکتے کہ مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر تقریریں کریں، یا اپنے مخالفوں اور دشمنوں کی قلعی کھولیں۔ اس کے لئے تمھیں ایک خاص ہتھیار تیار کرنا ہو گا اور وہ یہ ہے کہ تم خود اپنی قوت پیدا کرو، خود اپنی طاقت حاصل کرو اور اپنی جماعت کی تنظیم ایسی مکمل کر دو کہ پھر تم ہر قسم کے خطرے، ہر قسم کی طاقت اور ہر مخالف و دشمن کا مقابلہ کر سکو خواہ یہ دشمن اکیلا تم پر وار کرے یا کئی اوروں کے ساتھ مل کر حملہ آور ہو۔"

اوٹا کمنڈ میں تقریر (جون ۱۹۴۱ء):۔ "ہندوستان کبھی ایک قوم نہیں رہا۔ نمائندہ یا پارلیمنٹری حکومت کا تو ذکر ہی کیا یہاں کبھی کسی قسم کی قومی حکومت قائم نہیں ہوئی۔ یہاں کی حکومت ہمیشہ مطلق العنان تھی خواہ وہ حکومت ہندوؤں کی تھی یا مسلمانوں کی اور آج تو صرف بڑا

کی سنگینیں ہندوستان کو یکجا کئے ہوئے ہیں، جونہی یہ طاقت ہٹائی جائے گی ہندوستان کی جغرافی وحدت بھی ساتھ ہی رخصت ہو جائے گی۔"

بنگلور میں تقریر (جون ۱۹۴۱ء) :- "پاکستان ایک ایسا نصب العین ہے جس کے لئے جینے میں بھی مزا ہے اور مرنے میں بھی مزا۔ مسلمان یہ جد و جہد دوسروں کو نقصان پہنچانے کے لئے نہیں کر رہے بلکہ محض اس لئے کہ اس ملک میں وہ عزت و وقار کے ساتھ آزاد انسان بن کر رہ سکیں۔"

بمبئی میں بیان (۲۸ جولائی ۱۹۴۱ء) :- "یہ بات شرارت سے کہی اور دُہرائی جاتی ہے کہ مسلم لیگ ہندوؤں کے خلاف ایک تحریک ہے محض اس لئے کہ مسلم لیگ کو یقین ہے کہ ہندوستانی دستور کی الجھن کا واحد حل یہی ہے کہ اس کی تجویز کے مطابق ہندوستان کو تقسیم کیا جائے۔ اُس کی نیت ہندو یا ہندوستان کے خلاف نہیں ہے، بلکہ وہ چاہتی ہے کہ ہندو خود اپنے آبائی وطن کے کرتا دھرتا ہوں اور ادھر ہمیں ہمارے آبائی وطن کا انتظام کرنے دیں۔ لیکن اس کے برعکس ہندو لیڈروں میں کئی ہیں جو کھلے طور پر ہندویت اور ہندو راج کے علم بردار ہیں اور مسلمانوں کو ہمیشہ اپنے پنجے میں گرفتار رکھنا چاہتے ہیں اور یہی ہے اُن کا متحدہ جمہوری و قومی ہندوستان کا منصوبہ۔"

اسلامی ہند کو پیغام عید (اکتوبر ۱۹۴۱ء) :- "میں مسلمانوں کو عید مبارک کہتا ہوں۔ خوشی کی اس گھڑی میں جب کہ مسلمان دنیا بھر میں جابجا اکٹھے ہو کر خدا کا شکر ادا کر رہے ہیں کہ اُس نے اُنھیں اپنے فرض کی ادائیگی اور ایثار کے لئے ہمت دی آؤ ہم اپنے آپ کو اپنے ایک اور ایسے ہی ضروری فرض کی انجام دہی کے لئے تیار کریں اور آج کے مبارک دن پکا ارادہ کرلیں کہ ہم اپنی قوم کی طرف جو اس ملک میں اپنی آزادی کے لئے جد و جہد کر رہی ہے اپنا فرض پوری طرح ادا کریں گے۔ مجھے یقین ہے کہ اس گھڑی تم ہر طرح سے اپنے جان و مال کی قربانی دے کر بھی یہ کوشش کرو گے کہ اسلامی ہند ایک عظیم الشان قوم بن جائے۔ ہمارا اصول ہونا چاہیئے : "ایمان، اتحاد، انضباط"!"

خطبۂ صدارت آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن ناگ پور (دسمبر ۱۹۴۱ء) :- "اگر کوئی شخص غدار یا بے وفا ثابت ہوگا تو اُسے یقیناً نکال دیا جائے گا۔ اب دنیا کی کوئی طاقت ہمارے راستے میں حائل ہو کر ہمیں آگے بڑھنے اور مزید طاقت حاصل کرنے سے نہیں روک سکتی ... ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہمارا کوئی یار و مددگار نہیں اور ہم چاروں طرف سے دشمنوں سے گھرے ہوئے ہیں لیکن آپ کو مطلق مایوس و غم زدہ نہیں ہونا چاہیئے۔ جس شان سے اس صوبے کے مسلمان سینہ سپر ہوئے اس پر میں بے حد فخر کرتا ہوں۔ مصیبتیں تو ہمیں سہنی ہی پڑیں گی۔ بغیر دُکھ اُٹھائے اور قربانی کئے کوئی قوم نہ کبھی مضبوط ہو سکی اور نہ اُس نے اپنے منتہا کو پایا۔"

خطبۂ صدارت آل انڈیا مسلم لیگ الہ آباد (اپریل ۱۹۴۲ء) :- (کرپس کی تجاویز پر روشنی ڈالتے ہوئے اور مجوزہ مجلس آئین ساز پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا) : "جب یہ سب ہو چکے گا تو علیحدگی پسند صوبے یا صوبوں سے یوں خطاب کیا جائے گا : سنو سنو گھبراؤ نہیں تمھیں پھانسی پر لٹکائے جانے سے پہلے ایک موقع دیا جاتا ہے" (آخیر میں کہا کہ مسلمانوں کو ان تجاویز سے سخت مایوسی ہوئی ہے کیونکہ اُن کی قومی وحدت اور اخلاقی قوت کو واضح طور پر تسلیم نہیں کیا گیا)

(باقی)

بشیر احمد

غزل

جو اختیار میں ہو روحِ کائنات بنیں
فنا سے آنکھ ملائیں دلِ ثبات بنیں

حجابِ مرگ کو جو تار تار کر ڈالے
بنیں تو دوست وہ خمیازۂ حیات بنیں

کچھ اس طریق سے تنظیمِ رنگ و نور کریں
کہ ایک جاگتا فردوسِ شش جہات بنیں

قدم قدم پہ جلائیں محبتوں کے چراغ
جو قلبِ عشق پہ گزرے وہ واردات بنیں

جو ہر کسی کے لبوں پر ہو وہ نہ بات کریں
جو ہر کسی کے لبوں پر ہو ایسی بات بنیں

مٹا دیں لوحِ دو عالم سے حرفِ ناممکن
عمل کے رُوپ میں تقدیرِ ممکنات بنیں

جو ایک پل میں بدل دے نظامِ ناہموار
اُس انقلاب کا پیغامِ باصفات بنیں

عبدالمتین عارف

حضرت بایزید

حال ہی میں مرزا عبدالقادر بیدل کے مندرجہ ذیل اشعار بار بار زبان پر آتے رہے:۔

شنیدم کہ شیخِ زماں بایزید — شبے داشت با عشق گفت و شنید
کہ یارب چہ آرم منِ بوالفضول — کہ یابد دریں بزم رنگِ قبول
ندا آمد از حضرتِ ذوالجلال — کہ فرش است اینجا دو عالم کمال
زجنسِ عبادات، علم و عمل — مبرّاست ایں کشورِ بے خلل،
متاعے بجز نقص درکار نیست — کمالِ ترا کس خریدار نیست
زجنسِ شکست آنچہ پیدا شود — بریں آستاں قیمتش وا شود
شکستِ تو اینجا درستی نماست — کہ بحرِ کرم سر بسر مومیاست

ان اشعار کا ترجمہ کرنا ظلم ہے۔ ان کے معنی سمجھنے کی کوشش نہ کرنا جرم ہے۔ روحانی "نکات" کسی قسم کا فلسفیانہ گورکھ دھندا نہیں ہوتے۔ نکتہ کے سات اور ستر معنی ہوتے ہیں جن میں سے بہتر وہ ہوتے ہیں جن سے فرشتے بنیں اور پانچ وہ ہوتے ہیں جن سے ہر شخص ذاتی فہم سے فائدہ اٹھا کر مستفید ہو سکتا ہے۔

اگر کوئی لا اُبالی طبیعت والا شخص ان اشعار کو خدا کی طرف سے ہر گناہ کا ابدی لائسنس سمجھے تو "مقتضائے طبیعتش این است" ماجرا ہوگا۔ کوشش کرتا ہوں کہ معنی سمجھوں۔

اس نکتے میں اشارہ شخصی چلن کی طرف ہے قومی چلن کا مذکور نہیں۔ جہاں افراد بے سمجھ ہوں وہاں قوم مہمل ہوتی ہے۔ ایک دو سے آسمان نہیں بنتا۔

اس نکتے "میں کمال" سے کدورت نہیں۔ کدورت اس سے ہے جسے بزعمِ خود "کمال" کا دعویٰ ہو۔ اور احساس ہو کہ وہ کُلیۃً راستی "نقص" سے مراد یہ نہیں کہ پانچوں عیوب شرعی کا تاجدار رہو بلکہ اعتراف ہو کہ ع کرنے کیا آئے تھے اور کیا کر چلے۔ "شکست" کا لفظ ان اشعا ہے مگر مطلب فوجی شکست سے نہیں نہ اُس شکست" سے ہے کہ پاکستان کا مال بے دریغ لُٹا، نہ اُس سے کہ اغوا شدہ عورتوں کی موت بدتر زیست اور ان کے مردوں کی مجبوری کی بے عزتی کے مناظر سامنے ہیں اور دست دیا ہم سکت نہیں۔

اِن اشعار میں شکست کے معنی "ٹوٹنے" کے ہیں ورنہ یہ نہ کہا جاتا کہ بحرِ کرم سر بسر مومیائی ہے مگر کس چیز کے ٹوٹنے کے لئے؟ کہیں یہ اشارہ "خودی" کا بُت توڑ دو۔ دس بیس سال سے خودی کا بہت چرچا سننے میں آیا ہے مگر اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ مروجہ خودی ابلیسی خودی نہیں کون کہہ سکتا ہے کہ جس خودی کی تعلیم دی گئی تھی وہ بہتر قسم کے غلط معنوں کا شکار نہیں ہوئی؟

حضرت بایزید نے اپنے آپ کو "بوالفضول" کیوں کہا؟ کیا وہ "خودی" سے بے بہرہ تھے۔ ہرگز نہیں۔ انھیں خودی کی ابتدا انتہا دو کا مل علم تھا۔ جانتے تھے کہ صحیح خودی کے معنی تقریر فروشی یا خود فروشی نہیں۔ فنڈ کے فنڈ چٹ کر جانے والوں کا کال نہیں، کارخانے ہتیانے اور کسان کو کپاس کے دام کم دینے والے، ووٹ فروش، چور منڈیوں کے مالک غلط قسم کی خودی کا کھلا اشتہار ہیں۔

لمبے لمبے وعظوں والے اور اُلٹے سیدھے فتوے جاری کرنے والے (بالخصوص وہ جو اور کچھ نہیں کرتے) مسائل کے وہ مدعی جو عینذ

کی آگ بھڑکا کر غلط قسم کی خودی کے رقص میں مگن ہیں۔ یہ سب کے سب حضرت بایزید کو جس شکست کی تلقین دی گئی تھی اُس سے بہت دُور ہیں۔ اپنی خودی کے کافر بت کو نہیں دیکھتے قوم کو کیا سیدھا راستہ دکھائیں گے؟ اپنے آپ کو اس معنی میں مٹانا کہ بھاڑ بننا اور اُس پر فخر نہ کرنا یہ تو ہے حقیقی خودی کی جھلک، حضرت بایزید نے اسے اور واضح کر دیا۔ شیخِ زماں کہلا کر اپنے آپ کو کشورِ بے غل کے قابل نہ سمجھا اور یہی اور لوگوں کو سمجھایا۔ بہت کچھ ہوتے ہوئے یہی جتلایا کہ کچھ نہیں۔ کہاں وہ روحانی نکتہ سنج اور کہاں وہ مبلغ کہ کچھ نہ ہوتے ہوئے زمین پر پاؤں نہیں رکھتے۔

ان اشعار میں بہت سے غلط زاویہ ہائے نگاہ کا لطیف سا جواب ہے۔ مثلاً اس خودی کا: ؎

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہ‌ای ——— باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

شوخی کا یہ زور کہ ایک نہیں دو الزام مگر وہ شاعر کیا جو خدا پر تہمتیں تراشے؟ خدائی کا لطف یہ ہے کہ ظاہری دوست باطنی معترض، کافرِ مطلق، مطلب پرست نمازی سب کے لئے مداوا ہے۔

ایک اور خود پسند قسم کی خودی کا فوٹو دیکھئے: ؎

اے زاہدِ ظاہر بیں از قرب چہ می پرسی ——— او در من و من در وے چوں بو بہ گلاب اندر

اس ڈینگ کا خدائی جواب ہے ع

کمالِ ترا کس خریدار نیست

داستان لمبی، وقت محدود، فہم محدود تر، نفسیات کا سمندر عمیق، اسی نکتے میں بیدلؔ فرماتے ہیں ع

شکست است آغاز و انجامِ موج

عبدالعزیز

رُباعیات

اُمت کو راہِ حق پہ ڈالا تو نے ——— صحراؤں میں راستہ نکالا تو نے

جس بن میں سہارے ڈھونڈتی ہے دنیا ——— گرتی ہوئی قوم کو سنبھالا تو نے

بوڑھے قائد سے نوجواں شرما جائیں ——— وہ کام کیا کون و مکاں شرما جائیں

کمزور و نحیف و زار کندھوں پہ جلالؔ ——— وہ بار پڑا کہ آسماں شرما جائیں

مل جل کے رہو اپنوں کو رُسوا نہ کرو ——— ایسا نہ ہو اپنوں کو بھی بیگانہ کرو

ہو دوستو! جس سے روحِ قائد نادم ——— ایسا نہ کرو بھول کر ایسا نہ کرو

جلال میرزاخانی

"یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر"

یہ وہ الفاظ ہیں جو سعادت حسن صاحب منٹو نے کل ۲۰ اکتوبر کو مجھے اپنی تازہ ترین تصنیف "سیاہ حاشیے" ہدیۃً دیتے ہوئے کتاب پر لکھ دیئے۔ اس آشکائی ایک چھوٹی سی داستان ہے جس کے تین کردار ہیں منٹو میں اور پاکستان۔ منٹو کو جب وہ ہمایوں کے منٹو تھے میں کچھ جانتا تھا مگر جب سے وہ زیر و زبر ہوئے نی ترقی پسند ہو گئے ہم ایک دوسرے سے دور ہوتے گئے۔ پاکستان کے قیام کے بعد بھی کچھ یہی حال رہا، ان کی "لذتِ سنگ" سے مجھے مزا یاد آیا" اور ان کے قول دوستے مجھ پر ان کی ترقی پسندی کا حال کھلا۔ لیکن قائدِ اعظم کے انتقال کے بعد جب میں نے ان کی للکار سنی "یہ جھنڈے سرنگوں کرنے کا وقت نہیں جھنڈے سربلند کرنے کا وقت ہے" اور پھر "امروز" میں عسکری منٹو اتحاد کی طرف سے "پاکستان کے ادیبوں کا عزم جہاد" دیکھا تو میں نے محسوس کیا کہ مٹی رُت سے متاثر ہو کر پاکستان کا ایک بچھڑا ہوا ادیب گویا پھر اپنے ہم وطنوں سے آ ملا ہے۔ اس پر میں نے بھی اُن کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ وہ ہمایوں کو جانتے پہچانتے ہوئے یوں کے لئے کچھ لکھیں۔ چنانچہ انھوں نے مجھے ایک تازہ چیز "دیکھ کبیرا رویا" لکھ کر دی جس میں اُن کی پاکستانی گرم جوشی و شکوہ سنجی کا کھلا ہوا تیز اظہار تھا۔ ن دھیما سرد مزاج ہمایوں اس تیزی سے گھبرایا اور اس گرمی کو برداشت نہ کر سکا۔ منٹو پاکستان کا حامی ہوتے ہوئے بے اختیار ہو کر اس کی کمیوں کا شاکی ہے یوں شاکی ہوتے ہوئے بھی فی الحال ایک حد تک اظہارِ شکایت سے اجتناب کرنا چاہتا ہے۔ منٹو احتجاج کرتا ہے ہمایوں احتیاط۔

منٹو کا کہنا ہے "یہ خاموشی کہاں تک لذتِ فریاد پیدا کر" ہمایوں ابھی اس لذت سے لطف اندوز نہیں ہونا چاہتا اور اس "بلبلِ شوریدہ" کا نالہ سُن کر بت یہ التماس کرتا ہے کہ "چمن کی ہم آہنگی کے لئے" اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی"۔ لیکن تیز رَد حسّاس منٹو کا ردِّ عمل ہے کہ "یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر"۔ اس پر ہمایوں کا جواب اور دوستانہ مشورہ یہی ہو سکتا ہے کہ ضرورت ہے کہ آپ ذرا تھمیں اور ہم ذرا اور قدم بڑھائیں۔

"سیاہ حاشیے" پر حسن عسکری نے یوں حاشیہ آرائی کی ہے کہ "فسادات کے متعلق جتنے بھی افسانے لکھے گئے ہیں اُن میں منٹو کے یہ چھوٹے چھوٹے لطیفے سب سے زیادہ ہولناک اور سب سے زیادہ رجائیت آمیز ہیں۔ اُن سے ہم پر ظاہر ہوتا ہے کہ انسان ہر وقت اور بیک وقت انسان بھی ہوتا ہے حیوان بھی"۔ "انسان اگر بہت اچھا نہیں بن سکتا تو بہت برا بھی نہیں بن سکتا"۔ "اس اعتبار سے منٹو کو انسانی فطرت پر بہت بھروسہ ہے"۔ "انسان کی ہمیت بڑی سخت جان ہے"۔ "منٹو کے ان افسانوں کا سب سے بڑا وصف معمولی زندگی کی قوت اور عظمت کا یہی اعتراف ہے"۔

منٹو کے یہ "مختصر افسانے" اتنے مختصر ہیں کہ اُن میں سے چند افسانے پورے کے پورے چند سطروں میں پیش کئے جاتے ہیں۔

ساعتِ شیریں: اطلاع موصول ہوئی ہے کہ مہاتما گاندھی کی موت پر اظہارِ مسرت کے لئے امرتسر، گوالیار، اور بمبئی میں کئی جگہ لوگوں میں ریٹی بانٹی گئی (اے پ)

دعوتِ عمل: آگ لگی تو سارا محلہ جل گیا صرف ایک دکان بچ گئی جس کی پیشانی پر یہ بورڈ آویزاں تھا "یہاں عمارت سازی کا جملہ سامان ملتا ہے"۔

ہمیشہ کی چھٹی: "پکڑ لو پکڑ لو دیکھو جانے نہ پائے"۔ شکار تھوڑی سی دوڑ دھوپ کے بعد پکڑ لیا گیا۔ جب نیزے اس کے آر پار ہونے کے لئے آگے تو اُس نے لرزاں آواز میں گڑگڑا کر کہا "مجھے نہ مارو، مجھے نہ مارو، میں تعطیلوں میں اپنے گھر جا رہا ہوں"۔

رعایت: "میری آنکھوں کے سامنے میری جوان بیٹی کو نہ مارو"۔ "چلو اسی کی مان لو، کپڑے اتار کر ہانک دو ایک طرف"۔

آرام کی ضرورت: "مرا نہیں دیکھو ابھی جان باقی ہے"۔ "رہنے دو یار، میں تھک گیا ہوں"۔

بشیر احمد

پاکستان میں شخصی آزادی

اس میں شک نہیں کہ شخصی آزادی کے تصور کو کوئی مستقل بالذات حیثیت حاصل نہیں۔ اس تصور کا ارتقا تدریج اور خاص قسم کے معاشی اور سماجی حالات کے ماتحت ہوا ہے۔ اس تصور کے موجودہ شکل میں پیدا ہونے سے پہلے بھی لوگ اطمینان کی زندگی بسر کر سکتے تھے، اور اب بھی ایسا ہونا ممکن ہے۔ انسان تو بڑی جلدی بہلاووں میں آجاتا ہے۔ شخصی آزادی زندگی کی لازمی شرط نہیں۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ تصور ارتقا کے ایک خاص درجے پر پہنچ کر حاصل ہوا ہے، اور بہت سے معنوں میں ارتقا کی علامت ہے۔ یہ تصور اس بات کی شہادت ہے کہ اب انسان کی ذہنی اور اخلاقی قوتیں اس حد تک بڑھ گئی ہیں کہ ایک فرد بھی زندگی کی بہت سی باتوں میں اوروں سے الگ ہو کر چل سکتا ہے اور اپنے اوپر اعتماد کر سکتا ہے، اور ہیئتِ اجتماعی نے بھی اب اس حد تک استحکام اور توازن حاصل کر لیا ہے کہ افراد کی خود مختاری سے اس کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوتا۔ آزادی کے اس تصور کی بدولت کلچری کاوش کے بہت سے ایسے مظاہر وجود میں آئے ہیں جو اس کے بغیر پیدا ہی نہیں ہو سکتے تھے، اور اس کاوش میں حصہ لینے والوں کو بھی اس تصور سے بہت مدد ملی ہے ــــ صرف ادیبوں اور فن کاروں ہی کو نہیں بلکہ عالموں اور سائنس دانوں کو بھی۔ ایک خاص قسم کے معاشی نظام میں شخصی آزادی کے منفی پہلو بہت زیادہ اُبھر آتے ہیں، لیکن اگر معاشی انصاف کے ساتھ اس کا جوڑ ہو سکے تو شخصی آزادی کلچر کو زیادہ سے زیادہ "تومند، پہلودار اور متنوع" بنانے میں کام آسکتی ہے۔ معاشی انصاف زیادہ اہم چیز سہی، مگر شخصی آزادی بھی (بورژوا سماج کی پیداوار ہونے کے باوجود) کوئی چھوٹی چیز نہیں۔

جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے، ہمارے یہاں عام طور سے شخصی آزادی کی پوری اہمیت نہیں سمجھی جاتی۔ ہماری نوّے فی صدی آبادی ناخواندہ ہے، اُسے ابھی سیاسی آزادی اور معاشی انصاف کا مطلب ہی پوری طرح معلوم نہیں، شخصی آزادی تو پھر بھی دُور کی چیز ہے۔ مگر معاشی بے انصافی ایسی چیز ہے جس کا احساس آج کل کے زمانے میں جلد یا بدیر پیدا ہونا لازمی ہے، آدمی کی ضرورتیں خود ایسی باتیں سمجھا دیتی ہیں۔ پھر آج کل تو یہ چرچا عام ہے البتہ شخصی آزادی کی قدر و قیمت ذہنی اور تہذیبی ترقی کے بغیر معلوم نہیں ہوتی۔ مگر بھرپور تہذیبی ترقی اس آزادی کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ دونوں چیزیں لازم و ملزوم سی ہیں۔ اس لئے اگر پاکستان میں ایک چیز کو خطرہ ہے تو دوسری کو بھی۔ یہ خطرہ اوّل تو ایسے گروہوں کی طرف سے ہے جو شریعت کا نام لے کر محض ایک طبقے کے معاشی اور سماجی مفاد کا تحفظ چاہتے ہیں، اور یہ نہیں دیکھتے کہ اسلامی نظام خارجی لوازمات کا نام نہیں، بلکہ ایک خاص قسم کی رُوح سے عبارت ہے۔ اگر ہماری شخصی آزادی ایسے گروہوں کے ہاتھ سلب ہوئی تو ہم سراسر خسارے میں رہیں گے۔ اس سے تو ہمیں معاشی انصاف تک حاصل نہ ہوگا۔ مگر یہ خطرہ ان گروہوں کی طرف سے بھی ہو سکتا ہے جو معاشی انصاف چاہتے ہیں۔ اگر ہم احتیاط سے کام لیں تو ان دونوں خطروں سے بچنا ممکن ہے۔ یورپ تو آج تک انصاف اور آزادی کو ملانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ لیکن ممکن ہے کہ یہ تجربہ ہمارے یہاں کامیاب ہو ہی جائے۔ اسلامی روایات اس باب میں ہماری بہت مدد کر سکتی ہیں، کیونکہ یہ دونوں عناصر ہماری تاریخ میں موجود ہیں۔ بس اُنھیں واضح طور سے عوام کے سامنے پیش کرنے کی ضرورت ہے۔

محمد حسن عسکری

۱۷ ستمبر ۱۹۴۸ء

بگولا اُٹھا

اک بگولا اُٹھا

شُوکتا، دندناتا، بپھرتا ہوا

اک بگولا اُٹھا

سارے ماحول پر وحشتیں چھا گئیں

جیسے بس ایک چکر میں رکھ دے گا یہ۔ پیکرِ زعم اور سرفرازی جہاں کی

بگولا اُٹھا

آندھیوں سے نگاہیں ملانے لگا

اک بگولا اُٹھا

جھکڑوں کو بھی آنکھیں دکھانے لگا

شُوکتا دندناتا بپھرتا ہوا اک بگولا اُٹھا

سارے ماحول پر وحشتیں چھا گئیں

جیسے بس ایک ٹکر میں سب آندھیاں سارے جھکڑ فنا کرکے رکھ ہی تو دیگا!

بگولا اُٹھا

آندھیوں کی غلامی نہ بھائی اِسے

اک بگولا اُٹھا

جھکڑوں کی حکومت سے پانے رہائی بگولا اُٹھا

شُوکتا دندناتا بپھرتا ہوا

سارے ماحول پر وحشتیں چھا گئیں

سارا ماحول سمجھا

کہ اب ٹوٹ کر بجلیاں پے بہ پے آسماں سے گریں گی

بگولا اُٹھا

آندھیاں طیش میں آ کے بڑھنے لگیں

کف اُڑاتی ہوئی اور پھنکارتی

آگے بڑھنے لگیں

دھرتی تھرا گئی

چند لمحوں میں پھنکارتی آندھیوں کی حکومت تھی ہر سو

کہیں بھی مگر اب بگولا نہ تھا

شُوکتا، دندناتا، بپھرتا ہوا

وہ بگولا نہ تھا

جیسے ان آندھیوں کا ہی حصہ تھا اور اُن میں گھُل مل گیا

کوئی بجلی نہ ٹوٹی — نہ برسی کہیں

سارا ماحول کچھ سوچتا رہ گیا

سارا ماحول حیران ہو کر پکارا

بگولا کہاں ہے؟

بگولا کہاں ہے؟؟

بگولا کہاں ہے؟؟؟

خاطر غزنوی

۱۷ ستمبر کو نظام حیدرآباد (دکن) نے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔

عنوان سے دُور دُور

عذرا نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری اور چھت پر نظریں گاڑ دیں ۔ اس گئے لمحے وہ کچھ سوچ رہی تھی نہ جانے کیا خیال تھا ؟ بالکل نوخیز ۔ نہایت لطیف اور بے حد خوشگوار ۔ جس کی " موج خرام " اس کی سطح ذہن پر گل کتر گئی تھی " ۔۔۔ عذرا نے اپنے موجودہ خیالات پر ایک طائرانہ نظر ڈالی ۔ آج وہ خلاف معمول نارمل تھی ۔ کھانسی میں کافی افاقہ معلوم ہو رہا تھا ۔ زخموں کی ٹیسوں میں بھی کچھ کمی تھی ۔ لیکن یہ تو کوئی بے اندازہ خوشی کی بات نہ ہوئی ۔ ڈاکٹروں نے اسے پہلے ہی یقین دلا دیا تھا کہ وہ فوراً تندرست ہو جائے گی ۔ یہ خیالات ہرگز نہیں ہو سکتے ! عذرا نے پھر اپنے دماغ پر زور دیا ۔۔ محسوس کرنے کو بہچان لیا ۔ لیکن وہ نامعقول تو کبھی کا نکل بھاگا تھا جیسے کبھی آیا ہی نہ تھا اور نہ آئے گا ۔ بھلا آئے گا کیسے نہیں ؟ ضرور آئے گا اور اسی طرح دبے پاؤں بالکل غیر محسوس طریقے پر ۔ جس طرح ابھی آیا تھا ۔ عذرا کا چونکہ اُٹھنا ہی اس کم بخت کے لئے آہٹ ہو گئی بھٹکتے ہی دیکھتے یہ جا وہ جا ۔ غریب اس کی گرد کو بھی نہ پا سکی تاہم وہ اس بے نام سے خیال کے نقش قدم مٹا سکی اور نہ جھٹلا سکتی تھی ۔ عذرا کا ذہن اس شعر کی تفسیر تھا ۔

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے ۔۔۔ کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی

وہ مسکرانے لگی اس کی نرم رفتاری کا مس اس کے ذہن میں اب تک موجود تھا ۔ جیسے نیلگوں پانی پر تیرتی ہوئی بطخ کا خطِ رہ گذر ۔

" یہ زیادتی ہے سراسر زیادتی ! " عذرا نے بڑبڑاتے ہوئے اپنے دماغ کو دو انگلیوں سے ٹھونکا ۔ آخر ہو بھی کیا سکتا ہے ؟ چھوڑو بھی ! بھلا کچھ ان نے دھیان بٹانے کے لئے اپنے اردگرد کا جائزہ لینا شروع کر دیا ۔ عذرا کے برابر والی مریضہ حسب معمول کراہ رہی تھی ۔ اسے بھی اپنے کاری زخم اور ان کی ٹیسیں یاد آ گئیں ۔ لیکن وہ تو ان زخموں کی اس صدائے احتجاج پر کان نہیں دھرتی تھی ۔ بالکل خاموش رہ کر یا مسکرا کر اس نے اپنی انفرادیت قائم رکھی ڈاکٹر اسے شاباش دیتے تھے ۔ نرسیں بہت بند رہتی تھیں اور عذرا صرف مسکرا سکتی تھی ۔ اس کے زخم بھی ہرے تھے ان میں بھی ٹیس اُٹھتی تھی ۔ عذرا اس کا بھی کراہنے کو چاہتا تھا اور اکثر اس کے لبوں سے بے اختیار " آہ " نکل جاتی ۔ لیکن وہ بمشکل اپنی خفیف مسکراہٹ کو کھینچ کر لبوں تک لے آتی ۔ مسکراہٹ تھی یا مٹی مٹی ' اڑی اڑی سی لکیر ' ٹیسیں اور بخار کی تپش ' اسی مجموعے کا نام مسکراہٹ رہ گیا تھا ۔

" کیا سوچتی ہو بی بی ؟ تمہیں سونا چاہیئے اتنے وقت " نرس نے پاس سے گزرتے ہوئے ہدایت کی ۔ عذرا چونک پڑی ۔ سوچ رہی تھی ؟ اس نے خود سے سوال کیا ۔ کیا آخر ؟ کچھ بھی تو نہیں یقیناً کچھ نہیں ۔ اس کا ذہن تو کافی دنوں سے جھیل کے پانی کی طرح ساکن تھا اس میں سوچ بچار کی لہریں نہیں اٹھتی تھیں ۔ ہاں ! عذرا کو یاد آیا ۔ آج ایک لمحے میں وہی بے نام سا خیال نہایت سبک رفتاری سے گزر گیا تھا ۔ اسے پھر الجھن ہونے لگی وہ ذہن بھی بے طرح مچل اٹھا ۔ بات کیا تھی ؟ . . . . . . عذرا نے اپنی آنکھوں کے پپوٹوں پر آہستہ آہستہ انگلیاں پھیریں ۔ کس قدر جل رہی تھیں ۔ بھاری بھاری اور بے خواب آنکھیں ۔ عذرا کو محسوس ہوا جیسے وہ برسوں سے جاگ رہی ہے ۔ نرس کہا کرتی ہے کہ صرف آنکھیں بند کر لینا نیند کے برابر ہوتا ہے ۔ اس نے بارہا اس پر عمل کیا ۔ بھاری پپوٹوں کے ڈھکے جانے سے تو آنکھیں اور بھی اذیت محسوس کرتی تھیں جیسے نیندیں چل رہی ہوں ۔ خوابوں کے کچے ڈورے ٹوٹ گئے ہوں ۔۔۔ عذرا نے ڈاکٹر سے بھی ایک دن کہا تھا کہ وہ صرف ایک رات چاندنی میں گذارنا چاہتی ہے کھلی کھلی فضا اور بکھری ہوئی روپہلی کرنوں میں لپٹ کر اس کے لبوں پر جو مسکراہٹ طلوع ہو گی اس میں صداقت ہو گی اور یہ مسکراہٹیں تو جھوٹی ہیں دل نے ان پھیکے ہوئے لبوں کا ساتھ چھوڑ دیا ہے ۔

"لیکن تمہارے لئے اس قدر سردی میں کھلی فضا موت کے برابر ہے" سردیوں میں تو چاندنی راتیں اور بھی نکھر آتی ہیں۔ اس زندگی سے تو وہ موت بہتر ہوگی۔ ان باتوں پر ظفر بھی ہنس پڑا تھا۔" اگر تمہیں تندرست ہونا ہے تو کچھ دن صبر کرو" —— عذرا کو اس وقت بھی ظفر پر غصہ آرہا تھا۔ آخر وہ اتنی یگانگت کیوں جتاتا تھا۔ وہ تو ظفر کو سبطی بھیا کا ایک واجبی سا دوست سمجھتی تھی۔ خود پسند اور باتونی۔ عذرا کو ایسے لوگ ایک آنکھ نہ بھاتے تھے۔ بہت بُرا ہوا جو وہ ظفر کو فسادزدہ زخمیوں میں سسکتی مل گئی۔ عذرا نے تو بڑی ڈھٹائی سے اُسے پہچاننے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن یہ تجاہلِ عارفانہ" اور لاپروائی کا پارٹ زیادہ دن ادا نہ کر سکی۔ عذرا کی صحیح الدماغی پر کھٹے بندوں شبہ کئے جانے لگا۔ بھلا وہ اپنی صحیح الدماغی کا اس طرح خون ہوتے کیسے دیکھ سکتی تھی۔ بالآخر اسے پہچان لینا پڑا۔ اور تمام واقعات اپنی صحیح الدماغی کے ثبوت میں بلا کم و کاست بیان کر دینے پڑے۔ اس نے ایک ایک بات بتا دی۔ کہ جب بلوائیوں نے اچانک ان کے گھر پر دھاوا بول دیا۔ تو وہ بالائی منزل پر چلے گئے۔ عذرا سبطی بھیا کے بازو سے چمٹ کر رہ گئی تھی۔ اسے یوں لگا جیسے ہزاروں سپاہیوں کی محافظت میں آگئی ہے۔ وہی بلند و بالا قد۔ وہ جیہہ چہرہ مستحکم مسکراہٹ اور اس مسکراہٹ کے پاتے استقلال میں اس وقت بھی جنبش نہ آئی۔ وہ مسکرا رہے تھے۔ عذرا اُن موذیوں کے ہاتھ پڑنے سے پہلے اپنی جان پر کھیل گئی۔ وہ کھڑکی پر چڑھی۔ بلوائی نچلی منزل میں آگ لگا کر اب اوپر آرہے تھے۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں "عذرا عذرا" بھیا کی آوازیں میرے تعاقب میں چلی آئیں۔ میں زمین پر آنے سے پہلے ہی بے ہوش ہوگئی تھی۔ نہ معلوم مجھے کب ہوش آیا۔ تاہم میں مری نہیں اب تک زندہ ہوں۔ اب تو میرا دل بھی زندہ رہنے کو چاہتا ہے"۔ ظفر کے سامنے عذرا نے ان واقعات کو افسانوی انداز میں دہرایا۔" عذرا! عذرا — ان کی وہ آوازیں اب بھی میرے کانوں میں آتی ہیں" وہ ایک لمحے کے لئے رک گئی۔ وہ دل ہی دل میں مسکرا رہی تھی۔ یہ آوازیں؟ ..... بالکل جھوٹ تھی افسانہ نگاری۔ پھر بھلا اس سے مقصد کیا تھا؟ ظفر کی ہمدردی حاصل کرنا۔ عذرا جھنجھلا اٹھی۔ یہ اس کی فطرت نہ تھی۔ تاہم عذرا کو یہ سوچ کر اطمینان ہو گیا کہ بعض مرتبہ انسان اتنا محسوس نہیں کرتا جتنا کہ کہہ دیتا ہے اور اکثر صرف محسوس کر کے رہ جاتا ہے۔ اس سے کہا نہیں جاتا۔ ایک لفظ بھی نہیں کہا جاتا — اچانک اسے وہی اپنا احساس یاد آگیا۔ جس کی جستجو نے عذرا کا سکون درہم برہم کر دیا تھا اور جس کے نقشِ قدم پتھر پر لکیر ہو کر رہ گئے تھے۔ تمام خیالات اس لکیر پر سے لہروں کی طرح گذر گئے تھے۔ وہ جملے کی نوک موجود تھی۔ یہ الجھن بڑھتی چلی جاتی اگر اسی وقت نرس ٹمپریچر لینے نہ آجاتی۔ کئی دن سے عذرا کو بخار نہیں ہوا تھا۔ اب وہ تندرست ہو کر نئی زندگی کا آغاز کرے گی۔ کالج کے زمانے کے منصوبوں کو یہ ہلاکت خیزیاں ذرا بھی نقصان نہ پہنچا سکی تھیں۔ ماضی قریب کی فسادزدہ یادیں اور سبطی بھیا کو وہ بھلا دینا چاہتی تھی۔ اس کی صحت مند امیدیں تتلیوں کی طرح اردگرد منڈلا رہی تھیں۔ تندرست ہو کر وہ انہیں بآسانی قابو میں کر سکے گی۔

"نارمل؟" عذرا نے نرس سے مسکرا کر پوچھا۔

"نہیں آج تمہیں ٹمپریچر ہے"۔ عذرا کے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔

"حرارت غریزی کو بھی ٹمپریچر کہہ دیا کرتی ہیں" اس نے اپنے زرد چہرے پر بشاشت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ وہ اسی وقت پلنگ پر سے اٹھ کر چل پھر سکتی تھی۔ اور اسی وارڈ کے دس چکر لگا سکتی تھی۔ عذرا کا دل کودنے پھاندنے کو چاہ رہا تھا — لیکن اس کا سانس پھول رہا تھا جیسے حقیقتاً اس نے وارڈ کے دس چکر لگا لئے ہیں۔ عذرا نے اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھ لئے اور آہستہ آہستہ دبانے لگی۔ اسے بے طرح چکر آرہے تھے۔ عذرا کا سر نڈھال ہو کر تکئے سے ڈھلک گیا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ بادبانی کشتی میں اڑی چلی جا رہی ہے۔ اس کے احساسات سمندری لہروں کی طرح پیچھے چلے گئے۔ عذرا کو اب بھی یقین تھا۔ کہ مسکراہٹ اس کی ہمسفر ہے۔ کتنی ہلکی اور کس قدر پُر سکون۔ جیسے لہروں کے دوش پر ہوائیں۔ معاً وہ بے طرح چونک پڑی۔ اس کے احساسات کی پنکھڑیاں کسی تیز جھونکے کی زد میں آکر بکھر گئی تھیں۔ ننھے آبگینے چٹانوں سے ٹکرا گئے تھے۔ تاہم اس جھونکے کے سامنے ان پنکھڑیوں کے بکھر جانے کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ ننھے آبگینے بے حقیقت تھے۔

"آج اتوار ہے" ـــــ اس نے آنکھوں کو مسلنا شروع کر دیا "ظفر آئے گا" ـــــ اس مرتبہ بھاگتے ہوئے اس بے نام خیال کا پاؤں پھسل گیا تھا۔ یقیناً یہی خیال ہوگا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ خود کو ڈانٹنے لگی۔ اُسے تو ظفر سے کسی نیک خیال کی وابستگی سے چڑ سی ہوگئی تھی۔ آنکھ ہے تو آیا کرے۔ آج کوئی نیا تو نہیں آرہا ـــــ عذرا مسلسل بڑبڑا رہی تھی۔

"بخار تیز ہوگیا ہے" نرس نے کمبل اوڑھا دیا۔

"عذرا کیسی طبیعت ہے اب؟" ـــــ عذرا نے اپنی جھلستی ہوئی آنکھیں بمشکل کھولیں۔ ایک لمحے کے لئے اسے اپنے خیال کے مجسم ہو جانے کا شبہ ہوا۔ ظفر پریشان سا کھڑا تھا۔

"آپ! . . . . . آپ؟ . . . ہاں مجھے آپ سے ایک کام ہے" عذرا نے شکستہ لہجے میں کہا۔

"مجھ سے! کیا کام ہے بھلا؟" ظفر نے جھک کر نہایت ملائمت سے پوچھا۔

". جیسے دہکتے ہوئے شعلوں پر کسی نے پانی چھڑک دیا ہو ـــــ یا کھڑکی میں سے جھانکتی ہوئی موتیا کی ٹہنی میں سے بے شمار پھول جھڑ جایا کرتے تھے ـــــ مسکراہٹوں کا سیلاب! . . . . . . " عذرا کا حلق خشک ہو رہا تھا . . . . . . اس نے پھر جلتے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیری ۔ اور رُک کر بولی۔

"آپ بتائیے ظفر صاحب! خدا را بتائیے۔ آج حسین خیال کیا ہوگا ـ" ظفر سراسیمہ بیٹھا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ عذرا کا مطلب کیا ہے . . . . اور عذرا کی دھنسی ہوئی آنکھیں ظفر کے چہرے پر یوں گڑی ہوئی تھیں جس طرح گھڑی بند ہونے پر اس کی سوئیاں ایک ہی ہندسے پر ٹھہر جاتی ہیں۔ . . . . . .

اختر جہاں

اجل سے ـــــ!

ابھی تو آرزوئے دل جگائی ہے میں نے ۔۔۔ تخیلات کی دُنیا بسائی ہے میں نے

ابھی تو نغمۂ اُلفت سے ناشناسا ہوں ۔۔۔ نوائے عشق کی لذت سے ناشناسا ہوں

ہے مستتر نگہِ بے قرار میں فریاد ۔۔۔ اجل، قسم ہے تجھے زندگی نہ کر برباد

ابھی نہ توڑ خدارا ربابِ ہستی کو ۔۔۔ نہ چاک کر ارے ظالم کتابِ ہستی کو

ابھی نہ چھین مری کیف آفریں دُنیا ۔۔۔ حسین، آرزو انگیز، دل نشیں دُنیا

نسیمہ سوز

غزل

جگہ نہیں ہے کہیں بھی مری تہِ افلاک
سبب ہے اس کا مگر میری فطرتِ بیباک

زبانِ عرضِ محبت خدا سے مانگ تو لوں
عطا ہوا ہے مگر مجھکو دیدۂ نمناک

خدا کرے نہ کوئی تیرے در سے یوں جائے
خراب حال و شکستہ دل و گریباں چاک

نبھے تو شیخِ حرم میری کس طرح تجھ سے
چراغِ راہ مرا عشق ہے ترا ادراک

اب اپنے معرکۂ خیر و شر کی خیر منا
جنوں تو سادہ و معصوم ہے خرد چالاک

وفورِ شوق کی منزل ہے دو جہاں سے پرے
مری نگہ میں نہیں ہے یہ محفلِ خاشاک

تمام نورِ مجسّم، تمام کیف و سُرور
نہ پوچھ کیا ہے غمِ عاشقی کی لذّتِ پاک

وہ ایک دن جسے سرمایۂ حیات کہیں
اب اس کی یاد ہے اور تیرا تابشِ غمناک

تابش صدیقی

غزل

زمانہ ہنستا رہا دوست مسکراتے رہے
مگر فریب کے مارے فریب کھاتے رہے

ترے خیال کی سحر آفرینیاں توبہ
دل و دماغ میں تارے سے جھلملاتے رہے

تری نوازشِ پیہم سے ہم کو کیا نسبت
یہ اور بات ہے، ہم تیرے گیت گاتے رہے

نہ ساتھ دے سکے اُن کا نہ اُن کو چھوڑ سکے
کچھ اس طرح وہ ہمارے قریب آتے رہے

بھنور تو خیر بھنور ہے علاج کیا اس کا
کئی سفینے کناروں پہ ڈگمگاتے رہے

زمانہ غیر تھا اور غیر ہی رہا باقی
عبث چراغ اُمیدوں کے ہم جلاتے رہے

باقی صدیقی

[illegible] لارنس روڈ لاہور سے شائع کیا۔ ([illegible] پریس لاہور میں چھپا)

مطبوعات

ماہِ نو کا خاص نمبر جو پاکستان کے دارالسلطنت سے پاکستان کی پہلی سال گرہ کے دن ۱۴ اگست ۱۹۴۸ء کو شائع ہوا واقعہ سعید کے شایانِ شان حیثیت رکھتا ہے۔

"آزادی کے بارہ مہینے" اور "پاکستان کا قیام و استحکام" میں پاکستان کے پہلے سال پر سرسری نظر ڈالی گئی ہے۔ "مشرقی پاکستان کا معاشرتی خاکہ" ہمیں مشرقی بنگال سے روشناس کراتا ہے تو "شالامار باغ" "پنجاب کے دیہاتی گیت" اور "سندھی کہاوتیں" پنجاب اور سندھ کی کہانی سناتی ہیں۔ "ہماری ریاستیں" پاکستانی ریاستوں سے تعلق ہے۔ علاوہ بریں پاکستان کے مشترکہ مسائل کے سلسلے میں "پاکستان میں کلچر کا "اُردو پاکستان کی قومی زبان" ، "پاکستان کا نظامِ زر" ، "پاکستان کے تمدنی روابط" ، "دیہی اصلاح کا ایک خاکہ" اور "پاکستان کی اعلیٰ درجہ کے علمی مضامین ہیں جن میں مختلف موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ادبی مضامین میں "اُردو غزل اور حُسنِ ادا"، "اقبال کی بے جدید سوانح نگاری" اور مختلف دلچسپ افسانے قابلِ ذکر ہیں۔ اُردو کے کئی مشہور ادیبوں سے ہمارا تعارف ہوتا ہے مثلاً پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی، ڈاکٹر یوسف حسن، حامد علی خاں، سید امتیاز علی تاج، سعادت حسن منٹو، شوکت تھانوی، ڈاکٹر تاثیر اور قدرت اللہ شہاب۔ ان نے بھی دو مقالے سپردِ قلم کئے ہیں۔ خواتین میں حجاب امتیاز علی، صفیہ شمیم، ممتاز شیریں، خدیجہ مستور اور صالحہ عابد حسین کے رشحاتِ قلم شامل ہیں۔ ... میں اسد ملتانی، احمد ندیم قاسمی، سیماب اکبرآبادی، ساغر نظامی، حفیظ جالندھری، حفیظ ہوشیارپوری، جگر مرادآبادی، اختر شیرانی، بھورام جوش ملسیانی، عبدالحمید عدم، حامد اللہ افسر وغیرہ کے تخیلات زیبِ قرطاس ہیں۔ پاکستان اور قائدِ اعظم پر متعدد نظمیں ہیں پر اسد ملتانی کی نظم خوب ہے:

ہم غلامانِ رسولِ پاکؐ کی یہ شان ہے — جس زمیں پر ہم قدم رکھ دیں وہ پاکستان ہے
بہرِ مسلم زندگی کا ماحصل ایمان ہے — مال بھی اور جان بھی ایمان پر قربان ہے
ہو گیا ہے آج پاکستان پورے سال کا — دیکھ لیں کتنے ہیں جو کچھ دن کا یہ مہمان ہے
ہے یہ بے شک خطۂ محدود لیکن اس میں بھی — اہلِ ہمت کے لئے بے انتہا میدان ہے

اس ضمن میں سیماب اکبرآبادی کی نظم "ماہِ نو" کا آخری بند قابلِ داد ہے:

اپنے آئینِ کہن میں کر کے پیدا انقلاب
راہِ منزل کو نئی تدبیر سے آساں بنا — سادگی و بے زدہ کاری کو سروساماں بنا
پاک کیک پہلے اپنے دل کو پاکستاں بنا — عزمِ پاکیزہ سے پھر اس میں نئے ارماں بنا
"ماہِ نو" کی شان سے منزل میں ہو جا باریاب

رنگین و سادہ تصاویر نے رسالے کو چار چاند لگا دیئے ہیں، قائدِ اعظم، شالامار باغ لاہور، خواتینِ پاکستان اور اقبال کی دلکش تصاویر خصوصیت سے قابلِ دید ہیں رسالے کا ... صفحات پر مشتمل ہے جس کے مقابل میں ایک روپیہ قیمت بہت کم ہے ہم حکومتِ پاکستان کے شعبۂ اشاعت کو اور بالخصوص ماہِ نو کے مدیر ... کو اس خاص نمبر پر ... ہیں پاکستان کے ہر اردو نواز شہری کو یہ پرچہ خریدنا چاہیئے۔ دفتر "ماہِ نو" پوسٹ بکس ۱۰۷ کراچی سے طلب کیجئے۔

بشیر احمد

حاشیئے از سعادت حسن منٹو۔ کاغذ دبیز۔ طباعت عمدہ قیمت دو روپے

عکس تحریر قائد اعظم محمد علی جناح

الفاظ جو آپ نے مدیر ھمایوں کی بیاض میں ۲۶ مارچ ۱۹۴۰ء
کو تحریر فرمائے۔